آیت اللہ العظمیٰ محمد حسین طباطبائی

ترجمہ

المیزان

فی

تفسیر القرآن

آیت اللہ حسن رضا غدیری

۱

الغدیر اکیڈمی

تالیف

آیت اللہ السید محمد حسین الطباطبائی علیہ الرحمۃ

المیزان

فی تفسیر القرآن

(علمی، فلسفی، ادبی، تاریخی اور حدیثی معارف سے مزین تفسیر القرآن بالقرآن)

جلد ۱

ترجمہ

آیت اللہ حسن رضا غدیری

ناشر

الغدیر اکیڈمی، پاکستان

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبرنگ ایجنسی، اسلام آباد سے رجسٹرڈ

ISBN 969-8947-02-7

نام کتاب .... "المیزان" فی تفسیر القرآن

جلد .... اوّل

تالیف .... آیت اللہ علامہ السید محمد حسین الطباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ .... آیت اللہ حسن رضا غدیری مدظلہ العالی

اہتمام وتزئین .... سید دولت علی زیدی

تکمیل تدوین وترتیب .... ابومزمل الشیخ ہاشم رضا الغدیری النجفی

تاریخ اشاعت باراوّل .... جولائی 2002ء

ناشر .... المعراج کمپنی پاکستان

تاریخ اشاعت باردوم .... اپریل 2004ء

ناشر .... المعراج کمپنی پاکستان

تاریخ اشاعت بارسوم .... ستمبر 2006ء

تاریخ اشاعت بارچہارم .... مارچ 2011ء

ناشر .... الغدیر اکیڈمی پاکستان

مطبع .... حیدری پریس لاہور

ملنے کا پتہ: ☆ الغدیر اکیڈمی، حسینیہ ہال، ہوپ روڈ، لوکوشیڈ، لاہور- 54900 (پاکستان)
فون (+92-42)36840622 / 36862267

☆ حق برادرز۔ غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ، اردو بازار۔ لاہور
فون 0333-4431382

☆ Hussaini Research Center
45-Peter Avenue, London, NW10 2DD U.K
Tel & Fax: (+44) 208 621 4088

فہرست

اس جلد میں شامل اہم موضوعات

- اسم اللہ کا معنی و مقصود
- عبادت و استعانت کی حقیقت
- عام رحمت اور خاص رحمت کا فرق
- قیامت کے دن کی ملکیت یا مالکیت
- صراط اور سبیل کے معانی و فروق
- صراطِ مستقیم کی اہمیت و حقیقت اور اس پر چلنے والوں کا مقام و منزلت
- ہدایت کی اصل و اساس
- ہدایت کی دائمی و عمومی طلب کا فلسفہ
- عبادت کی اقسام و مراتب
- معجزہ اور اس کی حقیقت: قرآنی بیانات و معارف کی روشنی میں!
- قرآن کا اعجاز اور اس کا مفہوم، اعجازِ قرآن کے مختلف حوالے
- جبر اور تفویض سے مربوط حقائق
- آدمؑ کو تعلیم اسماء اور اسماء کی حقیقت
- فرشتوں کو سجدۂ آدمؑ کا خدائی فرمان
- شفاعت اور اس کا معنی و مفہوم، موارد اور مواقع
- اہل کتاب اور ان کے نفاق کا دائرہ
- والدین کی عظمت و اہمیت اور حقوق و فرائض
- ہاروت و ماروت کون تھے؟
- نسخ کی حقیقت اور قرآنی آیات میں اس کی حیثیت
- مقامِ امامت اور اس کے عطائے ربانی ہونے کا بیان
- سمتِ قبلہ اور اس کے تعین کی تحقیق
- عالمِ برزخ اور اس کی حقیقت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ○
اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ○ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ○ صِرَاطَ
الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ○

خوش نصیب ہیں وہ مومنین جن کی زندگی میں انہیں دین سے وابستگی، ادائے فرض وواجبات، اعمالِ صالحہ کی ادائیگی اور قرآن فہمی کی توفیق حاصل ہوئی اوران کی وفات کے بعدان کے لواحقین وپسماندگان نے ان کی ارواح کوشاد کرنے اوران کے زادِراہِ آخرت میں اضافہ کرنے کے لئے قرآن خوانی، مجالس عزائ، محافل دعااور باقیات الصالحات کا اہتمام کیا، اس کی ایک مثال مانچسٹر میں مقیم جناب الحاج شیخ سعید الحسن صاحب ہیں جنہوں نے اپنے والدین مرحومین اوراپنی زوجہ مرحومہ کے ایصال ثواب کے لئے دیگر اعمال خیر کے ساتھ ساتھ کتاب المیزان فی تفسیر القرآن کی پہلی جلد کی تجدید اشاعت میں مالی معاونت کی، خداوند عالم ان کے اس عمل خیر کواپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطافرمائے اوران کے والدین مرحومین اورزوجہ مرحومہ نسیم اختر حسن اور فرزند مرحوم عاصم حسن کو جوار رحمت میں جگہ دے اور انہیں شفاعتِ محمد وآل محمد علیہم السلام نصیب فرمائے، قارئین کرام سے جملہ مومنین مرحومین ومومنات مرحومات بالخصوص منگلہ خاندان کے مرحومین کے لئے سورۂ فاتحہ کی تلاوت اوردعائے مغفرت کی استدعا ہے۔

اللھم اغفر للمؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات الاحیاء منھم والاموات تابع اللھم بیننا و بینھم بالخیرات انك مجیب الدعوات انك علی کل شیی قدیر برحمتك یا ارحم الراحمین

الغدیر اکیڈمی پاکستان

عرض ناشر

قرآن مجید، خداوند عالم کا وہ عظیم ومقدس کلام ہے جسے اس نے اپنے سب سے بڑے اور آخری نبی سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کے قلب مبارک پر جبرئیل امین کے ذریعے نازل فرمایا۔ قرآن مجید اپنے لفظوں میں معانی کی ایک کائنات سمیٹے ہوئے ہے اور حضرت علیؑ کے ارشاد گرامی کے مطابق اس کے ہر ظاہر کے ستر باطن ہیں، اس مقدس کلام کا ہر حرف سرچشمۂ ہدایت ہے، اس کے الفاظ سے معانی کے کشف کرنے کا عمل کہ جسے تفسیر کہا جاتا ہے نزولِ قرآن ہی کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا اور حضرت پیغمبر اسلامؐ نے آیات کے معانی پر پڑے ہوئے حجابوں کو الٹ کر اپنی امت کو حقائق کی تصویر دکھانے کا عمل خود انجام دیا کہ جس سے اصول تفسیر سے آگاہی حاصل ہوگئی، انہیں اصولوں کی بنیاد پر آئمہ اہل بیتؑ نے سلسلۂ تفسیر جاری رکھا اور آیات کے معانی کی وضاحت فرمائی، حضرت رسول خداؐ نے یہ کام بوسیلۂ وحی انجام دیا اور کشف کے بجائے بیان ووضاحت کے ذریعے معانی ومفاہیم اور حقائق کو آشکار فرمایا، اسی طرح آئمہ معصومین علیہم السلام نے علم امامت کے ذریعے قرآنی آیات کی تفسیر وتشریح کی، جلیل القدر صحابہ کرام نے تفسیر کی بابت اپنی کاوشیں بروئے کار لائیں، یہ سلسلہ علماء کرام اور امت کے دانشوروں کے ذریعے جاری ہو گیا اور اس میں وسعت پیدا ہوئی چنانچہ ترتیبی تفسیر کے ساتھ ساتھ موضوعی تفسیر کا باب بھی کھل گیا اور اس میں بھی اہل علم ودانش نے کلام الٰہی سے ہدایت وسعادت کے جواہر تک رسائی کی ہمہ جہت کوششیں کیں، ہر عالم ومحقق نے اپنے علمی ذوق کے مطابق احادیث مبارکہ وارشادات نبویہؐ کی مدد سے تفسیر کا عمل انجام دیا، اس اثناء میں تفسیر القرآن بالقرآن کی وہ روش جس کی بنیاد حضرت پیغمبر اسلامؐ نے خود رکھی اور آئمہ اہل بیت نے اسے اپنایا اس کے تسلسل میں جن اکابرین نے اپنی فکری وعملی توانائیوں کے عملی مظاہر پیش کئے ان میں ایک نام المیزان فی تفسیر القرآن کے مؤلف کا ہے کہ جنہوں نے تفسیر القرآن بالقرآن کی بنیاد پر منفرد انداز میں قرآن فہمی کی کوشش میں کردار ادا کیا، المیزان فی تفسیر القرآن کے اردو ترجمہ کو اہل علم حضرات کی طرف سے جو پذیرائی حاصل ہوئی اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہلی جلد کی اشاعت کا تیسرا مرحلہ الغدیر اکیڈمی کے ذریعے انجام پذیر ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے ہماری کوشش ہے کہ بیس جلدوں کے اس عظیم مجموعہ کی اشاعت کو یکے بعد دیگر جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچائیں، پروف ریڈنگ کی بابت حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ اس علمی خزانہ کو کتاب کی غلطیوں سے مبرا ومنزہ صورت میں پیش کیا جائے اس کے باوجود اگر کسی مقام پر کوئی غلطی باقی رہ گئی ہو تو قارئین کرام کی نشاندہی پر ان کے شکریہ کے ساتھ آئندہ اشاعتوں میں اسے دور کر دیا جائے گا، خداوند عالم ہماری اس مخلصانہ خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے۔

(سید دولت علی زیدی)

الغدیر اکیڈمی، پاکستان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

ابتدائیہ

مقدمۂ مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ الحمدللہ الذی انزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعالمین نذیراً والصلوٰۃ والسلام علیٰ من ارسلہ شاھداً ومبشراً و نذیراً و داعیاً الی اللہ باذنہٖ و سراجاً منیراً و علیٰ آلہٖ الذین اذھب اللہ عنھم الرجس و طھرھم تطھیراً ۔

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، ہمیشہ رحم کرنے والا ہے، ہر حمد و ستائش اللہ سے مخصوص ہے، وہ کہ جس نے حق کو باطل سے جدا کرنے والی کتاب اپنے بندے پر نازل کی تا کہ وہ پوری کائنات کے لئے ۔ ہادی و رہنما اور انذار کرنے والا ہو، اور درود و سلام ہو اس ہستی پر جسے اس نے شاہد و گواہ، بشارتیں و خوشخبریاں دینے والا، انذار اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والا، اپنے اذن و حکم سے دعوت الی اللہ دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا، اور اس کی آل پر ۔ درود و سلام ہو ۔ کہ اللہ نے جن سے ہر طرح کے رجس و ناپاکی کو دور کر دیا اور انہیں اس طرح پاک کیا جس طرح پاک کرنے کا حق ہے ۔

تمہید:

ہم اس مقدمہ میں نہایت اختصار کے ساتھ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اس کتاب (المیزان) میں قرآنی آیات کریمہ کے معانی کی بابت ہمارا طریقۂ بحث کیا ہے اور آیات کی تفسیر میں ہم نے کیا روش اختیار کی ہے ۔

سب سے پہلے اس حقیقت کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ "تفسیر" یعنی قرآنی آیات کے معانی کی وضاحت اور ان کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے بحث و تحقیق کا کام ان نہایت اہم علمی کاوشوں میں سے ایک ہے جو قدیم زمانہ سے

اہل اسلام انجام دیتے چلے آ رہے ہیں' حقیقت امر یہ ہے کہ اس طرح کی بحث و تحقیق جسے ''تفسیر'' کہا جاتا ہے اگر اس کے تاریخی پس منظر پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل آغاز نزول قرآن ہی کے زمانہ سے ہو چکا تھا جیسا کہ قرآن مجید میں خدائے قدوس کے ارشاد گرامی سے ظاہر ہوتا ہے جس میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

سورہ بقرہ، آیت ۱۵۱:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

(جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیات کی تلاوت کرتا ہے اور تمہارا تزکیہ نفس کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے.....)

اس آیت مبارکہ میں ''کتاب کی تعلیم'' سے مراد قرآنی آیات کے معانی کی وضاحت اور ان سے مربوط مطالب کا بیان وتشریح ہے کہ جسے ''تفسیر'' کہا جاتا ہے۔

مفسرین اسلام کا پہلا طبقہ چند صحابہ کرام پر مشتمل تھا (یاد رہے کہ یہاں صحابہ سے ہماری مراد حضرت علی علیہ السلام اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام نہیں ہیں کیونکہ ان ہستیوں کے بارے میں ہمارا نظریہ اس سے بالاتر ہے اور ہم اس سلسلے میں بہت جلد تفصیلی تذکرہ کریں گے) جن میں جناب عبداللہ ابن عباس، جناب عبداللہ ابن عمر اور جناب اُبی وغیرھم سرفہرست ہیں' ان حضرات نے تفسیر کے حوالہ سے نہایت اہمیت اور بھرپور توجہ سے کام کیا، اس دور میں عام طور پر جو بحثیں ہوتی تھیں ان کا محور صرف یہ چار موضوعات تھے:

۱۔ آیات کے ادبی پہلو

۲۔ شان نزول

۳۔ ایک آیت کے معنی کی وضاحت کے لیے دوسری آیت سے مختصر استدلال

۴۔ تاریخی واقعات اور مبدء ومعاد۔۔ خدا وقیامت۔۔ وغیرہ کی بابت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول روایات واحادیث کے حوالہ سے آیات کی تفسیر۔

یہی روش اور طریقہ بحث دوسرے طبقہ میں آنے والے مفسرین یعنی ''تابعین'' میں بھی رائج رہا جن میں مجاہد' قتادہ' ابن ابی لیلیٰ، شعبی، سدی اور پہلی و دوسری صدی ہجری کے دانشور حضرات شامل ہیں ان سب حضرات نے صحابہ کرام ہی کے طریقہ بحث وتفسیر کو اختیار کیا البتہ ایک چیز کے اضافہ کے ساتھ اور وہ یہ کہ انہوں نے طبقہ اول کے مفسرین کی نسبت زیادہ روایات ذکر کیں (افسوس ہے کہ ان روایات میں یہودیوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کی من گھڑت روایات

بھی شامل ہوگئیں) اور وہ روایات بھی شامل کر دیں جو گزشتہ اقوام کے حالات واقعات اور تخلیق عالم سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً آسمانوں کی تخلیق کی ابتدا' زمین کی تکوین وآفرینش' دریاؤں کی تخلیق اور شداد کے باغ ارم' انبیاءؑ کی لغزشیں' تحریف قرآن اور اس طرح کی دیگر باتیں صحیح روایات واحادیث میں شامل کردی گئیں یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض روایات تفسیری وغیر تفسیری کتب میں آج بھی موجود ہیں۔

پھر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلفاء کے دور میں علم کلام کی بحثیں مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوحہ ممالک کی اقوام اور گوناگوں ادیان ومذاہب کے علماء سے ملاقاتوں ومیل جول کے نتیجہ میں رواج پاگئیں۔

دوسری جانب، پہلی صدی ہجری کے آخری حصہ میں اموی سلطنت اور پھر عباسیوں کے دور حکومت میں فلسفہء یونان کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا اور علمائے اسلام کے درمیان فلسفیانہ وعقلی مباحث کا سلسلہ وسعت اختیار کر گیا۔

تیسری طرف یہ ہوا کہ فلسفیانہ وعقلی بحثوں کے عام ہونے کی وجہ سے تصوف وعرفانی مباحث نے بھی اسلام میں راہ پالی اور لوگوں کے ایک طبقہ میں یہ رجحان پیدا ہوگیا کہ دینی معارف وحقائق کو کسی لفظی وعقلی دلیل وبرہان کے بجائے مجاہدت وریاضتِ نفس کے ذریعے حاصل کیا جائے۔

اور چوتھی سمت، یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے کہ جنہیں اہل الحدیث کہا جاتا ہے قرآنی آیات کو روایات واحادیث کے ظاہری الفاظ ہی کے ذریعے سمجھنے پر اکتفاء کرتے ہوئے ان کے معانی کے ادراک کی بابت آیات کے ادبی پہلوؤں کے علاوہ کسی بھی دوسری جہت میں بحث وتحقیق اور غور وفکر کرنے کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔

یہی وہ چار عوامل تھے جن کے باعث قرآن مجید کی تفسیر میں علماء ومحققین کی روش میں یکسانیت نہ رہی اور سب سے بڑھ کر تفسیر کے باب میں اہل علم وتحقیق کی روش وطریقہء بحث کے مختلف ہونے کا سبب ان کے مذاہب ومسالک کا مختلف ہونا تھا اور اسی مذہبی فرق ومسلکی اختلاف کے سبب مسلمانوں کے درمیان کلمہء توحید ورسالتؐ یعنی لا الہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ کے ظاہری الفاظ کے علاوہ کسی بات پر اتفاق رائے قائم نہ ہوسکا بلکہ اس کے علاوہ یہ کہ ہر مسئلہ میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا چنانچہ خداوند عالم کے اسماء مبارکہ' صفات مقدسہ وافعال کریمہ' آسمانوں اور جو کچھ ان میں ہے' زمین اور جو کچھ اس میں ہے' قضاء وقدر' جبر وتفویض' ثواب وعذاب' موت' برزخ' بعث ونشر' قبر سے اٹھنا' قیامت کے دن خدا کی بارگاہ میں حاضری' بہشت ودوزخ' مختصر یہ کہ ان تمام مسائل کے معانی ومفاہیم میں اختلاف نظر پیدا ہوگیا جن کا تعلق کسی بھی پہلو سے دینی حقائق ومعارف سے تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل اسلام میں قرآنی آیات کے معانی کو سمجھنے کی روش اور طریقہء بحث میں اختلاف پیدا ہوگیا اور ہر گروہ نے اپنے مذہب ومسلک کے مطابق تفسیر قرآن کا مخصوص طریقہ وضع کرلیا۔

تاہم وہ حضرات کہ جنہیں اصطلاح میں ''محدثین'' (حدیث شناس) کہا جاتا ہے انہوں نے صحابہ وتابعین کی

بیان کردہ روایات ہی کے ذریعے قرآنی آیات کے سمجھنے پر اکتفاء کی اور ہر آیت کی بابت صحابہ وتابعین کی ''روایات'' کو بنیاد قرار دے کر آیات کے معانی و مفاہیم کی بابت بحث و تحقیق کی لہٰذا جن آیات کی بابت روایات میسر آئیں انہوں نے ان کی روشنی میں آیات کی تفسیر کی اور اگر کسی آیت کے بارے میں انہیں کوئی حدیث و روایت نہ مل سکی تو اس کی بابت بحث و تحقیق اور غور وفکر کرنے کے بجائے اس کی بابت '' توقف '' اختیار کر لیا (یعنی کسی قسم کی رائے قائم کرنے سے اجتناب کیا) اور صرف ''حدیث'' و روایت کو آیات کے معانی کی بابت کافی سمجھا اور یہ کہہ کر ان آیات کی بابت غور وفکر کرنے سے دوری اختیار کی کہ نہ تو ان آیات کے الفاظ کسی مطلب کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں کیونکہ ان کے لیے غیر معمولی بحث و تفکر کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان آیات کی بابت کوئی روایت و حدیث موجود ہے لہٰذا اس سلسلے میں ہم اس قرآنی آیت سے تمسک کرتے ہیں جس میں خداوند عالم نے اہل علم کا بیان ذکر فرمایا ہے:

سورہ آل عمران، آیت ۷:

وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ

(جو راسخون فی العلم ہیں۔ علم کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے)

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کا یہ موقف ۔۔ اور اس پر اس آیت سے تمسک و استدلال ۔۔ غلط و نادرست ہے کیونکہ اس طرح انہوں نے عقل وفکر کی قوتوں کو بے کار کر دیا اور تفکر و تدبر کے عمل کو بے سود قرار دے دیا اور صرف روایات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے تمسک اختیار کرنے پر اکتفاء کی جبکہ ایسا کرنا ہرگز درست نہیں کیونکہ خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب ۔ قرآن مجید ۔ میں عقل کو حجت قرار دینے کی ہرگز مخالفت و ممانعت نہیں کی اور نہ ہی عقلی حقائق کو غلط و نادرست قرار دیا ہے اور یہ بات کیونکر ممکن و معقول ہے کہ قرآن عقل وفکر کو حجت قرار نہ دے جبکہ قرآن مجید اور اس کے کلام خدا ہونے کی اصل دلیل ہی عقل ہے لہٰذا حقیقت حال اس کے برعکس ہے یعنی خدا نے عقل وفکر کو حجت قرار دیا ہے اور صحابہ وتابعین کے اقوال اور ان کی بیان کردہ روایات کو حجت قرار نہیں دیا اور کسی آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ صحابہ و تابعین اور ان جیسے حضرات جو کچھ بیان کر دیں وہ تسلیم کر لو کہ وہ تمہارے لیے حجت ہے! قرآن مجید ہرگز ایسا حکم نہیں دے سکتا کیونکہ صحابہ وتابعین کے بیانات و روایات میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے کہ انہیں حجت قرار دیا ہی نہیں جا سکتا اور یہ بات قرآنی عظمت کے سراسر منافی ہے کہ وہ لوگوں کو سفسطہ و بے ربط چیز کی دعوت دے کر ایسی باتوں کو تسلیم کر لینے کی ترغیب دلائے جو تناقض و تضادات پر مشتمل ہوں (یعنی ان میں سے کچھ ایسے اقوال ہوں جو ایک دوسرے سے معنے کے لحاظ سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور کچھ ایسے ہوں جو ایک دوسرے کی نفی کرتے ہوں) اس طرح کے اقوال و روایات سے تمسک کرتے ہوئے قرآنی آیات کی تفسیر اور ان کے

معانی کو سمجھنے کی ترغیب دلانا کسی صورت میں قرآنی مقام و منزلت سے ہم آہنگ نہیں بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنی مقدس و پاکیزہ آیات میں تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے اور اس امر کی بھرپور ترغیب دلائی ہے کہ قرآنی آیات کو سمجھنے کے لیے اپنی عقلی و فکری قوتیں بروئے کار لا کر آیات کے درمیان ظاہری طور پر نظر آنے والے اختلاف کو دور کریں۔ کیونکہ حقیقی معنوں میں قرآنی آیات کے درمیان کوئی اختلاف و دوگانگی نہیں پائی جاتی ہے۔ اور یہ کام عقل و فکر کو کام میں لانے اور تفکر و تدبر کے ذریعے ہی نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید کو ہادی و رہنما' نور اور ہر چیز کے واضح بیان پر مشتمل کتاب قرار دیا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ نور اپنی روشنی کسی دوسرے کے نور سے حاصل کرے؟ اور جو چیز ہدایت کرنے والی ہو وہ خود اپنی ہدایت کے لیے کسی دوسرے کی محتاج ہو؟ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو چیز خود ہر چیز کے واضح بیان پر مشتمل ہو وہ اپنے بیان اور اپنے معانی و مطالب کی وضاحت کے لیے کسی دوسرے کی احتیاج رکھتی ہو؟ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔

اب رہی '' متکلمین'' کی بات' تو انہوں نے اختلاف مسلک کی وجہ سے اپنے مذہبی نظریات کو تفسیر قرآن کی بنیاد قرار دے کر آیات کے معانی اس انداز میں کیئے کہ ان کے عقائد و افکار اور مذہبی آراء و خیالات سے مطابقت ہو اور اگر کوئی آیت ان کے نظریات سے ٹکراتی ہو تو اس کی تاُویل کر دیں اور تاُویل بھی اپنے ہی مذہبی نظریات و مسلکی افکار کی روشنی میں کریں۔

بہر حال تفسیر قرآن مجید کی بابت مخصوص نظریات کو بنیاد قرار دے کر دوسروں سے الگ روش اختیار کرنے کے تین اسباب ہوسکتے ہیں:

(۱) علمی نظریات کا مختلف ہونا

(۲) دوسروں کی اندھی تقلید

(۳) قومی و ملی تعصّبات وغیرہ

یہاں ان اسباب کو زیر بحث لاکر ان کی صحت و سقم کی بابت اظہار خیال کی ضرورت نہیں البتہ ہم اتنا ضرور کہتے ہیں کہ اس طرح کے طریقہء بحث کو '' تفسیر'' کے بجائے '' تطبیق '' کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ جب کوئی شخص تحقیق کے مرحلہ میں مخصوص نظریات کو بنیاد قرار دے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی آراء و افکار کو قرآن فہمی کی اساس سمجھتا ہے اور قرآن کو اپنے عقائد و نظریات کی روشنی میں دیکھتا ہے گویا وہ قرآن کو اپنے نظریات سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے یعنی قرآنی مطالب کو اپنے افکار و آراء سے تطبیق دینا چاہتا ہے اور اپنے نظریات کو قرآن کے مطابق کرنا اس کا مطلوب نہیں ہے، اس لیے اس قسم کی روشِ بحث کو'' تطبیق'' کا عمل کہنا تفسیر کہنے سے زیادہ موزوں ہے۔(کیونکہ تفسیر کا اصل معنی

آیات کے مختلف پہلوؤں پر بحث اور ان میں غور وفکر کر کے ان سے مطالب اخذ کرنا ہے تاکہ ان مطالب کو عقائد و نظریات اور افکار و آراء کی بنیاد قرار دیا جائے)۔

بنابرایں جو شخص قرآنی آیات میں سے کسی آیت کی بابت بحث کرتے ہوئے اظہار خیال کرنا چاہے تو اس کے اظہار کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں (یعنی وہ بحث و تحقیق کے مرحلہ میں یہ بات سوچ سکتا ہے کہ):

۱۔ اس آیت سے کیا مراد ہے؟

۲۔ اس آیت کو کس معنے پر محمول کرنا چاہیے؟ (اس سے کون سا معنی مراد لینا چاہیے)

ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں بہت فرق ہے کیونکہ پہلی صورت میں وہ یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ قرآن کا مطلب و مقصود کیا ہے اور قرآن کیا کہنا چاہتا ہے لہٰذا اسے ہر طرح کے نظریات و افکار اور شخصی خیالات و آراء کو بالائے طاق رکھ کر آیت کے معنی و مفہوم پر غور کرنا ہوگا جبکہ دوسری صورت میں وہ اپنے نظریات کو بنیاد قرار دے کر آیت کے معنی سے مفہوم حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ قرآن سے کچھ حاصل کرنے کے بجائے اسے اپنے نظریات میں ڈھالنے کے درپے ہوتا ہے اس لیے بحث و تحقیق کے اس انداز کو آیت کے معنی کے سمجھنے اور اس کے اصل مطلب و مراد سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس صورت میں وہ شخص کوئی معنی حاصل کرنے سے پہلے ہی ایک معنی ذہن میں رکھ کر اسے قرآنی رنگ دینے میں کوشاں ہوتا ہے اس لیے اس کے ایسا کرنے کو ''تطبیق'' (قرآن کو اپنے نظریات کے مطابق بنانا) کا نام دینا زیادہ مناسب ہے۔

اب رہے فلاسفر حضرات ' تو وہ بھی متکلمین کی طرح تفسیر کی بجائے ''تطبیق'' کی وادی میں گھس گئے اور انہوں نے بھی قرآنی آیات کی بابت بحث و تحقیق میں ان آیات کی تاویل و توجیہ کا ارتکاب کیا جو اپنے ظاہری الفاظ میں ان کے فلسفیانہ نظریات و اصولوں سے ہم آہنگ نہ تھیں' یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''فلسفہ'' سے اس کا وہ عام و جامع معنی مراد ہے جس میں علوم ریاضیات' طبیعیات' الٰہیات اور حکمت عملیہ سب شامل ہیں' مزید وضاحت کے لیے یہ امر قابل ذکر ہے کہ فلاسفہ کے دو مسلک ہیں: ایک ''مشائی'' کا مسلک کہلاتا ہے اور دوسرا ''اشراق'' کا مسلک کہلاتا ہے' پہلے مسلک والوں کو ''مشائین'' اور دوسرے مسلک والوں کو ''اشراقیین'' کہا جاتا ہے' مشائین کے نظریاتی اصولوں کی بنیاد یہ ہے کہ وہ بحث و تحقیق کو صرف ظاہری دلیل و برہان کے حوالہ سے صحیح سمجھتے ہیں جبکہ اشراقیین، حقائق و معارف کو تہذیبِ نفس و ریاضت کے ذریعے حاصل کرنے کو درست قرار دیتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ ''مشائین'' نے ان تمام آیات کی تاویل کر دی جو ان حقائق کے بیان پر مشتمل تھیں جو ماورائے طبیعت' خلقت و آفرینشِ عالم' آسمانوں اور زمین کی تخلیق' برزخ و معاد اور قیامت کے بارے میں ہیں بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ انہوں نے ان تمام آیات کی تاویل کی جو ان کے اپنے بنائے ہوئے معیاروں و

فرضیات اور سائنسی علوم کے مقررہ اصولوں وضابطوں سے ہم آہنگ نہ تھیں مثلاً افلاک کے کلی وجزئی نظام عناصر کی ترتیب و ترکیب اور افلاک وعناصر کے احکام وخصوصیات‘ ان کی بابت انہوں نے کئی معیار مقرر کر دیئے جنہیں وہ ”اصول موضوعہ“ کہتے ہیں اور ان اصولوں کے بارے میں وہ خود ہی کہتے ہیں کہ یہ سب ان کے اپنے ہی بنائے ہوئے (خود ساختہ) ایسے معیار ہیں جن کی بابت کوئی ٹھوس دلیل موجود نہیں لیکن اس کے باوجود افلاک وعناصر کے احکام انہی مقررہ وموضوعہ اصولوں و معیاروں کی بنیاد پر استوار کئے گئے ہیں اور وہی اصولِ موضوعہ ان کے تمام نظریات کی اصل واساس ہیں‘ بنابرایں اگر کوئی آیت ان کے ان مقررہ اصولوں اور معیاروں پر پوری نہ اترتی ہوتو وہ فوراً اس کی تاویل کر دیتے ہیں۔

اور جہاں تک ”متصوفہ“ کا تعلق ہے تو چونکہ ان کا مسلک اور طریقہ وروش یہ ہے کہ وہ عالم ظاہر کو ہرگز درخور اعتناء نہیں سمجھتے بلکہ اپنی بحثوں میں تمام تر توجہات باطنِ خلقت پر مرکوز رکھتے ہیں اور صرف انہی آیات کی بابت بحث وتحقیق کرتے ہیں جن کا تعلق عالم باطن اور نفوس کے اسرار سے ہو اور آفاق وکائنات سے مربوط آیات کی بابت غور وفکر کرنے کے بجائے ان کی تاویل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں اور ”تنزیل“ (قرآنی آیات کے ظاہری الفاظ سے تمسک) کی بجائے ”تاویل“ کا راستہ اختیار کرتے ہیں ان کا ایسا کرنا لوگوں میں آیات کی تاویلیں کرنے کے عمل کے رواج کا سبب بنا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیات کے معانی کو سمجھنے کا معیار لوگوں کا اپنا طرز تفکر ہی قرار پایا اور قرآنی آیات کو شعری مطالب (کہ جن کا تعلق عام طور پر خیالات کی دنیا کے علاوہ کسی چیز سے نہیں ہوتا) سے خلط ملط کر کے ان کے معانی متعین کرنے کی کوشش کی گئی اور پھر ہر چیز سے ہر چیز پر استدلال کیا جانے لگا‘ پھر ان کے اس عمل وروش کا سلسلہ اس حد تک وسیع ہو گیا کہ آیات کی تفسیر میں ان کی تقسیم کر دی گئی اور کہا گیا کہ کچھ آیات واضح وروشن ہیں اور کچھ غیر واضح ومجمل‘ کچھ حروف نورانی ہیں اور کچھ ظلمانی‘ یعنی حروف کی تقسیم نور اور ظلمت کے حوالہ سے کی گئی اور ہر آیت کی تفسیر میں کہا گیا کہ اس کے فلاں حروف نورانی اور فلاں ظلمانی ہیں اور پھر ان نورانی وظلمانی حروف کے لیے مخصوص احکام وآثار مقرر کر دیئے اور انہی آثار واحکام کو آیت کے معنی ومفہوم کے سمجھنے کی بنیاد قرار دے دیا۔

یہ امر واضح ہے کہ قرآن مجید ان من گھڑت نظریات کے حامل افراد۔ متصوفہ۔ ہی کی ہدایت کے لیے نازل نہیں ہوا اور نہ ہی اس کے مخاطبین صرف علم الاعداد واوفاق اور علم الحروف کے ماہرین ہیں اور نہ ہی قرآنی معارف کی بنیاد وہ خود ساختہ امور ہیں جنہیں منجّمین (علم نجوم وفلکیات کے ماہرین) نے اپنی بحثوں کے بنیادی اصول ومعیار قرار دیا ہے اور یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ نجومیوں کے نظریاتی اصول قرآنی معارف کی بنیاد کیونکر بن سکتے ہیں جبکہ نجوم وفلکیات کے اصول ونظریات یونانیوں وغیرہ سے لے کر عربی زبان میں ڈھال دیئے گئے ہیں۔

ہاں‘ یہ بات درست ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے کچھ روایات

منقول ہیں جن میں انہوں نے ارشاد فرمایا: (ان للقرآن ظهراً و بطناً و لبطنه بطناً الیٰ سبعة ابطن او الیٰ سبعین بطناً) ''قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے اور ہر باطن کا ایک باطن یا سات باطن یا ستر باطن ہیں'' (الحدیث)

تاہم ان کے اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآن کے دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ظاہر کو بھی اسی طرح قابل توجہ قرار دیا ہے جس طرح باطن کو' اور ''تنزیل'' کو اسی طرح اہمیت دی ہے جس طرح '' تاویل'' کو دی ہے۔ انہوں نے کسی مقام پر قرآن کے ظاہر کو یکسر نظر انداز کر کے اس کے باطن سے تمسک اختیار کرنے پر اکتفاء نہیں کی۔ انشاء اللہ ہم سورہ آل عمران کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں ''تاویل'' کی بابت تفصیلی ذکر کرتے ہوئے اس امر کو واضح طور پر بیان کریں گے کہ عام طور پر ''تاویل'' کا جو معنی سمجھا جاتا ہے وہ درست نہیں کیونکہ ''متصوفہ'' اور ان کے مسلک پر چلنے والوں کی نظر میں تاویل کا مطلب یہ ہے کہ آیات سے وہ معانی مراد لیے جائیں جو ان کے ظاہری الفاظ و معانی سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور ''تاویل'' کا یہ معنی نزول قرآن اور دعوت اسلامیہ کے وسیع پیمانہ پر پھیلاؤ کے بعد مسلمانوں کے درمیان رائج ہوا جبکہ قرآن مجید کی مقدس آیات میں ''تاویل'' کے لفظ سے جو معنی مراد لیا گیا ہے وہ ''معنی و مفہوم'' کے باب سے نہیں' (لہٰذا متصوفہ نے ''تاویل'' کا جو معنی کیا ہے وہ درحقیقت ''تاویل'' کی غلط تاویل ہے)

یہ تھی سابقہ ادوار میں تفسیر قرآن کی بابت اختیار کئے گئے طریقوں اور روشوں کی تفصیل' لیکن عصر حاضر میں تفسیر قرآن کے سلسلے میں ایک نئی روش و طریقہ اور مسلک دیکھنے میں آیا ہے اور وہ یہ کہ چند نام نہاد مسلمانوں نے جدید سائنسی و طبیعی علوم اور ان جیسے دیگر علوم کہ جن کی بنیاد حسّیات و تجربات پر ہے اور اسی طرح اجتماعی و معاشرتی امور کہ جو شماریات کے تجربوں پر استوار ہیں ان میں بھرپور توجہ و انہماک اور مہارت کی وجہ سے یا تو یورپی فلاسفہ کے قدیم نظریہء حس کی طرف جھکاؤ اختیار کر لیا یا پھر اصالۃ العمل کے فلسفی نقطہء نگاہ کی طرف راغب ہو گئے (یاد رہے کہ نظریہ ''اصالۃ العمل'' کی بنیاد یہ ہے کہ انسانی ادراکات کو صرف اسی عمل کی اساس ہونے کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے جس کا تعلق انسان کی مادی زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے ہو کیونکہ انہی پر زندگی کا دارومدار ہوتا ہے) یہی وہ نظریہ ہے جس کی بنیاد پر اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے حضرات اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ ''دینی معارف کی بنیاد موجودہ مروّجہ علوم کے مسلّمہ اصولوں کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی اور دینی حقائق کا جدید علوم کی اصل روح اور اساس سے متصادم ہونا ممکن ہی نہیں' ان علوم اور ان کے مسلّمہ اصولوں کی اصل و اساس اور حقیقی روح یہ ہے: ''عالم وجود میں مادہ اور اس کی محسوس خصوصیات ہی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہر چیز کی اصل و اساس اور بنیاد یہی ہے'' لہٰذا جن چیزوں کے متعلق دینی معارف میں ایسے مطالب ذکر کئے گئے ہیں کہ موجودہ علوم سے ان کی

حقیقت کی تصدیق نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ محسوسات کے دائرہ سے خارج ہیں۔ جیسے عرش' کرسی' لوح وقلم وغیرہ' تو ان کی کسی نہ کسی صورت میں تاویل کرنی پڑے گی اور اگر دین ان امور کا تذکرہ کرے جن کے بارے میں موجودہ علوم نے سرے سے ہی کوئی رائے قائم نہیں کی اور نہ ہی ان امور سے ان علوم کا کوئی ربط وتعلق اور سروکار ہے جیسے معاد اور اس کے متعلقہ حقائق' تو ضروری ہے کہ ان کے مفاہیم کے سمجھنے کے لیے مادی قوانین کا سہارا لے کر ان حقائق کی توجیہ وتاویل کی جائے اور اسی طرح وہ امور جن پر شرعی احکام کی بنیاد قائم ہے یعنی وحی' فرشتہ' شیطان' نبوت' رسالت' امامت وغیرہ تو یہ سب روحانی وغیر مادی امور ہیں اور روح خود مادّی چیز اور مادّہ کی خصوصیات میں سے ایک ہے اور تشریع۔ قانون سازی۔ ایک طرح کی اجتماعی و معاشرتی مہارت سے عبارت ہے کہ جس سے معاشرتی قوانین کی تدوین صالح وصحیح افکار ونظریات کی بنیاد پر کی جاتی ہے تاکہ ان قوانین کے نفاذ سے ایک صالح وترقی یافتہ معاشرہ وجود میں آ سکے لہٰذا ان سب کے لیے "مادّی اصولوں اور معیاروں کو بنیاد قرار دینا پڑے گا۔"

یہ ہیں ان نام نہاد مسلمانوں کے دینی حقائق کے بارے میں نظریات' اور انہوں نے اپنے ان موہوم نظریات کو صحیح قرار دینے کے لیے روایات کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

"چونکہ روایات میں اصلی وجعلی سب مخلوط ہو چکی ہیں اس لیے ان میں سے کوئی بھی قابل اعتماد نہیں اور انہیں احکام و قوانین کی اصل واساس قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ صرف اسی حدیث وروایت کو قابل قبول سمجھا جا سکتا ہے جو کتاب الٰہی قرآن مجید سے مطابقت رکھتی ہو اور جہاں تک قرآن کا تعلق ہے تو اس کی تفسیر میں قدیم مذاہب اور آراء ونظریات کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ وہ سب عقلی استدلال کی بنیاد پر استوار ہیں جبکہ موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں علم نے حس وتجربہ کی بنیاد پر عقلی استدلال کو غلط ونادرست ثابت کر دیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر صرف اسی انداز ومسلک کے ساتھ کریں جو خود قرآن نے بتایا ہے سوائے ان موارد کے کہ جہاں ہمارے علوم نے وضاحت کر دی ہے یعنی ان میں قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ و اصول کی بجائے ہم اپنے علوم کی روشنی میں تفسیر کریں گے۔"

یہ ہے ان حضرات کے نظریات وافکار کی بنیاد کہ جسے انہوں نے اپنے صریح وواضح بیانات میں خود ذکر کیا ہے یا ان کے بیانات کی روشنی میں ضمنی طور پر سمجھی جا سکتی ہے کہ ہر چیز کی اصل بنیاد حس وتجربہ ہے اور تفسیر قرآن بھی ان امور میں سے ایک ہے جن کے لیے حس وتجربہ ہی کو اصل واساس قرار دینا چاہیے۔

بہرحال ہم اس مقام پر ان کے نظریات وافکار کی غلط بنیادوں اور ان کے علمی وفلسفی اصولوں کو زیر بحث نہیں لانا چاہتے البتہ اس امر کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ ان حضرات نے جو اعتراض سابقہ مفسرین پر کیا ہے کہ ان کا طریقۂ تفسیر نادرست تھا کیونکہ وہ تفسیر کے بجائے "تطبیق" کا عمل تھا تو یہی اعتراض بعینہ خود ان پر کیا جا سکتا ہے کہ ان کا طریقۂ تفسیر بھی

تفسیر کی بجائے "تطبیق" ہے، یہ اور بات ہے کہ انہوں نے خود ہی تفسیر قرآن کے صحیح طریقہ و روش اور اسلوب کے بارے میں اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ تفسیر القرآن بالقرآن یعنی قرآن ہی سے قرآن کی تفسیر کرنا حقیقی معنے میں "تفسیر" ہے۔
بنا برایں ہم ان حضرات سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ اگر آپ نے قرآنی آیات کے معانی کو سمجھنے کے لیے اپنی طرف سے کوئی بات شامل نہیں کی اور اپنے نظریات کو تفسیر قرآن اور آیات کے معانی کو سمجھنے میں بنیاد قرار نہیں دیا تو پھر اپنے عملی نظریات کو "مسلمہ اصولوں" کا درجہ کیوں دیتے ہیں اور ان سے روگردانی یا انہیں بنیاد قرار نہ دے کر تفسیر کرنے کو کیوں نادرست سمجھتے ہیں؟ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے سابقہ مفسرین کے طریقہء تفسیر میں کوئی اصلاحی روش نہیں اپنائی اور ان کے انداز و اسلوب کی خرابیوں کو دور کرنے میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا۔

قارئین کرام! اگر آپ ان تمام طریقوں اور نظریات پر غور کریں جو ہم نے تفسیر قرآن کی بابت ذکر کئے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان سب میں ایک مشترک خامی بلکہ نہایت بری خامی پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ علمی یا فلسفیانہ بحثوں سے حاصل کئے گئے نتائج کو قرآنی آیات کے معانی و مفاہیم پر ٹھونس دیا گیا ہے یعنی آیات کے ظاہری معانی کی پرواہ کئے بغیر ان پر علمی و فلسفیانہ مباحث کے نتائج کا رنگ چڑھا دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں ان کا طریقہء تفسیر بھی "تطبیق" کی صورت اختیار کر گیا اور انہوں نے اپنے اس "تطبیق" کے عمل کو تفسیر کا نام دے دیا اور پھر قرآنی حقائق، مجازات میں بدل گئے اور کئی آیات "تنزیل" کی اصل بنیاد سے دور ہو کر "تاویل" کی وادی میں چلی گئیں یعنی انہوں نے آیات کی تاویل اپنے نظریات اور مخصوص آراء و افکار کی روشنی میں کی' ان کا ایسا کرنا اس بات کا سبب بنا کہ قرآن کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اگرچہ وہ اپنے آپ کو هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (سورہء آل عمران، آیت ۹۶) (پوری کائنات کے لیے ہادی و رہنما)۔ نُوْرًا مُّبِيْنًا (سورہء نساء، آیت ۱۷۴) (ہر چیز کو واضح کرنے والا نور) اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورہء نحل، آیت ۸۹) (ہر چیز کا واضح بیان) کہتا ہے لیکن وہ خود ہدایت کے سلسلے میں کسی "اور" کا محتاج ہے اور نور مبین کی بجائے خود کسی اور سے روشنی حاصل کرے اور کسی "اور" کے ذریعے اس کا بیان واضح ہو اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ "اور" کیا ہے اور اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے کہ جس کے ذریعے قرآن کی ہدایت حاصل کی جا سکے؟ اور وہ کس حیثیت و منزلت کا حامل ہے کہ جو قرآن کو روشنی اور واضح بیان عطا کرتا ہے؟ اور پھر یہ بھی دیکھیں کہ اگر اس "اور" میں ہی اختلاف پیدا ہو جائے جیسا کہ اس کی بابت بہت زیادہ اختلاف واقع بھی ہو چکا ہے تو پھر ہم کس طرف رجوع کریں؟

بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تفسیر کی روش اور طریقہ و اسلوب میں جو اختلافات ذکر کئے گئے ہیں ان کا سبب کلمات یا آیات میں کسی مفرد لفظ یا جملے کے لغوی و عرفی معنی و مفہوم میں اختلاف رائے نہیں کیونکہ یہ کلام واضح عربی زبان میں ہے اور اس کے سب کلمات و آیات اس قدر واضح عربی الفاظ پر مشتمل ہیں کہ ان کے معانی کو سمجھنے میں کوئی اہل عرب اور نہ ہی

کوئی غیر عرب کہ جو عربی زبان کی لغت واسلوب کلام سے آگاہ ہو کسی قسم کی پیچیدگی کا شکار نہیں ہو سکتا' اور یہ بھی واضح ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیات ۔ جو کہ کئی ہزار ہیں ۔ میں سے کوئی ایک آیت بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی جس کے مفہوم میں اس قدر پیچیدگی اور غیر واضح صورت موجود ہو جس کی وجہ سے اس کا سمجھنا دشوار ہو' آخر ایسا کیوں ہو جبکہ قرآن مجید ہر کلام سے زیادہ فصیح کلام ہے اور فصاحت و بلاغت میں کوئی کلام اس کا ہمسر نہیں اور کسی کلام میں فصاحت کی اہم ترین شرط ہی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے اغلاق و تعقید یعنی معنے میں پیچیدگی اور غیر واضح کیفیت سے مبرا ہو لہٰذا قرآن مجید کی کسی آیت میں معنے کے لحاظ سے کوئی پیچیدگی اور اس کے مفہوم کو سمجھنے میں کوئی ابہامی کیفیت نہیں پائی جاتی یہاں تک کہ وہ آیات جنہیں'' آیات متشابہات'' کہا جاتا ہے جیسے منسوخ شدہ آیات وغیرہ تو وہ بھی مفہوم کے لحاظ سے نہایت واضح ہیں اور ان کا'' متشابہات'' ہونا ان کے ظاہری الفاظ سے معانی و مفاہیم کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری کے سبب سے نہیں بلکہ ان کے مرادی معانی کے تعین کے حوالہ سے ہے اور تفسیر کے باب میں جو اختلاف نظر اور طریقہ واسلوب میں فرق پایا جاتا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہر شخص نے کلمات کے مصداق کے تعین میں الگ الگ رائے قائم کی اور مفرد و مرکب الفاظ کے معانی و مفاہیم کی تطبیق کے موارد میں علیحدہ علیحدہ نظریات قائم کر لیے اور اس امر میں بھی اختلاف کیا کہ آیات کے الفاظ علم منطق کی روشنی میں ۔ تصور و تصدیق کے لحاظ سے کیا معنی دیتے ہیں' اس کی وضاحت یوں ہے کہ عام طور پر (جیسا کہ کہا گیا ہے) ہم جب بھی کوئی لفظ یا جملہ سنتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں اس لفظ یا جملے سے اس کا ظاہری ۔ مادی' معنی ہی آتا ہے اور کسی دوسرے معنے سے پہلے اس کے اسی معنے کی طرف ہماری توجہ مبذول ہو جاتی ہے جو مادی یا مادہ سے تعلق رکھتا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم انسان اسی مادی دنیا میں رہتے ہیں اور ہمارا بدن اور اس کی تمام قوتیں مادہ ہی سے وابستہ ہیں اور اسی کے گرد گھومتی ہیں چنانچہ ہم جب زندگی' علم' قدرت' سمع و بصر' کلام و ارادہ' رضا و غضب' اور خلق و امر جیسے الفاظ سنتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں ان کے مفاہیم کے مادی وجود نمایاں ہو جاتے ہیں یعنی ان الفاظ کے وہی معانی لوح ذہن میں مثبت ہو جاتے ہیں جن کا تعلق مادہ سے ہے' اسی طرح ہم جب آسمان و زمین' لوح و قلم' عرش و کرسی' ملائکہ اور ان کے پر' شیطان اور اس کا لشکر وغیرہ جیسے الفاظ سنتے ہیں تو فوراً ان سب کے مادی معانی ہمارے ذہنوں میں آتے ہیں اسی بنیاد پر جب ہم یہ الفاظ سنتے ہیں کہ'' خدا نے کائنات کو پیدا کیا'' اور'' خدا نے فلاں کام کیا'' ، '' خدا فلاں چیز کا عالم ہے'' ، '' خدا نے فلاں چیز کا ارادہ کیا ہے یا ارادہ کرتا ہے'' یا '' اس نے فلاں چیز کو چاہا یا چاہتا ہے'' تو ہم فوراً ان جملوں سے وہی معانی سمجھتے ہیں جو ہمارے ذہنوں میں ہیں یعنی ماضی کے صیغے (اس نے فلاں کام کیا) سے گزرے ہوئے زمانہ اور مضارع کے صیغے (وہ فلاں کام کرتا ہے) سے حال یا مستقبل کے زمانے کا تصور ذہن میں آتا ہے اور جب ان جملوں کو خدا کی طرف نسبت کے ساتھ سنتے ہیں تب بھی ہمارے ذہنوں میں ان کے وہی معانی آتے ہیں جن کا تعلق'' زمانہ'' سے ہے یعنی ماضی کے صیغہ سے، گزرے ہوئے زمانہ اور مضارع کے صیغہ سے، حال یا مستقبل کے

زمانے کی طرف توجہ ہو جاتی ہے مثلاً "خلق اللّٰہ" (خدا نے پیدا کیا) تو چونکہ یہ فعل ماضی کا صیغہ ہے لہٰذا اس سے یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کام گزرے ہوئے زمانہ میں وقوع پذیر ہوا اور "یخلق" (وہ پیدا کرتا ہے) چونکہ فعل مضارع کا صیغہ ہے اس لیے اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اس کام کو کرتا ہے یا کرے گا یعنی حال و مستقبل کے زمانہ کو ذہن میں لاتے ہیں، اسی طرح جب ہم یہ سنتے ہیں کہ خدا نے ارشاد فرمایا:

وَلَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ (سورہ ق، آیت ۳۵)۔۔ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔۔،

اور لَّاتَّخَذۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّاۤ (سورہ انبیاء، آیت ۱۷)۔۔ہم اسے اپنی طرف سے ایسا بناتے۔۔،

اور وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ (سورہ آل عمران، آیت ۱۹۸)۔۔جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ بہتر ہے نیک لوگوں کے لئے۔۔،

اور اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ (سورہ بقرہ، آیت ۲۸)۔۔تم اسی کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔۔،

تو ان تمام الفاظ سے وہی معانی ہمارے ذہنوں میں آتے ہیں جن کا تعلق مکان یعنی جگہ سے ہے مثلاً: "ہمارے پاس"، "اپنی طرف"، "اس کی طرف" وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن سے ان کے مکانی معانی ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں اس لیے جب ان الفاظ کو خدا کے لیے اور اس سے نسبت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے تو اس صورت میں بھی ہمارے ذہنوں میں وہی معانی آتے ہیں، اسی طرح جب ہم یہ ارشاد خداوندی سنتے ہیں:

"اِذَاۤ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نُّهۡلِكَ قَرۡيَةً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِيۡهَا۔۔۔" (سورہ اسراء، آیت ۱۶)۔۔جب ہم نے کسی بستی کو تباہ کرنا چاہا تو اس کے خوش عیش (صاحبان ثروت) لوگوں کو حکم دیا۔۔۔،

اور وَنُرِيۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيۡنَ ۔۔۔ (سورہ قصص، آیت ۵)۔۔ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں ان لوگوں پر۔۔۔۔،

اور يُرِيۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ (سورہ بقرہ، آیت ۱۸۵)۔۔خدا تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے۔۔،

تو ان تمام آیات میں "ارادہ" اور "چاہنے" کا وہی معنی و مطلب سمجھتے ہیں جو ہمارے ذہنوں میں پہلے سے موجود ہے، گویا ہم اپنے اور خدا کے ارادے کو ایک جیسا سمجھتے ہیں اور اس طرح کے الفاظ سے ان کے وہی معانی مراد لیتے ہیں جو عام طور پر ہمارے ذہنوں میں موجود ہوتے ہیں اور یہ صورت حال ان تمام الفاظ کی بابت ہے جن کو ہم اپنی نجی و معاشرتی زندگی میں استعمال کرتے ہیں اور ہم ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہیں کیونکہ ان الفاظ کی بناوٹ کی ضرورت ہی اس لیے پیش آئی کہ ہم معاشرتی زندگی میں ایک دوسرے کو افہام و تفہیم اور اپنے مافی الضمیر یعنی دل کی بات کا واضح طور پر اظہار کر سکیں اور چونکہ معاشرتی زندگی کا ایک اہم پہلو انسان کی مادی ضرورتوں کی تکمیل ہے لہٰذا ہم نے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے

''الفاظ'' کو ایک قسم کی علامتیں اور نشانیاں قرار دیا تاکہ ان کے ذریعے ہم اپنے مطلوبہ مقاصد کو حاصل کر سکیں اس لیے ہر لفظ کو ایک خاص چیز اور مخصوص امر کے لیے معین کر دیا اور اپنے روزمرہ کے استعمالات میں ان الفاظ سے وہی مقررہ و معینہ معانی ہی سمجھنے لگے لیکن ہمیں اس حقیقت کو ہمیشہ خاطر میں لانا چاہیے کہ جن چیزوں کے لیے ہم نے الفاظ وضع کئے چونکہ وہ مادی ہیں اور مادی اشیاء میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور وہ ضرورت کی بنیاد پر تحول و تکامل کے حوالہ سے بدلتی رہتی ہیں (معاشرتی زندگی میں انسان کی ضرورتیں روز بروز بدلتی رہتی ہیں اور ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے وہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں) مثلاً لفظ ''چراغ'' تو یہ لفظ ابتداء میں ایک ایسے برتن کا نام رکھا گیا جس میں گھی یا تیل ڈال کر اس سے فتیلہ (بتی) کو جلایا جاتا تھا تاکہ اس سے روشنی حاصل کی جا سکے اور جب بھی ''چراغ'' کا لفظ بولا جاتا تو اس سے وہی برتن سمجھا جاتا تھا' پھر رفتہ رفتہ اس میں تبدیلی آتی گئی اور علمی و معاشرتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی شکل و صورت بہتر سے بہتر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ بجلی کے بلب کی شکل اختیار کر گیا اور اب ''چراغ'' کا لفظ اس برتن کی بجائے بلب پر استعمال ہوتا ہے جبکہ اس میں اس برتن کے اجزاء میں سے کوئی چیز بھی نہیں پائی جاتی یعنی نہ وہ برتن نہ گھی یا تیل اور نہ ہی فتیلہ (بتی)، لیکن پھر بھی اسے ''چراغ'' کہا جاتا ہے' اسی طرح لفظ ''میزان'' یعنی ترازو' تو یہ بھی ابتداء میں اسی چیز کے لیے بنایا گیا تھا جس سے چیزوں کو تولا جاتا تھا اور اس کے ذریعے اشیاء کا وزن و مقدار معلوم کی جاتی تھی مگر اب یہ لفظ صرف چیزوں کی مقدار اور وزن معلوم کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ گرمی و سردی' حرارت و برودت کی مقدار اور وزن معلوم کرنے کے آلات کو بھی میزان یعنی ترازو کہا جاتا ہے' یہی حال ''اسلحہ'' کے لفظ کا ہے (کہ پہلے پہل ڈنڈوں اور چاقوؤں کو اسلحہ کہا جاتا تھا مگر رفتہ رفتہ تلوار' خنجر اور اب ٹینک' توپ' بندوق اور کلاشنکوف کے لیے ''اسلحہ'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے) تو اس سے معلوم ہوا کہ اب ان الفاظ کی لفظی صورت ہی باقی رہ گئی ہے ورنہ جن چیزوں کے لیے وہ الفاظ نام کے طور پر پہچانے جاتے تھے اب ان میں اس قدر تبدیلی آ چکی ہے کہ سابقہ اشیاء کی کوئی صورت باقی نہیں رہی' نہ وہ اجزاء ہیں اور نہ ہی ان کی سابقہ ترتیب و ترکیب باقی ہے یعنی ذات وصفات اور اوصاف سب بدل چکے ہیں صرف نام باقی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان چیزوں کے نام تجویز کرتے وقت ان کی شکل و صورت کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا بلکہ ان سے جو کام لینا مقصود تھا وہ مراد و ملحوظ رکھا گیا لہٰذا جب تک وزن معلوم کرنے یا روشنی حاصل کرنے یا اپنا دفاع کرنے کا مقصد حاصل ہوتا رہے گا اس وقت تک ترازو' چراغ اور اسلحہ کے الفاظ ہی استعمال کیے جائیں گے' اسی طرح دوسرے تمام الفاظ کہ جو کسی معین غرض کے لیے تجویز کئے گئے تو جب تک وہ غرض حاصل ہوتی رہے گی وہ الفاظ بھی استعمال ہوتے رہیں گے خواہ ان کی شکل و صورت بدل ہی کیوں نہ جائے۔

بنابریں اس امر کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ کسی نام کے صحیح استعمال کے لیے اصل معیار یہ ہے کہ اس کا مصداق اپنی اصلی غرض و غایت کا حامل ہو یعنی جس مقصد کے لیے وہ نام تجویز کیا گیا تھا وہ اس سے حاصل ہوتا ہو نہ یہ کہ صرف اس کی

ظاہری شکل وصورت ہی کے لیے وہ لفظ استعمال کیا جائے۔ مثلاً لفظ ''چراغ'' سے اس کا وہی قدیم معنی (یعنی وہ برتن کہ جس میں تیل اور بتی ہوتی تھی) سمجھا جائے اور ''اسلحہ'' صرف ڈنڈوں اور چاقوؤں ہی کو کہا جائے۔ اس طرح کا لفظی جمود ہرگز درست نہیں اور اس طرح کے لفظی جمود کی کوئی وجہ بھی معلوم نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ الفاظ کے استعمال کی عام عادت اور ان کے معانی سے ذہنی انس مذکورہ امور کی طرف توجہ رکھنے کا سبب ہے اور یہی بات اس امر کا باعث بنی کہ اصحاب حدیث میں سے گروہ مقلدین یعنی فرقہ حشویہ اور فرقہ مجسمہ نے تفسیر کے سلسلے میں آیات کے ظاہری الفاظ پر اکتفاء کی تاہم ان کا ایسا کرنا درحقیقت آیات کے ظواہر پر اکتفاء کرنا نہیں بلکہ آیات کے مصادیق کی تشخیص میں اپنی عادت اور ذہنی انس کو بنیاد قرار دینے کی ایک صورت ہے' اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود انہی ظواہر آیات میں ایسے امور موجود ہیں جن سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ آیات کے معانی کو سمجھنے کے لیے انس وعادت کا سہارا لینا اور انہیں بنیاد قرار دینا فکری پراکندگی اور اصل معانی کے سمجھنے میں سخت دشواری کا سبب بنتا ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے :

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (سورہ شوریٰ، آیت ۱۱)۔۔اس کی مثل کوئی چیز ہی نہیں۔۔،

اور لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (سورۂ انعام، آیت ۱۰۳) ۔۔ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں جبکہ وہ نظروں کا ادراک واحاطہ کر سکتا ہے اور وہ مہربان وآگاہ ہے،

اور سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (سورہ مومنون، آیت ۹۱)۔۔خدا اس سے پاک وبالاتر ہے جو وہ اس کی توصیف کرتے ہیں۔۔،

ان آیات مبارکہ میں واضح طور پر اس امر کی نفی کی گئی ہے کہ خدا اور ہمارا فہم وادراک ایک جیسا ہے یا کوئی چیز اس جیسی ہو سکتی ہے' اور یہی بات اس امر کا سبب بنی ہے کہ لوگ آیات کے معانی کو سمجھنے کے لیے اپنے معمولی فہم وادراک کا سہارا لے کر آیات کے وہ معانی مراد نہ لیں جن سے ان کے اذہان مانوس ہوں' جیسا کہ مجہول ونامعلوم نتائج کے حصول کے لیے ہر قسم کی خطاء وغلطی سے بچنے کے مقصد اعلیٰ نے انسان کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ علمی بحث وتحقیق کا دامن تھامے اور قرآن مجید کے بلند پایہ حقائق کو سمجھنے اور اس کے عظیم مقاصد کی تشخیص کے لیے ہر پہلو کو زیر بحث لائے لہٰذا آیات کے معانی اور ان کے مصادیق کی صحیح تشخیص میں علمی مباحث کی وادی میں قدم رکھنا ناگزیر ہوا اور یہ کہ تفسیر قرآن کے لیے درج ذیل دو صورتوں میں سے ایک کو اختیار کیا جائے :

(۱)۔ اپنی فکر ونظر کو بنیاد قرار دے کر بحث کریں' اور وہ یوں کہ جس مسئلہ کو کسی آیت میں ذکر کیا گیا ہے سب سے پہلے علمی وفلسفیانہ بحث کر کے اس کی اصل حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں اور جب اس کا معنی ومفہوم سمجھ میں آجائے تو آیت کو اس پر محمول کریں اور یہ کہیں کہ آیت بھی اس مطلب کو بیان کرتی ہے (جو ہم نے سمجھا ہے)' یہ طریقہ اگرچہ فکر ونظر اور علمی بحث

وتحقیق کے حوالہ سے نہایت پسندیدہ ہے لیکن قرآن اس سے ہرگز اتفاق نہیں کرتا' جیسا کہ آپ سابقہ مطالب سے سمجھ چکے ہیں کہ قرآن مجید میں اس طرح کے طریقہء تفسیر کی تائید نہیں ہوئی۔

(۲)۔ قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے کریں' اور وہ اس طرح کہ کسی آیت کے معنی کو سمجھنے کے لیے اس جیسی دوسری آیت میں غور وفکر کرنے اور تفکر وتدبر کے اس طریقہ وروش کو اپنائیں جو خود قرآن مجید میں موردِ توجہ قرار دیا گیا ہے اور آیات کے مصادیق کی تشخیص اور ان کی صحیح پہچان کے لیے انہی خصوصیات کو معیار قرار دیں جو آیات قرآنیہ نے بتائی ہیں جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: (آیات ملاحظہ ہوں)

سورہء نحل، آیت ۸۹:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ

(ہم نے آپؐ کی طرف کتاب نازل کی جو کہ ہر چیز کا واضح بیان ہے)

اس آیت مبارکہ میں قرآن کو ہر چیز کا واضح بیان۔ یا ہر چیز کو واضح طور پر بیان کرنے والی کتاب۔ کہا گیا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود تو ہر چیز کا واضح بیان کرنے والا ہو لیکن خود اپنی وضاحت نہ کر سکے' ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔

سورہء بقرہ، آیت ۱۸۵:

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

(وہ لوگوں کے لیے ہادی ورہنما ہے اور ہدایت کی واضح نشانیاں اور حق وباطل کے درمیان فرق کو واضح کرنے والا ہے)

سورہء نساء، آیت ۱۷۴:

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا

(ہم نے تمہاری طرف نور مبین بھیجا)

ان آیات کے باوجود یہ بات کیونکر درست ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید لوگوں کے لیے ہر اس چیز میں ہادی ورہنما' واضح نشانی' حق وباطل کے درمیان فرق کو واضح کرنے والا اور تابندہ نور ہو جس کی وہ احتیاج رکھتے ہیں لیکن ان کے لیے خود اپنی بابت کفایت نہ کرے جبکہ لوگ ہر چیز سے زیادہ قرآن کے محتاج ہیں؟ اس کے علاوہ یہ کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہء عنکبوت، آیت ۶۹:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

(جو لوگ ہماری بابت کوشش کریں ہم ضرور انہیں اپنے راستوں کی رہنمائی کرتے ہیں)

تو کون سی ایسی کوشش ہے جو کتاب خدا کے معانی کو سمجھنے میں اپنی توانائیاں بروئے کار لانے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور کون سا ایسا راستہ ہے جو قرآن سے زیادہ ہدایت و رہنمائی کرنے والا ہے ؟

بہر حال اس موضوع کی بابت کثیر تعداد میں آیات موجود ہیں اور ان سب کے بارے میں ہم تفصیلی تذکرہ سورہء آل عمران کے اوائل میں " محکم و متشابہ " آیات کی بحث میں کریں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں کیا روش و طریقہ اپنایا ہے؟ کیونکہ خدا نے آنحضرتؐ کو قرآن کی تعلیم دی اور پھر انہیں اپنی اس مقدس کتاب کا معلم قرار دیا جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے :

سورہء شعراء، آیت ۱۹۴:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿۱۹۳﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ (اسے روح الامین نے آپؐ کے دل پر اتارا)

سورہء نحل، آیت ۴۴:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ....

(اور ہم نے آپؐ پر ذکر (قرآن) نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کو واضح طور پر بتائیں کہ ان کے لیے کیا نازل کیا گیا ہے)

سورہء جمعہ، آیت ۲:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ....

(وہ (پیغمبرؐ) لوگوں کے سامنے آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہء نفس کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے)

ان آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کے علوم و معارف اور مقدس حقائق کی تعلیم دینے والا کہا گیا ہے اور واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں، آنحضرتؐ نے یہ مقام (یعنی قرآن کی تعلیم دینا اور لوگوں کو کتاب خدا کے بیانات سے آگاہ کرنا) آئمہ اطہار علیہم السلام کو عطا فرمایا اور اس اہم کام کے لیے انہیں اپنا قائم مقام بنایا، چنانچہ فریقین (شیعہ و سنی) کے نزدیک متفقہ حدیث میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا :

"انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله و عترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا بعدی ابداً و انهما لن یفترقا حتیٰ یردا علیّ الحوض" (میں تم میں دو گرانقدر چیزیں

چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی عترت اہل بیتؑ اگر تم نے ان دونوں سے تمسک اختیار کیا تو تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوض کوثر پر آ جائیں گے)۔

۔کتاب بصائر الدرجات صفحہ ۴۱۳۔۔

اس بیان میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن و اہل بیتؑ کے مقام و منزلت کو واضح طور پر ذکر فرمایا ہے اور اہل بیتؑ کو قرآن کے ساتھ ساتھ قرار دیا ہے اور لوگوں کو دونوں کے ساتھ تمسک اختیار کرنے اور اسے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی کی تصدیق ان آیات مبارکہ سے ہوتی ہے :

سورہ احزاب، آیت ۳۳:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا

(اے اہل بیتؑ! خدا کا ارادہ ہے کہ وہ ہر قسم کے رجس کو تم سے دور رکھے اور تمہیں اس طرح پاک رکھے جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے)

سورہ واقعہ، آیات ۷۷ تا ۷۹:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾

(یہ قرآن کریم ہے، ایک پوشیدہ کتاب میں ہے، کہ جسے پاک و مطہر افراد کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا)

تو یہ دوسرا طریقہ تفسیر کہ جسے ہم نے ذکر کیا ہے اسے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اپنایا چنانچہ اس سلسلے میں متعدد روایات و احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہل بیتؑ نے تفسیر قرآن کی بابت اسی روش کو اختیار کیا۔ ہم عنقریب ان روایات کو اس کتاب میں ''روایات پر ایک نظر'' کے عنوان سے آیات کی تفسیر کے ذیل میں ذکر کریں گے اور آپ ان کا مطالعہ کر کے اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے کہ آج تک کسی محقق نے ان روایات و احادیث میں تفسیر قرآن کی بابت کوئی ایک مورد و مقام بھی ایسا نہیں پایا جس میں آئمہ اہل بیتؑ نے کسی علمی فرضیہ یا فلسفی نظریہ کو بنیاد قرار دیا ہو اور وہ ایسا کیونکر کر سکتے تھے جبکہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے :

فاذا التبست عليكم الفتن كقطع الليل المظلم فعليكم بالقرآن فانه شافع مشفع، و ماحل مصدق، من جعله اماماً قاده الى الجنّة، ومن جعله خلفه ساقه الى النار، وهو الدليل يدل على خير سبيل، و هو كتاب تفصيل، و بيان و تحصيل، و هو الفصل ليس بالهزل، و له ظهر و بطن، فظاهره حكمة، و باطنه علم، ظاهره انيق، و

باطنه عميق، له نجوم، و على نجومه نجوم، لا تحصى عجائبه، ولا تبلى غرائبه، فيه مصابيح الهدى، و منار الحكمة، و دليل على المعروف لمن عرف النصفة. فليرع رجل بصره، ويبلغ الصفة نظره، ينجو من عطب، و يخلص من نشب، فان التفكر حياة قلب البصير كما يمشي المستنير في الظلمات بالنور يحسن التخلص، و يقل التربص"

جب فتنے سیاہ رات کے ٹکڑوں کی طرح تم پر آ پڑیں اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے تو اس وقت تم قرآن سے تمسک اختیار کرو کیونکہ وہی شفاعت کرنے والا ہے اور اس کی شفاعت قابل قبول واقع ہوگی' اور وہی ہے جو صحیح اور حق و حقیقت کے اثبات میں قابل تصدیق کردار ادا کرسکتا ہے جو شخص اسے اپنا پیشوا قرار دے تو وہ (قرآن) اسے بہشت لے جائے گا اور جو اسے پس پشت ڈال دے تو وہ اسے جہنم میں دھکیل دے گا' قرآن ایسا راہنما ہے جو سب سے بہتر راستے کی نشاندہی کرتا ہے' وہ ایسی کتاب ہے جس کے ذریعے حق و باطل کے درمیان تمیز ہوسکتی ہے' اور وہ ایسی کتاب ہے جس میں ہر چیز کا واضح بیان موجود ہے' اسی کے ذریعے حق و حقیقت کا حصول ممکن ہے' وہ خدا کی کھلی ہوئی کتاب ہے کہ اس میں حق و باطل کی پہچان کے بنیادی اصول نہایت سنجیدگی کے ساتھ۔ بیجا و فضول باتوں سے منزہ۔ ذکر کئے گئے ہیں' وہ ایسی کتاب ہے جس کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی' اس کا ظاہر سراسر حکمت و دانائی اور اس کا باطن بھرپور علم ہے' اس کا ظاہر عمدہ و دلکش اور اس کا باطن نہایت عمیق ہے' اس کے کئی نجوم اور روشن نشانیاں ہیں اور ان تمام نجوم پر کئی اور نجوم ہیں' قرآن کے عجائبات اور پاکیزہ قدروں کو شمار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کے اسرار و رموز کی عظمتیں بوسیدہ ہوسکتی ہیں' اس میں ہدایت کے روشن چراغ اور حکمت و دانائی کے درخشندہ مینار ہیں' قرآن ہر نیکی کا راستہ دکھاتا ہے لیکن اسے جو انصاف پسند و حقیقت شناس ہو' لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ پوری توجہ کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے' اس کی گہرائیوں میں فکر و نظر کرے اور اس کی اصل حقیقت اور مقدس صفات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے معانی پر غور کرے ایسا شخص تباہی کے گہرے کھڈ میں گرنے سے بچ جائے گا اور آنکھوں میں دھول جھونکنے والوں کے حملوں سے امان میں رہے گا کیونکہ دانا و اہل بصیرت شخص کے لیے حق و حقیقت کو سمجھنے کی خاطر غور و فکر کرنا اصل میں دل کی زندگی ہے اور وہ اس طرح سے ہے جیسے کوئی شخص چراغ ہاتھ میں لے کر اندھیروں میں چلتا ہے تاکہ اس کی روشنی سے منزل مقصود کا راستہ دیکھ سکے اور نہایت آسانی کے ساتھ تاریکیوں سے نجات پا کر اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوسکے)

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۳۱۔ میں قرآن مجید کی توصیف کے ضمن میں) یوں ارشاد فرمایا:

"ینطق بعضه بعضاً و یشهد بعضه علیٰ بعض"

(قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض حصے کی وضاحت کرتا ہے اور اس کا بعض حصہ دوسرے بعض کی صداقت پر گواہ ہے)

تو یہ طریقہء تفسیر ہی درحقیقت اس باب میں صراط مستقیم۔ قرآنی حقائق کو سمجھنے کا سیدھا راستہ۔ ہے اور اسے ہی معلّمین قرآن اور لوگوں کو قرآنی معارف وحقائق سے آگاہی دلانے والے آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے تفسیر کے باب میں اختیار کیا ہے' ہم بھی اپنی اس کتاب میں انشاءاللہ تعالیٰ اسی روش وطریقہ کو اپنائیں گے اور اسی کو بنیاد قرار دے کر قرآنی آیات کی بابت مطالب بیان کریں گے۔ بنابراین ہم نے اپنی تمام بحثوں میں اور مطالب کے بیان میں فلسفیانہ نظریات یا علمی مفروضات یا عرفانی مکاشفات میں سے کسی چیز کو ہرگز بنیاد قرار نہیں دیا' تاکہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی کے ذریعے اور قرآن ہی کے حوالہ سے کی جائے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہم نے اس تفسیر میں صرف انہی ادبی نکات کو ذکر کیا ہے جن کا جاننا عربی زبان کے اسلوب کلام کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے یعنی صرف ان ادبی پہلوؤں کے بدیہی و مسلّمہ اور ناقابل انکار اصولوں یا عملی معیاروں کو ذکر کیا ہے جن کی بابت سب کی سوچ یکساں ہے۔

بہرحال مذکورہ مطالب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم نے تفسیر قرآن میں جس طریقہ وروش کو اپنایا ہے اس میں ہماری تمام تر کوشش یہ رہی ہے کہ ہم آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے انداز تفسیر کو بنیاد قرار دے کر قرآن کی تفسیر قرآن ہی کے ذریعے کریں' اس لیے ہم نے درج ذیل امور کو اپنی تمام بحثوں کا محور قرار دے کر ان کی بابت اہم مطالب ذکر کئے ہیں :

(۱) وہ مطالب جن کا تعلق خداوند عالم کے اسماء مبارکہ و صفات کریمہ مثلاً حیات' علم' قدرت' سمع' بصر اور وحدانیت وغیرہ سے ہے' لیکن جہاں تک اس کی مقدس ذات کا تعلق ہے تو آپ اس امر سے آگاہ ہو جائیں گے کہ قرآن نے ذات کردگار کو ہر قسم کے بیان و وضاحت سے بے نیاز قرار دیا ہے یعنی وہ اس قدر واضح و آشکار حقیقت ہے کہ اس کے لیے مزید کسی اظہار و بیان کی ضرورت ہی نہیں۔

(۲) وہ معارف جن کا تعلق خداوند عالم کے افعال سے ہے جیسے خلق ،امر، ارادہ، مشیّت ،ہدایت ، اضلال و گمراہی کی تاریکی میں ڈالنا، قضا وقدر ، جبر وتفویض، رضا وغضب وغیرہ۔

(۳) وہ معارف جن کا تعلق ان وسائط سے ہے جو خدا اور انسان کے درمیان واقع ہیں جیسے حجابات' لوح وقلم' عرش وکرسی' بیت المعمور' آسمان وزمین' فرشتے' شیاطین' جن وغیرہ۔

(۴) وہ معارف جن کا تعلق انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے سے ہے۔

(۵) وہ معارف جن کا تعلق انسان کے ساتھ اسی دنیا میں ہے جیسے نوع انسانی کی تخلیق کے حالات وادوار سے آگاہی، اس کی اپنے بارے میں آگاہی اور اپنے معاشرتی اصولوں سے آگاہی، نبوت ورسالت، وحی والہام، کتاب الٰہی اور دین وشریعت وغیرہ سے آگاہی، اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کے مقام ومرتبہ کہ جوان سے مربوط واقعات کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے اس سے آگاہی کے امور۔

(۶) وہ معارف جن کا تعلق انسان کے ساتھ اس دنیا سے جانے کے بعد سے ہے یعنی برزخ اور معاد وغیرہ۔

(۷) وہ معارف جن کا تعلق انسان کے اخلاقیات سے ہے، اس ضمن میں اولیائے الٰہی کے وہ بلند مقامات و مراتب بھی ہیں جن سے ان کے مقام بندگی کا ثبوت ملتا ہے یعنی اسلام، ایمان، احسان ونیکی، اخبات واخلاص وغیرہ۔

اور جہاں تک احکام سے مربوط آیات کا تعلق ہے تو ہم نے ان کی بابت تفصیلی بیان سے اجتناب کیا ہے کیونکہ اس موضوع کا تعلق فقہ سے ہے تفسیر سے نہیں۔

اس کتاب میں اختیار کی گئی روش وطریقہء تفسیر سے جو اہم نتیجہ حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں اس کے ظاہری معنے کے برعکس کوئی معنی ذکر نہیں کیا گیا یعنی آیت کی تفسیر میں اس کی ایسی تاویل نہیں کی گئی جس سے اس کا ظاہری معنی ہی بدل جائے بلکہ اسی معیار پر تاویل کی گئی جسے قرآن مجید نے خود متعدد آیات میں درست قرار دیا ہے اور آپ خود اس امر سے آگاہ ہو جائیں گے کہ وہ تاویل معنے کے باب سے نہیں۔

پھر ہم نے آیات کی تفسیر اور ان کے مربوطہ مطالب کے بیان کے بعد روایات کی متفرقہ بحثیں بھی شامل کر دی ہیں جنہیں ''روایات پر ایک نظر'' کے عنوان پر ذکر کیا گیا ہے اس میں ہم نے مقدور بھر وہی روایات ذکر کی ہیں جو فریقین۔ عامہ وخاصہ۔ یعنی شیعہ وسنی محدثین ومحققین نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے حوالوں سے بیان کی ہیں لیکن وہ روایات جو صحابہ وتابعین میں سے مفسرین نے بیان کی ہیں تو چونکہ وہ صحیح وغلط کے مخلوط ہو جانے اور مطالب میں تناقض کی وجہ سے کسی مسلمان کی نظر میں قابل قبول نہیں سمجھی جاتیں اس لیے ہم نے انہیں ذکر نہیں کیا۔

ہمیں امید ہے کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے حوالوں سے بیان کی گئی روایات میں غور وفکر کر کے ارباب تحقیق اس امر سے آگاہ ہو جائیں گے کہ ہم نے اپنی اس کتاب میں جس نئے طریقہء تفسیر اور اسلوب بحث کو اپنایا ہے وہ درحقیقت تفسیر قرآن کے باب میں تمام طریقوں سے پہلے اور سب سے مقدم روش ہے کیونکہ یہ وہ طریقہ ہے جسے قرآنی حقائق کے معلّم آئمہ اہل بیتؑ نے اختیار فرمایا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ہم نے اس کتاب میں مختلف مقامات میں گوناگوں بحثیں شامل کی ہیں مثلاً فلسفیانہ، علمی، تاریخی، اجتماعی ومعاشرتی اور اخلاقی وغیرہ، اور ان تمام بحثوں میں جو اہم ترین مطالب بیان کئے گئے ہیں وہ

ہماری بھرپور کاوش کا نتیجہ ہے اور ہم نے ہر بحث میں کوشش کی ہے کہ اس موضوع سے متعلق و مربوط بنیادی امور ہی ذکر کیے جائیں اور جن امور کا اس بحث کی اصل و اساس سے بنیادی تعلق نہیں انہیں ذکر نہ کیا جائے۔

ہم اپنی کوشش اور علمی کاوش کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے بارگاہ الٰہی میں دست بہ دعا ہیں کہ وہ ہمیں ہر مرحلہ میں اپنی عنایات خاصہ سے بہرہ ور ہونے اور قرآنی حقائق سے ہدایت کی روشنی پانے کی توفیق عطا فرمائے کہ وہی سب سے بہتر مدد کرنے والا اور ہدایت کرنے والا ہے۔

ہر حال میں خدا کی عنایت کا محتاج و طلب گار

(محمد حسین طباطبائی)

حرفِ اوّل

مقدمہء مترجم
(طبع اول)

بسم اللہ الرحمن الرحیم. الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سیدنا و نبینا محمد و آلہ الطاہرین.

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر اور اس کی مقدس آیات کے معانی کی وضاحت وتشریح غیر معمولی اہمیت کا حامل امر ہے اور صحیح معنے میں یہ کام انہی ہستیوں کو زیبا ہے جو اس عظیم کتاب ہدایت کے اسرار ورموز سے آشنا ہیں ورنہ ان کے علاوہ جو شخص خواہ وہ علم ودانش کے بلند ترین مقام پر فائز کیوں نہ ہو اس کی کاوشیں قرآن مجید کی بلند پایہ حقیقتوں کے مکمل ادراک میں نتیجہ بخش ثابت نہیں ہوسکتیں تاہم علوم الٰہیہ کے مخازن سے کسب فیض کرنے والے اہل علم وارباب بصیرت نے اس مقدس کلام الٰہی کی لفظی توضیح اور معنوی تشریح کے سلسلے میں اپنی علمی وفکری توانائیاں بروئے کار لاکر جن جواہر پاروں سے عاشقان قرآن کے دامنِ معرفت کو بھر دیا ہے وہ کسی نہ کسی پہلو سے خالقِ کلام کے عظیم کلام کے حقائق سے آگاہی دلانے میں ضرور مدد دیتے ہیں۔

قرآن مجید آئینِ زندگی اور سرچشمۂ سعادت ہے۔ اس کی پاکیزہ تعلیمات بنی نوع آدم کو فطرت کے صراط مستقیم پر لاکھڑا کرنے کی ضمانت دیتی ہیں اور عظیم آئین الٰہی کی عظمت وحقانیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کی سورتوں کی حقیقی اور ظاہری و باطنی صورتوں کو واضح طور پر دیکھا جائے اور اس کی آیتوں کو ہدایت کی نشانیاں قرار دے کر ان سے زندگی کے ''سیدھے راستہ'' کی رہنمائی حاصل کی جائے۔

قرآن مجید کے عظیم معانی کو الفاظ کے پردوں سے نکال کر لوح فکر پر ثبت کرنے کا دوسرا نام ''تفسیر'' ہے بلکہ اس

سے واضح لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آیات کے الفاظ کو معانی کی دلیلیں قرار دے کر ان کے جملہ پہلوؤں کی بابت فکری توانائیاں صرف کرتے ہوئے قرآنی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کا نام "تفسیر" ہے۔

تفسیر قرآن کے سلسلہ میں اب تک جو صورت حال دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ کہ ہر مکتبِ فکر اور طبقۂ خیال کے افراد نے اس میں اپنی کاوشیں بروئے کار لائی ہیں مثلاً علم کلام کے ماہرین نے عقائد و نظریات کے حوالہ سے آیات کو زیر بحث قرار دیا ہے علم تاریخ میں مہارت رکھنے والوں نے واقعات و سوانح کے پس منظر و پیش منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی آیات کی بابت بحث و تحقیق کی علم فقہ کے ماہرین نے احکام کے استنباط و اجتہاد کے لیے آیتوں کے سمندر میں غوطہ زنی کی فلاسفہ نے اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں اور فکری معیاروں کی روشنی میں آیات کے معانی کے تعین کی کوشش کی اہل عرفان نے اپنے مخصوص افکار کو بنیاد قرار دے کر قرآنی آیات کی بابت اظہار خیال کیا علم حدیث کے ماہرین نے اپنے زاویۂ نگاہ سے آیات کو دیکھا ان کے علاوہ مستشرقین اور غیر مسلم دانشوروں و مفکرین و محققین نے قرآنی موضوعات کو اپنے اپنے نقطۂ نظر اور مسلک و موقف کے حوالہ سے زیر بحث قرار دیا اور ان تمام علماء و مفکرین نے اس سلسلہ میں مستقل کتابیں تالیف کیں یا پھر اپنی علمی تحقیقات کے ضمن میں قرآنی آیات کو مورد بحث قرار دے کر ان کی بابت اظہار خیال کیا لیکن ان تمام کتبِ تفسیر کے بارے میں تفصیلی بحث اور ان کے مندرجات کی صحت و سقم کی بابت اظہار خیال کرنا ہمارے اس تمہیدی بیان کی حدود سے باہر ہے لہٰذا صرف کتاب "المیزان فی تفسیر القرآن" کے بارے میں چند امور کے تذکرہ پر اکتفاء کی جاتی ہے کہ جس کے اردو ترجمہ کا شرف ہمیں حاصل ہوا ہے۔

تفسیر "المیزان" جن علمی امتیازات کی حامل ہے وہ کسی اہل علم و دانش سے پوشیدہ نہیں اور مؤلف کی شخصیت اور علمی مقام و منزلت بھی ارباب معرفت سے مخفی نہیں لہٰذا ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان دونوں پہلوؤں کے حوالہ سے کچھ مطالب عام قارئین کے لیے پیش کرتے ہیں!

سب سے پہلے کتاب کی اہم خصوصیات کا تذکرہ

"المیزان" میں تفسیر قرآن کا جو اسلوب اور طریقۂ بحث اختیار کیا گیا ہے وہ "قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے" کی بنیاد پر استوار ہے یعنی "تفسیر القرآن بالقرآن" کی روش کو اپناتے ہوئے آیات کی تفسیر آیات ہی کے ذریعے کی گئی ہے تاکہ الفاظ کے معانی میں اپنی آراء و نظریات کے دخل سے محفوظ رہا جا سکے اور حضرت پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے طریقۂ تفسیر کی پیروی بھی ہو اور "یفسّر القرآن بعضہ بعضا" (قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض کی

تفسیر کرتا ہے) کے اصول کی عملی صورت سامنے آ سکے' ظاہر ہے کہ اس طریقہءتفسیر کے نتیجہ میں تفسیر بالرائے کے مذموم عمل کا ارتکاب بھی نہیں ہوتا اور قرآن فہمی کی بابت حقائق کے ادراک میں فکری تشویش بھی لاحق نہیں ہوتی' اور یہ طریقہءتفسیر قدیم زمانہ سے تفسیر قرآن کے باب میں رائج ہے بلکہ اگر تحقیقی نظر سے دیکھا جائے تو یہ طریقہ سب سے پہلے معلم قرآن حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنایا اور اس طرح آنحضرتؐ کے بعد آئمہ اطہار علیہم السلام اور صحابہ کرام میں سے مفسرین نے بھی اسی طریقہءتفسیر کو اختیار کیا جیسا کہ ذہبی، زمخشری، طبری، ابن کثیر' سیوطی اور دیگر محدثین ومفسرین نے اس کی بابت واضح الفاظ میں شواہد اور مثالیں ذکر کر کے بیان کیا ہے کہ یہی اصل میں تفسیر قرآن کا صحیح طریقہ وروش ہے جسے حضرت پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے بعد آئمہ اطہارؑ اور دیگر مفسرین نے اختیار کیا' اگر غور کیا جائے تو اس طریقۂ تفسیر کی اصل بنیاد کا تذکرہ خود قرآن مجید میں موجود ہے اور قرآن ہی نے اسے آیات کے معانی کو سمجھنے کی اساس قرار دیا ہے لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ المیزان میں تفسیر کا قرآنی طریقہ اپنایا گیا ہے اور اسے ہی آیات کے معانی کو سمجھنے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے چنانچہ آیات قرآنیہ میں تدبر کے حکم کو مولفؒ نے قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے کرنے کے معنے میں لیا ہے اور آیت مبارکہ " اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا " (یہ لوگ قرآن میں تدبر وغور وفکر کیوں نہیں کرتے کہ (اگر وہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو یہ لوگ ضرور اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے) میں تدبر سے مراد یہ لیا ہے کہ بعض آیات کے معانی کو سمجھنے کے لیے دوسری آیات سے استفادہ کرنا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس مقدس کلام الٰہی میں کسی پہلو سے کوئی اختلاف ودورنگی نہیں پائی جاتی بلکہ تمام آیات ایک دوسرے کی تصدیق وتائید کرتی ہیں' اسی طرح آیات کی تفسیر میں جو روایات واحادیث وارد ہوئی ہیں انہیں بھی آیات ہی سے حاصل شدہ معانی کی تائید وتصدیق کے حوالہ سے دیکھا گیا ہے تاکہ "قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے" کی روش وطریقہءتفسیر میں کسی دوسری چیز کو شامل نہ کیا جا سکے۔

المیزان میں قرآنی طریقہءتفسیر کو اس حد تک اپنایا گیا ہے کہ کسی آیت میں اس کے متعلقہ پہلوؤں کی بابت بحث کرتے ہوئے موضوع سے مناسبت کی حامل آیات کو موزوں انداز میں ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ آیات کے موضوع اور اس سے مربوطہ مطالب سے آگاہی حاصل کرنا آسان ہو اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات کا تذکرہ اس انداز میں کیا گیا ہے جس سے آیات کے معانی کو سمجھنے کے لیے آیات ہی کی طرف رجوع کرنے کی رہنمائی ہوتی ہے گویا روایات کی صحت وسقم کو پرکھنے کا معیار بھی آیات ہی کو قرار دیا گیا ہے۔

" المیزان "میں ہر موضوع کی بابت اس کے متعلقہ ومربوط پہلوؤں کو واضح کرنے والی آیات کا انتخاب نہایت

خوبصورت علمی انداز میں کیا گیا ہے تا کہ کسی ایک موضوع کے ذکر سے متعدد موضوعات میں بکھری ہوئی آیتوں کے باہمی تعلق وربط سے آگاہی حاصل ہو سکے۔

" المیزان "میں ہر سورہ کے آغاز میں اس سورہ میں مذکور موضوعات کے تذکرہ کی حامل واضح ترین آیات مختصر تشریح کے ساتھ ذکر کر دی گئی ہیں تا کہ مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں سورت کے تمام مضامین کی فہرست آ جائے اور وہ اپنی ذہنی وفکری آمادگی کے ساتھ تمام آیات کی بابت تفسیر کے موارد میں مطلوبہ استفادہ کر سکے۔

" المیزان "میں سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کے عمومی تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان کے انتساب کی صحت وسقم پر بھی اظہارِ رائے کی ضرورت محسوس ہونے کی صورت میں اس سے اجتناب نہیں کیا گیا تا کہ آیات کے سیاق و سباق اور موضوعات کے باہمی ارتباط کی موزونیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

" المیزان "میں آیات کے الفاظ کی تشریح کی بابت لغت کے حوالہ سے ضروری حد تک بحث کی گئی ہے تاہم اہل لغت کے اقوال ذکر کر دینے پر اکتفاء کرنے کی بجائے کتب تفسیر سے بھی استناد پیش کیا گیا ہے تا کہ اہل لغت کے نزدیک مسلمہ معانی کی تصدیق کے ساتھ ساتھ ان کے مناسب وموزوں موارد سے آگاہی حاصل ہو سکے اور آیت کے مطلوبہ معنی و مقصود کی وضاحت ہو سکے البتہ یہ امر ملحوظ رہے کہ آیت کے لغوی معنی کی تصدیق کے طور پر اگر کسی مقام پر عربی اشعار سے استناد کیا گیا ہے تو اس سے ہرگز یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ مؤلف نے اشعار کو دینی حقائق کے اثبات کے لیے بطور دلیل ذکر کیا ہے بلکہ ان کا ذکر صرف ادبی پہلو کو واضح کرنے کی غرض سے ہوا۔

" المیزان "میں اگر کسی مقام پر آیت کے اعراب میں تبدیلی سے مطلوبہ معنی میں یکسر تبدیلی لازم آتی ہو تو اس کی ضروری وضاحت دوسری آیت کے حوالہ سے کر دی گئی ہے تا کہ قرائت میں صحت کے ساتھ ساتھ معنی میں صحت بھی ملحوظ رہے۔

" المیزان " میں آیات کے معنی کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے علم بیان اور فصاحت و بلاغت کے اصولوں کا ضروری حد تک تذکرہ کیا گیا ہے تا کہ مطلوبہ معانی کے ادبی وعلمی پہلوؤں کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

" المیزان " میں موضوعات کے سیاق وسباق کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے اور آیات میں بکھرے ہوئے موضوعات کی تصدیق کے لیے آیات ہی کے ذریعہ ان کے موزوں مقام پر ذکر کرنے کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

" المیزان " میں علمی اندازِ تحقیق اختیار کرتے ہوئے مفسرین کے اقوال وآراء اور نظریات کی تصدیق یا تردید میں کسی مخصوص عقیدہ اور نظریہ پر انحصار کرنے کی بجائے نہایت وسعت نظری کا ثبوت دیا گیا ہے تا کہ ہر مکتب فکر کے پیروکار

مطالعہ کرتے وقت تقلیدی زنجیروں میں جکڑے ہوئے افکار کی بجائے تحقیقی زاویہ ہائے نگاہ سے آگاہ ہو سکیں۔

"المیزان" میں الفاظ کے مخصوص زاویوں ہی کو موردِ بحث قرار دینے پر اکتفاء کرنے کی بجائے آیات کے حوالہ جات سے ہر ممکن پہلو پر اختصار کے ساتھ علمی اشارے کئے گئے ہیں مثلاً عقلی، علمی، فلسفی، اخلاقی، تاریخی اور اجتماعی و معاشرتی بحثوں کے ضمن میں آیات سے مربوط معانی کی روشنی میں دوسرے علوم کو قرآن فہمی کی بابت موردِ بحث قرار دیا گیا ہے تاکہ اربابِ ذوق اس گلدستۂ معارف سے حسبِ منشا گل چینی کر کے لطف اندوز ہو سکیں۔

"المیزان" میں آیات کی طبقہ بندی کے عمل میں نہایت منفرد انداز اختیار کیا گیا ہے اور آیات محکمات و متشابہات اور تفسیر و تأویل کے معانی کی وضاحت میں علمی نکات ذکر کئے گئے ہیں جن سے کتاب کی ٹھوس علمی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔

"المیزان" میں ان تمام موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو عصرِ حاضر کے دانشوروں اور اربابِ تحقیق کے درمیان رائج ہیں، ان موضوعات کی بابت تمام پہلوؤں کو تفصیلی طور پر ذکر کیا گیا ہے تاکہ جدید ترقی یافتہ دور میں موردِ توجہ قرار پانے والے موضوعات قرآنی حوالہ سے تشنۂ بحث نہ رہ جائیں مثلاً آزادی، معاشرتی روابط، عورت کی معاشرتی ذمہ داریاں اور حقوق، انسانی معاشرہ میں حکمرانی سے متعلق امور، بشری تخلیق کی بابت فلسفیانہ نظریات، اشتراکی نظامِ حکومت، اسلامی نظامِ حاکمیت اور معاشرتی رسم و رواج کی تقلیدی جہتوں وغیرہ کو نہایت علمی انداز میں زیرِ بحث لایا گیا ہے تاکہ ان کی بابت قرآنی مؤقف کے بارے میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

"المیزان" میں اس امر کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ کسی موضوع کی بابت بحث کرتے ہوئے بیجا طوالت و نامربوط امور کے تذکرہ سے اجتناب کیا جائے اور اسی حد تک مطالب کے بیان میں کفایت کی جائے جس سے آیات کے معانی کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

"المیزان" میں قرآنی طریقۂ تفسیر کی روشنی میں "روایات پر ایک نظر" کے عنوان سے اعتقادی پہلوؤں پر مشتمل احادیث و روایات باتبصرہ و بلاتبصرہ دونوں صورتوں میں ذکر کی گئی ہیں تاکہ کسی بھی نظریہ پر اعتقاد رکھنے والوں اور اس کا انکار کرنے والوں کو قرآنی معانی و مفاہیم سے بھرپور آزادیٔ فکر کے سایہ میں اعتقادی اصولوں کے تعین میں مدد مل سکے۔

"المیزان" میں نظریاتی تعصبات کی زنجیروں کو جس ٹھوس علمی انداز میں توڑا گیا ہے اس سے بحث و تحقیق اور قرآنی معارف سے آگاہی حاصل کرنے میں بہت مدد ملتی ہے اور ہر انصاف پسند محقق و دانشور اس عظیم مجموعۂ ہدایت سے

استفادہ کر سکتا ہے۔

"المیزان" میں علوم قرآن کی بابت تحقیقی زاویہء نگاہ سے بحث کی گئی ہے اور آیات کے حوالوں سے قرآنی علوم کے متعلق آراء قائم کی گئی ہیں مثلاً مسئلہ تاویل، اسباب نزول، مسئلہء نسخ، قرائتوں کا اختلاف، آیاتِ احکام وغیرہ۔

بہر حال اگرچہ المیزان کو قرآن مجید کی جامع ترین تفسیر تو نہیں کہا جا سکتا لیکن قرآنی معارف و حقائق کو سمجھنے کے لیے مشعل راہ کہلانے میں اس کے علمی موضوعات اور طریقہء بحث کو دلیل ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ المیزان انہی حضرات کے استفادہ کے لیے ہے جو علم و دانش کے ابتدائی مراحل طے کر چکے ہوں اور قرآن فہمی کے علمی ذوق کے حامل ہوں؛ تاہم عوام الناس اور متوسط علمی طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کے استفادہ کے لیے ہم نے آسان سے آسان اردو جملے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض علمی اصطلاحات میں ہم نے عام فہم ترجمہ کرنے کو کسی غلط فہمی کا پیش خیمہ سمجھتے ہوئے ترک کیا ہے اور چونکہ المیزان کی ترجمہ نگاری کا کام ایک نذر شرعی کی ادائیگی سے مربوط ہوا ہے اس لیے اداء واجب کے طور پر قربتاً الی اللہ اسے انجام دیا گیا ہے لہٰذا ارباب دانش سے توقع ہے کہ ہمارے اس کام کو علمی عبادت قرار دیتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں اس کے شرف قبولیت پانے کی دعا کریں گے اور اس کی بخیر و خوبی و بطور احسن تکمیل کی توفیق کے لیے کی گئی دعاؤں کی استجابت کے لیے شریک عبادت ہوں گے۔

مؤلف: ایک عظیم شخصیت

"المیزان" کی کتابی خصوصیات کے تذکرہ کے ضمن میں اس عظیم علمی کاوش اور قرآن مجید کے معانی و مطالب کی تفسیر و تفہیم کے باب میں صرف کی گئی توانائیوں کے اجمالی ذکر کے ساتھ ساتھ اس کے عظیم و بلند مرتبت مؤلف کی پاکیزہ علمی شخصیت کے بارے میں چند باتیں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں؛ مجھے ان سے علمی استفادہ کرنے اور ان کے حضور شرف تلمذ پانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے ان کی عبقری شخصیت کا تذکرہ تمام علمی پہلوؤں سے تو نہیں ہو سکتا تاہم ان کے متعلق اہم ترین بنیادی امور کے تذکرہ پر اکتفاء کی جاتی ہے۔

عالم جلیل القدر حضرت آیت اللہ علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ کا شمار دنیائے اسلام کے ان بلند پایہ مفکرین و محققین میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے علمی مقام و مرتبہ کا اظہار گوناگوں علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد منفرد انداز میں

کیا۔ علامہ طباطبائی ۲ ذی الحجۃ ۱۳۲۱ھ کو تبریز (ایران) میں پیدا ہوئے، آپ کا خاندان علمی حوالہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور آپ اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کے علماء و دانشور اپنی علمی رفعتوں کے ساتھ پہچانے جاتے ہیں، آپ کے خاندان میں چودہ پشتوں سے جید علماء و مفکرین کا موجود ہونا علمی تاریخ کا درخشندہ باب سمجھا جاتا ہے۔ علامہ طباطبائیؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر تبریز میں حاصل کی اور ۲۳ سال کی عمر میں نجف اشرف روانہ ہو گئے، دس سال تک وہاں علم و معرفت کی تحصیل میں مصروف رہے، حوزہ علمیہ نجف اشرف سے علمی مراحل کی تکمیل کے بعد واپس تبریز تشریف لے آئے اور گیارہ برس تک تبریز میں علوم دینیہ کی تدریس اور لوگوں کو قرآنی حقائق کی تعلیم دینے میں مصروف رہے، پھر ایران کے مذہبی شہر قم المقدس میں تشریف لے گئے اور وہاں ہزاروں تشنگان علومِ الٰہیہ کو سیراب کرتے رہے۔ علامہ طباطبائیؒ نے دیگر علوم کی تدریس کے ساتھ ساتھ علمِ فلسفہ کو غیر معمولی اہمیت دی اور اس کی تدریس کے لیے وسیع لائحہ عمل مرتب کیا۔ علامہ طباطبائیؒ نے اپنے خودنوشت حیات نامہ میں اپنے جن اساتذہ کرام اور بزرگان کا تذکرہ کیا ہے ان میں سرفہرست یہ حضرات ہیں: حضرت آیت اللہ العظمیٰ مرزا محمد حسن نائینیؒ، آیت اللہ العظمیٰ محمد حسین کمپانیؒ، حضرت علامہ سید حسین بادکوبیؒ اور علامہ سید ابوالقاسم خوانساریؒ۔ علامہ طباطبائیؒ سے کسب فیض کرنے والے ہزاروں خوش نصیب افراد میں سرفہرست علامہ مرتضیٰ مطہریؒ ہیں جن کا علم و دانش اور فلسفی مقام و مرتبہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مترجم کو ان دونوں شخصیتوں سے علمی استفادہ کا موقع ملا ہے۔ علامہ طباطبائیؒ اپنے دور کے عظیم فلسفی، مفسر اور مجتہد تھے، ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تالیفات یہ ہیں: اصولِ فلسفہ و روش ریالسم (فارسی) علمِ فلسفہ کی درسی نصابی کتاب۔ پانچ جلدیں، اس کا عربی ترجمہ علامہ جعفر سبحانی نے کیا ہے۔ الاعداد الاولیہ، علم ریاضی میں عظیم تالیف ۳۔ بدایۃ الحکمۃ (عربی) علم فلسفہ کی نصابی کتاب (۴)۔ تعلیقات علی الاسفار (فارسی) ۶ جلدیں (۵)۔ تعلیقات علیٰ اصول الکافی (۶)۔ تعلیقات علیٰ بحار الانوار (۷)۔ تعلیقات علیٰ کفایۃ الاصول (۸)۔ الاسماء والصفات (عربی) (۹)۔ الاعتبارات (عربی) (۱۰)۔ اعجاز (فارسی) (۱۱)۔ الافعال (عربی) (۱۲)۔ الانسان بعد الدنیا (عربی) (۱۳)۔ الانسان فی الدنیا (عربی) (۱۴)۔ الانسان قبل الدنیا (عربی) (۱۵)۔ البرہان (عربی) (۱۶)۔ التحلیل (عربی) (۱۷)۔ الترکیب (عربی) (۱۸)۔ الذات (عربی) (۱۹)۔ علمِ امام (فارسی) (۲۰)۔ القوۃ والفعل (عربی) (۲۱)۔ المشتقات (عربی) (۲۲)۔ المغالطہ (عربی) (۲۳)۔ النبوات و المنامات (عربی) (۲۴)۔ حکومتِ اسلامی (فارسی) (۲۵)۔ وحی (فارسی) (۲۶)۔ الوسائط (عربی) (۲۷)۔ الولایۃ (عربی) (۲۸)۔ الشیعہ فی الاسلام (عربی) (۲۹)۔ علی والفلسفۃ الالٰہیہ (عربی) (۳۰)۔ قرآن در

اسلام (فارسی) (۳۱)۔شیعہ ۲ جلدیں (فارسی) (۳۲)۔زن در اسلام (فارسی) (۳۳)۔معنویت تشیع (فارسی) (۳۴)۔درسیائے از اسلام (فارسی) (۳۵)۔رہنمائے قرآن (فارسی) (۳۶)۔ ویز گیہاے اسلام(فارسی) (۳۷)۔قواعد خط فارسی(منظوم) (۳۸)۔نہایۃ الحکمۃ(عربی)علم فلسفہ کی نصابی کتاب (۳۹)۔المیزان فی تفسیر القرآن(عربی)۲۰ جلدیں

علامہ طباطبائیؒ نے کتاب'' المیزان فی تفسیر القرآن '' کی ۲۰ جلدیں تقریباً سترہ برس کے طویل عرصہ میں تالیف کیں، سب سے پہلی جلد ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی یعنی ۱۳۷۵ھ میں،اور آخری جلد کی تالیف کا کام ۱۳۹۲ھ(۱۹۷۳ء) میں اتمام کو پہنچا۔علامہ طباطبائیؒ اپنی ان عظیم علمی کاوشوں کے حوالہ سے ہمیشہ یادرہیں گے۔

'' المیزان '' کے اردو ترجمہ کی بابت یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہم نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ زبان کی تبدیلی کی وجہ سے عربی متن کی علمی لطافت سے محروم نہ ہوجائیں تاہم عوام الناس وخواص کے استفادہ کے لیے جملوں میں سلاست کو ملحوظ رکھا گیا ہے یہاں تک کہ کئی بار جملے تبدیل کر کے آسان سے آسان عبارتیں لانے کی کوشش کی ہے،ہم اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو اہلِ علم قارئین ہی کریں گے،ہم تمام قارئین کرام سے دعاؤں کی استدعا کرتے ہیں کہ خداوند عالم بحق محمد وآل محمد علیہم السلام ہمیں قرآنی حقائق کے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور قرآنی تعلیمات کو عملی زندگی میں اپنانے کی سعادت نصیب کرے، میری طرف سے ادارہ مصباح القرآن ٹرسٹ کے جملہ اراکین وکارکنان بالخصوص جناب ڈاکٹر نور محمد صاحب اور برادر عزیز شیخ محمد امین سیٹھ صاحب لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے قرآنی معارف کی ترویج و اشاعت میں اپنی تمام تر توانائیاں وقف کر رکھی ہیں، خدا ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے (آمین)

العبد حسن رضا غدیری عفی عنہ

حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر مانچسٹر (انگلینڈ)

مقدمہ طبع سوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا ونبینا محمد وآلہ الطاہرین

تفسیر المیزان اپنی علمی ومعلوماتی خصوصیت کے ساتھ عوام وخواص میں مقبول ہے اس کی افادیت کے پیش نظر قلیل مدت میں تیسری اشاعت آپ کے سامنے ہے، اس کے مطالب اور مخصوص طرز تفسیر یعنی تفسیر القرآن بالقرآن ہی کی بنیادی وجہ ہے کہ اسے علمی حلقوں اور ارباب ذوق حضرات نہایت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ تفسیر قرآن کے حوالہ سے بالعموم یہ امر ملحوظ ہوتا ہے کہ اس مقدس کلام کی مبارک آیات سے استفادہ کرنے میں علوم ومعارف اور حقائق سے بہرہ مندی ہو اور کلام الٰہی کے اسرار ورموز سے آشنائی حاصل ہو جائے۔ کون نہیں جانتا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وہ کتاب ہدایت ہے جس میں افراد بشر کے لئے سعادت مند زندگی کے زریں اصول اور ابدی حیات کے ضامن تابندہ دستورات موجود ہیں اس کی پاکیزہ تعلیمات انسان سازی کا سرچشمہ اور اس کے حقائق حکمتوں کے خزانے ہیں، قرآن مجید کی ہر آیت اپنے دامن میں ھدایت کی نورانی دولت سمیٹے ہوئے ہے۔ اس عظیم دریائے نور میں غوطہ زنی کرنے والے خوش نصیبوں کو جس قدر گوہر ہائے گراں بہا مل جائیں اس پر انہیں بارگاہ رب العزت میں ادائے شکر کرتے ہوئے اس خدائی عطیہ سے استفادہ کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ قرآن اپنی آفاقی حیثیت کے حوالہ سے ہر دور کے افراد بشر کی ہدایت کا ضامن ہے اور اس میں علوم ومعارف الٰہیہ سے فیض یاب ہونے کے تمام اسباب سے آگاہی پانے کی راہیں بتائی اور دکھائی گئی ہیں لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مقدس کتاب ایک جامع دستور زندگی کی صورت میں انسان کی تمام بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے آسان راستے دکھاتی ہے اور انفرادی واجتماعی امور میں یکساں طور پر ہدایت ورہنمائی کرتی ہے ان امور میں اعتقادات، اخلاقیات، معاشیات واقتصادیات، سیاسیات، معاملات اور دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل شامل

ہیں بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ دنیاوی زندگی کے ساتھ ساتھ اخروی حیات کی سعادت مندی کو یقینی بنانے کے پختہ اصول مذکور ہیں کہ جن سے آگاہی کا حصول ان پر عمل کر کے ان سے فیض پانے کے مرحلے کی کامیابی کا پہلا زینہ ہے، اسی لیے آیات مبارکہ کی تفسیر ایک ناگزیر امر ہے۔ اس سلسلے میں ارباب دانش کی کاوشیں ہر حوالہ سے قابل قدر ہیں خواہ ان کا دائرہ لغت و ادب تک محدود ہو یا حدیث وروایات تک وسیع ہو، ترتیبی صورت میں ہو یا موضوعی شکل میں ہو، انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی کاوش میں، لفظی تشریحات سے مخصوص ہو یا معنوی و مفہومی تفہیمات و تفہمات کی مساعی کا امین ہو ہر لحاظ سے ہر کوشش اپنے مقام پر اور اپنی حیثیت میں لائق ستائش ہے، انہی عظیم کاوشوں میں ایک نام المیزان فی تفسیر القرآن کا ہے کہ جس کے بارے میں ایک ہی جملہ ہی اس کی مکمل پہچان کروا سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہ کتاب تفسیر القرآن بالقرآن کا بے مثال مرقع ہے کہ جس کے ہر صفحہ پر آیات اس طرح اپنی نورانی عظمتیں بکھیر رہی ہیں جس طرح فضائے فلک پر ستارے و سیارے اندھیری رات میں روشنی کی بستی آباد کر کے دیکھنے والی ہر آنکھ کو نور اور دھڑکنے والے ہر دل کو سرور عطا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات ہمارے لیے باعث عزت وافتخار ہے کہ ہمیں روشنی کے میناروں حضرات محمد و آل محمد علیہم السلام کے ارشادات وفرامین کہ جو قرآن کی تفسیر میں وارد ہوئے ہیں ان سے استفادہ کر کے کلام الٰہی سے کسب معارف کی توفیق حاصل ہے کیونکہ وہی ہستیاں ہیں کہ جو اسرار و رموز قرآنی سے کامل آگاہی رکھتی ہیں اور ہر آیت کی اصل حقیقت بتا سکتی ہیں جیسا کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے قرآن کی آیت کے بارے میں پوچھنا چاہو پوچھو میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ کون سی آیت کب، کہاں، اور کس کی شان میں اتری، رات میں اتری یا دن میں اتری، دریا میں اتری یا صحراء میں اتری، جنگل میں اتری یا پہاڑ پر اتری، اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ ان میں سے ناسخ کون سی ہے اور منسوخ کون سی ہے، محکم کون سی ہے اور متشابہ کون سی ہے مکی کون سی ہے اور مدنی کون سی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے علم کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے اس طرح حضرت پیغمبر اسلامؐ سے علم حاصل کیا ہے جس طرح پرندہ اپنی چونچ سے غذا حاصل کرتا ہے اور جس طرح شیر خوار بچہ اپنی ماں سے دودھ پیتا ہے لہذا جب تک میں تم موجود ہوں جو چاہو مجھ سے پوچھ لو کہ میں آسمانوں کے راستوں کو زمین کے راستوں سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔ تو ایسی عظیم ہستیوں سے وابستگی کی نعمت سے بہرہ مندی کے بعد ہمیں کلام خدا سے ہدایت کے حصول میں ہرگز دشواری لاحق نہیں ہو سکتی۔ یہ کتاب انہی معصوم ہستیوں کے پاکیزہ مکتب سے کسب فیض کا نتیجہ ہے۔ اس کی عبارتوں کو اردو میں ڈھالنے کی سعادت کے حصول پر بارگاہ خداوندی میں ادائے شکر کے ساتھ ساتھ یہ اظہار ضروری ہے کہ اس سلسلے میں وہ تمام احباب لائق تشکر ہیں جنہوں نے ترجمہ کی بابت تشویقی کلمات سے نوازا اور اس کی تکمیل کے بھرپور اصرار کی صورت میں شریک عبادت ہوئے۔ اس مقام پر اگر ڈاکٹر سید نسیم الحسن صاحب (مانچسٹر) کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو حق تلفی ہو کہ جن کی فکری ترغیبات اس جلد کی ادبی صورتگری میں شامل رہیں۔ اور اب اس کی تجدید طبع میں نہایت مخلص مومن اہل

بیتؑ جناب سید دولت علی زیدی حفظہ اللہ تعالیٰ کی کاوشیں قابل قدر ہیں کی جنہوں نے ہمیشہ کی طرح اس سلسلہ میں وسیع خدمات پیش کیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن فہمی اور اس کی اعلیٰ وارفع تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ترجمہ کی بابت چند امور کا تذکرہ ضروری ہے: اس جلد کی سابقہ اشاعتوں میں پروف ریڈنگ کی بابت ناشر کی طرف سے عجلت وعدم توجہی کے نتیجہ میں املائی اغلاط اور صفحہ بندی میں ترتیبی خامی، آیات وروایات کی ترکیب وترتیب میں عدم تنظیم اور عناوین وعبارات کی تدوین میں عدم تناسب وغیرہ کے باعث کتاب کی طباعتی حیثیت مطلوبہ حسن کی حامل نہ رہی لہذا ان تمام امور میں کسی حد تک درستگی کے عمل کو یقینی بنایا گیا اور علماء کرام بالخصوص خطباء حضرات کی طرف سے فرمائش پر احدیث وروایات کی عربی عبارتیں شامل کردی گئیں لیکن یہ کام جزوی طور پر انجام ہوسکا کیونکہ وقت کی قلت کے ساتھ ساتھ کتاب کا حجم بھی ملحوظ تھا اس لیے بعض اہم مقامات کے انتخاب پر اکتفاء کرتے ہوئے اس کام کو آئندہ جلدوں پر موقوف کردیا گیا۔ البتہ احادیث وروایات کے عناوین کی از سر نو تنظیم وتعیین کے عمل سے احباب کی فرمائشوں کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ ادبی حوالہ سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ املاء وانشاء کے قدیم اصولوں کے تناظر میں جدید مروجہ محاوروں اور تحریر وتکلم کے امتزاج کے ساتھ بعض الفاظ کی جو صورت گری ہوئی اس میں قارئین کے ذوق قرائت کو ملحوظ رکھا گیا چنانچہ اس حوالہ سے یہ جزوی تبدیلی واقع ہوئی مثلاً مفرد اور جمع کے مخصوص قرائن کے علاوہ دیگر موارد میں جملہ بندی کی یہ صورت رہی: حوالہ سے حوالے، سلسلہ سے سلسلے، فقرہ سے فقرے، معنی سے معنے، مطالبہ سے مطالبے، معجزہ سے معجزے، واقعہ سے واقعے، مشاہدہ سے مشاہدے، طریقہ سے طریقے، سلیقہ سے سلیقے، قافلہ سے قافلے، نظریہ سے نظریے، جملہ سے جملے اور اس طرح کے دیگر الفاظ میں تلفظ کو ملحوظ وپیش نظر رکھا گیا تاکہ قارئین کو عمومی طور پر آسانی ہو اور قدیم طرز وروش اور اصول ادب بھی محفوظ رہیں۔ اور یہ کوشش کی گئی کہ عربی متن سے لفظی ومفہومی ترجمہ کی ملی جلی صورت پیدا ہوتا کہ تطبیق کے عمل میں دشواری نہ آنے پائے۔ آیات مبارکہ کے حوالہ جات کو نمایاں کر کے واضح جگہ دی گئی تاکہ محققین کو آیات تک رسائی میں سہولت ہو۔ اس کے علاوہ بعض موارد میں ترتیبی تبدیلی کی گئی جس سے تلاوت وقرائت میں مزید آسانی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ سے ان تمام امور اور مخلصانہ کاوشوں کی قبولیت کی دعا کرتا ہوں کہ وہی دلوں کے راز جاننے والا اور نیتوں سے آگاہ ہے۔ خدایا اپنے مقدس کلام کی بابت ہماری اس نہایت معمولی خدمت کو شرف قبولیت عطا فرما کہ تو ہی ہر عمل کو قبول کرنے والا ہے۔

العبد حسن رضا غدیری عفی عنہ

لندن

سورۂ فاتحہ

(ابتدائی سورت)

اس سورت میں سات آیات ہیں

سورۃ الفاتحۃ

○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

○ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ (۱)

○ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ (۲)

○ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ○ (۳)

○ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ○ (۴)

○ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ○ (۵)

○ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ○ (۶)

○ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ○ (۷)

ترجمہ

○ آغازِ کار اللہ کے نام سے' جو وسیع رحمت والا' نہایت مہربان ہے۔ (۱)

○ ہر حمد مخصوص ہے خدا کے لیے' جو کائنات کا پروردگار ہے۔ (۲)

○ جو وسیع رحمت والا' نہایت مہربان ہے۔ (۳)

○ جو قیامت کے دن کا حاکم ہے۔ (۴)

○ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں۔ (۵)

○ تو ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت فرما۔ (۶)

○ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے نعمتیں نازل کیں۔ (۷)

نہ کہ ان کا راستہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا۔ اور نہ ہی ان کا جو گمراہ ہیں۔

☆☆☆

پہلی پانچ آیات

۱ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
۲ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ
۳ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
۴ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ
۵ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ

ترجمہ

۱ آغاز کار اللہ کے نام سے، جو وسیع رحمت والا نہایت مہربان ہے۔
۲ ہر حمد مخصوص ہے خدا کے لیے، جو کائنات کا پروردگار ہے۔
۳ جو وسیع رحمت والا نہایت مہربان ہے۔
۴ جو قیامت کے دن کا حاکم ہے۔
۵ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں۔

☆☆☆

تفسیر و بیان

پہلی آیت:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

(آغازِ کار اللہ کے نام سے' جو وسیع رحمت والا ہے' نہایت مہربان ہے)

عام طور پر لوگ جو کام کرتے ہیں یا اسے شروع کرنا چاہتے ہیں تو اپنے کام کی ابتداء اس شخصیت کے نام سے کرتے ہیں جو انہیں دوسروں سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہو یا قدر و منزلت کے لحاظ سے ان کے نزدیک سب سے زیادہ باعظمت ہو تا کہ اس محبوب یا عظیم المرتبت ہستی کی بدولت ان کا کام بابرکت اور نتیجہ خیز ہو جائے یا کم از کم یہ کہ اس شخصیت کی یاد ہمیشہ تازہ رہے' اسی طرح کوئی نام تجویز کرتے وقت بھی یہی امر ملحوظ ہوتا ہے مثلاً نومولود بچے کا نام یا اپنے شاہکار صنعت مثلاً وہ گھر کہ جسے انہوں نے بنایا یا کسی ادارہ و مرکز کا نام کہ جسے انہوں نے قائم کیا اپنی کسی پسندیدہ یا محترم شخصیت کے نام پر تجویز کرتے ہیں تا کہ اس طرح اس محبوب یا عظیم ہستی کا نام زندہ و جاوید رہے اور اس کا جمال و کمال عالم وجود میں آنے والی نئی چیز کی بقاء سے ہمرنگ ہو سکے (جب تک وہ نام باقی ہو اس سے منسوب شخصیت کی یاد بھی باقی رہے) جس طرح کوئی باپ اپنے بیٹے کا نام اپنے والد کے نام پر رکھتا ہے تا کہ اس طرح اس بزرگ کا نام ہمیشہ باقی رہے اور اس کی یادگار کے ساتھ ساتھ اس کی محبت و عظمت کی تصویر آنکھوں کے سامنے مجسم اور اس کی یاد کا چراغ دلوں میں روشن رہے۔

یہی بات خدا کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے' خالق کائنات نے اپنے مقدس کلام کا آغاز اپنے سب سے پیارے و محبوب نام سے کیا تا کہ اس کا کلام اس کی عظمتوں کا حامل و ترجمان اور اس کی لازوال ذات ہی سے وابستہ و مربوط رہے' اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی مخلوق کو ایک پاکیزہ روش اور رفتار و گفتار کے پسندیدہ آداب سے بھی آگاہ کرے جس کو اپنا کر لوگ اپنے ہر کام کی ابتداء اس کے مقدس و بابرکت نام ہی سے کریں تا کہ اس کی برکتیں اور عنایتیں ان کے شامل حال ہوں اور اس کی ابدیت نواز صفات کی روحانیت ان کے اعمال و اقوال پر محیط ہو جائے اور ان کی ہر بات اور ہر کام کا مقصد اعلیٰ خدا کی رضا و

خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ اسی سے لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اپنے اعمال میں ہر طرح کی ناکامی و پریشانی اور شکست و تباہی سے نجات پا سکتے ہیں کیونکہ جس لازوال ہستی کے نام سے انہوں نے ابتداء کی وہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور اس کی بابت فنا و نابودی کا تصور ہی نہیں ہو سکتا' چنانچہ خداوند عالم نے اس حقیقت کا اظہار اپنے پاکیزہ کلام میں کئی مقامات پر کیا ہے کہ "جو کام اس کی رضا و خوشنودی کے لیے انجام نہ دیا جائے وہ نہ تو نتیجہ بخش ثابت ہو گا اور نہ ہی اس کے ثبات و پائیداری کی توقع کی جا سکتی ہے بلکہ وہ بے اثر و بے نتیجہ اور مٹ جانے والا ہے" اور خدا نے ارشاد فرمایا: "وہ عنقریب لوگوں کے اعمال کا جائزہ لے کر ان تمام کاموں کو جن میں اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کی کوشش شامل نہ ہو گی خاک کے اڑتے ہوئے ذروں کی مانند بنا دے گا کہ جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور ان کے ان اعمال پر پانی پھیر دے گا جو اس کی مقدس ذات کی خوشنودی کے لیے انجام نہ دیئے گئے ہوں گے"۔ اس کے علاوہ خالق کائنات نے یہ امر بھی واضح کر دیا کہ اس کی ذات کے سوا کسی چیز کو بقا و دوام حاصل نہیں لہٰذا جو کام اس کی ذات کی رضا کے حصول کی خاطر انجام دیا جائے اور اس کے پاکیزہ نام کے ساتھ شروع کیا جائے وہ ہمیشہ باقی رہے گا اور کبھی محو و نابود نہیں ہو سکتا۔

بنا برایں ہر چیز کی بقا کا راز چونکہ خدا کی ذات کی خوشنودی کے حصول کی کوشش میں مضمر ہے اس لیے اس کی بقا کی مقدار بھی اتنی ہی ہو گی جتنا رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش کا اس میں دخل...... یہ وہ مسلم الثبوت حقیقت ہے جو فریقین (شیعہ و سنی) کے نزدیک متفق علیہ حدیث نبویؐ میں بیان کی گئی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

" کل امر ذی بال لم یبدأ فیه باسم الله فهو ابتر "

(جو اہم کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے اثر و بے نتیجہ ہے)

عربی زبان میں "ابتر" بے اثر و بے نتیجہ چیز کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جس کا انجام کار کچھ نہ ہو۔

بنا برایں یہ کہنا بجا ہو گا کہ " بسم اللہ " کی ب کے تمام معانی میں سے اس مقام پر "ابتدائی" کا معنی ہی مناسب ہے لہٰذا "بسم اللہ" کا ترجمہ یوں ہو گا: "میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے" ! یا "میری ابتداء اللہ کے نام سے" ! اس مناسبت کی ایک اہم وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ کلام خدا کی ابتدا بھی اسی جملے سے ہوئی اور "کلام" افعال میں سے ایک فعل ہے جسے وحدت حاصل ہے اور کسی کلام کی وحدت اس کے معنی و مفہوم کی وحدت کی وجہ سے ہوتی ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا کا کلام بھی اول سے آخر تک حقیقی معنی میں وحدت کا حامل ہے (یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کا خدا نے اپنے کلام کی ابتداء میں ارادہ فرمایا ہے "اللہ" کے نام سے شروع کرنے میں یہی راز پوشیدہ ہے کہ اس کی حقیقی وحدت کا تصور ہر حال میں باقی رہے)

اب دیکھنا یہ ہے کہ کلام خدا میں معنی کی وحدت سے کیا مراد ہے؟ تو اس سلسلے میں خداوند عالم نے اپنے کلام یعنی قرآن مجید کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا :

سورہ مائدہ، آیت ۱۵۔۱۶:

★ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ.........

(یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین آئی اس کے ذریعے خدا ہدایت کا کام انجام دیتا ہے......)

اس آیت کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں یہی مطلب بیان کیا گیا ہے اور یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ کلام الٰہی۔ کتاب خدا' قرآن مجید۔ کا مقصد لوگوں کی ہدایت کے سوا کچھ بھی نہیں یعنی لوگوں کو حق وحقیقت کی رہنمائی کرنا ہی قرآن کے نزول کا واحد مقصد وغرض ہے' لہٰذا ''ہدایت'' ہی وہ معنی ہے جس کی ابتداء خدا کے نام سے ہوئی'' وہ خدا جو رحمان ہے' رحیم ہے اور وہی کردگار ومعبود برحق ہے جس کی طرف تمام لوگوں کی بازگشت ہے' وہ رحمان ہے اور اپنے تمام بندوں کو اپنی رحمت عام کا وہ راستہ دکھاتا ہے جو ان کے وجود وحیات کی صلاح وبہتری کا ضامن ہو خواہ وہ بندے مؤمن ہوں یا کافر! وہ رحیم ہے اور اپنی رحمت خاص کی راہ اہل ایمان کے لیے واضح کر دیتا ہے یعنی ان کی اخروی سعادت کے حصول اور اپنی بارگاہ میں ان کی شرف یابی کا راستہ انہیں دکھاتا ہے ، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ اعراف، آیت ۱۵۶:

★ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ

(میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور میں عنقریب اپنی رحمت کو متقی و پرہیزگار لوگوں کے لیے مخصوص کر دوں گا)

بہرحال'' ابتداء '' کا مذکورہ معنی پورے قرآن کی بابت ذکر کیا گیا ہے جسے دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ پورے قرآن کا مقصد صرف ایک چیز یعنی ''ہدایت''، اور اس کا آغاز خدا کے پاکیزہ نام سے ہوا ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں کئی مقامات پر لفظ ''سورہ'' استعمال کیا ہے چند آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ یونس، آیت ۳۸:

★ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ

(پس لے آؤ اس جیسا ایک سورہ۔۔)

سورۂ ہود، آیت ۱۳:

★ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ.......

(پس لے آؤ اس جیسی دس سورتیں من گھڑت۔۔)

سورہ توبہ، آیت ۸۶:

★ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ

(اور جب نازل کی جاتی ہے کوئی سورت۔۔۔)

سورۂ نور، آیت ۱:

★ سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰھَا وَفَرَضْنٰھَا ....

(اور وہ سورت جسے ہم نے نازل کیا اور اسے فرض کر دیا۔۔۔)

ان آیات مبارکہ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے اپنے کلام کے ہر جزء پر مشتمل حصہ کو "سورہ" کا نام دیا ہے اور یہ کہ ان تمام سورتوں میں سے ہر ایک سورہ کلامِ الٰہی کا ایک حصہ ہے' اگرچہ خداوند عالم نے ان سب کو ایک دوسرے سے جدا کر کے ذکر کیا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک' قرآن کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے معنی و مفہوم کی مخصوص وحدت کا حامل ہے ایسی وحدت جو نہ تو سورہ کے اجزاء اور نہ ہی دو سورتوں کے درمیان نظر آتی ہے' اس سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ہر سورہ کا مقصد و غرض مستقل اور ایک دوسرے سے علیحدہ و مختلف ہے یعنی ہر سورہ ایک مخصوص مقصد کے لیے ہے اور خاص مطلب کو بیان کرنا ہی اس کی بنیادی غرض ہے لہٰذا جب تک وہ غرض حاصل نہ ہو جائے اس کا اختتام نہیں ہوتا' لہذا ہر سورہ سے پہلے" بسم اللہ " کا ذکر کرنا اس لیے ہے کہ اس سورہ سے خاص غرض و مخصوص مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔ ہر سورہ کی ابتداء میں "بسم اللہ" کی بازگشت اس سورہ میں ملحوظ غرض کی طرف ہے۔

بنابرایں سورہ الحمد میں "بسم اللہ" کا تعلق اس غرض و پاکیزہ مقصد سے ہے جو اس سورہ میں ملحوظ ہے اور صرف اسی مقصد کا حصول ہی مطلوب ہے جو اس سورہ کے نزول کی اصل بنیاد ہے' سورہ فاتحہ کی ترتیب و ترکیب سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں جو بنیادی مقصد ملحوظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہے :

"خدا کی حمد بجالانا حقیقی معنے میں اس کی بندگی و عبودیت کا اظہار کرتے ہوئے' اور اسی کی بارگاہ میں سربسجدہ ہو کر' اور صرف اسی سے مدد مانگتے ہوئے اور صرف اسی کے حضور ہدایت و رہنمائی کی درخواست لے کر......"

سورہ فاتحہ درحقیقت ایک ایسا کلام ہے جو خدا نے اپنے بندے کی طرف سے خود اس لیے ارشاد فرمایا کہ وہ (بندہ) اس کی بارگاہِ ذی جاہ میں اظہار بندگی و عبودیت کے انہی مخصوص آداب کو اپنائے جو خدا نے اسے تعلیم دیئے ہیں۔

اظہارِ بندگی وہ پاکیزہ عمل ہے جسے "عبد" اپنے معبود کے حضور بجالاتا ہے اور ایسا اہم کام ہے جس کی انجام دہی کا اقدام کرتا ہے چنانچہ اس عمل و اہم کام کی ابتداء خدائے رحمان و رحیم کے مبارک نام سے کرتا ہے' اور "بسم اللہ" سے اپنے عمل کا آغاز کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ خدایا! تیرے نام سے تیرے حضور اظہارِ بندگی کا شرف حاصل کرتا ہوں۔

ایک ادبی نکتہ

سورۂ الحمد کی ''بسم اللہ'' میں حرف (ب) کا تعلق ابتداء سے ہے۔۔ب کا متعلق ابتدا ہے۔۔یعنی ابتداء خدا کے نام سے' اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اپنی بندگی کے اظہار کو اخلاص کی عظمتوں سے ہم آہنگ کر کے بارگاہِ ربوبی میں شرف سخن حاصل کیا جائے۔

عربی ادب کے بعض ارباب فکر ونظر کا خیال ہے کہ ''بسم اللہ'' میں بؔ کا متعلق استعانت یعنی مدد طلب کرنا ہے' اگرچہ اس نظریہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ابتداء یعنی شروع کرنے کا معنی ومفہوم ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ خود سورۂ مبارکہ میں استعانت (مدد طلب کرنے) کے صریح الفاظ موجود ہیں: '' اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ '' (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) لہٰذا ''بسم اللہ'' سے اس (استعانت) کے علاوہ ہی معنی مراد لینا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اسم کی بحث

'' اسم '' نام ..... عربی زبان میں اس لفظ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کی پہچان کا ذریعہ ہو یا جو کسی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہو۔

'' اسم '' کے اشتقاق یعنی لفظی بناوٹ کے سلسلہ میں دو امکان پائے جاتے ہیں :

۱۔ '' سمتہ '' سے بنایا گیا ہے جس کا معنی ہے علامت ونشانی!

۲۔ '' سمو '' سے بنایا گیا ہے جس کا معنی ہے رفعت وبلندی!

بہر حال لغت اور عرف عام دونوں میں '' اسم '' سے وہ لفظ مراد لیا جاتا ہے جو کسی چیز پر دلالت کرے (یعنی اس کی پہچان ومعرفت کا ذریعہ ہو) اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ''اسم'' جس چیز کی پہچان کا ذریعہ بن رہا ہے اس کی ''حقیقت'' سے قطعی مختلف ہے یعنی اس چیز کی حقیقت کا حصہ نہیں ہوگا بلکہ صرف اس کی پہچان کا ذریعہ ووسیلہ ہوگا (اسم اور ہے اور مسمی کچھ اور)۔

''اسم'' کو ذات کے معنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب اسے اس ذات کے حقیقی اوصاف میں سے کسی ایک وصف سے بنایا گیا ہو (یعنی اسم سے وہ ذات مراد لیں جس کے اوصاف میں سے ایک وصف ہمارے ملحوظ خاطر ہو) تو اس صورت میں وہ (اسم) ''الفاظ'' کے دائرے سے نکل کر ''اعیان'' اور ذوات کی دنیا میں شمار کیا جائے گا اور اسم کے پہلے معنے کی روشنی میں اصل ''مسمی'' بن جائے گا مثلاً لفظ ''عالم''......جو کہ خدا کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک ہے...... ایسا لفظ ہے جو اپنے ''مسمی'' (جس کے لیے بنایا گیا ہے) کی پہچان کرواتا ہے یعنی وہ ذات جس کا وصف علم ملحوظ ہے اور یہی لفظ (عالم) بعینہ اس ذات کا اسم ہے جس کی بابت اس کی صفات کے علاوہ ہمیں کسی چیز کا علم نہیں ...... اس کی اصل ذات کی جگہ

اس کی صفات ہی ملحوظ ہیں...... (لہٰذا یہ اسم بھی ہے اور اس کا ''مسمّی'' بھی)...... بنابریں ان دو معانی میں سے پہلے معنے کی روشنی میں اسم کی حیثیت ایک ایسے لفظ سے زیادہ نہ تھی جو ذات کی پہچان کا ذریعہ ہو جس میں ذات کی ذاتی خصوصیات شامل نہ تھیں اور دوسرے معنے کی روشنی میں اسم خود ذات ہی کی تصویر ہے جس میں ذات کی حقیقی صفات شامل و دخیل ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب اسم جو کہ الفاظ میں سے تھا اور ذات کی پہچان کروانے کے علاوہ اس کا کوئی کام نہ تھا تو اسے ذات کی حقیقی صفات کے حوالہ سے ذات کی ایک تصویر کیونکر بنا دیا گیا؟ یعنی پہلے معنی کے مطابق اسم الفاظ کے باب سے تھا اور دوسرے معنے کے مطابق ''اعیان'' میں کیونکر شامل ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صاحبان علم و دانش نے جب کسی ذات کی پہچان کے لیے بنائے گئے اسم کو دیکھا تو اس امر سے آگاہ ہوئے کہ لفظ اسم ان الفاظ میں سے ایک ہے جو اپنے ''مسمّی'' کی پہچان کرواتے ہیں، پھر انہوں نے ذات کی حقیقی صفات کو تحقیقی نظروں سے دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ ہر صفت اپنی ذات کی پہچان کی بابت وہی کام دیتی ہے جو ''اسم'' ایک لفظ کی صورت میں انجام دیتا ہے لہٰذا انہوں نے اس صفت کو بھی اسم کا نام دے دیا جو کسی ذات کی پہچان کا ذریعہ ہو' اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ ''اسم'' جس طرح سے ایک ''لفظ'' ہے اور اس کا شمار ''الفاظ'' کے باب میں ہوتا ہے اسی طرح صفات میں استعمال ہونے کے حوالہ سے وہ ایک ''حقیقت'' و ذات کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا شمار الفاظ کے بجائے ''اعیان'' و ذوات میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان صاحبانِ دانش نے یہ بھی دیکھا کہ جو چیز کسی ذات پر دلالت کرے (اس کی پہچان کا ذریعہ ہو) اور وہ اس ذات سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے زیادہ اس کے قریب ہو تو وہی اس ذات کا اسم ہے یعنی دوسرے معنے کی روشنی میں جو چیز کسی ذات کی پہچان کا ذریعہ ہو وہ اس ذات کا اسم کہلانے کی مستحق ہوتی ہے اور تجزیہ و تحلیل کے مطابق وہی اس ذات کا اسم ہے' جبکہ پہلے معنے کی روشنی میں اسم اسے کہیں گے جو کسی ذات کی پہچان کا ذریعہ تو ہو مگر دوسرے معنے والے اسم کی وساطت سے' یہی وجہ ہے کہ اربابِ تحقیق نے دوسرے معنے والی چیز کو ''اسم'' کہا اور پہلے معنے والی چیز کو ''اسم الاسم'' کے نام سے یاد کیا۔ البتہ یہ سب مطالب علمی و تحقیقی باریک بینیوں کا نتیجہ ہے ورنہ انہیں لغت کے قالب میں نہیں ڈھالا جاسکتا' اس لیے لغت کے اعتبار سے اسم کا وہی معنی ہوگا جو ہم نے سب سے پہلے ذکر کیا یعنی وہ لفظ جو کسی ذات پر دلالت کرے (اس کی پہچان کا ذریعہ ہو)۔

ایک تاریخی تجزیہ

صدرِ اسلام کے علمی حلقوں کا تاریخی تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں علماء و دانشوروں کے درمیان اس مسئلہ میں شدید بحث و نزاع کا بازار گرم تھا کہ آیا اسم' عین مسمّی ہے یا اس کا غیر ہے؟ یعنی نام اور ذات دونوں ایک ہی

حقیقت رکھتے ہیں یا ان میں فرق پایا جاتا ہے؟ اس سلسلہ میں "متکلمین" (الٰہیات کے ماہرین) میں شدید اختلاف رائے پایا جاتا تھا اور اس موضوع کی بابت ان کے درمیان باہمی تنازعات کی داستانیں صدرِ اسلام کی تاریخ کا وسیع حصہ ہیں لیکن عصر حاضر میں اس طرح کے مسائل روز روشن کی طرح واضح ہو چکے ہیں اور اب ان کے بارے میں لوگ اس حد تک آگاہی حاصل کر چکے ہیں کہ ان مسائل کی بابت کسی دلیل و برہان پیش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی لہٰذا اب اس سلسلے میں بحث و تمحیص ضیاعِ وقت کے سوا کچھ نہیں اور جب تمام پہلو آشکار ہو چکے ہیں تو یہ بات ہرگز درست نہیں کہ ان کی بابت صدرِ اسلام کے دانشوروں کے نظریات ملحوظ رکھتے ہوئے صحیح و غلط کی تمیز کے نام پر اپنی توانائیاں صرف کی جائیں اور احقاق حق (حق کو ثابت کرنے) اور ابطالِ باطل (باطل کو باطل ثابت کرنے) کے نام پر فکری و عملی کاوشیں بروئے کار لائی جائیں' بنا برایں ہم بھی اس سلسلہ میں مزید بحث کرنے سے احتراز و اجتناب کرنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔

اللہ

لفظِ جلالہ ـ اللہ..... اصل میں " الالٰہ " تھا، کثرت استعمال کی وجہ سے ہمزہ حذف ہو گیا، "ال الٰہ" سے "اللہ" ہو گیا۔

عربی زبان کی لغت کے مطابق " اللہ " لفظ " الٰہ" سے بنا ہے جس کے معنی عبادت و پرستش کرنے کے ہیں چنانچہ جب کہا جاتا ہے :"الٰہ الرجل یألہ" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ " اس شخص نے عبادت کی" یا "وہ شخص عبادت کرتا ہے"۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی اصل "الٰہ" کی بجائے "ولہ" ہو جس کا معنی تحیر ہے چنانچہ جب کہا جائے: " الہ الرجل" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "وہ شخص ورطۂ حیرت میں پڑ گیا اور یہی معنی "ولہ الرجل" کا ہے۔

" الٰہ " فعال کے وزن پر اسم مفعول کا معنی دیتا ہے جیسے لفظ "کتاب"، مکتوب یعنی لکھی ہوئی چیز کے معنے میں آتا ہے۔

مذکورہ دونوں معنوں کی روشنی میں لفظ "اللہ" کا معنی یا تو "معبود" ہوگا یعنی وہ ذات جس کی عبادت و پرستش کی جائے' یا ایسی ذات کہ جس کی حقیقت کو سمجھنے سے عقل دنگ ہے اور اس کی بابت افکار ورطۂ حیرت میں پڑے ہوئے ہیں۔

"اللہ" خداوند عالم کا خاص و مخصوص نام ہے..... عربی زبان میں مخصوص نام کو " علم " کہتے ہیں ... اور یہ نام نزول قرآن سے قبل عربوں میں معروف و مستعمل تھا اور زمانۂ جاہلیت کے عرب بھی اس سے آشنا تھے جیسا کہ سورہ زخرف آیت ۸۷ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

★ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ

(اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کا خالق کون ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ "اللہ" ہے)

اسی طرح سورہ انعام آیت ۱۳۶ میں ہے :

★ فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ

(اپنی قربانیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ "اللہ" کے لیے ہے اور یہ ہمارے شرکاء کے لیے ہے۔ جنہیں ہم نے خدا کا شریک بنایا ہوا ہے)۔

لفظ "اللہ" کے اختصاص کی وجہ

لفظ "اللہ" کے، خدا کا علم (مخصوص نام) ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ خداوند عالم کی توصیف میں اس کے اسماء حسنیٰ سے استفادہ کیا جاتا ہے اور اس کے ان افعال کے ذریعے اس کی توصیف کی جاتی ہے جو اسماء حسنیٰ سے ماخوذ ہیں لیکن اس کے برعکس کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ لفظ "اللہ" کے ذریعے اس کی توصیف کی جائے' چنانچہ یوں کہا جاتا ہے' "اللہ" رحمان ہے ، رحیم ہے، اور یوں بھی کہا جاتا ہے : " اللہ نے رحم کیا ، اللہ کو علم ہے، اللہ نے رزق دیا"، لیکن کبھی یوں نہیں کہا جاتا : رحمان اللہ ہے، رحیم اللہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ لفظ جلالہ "اللہ" نہ تو خدا کے اسماء حسنیٰ میں سے کسی اسم کی صفت واقع ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے اس کے اسماء کی کوئی صفت بنائی جاتی ہے جس کے ذریعے اس کی توصیف کی جائے (لفظ "اللہ" خدا کی ذات سے مختص اس کا مخصوص نام ہے جس کا تعلق صرف ذات سے ہے) اور چونکہ خداوند عالم جو کہ پوری کائنات کا معبود ہے وہ خود اپنی مخلوق کو اپنی صفات کمال کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور وہ اپنے بندوں کو اس امر سے آگاہ کرتا ہے کہ وہ تمام کمالی صفات سے متصف ہے لہذا تمام کمالی صفات اسی سے وابستہ و پیوستہ اور اسی کے مظاہر ہیں۔ اس بناء پر یہ بات بھی درست ہے کہ لفظ "اللہ" اس ذات والاصفات کا نام نامی اسم گرامی ہے جو "واجب الوجود" ہے اور تمام صفات کمال اس میں جمع و یکجا ہیں۔

لیکن اگر مذکورہ بالا بیان سے قطع نظر کریں اور ذات و صفات والتزامی دلالت کی باریکیوں میں نہ جائیں تو لفظ "اللہ" خداوند عالم کا مخصوص نام (علم) ہونے کے علاوہ صرف وہی معنی دے گا جو مادہ "الہ" (عبادت و پرستش) میں پوشیدہ ہے اور اس کے سوا کوئی اہم مطلب اس سے ظاہر نہ ہو سکے گا (گویا لفظ "اللہ" کا معنی معبود یعنی وہ ذات جس کی پرستش ہوتی ہے یا جو پرستش کے لائق ہے)۔

رحمان و رحیم

رحمان و رحیم دو ایسی صفتیں ہیں جو "رحمت" سے مشتق ہیں۔ رحمت ایک ایسی انفعالی صفت ہے جو خاص اثر کی حامل ہے اور وہ اثر اس وقت دل پر ظاہر ہوتا ہے جب کوئی نادار و حاجتمند شخص دکھائی دے کہ جو اپنی حاجت کے پورا ہونے میں کسی چیز کا محتاج ہو، ایسی صورت میں انسان کا دل اس بیچارے حاجتمند کی حالت کو دیکھ کر سخت متاثر ہوتا ہے اور وہ اس کی ضرورت کو پورا کرنے اور اس کی حاجت روائی کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں و صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے میدان عمل

میں کود پڑتا ہے، لیکن یہ سب کچھ خدا کی ذات کے بارے میں تب ہی دُرست قرار دیا جا سکتا ہے جب اسے ممکنات کی حدود سے خارج کر کے واجب الوجود کے آئینہ میں دیکھیں کیونکہ خدا کی بابت ''رحمت'' کا معنی صفحۂ دل پر ظاہر ہونے والی خاص کیفیت کا نام نہیں بلکہ اس سے مراد اعطاء وفیض اور حاجت روائی کا حقیقی مفہوم ہے اور اسی معنی میں خدا کو رحمت کی صفت سے متصف کیا جاتا ہے یعنی خدا کو رحمت کی صفت کا حقیقی سزاوار اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ صفت اپنے مافوق المادہ معنے میں اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔

رحمان

رحمان ''فعلان'' کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس میں رحمت کی کثرت کا معنی پایا جاتا ہے۔ جملہ (خدا رحمان ہے) کا مطلب یہ ہے کہ وہ کثیر الرحمت ہے، (زیادہ رحمت کرنے والا ہے)۔

رحیم

رحیم ''فَعِیل'' کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور ثبات و دوام کے معنے دیتا ہے...... ''خدا رحیم ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ دائم الرحمت ہے، (ہمیشہ رحمت کرنے والا ہے)۔

مذکورہ بالا معنی کی روشنی میں لفظ ''رحمان'' کی مناسبت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ رحمت کثیر پر دلالت کرے یعنی ایسی عام رحمت جو مومن و کافر دونوں کو حاصل ہوتی ہے اور یہی معنی قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ طٰہٰ، آیت ۵ :

★ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝

(وہ رحمان، عرش پر قائم ہے)

سورہء مریم، آیت ۷۵ :

★ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ

(کہہ دیجئے، جو شخص گمراہی میں پڑا ہوا ہے تو رحمان اسے ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے)

اس کے علاوہ دیگر کئی آیات میں رحمان کا یہی معنی مراد لیا گیا ہے۔ اور لفظ ''رحیم'' کے سلسلہ میں بھی اس کے معنی کی مناسبت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ دائمی نعمت اور ہمیشہ باقی رہنے والی رحمت پر دلالت کرے یعنی ایسی رحمت جو مومنین کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے فیض سے صرف اہل ایمان ہی بہرہ ور ہو سکتے ہیں جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا :

سورہء احزاب، آیت ۴۳:

★ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ﴿۴۳﴾

(خدا، مومنین پر رحیم ہے...... ان پر ہمیشہ رحمت نازل کرنے والا ہے)۔

سورہء توبہ، آیت ۱۱۷:

★ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

(خدا، اہل ایمان پر مہربان و رحیم ہے)

اسی طرح دیگر متعدد آیات میں رحیم سے رحمت کی ہمیشگی اور اس کا مومنین سے مخصوص ہونا مراد لیا گیا ہے، اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ رحمان عام ہے اور رحیم خاص یعنی رحمان سے مراد یہ ہے کہ اس کی رحمت مومن و کافر سب کے لیے ہے اور رحیم سے مراد یہ ہے کہ اس کی رحمت مومنین کے لیے مخصوص ہے۔

حمد و ستائش کا اختصاص

الحمد للہ

حمد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایسی تعریف ہے جو کسی ایسے اچھے کام پر کی جائے جو ارادہ و اختیار سے انجام دیا گیا ہو (اس میں وہ صفات بھی شامل ہیں جو اختیاری طور پر حاصل ہوئی ہوں) اور مدح اس تعریف کو کہتے ہیں جو اختیاری و غیر اختیاری دونوں صورتوں میں انجام دیئے جانے والے اچھے کام اور اس سے حاصل ہونے والی اچھی صفت پر کی جائے' اس طرح مدح کا دائرہ حمد کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے (لیکن حمد کا تعلق چونکہ ارادہ و اختیار سے ہے اس لیے اس کی عظمت زیادہ ہے) مثلاً کسی کی حمد یا مدح کے لیے یوں کہا جاتا ہے کہ "میں نے اس کی حمد کی یا اس کی مدح کی اس کے کرم و عنایت پر' البتہ اگر قیمتی موتیوں کی تعریف کرنی ہو تو یوں کہا جاتا ہے : " میں نے لوءلوء (قیمتی موتی) کی مدح کی اس کی خوبصورتی اور چمک دمک پر' لیکن کبھی یوں نہیں کہا جاتا: "میں نے فلاں موتی کی حمد کی اس کے خوبصورت ہونے پر' (کیونکہ کسی موتی یا جواہرات کا خوبصورت ہونا ان کے اپنے اختیار میں نہیں اور ان کی چمک دمک ان کے ارادہ سے حاصل نہیں ہوتی اس لیے ان کی تعریف میں لفظ "حمد" استعمال نہیں ہو سکتا)۔

الف و لام:

"الحمد" میں الف و لام کے دو معنے ممکن ہیں : (۱) جنس (۲) استغراق، اگرچہ علماء ادب اور ماہرین علم لغت نے دونوں معانی کو بیان کیا ہے لیکن یہاں دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے یعنی خواہ الف و لام کو جنس کے معنے میں لیں یا استغراق کے معنے میں، اس مقام پر دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے...... اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ حمد اپنی حقیقت اور اصل کے لحاظ سے خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور حمد کی تمام اقسام خدا کے لیے ہیں، گویا حقیقی حمد اور حمد کی تمام قسمیں خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔

حقیقی حمد اور حمد کی تمام قسموں کے خدا کے ساتھ مخصوص ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس موضوع کو واضح کیا ہے۔ بطور مثال چند آیات ملاحظہ ہوں :

سورہء غافر، آیت ۶۲:

★ " ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ "

(یہ ہے خدا تمہارا رب، جو ہر چیز کا پیدا کر[illegible] ہے)

اس آیت میں خداوند عالم نے اس امر کو وا[illegible] کہ جس کو "شے" (چیز) کہہ سکتے ہوں وہ اس کی مخلوق ہے۔

سورہء سجدہ، آیت ۷:

☆ الَّذِيْ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ

(خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کی خلقت وآفرینش کو بہتر صورت عطا کی)

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے ہر چیز کی تخلیق کی بابت یہ بیان کیا ہے کہ اس نے اسے "حسن خلقت" سے نوازا' یہاں خدا نے ہر چیز کے بارے میں اس کے حسن و جمال کا اثبات اس طرح سے کیا کہ چونکہ ہر چیز اس کی پیدا کی ہوئی ہے اور اسی کی طرف منسوب ہوتی ہے لہٰذا وہ حسین وجمیل ہے یعنی ہر شے کے حسن و جمال کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ خدا کی مخلوق ہے اور خدا کی ہر مخلوق اس کے جمال قدرت کی آئینہ دار ہے پس کوئی مخلوق ایسی نہیں جو خدا کے احسان کے باوجود حسن و جمال سے خالی ہو بلکہ ہر چیز کا حسن و جمال خدا کے احسان تخلیق کا مرہون منت ہے اور کوئی حسن ایسا نہیں جو اس کی قدرت کاملہ کا شاہکار اور اس کی طرف منسوب نہ ہو، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :

سورۂ زمر، آیت ۴:

☆ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ④

(وہ اللہ ایک ہے، غلبہ والا ہے)

سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۱:

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ

(سب چہرے خدائے حی وقیوم کے سامنے جھک گئے)

ان دو آیتوں میں خداوند عالم نے یہ بات واضح طور پر بیان فرمادی کہ اس نے کسی چیز کو نہ تو کسی کے اجبار واکراہ کی بنیاد پر پیدا کیا اور نہ ہی کسی مافوق قدرت وقوت کے قہر وغلبہ کی وجہ سے اس کی تخلیق کی بلکہ ہر چیز کو اپنے علم وارادہ اور اختیار سے پیدا کیا لہٰذا ہر چیز ..... کو وجود عطا کرنا...... اس کا اچھا وجمیل عمل اور اختیاری فعل ہے۔ بنابرایں فعل وعمل کے حوالہ سے ہر حمد اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہی صورت حال "اسم" میں ہے، چنانچہ ارشاد ہوا :

سورہء طہٰ، آیت ۸:

☆ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ⑧

(وہ خدا کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں' اسی کے لیے ہیں اسمائے حسنیٰ (سب اچھے نام)۔

سورہ اعراف آیت ۱۸۰ :

☆ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ

(خدا ہی کے لیے ہیں سب اچھے نام' پس تم اسے پکارو انہی ناموں کے ساتھ' اور جو لوگ اس کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں انہیں چھوڑ دو)

بہر حال خداوند عالم اپنے تمام اسماء گرامی میں جمیل اور اپنے تمام افعال میں بھی جمیل ہے بلکہ ہر جمیل شے اسی سے ہے۔

مذکورہ مطالب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ خداوند عالم اپنے تمام اسماء جمیلہ اور افعال حسنہ کی وجہ سے حمد وستائش کا سزاوار ہے اور جو شخص جس اچھے کام یا اچھی چیز کی حمد بجالائے وہ حقیقت میں خدا ہی کی حمد ہو گی کیونکہ ہر وہ امر جمیل جو حمد کا موضوع قرار پاتا ہے وہ خدا ہی کی قدرت کاملہ کا اثر وشاہکار ہے لہٰذا اس معنے میں حمد کی جنس واصل اور سب حمد اور ہر قسم کی حمد خدا ہی کے لیے ہے۔

ایک اہم نکتہ

اس مقام پر ایک اہم نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب کلام (ظاہر سیاق) اور ''ایاک نعبد'' میں پائے جانے والے قرینۂ التفات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ سورہ، مخلوق خدا کا کلام ہے جو وہ اپنے پروردگار سے مخاطب ہو کر کرتی ہے اور اس سورہ میں خداوند عالم نے اپنی مخلوق کو اپنی حمد کا درس دیا ہے اور اس بات کی تعلیم دی ہے کہ جب کوئی بندہ اپنے پروردگار کے حضور اظہار بندگی کرنا چاہے تو اس کے آداب کیا ہیں اور کوئی عبد اپنے معبود سے کیونکر مخاطب ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ''الحمد للہ'' کے الفاظ بھی اسی امر کی تصدیق کرتے ہیں اور ان سے یہی درس ملتا ہے کہ بارگاہ ایزدی میں اظہار عبودیت و بندگی اس طرح کیا جائے' اور یہ اس لیے ہے کہ حمد درحقیقت ایک قسم کی توصیف ہے جبکہ خداوند عالم نے خود کو توصیف کرنے والوں کی توصیف سے منزہ ...... وبالاتر ...... قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا :

سورۂ صافات، آیت ۱۵۹ اور ۱۶۰:

☆ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ⑮⑨ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ⑯⓪

(خدا پاک و برتر ہے اس سے جو وہ توصیف کرتے ہیں، سوائے اس کے مخلص و برگزیدہ بندوں کے!)

یہ آیت مطلق ہے اس میں کسی قسم کی قید و شرط ذکر نہیں کی گئی، اور قرآن مجید میں خداوند عالم نے ایسے الفاظ ذکر نہیں فرمائے جن سے ثابت ہو کہ خود اس کے علاوہ کسی اور نے اس کی حمد کی ہو سوائے اس کے چند عظیم المرتبت و برگزیدہ پیغمبروںؑ کے، کہ جن کا تذکرہ کرتے ہوئے خدا نے ارشاد فرمایا کہ "انہوں نے حمد بجالائی" مثلاً حضرت نوحؑ کے متعلق یوں آیا ہے کہ خدا نے ان سے فرمایا :

سورۂ مومنون، آیت ۲۸:

☆ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۸﴾

(پس کہیے کہ حمد ہے اللہ کے لیے کہ جس نے ہمیں ظالم و ستمگر لوگوں سے نجات بخشی)

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے تذکرے میں خدا نے فرمایا کہ ابراہیمؑ نے کہا:

سورۂ ابراہیم، آیت ۳۹:

☆ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ

(حمد ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے عالم پیری میں اسماعیل و اسحاق عطا کیے)

اور کئی مقامات میں حضرت محمدؐ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا :(مثلاً)

سورۂ نمل، آیت ۹۳:

☆ وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ

(اور کہو کہ حمد ہے اللہ کے لیے!)

اسی طرح اہل بہشت کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ کینہ پروری، لغو و بیہودہ کلام اور گناہ و فتنہ انگیزیوں سے پاک و منزہ ہیں ان کا منتہائے ذکر، حمد الٰہی ہے:

سورۂ یونس، آیت ۱۰:

☆ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰﴾ ع

(اور ان کی آخری بات (منتہائے ذکر) یہ ہے کہ حمد ہے اللہ کے لیے جو کائنات کا پروردگار ہے)

مذکورہ بالا موارد کے علاوہ اگرچہ خداوند عالم نے مخلوق کی طرف سے کی جانے والی حمد کا تذکرہ کیا اور حمد کرنے کی نسبت بھی انہی کی طرف دی جیسا کہ ارشاد فرمایا :

سورۂ شوریٰ، آیت ۵:

☆ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ

(اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں)

سورۂ رعد، آیت ۱۳:

☆ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ

(اور بجلی تسبیح کرتی ہے اس کی حمد کے ساتھ)

سورۂ اسراء، آیت ۴۴:

☆ "وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ"

(کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ تسبیح کرتی ہے اس کی حمد کے ساتھ!)

لیکن اس کے باوجود خدائے قدوس نے مذکورہ بالا موارد میں حمد کو تسبیح کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا بلکہ تسبیح ہی کو بنیادی حیثیت دے کر حمد کو اس کے ضمن میں بیان کیا (تمام موجودات اس کی تسبیح بجالاتی ہیں اس کی حمد کے ساتھ) اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی غیر خدا' اس کے افعال کے جمال وعظمت اور کمال ورفعت کا احاطہ بھی اسی طرح نہیں کر سکتا جس طرح کہ اس کی صفات کریمہ واسماء حسنہ کے جمال کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے کیونکہ اس کی صفات واسماء ہی ہیں جو اس کے حسن افعال کو جنم دیتے ہیں (یعنی خود ذات حق تعالیٰ کے سوا کوئی بھی اس کے افعال کے حسن وجمال اور کمال کا ادراک نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے افعال کا جمال وکمال اس کی صفات واسماء کے جمال کا پرتو ہے اور کوئی شخص اس کی صفات واسماء کے جمال وکمال کے ادراک پر قادر نہیں) چنانچہ غیر خدا کے عجز وناتوانی کا تذکرہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے اس طرح واضح وصریح الفاظ میں ارشاد فرمایا:

سورۂ طہٰ، آیت ۱۱۰:

☆ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾

(لوگ اپنے علم سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے)

بنابرایں جو لوگ اس کی توصیف (اس کی کسی صفت کے ساتھ) کریں تو گویا انہوں نے خدا کو اسی صفت کے آئینہ میں دیکھا اور اسے اپنی قوت فکر کی محدودیت کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور اسے اپنی سوچ کے دائرے میں محدود کر دیا اور اپنے افکار کی تنگ دامنی کا شکار کر دیا جبکہ خداوند عالم کسی بھی حوالہ سے محدود نہیں، نہ ذات میں اور نہ ہی افعال وصفات میں...... لہٰذا اس کی تعریف وتوصیف صرف اسی طرح ممکن ہے کہ پہلے اسے اپنی فکر وسوچ کے محدود زاویوں سے باہر لا کر ہر قسم کی محدودیت سے پاک ومنزہ قرار دیں اور اپنے تئیں اس کا اعتراف کریں کہ اس کی ذات وصفات ہمارے ادراکات کی حدود سے ماوراء اور ہماری عقل اس کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے' جیسا کہ اس نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ نحل، آیت ۷۴:

☆ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(یقیناً خدا جانتا ہے جبکہ تم نہیں جانتے)

البتہ جو اس کے مخلص و برگزیدہ بندے ہیں ان کے حمد و ستائش کرنے کو خداوند عالم نے اپنی طرف نسبت دی ہے اور ان کے توصیف کرنے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے (یعنی ان کا حمد کرنا گویا میرا حمد کرنا ہے اور ان کا توصیف کرنا گویا میرا توصیف کرنا ہے) کیونکہ اس نے انہیں خاص اپنے لیے مخصوص کیا ہے۔

مذکورہ مطالب سے یہ مطلب واضح ہو گیا کہ آداب بندگی اس امر کے متقاضی ہیں کہ بندہ اپنے پروردگار کی حمد اسی طرح بجالائے جس طرح خدا نے خود اپنی حمد کی ہے اور ذرہ بھر اس سے تجاوز نہ کرے جیسا کہ فریقین شیعہ و سنی کے نزدیک متفقہ حدیث میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے آپؐ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی :

☆ "لا احصی ثناء علیك انت کما اثنیت علیٰ نفسك"

(پروردگارا ! میں تیری حمد و ثناء کے احصاء سے قاصر ہوں' بس تو اسی طرح ہے جیسے تو نے خود اپنی ثناء کی ہے)۔ بحوالہ کتاب سنن ابوداود جلد ۲ صفحہ ۵۲۔

بنابرایں ابتدائے سورہ میں "الحمد للہ" کہہ کر خداوند عالم نے اپنی مخلوق کو آداب بندگی سکھائے اور اس امر کی تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے حضور کیونکر اظہار نیاز کریں' اگر خداوند عالم' اپنے بندے کو یہ نہ بتاتا اور اس طرح آداب بندگی کی تعلیم نہ دیتا تو بندہ اس کی حمد بجالانے سے عاجز ہوتا' (خدا نے اپنے بندے کی طرف سے اپنی حمد و ثنا بجالانے کا طریقہ بتاتے ہوئے "الحمد للہ" کے الفاظ کہہ کر اپنی مخلوق کو اظہار بندگی و عبودیت اور حمد و ثنا کے آداب کی تعلیم دی ہے' کہ اگر خدا یہ آداب تعلیم نہ دیتا تو بندہ اس کی حمد و ثنا میں کچھ کہہ ہی نہ سکتا)۔

خدا کے چار صفاتی اسماء

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝

(کائنات کا رب، رحمان، رحیم، یوم جزا کا مالک و حاکم)

(اکثر قاری حضرات نے "مَالِک" کے بجائے "مَلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ" پڑھا ہے)

رب کے معنی کی وضاحت:

رب، اس مالک کو کہتے ہیں جو اپنے مملوک کے معاملات و امور کی تدبیر و تنظیم کرے، اس لحاظ سے "ملکیت" کا معنی بھی اس میں پایا جاتا ہے (کسی چیز کی ملکیت سے مراد یہ ہوتا ہے کہ مالک اس میں ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے اور اس کے بارے میں حق و قوت فیصلہ رکھتا ہے)۔ اگر ملکیت کے معنے کو ہمارے ہاں مروجہ معاشرتی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ "اختصاص" کی ایک خاص قسم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ایسا ربط و تعلق کہ اسکی بناء پر دوسری

چیز میں ہر طرح کا تصرف کیا جا سکے گویا اس خاص تعلق و ربط کی وجہ سے اس میں تصرف کرنے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز ہماری ملکیت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق اس کے ساتھ ایک خاص نوعیت کا حامل ہے کہ ہم اس میں ہر قسم کے تصرفات کا حق رکھتے ہیں (اور اس کے بارے میں ہر طرح کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہمیں حاصل ہے) کہ اگر یہ تعلق نہ ہوتا تو ہم اس میں کسی طرح کے تصرف کا حق نہ رکھتے اور اس کے بارے میں ہمارا کوئی فیصلہ بلا جواز ہوتا۔

یہ ہے ''ملکیت'' کا وہ معاشرتی مفہوم جسے معاشرہ کے دوسرے قوانین کی مانند تدوین کیا جاتا ہے.... یعنی ''ملکیت'' کو ایک قانونی حیثیت دے کر اسے کسی شخص کا ''قانونی حق'' کہا جاتا ہے اور اسی قانونی حیثیت و اعتبار کی بنیاد پر جو چیز کسی کی ملکیت کہلاتی ہے (اس کی مملوکہ چیز ہو جاتی ہے) تو وہ اس میں ہر قسم کے تصرف و استعمال کا حقدار بن جاتا ہے اور جب تک وہ قانونی اختیار باقی رہتا ہے اس وقت تک وہ شخص اس چیز کا مالک کہلاتا ہے۔ البتہ ''ملکیت'' کا یہ معنی حقیقی نہیں بلکہ مجازی و اعتباری ہے جو اس کے اصل معنی و مفہوم کہ جسے ''حقیقی ملکیت'' کہا جاتا ہے سے بنایا گیا ہے، جیسا کہ ہمارے وجود میں متعدد چیزیں ایسی ہیں جو سب ہمارے ہی اختیار میں اور حقیقی معنے میں ''ہماری'' کہلاتی ہیں مثلاً ہمارے بدن کے اعضاء اور جسمانی قوتیں' آنکھ' کان' ہاتھ' پاؤں سب ہماری ملکیت میں ہیں اور حقیقی معنی میں ''ہمارے'' ہیں کیونکہ ہمارے ہی وجود سے وابستہ ہیں اور ہماری ہی وجہ سے موجود ہیں یعنی اگر ہم نہ ہوں تو وہ بھی نہ ہوں گے اور ''ملکیت'' کا حقیقی معنی بھی یہی ہے کہ ان کا وجود ہمارے وجود سے وابستہ ہے ہمارے وجود سے علیحدہ ان کی کوئی مستقل حیثیت نہیں' ان کا اختیار بھی ہمارے ہاتھ میں ہے' ہم جس طرح بھی ان میں تصرف کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور ان کے استعمال کا پورا پورا حق ہمیں حاصل ہے' یہی وہ مفہوم ہے جسے حقیقی معنی میں ''ملکیت'' کہا جاتا ہے (حقیقی اور غیر حقیقی ملکیت کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ہماری وہ چیزیں جو ہمارے وجود کے ساتھ قائم ہیں اور ان کا اختیار بھی ہمارے پاس ہے وہ ہماری ''حقیقی ملکیت'' میں داخل ہیں کہ اگر ہم نہ ہوں تو وہ بھی نہ ہوں گی جیسے بدن کے اعضاء و قوتیں، لیکن وہ چیزیں جو ہمارے وجود کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ صرف ہمارے اختیار میں ہیں یعنی ان کو استعمال میں لانا ہمارے اختیار میں ہے مثلاً گاڑی' مکان اور دیگر مادی اشیاء وغیرہ تو یہ سب اگرچہ ہماری ملکیت میں آتی ہیں لیکن ہمارے وجود کے ساتھ قائم نہیں اور ہمارے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی یہ سب باقی رہیں گی البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ہمارے علاوہ کسی دوسرے کی ملکیت ہو جائیں گی تو جب تک ہم زندہ ہیں یہ سب چیزیں ہماری ملکیت و اختیار میں آ سکتی ہیں' اسے ''غیر حقیقی'' اور قانونی و مجازی ملکیت کہا جاتا ہے جو کہ حقیقی ملکیت کے مشابہ ہے۔

''ملکیت'' کی ان دو قسموں میں سے جس قسم کی حقیقی نسبت خداوند عالم کی طرف دی جا سکتی ہے وہ ''حقیقی ملکیت'' ہے نہ کہ غیر حقیقی و اعتباری ملکیت' کیونکہ غیر حقیقی ملکیت کو دوام و ثبات حاصل نہیں اور وہ ہمیشہ تزلزل و بے ثباتی سے دوچار رہتی ہے یعنی جب تک قانونی و اعتباری رابطہ قائم ہوتا ہے وہ ملکیت بھی باقی ہوتی ہے اور جوں ہی وہ رابطہ ختم ہوتا ہے وہ ملکیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بنابرایں خدا کی ملکیت ایسی ہرگز نہیں ہو سکتی جو تزلزل و بے ثباتی کا شکار ہو بلکہ اس کی ملکیت حقیقی ہے وہ پوری کائنات کا حقیقی مالک ہے اور یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ حقیقی ملکیت کا، تدبیر و تنظیم امور کے اختیار سے چولی دامن کا

ساتھ ہے کہ جو کسی صورت میں اس سے الگ نہیں ہوسکتا کیونکہ جو چیز اپنے وجود و ہستی میں کسی کی محتاج ہو وہ کسی بھی صورت میں اس سے جدا نہیں ہوسکتی اور جب اپنے اصل وجود میں اس سے جدا نہیں ہوسکتی تو اپنے وجود کے آثار اور دیگر مربوطہ امور میں اس سے کیونکر جدا ہو سکے گی' لہٰذا خداوند عالم اپنے سوا پوری کائنات کا "رب" ہے اور ہر چیز اس کی ملکیت میں ہے کیونکہ رب (حقیقی معنے میں) کہتے ہی اسے ہیں جو "مالک" ہو اور اپنی مملوکہ چیز کا مکمل اختیار اور اس سے مربوطہ امور کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہو تو اس معنی میں خداوند عالم پوری کائنات کا رب ہے یعنی مالک و مدبر ہے اور یہ وصف حقیقی معنی میں اسی کی ذات کو زیبا ہے۔

عالمین

"عالمین"، عالَم ...... لام پر زبر کے ساتھ...... کی جمع کا صیغہ ہے کہ جس کا معنی ہے "مایعلم بہ" وہ چیز جس کے ذریعے کسی چیز کو معلوم کیا جاتا ہو (آلہ و پیمانہ)، جیسے قالب' خاتم' طابع وغیرہ، قالب، (مایقلب بہ) جس کے ذریعے قالب باندھا جاتا ہے (سانچہ)۔ خاتم، (مایختم بہ) جس کے ذریعے مہر و نشان لگایا جاتا ہے۔ طابع، (مایطبع بہ) جس کے ذریعے کوئی نشان یا دستخط ثبت کئے جاتے ہیں۔

عالَم کا لفظ، تمام موجودات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور موجودات کی ہر اس نوع پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو اپنے افراد و اجزاء سے مرکب ہو جیسے عالم جماد' عالم نبات' عالم حیوان' عالم انسان۔ اسی طرح نوع کی ہر اس صنف کو بھی "عالَم" کہا جاتا ہے جو افراد کا مجموعہ ہو جیسے عالم عرب' عالم عجم۔ اور یہی معنی کہ عالم سے مراد ہر صنف لی جائے یہاں زیادہ مناسب و موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان آیات میں خداوند عالم کے اسمائے حسنیٰ کا تذکرہ اور ان کو شمار کیا جا رہا ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" تک جا پہنچتا ہے اور "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں "دین" سے مراد جزاء و بدلہ ہے اور قیامت کے دن جزاء و بدلہ کا تعلق صرف انسان یا انس و جن دونوں کے ساتھ ہے لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ "عالمین" سے مراد عالم انس و عالم جن ہے اور انہی دو کے گروہ مراد ہیں۔ اور قرآن مجید میں کئی مقامات پر "عالمین" سے یہی معنی مراد لیا گیا ہے (اصناف انسان) مثلاً:

سورہ آل عمران، آیت ۴۲:

☆ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

(اور تجھے (مریمؑ کو) چن لیا عالمین کی عورتوں پر!)

سورۂ فرقان، آیت ۱:

☆ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ۝۱

(تا کہ وہ عالمین کے لیے ڈرانے والا ہو)

سورۂ اعراف، آیت ۸۰:

☆ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۰

(آیا تم ایسی برائی کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے عالمین میں سے کسی نے بھی نہیں کی)

ان تمام آیات مبارکہ میں "عالمین" سے عالم انسان اور اصناف انسان مراد ہے۔

قیامت کے دن کی ملکیت و حاکمیت

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

(یوم جزا کا مالک)

"مالک" کا معنی آپ پہلے جان چکے ہیں اور اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اس کا اشتقاق "ملک" (م کے نیچے زیر کے ساتھ) سے ہے جبکہ "ملک" (جو کہ م پر پیش "مُلک" سے بنا ہے) کا معنی بادشاہ ہے یعنی وہ شخص جو لوگوں کے نظام امور اور ان کی تدبیر و تنظیم کا اختیار رکھتا ہو، ان کا حاکم ہو البتہ کسی چیز کی اصل ملکیت کا اس سے تعلق نہ ہو گویا وہ افراد کا حاکم ہو نہ کہ اشیاء کا مالک (یعنی لوگوں کا مالک نہ ہو بلکہ ان کا حاکم ہو)

اگر چہ "ملک" (مَلِک) اور "مِلک" (مالک) دونوں قرائتوں کی بابت دلائل و وجوہات ذکر کی گئی ہیں لیکن جو اہم نکتہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ دونوں صورتوں (مُلک یا مِلک) ۔۔ مَلِک ۔۔ یا ۔۔ مٰلک ۔۔ میں ملکیت و سلطنت کا حقیقی معنی و مفہوم حقیقی طور پر خداوند عالم کے لیے مخصوص ہے یعنی اگر "مالک" پڑھیں تب بھی یہ معنی ہوگا کہ خدا روز جزا کا مالک ہے (یہ دن اسی کی ملکیت ہے) اور اگر "ملک" پڑھیں تب بھی صحیح ہے اور معنی یہ ہوگا کہ خدا روز جزا کا حاکم ہے۔

ایک اہم نکتہ

مُلک اور مِلک کے درمیان ایک اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ لغت و عرف عام دونوں میں "ملک" (حکومت و اقتدار) کی نسبت وقت و زمانہ کی طرف دی جاتی ہے مثلاً کہا جاتا ہے: مَلِكُ العصرِ الفلاني "فلاں زمانے کا بادشاہ (حاکم)" لیکن یہ نہیں کہا جاتا : مالک العصر الفلاني (فلاں زمانہ کا مالک) اور اگر کہیں "فلاں زمانہ کا مالک" کہا بھی جائے تو اس میں مجازی طور پر معنیٔ مقصود کی تفہیم ملحوظ ہوتی ہے جو کہ عام طور پر ذہنوں کی دسترس سے باہر یا کم از کم ان سے نامانوس طرز عمل ہے چنانچہ زیر نظر آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا : "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ"...... روز جزا کا مالک...... اس میں خدا نے قیامت کے دن کی حکمرانی کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور سورہ غافر آیت ۱۶ میں یوں ارشاد فرمایا : "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" (اس دن کس کی حکومت ہوگی؟ اللہ کی، جو واحد ہے غالب ہے)۔

بنابرایں " مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ " ہی پڑھنا قرین قیاس ہے۔

مترجم : مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں مالک اور ملک کی قرائتوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور جب ملک کی نسبت زمان کی طرف دی جائے تو ملکیت کے بجائے حکومت واقتدار کا معنی موزوں لگتا ہے' اس لحاظ سے یوم جو کہ وقت اور زمان کے باب سے ہے اس کی مناسبت سے "مَلِكِ" پڑھنا زیادہ مناسب و بہتر ہے اور شاید اسی وجہ سے اکثر اہل علم قاریوں نے مَلِكِ ہی پڑھا ہے جیسا کہ ابتدائے بحث میں خود مؤلف نے بھی اسے قاریوں کی اکثریت سے منسوب کیا ہے' بنابرایں صحیح یا بہتر قرائت "ملک" ہی ہے جبکہ "مالک" پڑھنے کے لیے ادبی تکلف سے کام لینا پڑے گا۔

روایات پر ایک نظر

امام رضاؑ کا ارشاد گرامی

کتاب " عیون اخبار الرضاؑ " اور کتاب "معانی الاخبار" میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے "بسم الله" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا : اس سے مراد یہ ہے: "اسم نفسي بسمة من سمات الله وهي العبادة۔ یعنی "بسم الله"۔۔۔ اللہ کے نام سے۔ کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو خدا کی علامات میں سے ایک علامت یعنی عبادت کے ساتھ موسوم (مخصوص) کر رہا ہوں۔

امامؑ سے پوچھا گیا : ما السّمة ؟ "سمۃ" سے کیا مراد ہے ؟

آپؑ نے ارشاد فرمایا : العلامة، اس سے مراد علامت ونشانی ہے۔

(یاد رہے کہ عربی زبان میں "سمة" کا لفظی معنی "داغ" ہے لہٰذا روایت کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا کہ میں اپنے آپ کو خدا کے داغوں میں سے ایک داغ کے ساتھ داغ رہا ہوں' "سمات" یعنی داغوں میں سے وہ نشانیاں جو بندے کے خدا کے ساتھ رابطہ کی علامتیں بنتی ہیں اور "داغنے" کا مطلب یہ ہے کہ لوگ پہچان لیں کہ میں کس کا بندہ ہوں اور عبادت سے بڑھ کر کون سی چیز بندے کی پہچان کا ذریعہ بن سکتی ہے' داغنا ایک لحاظ سے عرفانی درجۂ کمال کے باب سے ہے' م)

مذکورہ بالا معنی درحقیقت اسی معنی سے مأخوذ ہے جو ہم نے "بسم الله" کی ب کے متعلق بیان کیا تھا کہ وہ (ب) ابتداء کا معنی دیتی ہے' چنانچہ جب کوئی بندہ اپنی عبادت کو خدا کے نام کے ساتھ موسوم کرتا ہے تو ضروری ہے کہ اپنی عبادت کی مانند اپنے آپ کو بھی خدا کی علامتوں میں سے کسی علامت کے ساتھ مخصوص کر دے۔

اسم اعظم سے تمثیل

کتاب ''التہذیب'' میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور کتاب ''عیون اخبار الرضاؑ'' اور تفسیر العیاشی میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام سی منقول ہے کہ ''بسم اللہ'' اور خدا کے اسم اعظم کا قرب، آنکھ کی پتلی اور اس کی سفیدی کے قرب سے بھی زیادہ ہے۔(انہا اقرب الی اسم اللہ من ناظر العین الی بیاضہا)

عنقریب اسم اعظم کی بحث کے ضمن میں اس روایت کی مزید وضاحت کی جائے گی۔

آیت بسم اللہ کی جز ئیت کا واضح بیان

کتاب ''عیون اخبار الرضا'' میں حضرت امیر المومنینؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا :

(انہا من الفاتحۃ وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان یقرءہا و یعدہا آیت منہا ویقول:فاتحۃ الکتاب ھی السبع المثانی)

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" سورۂ فاتحہ کا جزئ......حصہ...... ہے اور حضرت پیغمبر اسلامؐ ہمیشہ بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت قرار دے کر اسے پڑھا کرتے تھے اور سورۂ فاتحہ کو ''سبع المثانی'' کے نام سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

اہل سنت والجماعت کی مستند کتب میں بھی اس بات کی تائید ملتی ہے مثلاً دار قطنی نے ابو ہریرہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

(اذا قرأتم الحمد فاقرأوا بسم اللہ الرحمن الرحیم ، فانہا ام القرآن والسبع المثانی،و بسم اللہ الرحمن الرحیم احدی آیاتہا)

'' جب تم سورۂ الحمد پڑھو تو بِسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم ضرور پڑھا کرو کیونکہ سورۂ الحمد ''ام القرآن'' (اصل و اساسِ قرآن) اور ''السبع المثانی'' ...... سات آیات...... ہے اور بِسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم ان سات آیات میں سے ایک ہے۔

عظیم ترین آیت

کتاب خصال میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا :

(ما لھم ؟ قاتلھم اللہ عمدوا الی اعظم آیۃ فی کتاب اللہ فزعموا انہا بدعۃ اذا اظہروھا)

'' ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے خدا انہیں ہلاک کرے، انہوں نے کتاب خدا کی ایک عظیم ترین آیت (بِسم اللہ

الرحمٰنِ الرحیم) کے متعلق یہ کتنا برا گمان کرلیا ہے کہ اس کا بلند آواز سے پڑھنا بدعت ہے۔

ہر کام سے پہلے

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (سرقوا اکرم آیة فی کتاب الله: بسم الله الرحمن الرحیم، وینبغی الاتیان به عند کل امر عظیم او غیر لیبارک فیه)

لوگوں نے کتاب خدا کی باعظمت ترین آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم کو چرالیا ہے جبکہ ضروری ہے کہ ہر کام کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھیں خواہ وہ کام بڑا ہو یا چھوٹا تاکہ اس میں برکت پیدا ہو۔

اس سلسلہ میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول کثیر روایات موجود ہیں اور ان تمام روایات سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ بسم اللہ ہر سورہ کا جزء ہے سوائے سورہ برائت کے اسی طرح اہل سنت والجماعت کی کتب میں بھی متعدد روایات موجود ہیں جن میں بسم اللہ کو ہر سورہ کا جزء قرار دیا گیا ہے چنانچہ کتاب صحیح مسلم میں انس سے مروی ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا:

(انزل علی آنفاً سورة فقرء: بسم الله الرحمن الرحیم)

"ابھی ابھی مجھ پر ایک سورہ نازل ہوا ہے"، اس کے فوراً بعد آنحضرتؐ نے اس نازل شدہ سورہ کی تلاوت شروع کی اور اس کی ابتداء بسم اللہ الرحمن الرحیم سے فرمائی۔

ابن عباس کی روایت

ابوداؤد نے ابن عباس سے روایت کی ہے (اس روایت کو صحیح السند قرار دیا گیا ہے) انہوں نے کہا:

(ان رسول الله (ص) کان لایعرف فصل السورة حتی ینزل علیه: بسم الله الرحمن الرحیم) حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی سورہ کی ابتداء وانتہاء کی تشخیص وتحدید بسم الله الرحمن الرحیم سے کرتے تھے اور نئے سورہ کا آغاز اس وقت معلوم ہوتا تھا جب بسم اللہ الرحمن الرحیم کی آیت نازل ہوتی تھی۔

مذکورہ بالا روایات کی مانند کتب شیعہ میں بھی امام محمد باقر علیہ السلام کے ارشادات موجود ہیں۔

اللہ، رحمان اور رحیم کا مطلب

اصول کافی، التوحید، معانی الاخبار اور تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

(الله اله کل شیء، الرحمن بجمیع خلقه، الرحیم بالمومنین خاصة)

"اللہ" سے مراد، ہر شے کا معبود، رحمان سے مراد، تمام موجودات پر رحم کرنے والا اور رحیم سے مراد، مومنین

سے خاص مہربان ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا جامع ارشاد

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا :

(الرحمن اسم خاص بصفة عامة والرحیم اسم عام بصفة خاصة)

"رحمن" خدا کا خاص نام ہے مگر عام صفت کے ساتھ اور "رحیم" خدا کا عام نام ہے مگر خاص صفت کے ساتھ!

توضیح:

سابق الذکر مطالب و بیانات سے یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ رحمان سے وہ عام رحمت کیوں مراد لی گئی ہے جو مؤمن و کافر دونوں کو حاصل ہوتی ہے اور رحیم سے وہ خاص رحمت کیوں مراد لی گئی ہے جو صرف اہل ایمان سے مختص ہے۔ تاہم اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مذکورہ بالا (امام جعفر صادقؑ سے منقول) حدیث میں "رحمان" کو صفت عام کے ساتھ اسم خاص اور "رحیم" کو صفت خاص کے ساتھ اسم عام کیوں کہا گیا ہے؟، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رحمان (میں رحمت کا تعلق) صرف دنیا سے ہے جو کہ مومن و کافر سب کو حاصل ہے اور رحیم (میں رحمت کا تعلق) دنیا و آخرت دونوں سے ہے لیکن وہ رحمت مخصوص ہے مومنین کے ساتھ۔ (رحمان خدا کا خاص نام ہے لیکن اس میں جو "رحمت" ملحوظ ہے وہ مومن و کافر سب کو دنیا میں حاصل ہوتی ہے جبکہ رحیم خدا کا عام نام ہے لیکن اس میں جو "رحمت" ملحوظ ہے وہ صرف مومنین سے مختص ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ "رحمان" تکوین و تخلیق کے مراحل میں عطا کی جانے والی رحمت کا عکاس ہے جو عالم وجود میں مومن و کافر دونوں کو حاصل ہوتی ہے اور "رحیم" تکوین و تخلیق کے ساتھ ساتھ تشریعی مراحل میں بھی فیضان رحمت کی نشانی ہے جو کہ ہدایت و سعادت کے باب سے ہے وہ صرف مومنین کو حاصل ہوتی ہے اور خداوند عالم نے مومنین کو اپنی خاص رحمت و عنایت سے اس لیے نوازا ہے کہ دوام و ثبات صرف انہی نعمتوں کو حاصل ہوتا ہے جو اہل ایمان کو عطا کی جاتی ہیں اور تقویٰ ہی کامیابی و تابندہ مستقبل کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

کشف الغمہ کی روایت

کتاب کشف الغمہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: ایک دن میرے والد بزرگوار کا خچر گم ہو گیا انہوں نے منت مان لی کہ اگر وہ مجھے واپس مل جائے تو میں خدا کی ایسی حمد بجا لاؤں گا جس سے وہ خوش ہو جائے، تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہ خچر زین اور لگام کے ساتھ ہی واپس لایا گیا، امامؑ اس پر سوار ہوئے اور آسمان کی طرف رخ کر کے کہا: "الحمد للہ" ، اس کے بعد آپؑ خاموش ہو گئے، پھر فرمایا: میں نے خدا کی حمد میں کوئی کسر باقی نہیں

چھوڑی ہے بلکہ ہر قسم کی حمد وستائش کو اس کے لیے مختص کر کے بیان کر دیا ہے اور کوئی حمد ایسی ممکن ہی نہیں جس میں خدا شامل نہ ہو"

الحمدللہ کی تفسیر امام علی کی زبانی

کتاب عیون اخبار الرضا میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ سے "الحمدللہ" کی تفسیر دریافت کی گئی تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(هو ان الله عرف عباده بعض نعمه عليهم جملاً اذلا يقدرون على معرفة جميعها بالتفصيل لانها اكثر من ان تحصى او تعرف. فقال: قولوا الحمد لله على ما انعم به علينا)

(خداوند عالم نے اپنے بندوں کو اپنی صرف چند نعمتوں ہی کی پہچان کروائی ہے کیونکہ لوگ خدا کی تمام نعمتوں کو تفصیل کے ساتھ نہیں پہچان سکتے خدا کی تمام نعمتیں نہ تو شمار کی جا سکتی ہیں اور نہ ہی کوئی انہیں پورے طور پر پہچان سکتا ہے لہٰذا خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ میری نعمتوں کو یاد کر کے صرف یہی کہا کرو "الحمد لله على ما انعم به علينا" یعنی تمام حمد ہے اللہ کے لیے، ان نعمتوں پر جو اس نے ہمیں عطا فرمائیں)۔

امامؑ کے اس ارشاد گرامی میں اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ "الحمدللہ" کے الفاظ خداوند عالم کی طرف سے اپنے بندے کی نیابت میں کہے گئے ہیں تا کہ لوگوں کو آدابِ بندگی کی تعلیم دی جائے اور اظہار عبودیت کا طریقہ بتایا جائے۔

ایک فلسفیانہ بحث

عقلی دلائل سے یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ کسی معلول کا ذاتی استقلال اور اس کے تمام امور، اس کی علت سے وابستہ ہوتے ہیں اور اسے جو بھی کمال حاصل ہو وہ اس کی علت کے وجود کا پرتو..... یا اس کے سایۂ وجود کا اثر...... ہے لہٰذا اگر "حسن و جمال" کو عالم وجود میں کوئی حیثیت حاصل ہے تو اس کا کمال و استقلال واجب الوجود..... ذات اقدس خداوند متعال ..... کی وجہ سے اور اسی کے لیے ہے کیونکہ وہی تمام موجودات کی علت ومحور ہے کہ جس پر تمام علل و اسباب منتہی ہوتے ہیں (ہر علت کا منتہا وہی ہے اور ہر علت کا سلسلۂ وجود بالآخر اسی تک جا پہنچتا ہے) اور حمد وثناء درحقیقت کسی چیز (موجود) کا اپنے وجود کے ذریعے کسی دوسری چیز (موجود) کے کمال کو ظاہر کرنا ہے۔ اس لحاظ سے وہ دوسری چیز (موجد) کہ جس کے کمال کا اظہار ہوا ہے اس (پہلی چیز) کی علت ہو گی اور چونکہ ہر کمال کا منتہا ذات باری تعالیٰ ہے لہٰذا ہر حمد وثنا کی اصل حقیقت کی

بازگشت اسی کی طرف ہوگی اور سب کا سلسلہ اسی تک جا پہنچے گا۔ بنا برایں یہ کہنا بجا اور یقینی طور پر صحیح و برحق ہے کہ "الحمد للہ رب العالمین" ہر حمد اسی کے لیے ہے جو عالمین کا رب ہے۔

عبادت واستعانت کا اختصاص

"اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ"

(ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں)

عبد، عربی زبان میں ہر اس انسان یا کسی ذی شعور کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے کی ملکیت میں ہو البتہ انسان کے علاوہ کسی دوسرے ذی شعور کو اس وقت "عبد" کہہ سکتے ہیں جب "عبد" کے معنی میں انسانی خصوصیات کو دخیل نہ سمجھا جائے اور کہا جائے کہ عبد ہر اس مملوک کو کہتے ہیں جو کسی کی ملکیت میں ہو انسان ہو یا غیر انسان، اس طرح تمام موجودات کو "عبد" کہا جا سکتا ہے جیسا کہ خود خداوند عالم نے ارشاد فرمایا :

سورہ مریم، آیت ۹۳:

★ "اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا"

(نہیں ہے آسمانوں اور زمین میں کوئی، مگر یہ کہ وہ رحمان کی بارگاہ میں آتا ہے عبد بن کر)

لفظ "عبادت"، عبد سے بنایا گیا ہے لہٰذا اس میں وہی معنی پایا جاتا ہے جو "عبد" میں ہے البتہ اس کے اشتقاقات اور استعمالی معانی میں فرق کی وجہ اس کے موارد کا مختلف ہونا ہے مثلاً لغت کے معروف مؤلف جوہری نے اپنی کتاب "الصحاح" میں لکھا ہے کہ عبودیت کی اصل واساس خضوع ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے لفظ کے لغوی معنی ذکر کرنے کی بجائے اس کے متعلقہ امر لازم کو ذکر کر دیا ہے کیونکہ خضوع عبادت وعبودیت کا اصل معنی نہیں بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں اور خضوع عبودیت کا "لازم المعنی" ہے (لازم المعنی کا مطلب یہ ہے کہ خضوع عبادت وعبودیت کے ساتھ اس طرح ملا ہوا کہ کبھی اس کے معنے سے جدا نہیں ہو سکتا) نہ یہ کہ اس کا اصل معنی یہی ہے اور جب عربی گرائمر اور علم نحو کے اصول و قواعد کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "خضوع" لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے (یعنی اس کے متعلق کے ساتھ لام کا ذکر کرنا ضروری ہے) جبکہ عبادت کے لفظ کے ساتھ لام کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود اپنے معنے دیتا ہے اور اپنے ہی ساتھ متعدی ہو کر آتا ہے (مثلاً کہا جاتا ہے "حسن خضع لعلی" حسن نے علی کے لیے خضوع کیا، اس میں خضوع کے لیے علی پر لام لگایا گیا ہے جبکہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) میں لام کی ضرورت نہیں)۔

بہر حال عبادت کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ عبد اپنے آپ کو اپنے پروردگار کی بندگی میں قرار دے اور اس کے حضور غلامی کے تمام تقاضے پورے کرتا ہوا اپنے آپ کو اپنے رب کا مملوک ظاہر و ثابت کرے یہی وجہ ہے کہ عبادت و بندگی تکبر و بڑائی سے کبھی ہم آہنگ وہمرنگ نہیں ہو سکتی بلکہ غرور و نخوت سے کوسوں دور ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جو عجز وانکساری کا درجہ

تکمال ہے البتہ مفہوم کی وسعت کے حوالہ سے اس میں شرک واشتراک کی گنجائش پائی جاتی ہے لہٰذا یہ ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ افراد کسی کی ملکیت میں ہوں اور اس کے عبد و بندے کہلائیں چنانچہ ارشاد خداوندی ہے :

سورہ غافر، آیت ۶۰:

★ ''اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ''

(وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر و سرتابی کرتے ہیں بہت جلد ذلت و خواری کے ساتھ جہنم میں جائیں گے)

اور ارشاد فرمایا :

سورہ کہف، آیت ۱۱۰:

★ ''وَّلَا یُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا''

(اور شریک نہ کرے اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو)

پہلی آیت (سورہ غافر، ۶۰) میں تکبر و سرتابی کا ذکر ہوا جو کہ شائستہ مقامِ بندگی نہیں اور عبادت میں تکبر و سرتابی کا انجام آتش دوزخ قرار دیا گیا ہے جبکہ دوسری آیت (سورہ کہف، آیت ۱۱۰) میں خداوند عالم نے اپنی عبادت میں کسی کو شریک کرنے کی نہی فرمائی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک ممکن امر ہے لہٰذا اس سے روکنا ضروری تھا اور یہ بات واضح ہے کہ کسی کام سے روکنا تبھی درست ہوتا ہے جب وہ کام دائرۂ امکان میں ہو اور اسے انجام دینا مقدور بھی ہو بنا بر ایں چونکہ تکبر حقیقی عبادت و بندگی کے مفہوم میں آ ہی نہیں سکتا اور ان دونوں (عبادت اور تکبر) کا آپس میں کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا اس لیے اسے علیحدہ ذکر کر کے اس سے نہی کی ضرورت ہی نہیں۔

ایک اہم نکتہ

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ عبودیت و بندگی غلام اور آقا کے درمیان انہی چیزوں میں ممکن ہوتی ہے جو آقا کی ملکیت میں ہوں یعنی مولا اپنے غلام ...... عبد ...... کی جن چیزوں کا مالک بن سکتا ہے اس کی بندگی صرف انہی تک محدود رہے گی لیکن جن چیزوں سے اس کی ملکیت کا تعلق ہی نہ ہو اور وہ اس کے دائرۂ کار و اختیار سے باہر ہوں تو ان میں عبادت و بندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مثلاً عبد کے ذاتی اوصاف و خصوصیات جیسے کسی کا فرزند ہونا یا قد کی لمبائی وغیرہ تو ایسے امور میں مولا کو کسی قسم کی قدرت و اختیار حاصل ہی نہیں اور یہ تمام چیزیں اس کے دائرۂ اختیار سے خارج ہیں لہٰذا ان میں عبادت و عبودیت کا تصور ہی ممکن نہیں البتہ یہ سب کچھ عام لوگوں کی بابت ہے لیکن جب ملکیت کا تصور اور نسبت خدا اور خلق کے درمیان ہو اور یہ دیکھا جائے کہ خدا کن کن چیزوں میں اپنے بندوں کا مالک ہے تو اس سلسلے میں یہ بحث ہی نہیں آتی کہ وہ کن چیزوں میں مالک ہے اور کن چیزوں میں اس کی ملکیت نہیں کیونکہ خداوند عالم کی ملکیت علی الاطلاق ہے یعنی ہر قسم کی محدودیت سے بالاتر ہے اور یہ تصور سرے ہی سے غلط ہے کہ کوئی بندہ اپنی کچھ چیزوں میں تو خدا کا مملوک ہے اور کچھ چیزوں میں نہیں یا یہ کہ اس کے چند

امور میں خدا کو تصرف و اختیار حاصل ہے اور چند دیگر امور میں یہ حق اسے حاصل نہیں۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے ہم اپنے غلاموں کے بعض امور میں مالک ہوتے ہیں اور بعض امور میں مالک نہیں ہوتے مثلاً ان کے وہ کام جو ان کے ارادہ و اختیار میں ہیں۔ (افعالِ اختیاری) ان میں ہم مالک کے طور پر انہیں حکم دے سکتے ہیں لیکن ان کے وہ امور جو خود ان کے اپنے اختیار سے بھی باہر ہوتے ہیں جیسے ذاتی خصوصیات (اوصافِ غیر اختیاری) وغیرہ' تو ان میں ہماری ملکیت اور سلطنت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ حقیقت میں ان سے ''ملکیت'' کا تعلق ہی قائم نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ امور جن میں ہم اس (عبد و غلام) پر مالکانہ احکامات جاری کرتے ہیں ان میں سے بھی کچھ ایسے ہیں جن میں ہمارا عمل دخل روا ہوتا ہے اور ہم ان کی بابت فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں اور کچھ امور ایسے ہیں جن کی بابت ہم کوئی فیصلہ کرنے کا حق و اختیار نہیں رکھتے مثلاً کسی کو ناجائز قتل کر دینا' اگرچہ یہ کام اس...... غلام...... کے افعالِ اختیاری میں سے ہے لیکن ہم اسے ایسا کرنے کا حکم نہیں دے سکتے اور اس کا یہ عمل اور اختیاری فعل ہماری ملکیت کی حدود سے خارج ہے۔ البتہ خداوند عالم کسی محدودیت اور تقیید کے بغیر ہمارا مالک ہے اور پوری کائنات اس کی مطلق اور لامحدود ملکیت کے دائرے میں آتی ہے' نہ تو اس کی ملکیت کی حدود معین کی جا سکتی ہیں اور نہ اس کی وسعتوں کے لیے کوئی شرط رکھی جا سکتی ہے بلکہ ہر قسم کی شروط و قیود سے بالاتر اس کی ملکیت ہر چیز پر حاوی و محیط ہے' لہٰذا خدا اور بندے کے درمیان ملکیت و عبودیت کا عالم یہ ہے کہ پروردگار کی ربوبیت ہر چیز کی علی الاطلاق ملکیت کے ساتھ ہے اور بندے کی عبدیت و بندگی کا حصر اس میں ہے کہ وہ علی الاطلاق اس کا عبد اور مملوک ہے' پس رب سے مراد یہ ہوا کہ وہ جو ہر چیز کا مالک ہے اور عبد سے مراد یہ ہے کہ وہ جو ہر لحاظ سے مملوک ہے' اور یہی وہ نکتہ ہے جو '' ایاک نعبد '' میں پوشیدہ ہے'۔ اگر ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تب بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ '' اِیَّاکَ نَعْبُدُ '' ...... ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں...... کے جملے میں مفعول پہلے ذکر کیا گیا ہے اور فاعل کا ذکر بعد میں ہوا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ''عبادت'' مشروط یا محدود و مقیّد نہیں بلکہ مطلق اور عام ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر لحاظ سے تیرے بندے ہیں' دوسرے لفظوں میں یہ کہ بس تو ہی ہمارا معبود و مالک ہے اور بس ہم تیرے ہی عبد و مملوک ہیں' اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ مطلب بھی واضح ہو گیا کہ ملکیت کا دار و مدار مالک ہی پر ہوتا ہے (ملکیت کا وجود مالک کے وجود پر منحصر ہے) لہٰذا یہ ہرگز ممکن نہیں کہ ملکیت بغیر مالک کے پائی جائے' نہ مالک ملکیت سے جدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی ملکیت مالک کے بغیر قابل تصور ہے۔ بلکہ جہاں ملکیت وہاں مالک اور جہاں مالک وہاں ملکیت' دونوں کے درمیان کوئی حجاب اور مانع موجود نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب آپ زید کے گھر کو دیکھیں تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ آپ کی توجہ صرف اس گھر پر ہو اور آپ اس کے مالک کے متعلق کچھ بھی نہ سوچیں۔ تو اس صورت میں مالک کا تصور پیدا نہ ہو گا' دوسری صورت یہ کہ آپ اس گھر کو اس تصور کے ساتھ دیکھیں کہ یہ زید کا گھر ہے اور اسی کی ملکیت میں ہے تو اس صورت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ ملکیت کو مالک سے الگ تصور میں لا سکیں بلکہ گھر کو دیکھتے ہی اس کے مالک کا تصور ذہن میں آ جائے گا۔ اور آپ اس امر سے

آ گاہ ہو چکے ہیں کہ پوری کائنات خدا کی ملکیت ہے' اس کے بغیر کائنات کی کوئی وجودی حیثیت و شخصیت ہی نہیں' یہی اس کی حقیقت ہے اور یہی اس کی اصل واساس ہے' لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز خدا سے مخفی و پوشیدہ نہیں اور نہ ہی کائنات میں کوئی ایسی شے ہو سکتی ہے جسے دیکھ کر خدا کا تصور نہ آئے' بلکہ ہر چیز سے خدا کے وجود کی نشاندہی ہوتی ہے اور وہ ہر چیز کے ساتھ اور اس پر ناظر ہے چنانچہ اس کا ارشاد گرامی ہے :

سورہ حم السجدہ، آیات ۵۳، ۵۴:

"اَوَلَمۡ یَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ﴿۵۳﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ فِیۡ مِرۡیَةٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ ؕ اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ"

(کیا یہ کافی نہیں کہ تیرا پروردگار ہر چیز پر ناظر اور قابو رکھنے والا ہے' یاد رکھو کہ یہ لوگ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہونے سے شک میں پڑے ہوئے ہیں' یقیناً وہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے)۔

لہٰذا خدا کی حقیقی عبادت اس طرح ممکن ہے کہ دونوں جانب سے "حضور" و دیدار پایا جائے' یعنی عبد اور معبود دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا اور مخلوق کیونکر ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے قرار پا سکتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے روبرو اور سامنے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ اس کی عبادت بجالائے تو یہ تصور کر کے بجالائے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میرے سامنے ہے' یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ابتدائی جملوں میں مخاطب کی بجائے غائب کا لب ولہجہ استعمال کیا گیا اور جب عبادت و پرستش کی بات آئی تو فوراً مخاطب کا انداز اختیار کرتے ہوئے اس طرح کہا گیا "اِیَّاكَ نَعۡبُدُ" ... تیری ہی عبادت کرتے ہیں..... تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ عبادت کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اسے حاضر و ناظر تصور کر کے اس کی پرستش کی جائے' اور یہی معنی ہے خدا کے دیکھنے اور آمنے سامنے ہونے کا' اور بندے کے آمنے سامنے قرار پانے کا مقصد یہ ہے کہ بندہ اس طرح عبادت بجالائے جیسے ایک غلام اپنے آقا کے حضور ادب واحترام اور خضوع وانکساری کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرا آقا مجھے دیکھ رہا ہے' لہٰذا ایک عبد کی عبادت بھی ایسی ہونی چاہیے کہ ایک لحہ بھی اپنے پروردگار سے غافل نہ ہونے پائے ورنہ اس کی عبادت ظاہری ہوگی نہ کہ حقیقی......اور ایسی ہوگی جیسے کوئی لفظ بغیر معنی کے اور ایک بدن بغیر روح کہ جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی' یا پھر یہ کہ وہ اپنی عبادت میں خدا کے ساتھ کسی کا تصور بھی ذہن میں لائے گا جس سے اس کی فکر دو جانب مشغول ہو جائے گی تو اس صورت میں وہ یا تو ظاہر و باطن دونوں حالتوں میں خدا اور غیر خدا کا تصور کر کے عبادت کرنے والا ہوگا جیسے بت پرست، اللہ اور بت دونوں کی عبادت ایک ساتھ کرتے ہیں یا صرف باطن میں خدا اور غیر خدا کی عبادت کرے گا لیکن ظاہر میں یکتا پرست' موحد کہلائے گا تو اس صورت میں اس کی عبادت کسی خاص غرض اور مخصوص مقصد سے وابستہ ہو کر رہ جائے گی' جیسے کوئی شخص بظاہر تو خدا کی عبادت کرتا ہے مگر باطن میں کسی دوسرے کو دکھانا مقصود ہوتا ہے' یا صرف "اللہ" کی عبادت کرتا ہے مگر جنت کے طمع ولالچ میں یا جہنم کے خوف

سے' تو یہ تمام صورتیں شرک کی ہیں جو کہ عبادت میں پایا جاتا ہے اور اس سے نہایت سختی و تاکید کے ساتھ منع کیا گیا ہے چنانچہ عبادت میں اخلاص برتنے کی بابت ارشاد الٰہی ہے :

سورہ زمر، آیت ۲:

★ " فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ "

(پس تو عبادت کر اللہ کی، خالص و مخلص ہو کر)

اور اسی طرح خدا نے ارشاد فرمایا :

سورہ زمر، آیت ۳:

★ " اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ "

(یادرکھو کہ خالص دین.... عبادت..... خدا کے لیے ہے' اور جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے (کئی) اولیاء بنا لیے (اور کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ یہ خدا کی بارگاہ میں ہمارا تقرب بڑھا دیں گے' یقیناً خدا ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس امر کی بابت جس میں وہ جھگڑا اور اختلاف کرتے ہیں)

پس حقیقی عبادت اسی صورت میں ہوگی جب بندہ اسے خلوص و اخلاص کے ساتھ بجالائے' اور خلوص سے مراد حضور اور آمنے سامنے قرار پانے کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جس کا تذکرہ پہلے ہم کر چکے ہیں۔ اور اس بیان سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ حقیقی معنی میں عبادت اسی صورت میں متحقق ہوگی جب عبادت کرنے والا اپنے عمل میں خدا کے سوا کسی کا تصور ہی نہ کرے' ورنہ ایسا ہوگا جیسے اس نے خدا کی عبادت میں شرک کر لیا ہو اور یہی صورت حال اس وقت ہوگی جب کوئی شخص عبادت کرتے وقت اپنے دل میں کوئی امید و آرزو یا خوف و ڈر پیدا کر لے تو اس صورت میں بھی اس کی عبادت خدا کی رضا کے لیے نہیں بلکہ اپنے مطلوب کے حصول کے لیے ہوگی جیسے جنت کا لالچ یا جہنم کا خوف وغیرہ۔

ان تمام امور کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ عبد، مقام عبادت میں اپنے آپ کو بھول کر صرف خدا کی یاد میں مشغول ہو ورنہ اس کا عمل مقام بندگی کے منافی ہوگا کیونکہ بندگی میں "انانیت و تکبر" کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "اعبد" .صیغہ واحد متکلم..... (میں عبادت کرتا ہوں) کی بجائے "نَعْبُدُ"..... صیغہ جمع متکلم ..... (ہم عبادت کرتے ہیں) ذکر کیا گیا ہے' اور یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ "میں" کے لفظ سے انانیت کا احساس بیدار ہوتا ہے لیکن "ہم" کے لفظ میں فرد واحد گم ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ اس میں کسی ایک کا فردی تشخص و تعین ختم ہو جاتا ہے اور انانیت و فردیت کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ جاتی ہیں لیکن جماعت اور گروہ میں داخل ہونے اور عام لوگوں کے زمرے میں آ جانے سے کسی فرد واحد کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہوتا بلکہ جماعت و گروہ میں شامل ہو جانے سے اس کے ذاتی تعین اور فردی تشخص کے تمام آثار محو

ہوجاتے ہیں اور اسی سے عبادت کے اخلاص کی ضمانت ملتی ہے۔ (کیونکہ اجتماعی حیثیت ہر لحاظ سے فردی حیثیت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کی حامل ہے)۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ امر واضح ہوگیا کہ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' اظہار بندگی کے لیے ایسا پاکیزہ جملہ ہے جس میں نہ تو معنے کے لحاظ سے کوئی نقص پایا جاتا ہے اور نہ ہی اخلاص کے لحاظ سے کوئی کمی پائی جاتی ہے' البتہ صرف ایک لحاظ سے اس میں کمی پائی جاتی ہے جو ''اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کے ذریعے پوری کردی گئی ہے' اور وہ یہ کہ اس میں عبادت کی نسبت خود عبد کی طرف ہے (ہم عبادت کرتے ہیں) جس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ کہنے والا اپنے وجود' قدرت اور اختیار میں اپنی مستقل حیثیت کا دعویدار ہے جبکہ وہ ایک بندہ، غلام اور مملوک ہے جو خود کسی چیز اور اپنے کسی عمل کا مالک نہیں بن سکتا لہٰذا ''ایاک نستعین'' کے ذریعے اس کمی کو پورا کردیا گیا ہے اور اس کی تلافی وتدارک اس طرح پر ہوا کہ گویا ہم کہتے ہیں: اے پروردگار! ہم عبادت کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں اور خود ہی اُسے انجام دیتے ہیں لیکن تجھ سے مدد طلب کرتے ہوئے ایسا کرتے ہیں نہ یہ کہ اپنی کسی مستقل حیثیت کے دعویدار بن کر...... اور نہ ہی تیرے سوا اپنے لیے کسی خاص مقام ومنزلت کا تصور کرتے ہوئے......!

بنابرایں کسی عبد کا ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کہنا درحقیقت صرف ایک مقصد کا ترجمان ہے اور وہ ہے خالصانہ ومخلصانہ عبادت' کہ جس میں ریاء' شرک اور تکبر کا ذرا بھر دخل نہیں۔ شاید اسی وجہ سے عبادت واستعانت کو یکجا ذکر کیا گیا اور یوں کہا گیا ہے : ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' یعنی پہلے عبادت کا تذکرہ ہے اور پھر استعانت کا ذکر ہے' اور اگر اس کی بجائے یوں کہہ دیا جاتا: ''ایاك نعبد اعنا واهدنا الصراط'' یعنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں' تو ہماری مدد فرما اور ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت فرما۔ تو یقیناً اس میں وہ عجز وانکساری نہ ہوتی جو ''اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' میں موجود ہے اور دونوں کے درمیان پائی جانے والی معنوی لطافت بھی ختم ہوکر رہ جاتی۔ اس لیے ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' کے بعد ''اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کہا تاکہ عبادت واستعانت کے امتزاج کی روحانی عظمت نمایاں ہوتی رہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر جملوں کی ترتیب میں پائے جانے والے پاکیزہ مفہوم کا لحاظ ہی مقصود تھا تو ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' میں اسے کیوں نظرانداز کردیا گیا جبکہ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کے بعد **''ایاک نستهدی الی صراط مستقیم''** کہنا چاہیے تھا تاکہ لفظ ومعنے کی ہم آہنگی باقی رہ جائے۔

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ جملہ کی تبدیلی میں ایک نہایت اہم وجہ پائی جاتی ہے جس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔

چھ اہم مطالب

''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا جاچکا ہے اس میں سے اہم مطالب کی اجمالی

فہرست یوں ہے:

(۱)۔ غائب کے صیغوں کی بجائے مخاطب کا لب ولہجہ اختیار کر کے عبد و معبود کے درمیان حضوری رابطے کی نشاندہی کی گئی (ایاہ کے بجائے اِیَّاکَ کہہ کر مخاطب اور آمنے سامنے ہونے کے تصور کی بنیاد قائم کی گئی ہے)

(۲)۔ ''اِیَّاکَ'' کو نَعۡبُدُ اور نَسۡتَعِیۡنُ سے پہلے ذکر کر کے عبادت و استعانت کے حصر کی وضاحت کر دی گئی (مفعول کو فاعل پر مقدم کرنے میں حصر کے معنی کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے)

(۳)۔ ''نَعۡبُدُ'' میں عبادت کو مطلق ذکر کیا گیا تاکہ عبادت میں ہر قسم کی محدودیت و تقید کا تصور ختم ہو جائے اور کمال بندگی کی وسعتوں کی روحانی و معنوی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کا جذبہ قائم رہے۔

(۴)۔ واحد متکلم کے صیغہ ''اعبدُ'' کی بجائے جمع متکلم کا صیغہ ''نَعۡبُدُ'' ذکر کر کے فرد کے احساس فردیت وانفرادیت کو شعور اجتماعیت کی پاکیزہ غذا فراہم کی گئی ہے۔

(۵)۔ ''نَعۡبُدُ'' کے فوراً بعد'' نَسۡتَعِیۡنُ'' کہہ کر عبادت و استعانت کے امتزاج کی اصل حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

(۶)۔ ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ'' اور'' اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ'' کے دونوں جملوں میں ایک ہی انداز تکلم اختیار کیا گیا ہے تاکہ اظہار بندگی اور طلب مدد کی حکمت ہمیشہ ملحوظ رہے' اور عبد کی معبود کے سامنے عاجزی و ناتوانی کسی بھی سبب سے فراموش نہ ہو سکے' ان دو جملوں کے بعد اھدنا الصراط المستقیم میں انداز کلام کی تبدیلی بھی ایک خاص امر کی عکاسی کرتی ہے۔

مذکورہ بالا تمام مطالب اور ان کے اسباب و وجوہات کے بارے میں وضاحت کر دی گئی ہے' البتہ مفسرین کرام نے اس سلسلے میں دیگر مطالب بھی ذکر کئے ہیں لہٰذا جو شخص ان ارباب فکر کے نظریات سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہو وہ ان کی کتب کا مطالعہ کر کے ان سے مطلع ہو سکتا ہے' تاہم حقیقت الامر یہ ہے کہ کلام الٰہی کی بابت جتنا کچھ بیان کیا جائے کم ہے اور حق تو یہ ہے کہ ہم خدا کے کلام کا پورا حق ادا نہیں کر سکتے اور اس کا یہ حق ہمیشہ ہمارے ذمہ باقی رہتا ہے۔

آیات ۶، ۷

○ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۶)

○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۷)

○ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ

ترجمہ

○ تو ہمیں ہدایت فرما سیدھے راستے کی' (۶)

○ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا' ' (۷)

نہ ان پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی وہ جو کہ گمراہ ہیں۔'

تفسیر و بیان

سیدھے راستہ کی ہدایت کے حصول کی دعا

"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ..."

(ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت فرما، ان کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔)

"اِهْدِنَا"... تو ہمیں ہدایت فرما... اس میں ہدایت کا تذکرہ ہوا ہے۔ "صراط" کی بحث میں اس کا معنی واضح ہو جائے گا۔

"صراط"...... عربی زبان میں طریق، سبیل اور صراط تقریباً ایک جیسا معنی دیتے ہیں یعنی راستہ۔

خداوند عالم نے صراط (راستہ) کو مستقیم کی صفت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس کے بعد اس راستہ کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ وہ ایسا راستہ ہے جس پر وہ لوگ گامزن ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں نازل فرمائی ہیں اور انہیں خصوصی انعامات سے نوازا ہے، پس وہ راستہ جو ان عظمتوں کا حامل ہے اس کی ہدایت طلب کی گئی ہے، گویا اسے عبادت کا مقصد و مقصود اعلیٰ قرار دیا گیا ہے یعنی بندہ اپنے پروردگار سے یہ چاہتا ہے کہ اس کی خالصانہ و مخلصانہ عبادت اس راستہ میں واقع ہو جو مستقیم (سیدھا) ہے اور اس پر وہی ہستیاں چلتی ہیں جنہیں خصوصی انعام سے نوازا گیا ہے (منعم علیہم)۔

تشریح:

خداوند عالم نے اپنے کلام میں بنی نوع انسان بلکہ پوری کائنات کے لیے ایک ایسے راستہ کی نشاندہی کی ہے جس پر چل کر وہ ذات باری تعالیٰ کی طرف آتے ہیں چنانچہ انسان کی بابت خاص طور پر یوں ارشاد ہوا :

سورہ انشقاق، آیت ۶:

"يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ"

(اے انسان تو اپنے رب کی طرف آنے کی کوشش کرتا ہے تو یقیناً تو اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگا اور خدا تک پہنچ

جائے گا)۔

اور عام مخلوق کی بابت ارشاد فرمایا :

سورۂ تغابن، آیت ۳:

"وَ اِلَیۡهِ الۡمَصِیۡرُ"

(اور اسی کی طرف بازگشت ہے)

ایک مقام پر یوں ارشاد ارشاد فرمایا :

سورۂ شوریٰ، آیت ۵۳:

"اَلَاۤ اِلَی اللّٰهِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ"

(یاد رکھو تمام امور کی بازگشت خدا کی طرف ہے)

اس طرح کی دیگر متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں سب افراد کسی راستہ پر چل کر اپنا سفر حیات طے کرتے ہیں لیکن سب کا منتہا اور آخری منزل ذات باری تعالیٰ ہی ہے جس کی طرف پوری کائنات رواں دواں ہے۔

زیر بحث آیت میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ "راستہ" صرف ایک نہیں اور نہ ہی صرف ایک خصوصیت کا حامل ہے بلکہ حقیقت میں دو راستے ہیں جن پر پوری کائنات چلتی ہے: ایک خدا کا راستہ اور ایک شیطان کا راستہ' چنانچہ اسی امر کے بیان میں ارشاد ہوا :

سورۂ یٰس، آیت ۶۱:

★ "اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ۙ﴿۶۰﴾ وَّ اَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۱﴾"

(کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں لے لیا اے اولاد آدم! کہ تم شیطان کی پوجا نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا بہت بڑا دشمن ہے اور تم صرف میری عبادت کرنا کہ یہی "صراط مستقیم" (سیدھا راستہ) ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ " صراط مستقیم " کے علاوہ ایک راستہ اور بھی ہے جو "مستقیم" نہیں۔ گویا دو راستے ہیں: ایک مستقیم ہے اور دوسرا مستقیم نہیں ہے چنانچہ اس مطلب کے بیان میں مخصوص انداز اور نہایت ظریفانہ طور پر دعا اور ایمان و اطاعت کے حوالہ سے اس طرح ارشاد الٰہی ہوا :

سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۶:

★ "فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَ لۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّهُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾"

(میں پاس ہی ہوں' اور جب کوئی مجھ سے دعا مانگتا ہے تو میں ہر دعا کرنے والے کی دعا سنتا ہوں (اور قبول کرتا ہوں) پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا کہا بھی مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ سیدھی راہ پر آ جائیں (ہدایت پالیں)

اور دعا کے حوالہ ہی سے اس طرح ارشاد فرمایا : سورہء غافر، آیت ۶۰:

★ "اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ" ۔

(تم مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے تکبر و سرتابی کرتے ہیں وہ بہت جلد ذلت کے ساتھ جہنم میں جائیں گے)

اس آیت میں خداوند عالم نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ اپنے بندوں سے قریب ہے اور اس کی طرف آنے کا نزدیک ترین راستہ یہ ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس سے دعا مانگی جائے۔

اس کے بعد خداوند عالم نے ان لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جو ایمان نہیں لاتے چنانچہ ان کے بارے میں اس طرح ارشاد فرمایا:

سورہء حم سجدہ، آیت ۴۴:

★ " اُولٰٓىِٕكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ "

(ان لوگوں کو بہت دور جگہ سے بلایا جائے گا)

اس آیت سی معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے وہ اصل راستے سے دور ہو جاتے ہیں اور ان کا سفر طویل تر ہو جاتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ خدا تک پہنچنے کے دو راستے ہیں: ایک نزدیک راستہ اور وہ اہل ایمان کا راستہ ہے' اور دوسرا دور راستہ اور وہ ان لوگوں کا راستہ ہے جو مؤمن نہیں ہیں۔

یہ ہے خدا تک پہنچنے کے راستوں کا فرق' اس کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ ایک راستہ بلندی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا پستی کی طرف' جو راستہ بلندی کی طرف جاتا ہے اس کے متعلق اشاراتی تذکرہ کرتے ہوئے اس کے مقابل روش اپنانے والوں کے انجام کار کے حوالہ سے اس طرح ارشاد الٰہی ہوا :

سورہء اعراف، آیت ۴۰:

★ " اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ "

(وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان کی بابت تکبر کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جو بلندی کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور ان کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ورنہ آسمان کے دروازوں کا ذکر کرنا بے معنی ہوتا جبکہ کلام الٰہی کا بے معنی ہونا قابل تصور ہی نہیں' لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ایک ایسا راستہ بھی ہے جو پستی سے بلندی کی طرف جاتا ہے۔

اور دوسرا وہ راستہ جو بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے اس کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ طہٰ، آیت ۸۱:

★ "وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى"

(اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ گویا پستی میں گر گیا)

"هوٰى" سے مراد، بلندی سے پستی کی طرف گرنا ہے۔

مذکورہ بالا راستوں کے علاوہ ایک اور راستہ بھی ہے جو کہ تباہی و بربادی کی طرف لے جاتا ہے اس کے متعلق خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا:

سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۸:

"وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ"

(اور جو شخص ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرلے گویا وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا)

اس آیت میں سیدھے راستہ سے بھٹک جانے کو "شرک" کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب میں اچھی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ راستوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے لوگ تین قسموں میں منقسم ہو گئے:

(۱)۔ وہ لوگ جو بلندی کی طرف سفر کرتے ہیں اور وہ وہی ہیں جو آیات الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کی عبادت سے تکبر و سرتابی نہیں کرتے۔ (الذین یومنون بآیات الله ولا یستکبرون عن عبادته)

(۲)۔ وہ لوگ جو پستی میں گرتے ہیں، اور وہ وہی ہیں جن پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔ (الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ)

(۳)۔ وہ لوگ جو سیدھے راستہ سے بھٹک گئے اور گمراہ ہو گئے۔ (الضَّآلِّيْنَ)

بظاہر انہی تین گروہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

★ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ"

یعنی (۱) "منعم علیھم"، ۔۔جن پر انعام کیا گیا۔۔(۲) "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ"، جن پر غضب نازل ہوا۔۔(۳) "الضَّآلِّيْنَ"، ۔۔جو گمراہ ہیں۔۔،

یہاں "صراط مستقیم" سے مذکورہ بالا تین راستوں میں سے نہ دوسرا راستہ مراد ہے اور نہ ہی تیسرا، بلکہ پہلا راستہ مراد ہے، یعنی نہ تو ان لوگوں کا راستہ مراد ہے جن پر خدا کا قہر و غضب نازل ہوا اور وہ "مغضوب علیھم" ہیں اور نہ ہی ان لوگوں کا راستہ مقصود ہے جو راستہ سے بھٹک گئے یعنی "ضالین" ہیں لہٰذا صرف پہلا راستہ ہی مقصود ہے جو ان مومنین کا راستہ ہے جو اللہ کی عبادت میں تکبر و سرتابی نہیں کرتے، البتہ تمام اہل ایمان کا راستہ ایک جیسا نہیں بلکہ اس میں بھی کئی قسمیں اور جہتیں ہیں، چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورۂ مجادلہ، آیت ۱۱:

★ "يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ"

(بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اللہ، تم میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور صاحبان علم کو کئی درجے عطا کرتا ہے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد جو راستہ اختیار کیا جائے اس کے کئی درجے ہیں اور ہر ایک درجے کا الگ مقام و مرتبہ ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ہر گمراہی شرک ہے اور ہر شرک گمراہی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۸:

★ "وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ"

(اور جو شخص ایمان کو کفر سے بدل دے وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا)

اسی مطلب کو سورۂ یس، آیت ۶۲ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

★ "اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا"

(یہ کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا، وہ یقیناً تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اور یہ کہ تم صرف میری عبادت کرنا، یہی صراط مستقیم (سیدھی راہ) ہے، اور (اس کے باوجود) اس (شیطان) نے تم میں سے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا)

قرآن مجید میں "شرک" کو ظلم اور "ظلم" کو شرک کا نام دیا گیا ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے سورہ ابراہیم آیت ۲۲ میں شیطان کا وہ قول ذکر کیا جو وہ قیامت کے دن کہے گا:

★ "اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ"

(میں اس سے پہلے ہی بیزار ہوں۔۔ کفر اور انکار کیا ہے۔۔ کہ تم نے مجھے (خدا کا) شریک بنایا، یقیناً جو لوگ ظالم ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے)۔

اس آیت میں شرک کو "ظلم" کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور سورہ انعام آیت ۸۲ میں ظلم (شرک) کو گمراہی و ضلالت سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

★ "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ"

(جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم کا لباس نہ پہنایا (شرک سے آلودہ نہ کیا) انہی کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)

مذکورہ بالا آیات کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ہدایت کی منزل کا حصول اور گمراہی یا اس کے تباہ

کن آثار سے بچنے کا واحد راستہ ظلم سے دوری اختیار کرنا اور شمع ایمان کی نورانی ضیاء سے کائنات دل کو منور کر دینا ہے۔

بہر حال ضلالت و گمراہی اور شرک و ظلم اگرچہ معنی و مفہوم کے لحاظ سے جدا جدا ہیں لیکن سب کا مصداق ایک ہے یعنی اگر ان میں سے کوئی ایک بھی پایا جائے تو دوسرا لازمی طور پر پایا جائے گا' گویا مصداق میں ان کی حیثیت لازم و ملزوم جیسی ہو جاتی ہے' اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ ان تینوں میں سے ہر ایک، دوسرے کی پہچان کرواتا ہے یا یہ کہ دوسرے کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے تو اس سے مراد یہی ہے کہ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا مفہوم مستقل ہے لیکن مصداق میں سب یکجا ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارا سروکار اور تعلق مصداق سے ہے' مفہوم سے نہیں۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ صراط مستقیم جو کہ ان لوگوں کا راستہ ہے جو گمراہ نہیں اس میں نہ تو شرک کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی ظلم کا تصور' بلکہ ظلم و شرک اس میں اسی طرح مفقود ہیں جیسے ضلالت و گمراہی' لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ "صراط مستقیم" میں گمراہی کا کوئی پہلو قابل تصور ہی نہیں' نہ ظاہری طور پر اور نہ باطنی طور پر' باطنی طور پر گمراہی کے ناقابل تصور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں کفر یا کسی ایسے خیال باطل کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی جو خداوند عالم کی رضا و خوشنودی کے منافی ہو' اور عالم ظاہر میں گمراہی کے فقدان سے مراد یہ ہے کہ اعضاء و جوارح میں گناہ کے ارتکاب یا اطاعت و فرمانبرداری میں کوتاہی کا خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی نہ تو دل میں کفر کا خیال آتا ہے اور نہ ہی ظاہری طور پر گناہ کے ارتکاب کا رجحان پیدا ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ توحید کی عظمتوں کی پاسداری اور اس کے تقاضوں کی علمی و عملی تکمیل بھی اسی کا نام ہے کیونکہ کوئی تیسری شق موجود ہی نہیں۔ بلکہ حق کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ گمراہی و ضلالت ہے اور اس کے علاوہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا' انہی مطالب کو سورہ انعام آیت ۸۲ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ"

(جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کا لباس نہ پہنایا پس انہی کے لیے امن و امان ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)

اس آیت میں امن و امان کی یقینی صورت کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ مکمل ہدایت کا وعدہ کیا گیا ہے لیکن ان دونوں...... امن و ہدایت...... کا دارومدار خالص ایمان پر اور پھر ظلم سے دوری پر ہے۔

ایک ادبی نکتہ

اس مقام پر ایک ادبی نکتہ کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ بقول بعض اہل ادب چونکہ اسم فاعل' حقیقت میں مستقبل کا معنی دیتا ہے یعنی جس کام کے زمانۂ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے کی خبر دینا مقصود ہو اس کے لیے فاعل کا صیغہ لایا جاتا ہے لہٰذا اس آیت میں حقیقی ہدایت کے حصول کو "وعدہ" کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا اور کہا گیا ہے "لھم الامن وھم مھتدون" (انہی کے لیے ہی امان ہے اور وہی ہدایت والے ہیں)

یاد رہے کہ یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ "صراط مستقیم" کی صفات میں سے صرف ایک صفت کی وضاحت ہے۔

منعم علیہم
(جن پر انعام کیا گیا)

"صراط مستقیم" کا ذکر کرنے کے بعد خداوند عالم نے ان افراد کا تذکرہ فرمایا ہے جو "انعمت علیہم" کا مصداق ہیں اور ان پر خدا نے خاص انعام کیا ہے یعنی وہ لوگ جن کی طرف "صراط مستقیم" کو منسوب کیا گیا اور کہا گیا ہے کہ یہ راستہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر خدا نے انعام فرمایا' ان کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ نساء، آیت ۶۸:

★وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا "۔

(اور جس نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی پس ایسے لوگ ان بندوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا جو کہ انبیائؑ' صدیقین' شہداء اور صالحین میں سے ہیں اور وہ لوگ کیا ہی اچھی رفاقت والے ہیں)

اس آیت میں "منعم علیہم" کی صفات بیان کی گئی ہیں لیکن اس سے قبل آیت ۶۶ میں ایمان اور اطاعت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

"فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى لِدَيْكَ فِيْمَا يْنِ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا ! وَافِيْ اَنْفُسِهِمْ مِّرجَامِّمَّا اوَ ۲ا تَسْلِيْمًا ۝ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا"

(پس اے رسولؐ) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک سچے مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں اپنا حاکم نہ بنائیں پھر تم جو فیصلہ کرو اس سے تنگدل بھی نہ ہوں بلکہ خوشی خوشی اسے تسلیم کر لیں' اور اگر ہم ان کو... بنی اسرائیل کی مانند...... یہ حکم کر دیتے کہ تم اپنے آپ کو (ایک دوسرے کو) قتل کر دو یا اپنے شہروں سے باہر نکل جاؤ تو ان میں سے چند افراد کے سوا کوئی بھی عمل نہ کرتا' اور اگر یہ لوگ اس بات پر عمل کرتے جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا اور ایسا کرنا ان کے لیے ثابت قدم رہنے کا سبب بن جاتا)۔

اس آیت میں خداوند عالم نے "منعم علیہم" (انعام یافتگان) کی توصیف اس طرح فرمائی ہے کہ وہ اپنے قول' فعل' ظاہر اور باطن میں ہر لحاظ سے عبدیت و بندگی پر اس طرح ثابت قدم ہیں کہ ان کے پائے استقلال میں لغزش وانحراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' لیکن اس کے باوجود ان صفات کے حامل مومنین کو ان لوگوں کے نقش قدم پر چلنے والے قرار دیا گیا ہے جن پر خداوند عالم نے انعام فرمایا (منعم علیہم) اور انہیں ان (منعم علیہم) سے کم درجہ

افراد میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ ارشاد الٰہی ہے "مع النبیین" یعنی نبیوں کے ساتھ' اور یہ نہیں فرمایا: " اولئك من الذین' (ان میں سے)، (تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کو " منعم علیہم " (انعام یافتگان) کے ساتھ رہنے والے قرار دیا گیا ہے، ان میں سے قرار نہیں دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا " وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا " یعنی بہت اچھی ہے یہ رفاقت اور ساتھ ہونا' تو اس سے بھی مذکورہ مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

اسی طرح سورہ حدید آیت ۱۹ میں بھی انہی مطالب کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا :

★ " وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ "

(جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر' وہی درحقیقت صدیقین اور شہداء ہیں اپنے پروردگار کے نزدیک' انہی کے لیے ہے ان کا اجر اور ان کا نور!)

اس آیت میں " عِنْدَ رَبِّهِمْ " اور " لَهُمْ اَجْرُهُمْ " کے الفاظ سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ مومنین کو آخرت میں شہداء اور صدیقین کے ساتھ ملحق کیا گیا ہے یعنی اہل ایمان قیامت کے دن شہیدوں اور سچوں کے ساتھ ہوں گے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اصحاب صراط مستقیم (یعنی وہ ہستیاں جو صراط مستقیم پر گامزن اور اسی سے وابستہ ہیں) قدر و منزلت اور رفعت شان کے لحاظ سے ان مومنین سے بھی افضل اور برتر ہیں جو اپنے دلوں کو ایمان کے نور سے روشن کر کے اپنے اعمال کو ہر قسم کی گمراہی' شرک اور ظلم سے پاک و منزہ کر چکے ہیں۔

ان تمام آیات میں جو اب تک ذکر کی جا چکی ہیں غور و فکر کرنے سے اس امر کی بابت یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ مومنین اگرچہ بہت عظمت اور قدر و منزلت کے حامل ہیں لیکن ان کی رفعت شان کے لیے ابھی کچھ درجات باقی ہیں جنہیں حاصل کرنے کے بعد ہی وہ " منعم علیہم " کے ساتھ ان کی صف میں قرار پا سکتے ہیں یعنی ان کے "ساتھ ہونے" سے ترقی کر کے "ان میں سے" کی منزل پر فائز ہو سکتے ہیں کیونکہ اگر ان کی موجودہ صفات ہی کافی ہوتیں تو انہیں بھی ان لوگوں میں شمار کیا جاتا جن پر اللہ نے اپنا خاص انعام فرمایا اور انہیں اپنی خصوصی نعمتوں سے نوازا' جبکہ ایسا نہیں ہوا' شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اصحاب صراط مستقیم اور خدا کی خاص نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والے حضرات' علم و معرفت الٰہی کی خاص دولت سے مالا مال ہونے کے سبب عظیم رتبہ پا چکے ہیں لہٰذا ان کا مقام مومنین سے بالا و برتر ہے' اسی مطلب کو خداوند عالم نے سورہ مجادلہ آیت ۱۱ میں اس طرح بیان کیا ہے :

" يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ "۔

(بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اللہ، ان لوگوں کو تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور صاحبان علم کو کئی درجے عطا کرتا ہے)

پس صراط مستقیم والے افراد وہی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم نعمت سے نوازا ہے جو ہر نعمت سے برتر و بہتر ہے اور وہ اسی مخصوص نعمت کے سبب ہر ایک سے افضل و برتر قرار پائے ہیں یہاں تک کہ ان افراد سے بھی برتر ہیں جو "ایمان کامل" کی نعمت سے بہرہ ور ہیں' یہ بات بھی " صراط مستقیم " کے اوصاف عالیہ اور صفات متعالیہ میں سے ایک ہے۔

صراط اور سبیل کی بحث

صراط اور سبیل' دونوں الفاظ "راستہ" کے معنے میں آتے ہیں۔

خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں متعدد مقامات پر صراط اور سبیل کا تذکرہ فرمایا ہے لیکن "صراط مستقیم" کے سوا کسی صراط کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا جبکہ کئی سبیل اپنی طرف منسوب کر کے ذکر کئے ہیں' چنانچہ جہاد کرنے والوں کے تذکرہ میں سبیل کی بابت ارشاد الٰہی ہے:

سورہ عنکبوت، آیت ۶۹:

★ "وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا"

(وہ لوگ جنہوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا ہم ضرور انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے)

اس آیت میں "سبلنا"۔۔ سبیل سے جمع کا صیغہ۔۔ (ہمارے راستے) کا لفظ ذکر کیا گیا ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "کئی راستے" ہیں۔ البتہ صراط مستقیم کا تذکرہ ہمیشہ ایک یعنی واحد کے صیغہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اس مقام پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سورہ الحمد کی زیر بحث آیت (صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) علاوہ کسی دوسرے مقام پر "صراط مستقیم " کی نسبت مخلوق کی طرف نہیں دی گئی' چنانچہ اس آیت میں "صراط مستقیم " کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

"صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ . . ."

صراط مستقیم' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا......،

لیکن اس کے مقابلہ میں "سبیل" کو کئی مقامات پر اپنی مخلوق کی طرف منسوب کر کے ذکر کیا' جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

سورہ یوسف، آیت ۱۰۸:

★ "قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ"

(کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے' میں خدا کی طرف بلاتا ہوں بصیرت و آگاہی کے ساتھ!)

اس آیت میں سبیل کو حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہوئے (سبیلی)۔۔ میرا راستہ۔۔ کہا گیا ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر سبیل کو توبہ کرنے والوں کی طرف نسبت دی ہے اور ارشاد فرمایا:

سورۂ لقمان، آیت ۱۵:

★ "سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ"

(اس شخص کا راستہ جو میری طرف رجوع کرے)

- اور ایک مقام پر مخلوق کی طرف نسبت کے حوالہ سے سبیل کو اہل ایمان کی طرف منسوب کر کے یوں ارشاد فرمایا:

سورۂ نساء، آیت ۱۱۵:

★ "سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ"

(مومنین کا راستہ)

مذکورہ بالا آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے سبیل اور صراط مستقیم کے درمیان فرق سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ عبادت کرنے والوں کے درجات اور گوناگوں مراتب کے سبب سبیل بھی مختلف ومتعدد ہیں لیکن جہاں تک "صراط مستقیم" کا تعلق ہے تو وہ ایک ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا کثرت واقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ مائدہ، آیت ۱۶:

★ "قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ"۔

(تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور اور واضح کتاب آئی ہے اسی کے ذریعہ خداوند عالم سلامتی کے راستوں پر لاتا ہے ہر اس شخص کو جس نے اس کی رضا وخوشنودی کے مطابق عمل کیا اور انہیں اپنی خاص عنایت کے ساتھ اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے اور انہیں "صراط مستقیم" کی ہدایت کرتا ہے)۔

اس آیت میں سبیل کو جمع کے لفظ (سبل) کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے ان کی تعدّد اور کثرت کی نشاندہی ہوتی ہے جبکہ "صراط" کو واحد کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے اس کی وحدت اور ایک ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن ان دونوں کے معانی اور موارد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ یا تو "صراط مستقیم" اپنے سبل یعنی کثیر راستوں کے مجموعہ کا نام ہے (تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام راستوں کی خصوصیات کو یکجا کر دیا جائے تو صراط مستقیم بنتا ہے) یا یہ کہ وہ سب راستے...... سبل...... ان چھوٹے بڑے راستوں کی مانند ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہو کر ایک شاہراہ پر منتہی ہوتے ہیں اور وہ شاہراہ "صراط مستقیم" ہے۔

"سبل" اور "صراط" کے درمیان فرق کے سلسلے میں ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

سورۂ یوسف، آیت ۱۰۶:

★ "وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ"۔

(اور اکثر لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے مگر شرک کے ساتھ ساتھ)

اس آیت میں خداوند عالم نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شرک جو کہ ضلالت و گمراہی کا دوسرا نام ہے' ایمان (ظاہری) کے ساتھ کہ جسے سبیل کا نام دیا گیا ہے باہم قرار پا سکتا ہے یعنی سبل اور شرک کا یکجا ہونا قابل تصور اور امکان پذیر ہے لیکن ''صراط مستقیم'' کسی صورت میں ضلالت ..... گمراہی ..... سے ہم رنگ نہیں ہو سکتا' چنانچہ ''ولا الضالین'' کے الفاظ اس حقیقت پر واضح گواہ ہیں۔

(''وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' صراط مستقیم والوں کی صفت ہے یعنی عدم گمراہی۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ ''صراط مستقیم'' ان لوگوں کا راستہ ہے جو ہر قسم کے ضلال (گمراہی) سے دور ہیں لہٰذا جہاں ضلالت کی گنجائش موجود ہو گی وہاں صراط مستقیم کا تصور ہی نہیں آ سکتا جبکہ شرک اگرچہ ایک قسم کی ضلالت و گمراہی ہی ہے لیکن اس میں سبیل یعنی ایمان کے تصور کی گنجائش پائی جاتی ہے جو کہ صراط مستقیم میں ہرگز نہیں۔م)۔

مذکورہ بالا آیات میں تدبر اور غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''سبل'' میں سے ہر ایک سبیل (راستہ) میں نقص اور عدم کمال سے ہم آہنگ ہونے اور امتیازات کی نا مطلوبیت سے ہم رنگ ہونے کی گنجائش موجود ہے جو کہ اس کی خصوصیات کو مفقود کر دینے کا سبب بن سکتی ہے جبکہ ''صراط مستقیم'' میں ایسا ہرگز نہیں یعنی نہ تو اس میں کوئی نقص قابل تصور ہے اور نہ کسی قسم کے امتیازات کی گنجائش موجود ہے (یعنی ایسا ہرگز نہیں کہ کسی کا ''صراط مستقیم'' کچھ ہو اور کسی کا کچھ اور) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ''سبیل'' اور ''صراط مستقیم'' کے درمیان ہدف اور مقصد کے لحاظ سے ایسا تعلق و رابطہ قائم ہے کہ اگرچہ سبیل کئی دوسرے عنوانات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے جبکہ ''صراط مستقیم'' ایسا نہیں لیکن ان دونوں کی جہت اور سمت میں یگانگت کے تصور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''صراط مستقیم'' کا تعلق و رابطہ سبیل کی ہر قسم کے ساتھ وحدت و اتحاد کے تقاضوں کے عین مطابق ہے' ان حقائق کی تائید مذکورہ آیات کے علاوہ درج ذیل آیات سے بھی ہوتی ہے:

سورۂ یٰس، آیت ۶۱:

''وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ''

(اور یہ کہ تم میری عبادت کرو' یہی صراط مستقیم (سیدھا راستہ) ہے)

سورۂ انعام، آیت ۱۶۱:

''قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا''

(کہہ دو کہ مجھے میرے پروردگار نے صراط مستقیم (سیدھے راستہ) کی ہدایت کی ہے جو کہ مضبوط دین' ابرہیمؑ پاکباز کا مذہب ہے)

پہلی آیت میں عبادت کو ''صراط مستقیم'' کا نام دیا گیا ہے اور دوسری آیت میں ''دین'' کو صراط مستقیم کہا گیا ہے جبکہ یہ دونوں عنوان یعنی عبادت اور دین' سبل کی تمام اقسام میں پھیلے ہوئے ہیں، گویا سبل و صراط کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ صراط مستقیم کا رابطہ سبیل اللہ سے ایسا ہے جیسے روح اور بدن کے درمیان تعلق ہوتا ہے۔ بدن

اپنی زندگی میں کئی مختلف حالات اختیار کرتا ہے اور ہر حالت دوسری حالت سے مختلف ہوتی ہے مثلاً ابتدائے زندگی، عہد طفولیت، آغاز جوانی، شباب، پیری، بال سفید ہونا اور ادھیڑ عمر ہونا وغیرہ یہ سب حالتیں ایسی ہیں جو ایک بدن سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے فرق رکھتی ہیں لیکن روح ہر حالت میں ایک کیفیت کی حامل رہتی ہے اور بدن کی تمام حالتوں کے ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود اس کی یکسانیت میں فرق نہیں آتا اور بدن کے ساتھ اس کا تعلق ہر حالت میں یکساں ہے۔ بدن کے ساتھ اس کی ہم آہنگی ٹھوس بنیادوں پر استوار ہے، اس کے علاوہ یہ کہ بدن پر کئی ایسے حالات عارض ہو سکتے ہیں جو روح کے تقاضوں کے منافی ہوں اور روح ان سے ہم آہنگ نہ ہو، یعنی بدن کے ساتھ امتزاجی کیفیت سے ہٹ کر روح ان حالات سے سازگار نہ ہو، لیکن روح بدن سے ہٹ کر کسی ایسی حالت سے دوچار نہیں ہو سکتی جو اس کے تقاضوں کے منافی ہو کیونکہ اس کی بنیاد فطرت الٰہی ہے جو کہ تخلیق بشر کی اصل و اساس ہے اور اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، روح اور بدن کے اس فرق کے باوجود اگر حقیقت امر پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان اسی روح اور بدن ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسی طرح وہ سبیل (راستہ) جو اللہ کی طرف جاتا ہے وہ صرف "صراط مستقیم" ہے، اس کے علاوہ ہر سبیل ... راستہ جیسے سبیل المومنین (مومنین کا راستہ)، سبیل المنیبین (خدا کی طرف رجوع کرنے والوں کا راستہ)، سبیل المتبعین للنبیؐ (پیغمبر اکرمؐ کے پیروکاروں کا راستہ) اور اس طرح کے دوسرے راستے، سب ایسے ہیں جو کسی نہ کسی آفت یا نقص سے دوچار ہو جاتے ہیں لیکن "صراط مستقیم" ہرگز ایسا نہیں اور اس پر کسی قسم کا کوئی نقص یا آفت داخلی ہو یا بیرونی ... وارد نہیں ہو سکتی، چنانچہ بیان ہو چکا ہے کہ ایمان جو کہ ایک سبیل (راستہ) ہے کبھی شرک کے ساتھ اور کبھی ضلال کے ساتھ یکجا ہو جاتا ہے جبکہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ شرک و گمراہی میں سے کوئی ایک "صراط مستقیم" کے ساتھ مل جائے۔

بنابراین یہ مطلب واضح ہو گیا کہ سبیل کے کئی مراتب ہیں، جن میں سے کچھ خالص اور ہر طرح کی آمیزش سے پاک ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو شرک و ضلالت سے آمیختہ ہیں، اسی طرح کچھ منزل مقصود سے قریب تر ہیں اور کچھ اس سے دور ہیں، لیکن ان تمام راستوں کا منتہیٰ "صراط مستقیم" ہے اور سب اسی پر آ کر ختم ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ سب راستے صراط مستقیم کے ساتھ مل کر ایک ہی حیثیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔

خداوند عالم نے اس امر کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ اگرچہ اس کی طرف آنے والے راستے ... سبل ... کئی اعتبار سے مختلف ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے فرق رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ تمام راستے صراط مستقیم ہی سے ملتے ہیں اور اس کے مصداق قرار پا جاتے ہیں، جیسا کہ خدا نے حق و باطل کی بابت ایک مثال دیتے ہوئے اس حقیقت کو بیان فرما دیا ہے، وہ مثال یہ ہے:

سورہ رعد، آیت ۱۷:

★ "اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَ مِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْیَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ

جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ

(اس نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہہ نکلے' پھر پانی کے ریلے پر (جوش کھا کر) پھولا ہوا جھاگ (پھین آ گیا) اور اس چیز (دھات) سے بھی جسے یہ لوگ زیور یا دیگر آلات بنانے کی غرض سے آگ میں تپاتے ہیں اسی طرح پھن آ جاتا ہے (پھر الگ ہو جاتا ہے)۔ یوں خدا حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے (کہ پانی حق کی مثال اور پھن باطل کی) غرض کہ پھن خشک ہو کر غائب ہو جاتا ہے' اور جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے (پانی) وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ یوں خداوند عالم لوگوں کے سمجھانے کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے)

اس آیت میں خداوند عالم نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ معارف و کمالات کے حصول کی بابت دلوں اور فہم و ادراک کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں جبکہ ان سب کا منبع و سرچشمہ اور منتہا...... بارش کے پانی کی مانند...... ایک ہی ہے یعنی رزق آسمانی اور عنایت الٰہی' (مذکورہ بالا آیت میں ذکر کی گئی مثال میں پانی کا تذکرہ تھا جو ایک تھا اور جب آسمان سے زمین پر آیا تو کئی ندی نالوں کی صورت اختیار کر گیا یہی حال معارف و حقائق کا ہے کہ اگرچہ ایک ہی عنایت ربانی ان سب کا سرچشمۂ فیض ہے' لیکن وہ ہر دل میں ایک خاص شکل اور مخصوص اندازے کے مطابق سماتے ہیں) اس مثال کی مکمل وضاحت سورہ رعد میں کی جائے گی' خلاصہ یہ کہ یہ امر بھی صراط مستقیم کی صفات میں سے ایک ہے اور اس کی امتیازی خصوصیات کا حصہ ہے۔

صراط مستقیم اور دیگر راستے

صراط مستقیم کی خصوصیات اور امتیازی پہلوؤں پر غور کرنے سے آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں کہ صراط مستقیم خدا تک پہنچنے کے تمام راستوں پر غالب ہے اور اسی طرح ان راستوں پر بھی حاوی ہے جو خدا تک پہنچنے کی ہدایت اور رہنمائی میں مؤثر واقع ہو سکتے ہیں' گویا وہ تمام راستے صراط مستقیم کی شاخیں اور اس کے شعبے ہیں' یعنی خدا تک پہنچنے کے جس راستے کو بھی دیکھیں وہ اسی حد تک منزل مقصود تک پہنچانے میں موثر ہو گا جس مقدار میں صراط مستقیم کی حقیقت اس میں شامل ہو گی' جبکہ ''صراط مستقیم'' ہر قسم کی محدودیت اور شروط و قیود سے بالاتر ایسے ہادی و رہنما کی حیثیت رکھتا ہے جو خدا تک پہنچا دے اور سیدھا منزل مقصود پر لا کھڑا کرے' یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے اسے صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ کا نام دیا ہے کیونکہ صراط اس راستہ کو کہتے ہیں جو ''واضح'' ہو جو کہ ''سرط'' سے بنایا گیا ہے جس کا معنی ''نگل جانا'' ہے چنانچہ کہا جاتا ہے ''سرطت سرطاً'' یعنی میں نے پوری طرح نگل لیا' تو یہاں اس کی مناسبت سے یوں کہا جائے گا کہ وہ ایسا راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والوں کو نگل لیتا ہے یعنی اپنے اندر سما لیتا ہے جس سے پھر وہ نہ تو اس سے باہر نکل سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے انحراف و کجروی اختیار کرتے ہوئے ادھر ادھر جا سکتے ہیں' (گویا اس کی جاذبیت اس قدر زیادہ ہے کہ جو اس پر گامزن ہو گیا وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اسی میں رہے گا اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو جائے گا۔)

اور ''مستقیم''...... سیدھا...... اسے کہتے ہیں جو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا خواہاں ہو اور کسی کا سہارا لیے بغیر

اپنے اوپر قابو رکھ سکے جیسے وہ شخص جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے اور کسی سہارے کے بغیر اپنے اوپر قابو رکھتا ہے (اپنے امور خود سنبھال سکتا ہے) اس معنی کی روشنی میں ''مستقیم'' اس چیز کو کہیں گے جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدیلی نہ پائی جائے اور وہ ہر حال میں پابرجا ہو۔

''صراط'' اور ''مستقیم'' کے معانی کی وضاحت کے بعد یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ صراط مستقیم سے مراد وہ راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والوں کو یقینی طور پر منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے اور انہیں ہر قسم کے انحراف و گمراہی سے بچاتے ہوئے ان کی مطلوبہ مقصد تک پہنچنے کی کوشش کو نتیجہ خیز بنا دیتا ہے چنانچہ اس سلسلے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ نساء، آیت ۱۷۴:

★ ''فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا''۔

(پس وہ لوگ جو خدا پر ایمان لائے اور اس (ایمان) پر قائم رہے تو خدا انہیں اپنی طرف سے رحمت اور فضل و کرم کے دائرے میں لے آئے گا اور انہیں ہدایت کرے گا اپنی طرف، جو کہ صراط مستقیم ہے)

اس آیت میں خداوند عالم نے صراط مستقیم کی تعریف و توصیف میں فرمایا کہ وہ ایسا راستہ ہے جس میں ہدایت و رہنمائی کی بابت کسی قسم کی کمی و کوتاہی موجود نہیں بلکہ وہ ہمیشہ اپنی استقامت شعار کیفیت پر باقی رہتا ہے اور اپنے سالک (اوپر چلنے والے) کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

اسی طرح ارشاد الٰہی ہوا:

سورہ انعام، آیت ۱۲۶:

★ ''فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا''۔

(پس جس شخص کے بارے میں خدا ہدایت کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کی بابت ضلالت و گمراہی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان میں اڑنے لگتا ہے اسی طرح خداوند عالم ان لوگوں پر رجس لازم قرار دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے اور یہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے)

اس آیت میں خداوند عالم نے اپنی طرف پہنچنے کے سیدھے راستے کی بابت فرمایا ہے کہ اس میں نہ کسی قسم کا کوئی اختلاف واقع ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے اوپر چلنے والوں کو گمراہی سے دوچار کرتا ہے۔

سورہ ءحجر، آیت ۴۲:

★ " قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ "۔

(فرمایا یہ میرا سیدھا راستہ ہے، بتحقیق میرے بندوں پر تجھے کوئی سلطنت وغلبہ حاصل نہیں ہوگا سوائے ان گمراہ لوگوں کے جو تیرے پیچھے چلے)

خدا نے اس آیت میں "صراط مستقیم" کی بابت ارشاد فرمایا کہ یہ میری ایسی روش اور طریقہ ہے جو ہمیشگی کی صفت سے متصف ہوتے ہوئے ہر قسم کی تبدیلی اور تغیر سے پاک ہے، اور اس کی حقیقت اس آیت کے معنی ومفہوم سے ملتی جلتی ہے جس میں خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہ ءفاطر، آیت ۴۳:

★ " فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا "۔

(پس تم نہیں پاؤ گے سنت الٰہیہ میں کوئی تبدیلی، اور ہرگز نہیں پاؤ گے سنت الٰہیہ میں کوئی تغیر)

پانچ اہم نکات

مذکورہ بالا مطالب سے جو کہ "صراط مستقیم" کے معنے کی بابت ذکر کئے گئے ہیں پانچ اہم نکات سے آ گاہی حاصل ہوتی ہے:

(۱)۔ صراط مستقیم کی اہمیت

خداوند عالم تک پہنچنے کے راستے کمال، نقص تنگی اور وسعت کے اعتبار سے مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے فرق رکھتے ہیں، یہ فرق اس لحاظ سے ہے کہ ان راستوں میں سے ہر ایک کو سرچشمہ ءحقیقت اور صراط مستقیم سے قریب تر ہونے کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے جیسے اسلام، ایمان، عبادت، اخلاص اور اخبات (عشق الٰہی میں محو ہونا) ..... اگرچہ یہ تمام راستے خدا تک پہنچنے کے ذرائع ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کی حیثیت میں فرق ہے، یعنی ان میں سے ہر ایک، دوسرے سے اس لحاظ سے فرق رکھتا ہے کہ دوسرے کو سرچشمۂ حقیقت سے زیادہ قرب حاصل ہے .. یہی حال ان تمام راستوں کے متقابل امور کا ہے یعنی گمراہی کے بھی مراتب اور درجات ہیں اور ہر درجہ، دوسرے سے مختلف ہے جیسے کفر، شرک، حجود، ہٹ دھرمی، طغیان (سرکشی) اور معصیت، (ان تمام امور میں گمراہی کی شدت وضعف کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے ورنہ یہ سب ضلالت وگمراہی

ہی کے مختلف عناوین ہیں جیسا کہ اسلام و ایمان وغیرہ، سب ہدایت کے مختلف نام ہیں) چنانچہ خداوند عالم نے دونوں صنفوں کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

سورہ احقاف، آیت ۱۹:

★ "وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ"۔

(اور سب کے لیے درجات ہیں اس کی بابت جو انہوں نے اعمال بجالائے اور انہیں ان کے اعمال کی پوری پوری جزا دی جائے گی اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا)

ان سب کی مثال معارف الٰہیہ اور حقائق ربانیہ جیسی ہے کہ عقلیں ان کے ادراک میں ایک جیسی نہیں کیونکہ صلاحیتیں اور قابلیتیں مختلف ہوتی ہیں اور اہلیتوں و قابلیتوں کا فرق ان پر اثر انداز ہوتا ہے جیسا کہ سورہ رعد کی آیت ۱۹ میں آسمان سے نازل کئے جانے والے پانی کا ذکر اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے: "انزل من السماء ماء فسالت اودیة بقدرھا" (اس نے نازل کیا آسمان سے پانی، پھر اپنے اپنے اندازے کے مطابق ندی نالے بہہ نکلے) یعنی خدا نے قوت عقل عطا کی لیکن ہر شخص اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق معارف الٰہیہ سے فیض یاب ہوتا ہے۔

(۲)۔ صراط مستقیم والوں کا مقام و منزلت

جس طرح "صراط مستقیم" دیگر تمام سبل (راستوں) پر برتری رکھتا ہے اسی طرح صراط مستقیم والے افراد کہ جنہیں خدا نے اس راستے پر گامزن فرمایا اور انہیں اپنی عنایتوں سے نوازتے ہوئے اپنے بندوں کے تمام امور اور ان کی ہدایت و رہبری کے تمام مسائل کی ذمہ داری ان کے سپرد کی وہ بھی دوسرے لوگوں سے برتر اور بلند مقام و منزلت کے حامل ہیں۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہوا:

سورہ نساء، آیت ۷۱:

★ "وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا"

(اور کتنی اچھی ہے ان کی رفاقت!)

اسی طرح خداوند عالم نے ولایت و سلطنت کے موارد کے تعین کی بابت نہایت واضح اور صریح الفاظ میں سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ میں اس طرح ارشاد فرمایا:

★ "اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ"۔

(یقیناً تمہارا ولی (حاکم) خدا ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ مومن ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں)

اس آیت سے متعلق روایات معتبرہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی اور آپؑ ہی پوری امت میں سے پہلے وہ فرد ہیں جنہوں نے اس مقدس وادی میں قدم رکھا اور صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی طرح ڈالی۔

(اس آیت کی بابت تفصیلی بحث اس کے مربوطہ مقام پر کی جائے گی)

(۴)۔ ہدایت کی حقیقت

صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا حقیقی معنی تب ہی واضح ہو سکتا ہے جب خود صراط مستقیم کا مطلب معلوم ومعین ہو جائے' اس کی وضاحت یوں ہے کہ لغت میں ہدایت کا معنی رہنمائی ہے جیسا کہ لغت کی مشہور ومعروف کتاب ''صحاح'' میں مذکور ہے' البتہ ہدایت کی اس تعریف پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ لفظ ہدایت کا معنی ہر مقام پر دلالت ورہنمائی نہیں اور عربی ادب کے قواعد کی روشنی میں لفظ ''ہدایت'' کے استعمال میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے چنانچہ اہل حجاز کی لغت میں لفظ ''ہدایت'' دو مفعولوں کے ساتھ متعدّی ہوتا ہے لیکن ان کے علاوہ دیگر اہل زبان حضرات لفظ ''ہدایت'' کو دوسرے مفعول کے ساتھ متعدّی کرنے کے لیے لفظ ''الیٰ'' کا لانا ضروری سمجھتے ہیں' لہٰذا صرف ایک گروہ کے نظریہ کو ہی ہدایت کے معنے کے لیے معیار قرار دینا صحیح نہیں' البتہ بظاہر کتاب صحاح کا نظریہ درست ہے۔

کتاب صحاح میں ہدایت کا معنی ''رہنمائی کرنا'' ہے لیکن دیگر اہل لغت کا نظریہ یہ ہے کہ ہدایت کا معنی ہر مقام پر رہنمائی کرنے کے لیے نہیں آتا بلکہ صرف اسی مورد اور مقام پر اس کا معنی رہنمائی کرنا ہوگا جہاں اس کے دوسرے مفعول کے ساتھ کلمہ ''الیٰ'' ذکر کیا جائے (جسے ادبی اصطلاح میں ''تعدیہ بہ الیٰ'' کہتے ہیں) اور اگر کلمہ ''الیٰ'' کے بغیر دوسرے مفعول کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی رہنمائی کرنا نہیں ہوگا بلکہ اس کا معنی'' ایصال الی المطلوب'' یعنی منزل مقصود تک پہنچا دینا ہوگا۔

پس جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ لفظ ''ہدایت'' جب ''الیٰ'' کے بغیر خود ہی دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہو تو اس کا معنی ایصال الی المطلوب (مقصد تک پہنچا دینا) ہے اور جب ''الیٰ'' کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی ''ارائۃ الطریق'' (راستہ دکھا دینا) ہے ان حضرات نے قرآن مجید کی اس آیت شریفہ کے ساتھ استدلال کیا ہے:

سورہ قصص، آیت ۵۶:

★ ''اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ۔''

(تو جسے چاہے اس کی ہدایت نہیں کر سکتا لیکن اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہدایت کرتا ہے)

اس آیت میں خداوند عالم نے پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے جس ہدایت کی نفی کی ہے وہ ''ایصال الی المطلوب'' (منزل مقصود تک پہنچانے والی) ہدایت ہے' ورنہ ''ارائۃ الطریق'' (یعنی راستہ دکھانے والی ہدایت) تو

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے مسلم الثبوت امر ہے، اس آیت میں کلمہ "ہدایت" لفظ "الیٰ" کے بغیر دو مفعولوں کے ساتھ متعدی ہوا ہے لہٰذا اس آیت میں ہدایت کا معنی "ایصال الی المطلوب" ہوگا جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۶۸ میں ارشاد الٰہی ہے:

★ "وَّ صِرَا "

(اور ہم انہیں ضرور ہدایت کرتے صراط مستقیم کی)

اس آیت میں لفظ ہدایت اپنے دونوں مفعولوں کے ساتھ لفظ "الیٰ" کے بغیر متعدی ہوا ہے لہٰذا اس کا معنی "ایصال الی المطلوب" (منزل تک پہنچانا) ہے، اور اس ہدایت کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہے تو اس سے مراد راستہ دکھانا نہیں بلکہ مقصد تک پہنچانا ہے، جبکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہدایت کے سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ شوریٰ، آیت ۵۲:

★ "وَاِنَّكَ لَتَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ"

(اور بے شک آپ ہدایت کرتے ہیں صراط مستقیم کی طرف)

اس آیت شریفہ میں پیغمبر اکرمؐ کے عمل ہدایت کا تذکرہ ہے اور اسے لفظ "الیٰ" کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی "ارائۃ الطریق" یعنی راستہ دکھانا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ کلمہ "ہدایت" جہاں ایصال الی المطلوب (مقصد تک پہنچانے) کے معنے میں آئے وہاں کسی اور لفظ کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود ہی اپنے دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے اور جہاں "ارائۃ الطریق...... راستہ دکھانے...... کے معنے میں آئے وہاں لفظ "الیٰ" کے ساتھ دوسرے مفعول کی طرف اس کا تعدیہ ہوتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتاب صحاح کے بیان پر کیا جانے والا اعتراض درست نہیں کیونکہ اعتراض کرنے والے ارباب دانش نے جس آیہ مبارکہ کو مورد استدلال قرار دیا ہے (یعنی آیہ ۵۶ سورہ قصص) اس میں ہدایت کی جو نفی کی گئی ہے وہ ہدایت کی اس حقیقت سے مربوط ہے جو ذات کردگار کے ساتھ مخصوص ہے اور اس نفی سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سرے سے ہی ہدایت سے کوئی تعلق نہیں، گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آیہ شریفہ میں کمال ہدایت کی نفی کی گئی ہے نہ کہ اصل و حقیقت ہدایت کی، اس کے علاوہ خود قرآن مجید نے بھی مومن آل فرعون کے قصہ میں اس امر کو واضح کر دیا ہے جس کے بعد کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی، چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ غافر، آیت ۳۸:

☆ "یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوۡنِ اَهۡدِكُمۡ سَبِیۡلَ الرَّشَادِ"

(اے لوگو! میری پیروی کرو تا کہ میں تمہیں نیکی کے راستہ کی ہدایت کر سکوں)

اس آیہء شریفہ میں لفظ "ہدایت" کو "الیٰ" کے بغیر دوسرے مفعول کی طرف متعدی کیا گیا ہے جبکہ اس کا معنی یقیناً "راستہ دکھانا" ہے نہ کہ منزل تک پہنچانا' بنابرایں صحیح نظریہ یہ ہوا کہ ہدایت کے معنے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا خواہ وہ لفظ "الیٰ" کے ساتھ دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہو کر آئے یا اس کے بغیر واقع ہو' البتہ یہ بات ممکن ہے کہ لفظ ہدایت کا دوسرے مفعول کی طرف "الیٰ" کے بغیر متعدی ہو جانا اس طرح ہو جیسے عام طور پر یوں کہا جاتا ہے: "دخلت الدار" (میں گھر میں داخل ہوا) جبکہ اصل میں جملہ یوں ہے: "دخلت في الدار"۔ لیکن عام طور پر لفظ "في" ..... میں ... ذکر نہیں کیا جاتا اور اہل عرب اسے صحیح سمجھتے ہیں' گویا کثرت استعمال یا استعمال عرفی (عام لوگوں کے درمیان گفتگو) میں اسی طرح ہوتا ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جاتا کہ جہاں ایسا ہو (حرف فی ذکر نہ کیا جائے) وہاں معنی ہی تبدیل ہو جائے گا' لفظ "ہدایت" میں بھی یہی صورت حال ہے کہ خواہ اس کا معنی دلالت و رہنمائی ہو یعنی ارائۃ الطریق (راستہ دکھانا) اور خواہ منزل مقصود تک پہنچانا ہو یعنی ایصال الی المطلوب دونوں صورتوں میں اس کے تعدیہ میں فرق نہیں آئے گا یعنی جب بھی اسے دوسرے مفعول کی طرف متعدی کرنا چاہیں تو اس کے لیے لفظ "الیٰ" ذکر کرنا پڑے گا' یہ اور بات ہے کہ عمومی استعمال کی طرح "دخلت في الدار" کے بجائے "دخلت الدار" کہہ دیا جائے۔

بہر حال ہدایت کا معنی دلالت و رہنمائی اور منزل مقصود کی نشاندہی کرانا ہے بذریعہ راستہ دکھانے کے' اور یہ بھی بجائے خود ایک طرح کا ایصال الی المطلوب یعنی منزل مقصود تک پہنچانا ہے' تاہم یہ کام (مقصد تک پہنچانا) حقیقت میں خداوند عالم ہی کا ہے لیکن اس کے تمام امور میں جو سنت اور طریقہء کار جاری ہے وہ یہ کہ اس کے امور بذریعہ اسباب انجام پاتے ہیں اور وہ سبب کو ایجاد کرنے کے بعد اس کے ذریعے لوگوں کو مطلوب حقیقی کا پتہ دیتا ہے اور یہ اس کی روش اور اصول عمل ہے کہ وہ ہر کام بذریعہ سبب یا اسباب کے انجام دیتا ہے (لیکن منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے بھی توفیق عمل کی ضرورت باقی رہتی ہے) اور جب خداوند عالم کسی کی ہدایت کاملہ کا ارادہ کر لیتا ہے تو پھر اسے اسباب کے ذریعے منزل مقصود تک پہنچا ہی دیتا ہے چنانچہ اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہء انعام، آیت ۱۲۵:

★ "فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ"

(پس خدا جس کے بارے میں ہدایت کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے)

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

سورہء زمر، آیت ۲۳:

★ "ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ"

(پھر ان کے جسم اور دل نرم ہو کر اللہ کی یاد سے وابستہ ہو جاتے ہیں، یہ خدا کی ہدایت ہے وہ اس کی ذریعے جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے)

اس آیت میں "تلین" کو لفظ "الیٰ" کے ساتھ متعدّی کر کے ذکر کیا گیا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ لغت میں "لین" اور "لینت" توجہ جھکاؤ اور اطمینان کے معنے میں آئے ہیں' اور اس طرح کے کلمات جو ان معانی کے لیے ہوں وہ "الیٰ" کے ساتھ متعدّی ہوتے ہیں' آیہ شریفہ میں "لینت" یعنی نرمی سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم ان کے دلوں میں ایسی صفت ایجاد کر دیتا ہے کہ اس صفت' حالت اور کیفیت کی وجہ سے وہ خدا کی یاد اور اس کے ذکر کو قبول کر لیتے ہیں اور خدا کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بارگاہ اقدس میں اظہار عجز کرتے ہوئے اس کے پاکیزہ ذکر سے اطمینان قلب حاصل کر لیتے ہیں اور چونکہ خدا تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں لہٰذا ہر راستہ کی ہدایت دوسرے سے مختلف ہے گویا ہر راستہ کی ہدایت اس کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ ہر راستہ کی ہدایت پہلے ہی سے اس کے ساتھ مختص ہو چکی ہوتی ہے اور وہ اختصاص اس کے ساتھ باقی رہتا ہے۔

ہدایت کے راستوں کے مختلف ہونے اور ان کے درمیان پائے جانے والے فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹:

★ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔"

(وہ لوگ جنہوں نے ہم میں جہاد کیا تو ضرور ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور یقیناً خدا نیک لوگوں کے ساتھ ہے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے اور خود خدا میں جہاد کرنے میں فرق ہے کیونکہ جو شخص خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے ..... مجاہد فی سبیل اللہ ..... وہ یہ چاہتا ہے کہ ایسا صاف راستہ ملے جس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو یعنی راستہ بھی سیدھا ہو اور اس میں رکاوٹیں بھی حائل نہ ہوں لیکن جو شخص "خدا میں" جہاد کرتا ہے ..... مجاہد فی اللہ ..... وہ راستہ نہیں چاہتا بلکہ خود خدا کو چاہتا ہے اور راستہ کے سیدھا ہونے اور اس میں حائل رکاوٹیں دور ہونے کی نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش کرتا ہے' اس لیے خدا اسے سیدھے راستہ کی ہدایت کرتا ہے اور اپنی عنایت خاصہ کے ساتھ اسے اس کی استعداد و قابلیت کے مطابق ایسے راستہ پر گامزن کر دیتا ہے کہ پھر وہ سرگرداں نہیں ہوتا بلکہ اس راستہ سے دوسرے راستہ اور پھر اس سے تیسرے راستہ اور پھر اس سے دیگر راستے کی طرف ہدایت پاتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ ہدایت الٰہی کے سہارے ان تمام راستوں کو طے کرتا ہوا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے کہ پھر خدا اسے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص کر لیتا ہے۔

(۴)۔ ہدایت کے بعد طلب ہدایت کا راز

"صراط مستقیم"، خدا کے تمام راستوں پر غالب' حاوی اور برتر ہونے کے حوالے سے ایک ایسی حقیقت کا حامل ہے جو ان تمام راستوں میں پائی جاتی ہے جبکہ وہ تمام راستے کئی جہات میں ایک دوسرے سے مختلف و متفاوت ہیں' تاہم صراط

مستقیم کی بنیادی حقیقت ان سب میں غلبہ و برتری کے سبب موجود و محفوظ ہے' لہٰذا یہ کہنا بجا و درست ہے کہ خداوند عالم اس شخص کو جو "صراط مستقیم" کے علاوہ خدا کے دیگر راستوں کی ہدایت پا چکا ہو اسے صراط مستقیم کی ہدایت کرے یعنی جب وہ شخص کسی ایک راستہ کی ہدایت پالے تو پھر یہ بات درست کہلائے گی کہ خدا اسے کسی بڑے راستے کی ہدایت کرے تاکہ وہ درجۂ کمال سے اعلیٰ تر اور پھر اس سے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچ جائے' یعنی یہ درست ہے کہ کسی ہدایت یافتہ شخص کو کمال ہدایت کی خاطر خداوند عالم مختلف راستوں کی ہدایت کر کے صراط مستقیم جو کہ کمال ہدایت کا آخری نکتہ ہے کی ہدایت کرے' پس جن آیات میں ہدایت یافتہ لوگوں کا ہدایت طلب کرنا مذکور ہے اس سے یہی مراد ہے کہ وہ ایک راستہ کی ہدایت پا کر اس سے بلند و برتر راستہ کی ہدایت چاہتے ہیں جیسا کہ خدا کے ہدایت یافتہ و باایمان بندے ہر روز کئی مرتبہ یہ الفاظ دہراتے ہیں :

"اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ"

خدایا ہمیں سیدھے راستہ...... صراط مستقیم...... کی ہدایت فرما۔

تو اس سے مراد یہی ہے کہ وہ ہدایت یافتہ ہوتے ہوئے کمال ہدایت کے حصول کی دعا کرتے ہیں' کیونکہ وہ عبادت الٰہی بجا لاتے ہوئے ایسا کہتے ہیں تو ان کی اس طلب اور استدعاء میں جو کہ کمال ہدایت کے لیے ہے کوئی مانع نہیں۔

یاد رہے کہ یہ جملہ" اھدنا الصراط المستقیم " خداوند عالم کا وہ کلام ہے جو اس نے اپنے اس بندے کی طرف سے کیا ہے جسے اس نے عبادت کی توفیق بخشی (بندے کی نیابت میں خدا کا یہ کلام دراصل خالق کی اپنی مخلوق پر خاص عنایت کی دلیل ہے)

ایک سوال اور اس کا جواب

عام طور پر سوال کیا جاتا ہے کہ ہدایت یافتہ شخص کا دوبارہ ہدایت طلب کرنا درست نہیں کیونکہ یہ ایک حاصل شدہ چیز کو حاصل کرنے کی استدعاء کے برابر ہے جسے علمی اصطلاح میں "تحصیل حاصل" کہا جاتا ہے جو کہ محال ہے یعنی یہ بات ممکن ہی نہیں کہ ایک حاصل شدہ چیز کو دوبارہ حاصل کیا جائے' لہٰذا راستے پر پہنچ کر راستے پر پہنچنے کی دعا کرنا معقول نہیں بلکہ اس کے حصول کا سوال کرنا اس سے تعلق ہی نہیں پکڑ سکا کیونکہ وہ حاصل ہے لہٰذا طلب ہدایت سے کیا مراد ہے؟

اس سوال کا جواب سابقہ بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس ہدایت کو سوال کرنے والا حاصل کر چکا ہوتا ہے اس کے دوبارہ حصول کی دعا نہیں کرتا بلکہ اس سے بلند و برتر راستے کی ہدایت اور پھر کمال ہدایت کو چاہتا ہے جو کہ نہ عقلی طور پر محال ہے اور جسے نہ ہی کسی اور معیار کی روشنی میں غلط و نادرست قرار دیا جا سکتا ہے' بلکہ حقیقت میں کمال ہدایت کا سوال مطلوب و پسندیدہ امر ہے جو کہ عقلاً محبوب ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

"صراط مستقیم" کی ہدایت طلب کرنے پر ایک یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب ہماری شریعت تمام سابقہ شریعتوں سے افضل اور ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے اور گذشتہ تمام اقوام کی شریعتوں میں سے کوئی بھی شریعت، شریعت محمدیہؐ پر برتری نہیں رکھتی تو پھر وہ شخص جو شریعت محمدیہؐ کا پیروکار ہے اس کا صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرنا معقول نہیں کیونکہ اس کی شریعت کامل و اکمل ہونے کے سبب صراط مستقیم سے جدا نہیں، بلکہ جو شخص اتنی کامل شریعت کے تابع ہو اس کا صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرنا یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ شاید وہ اپنے آپ کو سیدھی راہ پر گامزن نہیں سمجھتا یعنی خود کو ہدایت یافتہ نہیں سمجھتا اس لیے صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرتا ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ شریعت محمدیہؐ ہر لحاظ سے کامل اور سابقہ شریعتوں سے افضل و اکمل ہے لیکن کسی شریعت و مذہب کا کامل ہونا اور بات ہے اور اس کے پیروکار کا دوسری شریعتوں کے پیروکاروں سے افضل ہونا دوسری بات ہے، یعنی یہ دو الگ الگ مسئلے ہیں، اس لیے کسی مسلمان کا صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرنا وہ معنی نہیں دیتا جو عام طور سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ پروردگارا! میں تیرے دین اسلام اور شریعت محمدیہؐ پر ایمان لایا ہوں اور اس پر عمل بھی کرتا ہوں لہٰذا مجھے اپنے خاص و مقرب ترین بندوں میں شامل کر لے اور مجھے ان عظیم و پاکیزہ ہستیوں کے ساتھ ملا دے جنہیں تو نے اپنی عنایات سے نوازا ہے، یعنی خدایا! مجھے ایمان و عمل کے اس مرتبہ سے کہ جس پر میں اب فائز ہوں بلند تر مرتبہ پر فائز کر اور مجھے ان خوش نصیب افراد کے راستے کی ہدایت فرما جو تیرے خصوصی انعام کے سزاوار ٹھہرے ہیں (منعم علیہم)

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ شریعت محمدیہؐ دیگر تمام شریعتوں اور ادیان و مذاہب سے کامل و اکمل ہے لیکن اس شریعت کا پیروکار ہر لحظہ اپنے ایمان و عمل کے کمال کی دعا مانگ سکتا ہے اور اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ شریعت محمدیہؐ کے پیروکار ہونے کے ناطے وہ تمام شریعتوں کے پیروکاروں سے بھی افضل ہو گیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر لحہ مراتب کمال کے حصول کا محتاج ہے اور اس کا شریعت محمدیہؐ کو قبول کر لینا اور اس پر عمل پیرا ہونا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ وہ صرف اسی سبب سے اب ہر قسم کے رتبہ ء کمال سے بے نیاز ہو گیا ہے یا یہ کہ اب وہ سابقہ شریعتوں کے تمام افراد پر فضیلت و برتری رکھتا ہے مثلاً یہ کہ اب وہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی افضل ہے، ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک عام مسلمان خواہ وہ ایمان و عمل کے کتنے ہی بلند مرتبے پر فائز کیوں نہ ہو لیکن حضرت نوحؑ و حضرت ابراہیمؑ سے ہرگز افضل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان کے کمالات معنویہ کو پا سکتا ہے، لہٰذا اصل شریعت کا افضل و اکمل ہونا ایک الگ مسئلہ ہے جو کہ خود شریعت کی عظمت سے تعلق رکھتا ہے، پس کسی شریعت کے کامل و اکمل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا پیروکار تمام شریعتوں کے پیروکاروں سے افضل و اکمل ہے اور اب اسے کسی بلند رتبہ کے طلب کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ شریعت پر ایمان لا کر اس پر عمل پیرا ہونے کا تاکیدی حکم صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس شریعت کے کمالات اور خصوصیات کو حاصل کر

لینے کی راہ ہموار ہو سکے اور جو شخص اس شریعت کا تابع ہو اس کے لیے حصول کمال آسان ہو جاتا ہے نہ یہ کہ وہ حصول کمال کی استدعا ہی نہیں کر سکتا مثلاً جو شخص سابقہ شریعتوں میں سے کسی ایک شریعت کا پیروکار ہے اور وہ معرفت الٰہی کے اس بلند ترین مقام پر فائز ہے جس پر شریعت محمدیہؐ کا پیروکار فائز نہیں تو یقیناً وہ شخص عام مسلمان سے افضل اور اپنے ایمان و عمل اور عقیدہ و معرفت کی بلندی کے سبب ہر اس شخص پر برتری رکھتا ہے جو شریعت محمدیہؐ کا پیروکار ہونے کے باوجود اس بلند مقام و منزلت پر فائز نہیں ہوا اور اس کا دل ایمان کی عظمتوں سے آشنا ہو کر نور عمل سے منور نہیں ہوا۔ لہٰذا کسی کا شریعت محمدیہؐ کا تابع ہونا اور اس پر عمل پیرا ہونا اس امر کی دلیل نہیں کہ اب اسے کسی مرتبۂ کمال کی احتیاج نہیں اور اب وہ سابقہ شریعتوں کے پیروکار نہایت بلند مرتبت افراد سے بھی افضل ہو گیا ہے' نہیں اور ہرگز ایسا نہیں' بلکہ شریعت محمدیہؐ کا پیروکار اور اس پر ایمان و عمل کا عہد کرنے والا اگر صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرے اور مراتب و مدارج کمال کی استدعا کرے تو وہ قابل تحسین ہوگا اور اس کے ایسا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ کمالات سے محبت کرتا ہے اور ہدایت کے اعلیٰ ترین مرتبے کا خواہاں ہے جو کہ یقیناً لائق ستائش امر ہے۔ پس نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت محمدیہؐ کے پیروکار کا بارگاہ الٰہی میں ''صراط مستقیم'' کی ہدایت طلب کرنا درحقیقت حصول کمال کے فطری جذبہ کی دلیل ہے اور یہ شریعت محمدیہؐ کے کامل و اکمل ہونے کے منافی بھی نہیں۔

بعض محققین نے اس اعتراض کا جواب دوسری طرح سے دیا ہے جو کہ ان کے علمی مقام و منزلت کے پیش نظر نہایت تعجب آور ہے' وہ اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر قیامت تک دین الٰہی صرف ایک ہے اور وہ ہے اسلام' اسی طرح تمام شریعتوں کی بنیاد بھی ایک ہے یعنی تمام بنیادی معارف و حقائق کی اصل و اساس ایک ہے اور وہ ہے توحید' نبوت اور قیامت پر ایمان لانا' اور یہ تمام شریعتوں میں یکساں ہے یعنی تمام افراد بشر توحید' نبوت اور قیامت پر ایمان لانے اور ان کے احکامات پر عمل کرنے کے پابند ہوتے ہیں اور یہ امر شریعت محمدیہؐ سمیت تمام شریعتوں میں برابر ہے البتہ جو اہم بات شریعت محمدیہؐ کی امتیازی خصوصیت ہے وہ یہ کہ اس کے احکام اور عملی دستورات کا دائرہ دیگر شریعتوں سے وسیع تر ہے اور اس کے احکام تمام شعبہ ہائے زندگی پر محیط ہیں جبکہ سابقہ شریعتوں میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری موجود نہ تھی لہٰذا شریعت محمدیہؐ میں لوگوں کی بھلائی اور بہتری کے لیے سابقہ شریعتوں کی نسبت زیادہ توجہ دی گئی ہے' اس کے علاوہ یہ امر بھی شریعت محمدیہؐ کی امتیازی خصوصیت کہلا سکتا ہے کہ اس کے معارف و احکام معلوم کرنے کے لیے متعدد طریقے مقرر کئے گئے ہیں جبکہ دیگر شریعتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ صرف ایک یا چند طریقوں پر اکتفا کی جاتی تھی لیکن شریعت محمدیہؐ میں حکمت و موعظۂ حسنہ اور جدال احسن کے تمام تقاضے پورے کرنے کی راہ ہموار کر کے ان کے ذریعے معارف الٰہیہ اور احکام شرعیہ پر استدلال قائم کرنے کی سہولت فراہم کر دی گئی ہے لہٰذا شریعت محمدیہؐ کے پیروکار عام مسلمان کے فرائض اور ذمہ داریوں کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ اس کی شریعت کے احکام کے دائرے کی وسعت' اور جب اس کے احکام و فرائض نسبتاً زیادہ ہیں تو اسے اپنے دین و شریعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہدایت و رہبری کی ضرورت و احتیاج بھی زیادہ ہے اس لیے وہ اپنے پروردگار سے استدعا کرتا ہے کہ اسے اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہدایت فرمائے اور اپنے سیدھے راستے پر

گامزن و ثابت قدم رکھے' بنابرایں اگرچہ سب کا دین ایک ہے اور تمام شریعتوں میں بنیادی حقائق و معارف اور اصول احکام یکساں ہیں لیکن ہم سے پہلے زمانے کے لوگ دین الٰہی کی پیروی کرنے میں ہم پر سبقت لے گئے اور اس سلسلے میں انہوں نے ہم سے پہلے ایمان کی دولت حاصل کی اور میدان عمل میں اترے لہٰذا خداوند عالم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ان کے اعمال پر نگاہ کریں اور اس امر کا جائزہ لیں کہ انہوں نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کس راہ و روش کو اپنایا تا کہ ہم ان کے حالات کی روشنی میں اپنی زندگی کے امور کو مرتب کریں اور اس مقصد کے لیے بارگاہ الٰہی میں ہدایت کے درجۂ کمال کو پالینے کی دعا کریں۔

یہ وہ جواب ہے جو بعض محققین نے ہدایت طلب کرنے کے سلسلے میں کئے جانے والے اعتراض کی بابت دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جواب درست نہیں کیونکہ اس کی بنیاد ان اصولوں پر استوار ہے جو تفسیر قرآن کے سلسلے میں وضع کئے گئے ہیں جو کہ تفسیر کے حقیقی اصولوں کے سراسر منافی ہیں' حق تو یہ تھا کہ تفسیر قرآن کو اس کے حقیقی اصولوں سے ہم آہنگ کیا جاتا نہ کہ خودساختہ اصولوں کے ساتھ کہ جن کی بنیاد یہ ہے کہ: معارف اصلیہ کی حقیقتوں میں اتحاد و یگانگت پائی جاتی ہے یعنی ان سب کی حقیقت ایک ہے اور کمالات و مراتب و درجات کا فرق اس پر اثر انداز نہیں ہوتا' گویا تمام حقائق کا محور ایک ہے اور سب کی اصل و اساس ایک ہے اور ان حقائق و معارف میں مراتب و درجات کی کوئی حیثیت ہی نہیں اور یہی حال ان کمالات معنویہ کا ہے جن کا تعلق عالم باطن سے ہے لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ سے افضل ہیں اپنے وجود اور تکوینی کمالات میں ایک عام اور نہایت معمولی حیثیت کے حامل شخص کے برابر ہیں اور ان دونوں کے درمیان تکوینی و تخلیقی صلاحیتوں کے حوالہ سے کوئی فرق نہیں البتہ فضلیت و برتری کا معیار صرف تشریعی اور معین کردہ قواعد و ضوابط ہیں جیسا کہ ایک بادشاہ اور رعایا کے درمیان امتیازات قرار دیئے جاتے ہیں اور ان کا سبب صرف یہی ہوتا ہے کہ ایک شخص کو بادشاہ اور حکمران تسلیم کرلیا جاتا ہے لہٰذا اسے دوسرے افراد سے برتر سمجھا جاتا ہے جبکہ انسانی وجود (انسان ہونے کے حوالہ سے) کے اعتبار سے سب افراد برابر ہیں' دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایمان و اعتقاد کے لحاظ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جو کہ تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام سے افضل ہیں اور ایک عام انسان میں انسان ہونے کے حوالہ سے کوئی فرق نہیں دونوں ایمان و اعتقاد اور کمالات و صفات میں ایک جیسے ہیں تخلیقی طور پر کسی برتری کا پہلو ان میں سے کسی کے لیے نہیں اور فرق صرف یہ ہے کہ ایک کو خدا نے پیغمبر بنا دیا اور دوسرے کو نہیں بنایا...... اسی سمجھوتے کی بنیاد پر ایک عام شخص اپنے نبی کے تابع قرار دیا گیا ہے ورنہ اس کے علاوہ کوئی فضلیت و برتری نہیں...... (معاذ اللہ)

درحقیقت اس غلط نظریہ کی بنیاد ایک اور چیز ہے اور وہ یہ کہ جنہوں نے یہ رائے قائم کی ہے وہ مادہ کو اصل و اساس سمجھتے ہیں اور جو کچھ ماورائے مادہ ہے اس کی مکمل طور پر نفی کرتے ہیں اور یا اس کے اصل ہونے کی بابت کسی قسم کا اظہار خیال ہی نہیں کرتے' البتہ وہ صرف خداوند عالم کی ذات کو مادّہ سے بالاتر سمجھتے ہیں اور اس استثناء کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں مضبوط دلیل موجود ہے جسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتے' اگر ان کے اس فکری انحراف و کجروی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس غلط طرز تفکر کی بنیاد ان دو اسباب میں سے کوئی ایک ہے:

(۱)۔ وہ ماورائے طبیعت پر ایمان ہی نہیں رکھتے بلکہ جو کچھ ان کے محسوسات کے دائرے میں آتا ہے اور ان کے اپنے ہی بنائے ہوئے علوم اسے ثابت کرتے ہیں وہ اسی کو صحیح اور حق تسلیم کرتے ہیں اس کے علاوہ کسی چیز کو نہیں مانتے۔

(۲)۔ وہ لوگ قرآن مجید کے معارف و حقائق میں غور کرنے کو بے سود سمجھتے ہیں اور تفسیر قرآن کے سلسلے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کی مقدس آیات کے معانی کے سمجھنے کے لیے عام اور معمولی سطح کے افراد کی قوت فہم کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

بہر حال ان کے نظریے کی بابت بحث کا دائرہ وسیع ہے اور ہم اس سلسلے میں آئندہ آنے والی علمی بحثوں میں مزید اظہار خیال کریں گے۔ انشاء اللہ

(۵)۔ صراط مستقیم کی وجہ امتیاز

صراط مستقیم والے افراد اور دوسرے لوگوں کے درمیان وجہ امتیاز عمل نہیں بلکہ علم ہے اسی طرح خود صراط مستقیم بھی علم کے حوالہ سے دوسرے سبل (راستوں) سے ممتاز ہے' چنانچہ علم کا جو بلند مرتبہ صراط مستقیم والے افراد کو ان کے پروردگار کی بابت حاصل ہوا ہے وہ دوسروں کو حاصل نہیں اور یہ بات ہمارے سابقہ بیانات سے واضح ہو چکی ہے کہ صراط مستقیم کے علاوہ دیگر کئی سبل اور راستوں میں بھی عمل اپنے کمال کے ساتھ موجود ہے لہٰذا صراط مستقیم والوں کی خصوصیت اور برتری کی بنیاد صرف علم ہے۔

اب جبکہ یہ امر واضح ہو گیا کہ علم ہی صراط مستقیم اور اس پر چلنے والوں کی برتری کی بنیاد ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ علم کیا ہے اور کیسا ہے؟ اس کی نوعیت اور کیفیت کیا ہے؟ تو انشاء اللہ ہم اس سلسلے میں سورہ رعد آیت ۱۷ (اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا...) کی تفسیر میں تفصیلی بحث کریں گے۔

صراط مستقیم والوں کی برتری کا تذکرہ درج ذیل دو آیتوں میں بھی موجود ہے:

سورہ مجادلہ، آیت ۱۱:

☆ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

(رفعت و برتری دیتا ہے خدا، ان لوگوں کو جو تم میں سے ایمان لائے اور ان لوگوں کو جنہیں علم عطا کیا گیا بلند درجات دیتا ہے۔

سورہ ملائکہ، آیت ۱۰:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ

(خدا کی طرف اوپر جاتے ہیں پاکیزہ کلمات اور عمل صالح انہیں بلند کرتا ہے)

پس جو چیز خداوند عالم کی طرف صعود اور پرواز کرتی ہے وہ "الْكَلِمُ الطَّيِّبُ" ہے جو کہ اعتقاد اور علم کا دوسرا نام

ہے اور عمل صالح کا کام "کلم الطیب" کو بلندی عطا کرنا ہے یعنی عمل صالح، علم کو اونچا کرتا ہے اور اسے طاقت پرواز عطا کرتا ہے تاکہ وہ اپنے رب تک پہنچ سکے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ امداد اور سہارا دینا کچھ اور ہے اور صعود و پرواز کرنا کچھ اور!

انشاء اللہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں تفصیلی بحث آئے گی۔

روایات پر ایک نظر

عبادت کی تین قسمیں!

اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے عبادت کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

العبادة ثلاثة: قوم عبدوا الله خوفاً، فتلك عبادة العبيد، و قوم عبدوا الله تبارك و تعالىٰ طلب الثواب فتلك عبادة الاجراء، وقوم عبدوا الله عزوجل حباً فتلك عبادة الاحرار و هي افضل العبادة.

"عبادت کی تین قسمیں ہیں": خوف کی عبادت، طمع کی عبادت، محبت کی عبادت!

(۱)۔ خوف کی عبادت:

کچھ لوگ خدا کے خوف سے اس کی عبادت کرتے ہیں، اس قسم کی عبادت مجبوروناتوان غلاموں کی عبادت کہلاتی ہے۔

(۲)۔ طمع کی عبادت:

کچھ لوگ حصول ثواب کے لیے خدا کی عبادت کرتے ہیں، اس قسم کی عبادت کو مزدوروں کی عبادت کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اُجرت کے لالچ میں عبادت کرتے ہیں۔

(۳)۔ محبت کی عبادت:

کچھ لوگ خدا سے دلی محبت کرتے ہوئے اس کی عبادت کرتے ہیں، اس قسم کی عبادت کو حریت شعار لوگوں کی عبادت کہا جاتا ہے اور یہ سب سے افضل عبادت ہے۔

حضرت امیر المومنین ؑ کا ارشاد گرامی!

نہج البلاغہ میں حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب ؑ کا ارشاد گرامی ہے:

(ان قوماً عبدوا الله رغبةً فتلك عبادة التجار ، وان قوماً عبدوا الله رهبةً فتلك عبادة العبيد، وان قوماً عبدوا الله شكراً فتلك عبادة الاحرار)

(کچھ لوگوں نے خدا کی عبادت اجر وثواب کے حصول کی خاطر کی، پس یہ تاجروں کی عبادت ہوئی، کچھ لوگوں نے خدا کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اس کی عبادت کی جو کہ غلاموں کی عبادت ہے اور کچھ لوگوں نے خدا کا شکر بجالانے کے لیے اس کی عبادت کی، تو یہ حریت شعار لوگوں کی عبادت ہے)

امام جعفر صادق ؑ کا قول!

کتاب علل الشرائع، المجالس اور الخصال میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپ ؑ نے ارشاد فرمایا:

ان الناس يعبدون الله على ثلاثة اوجه: فطبقة يعبدونه رغبةً في ثوابه فتلك عبادة الحرصاء وهو الطمع، وآخرون يعبدونه خوفاً من النار فتلك عبادة العبيد وهي رهبة، ولكني اعبده حباً له عزوجل فتلك عبادة الكرام، لقوله عزوجل (وهم من فزع يومئذ آمنون) ولقوله عزوجل (قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله) فمن احب الله عزوجل احبه ، ومن احبه الله كان من الآمنين، وهذا مقام كنون لا يمسه الا المطهرون.

(لوگ تین طرح سے خدا کی عبادت کرتے ہیں: کچھ لوگ اجر وثواب کے حصول کی خاطر اس کی عبادت کرتے ہیں جو کہ حریص لوگوں کا شیوہ ہے کیونکہ طمع ولالچ ہی اس کا اصل سبب ہے۔ کچھ لوگ جہنم کے خوف سے خدا کی عبادت کرتے ہیں جو کہ غلاموں کی عبادت ہے کیونکہ اس کا سبب خوف ہے، لیکن میں خدا سے محبت کرتے ہوئے اس کی عبادت بجالاتا ہوں جو کہ باعظمت لوگوں کی سنت ہے کیونکہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: "وهم من فزع يومئذ امنون" (سورۂ نمل، آیت ۹۸) (اور وہ لوگ اس دن (قیامت کے دن) ہر قسم کے ڈر سے امن میں ہوں گے) اور پھر ارشاد فرمایا: "قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله..." (سورۂ آل عمران، آیت ۱۳) (کہہ دیجئے: اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرے گا)۔ پس جو شخص خدا سے محبت کرے خدا بھی اس سے محبت کرتا ہے اور جس سے خدا محبت کرے وہ امن والوں میں سے ہوجائے گا، اور یہ وہ پوشیدہ مقام ومنزلت ہے کہ پاک لوگوں کے سوا کسی کی رسائی وہاں تک نہیں۔

ہمارے سابقہ بیان کی روشنی میں مذکورہ روایات کا مطلب واضح ہو گیا' ان روایات میں معصومین علیہم السلام نے عبادۃ الاحرار یعنی حریت شعار لوگوں کی عبادت کو کبھی شکر اور کبھی محبت پر مبنی قرار دیا کیونکہ ان دونوں (شکر اور محبت) کی بازگشت ایک ہی امر کی طرف ہے' شکر سے مراد یہ ہے کہ جو نعمت آپ کو عطا کی گئی ہے اسے اس کے صحیح مورد میں قرار دیں اور شکر پر مبنی عبادت سے مراد بھی یہی ہے کہ وہ صرف اس خدا کے لیے ہونی چاہیے جس کی ذات لائق عبادت ہے۔ پس ایسی صورت میں عبادت گذار، خدا کی عبادت اسے ''خدا'' سمجھ کر کرتا ہے یعنی اس لیے اس کی پرستش کرتا ہے کہ اس کی ذات میں تمام صفات جمال وکمال یکجا ہیں اور وہ اپنی انہی ذاتی صفات اور حسن و جمال کی وجہ سے اپنی ذات ہی کے لحاظ سے محبوب ہے اس لیے وہ محبت کے قابل ہے' اس کی ذات اس کی مستحق و سزاوار ہے کہ اس سے محبت کی جائے کیونکہ محبت حسن و جمال سے دل لگانے اور اس میں جذب ومحویت ہی کا نام ہے' لہٰذا ہم جب یہ کہتے ہیں کہ خدا معبود ہے اس لیے کہ وہ خدا ہے اور وہ معبود ہے اس لیے کہ وہ جمیل ومحبوب ہے اور وہ معبود ہے اس لیے کہ اس نے نعمتیں عطا کی ہیں جن کا شکر بجالانا ضروری ہے تو ان سب الفاظ کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے اور سب کا معنی ومفہوم ایک ہے کیونکہ اس کی ذات اپنے جمال وکمال کی وجہ سے لائق عبادت ہے اور وہ اپنے جمال کے سبب سزاوار محبت ہے اور وہ اپنی نعمتوں کے حوالے سے شکر کا مستحق ہے' گویا اس کی عبادت حقیقت میں اس کے ذاتی استحقاق کی وجہ سے ہے نہ کہ ثواب کے حصول کے لیے یا عذاب سے بچنے کے لیے!۔

اہل سنت کی بیان کردہ حدیث!

ایک روایت میں جو کہ علماء اہل سنت نے بیان کی ہے کہ آیت ''ایاك نعبد وایاك نستعین'' کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

(لا نرید منك غیرك ولا نعبدك بالعوض والبدل، کما یعبدك الجاھلون بك المغیبون عنك).

(اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اے خدا ہم تجھ سے تیرے سوا کچھ بھی نہیں چاہتے اور ہم تیری عبادت کسی اجر وجزا کے لیے نہیں کرتے جیسا کہ جاہل ونادان لوگ تیری عبادت کرتے ہیں جبکہ ان کے دلوں میں تیری محبت کا چراغ روشن نہیں ہوتا اور وہ تیری یاد سے غافل ہوتے ہیں)

مذکورہ بالا روایت میں اس اہم ترین مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو گذشتہ آیات کی تفسیر وبیان میں مدِ نظر تھا یعنی عبادت اخلاص اور حضور قلب کا دوسرا نام ہے اور یہ دونوں چیزیں (خلوص اور حضور قلب) اجر وثواب کے حصول اور عذاب وعقاب کے ڈر سے کی جانے والی عبادت سے منافی ہیں کیونکہ اگر طمع یا خوف کی حالت میں عبادت کی جائے تو اس میں خلوص ہرگز موجود نہیں ہوتا بلکہ خلوص کی عبادت یہ ہے کہ خدا کو لائق عبادت سمجھ کر اس کی عبادت کی جائے۔

تحف العقول کی ایک روایت!

کتاب تحف العقول میں ایک حدیث ذکر کی گئی ہے جس میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

(و من زعم انه يعبد بالصفة لا بالادراك فقد احال على غائب ومن زعم انه يعبد الصفة و الموصوف فقد ابطل التوحيد لان الصفة غير الموصوف ومن زعم انه يضيف الموصوف الى الصفة فقد صغر بالكبير وما قدروا الله حق قدره ...) الحديث

(جو شخص یہ گمان کرے کہ وہ خدا کی عبادت "صفت" کے ساتھ کرتا ہے نہ کہ اس کے ادراک کے سہارے تو گویا اس نے اپنے عقیدے کو غائب و پوشیدہ ذات کے ساتھ مربوط کرلیا' اور جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ وہ صفت اور موصوف دونوں کی عبادت کرتا ہے تو گویا اس نے توحید اور وحدانیت پروردگار کی جڑیں کاٹ دیں کیونکہ صفت اور موصوف ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ حقیقتیں ہیں یعنی صفت کچھ اور ہے اور موصوف کچھ اور' اور جو شخص موصوف کو صفت سے منسوب کرنے کا گمان کرتے ہوئے عبادت کرے پس اس نے خدا کے بزرگ و برتر ہونے کی تحقیر کی' حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کی عظمت و بزرگی کا پاس ہی نہیں کیا اور اس کی قدر نہیں جانی)

اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر!

کتاب معانی الاخبار میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیت شریفہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

يعني ارشدنا الى لزوم الطريق المودي الى محبتك والمبلغ الى جنتك، والمانع من ان نتبع اهوائنا فنعطب او ان ناخذ بآرائنا فنهلك،

(اس کا معنی یہ ہے کہ اے خدا ہمیں اس راستے پر قائم رہنے کی ہدایت فرما جو ہمیں تیرے مقدس ایوان محبت اور تیری پاکیزہ جنت تک پہنچادے اور ہمیں خواہشات نفس کی پیروی کرنے سے باز رکھے کیونکہ خواہشات نفس کی پیروی ہماری تباہی کا سبب ہے۔ اور ہمیں اس بات سے بھی محفوظ رکھے کہ ہم اپنے غلط نظریات پر ڈٹے رہیں کیونکہ ایسا کرنا ہماری ہلاکت کا باعث ہے)۔

حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی

معانی الاخبار میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

يعني ادم لنا توفيقك الذي اطعناك به في ماضي ايامنا حتى نطيعك كذالك في مستقبل اعمارنا،

(کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اے خدا تو نے ہمیں اپنی اطاعت کی جو توفیق اب تک عطا فرمائی ہے اسے قائم رکھ، تاکہ ہم آئندہ بھی اسی طرح تیری اطاعت وفرمانبرداری کا حق ادا کرتے رہیں)

مذکورہ بالا دونوں روایتیں اس غلط فہمی کو دور کرتی ہیں جو "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی بابت کچھ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان، مومن، صالح اور عبادت گزار شخص جو کہ ہدایت کی راہ پر آ چکا ہے وہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کہے تو یہ ہدایت کا طلب کرنا بے معنی ہے کیونکہ ہدایت پانے کے بعد ہدایت کا طلب کرنا معقول نہیں مثلاً نماز گزار شخص حالت نماز میں کہے کہ اے خدا مجھے سیدھے راستے کی ہدایت فرما تو یہ تحصیل حاصل یعنی حاصل شدہ چیز کو دوبارہ طلب کرنا کہلائے گا جو کہ عقلاً صحیح نہیں۔ اس غلط فہمی کا جواب مذکورہ بالا روایات میں موجود ہے البتہ ہر روایت میں ایک خاص اور مخصوص انداز میں جواب دیا گیا ہے، پہلی روایت میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ چونکہ ہدایت کے کئی مراتب و مدارج ہیں لہٰذا نماز گزار شخص بارگاہ الٰہی میں ہدایت کے اعلیٰ ترین مرتبہ تک پہنچنے کی دعا کرتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہدایت کے جس رتبہ تک اس کی رسائی ہوئی ہے اس سے بالاتر مراتب بھی موجود ہیں اس لیے وہ ان کے حصول کی تمنا کرتا ہے۔

دوسری روایت میں اس امر کا بیان ہے کہ نماز گذار شخص اگرچہ مراتب ہدایت کو جانتا ہے لیکن وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ ہدایت کے مراتب کی حقیقت ایک ہے اور سب کا سرچشمہ ایک ہی پاکیزہ اور مقدس حقیقت ہے لہٰذا وہ بارگاہ الٰہی میں ہدایت پر قائم رہنے کی دعا کرتا ہے اور خدا سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اسے ہدایت کے اسی راستے پر استقامت و پائداری عطا فرمائے۔

بنابرایں پہلی روایت مراتب ہدایت کے مختلف ہونے کے حوالہ سے جواب دیتی ہے اور دوسری روایت تمام مراتب کی حقیقت کے ایک ہونے کو بیان کر کے غلط فہمی کا ازالہ کرتی ہے (پہلی روایت میں مراتب ہدایت کے مصادیق کے مختلف ہونے اور دوسری روایت میں ان کے مفہوم کی یگانگت کو ملحوظ رکھا گیا ہے)

غلو اور تقصیر سے پاک راستہ

کتاب معانی الاخبار میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(الصراط المستقيم فى الدنيا ما قصر عن الغلو و ارتفع عن التقصير و استقام. وفى الآخرة طريق المومنين الى الجنة.)

"دنیا" میں صراط مستقیم سے مراد وہ راستہ ہے جو غلو اور تقصیر سے پاک ہو یعنی اس میں نہ افراط ہو اور نہ تفریط ہو بلکہ درمیانی راستہ ہو اور وہ ہر قسم کی کجی سے خالی سیدھا راستہ ہے اور آخرت میں مومنین کا وہ راستہ ہے جو سیدھا بہشت کی طرف جاتا ہے۔

کن لوگوں کا راستہ؟

کتاب معانی الاخبار ہی میں حضرت علی علیہ السلام سے آیہ شریفہ "صراط الذین..." کی تفسیر میں منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

ای: قولوا: اهدنا الصراط الذين انعمت عليهم بالتوفيق لدينك و طاعتك، لا بالمال والصحة، فانهم قد يكونون كفاراً او فساقاً، قال: وهم الذين قال الله: ومن يطع الله والرسول فاولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقاً.

(اس سے مراد یہ ہے کہ: کہیے اے خدا: ہمیں ان لوگوں کے راستہ کی ہدایت فرما جنہیں تو نے اپنے دین اور اپنی اطاعت کی توفیق جیسی پاکیزہ نعمت عطا فرمائی' نہ کہ ان کا راستہ جنہیں تو نے صرف مال و دولت اور صحت و تندرستی سے نوازا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کافر و فاسق افراد خدا کی اس نعمت (مال وصحت) سے بہرہ ور ہوئے ہوں تو کوئی مومن ایسے لوگوں کے راستے کی تمنا کبھی نہیں کرسکتا' بلکہ دین اور اطاعت الٰہی کی توفیق حاصل کرنے والے خوش قسمت افراد وہی ہیں جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا: "وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا" - اور جو شخص اطاعت کرے اللہ کی اور رسولؐ کی پس یہی لوگ ہیں جو ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا نے انعام نازل کیا جو کہ انبیاءؑ صدیقین' شہداء اور صالحین ہیں' اور انہی لوگوں کی رفاقت ہی بہتر ہے)

سورہ فاتحہ کی معنوی تقسیم

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے' آپؑ نے اپنے آباء کرام کے حوالہ سے حضرت علی علیہ السلام کا یہ ارشاد ذکر فرمایا کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے آپؐ نے فرمایا: خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: (قسمت فاتحة الكتاب بيني و بين عبدي فنصفها لي و نصفها لعبدي ما سئل) کہ میں نے سورہ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے آدھا حصہ مجھ سے مخصوص ہے اور آدھا میرے بندے سے' اور میرے بندے کو مجھ سے ہر چیز مانگنے کا حق ہے:

جب کوئی بندہ کہتا ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تو خدا ارشاد فرماتا ہے: (بدء عبدي باسمي و حق علي ان اتمم له اموره و ابارك له في احواله) میرے بندے نے میرے نام سے آغاز کیا ہے اور اب میں اس کے تمام امور کی تکمیل اور اسے تمام احوال میں برکتیں عطا کرنے کا ذمہ دار ہوں۔

اور جب وہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

تو خدا ارشاد فرماتا ہے: (حمدنی عبدی و علم ان النعم التی له من عندی وان البلایا التی دفعت عنه بتطولی، اشهد کم انی اضیف له الی نعم الدنیا نعم الآخرة وادفع عنه بلایا الآخرة کما دفعت عنه بلایا الدنیا) میرے بندے نے میری حمد بجالائی ہے اور اسے اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ اس کے پاس جتنی نعمتیں موجود ہیں وہ سب میری ہی دی ہوئی ہیں اور جتنی آفتیں اس سے ٹل گئی ہیں وہ بھی میرے ہی کرم وعنایت کا نتیجہ ہے پس میں تمہیں گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اسے دنیا کی نعمتوں کے ساتھ آخرت میں بھی نعمتیں عطا کروں گا، اسے آخرت میں بھی اسی طرح مصائب وآلام سے نجات عطا کروں گا جس طرح اس دنیا میں آفتوں کو اس سے دور کر دیا ہے

اور جب وہ کہتا ہے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تو خدا کہتا ہے: (شهد لی عبدی انی الرحمن الرحیم اشهد کم لاوفرن من رحمتی حظه ولاجزلن من عطائی نصیبه) میرے بندے نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ میں رحمان ورحیم ہوں، پس تم گواہ رہنا کہ میں اپنی رحمت میں سے اس کا حصہ زیادہ کرتا ہوں اور میں اسے اپنی عطا وعنایت سے مالا مال کر دوں گا۔

اور جب وہ کہتا ہے: مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ

تو خدا ارشاد فرماتا ہے: (اشهد کم کما اعترف انی مالك یوم الدین لاسهلن یوم الحساب حسابه ولاتقبلن حسناته ولاتجاوزن عن سیئاته) میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جس طرح سے میرے بندے نے اعتراف کیا ہے کہ میں روز جزا کا مالک ہوں پس میں بھی قیامت کے دن اس کا حساب آسان کر دوں گا اور میں اس کی نیکیوں کو شرف قبولیت عطا کروں گا اور اس کی برائیوں سے درگزر کروں گا۔

اور جب وہ کہتا ہے: اِیَّاكَ نَعْبُدُ

تو خدا ارشاد فرماتا ہے: (صدق عبدی ایای یعبد اشهد کم لاثیبنه علی عبادته ثواباً یغبطه کل من خالفه فی عبادته لی) میرے بندے نے سچ کہا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کرتا ہے، میں تمہیں گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اسے اس خالص عبادت پر اتنا ثواب عطا کروں گا کہ وہ لوگ بھی اس پر رشک کریں گے جو میری عبادت کرنے پر اس سے مخالفت برتتے تھے۔

اور جب وہ کہتا ہے: اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ○

تو خدا ارشاد فرماتا ہے: (بی استعان عبدی والی التجاء اشهد کم لاعینه علی امره ولاغیثنه فی شدائده ولآخذن بیده یوم نوائبه) میرے بندے نے مجھ سے مدد طلب کی ہے اور میری پناہ میں آنے کی استدعا کی ہے، پس تم گواہ رہنا کہ میں اس کے ہر کام میں اس کی مدد کروں گا، اور میں مشکل حالات میں اس کی فریاد رسی کروں گا اور پریشانی ومصیبت کے دن اسے سہارا دوں گا۔

اور جب وہ کہتا ہے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ○ صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ○ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّينَ ○

تو خدا ارشاد فرماتا ہے: (**هذا لعبدی و لعبدی ما سئل و قد استجبت لعبدی و اعطیته ما امل و آمنته مما منه وجل**) یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ جو کچھ وہ چاہتا ہے مجھے قبول ہے اور میں نے اپنے بندے کی ہر بات پوری کردی ہے اور جس چیز کی اس نے تمنا کی وہ میں نے اسے عطا کردی ہے اور وہ جس چیز سے خوفزدہ تھا میں نے اسے اس کی بابت امن و امان عطا کیا ہے۔

مذکورہ بالا روایت کی مانند ایک روایت کتاب علل الشرائع میں شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام رضا علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کی ہے' اور یہ روایت جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے نماز میں پڑھے جانے کے حوالے سے سورہ فاتحہ کی تفسیر کرتی ہے' پس اس سے ہمارے سابقہ بیان کی تائید ہوتی ہے کہ سورہ فاتحہ درحقیقت خدا کا ایسا کلام ہے جو اس نے اپنے بندہ کی نیابت میں پیش کیا ہے کہ جس میں بندہ اپنے خالق کے حضور مصروف عبادت ہو کر اظہار بندگی کرتے ہوئے اپنے پروردگار کی ثناء کرتا ہے اور اپنا حق بندگی ادا کرتا ہے لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ سورہ عبادت ہی کے لیے بنایا گیا ہے اور اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایسا کوئی سورہ نہیں جو اس مقام و منزلت کا حامل ہو' اس بیان سے میری مراد درج ذیل چند اہم نکات ہیں:

(۱)۔ یہ سورہ شروع سے آخر تک خدا کا ایسا کلام ہے جو اس نے اپنے بندے کی نیابت میں بیان کیا ہے کہ جب بندہ اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے آپ کو سراپا عبد سمجھ کر بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتا ہے تو یوں کہتا ہے! (اس سورہ کے الفاظ کے ذریعے اپنے دل کی بات کہتا ہے)۔

(۲)۔ یہ سورہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے: ایک حصہ خدا سے اور دوسرا حصہ بندے سے تعلق رکھتا ہے۔

(۳)۔ یہ سورہ اپنے اختصار کے ساتھ تمام معارف قرآنی پر مشتمل ہے اور اس میں قرآن کی تمام پاکیزہ تعلیمات کا خلاصہ ذکر کر دیا گیا ہے گویا الفاظ و آیات کے کم ہونے کے باوجود قرآنی علوم و معارف کی ایک وسیع کائنات اس میں پوشیدہ ہے اور یہ امر کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ قرآن اپنے بنیادی حقائق و معارف کی تابناک وسعتوں کے ساتھ کئی دیگر فروعات مثلاً اخلاق' عبادات' معاملات' سیاسیات اور اجتماعیات کے آداب و احکام' اطاعت پر ثواب اور معصیت پر عقاب کے ذکر اور سبق آموز داستانوں اور عبرت آمیز واقعات کے تذکرہ پر مشتمل مجموعہ ہے لیکن اس کے تمام بیانات کی بازگشت توحید' نبوت' معاد (قیامت) اور ان سب کے فروعات کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ہدایت اور انہیں دنیا و آخرت میں بھلائی و بہتری کی راہ دکھانے ہی کی طرف ہے' اور یہ سورہ مبارکہ (فاتحہ) لفظوں کے اختصار کے باوجود نہایت واضح معانی کے ساتھ مذکورہ بالا تمام بنیادی اصولوں پر مشتمل ہے۔

اگر آپ اس سورہ مبارکہ کی عظمت و جلالت کے بارے میں مزید آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس میں پائے جانے والے پاکیزہ مطالب اور مقدس معارف کہ جنہیں خداوند عالم نے مسلمانوں کے لیے نماز کا اہم حصہ قرار دیا ہے کا تقابلی

جائزہ ان باتوں سے لیں جو عیسائیوں (نصاریٰ) نے اپنی نماز میں شامل کر رکھی ہیں اور انجیل میں ان سب کو بیان کر دیا گیا ہے چنانچہ انجیل متی (۶۔۹۔۱۳) میں یوں مذکور ہے :

'' اے ہمارے رب! تو کہ جو آسمانوں میں ہے ! تیرا نام پاکیزہ رہے' تیرا حکم نافذ رہے' تیری مشیت جس طرح آسمان میں حکمفرما ہے اسی طرح زمین میں بھی حکمفرما رہے' ہماری روٹی (جو کچھ ہمارے پاس ہے) ہمارے لیے کافی ہے ، آج ہمیں عطا فرما (اپنی عنایت سے نواز!) اور ہمارے گناہوں کو معاف کر دے جس طرح کہ ہم خود ایک دوسرے کے گناہوں کو بخش دیتے ہیں' اور ہمیں وادیٔ امتحان میں نہ ڈال بلکہ اس کے بدلے میں ہمیں شیطان کے شر سے نجات عطا فرما''۔

انجیل کی مذکورہ بالا عبادت پر غور کیجئے اور ان الفاظ سے جو معانی آپ سمجھ سکتے ہیں ان پر توجہ فرمایئے اور دیکھئے کہ ان میں کلام الٰہی اور معارف آسمانی کے نام پر لوگوں کو کیا کچھ سمجھایا جاتا ہے اور انہیں باور کرایا جاتا ہے کہ آداب بندگی یہ ہیں: سب سے پہلے نماز گزار سے کہا جاتا ہے کہ وہ یوں کہے کہ ان کا باپ (خدا) آسمانوں میں ہے (جبکہ خداوند عالم مکان و مکانیات سے پاک اور بے نیاز ہے) اس کے بعد باپ (خدا) کے لیے یوں دعا کرے کہ اس کا نام مقدس رہے' اس کا حکم نافذ رہے' اس کی مشیت زمین میں اسی طرح نافذ و حکم فرما ہو جس طرح سے آسمان میں حکم فرما ہے' یہ تمام دعائیں مانگنے والا یہ نہیں جانتا کہ انہیں کس نے شرف قبولیت عطا کرنا ہے' حقیقت یہ ہے کہ یہ سب دعائیں حقیقی معنوں میں دعا ہونے کی بجائے ان سیاسی نعروں سے زیادہ مشابہت رکھتی ہیں جو سیاسی پارٹیاں لگاتی رہتی ہیں۔

اس کے بعد نماز گزار سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے آج کے دن کی روٹی کا سوال کرو' اور کہو کہ ہمارے گناہ اسی طرح معاف کرے جیسے ہم ایک دوسرے کے گناہ معاف کر دیتے ہیں اور اسی طرح اپنے حق سے درگزر کرے جس طرح ہم ایک دوسرے کو اپنے حقوق معاف کر دیتے ہیں......،

نصرانی نماز گزار یہ سب باتیں جہالت اور غفلت کے سبب کرتا ہے ورنہ اگر خدا ان کے لیے کوئی حق اور حقوق قرار نہ دیتا تو انہیں کسی قسم کا کوئی حق حاصل ہی نہ تھا کیونکہ خدا کے سوا اور کون ہے جو انہیں کوئی حق عطا کرے۔

پھر نماز گزار سے کہا جاتا ہے کہ یوں کہے: اے خدا ہمارا امتحان نہ لے بلکہ ہمیں شیطان کے شر سے نجات عطا کر ۔ ۔ ۔ ،

حالانکہ یہ بات کہنا نادرست بلکہ محال و ناممکن چیز کے طلب کرنے کے برابر ہے کیونکہ یہ دنیا تو امتحان و آزمائش کا گھر ہے اور اس میں طلب کمال کی ترغیب دلائی گئی ہے' پس اگر امتحان اور ابتلاء و آزمائش نہ ہو تو شر شیطان سے نجات مانگنا ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام مطالب سے زیادہ تعجب آور وہ بات ہے جو کتاب ''تاریخ تمدن اسلام'' کے مؤلف فاضل پادری گستا ولبون (عیسائی) نے لکھی ہے جس کا شمار یورپ کے بلند پایہ مؤرخین اور ارباب فکر و دانش میں ہوتا ہے' اس کے بیان کو بعض نام

نہاد مسلمان دانشوروں نے بھی نہایت اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس کے نظریے کی تائید کی ہے اور اسے صحیح قرار دیتے ہوئے اس کا ساتھ دیا ہے' اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ: اسلام اپنے علوم و معارف میں دیگر ادیان پر کوئی برتری نہیں رکھتا کیونکہ تمام ادیان الٰہی اور مذاہب آسمانی انسان کو توحید' تزکیۂ نفس' حسن خلق' اچھی عادات اور نیک اعمال کی دعوت دیتے ہیں اور اسلام نے بھی یہی کچھ کہا ہے جبکہ کسی ایک دین کی دوسرے دین پر برتری اجتماعی و معاشرتی مسائل میں ایسے مؤثر نظام کے پیش کرنے میں ہوتی ہے جس کے نتائج کائنات انسانی کے لیے مفید ثابت ہوں۔

دیگر روایات پر ایک نظر

صراط مستقیم سے مراد کیا ہے؟

کتاب '' من لا یحضرہ الفقیہ'' اور تفسیر ''العیاشی'' میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: صراط مستقیم سے مراد حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔

معانی الاخبار کی روایت

کتاب معانی الاخبار میں ''صراط مستقیم'' کے سلسلے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ فرمان مذکور ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

(ھی الطریق الیٰ معرفة الله، وھما صراطان: صراط فی الدنیا و صراط فی الآخرة، فاما الصراط فی الدنیا فھو الامام المفترض الطاعة، من عرفه فی الدنیا واقتدیٰ بھداہ مر علی الصراط الذی ھو جسر جھنم فی الآخرة، ومن لم یعرفه فی الدنیا زلت قدمه فی الآخرة فتردیٰ فی نار جھنم،)

(اس سے مراد معرفت الٰہی کا راستہ ہے اور وہ دو طرح پر ہے: ایک راستہ دنیا میں ہے اور ایک راستہ آخرت میں ہے' جو راستہ دنیا میں ہے اس سے مراد وہ امامؑ برحق ہے جس کی اطاعت لوگوں پر واجب قرار دی گئی ہے پس جو شخص اس دنیا میں اپنے راستہ یعنی امامؑ برحق کی معرفت حاصل کرلے اور اس کی اطاعت کرے تو وہ آخرت میں اس راستہ (پل) سے آسانی کے ساتھ گزر جائے گا جو جہنم کے اوپر بنایا گیا ہے اور جو شخص اس دنیا میں اپنے امامؑ کی معرفت حاصل نہ کرسکے تو اس کے قدم

آخرت میں بھی ڈگمگا جائیں گے اور وہ آتش جہنم میں اوندھے منہ گر جائے گا)

امام زین العابدینؑ کا فرمان

کتاب معانی الاخبار میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

لیس بین الله و بین حجته حجاب، ولا لله دون حجته ستر، نحن ابواب الله، و نحن الصراط المستقیم، و نحن عیبة علمه، و نحن تراجمة وحیه، و نحن ارکان توحیده، و نحن موضع سره.

(خدا اور حجت اللہ..... امام برحق ..... کے درمیان کوئی حجاب نہیں اور نہ ہی خدا اپنی حجت برحق کے سامنے حجاب میں ہے' ہم (آل محمدؐ) ابواب خدا ہیں' ہم صراط مستقیم ہیں' ہم خدا کے علم کا خزینہ ہیں' اور ہم اس کی وحی کے ترجمان ہیں' ہم ہی خدا کی توحید کے ارکان ہیں اور ہم ہی اس کے اسرار کا مخزن ہیں)

محبت اہل بیتؑ کی دعا

ابن شہر آشوب نے تفسیر وکیع بن جراح سے، اس نے ثوری' اس نے سدی' اس نے اسباط' اس نے مجاہد کے حوالہ سے روایت کی ہے کہ ابن عباسؓ نے "اھدنا الصراط المستقیم" کی تفسیر میں فرمایا:

قولوا معاشر العباد! ارشدنا الی حب محمد صلی الله علیه وآله وسلم و اهل بیته علیهم السلام.

(اس سے مراد یہ ہے کہ اے بندگان الٰہی: خدا کے حضور استدعا کرو کہ اے پروردگار ہمیں حضرت محمدؐ اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی محبت عطا فرما)

مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل متعدد روایات کتب حدیث میں موجود ہیں لیکن ہم نے یہاں چند روایات کے ذکر پر اکتفاء کی ہے اور ہمارا ایسا کرنا درحقیقت مفہوم یا کلی کو ایک واضح مصداق پر منطبق کرنے کے اس علمی طریقہ کے مطابق ہے جو حضرات آئمہ اطہار علیہم السلام کے فرامین سے حاصل کیا گیا ہے اور ہم نے اپنی اس کتاب میں کئی مقامات پر اس طریقہ کو اپنایا ہے اسے "جری" کہتے ہیں۔

قرآن کا ظاہر و باطن!

تفسیر العیاشی میں فضیل بن یسار سے منقول ہے انہوں نے کہا میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا جس میں کہا گیا ہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن' اور اس کے ہر حرف کی ایک حد معین ہے اور ہر حد کو جانے والا بھی کوئی ہے' تو اس حدیث میں "ظاہر اور باطن" سے کیا مراد ہے؟ امام علیہ السلام نے ارشاد

فرمایا:(ظهره تنزیل و بطنه تاویل، منه ما مضی و منه ما لم یکن بعد، یجری کما یجری الشمس والقمر، کلما جاء منه شیئ وقع) اس کے ظاہر سے مراد اس کی تنزیل ہے اور اس کے باطن سے مراد اس کی تأویل ہے، اور اس تأویل میں سے کچھ حصہ گزر چکا ہے اور کچھ حصہ ابھی آنے والا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے جیسے سورج اور چاند کا نظام چلتا ہے لہٰذا جب بھی کسی تأویل کا وقت آتا ہے تو وہ امر واقع ہو جاتا ہے۔

اس طرح کی کئی دیگر روایات موجود ہیں جو تطبیق کے علمی طریقہ (جری) کو بیان کرتی ہیں اور یہ طریقہ حضرات آئمہ معصومین علیہم السلام ہی کا ہے کہ وہ قرآن مجید کی ہر آیت کو اس کے مناسب اور موزوں امر پر منطبق کرتے تھے خواہ اس امر کا ظاہری تعلق آیت کے شان نزول سے کسی طرح سے بھی نہ ہو۔ آئمہ اطہار علیہم السلام کے اس طریقہ کو عقل بھی تسلیم کرتی ہے کیونکہ قرآن پوری کائنات کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے اور وہ کائنات ہستی کو بنیادی اعتقاد، اخلاق اور عمل کے اصولوں کی رہنمائی کرتا ہے (انہیں بتاتا ہے کہ وہ کیا عقیدہ رکھیں، کیا عمل کریں اور کیونکر زندگی گزاریں) اور قرآن نے جو علمی اصول و معارف بتائے ہیں وہ ایسی پاکیزہ حقیقتیں ہیں جو کسی ایک حالت یا خاص زمانے کے ساتھ مختص و مخصوص نہیں، اسی طرح قرآن مجید نے جن فضائل و رذائل کی نشاندہی کی یا کوئی عملی دستور بتایا وہ بھی نہ کسی خاص فرد کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہی کسی مخصوص زمانے کے لیے ہے بلکہ تمام شرعی احکام ہر فرد اور ہر زمانہ میں یکساں حیثیت کے حامل ہیں (اور یہی امر شریعت اسلامیہ کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے) البتہ جہاں تک کسی آیت کے شان نزول کی بات ہے تو یہ امر واضح ہے کہ شان نزول اس چیز یا اس واقعہ کو کہتے ہیں جو کسی شخص یا کسی واقعہ کے سلسلے میں کسی آیت یا آیات کے نزول کا سبب بنے، لہٰذا شان نزول، آیت میں ذکر کئے گئے حکم یا دستور کو اپنے محدود دائرے میں پابند نہیں کر دیتا، کیونکہ اگر ایسا ہو تو شرعی حکم کی افادیت ختم ہو کر رہ جائے گی اور اس کی حیثیت و اعتبار نہایت محدود ہو جائے گا اور وہ اس واقعہ تک باقی رہے گا جو اس کے نزول کا سبب تھا، لہٰذا جوں ہی وہ واقعہ ختم ہوا تو وہ حکم بھی خود بخود ختم ہو جائے گا اور اپنی وقعت کھو بیٹھے گا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی بیان کسی محدودیت کا شکار نہیں بلکہ وہ عمومیّت رکھتا ہے اور سبب و شان نزول اسے اپنی محدودیّت کا شکار نہیں کر سکتا۔ (قرآنی بیانات میں عموم پایا جاتا ہے اور وہ محدودیت سے خالی ہیں اس لیے اس کے احکام کے اسباب و علتوں میں اطلاق ہے اور وہ ہر قید و شرط سے مبرا ہیں۔ یہ بات قرآن کے امتیازات میں شامل ہے) مثلاً جب قرآن کچھ مومنین کی مدح و تعریف کرتا ہے تو اس کی وجہ ان مومنین میں پائی جانے والی فضیلت کو قرار دیتا ہے اور جب کسی کی مذمت کرتا ہے تو اس کا سبب اس برائی اور رذیلت کو قرار دیتا ہے جو اس شخص میں پائی جاتی ہے، لہٰذا کسی کی تعریف یا کسی کی مذمت کو صرف انہی افراد میں مخصوص نہیں کیا جا سکتا بلکہ قرآنی بیان کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس شخص میں بھی وہ فضیلت پائی جائے وہ لائق ستائش اور جس میں وہ برائی پائی جائے وہ قابل مذمت ہے، پس معلوم ہوا کہ شان نزول کسی آیت کی عمومی حیثیت کو زائل نہیں کرتا اور نہ ہی اسے اپنے دائرے میں محدود کر دیتا ہے، چنانچہ قرآن مجید نے خود اس کی طرف متوجہ کر دیا ہے اور اس سلسلہ میں یوں ارشاد فرمایا ہے

سورہ مائدہ، آیت ۱۶:

★ " یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ "

(خداوند عالم اس ...... قرآن ...... کے ذریعے ہر اس شخص کی ہدایت و رہنمائی کرتا ہے جو اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لئے قدم بڑھائے)

سورہ حم سجدہ، آیت ۴۲:

★ " وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۝ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ -- "۔

(وہ......قرآن......ایسی مقدس کتاب ہے کہ اس کی کسی جہت میں باطل راہ نہیں پا سکتا 'نہ اس کے سامنے سے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے!)

سورہ حجر، آیت ۹:

★ " اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ "

(ہم نے ہی ذکر ...... قرآن ...... نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

بہر حال قرآنی آیات کی تطبیق خواہ آئمہ اطہار علیہم السلام پر ہو یا ان کے اعداء پر' دونوں صورتوں میں واضح روایات موجود ہیں اور ہم انہی روایات کی روشنی میں آیات کی تطبیق کا وہ طریقہ جو ہمیں آئمہ معصومین علیہم السلام نے بتایا ہے نہایت آسانی کے ساتھ اپنا سکتے ہیں اور ایسی روایات مختلف ابواب میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ شاید ان کی تعداد سیکڑوں تک ہو' لیکن ہم نے یہاں آیات کی تطبیق کے طریقہ کی وضاحت کے لیے چند آیات کا تذکرہ کر دیا ہے تا کہ " طریقہء تطبیق " (جری) کی بنیاد معلوم ہو سکے اور ہم اس سلسلے کی دیگر روایات کو ان کی متعلقہ بحثوں کے باب میں زیادہ سے زیادہ پیش کریں گے کیونکہ اس کتاب میں ہمارا بنیادی مقصد روایات کی بابت تفصیلی بحث کرنا نہیں ہے البتہ موضوع کی مناسبت سے متعلقہ مطالب سے مربوط حد تک روایات کی بابت اظہار خیال سے اجتناب نہیں کیا جائے گا۔

سورۂ بقرہ

(گائے والی سورت)

اس سورہ کی ۲۸۶ آیات ہیں

پہلی پانچ آیات

○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾

○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾

○ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾

○ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾

○ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

ترجمہ

○ میری ابتداء اللہ کے نام سے ہے، جو رحمان ہے رحیم ہے۔
الم (۱)

○ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔ سرچشمۂ ہدایت ہے
پرہیزگاروں کے لیے۔ (۲)

○ وہ کہ جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق عطا کیا ہے
اس میں سے انفاق (راہ خدا میں خرچ) کرتے ہیں۔ (۳)

○ اور وہ ایمان رکھتے ہیں ہر اس چیز پر جو آپؐ پر نازل کی گئی اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں
جو اس سے پہلے نازل کی گئی اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ (۴)

○ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ (۵)

تفسیر و بیان

اس سورہء مبارکہ کی تنزیل چونکہ تدریجی ہوئی لہٰذا اس کی تمام آیات کے لیے کسی ایک جامع غرض کا تعین نہیں ہوسکتا' یعنی سورہء بقرہ کا نزول مختلف اوقات اور حالات میں ہوا اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی تمام آیتیں صرف ایک موضوع سے متعلق ہیں کہ جس کی غرض ایک سے زیادہ نہیں' البتہ اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کی اکثر آیات میں ایک خاص غرض اور مقصد ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم کی حقیقی عبادت کا راز اس میں مضمر ہے کہ اس کا بندہ ان تمام چیزوں ... کتب' صحف' احکام وغیرہ پر ایمان رکھتا ہو جو خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے نازل فرمائیں اور یہ کہ خدا کی نازل کی ہوئی کتابوں' احکام اور پیغمبروں میں کوئی فرق نہیں بلکہ سب خدا کی طرف سے ہیں، سب کے فرامین خدا کے فرامین ہیں' سب کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے!

اس سورہء مبارکہ میں مذکورہ بالا عظیم مطلب کے بیان کے علاوہ کافرین ومنافقین کی مذمت اور اہل کتاب کو بدعتیں پھیلانے' دین میں تفرقہ ڈالنے اور پیغمبروں کے درمیان فرق کا عقیدہ رکھنے پر مورد مذمت قرار دیا گیا ہے' اور اس کے علاوہ کئی بنیادی احکام مثلاً قبلہ کی تبدیلی' حج' میراث اور روزہ وغیرہ کے احکام بھی ذکر کئے گئے ہیں۔

الٓمّٓ

قرآن مجید کی کئی سورتوں کے آغاز میں الٓمّٓ کی طرح کے حروف ذکر کئے گئے ہیں جنہیں ''حروف مقطعہ'' کہتے ہیں یعنی ایسے حروف جن کا کسی جملے سے (بظاہر) کوئی تعلق و ربط نہیں' ان سب کی بابت سورہ، شوریٰ میں تفصیل سے بحث ہو گی۔ انشاء اللہ۔ اور اسی طرح یہ بھی بیان کیا جائے گا کہ قرآن کی ہدایت سے کیا مراد ہے اور اسے ''کتاب'' کیوں اور کس معنے میں کہا گیا ہے؟۔

متقین کے لیے سرچشمۂ ہدایت

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ ۔۔۔۔۔۔۔،

متقین سے مراد مومنین ہی ہیں کیونکہ تقویٰ اہل ایمان کے کسی خاص گروہ اور طبقہ کی مخصوص صفت کا نام نہیں، یعنی ایسا نہیں کہ تقویٰ' ایمان کے مراتب ودرجات میں سے ایک ہو اور اس کی حیثیت ایمان کے دیگر درجات مثلاً احسان' انکساری اور خلوص کی مانند ہو بلکہ وہ ایک ایسی پاکیزہ اور جامع صفت ہے جس میں ایمان کے تمام مراتب ودرجات پائے جاتے ہیں البتہ یہ صفت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ایمان حقیقی معنی میں وجود پذیر ہو جائے' اور اس کی دلیل بھی یہ ہے کہ خدا نے تقویٰ کو اہل ایمان کے کسی خاص گروہ کی مخصوص صفت کے طور پر ذکر نہیں کیا جبکہ مومنین اپنے مراتب ودرجات کے لحاظ سے مختلف اور کئی قسموں میں منقسم ہیں' اس سورہ مبارکہ کی پہلی سترہ آیتوں میں کہ جن میں مومنین' کفار' اور منافقین کے حالات واحوال بیان کئے گئے ہیں خداوند عالم نے تقویٰ کی پہچان کے لیے درج ذیل پانچ بنیادی صفات ذکر کی ہیں:

(۱)۔ غیب پر ایمان لانا

(۲)۔ نماز قائم کرنا

(۳)۔ خدا کے دیئے ہوئے رزق کو اس کی راہ میں خرچ کرنا

(۴)۔ جو کچھ خدا نے اپنے انبیاءؑ پر نازل فرمایا ہے اس پر ایمان لانا

(۵)۔ آخرت پر یقین رکھنا

ان صفات کے ذکر کے بعد خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ ان صفات کے حامل افراد ہی اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ یہ سب کچھ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اہل ایمان کا ان پاکیزہ صفات کے ساتھ متصف ہونا درحقیقت اس ہدایت کے سبب سے ہے جو خداوند عالم کی طرف سے انہیں حاصل ہوئی ہے۔ یعنی وہ ان صفات کے ساتھ جو انہیں خدا کی طرف سے ملنے والی ہدایت کے سبب سے حاصل ہوئی ہیں متقی و پرہیزگار ہوئے۔

پھر خداوند عالم نے قرآن مجید کی توصیف میں ارشاد فرمایا کہ یہ کتاب ان متقین کے لیے ہدایت ورہنما ہے:

☆ ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝''

(یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے!)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی ہدایت اس ہدایت سے مختلف ہے جو مذکورہ پانچ صفات کا سبب بنی، اور یہاں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ متقین کو دو ہدایتیں حاصل ہوئیں: پہلی وہ ہدایت جس کے سبب سے وہ متقی ہوئے اور دوسری وہ ہدایت جو خداوند عالم نے انہیں ان کے تقویٰ کی بدولت عطا فرمائی' یعنی حصول تقویٰ کے بعد اور اس سے پہلے والی ہدایت میں فرق ہے۔ پہلی ہدایت کے سبب وہ لوگ ان پانچ صفات کے حامل بن کر متقی قرار پائے اور دوسری ہدایت اس تقویٰ کے بعد حاصل ہوئی جو

خدا کی متقین پر خاص عنایت ہے اس صورت میں متقین کفار اور منافقین کے درمیان تقابلی جائزہ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے یعنی جس طرح متقین دو ہدایتوں کے حامل ہیں اسی طرح کفار بھی دو گمراہیوں میں اور منافقین دو طرح کے اندھے پن میں مبتلا ہیں۔ ایک وہ گمراہی اور اندھا پن جو ان کے کفر و نفاق کی بدترین وادی میں گر جانے کا سبب ہے اور دوسری وہ گمراہی اور اندھا پن جو ان کی پہلی ضلالت و گمراہی میں شدت کا باعث ہوا جس کے نتیجے میں وہ کفر و نفاق کی پستی کا شکار ہو کر بھٹک گئے۔
چنانچہ خداوند عالم نے کفار کی بابت یوں ارشاد فرمایا:
سورہء بقرہ، آیت ۷:

★ "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ۔۔۔"

(اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی اور ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ ہے۔۔)

اس آیت میں خداوند عالم نے "مہر لگانے" کی نسبت اپنی طرف دی اور پردے کی نسبت خود ان کی طرف دی۔
اور پھر منافقین کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا :
سورہء بقرہ، آیت ۱۰:

★ "فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔۔۔"

(ان کے دلوں میں بیماری ہے، پس خدا ان کی بیماری میں اضافہ کر دیتا ہے)۔

اس آیت میں خداوند عالم نے ان کی پہلی بیماری کی نسبت خود ان کی طرف دی اور دوسری بیماری (پہلی بیماری میں اضافہ) کی نسبت اپنی طرف دی ہے اس مطلب و مفہوم کو ایک اور آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوا :
سورہء بقرہ، آیت ۲۶:

★ "یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ۔"

(خداوند عالم اس قرآن کے ذریعے کثیر لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور اسی کے ذریعے کثیر لوگوں کی ہدایت کرتا ہے اور اس کے ذریعے کسی کو گمراہ نہیں کرتا سوائے فاسق لوگوں کے)

اسی طرح ارشاد الٰہی ہوا :
سورہء، صف، آیت ۵:

★ "فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ"

(پس جب وہ خود حق کے راستے سے منحرف ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا)۔

بہر حال یہ امر ثابت ہو گیا کہ متقین دو ہدایتوں کے درمیان قرار پائے ہوئے ہیں جیسا کہ کفار و منافقین دو گمراہیوں میں مبتلا ہیں اور انہی میں گھرے ہوئے ہیں اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ متقین کی دوسری ہدایت کا تعلق قرآن مجید سے ہے جبکہ پہلی ہدایت قرآن سے پہلے فطرت سلیمہ کے سبب انہیں حاصل ہے کیونکہ فطرت سلیمہ اس حقیقت سے کبھی غافل نہیں ہو سکتی کہ

وہ اپنی ذات میں کسی ایسی قوت کی محتاج ہے جو اس کے دائرہ وجود سے باہر ہے' یعنی ہر وہ شخص جو فطرت سلیمہ رکھتا ہے وہ اس امر کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود و ہستی میں کسی ایسی قوت کا محتاج ہے جو اس کے ظاہری وجود کی حدود سے باہر ہے اور اسی طرح ہر وہ شے جو احساس' وہم اور عقل کے دائرے میں آتی ہے وہ بھی اپنے وجود و ہستی میں ایک ایسی حقیقت کی محتاج ہے جس پر اس کے تمام امتیازات کا سلسلہ منتہی ہوتا ہے' پس فطرت سلیمہ ایک ایسی پاکیزہ حقیقت کے وجود پر ایمان و یقین رکھتی ہے جو عالم حس سے بالاتر بلکہ دور ہے۔ اور وہی تمام موجودات کا سرچشمۂ وجود ہے (مبداء ہے) اور سب کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے اور وہی سب کا منتہا ہے' گویا سب کی ابتداء اسی سے ہے اور سب کی انتہا اسی پر ہے اور اسی کی طرف سب نے پلٹ کر جانا ہے۔ اسی طرح فطرت سلیمہ کا اس بات پر بھی یقین ہے کہ وہ ذات جو کائنات ہستی کا سرچشمۂ وجود ہے اور وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی مخلوق کی احتیاجات اور ضرورتوں سے غافل نہیں تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ وہ لوگوں کی ہدایت اور ان کے اعمال واخلاق سے غافل ہو اور انہیں اخلاقی برائیوں کی تباہ کن صورتوں سے آگاہ نہ کرے اور ان تباہ کن صورتوں سے بچنے کی ہدایت اور رہنمائی کا کام انجام نہ دے۔ فطرت سلیمہ کے اسی ایمان و یقین ہی کا دوسرا نام اصول دین یعنی توحید' نبوت اور قیامت پر ایمان لانا ہے' اور جب کوئی شخص اپنی فطرت سلیمہ کے ساتھ ان امور پر ایمان واعتقاد قائم کر لے تو پھر اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس ذات والا صفات کے سامنے اس کی ربوبیت کا اقرار واعتراف کرتے ہوئے سر تسلیم خم کر دے' اور پھر اپنے اس پاکیزہ اعتقاد کو عام کرنے اور دوسروں کو اس مقدس حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے جہاں تک ممکن ہو اپنے مال' جاہ وجلال اور علم وکمال کی دولت اس راہ میں خرچ کرے اور یہ دونوں کام یعنی عالم حس سے باہر کی حقیقت پر ایمان و یقین اور اس یقین واعتقاد کو عام کرنے کے لیے اپنے تمام تر وسائل کا بروئے کار لانا ہی ''صلوۃ'' اور ''انفاق'' کا دوسرا نام ہے بلکہ اس کی اصل حقیقت ہے..... (گویا اس آیت مبارکہ میں ''صلوۃ'' اور ''انفاق'' کا مفہوم عام ہے اور ان سے مخصوص و معین معانی مراد نہیں بلکہ اس عام اور وسیع مفہوم میں خاص اور مخصوص و معین معانی بھی شامل ہو جائیں گے)۔

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہو گیا کہ خداوند عالم نے متقین کی جن پانچ صفات کو ذکر کیا ہے وہ فطرت ہی کے مقدس تقاضے ہیں اور خدا نے انہی صفات کے حامل افراد سے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ایک پاکیزہ امر یعنی ہدایت کی نعمت سے نوازے گا (یعنی ایسی ہدایت عطا کرے گا جو فطری تقاضوں سے بلند تر ہے) لہٰذا یہ پاکیزہ اعمال جنہیں متقین کی صفات کے طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ دو ہدایتوں...... ہدایت کی دو قسموں کے درمیان واقع ہوتے ہیں اور اگر پہلی ہدایت کے بعد یہ دونوں پختہ اعتقاد اور نیک اعمال نہ ہوں تو دوسری ہدایت کا حصول ممکن نہیں ہوتا' اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس امر کا واضح ثبوت پایا جاتا ہے کہ یہ دوسری ہدایت جو کہ خدا کی طرف سے ہے پہلی ہدایت کی فرع ہے یعنی پہلی ہدایت اصل واساس اور حقیقی بنیاد ہے جس کے بعد دوسری ہدایت کے حصول کی راہ ہموار ہوتی ہے' ان آیات میں سے چند بطور مثال پیش کی جاتی ہیں:

سورہ ابراہیم آیت ۲۷:

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ

(ثابت قدم رکھتا ہے خدا ان لوگوں کو جو ایمان لائے محکم بات کے ساتھ دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں۔۔)

سورہ حدید آیت ۲۸:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ

(اے اہل ایمان! تقوائے الٰہی اختیار کرو اور ایمان لاؤ خدا کے رسولؐ پر' خدا تمہیں اپنی رحمت میں سے دو حصے دے گا اور تمہارے لیے ایسا نور اور روشنی قرار دے گا جس کے ذریعے تم چل پھر سکو گے)

سورہ محمدؐ آیت ۷:

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ

(اگر تم خدا کی نصرت کرو تو وہ بھی تمہاری نصرت کرے گا اور تمہیں ثابت قدم بنا دے گا)

سورہ صف آیت ۷:

وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ

(اور خدا ظالموں کو ہدایت کی نعمت عطا نہیں کرتا)

سورہ صف آیت ۵:

وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ

(اور خدا فاسق لوگوں کو ہدایت کی نعمت عطا نہیں کرتا)

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ متعدد دیگر آیات میں بھی ان مطالب کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کفار و منافقین کی گمراہی وضلالت بھی اسی طرح دو قسموں اور دو مرحلوں کی حامل ہے جس طرح کہ متقین کی ہدایت کے بارے میں ذکر ہو چکا ہے' تاہم اس کا تفصیلی تذکرہ عنقریب آئے گا' انشاء اللہ۔

بہر حال مذکورہ بالا آیات میں انسان کی ایک اور زندگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نہایت مضبوط اور مستقل بنیادوں پر استوار ہے اور اسے اس دنیاوی زندگی سے وہی نسبت ہے جو باطن کو ظاہر سے ہوتی ہے یعنی وہ اخروی زندگی اس دنیاوی زندگی کے ''باطن'' کی حیثیت رکھتی ہے' گویا وہی اصل و اساس ہے اور وہی انسان کی اس دنیاوی زندگی بلکہ موت کے بعد اور دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کے وقت بھی بنیادی حیثیت کی حامل ہے یعنی اس پر انسان کے تمام امور اور نظام حیات کا دار و مدار ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ، انعام، آیت ۱۲۲:

★ " اَوَ مَنۡ كَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰهُ وَ جَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِهٖ فِی النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا۔"

(اور وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی عطا کی اور اس کے لیے ایک روشنی قرار دی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا (رہتا) ہے کیا اس شخص جیسا ہے کہ جو اندھیروں میں پڑا ہے کہ کبھی وہاں سے باہر نہ آ سکے گا)۔

اُخروی زندگی کے بارے میں انشاءاللہ ہم تفصیلی تذکرہ عنقریب کریں گے۔

ایمان کا حوالہ

" یُؤۡمِنُوۡنَ۔۔۔"

(وہ ایمان رکھتے ہیں۔۔)

''ایمان'' سے مراد عقیدہ کا دل میں جاگزین ہونا ہے۔ لفظوں کے لحاظ سے اس کی اصل ''امن'' ہے یعنی یہ امن سے مشتق ہوا ہے لہٰذا اس مناسبت سے اس کا معنی یوں ہوگا کہ مومن جس پر ایمان رکھتا ہے اس کی بابت اسے اپنے قلبی اطمینان کی دولت عطا کرتا ہے کہ پھر وہ کسی قسم کے شک وشبہ کا شکار نہیں ہوتا کیونکہ شک' اعتقاد کی جڑوں کو کمزور کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسے عقیدہ کے لیے ''آفت'' کا نام دیا گیا ہے اور ایمان کی بابت یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے کئی مراتب و درجات ہیں کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق یقین پیدا ہو جائے تو وہ یقین اسی چیز تک محدود ہوتا ہے لہٰذا اسی حد تک اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں' اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس یقین میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے، تو جس چیز کے بارے میں یقین پیدا ہوتا ہے وہ اس کے ''بعض لوازم'' کو بھی اپنے دائرے میں لے لیتا ہے' اور کبھی وہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اس شے کے ''تمام لوازم'' سے مربوط ہو جاتا ہے' تو اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ اہل ایمان کے مراتب بھی اتنے ہی ہیں جتنا کہ ایمان کے مراتب و درجات ہیں۔ (اور مومنین کے ایمانی درجات کا تعین ان کے اعتقاد و یقین کے مراتب کے مطابق ہوتا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومنین اپنے ایمانی مراتب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے فرق رکھتے ہیں یعنی جس قدر ایمان میں پختگی ہوگی اسی قدر ایمانی مرتبہ بلند ہوگا اور جس قدر ایمان و یقین کمزور ہوگا اتنا ہی ایمانی درجہ کم ہوگا۔ لوازم سے مراد وہ امور ہیں جو کسی چیز کے وجود کے ساتھ اس طرح وابستہ و متعلق ہوتے ہیں کہ اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔

ایمان کی مربوطہ جہت کا حوالہ

" بِالۡغَیۡبِ"

''غیب'' (پوشیدہ)۔ یہ لفظ ''شہود'' یعنی ظاہر کے مقابل میں آتا ہے' اس کا استعمال ہر اس شے پر صحیح ہے جو

سورہ ۶، انعام، آیت ۱۲۲:

★ " اَوَ مَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا۔"

(اور وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی عطا کی اور اس کے لیے ایک روشنی قرار دی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا (رہتا) ہے کیا اس شخص جیسا ہے کہ جو اندھیروں میں پڑا ہے کہ کبھی وہاں سے باہر نہ آ سکے گا)۔

اُخروی زندگی کے بارے میں انشاءاللہ ہم تفصیلی تذکرہ عنقریب کریں گے۔

ایمان کا حوالہ

" يُؤۡمِنُوۡنَ۔۔۔"

(وہ ایمان رکھتے ہیں۔۔)

''ایمان'' سے مراد عقیدہ کا دل میں جاگزین ہونا ہے۔ لفظوں کے لحاظ سے اس کی اصل ''امن'' ہے یعنی یہ امن سے مشتق ہوا ہے لہٰذا اس مناسبت سے اس کا معنی یوں ہوگا کہ مومن جس پر ایمان رکھتا ہے اس کی بابت اسے اپنے قلبی اطمینان کی دولت عطا کرتا ہے کہ پھر وہ کسی قسم کے شک وشبہ کا شکار نہیں ہوتا کیونکہ شک' اعتقاد کی جڑوں کو کمزور کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسے عقیدہ کے لیے ''آفت'' کا نام دیا گیا ہے اور ایمان کی بابت یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے کئی مراتب ودرجات ہیں کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق یقین پیدا ہو جائے تو وہ یقین اسی چیز تک محدود ہوتا ہے لہٰذا اسی حد تک اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں' اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس یقین میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے، تو جس چیز کے بارے میں یقین پیدا ہوتا ہے وہ اس کے ''بعض لوازم'' کو بھی اپنے دائرے میں لے لیتا ہے' اور کبھی وہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اس شے کے ''تمام لوازم'' سے مربوط ہو جاتا ہے' تو اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ اہل ایمان کے مراتب بھی اتنے ہی ہیں جتنا کہ ایمان کے مراتب ودرجات ہیں۔ (اور مومنین کے ایمانی درجات کا تعین ان کے اعتقاد ویقین کے مراتب کے مطابق ہوتا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومنین اپنے ایمانی مراتب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے فرق رکھتے ہیں یعنی جس قدر ایمان میں پختگی ہوگی اسی قدر ایمانی مرتبہ بلند ہوگا اور جس قدر ایمان ویقین کمزور ہوگا اتنا ہی ایمانی درجہ کم ہوگا۔ لوازم سے مراد وہ امور ہیں جو کسی چیز کے وجود کے ساتھ اس طرح وابستہ ومتعلق ہوتے ہیں کہ اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔

ایمان کی مربوطہ جہت کا حوالہ

" بِالۡغَيۡبِ"

''غیب'' (پوشیدہ)۔ یہ لفظ'' شہود ''یعنی ظاہر کے مقابل میں آتا ہے' اس کا استعمال ہر اس شے پر صحیح ہے جو

قوت حس کی گرفت سے بالاتر ہو یعنی محسوسات کی دنیا سے باہر ہو اور ہم جب موجودات ہستی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی شے جو محسوسات سے باہر ہو وہ صرف ذات خداوند عالم اور اس کی وہ عظیم آیات ہیں جو ہمارے حواس سے مخفی و پوشیدہ ہیں کہ جن میں سے ایک وحی ہے کہ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

★ "وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ"

(اور وہ لوگ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو تمہاری طرف نازل کیا گیا اور اس پر جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا)

پس ایمان بالغیب (غیب پر ایمان لانا) جو کہ وحی پر ایمان لانے اور آخرت پر یقین رکھنے کے مقابل ذکر ہوا ہے اس سے مراد خدائے متعال پر ایمان لانا ہے۔ اور اسی سے اصول دین کے تین بنیادی ارکان پر ایمان کی تکمیل ہو جاتی ہے، یعنی خدا پر ایمان، وحی پر ایمان اور آخرت پر ایمان، (توحید، نبوت، معاد) اور قرآن مجید اس بات کی بھرپور تاکید کرتا ہے کہ صرف محسوسات پر اکتفاء نہیں کرنی چاہیے یعنی یہ کہ ہم صرف اسی چیز پر ایمان لائیں جو ہماری قوت حس کے دائرے میں آئے بلکہ اعتقاد و یقین اور ایمان و عقیدہ کے سلسلہ میں عقل سلیم اور صحیح فکر و نظر سے کام لینا چاہیے، گویا قرآن نے ہمیں دو امور کی تاکید کی: ایک یہ کہ ہم اپنے ایمان کو صرف محسوسات تک محدود نہ رکھیں اور دوسرے اس امر کی ترغیب دلائی ہے کہ ہم عقل و خرد اور فکر و نظر کی قوتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ایمان کی بنیادوں کو مضبوط کریں۔

آخرت پر یقین کا حوالہ

"وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ"

(اور وہ آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں)

اس جملے میں ایمان کی بجائے یقین کا لفظ استعمال کیا گیا اور "یومنون" کی بجائے "یوقنون" کہا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے غیب کے ساتھ ایمان کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمیں اس امر سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ تقویٰ یقین کے بغیر نامکمل ہے یعنی آخرت پر پختہ یقین سے تقویٰ کی تکمیل ہوتی ہے ایسا یقین کہ جس میں نسیان (آخرت کو بھول جانے) کی کوئی گنجائش ہی نہیں، جبکہ صرف ایمان میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی کیونکہ کبھی انسان کسی چیز پر ایمان رکھتا ہے لیکن اس کے بعض متعلقہ امور کو بھول جاتا ہے اور ایسا کام کر لیتا ہے جو اس چیز کے منافی ہو، لیکن اگر وہ اس دن کو جانتا اور مدنظر رکھتا ہو (اس کی بابت یقین رکھتا ہو) جس میں اس کے ہر چھوٹے، بڑے اور تھوڑے، زیادہ عمل کا پورا پورا حساب لیا جائے گا تو وہ کبھی ایسا کام نہیں کرے گا جو اسے ہلاکت و تباہی کے گہرے کنویں میں ڈال دے اور نہ ہی وہ کسی ایسے عمل کے قریب جائے گا جسے خدا نے حرام اور ممنوع قرار دیا ہو، چنانچہ خداوند عالم نے اسی سلسلے میں ارشاد فرمایا:

سورہ ص، آیت ۲۶:

★ "وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا

نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ "۔

(اور آپ خواہشات نفس کی پیروی نہ کریں ورنہ وہ آپ کو خدا کی راہ سے دور کر دیں گی، وہ لوگ جو خدا کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت ترین عذاب ہے کیونکہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے)۔

اس آیت شریفہ میں خدا نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ خدا کی راہ سے بھٹک جانے کا سبب، حساب کے دن کو بھلا دینا ہے، پس نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن کی یاد اور اس پر یقین رکھنے کا نتیجہ، تقویٰ کا حصول ہے، یعنی جو شخص یوم حساب کو یاد رکھے اور اس پر پختہ یقین قائم کرے وہی متقی کہلائے گا۔

تقویٰ کا نتیجہ: خدائی ہدایت

" اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ "

(یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں)

حقیقت میں ہر قسم کی ہدایت خدا کی طرف سے ہے لیکن جب اس کی نسبت خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف ہو تو وہ حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہو گی کیونکہ خدا کے علاوہ کسی کی طرف ہدایت کی حقیقی نسبت کسی صورت میں نہیں دی جا سکتی، ہدایت کی حقیقی اور مجازی نسبت کی بابت عنقریب تفصیلی بحث آئے گی، انشاء اللہ۔

زیر نظر آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے مومنین کی توصیف، ہدایت کے ساتھ کی ہے اور ہدایت کی بابت سورہ انعام آیت ۱۲۵ میں یوں ارشاد فرمایا:

★ " فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ "

(پس اللہ جس کے بارے میں ہدایت کا ارادہ کرے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول لیتا ہے)

شرح صدر یعنی سینہ کھول دینے سے مراد یہ ہے کہ اس میں وسعت پیدا کر دیتا ہے کہ پھر ہر قسم کی تنگی و تنگ نظری اس سے دور ہو جاتی ہے، چنانچہ اسی سلسلے میں پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ حشر، آیت ۹:

★ " وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "

(اور جسے اس کے نفس کے بخل و حرص سے بچایا گیا تو ایسے لوگ ہی کامیاب ہیں)

اہل ایمان اور ہدایت کے بارے میں وضاحت کرنے کے بعد خداوند عالم نے اس آیہ مبارکہ..... آیت ۵ سورہ بقرہ..... میں " اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ " کے بعد ان کی فلاح و کامیابی کے متعلق یوں ارشاد فرمایا: " وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ "۔

(اور آپ خواہشات نفس کی پیروی نہ کریں ورنہ وہ آپ کو خدا کی راہ سے دور کر دیں گی' وہ لوگ جو خدا کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت ترین عذاب ہے کیونکہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے)۔

اس آیت شریفہ میں خدا نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ خدا کی راہ سے بھٹک جانے کا سبب' حساب کے دن کو بھلا دینا ہے' پس نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن کی یاد اور اس پر یقین رکھنے کا نتیجہ، تقویٰ کا حصول ہے' یعنی جو شخص یوم حساب کو یاد رکھے اور اس پر پختہ یقین قائم کرے وہی متقی کہلائے گا۔

تقویٰ کا نتیجہ: خدائی ہدایت

" أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ "

(یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں)

حقیقت میں ہر قسم کی ہدایت خدا کی طرف سے ہے لیکن جب اس کی نسبت خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف ہو تو وہ حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہو گی کیونکہ خدا کے علاوہ کسی کی طرف ہدایت کی حقیقی نسبت کسی صورت میں نہیں دی جا سکتی' ہدایت کی حقیقی اور مجازی نسبت کی بابت عنقریب تفصیلی بحث آئے گی' انشاء اللہ۔

زیر نظر آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے مومنین کی توصیف، ہدایت کے ساتھ کی ہے اور ہدایت کی بابت سورہ انعام آیت ۱۲۵ میں یوں ارشاد فرمایا:

★ " فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ "

(پس اللہ جس کے بارے میں ہدایت کا ارادہ کرے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول لیتا ہے)

شرح صدر یعنی سینہ کھول دینے سے مراد یہ ہے کہ اس میں وسعت پیدا کر دیتا ہے کہ پھر ہر قسم کی تنگی و تنگ نظری اس سے دور ہو جاتی ہے' چنانچہ اسی سلسلے میں پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ حشر، آیت ۹:

★ " وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ "

(اور جسے اس کے نفس کے بخل و حرص سے بچایا گیا تو ایسے لوگ ہی کامیاب ہیں)

اہل ایمان اور ہدایت کے بارے میں وضاحت کرنے کے بعد خداوند عالم نے اس آیہ مبارکہ..... آیت ۵ سورہ بقرہ..... میں " أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ " کے بعد ان کی فلاح و کامیابی کے متعلق یوں ارشاد فرمایا: " وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ "، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

روایات پر ایک نظر

غیب پر ایمان لانے والے!

کتاب معانی الاخبار میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپؑ نے "اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

(من آمن بقیام القائم (ع) انه حق) اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت قائم آل محمدؑ کے تشریف لانے اور ان کے قیام کرنے پر ایمان لائے اور اسے حق تسلیم کیا۔

مذکورہ بالا روایت کی طرح دیگر متعدد روایات میں اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے' اور یہاں بھی "اصول تطبیق" سے استفادہ کیا گیا ہے جس کا تذکرہ سورہ فاتحہ میں وضاحت کے ساتھ ہو چکا ہے۔

خدائی رزق (علم) سے خرچ کرنے والے!

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے جو علم انہیں عطا کیا ہے وہ اسے دوسروں تک پہنچاتے اور اس میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ (ومما علمناهم يبثون)

تلاوت قرآن کرنے والے!

کتاب معانی الاخبار میں اسی آیت کی بابت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(ومما علمناهم يبثون، ومما علمناهم من القرآن يتلون)

اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے جو علم انہیں عطا کیا ہے اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں (دوسروں کو تعلیم دیتے ہیں اور اس علم کو پھیلاتے ہیں) اور ہم نے انہیں قرآن سے جو کچھ پڑھایا ہے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں "انفاق" (خدا کی راہ میں خرچ کرنے) کو اس کے وسیع معنے پر محمول کیا گیا ہے

یعنی اس سے مراد صرف مال کا خرچ کرنا نہیں بلکہ ہر نعمت الٰہی خواہ وہ مال ہو یا علم یا کوئی دوسری چیز' اسے خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور خدا کی راہ میں اسے استعمال میں لانا مقصود ہے۔ اور یہ "انفاق" کا وسیع معنی ہے۔

ایک فلسفیانہ بحث

یہاں ہم اس بارے میں گفتگو کریں گے کہ آیا ادراکات حسّیہ کے علاوہ مبانی عقلیہ کو (ایمان وعقیدہ کی) بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی جن امور کا قوت حس ادراک نہ کر سکے بلکہ ان کی بابت صرف عقل کا فیصلہ ہی معیار ہو تو آیا نظریات کی دنیا میں ان کا سہارا لیا جا سکتا ہے؟

یہ مسئلہ مغربی دانشوروں کے درمیان معرکۃ الآراء موضوعات میں سے ایک ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے بھرپور بحثیں کی ہیں' خاص طور پر عصر حاضر کے محققین نے اس موضوع پر اپنی علمی قوتیں صرف کر کے اسے اہم ترین مسائل میں شمار کر دیا ہے' جبکہ قدیم دانشوروں اور مسلمان فلاسفر حضرات نے حس اور عقل (محسوسات اور معقولات) دونوں کو (نظریات کی) بنیاد بنانا صحیح قرار دیا ہے بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ علمی دلیل محسوسات کو محسوسات ہونے کی حیثیت میں اپنے دائرے میں ہی نہیں لاتی لیکن اس کے باوجود مغربی دانشوروں نے اس مسئلہ میں بہت زیادہ اختلاف رائے کیا اور ان کی اکثریت بالخصوص علم سائنس کے ماہرین نے حسی قوتوں کے علاوہ کسی چیز کو نظریات کی بنیاد قرار دینا صحیح نہیں سمجھا اور وہ سب اس بات پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ صرف محسوسات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، وہ اپنے اس مؤقف پر یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ عقلیات محضہ (وہ امور جو صرف عقل کے ساتھ مربوط ہیں اور ان کی بابت صرف عقلی دلیل وفیصلہ ہمارے سامنے ہے) میں اکثر خطا واقع ہوتی ہے (یعنی وہ اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں) اور یہ تبھی ہوتا ہے جب ان کے ساتھ کوئی ایسی قوت موجود نہ ہو جو صحیح وغلط کے درمیان تمیز پیدا کر دے یعنی حس وتجربہ کہ جو جزئیات کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے کو ظاہر کرتے ہیں' جبکہ ادراکات حسیہ ایسے نہیں' (یعنی ان میں عقلیات محضہ کی طرح خطا واقع نہیں ہوتی) یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنے حواس میں سے کسی ایک کے ذریعے کسی چیز کا ادراک کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ اس جیسی دیگر مثالیں دے کر اپنے تجربات کے ذریعے اس کی تصدیق کر لیتے ہیں اور پھر اس عمل کو اس وقت تک بار بار دہراتے ہیں جب تک ہمارا حقیقی مقصود ہمیں حاصل نہ ہو جائے اور ہم تصور وخیال کی دنیا سے باہر نکل کر اپنے مطلوبہ امر کا عملی مشاہدہ نہ کر لیں اور اس مرحلہ تک نہ پہنچ جائیں کہ اس کی بابت پھر کوئی شک لاحق نہ ہو۔

یہ ہے ان دانشوروں کی دلیل جو غیر محسوس قوتوں کو معیار قرار دینا صحیح نہیں سمجھتے اور صرف محسوسات کو تمام امور (اور نظریات) کی بنیاد مانتے ہیں۔

یعنی اس سے مراد صرف مال کا خرچ کرنا نہیں بلکہ ہر نعمت الٰہی خواہ وہ مال ہو یا علم یا کوئی دوسری چیز' اسے خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور خدا کی راہ میں اسے استعمال میں لانا مقصود ہے۔ اور یہ'' انفاق '' کا وسیع معنی ہے۔

ایک فلسفیانہ بحث

یہاں ہم اس بارے میں گفتگو کریں گے کہ آیا ادراکات حسّیہ کے علاوہ مبانی عقلیہ کو (ایمان و عقیدہ کی) بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی جن امور کا قوت حس ادراک نہ کر سکے بلکہ ان کی بابت صرف عقل کا فیصلہ ہی معیار ہو تو آیا نظریات کی دنیا میں ان کا سہارا لیا جاسکتا ہے؟

یہ مسئلہ مغربی دانشوروں کے درمیان معرکۃ الآراء موضوعات میں سے ایک ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے بھرپور بحثیں کی ہیں' خاص طور پر عصر حاضر کے محققین نے اس موضوع پر اپنی علمی قوتیں صرف کر کے اسے اہم ترین مسائل میں شمار کر دیا ہے' جبکہ قدیم دانشوروں اور مسلمان فلاسفر حضرات نے حس اور عقل (محسوسات اور معقولات) دونوں کو (نظریات کی) بنیاد بنانا صحیح قرار دیا ہے بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ علمی دلیل محسوسات کو محسوسات ہونے کی حیثیت میں اپنے دائرے میں ہی نہیں لاتی لیکن اس کے باوجود مغربی دانشوروں نے اس مسئلہ میں بہت زیادہ اختلاف رائے کیا اور ان کی اکثریت بالخصوص علم سائنس کے ماہرین نے حسی قوتوں کے علاوہ کسی چیز کو نظریات کی بنیاد قرار دینا صحیح نہیں سمجھا اور وہ سب اس بات پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ صرف محسوسات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، وہ اپنے اس مؤقف پر یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ عقلیات محضہ (وہ امور جو صرف عقل کے ساتھ مربوط ہیں اور ان کی بابت صرف عقلی دلیل و فیصلہ ہمارے سامنے ہے) میں اکثر خطا واقع ہوتی ہے (یعنی وہ اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں) اور یہ تبھی ہوتا ہے جب ان کے ساتھ کوئی ایسی قوت موجود نہ ہو جو صحیح و غلط کے درمیان تمیز پیدا کر دے یعنی حس و تجربہ کہ جو جزئیات کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے کو ظاہر کرتے ہیں' جبکہ ادراکات حسیہ ایسے نہیں' (یعنی ان میں عقلیات محضہ کی طرح خطا واقع نہیں ہوتی) یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنے حواس میں سے کسی ایک کے ذریعے کسی چیز کا ادراک کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ اس جیسی دیگر مثالیں دے کر اپنے تجربات کے ذریعے اس کی تصدیق کر لیتے ہیں اور پھر اس عمل کو اس وقت تک بار بار دھراتے ہیں جب تک ہمارا حقیقی مقصود ہمیں حاصل نہ ہو جائے اور ہم تصور و خیال کی دنیا سے باہر نکل کر اپنے مطلوبہ امر کا عملی مشاہدہ نہ کر لیں اور اس مرحلہ تک نہ پہنچ جائیں کہ اس کی بابت پھر کوئی شک لاحق نہ ہو۔

یہ ہے ان دانشوروں کی دلیل جو غیر محسوس قوتوں کو معیار قرار دینا صحیح نہیں سمجھتے اور صرف محسوسات کو تمام امور (اور نظریات) کی بنیاد مانتے ہیں۔

ان کی یہ دلیل کئی لحاظ سے غلط اور نہایت ضعیف ہے اور اس پر کئی جہات سے خدشہ واشکال وارد ہوسکتا ہے ملاحظہ ہو:

۱۔ اس دلیل میں جن امور کو بنیاد قرار دیا گیا ہے وہ سب بذات خود عقلی وغیر حسی ہیں یعنی جس چیز کو غلط ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل قائم کی گئی ہے خود اسی کا سہارا لیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دلیل کس قدر بے وزن و کمزور ہے کیونکہ اس میں عقلی احکام وفیصلوں کا سہارا لے کر عقلی فیصلوں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے بنا برایں اگر اس دلیل کو درست مان لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عقلی احکام وفیصلوں کو معیار و بنیاد قرار دینا صحیح ہے تو اس طرح دلیل پیش کرنے والوں کی غرض ومقصود کے برعکس صورت پیدا ہوجائے گی کیونکہ اس دلیل کے قیام کا مقصد عقلی احکام وفیصلوں کو معیار قرار دینے کی نفی تھا جبکہ اس سے عقلی احکام کو استدلال کی بنیاد قرار دینے کا اثبات ہوا لہٰذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ دلیل خود اپنے نادرست ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ ہمارے حواس جن چیزوں کا ادراک کرتے ہیں ان میں غلطیوں کی تعداد ان چیزوں سے کم نہیں جن کا ادراک ہماری عقلیں کرتی ہیں (بلکہ محسوسات میں معقولات کی نسبت زیادہ غلطیاں پائی جاتی ہیں) اس بات کا ثبوت وہ بحثیں ہیں جو ان دانشوروں نے مبصرات...... آنکھوں سے دیکھی جانے والی چیزوں اور دیگر محسوسات کے بارے میں کی ہیں تو اگر کسی ایک باب میں خطاء اور غلطی کا وقوع پذیر ہونا اس کے مسدود ہونے اور ہر لحاظ سے اس کے بے اثر و بے فائدہ ہونے کا سبب ہوتا تو سب سے پہلے محسوسات اور ان چیزوں کو بے اثر و بے فائدہ قرار دینا ضروری اور لازمی ہوتا جن پر قوت حس حکم فرما ہے (کیونکہ ان میں غلط اور نادرست امور کی تعداد بہت زیادہ ہے)

۳۔ صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرنا ایک ایسا امر ہے جو تمام مدرکات (جن کا ادراک کیا جائے) میں ضروری ہے جبکہ تجربہ جو کہ محسوسات کی دنیا میں گھومنے کا دوسرا نام ہے وہ صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کا ذریعہ نہیں ہوسکتا بلکہ تجربہ حقیقت میں اس قیاس کے مقدمات میں سے ایک ہوتا ہے جس کے ذریعے اپنے مطلوب ومراد پر استدلال قائم کیا جائے مثلاً جب ہم اپنے حواس کے ذریعے کسی چیز کے خواص وخصوصیات میں سے کسی ایک خاصہ وخصوصیت کا ادراک کرتے ہیں اور پھر اس جیسی دیگر مثالوں کے ساتھ تجربہ کی روشنی میں اسے دیکھتے ہیں تو ہمارے استدلال کی یہ صورت ہو جاتی ہے کہ: "یہ خاصہ (خصوصیت) اس موضوع کے لیے دائمی الوجود (ہمیشہ ساتھ رہنے والی) یا اکثری الوجود (اکثر ساتھ رہنے والی) ہے لیکن اگر اس موضوع کے علاوہ کسی اور چیز کا خاصہ ہوتا تو پھر یہاں دائمی الوجود یا اکثری الوجود نہ ہوتا لیکن چونکہ وہ دائمی الوجود یا اکثری الوجود ہے لہٰذا اس موضوع ہی کی خاص خصوصیت ہے! (اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ جب ہم نمک چکھیں اور اس کا مخصوص ذائقہ محسوس کریں اور پھر بار بار نمک کو چکھنے سے وہی ذائقہ پائیں تو یقین حاصل ہوجائے گا کہ نمک کا ذائقہ ایسا ہوتا ہے اور عقل کہے گی کہ یہ ذائقہ اسی کے ساتھ مخصوص ہے ہمیشہ یا اکثر)۔

مذکورہ بالا قیاس (دلیل واستدلال) کے متعلق آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس کے مقدمات عقلی وغیر حسی ہیں نہ کہ تجربی!۔

۴۔ یہ بات درست ہے کہ مرحلۂ عمل میں تمام علوم حسیہ کی تصدیق، تجربہ سے ہوتی ہے یعنی تجربہ ان کا سہارا بنتا

ہے لیکن یہ امر بھی واضح و روشن ہے کہ خود تجربہ کا ثبوت کسی دوسرے تجربہ سے نہیں ہوتا ورنہ اس دوسرے تجربے کے ثبوت کے لیے تیسرے تجربہ اور تیسرے تجربہ کے ثبوت کے لیے چوتھے تجربہ کی ضرورت ہوگی اور اسی طرح یہ سلسلہ لامتناہی حد تک چلا جائے گا۔ بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ کسی تجربہ کے ثبوت اور اس کے صحیح ہونے کے لیے کسی غیر حسی (عقلی) دلیل کا سہارا لینا پڑتا ہے اس لیے جب حس اور تجربہ کا سہارا لیا جائے تو دراصل وہ کسی عقلی امر پر سہارا لینا ہے یا اس سے بالاتر یوں کہا جائے کہ حس و تجربہ کو بنیاد قرار دینا خواہ اور نا خواہ علم عقلی کو بنیاد قرار دینے کے برابر ہے۔

۵۔ قوت حس ایسے جزئی امر کے علاوہ کسی چیز کا ادراک نہیں کرتی جو لحہ بہ لحہ تغیر پذیر ہوتا ہے جبکہ علوم اس کے برعکس کلیات تک پہنچا دیتے ہیں اور وہ کلیات کے علاوہ کسی نتیجہ کے حصول کے لیے استعمال میں نہیں لائے جاتے اور تمام کلیات عقلی ہیں ان کا تعلق حس اور تجربہ سے نہیں ہوتا۔ مثلاً انسانی بدن کی تشریح یعنی پوسٹ مارٹم خواہ چند افراد کا ہو یا زیادہ کا، اس سے قوت حس کو اس بات کے مشاہدہ کا موقعہ ملتا ہے کہ اس انسان کے بدن میں دل اور جگر موجود ہے اور ایسے مشاہدات سے کئی امور کی نشاندہی ہوتی ہے۔ لیکن بار بار اس طرح کے مشاہدے سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اسے "حکم کلی" نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ہم جب بھی ان مشاہدات سے حاصل ہونے والے نتیجہ کا اظہار کریں گے تو یوں کہیں گے کہ اس انسان کا ایک دل ہے اور ایک جگر ہے ہمارا یہ کہنا درحقیقت اس مشاہدے کا اثر اور نتیجہ ہے لیکن یہ "کلی" نہیں بلکہ اسی ایک فرد کے بارے میں اظہار خیال ہے جس کا مشاہدہ ہم نے کیا ہے پس اگر ہم حس اور تجربہ کو بنیاد بنا کر صرف انہی سے حاصل ہونے والے امور کو معیار قرار دیں اور عقلی امور کا سہارا ہی نہ لیں تو ہمارا کوئی "کلی ادراک" مکمل نہ ہوگا اور نہ ہی کوئی غور وفکر اور علمی بحث نتیجہ بخش ثابت ہوگی لہٰذا جس طرح کچھ امور میں قوت حس و احساس کا سہارا لینا صحیح بلکہ ضروری ہے اسی طرح جو امور قوت عقل سے تعلق رکھتے ہیں ان میں عقلی فیصلوں ہی کو بنیاد بنانا لازمی ہے اور عقل سے مراد وہ قوت ہے جو ان تصدیقات کلیہ کا مبداء و سرچشمہ ہے جنہیں ہم جزئیات پر منطبق کرتے ہیں اسی طرح تمام احکام عامہ کے ادراک کی طاقت کا نام بھی عقل ہے اور یہ بات ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ انسان کے پاس ایسی قوت و طاقت موجود ہے جو تصدیقات کلیہ کا سرچشمہ اور احکام عامہ کے ادراک کا مرکز ہے جب ایسا ہے تو پھر یہ امر کیونکر قابل تصور ہے کہ خدا نے انسان کے وجود میں ایسی قوت رکھ دی ہے جو سرے سے ہی خطاء کا ارتکاب کرنے والی ہے یا کم از کم یہ کہ وہ قوت ایسے امور میں غلطی کا ارتکاب کر سکتی ہو جن کی خاطر اس کی تخلیق عمل میں آئی ہے اس کے علاوہ یہ امر بھی کسی صورت میں قابل انکار نہیں کہ قدرت تخلیق جب بھی موجودات عالم میں سے کسی ایک فرد کے ساتھ کسی کام کو مخصوص کرتی ہے تو پہلے اس فرد اور اس کام کے درمیان ایسا رابطہ قائم کرتی ہے جس سے عملی طور پر اس کام کے وجود و وقوع پذیر ہونے میں کوئی مانع درپیش نہ ہو اور آسانی سے وہ کام انجام پا سکے اس طرح کے رابطہ کے بغیر کوئی کام کسی سے مخصوص کرنا صحیح قرار نہیں پا سکتا۔ اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک موجود اور ایک معدوم کے درمیان اس طرح کا رابطہ قائم کیا جائے ایک ایسی قوت جو وجود کی نعمت رکھتی ہے (عقل) اور ایسی چیز جو وجود سے محروم ہے (خطا اور غلطی) ان کے درمیان ایسا رابطہ برقرار ہی نہیں ہو سکتا جس سے وہ معدوم چیز اس موجود حقیقت سے مربوط و مرتبط

ہو جائے' لہٰذا نہ صرف یہ کہ عقل خطاء کا ارتکاب نہیں کرتی بلکہ تکوینی و تخلیقی طور پر ہی ان کے درمیان کوئی ربط وارتباط نہیں پایا جاتا۔

اب صرف ایک سوال باقی رہتا ہے کہ جب عقل اور خطاء و غلطی کے درمیان تکوینی و تخلیقی طور پر ہی کوئی ربط وارتباط موجود نہیں تو پھر علوم یا حواس میں عام طور پر خطاء و غلطی کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے اور اس میں کیا عوامل کارفرما ہیں جو اس طرح کے امور کا سبب بنتے ہیں؟

اس کے تفصیلی جواب اور اس سلسلے میں حقیقت حال کی وضاحت کے لیے ہم کسی اور مقام پر بحث کریں گے۔

دوسری فلسفیانہ بحث

جب انسان اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل طے کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو موجودات عالم میں سے جس چیز پر بھی اس کی نظر پڑتی ہے وہ اس کے ظاہری وجود کے علاوہ اس کی بابت کچھ بھی نہیں جانتا اور نہ ہی اس کی توجہ اس امر کی طرف ہوتی ہے کہ ایک ایسی قوت بھی موجود ہے جسے "علم" کہتے ہیں کہ جو اس کے اور موجودات ہستی کے درمیان ذریعہ و واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے موجودات عالم کی حقیقتوں سے آگاہ کرتا ہے، اسی طرح وہ اپنے سفر حیات کو طے کرتا ہوا (موجودات عالم کی بابت ناآگاہی کے ظاہری احساس کے ساتھ) کبھی ایسی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے کہ اسے بعض امور میں شک یا ظن لاحق ہوتا ہے تو اس وقت وہ اس امر کی طرف متوجہ اور اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ سفر زندگی اور امور زندگانی میں اسے "علم" کی قوت سے استفادہ کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں بلکہ "علم" ہی ہے جو اس کے تمام مسائل میں اس کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے، خاص طور پر جب وہ یہ احساس دل میں لاتا ہے کہ وہ کبھی حقائق کے ادراک اور ان کے درمیان تمیز کرنے میں خطاء اور غلطی بھی کرتا ہے تو اس وقت علم کی طرف توجہ والتفات میں شدت آجاتی ہے کیونکہ وہ سمجھ لیتا ہے کہ ذہن کی حدود سے باہر کی دنیا میں خطاء و غلطی وجودی طور پر واقع ہو ہی نہیں سکتی' پس اسے یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کے وجود میں ایک ایسی حقیقت ہے جس کا نام "علم" ہے یعنی ایسا ادراک جو ذہن کی حدود میں اپنی نقیض (مخالف قوت) کو آنے ہی نہیں دیتا۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہر انسان اپنے وجود میں "علم" کی پاکیزہ حقیقت کا احساس کرتا ہے اور اس کی ضرورت اور اثر کو تسلیم کیے بغیر رہ نہیں سکتا بلکہ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس امر سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے تمام "ادراکات تصدیقیہ" کا محور وہ امر ہے جسے عقلی حقائق میں پہلا درجہ حاصل ہے بلکہ وہ مسلمات عقلیہ کی اساس و بنیاد ہے یعنی یہ کہ "ایجاب اور سلب یکجا نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ایسا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو"۔ (ہونا اور نہ ہونا یکجا نہیں ہو سکتے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ نہ وجود ہو اور نہ عدم ہو)۔

پس کوئی ایسا بدیہی یا نظری موضوع ہی نہیں جو اپنی تصدیقات میں مذکورہ بالا امر سے بے نیاز ہو بلکہ تمام حقائق اور بدیہی ونظری امور کا محور یہی ہے اور یہ اپنی حقیقت میں ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے یہی وجہ ہے کہ اسے " القضیۃ البدیہیۃ الاولیہ " کا نام دیا گیا ہے یعنی ایک بنیادی واضح اور نا قابل انکار امر' اور اس امر کا بدیہی اور واضح ونا قابل انکار ہونا اس حد تک ثابت ہے کہ اگر ہم اپنے تئیں اس کی حقیقت کی بابت شک کریں کہ آیا یہ امر صحیح ہے یا غلط تو ہمارا یہی شک اپنے صحیح ہونے میں بھی اسی کا محتاج نظر آئے گا۔

وضاحت:

مذکورہ بالا مطالب کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ایک ہی وقت میں موجود بھی ہو اور موجود نہ بھی ہو' یہ ممکن نہیں' ایجاب یعنی ہونا اور سلب یعنی نہ ہونا۔ یہ دونوں ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی چیز ان دونوں سے بے نیاز ہو یعنی ہم یہ کہیں کہ وہ نہ ہے اور نہ ہی نہیں ہے' کیونکہ یا وہ ہوگی یا نہ ہوگی، اور ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ ہو بھی اور نہ بھی ہو...... یہ عقلی فیصلہ ہے اور اسے "القضیۃ البدیہیۃ الاولیہ" کہتے ہیں' یعنی ایسا امر کہ جس کے صحیح ہونے کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ایک واضح ونا قابل انکار حقیقت ہے' بلکہ اگر ہم اس کے صحیح ہونے کے بارے میں کسی قسم کے شک وشبہ کا شکار ہو جائیں تو ہم اپنے شک میں بھی اسی کے محتاج ہوں گے کیونکہ یا وہ (شک) ہوگا یا نہ ہوگا اور ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ ہو اور نہ بھی ہو' اس لیے اس واضح حقیقت کے بارے میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ اس کا سہارا لیے بغیر "شک" بھی اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔

پس جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ ایجاب (ہونا) اور سلب (نہ ہونا) نہ یکجا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ایسا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو' تو اس امر کے بدیہی اور محتاج دلیل نہ ہونے کے ثبوت کے بعد کئی ایسے علمی مسائل کی حقیقتیں کھل جاتی ہیں جن کے اثبات کے لیے ہم کوشاں رہتے ہیں' اور وہ تمام مسائل اور امور واضح وآشکار ہو جاتے ہیں جن سے انسان اپنی زندگی کے گوناگوں مراحل میں دوچار ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا علمی موضوع یا مسئلہ ایسا نہیں جس میں انسان "علم" کا سہارا نہ لیتا ہو' یہاں تک کہ وہ اپنے "شک" کی تشخیص بھی علم ہی کے ذریعے کرتا ہے اور علم ہی اسے واضح طور پر بتاتا ہے کہ یہ "شک" ہے، ورنہ وہ اسے "شک" تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اور اسی طرح اسکے ظن' وہم اور جہل کی پہچان اور تشخیص بھی علم ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے' جب تک "علم" ظن' وہم اور جہل کے بارے میں واضح طور پر نہ بتادے اس وقت تک انسان ان میں سے کسی کو تسلیم ہی نہیں کرتا'

پس معلوم ہوا کہ انسان اپنی زندگی میں اس حد تک "علم" کی احتیاج رکھتا ہے کہ اس کے بغیر اپنے شک' ظن' وہم اور جہل کی پہچان بھی نہیں کر سکتا' لیکن اس کے باوجود یونانیوں کے دور میں کچھ لوگ ایسے بھی سامنے آئے ہیں جنہیں "سوفسطائی" کہا جاتا ہے انہوں نے سرے سے "علم" کے وجود کا انکار کر دیا' اور کہا کہ وہ کسی چیز کے بارے میں "علم" نہیں

رکھتے' اور وہ ہر شے کے متعلق "شک" کرنے لگے یہاں تک کہ خود اپنے بارے میں بھی شک کا شکار ہو گئے بلکہ اپنے "شک" کو بھی شک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اور وہ لوگ جو ان سے مشابہ نظریات رکھتے تھے کہ جنہیں "شکاک" کہا جاتا ہے وہ بھی ان کے پیروکاروں میں شامل ہو گئے' اور انہوں نے بھی اپنے سے باہر کی دنیا اور اپنے افکار و نظریات یعنی اپنے ادراکات سے متعلق "علم" کے وجود کا انکار کر دیا' اور اپنے اس انکار پر کئی دلائل بھی گھڑ لیے جن میں سے اہم ترین یہ ہیں:

(۱)۔ مضبوط ترین علوم اور ٹھوس ادراکات یعنی وہ امور جو ہمیں ہمارے حواس ظاہریہ کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں وہ غلطیوں اور نادرست نتائج سے بھرے ہوئے ہیں تو جب حواس ظاہریہ سے حاصل ہونے والے امور کا یہ حال ہے تو جو چیز ان کے بغیر حاصل کی جائے اس میں خطا و غلطی کس حد تک ہو گی؟ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب حواس ظاہریہ سے حاصل ہونے والے امور میں اس قدر غلطیاں پائی جاتی ہیں تو ان امور کا کیا حال ہو گا جن کا سہارا اور بنیاد وہ علوم اور علمی تصدیقات و ادراکات ہیں جو ہمارے وجود سے باہر کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔

یعنی: جب حواس ظاہرہ سے حاصل ہونے والے امور میں اس قدر غلطیاں پائی جاتی ہیں تو ان امور میں غلطیوں کا کیا حال ہو گا جن کی بنیاد "علم" ہو کہ جو ہمارے وجود سے باہر کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔

(۲)۔ ہم جب اپنے وجود سے باہر کی دنیا کی کسی چیز کے بارے میں جاننا چاہیں کہ وہ کیا ہے اور کیونکر ہے یعنی اسکی حقیقت کیا ہے تو ہماری کوششیں صرف اسی حد تک پہنچیں گی جتنا ہمیں اس چیز کے بارے میں علم ہو گا' اس کی اصل حقیقت کو ہم نہیں سمجھ سکیں گے' یعنی ہم اس چیز کے بارے میں کچھ جاننے کی بجائے صرف اپنی معلومات کی طرف متوجہ ہوں گے اس سے زیادہ کچھ نہیں، پس اس صورت میں ہم عالم ہستی کی کسی شے کی حقیقت کا کیونکر ادراک کر سکتے ہیں!

ان دو پہلوؤں کے علاوہ بھی دیگر دلائل ذکر کئے گئے ہیں جن میں علم کے وجود کی نفی کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلی دلیل کا جواب:

یہ استدلال خود ہی اپنے بطلان اور نادرستی کو واضح کرتا ہے' یعنی اسے غلط ثابت کرنے کے لیے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ یہ خود ہی اپنے غلط ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اور وہ یوں کہ اس میں کہا گیا ہے کہ تصدیقات علمیہ کا سہارا نہیں لیا جا سکتا اور انہیں کسی اہم مطلب کے لیے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا' جبکہ خود انہوں نے اپنے اس استدلال میں ہی تصدیقات علمیہ کا سہارا لیا ہے اور اپنے موقف کے صحیح ہونے پر انہی تصدیقات علمیہ کو بنیاد قرار دیا ہے۔ پس اگر ان تصدیقات علمیہ کو بنیاد بنانا نادرست ہوتا تو وہ خود اپنے استدلال کے لیے انہیں بنیاد قرار نہ دیتے' اس کے علاوہ انہوں نے خطاء و غلطی کے ہونے اور اس کی کثرت کا بھی اعتراف کیا ہے جو کہ خود ہمارے موقف کو تقویت دیتا ہے کیونکہ خطاء و غلطی کا اعتراف کر لینا درحقیقت "صحیح" کے وجود کو بھی تسلیم کرنے کے برابر ہے یعنی جس مقدار میں غلطی ہو گی کم از کم اسی مقدار میں یا اس سے زیادہ "صحیح" کا وجود بھی ہو گا' یعنی جب ہم کسی شے میں خطا و غلطی کا وجود تسلیم کریں گے تو گویا ہم نے صحیح امر کے وجود کا بھی اعتراف

کر لیا ورنہ کسی چیز کے غلط ہونے کی تشخیص و تمیز ممکن ہی نہ ہوگی' اور اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو لوگ ''علم'' کے وجود اور اس کی حقیقت کے قائل ہیں انہوں نے کبھی یہ ادعاء نہیں کیا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ہر لحاظ سے صحیح اور ہر قسم کی غلطی سے پاک ہے یعنی ایسا نہیں کہ تمام تصدیقات علمیہ ایسی ہیں جن میں کسی قسم کی خطاء و غلطی کا امکان نہیں' بلکہ وہ کہتے ہیں کہ تصدیقات علمیہ میں سے کچھ ایسی ہیں جن کا سہارا لیا جا سکتا ہے اور وہ صحیح ہیں' دوسرے لفظوں میں وہ لوگ ''علم'' کے وجود کا سرے سے انکار کرنے والوں کے جواب میں کہتے ہیں کہ ایسا نہیں کہ ''علم'' کسی صورت میں بھی موثر نہ ہو بلکہ کئی علمی تصدیقات ایسی بھی ہیں جنہیں استدلال کے مقام پر بنیاد بنایا جا سکتا ہے' گویا علم کے وجود اور اس کی ٹھوس تاثیر کے قائل حضرات ''سالبہ کلیہ'' کے مقابلے میں ''موجبہ جزئیہ'' پیش کرتے ہیں (یعنی کچھ بھی نہ ہونے کے مقابلے میں کچھ ہونا ثابت کرتے ہیں) اور ''سوفسطائیوں'' (علم کا سرے سے انکار کرنے والوں) نے جو دلیل پیش کی ہے وہ اس ''موجبہ جزئیہ'' کی نفی نہیں کر سکتی۔

دوسری دلیل کا جواب:

ہماری بحث اور اختلاف رائے ''علم'' کی بابت ہے' ہمارا موقف یہ ہے کہ ''علم'' موجود ہے اور اس کا سہارا لیا جا سکتا ہے جبکہ ان کا موقف یہ ہے کہ ''علم'' کا وجود ہی نہیں ہے' یعنی ہماری بحث علم کے ہونے اور نہ ہونے میں ہے اور علم سے مراد در حقیقت ''نامرئی چیز کا کشف و ظہور'' ہے یعنی کسی چیز کا پردۂ ظلمت سے باہر آ جانا' چنانچہ جب ہم موجودات عالم میں سے کسی چیز کے متعلق سوچیں اور اسے جاننے کا ارادہ کریں تو ضروری مراحل طے کرنے کے بعد ہم کہتے ہیں کہ ہم نے اسے جان لیا ہے یعنی ہمیں اس کے متعلق علم حاصل ہو گیا ہے' ہمارا یہ کہنا گویا اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اس چیز کی حقیقت ہمارے سامنے آشکار ہو گئی ہے اور گویا ہم یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ''علم'' کا وجود ہے کیونکہ کسی چیز کے معلوم کر لینے کا دعویٰ کرنا در حقیقت ضمنی طور پر ''علم'' کے وجود کا اقرار بھی ہے۔

اس مقام پر یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ آج تک کسی نے ''علم'' کی بحث میں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کے وجود سے مراد یہ ہے کہ ہم کسی چیز کی حقیقت اور اصل و اساس کا ادراک کر لیتے ہیں یا یہ کہ ہم جو کچھ درک کرتے ہیں وہی عین حقیقت ہوتا ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اگر انصاف کی نظروں سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ کہ جو ''علم'' کے وجود کے منکر ہیں اپنی روزمرہ کی زندگی کے معمولات میں اپنے نظریے کی عملی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کا ایسا کرنا ہی ان کے خیالات کی نفی کرتا ہے' گویا وہ اپنے عمل سے اپنے نظریات کو غلط ثابت کرنے میں مصروف ہیں مثلاً جب انہیں بھوک اور پیاس کی شدت محسوس ہوتی ہے تو وہ کھانا اور پانی کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اسی طرح جب بھی انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنے مطلوب کے حصول کے لیے اقدام کرتے ہیں، ان کا ایسا کرنا صرف ان کے تصور و خیال محض کے سبب نہیں

بلکہ حقیقی معنی میں اپنے مطلوب کو پانے کے لیے ہوتا ہے' وہ مطلوب کہ جس کا حصول ان کے احساسات کی شدت کو کم کرنے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے' کیونکہ وہ حقیقتاً اپنی بھوک اور پیاس سے آگاہ ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ ''علم'' و آگاہی انہیں ہر طرح کے ضروری اقدامات پر آمادہ کر دیتی ہے۔ یہی صورت حال اس وقت سامنے آتی ہے جب وہ کسی درندے کو دیکھ کر یا اس کی بابت آگاہی حاصل کر کے بھاگتے ہیں تو ان کا بھاگنا اور درندے سے جان بچانے کے لیے ضروری اقدام و انتظام کرنا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ درندے کے وجود کو جان چکے ہوتے ہیں نہ یہ کہ صرف اس کا تصور کر کے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں' ہرگز ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ تب ہی اپنی جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگتے ہیں جب انہیں ''معلوم'' ہو جاتا ہے کہ درندہ آ گیا ہے یا آ رہا ہے' ورنہ کسی درندے کا تصور کر لینا کسی کو چیر پھاڑ نہیں کھاتا'

خلاصہ یہ کہ وہ تمام نفسانی ضرورتیں اور احتیاجات جنہیں ہمارے احساسات ہمارے سامنے لاتے ہیں ہم ان کے پورا کرنے کے لیے ہر قسم کا عملی اقدام کرتے ہیں لیکن اگر صرف ان ضرورتوں کا تصور کریں جبکہ وہ حقیقت میں نہ ہوں تو صرف ان کا تصور انہیں پورا کرنے کے لیے عملی اقدام کی دعوت نہیں دیتا اور نہ ہی کوئی شخص ان احتیاجات کا تصور کر کے ان کو پورا کرنے کے لیے کوئی اقدام کرتا ہے' لہٰذا معلوم ہوا کہ ان دو تصورات میں بہت فرق ہے' پہلا تصور کہ جہاں عملی اقدام ناگزیر تھا اس میں ایک حقیقت کی عملداری تھی اور دوسرا تصور کہ جہاں کسی عملی اقدام کی ضرورت نہیں وہ صرف خیال و ذہن کی حدود تک محدود ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک ''علم'' وہ ہے جسے انسان خود اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ اپنے اندر پیدا کرتا ہے اور دوسرا وہ علم ہے جو کسی ایسے سبب سے انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے جس کا تعلق نفس انسانی سے باہر کی دنیا سے ہے لیکن وہ سبب اپنی اثر آفرینی سے انسان کے دل میں کسی چیز کی حقیقت کو آشکار کر دیتا ہے۔ مذکورہ بیان سے یہ ثابت ہو گیا کہ ''علم'' ہے اور اس کا وجود مسلم ہے۔ یہی وہ امر ہے جس کے اثبات کے لیے ہم کوشاں ہیں۔

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ

''علم'' کے وجود کی بابت شک کی صورت ایک اور طرح سے بھی قابل توجہ واقع ہوئی ہے اور وہ اس قدر مضبوط و مستحکم ہے کہ اسی پر عصر حاضر کے علوم مادیہ کی بنیادیں استوار ہیں' اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں ''علم ثابت'' نامی کوئی حقیقت موجود ہی نہیں' (جبکہ حقیقت امر یہ ہے کہ ہر علم ثبات کی صفت سے متصف ہے)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ علمی بحثوں سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ دنیائے طبیعت میں تغیر و تبدل اور تکامل و ارتقاء کا ایک مضبوط نظام موجود ہے اور موجودات عالم کا ذرہ ذرہ حصول کمال کے لیے کوشاں اور ترقی و تکامل کے مراحل طے کرتا ہوا کمال کی جانب بڑھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چیز میں لحہ بہ لحہ تبدیلی پائی جاتی ہے یعنی آپ جس چیز کو دیکھیں وہ اپنے حال میں اپنے ماضی سے مختلف نظر آتی ہے' (اپنے وجود کے حوالہ سے دوسرے لحہ میں پہلے لحہ کی حالت سے مختلف ہے) اس تبدیلی کی وجہ اس کا لحہ بہ لحہ کمال کی طرف رواں دواں ہونا ہے' جب یہ بات واضح ہو گئی کہ موجودات عالم اور

دنیائے طبیعت کی ہر چیز تغیر و تبدل اور تکامل و ارتقاء کے نا قابل انکار نظام سے وابستہ ہے تو اب ہم اسی اصول کی روشنی میں فکر و ادراک کو دیکھتے ہیں جس کا تعلق مغز و دماغ سے ہے کہ وہ مغز کے خواص (خصوصیات و اوصاف خاص) میں سے ہے اور چونکہ مغز' مرکبات مادیہ یعنی ان چیزوں میں سے ہے جن کے تمام بنیادی اجزاء مادی ہیں لہٰذا جو چیز اس کے خواص و اثرات میں سے ہوگی وہ بھی یقینی طور پر مادی ہوگی اور جب وہ امور مادیہ کے زمرے میں آئے گی تو لامحالہ اسی تغیر و تکامل کے نظام کے سایے میں آجائے گی جو دنیائے طبیعت پر چھایا ہوا ہے۔ پس ہمارے تمام ادراکات پر جن میں وہ ادراک بھی شامل ہے جسے ''علم'' سے موسوم کیا جاتا ہے تغیر و تبدل اور ارتقاء و تکامل کا نظام حکم فرما ہوگا' لہٰذا کسی ایسی حقیقت کا تصور ہی غلط ہے جسے ''علم ثابت'' یعنی ایسا ادراک جو نا قابل تغیر ہو، کہا جا سکے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تغیر نا پذیر علم کا کوئی وجود ہی نہیں البتہ ہمارے علم و ادراک کا ثبوت و دوام نسبی ہے یعنی کچھ تصدیقات ایسی ہیں جن کی بقاء، دوسری تصدیقات سے زیادہ ہے اور ان کی مدت نسبتاً طولانی ہے یعنی وہ دوسری تصدیقات کی نسبت زیادہ دیر تک باقی رہتی ہیں' اور اگر ہم اس سے بھی وسیع نظر سے دیکھیں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ بعض تصدیقات ایسی ہیں جن کی نقیض یا نقض (توڑ) دوسری تصدیقات کی نسبت زیادہ پوشیدہ ہے اور ہم نے ایسی تصدیقات کو ''علم'' کا نام دے دیا ہے جبکہ وہ حقیقت میں ''علم'' نہیں ہیں' مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہمیں فلاں چیز کے بارے میں ''علم'' ہے جبکہ ہمیں حقیقی معنی میں ''علم'' نہیں ہوتا بلکہ صرف ہمیں اس کی نقیض۔ مخالف' مقابل امر سے آگاہی حاصل نہیں ہوتی اور ہم ہر لحہ اس کے نقیض کا احتمال بھی دیتے ہیں اور اس کے امکانی وجود کی نفی بھی نہیں کرتے' پس اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی حقیقت ہی وجود نہیں رکھتی جسے ''علم ثابت'' یعنی نا قابل تغیر ادراک کہا جا سکے۔

جواب:

مذکورہ بالا مغالطہ کا جواب یہ ہے کہ ان کی دلیل تب درست قرار دی جا سکتی ہے جب ''علم''، امور مادیہ میں سے ہو اور اپنے وجود میں تجرد نہ رکھتا ہو یعنی مرکب ہو' جبکہ ایسا ہرگز نہیں' لہٰذا نہ ان کا ادعاء صحیح ہے اور نہ ہی اس پر پیش کی جانے والی دلیل درست ہے اور نہ ہی اب تک علم کے مادی اور مرکب ہونے پر کوئی ثبوت پیش کیا گیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ''علم'' ہرگز مادی امور میں سے نہیں کیونکہ اس میں امور مادیہ کی کوئی صفت اور اثر نہیں پایا جاتا مثلاً: قابلِ تقسیم ہونا' زمان و مکان کا محتاج ہونا' حرکت و تحرک اور تغیر و تبدل وغیرہ'

مزید وضاحت:

۱۔ تمام مادیات...... موجودات مادیہ...... میں یہ صفت پائی جاتی ہے کہ وہ قابل تقسیم ہوتے ہیں' یعنی کوئی ایسا امر مادی نہیں جو قابل تقسیم نہ ہو بلکہ قابل تقسیم ہونا تمام موجودات مادیہ کی مشترک صفت ہے جبکہ ''علم'' اپنے وجود میں کسی طرح بھی قابل تقسیم نہیں' اس کی وجودی حیثیت قابل تقسیم ہونے کے منافی ہے' (یاد رہے کہ کسی مادی موجود کی پہچان یہ ہے کہ وہ ابعاد ثلاثہ یعنی طول' عرض اور عمق رکھتا ہو اور جو چیز ان تین امور کی حامل ہو وہ یقیناً قابل تقسیم ہوتی ہے جبکہ ''علم'' ان تینوں سے منزہ

ہے اس لیے اس کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ تمام مادیات (موجودات مادیہ) کی مشترکہ صفت یہ ہے کہ وہ زمان ومکان کی محتاج ہوتی ہیں اور دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جو موجودات مادیہ میں سے ہو اور مکان وزمان سے بے نیاز ہو۔ جبکہ علم ایسا نہیں اور وہ اپنی جودی حیثیت میں زمان ومکان کی احتیاج اور تقید سے بالاتر ہے' اس کا ثبوت یہ ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی معمولی سے معمولی واقعہ رونما ہو تو ہم اس کی تمام خصوصیات سے آگاہی اور اس کے آثار کے ساتھ اس کا تصور وتعقل دنیا کے ہر گوشہ میں کرسکتے ہیں اور ہر وقت کرسکتے ہیں' لیکن اگر علم زمان ومکان کا محتاج ہوتا تو ہم اس چھوٹے سے واقعہ کا تصور وتعقل دنیا کے کسی بھی گوشے میں بیٹھ کر اور جب چاہتے' نہ کرسکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ "علم" زمان ومکان سے بے نیاز ہے۔

۳۔ تمام مادیات (موجودات مادیہ) "حرکت" وتحرک کے ہمہ گیر نظام سے وابستہ ہیں اور وہ وسعت آمیز نظام تمام موجودات مادیہ پر محیط ہے اس لیے ان سب میں "تغیر" وتبدل ایک خاصیت اور پہچان کا ذریعہ ہے (تغیر ان تمام موجودات کی عمومی صفت ہے) جبکہ "علم" اپنے وجود (علم ہونے کی حیثیت) میں قابل تغیر نہیں اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ممکن نہیں کیونکہ علم اپنی ذاتی حیثیت میں تغیر وتبدل سے منافات رکھتا ہے (تغیر وتبدل علم کی ذات وحقیقت کے منافی ہے) یعنی جب تک علم کو "علم" کہا جائے گا وہ تغیر وتبدل سے ہم آہنگ ہو ہی نہیں سکتا ورنہ وہ "علم" ہی نہ رہے گا۔ تاہم اس حقیقت سے وہی شخص آگاہ ہوسکتا ہے جو ان امور کی بابت غور وفکر کرے اور صحیح طور پر تمام جہات کا جائزہ لے سکتا ہو۔ جو شخص ایسا کرلے اس پر تمام پہلو واضح وآشکار ہو جائیں گے۔

۴۔ اگر "علم" بھی مادیات (موجودات مادیہ) کی طرح ان چیزوں میں سے ہوتا جو اپنی ذات کے لحاظ سے قابل تغیر ہیں یعنی وہ لحہ بہ لحہ ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتی رہتی ہیں تو کسی ایک چیز یا ایک واقعہ کا دو مختلف اوقات میں ایک ساتھ تصور وتعقل ممکن نہ ہوتا اور نہ ہی ماضی میں ہونے والے واقعہ کا تصور وتذکر زمانہ حال ومستقبل میں ممکن ہوتا کیونکہ جو چیز تغیر پذیر ہوتی ہے وہ دوسرے لحہ میں پہلے لحہ سے بالکل مختلف ہوتی ہیں (جبکہ "علم" ایسا نہیں' اس پر اوقات ولحات کا بدلنا اثر انداز نہیں ہوتا' وہ ہر لحہ ثابت وقائم اور استوار رہتا ہے)۔

مذکورہ بالا دلائل اور ان جیسے دیگر متعدد شواہد سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ علم اپنے وجود (علم ہونے) کی حیثیت میں کسی طور بھی "مادی" نہیں (موجودات مادیہ میں سے نہیں) تاہم جو چیز انسانی بدن کے حساس ترین عضو یعنی مغز میں طبیعت کے واضح وآشکار اثر کے طور پر وجود میں آتی ہے ہماری اس بحث کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ہم اسے "علم" کہہ سکتے ہیں کیونکہ اسے "علم" کے نام سے موسوم کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں' اور اسباب کے درمیان مماثلت و مشابہت کسی ایک عمل کو دوسرے کے ساتھ یکساں نہیں بنا دیتی۔

"علم" کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اسی پر اکتفاء کی جاتی ہے اور اگر اس سے زیادہ کچھ مطلوب ہو تو کسی اور مقام پر رجوع کیا جاسکتا ہے۔

آیات:۶، ۷

○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

○ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷

ترجمہ

○ وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کرلیا ہے ان کے لیے کوئی فرق نہیں کہ آپ انہیں انذار کریں یا نہ کریں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (۶)

○ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے۔ (۷)

تفسیر و بیان

کفر اختیار کرنے والوں کے بارے میں ا

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ... ؕ

(وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا......)

اس آیت میں ان لوگوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اسلام کے مقابلے میں کفر اختیار کیا اور اپنے "کفر" (انکار) پر ڈٹ گئے، اور صرف یہی نہیں بلکہ کفران کے دل کی گہرائیوں میں جگہ کر گیا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان پر کوئی نصیحت یا عذاب الٰہی سے ڈرانا اثر ہی نہیں کرتا بلکہ ان کے لیے انذار (عذاب خدا سے ڈرانا) اور عدم انذار (نہ ڈرانا) دونوں برابر ہیں، اسی لیے خدا نے ارشاد فرمایا: (سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ) کہ اے میرے نبی! آپ ان لوگوں کو انذار کریں یا نہ کریں ان کے لیے کوئی فرق نہیں، (اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ نبیؐ کی نصیحتوں اور وعظ و ارشاد سے ہدایت نہ پائے وہ اپنے کفر میں اتنے مضبوط تھے کہ گویا کفران کے دلوں میں گھر کر چکا تھا)۔

اب سوال یہ ہے کہ اس آیت میں کون سے کفار مراد ہیں؟ تو اس سلسلہ میں ایک امکان یہ ہے کہ ان سے مراد سرداران قریش اور کفار مکہ میں سے وہ بڑے بڑے لوگ ہوں جنہوں نے دین کے معاملہ میں عناد اور ڈھٹائی سے کام لیا اور دین خدا کی دشمنی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی اور آخر دم تک "ایمان" نہ لائے، بال آخر خداوند عالم کا غضب و عذاب ان پر نازل ہوا اور خدا نے جنگ بدر وغیرہ میں ان کے آخری فرد تک کو ہلاک کر دیا، بظاہر یہی احتمال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس آیت میں ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ "ان کے لیے کوئی فرق نہیں کہ آپ (محمدؐ) انہیں عذابِ الٰہی سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے کفار کا ایک خاص گروہ مراد ہے، کیونکہ یہ بات ہرگز ممکن نہیں کہ اس سے تمام کفار مراد لیے گئے ہوں ورنہ یہ کہنا پڑے گا کہ ہدایت کا دروازہ ہی بند ہو گیا ہے جبکہ قرآن مجید بہ بانگ دھل، باب ہدایت کے مسدود ہونے کی نفی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ یہ الفاظ (ان کے لیے کوئی فرق نہیں کہ آپؐ انہیں انذار کریں یا نہ کریں، وہ ایمان نہیں لائیں گے) قرآن مجید میں دو مقامات پر ذکر ہوئے

ہیں: (۱) ایک سورہ بقرہ میں، (۲) دوسرے سورۂ یٰس میں، جبکہ سورۂ یٰس مکہ مکرمہ میں نازل ہوا اور سورۂ بقرہ مدینہ منورہ میں، اور سورہ بقرہ مدینہ منورہ میں نازل ہونے والا سب سے پہلا سورہ ہے جو کہ جنگ بدر سے پہلے نازل ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں جن کفار کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ''کفار مکہ'' ہی ہیں، بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی ''الذین کفروا'' (وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا) ذکر ہوا ہے اس سے مراد ''کفار مکہ'' ہیں کہ جو اوائل بعثت میں اپنے کفر پر ڈٹ گئے اور ایمان نہ لائے، لیکن اگر کسی جگہ اس کے برخلاف کوئی قرینہ یا ثبوت مل جائے کہ کفار مکہ مراد نہیں تو ہم اسے ضرور مان لیں گے چنانچہ ہم آیت ''الذین امنوا'' (وہ لوگ جو ایمان لائے) کے بارے میں بیان کریں گے کہ قرآن مجید میں یہ الفاظ جہاں بھی ذکر ہوئے ہیں ان سے مراد وہ مسلمان ہیں جو اوائل بعثت میں ایمان لائے اور خدا نے انہیں ''اہل ایمان'' کے مقدس خطاب سے نوازا، لیکن اگر کسی مقام پر کوئی قرینہ یا دوسری دلیل موجود ہو کہ ''الذین امنوا'' سے مراد مسلمانان مکہ کے علاوہ دوسرے اہل ایمان ہیں تو ہمیں تسلیم کرنے میں کیا مانع ہوسکتا ہے؟

(پس نتیجہ یہ ہوا کہ ''الذین کفروا'' (وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا) سے مراد کفار مکہ ہیں جیسا کہ ''الذین امنوا'' (وہ لوگ جو ایمان لے آئے) سے مراد مسلمانانِ مکہ ہیں مگر یہ کہ کوئی قرینہ یا دلیل اس امر کو ثابت کردے کہ کفار یا مسلمانان مکہ کے علاوہ کوئی اور مراد ہے)۔

دلوں اور کانوں پر مہریں، آنکھوں پر پردے

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ...

(اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہریں لگادی ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے ...)

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کی نسبت اپنی طرف دی ہے۔ جبکہ آنکھوں پر پردے کی نسبت ان (کافروں) کی طرف دی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کفر اور حق کے دیدار سے محرومی کے دو اسباب ہیں: ایک یہ کہ انہوں نے خود کفر اختیار کیا اور ایمان کی نورانی حقیقت سے مرحوم ہوگئے اور دوسرا یہ کہ خداوند عالم نے ان کے کفر اور فسق وفجور کی وجہ سے انہیں ایمان کی حقیقت سے محروم کردیا، لہٰذا ان کے اعمال دو پردوں کے درمیان قرار پا گئے: ایک وہ پردہ جو خود انہوں نے اپنے اوپر ڈال لیا اور حق کو نہ دیکھ سکے، دوسرا وہ پردہ جو خدا نے ان کے سامنے ڈال دیا جس سے وہ حق کی حقیقت اور اس کے مشاہدہ سے محروم رہ گئے۔ (یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ پہلے انہوں نے خود کفر اختیار کرکے ایمان سے محرومی کا سبب فراہم کرلیا اور پھر خدا نے انہیں اس کی سزا دی اور انہیں ایمان کی حقیقت سے محروم کردیا)۔

انشاء اللہ ہم عنقریب اس سلسلہ میں آیہ شریفہ ''ان اللہ لا یستحیی ان یضرب مثلا ...'' کی تفسیر میں مزید مطالب بیان کریں گے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کفر ایک ایسی صفت ہے جس میں شدت وضعف (زیادتی وکمی) پائی جاتی ہے اور اس

کے مراتب ودرجات بھی ایمان کی طرح بہت زیادہ ہیں کہ ہر درجہ کے آثار دوسرے درجہ سے مختلف ہیں جیسا کہ ''ایمان'' میں شدت وضعف اور مراتب ودرجات کی کثرت اوران درجات کے آثار کا مختلف ہونا ہے۔

روایات پر ایک نظر

کفر کی پانچ اقسام اوران کی تشریح

کتاب کافی میں زبیری سے منقول ہے انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: مجھے آگاہ فرمائیں کہ قرآن مجید میں کفر کی کتنی صورتیں بیان کی گئی ہیں؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا:

کتابِ خدا میں کفر کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں:

پہلی قسم: کفر جحود (ہٹ دھرمی والا انکار) یہ کفر جحود کی ایک قسم ہے۔

دوسری قسم: حق کو پہچاننے کے باوجود اس کا انکار کرنا۔

تیسری قسم: کفر احکام الٰہی: خدا کے قوانین کا انکار

چوتھی قسم: کفر برائت: بیزاری کے ساتھ انکار

پانچویں قسم: کفران نعمت: خدا کی نعمتوں کی قدردانی نہ کرنا۔

کفر جحود کی پہلی قسم:

اس سے مراد خدا کی ربوبیت کا انکار ہے اور یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو کہتے ہیں کہ ''نہ کوئی رب ہے اور نہ ہی بہشت ودوزخ کا کوئی وجود ہے۔ یہ عقیدہ زندیق (خدا کے منکرین) کے دو گروہوں کا ہے کہ جنہیں ''دھریے'' کہا جاتا ہے یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید میں ہے کہ وہ کہتے ہیں (وما یھلکنا الا الدھر) ''ہمیں دہر (زمانہ) کے سوا کوئی ہلاک نہیں کرسکتا'' (چونکہ یہ لوگ ''دہر'' کو مبدءِ وسرچشمۂ فیض اور محور واصل واساس سمجھتے ہیں اس لیے انہیں ''دہریے'' کہا جاتا ہے) یہ ایک مستقل دین ہے جو انہوں نے اپنی خوش فہمی سے اپنے لیے گھڑ لیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے عقائد کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں جیسا کہ خداوند عالم نے مذکورہ بالا آیت کے ذیل ہی میں ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

"ان ھم الا یظنون" (یہ سب ان کا اپنا گمان ہے)

اسی طرح خدا نے فرمایا:

"اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ"

(جو لوگ کفر اختیار کر گئے ہیں ان کی بابت فرق نہیں کہ آپؐ انہیں انذار کریں یا نہ کریں، وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے)

یعنی وہ لوگ خدا کی توحید پر ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ کفر کی ایک قسم ہے۔

کفر جحود کی دوسری قسم:

کفر جحود یعنی ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی والے کفر کی اس دوسری قسم سے مراد یہ ہے کہ کافر (انکار کرنے والا) حق کو پہچاننے اور اس کے ثابت ہو جانے کے باوجود اس کا انکار کرے، ایسے لوگوں کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا:

سورۂ نمل، آیت ۱۴:

"وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا۔"

(اور انہوں نے خدا کے دین کا انکار کر دیا جبکہ وہ اپنے دلوں میں اس کی حقانیت کا یقین رکھتے تھے، انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ ظلم اور بڑائی و غرور کا شکار تھے)۔

اور ارشاد فرمایا:

سورہء بقرہ، آیت ۸۹:

"وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔"

(وہ (یہودی) اس سے پہلے (قبل از اسلام) کافروں سے کہتے تھے کہ عنقریب آخری نبی تشریف لائیں گے اور ہمیں تم پر فتح و کامیابی عطا کریں گے، لیکن جب اسلام آ گیا اور نبی آخر الزمان (حضرت محمدؐ) تشریف لے آئے تو انہوں نے کفر اختیار کر لیا۔ جبکہ وہ آنحضرتؐ کو پہچان چکے تھے...... پس خدا کی لعنت ہو کفر اختیار کرنے والوں پر)

مذکورہ بالا دو صورتیں کفر جحود کی ہیں اور کفر جحود سے مراد ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی والا کفر ہے۔

کفر کی تیسری قسم:

کفران نعمت: یہ کفر کی تیسری قسم ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، اس سلسلہ میں خداوند عالم نے حضرت

سلیمانؑ کا یہ قول ذکر فرمایا کہ انہوں نے کہا:

سورۂ نمل، آیت ۴۰:

★ "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ"

(یہ میرے پروردگار کا فضل و عنایت ہے اور یہ اس لیے ہے کہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا میں اس کا شکر بجالاتا ہوں یا کفر کرتا ہوں' اور حق یہی ہے کہ جو شخص شکر بجالائے تو اس کے اپنے لیے فائدہ مند ہوگا اور جو کفر اختیار کرے تو خدا ہر شئے سے بے نیاز' کرم کرنے والا ہے)

اس آیت میں شکر نعمت کے مقابلہ میں جو کفر ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد "کفران نعمت" ہے۔ اور دو مرتبہ ان دونوں کا تقابلی ذکر ہوا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ کفر سے مراد خدا کا انکار نہیں بلکہ کفران نعمت ہے۔

اسی طرح ارشاد الٰہی ہے۔

سورۂ ابراہیم، آیت ۷:

"لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ"

(اگر تم شکر ادا کرو تو میں تمہیں مزید عطا کردوں گا اور اگر تم کفر کرو تو میرا عذاب بہت سخت ہے)

اس آیت میں بھی شکر کے مقابل میں کفر کا ذکر آیا ہے جس سے مراد کفران نعمت ہے۔

پھر ارشاد ہوا:

سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۲:

"فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ"

(پس تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرو' میرا کفر نہ کرو)

اس آیت میں بھی کفر کا ذکر' شکر کے مقابلے میں ہوا ہے جس سے مراد کفران نعمت ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں کفران نعمت کا ذکر شکر کے مقابلہ میں ہوا اور یہ (کفران نعمت) کفر کی ایک قسم ہے۔

کفر کی چوتھی قسم:

کفر احکام الٰہی: خداوند عالم کے احکام و دستورات کا ترک کرنا کفر ہی کی ایک قسم ہے' چنانچہ اس کی بابت خدا کا ارشاد ہے:

سورۂ بقرہ، آیات ۸۴، ۸۵:

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ

تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۚ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ"

(اور یاد کرو جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہ بہانا' اور ایک دوسرے کو اپنے گھروں اور وطن سے نکال باہر نہ کرنا' تم نے اس وعدہ کو پورا کرنے کا اقرار بھی کیا اور گواہی بھی دی' لیکن پھر تم ہی نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکال باہر کر دیا اور تم نے ان کے ساتھ دشمنی وعداوت کی بنیاد ڈال دی' اور جب وہ لڑائی میں تمہارے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تو تم ان سے "فدیہ" وصول کرتے تھے۔ جبکہ تمہارے لیے ایسا کرنا حرام قرار دیا گیا تھا' اور انہیں وطن سے نکال باہر کرنا ممنوع تھا' کیا تم کتاب خدا کے کچھ احکام پر ایمان لائے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟)

اس آیت مبارکہ میں "کفر" سے مراد' احکام الٰہی کا ترک کرنا ہے جبکہ ان کی طرف "ایمان" کی نسبت بھی دی گئی ہے (اَفَتُؤْمِنُوْنَ) اگرچہ اس ایمان کو خدا نے ان سے قبول نہیں کیا اور اسے ان کے لیے فائدہ مند قرار نہیں دیا لیکن ان کی طرف سے بعض احکام الٰہی پر عمل نہ کرنے کو "کفر" کا نام دیا ہے' اور ان کے ایسا کرنے کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے اسی آیت (۸۵) میں ارشاد فرمایا:

"فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۚ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ"۔

(جو شخص ایسا کرے تو اس کی جزاء سوائے اس کے اور نہیں کہ وہ دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری سے دوچار ہو گا اور اسے قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف کھینچ کے لے جایا جائے گا اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے)

کفر کی پانچویں قسم:

کفر برائت: کفر کی پانچویں قسم' کفر برائت ہے' اس کی بابت سے قرآن مجید میں خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول ذکر فرمایا ہے:

سورۂ ممتحنہ' آیت ۴:

"كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ"۔

اور ہم نے تمہارے ساتھ "کفر" کیا' ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت و عناد پیدا ہو گیا اور ہم اسی طرح ہی رہیں گے جب تک کہ تم خدا کی وحدانیت پر ایمان نہیں لاتے)

اس آیت میں "کفر" سے مراد برائت، دوری اور لاتعلقی کا اظہار ہے۔

اسی طرح خدا نے ابلیس کی بابت ذکر فرمایا کہ وہ قیامت کے دن انسانوں میں سے اپنے دوستوں سے برائت کا

اظہار کرے گا' اور کہے گا:

سورہ ابراہیم، آیت ۲۲:

"اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ"

(اس سے پہلے (دنیا میں) تم نے مجھے جس طرح (خدا کا) شریک بنالیا تھا میں اس سے بری ولاتعلق ہوں)

اس میں بھی لفظ "کفر" استعمال ہوا ہے جبکہ اس سے مراد برائت اور اظہار لاتعلقی ہے۔

ایک اور مقام پر بت پرستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہ عنکبوت، آیت ۲۵:

"اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا"۔

(تم نے خدا کو چھوڑ کر بتوں سے ناطہ جوڑ لیا اور تمہارے درمیان دنیاوی زندگی میں بہت زیادہ قرب اور محبت والفت پیدا ہوگئی' لیکن یاد رکھو تم قیامت کے دن ایک دوسرے سے اظہار برائت کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے)۔

اس آیت میں بھی "برائت" کی جگہ لفظ "کفر" استعمال ہوا ہے۔

(کتاب اصول کافی جلد دوم صفحہ ۳۸۹)

اس روایت میں درحقیقت' کفر کی شدت وضعف کو بیان کیا گیا ہے اور اس مطلب کو واضح کیا گیا ہے کہ کفر میں شدت وضعف ممکن ہے۔ اس سلسلے میں ہم پہلے بھی وضاحت کر چکے ہیں۔

آیات ۸ تا ۲۰

o وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾

o يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾

o فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ۬ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾

o وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

o اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

o وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ
اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

o وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

o اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

o اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا
مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

o مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ
وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾

o صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ۙ

o اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ
مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

o يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙۗ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ
قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

ترجمہ

- کچھ لوگ ایسے ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لائے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے۔ (۸)
- وہ اپنے تئیں خدا اور مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں جبکہ وہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں لیکن وہ اس کا شعور ہی نہیں رکھتے۔ (۹)
- ان کے دلوں میں بیماری ہے' اور خدا ایسے لوگوں کی بیماری کو زیادہ کرتا ہے' اور ان کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے ان کے لیے دردناک عذاب مقرر کیا گیا ہے۔ (۱۰)
- اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح احوال کرنے والے ہیں۔ (۱۱)
- یاد رکھیں کہ یہی لوگ فساد پھیلانے والے ہیں لیکن انہیں اس بات کا شعور ہی نہیں۔ (۱۲)
- اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایمان لاؤ جس طرح کہ دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں' یاد رکھیں' یہی لوگ بے وقوف ہیں لیکن وہ خود نہیں جانتے۔ (۱۳)
- اور جب کبھی اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں' اور جب اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ایمان لانے والوں کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ (۱۴)
- خدا ایسے لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی میں چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اسی میں سرگرداں رہیں۔ (۱۵)
- یہی لوگ ہیں کہ جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی مول لے لی ہے حالانکہ ان کے لیے یہ تجارت سود بخش نہیں اور نہ ہی وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ (۱۶)

- ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے روشنی کے لیے آگ جلائی اور جب آگ کی روشنی سے اردگرد کی سب چیزیں نظر آنے لگیں تو خدا نے آگ کو ٹھنڈا کر کے انہیں روشنی سے محروم کر دیا اور انہیں ایسی تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ (۱۷)
- یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور اب راہ راست پر واپس نہیں آ سکتے۔ (۱۸)
- یا پھر ایسے لوگوں کی مثال اس بارش کی سی ہے جس میں تاریکیاں گرج اور بجلی ہو اور لوگ موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں جبکہ خدا کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ (۱۹)
- اور ایسا لگتا ہے کہ ابھی یہ بجلی ان کی آنکھوں کو چندھیا دے، پس جب بجلی چمکتی ہے اور ان کے لیے سب کچھ روشن کر دیتی ہے تو وہ چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا کر دیتی ہے تو وہ رک جاتے ہیں۔
اور اگر خدا چاہے تو انہیں سننے اور دیکھنے سے محروم کر دے، کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۰)

تفسیر و بیان

بعض الفاظ کے معانی

○ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ... الخ:

ان آیات میں لفظ "خدعہ" استعمال کیا گیا ہے (یخادعون، یخدعون) جو کہ مکر و فریب کی ایک قسم ہے' اس کا لفظی ترجمہ "دھوکہ" ہے۔ اور ان آیات میں "شیطان" کا ذکر بھی آیا ہے' شیطان یعنی شریر، اس بناء پر ابلیس کو شیطان کہا گیا ہے کہ وہ سراپا شر اور برائی ہے۔

زیر نظر آیات میں منافقین کے بارے میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے' انشاء اللہ ہم ان کی بابت سورہ منافقین اور دیگر مقامات میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

منافقوں کی بابت ایک تمثیل

○ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا... الخ

اس آیت میں خداوند عالم نے ایک مثال دے کر منافقین کی حالت کو بیان کیا ہے کہ وہ اس شخص کی مانند ہیں جو گھنے اندھیرے میں پڑا ہوا ہے اور خیر و شر کی تمیز و پہچان نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنے لیے اچھے اور برے کو سمجھ سکتا ہے' لہٰذا وہ اس تاریکی سے نجات پانے کے لیے ہر طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس تاریکی سے نجات پا کر روشنی حاصل کرلے' چنانچہ وہ آگ جلاتا ہے اور اس کی روشنی سے اپنے اردگرد کی چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے اور جب سب کچھ اسے نظر آنے لگتا ہے تو خدا اپنے وسائل مثلاً ہوا' بارش وغیرہ کے ذریعے اس آگ کو بجھا دیتا ہے اور وہ شخص پھر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔ بلکہ اب اسے دو تاریکیاں گھیر لیتی ہیں: ایک پہلی تاریکی جو اس پر چھائی ہوئی تھی اور ایک اس بات کی تاریکی کہ آخر یہ کیا ہوا اور اس نے روشنی کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ کیونکر بے اثر ہو گیا یعنی حیرت و تعجب کی تاریکی بھی اب اس پر محیط ہو جاتی ہے۔

یہ ہے منافقین کی حالت کہ بظاہر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور دین کے نام پر کچھ فوائد حاصل کرتے ہیں اور چونکہ اپنے آپ کو "مومن" کہلاتے ہیں لہٰذا مومنین سے میراث بھی پاتے ہیں اور ان کے ساتھ ازدواجی رشتے بھی قائم کرتے ہیں' اس کے علاوہ وہ تمام فوائد حاصل کر لیتے ہیں جو مومنین کو "ایمان" کے حوالہ سے حاصل ہوتے ہیں' لیکن جونہی موت کا وقت قریب آتا ہے جو کہ "ایمان" کے فیوضات حاصل کرنے کا سب سے بہترین وقت ہوتا ہے تو خداوند عالم ان لوگوں کو اپنے نور

حقیقت سے محروم کر دیتا ہے اور ان کے تمام اعمال جو انہوں نے دین کے نام پر انجام دیئے تھے باطل و بے اثر قرار دے کر انہیں ایسی تاریکی میں ڈال دیتا ہے کہ وہ کسی چیز کو سمجھ ہی نہیں سکتے' اور پھر وہ دو تاریکیوں میں ڈوب جاتے ہیں: ایک اصلی تاریکی اور دوسری ان کے اعمال کے نتیجہ میں ان پر آنے والی تاریکی!۔

بارش کے ذریعے تمثیل

○ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ... الخ

اس آیت میں جو الفاظ (مفردات) ذکر کئے گئے ہیں سب سے پہلے ان کے معانی بیان کئے جاتے ہیں:

صیب: موسلا دھار بارش۔

برق: اس کا مشہور معنی "بجلی" ہے۔

رعد: گرج' یعنی وہ آواز جو بادل سے اس وقت نکلتی ہے جب وہ زور سے چمکتا ہے۔

صاعقہ: وہ آسمانی آگ جو گرج اور کڑک کے ساتھ زمین پر گرتی ہے

اس آیہ شریفہ میں خداوند عالم نے منافقین کے بارے میں ایک اور مثال پیش کی ہے کہ وہ لوگ بظاہر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں ہوتا' تو وہ اس شخص کی مانند ہیں جو ایک موسلا دھار بارش کی زد میں ہو' ایسی بارش کہ جس کے ساتھ ظلمت و تاریکی ہو جس کے سبب نہ تو کچھ دکھائی دیتا ہو اور نہ ہی کسی چیز کی تمیز و پہچان ہو سکتی ہو' ایسی حالت میں وہ دو چیزوں کے درمیان پھنس جاتا ہے: ایک موسلا دھار بارش جو اسے بھاگنے اور پناہ گاہ تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے اور دوسری ظلمت و تیرگی جو اسے بھاگنے اور جان بچانے کے لیے پناہ گاہ تلاش کرنے سے مانع ہے' اس کے ساتھ ساتھ رعد (گرج) اور صاعقہ (آسمانی آگ کا ٹکڑا) بھی چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے ہیں اور اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا کہ وہ بجلی کا سہارا لے اور اس کی روشنی سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے لیے نجات کا راستہ تلاش کرے لیکن وہ بجلی لحہ بھر سے زیادہ نہیں ہوتی اور ایسی نہیں کہ وہ اس کے ذریعے اطمینان کے ساتھ اپنی پناہ گاہ ڈھونڈ لے۔ لہٰذا اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جب بجلی چمکتی ہے تو وہ چل پڑتا ہے اور جب اس پر اندھیرا کر دیتی ہے تو وہ رک جاتا ہے۔

منافق کی حالت بھی ایسی ہے کہ اس کے دل میں ایمان کی محبت نہیں ہے لیکن وہ مجبور و ناچار ہو کر اظہار ایمان کرتا ہے اور چونکہ اس کا دل اور اسکی زبان ایک جیسے نہیں بلکہ دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ اور!۔ لہٰذا اس کی زندگی کا راستہ اس کے لیے واضح نہیں اور وہ ہمیشہ لڑکھڑاتا رہتا ہے اور اپنے سفر حیات میں منزل مقصود سے کوسوں دور ہو کر حیران و سرگردان ہو جاتا ہے' اسی حالت میں ایک قدم چلتا ہے اور پھر رک جاتا ہے اور پھر کچھ دیر چلتا ہے تو رک جاتا ہے' اس کی یہ کیفیت اس امر کا باعث بنتی ہے کہ خدا اسے معاشرے میں رسوا کر دیتا ہے' لیکن اگر خدا چاہتا تو اسے سماعت و بصارت کی قوت سے محروم کر دیتا اور وہ پہلے دن سے ہی ذلت و رسوائی کا شکار ہو جاتا جبکہ خدا لوگوں کو مہلت دیتا ہے اور انہیں رسوا کرنے میں جلدی نہیں کرتا اور منافق اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

آیات ۲۱ تا ۲۵

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾

الَّذِیۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ‌ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾

وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ؕ كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا‌ۙ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِىۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ‌ؕ وَلَهُمۡ فِيۡهَآ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ‌ۙ وَّهُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵﴾

ترجمہ

- اے لوگو! تم عبادت کرو اپنے پروردگار کی، کہ جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے تھے، تا کہ تم پرہیز گار بن سکو۔ (۲۱)
- وہ ..... پروردگار...... کہ جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا اور آسمان کو چھت قرار دیا اور آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس (پانی) سے تمہارے لیے رزق کے طور پر پھل پیدا کیے پس کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ جب کہ تم آگاہی رکھتے ہو۔ (۲۲)
- اور اگر تم اس چیز کے بارے میں کسی طرح کے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے (قرآن) تو اس جیسی ایک سورت پیش کرو اور خدا کے علاوہ اپنے مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ (۲۳)
- پس اگر تم نے ایسا نہ کیا اور نہ ہرگز کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہونگے اور جو کافروں کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ (۲۴)
- اور خوشخبری دیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے کہ ان کے لیے بہشت کے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں۔ جب انہیں ان باغات کا کوئی میوہ کھانے کے لیے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی کھانے کے لیے دیا جا چکا ہے حالانکہ انہیں جو میوے دیئے گئے تھے وہ ذائقے میں اس میوے جیسے تھے اور بہشت میں ان کے لیے پاک و پاکیزہ ازواج ہوں گی اور وہ لوگ انہی باغات میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۵)

تفسیر و بیان

عبادت کا عمومی حکم

○ "یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا... الخ"

(اے لوگو! تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔۔۔)

جب خداوند عالم نے متقین، کافرین اور منافقین، تینوں گروہوں کے بارے میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا کہ متقین اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور قرآن ان کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے اور کافرین کے دلوں اور کانوں پر مہریں لگا دی گئی ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور منافقین کے دلوں میں بیماری ہے اور خدا ان کی بیماری کو مزید بڑھا دیتا ہے اور وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں...... یہ سب باتیں گذشتہ ۱۹ آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے بعد انداز خطاب بدلتے ہوئے کردگار عالم نے لوگوں کو اپنی عبادت و بندگی کی دعوت دی اور انہیں ترغیب دلائی کہ وہ کافروں اور منافقوں کو چھوڑ کر مومنین کے ساتھ مل جائیں اور انہی کے زمرہ میں داخل ہوں، خدا نے اس دعوتِ بندگی کو آیہ ۱۲ سے ۵۲ تک پانچ آیات میں بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت ۱۲ میں "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" کا تعلق "اعْبُدُوْا" سے ہے نہ کہ "خَلَقَکُمْ" سے، تاہم اگر اس کا تعلق "خَلَقَکُمْ" سے بھی ہو تب بھی صحیح ہے اور معنی و مطلب کی صحت میں کوئی خدشہ وارد نہیں ہوتا۔

وضاحت:

آیت ۱۲ میں ارشاد ہوا: (یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ) لوگو تم عبادت کرو اپنے پروردگار کی، وہ کہ جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے تھے، تا کہ تم پرہیز گار بن سکو، اب سوال یہ ہے کہ "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" (یعنی تم پرہیز گار بن سکو) اس جملے کا تعلق "اعْبُدُوْا" (عبادت کرو) سے ہے یا "خَلَقَکُمْ" سے، اگر اعْبُدُوْا سے ہو تو یوں معنی کیا جائے گا: تم عبادت کرو تا کہ تم پرہیز گار بن سکو، اور اگر "خَلَقَکُمْ" سے ہو تو یوں معنی کیا جائے گا کہ تم عبادت کرو اپنے رب کی کہ جس نے تمہیں پیدا کیا تا کہ تم پرہیز گار بن سکو، دوسری صورت میں "پیدا کرنے کا مقصد" پرہیز گاری کا حصول ہے اور پہلی صورت میں عبادت کا نتیجہ پرہیز گاری کا حصول ہے۔

اگرچہ بظاہر یہ لگتا ہے کہ اس کا تعلق ''اعبدوا'' سے ہے یعنی پرہیزگاری کا حصول درحقیقت عبادت کا نتیجہ ہے' یعنی عبادت کرو تاکہ پرہیزگار بن سکو' نہ یہ کہ اس کا تعلق ''خَلَقَكُمْ'' سے ہے اور معنی یہ ہو کہ اس نے تمہیں پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار بن سکو' تاہم اگر دوسرا معنی بھی مراد لیا جائے تب بھی درست قرار پا سکتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ پرہیزگار بن سکیں' گویا غرض تخلیق یہ ہے کہ لوگ تقویٰ ایسی عظیم نعمت سے بہرہ ور ہوں' جبکہ پہلی صورت میں نتیجہ عبادت تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح دونوں پہلو صحیح ہیں۔

خدا کے مقابل وہمسر بنانے کی ممانعت

○ ''فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ''۔

اس آیت میں کلمہ ''انداد'' ذکر ہوا جو ''ند'' کی جمع ہے اور یہ لفظ (ند) لفظی طور پر ''مثل'' کے وزن پر ہے اور معنے کے لحاظ سے بھی اسی کی مانند ہے (مثل کا معنی دیتا ہے) اور آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ''وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'' (حالانکہ تم خود جانتے ہو) اس جملے کو کسی خاص قید وشرط کے بغیر اور ''فَلَا تَجْعَلُوْا'' کے جملے کا حال بنا کر ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ نہی میں تاکید مقصود ہے' لہٰذا معنی یہ ہوگا کہ ''پس تم خدا کے مثل نہ بناؤ جبکہ تم خود جانتے ہو کہ ایسا کرنا غلط ہے''۔ گویا خدا تاکید کے ساتھ فرمارہا ہے کہ انسان خواہ جتنا کچھ جانتا ہو لیکن اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچا کہ وہ خدا کا مثل قرار دے حالانکہ خداوند عالم نے ان لوگوں کو اور ان سے پہلے والے لوگوں کو پیدا کیا اور پھر ان کے رزق وبقاء کے لیے کائنات کے نظام کو مرتب کیا۔

قرآن کے بارے میں کھلا چیلنج

○ ''فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ . . .''

(پس لے آؤ اس جیسی ایک سورت)

اس آیت میں قرآن جیسی ایک سورت پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس طرح کے حکم (امر) کو ''امر تعجیزی'' کہتے ہیں۔ اس (امر تعجیزی) کے ذریعے قرآن کے معجزہ ہونے کا اظہار مقصود ہے اور یہ کہ یہ کتاب، خدا کی طرف سے نازل کی گئی ہے اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا اور یہ ایسا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے جو اس وقت تک باقی رہے گا جب تک زمانہ باقی ہے اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس کے معجزہ ہونے میں ذرہ بھر فرق نہیں آئے گا۔

قرآن مجید کی مثل ونظیر لانے سے لوگوں کی ناتوانی کا تذکرہ متعدد آیات میں ہوا ہے مثلاً:

سورۂ اسراء آیت ۸۸:

: ''قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ

بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔

(کہہ دیجئے کہ اگر سب انسان اور جن مل کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو اس کی مثل نہیں لا سکتے خواہ وہ اس سلسلے میں ایک دوسرے کے مددگار ہی بن جائیں)۔

سورہ ''ھود'' آیت ۱۳:

''اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ''۔

(کیا وہ کہتے ہیں کہ اس (محمد) نے خدا پر افتراء باندھا ہے' ان سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ افتراء ہے تو پھر تم بھی ایسی دس من گھڑت سورتیں پیش کر دو اور خدا کے سوا جس کو بھی بلا سکتے ہو اس کام میں اپنی مدد کے لیے بلا لو اگر تم اپنی بات میں سچے ہو)۔

بنابرایں آیت ۲۳ میں ''مثلہ'' کی ضمیر (ہ) آیت کی ابتداء میں ذکر کئے گئے جملے ''مِّمَّا نَزَّلْنَا'' کے حرف ''ما'' کی طرف لوٹتی ہے یعنی اس جیسی ایک سورت' لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن اپنے قرآن ہونے کے حوالہ سے اور اپنے مخصوص اسلوب و عمدہ طرز بیان کے ساتھ اس عظمت کا حامل ہے کہ اس کی مثل و نظیر لانا لوگوں کے بس کا روگ نہیں گویا لوگوں کا قرآن کی مثل و نظیر نہ لاسکنا دراصل خود قرآن کی ترتیب و ترکیب اور اسلوب بیان کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی اور سبب سے' اس مقام پر ایک اور احتمال بھی دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے ضمیر (ہ) آیت میں مذکور کلمہ ''عبدنا'' کی طرف لوٹ رہی ہو' تو اس صورت میں لوگوں کا عجز و ناتوانی خود قرآن کے حوالہ سے نہیں بلکہ قرآن کے اس حیثیت کے حامل ہونے کی وجہ سے ہے کہ اسے وہ شخص لایا ہے جو ''امی'' ہے کہ جس نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا اور نہ ہی لوگوں میں سے کسی سے یہ عظیم اور بلند پایہ معارف و علوم اور نہایت عمدہ و پختہ بیانات سیکھے ہیں' (جبکہ تم ایسا نہیں کر سکتے) یعنی یہ تمہارے لیے مقدور و ممکن نہیں کہ تم میں سے کوئی شخص کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے بغیر اس قدر وسیع علم و معرفت اور عظیم علوم و حقائق کا پاکیزہ مجموعہ پیش کر سکے' لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ کتاب، خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور جس پر نازل ہوئی اس نے مخلوق میں سے کسی سے بھی کسب فیض نہیں کیا بلکہ خدا نے اسے یہ سب علوم و حقائق تعلیم دیئے ہیں) گویا اس آیت کا اشارہ سورہ یونس آیت ۱۶ کی طرف ہے کہ جس میں خدا نے ارشاد فرمایا:

''قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ''۔

(کہہ دیجئے کہ اگر خدا چاہتا تو میں نہ اسے (قرآن کو) تمہارے سامنے پڑھتا اور نہ ہی مجھے اس کی کچھ خبر ہوتی جبکہ میں اس کے نازل ہونے سے پہلے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ تم میں گزار چکا ہوں' کیا پھر بھی تم غور نہیں کرتے؟)

یہ تھا آیت مبارکہ میں (ہ) کی ضمیر کا بیان' لیکن آیت کی تفسیر میں وارد ہونے والی بعض روایات میں دونوں

احتمالات ذکر کئے گئے ہیں کہ یہ ضمیر یا تو "ماانزلنا" میں "ما" کی طرف لوٹتی ہے یا "عبدنا" کی طرف، پہلی صورت میں قرآ ن بحوالہ خود اور دوسری صورت میں قرآن بحوالہ پیغمبر اسلام مراد ہوگا۔

بہر حال اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات میں اس حقیقت کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ قرآن ہر لحاظ سے معجزہ ہے او اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت جیسے سورہ کوثر اور سورہ عصر بھی معجزہ ہے اور کوئی شخص اس کی مثل ونظیر نہیں لا سکتا۔

اور جہاں تک اس ممکنہ احتمال کا تعلق ہے کہ "مِّثْلِهٖ" میں ضمیر "ہٖ" اسی سورت کی طرف لوٹ رہی جس میں وہ مذکو ہے، یعنی سورہ بقرہ یا سورہ یونس، کیونکہ اس آیت میں ہے کہ "فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" یعنی لے آؤ اس جیسی ایک سورت لہٰذا اس سے مراد پورا قرآن نہیں بلکہ صرف وہی سورت ہو جس میں یہ آیت ذکر ہوئی ہے...... تو یہ نظریہ یا احتمال، اسلوب سخ اور مزاج بیان کے سراسر خلاف ہے اور کوئی صاحب ذوق سلیم اسے تسلیم نہیں کر سکتا، کیونکہ جو شخص قرآن کے بارے میں تہمت لگاتا ہے کہ یہ محمدؐ کا من گھڑت کلام ہے اور اس (محمدؐ) نے خدا پر جھوٹ وافتراء باندھا ہے، تو وہ پورے قرآن پر تہمت لگاتا ہے نہ کہ کسی ایک سورت پر یا چند سورتوں پر، لہٰذا یہ کہنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ سورہ بقرہ یا سورہ یونس جیسی سورتوں ا بابت کہا گیا ہے کہ لوگ ان جیسی سورتیں لانے سے عاجز و ناتواں ہیں کیونکہ اگر ایسا ہو تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تم سورہ کوثر مثلاً سورہ اخلاص کے بارے میں شک کرتے ہو تو سورہ یونس جیسی ایک سورت پیش کر دو، جبکہ یہ معنی مراد لینا قطعی طور نادرست بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔

معجزہ اور اس کی حقیقت

قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ معجزہ ہے، اپنے اس دعوے کی صحت پر دلیل قائم کرتے ہوئے قرآن نے چیلنج کیا ہے کہ ا جیسی ایک سورت پیش کرو، جیسا کہ اس آیت شریفہ (۲۳۔البقرہ) میں مذکور ہے، قرآن کا ادعائے اعجاز درحقیقت دو دعووں مشتمل ہے یعنی یہ ایک دعویٰ دراصل دو دعوے ہیں، ایک یہ کہ دنیا میں معجزہ کا وجود ثابت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، دو یہ کہ قرآن اس ناقابل انکار حقیقت (معجزہ) کا ایک مصداق ہے (یعنی معجزہ ہے) اور یہ بات واضح ہے کہ اگر دوسرا دعویٰ ثابہ ہو جائے تو پہلا دعویٰ خود بخود ثابت ہو جائے گا۔ یعنی جب قرآن کا معجزہ ہونا ثابت ہو جائے تو اصل معجزہ کا وجود یقینی طور پر ثابہ ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے دوسرے دعوے کے اثبات پر اکتفاء کی ہے اور پہلے دعویٰ کے بارے میں سکوت اختیہ کیا ہے، چنانچہ آیات شریفہ میں صرف یہی مذکورہ ہے کہ اگر تمہیں اس کے بارے میں کوئی شک ہے تو اس جیسی ایک سورت پیش کرو، گویا قرآن نے اپنے معجزہ ہونے کے بارے میں چیلنج کر کے معجزہ کے اصل وجود کو مسلم الثبوت قرار دے دیا ہے۔ ا طرح دونوں دعوے ثابت ہو گئے، یعنی ایک معجزہ کا اصل وجود اور اس کی ناقابل انکار حقیقت، اور دوسرا قرآن کا معجزہ ہونا۔

معجزہ کی بابت ایک فنی سوال

اصل وجودِ معجزہ اور قرآن کے معجزہ ہونے کے اثبات کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ کس طرح وجود پذیر ہوتا ہے جبکہ وہ ''معجزہ'' ہے اور اس کے نام سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے مقابلہ میں بشر ناتواں ہے کیونکہ معجزہ کہتے ہی اسے ہیں جو دنیائے طبیعت کے مسلمہ اور مروجہ اصولوں و معمول سے ہم آہنگ نہ ہو' یعنی جبکہ دنیا میں سبب و مسبب کے درمیان ایسا پختہ رابطہ ہے کہ نہ سبب مسبب سے الگ ہو سکتا ہے اور نہ مسبّب' سبب کے بغیر وجود میں آسکتا ہے' اور سبب و مسبّب کے درمیان اس مضبوط رابطہ میں کوئی استثناء موجود نہیں بلکہ یہ اصول دنیا کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے گویا دنیائے طبیعت کی کوئی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں تو پھر معجزہ کا وجود میں آنا کیونکر ممکن ہے اور سبب و مسبّب کے اس پختہ رابطے اور اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے معجزہ کس طرح ثابت و متحقق ہو سکتا ہے؟

جواب:

قرآن مجید نے اپنے پاکیزہ بیان کے ساتھ اس سوال کا نہایت واضح جواب دیا ہے اور حقیقت امر کو آشکار کر دیا ہے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن نے دو پہلوؤں سے حقیقت امر کو واضح کیا ہے ایک یہ کہ معجزہ' ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور قرآن جو کہ خود معجزہ ہے وہ معجزے کی اصل حقیقت کے اثبات کے لیے خود ایک واضح دلیل ہے اسی وجہ سے اس نے چیلنج کیا ہے کہ اس جیسی ایک سورت پیش کی جائے' دوسرا یہ کہ معجزہ کیا ہے اور اس کی حقیقت کس طرح سے دنیائے طبیعت میں وجود پذیر ہو سکتی ہے یعنی یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک ایسی چیز وجود میں آجائے جو دنیائے طبیعت کے تمام اصولوں کو نظر انداز کر کے اور ان کی مسلمہ بنیادوں سے ہٹ کر اپنا وجود ثابت کرے ان دونوں امور کی بابت تفصیلی تذکرہ کیا جاتا ہے:

قرآن کا معجزہ ہونا

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید نے اپنے ''معجزہ'' ہونے کے بارے میں اپنی متعدد آیات میں' جن میں سے کچھ مکی (مکہ میں نازل ہونے والی) اور کچھ مدنی (مدینہ میں نازل ہونے والی) ہیں' چیلنج کر کے کہا ہے کہ اگر اس کے بارے میں کسی کو کوئی شک ہو تو وہ اس جیسی ایک سورت پیش کرے' ان آیات میں قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن' خدا کی نہایت واضح و آشکار نشانی اور مافوق الطبیعت ...... خارق العادت (معجزہ) ہے' بلکہ آیت ۲۳ (جو پہلے ذکر کی جاچکی ہے) بھی قرآن مجید کے ''معجزہ ہونے کی دلیل ہے اور اس میں چیلنج کر کے

کہا گیا ہے کہ اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ (وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ) یعنی اگر تم کہتے ہو کہ یہ (قرآن) محمدؐ کا من گھڑت کلام ہے تو تم بھی اس جیسا کلام پیش کرو۔

یاد رہے کہ یہ آیت (۲۳) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی براہ راست دلیل نہیں بلکہ یہ قرآن کے معجزہ ہونے کی دلیل ہے جو کہ حضرت رسول خداؐ پر نازل ہوا' کیونکہ اگر یہ آیت، آنحضرتؐ کی نبوت و رسالت کی براہ راست دلیل ہوتی تو آیت "وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا" (اگر تم اس چیز کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے) کے بجائے اس طرح ہوتی "وان کنتم فی ریب من رسالة عبدنا" (اگر تم شک میں ہو ہمارے بندے کی رسالت میں تو.....) جبکہ ایسا نہیں' لہٰذا اگر اس آیت میں "من مثلہ" کی ضمیر "ہ" سے مراد پیغمبر اکرمؐ بھی ہوں تب بھی یہ آیت آنحضرتؐ کی نبوت کی دلیل نہیں بلکہ قرآن کے معجزہ ہونے کی دلیل ہے البتہ اس صورت میں یوں معنی کیا جائے گا کہ اگر تم اس چیز کے بارے میں شک کرتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو تم بھی اس کی نظیر لے آؤ یعنی جو کام اس نے کیا ہے اس جیسا تم بھی کر کے دکھاؤ' گویا یہ چیلنج پیغمبر اکرمؐ کے حوالہ سے کیا گیا ہے۔

بہرحال قرآن مجید میں جہاں جہاں لوگوں کو چیلنج کیا گیا ہے کہ قرآن کی مثل و نظیر پیش کرو وہ تمام آیات قرآن کے "معجزہ" ہونے کی دلیلیں ہیں گویا ان کے ذریعے قرآن کے معجزہ ہونے پر استدلال کیا گیا اور اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ یہ مقدس کتاب، خدا کی طرف سے "معجزہ" بن کر نازل ہوئی ہے۔ البتہ ان آیات شریفہ میں مختلف پہلوؤں سے چیلنج کیا گیا ہے بعض آیات میں عمومیت کے ساتھ چیلنج کیا گیا ہے اور بعض میں خاص موارد کے ساتھ' مثلاً سورہ اسراء آیت ۸۸ میں عمومیت کے ساتھ یعنی پورے قرآن کی مثل و نظیر لانے کا چیلنج کیا گیا ہے: چنانچہ ارشاد ہوا:

★ "قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔"

(کہہ دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جن مل کر اس قرآن کی مثل و نظیر لانا چاہیں تو اس کی مثل نہیں لا سکتے' خواہ وہ اس سلسلے میں ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور تعاون و مدد ہی کیوں نہ کریں)

اس آیت میں پورے قرآن کی نظیر لانے کے ساتھ چیلنج کر کے قرآن کے "معجزہ" ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ آیت مبارکہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اور ہر اہل نظر اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے کہ اس میں پورے قرآن کو بطور "معجزہ" بیان کر کے چیلنج کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں کسی طرح کے شک کی گنجائش نہیں۔

پس اگر صرف قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اسلوب بیان کی عظمت کے ذریعے اس کی مثل و نظیر لانے کا چیلنج کیا گیا ہوتا تو یہ بات صرف عربوں تک محدود ہوتی کیونکہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے اور انہی اہل زبان سے کہا جاتا جو زمانۂ جاہلیت میں اہل ادب کہلاتے تھے اور ان کی زبان ہر قسم کی آمیزش اور ادبی نقائص سے پاک تھی کہ وہ اس کی مثل پیش

کریں' جبکہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس تمام انسانوں اور جنوں کو چیلنج کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا ''معجزہ'' ہونا صرف فصاحت و بلاغت کلام اور عمدہ طرز و اسلوب بیان کے حوالہ سے نہیں اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی ایک خاص جہت اور مخصوص پہلو کو مدِ نظر قرار دے کر چیلنج کیا گیا ہے' جبکہ قرآن' معارف و حقائق' اخلاق و فضائل' احکام و دستورات شریعت' غیبی خبروں اور کئی دیگر ایسے علوم و معارف پر مشتمل ہے کہ انسان نے ابھی تک ان کے چہرۂ عظمت سے نقاب نہیں الٹی۔ اور یہ سب اپنی اپنی حقیقت میں عظمت قرآن کی منہ بولتی تصویریں ہیں اور ان سے قرآن کے ''معجزہ'' ہونے کا ثبوت ملتا ہے تاہم یہ ایسے امور ہیں جن کی بابت تمام انسانوں اور جنوں کو توآگاہی حاصل نہیں لیکن کچھ ایسی بلند پایہ ہستیاں بھی ہیں جو ان پاکیزہ حقائق سے مطلع و آگاہ ہیں اس لیے قرآن کا چیلنج تمام جہات اور فضیلت و برتری کے تمام ممکنہ پہلوؤں کے ساتھ ہے یعنی یہ نہیں کہا گیا کہ اس جیسی فصیح کتاب پیش کریں یا اس جیسی کتاب اخلاق یا کتاب احکام لائیں بلکہ کہا گیا کہ اس جیسی کتاب لائیں یعنی جو ہر ممکن پہلو سے فضیلت کی حامل ہو' نہ یہ کہ صرف ایک یا دو یا کئی پہلوؤں سے' لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن اپنی فصاحت و بلاغت میں صاحبانِ فصاحت و بلاغت کے لیے' اہل حکمت کے لیے علم و حکمت میں' ارباب دانش کے لیے دانش و معرفت میں' علم الاجتماع کے ماہرین کے لیے اپنے اجتماعی و معاشرتی مسائل کی جامعیت میں' قانون سازی کے ماہرین کے لیے تدوین قانون میں' سیاست دانوں کے لیے سیاسی امور میں' ارباب اقتدار کے لیے حکومتی مسائل میں اور تمام اہل عالم کے لیے ان تمام حقائق کے لحاظ سے ''معجزہ'' ہے جن کے ادراک سے وہ قاصر ہیں مثلاً غیبی امور' اور حکم و علم و بیان کے مختلف ہونے کی بابت سب لوگ حقائق سے مکمل آگاہی حاصل کرنے سے عاجز و ناتواں ہیں' اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید نے تمام جہات میں معجزہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور کائنات کے ہر فرد کے لیے اس کا یہ دعویٰ عام ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے' عوام میں سے ہو یا کسی مخصوص طبقہ سے تعلق رکھتا ہو' عالم ہو یا جاہل ہو' مرد ہو یا عورت ہو' اپنے علم و فضل میں بلند مقام رکھتا ہو یا کم درجہ کا حامل ہو لیکن کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو' تو قرآن ان سب کو مخاطب کرکے اپنے معجزہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کیونکہ ہر انسان اپنی عظیم فطرت کے سایہ میں یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ فضیلت و عظمت کی پہچان و تشخیص اور اس کے کم یا زیادہ ہونے کا تعین کر سکے' اس لیے ہر انسان اپنی اور دوسروں کی فضیلتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے اور ان فضیلتوں کے مراتب و درجات کی پہچان بھی کر سکتا ہے لہٰذا جب وہ ان تمام کمالات اور فضیلتوں کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ان عظمتوں اور کمالات کے ساتھ ان کا موازنہ کرے جو اسے قرآن کی بابت معلوم ہوئی ہیں تو اس صورت میں وہ صحیح و منصفانہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ آیا کوئی بشری قوت ان جیسے عظیم حقائق اور فضائل و کمالات کے حامل پاکیزہ معارف الٰہیہ کو پیش کر سکتی ہے اور کیا کوئی انسانی طاقت قرآنی حقائق و معارف کی نظیر لا سکتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان ایسی اخلاقی اقدار کا نمونہ پیش کر سکے جو قرآن کی پیش کی ہوئی پاکیزہ اور باعظمت قدروں کے برابر ہوں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بشر ایسے فقہی و سعادت بخش احکام و قوانین کی تدوین کر سکے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو سے تعلق رکھنے کے باوجود ہر قسم کے اختلاف و تناقض سے پاک ہوں اور ہر قانون و دستور میں اور اسی طرح ان کے نتائج و آثار میں روح توحید اور تقویٰ و پرہیزگاری کی اعلیٰ اقدار محفوظ رہیں

اور وہ قوانین ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ اصولوں پر مبنی ہوں؟ (ان کی ہر اصل و فرع میں پاکیزگی ہی پاکیزگی ہو) اور کیا کوئی اہل عقل وخرد یہ سوچ سکتا ہے کہ انسان کی فردی و اجتماعی زندگی کے جملہ پہلوؤں کا جائزہ لے کر ان کے لیے نہایت مناسب و موزوں اور سعادت بخش اصول و قوانین کی تدوین وہ شخص کرے جس نے دنیا کے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہ کیا ہو؟ بلکہ ایسے لوگوں میں رہ کر نشوونما پائی ہو جو انسانی قدروں کی پامالی میں اس حد تک پہنچ چکے ہوں کہ ڈاکہ زنی، لڑائیاں، جھگڑے، جنگ وجدال، لوٹ مار، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، غربت و افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینا، اپنے فاسق و فاجر اور درندہ صفت آباء واجداد پر فخر ومباہات کرنا، اپنی ماؤں کے ساتھ شادیاں کرنا، اپنے فسق وفجور پر ناز کرنا، علم کی مذمت اور اس سے نفرت کرتے ہوئے جہالت کی آغوش میں پناہ لینا، اپنی جھوٹی غیرت کی بنیاد پر لوگوں کی عزت و ناموس کا خون کرنا، کبھی یمن والوں کی غلامی اختیار کرنا تو کبھی حبشیوں کے در پہ جھکنا، کبھی رومیوں کے ہاتھوں میں اپنی زمام اقتدار و اختیار دے دینا تو کبھی اہل فارس کی جی حضوری کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دینا وغیرہ ان کی پہچان بن چکا ہو۔ تو کیا ایسے لوگوں میں رہ کر یعنی زمانۂ جاہلیت میں حجاز کے عربوں میں پیدا ہونے والا اور ان کے ساتھ زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ گزارنے والا شخص قرآن ایسی عظیم کتاب اپنی طرف سے بنا کر پیش کر سکتا ہے؟

کیا کوئی عقلمند یہ جرات کر سکتا ہے کہ خود اپنی طرف سے ایک ایسی کتاب پیش کرے جس کے بارے میں وہ مدعی ہو کہ وہ پوری کائنات کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے اور اس میں زمانہء ماضی و مستقبل کی خبریں' گذشتہ اقوام اور آئندہ آنے والے لوگوں کے حالات' ایک یا دو ابواب میں نہیں بلکہ کئی ابواب میں مختلف واقعات' حوادث اور آئندہ رونما ہونے والے وقائع کے بارے میں پیشگوئیاں بھی درج ہوں اور اس کے تمام مندرجات صحیح اور ہر لحاظ سے سچ ثابت ہو جائیں؟

اور کیا کوئی انسان کہ جو خود اس عالم طبیعت اور لحہ بہ لحہ تغیر پذیر دنیا کی مادی زندگی کی حامل موجودات میں سے ایک ہو ایسا کر سکتا ہے کہ پوری دنیائے بشریت اور کائنات انسانی کے تمام امور میں دخیل ہو کر ان کی بابت ایسے معارف' علوم' قوانین' احکام و دستورات' مواعظ و اخلاق' اور ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کے بارے میں معلومات فراہم کرے جو ہر لحاظ سے صحیح، مکمل اور پائدار ہوں اور جن پر حوادث روزگار اور دنیا کی تغیر پذیری اثر انداز نہ ہو سکے اور ان قوانین و دستورات میں کمال ونقص کے حوالے اور اعتبارات بے اثر ہوں' جبکہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر اور مختلف اوقات میں پیش کیا گیا اور ان میں سے کچھ امور کئی مرتبہ ظہور پذیر ہوئے اور کئی ایسے فروعات ہیں جو اپنے اصولوں کے آثار کے طور پر ان سے وابستہ ہیں؟ اس کے ساتھ ساتھ ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ کوئی انسان اپنے عمل کے کمال ونقص کے حوالہ سے ایک حالت پر باقی نہیں رہتا بلکہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں فکر و عمل کی پختگی و کمزوری کی گوناگوں کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے' لہٰذا ہر عقلمند اور صاحب بصیرت انسان کہ جو ان تمام مذکورہ مطالب وحقائق کو سمجھ سکتا ہو وہ کبھی اس سلسلے میں کسی قسم کے شک کا شکار نہیں ہو سکتا کہ یہ سب خصوصیات اور فضائل وکمالات جو قرآن مجید میں موجود ہیں بشری قوت سے بالاتر اور دنیائے طبیعت کے مادیت شعار وسائل سے ماوراء ہیں' اور اگر کوئی شخص ان مطالب کا بھی ادراک نہ کر پائے تو کم از کم اپنی انسانی حیثیت کو یاد کر کے اپنے

ضمیر کے اس فطری اصول کو کبھی فراموش یا نظر انداز نہیں کر سکتا کہ انسان جس چیز کو حقیقت کی سمجھنے سے قاصر اور اس کی بنیادوں سے ناآگاہ ہو اسے چاہیے کہ اس کی بابت مکمل علم وآگاہی رکھنے والے ارباب دانش واہل بصیرت کی طرف رجوع کرے۔

ایک امکانی سوال اور اس کا جواب

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں ممکن ہے آپ سوال کریں کہ قرآن مجید کا اس طرح سے اعلان عام اور ہر ایک کو چیلنج کرنا کیا فائدہ رکھتا ہے' عوام الناس کو چیلنج کرنے سے کیا حاصل ہوگا جبکہ خواص سے ایسا کہنا چاہیے تھا لیکن خواص کو چھوڑ کر عوام کو چیلنج کیا گیا ہے اور عوام تو ہر نئی بات کو جلد سے جلد مان لینے پر تیار ہو جاتے ہیں چنانچہ عوام کی فکری ناپختگی کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ حسین علی بہاء (فرقہ بہائیت کا بانی) مرزا غلام احمد قادیانی (فرقہ احمدیہ کا بانی) اور مسیلمہ کذاب جیسے لوگوں کے سامنے جھک گئے اور انہیں تسلیم کر لیا' جبکہ مذکورہ افراد نے جو نظریات پیش کئے اور ان کی صحت و حقانیت پر جو دلائل دیئے وہ نہایت بیہودگی اور حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں اور انہیں کسی معقول آدمی کی باتیں نہیں کہا جا سکتا۔

اس سوال کا جواب میں اس طرح دوں گا کہ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن نے اثبات معجزہ کے لیے جس راہ کو اختیار کیا ہے حقیقت میں وہی صحیح ہے کیونکہ ہر جہت سے "معجزہ" ثابت کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اسے ایسے انداز میں پیش کیا جائے جس میں فضیلت و برتری کی گنجائش ہو، تاکہ کسی کے کمال وعظمت کی پہچان آسانی سے ہو سکے' اور دوسرا یہ کہ لوگ فہم وشعور کے لحاظ سے مختلف ہونے کی وجہ سے کسب کمال میں بھی یکساں نہیں ہو سکتے اور جس طرح لوگوں میں سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے کی قوتوں میں فرق ہوتا ہے اسی طرح کمالات میں بھی فرق پایا جاتا ہے' لہٰذا ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے فہم وادراک میں بلند مقام رکھتا ہے اور صاحب فکر ونظر ہے وہ حقائق کو اچھی طرح درک کرے گا اور جو شخص اس سے کم درجہ کا حامل ہوگا اور فہم وادراک میں اس سے کمزور ہوگا وہ اس کی طرف رجوع کر کے حقائق سے آگاہی حاصل کرے گا' یہ وہ امر ہے جس کا فیصلہ فطرت سلیمہ اور انسانی طبیعت نے واضح طور پر کر دیا ہے۔ اسی لیے قرآن کے معجزہ ہونے کا اعلان اور اس کی مثل ونظیر لانے کا چیلنج "علم ومعرفت" کے ذریعے کیا گیا کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس سے ہر فرد حقائق سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے اور اس کا طریقہ وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ ارباب علم ودانش اور صاحبان فکر ونظر اپنی فکری قوت کے ساتھ حقائق ومعارف کا ادراک کریں گے جبکہ عوام الناس ان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی جہالت دور کریں گے اسی طریقہ کی تائید فطرت سلیمہ سے بھی ہوتی ہے' اب رہے وہ امور جو علم ومعرفت کے علاوہ معجزہ ہیں تو ان کی بابت حقیقت امر واضح ہے کہ علم و معرفت کے علاوہ جس چیز کو بھی معجزہ تصور کریں وہ دنیائے طبیعت کی موجودات میں سے ایک ہونے کے حوالہ سے یا حادث و حسی ہونے کے ناطے قانون طبیعت کی زد میں آتی ہے اور ایک خاص زمانہ اور مخصوص جگہ میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے کہ جسے سوائے چند افراد کے اور کوئی نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی کوئی دوسرا اس کے معجزہ ہونے کی حقیقت کا مشاہدہ کر سکتا ہے، اگر بہ فرض محال اسے دنیا کے ہر فرد کے لئے معجزہ اور قابل مشاہدہ مان لیں تو یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب ساری دنیا کے افراد ایک

جگہ اکٹھے ہو کر اس کا مشاہدہ کریں اور اگر یہ بھی مان لیں کہ وہ ہر جگہ اور ہر فرد کے لیے قابل مشاہدہ ہے تب بھی اسے ایک خاص زمانہ اور مخصوص دور کے لیے معجزہ ماننا پڑے گا نہ کہ ہمیشہ کے لیے' اس لیے قرآن نے کسی ایسے پہلو سے چیلنج نہیں کیا جو زمان و مکان کی محدودیت کی زنجیروں میں جکڑ کر کائنات کے ہر فرد کے لیے قابل عمل نہ ہو بلکہ اس نے اپنا چیلنج اس طرح اور اس پہلو سے کیا ہے کہ اس کا مخاطب ہر دور میں' ہر مقام پر کائنات کا ہر فرد ہے اور یہ عام اعلان اور کھلا چیلنج ہی درحقیقت لوگوں کے ہر طبقہ کو دعوت فکر دیتا ہے اور قرآن کی عظمت اور اس کے معجزہ ہونے کو واضح طور پر ثابت کرتا ہے۔

(۱)
علم کے حوالہ سے چیلنج

قرآن مجید نے علم و معرفت کے حوالہ سے چیلنج کر کے مختلف مقامات پر اپنے ''معجزہ'' ہونے کا اعلان کیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:

سورہ نحل، آیت ۸۹:

★ ''وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ''

(اور ہم نے آپؐ پر کتاب نازل کی جو ہر چیز کا واضح بیان ہے)۔

اور ارشاد فرمایا:

سورہ انعام، آیت ۵۹:

★ ''وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ''

(اور نہیں ہے کوئی تر اور نہ خشک چیز مگر یہ کہ اس کا ذکر اس روشن و واضح کتاب میں موجود ہے)۔

ان دو آیات کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں قرآن کی علمی عظمت کا تذکرہ ہوا ہے' گویا ان آیات میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ قرآن کہ جس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے اور ہر خشک و تر کا ذکر اس میں ہے اس کی مثل و نظیر لانا کسی بشر کے بس کا روگ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی مقدس و بلند پایہ تعلیمات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمام کلیات اور بنیادی حقائق کہ جن کا تذکرہ قرآن مجید نے کیا ہے اور تمام جزئیات و تفصیلات کہ جن کی بابت قرآن نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

سورہء حشر، آیت ۷:

★ "مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا"

(پیغمبر اسلامؐ جو حکم تمہیں دیں اس پر عمل کرو اور جس سے روکیں رک جاؤ)۔

اسی طرح ارشاد ہوا:

سورہء نساء، آیت ۱۰۵:

★ "لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ"

(تاکہ آپؐ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ذریعے حکم (فیصلہ) کریں جو خدا نے آپؐ کو دکھائی ہے)۔

ان سب میں علوم و معارف الٰہیہ فلسفیہ' بلند پایہ اخلاق' اور دین کے اصول و فروغ کی بابت بنیادی احکام و دستورات کہ جن میں عبادات' معاملات' سیاسیات' اجتماعیات اور وہ سب امور بیان کئے گئے ہیں جن کا تعلق انسان کے افعال و اعمال سے ہے' اور تمام معارف و مطالب فطرت سلیمہ اور حقیقت توحید کے عین مطابق ہیں اور پر لطف بات یہ ہے کہ جب ان علوم و معارف کی تفصیلات کا تجزیہ کریں اور تمام جزئیات کا جائزہ لیں تو سب کی بازگشت توحید کی طرف ہوتی ہے اور جب حقیقت توحید اور اس کے بنیادی پہلوؤں پر نظر کریں تو تمام معارف و احکام کی تصویر اس میں نظر آتی ہے۔

قرآن مجید نے اپنی تعلیمات اور علوم و معارف کی بقاء و دوام کی ضمانت بھی خود ہی دی ہے اور واضح طور پر بیان بھی کر دیا ہے کہ اس کے حقائق ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں اور ہر دور میں انسان کی صلاح و بہتری کے لیے قابل اجراء ہیں اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آ سکتا چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا:

سورہء حم سجدہ، آیت ۴۲:

★ "وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ"۔

(یہ ایسی کتاب عزیز ہے کہ جس پر باطل پہلے اور نہ آئندہ کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ یہ خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نازل کی گئی ہے)۔

اسی طرح ارشاد فرمایا:

سورہء حجر، آیت ۹:

★ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ"۔

(ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم اس کے محافظ ہیں)۔

قرآن وہ کتاب ہے جس کی تعلیمات قیامت تک کسی کے ہاتھوں زوال پذیر نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی دنیائے طبیعت پر حکم فرما قانون تغیر و تکامل اس کی تازگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے بلکہ وہ ابدیت نواز اور دوام شعار معجزہ الٰہی ہے۔

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

اس مقام پر ممکن ہے آپ سوال کریں کہ علم الاجتماع اور معاشرتی علوم کے ماہرین اور عصر حاضر کے قانون ساز محققین کا متفقہ نظریہ ہے کہ معاشرہ کے قوانین کا حالات زمانہ کی تبدیلی اور معاشرتی اقدار کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلنا ضروری ہے اور چونکہ ہر دور ایک جیسا نہیں رہتا بلکہ حالات واحوال کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے لہٰذا دنیا کی ترقی' تمدن اور پیشرفت کے باوجود صدیوں پرانے قوانین کس طرح قابل اجراء ہو سکتے ہیں'...... اسلام کے احکام و دستورات اور قوانین' قدیم عہد کی یادگاریں ہیں جبکہ عصر حاضر میں دنیا ترقی کر چکی ہے تو صدیوں پرانے قوانین کو نافذ کر کے معاشرے کی بہتری و بھلائی کی کس طرح توقع کی جا سکتی ہے؟

اس سوال' اعتراض یا غلط فہمی کا تفصیلی جواب سورہ بقرہ آیت ۲۱۳ (کان الناس امة واحدة) کی تفسیر میں دیا جائے گا اور اس موضوع کی بابت مکمل بحث ہوگی' لیکن یہاں سرسری طور پر اس کا مختصر اور جامع جواب یوں دیا جاتا ہے کہ قرآن نے اپنے تمام قوانین و دستورات کی بنیاد دو چیزوں کو قرار دیا ہے: ایک توحید فطری اور دوسری بلند پایہ اخلاق و عادات کہ جن کا تعلق طبیعت کے تقاضوں سے ہے اس کے علاوہ قرآن کا موقف یہ ہے کہ قانون سازی' تکوین و تخلیق عالم اور وجود و ہستی کے بنیادوں اصولوں پر ہونی چاہیے تاکہ حالات زمانہ اور تبدیلیء احوال ان کی افادیت کو زائل نہ کر سکے لیکن عصر حاضر کے ماہرین قانون اپنے علمی نظریات اور قانون سازی کے اصولوں کو معاشرہ کے بدلتے ہوئے احوال و اطوار کی روشنی میں استوار کرتے ہیں اور معنویات کو سرے سے ہی نظر انداز کر دیتے ہیں' ان کی توجہ معارف توحید اور پاکیزہ و باعظمت اخلاق کی طرف مبذول ہی نہیں ہوتی جس کے نتیجہ میں ان کی تمام کاوشیں معنوی و روحانی اقدار سے خالی ہوتی ہیں اور ان کی نظر صرف معاشرہ کی مادی ترقی پر ہوتی ہے اور یہ بات ان کے فکری جمود اور نہایت سطحی سوچ کی عکاس ہے' لیکن تعلیمات الٰہیہ وسیع' جامع اور ہر لحاظ سے کامل ہونے کے حوالہ سے نہایت بلند مقام و مرتبت کی حامل ہیں اور ان کی ہمہ گیری کا پرچم ہمیشہ ایوان انسانیت پر لہراتا رہے گا۔

(۲)

اس شخصیت کے حوالہ سے چیلنج جس پر قرآن نازل کیا گیا

قرآن مجید نے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے حوالہ سے بھی اپنے معجزہ ہونے کا اعلان اور اس کی مثل و نظیر لانے کا چیلنج کیا ہے' اور وہ اس طرح کہ یہ قرآن جو اپنے الفاظ و معانی دونوں کے لحاظ سے معجزہ ہے اسے اس شخص نے پیش کیا ہے جس نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی سے علمی و فکری تربیت پائی ہے تو اس کا ایسا کرنا (قرآن جیسی عظیم

کتاب پیش کرنا) معجزہ کے سوا کچھ نہیں، چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ یونس، آیت ۱۶:

★ "قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔"

(کہہ دیجیے کہ اگر خدا چاہتا تو میں اسے (قرآن کو) نہ ہی تمہارے سامنے پڑھتا اور نہ مجھے اس کی کوئی خبر ہوتی، جبکہ میں اس کے نازل ہونے سے پہلے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ اور طویل عرصہ تم میں گزار چکا ہوں، کیا پھر بھی تم غور نہیں کرتے)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سالہا سال ان لوگوں میں معاشرہ کے ایک عام فرد کی طرح رہے اور اس اثناء میں آنحضرتؐ نے نہ تو کسی کو اپنی کوئی فضیلت و برتری جتلائی اور نہ ہی اپنے علمی کمالات کا اظہار کیا، یہاں تک کہ اپنی چالیس سالہ زندگی میں کوئی شعر یا نثر جو آپ کی ادبی شخصیت کی دلیل ہو بھی پیش نہیں کی جبکہ یہ عرصہ (چالیس سال) آپ کی پوری زندگی کا دو تہائی حصہ ہے۔ لیکن اس دوران آپؐ نے اپنی برتری کے اظہار اور کسی معاشرتی عظمت کے مظاہرے کے طور پر کچھ بھی نہیں کیا بلکہ ایک عام فرد کی حیثیت میں لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہے، اور پھر دفعۃً اپنی نبوت کا اظہار کیا اور ایک ایسی کتاب پیش کر دی جس کے سامنے اس دور کے بلند پایہ ارباب علم و دانش دنگ رہ گئے اور زمانہ کے جلیل القدر اہل ادب اور فصاحت و بلاغت کے ماہرین قرآن کی عظمت کے سامنے زبان نہ کھول سکے۔ اور جب اس نے اپنی اس کتاب کو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا تو کسی عالم، فاضل اور ادیب و دانشور اور مفکر کو یہ جرات نہ ہو سکی کہ اس کے خلاف لب کشائی کرے اور اس کا مقابلہ کر سکے۔ البتہ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکے کہ یہ (محمدؐ) تجارت کی غرض سے ملک شام گئے تھے اور یہ سب کچھ انہوں نے وہاں کے راہبوں سے سیکھا ہے اور یہ تمام واقعات اور داستانیں انہی سے پڑھ کر آئے ہیں، حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ آنحضرتؐ ایک مرتبہ اپنے چچا محترم حضرت ابو طالبؑ کے ساتھ شام گئے جبکہ آپؐ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے تھے اور ایک مرتبہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے غلام میسرہ کے ساتھ شام گئے، اس وقت آپؐ کی عمر ۲۵ سال تھی اور آپؐ کے ساتھ کئی افراد بھی تھے جو ہر وقت آپؐ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اگر بفرض محال آپؐ نے اپنے اس سفر میں کسی سے کچھ سیکھا بھی ہو تو اس کا تعلق قرآن مجید کے باعظمت علوم و معارف سے کیا ہے؟ اور یہ پاکیزہ حکمتیں اور بلند پایہ حقائق کہاں سے آ گئے؟ اور اس دور میں کس نے آپؐ کو فصاحت و بلاغت کے یہ جواہر پارے عطا کر دیئے کہ ان کے سامنے دنیا بھر کے اہل ادب اور ارباب علم و دانش اور صاحبان فصاحت و بلاغت دنگ اور مات رہ گئے؟

اس کے علاوہ آنحضرتؐ پر یہ تہمت لگائی گئی کہ آپؐ ہر روز مکہ میں مقیم روم کے رہنے والے ایک لوہار کہ جو شمشیر سازی کا کام کرتا تھا، کے پاس جایا کرتے تھے اور اس سے یہ سب کچھ سیکھا اور پڑھا ہے۔ اس تہمت کا جواب خداوند عالم نے

اس طرح دیا:

سورہ نحل، آیت ۱۰۳:

★ "وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ"۔

(اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں اسے (محمدؐ کو) ایک انسان نے یہ سب کچھ پڑھایا ہے۔ جس زبان کی طرف یہ جھوٹی نسبت دیتے ہیں وہ عجمی ہے جبکہ یہ واضح و روشن عربی زبان ہے)۔

اس کے علاوہ آنحضرتؐ پر یہ تہمت بھی لگائی گئی کہ آپؐ نے کچھ چیزیں سلمان فارسی سے پڑھی ہیں کیونکہ وہ فارس کے ایک جید عالم دین تھے اور ان کے پاس ادیان و مذاہب کے بارے میں وسیع معلومات تھیں' حالانکہ جناب سلمان فارسی مدینہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس وقت قرآن کا اکثر حصہ نازل ہو چکا تھا کیونکہ قرآن کا زیادہ تر حصہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا اور اسی میں تمام بنیادی معارف و تعلیمات مذکور ہیں اور ان واقعات کا تذکرہ بھی ہے جن کی بابت کچھ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں بلکہ مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی آیات میں مدنی آیات کی نسبت زیادہ مطالب موجود ہیں' تو اس کے علاوہ اور کون سے ایسے مطالب ہیں جو سلمان فارسیؓ نے آپؐ کو تعلیم دیئے؟ اس کے علاوہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سلمان فارسی مذاہب و ادیان کا وسیع علم رکھتے تھے اور تورات و انجیل کے عالم تھے' تو وہ تورات و انجیل اب بھی موجود ہے ان کا مطالعہ کرنے سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے مطالب اور قرآن کے مطالب میں بہت فرق ہے' قرآن مجید میں انبیاء الٰہی علیہم السلام اور ان کی امتوں کے بارے میں جو واقعات مذکور ہیں وہ تورات و انجیل میں نہیں اور قرآن نے جو تاریخی حقائق پیش کئے ہیں وہ ان دو کتابوں میں مذکور نہیں' اس کے علاوہ قرآن اور تورات و انجیل میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ ان دو کتابوں میں انبیاء علیہم السلام کی طرف ایسی نازیبا نسبتیں دی گئی ہیں جو فطرت سلیمہ کے پاکیزہ مزاج کے سراسر منافی ہیں' بلکہ وہ ایسی ناپاک نسبتیں ہیں کہ کسی عام نیک و صالح اور صاحب عقل و بصیرت کی طرف بھی نہیں دی جا سکتیں' جبکہ قرآن مجید انبیاء و پیغمبران الٰہی علیہم السلام کو ہر قسم کے نقائص' قبائح اور قابل مذمت و لائق نفرت افعال سے پاک سمجھتا ہے' اور اس کے علاوہ کئی دیگر ایسے مطالب ان دو کتابوں میں مذکور ہیں کہ جن سے کسی حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی ان میں کسی اخلاقی فضیلت کا تذکرہ ہے کہ جو انسان کے لیے سعادت و خوش بختی کی راہ ہموار کرے' لیکن قرآن مجید نے ان کتابوں سے صرف انہی مطالب و حقائق کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے جو لوگوں کے لیے علوم و معارف اور اخلاق و آداب زندگی میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ ان کتابوں کا اکثر حصہ چھوڑ دیا ہے۔

(نوٹ) یاد رہے کہ مذکورہ بالا بحث میں تورات و انجیل سے مراد موجودہ دور میں پائی جانے والی یہ دو کتابیں ہیں کہ جن میں وسیع پیمانہ پر تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور اب یہ اپنی اصل حالت و صورت میں باقی نہیں اور اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید کی وجہ سے یہ دونوں منسوخ ہو چکی ہیں لہٰذا ناسخ اور منسوخ کا تقابل ہی نہیں ہو سکتا۔۔۔م)

(۳)

غیبی خبریں دینے کے حوالہ سے چیلنج

قرآن مجید نے اپنی متعدد آیات میں غیبی خبریں دے کر اپنے معجزہ ہونے کا اعلان و اظہار کیا ہے اور لوگوں سے کہا ہے کہ اگر تمہیں قرآن کے بارے میں کوئی شک ہو تو اس جیسی کتاب پیش کرو جس میں غیب کی خبریں دی گئی ہوں۔

غیب کی خبریں دینے کی بابت قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اور گوناگوں موضوعات کے ضمن میں تذکرہ ہوا ہے' ذیل میں ان موارد کو ذکر کیا جاتا ہے جن میں صراحت کے ساتھ خدا کی طرف سے قرآن میں غیب کی خبریں دینے کا اظہار کیا گیا ہے:

(۱) سابقہ انبیاء الٰہیؑ اور ان کی امتوں کے واقعات کی خبر دیتے ہوئے اس طرح ارشاد ہوا:

سورہ ء ہود، آیت ۴۹:

★ "تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا..."

(یہ سب غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپؐ کی طرف وحی کرتے ہیں' جبکہ اس سے پہلے ان کے بارے میں نہ آپؐ جانتے تھے اور نہ ہی آپؐ کی امت ۔۔۔)

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد یوں فرمایا:

سورہ ء یوسف، آیت ۱۰۲:

★ "ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ۔"

(یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے کہ جو ہم آپؐ کی طرف وحی کرتے ہیں' اور آپؐ تو اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب انہوں نے آپس میں یوسف کو دھوکہ دینے کے بارے میں متفقہ فیصلہ کر لیا)

حضرت مریمؑ کے تذکرہ میں اس طرح ارشاد ہوا:

سورہ ء آل عمران، آیت ۴۴:

★ "ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ۔"

(یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جو ہم آپؐ کی طرف وحی کرتے ہیں حالانکہ آپؐ اس وقت ان کے پاس

موجود نہ تھے جب وہ آپس میں قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ ان میں سے کون مریمؑ کی کفالت و سرپرستی کرے' اور آپ ان میں موجود نہ تھے جب وہ اس سلسلے میں آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

سورہء مریم، آیت ۳۴:

★ "ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ"

(یہ عیسیٰؑ بن مریمؑ ہے' یہ وہ حق کی بات ہے جس میں یہ لوگ شک کر رہے ہیں)۔

ان آیات کے علاوہ دیگر متعدد آیات ایسی ہیں جن میں سابقہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن اپنی ان غیبی خبروں کے حوالہ سے اپنے معجزہ ہونے کا اظہار کر رہا ہے اور چیلنج کر رہا ہے کہ جنہیں قرآن کی بابت شک ہو کہ یہ کسی بشر کا کلام ہے تو وہ اس جیسی غیبی خبروں پر مشتمل کتاب پیش کرے۔

(۲) آئندہ رونما ہونے والے حوادث کی خبر دیتے ہوئے ارشاد ہوا:

O سپاہ روم کی شکست اور فتح کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہء روم آیت ۲۔۳:

★ "غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ۔"

(شکست کھا گئے روم والے قریب ترین علاقہ میں' البتہ چند ہی سالوں میں وہ پھر غلبہ پالیں گے)

O ہجرت کے بعد پیغمبر اسلامؐ کی مکہ واپسی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہء قصص، آیت ۸۵:

★ "اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَاۗدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ"

(وہ خدا کہ جس نے تجھے قرآن عطا فرمایا وہ ضرور تجھے اس جگہ واپس لائے گا جہاں سے تو چلا گیا تھا)

O فتح و نصرت کی خوشخبری دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہء فتح، آیت ۲۷:

★۔ "لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ۔۔۔"

(تم ضرور داخل ہو گے مسجد الحرام میں انشاء اللہ امن و امان کے ساتھ' جبکہ تم نے اپنے سروں کو منڈوایا ہوا ہو گا اور تقصیر (تھوڑے سے بال کٹوائے ہونگے) کی ہوگی اور کوئی خوف نہ کرو گے)

O جہاد سے منہ موڑ کر گھر بیٹھ جانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہ فتح، آیت ۱۵:

★ "سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ"

(عنقریب کہیں گے وہ لوگ جو جہاد سے روگردانی کرتے ہوئے پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے جب تم مال غنیمت لینے کے لیے جاؤ تو ہمیں بھی اجازت دینا ہم بھی آپ کے ساتھ آئیں گے)

O خدا نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کے شر سے بچانے کی ذمہ داری اور ضمانت کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہ مائدہ، آیت ۶۷:

★ "وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ"

(خدا آپ کو لوگوں ...... کے شر...... سے بچالے گا)

O قرآن کی بابت ارشاد فرمایا:

سورہ حجر، آیت ۹:

★ "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ"

(ہم ہی نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ کثیر آیات موجود ہیں جن میں مومنین کو نعمتوں کی خوشخبری دی گئی جو کہ صحیح ثابت ہوئی اور مکہ کے مشرکین و کفار کو عذاب سے ڈرایا گیا اور وہ ان پر آ کے رہا۔

اسی طرح غیب کے واقعات کی بابت چند دیگر آیات بھی ذکر کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو:

سورہ انبیاء، آیات ۹۵ تا ۹۷:

★ "وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٩٥﴾ حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ۔"

(جس بستی کو ہم نے تباہ کر دیا ہے اس کے رہنے والوں کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اس وقت تک واپس آئیں جب تک کہ یاجوج اور ماجوج کے آنے کی راہ ہموار نہ ہو جائے اور پھر وہ ہر اونچان سے دوڑتے ہوئے آئیں گے، اور اس طرح حق کا وعدہ پورا ہوگا پس اس وقت کافروں کی آنکھیں شدت حیرت سے کھل جائیں گی اور وہ کہیں گے: افسوس کہ ہم تو غفلت میں رہے اور اپنے اس انجام کو بھول گئے تھے بلکہ ہم ہی نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے)

سورہ نور، آیت ۵۵:

★ "وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ"

(خدا نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے کہ بہت جلد انہیں زمین میں خلافت واقتدار عطا کرے گا)

سورہء انعام، آیت ۶۵:

★ "قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ"

(کہہ دیجئے کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب نازل کرے)

سورہء حجر، آیت ۲۲:

★ "وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ۔۔۔"

(اور ہم نے ہواؤں کو بھیجا باردار کرنے والی بنا کر۔۔۔)

سورہء حجر، آیت ۱۹:

★ "وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ۔۔۔"

(اور ہم نے اس میں (زمین میں) ہر چیز کو وزن اور اندزے میں اگایا)

سورہء نباء، آیت ۷:

★ "وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا۔۔۔"

(اور پہاڑوں کو میخیں بنایا)

مذکورہ بالا اور ان جیسی دیگر آیات میں جن حقائق کی خبر دی گئی ہے وہ ان آیات کے نزول کے وقت بالکل مجہول تھے اور ان علمی حقائق کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے لیکن صدیاں گزر جانے کے بعد علمی تحقیقات نے قرآن کی بیان کردہ حقیقتوں کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کردی اور موجودہ دور میں انسان نے ان حقائق کا مشاہدہ کرلیا ہے۔

یاد رہے کہ ہماری اس تفسیر کی بنیادی خصوصیات میں یہ بات شامل ہے کہ اس میں آیات کے معانی ومفاہیم کے سمجھنے کے لیے دوسری آیات سے استفادہ کیا جاتا ہے اور دوسری آیات ہی کو شاہد کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے (اس طریقۂ تفسیر کو "تفسیر القرآن بالقرآن" کہتے ہیں یعنی قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے) لہٰذا مذکورہ بالا آیات کی تصدیق کے طور پر چند دیگر آیات ذکر کی جاتی ہیں جن میں غیب کی خبریں اور حالات وواقعات بیان کئے گئے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

سورہء مائدہ، آیت ۵۴:

★ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ"

(اے اہل ایمان! جو شخص تم میں سے اپنے دین سے منحرف ہوجائے (مرتد ہوجائے) تو اس کا ایسا کرنا دین الٰہی پر

اثر انداز نہیں ہو سکتا' بلکہ ..... بہت جلد خداوند عالم ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اسے (خدا کو) دوست رکھتے ہوں گے اور وہ (خدا) بھی ان کو دوست رکھتا ہو گا)۔

سورہء یونس، آیت ۴۷:

★ "وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ"... الخ۔

(ہر امت کے لیے ایک رسولؐ ہے' پس جب ان کا رسولؐ آئے تو ان کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جاتا ہے)۔

یاد رہے کہ اس آیت کے بعد والی آیات میں بھی ایسے ہی مطالب کو ذکر کیا گیا ہے۔

سورہء روم، آیت ۳۰:

★ "فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا..."

(پس آپ یکسو ہو کر اپنا رخ خالص دین کی طرف کرلیں کہ یہی وہ فطرت الٰہی ہے جس پر خدا نے انسانوں کی تخلیق فرمائی)۔

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ متعدد دیگر آیات میں ان حالات وواقعات کی خبر دی گئی ہے جو نزول قرآن کے زمانہ کے بعد امت اسلامیہ یا دوسرے لوگوں کے لیے رونما ہوئے' ہم بہت جلد اس طرح کی دیگر آیات کو سورہ اسراء کی تفسیر میں ذکر کریں گے اور ان کی بابت تفصیلی بحث کریں گے۔

(۴)

قرآن میں اختلاف نہ ہونے کے حوالہ سے چیلنج

قرآن مجید نے چیلنج کیا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف موجود نہیں' یعنی اس کے معانی ومطالب میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں پایا جاتا اور نہ ہی وہ ایک دوسرے سے مفہوم کے اعتبار سے متصادم ہیں' چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہء نساء، آیت ۸۲:

★ "أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا"۔

(کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے' کہ اگر وہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ ضرور اس میں بہت

زیادہ اختلاف پاتے)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا ایک مادی جہان ہے اور اس میں تحول و تکامل کا قانون حکمفرما ہے، لہٰذا اس عالم کی موجودات میں سے ہر فرد لحظہ بہ لحظہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ضعف سے قوت اور نقص سے کمال کی طرف بڑھتا ہے' اس کے وجود کی یہ تدریجی تبدیلیاں اس کی ذات اور ذات سے متعلقہ تمام امور یعنی اس کے افعال و اعمال میں نمایاں ہوتی ہیں اور اسے کمال کے آخری درجہ تک لے جاتی ہیں' ان موجودات میں سے ایک ''انسان'' بھی ہے جو اپنے وجود اور اپنے افعال و اعمال میں لحہ بہ لحہ تحول و تکامل میں رہتا ہے اور شاہراہ ترقی پر گامزن ہو کر منزل کمال کی جانب رواں دواں ہے' انسانی وجود کے آثار میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کی قوت فکر و ادراک کو بروئے کار لانے سے ظاہر ہوتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے ''آج'' کو گذشتہ ''کل'' سے بہتر اور کامل تر سمجھتا ہے اور اسی ادراک کی روشنی میں لحہ بہ لحہ اپنے کئے سے آگاہ ہو کر اپنی غلطیوں' کوتاہیوں اور گفتار و کردار کی خامیوں کو بھانپ لیتا ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ گذشتہ لحات میں انجام پذیر ہونے والے اعمال اور اس کے بعد سرزد ہونے والے افعال میں کس قدر فرق ہے۔ اپنے افعال و اعمال کی اس تبدیلی اور اپنے کئے کی بابت تمام پہلوؤں سے آگاہی کا حصول ایسا امر ہے جس سے کوئی باشعور انسان انکار نہیں کر سکتا' اور اپنے تئیں اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کا ''آج'' گزرے ہوئے کل میں انجام دیئے گئے افعال و اعمال کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ کرتا ہے جس سے آنے والے کل کے لیے معیار عمل کا تعین آسان ہوتا ہے۔

یہ آسمانی کتاب کہ جسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش کیا اور اس کا نزول تدریجی طور پر ہوا اور آنحضرتؐ نے اسے حصہ حصہ کر کے ۲۳ سال کے طویل عرصہ میں لوگوں کے سامنے پڑھا' اور مختلف حالات و احوال میں اس کی قرائت کی' چنانچہ کچھ حصہ مکہ مکرمہ میں' کچھ مدینہ منورہ میں' کچھ رات کی گھڑیوں میں' کچھ دن کے اوقات میں' کچھ عالم سفر میں' کچھ وطن میں، کچھ امن کے دور میں' کچھ جنگ کے زمانہ میں' کچھ عسرت و پریشانی کے عالم میں' کچھ فتح و کامیابی کے عالم میں' کچھ سکون و اطمینان کی حالت میں اور کچھ خوف و اضطراب کے عالم میں' اور یہ بھی نہیں کہ یہ سب کچھ ایک ہی موضوع و مورد کے لیے نازل ہوا بلکہ اس کے اغراض و مقاصد میں علوم و معارف الٰہیہ کا القاء' پاکیزہ اخلاق و آداب کی تعلیم' تمام ضروری امور میں دینی احکام اور شرعی قوانین کی تدوین شامل ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود اس مقدس کتاب میں ذرہ بھر اختلاف یا اس کی آیات کی ترتیب میں معمولی سا فرق اور نقص بھی نہیں پایا جاتا' یہی وجہ ہے کہ اس نے صراحت و وضاحت کے ساتھ کہا ہے:

''کتاباً متشابهاً مثانی '' یعنی ایسی کتاب ہے جس میں مطالب کا تکرار اس کے حسن نظم و ترتیب سے ہم آہنگ ہے۔

یہ ہے اس کے اسلوب و ترتیب کلام کی کیفیت' اور جہاں تک اس کے مطالب و معانی اور معارف و اصول کا تعلق ہے جو اس نے بیان کئے ہیں ان میں بھی کسی طرح کا فرق و اختلاف نہیں پایا جاتا۔ یعنی ایسا نہیں کہ کچھ مطالب دوسرے

مطالب سے مختلف ومتضاد ہوں اوران کے درمیان معنے ومفہوم کے لحاظ سے کسی قسم کا کوئی فرق پایا جاتا ہو بلکہ وہ سب ہر قسم کے تضاد، تناقض اور ناہم آہنگی سے پاک ہیں، اور ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ وہمرنگ ہیں کہ ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے، اور ایک جملہ دوسرے جملے کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے اور آیات کا ارتباط اس قدر پختہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تشریح وتوضیح اور تصدیق بھی خود کرتی ہیں یعنی اگر ایک آیت کے معنے واضح طور پر معلوم نہ ہوسکیں تو کسی دوسری آیت کے ذریعے اس کی وضاحت کا کام لیا جاسکتا ہے چنانچہ اس امر کی بابت حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

(ینطق بعضہ ببعض ویشھد بعضہ علی بعض)

یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی وضاحت کرتا ہے اور ایک حصہ دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہے' (نہج البلاغہ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ کتاب، خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس کے الفاظ کی ترتیب میں یہ حسن وتازگی نہ پائی جاتی اور نہ ہی اس کے جملوں میں فصاحت وبلاغت کے اصول ملحوظ ہوتے' اسی طرح نہ اس کے معانی و معارف میں درستی ونادرستی کا فرق معلوم ہوتا اور نہ ہی اس کی پختگی وسلیقہ میں شائستگی نمایاں ہوتی' بلکہ الفاظ ومعانی میں بے ترتیبی وناہم آہنگی کے ساتھ ساتھ پختگی اور غیر معمولی فرق اس کے معنوی حسن کو تباہ کر دیتا۔

ایک سوال یا اعتراض!

ممکن ہے آپ کہیں کہ یہ سب کچھ جو آپ نے کہا ہے وہ زبانی دعوے کے سوا کچھ نہیں کیونکہ آپ نے اس پر کوئی مضبوط دلیل قائم نہیں کی' اور اس کے علاوہ یہ کہ قرآن پر طرح طرح کے اعتراضات بھی کئے گئے ہیں اور اس میں تناقضات کو ثابت کرنے کے لیے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان کتب میں قرآن کے الفاظ اور ادبی پہلوؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں فصاحت وبلاغت کے منافی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے' اسی طرح قرآن کے معانی پر بھی اعتراضات کئے گئے ہیں کہ قرآن اپنی آراء ونظریات اور تعلیمات میں غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور ان اعتراضات کے سلسلے میں مسلمانوں کی طرف سے جو جوابات پیش کئے گئے وہ حقیقت میں ناپختہ تاویلات کے سوا کچھ بھی نہیں اور اگر ان تاویلات کی روشنی میں قرآن کے معانی کو دیکھا جائے تو قرآن ہر قسم کے اسلوب کلام اور استقامت وپختگی بیان کے مروجہ اصولوں سے عاری ہو جائے گا اور فطرت سلیمہ بھی اسے کبھی پسند نہ کرے گی۔ لہٰذا قرآن میں اختلاف نہ ہونے کا دعویٰ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟

جواب:

آپ کے سوال میں قرآن مجید پر کئے گئے جن اعتراضات اور تناقضات کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سب اور ان کے جوابات کتب تفسیر میں ذکر کئے گئے ہیں اور ان کتب میں سے ایک یہی کتاب (المیزان) بھی ہے' اس میں بھی ان تمام

اعتراضات کے مدلل جوابات دیئے گئے ہیں لہٰذا آپ کا اعتراض کہ ہمارا بیان ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی دلیل پیش نہیں کی گئی بجائے خود کسی ثبوت سے خالی زبانی دعوے کے سوا کچھ بھی نہیں' اور اعتراض کرنے والے نے جن کتب کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں آپ کو کوئی ایسا اعتراض یا سوال نہیں ملے گا جس کا واضح و مدلل جواب نہ دیا گیا ہو مگر افسوس کہ قرآن پر اعتراضات کرنے والوں نے تمام اعتراضات کو یکجا کر کے اور باقاعدہ طور پر ترتیب دے کر ایک کتاب میں ذکر کر دیا ہے لیکن ان کے جوابات کو ذکر نہیں کیا اور اس سلسلہ میں اہمال اور بے توجہی سے کام لیا' اور اگر کچھ جوابات ذکر بھی کئے تو غلط رنگ دے کر پیش کئے البتہ ان سے توقع بھی یہی تھی' کیونکہ ایک مخالف اور دشمن اس کے علاوہ کیا کر سکتا ہے' کیا خوب کہا گیا ہے کہ اگر نگاہ محبت پر غلط غلط گمان کی گنجائش ہے تو چشم بغض وعناد پر اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔

ایک اور سوال:

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ قرآن مجید نے خود ہی تو "نسخ" کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ:

سورہ بقرہ، آیت ۱۰۶:

★ "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ "...،

(ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے مگر یہ کہ اس کی جگہ اس سے بہتر آیت لے آتے ہیں)۔

ایک اور مقام پر یوں کہا:

سورہ نحل، آیت ۱۰۱:

★ "وَ اِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ "...،

(اور جب ہم کسی آیت کے بدلے اس کی جگہ دوسری آیت لاتے ہیں تو خداوند عالم بخوبی آگاہ ہے اس سے جو وہ نازل کرتا ہے)۔

ان آیات میں قرآن نے خود ہی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس میں نسخ اور تبدیلی واقع ہوئی ہے' اور اگر ہم اس تبدیلی کو تناقض نہ بھی کہیں لیکن رائے اور نظریہ کا اختلاف تو ضرور ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا! لہٰذا قرآن کو ہر طرح کے تضاد و اختلاف سے مبرا کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب:

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نسخ' نہ تو تناقض گوئی کے باب سے ہے اور نہ ہی رائے و نظریہ یا حکم و دستور کے اختلاف کی قسم سے' بلکہ اس کا تعلق مصداق میں تبدیلی اور فرق پیدا ہونے سے ہے' اور وہ اس طرح کہ جو حکم خدا کی طرف سے صادر ہوا ہے وہ ایک مصداق و مورد پر منطبق ہوتا ہے کیونکہ اس مصداق و مورد میں ایسی مصلحت موجود ہے جس کے لیے حکم صادر ہوا ہے لیکن وہی حکم دوسرے وقت میں اس مصداق و مورد پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ وہ مصلحت ایک اور مصلحت میں بدل چکی ہوتی

ہے لہٰذا وہ ایک نئے حکم کی متقاضی ہوتی ہے' اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ جن آیات میں حکم کی منسوخی کا بیان ہے ان کے الفاظ ہی کچھ ایسے ہیں (لفظی قرائن موجود ہیں) جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت میں دیا گیا حکم بہت جلد منسوخ ہو جائے گا۔ مثلاً صدر اسلام میں چونکہ معاشرے میں زنا عام تھا اور اکثر خاندان اس گناہ میں مبتلا تھے لہٰذا معاشرے کو اس لعنت سے پاک کرنے کے لیے مصلحت یہ تھی کہ ان عورتوں کو گھروں میں تاحیات قید کر دیا جائے' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اس سلسلہ میں یوں حکم صادر ہوا:

سورہء نساء، آیت ۱۴:

★ "وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا"

(جو عورتیں زنا کا ارتکاب کریں ان پر چار گواہ ...... جو تم میں سے ہوں ...... طلب کرو پس اگر وہ ان کے خلاف زنا کی گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں قید کر دو یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا خدا ان کے لیے کوئی راہ قرار دے)۔

اس آیت کے آخری جملہ پر غور کریں' (اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا) اس میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس حکم میں تبدیلی کی گنجائش و امکان موجود ہے' چنانچہ اسلام نے پیش رفت کی اور اس کی حکومت کی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہو گئیں تو مصلحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکم دیا گیا کہ زنا کے جرم میں غیر شادی شدہ کو کوڑے مارے جائیں اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے۔

اسی طرح ابتدائے اسلام میں جبکہ اسلامی حکومت مستحکم نہ تھی تو اہل کتاب کی سرگرمیوں کا سختی سے نوٹس لینے کا حکم صادر نہیں ہوا بلکہ یوں کہا گیا:

سورہء بقرہ، آیت ۱۰۹:

★ "وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا .... فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ"۔

(اکثر اہل کتاب کی خواہش و کوشش ہے کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر بنا دیں پس تم ان کی حرکتوں کا نوٹس نہ لو اور ان سے روگردانی کرلو جب تک کہ خدا کی طرف سے کوئی حکم نہ آ جائے)

اس آیت میں اہل ایمان کو کسی قسم کا نوٹس نہ لینے' درگزر کرنے اور ان سے روگردانی کر لینے کا حکم دیا گیا لیکن آیت کے آخری جملے میں انہیں خدا کے حکم کا منتظر ہونے کو کہا گیا' اس سے پتہ چلتا ہے کہ درگزر کرنے اور روگردانی کرنے کا حکم عارضی اور بنابر مصلحت تھا (یہی وجہ ہے کہ جب اسلام کی مقدس تعلیمات عام ہوئیں اور اسلامی حکومت مضبوط ہو گئی تو اہل کتاب سے درگزر کرنے کی مصلحت نے اپنا رنگ بدلا اور اس کی جگہ ان سے جنگ کرنے اور ان کی باطل سرگرمیوں کا سختی کے

ساتھ مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا چونکہ مصلحت اسی میں تھی جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں آخری جملے اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ یہ دونوں حکم عارضی اور منسوخ ہونے والے تھے)۔

(۵)

بلاغت کے ذریعے چیلنج

جن امور کے حوالہ سے قرآن مجید نے لوگوں کو چیلنج کیا ہے کہ اگر قرآن کے بارے میں کسی قسم کے شک کا شکار ہو تو اس جیسی کتاب پیش کرو ان میں سے ایک فصاحت و بلاغت ہے قرآن مجید نے اپنی بلاغت کلام کے حوالہ سے چیلنج کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہ ہود، آیت ۱۳، ۱۴:

★ "اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" ۔

(یا وہ کہتے ہیں کہ اس (محمدؐ) نے اس خدا پر افتراء باندھا ہے آپ کہہ دیجئے کہ پس تم اس جیسی افتراء باندھی ہوئی من گھڑت دس سورتیں پیش کرو اور خدا کے سوا جسے بلا سکتے ہو بلا کر لے آؤ اگر تم سچے ہو پس اگر وہ آپ کی بات کا جواب نہ دیں تو جان لو کہ یہ قرآن علم الٰہی کے ساتھ نازل ہوا ہے اور خدا کے سوا کوئی معبود نہیں کیا اب تم تسلیم کرو گے؟)۔

یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

اسی طرح ارشاد ہوا:

سورہ یونس، آیت ۳۸، ۳۹:

★ "اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ" ۔

(یا وہ کہتے ہیں کہ اس (محمدؐ) نے اسے خدا پر افتراء باندھ کر پیش کیا ہے کہہ دیجئے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو اس جیسی ایک سورت پیش کرو اور خدا کے سوا جس کو بھی اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایسے امر کو جھٹلایا ہے جس کے بارے میں انہیں معلوم ہی نہیں اور نہ ہی وہ اس کا صحیح مطلب سمجھ سکتے ہیں)۔

یہ آیات مبارکہ بھی مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں قرآن مجید کی بلاغت کلام اور نظم و اسلوب سخن کے حوالہ سے چیلنج کیا گیا ہے کیونکہ جس دور میں یہ آیات قرآنیہ نازل ہوئیں اس زمانہ میں عربوں کے نزدیک فصاحت و بلاغت کلام کو ہی فضیلت و برتری کا واحد معیار سمجھا جاتا تھا اور وہ اس کی بابت غیر معمولی اہمیت کے قائل تھے' چنانچہ یہ بات تاریخ کی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں عرب اپنی اصالت کے ساتھ فصاحت و بلاغت کلام کے جس بلند مرتبہ تک پہنچ چکے تھے اس کی نظیر گذشتہ اقوام کی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی اور نہ ہی ان کے بعد آنے والی قوموں نے وہ مقام پایا' اور وہ اس سلسلے میں اس حد تک ترقی و پیش رفت کے مراحل طے کر چکے تھے کہ کوئی قوم وملت اس عظمت کو نہ پا سکی' کمال بیان' حسن اسلوب' الفاظ کا برمحل استعمال' موقع کی مناسبت کا لحاظ اور نرمیٔ گفتار یہ سب امور ایسے ہیں جو ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت بن چکے تھے' ان حالات میں قرآن مجید نے تعصب اور قومیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عربوں کی غیرت کو للکارا اور ان کے ذہنوں کو جھنجوڑتے ہوئے نہایت مضبوط انداز میں چیلنج کر کے اپنی نظیر لانے کی دعوت دی' اور یہ بات بھی کسی دلیل یا مزید وضاحت کی محتاج نہیں کہ عرب اپنے علم و ادب کی دولت پر اس قدر مغرور تھے کہ کسی دوسرے کی علمی' ادبی اور فکری و عملی عظمت و کمال سے ذرا بھر متاثر نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے ادب کے مقابلہ میں دوسروں کے ادبی شاہکار صنعت کو ہیچ جانتے تھے' اور ان کی یہ کیفیت ایک ایسا امر ہے جس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا' ان حالات میں قرآن مجید نے انہیں چیلنج کیا اور اپنی نظیر پیش کرنے کو کہا' اور یہ چیلنج صرف ایک یا دوبار نہیں تھا کہ عرب اسے بھول جاتے بلکہ قرآن کا چیلنج نہایت طویل عرصہ پر محیط رہا اور اس دوران عربوں نے اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے جو کچھ ممکن تھا، کیا اور ہر طرح سے ہاتھ پیر مارے لیکن ان کی کوششیں ریت کی دیوار سے زیادہ کچھ نہ تھیں اور وہ اس سلسلے میں جس قدر آگے بڑھتے تھے اتنا ہی ان کے عجز و ناتوانی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا اور ان کی کمزوریاں آشکار تر ہوتی چلی جاتی تھیں یہاں تک کہ ان کے لیے ضعف و ناتوانی کے سبب منہ چھپا کر راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ ءکار باقی نہ رہا' چنانچہ ان کے بارے میں قرآن مجید نے اس طرح بتایا:

سورہ ءہود، آیت ۵:

★ "اَلَآ اِنَّهُمۡ يَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ لِيَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡهُ‌ ؕ اَلَا حِيۡنَ يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ ۙ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ‌۔"

(آگاہ رہو! کہ یہ لوگ اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہو کر دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کسی طور سہی اپنی ناتوانی پر پردہ ڈال دیں (تاکہ انہیں کسی ملامت کا سامنا نہ کرنا پڑے) اور اپنے آپ کو لوگوں سے چھپالیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ اپنے آپ کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں تو خدا انہیں اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیا کچھ دلوں میں چھپاتے ہیں اور کیا کچھ لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہیں)۔

قرآن کے چیلنج کو صدیاں گزر چکی ہیں اور اس کی تنزیل سے اب تک چودہ سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے

باوجود آج تک کوئی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکا اور نہ ہی کسی نے ایسا کرنے کی جرات کی ہے اور اگر کسی نے اس کی نظیر لانے کی غلط کوشش کی بھی ہے تو وہ ذلت و رسوائی سے دوچار ہو گیا اور اسے اپنے کیے پر ندامت و شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔

تاریخ میں کچھ ایسے عام خیال لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے قرآن کی نظیر لانے کے لیے زور آزمائی کی اور طرح طرح کے ناپختہ اور کمزور اعتراضات کے ساتھ قرآن کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو گئے مثلاً مسیلمہ کذاب نے سورہ فیل کے مقابلے میں اپنی ادبی قوت کا اظہار کرتے ہوئے یہ سورت پیش کی:

★ "الفیل ما الفیل و ما ادریک ما الفیل له ذنب وبیل و خرطوم طویل۔"

(ہاتھی، اور کیا ہے ہاتھی؟ اور آپ کو کیا معلوم کہ کیا ہے ہاتھی؟ اس کی سخت دم ہے اور لمبی سونڈ ہے)۔

اسی طرح مسیلمہ نے سجاح نامی اس عورت کے مقابلے میں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا وحی کی بابت اس طرح کہا:

★ "فنولجه فیکن ایلاجاً و نخرجه منکن اخراجاً"۔

(اور ہم اسے تمہارے اندر داخل کر دیں گے جیسے داخل کرنے کا حق ہے اور اسے باہر نکالیں گے جیسے باہر نکالنے کا حق ہے)

(مسیلمہ کذاب نے قرآنی آیات کے مقابلے میں اس کے علاوہ بھی کچھ پیش کیا ہے لیکن وہ اس قابل ہی نہیں کہ اسے یہاں ذکر کیا جائے کیونکہ اس کی بیہودہ باتوں کا پول کھل چکا ہے اور وہ ذلیل و رسوا ہو چکا ہے)۔

اس کے علاوہ نصاریٰ میں سے بھی ایک شخص نے سورہ فاتحہ کے مقابلے میں سورت پیش کی ہے، ملاحظہ ہو:

★ **"الحمد للرحمٰن، رب الاکوان، الملک الدیان، لک العبادۃ و بک المستعان اهدنا صراط الایمان۔"**

(حمد ہے رحمان کے لیے، جو پروردگار ہے کائنات کا، جو بادشاہ ہے، دین بنانے والا ہے، تیرے لیے عبادت ہے اور تجھ سے مدد مطلوب ہے۔ ہمیں ایمان کے راستے کی ہدایت فرما)

مذکورہ بالا کے علاوہ بھی بہت کچھ غیر معیاری اور من گھڑت کلام پیش کیا گیا ہے جو قابل ذکر ہی نہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے آپ سوال کریں کہ کسی کلام کے معجزہ ہونے کا مطلب کیا ہے؟ یعنی ایک کلام اپنی ترتیب و ترکیب اور حسن اسلوب کے لحاظ سے اس حد تک پہنچ جائے کہ اسے "معجزہ" کہا جا سکے اس سے کیا مراد ہے جبکہ کلام، انسانی ذوق سلیم ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے حسن طبع و ذوق سلیم سے جو شاہکار وجود میں آئے اس کا کلام اس کے لیے معجزہ بن جائے اور وہ اس کی نظیر لانے سے قاصر ہو، جبکہ یہ امر مسلم ہے کہ ہر فاعل اپنے فعل سے قوی اور زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور جو چیز کسی کے وجود میں آنے کا بنیادی ذریعہ...... منشاء اثر...... ہو وہ اس چیز (اثر) پر ہر طرح سے محیط و غالب ہوتی ہے، تو کلام جو کہ انسان کا

فعل ہے اور اس کے کمال فکر اور ذوق و طبع سلیم کا نتیجہ ہے وہ کیونکر انسان کے دائرہ قدرت سے باہر ہو سکتا ہے؟ اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ انسان ہی نے تو یہ سب الفاظ و کلمات بنائے ہیں تا کہ وہ ان الفاظ کو استعمال کر کے معاشرے میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے دل کی بات اور مافی الضمیر کو دوسرے تک پہنچا سکے اور اسی طرح ان کے ذریعے دوسرے کے دل کی خواہش کو سمجھ سکے اور انسانی معاشرے کے افراد ایک دوسرے کی احتیاجات اور ضرورتوں سے آگاہ ہو سکیں' لہٰذا کسی لفظ سے اس کے مطلوبہ معنی کو کشف کر لینا یہ انسان ہی کا کام ہے کیونکہ اس نے ہی الفاظ کو معانی کے لیے بنایا اور معین کیا ہے اور اس نے ہی یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس معنی و مطلب کے لیے یہ لفظ ہونا چاہیے۔ جب ایسا ہے تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ الفاظ سے معانی کے سمجھنے کی یہ خصوصیت کہ جو انسان ہی کے ذوق و طبع کا نتیجہ ہے اس کے ذوق و طبع کی حدود سے آگے نکل جائے اور اس حد تک پہنچ جائے کہ پھر انسانی طبع و ذوق اس تک پہنچنے سے قاصر ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ الفاظ میں ہی ایسی خصوصیت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے معینہ معانی کے مقابلے میں کسی دوسرے معانی کو ظاہر کریں ایسے معانی جو انسان کی قوت فکر اور ذوق طبع کی حدود سے خارج ہوں کیونکہ اس صورت میں الفاظ کی دلالت ان معانی پر اصل بناوٹ کے مقررہ اصولوں (دلالت وضعیہ اعتباریہ) کے مطابق نہیں ہوگی۔ اور اگر فرض بھی کر لیں کہ کسی کلام کی ترکیب میں ایسی خصوصیت رکھ دی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ کلام معجزہ کی حد تک پہنچ چکا ہے اور کوئی شخص اس جیسی ترکیب کا حامل کلام پیش نہیں کر سکتا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ الفاظ سے جن معانی کا ارادہ کیا گیا ہے ان میں سے ہر معنی کئی مختلف ترکیبات کا حامل ہو اور ان ترکیبات میں نقص' کمال' فصاحت و بلاغت وغیرہ کے لحاظ سے فرق پایا جاتا ہو یعنی کچھ ناقص' کچھ کامل' کچھ فصیح و بلیغ اور کچھ فصاحت و بلاغت سے خالی ہوں۔ اور ان تمام ترکیبات میں سے ایک ترکیب ایسی ہو جو ہر لحاظ سے کامل اور فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ ہو اور کوئی انسان اس جیسی ترکیب پیش نہ کر سکتا ہو لہٰذا وہی ''معجزہ'' کہلائے' اگر یہ مان لیں تو اس کے نتیجہ میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر معنی و مطلب میں ایک معجزہ آسا ترکیب بھی پائی جاتی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید نے ایک ہی معنی کو کئی مختلف بیانات اور پہلوؤں اور گوناگوں ترکیبات کا حامل بنا کر پیش کیا ہے جیسا کہ قصص و واقعات کے بیان میں یہ امر واضح اور ناقابل انکار ہے' اگر اس کی تمام ترکیبات معجزہ آسا ہوتیں تو ہر معنی میں ایک ہی جہت پائی جاتی اور کوئی دوسرا پہلو موجود نہ ہوتا جبکہ ایسا نہیں ہے!

ایک جواب یا تاویل:

پہلی بات تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا دو اشتباہات و غلط فہمیاں اور ان جیسے دوسرے امور ہی اس امر کا سبب بنے کہ علماء و محققین قرآن مجید کے معجزہ ہونے اور اس کی فصاحت و بلاغت کے بے نظیر ہونے میں ''صرف'' کے قائل ہوں۔ ''صرف'' کا معنی یہ ہے کہ خدا نے ہی لوگوں کو اس کی نظیر و مثل پیش کرنے سے عاجز کر دیا ہے اور ان کے دل اس امر سے پھیر دیئے ہیں' یعنی یہ بات درست ہے کہ قرآن کی مثل و نظیر پیش کرنا یا اس کی سورتوں بلکہ ایک سورت کی مثال لانا بھی ممکن نہیں اور کوئی بشر اس کی طاقت نہیں رکھتا اور اس حقیقت کو قرآن نے اپنی آیات کے ذریعے چیلنج کرتے ہوئے بیان بھی کر دیا ہے چنانچہ

صدیاں گزر جانے کے باوجود اب تک کوئی دشمن قرآن اس کی مثال پیش نہیں کر سکا اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا کرنا انسان کے بس کا روگ نہیں، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ کلام کی ترکیب اور جملوں کی ترتیب اس طرح سے ہے کہ انسانی طاقت اس کی نظیر لانے سے قاصر و عاجز ہے کیونکہ اس جیسی ترکیب و ترتیب انسانی کلام میں پائی جاتی ہے اور اس کے لیے ایسا منظم و مرتب کلام لانا ممکن ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قرآن کا مقابلہ کرنے کی راہ سے پھیر دیا ہے اور اس کی مثل و نظیر لانے سے عاجز کر دیا ہے لہٰذا انسان کا قرآن کی نظیر نہ لاسکنا در حقیقت کلام کی ترکیب و ترتیب اور فصاحت و بلاغت کے سبب سے نہیں بلکہ خداوند عالم کے اس ارادہ کی وجہ سے ہے جو پوری کائنات پر حاکم ہے اور انسانی ارادہ پر بھی اس کی حکومت ہے اس لیے خداوند عالم انسان کو ایسا کرنے ہی نہیں دیتا کہ وہ قرآن کی مثل و نظیر لا سکے تا کہ نبوت کی نشانی معجزے کے طور پر باقی رہ جائے اور رسالت کی حرمت بھی باقی رہے، یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص قرآن کی مثل و نظیر لانے کی کوشش کرتا ہے تو خدا اس کے ارادہ اور اس کی قوتوں پر غالب آ کر اسے عاجز کر دیتا ہے اور وہ ناتواں ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے ارادہ سے صرف نظر کر لیتا ہے یعنی اپنی ناتوانی کا اعتراف کرتے ہوئے قرآن کا مقابلہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔ اسے ''صرف'' کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا جواب قطعاً غلط اور نادرست ہے اور قرآن کی ان آیات سے کسی طور پر مطابقت نہیں رکھتا جن میں لوگوں کو قرآن کی مثل و نظیر لانے کا چیلنج کیا گیا ہے، مزید وضاحت کے لیے اصل آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ ہود، آیات ۱۳، ۱۴:

★ ''قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَّادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ۔۔'' ۔

(کہہ دیجیے کہ اس جیسی دس سورتیں من گھڑت پیش کرو اور خدا کے سوا جسے بھی بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم اپنی بات میں سچے ہو، پس اگر وہ تمہیں اس (چیلنج) کا جواب نہ دیں تو جان لو کہ یہ (قرآن) علم الٰہی سے نازل کیا گیا ہے)۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کی مثل و نظیر لانا کسی بشر کے بس میں نہیں نہ یہ کہ خدا اسے ایسا نہیں کرنے دیتا، خاص طور پر اس آیت کا آخری جملہ ... فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ ... (پس جان لو کہ اسے علم الٰہی سے نازل کیا گیا ہے) واضح طور پر اس امر کو بیان کرتا ہے کہ قرآن کی مثل و نظیر پیش کرنے کی بابت جو چیلنج کیا گیا ہے اس کی دلیل صرف یہ ہے کہ یہ (قرآن) خدا کی طرف سے نازل ہوا نہ یہ کہ اسے رسول خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طرف سے جعل کیا ہے۔ اور یہ علم خدا کے ساتھ نازل ہوا نہ کہ شیاطین اس کے نزول میں دخیل ہیں، جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ طور، آیت ۳۴:

★ ''اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾'' ۔

(یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے (محمدؐ نے) اسے اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کیا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ مانتے ہی نہیں' اور اگر سچے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اس جیسا کلام پیش کریں)

اور ارشاد ہوا:

سورۂ شعراء، آیت ۲۱۲:

★ "وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾"۔

(یہ (قرآن) شیاطین کے ذریعے نازل نہیں ہوا کیونکہ وہ نہ تو اس کام کے لائق ہیں اور نہ ہی انہیں اس امر کی طاقت وصلاحیت ہے وہ تو آسمانی اسرار اور رموز الٰہی کے سننے سے ہی محروم کر دیئے گئے ہیں)۔

"صرف" کے بارے میں جو کچھ ان حضرات نے بیان کیا ہے وہ درست نہیں کیونکہ اس سے فقط حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے نہ کہ اس امر کا ثبوت کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور اس کی طرف سے نازل ہوا ہے مذکورہ بالا آیات کی طرح یہ آیت بھی ہمارے مطلوب کو ثابت کرتی ہے: (ملاحظہ ہو)

سورۂ یونس، آیت ۳۹:

★ "قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ"۔

(کہہ دیجئے کہ پس لے آؤ اس جیسی ایک سورت' اور خدا کے سوا جسے بھی بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جھٹلا دیا ہے اس چیز کو جس کا وہ اپنے علم کے ذریعے احاطہ نہیں کر سکے اور نہ ہی ان کے پاس اس کی کوئی تاویل پہنچی ہے)۔

اس آیت سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کا قرآن کی نظیر نہ لا سکنا اور ان کی انفرادی و اجتماعی قوتوں وصلاحیتوں کا اس سلسلے میں بے اثر و بے نتیجہ ثابت ہونا اور اسی طرح ان کی اس سلسلے میں مدد کرنے والوں کا ناتوان ہونا درحقیقت اس سبب سے ہے کہ قرآن ایک ایسی تاویل (اسرار و رموز) کا حامل ہے کہ بشر نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اس سے ناآگاہ اور اس کی حقیقت کے ادراک سے عاجز ہونے کی وجہ سے اس کی تکذیب کی اور اس کی عظمت کو جھٹلا دیا اور خدا کے سوا کسی کو اس کی حقیقی تاویل سے آگاہی حاصل نہیں اور یہی (عدم آگاہی) اور قرآن کے اسرار و رموز کا مکمل احاطہ نہ کر سکنا ہی اس بات کا اصل سبب ہے کہ کوئی بشر اس کی مثل ونظیر نہیں لا سکتا اور مخلوق میں سے کوئی بھی اس کا مقابلہ کرنے پر قادر نہیں نہ یہ کہ خداوند عالم نے ان کے دلوں کو ایسا کرنے سے پھیر دیا ہے جبکہ ان میں ایسا کرنے (قرآن کی نظیر لانے) کی صلاحیت موجود ہے یعنی اگر خدا ان کے دلوں کو نہ پھیرتا (صرف) تو وہ قرآن کا مقابلہ کرنے اور اس کی مثل ونظیر پیش پر قادر ہوتے' نہیں ایسا ہرگز نہیں۔

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورہ نساء آیت ۸۲:

★ ”اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا“۔

(کیا وہ قرآن کی بابت تدبر اور غور و فکر نہیں کرتے' کہ اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ ضرور اس میں اختلاف کثیر پاتے)۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ بشر اس وجہ سے قرآن کی مثل و نظیر لانے سے عاجز ہے کہ قرآن خود اپنے الفاظ اور معانی میں اس صفت کا حامل ہے کہ اس میں کسی قسم کی دورنگی و اختلاف نہیں پایا جاتا اور مخلوق میں سے کوئی بھی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ ایسا کلام پیش کر سکے جس میں کسی قسم کی دوئیت و اختلاف موجود نہ ہو نہ یہ کہ خدا نے لوگوں کے دلوں کو قرآن میں پائے جانے والے اختلاف اور دوئیت سے آگاہ ہونے اور اسی حوالہ سے اس کا مقابلہ کرنے سے پھیر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے اور یہ معجزہ ہے' لہٰذا بعض حضرات نے ”صرف“ کے حوالہ سے قرآن کا ”معجزہ“ ہونا ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ درست نہیں اور اس کے لیے اس کا سہارا لینا بھی صحیح نہیں۔

اصل اعتراض کا جواب

مذکورہ بالا تمہید کے بعد اب ہم اصل اعتراض کا جواب پیش کرتے ہیں' سوال یا اعتراض یہ تھا کہ قرآن کا معجزہ ہونا فصاحت و بلاغت کے حوالہ سے کیونکر ممکن ہے جبکہ فصاحت و بلاغت تو بنائے اور وضع کئے ہوئے کلام کی صفات میں سے ہے اور ”وضعِ کلام“ طبع انسانی کے آثار میں سے ایک ہے یعنی انسان ہی کا کارنامہ ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ وہ چیز جو خود انسان کا کارنامہ اور اس کی طبع وجودی کا شاہکار ہو وہ اس حد تک کمال کی منزل کو پہنچ جائے کہ انسانی طبع کی رسائی وہاں تک ممکن ہی نہ ہو اور وہ بشر کی توانائیوں کی حدود سے باہر نکل جائے گویا اس کا معنی یہ ہوا کہ انسان خود اپنی بنائی ہوئی چیز کے سامنے عاجز و ناتواں اور اس کی مثل و نظیر لانے سے قاصر ہو یعنی جس چیز کے وجود میں آنے کی علت و سبب وہ خود اور اس کی وجودی صلاحیت ہو اس کی مثل و نظیر لانا اس کے لیے ناممکن ہو یہ کیونکر ممکن ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ”کلام“ کا انسانی طبیعت سے اسی حد تک تعلق ہے کہ ایک لفظ سے اس کا معنی ظاہر ہو سکے (لفظ مفرد سے اس کے معنے کے کشف کی نسبت طبع انسانی کی طرف ہوتی ہے) اور جہاں تک کلام کی ایسی ترتیب و ترکیب کا تعلق ہے کہ جس سے الفاظ کے معانی ظاہر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے حقیقی حسن و جمال کا اظہار ہو اور معنی کی حقیقی شکل و ہیئت کے ساتھ کہ جو کلام کرنے والے کے ذہن میں ہے اسے سننے والے تک پوری طرح یا ناقص طور پر پہنچایا جا سکے اور جو معنی کلام کرنے والے کے ذہن میں ہے اسے سننے والے کے سامنے واضح یا خفی طور پر ظاہر کیا جا سکے' اسی طرح کلام کرنے والا اپنے ذہن میں اس معنے کو اس طرح مرتب و منظم کرے اور اس کی علمی صورت گری کا عمل اس طرح انجام دے کہ وہ اپنے تمام متعلقہ پہلوؤں' مقدمات' مقارنات و لواحقات میں اصل حقیقت اور واقع الامر کے عین مطابق ہو یا

اگر تمام متعلقہ پہلوؤں میں مطابقت نہ رکھتا ہو تو اکثر و بیشتر پہلوؤں میں مطابقت کا حامل ہو یا یہ کہ کچھ پہلوؤں میں مطابقت رکھتا ہو اور کچھ میں نہ رکھتا ہو، تو یہ سب ایسے امور ہیں جن کا تعلق کلام کی وضع و اصل بناوٹ سے نہیں بلکہ ان کا تعلق کلام کرنے والے کی علم بیان اور فن بلاغت میں اس مہارت سے ہے جو اسے اس کی بشری طبع وجودی سے حاصل ہوتی ہے اور وہ اسی کے سہارے الفاظ کی بہتر ترتیب و ترکیب پر قادر ہو جاتا ہے اور پھر اسی مطابقت ذہنی کے ذریعے وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے اسے الفاظ کے قالب میں اس طرح ڈھال دیتا ہے کہ اس کا کلام مدِ نظر موضوع کے تمام پہلوؤں اور لوازم و متعلقات کا مکمل طور پر احاطہ کر سکے۔

فصاحت و بلاغت کے باب میں تین صورتیں ممکن ہیں اور وہ تینوں ایک ہی کلام میں یکجا بھی ہو سکتی ہیں اور متفرق بھی، یعنی ایک دوسرے کے ساتھ اور علیحدہ صورت میں بھی قابل تصور و وجود پذیر ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

ایک صورت:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی زبان کے بارے میں وسیع معلومات اور کامل تسلط رکھتا ہو یہاں تک کہ اس زبان کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے وہ نا آگاہ ہو لیکن اس کے باوجود وہ اس زبان میں گفتگو نہیں کر سکتا۔

دوسری صورت:

دوسری صورت یہ کہ کوئی شخص کسی زبان کے الفاظ کا صرف عالم ہی نہیں بلکہ اس میں گفتگو کرنے میں بھرپور مہارت رکھتا ہو اور الفاظ کی ترتیب و ترکیب پر احسن طور سے قادر ہو لیکن ٹھوس علم نہ ہونے اور معارف و مطالب سے نا آگاہی کی وجہ سے ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز و ناتوان ہو جو معانی و مفاہیم کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر سکے اور ان کے حقیقی حسن و جمال سے پردہ اٹھا سکے۔

تیسری صورت:

تیسری صورت یہ کہ کوئی شخص کسی زبان کے الفاظ سے بھی بھرپور آگاہ ہو اور کسی حد تک علوم و معارف میں بھی مہارت رکھتا ہو اور لطافت طبع و نزاکت فطرت کی خوبیوں کا حامل بھی ہو لیکن اس کے باوجود اپنی معلومات اور فکری ذخیرہ کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر اپنے دل کی بات زبان پر لانے سے قاصر ہو یعنی اپنے تئیں ان معلومات اور معارف و علوم کی زیبائیوں سے بھرپور لطف اندوز ہوتا رہے لیکن انہیں الفاظ کی صورت میں کسی کے سامنے پیش کرنے سے قاصر اور اپنے مافی الضمیر کا اظہار دلکش انداز میں نہ کر سکتا ہو۔

یہ وہ تین پہلو یا تین صورتیں ہیں جو کلام کے سلسلہ میں قابل تصور ہیں اور ان کا یکجا ہونا اور متفرق ہونا دونوں ممکن ہیں، ان میں سے پہلی صورت کا تعلق الفاظ کی وضع و بناوٹ سے ہے کہ انسان اپنی معاشرتی طبع اور اجتماعی تقاضوں کی روشنی میں لفظوں کو وضع کرتا ہے جبکہ دوسری اور تیسری صورت کا تعلق، الفاظ کی وضع و بناوٹ سے نہیں بلکہ وہ دونوں قوت فکر و ادراک کی لطافت سے مربوط ہیں اور یہ ایک واضح و ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہماری فکر و ادراک کی قوتیں محدود ہیں اور ان کی حدود مقرر و طے شدہ ہیں اور ہم تمام حوادث و وقائع اور حقائق امور کی تفاصیل و جزئیات اور ان کے جملہ متعلقات کا احاطہ نہیں کر

سکتے' یہی وجہ ہے کہ ہم کسی لمحہ بھی کسی سلسلے میں خطاء و غلطی سے مامون و محفوظ نہیں' اس کے ساتھ ساتھ چونکہ ہمارا کمال تک پہنچنا بھی تدریجی ہے اور ہمارا وجود و ہستی مرحلہ بہ مرحلہ کمال کی جانب رواں دواں ہے لہٰذا اس تدریجی کیفیت کے سبب ہماری معلومات میں بھی تدریجی اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ تدریجی طور پر نقص سے کمال کی طرف جاتی ہیں' چنانچہ دنیا میں کوئی خطیب وسخنور اور ادیب و شاعر ایسا نہیں جس کا کلام وسخن اپنے ابتدائی مراحل سے آخری مراحل تک بالکل ایک جیسا ہو اور اس کے حسن و جمال اور کمال میں یکسانیت پائی جاتی ہو' لہٰذا ہم جس انسان کا کلام بھی فرض کر لیں اور اس کا متکلم جس قدر بلند مرتبہ ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ کلام ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہر لحاظ سے خطاء و غلطی سے پاک ہو کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی متکلم (کلام کرنے والا) کسی امر کی بابت تمام جزئیات و تفصیلات سے پورے طور پر آگاہ نہیں ہوتا اور دوسرا یہ کہ اس کا کلام شروع میں اور آخر میں بلکہ ابتدائی مراحل ہی میں یکسانیت کا حامل نہیں ہوتا اگرچہ ہم اس اختلاف و نابرابری کو پورے طور پر نہ سمجھ سکیں لیکن اس حد تک ضرور جانتے ہیں کہ قانون تحول و تکامل عام ہے جو کلام کرنے والے کے تمام مراحل سخن میں اس پر حاوی و مسلط رہتا ہے' بنابرایں اگر ہمیں دنیا میں کوئی ایسا کلام مل جائے جس میں نہ تو کوئی ہزل و بیہودگی ہو (ہزل اس بات کو کہتے ہیں جو ٹھوس علم کے بغیر کی جائے) اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی اختلاف پایا جاتا ہو اور وہ حق کو باطل سے الگ کر کے اس کی پہچان بھی کروا سکے تو وہ یقیناً کسی انسان کا کلام نہ ہوگا' اسی مطلب کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

سورہ ءنساء، آیت ۸۲:

★ "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا"

(کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے' کہ اگر وہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً وہ لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

سورہ ءطارق، آیات ۱۱ تا ۱۴:

★ "وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ⑪ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ⑫ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ⑬ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ⑭"

(قسم ہے آسمان کی جو بار بار بارش برسانے والا ہے (یا گردش محوری رکھتا ہے) اور زمین کی جو شگاف رکھتی ہے' یقیناً وہ (قرآن) حق کو باطل سے جدا کرنے والا قول ہے نہ یہ کہ لغو و بے فائدہ قول)

اس آیت میں غور کریں کہ اس میں آسمان اور زمین کی قسم کھائی گئی ہے جو کہ تغیر پذیر رہتے ہیں' اور یہ قسم اس چیز کے لیے کھائی گئی ہے جو تغیر پذیر نہیں بلکہ ایک ثابت و مستحکم حقیقت پر مبنی ہے جو کہ اس کی "تاویل" ہے (تاویل کی بابت عنقریب بیان کیا جائے گا کہ قرآن میں اس سے مراد کیا ہے؟) یعنی وہ اس کی اصل حقیقت ہے۔

خداوند عالم نے قرآن مجید کے متعلق یوں ارشاد فرمایا:

سورہء بروج آیت ۲۲:

★ "بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ--"۔

(بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو کہ لوح محفوظ میں ہے)۔

سورہء زخرف آیات ۲۔۴:

★ "وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ"۔

(قسم ہے کتاب مبین کی، ہم ہی نے اسے آسانی سے پڑھا جانے والا عربی زبان میں بنایا ہے تا کہ تم پرہیزگار بن سکو اور وہ ہمارے پاس "ام الکتاب" میں بلند مقام و مرتبت والا اور حکمت و دانائی والا ہے)۔

سورہء واقعہ، آیات ۷۵ تا ۷۹:

★ " فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ "۔

(قسم ہے ستاروں کے اترنے کی جگہوں کی اور یہ کتنی عظیم قسم ہے اگر تمہیں علم ہوتا (تو اس کی عظمت کو جانتے) وہ قرآن کریم ہے جو ایک پوشیدہ کتاب میں ہے اور اسے پاک و پاکیزہ لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں چھو سکتا)۔

مذکورہ بالا اور ان جیسی دیگر آیات اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ قرآن اپنے معانی و معارف میں ثابت و مستحکم اور ناقابل تغیر حقائق پر مشتمل و مبنی ہے، اس طرح کہ نہ خود قرآن تغیر پذیر ہے اور نہ ہی وہ حقائق، کہ جن پر قرآن کے معانی قائم واستوار ہیں بلکہ دونوں غیر متغیر ہیں)

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں آپ اشکال و اعتراض کے جواب سے بخوبی آگاہ اور اس حقیقت سے مطلع ہو چکے ہوں گے کہ الفاظ کی وضع و بناوٹ کا انسان کی طرف استناد اس بات کا باعث نہیں ہو سکتا کہ کوئی ایسا کلام ہی موجود نہ ہو جو اپنی ترتیب و ترکیب کے حوالہ سے انسان کی طاقت و قوت سے بالاتر ہو اور انسان اس کے مثل و نظیر لانے پر قادر نہ ہو، یعنی اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ الفاظ انسان نے بنائے اور ان کی وضع میں اسی کی طبع سلیم کارفرما تھی لیکن یہ مان لینا اس بات کا باعث نہیں کہ دنیا میں کوئی معجزہ آسا کلام ہی نہ پایا جائے یعنی ایسا کلام جس کی نظیر لانا انسان کے بس میں نہ ہو، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس لوہار نے تلوار بنائی وہ تلوار چلانے والے سے زیادہ بہادر ہونا چاہیے اور نرد (ستار/بین باجا) اور شطرنج وغیرہ بنانے والا ان کے کھیلنے والے سے زیادہ ماہر ہونا چاہیے اور سارنگی کا موجد اسے بجانے والے سے زیادہ بہتر بجانے پر قادر ہو (جبکہ ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں)

مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کمال بلاغت کی بنیاد وہ علم ہے جو واقع اور حقیقت الامر کے مطابق ہو اور وہ مطابقت اس جہت سے ہو کہ کلام میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ اپنے معانی سے پوری مطابقت رکھتے ہوں اور

ان پر مکمل طور پر دلالت کرتے ہوں اور جو معانی متکلم کے ذہن میں ہیں وہ الفاظ کے ذریعے سننے والے کی لوح فکر پر نقش ہو جائیں یعنی الفاظ معانی سے اور معانی الفاظ سے پوری۔۔کامل و مکمل۔۔مطابقت رکھتے ہوں۔

الفاظ و معانی کی مطابقت کا بیان

الفاظ و معانی کے درمیان مطابقت کی وضاحت یوں ہے کہ جہاں تک ''لفظ'' کا تعلق ہے تو ضروری ہے کہ لغوی وضع کے لحاظ سے لفظ کے اجزاء میں پائی جانے والی ترتیب اس معنی کے اجزاء کی ترتیب سے حسب طبع بھی مطابق ہو جس کا ذریعہ اظہار وہ لفظ بنا ہے اس طرح وضع اور طبع کے درمیان مطابقت حاصل ہو جائے گی اور کلام فصیح و بلیغ کہلائے گا، فصیح و بلیغ کلام کی یہ تعریف شیخ عبدالقاہر جرجانی نے کتاب دلائل الاعجاز میں لکھی ہے۔اور معنے کی بابت یہ ضروری ہے کہ وہ عالم ماورائے ذہن میں پائی جانے والی حقیقت کے عین مطابق ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ لفظ کے سانچے میں ڈھل جانے کے بعد اپنی اصل حقیقت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یہ وہ امر ہے جو رتبہ کے لحاظ سے پہلے امر (یعنی لفظ کے اجزاء کی ترتیب کا وضع و طبع کے لحاظ سے معنے کی ترتیب سے مطابقت رکھنا) سے بھی مقدم ہے بلکہ اس کی بنیاد ہی یہ ہے، کیونکہ کتنے ایسے فصیح و بلیغ کلام ہوتے ہیں جو اپنے الفاظ و معانی میں مکمل مطابقت کے حامل ہونے کے باوجود کسی غرض و مقصد سے خالی اور مذاق پر مبنی ہوتے ہیں کہ ماورائے ذہن ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی لہٰذا وہ سنجیدہ کلام سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور اسی طرح کتنے ایسے کلام ہوتے ہیں جو فصیح و بلیغ ہونے کے باوجود جہالت پر مبنی ہونے کی وجہ سے علم و حکمت کے حامل کلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ ہزل و مذاق اور جہالت کا علم حکمت اور سنجیدگی سے کوئی جوڑ ہی نہیں، اور جو کلام لفظ و معنی کی ہمہ جہت مطابقت کا حامل ہو اور الفاظ کی شیرینی، حسن اسلوب معنے کی بلاغت اور حقیقت الواقع تمام اس میں یکجا ہوں وہ سب سے بلند و برتر اور باعظمت کلام کہلاتا ہے۔اور جب کوئی کلام حقیقت پر مبنی ہو اور معنے کے لحاظ سے بھی ذہن اور ماورائے ذہن دونوں کے درمیان مکمل طور پر مطابقت و ہمرنگی کا حامل ہو تو ممکن ہی نہیں کہ وہ دوسرے حقائق کی تکذیب کرے یا دوسرے حقائق اس کی تکذیب کریں، کیونکہ حق کے اجزاء و ارکان کے درمیان مکمل اتحاد و ہم آہنگی و یکجہتی پائی جاتی ہے اس لیے کوئی ''حق'' کسی حق کو غلط و بے اثر اور اس کا ابطال نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی ''صدق'' (سچائی) سے کسی دوسری سچائی کی تکذیب ہو سکتی ہے جبکہ باطل ہر دوسرے باطل سے بھی منافات رکھتا ہے اور حق سے بھی، ذرا غور سے اس آیہ شریفہ کے مفہوم پر توجہ کریں: ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ یونس، آیت ۳۲:

★ ''فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ''۔

(حق کے بعد گمراہی و ضلالت کے سوا کچھ بھی نہیں)

اس آیت میں ''حق'' کو مفرد (ایک) کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے تاکہ بیان کیا جا سکے کہ اس میں کسی قسم کی دوئیت و اختلاف اور پراگندگی و تفرقہ نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح ایک اور آیت میں ارشادِ الٰہی ہے:

سورہ ٔ انعام، آیت ۱۵۳:

★ "وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ---"۔

(اور پیروی نہ کرو راستوں کی ورنہ وہ تمہیں متفرق و پراگندہ کر دیں گے)

اس آیت میں باطل کو "سبل" (صیغہ ٔ جمع) (یعنی راستے) سے تعبیر کیا گیا ہے جو کہ خود بھی متفرق و پراگندہ ہیں اور تفرق و تفرقہ پیدا کرنے والے بھی ہیں۔

مذکورہ بالا دو آیتوں سے اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ "حق" ایک ہے اس میں کسی قسم کی دوئیت، تفرق و تشتت وغیرہ نہیں پایا جاتا لیکن حق کے علاوہ دوسرے سب راستے متعدد، متفرق، متشتت اور تفرقہ آور ہیں۔

پس جب یہ بات واضح ہوگئی کہ حق متحد الاجزاء ہوتا ہے اور اس کے اجزاء میں کسی قسم کی دوگانگی، تفرقہ و اختلاف نہیں پایا جاتا بلکہ ہر جزء دوسرے جزء کے ساتھ ملا ہوا ہے اور وہ ایک دوسرے کی صداقت کے گواہ ہیں اور ایک دوسرے کے معانی و مفاہیم سے پردہ اٹھانے والے ہیں، تو یہ امر خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن جو کہ "حق" ہے اس میں بھی کسی قسم کا اختلاف و دوگانگی نہیں پائی جاتی اور چونکہ "حق" ہے اس لیے اس کے اجزاء ایک دوسرے کی صداقت کے گواہ اور ایک دوسرے کے معانی و مفاہیم کو واضح کرنے کا ذریعہ ہیں اور یہ بات قرآن مجید کی اہم خصوصیات میں سے ہے کہ اس کی کوئی آیت بے معنی و بے نتیجہ نہیں، اسی طرح جب کوئی ایک آیت کسی دوسری مناسب آیت کے ساتھ ملا کر دیکھی جائے تو اس سے ایک نئی نویلی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے اور جب ان دونوں کے ساتھ تیسری آیت کو ملا کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری ان دو کی صداقت کی گواہی پیش کر رہی ہے، اور یہ خصوصیت صرف قرآن مجید کو حاصل ہے اور آپ خود ہماری اس کتاب میں آیات کے بیان و تفسیر کی بحث میں قرآن کی اس خصوصیت کے پاکیزہ نمونے ملاحظہ فرمائیں گے، لیکن افسوس ہے کہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں اس روش اور طریقۂ کار (قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے) کو مفسرین کرام نے نہیں اپنایا، اگر ابتداء ہی سے اس روش کو اپنایا جاتا تو آج ہم قرآن کے دریائے عظمت سے زیادہ سے زیادہ پاکیزہ گوہر حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوتے اور اس کے مقدس و نفیس خزانوں سے زیادہ بہرہ ور ہو سکتے۔

مذکورہ بالا بیانات و مطالب سے واضح ہو گیا کہ قرآن کے معجزہ ہونے پر جو اعتراض کیا گیا تھا وہ دونوں پہلوؤں کی بابت دور ہو گیا بلکہ غلط ثابت ہوا کیونکہ معجزہ نما بلاغت کلام کا تعلق صرف الفاظ سے نہیں لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان جو کہ خود کلام کا وضع کرنے والا ہے وہ کیونکر کسی فصیح و بلیغ کلام سے زیادہ فصاحت و بلاغت کا حامل کلام پیش نہیں کر سکتا ہے؟ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ الفاظ کی تمام قابل تصور ترکیبات میں سے سب سے زیادہ فصیح و بلیغ ترکیب صرف ایک ہے لہٰذا ایک معنی کو کئی ترکیبات کے ذریعے بیان کرنا کیونکر ممکن ہے جبکہ وہ ترکیبات و عبارات سیاق و سباق کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور وہ سب انسانی طاقت سے بالاتر اور معجزہ کی حد تک پہنچی ہوئی ہوں، بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ ان تمام امور

میں اصل معیار واساس وہ معنی ہے جو ذہن اور ماورائے ذہن کی تمام جہتوں اور پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو ، وہی بلاغت کلام کا حقیقی معیار ہے (اور اسی کی روشنی میں ہمارے مدعا کی صحت اور اعتراض کرنے والے کا صحیح جواب واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے)۔

قرآن میں معجزہ کا معنیٰ اور اس کی حقیقی تفسیر

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ قرآن مجید آیت معجزہ کے ثبوت کی روشن دلیل ہے اور اس میں واضح طور پر معجزہ کے وجود پذیر ہونے کے ضمن میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ معجزہ ایک "خارق العادت" امر کا نام ہے جو عالم طبیعت وجہان مادہ میں ایک ماورائے طبیعت اور مافوق المادہ حقیقت کی اثر انگیزی کو ثابت کرتا ہے یعنی ایک ایسی قوت جس کا تعلق مادی جہان سے نہیں وہ مادی جہان پر اثر انداز ہو کر وہ کچھ کر دکھائے جو عام طور پر نہیں کیا جا سکتا اس معنے میں معجزہ یعنی ایک خارق العادت (عجیب وغریب یا نادر وانوکھے) امر کو قرآن نے تسلیم اور ثابت کیا ہے اور اس (معجزہ) سے ہرگز وہ امر مراد نہیں جو عقل کے مسلمہ اصولوں کو غلط اور نادرست قرار دے۔

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں ان نام نہاد دانشوروں کے خودساختہ نظریات کی قلعی بھی کھل گئی اور ان کے طرز تفکر کے نادرست ہونے کا ثبوت بھی فراہم ہو گیا جنہوں نے قرآن مجید میں موجود آیات معجزہ کی تاویل کرتے ہوئے انہیں اپنی مادی وطبعی بحثوں کی ظاہری حقیقتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اپنی بظاہر علمی تحقیق کے سایے میں آیات معجزہ کی تفسیر کی ایسے افراد کی یہ کوشش جو کہ عصر حاضر کی مادی تحقیقات کی بنیاد پر استوار ہے خود انہی کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔

اب ہم معجزہ یعنی خارق العادت امر کے سلسلہ میں قرآن مجید کے بیان کردہ معنے کو چند فصلوں میں وضاحت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تا کہ حقیقت حال واضح طور پر معلوم ہو سکے۔

(۱)
قانون علیت عامہ کے بارے میں قرآنی تصدیق

قرآن مجید نے اس بات کو تسلیم اور ثابت کیا ہے کہ عالم طبیعت کے واقعات اور تمام حوادث روزگار اپنے مخصوص اسباب کے ساتھ رونما ہوتے ہیں اور ان اسباب کے بغیر کوئی واقعہ وجود پذیر نہیں ہو سکتا' اور قرآن نے علّیت عامہ (یعنی کوئی چیز بغیر سبب کے وجود میں نہیں آ سکتی) کی بھرپور تصدیق کی اور اسے اسی طرح مورد تائید قرار دیا جس طرح عقل نے اپنے

مسلمہ اصولوں کے ساتھ اس کی تائید و تصدیق کی اور اس کے علاوہ علمی بحثوں اور فکری استدلال و تحقیق کی بنیاد بھی یہی ہے کیونکہ ہر انسان فطری طور پر یہ نظریہ رکھتا ہے کہ اس مادی دنیا اور عالم طبیعت میں کوئی واقعہ کسی مخصوص علت و سبب کے بغیر وجود پذیر نہیں ہوتا بلکہ تمام واقعات و حوادث کے رونما ہونے کے پیچھے ان کے مخصوص علل و اسباب کارفرما ہوتے ہیں' یہ ایک مسلم الثبوت امر ہے کوئی شخص اس میں شک و شبہ ہی نہیں رکھتا بلکہ اسے ایک ناقابل انکار عقلی فیصلہ کے طور پر تسلیم کرتا ہے' اسی طرح موجودہ علوم اور تمام علمی تحقیقات میں عالم طبیعت میں رونما ہونے والے تمام واقعات و حوادث کی بابت ان کے مناسب اسباب اور موزوں علل کو بنیاد قرار دیا گیا ہے اور اس حقیقت کا واضح طور پر اعتراف کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں کوئی واقعہ مخصوص علت و سبب کے بغیر رونما نہیں ہوتا' اور علت و سبب سے ہماری مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ عالم طبیعت میں جب کوئی ایک چیز یا امر اور متعدد اشیاء یا امور وجود پذیر ہوتے ہیں تو ان کی وجہ سے ایک نئی چیز یا نیا امر وجود میں آ جاتا ہے اور ہم اس وجود میں آنے والے امر کو ''معلول'' کا نام دیتے ہیں' (معلول یعنی وہ چیز جو کسی چیز کی وجہ سے وجود میں آئی ہو) چنانچہ تجربات نے علت و معلول کی حقیقت کو ہمارے سامنے واضح کر دیا ہے مثلاً ہم نے بار بار کے تجربات سے یہ آگاہی حاصل کی ہے کہ جب بھی کسی جلی ہوئی چیز کو دیکھتے ہیں تو فوراً آگ کا تصور سامنے آ جاتا ہے جو کہ اس چیز کے جلنے کا سبب اور باعث تھی اور یہ بھی یقین ہو جاتا ہے کہ آگ یا کوئی دوسرا سبب جس نے اس چیز کو جلایا ہے وہ اس سے پہلے موجود تھا ورنہ یہ چیز نہ جلتی' اسی طرح ہم بار بار ایسی چیزیں دیکھ کر اس عمومی اصول اور قانون کلی سے آگاہ ہو جاتے ہیں کہ ہر چیز کے وجود میں آنے اور رونما ہونے کے لیے کسی مخصوص' موزوں و مناسب علت و سبب کی ضرورت ہوتی ہے' اس کے بغیر کوئی امر وقوع پذیر نہیں ہو سکتا اسی طرح جب وہ علت اور سبب وجود میں آ جائے تو اس کے ''معلول'' کا رونما ہونا اور وجود میں آنا لازمی و ضروری ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ علت تحقق پذیر ہو (وجود میں آئے) لیکن ''معلول'' وجود میں نہ آئے' یہ ہرگز ممکن نہیں' اسے ''قانون علیت عامہ'' کہتے ہیں' بنابرایں کلیت و عمومیت اور علت و معلول کا ایک دوسرے سے الگ نہ ہونا۔ بلکہ ایک دوسرے کا لازم و ملزوم ہونا..... ہی علیت و معلولیت کے قانون کی اصل بنیادیں اور بنیادی اصول ہیں۔

مذکورہ بالا ''قانون علیت'' جسے عقل' علوم اور تجربات نے ثابت و تسلیم کیا ہے بلکہ علوم و تحقیقات کی بنیاد بھی یہی قانون ہے اسے قرآن مجید نے بھی مورد تائید قرار دیا ہے اور اپنے ظاہر و واضح بیانات و موضوعات میں مکمل طور پر اسے تسلیم کر کے اس کی بھرپور تصدیق کی ہے' چنانچہ قرآن مجید نے موت و حیات، رزق اور دیگر سماوی و ارضی حوادث و واقعات وغیرہ کے تذکرے میں ان سب کو علل و اسباب کے ساتھ مربوط کر کے ذکر کیا ہے اور ان کی بنیاد و اساس ان کے مخصوص عوامل و اسباب ہی کو قرار دیا ہے' اگرچہ ان کی بازگشت ذات الٰہی کی طرف ذکر کی اور حقیقی معنے میں ان سب کا استناد خدا کی طرف کیا ہے کیونکہ توحید کے اثبات کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا بلکہ عقیدہ توحید کی اصل روح کا تقاضہ بھی یہی ہے لیکن اس سے بخوبی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید نے ''قانون علیت عامہ'' کی بھرپور تائید و تصدیق کی اور اس سے یہ مراد لیا ہے کہ جب بھی کوئی سبب اپنے تمام لوازم و شرائط اور خصوصیات کے ساتھ وجود پذیر ہو جائے اور اس کی اثر آفرینی میں کوئی چیز مانع و رکاوٹ بھی نہ بنے

تو اس سبب کا "مسبّب" باذن خدا وجود میں آ جائے گا۔ لہٰذا جب بھی ہم کسی "مسبّب" کو دیکھیں تو اس سے اس کے "سبب" کے وجود کا یقین حاصل ہو جائے گا اور ہم اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں گے کہ اس (مسبب) سے پہلے اس کا سبب موجود تھا اور یہ اسی کا اثر و نتیجہ ہے ورنہ اسے کبھی وجود نہ مل سکتا۔

(۲)

قرآن میں خارق العادت امر کا اثبات

قرآن مجید نے اگرچہ علت و معلول کے قانون کی تصدیق کی ہے لیکن اس کے باوجود ایسے واقعات اور حوادث بھی بیان کئے ہیں جو عالم طبیعت میں پائے جانے والے علت و معلول کے عمومی نظام اور مروجہ عادات سے قطعی طور پر ہم آہنگ نہیں بلکہ وہ ایسے خارق العادت امور ہیں جن کا تعلق عالم ماوراء الطبیعہ سے ہے مثلاً وہ معجزات جو بعض انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں جیسے حضرت نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ، لوطؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات، اور وہ سب ایسے امور ہیں جو عالم طبیعت میں جاری و ساری نظام و عادات سے کسی طور پر ہم آہنگ نہیں، تاہم اس حقیقت سے انکار ہرگز ممکن نہیں کہ یہ سب امور (معجزات انبیاءؑ) اور واقعات و حوادث اگرچہ عالم طبیعت میں عام طور پر وجود پذیر نہیں ہوتے بلکہ نظام طبیعت ان کی نفی کرتا ہے لیکن یہ بذات خود محال نہیں اور عقل سلیم انہیں ناممکن قرار نہیں دیتی جس طرح کہ ایجاب و سلب (وجود و عدم) (ہونے اور نہ ہونے) کے بارے میں عقل کا فیصلہ ہے کہ یہ دونوں کسی لحاظ سے بھی یکجا نہیں ہو سکتے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہو، اسی طرح عقل ہمارے اس قول کی بھی نفی کرتی ہے کہ کسی چیز کو اس کی اصل حقیقت (اپنے آپ) سے الگ کیا جا سکتا ہے، مثلاً یہ کہیں کہ انسان، انسان نہیں یا انگور، انگور نہیں، اور "ایک" (۱) عدد کے لحاظ سے "دو" (۲) کا آدھا نہیں، تو یہ سب اور ان جیسے دیگر امور بذات خود محال و ناممکن ہیں جبکہ معجزات اور خارق العادت امور ہرگز ایسے نہیں اور نہ ہی عقل نے ان کے وجود پذیر ہونے کی نفی کی ہے اور یہ ناممکن بھی کیونکر ہو سکتے ہیں جبکہ لاکھوں عقلمند لوگ زمانہء قدیم سے ان معجزات کو تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں اور کسی قسم کے شک و شبہ کے بغیر ان حقائق پر ایمان لائے ہیں، اگر یہ معجزات بذات خود ناممکن ہوتے تو کوئی عقل مند انہیں تسلیم نہ کرتا اور نہ ہی انہیں کسی شخص کی نبوت کی تصدیق یا کسی بات کے صحیح ہونے پر دلیل قرار دیتا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر یہ معجزات عقلی طور پر ناممکن ہوتے تو کوئی شخص انہیں کسی کی طرف منسوب ہی نہ کرتا، اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان تمام امور یعنی معجزات کی اصل حقیقت کا انکار اصلِ "طبیعت" بھی نہیں کرتی بلکہ وہ خود ان کی تصدیق و توثیق کرتی ہے چنانچہ عالم طبیعت میں پائے جانے والے امور اس امر کے زندہ گواہ ہیں کہ ان معجزات کا وجود ناقابل انکار ہے مثلاً ایک زندہ کا مردہ ہو جانا اور مردہ کا زندہ ہو جانا

ایک شکل کی دوسری شکل میں تبدیلی‘ ایک واقعہ و حادثہ کا دوسرے واقعہ و حادثہ میں بدل جانا‘ خوشیوں کا مصیبتوں میں اور مصیبتوں کا خوشیوں میں تبدیل ہو جانا وغیرہ یہ سب ایسے امور ہیں جو عام طور پر رونما ہوتے رہتے ہیں اور مادی دنیا میں ان کا وجود پذیر ہونا معمول کا سلسلہ ہے‘ البتہ عادی امور اور معجزات میں جو کہ خارق العادت ہیں فرق یہ ہے کہ عادی امور کے مادی اسباب کہ جو ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے ہاتھوں میں ہیں وہ اپنا اثر مخصوص کیفیتوں اور زمان و مکان کی خاص حالتوں کے ساتھ تدریجی طور پر ظاہر کرتے ہیں جبکہ معجزات ایسے نہیں یعنی نہ تو ان کے اسباب ہمارے سامنے یا ہمارے اختیار میں ہوتے ہیں اور نہ ہی ان اسباب کی تاثیر کے لیے مخصوص حالات و کیفیات کی احتیاج ہوتی ہے بلکہ وہ دفعتہً ظہور پذیر ہوتے ہیں مثلاً عصا کا اژدھا بن جانا اور بوسیدہ جسم کا انسانی صورت میں آ جانا عقلی طور پر ناممکن نہیں لیکن عالم طبیعت میں ایسا ہو جانا خاص اسباب اور زمان و مکان کی مخصوص کیفیتوں اور حالتوں پر موقوف ہے کہ ان حالتوں اور اسباب کے ساتھ ''مادہ'' ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہوتا ہوا اپنی وہ آخری صورت اختیار کر لیتا ہے جو اس کے لیے تصور کی گئی ہوتی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ عصا ہر قسم کی حالت و کیفیت اور اسباب کے ساتھ یا کسی مخصوص سبب کے بغیر یا ہر کسی کی خواہش و ارادے پر اژدھا بن جائے جبکہ معجزات اور خارق العادت امور کہ جن کا تذکرہ قرآن مجید نے کیا ہے وہ کسی اسباب اور خاص حالات و مخصوص کیفیات کے محتاج نہیں بلکہ ان کے وجود پذیر ہونے کے لیے ارادہ الٰہی کافی ہے جو تمام اسباب پر غالب و حاوی ہے اور جب خدا چاہتا ہے تو کسی وقفہ اور تبدیلیوں کے مراحل طے کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حقیقت یہ ہے کہ خارق العادت امور (معجزات) کا سمجھنا اور ان کی حقیقت کا ادراک کر کے ان کی تصدیق کرنا جس طرح ہر شخص کے بس میں نہیں کیونکہ ایک عام آدمی ہر چیز کو اپنے حس اور تجربہ کی بنیاد پر دیکھتا ہے اور وہ دونوں (حس اور تجربہ) خارق العادت امور کے ادراک کی راہ میں مددگار ثابت نہیں ہوتے اسی طرح علم طبیعیات کے تحقیقی نظریات بھی اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود معجزات کی حقیقت کے ادراک میں اہم کردار ادا نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی بنیاد عالم طبیعت میں جاری و ساری علت و معلول کے عمومی اصول و نظام کے سوا کچھ بھی نہیں اور وہ ایسا نظام ہے جو عصر حاضر کے تمام علمی تجربات اور مادی حوادث و واقعات کے فرضی اسباب کی بنیاد اور اصل و اساس ہے اور موجودہ زمانہ کے محققین اپنی تمام تر کاوشیں اسی نظام کی روشنی میں بروئے کار لاتے ہیں‘ لیکن ان سب حقائق کے باوجود اس کے باوجود کہ علم طبیعت کے موجودہ اصول معجزات کی تصدیق کے سلسلہ میں عاجز ہیں یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ ''علم'' معجزات اور خارق العادت امور کا انکار بھی نہیں کر سکتا اور نہ ان پر پردہ ڈال سکتا ہے کیونکہ نگاہ علم لحہ بہ لحہ ان حقائق کا مشاہدہ کرتی رہتی ہے‘ یہ اور بات ہے کہ ابھی تک ''علم'' اپنی تمام تر ترقی اور وسعت کے باوجود معجزات اور خارق العادت امور کی اصل حقیقت و سبب کو سمجھ نہیں سکا لیکن ان کے وجود سے انکار بھی ممکن نہیں‘ چنانچہ دنیا میں کتنے ایسے خارق العادت اور محیر العقول کام ہیں جو ریاضت پیشہ لوگ کرتے ہیں اور ہر روز ان کارناموں کا چرچہ دیکھنے اور سننے میں آتا ہے اور اخبارات و جرائد اور کتابوں میں ان کے تذکرے موجود ہیں اور ان کی کثرت اس حد تک واضح ہو

چکی ہے کہ کوئی عقلمند ان کے بارے میں کسی قسم کا شک نہیں کر سکتا اور نہ ان کے وجود پذیر ہونے کو تسلیم کیے بغیر رہ سکتا ہے۔

اور چونکہ معجزات کی حقیقت اور ان کے رونما ہونے کی بابت کسی قسم کا شک اور انکار ممکن نہیں اس لیے عصر حاضر کے جدت پسند روحانی علوم کے محققین کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ وہ ان خارق العادت امور (معجزات) کی تأویل کریں اور ان کے اسباب کی بابت مخصوص نظریہ قائم کریں چنانچہ انہوں نے ان امور کو نامعلوم مقناطیسی، برقی امواج کے ساتھ مربوط قرار دیتے ہوئے کہا کہ "سخت قسم کی ریاضت کے عمل سے انسان کو ایک طرح کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ نہایت طاقتور اور پراسرار امواج کی تسخیر پر قادر ہو کر انہیں اپنے ارادہ اور شعور کے تابع بنا دیتا ہے یا پھر اس کا ارادہ و شعور ان امواج کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اسی کے سبب وہ مادہ میں طرح طرح کے تصرفات کر کے ان سے خارق العادت امور انجام دینے پر قادر ہو جاتا ہے اور مادہ کو ہر قسم کی شکل و صورت میں تبدیل کر کے عجیب و غریب اور محیر العقول کارنامے پیش کر سکتا ہے"۔

اگر مذکورہ بالا فرضیہ صحیح ہو اور اسے ہر قسم کے نقص و ابرام سے مبرا تسلیم کر لیا جائے تو اس سے ایک نئے وسیع فرضیہ کا سراغ مل جائے گا اور وہ یہ کہ تمام گونا گوں حوادث کے پیچھے ایک طبیعی علت و سبب کا کارفرما ہونا ضروری ہے، جیسا کہ زمانہ قدیم میں تمام یا بعض حوادث کو "حرکت و قوت" کی بنیاد پر قائم فرضیہ کی روشنی میں دیکھا جاتا تھا اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تمام مادی حوادث ایک ہی طبیعی علت کے سبب رونما ہوتے ہیں اور اسی سے مربوط ہیں۔

یہ ہے ان کا فرضیہ، اور وہ اپنے اس نظریہ میں کسی حد تک حق بجانب بھی ہیں کیونکہ عالم طبیعت میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اپنے طبیعی سبب کے بغیر وجود میں آ سکے جبکہ اس کے ساتھ اس کا طبیعی رابطہ برقرار بھی ہو، اس بات کو آسان عبارت میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ طبیعی سبب سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند طبیعی چیزیں (مثلاً پانی، سورج، ہوا، مٹی وغیرہ) مخصوص کیفیتوں کے ساتھ یکجا ہوں تو ان کے آپس میں ملنے سے ایک نئی چیز وجود میں آ جائے اور وہ چیز وجود میں آنے کے بعد اس مواد (طبیعی چیزوں) سے مربوط بھی رہے کہ اگر وہ (چیزیں) یکجا نہ ہوتیں تو اس نئی چیز کا وجود ممکن ہی نہ ہوتا۔

اب آیئے، قرآن مجید کے بیانات پر نظر کریں، قرآن مجید نے اگرچہ اس طبیعی علت کی نشاندہی نہیں کی جو تمام مادی حوادث خواہ وہ عادی ہوں یا ہمارے خیال کے مطابق "خارق العادت" ہوں، کے وجود میں آنے کا سبب ہوتی ہے، قرآن نے اس کے نام اور اس کی اثر آفرینی کی کیفیت کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی کیونکہ ایسا کرنا قرآن کے بنیادی مقاصد میں شامل ہی نہیں، لیکن اس کے باوجود قرآن ہر مادی حادث کے لیے ایک مادی سبب کے وجود اور اس کے ضروری ہونے کو ثابت کرتا ہے ایسا سبب جو اذن الٰہی سے اس حادث مادی امر کو وجود میں لا سکے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن مجید اس حقیقت کو واضح طور پر ثابت کرتا ہے کہ ہر وہ حادث مادی امر جس کا استناد خداوند قدوس کے مقدس وجود کی طرف ہوتا ہے (جبکہ تمام موجودات اسی کی طرف مستند ہوتی ہیں) کے لیے ایک ایسا مادی نظام اور طبیعی راستہ موجود ہے جس کے ذریعے خداوند عالم اسے وجود اور ہستی کا فیض پہنچاتا ہے چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ طلاق، آیت ۳:

★ "وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا" ۔

(جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے خدا اس کے لیے نجات کا راستہ قرار دیتا ہے اور اس کو اس طرح رزق عطا کرتا ہے کہ وہ جس کا گمان بھی نہیں کر سکتا' اور جو شخص خدا پر بھروسہ رکھے وہ اس کی کفایت کرتا ہے' یقیناً خدا اپنا کام پورا کرتا ہے' خدا نے ہر چیز کی ایک مقدار اور اندازہ مقرر کر دیا ہے)

اس آیت کا ابتدائی جملہ اپنے اطلاق کے ساتھ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ عالم بشریت کے لیے اعلان عام ہے کہ "جو شخص بھی تقوائے الٰہی اختیار کرے اور خدا پر توکل کرے وہ اس کے لیے کافی ہے اور اسے رزق فراہم کرتا ہے اس طرح سے کہ جس کا وہ گمان بھی نہیں کر سکتا جبکہ یہ تمام مادی و محسوس اسباب کہ جنہیں ہم "اسباب" سمجھتے ہیں اس کے برعکس فیصلہ کرتے ہیں اور خدا نے اس کی کفایت کی ذمہ داری لی ہے اور جس چیز کا ذمہ دار خدا ہو وہ یقینی طور پر وجود پذیر اور محقق ہوتی ہے' جیسا کہ درج ذیل آیات بھی اس مطلب کو بیان کرتی ہیں:

سورہ بقرہ، آیت ۱۸۶:

★ "وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۚ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ" ۔

(اور جب میرے بندے میرے بارے میں آپؑ سے پوچھیں...... تو کہہ دیجئے کہ...... میں ان سے قریب ہوں اور ہر دعا مانگنے والے کی دعا کو سنتا اور قبول کرتا ہوں جب وہ صرف مجھے ہی پکارے)۔

سورہ مومن، آیت ۶۰:

★ "ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ---"

(مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا)۔

سورہ زمر، آیت ۳۶:

★ "اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ---" ۔

(آیا خدا اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟)

ان آیات میں کلام مطلق ہے جو کہ سورہ طلاق کی آیت ۳ کے ابتدائی جملے کے اطلاق اور معنی مقصود کی صحت کا ثبوت فراہم کرتا ہے' اور اسی (آیت ۳) کے آخری جملہ (اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ) میں آیت کے ابتدائی جملہ (وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ... وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ...) کے مطلق ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے اور اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ خداوند عالم کیونکر اپنے بندوں اور تقویٰ و توکل کرنے والوں کی کفایت کرتا ہے جبکہ ظاہری اسباب اس امر کی نفی کرتے ہیں' اسی طرح سورہ یوسف آیت ۲۱ میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے:

★ "وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ"۔
(خدا اپنے ہر کام میں غلبہ رکھتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

اس آیت کے الفاظ بھی مطلق ہیں یعنی ان میں کسی قسم کی قیود وشروط ذکر نہیں کی گئیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند عالم کی مشیت وارادہ جس حادث امر سے تعلق پکڑے اس پر خدا کا مکمل کنٹرول ہے اور اسے اس پر قدرت وغلبہ حاصل ہے خواہ تمام عادی ومادی اسباب اس کے وقوع و وجود پذیر ہونے کی نفی ہی کیوں نہ کریں (گویا خدا کی قدرت وغلبہ ہی بندوں کے امور کی کفایت کا سبب وسرچشمہ ہے)۔

ایک نہایت اہم سوال اور اس کا جواب

اب سوال یہ ہے کہ آیا خداوند عالم ظاہری عادی ومادی اسباب سے استفادہ کئے بغیر ایسا کرتا ہے اور اس کا "ارادہ" ہی تمام امور میں مؤثر وکافی ہوتا ہے یا یہ کہ وہ طبیعی اسباب کے ذریعے سب کچھ انجام دیتا ہے لیکن ہم ان اسباب سے ناآگاہ ہیں اور وہ خود ہی ان اسباب کا مکمل علم رکھتا ہے اور ان کے ذریعے جو کام چاہتا ہے انجام دیتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دونوں صورتیں ممکن ہیں، البتہ سورہ طلاق کی آیت ۳ کا آخری جملہ (قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا) جو کہ پہلے جملوں میں ذکر کئے گئے مطالب کی تعلیل میں (ان کے علل کے بیان میں) اس امر کو واضح کرتا ہے کہ خداوند عالم تقویٰ اور توکل اختیار کرنے والوں کو کیونکر رزق دیتا اور ان کی کفایت کرتا ہے، یہ جملہ دوسری صورت کو ثابت کرتا ہے یعنی یہ کہ خداوند عالم تمام امور کو ان کے اسباب کے ذریعے انجام دیتا ہے لیکن ہم ان اسباب سے ناآگاہ ہیں اور وہ خود ہی ان اسباب کا علم رکھتا ہے کیونکہ اس دوسری صورت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مسبّب خواہ وہ اپنے وجود میں عادی اسباب کا مرہون منت ہو یا نہ ہو اس کے لیے خداوند عالم نے ایک اندازہ اور حد مقرر کردی ہے اور اس کا دیگر موجودات کے ساتھ ربط و تعلق قائم کردیا ہے اور وہ تمام موجودات کے ساتھ وجود وہستی کے ناطے مربوط اور ملی ہوئی ہے اور خداوند عالم اس امر پر قادر ہے کہ وہ ان موجودات کے باہمی ارتباط کے ذریعے معجزات اور خارق العادت امور کو وجود بخشے خواہ ظاہری طور پر عادی اسباب موجود نہ ہوں اور نہ ہی اس خارق العادت امر سے ان کا کوئی ربط وتعلق ہو کیونکہ موجودات عالم کے درمیان پایا جانے والا ربط وتعلق اور اتصالات وارتباطات ان موجودات کی ملکیت اور دائرۂ تصرف میں نہیں کہ جب چاہیں اطاعت وفرمانبرداری کریں اور جب چاہیں معصیت ونافرمانی کریں بلکہ جس طرح سے خود موجودات کو خدا نے پیدا کیا اور ان کے لیے حدود مقرر کردی ہیں اسی طرح ان کے درمیان ربط واتصال بھی خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی ان کا مالک ہے اور وہی ان کے تصرف پر قادر ہے اور یہ تمام موجودات اور ان کے درمیان پائے جانے والے اتصالات وارتباطات وجودی وعملی طور پر خدا کی اطاعت وفرمانبرداری میں ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت (طلاق ۳) اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء

موجودات کے درمیان ارتباطات و اتصالات...... رابطے و تعلق...... پیدا کر دیئے ہیں وہ اس بات پر قادر ہے کہ ان سے جو کام جس طرح لینا چاہے لے لے، اس سے اشیاء و موجودات کے درمیان سببیّت و علیت کی نفی نہیں ہوتی، ایسا نہیں کہ اب ان کے درمیان کوئی سبب و علت ہی نہیں پائی جاتی یا اس کی ضرورت نہیں بلکہ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ یہ تمام اسباب و علل خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہ ان سے اپنی مشیت و ارادہ کے مطابق جو کام لینا چاہے لے سکتا ہے' گویا ان سے خدا کی قدرت کا ثبوت ملتا ہے' پس تمام موجودات کے درمیان علت و معلول کا نظام قائم ہے اور ان میں سے ہر شے اپنے سے پہلی شے سے حقیقی طور پر مربوط ہے اور ان کے درمیان علیت کا نظام پایا جاتا ہے البتہ یہ رابطہ و تعلق وہ نہیں جسے ہم ان موجودات کے درمیان پاتے ہیں بلکہ اس سے سوا ایک ایسی پاکیزہ حقیقت ہے جس کا علم صرف خدا کو ہے' اس نظام کی حقیقت صرف وہی جانتا ہے کیونکہ وہی اس کا ایجاد کرنے والا ہے' یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے علمی قواعد اور مفروضوں کو رونما ہونے والے تمام واقعات اور وجود میں آنے والے تمام حوادث کی تعلیل اور ان کے اسباب کو ڈھونڈ پانے میں عاجز پاتے ہیں اور یہ قواعد ہمیں ان واقعات کے اسباب سے آگاہ نہیں کر سکتے' یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس کا ثبوت قرآنی آیات سے بخوبی ملتا ہے اور وہ آیات جنہیں "آیات قدر" کہا جاتا ہے (جس میں نظام تقدیر اور مقدرات الٰہی کا ذکر ہے) مذکورہ بالا مطالب کی واضح دلیلیں ہیں وہ آیات یہ ہیں:

سورہ حجر، آیت ۲۱:

★ "وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ"۔

(ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں اور ہم اس سے ایک معلوم مقدار بھیجتے رہتے ہیں)۔

سورہ قمر، آیت ۴۹:

★ "اِنَّا كُلَّ شَىۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ"۔

(یقیناً ہم نے ہر چیز کو ایک اندازہ و مقدار کے ساتھ پیدا کیا ہے)

سورہ فرقان، آیت ۲:

★ "خَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا"

(اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پھر اسے ایک اندازہ کے مطابق قرار دیا)

سورہ اعلیٰ، آیت ۳:

★ "الَّذِىۡ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝۲ وَالَّذِىۡ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝۳"۔

(وہ کہ جس نے پیدا کیا' پھر درست کیا' اور وہ ہے کہ جس نے اندازہ مقرر کیا پھر ہدایت و رہنمائی کی)

سورہ حدید، آیت ۲۲:

★ "مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡـرَاَهَا"۔

(جتنی مصیبتیں روئے زمین پر یا تم لوگوں پر آتی ہیں اس سے پہلے کہ ہم انہیں پیدا کریں کتاب...... لوح محفوظ...... میں لکھی ہوئی ہیں)

سورہ تغابن، آیت ۱۱:

★ "مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ یَہۡدِ قَلۡبَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ"۔

(کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اذن الٰہی کے ساتھ اور جو شخص خدا پر ایمان لائے تو خدا اس کے دل کو ہدایت عطا کرتا ہے اور خدا ہر چیز کا بہتر جاننے والا ہے)۔

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت اور اسی طرح دیگر تمام آیات اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ دنیائے ہستی میں پائی جانے والی ہر چیز خداوند عالم کے مقرر کردہ اندازہ و مقدار (تقدیر الٰہی) سے تکوین کا ہر مرحلہ طے کرتی ہوئی اپنے معین مشخص مقام تک پہنچتی ہے...... اس بات کو علمی اصطلاح میں یوں کہا جاتا ہے کہ وہ "دائرہ اطلاق" سے خارج ہو کر دائرہ "تعین و تشخص" میں آجاتی ہے یعنی اب اس کی پہچان کی جا سکتی ہے...... اور خدا ہی اس کا اندازہ و مقدار معین کرتا ہے اور وہ ہے جو اس کے تکوینی مراحل کی حدود اس طرح مقرر کرتا ہے کہ وہ نظام تقدیر اس وجود میں آنے والی چیز سے پہلے بھی ہے اور اس کے ساتھ بھی اور یہ بات کیونکر صحیح ہو سکتی ہے کہ کوئی چیز اپنے وجود ہستی میں محدود و مقدر اور ایک مخصوص اندازہ و مقدار کے مطابق ہو جبکہ اس کے اور دیگر موجودات کے درمیان پائے جانے والے ارتباط کا تعین نہ ہو چکا ہو (کسی چیز کے اپنے وجود میں محدود و مقدر ہونے سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے اور دیگر موجودات کے تمام روابط کی تجدید و تعین ہو چکا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر شئے دوسری اشیاء و موجودات کے ساتھ اس لحاظ سے بھی معین ربط رکھتی ہے کہ سب "مادی" ہیں اور ہر مادی شئے دوسرے مادی اشیاء سے مربوط ہے بلکہ وہ تمام مادی موجودات کے مجموعہ کا حصہ ہے اور وہ مجموعہ ایک قالب کی مانند ہے جس کے ذریعے کسی چیز کے وجود ہستی کی پہچان ہوتی ہے اور وہ قالب اس شئے کے اندازہ و مقدار کو واضح و آشکار کرتا ہے لہٰذا دنیائے امکان میں ہر مادی شئے دیگر تمام مادی موجودات سے مربوط و وابستہ ہے خواہ وہ موجودات اس سے پہلے ہوں اس کے ساتھ ہوں، وہ ہر حالت میں کسی دوسری چیز کی معلول اور اس کے سبب سے وجود میں آئی ہوتی ہے جیسا کہ وہ دوسری چیز بھی کسی اور چیز کی معلول اور اس کے سبب سے وجود میں آئی ہوئی ہے، گویا ان تمام مادی موجودات کے درمیان "علت و معلول" کا رابطہ ہے یعنی ایک چیز جو پہلے ہے وہ دوسری چیز کے وجود میں آنے کا باعث ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ تمام موجودات ہستی میں پایا جاتا ہے اور یہ ایسا سلسلہ ہے جس کا کسی صورت میں انکار ممکن ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب کی تائید و تصدیق کے لیے درج ذیل آیات سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے اور انہیں اپنے مقصود کے اثبات کے لیے دلیل کے طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے (ملاحظہ ہو):

سورہء مومن، آیت ۶۲:

"ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ"۔

(وہ اللہ ہے جو تمہارا پروردگار ہے وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے)۔

سورہء ہود، آیت ۵۶:

"مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ"۔

(روئے زمین پر چلنے پھرنے والے کی چوٹی اس (اللہ) کے ہاتھ میں ہے، حقیقت یہ ہے کہ میرے پروردگار کا راستہ سیدھا ہے)۔

ان دو آیتوں کو آیات قدر میں ذکر کئے گئے مطالب کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ قرآنی آیات علت و معلول کے عمومی قانون اور جامع اصول کی تصدیق کرتی ہیں کیونکہ پہلی آیت ہر شئے کے مخلوق ہونے کو ثابت کرتی ہے لہٰذا اس کی روشنی میں یہ امر واضح ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور وہ اس کا خالق ہے، اور دوسری آیت اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ سلسلۂ خلقت اور ایجاد ایک ہی طور وطرز پر اور ایک نہایت منظم و مرتب ضابطہ پر استوار ہے جس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ جس سے ان کی تخلیق میں خلل یا ان کے بے مقصد ہونے کو ثابت کیا جا سکے۔

پس قرآن ...... جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں...... تمام مادی موجودات میں علت و معلول (علیت) کے قانون کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی حقیقت کو ثابت کرتا ہے لہٰذا یہ نتیجہ بآسانی حاصل ہوتا ہے کہ تمام مادی موجودات میں خواہ وہ عادی طریقے سے وجود میں آئی ہوں یا خارق العادت ہوں ان میں پایا جانے والا نظام وجود و ہستی سیدھے راستہ (صراط مستقیم) پر استوار ہے کہ جس میں کسی قسم کے تخلف و کجی اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں اور وہ ایک ہی اصول پر قائم ہے یعنی یہ کہ ہر حادث اور نو پیدا چیز اپنے وجود و ہستی میں ایک ایسی علت کی محتاج ہے جو زمانی طور پر اس سے پہلے موجود ہو۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ جن عادی اسباب اور ان کے مسببات کے درمیان اختلاف و ناہم آہنگی اور عدم مطابقت کی صورت پیدا ہوتی ہے وہ حقیقی اختلاف و اسباب نہیں بلکہ اصل میں کچھ دیگر حقیقی اسباب ہیں جو تمام موجودات پر چھائے ہوئے ہیں اور ان کے اصول و خصوصیات کے حوالہ سے ان میں اور ان کے مسببات کے درمیان کبھی اختلاف و عدم مطابقت نہیں پائی جاتی جیسا کہ علمی تجربات نے عناصر حیات اور خارق العادت امور میں اس حقیقت کی تصدیق کر دی ہے، اور ہم اس کی وضاحت گذشتہ مطالب میں کر چکے ہیں۔

(۳)

قرآن ان تمام موجودات کی نسبت خدا کی طرف دیتا ہے جن کی نسبت مادی علت کی طرف دی جاتی ہے۔

قرآن مجید جس طرح تمام اشیاء وموجودات کے درمیان علت ومعلول کے نظام کو ثابت کرتا ہے اور اس امر کی تصدیق وتوثیق کرتا ہے کہ ان تمام موجودات میں سے ہر ایک دوسرے کی علت وسبب ہے اسی طرح وہ تمام موجودات کی نسبت خدا کی طرف دیتا ہے اور اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ حقیقی معنے میں علت وسبب خدا ہے' لہٰذا اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ دیگر تمام اسباب اثر انگیزی میں اپنی مستقل حیثیت نہیں رکھتے (خود سے کچھ بھی نہیں) اور حقیقی مؤثر خدائے قدوس کے سوا کوئی نہیں' چنانچہ اسی سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے:

سورہء اعراف، آیت ۵۴:

★ "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ--"

(یادرکھو اسی کے لیے ہے خلق اور امر--)

یعنی پیدا کرنا اور وجود عطا کرنا درحقیقت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

سورہء بقرہ، آیت ۲۸۴:

★ "لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ--"۔

(خدا ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)

سورہء حدید، آیت ۵:

★ "لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ--"۔

(اسی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی ملکیت)

سورہء نساء آیت ۷۸:

★ "قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ--"۔

(کہہ دیجیے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے)

مذکورہ بالا کے علاوہ دیگر متعدد آیات ایسی ہیں جن میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ تمام موجودات صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور اس امر میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں' اور خدا ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان اشیاء وموجودات میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور جب تک خدا کسی کو اذن نہ دے اور اسے ان اشیاء میں تصرف کرنے کا اختیار عطا نہ کرے کوئی

شخص ان میں ذرہ بھر تصرف نہیں کرسکتا' ہر شخص کا تصرف درحقیقت خدا کے عطا کردہ اختیار کی بدولت ہے' تاہم اس اختیار میں بھی کوئی شخص مستقل ملکیت نہیں رکھتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے صرف ''اذن'' دیا گیا ہے (اجازت دی گئی ہے) اور جس شخص کو صرف اذن دیا گیا ہو وہ اذن دینے والے کی معین کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرسکتا اور نہ اس اذن کا سہارا لیے بغیر کچھ کرسکتا ہے' اسی سلسلے میں ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورہ آل عمران، آیت ۲۶:

★ ''قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ''

(کہیے! بارالٰہا' اے وہ کہ کائنات کی ملکیت جس کے پاس ہے! تو جسے چاہتا ہے اختیار عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا اختیار لے لیتا ہے)۔

سورہ طہٰ، آیت ۵۰:

★ ''الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔۔''۔

(وہ کہ جس نے ہر شے کو وجود عطا کیا پھر ہدایت کی۔۔)۔

ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں صرف خدا کو پوری کائنات کا مکمل بااختیار مالک ذکر کیا گیا ہے۔ اور بعض آیات ایسی ہیں جن میں ''تصرف'' کی اجازت کے بارے میں یوں ذکر ہوا ہے:

سورہ بقرہ، آیت ۲۵۵:

★ ''لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ''

(اسی کی ملکیت میں ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے' کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت و اذن کے بغیر شفاعت کرسکے)

سورہ یونس، آیت ۳:

★ ''ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ۔۔''۔

(پھر وہ عرش پر مستقر ہوا، وہ ہر شے کی تدبیر کرتا ہے، کوئی شفاعت کرنے والا نہیں مگر اس کے اذن کے بعد!)

مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ تمام اسباب خدا ہی کی عطا کردہ قوت و صلاحیت کے باعث ''سبب'' کہلاتے ہیں اور وہ سبب ''سبب'' ہونے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اپنی اثر انگیزی میں مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ وہی امر ہے جسے خداوند عالم نے ''شفاعت'' کا نام دیا ہے اور ''اذن'' سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ ''اذن'' تب ہی درست ہوگا جب اذن کے بغیر تصرف ممکن نہ ہو بلکہ تصرف کی راہ میں مانع اور رکاوٹ موجود ہو اور وہ ''مانع'' اور رکاوٹ اسی صورت میں قابل تصور ہے جب تصرف میں لائی جانے والی چیز میں تصرف کا اقتضاء پایا جائے اور صرف اس مانع کی وجہ سے تصرف نہ کیا جا

سکتا ہو یعنی وہ مانع اس شخص (تصرف کرنے والے کہ جسے اذن دیا گیا ہو) اور اس چیز (جس میں تصرف مقصود ہو) کے درمیان حائل بنا ہو تو اس صورت میں اذن کے ذریعے وہ مانع ختم ہو جائے گا اور جسے اذن دیا گیا ہو وہ اس میں تصرف کر سکے گا۔

بنابرایں واضح ہو گیا کہ ہر سبب میں ایسا قوی موثر عنصر موجود ہے جو اس کی تاثیر کو یقینی بناتا ہے اور اسی موثر کے طفیل وہ سبب اپنے مسبب کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنتا ہے' لیکن اس سب کچھ کے باوجود اصل قدرت خدا ہی کے پاس ہے اور وہی حقیقی معنے میں موثر ہے۔

(۴)

معجزات میں انبیاءؑ کی خاص قوت کا قرآنی اثبات

خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ مومن، آیت ۷۸:

★ "وَ مَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ "۔

(کوئی رسولؐ خدا کے اذن کے بغیر کوئی آیت (معجزہ) پیش نہیں کر سکتا' پس جب خدا کا امر آ گیا تو حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا اور پھر باطل نواز..... حق کو جھٹلانے والے..... نقصان میں رہے)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی رسول جو معجزہ بھی پیش کرے وہ خدا کے اذن سے ہوتا ہے' اور یہ کہ معجزات کا ظاہر ہونا اور انبیاءؑ کی طرف سے ان کا پیش کیا جانا درحقیقت اس پاکیزہ قوت کی وجہ سے ہے جو انبیاء علیہم السلام کے نفوس مقدسہ میں موجود ہوتی ہے کہ جس کی تاثیر خدا کے اذن پر موقوف ہے' جیسا کہ گذشتہ فصل میں بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

سورہ بقرہ، آیت ۱۰۲:

☆ "وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ۭ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ۭ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ "

(اور ان لوگوں نے اتباع و پیروی کی اس چیز کی جو سلیمانؑ کے دور اقتدار میں شیاطین لوگوں کے سامنے پڑھا

کرتے تھے (جادو)، جبکہ سلیمانؑ نے کفر اختیار نہیں کیا لیکن شیاطین نے کفر اختیار کیا وہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے اور وہ کچھ بتاتے تھے جو دو فرشتوں یعنی ہاروت و ماروت پر بابل میں نازل کیا گیا تھا حالانکہ وہ دو فرشتے جب بھی کسی کو تعلیم دیتے تو اس سے کہہ دیتے تھے کہ ہم آزمائش و امتحان ...... کا ذریعہ ...... ہیں لہٰذا تم یہ تعلیم حاصل کر کے کافر نہ ہو جانا، پھر بھی وہ لوگ ان دو فرشتوں سے وہ کچھ سیکھتے تھے جو میاں بیوی کے درمیان تفرقہ و جدائی ڈال دے جبکہ وہ اس سے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے جب تک کہ خدا کا اذن نہ آ جائے)۔

یہ آیت جہاں جادو کے علم کی فی الجملہ تصدیق کرتی ہے وہاں اس امر کو بھی ثابت کرتی ہے کہ جادو، معجزہ کی طرح اس نفسانی قوت کے ذریعے تحقق پذیر ہوتا ہے جو جادوگر میں پائی جاتی ہے، گویا دونوں (جادو اور معجزہ) میں خدا کا اذن ایک قدر مشترک ہے۔

بہر حال آیت شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام خارق العادت امور خواہ انہیں معجزہ کہا جائے یا جادو یا اس کے علاوہ کچھ اور جیسے انبیاء کی کرامات یا ریاضت و مجاہدتِ نفس سے حاصل ہونے والی صفات و خصوصیات، سب کا استناد نفسانی قوتوں، روحانی توانائیوں اور ارادی تقاضوں کی طرف ہوتا ہے اور وہ انہی کے سبب سے تحقق پذیر ہوتی ہیں البتہ کلام الٰہی اس امر کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ وہ قوت (مبدائ) جو پیغمبروں، رسولوں اور مومنین کے پاس ہے وہ ہر سبب پر ہر حال میں غالب ہے، چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے، آیات مبارکہ ملاحظہ ہوں:

سورہ صافات، آیت ۱۷۳:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ﴿١٧١﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ﴿١٧٢﴾ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿١٧٣﴾

ہماری بات ہمارے (خاص) بندوں، پیغمبروں کے لئے پوری ہوگئی کہ صرف وہی ہیں جن کی مدد کی جائے گی اور وہی ہمارا لشکر ہے جو غالب ہوگا)

سورہ مجادلہ، آیت ۲۱:

كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ---،

(خدا نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے)۔

سورہ مومن، آیت ۵۱:

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ

(بلاشبہ ہم اپنے رسولوں کی ضرور مدد کریں گے اور ان لوگوں کی مدد کریں گے جو اہل ایمان ہیں اس دنیاوی زندگی میں اور اس دن جب گواہیاں قائم ہوں گی)

مذکورہ بالا آیات مبارکہ، مطلق ہیں یعنی ان میں نصرت اور مدد کرنے کے لئے کوئی قید و شرط ان میں ذکر نہیں کی

گئی۔

ان مطالب سے یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ وہ قوت (مبدأ) کہ جو نفوسِ انبیاءؑ میں موجود ہے اور اس کی مدد خدا کی طرف سے کی گئی ہے وہ ایک ماورائے طبیعت اور مافوق المادہ امر ہے (طبیعت و مادہ سے بالاتر اور ان کے علاوہ کوئی چیز ہے) کیونکہ اگر وہ مبدأ (قوت) بھی مادی ہوتا تو دوسری مادی اشیاء کی طرح اپنے سے قوی تر چیز سے مغلوب ہو جاتا اور اس کی اندازہ گیری اور حد بندی کا کام امکان پذیر ہوتا کیونکہ تمام مادی امور کا حال یہی ہے کہ وہ اپنے سے بالاتر قوت اور مضبوط ترین چیز کے ہاتھوں مغلوب ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے مقابلہ کی صورت میں قوی ترین چیز کمزور چیز پر غالب آ جاتی ہے' اگرچہ مقابلے کی صورت میں مادہ سے خالی چیزیں (مجرد) بھی ایسی ہی ہیں کہ قوی و مضبوط شے کمزور و ضعیف پر غالب آ جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مادہ سے خالی چیزوں (مجردات) کے درمیان تمانع و تزاحم پایا ہی نہیں جاتا کہ جس کی وجہ سے ایک' دوسری پر غالب آ جائے البتہ اگر کہیں دو مجرد چیزوں کے درمیان تقابل و تزاحم نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ ان کا تعلق کہیں نہ کہیں سے مادہ سے ہے۔ کیونکہ اگر مادہ سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو تو کبھی آپس میں تزاحم اور ٹکراؤ کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی' اور یہ مبداء (قوت) جو نفسانی بھی ہے اور مجرد بھی' اسے خداوند عالم کے ارادہ سے مدد و نصرت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ کسی مادی چیز سے ٹکرا جائے اور وہ مادی چیز اس کی تاثیر میں رکاوٹ بن جائے اس صورت میں خداوند عالم اس مجرد مبداء کو ایسی طاقت عطا فرماتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں آنے والی مادی چیز اس کی تاثیر کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی اور نہ ہی اس کے مقابلے میں آ سکتی ہے یعنی اس کے سامنے اسے تاب مقاومت ہی نہیں ہوتی' (ان مطالب پر اچھی طرح غور کریں)

(۵)

قرآن مجید معجزات کو انبیاءؑ کے ساتھ ساتھ خدا کی طرف بھی منسوب کرتا ہے!

گذشتہ فصل میں ذکر کی گئی آیت (سورہ مومن ۷۸) کا آخری جملہ (فَإِذَا جَآءَ أَمۡرُ ٱللَّهِ قُضِيَ بِٱلۡحَقِّ) اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ انبیاءؑ کے نفوس مقدسہ میں پائی جانے والی قوت کی تاثیر خدا کے امر پر موقوف ہے کہ جو اس اذن کے ساتھ ساتھ ہے جو کہ اس تاثیر کے لیے ضروری ہے' لہٰذا وہ تاثیر تب ممکن ہوگی جب وہ خدا کے امر سے مل جائے یا دونوں یکجا ہو جائیں۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا کا "امر" کیا ہے اور اس سے مراد کیا ہے؟ اس کا جواب درج ذیل آیات مبارکہ کے ذریعے دیا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہء یس، آیت ۸۲:

★ " اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ "۔

(خدا کا امر یہ ہے کہ جب کسی چیز کو چاہتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا! تو وہ ہو جاتی ہے)

اس آیت میں "امر" کو لفظ "کن" کے ذریعے ایجاد کے معنی میں لیا گیا ہے...... امر کو ایجاد اور لفظ "کن" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سورہء دہر، آیات ۲۹، ۳۰:

★ " اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ "

(بلاشبہ یہ (قرآن) سراسر نصیحت ہے، جو شخص چاہے وہ اپنے پروردگار تک پہنچنے کا راستہ اختیار کر لے، اور تم کچھ چاہتے ہی نہیں مگر یہ کہ جو خدا چاہتا ہے)۔

سورہء تکویر، آیات ۲۷، ۲۸، ۲۹:

★ " اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ "۔

(وہ کچھ نہیں مگر کائنات کے لیے نصیحت، تم میں سے جو بھی چاہے وہ سیدھا راستہ اختیار کر لے، اور تم کچھ بھی نہیں چاہتے مگر جو خدا چاہتا ہے جو عالمین کا پروردگار ہے)

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کا ارادہ کر سکتا ہے اور جس کام کو انجام دینے کی قدرت و اختیار رکھتا ہے اسے اس وقت تک وجود نہیں مل سکتا جب تک خدا نہ چاہے جب تک خدا یہ نہ چاہے کہ انسان اس چیز کا ارادہ کرے اور اسے چاہے تو اس وقت تک وہ چیز وجود میں نہیں آ سکتی، گویا خدا انسان کے چاہنے کو چاہے اور اس بات کا ارادہ کرے کہ انسان اس چیز یا اس کام کا ارادہ کرے کہ اگر خدا نہ چاہے تو انسان میں ارادہ اور چاہت پیدا ہی نہیں ہو سکتی (یعنی خدا انسان کے ارادہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے)۔

ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کے سب کام اس کے ارادہ و اختیار میں ہیں (وہ انہیں انجام دے سکتا ہے) اور وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے لیکن اس کا ارادہ و چاہت اس کے اختیار میں نہیں بلکہ اس کا تعلق خدا کی مشیت سے ہے اور وہ خدا کی مشیت کے ساتھ وابستہ ہے۔

اس مقام پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان آیات سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جو چیز انسان چاہے خدا بھی وہی چاہتا ہے یعنی جس چیز کا انسان ارادہ کرتا ہے گویا وہ خدا نے ارادہ کیا ہے، ایسا ہرگز نہیں بلکہ ایسا خیال کرنا بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ خدا کا ارادہ اس وقت پورا نہ ہو گا جب انسان اس کے مطابق ارادہ نہ کرے یعنی اگر انسان ارادہ نہ کرے جبکہ خدا نے ارادہ کیا ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ خدا کا ارادہ پورا نہ ہوا، ایسا ہرگز درست نہیں کہ خدا کسی چیز کا ارادہ

کرے اور وہ نہ ہو سکے' (اس کے ارادہ اور مراد کے درمیان عدم مطابقت قابل تصور ہی نہیں) اس سلسلہ میں وارد ہونے والی متعدد آیات شریفہ بھی خدا کے ارادہ اور مراد میں عدم مطابقت کی تکذیب کرتی ہیں' مثلاً:

سورہء سجدہ، آیت ۱۳:

★ "وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا"

(اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت عطا کرتے)۔

سورہء یونس، آیت ۹۹:

★ "وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا"

(اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر رہنے والے سب لوگ ایمان لاتے)

ان آیات کے علاوہ کئی دیگر آیات میں بھی اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔

بنابرایں ہمارا ارادہ اور ہماری چاہت اگر تحقق پذیر ہو اور ہمارے وجود میں پیدا ہو تو اس کا ہمارے اندر پیدا ہونا درحقیقت خدا کے ارادہ و مشیت سے ہے (خدا ہمارے اندر ارادہ و مشیت پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں اور اسے چاہتے ہیں) اسی طرح ہمارے افعال بھی خدا ہی کے ارادہ اور مشیت سے وجود میں آتے ہیں البتہ ہمارے ارادہ اور ہماری مشیت کے ذریعے سے' گویا ہمارا ارادہ خدا کے ارادہ سے پیدا ہوتا ہے اور ہمارے افعال ہمارے اس ارادہ سے وجود میں آتے ہیں جو خدا کے ارادہ سے پیدا ہوتا ہے' یعنی خدا نے چاہا کہ یہ افعال ہمارے ارادہ کے ذریعے سے تحقق پذیر ہوں تو یہ افعال بھی بالواسطہ خدا کے ارادہ سے وجود میں آئے' بنابرایں ارادہ اور فعل دونوں کا وجود میں آنا خدا کے "امر" اور کلمہ "کن" پر موقوف ہے' کہ اگر خدا کا امر اور کلمہ "کن" نہ ہو تو نہ ارادہ پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ فعل وجود میں آ سکتا ہے جو انسانی ارادہ کا نتیجہ ہے۔

پس تمام امور خواہ وہ عادی ہوں یا خارق العادت' اور وہ خارق العادت خواہ خیر و سعادت میں سے ہوں جیسے معجزہ و کرامت یا شر اور برائی میں سے ہوں جیسے جادو اور کہانت' یہ سب اپنے تحقق پذیر ہونے اور وجود میں آنے کے لیے ظاہری اور طبیعی اسباب کے محتاج اور انہی سے وابستہ ہیں اور ان کا استناد و نسبت انہی کی طرف ہے لیکن اس کے باوجود ان کا وجود میں آنا خدا کے ارادہ پر موقوف ہے کہ اگر وہ ارادہ نہ کرے اور نہ چاہے تو یہ وجود میں نہیں آ سکتے اور ان میں سے کوئی بھی خدا کے "امر" کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا یعنی یا تو وہ سبب خدا کے امر کے ساتھ مل جائے یا دونوں یکجا و متحد ہو جائیں ورنہ کوئی چیز وجود میں نہیں آ سکتی۔

اور کائنات میں پائی جانے والی تمام اشیاء اگرچہ خدا کے امر کی طرف مستند و منسوب ہونے کے ناطے برابر ہیں اور سب اس طرح ہیں کہ جب بھی خدا کا اذن اور امر ہو یہ موجودات اپنے ظاہری اسباب کے ساتھ وجود میں آ جاتی ہیں اور اگر اذن اور امر نہ ہو تو کوئی چیز وجود پذیر نہیں ہو گی یعنی خدا کے اذن و امر کے بغیر سبب و مسبب کا نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا اور جب

سلسلۂ سببیت ہی قائم نہ ہو تو کوئی مسبب وجود میں نہیں آئے گا کیونکہ سبب کے بغیر مسبب ہرگز وجود میں نہیں آ سکتا، لیکن ان میں سے کچھ امور مثلاً انبیاءؑ کے معجزات یا وہ جو کسی بندہء مومن نے خدا سے دعا کے ذریعے طلب کیئے وہ ہمیشہ خدا کے خاص ارادہ سے وابستہ ہیں اور کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتے بلکہ ہمیشہ خدا کا ارادہ اور اس کا خاص و مخصوص امر ان کے ساتھ ہوتا ہے اور انہیں وجود عطا کرتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہء مجادلہ، آیت ۲۱:

★ "كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ"۔

(اللہ نے لکھ دیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول ضرور غالب رہیں گے)۔

سورہء بقرہ، آیت ۱۸۶:

★ "اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ"۔

(میں قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کی دعا جب وہ مجھ سے دعا کرے)۔

ان آیات کے علاوہ گذشتہ فصل میں جو آیات ذکر کی جا چکی ہیں ان میں بھی یہ مطالب بیان کیئے گئے ہیں۔

(۶)

قرآن معجزے کو کبھی مغلوب نہ ہونے والے سبب کی طرف منسوب کرتا ہے!

گذشتہ فصلوں میں بیان کیئے گئے مطالب سے یہ بات واضح ہو گئی کہ معجزہ بھی دوسرے خارق العادت امور کی طرح عادی اسباب سے الگ نہیں بلکہ جس طرح دوسرے امور اپنے تحقق اور وجود میں آنے کے لیے ایک عادی و طبیعی (نیچرل) سبب کے محتاج ہوتے ہیں اسی طرح معجزہ بھی ان کی احتیاج رکھتا ہے اور سب امور خواہ عادی ہوں یا خارق العادت ہوں، عادی و ظاہری اسباب کے ساتھ ساتھ کچھ باطنی اسباب بھی رکھتے ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ جو امور عادی ہیں وہ اپنے ظاہری اسباب کے ساتھ ساتھ ہیں اور وہ ظاہری اسباب ایسے ہیں کہ عام طور پر یا اکثر و بیشتر حقیقی اور طبیعی اسباب ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور ان حقیقی اسباب کے ساتھ خداوند عالم کا ارادہ اور امر ہوتا ہے (یعنی عادی امور کے ساتھ ان کے ظاہری اسباب اور ظاہری اسباب کے ساتھ حقیقی و طبیعی اسباب اور حقیقی و طبیعی اسباب کے ساتھ ارادہ و مشیت الٰہی ہوتی ہے) جبکہ خارق العادت امور خواہ وہ شر اور برائی کے باب سے ہوں جیسے جادو اور کہانت یا خیر اور اچھائی کے باب سے جیسے دعا کا قبول ہونا وغیرہ ..... ایسے طبیعی مگر غیر عادی اسباب کے محتاج اور ان سے وابستہ ہیں جو اس حقیقی سبب کے ساتھ ملے ہوئے ہیں کہ جو خدا

کے اذن وارادہ کا محتاج ہے' (غیر عادی اسباب سے مراد وہ اسباب ہیں جنہیں عام طور پر لوگ سمجھ نہیں سکتے اور انہیں دیکھنے سے قاصر ہیں) بشرطیکہ ان امور پر کسی کی نبوت یا رسالت کے دعوے کی حقانیت وصداقت کا ثابت ہونا موقوف نہ ہو اور جہاں تک معجزے کا تعلق ہے تو چونکہ اس پر نبوت و رسالت اور دعوت الی اللہ کی صداقت موقوف ہے اس لیے وہ ایک طبیعی حقیقی سبب کا محتاج ہے جو خدائے تعالیٰ کے اذن وامر کے ساتھ معجزہ کو وجود میں لاتا ہے' جادو اور معجزہ کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ جادو کا سبب کسی دوسرے طاقتور سبب سے مغلوب ہو سکتا ہے لیکن معجزہ کا سبب مغلوب نہیں ہو سکتا (معجزہ و کرامت دیگر خارق العادت امور کے برعکس کسی دوسرے طاقتور سبب سے مغلوب نہیں ہو سکتے)۔

ایک سوال یا اعتراض:

مذکورہ مطالب کی روشنی میں اگر یہ فرض کریں کہ کوئی شخص معجزہ کے طبیعی (نیچرل) سبب سے آگاہی حاصل کرلے تو اس صورت میں وہ بھی معجزہ پیش کرنے کی صلاحیت حاصل کرلے گا اور اس کے لیے معجزہ لانا آسان ہو جائے گا جبکہ وہ نبی یا رسول نہیں' اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معجزہ اور غیر معجزہ میں صرف نسبت کا فرق باقی رہ جائے گا کہ ایک ہی چیز کچھ لوگوں کے لیے تو معجزہ ہے اور کچھ لوگوں کے لیے معجزہ نہیں یعنی جو معجزہ کے سبب سے آگاہ ہو جائیں ان کے لیے وہ چیز معجزہ نہیں اور جو لوگ اس کے طبیعی حقیقی سبب سے جاہل اور ناآگاہ ہوں ان کے لیے معجزہ ہو اور یہ کہ کسی زمانہ میں معجزہ ہو اور کسی زمانہ میں نہ ہو۔ پس اگر علمی ترقی سے معجزہ کے حقیقی طبیعی اسباب کی آخری حد معلوم ہو جائے تو معجزہ کی کوئی حیثیت ہی باقی نہ رہے گی اور وہ "حق" کی صحیح پہچان کروانے میں ناکام رہے گا اور نتیجتاً معجزہ صرف جاہل اور اس کے سبب سے ناآگاہ شخص کے لیے ہی معتبر اور حجت ہوگا نہ کہ اپنی کسی حیثیت سے' گویا اس کی ذاتی حیثیت ختم ہو کر رہ جائے گی؟ بنابرایں اس طرح کے امر کو عمومی طور پر کیونکر معجزہ کہا جا سکتا ہے بلکہ اسے معجزہ کے نام سے موسوم کرنا صحیح نہ ہوگا۔

جواب:

نہیں' ہرگز نہیں' کیونکہ معجزہ کو معجزہ اس لیے نہیں کہتے کہ وہ ایک نامعلوم (مجہول) طبیعی (نیچرل) سبب سے رونما ہو ہے' کہ اگر وہ نامعلوم سبب معلوم ہو جائے تو وہ معجزہ نہیں رہے گا اور اس کا اعتبار اور حیثیت ختم ہو جائے گی' اور نہ ہی اسے اس لحاظ سے معجزہ کہتے ہیں کہ اسے وجود میں لانے والا سبب' غیر عادی ہے بلکہ اسے اس لیے معجزہ کہتے ہیں کہ وہ ایسے سبب سے وجود میں آیا ہے جو طبیعی...... نیچرل ...... غیر عادی' اور کسی سبب سے مغلوب نہ ہونے والا ہے ہر حال میں غالب ہے' مثلاً کسی کی دعا کی قبولیت کے اثر سے کوئی بہت بڑا امر واقع ہو جائے تو اسے اس لحاظ سے معجزہ و کرامت کہتے ہیں کہ اس کا سبب مغلوب ہونے والا نہیں جیسے کسی مریض کا شفایاب ہو جانا جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دوا کے استعمال اور علاج معالجہ سے شفایاب ہو جائے' البتہ فرق یہ ہے کہ علاج ومعالجہ اور دوا کے استعمال سے شفایاب ہونا ایسا امر ہے جس کا سبب کسی دوسرے قوی سبب

سے مغلوب ہوسکتا ہے یعنی کوئی ماہر ترین ڈاکٹر پہلے ڈاکٹر سے بہتر اور مؤثر علاج کرے لیکن اسے ''معجزہ'' نہیں کہیں گے کیونکہ اس میں اپنے سے قوی سبب سے مغلوب ہونے کی گنجائش موجود ہے جبکہ ''معجزہ'' میں ایسا نہیں وہ کسی صورت میں کسی دوسرے سبب سے مغلوب نہیں ہوسکتا۔

(۷)

قرآن کی نظر میں معجزہ عام دلیل نہیں بلکہ رسالت کی حقانیت کا واضح ثبوت ہے

اس مقام پر ایک سوال ممکن ہے کہ معجزہ اور رسالت کے دعویٰ کی حقانیت میں کیا ربط ہے اور ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے جبکہ عقل کی رو سے ان دونوں کے درمیان کوئی ربط ہی موجود نہیں یعنی عقل یہ نہیں کہتی کہ اگر کوئی شخص رسول ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی صداقت اور اپنے دعوے کی حقانیت کے ثبوت کے طور پر کوئی خارق العادت امر پیش کرے (معجزہ لائے) ورنہ اس کا رسالت کا دعویٰ غلط ہوگا اور پھر قرآن مجید سے بھی ظاہراً ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی کہ رسالت کے دعوے کی تصدیق کے لیے معجزہ لانا ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ دعویٰ غلط ہوگا جیسا کہ قرآن نے کئی انبیاء کے واقعات ذکر کئے ہیں مثلاً حضرت ہودؑ، صالحؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کے واقعات اور یہ ذکر کیا ہے کہ جب انہوں نے اپنی نبوت ورسالت کا اعلان کیا تو لوگوں نے ان سے کوئی ایسی نشانی پیش کرنے کا مطالبہ کیا جس سے ان کے دعوے کی صداقت وحقانیت ثابت ہوجائے چنانچہ ان انبیاء کرامؑ نے بھی لوگوں کے مطالبہ پر جو کچھ وہ چاہتے تھے پیش کیا اور معجزات دکھائے اس کے علاوہ یہ بھی قرآن مجید کی واضح آیات سے ثابت ہے کہ انبیاء کرامؑ نے ابتدائے بعثت ہی میں لوگوں کے مطالبہ سے پہلے بھی معجزات پیش کئے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے بارے میں قرآن میں ہے کہ خداوند عالم نے موسیٰؑ سے ارشاد فرمایا:

سورہ طہٰ، آیت ۴۲:

★ ''اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ''

(تم اور تمہارا بھائی میری نشانیاں (معجزات) لے کر جاؤ اور میری یاد سے غفلت نہ کرنا)۔

اور حضرت عیسیٰؑ کے متعلق خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ آل عمران، آیت ۴۹:

★ ”وَرَسُولًا اِلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ“

(اور ہم نے بنی اسرائیل کی طرف ایک رسول بھیجا' اس نے ان لوگوں سے کہا کہ میں تمہارے لیے تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں' میں تمہارے سامنے گندھی ہوئی مٹی سے پرندے کی شکل میں ایک مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک ماروں گا پس وہ خدا کے اذن سے اڑنے والا پرندہ بن جائے گا' اور میں خدا کے اذن سے ماد زاد اندھے اور برص کے مریض کو تندرست کردوں گا' اور میں خدا کے اذن سے مردوں کو زندہ کردوں گا' اور میں تمہیں بتادوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا جمع کر کے رکھتے ہو' اگر تم ایمان دار ہو تو ان سب امور میں تمہارے لیے نشانی ہے (کہ میں اللہ کا رسول اور اپنے دعوائے رسالت میں سچا ہوں)۔

اور قرآن مجید کا حضرت پیغمبر اسلام ؐ کو معجزہ کے طور پر عطا کیا جانا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے' بہر حال عقل سلی ہرگز یہ نہیں کہتی کہ انبیاء کرام اور رسولوں نے خدا اور قیامت کے بارے میں جو پاکیزہ معارف پیش کئے ان کی صداقت اا حقانیت کے اثبات کے لیے ضروری ہے کہ ان (انبیاء ؑ ومرسلین ؑ) کی طرف سے خارق العادت امور بھی پیش کئے جائی ورنہ ان کے دعوے صحیح نہ ہوں گے' (علمی اصطلاح میں اسے ”تلازم“ یا ”ملازمہ“ کہتے ہیں' جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی چ کے لیے دوسری چیز کا ہونا لازمی اور ضروری ہے ورنہ پہلی چیز کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی' مثلاً ہماری بحث میں پہلی چیز نبوت رسالت کا دعویٰ ہے اور دوسری چیز معجزہ کا لانا ہے کہ اگر وہ معجزہ پیش نہ کرے تو اس کا دعویٰ غلط اور وہ نبی یا رسول نہیں ہوسک جبکہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ نبی یا رسول اپنے دعوے میں سچے ہوتے ہیں تاہم لوگوں کے مطالبہ پر یا ان کی تسلی کے لیے کوئی نشا پیش کرتے ہیں خواہ وہ معجزہ ہو یا کرامت' لہٰذا ایسا نہیں کہ اگر وہ معجزہ پیش نہ کریں تو وہ نبی ہی نہیں، م)۔

اس کے علاوہ یہ کہ انبیاء کرام نے جو مطالب پیش کئے وہ ایسے مضبوط اور پختہ دلائل پر مبنی تھے اور وہ ایسے واضح آشکار ثبوت ان کے ساتھ لائے کہ ان کے بعد کوئی صاحب علم وبصیرت معجزہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور وہ دلائل ا قدر روشن اور واضح ہیں کہ وہ معجزہ کے مطالبہ سے بے نیاز کر دیتے ہیں' اسی وجہ سے اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ معجزا درحقیقت عوام الناس کی تسلی کے لیے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی عقلیں اس بات سے قاصر ہوتی ہیں کہ وہ حقائق کی باریکیوں ا نہایت مضبوط عقلی معانی ومطالب کو سمجھ سکیں اور ان کا ادراک کرسکیں جبکہ خواص اور اہل علم ودانش حضرات حقائق اور ع مطالب کے سمجھنے اور ان کی تصدیق کرنے اور ان پر ایمان لانے میں کسی اور چیز مثلاً معجزہ وغیرہ کے محتاج نہیں ہوتے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انبیاء ؑ ومرسلین ؑ نے اپنے عمدہ اور نہایت واضح وروشن مطالب کو ثابت کرنے کے۔ معجزات پیش نہیں کئے کیونکہ وہ مطالب یعنی خدا کی وحدانیت اور قیامت (مبدء ومعاد) وغیرہ ایسی حقیقتیں ہیں کہ عقل ا

طرح ان کا ادراک اور ان کی تصدیق کر سکتی ہے لہٰذا انبیاء الٰہی نے بھی ان امور میں عقلی دلائل پر اکتفاء کی اور لوگوں کو فکر و نظر اور عقلی دلیلوں کے ذریعے مطالب کی تصدیق کرنے کی راہ دکھائی چنانچہ انہوں نے اپنے خطابات میں ایسے انداز اختیار کئے جو استدلال اور غور و فکر پر مبنی تھے مثلاً:

سورہ ابراہیم، آیت ۱۰:

★ "قَالَتۡ رُسُلُهُمۡ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ"۔

(ان کے رسولوں نے کہا کیا خدا کے بارے میں شک ہو سکتا ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟)

اس آیت میں رسولوں کا خطاب ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے توحید کے سلسلہ میں کیا اور اس میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو دلیل کے طور پر ذکر کیا جو کہ عقل اور غور و فکر سے تعلق رکھتی ہے۔

اسی طرح معاد و قیامت اور حشر و نشر کے بارے میں خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورہ ص، آیات ۲۷، ۲۸:

★ "وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾ اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالۡمُفۡسِدِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِيۡنَ كَالۡفُجَّارِ"۔

(آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے اسے ہم نے بے کار و بے فائدہ پیدا نہیں کیا یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جو کافر ہو گئے پس کافروں کے لیے جہنم کا عذاب ہے' کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے ان جیسا بنا دیں جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یا ان لوگوں کو جو متقی و پرہیز گار ہیں ان لوگوں کی مانند قرار دیں جو فجور اور برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں)۔

پس انبیاء الٰہی نے جو مطالب پیش کئے ان کے اثبات کے لیے معجزہ لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب ان رسولوں سے معجزہ کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے اپنی رسالت کے اثبات اور اپنے دعووں کی حقانیت کو واضح کرنے کے لیے معجزات پیش کئے۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام نے خدا کی طرف سے پیغام بر ہونے اور وحی کے ذریعے خدا کا پیغام وصول کر کے لوگوں تک پہنچانے کے ذمہ دار ہونے کا دعویٰ کیا ..... وحی' خدا سے کلام کر کے ہو یا فرشتہ کے ذریعے یا کسی اور ذریعہ سے ..... جو کہ بذات خود ایک خارق العادت امر کا ادعاء ہے کہ جس کا تعلق ان ظاہری و باطنی ادراکات سے نہیں جنہیں عوام الناس جانتے' پہچانتے اور انہیں اپنے اندر پاتے ہیں بلکہ وہ ایسا مخفی و پوشیدہ ادراک ہے جو عوام الناس کی فکر و نظر سے اوجھل ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کو ماورائے طبیعت میں خاص تصرف حاصل ہے اور یہ خاص تصرف حاصل ہونا انہی سے مختص ہے جبکہ انبیاء بھی دوسرے لوگوں کی طرح عالم بشریت ہی کے افراد (انسانی صلاحیتوں کے حامل) ہیں' یہ وہ اصل وجہ ہے کہ لوگوں نے ان کے دعووں کی فوری تصدیق نہ کی بلکہ ان کا انکار کرنے اور ان کی

سخت مخالفت کرنے پر تل گئے اور ان کے مقابلہ میں آ گئے البتہ لوگوں کا ایسا کرنا یعنی انبیاءؑ کے دعووں کا انکار اور ان کے مدمقابل آ جانا دو طرح پر تھا:

(۱)۔ کچھ لوگوں نے انبیاءؑ کے دعووں کو غلط و نادرست ثابت کرنے کی ٹھان لی اور اس پر بحث و استدلال کر کے ان کی تکذیب کی کوشش کی ان کے بارے میں قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہوا:

سورہ ابراہیم، آیت ۱۰:

★ "قَالُوٓا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ؕ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا"۔

(انہوں نے کہا: تم تو ہم جیسے بشر ہی ہو تم چاہتے ہو ہمیں ان چیزوں کی عبادت سے روک دو جو ہمارے آباء واجداد کیا کرتے تھے)۔

گویا ان لوگوں نے انبیاءؑ کے دعووں کو غلط و نادرست ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل قائم کی کہ وہ عام انسانوں جیسے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص اس طرح کے دعوے نہیں کر سکتا جو وہ کرتے ہیں (کہ ان پر وحی آتی ہے وغیرہ) تو اگر ان پر وحی آ سکتی ہے تو پھر ہر شخص پر وحی آ سکتی ہے کیونکہ سب انسان برابر ہیں اور ایسا کیونکر ممکن ہے کہ ایک پر وحی آئے اور دوسرے پر نہ آ سکے جبکہ سب انسان ہونے میں مساوی اور یکساں ہیں۔

انبیاءؑ نے ان کے اس استدلال کے جواب میں جو کچھ کہا اسے قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

سورہ ابراہیم، آیت ۱۱:

★ "قَالَتۡ لَهُمۡ رُسُلُهُمۡ اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ"۔

(ان کے رسولوں نے ان سے کہا: یہ درست ہے کہ ہم تم جیسے ہی بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس پر احسان کرتا ہے) ...... یہی بات ہمارے اور تمہارے درمیان وجہ امتیاز ہے۔۔۔

اس آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ انبیاءؑ نے لوگوں کی اس بات کا انکار نہیں کیا کہ وہ ان جیسے بشر ہیں بلکہ اسے تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ ہم تم جیسے بشر ہیں لیکن پیغمبری و رسالت خدا کی خاص عنایات میں سے ہے اور اگر خدا کسی کو اپنی خاص عنایات سے نوازے تو وہ بشریت کے دائرہ سے خارج نہیں ہو جاتا یعنی خدا کا کسی کو نبی یا رسول بنا دینا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ بشر نہیں کیونکہ ان دونوں میں منافات نہیں پائی جاتی (ایک کے ثابت ہونے سے دوسرے کی نفی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان میں سے ایک، دوسرے سے متصادم ہے) اور پھر یہ کہ خدا نے کچھ لوگوں کو خاص خصوصیات سے نوازا ہے کہ جس کا انکار ممکن نہیں لہٰذا اگر خدا کسی کو کوئی خصوصیت عطا کرنا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور نبوت بھی خدا کی خاص عنایات میں سے ایک ہے جو اس نے اپنے بعض بندوں کو عطا فرمائی ہے اگر وہ چاہتا تو دوسروں کو بھی دے سکتا تھا اور سب میں اس عنایت

سے بہرہ ور ہونے کا امکان پایا جاتا ہے۔

اسی طرح دوسرے انبیاءؑ کی مانند حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی یہی اعتراض کیا گیا اور ان کے بشر ہونے کو مقام نبوت و رسالت کے منافی قرار دے کر یوں کہا گیا:

سورۂ ص، آیت ۸:

★ "ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا"۔

(کیا یہ ذکر (قرآن) ہم میں سے صرف اسی پر ہی نازل کیا گیا ہے)

سورۂ زخرف، آیت ۳۱:

★ "لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ"۔

(یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی بزرگ آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا)۔

سورۂ فرقان، آیات ۷، ۸:

★ "وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا"۔

(انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اس پر کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا تاکہ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو "انذار" کرے یا کیوں اس پر کوئی خزانہ نہیں گرایا جاتا' یا کیوں اس کے پاس کوئی باغ (جنت) نہیں کہ جس سے غذا کھائے؟)۔

ان لوگوں کے استدلال کا مقصد یہ تھا کہ ادعائے رسالت اس بات کا متقاضی ہے کہ مدعی ہم جیسا بشر نہ ہو، رسالت کا دعویٰ کرنا ہم جیسے بشر کے لیے ہرگز مناسب نہیں کیونکہ اس پر (مدعیٔ رسالت پر) تو وحی آتی ہے جبکہ ہم ایسے نہیں ہیں اور ہم میں سے کسی پر وحی نہیں آتی اور نہ ہی ہم غیبی رابطوں کے حامل ہیں تو یہ جو نبی و رسول ہونے کا دعویدار ہے تو پھر کھانا کیوں کھاتا ہے اور (روزی کمانے کے لیے) بازاروں میں کیوں چلتا پھرتا ہے؟ جبکہ ضروری ہے کہ اس پر کوئی فرشتہ نازل ہو جو اس انذار اور لوگوں کو ہدایت کرنے کے عمل میں اس کا شریک بنے اور اس پر خزانہ اتارا جائے تاکہ وہ روزی کمانے کے لیے کاروبار کرنے پر مجبور نہ ہو اور بازاروں میں تلاش معاش کے لیے نہ گھومتا پھرے یا اس کے پاس کوئی جنت (باغ) ہو جس سے اپنا کھانا پانی حاصل کرے نہ یہ کہ ہماری طرح ہو اور جو کچھ ہم کھاتے ہیں وہی کھائے۔

تو خداوند عالم نے ان لوگوں کے اس استدلال کو غلط قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورۂ فرقان، آیات ۹ اور ۲۰:

★ "اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ... وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ

وَ كَانَ رَبُّكَ قَالُوا"۔

(آپ دیکھیں، یہ آپ کے لیے کس طرح کی مثالیں پیش کرتے ہیں، پس یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں اور ہدایت راستہ نہیں ڈھونڈ سکتے..... اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے نبی و رسول بھیجے وہ بھی عام لوگوں کی طرح کھانا کھاتے تھے او بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تم میں سے بعض لوگوں کو دوسروں کے لیے آزمائش و امتحان کا ذریعہ قرار دیا۔ اب دیکھتے ہیں کہ آیا تم بصیرت حاصل کرتے ہو یا نہ؟ البتہ آپ کا پروردگار ہر چیز سے آگاہ اور بصیرت والا ہے)۔

اسی طرح خداوند عالم نے ان کے اس مطالبہ کو بھی رد کرتے ہوئے اور غلط قرار دیتے ہوئے کہ کوئی فرشتہ اس کے ساتھ انذار اور ہدایت کے امر میں شریک کار ہو، یوں ارشاد فرمایا:

سورہ انعام، آیت ۹:

★ "وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ "۔

(اور اگر ہم اسے فرشتہ قرار دیتے تو پھر بھی اسے ایک آدمی ہی بناتے تو گویا ہم ہی انہیں ان غلط فہمیوں میں مبتلا دیتے جن میں وہ اب مبتلا ہیں)۔

اسی استدلال سے مشابہ بیان درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے: (ملاحظہ ہو)

سورہ فرقان، آیت ۲۱:

★ "وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا "۔

(وہ لوگ جو ہماری ملاقات کے امیدوار نہیں ہیں (قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے) انہوں نے کہا کہ ہم فرشتے کیوں نازل نہیں کیے جاتے یا ہم اپنے پروردگار کو کیوں نہیں دیکھتے، حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے تکبر کیا ہے اور وہ ا حدود سے آگے بڑھ کر باتیں کرتے ہیں اور بہت بڑی سرکشی کے مرتکب ہوئے ہیں)۔

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تئیں یہ گمان کیا کہ نبوت و رسالت کے دعوے کو غلط ثابت کر کا آسان طریقہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ ہم بھی فرشتہ کے نازل ہونے کا مشاہدہ کریں یا ہم بھی اپنے پروردگار کا دیا کریں کیونکہ ہم بھی تو نبی جیسے ہیں، یعنی وہ بھی ہم جیسا بشر ہے تو جب اس پر فرشتہ نازل ہو سکتا ہے تو ہم پر کیوں نہیں؟ گویا ا یہ مطالبہ درحقیقت ان کے اس گمان پر مبنی تھا کہ نبوت و رسالت اور وحی کے ذریعے خدا کا پیغام وصول کرنے کا دعوی کرنے بھی ہم جیسا بشر ہے لہٰذا ہر بشر پر وحی آنی چاہیے اور یہ کہ ہر بشر خدا کا دیدار کر سکے، تو خدا نے انؑ کے اس غلط گمان اور خبر باطل پر مبنی مطالبہ کو رد کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

سورہ فرقان، آیت ۲۲:

★ "يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَ يَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا "

(ایک دن آئے گا جب وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو اس دن مجرموں کو کوئی خوشی نہ ہوگی اور وہ پناہ مانگتے ہوئے...... فریاد بلند کریں گے کہ پناہ! پناہ!)۔

اس آیت میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ یہ لوگ اپنی اس جہالت میں فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتے البتہ موت کے وقت ضرور انہیں دیکھیں گے، اسی مطلب کو خداوند عالم نے ایک اور مقام پر یوں ذکر کیا ہے:

سورہء حجر، آیات ۶ تا ۸:

★ "وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۞ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۞"۔

(اور انہوں نے کہا اے وہ کہ جس پر ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے تو پاگل ہے، اگر تو سچا ہے تو پھر ان فرشتوں کو ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا...... ان سے کہہ دیجئے کہ...... ہم فرشتوں کو نازل نہیں کرتے مگر حق کے ساتھ، ورنہ ان لوگوں کو ہرگز مہلت نہ دی جاتی)۔

ان آیات میں پہلی آیات کی نسبت استدلال میں ایک مطلب کا اضافہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ ان لوگوں نے رسولؐ کی صداقت کو تسلیم کر لیا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہے اور جو کچھ یہ کہتا ہے اور بیان کرتا ہے درحقیقت اس کے جنون اور پاگل پن کا نتیجہ ہے چنانچہ ان کی اس بات کو قرآن مجید میں ایک اور مقام پر یوں ذکر کیا گیا ہے:

سورہء قمر، آیت ۹:

★ "مَجْنُوْنٌ وَّ ازْدُجِرَ"۔

(پاگل ہے اور اس پر جنات کا اثر ہے)۔

بہرحال مذکورہ بالا تمام آیات اور ان جیسی دیگر آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کافروں نے نبوت و رسالت کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے جو استدلال پیش کیا وہ اس بات پر مبنی تھا کہ یہ جو نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ہم جیسا ہی ہے تو اگر اس پر وحی اور فرشتہ آ سکتا ہے تو ہم پر کیوں نہیں آ سکتا، گویا مماثلت اور ایک جیسا ہونے کے حوالہ سے استدلال قائم کیا گیا...... جسے خداوند عالم نے مختلف انداز میں رد کیا۔

(۲)۔ کچھ لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے دعووں کی تکذیب کی بجائے صرف ان کا انکار کیا اور انہیں تسلیم کرنے کے لیے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی صداقت پر دلیل قائم کریں اور ثبوت پیش کریں۔ ان کے اس مطالبہ کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ انبیاءؑ کے دعوے ایسے امور پر مشتمل تھے جو عام لوگوں کے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں اور وہ عوام الناس کو عجیب اور انوکھے لگتے ہیں لہٰذا انہوں نے ان کی صحت و اثبات کے لیے دلیل طلب کی (گویا ان کا مطالبہ علم مناظرہ کی اصطلاح کے مطابق "المنع مع السند" (یعنی انکار کر کے دلیل مانگنا یا دلیل کے ساتھ انکار کرنا) کے مانند تھا) اور اس دلیل سے ان کی مراد "معجزہ" ہے، یعنی انہوں نے معجزہ پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ قرآنی بیانات وتذکروں کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ ہر نبی اور رسول نے اپنے اوپر وحی کے نازل ہونے اور خدا سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کلام کرنے کا دعویٰ کرتے ہوئے اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کیا جبکہ انسان کے ظاہری حواس اس طرح کے امور کی تصدیق نہیں کرتے اور نہ ہی تجربات سے ان کی تائید ہوتی ہے لہٰذا ان پر دوطرح سے اعتراض ممکن ہوا: ایک ان کی صحت پر دلیل نہ ہونے کے حوالہ سے اور دوسرا ان کے درست نہ ہونے پر پائی جانے والی دلیل کے حوالہ سے' یعنی ایک یہ کہ اس دعوے کے ساتھ کوئی دلیل موجود نہیں اور دوسرا یہ کہ اس دعوے کی نفی میں دلیل موجود ہے کیونکہ وحی اور خدا سے گفتگو کرنا اور پھر اسی کے سہارے دینی وشرعی قانون سازی کا عمل ایسے امور ہیں جو لوگوں کے مشاہدہ میں نہیں آتے اور تمام موجودات میں پایا جانے والا سبب ومسبب کا عمومی قانون اور یہ عام اصول کہ کوئی چیز کسی سبب وعلت کے بغیر وجود میں نہیں آتی وحی اور کسی انسان کے خدا سے گفتگو کرنے کو ثابت نہیں کرتا تو گویا ایسا ہونا ایک خارق العادت امر ہے کہ جسے علیت کا عمومی اصول صحیح قرار نہیں دیتا۔ پس اگر کوئی نبی اپنے ادعائے نبوت و وحی میں سچا ہو تو اس کا مطلب اور لازمہ یہ ہوگا کہ اس کا رابطہ عالم ماورائے طبیعت سے ہے اور وہ خدائی طاقت اس کے ساتھ ہے جو خارق العادت امر پیش کرنے پر قادر ہے (یعنی وہ طاقت جو عالم طبیعت میں جاری عادی نظام کے برعکس کچھ کرسکتی ہے) اور یہ کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ اس کی نبوت ورسالت اور اس پر وحی نازل کرنے کے حوالہ سے مادی دنیا پر حاکم عادی اصولوں اور عالم طبیعت میں پائے جانے والے عام قانون کو توڑ دے' تو جب صورت حال یہ ہے تو اس نبی کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی اور خارق العادت امر پیش کرسکے یعنی جب وہ وحی اور خدا سے ہمکلام ہونے جیسے خارق العادت امر کا دعوی کرتا ہے تو کوئی اور خارق العادت امر...... ''معجزہ'' ...... پیش کرے تاکہ لوگوں کو اس کے سچا ہونے کا ثبوت مل جائے' دوسرے لفظوں میں یہ کہ جب وہ ایک انسان ہونے کے باوجود وحی کے نازل ہونے اور خدا سے ہمکلام ہونے کے خارق العادت امر کا دعویٰ کرتا ہے اور خدا نے اسے یہ طاقت عطا کی ہے کہ وہ خارق العادت امر پیش کرسکے تو وہ وحی کے علاوہ بھی جس طرح کا خارق العادت امر پیش کرنا چاہے کرسکتا ہے کیونکہ خارق العادت ہونے کے لحاظ سے تمام خارق العادت امور کا معاملہ یکساں ہے اور جو حکم ایک خارق العادت امر کا ہے وہی دوسرے خارق العادت امر کا ہوگا کیونکہ ایک جیسی چیزوں (امثال) کے احکام بھی ایک ہی جیسے ہوتے ہیں' لہٰذا اگر خدا ایک خارق العادت امر کہ جسے نبوت اور وحی کہا جاتا ہے کے ذریعے لوگوں کو ہدایت کرنا چاہتا ہے تو پھر اس (خارق العادت امر یعنی نبوت اور وحی) کی تصدیق وتائید اور اسے ثابت کرنے کے لیے کسی دوسرے خارق العادت امر یعنی معجزہ کو پیش کرنا بھی ضروری ہے...... تاکہ لوگ نبی پر ایمان لائیں اور وہ بھی اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں کامیاب ہو' یہ وہ اصل وجہ ہے جس نے انبیاءؑ کی امتوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے نبی سے نبوت کے دعوے کی صداقت کے لیے معجزہ کا مطالبہ کریں ان کا ایسا کرنا ایک فطری امر اور طبعی تقاضا تھا' اور انہوں نے صرف نبوت کی تصدیق اور سالت کے ثبوت کے لیے معجزہ لانے کا مطالبہ کیا نہ کہ ان مطالب وحقائق کے صحیح ہونے کی دلیل کے طور پر کہ جو ان انبیاءؑ کرام نے پیش کئے' کیونکہ وہ مطالب مثلاً توحید ومعاد وغیرہ ایسے پختہ حقائق ہیں جنہیں مضبوط ومستحکم دلائل کے ساتھ ثابت کیا جاسکتا ہے

ور ان کے ثبوت کے لیے کسی معجزہ کی ضرورت ہی نہیں۔

اس مطلب کو ایک مثال دے کر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی قوم کے پاس اس قوم کے سردار کا خط لے کر آئے اور اس خط میں اس سردار کے احکامات ہوں اور وہ شخص دلیل و برہان کے ساتھ یہ دعویٰ کرے کہ یہ احکامات ان کے سردار نے ان کے لیے بھیجے ہیں ان احکامات میں کچھ کرنے کا حکم دیا گیا ہو اور کچھ کام کرنے کی ممانعت کی گئی ہو اور وہ گ اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوں کہ ان کا سردار ان کی بہتری و بھلائی کے سوا کچھ نہیں چاہتا تو ان لوگوں کے لیے ان حکامات کی حقانیت اور لازم و نافذ العمل ہونا قطعی طور پر ثابت ہو جائے گا لیکن ان احکامات میں پائے جانے والے پاکیزہ، ضبوط و مستحکم اور مفید مطالب کی حقانیت اور اس پر قائم کئے جانے والے دلائل اس بات کو ثابت نہیں کرتے کہ جو شخص ان حکامات کو پیش کر رہا ہے وہ واقعتاً ان کے حاکم و سردار کا بھیجا ہوا آدمی ہے اور ان کے حاکم نے اس کے ذریعے اپنے احکامات بھیجے ہیں لہٰذا انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے اپنے سردار کا قاصد اور پیغام بر ہونے کا ثبوت طلب کریں مثلاً سردار کی تحریر کہ یہ میرا قاصد ہے یا اس کے دستخط یا مہر کہ جسے پڑھ کر یا دیکھ کر انہیں یقین حاصل ہو کہ یہ شخص حاکم سردار کا قاصد ہے یا کوئی ی نشانی کہ جسے وہ جانتے اور پہچانتے ہوں ان کے سامنے پیش کرے جس سے اس کے دعویٰ کی صداقت ثابت ہو جائے یسا کہ مشرکین مکہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کیا (ان کے مطالبہ کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہوا:

ورہ ءاسریٰ، آیت ۹۳:

★ "حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ"۔

(ہم آپ کو اس وقت تک نبی تسلیم نہیں کریں گے)۔۔ جب تک آپ ہمارے پاس کوئی کتاب...... لکھی ہوئی ریر...... نہ لائیں کہ جسے ہم خود پڑھیں)۔

بہر حال اب تک جو مطالب ذکر کئے گئے ہیں ان سے چند امور واضح ہو گئے:

(۱)۔ نبوت و رسالت کے دعوے کی صداقت کے لیے معجزہ لانا ضروری ہے، ان دونوں امور (ادعائے سالت اور معجزہ پیش کرنے) میں تلازم پایا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ادعائے رسالت کی صحت معجزہ پیش کرنے پر قوف ہے گویا نبی و رسول کے لیے معجزہ پیش کرنا لازمی امر ہے، اور معجزہ درحقیقت کسی نبی کے اپنے ادعائے نبوت میں سچا نے کا ثبوت ہے جو کہ ہر عام و خاص کے لیے برابر حیثیت رکھتا ہے (عوام و خواص سب کے لیے معجزہ اپنے مقصد کے اثبات کے حوالہ سے یکساں حیثیت کا حامل ہوتا ہے)۔

(۲)۔ رسول و نبی جو "وحی" حاصل کرتے ہیں اور اس کے ذریعے جن امور کا ادراک کرتے ہیں وہ ہمارے اس، عقلوں اور فکر و نظر کی قوتوں سے حاصل ہونے والے امور کی سنخ سے نہیں بلکہ وحی کو "فکر صائب" (پختہ اور درست ئے) کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا ہے، اس مطلب کو قرآن مجید میں اس طرح وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ کم سے کم فہم و شعور رکھنے والا انصاف پسند شخص بھی اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کر سکتا، لیکن اس کے باوجود ہمارے چند

ہمعصر ارباب دانش اس سلسلہ میں انحراف و کجروی کا شکار ہو گئے اور اس بات کے قائل ہوئے کہ تمام الٰہی علوم و معارف او
دینی حقائق کی بنیاد جیسا کہ سائنسی علوم نے بھی ثابت کیا ہے تحول پذیر اور تکامل پسند مادہ پر استوار ہے اور وہی ان سب کی اصل
ہے' چنانچہ انہوں نے تمام انسانی ادراکات کے بارے میں یہ رائے قائم کی کہ وہ سب مادی خواص ہیں کہ جو ''دماغ'' سے
مترشح ہوتے ہیں ......اس سے نکلتے ہیں.....اور تمام حقیقی کمالات و ذاتی فضیلتیں خواہ وہ انفرادی کاوش سے حاصل ہوئی ہو
یا اجتماعی کوششوں سے وہ سب مادی ہیں اور اسی سے وابستہ ہیں (یاد رہے کہ ان حضرات کے اس نظریہ کی بنیاد صرف یہ ہے کہ و
اصالت مادہ کے قائل ہیں اور ان کے تمام علوم اسی اصل پر قائم ہیں اس لیے وہ ہر چیز کا سرچشمہ مادہ ہی کو مانتے ہیں) ا
ارباب دانش نے اپنے نظریات کی روشنی میں نبوت کے بارے میں یوں کہا کہ نبوت درحقیقت ایک قسم کا فکری نبوغ و بلند
اور عالی ذہانت و ذہنی صفا و پاکیزگی ہے کہ جو اس انسان کو حاصل ہوتی ہے جسے ''نبی'' کہا جاتا ہے اور وہ اس کے ذریعے اپ
قوم کو اجتماعی و معاشرتی کمالات تک پہنچانے اور انہیں حیوانوں اور جنگلی جانوروں جیسی زندگی سے نجات دلا کر حقیقی معنوں میں
تہذیب و تمدن کی مقدس وادی میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو گذشتہ نسلوں سے حاصل ہونے وا
نظریات و افکار کو اپنے دور کے تقاضوں اور اپنے معاشرے کے ماحول کے مطابق ڈھالنے کا اقدام کرتا ہے اور پھر اسی بنیاد
لوگوں کے لیے معاشرتی اصول و قوانین اور ایسے ضوابط کی تدوین کرتا ہے جن پر عمل کر کے لوگوں کی زندگی کے تمام امور
اصلاح و بہتری کی راہ ہموار ہو سکے' اس کے بعد اصلاح احوال کی بابت قانون سازی کی تکمیل کے طور پر لوگوں کے
عبادات کے احکام صادر کرتا ہے تاکہ اس ذریعہ سے ان کی روحانی قدروں کا تحفظ کر سکے کیونکہ ان امور کے بغیر
معاشرے کی بہتری ممکن نہیں اور یہی وہ امور ہیں جن کی بدولت معاشرے کی صلاح و اصلاح کا عمل نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا
چنانچہ انہی مفروضوں کی روشنی میں ان ارباب دانش نے نبوت و رسالت اور وحی و ملائکہ وغیرہ کے بارے میں درج ذ
نظریات قائم کر لیے ہیں:

(۱)۔نبی:

نبی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو نہایت مضبوط فکر و نظر کا حامل (نابغہ) ہو اور اپنی قوم کو اجتماعی و معاشرتی اصلاح
دعوت دے۔

(۲)۔''وحی'':

وحی درحقیقت اس (نبی) کی لوح ذہن میں بلند پایہ افکار کے ثبت ہو جانے کا نام ہے۔

(۳)۔''آسمانی کتاب'':

آسمانی کتاب انہی بلند پایہ افکار کے مجموعہ کا نام ہے جو ہر قسم کی نفسانی خواہشات و آرزوؤں اور ذاتی و ش
مفادات سے پاک و بالاتر ہیں۔یعنی اس میں ایسے مطالب پائے جاتے ہیں جو انسان کی روحانی تقویت کا سامان فر
کرتے ہیں اور اسے مادی پستی سے بچاتے ہیں۔

(۴)۔ "ملائکہ"، روح القدس، شیطان:

ملائکہ (فرشتے) کہ نبی جن کا تذکرہ کرتا ہے...... جو اس کے پاس آتے ہیں اور خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں...... درحقیقت وہ طبیعی...... نیچرل...... قوتیں ہیں جو عالم طبیعت کے امور کو چلاتی ہیں، اور یا وہ نفسانی طاقتیں ہیں جو لوگوں کو کمالات سے فیضیاب کرتی ہیں، اور "روح القدس" اسی طبیعی و مادی روح کے ایک بلند مرتبہ کا نام ہے جس سے یہ پاکیزہ افکار...... نبی تک...... پہنچتے ہیں، اور "شیطان" اسی روح کے نہایت پست مرتبہ کا دوسرا نام ہے جو نہایت پست افکار کا سرچشمہ ہے اور لوگوں کو ایسے قبیح افعال کی دعوت دیتا ہے جو معاشرہ کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

اسی طرح ان حضرات نے ان تمام حقائق کی تفسیر و تشریح اپنے مذکورہ بالا من گھڑت نظریات کی روشنی میں کی جن کا تذکرہ انبیاء ؑ نے کیا مثلاً لوح، قلم، عرش، کرسی، حساب و کتاب اور بہشت و دوزخ وغیرہ، چنانچہ انہوں نے ان تمام حقائق کو اپنے خیالی مفروضوں کے آئینہ میں دیکھا اور ان کی تفسیر کی۔

(۵)۔ ادیان و مذاہب:

ادیان و مذاہب ہر زمانہ کے تقاضوں کے تابع ہیں لہٰذا ان تقاضوں کے بدلنے سے ادیان میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے۔

(۶)۔ معجزات:

معجزات کہ جنہیں انبیاء ؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان کی کوئی حیثیت نہیں، یہ سب خرافات ہیں، من گھڑت چیزیں ہیں یا پھر ایسے عام اور نہایت معمولی واقعات ہیں جنہیں توڑ مروڑ کر اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ ان سے دینی مفادات حاصل کئے جائیں اور لوگوں کے عقائد و نظریات کو زمانہ کے تحولات کا شکار ہونے سے بچایا جا سکے یا دینی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دیا جا سکے، یہ اور اس جیسی دوسری من گھڑت باتوں ہی کو "معجزات" کا نام دیا جاتا ہے کہ جنہیں کچھ لوگوں نے پیش کیا اور دوسروں نے ان کی پیروی کر لی۔

یہ تھا ان حضرات کے نظریات کا خلاصہ، پس ان کے نظریات کی روشنی میں نبوت خدائی عہدہ و پیغمبری کی بجائے ایک طرح کا سیاسی کھیل قرار پائے گی۔

بہر حال ان کے بے بنیاد نظریات اور غلط افکار کی بابت تفصیلی گفتگو ہمارے موضوع بحث سے مربوط نہیں لہٰذا اس سلسلہ میں مزید کچھ ذکر کرنے سے اجتناب کیا جاتا ہے، البتہ اس مقام پر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ آسمانی کتابیں اور انبیاء کرام ؑ کے وہ بیانات جو ہم تک پہنچتے ہیں وہ کسی صورت میں مذکورہ نظریات سے مطابقت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان نظریات کو انبیاء ؑ کے ارشادات سے کسی قسم کی کوئی نسبت و ربط ہے یہ دونوں کسی بھی پہلو اور زاویہ نظر سے ایک دوسرے سے ہم رنگ نہیں، درحقیقت ان نظریات کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مادہ اور اس سے مربوط مسائل و مباحث کے علاوہ کچھ نہیں جانتے اور اس کے سوا کسی چیز کو اصل و بنیاد قرار نہیں دیتے جس کے نتیجہ میں ماورائے طبیعت تمام امور کا انکار کرتے ہیں اور معنویات نام کی

کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے اور مادی امور سے بالاتر حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے ہیں بلکہ ان عظیم و بلند پایہ حقائق کو معنویت کی بلندیوں سے مادیت کی پستیوں تک لے آتے ہیں اور ان حقائق کو مادیت کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

البتہ ان حضرات نے جو نظریات پیش کیے وہ درحقیقت ان سے پہلے لوگوں کے پیش کیے ہوئے نظریات کی نئی نویلی صورت اور ترقی یافتہ انداز ہے کیونکہ ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا اور تمام دینی حقائق کو مادی امور کے سانچے میں ڈھال کر ان کی معنوی عظمت کو پامال کر دیا' البتہ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے دانشوروں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ عرش' کرسی' لوح و قلم' ملائکہ وغیرہ سب مادی ہونے کے باوجود ہمارے حواس سے پوشیدہ ہیں اور ہمارے حواس کی قوتیں اور تجربات ان کے ادراک سے قاصر ہیں...... جبکہ موجودہ دانشور کسی ایسی چیز کو جو مادی وجود رکھتی ہو حواس کے دائرہ ادراک سے باہر نہیں سمجھتے...... لیکن جب سائنسی علوم نے ترقی کی اور ہر چیز کو حواس و تجربات کی بنیاد پر دیکھا جانے لگا تو ان دانشوروں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ یہ حقائق ایسے مادی وجود رکھتے ہیں جو حواس کے دائرہ ادراک سے خارج یا اس سے کوسوں دور ہیں' اور انہوں نے ان حقائق کی تفسیر اس طرح سے کی کہ ان کی بازگشت مادی اور حواس کے دائرہ ادراک میں آنے والے وجود کی طرف ہو' انہوں نے یہ اس لیے کیا کہ دینی حقائق ان کے علم و دانش کے مسلمہ امور سے مطابقت حاصل کر لیں اور مکمل سقوط سے بھی بچ جائیں۔

بہر حال یہ دونوں گروہ ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک دین سے بغاوت کا مرتکب ہوا اور دوسرا دین سے عداوت کی راہ اختیار کر گیا' پہلا گروہ کہ جو قدیم زمانہ کے ماہرین علم کلام...... متکلمین...... کے نام سے مشہور ہے انہوں نے دینی حقائق کو نہایت اچھی طرح سمجھا اور تمام حقائق کی اصل و اساس کے ادراک کے باوجود ان حقائق کے تمام مصادیق کو خالص مادی امور قرار دے کر انہیں حواس کے دائرہ ادراک سے خارج قرار دیا اور ان کے بارے میں دیگر مادی امور کی طرح رائے قائم نہ کی' یعنی ان تمام دینی حقائق کو مادی وجود کے حامل قرار دینے کے باوجود اس بات کے قائل ہوئے کہ ہمارے حواس ان کا ادراک نہیں کر سکتے اور انہیں آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا...... جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے' (کیونکہ اگر انہیں مادی وجود کے حامل تسلیم کر لیا جائے تو ان پر مادی چیزوں کے تمام احکام لاگو ہوتے ہیں اور ان احکام و آثار میں سے ایک یہ ہے کہ وہ دکھائی دے سکیں' جبکہ ان کے بقول وہ دکھائی نہیں دے سکتے تو یہ دونوں باتیں کیونکر درست قرار دی جا سکتی ہیں' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا نظریہ تضاد کا حامل ہے) اور دوسرا گروہ یعنی عصر حاضر کے دانشور' تو انہوں نے دینی حقائق کی اس طرح سے تفسیر و تشریح کی کہ انہیں ان کے نہایت واضح و آشکار مقاصد سے دور کر کے ایسے مادی حقائق پر منطبق کر دیا کہ حواس ان کا ادراک کر سکیں اور تجربات بھی ان کی تصدیق کریں' جبکہ حقیقت امر ہرگز اس طرح نہیں یعنی ان حقائق سے مراد وہ کچھ نہیں جو ان دانشوروں نے سمجھا اور نہ ہی ان حقائق سے مربوط اصل بیانات والفاظ ان لوگوں کے پیش کردہ مطالب سے ہم آہنگ ہیں۔

بہر حال اگر اس موضوع کی بابت صحیح انداز میں بحث اور غور و فکر کی جائے تو اس کے لیے سب سے پہلے ان حقائق

سے مربوط بیانات اور الفاظ وعبارات سے وہ معانی مراد لیے جائیں جو عرف عام اور لغت نے مراد لیے ہیں یعنی جو کچھ عرف عام اور لغت والوں نے ان الفاظ کے معنے کئے ہیں ہم بھی وہی کریں اس کے بعد ان کے مصداق کے لیے ان الفاظ و بیانات کا سہارا لیں کیونکہ دینی بیانات وعبارات میں ایک دوسرے کی تفسیر وتشریح پائی جاتی ہے یعنی ان میں سے بعض دوسرے بعض کی تفسیر کرتے ہیں پھر اس کے بعد ان معانی کو علمی نظریات کی کسوٹی پر پرکھیں کہ آیا علمی نقطہ ہائے نظر ان معانی ومصادیق کی نفی تو نہیں کرتے یا انہیں غلط تو قرار نہیں دیتے؟ اگر اس اثناء میں مادہ اور اس کے آثار واحکام سے پاک کوئی چیز ثابت ہوگئی تو پھر ان مصادیق کے اثبات یا نفی کا راستہ بھی معلوم ومعین ہوجائے گا اور وہ راستہ ایسا ہوگا جو اس بحث کو نیا رنگ عطا کرے گا اور پھر یہ بحث علوم طبیعت وسائنس کی بحثوں سے خارج ہوجائے گی کیونکہ ان علوم میں صرف اشیاء کی مادی حقیقتوں اور ان کی خصوصیات سے بحث کی جاتی ہے لہٰذا وہ حقائق جو مادہ اور عالم طبیعت سے تعلق نہیں رکھتے ان سے ان علوم کا کوئی ربط باقی نہ رہے گا اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ جو علم صرف مادہ اور اس کے خواص وخصوصیات کے بارے میں بحث کرنے سے مختص ہو اس میں غیر مادی امور کی بابت اثبات ونفی کی بحث ہی درست نہیں اور اگر کوئی دانشور ایسا کر بھی لے اور علوم طبیعت میں مہارت رکھنے کی وجہ سے غیر مادی امور کے اثبات یا نفی کی بحث میں پڑ جائے تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہوگی اور اس کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ بے بنیاد نظریات کے سوا کچھ نہ ہوگا اور اس کا حال اس طرح ہوگا جیسے کوئی ادیب اور علم لغت کا ماہر اپنے علم کے سہارے فلکیات کے بارے میں اثبات یا نفی کا نظریہ قائم کرے تو ظاہر ہے کہ ایسا کرنا چونکہ اس کے علم سے مربوط نہیں لہٰذا اس کے نقطۂ نظر ونظریہ کی کوئی اہمیت نہ ہوگی کیونکہ اسے اس سلسلہ میں نظریہ قائم کرنے کا حق ہی حاصل نہیں (بلکہ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ مربوطہ علم کے ماہرین کی طرف رجوع کرے)۔

اس بحث کے سلسلہ میں مذکورہ مطالب پر اکتفاء کی جاتی ہے اور اب ہم دیگر آیات کی بابت سلسلۂ بیان شروع کرتے ہیں:

جہنم کا ایندھن: انسان اور پتھر!

○ "فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ..."

(پس ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں......)

اگرچہ اس سورہ مبارکہ کی ابتدائی آیات لوگوں کے تین گروہوں یعنی متقین، کافرین ومنافقین کے تذکرہ پر مشتمل تھیں لیکن خداوند عالم نے جب "یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ" (اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو) کا عام اعلان کیا اور سب کو اپنی پرستش کی دعوت دی تو اس کے نتیجہ میں لوگ دو حصوں میں تقسیم ہوگئے ایک مومن یعنی خدا کی دعوت حق کو قبول کرنے والے اور دوسرے غیر مومن یعنی وہ کہ جنہوں نے اسے قبول نہ کیا، کیونکہ ان دو قسموں کے علاوہ تیسری قسم ممکن ہی نہیں یعنی یا وہ اس دعوت حق کو قبول کرتے ہیں یا قبول نہیں کرتے لہٰذا یا وہ مومن......(ایمان لانے والے)......ہیں یا کافر

ہیں......انکار کرنے والے ہیں......،اب رہی "منافق" کی بات تو اس کا معاملہ ظاہر و باطن کا ہے اور کسی کو منافق تب کہا جاتا ہے جب اس کا ظاہر و باطن ایک جیسا نہ ہو اور زبان و دل میں ہم آہنگی نہ پائی جائے' بنابراین اس دعوت حق کی بابت لوگ تین قسم کے ہوں گے:

(۱)۔ جو زبان و دل دونوں سے ایمان لائے (مومن)

(۲)۔ جو زبان و دل دونوں سے منکر ہوئے (کافر)

(۳)۔ جنہوں نے زبان سے اقرار اور دل سے انکار کیا (منافق)

گویا دعوت حق کی بابت دو صورتیں ہی بنیادی ہیں: اقرار اور انکار' شاید یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیت اور اس کے بعد والی آیت میں لوگوں کے دو گروہ ذکر کئے گئے ہیں: مومن اور کافر' مگر منافقین کا ذکر نہیں ہوا' اور "متقین" کی بجائے "مومنین" کہا گیا　تا کہ تیسری قسم کا ضمنی بیان ہو جائے۔

وقود (ایندھن)

آیت میں لفظ "وقود" ذکر کیا گیا ہے جس کا لفظی معنی وہ چیز ہے جس سے آگ روشن کی جائے' اس آیت میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ دوزخ کی آگ کا ایندھن "انسان" ہی ہے' پس انسان ایندھن بھی ہے اور اس سے روشن کی ہوئی آگ میں جلنے والا بھی ہے چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہء مومن، آیت ۷۲:

★ "۔۔ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ"

(پھر وہ آگ میں جلائے جائیں گے)۔

سورہء الھمزۃ، آیت ۷:

★ "۔۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝ ۔۔" ۔

(وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر چھا جائے گی)۔

پس انسان اپنی ہی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلنے کے عذاب سے دوچار ہوگا' اسی کے مانند اہل بہشت کے بارے میں بھی خدا کا ارشاد ہے:

سورہء بقرہ، آیت ۲۵:

★ " كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا" ۔

(جب بھی انہیں بہشت سے کوئی پھل کھانے کے لیے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا' درحقیقت اس جیسا ہی انہیں دیا گیا تھا)۔

یہ تمام جملے اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ آخرت میں انسان کو وہی کچھ ملے گا جو وہ اس دنیا میں اپنے لیے مہیا کرے..... تا کہ آخرت میں اس سے استفادہ کر سکے..... چنانچہ اس سلسلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

★ "کما تعیشون تموتون و کما تموتون تبعثون"۔

(جس طرح کی زندگی بسر کرو گے اسی طرح اس دنیا سے جاؤ گے' اور جس طرح اس دنیا سے جاؤ گے اسی طرح پر اٹھائے جاؤ گے)۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اہل بہشت اور اہل جہنم کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ بہشت والے جو کچھ خود اس دنیا میں رہ کر اکٹھا کریں گے اس کے علاوہ خداوند عالم کی طرف سے بھی انہیں بہت کچھ عطا کیا جائے گا' اس سلسلہ میں ارشاد خداوندی ہے:

سورہ ق، آیت ۳۵:

★ "...لَهُمْ مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ"۔

(وہ جو کچھ چاہیں گے انہیں ملے گا' اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ موجود ہے)

حجارہ (پتھر):

زیر بحث آیت میں لفظ "حجارۃ" استعمال کیا گیا ہے جس کا معنی "پتھر" ہے (وقودھا الناس والحجارۃ) اس سے مراد وہی بت ہیں جن کی لوگ عبادت کیا کرتے تھے' چنانچہ اسی کی بابت ایک اور مقام پر یوں ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورہ انبیاء، آیت ۹۸:

★ "اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ"۔

(تم اور وہ کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو (جنہیں معبود سمجھتے ہو) وہ سب جہنم کا ایندھن ہے)

یاد رہے کہ کلمہ "حصب" بھی وقود یعنی ایندھن کے معنی میں آتا ہے۔

بہشت میں پاکیزہ بیویاں

O "لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ"

(ان کے لیے بہشت میں پاکیزہ ازواج ہیں)

اس جملے میں کلمہ "ازواج" کے ساتھ "مطہرہ" اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں طہارت سے مراد گندگی' پلیدی اور

ان برائیوں کی تمام قسموں سے پاک ہونا ہے جو انس ومحبت اور الفت کی تکمیل کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں وہ گندگیاں اور برائیاں خواہ (ظاہری و) تخلیقی ہوں یا (باطنی و) اخلاقی ہوں۔

روایات پر ایک نظر

شیخ صدوق ؒ نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت (لَهُمْ فِيهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ) کا معنی پوچھا گیا تو آپ ؑ نے ارشاد فرمایا کہ "ازواج مطہرہ"...... پاکیزہ بیویوں...... سے مراد وہ (حوریں) ہیں جنہیں نہ حیض آتا ہے اور نہ ہی وہ ناپاک ہوتی ہیں (نہ ہی ان سے حدث سرزد ہوتا ہے)

بعض روایات میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے طہارت سے اس کا وسیع معنی مراد ہے یعنی تمام عیوب اور برائیوں سے پاک و منزہ ہونا۔

آیات ۲۶و ۲۷

○ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ﴿۲۶﴾

○ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

ترجمہ

○ خداوند عالم کو اس بات میں کوئی باک نہیں ہے کہ وہ مچھر اور اس سے بڑی چیز کی مثال دے پس جو لوگ مومن ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا اس طرح کی مثال دے کر کیا چاہتا ہے وہ تو گمراہ کرتا ہے اس مثال کے ذریعے بہت سے لوگوں کو اور ہدایت کرتا ہے اس مثال کے ذریعے بہت سے لوگوں کی' جبکہ وہ کسی کو اس کے ذریعے گمراہ نہیں کرتا سوائے فاسقین (بدکار لوگوں) کے!۔ (۲۶)

○ جو لوگ نہایت پختگی کے ساتھ کیئے گئے عہد الٰہی کو توڑ دیتے ہیں اور کاٹ دیتے ہیں اس چیز کو جس کے بارے میں خدا نے ملا کر رکھنے کا حکم دیا ہے' اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہ بہت سخت نقصان میں ہیں۔ (۲۷)

تفسیر و بیان

تمثیل کا خدائی انداز

(اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً...)

(خدا کو اس میں کوئی باک نہیں کہ مچھر سے مثال دے۔۔۔)

اس آیت میں لفظ "بعوضۃ" استعمال کیا گیا ہے جس کا معنی مچھر ہے اور وہ آنکھ سے دکھائی دیئے جانے وا۔۔ حیوانوں میں سب سے چھوٹا حیوان ہے۔

یہ اور اس کے بعد والی آیت، سورہ رعد کی آیات ۱۹۔۲۰۔۲۱ کی مانند ہیں جن میں یوں کہا گیا ہے:

★ "اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ"

(آیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے ا۔ شخص جیسا ہے جو نابینا ہے؟ اس بات کو صاحبان عقل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہی ہیں جو خدا کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو پ۔ کرتے ہیں اور اسے ہرگز نہیں توڑتے۔ اور وہی ہیں جو اس چیز کو ملا کر رکھتے ہیں جس کا خدا نے حکم دیا ہے کہ اسے ملا کر ر۔ جائے)

زیر بحث آیت مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ضلالت و گمراہی اور اندھا پن کہ جو انسان کے بر۔ اعمال کے نتیجہ میں...... عذاب کے طور پر...... اسے حاصل ہوتا ہے وہ اس گمراہی اور اندھے پن کے علاوہ ہے جو اس کے ا۔ ان برے اعمال کے ارتکاب سے پہلے موجود تھا اور اس کے نفس میں پایا جاتا تھا اور وہ خود اس کا سبب تھا چنانچہ اسی مطلب بیان کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

★ "مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ"۔

(خدا اس کے ذریعے کسی کو گمراہ نہیں کرتا سوائے فاسق لوگوں کے!)

اس جملے میں خدا نے اپنی طرف سے گمراہ کرنے کو "فسق" کے بعد اور اسکے نتیجے کے طور پر ذکر کیا ہے نہ ک۔

سے پہلے اس سے معلوم ہوا کہ گمراہی اور اندھا پن دو طرح کا ہے ایک فسق سے پہلے اور دوسرا فسق کے بعد جو فسق سے پہلے ہے اس کے سبب انسان گناہ و معصیت کا ارتکاب کرتا ہے اور جو فسق اور گناہ کے ارتکاب کے بعد ہے وہ خدا کی طرف سے ہے جو کہ اس معصیت کے عذاب کے طور پر ہے۔

اب رہی رہنمائی (ہدایت) اور گمراہ کرنا تو یہ دو لفظ ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں اور دونوں اپنی تمام اقسام کے جامع ہیں یعنی ہدایت سے مراد ہدایت کی تمام قسمیں اور اضلال و گمراہ کرنے سے مراد بھی اس کی تمام قسمیں ہیں ہدایت میں کرامت و بزرگی کی اور اضلال و گمراہ کرنے میں خزلان و رسوائی کی تمام قسمیں شامل ہیں کرامت و اقبال مندی اپنی تمام قسموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نیک و خوش قسمت افراد کو حاصل ہوتی ہے اور خزلان و رسوائی اپنی تمام قسموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برے اور بد بخت لوگوں کو ملتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام میں دونوں قسموں کے لوگوں کا ذکر فرمایا ہے نیک و خوش نصیب افراد کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا: کہ وہ انہیں پاک و پاکیزہ زندگی عطا کرتا ہے اور انہیں روح ایمان سے نوازتا ہے اور انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے اور ان کے لیے ایسا نور اور روشنی قرار دیتا ہے جس کے ذریعے وہ راستہ چلتے ہیں اور خدا ان کا ولی و سرپرست ہے اس لیے انہیں کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی وہ حزن و ملال کا شکار ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ ان کے ساتھ ہے وہ جب بھی اسے پکاریں وہ ان کی دعا مستجاب کرتا ہے اور جب وہ اسے یاد کرتے ہیں تو وہ بھی انہیں یاد کرتا ہے اور فرشتے ان پر سلامتی اور خوشیوں کا پیغام لے کر نازل ہوتے ہیں۔۔۔ اور اس طرح کی دیگر کرامتیں عزتیں اور شرف و اعزازات!۔

اور جو لوگ شقی و بد بخت ہیں ان کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا: کہ وہ انہیں خزلان و رسوائی سے دوچار کرتے ہوئے ضلالت و گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور انہیں روشنی سے دور کر کے اندھیروں میں ڈال دیتا ہے ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے اور ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ ڈالتا ہے ان کے چہرے ان کی پشت کی طرف پھیر دیتا ہے اور ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیتا ہے جس سے وہ ادھر ادھر نہیں دیکھ سکتے اور ان کے سامنے اور پیچھے کی جانب ایسے بند باندھ دیتا ہے کہ وہ کچھ دیکھ ہی نہیں پاتے اور شیطانوں کو ان کا ساتھی بنا دیتا ہے تاکہ وہ انہیں گمراہ کرتے رہیں وہ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہی ہدایت یافتہ ہیں جبکہ شیاطین ان کے غلط اور ناپاک اعمال کو اچھا بنا کر ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور شیاطین ہی ان کے سرپرست قرار پاتے ہیں اور خدا ایسے لوگوں کو دنیا کی لذتوں میں سرمست کر کے اس طرح ذلیل کر دیتا ہے کہ وہ سمجھ ہی نہیں پاتے اور اپنی اصلاح کا راستہ ہی نہیں ڈھونڈ پاتے اس طرح خدا انہیں اس دنیا میں مہلت دیتا ہے کیونکہ خدا کی گرفت سخت ہے خدا ان کے ساتھ مخصوص انداز میں برتاؤ کرتا ہے اور انہیں طغیان و سرکشی میں مصروف کر دیتا ہے تاکہ وہ اسی میں سرگرداں رہیں۔

یہ ہیں وہ مطالب جو خداوند عالم نے قرآن مجید میں ان دونوں گروہوں یعنی خوش قسمت افراد اور بد قسمت لوگوں کے بارے میں ذکر فرمائے ان مطالب سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اس دنیاوی زندگی کے علاوہ ایک اور زندگی بھی

ہے جس میں یا تو سعادت وخوش بختی ہے یا شقاوت وبدبختی' اور وہ زندگی جن بنیادوں پر استوار ہے وہی انسان کے لیے اصول حیات کی حیثیت رکھتی ہیں کہ ان کے سہارے انسان زندگی بسر کرے گا اور بہت ہی جلد اپنی اس زندگی سے آ گاہی حاصل کر لے گا اور یہ آ گاہی اسے اس وقت حاصل ہوگی جب تمام اسباب ختم ہو جائیں گے اور ہر طرح کا پردہ ہٹ جائے گا۔

خداوند عالم کے مقدس کلام سے انسان کے لیے اس دنیاوی زندگی سے پہلے بھی ایک زندگی کا ثبوت ملتا ہے کہ جو اس کی بعد والی زندگی کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے اور وہ اس میں اسی طرح اپنی دنیاوی زندگی کی جڑیں مضبوط کرتا ہے جس طرح دنیاوی زندگی میں اخروی زندگی کا ابدی ٹھکانہ تعمیر کرنے میں مصروف ہوتا ہے گویا انسان اس دنیاوی زندگی سے پہلے بھی ایک زندگی رکھتا تھا اور اس دنیاوی زندگی کے بعد بھی ایک زندگی پائے گا اور وہ تیسری زندگی اس کی دوسری زندگی کے عین مطابق اور اسی کی تصویر ہوگی جبکہ دوسری زندگی پہلی زندگی جیسی' یعنی انسان اس دنیا میں دو زندگیوں کے درمیان واقع ہے: ایک وہ زندگی جو اس دنیاوی زندگی سے پہلے تھی اور ایک وہ زندگی جو اس دنیاوی زندگی کے بعد میں آئے گی۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو تین زندگیاں عطا کی گئی ہیں:

(۱)۔اس دنیا میں آنے سے پہلے !

(۲)۔اس دنیا میں !

(۳)۔اس دنیا کے بعد !

ان تینوں کا آپس میں ایسا ربط ہے کہ دوسری زندگی پہلی زندگی سے ہم آہنگ اور تیسری زندگی دوسری زندگی سے ہمرنگ ہے' یہی وہ مطلب ہے جو قرآن مجید کے ظاہری الفاظ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے' لیکن اکثر مفسرین کرام نے آیات کی تفسیر اس سے مختلف انداز میں کی ہے چنانچہ انہوں نے اس دنیا سے پہلی کی زندگی کے بیان پر مشتمل آیات کی تفسیر میں یوں کہا کہ اس سے مراد زبان حال اور استعداد وصلاحیتوں کا اقتضاء (یا ان کا وجود میں آنا) ہے اور جو آیات اس دنیا کے بعد والی زندگی کو بیان کرتی ہیں انہیں "ایک طرح کے مجاز" اور استعارہ پر محمول کیا ہے' جبکہ ان مفسرین کے نظریات، متعدد آیات کے ظاہری الفاظ کی رو سے غلط قرار پاتے ہیں' اس کی تفصیل یہ ہے:

وہ آیات جو اس دنیا سے پہلے کی زندگی کے بیان پر مشتمل اور اس کا اثبات کرتی ہیں وہ عالم ذر و میثاق سے تعلق رکھتی ہیں' ان کے بارے میں واضح اور مفصل بیان ان آیات کی تفسیر میں آئے گا (اور وہاں اس امر کو ثابت کیا جائے گا کہ خدا نے انسان کو اس دنیا میں ظاہری وجود عطا کرنے سے پہلے اس سے کچھ عہد و پیمان لیے اور اس وقت اسے ایک طرح کی زندگی حاصل تھی)۔

دوسری وہ کثیر آیات کہ جن میں اس دنیا کے بعد والی زندگی کا ذکر ہوا ہے اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ قیامت کے دن جزاء وسزا کا معیار و دارومدار اسی دنیا کے اعمال پر ہے بلکہ وہی اعمال ہی جزاء وسزا کی شکل میں سامنے آئیں گے' چنانچہ اس

سلسلہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ تحریم، آیت ۷:

★ "لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ"

(تم آج عذر خواہی نہ کرو تمہیں وہی جزاء دی جائے گی جو تم عمل کرتے تھے)۔

سورہ بقرہ، آیت ۲۸۱:

★ "ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ..."،

(پھر ہر شخص کو پورے طور پر وہی کچھ دیا جائے گا جو اس نے انجام دیا)۔

سورہ بقرہ، آیت ۲۴:

★ "فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ---"۔

(پس تم ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں)۔

سورہ علق، آیات ۱۷، ۱۸:

★ "فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ"۔

(پس وہ اپنوں کو پکارے، ہم بھی جہنم کے داروغوں کو بلا لیں گے)

سورہ آل عمران، آیت ۳۰:

★ "يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوءٍ"

(وہ دن کہ جب ہر شخص اپنے کئے کو اپنے سامنے پائے گا خواہ وہ اچھا عمل ہو یا برا عمل)۔

سورہ بقرہ، آیت ۱۷۴:

★ "مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ"۔

(وہ لوگ انگاروں ہی سے اپنے پیٹ بھرتے ہیں)۔

سورہ نساء، آیت ۱۰:

★ "إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا"۔

(یتیم کا مال کھانے والے اپنے پیٹ میں آگ ہی آگ بھرتے ہیں)۔

مذکورہ بالا کے علاوہ دیگر کئی آیات میں اسی امر کو بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ان کے اعمال کے مطابق انہیں جزاء و سزا ملے گی تاہم اس سلسلہ میں اگر قرآن مجید میں سورہ ق کی آیت ۲۲ (لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ): (تو اس کے بارے میں غفلت میں تھا پس ہم نے تیری نگاہ بصیرت سے پردے ہٹا دیئے تو آج تیری نگاہ تیز ہے) کے علاوہ کوئی دوسری آیت نہ بھی ہوتی تو وہی آیت ہمارے مطلوب کے اثبات

کے لیے کافی تھی کیونکہ ''غفلت'' کا لفظ اسی مقام پر استعمال ہوتا ہے جہاں انسان اپنے سامنے موجود چیز سے بے خبر ہو (لہٰذ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آخرت کی زندگی دنیا میں بھی ہے البتہ ہمارے اور اس کے درمیان ایک پردہ حائل ہے) یہی وجہ ہے کہ آیت میں ''کشف الغطائ'' یعنی پردہ اٹھنے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ لفظ اسی مقام پر استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی چیز پردے کے پیچھے موجود ہو لیکن پردے کی وجہ سے اسے دیکھا نہ جا سکتا ہو لہٰذا جو کچھ قیامت کے دن موجود ہے اور انسان اس دن اس کا مشاہدہ کرے گا اگر وہ اس سے پہلے موجود نہ ہو تو یہ بات صحیح نہ ہو گی کہ اس دن انسان سے کہا جائے کہ تو اس چیز سے غافل تھا اور یہ تجھ سے مستور و پوشیدہ تھی اور اب ہم نے اس پردے کو ہٹا دیا ہے جو اس کے اور تیرے درمیان حائل تھا لہٰذا اب وہ تیرے سامنے ظاہر و آشکار ہو گئی ہے اور اب اس کی بابت ''غفلت'' باقی نہیں رہی۔

اس مقام پر میں اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے آپ سے (اپنے اندر اور اپنے باطن و ضمیر میں) انہ حقائق کی بابت ایسی رہنمائی طلب کریں جس سے آپ حقیقت امر سے آگاہ ہو جائیں اور کسی قسم کے مجاز کا سہارا بھی نہ لیں پڑے تو یقیناً آپ کا باطن ان بیانات و اوصاف کے علاوہ جو قرآن مجید نے پیش کئے ہیں کچھ اور نہیں بتا سکے گا۔

خلاصہء کلام یہ کہ قیامت اور آخرت کی زندگی کو خداوند عالم کے مقدس کلام میں دو طرح سے بیان کیا گیا ہے:

(۱)۔ جزاء و سزا کے بیان کی صورت میں !

(۲)۔ اعمال کے تجسم کی صورت میں !

پہلی صورت یعنی جزاء و سزا کے بیان کی بابت اس طرح ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کے مطابق ثواب و عقاب ہ گا اس سلسلہ میں متعدد آیات یہ بیان کرتی ہیں کہ انسان قیامت کے دن جو خیر اور شر مثلاً بہشت یا دوزخ پائے گا وہ اس کے ان اعمال کا نتیجہ ہو گا جو اس نے اس دنیا میں انجام دیئے۔

دوسری صورت یعنی تجسم اعمال کی بابت بھی متعدد آیات موجود ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ اعمال ہی سے یا ان کے لوازم و آثار سے تقدیر سازی ہوتی ہے اور انہی کے ذریعے مطلوب...... و پسندیدہ...... اور نا مطلوب...... و ناپسندیدہ امور یعنی خیر اور شر انسان کا مقدر بنتے ہیں اور انسان بہت جلد ان امور کا مشاہدہ کرے گا یعنی جب رازوں کے فاش ہونے دن آجائے گا تو پھر انسان اپنے اعمال کے نتیجے میں بننے والی اپنی تقدیر سے آگاہ ہو جائے گا۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں کسی قسم کی کوئی تنافی و تضاد بھی نہیں پایا جاتا اور آپ ان کے درمیان کسی قسم کی رنگی و اختلاف کا گمان ہرگز دل میں نہ لائیں کیونکہ پہلے بیان میں بہشت اور دوزخ کے موجود ہونے کو تسلیم کرتے ہو۔ انہیں انسان کے اعمال کی جزاء و سزا کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے بیان میں بہشت اور دوزخ کے وجود کو انسان کے اعمال سے وابستہ کر کے ذکر کیا گیا جس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں بیانات میں تضاد و تنافی پائی جاتی ہے جبکہ ا ہرگز نہیں بلکہ دونوں بیانات اپنے اپنے طور پر درست ہیں کیونکہ حقائق کے سمجھانے اور انہیں اچھی طرح واضح کرنے کے لیے مثالوں کے ذریعے مطالب پیش کئے جاتے ہیں اور قرآن مجید نے (ہمیشہ یا اکثر مقامات میں) اسی طریقہ اور اسلو

سخن کو اختیار کیا ہے۔

فاسقین کا استثناء

O " اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ "

" فسق" کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ان الفاظ میں سے ایک ہے جنہیں موجودہ مشہور و معروف معنے میں قرآن ہی نے استعمال کیا ہے' یعنی جس معنی میں قرآن مجید نے لفظ "فسق" کو استعمال کیا ہے اس سے پہلے اس معنی میں استعمال نہیں کیا گیا تھا (یہ معنی قرآن ہی کی ایجاد و ابداع ہے) قرآن مجید نے اسے اس کے اصلی معنی کی مناسبت سے ایک نئے معنی میں استعمال کیا' "فسق" کا لفظ "چھلکے سے باہر آنے" کے معنے میں آتا ہے' کہا جاتا ہے: فسقت التمر ۃ یعنی کھجور چھلکے سے باہر آ گئی (اس کا چھلکا اتر گیا) اسی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن مجید میں فاسقین کی پہچان اس طرح کروائی گئی ہے:

★ " اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ —"

(وہ کہ جو خدا کے عہد و پیمان کو اس کے پختہ ہونے کے بعد توڑ دیتے ہیں)

اس آیت میں نقض یعنی توڑنے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ لفظ (توڑنا) تب ہی درست ثابت ہوسکتا ہے جب پہلے پختہ طور پر باندھا گیا ہو لہٰذا عہد و پیمان کا توڑنا ایک طرح چھلکے سے باہر آنا ہے۔ اور پھر آیت کے آخر میں "فاسقین" کو "خاسرین" ...... نقصان پانے والے کہا گیا ہے ظاہر ہے کہ خسران اور گھاٹا اسی چیز میں قابل تصور ہے جو کسی حوالہ سے انسان کی ملکیت میں ہو۔ خاسرین یعنی گھاٹے والوں کے بارے میں خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا:

سورہ شوریٰ، آیت ۴۵:

★ " اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ —"،

(خسران اور گھاٹا اٹھانے والے وہ ہیں جنہوں نے قیامت کے دن خود اور اپنے اہل و عیال کو خسارے میں ڈالا)۔

آپ ہرگز یہ نہ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک و خوش نصیب بندوں کی تعریف میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں کہ وہ "مقربین' مخلصین' مجتبین' صالحین" مطہرین" ہیں، یا اپنے نافرمان' بدبخت و شقی لوگوں کے بارے میں کہا کہ وہ ظالمین' فاسقین' خاسرین' غاوین ...... بھٹکے ہوئے ...... ضالین ...... گمراہ ...... ہیں تو یہ کوئی لفاظی ہے یا خیالی باتیں ہیں' کیونکہ اگر آپ ایسا سوچیں گے تو کلام الٰہی کے سمجھنے میں صحیح طرز تفکر سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور پھر سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے' جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا کے کلام کو عام لوگوں کی عامیانہ باتوں جیسا قرار دے کر بازاری لوگوں کے بے قدر و قیمت الفاظ کی مانند سمجھنے لگیں گے' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نیک یا برے لوگوں کے بارے میں جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہ ان کی روحانی قدروں اور باطنی اوصاف و مراتب کی عکاسی کرتے ہیں اور اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ وہ سعادت یا شقاوت کے راستوں پر کیونکر گامزن ہیں اور ان مراتب میں سے ہر ایک مرتبہ مخصوص آثار کا حامل اور معین احکام و خصوصیات کا سرچشمہ ہے' اور یہ

اسی طرح پر ہیں جیسے عمر، بدن میں موجود قوتوں کی خصوصیات اور انسان کی تخلیقی صلاحیتیں مخصوص احکام و آثار کا سرچشمہ ہوتی ہیں کہ وہ آثار و احکام ہمیں اس مخصوص سن کے علاوہ کبھی حاصل نہیں ہوسکتے۔ یہ وہ حقائق ہیں کہ اگر آپ کلام الٰہی میں غور وفکر اور تدبر کریں تو یہ سب کھل کر آپ کے سامنے آجائیں گے اور پھر آپ ہمارے ادعاء کی صحت وصداقت سے آگاہی حاصل کرلیں گے۔

جبر اور تفویض کی بحث

مذکورہ بالا آیت (۲۶) میں ارشاد حق تعالیٰ ہوا: "وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ" (کہ خدا اس کے ذریعے کسی کو گمراہ نہیں کرتا سوائے فاسقین کے!)، اس جملے میں اضلال یعنی گمراہ کرنے کا ذکر ہوا ہے جس سے خداوند عالم کی طرف سے بندوں کے اعمال میں مداخلت کا ثبوت ملتا ہے اور اس امر کا اشارہ بھی ہے کہ خدا کی اپنے بندوں کے اعمال میں مداخلت کے نتائج کیا ہوسکتے ہیں! اس سلسلہ میں حقیقت حال کی وضاحت اسی جبر وتفویض کی بحث میں ہوگی۔

اس سلسلے میں تفصیلی بیان یہ ہے کہ: خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ ءبقرہ، آیت ۲۸۴:

★ "لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ"

(خدا ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے)۔

سورہ ءحدید، آیت ۵:

★ "لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

(اسی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی ملکیت)

سورہ ءتغابن، آیت ۱:

★ "لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ"

(اسی کے لیے ہے ملکیت واقتدار اور اسی کے لیے ہے حمد وثنا)

ان آیات اور ان جیسی دیگر متعدد آیات میں خداوند عالم نے اپنے آپ کو پوری کائنات کا مالک ہونے اور عالم ہستی کی تمام موجودات پر اپنے مکمل مالکانہ اختیار کو ثابت کیا ہے یعنی وہ ہر چیز کا مالک علی الاطلاق ہے، ہر لحاظ سے مالک ہے ایسا نہیں کہ کچھ پہلوؤں سے ان کا مالک ہوا اور کچھ سے نہ ہو مثلاً انسان کسی بندے یا کسی چیز کا مالک ہوتا ہے تو اسے اس چیز

میں علی الاطلاق ملکیت اور مالکانہ اختیار حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کی ملکیت کا دائرہ محدود ہے اور صرف انہی امور میں اسے مالکانہ اختیار حاصل ہوتا ہے جن میں عقلاء اس کے تصرف کو صحیح سمجھتے ہیں لہٰذا وہ اپنی مملوکہ چیز میں نامعقول تصرف نہیں کر سکتا (مثلاً یہ کہ اپنے غلام کو کسی جرم کے بغیر قتل کر دے یا اپنے مال کو جلا دے وغیرہ وغیرہ کیونکہ اس طرح کے تصرفات عقلی طور پر بھی اس کے لیے روا نہیں ہیں) جبکہ خداوند عالم پوری کائنات کا ہر جہت میں علی الاطلاق مالک ہے اور پوری کائنات ہر لحاظ سے اس کی مملوک ہے جبکہ ہم انسان جب کسی چیز کے مالک بنتے ہیں تو ہماری ملکیت کامل نہیں بلکہ ناقص ہوتی ہے اور ہم اس چیز میں بعض حوالوں سے تصرف کر سکتے ہیں اور بعض سے نہیں، اس کی مثال یوں ہے کہ جو شخص گدھے کا مالک ہے اس کے لیے اتنا ہی روا ہے کہ وہ اس پر کوئی چیز لاد دے یا اس پر سوار ہو لیکن اس کے لیے یہ ہرگز روا نہیں کہ وہ اسے بھوکا پیاسا قتل کر دے یا اسے آگ میں جلا دے کیونکہ کوئی عقلمند اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

بہر حال انسانی معاشرے میں پائی جانی والی ملکیتیں سب کی سب ناقص و ناکمل ہیں کیونکہ ان ملکیتوں کے ذریعے تمام تصرفات کا حق حاصل نہیں ہوتا بلکہ چند امور میں اختیار حاصل ہوتا ہے جبکہ خداوند عالم کی ملکیت ایسی نہیں، وہ ہر چیز کا علی الاطلاق مالک ہے اور ہر جہت میں اسے ان پر اختیار حاصل ہے کیونکہ کائنات میں موجود (تمام اشیاء کا رب و پروردگار خدا کے سوا کوئی نہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اپنے لیے نفع و نقصان، موت و حیات اور حشر و نشر کا خود سے کوئی اختیار رکھتی ہو، لہٰذا یہ بات ثابت ہوئی کہ کائنات کے بارے میں جو تصرف و اختیار بھی قابل تصور ہے وہ صرف خدا کو حاصل ہے اور وہی ہے جو تمام موجودات میں ہر طرح سے تصرف کر سکتا ہے لہٰذا وہ اپنے بندوں کے بارے میں کسی قسم کا تصرف کرنا چاہے تو اس پر کسی طرح کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور کوئی اس کے کسی قسم کے تصرف میں اس پر انگشت نمائی ولب کشائی کر سکتا ہے اور نہ اسے مورد الزام ٹھہرا سکتا ہے کیونکہ صرف اسی تصرف پر اعتراض ہو سکتا ہے جو تصرف کرنے والے کی ملکیت و اختیار میں نہ ہو اور عقلاء اسے اس تصرف کا مجاز نہ سمجھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ عقلاء مخلوق میں سے ہر ایک کو محدود تصرفات کا مجاز سمجھتے ہیں اور انہی امور کا اختیار اسے دیتے ہیں جو عقل کے نزدیک درست ہوں جبکہ خداوند عالم کو اپنی تمام مملوکہ اشیاء میں ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے کیونکہ وہ ان کا کامل اور ہر جہت میں مالک ہے اور چونکہ تمام موجودات پر اس کی ملکیت حقیقی ہے اور کائنات کی ہر چیز حقیقی معنے میں اس کی مملوک ہے لہٰذا اس کا ان تمام چیزوں میں تصرف کرنا ہر لحاظ سے جائز و روا اور بجا ہے، اسے کوئی کسی لحاظ سے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا اور نہ ہی کسی طرح سے اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے، وہ خود محاسبہ کرنے والا اور پوچھ گچھ کرنے والا ہے، نہ کہ کوئی دوسرا اس کا محاسبہ کر سکتا ہے یا اس سے پوچھ گچھ کر سکتا ہے اور یہ مطلق اور ہر جہت میں پائی جانے والی ملکیت ایک ایسی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ خداوند عالم نے اپنے علاوہ ہر ایک کو اس طرح کی ملکیت سے محروم قرار دیا ہے اور صرف انہی امور میں لوگوں کو تصرف کا اختیار ہے جو وہ خود چاہے یا اس کی اجازت دے اور جن تصرفات میں اس نے لوگوں کو اجازت نہیں دی یا اسے لوگوں کے لیے نہیں چاہا ان میں کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں

ارشاد الٰہی ہے:

سورہ بقرہ، آیت ۲۵۵:

★ "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ--"

(کون ہے جو خدا کے پاس شفاعت کرے اس کے اذن و اجازت کے بغیر؟)

سورہ یونس، آیت ۳:

★ "مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ--"

(اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا)۔

سورہ رعد، آیت ۳۱:

★ "اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِیْعًا"

(اگر خدا چاہتا تو تمام لوگوں کو خود ہی ہدایت کر دیتا)۔

سورہ نحل، آیت ۹۳:

★ "یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ--"

(وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے جسے چاہتا ہے)۔

سورہ دہر، آیت ۳۰:

★ "وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ--"

(تم کچھ بھی نہیں چاہتے مگر یہ کہ جو اللہ چاہتا ہے)۔

سورہ انبیاء، آیت ۲۳:

★ "لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْـَٔلُوْنَ"

(اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا اس کے بارے میں جو وہ انجام دیتا ہے جبکہ لوگوں سے پوچھا جائے گا ان کے بارے میں جو وہ کرتے ہیں)۔

بنابرایں یہ بات ثابت ہوئی کہ خداوند عالم اپنی مملوکہ اشیائ...... (پوری کائنات)...... میں ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی شخص اس طرح کے مالکانہ حقوق کا حامل نہیں سوائے ان امور کے کہ جن میں خود اس نے کسی کو اذن و اجازت دی ہو یا ان کو اس نے چاہا ہو' کیونکہ وہی رب اور پروردگار ہے' اور اس کی ربوبیت بھی اسی کی متقاضی ہے کہ اس کے ارادہ یا اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی چیز میں کوئی تصرف نہ کر سکے۔

اس کے علاوہ قرآنی آیات اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ خداوند عالم نے اپنے آپ کو تشریع یعنی قانون سازی کا ذمہ دار بھی قرار دیا ہے اور قانون سازی کے مرحلہ میں انہی اصولوں اور معیاروں کو بنیاد بنایا ہے جنہیں عقلاء بنیاد قرار دیتے ہیں

مثلاً ہر اچھے کام کو اچھا قرار دینا اور اس پر مدح وستائش کرنا' اور شکر بجالانا' اور ہر برے کام کو برا قرار دینا اور اس کی مذمت کرنا وغیرہ جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہ بقرہ، آیت ۲۷۱:

★ " اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ "

(اگر تم صدقات کو کھلم کھلا دو تو وہ بھی اچھا ہے)

سورہ حجرات، آیت ۱۱:

★ " بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِیۡمَانِ "

(فسق بہت ہی برا نام ہے)

اور خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں اس امر کو ذکر کیا ہے کہ اس نے جو احکام اور قوانین انسان کے لیے بنائے ہیں ان میں اس کی بہتری و بھلائی اور اسے برائیوں اور مفاسد سے دور رکھنے کا راز پوشیدہ ہے اور ان میں اسے اپنے نقائص دور کرنے کے لیے بہترین راستے دکھائے گئے ہیں تاکہ وہ ان پر چل کر اپنی بھلائی و کامیابی کو یقینی بنا سکے' چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورہ انفال، آیت ۲۴:

★ " اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡكُمۡ "

(جب وہ تمہیں اس کام کرنے کی دعوت دے کہ جو تمہیں زندگی عطا کرے)۔

سورہ صف، آیت ۱۱:

★ " ذٰلِكُمۡ خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ "

(یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم کو اس کا علم ہو)۔

سورہ نحل، آیت ۹۰:

★ " اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ " ... وَیَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ وَالۡبَغۡیِ ...،

(خداوند عالم عدل و احسان کا حکم دیتا ہے...... اور غلط کاموں' برائیوں اور ظلم کرنے سے روکتا ہے ...)۔

سورہ اعراف، آیت ۲۸:

★ " اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ "

(خدا کبھی فحشاء اور غلط کاموں کا حکم نہیں دیتا)۔

مذکورہ بالا آیات کی مانند دیگر متعدد آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے معیاروں کا اشارہ ملتا ہے' اور ان سے ان امور کی تصدیق ہوتی ہے جو انسانی معاشرے میں عقلاء کی روش اور طرز عمل کا حصہ

ہیں' گویا خداوند عالم فرماتا ہے کہ یہ اچھائی و برائی' بھلائی و مفسدہ' امر و نہی' ثواب و عقاب' مدح و ثناء اور مذمت و سرزنش' خیر کو ہمیشہ ترجیح دینا' نیک کام بجالانا اور برے کام سے دوری و اجتناب کرنا وغیرہ جس طرح سے عقلاء کے احکام وقوانین کی بنیادیں ہیں اور ان کا ہر حکم و قانون انہی اصولوں اور معیاروں پر قائم ہوتا ہے اسی طرح شرعی احکام وقوانین کی بنیادیں بھی یہی امور ہیں اور خداوند عالم نے جو دستورات اپنے بندوں کے لیے مقرر و معین کئے ہیں ان سب میں انہی معیاروں اور اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے مثلاً عقلاء کی روش اور ایک طرز عمل یہ ہے کہ وہ اپنے تمام کام صاحبان عقل و خرد کی مسلمہ اغراض و مقاصد اور مصلحتوں کی بنیاد پر انجام دیتے ہیں (کوئی کام کسی معقول غرض و مصلحت کے بغیر انجام نہیں دیتے) اور اپنے معاشرے کے لیے احکام وقوانین کی تدوین بھی عقلاء کے کاموں میں سے ایک کام ہے اور یہ بھی انہی کے کاموں اور روش کا حصہ ہے کہ وہ جزا و سزا کا نظام بناتے ہیں یعنی نیک اور اچھے کام کرنے پر جزا و انعام اور برے کام کرنے پر سزا مقرر کرتے ہیں' یہ سب امور بہتری و بھلائی اور صحیح و مناسب اغراض و مقاصد پر استوار ہیں' یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے احکام وقوانین میں سے کسی ایک امر یا نہی میں معاشرے کی بہتری و بھلائی دکھائی نہ دے یا اس کا اجراء و نفاذ موزوں و مناسب نہ ہو تو عقلاء اس قسم کے کاموں کی انجام دہی میں کوئی اقدام نہیں کرتے' اور اس کے ساتھ ساتھ جزاء و سزا کے نظام میں عقلاء اس قدر باریک بینی سے کام لیتے ہیں کہ ہر عمل کی مقدار اور خیر و شر کی نسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے موزوں و مناسب جزا و سزا معین کرتے ہیں اور اجزاء و اصل عمل کے درمیان سنخیت و مطابقت کو پورے طور پر ملحوظ رکھتے ہیں' اور وہ اپنے امر و نہی بلکہ ہر حکم و قانون کو انہی افراد پر لاگو سمجھتے ہیں جو فاعل مختار ہوں نہ کہ مجبور و ناچار اور بے اختیار لوگوں پر' اور اسی طرح جزا و سزا یعنی ثواب و عذاب بھی اختیاری افعال پر ہوتے ہیں (اختیاری افعال سے مراد وہ کام ہیں جو کسی قسم کی مجبوری و ناچاری کے بغیر مکمل ارادہ و اختیار کے ساتھ انجام دیئے جائیں اور ان کی ادائیگی و انجام دہی میں انسان کے اختیار و مکمل ارادہ کے علاوہ کوئی عامل کارفرما نہ ہو) البتہ اگر کوئی شخص وہ کام کرے جو اس کا اختیاری نہ ہو لیکن اس غیر اختیاری کام کا سبب اختیاری ہو اور وہ سبب اس نے اپنے ارادہ اور اختیار سے متحقق کیا ہو تو ایسے شخص کو سزا دینا عقلاء کے نزدیک قبیح اور برا نہیں کہلاتا مثلاً کوئی شخص اپنے ارادہ و اختیار سے شراب پی لے اور اس کے اثر سے اس پر نشہ طاری ہو جائے اور پھر وہ اس نشہ کی حالت میں زنا کر لے تو اسے اس زنا کی سزا سے صرف اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نشے میں تھا اور غیر اختیاری طور پر اس سے یہ فعل سرزد ہو گیا، کیونکہ اس غیر اختیاری فعل کا سبب یعنی شراب نوشی اس کا اختیاری فعل تھا اس لیے اس کے نتیجہ میں واقع ہونے والے غیر اختیاری فعل پر اسے سزا دی جائے گی اور عقلاء ایسے شخص کو سزا کا مستحق سمجھتے ہیں۔

اب مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں خدا کے احکام وقوانین پر نظر ڈالتے ہیں کہ اگر خداوند عالم اپنے بندوں کو اپنی اطاعت یا معصیت و گناہ کرنے پر مجبور کرتا یعنی اس طرح کہ اطاعت پر مجبور کیا جانے والا شخص معصیت نہ کر سکتا اور معصیت و گناہ کرنے پر مجبور کیا جانے والا شخص اطاعت پر قادر نہ ہوتا تو اس صورت میں اطاعت گزاروں کو بہشت عطا کرنا لغو و بیہودہ کام اور معصیت و گناہ کرنے والوں کو جہنم میں ڈالنا ظلم و ناانصافی ہوتا' اور چونکہ لغو و بیہودہ کام اور ظلم و ناانصافی کرنا عقلاء کے

زدیک قبیح وغلط ہے اور ترجیح بلا مرجح کا سبب ہے (ترجیح بلا مرجح کا مطلب یہ ہے کہ جب اطاعت کرنے والا اور گناہ کرنے الا دونوں ہی مجبور تھے تو ایک کو بہشت عطا کرنا اور دوسرے کو عطا نہ کرنا ایک کو دوسرے پر کسی برتری کے بغیر انعام دینا کہلائے گا اسے علمی زبان میں ترجیح بلا مرجح کہتے ہیں) اور یہ (ترجیح بلا مرجح) عقلاء کے نزدیک قبیح و نادرست ہے' قبیح اسے کہا جاتا ہے جس کی صحت و درستی پر کوئی دلیل موجود نہ ہو اور اس کا انجام دینے والا کوئی حجت پیش نہ کر سکتا ہو یا اس کی عدم صحت رمضبوط دلیل موجود ہو۔ (قبیح فعل میں کوئی حجت وعذر قابل قبول نہیں ہوسکتا) اور خداوند عالم نے اپنی بابت ہر قبیح کام کی نفی کی ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورہء نساء، آیت ۱۶۵:

★ " لِئَلَّا یَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ "

(خدا نے اس لیے رسولوں کو بھیجا کہ اس کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کی مخالفت کرنے کی بابت کوئی حجت باقی نہ ہے)۔

سورہء انفال، آیت ۴۲:

★ " لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ "۔

(رسولوں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا اس لیے ہے کہ جو ہلاک ہونا چاہتا ہے وہ سب کچھ جانتے ہوئے ہلاکت ختیار کرے اور جو زندگی پائے وہ دلیل و برہان کے ساتھ سب کچھ جانتے ہوئے زندگی حاصل کر سکے)۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا اس سے درج ذیل اہم نکات واضح ہوئے:

(۱)۔ جبر واکراہ کی نفی:

شرعی احکام وقوانین کی بنیاد جبر واجبار پر نہیں اور خدا نے کسی بندے کو کسی کام پر مجبور نہیں کیا' بلکہ اس نے جو فرائض گوں پر عائد کئے ہیں وہ لوگوں کی دنیا وآخرت کی بھلائی کے لیے ہیں۔ اور یہ فرائض انہی لوگوں پر عائد ہوتے ہیں جو انجام ینے اور انجام نہ دینے کا مکمل اختیار بھی رکھتے ہوں لہٰذا ہر شخص کو ثواب یا عذاب اس کے نیک یا برے ان اعمال کے عین طابق ملے گا جو اس نے اختیاری طور پر انجام دیئے ہوں۔

(۲)۔ خدا کی طرف نسبت کا تقدس:

قرآن مجید میں خداوند عالم کی طرف گمراہ کرنے (اضلال)، دھوکہ دینے (خدعہ)، مکر وفریب کرنے' سرکشی یں مدد کرنے' شیطان کو انسان پر مسلط کرنے اور اسے انسان کا سرپرست قرار دینے' شیطان کو بعض لوگوں کا ساتھی بنانے اور س قسم کے دوسرے امور کی جو نسبت دی گئی ہے وہ انہی معنوں میں ہے جو اس کی مقدس و پاکیزہ ذات کے شایان شان ہیں کہ جن سے اس کی ذات والا صفات کا ہر قسم کے نقص' ہر قسم کے قبیح و نادرست کام اور ہر طرح کی برائی سے پاک ہونا متاثر ہیں ہوتا بلکہ اس کی ذات ان تمام امور کے باوجود ہر نقص و برائی سے پاک ومنزہ رہتی ہے' کیونکہ یہ تمام امور بالآخر اضلال

یعنی گمراہ کرنے اور اس کی مختلف قسموں پر منتہی ہوتی ہیں جبکہ اضلال یعنی گمراہ کرنے کو اپنی تمام قسموں کے ساتھ کہ جن میں ابتدائی طور پر گمراہ کرنا اور دھوکے میں رکھنا بھی شامل ہے خداوند عالم کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی وہ اس کی مقدس ذات کے شایان شان ہے بلکہ جو اضلال...... گمراہ کرنا...... خدا کی ذات کے لیے ثابت ہے اور اس کی نسبت اس کی طرف صحیح ہے اس سے مراد وہ اضلال ہے جو سزا اور رسوا کرنے کے طور پر خدا کرتا ہے اور وہ اس کی بابت ہی کرتا ہے جو اپنے برے ارادہ واختیار کے ساتھ اس گمراہی کی طرف جائے' چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ بقرہ، آیت ۲۶:

★ " یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ " ۔

(وہ اس...... قرآن...... کے ذریعے بہت لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور اس کے ذریعے بہت لوگوں کی ہدایت کرتا ہے' اور وہ اس کے ذریعے صرف انہی لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو فاسق ہیں)۔

سورہ صف، آیت ۵:

★ " فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ " ۔

(پس جب وہ منحرف ہو گئے تو خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا)۔

سورہ مومن، آیت ۳۴:

★ " كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ " ۔

(اور اسی طرح گمراہ کرتا ہے خدا ہر اس شخص کو جو اسراف کرنے والا ہو اور شک کرنے والا ہو)۔

(۳)۔ قضاء وقدر الٰہی کی حقیقت:

خدا کی قضا...... اور قدر...... کا تعلق لوگوں کے افعال کے ساتھ اس حیثیت سے نہیں کہ ان افعال کی فعلی نسبت ان لوگوں کی طرف ہے جو انہیں بجالاتے ہیں بلکہ اس کا تعلق اس لحاظ سے ہے کہ وہ خدا کی موجودات میں سے ہیں اور خدا نے انہیں وجود عطا کیا ہے' اس سلسلے میں تفصیلی بحث عنقریب پیش کی جائے گی (روایات کی بحث میں) اور مسئلہ قضا وقدر میں بھی اس کی وضاحت ہوگی۔

(۴)۔ تشریع وقانون سازی میں تفویض کی نفی:

تشریع وقانون سازی میں جس طرح جبر کی گنجائش نہیں اسی طرح تفویض بھی اس میں روا نہیں کیونکہ اگر قانون سازی کا عمل تفویض سے ہم آہنگ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آقا کا آقا ہونے کی حیثیت میں اپنے بندوں کو ان امور میں امر ونہی کرنا جن میں اسے کوئی اختیار ہی حاصل نہیں ہے درست قرار پائے جبکہ ایسا کرنا ہرگز معقول نہیں۔ اور اس کے علاوہ یہ کہ تفویض یعنی خدا کا تمام اختیارات اپنے بندوں کے سپرد کر دینا اس وقت تک قابل تصور ہی نہیں جب تک کہ خدا کے ہر چیز میں علی الاطلاق مالک ہونے کا انکار نہ کیا جائے اور اس کی مملوکہ چیزوں میں سے بعض چیزوں میں اسے مالک نہ مانا جائے'

(جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا) لہٰذا خدا کے احکام وقوانین سازی کے عمل میں نہ جبر پایا جاتا ہے نہ تفویض بلکہ اس کی بابت جبر یا تفویض کا تصور ہی درست نہیں۔

(جبر سے بندوں کا بے بس و بے اختیار ہونا اور تفویض سے خدا کا بے اختیار ہونا لازم آتا ہے اور یہ دونوں صورتیں درست نہیں۔م)

روایات پر ایک نظر

جبر وتفویض کی مطلق نفی

جبر اور تفویض کی بابت اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے کثیر روایات وارد ہوئی ہیں جن میں آئمہ اطہار نے یوں ارشاد فرمایا:

★ **"لا جبر و لا تفویض بل امر بین الامرین"**

(نہ جبر ہے اور نہ تفویض، بلکہ ایک امر ہے جو ان دونوں کے درمیان میں ہے)

قضاء وقدر کی بابت حضرت علیؑ کا واضح بیان

کتاب "عیون اخبار الرضا" میں متعدد راویوں کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام جنگ صفین سے واپس آئے تو ایک بوڑھا آدمی کہ جو صفین میں آپؑ کے ساتھ تھا آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا امیر المومنینؑ! کیا ہمارا صفین کی طرف جانا خدا کی قضا وقدر سے تھا؟

حضرت امیر المومنینؑ نے جواب دیا: ہاں اے بزرگوار! خدا کی قسم! تم جس ٹیلے پر چڑھے یا جس وادی میں اترے وہ سب خدا کی قضا و قدر سے تھا۔

امامؑ کا جواب سن کر اس بوڑھے آدمی نے عرض کی یا امیر المومنین! اگر ایسا ہے تو پھر میرے خیال میں میری تمام زحمتوں اور تکلیفوں کا ذمہ دار خدا ہے!

حضرت امیر المومنینؑ نے اس بوڑھے آدمی کی بات سن کر ارشاد فرمایا: اے بزرگوار! ایسا ہرگز نہ سوچیں شاید آپ نے قضا وقدر سے مراد خدا کا حتمی ولازمی فیصلہ سمجھ لیا ہے، اگر ایسا ہوتا تو یہ سب ثواب وعذاب، امر ونہی وغیرہ بے اثر وغلط ہوتے

اور بہشت کا وعدہ اور جہنم سے ڈرانا بے معنی ہوتا' اور کسی بدکار کو برا کہنا اور کسی نیک کام کرنے والے کی تعریف کرنا صحیح نہ ہو بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہوتی یعنی نیک کام کرنے والا بدکار سے زیادہ ملامت کا مستحق ہوتا اور بدکار نیک کام کرنے والے سے زیادہ تعریف کا مستحق ہوتا' اور یہ وہ بات ہے جو بت پرست' دشمنان خدا اور اس امت کے قدریہ اور مجوسی کہتے ہیں اور یہ انہی لوگوں کا عقیدہ ہے' اے بزرگوار! خدا نے ہم پر جو فرائض عائد کئے ہیں ان میں ہمیں اختیار دیا ہے اور جن چیزوں سے ہمیں روکا ہے ان کی بابت ہمیں ان کے سنگین نتائج سے آگاہ کیا ہے' خدا نے تھوڑے عمل پر زیادہ اجر و ثواب دینے کا وعدہ کیا ہے اور اگر کوئی اس کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا اس سے مغلوب ہو گیا ہے اور اگر کوئی اس کی اطاعت کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے' خداوند عالم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اسے بے کار پیدا نہیں کیا' ایسے غلط گمان ان لوگوں کے ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا' پس جہنم ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر اختیار کیا۔ (الحدیث)

تبصرہ و تجزیہ:

امیر المومنینؑ کا یہ ارشاد کہ "یہ سب کچھ خدا کی قضا و قدر سے تھا"...... اور اس بوڑھے آدمی کا یہ کہنا کہ "پھر تو میری زحمتوں اور تکلیفوں کا ذمہ دار خدا ہے' اس سلسلے میں جاننا چاہیے کہ جو مسائل و موضوعات صدر اسلام میں زیر بحث لائے گئے ان پر گوناگوں نظریات و عقائد کی بنیاد قائم ہوئی ان میں سے ایک مسئلہ کلام اور دوسرا مسئلہ قضا و قدر ہے' علماء نے اس سلسلے میں سب سے پہلے قضاء و قدر کے معانی و مفاہیم کو اپنے تئیں تصور کیا پھر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خدا کا ارادہء ازلیہ کائنات میں موجود ہر چیز پر آیا لہٰذا کائنات میں کوئی چیز ممکن الوجود نہیں بلکہ اگر کوئی چیز موجود ہو (وجود میں آئے) تو وہ واجب الوجود ہوگی کیونکہ خدا کا ارادہ اس پر آیا ہے (خدا نے اس کے وجود میں آنے کا ارادہ کیا ہے) اور یہ محال ہے کہ اس کا ارادہ اپنے مراد سے جدا ہو یا اس کا مراد اس کے ارادے سے جدا ہو (یعنی جس چیز کے وجود میں آنے کا اس نے ارادہ کیا ہو اس کا وجود میں آنا لازمی و ضروری ہے اور اس حوالہ سے وہ "ضروری الوجود" ہوگی کیونکہ خدا کا ارادہ ہر صورت میں پورا ہوتا ہے اس کے ارادہ اور "مراد" (جس چیز کا اس نے ارادہ کیا ہے) میں عدم مطابقت و ناہم آہنگی ممکن ہی نہیں) البتہ یہ بات ان چیزوں کے بارے میں ہے کہ خدا کا ارادہ جن کے موجود ہونے پر آئے لیکن اگر کوئی چیز معدوم ہو (وجود سے محروم ہو) تو اس کا وجود میں آنا ممکن ہی نہیں کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوگا کہ خدا کا ارادہ اس کے وجود میں آنے پر آیا ہی نہیں (خدا نے اس کے وجود میں آنے کا ارادہ ہی نہیں کیا) لہٰذا یہ نتیجہ نکلا کہ دنیا میں دو ہی قسم کی موجودات ہیں: یا واجب الوجود ہیں یا ممتنع الوجود ہیں یعنی یا تو خدا نے چاہا ہے کہ یہ چیز موجود ہو یا نہیں چاہا کہ موجود ہو، جس چیز کے متعلق خدا نے ارادہ کیا کہ وہ موجود ہو اس کے لیے وجود ضروری و لازم ہے کیونکہ خدا کا ارادہ اپنے مراد سے جدا نہیں ہو سکتا' اور اگر خدا نے کسی چیز کے متعلق یہ ارادہ نہیں کیا کہ وہ موجود ہو تو اس کے لیے وجود کا نہ ہونا ضروری و لازم ہے کیونکہ خدا کا ارادہ اس کے وجود میں آنے پر قائم ہی نہیں ہوا اور اگر خدا کا ارادہ اس کے

وجود عطا کرنے پر آتا تو وہ ضروری الوجود ہوتی' اب اگر ہم اس اصول کو وسعت دے کر تمام موجودات عالم میں جاری کریں تو ہمارے اختیاری افعال میں اشکال پیدا ہو جائے گا' کیونکہ ہمارے اختیاری افعال بھی موجودات عالم کا حصہ ہیں لہٰذا وہ یا موجود ہوں گے یا معدوم ہوں گے۔ اگر موجود ہوں تو ان کے لیے وجود میں آنا ضروری ولازمی ہوگا اور اگر موجود نہ ہوں تو ان کا موجود نہ ہونا ضروری ولازمی ہوگا' اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم خود اپنے افعال کو وجود میں لانے یا نہ لانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ جبکہ یہ درست نہیں کیونکہ جب بھی ہم اپنے افعال کے وجود اور عدم کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمیں ان دونوں...... وجود اور عدم ...... کی نسبت اپنی طرف مساوی نظر آتی ہے' یعنی جس طرح ہم ان افعال کو وجود میں لانے کی طاقت اور اختیار اپنے اندر پاتے ہیں اسی طرح انہیں ترک کرنے اور وجود میں نہ لانے کی طاقت واختیار بھی ہمیں حاصل ہوتا ہے' لہٰذا جب ہم ان دونوں ...... انجام دینے اور ترک کرنے ...... میں سے کسی ایک کو اختیار کرتے ہیں اور اس کا ارادہ بھی کرتے ہیں تو وہ وجود پذیر ہو جاتا ہے' گویا اختیاری افعال میں سے کسی کو وجود میں لانا یا وجود میں نہ لانا ہمارے ہی اختیار اور ارادے سے تعلق رکھتا ہے (یہاں اختیار سے مراد انتخاب ہے یعنی ان دونوں ...... وجود اور عدم ...... میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا) پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہمارے افعال اختیاری ہیں اور ان کا انتخاب ہمارے ہاتھ میں ہے اور ہمارا ارادہ ان افعال کے وجود پذیر ہونے میں مؤثر بلکہ ان کے وجود میں آنے کا سبب ہے' لیکن اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ خدا کا ارادہ ازلیہ کہ جو کبھی اپنے مراد سے جدا نہیں ہوتا وہ ہمارے افعال پر بھی واقع ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ پہلے تو یہ ہوگا کہ افعال کے بارے میں ہمارا کوئی اختیار باقی نہ رہے گا اور ہم اپنے فعال میں ہر قسم کے اختیار کے محروم ہوں گے ہمارا کوئی فعل اختیاری نہ ہوگا گویا افعال اختیار یہ کا وجود ہی نہ رہے گا' اور دوسرا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی فعل کو وجود میں لانے میں ہمارا ارادہ موثر ہی نہیں اور پھر کسی فعل سے پہلے اس پر قادر ہونا یا نہ ہونا برابر ہو جائے گا (کسی فعل سے پہلے اس پر قادر ہونے کی بات بے معنی ہو جائے گی) جس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے فرائض کا عائد کرنا (تکلیف) بھی بے معنی ہو جائے گا کیونکہ کسی پر فرائض عائد کرنا تب ہی درست ہوتا ہے جب وہ ان فرائض کے ادا کرنے پر قادر ہو' اور اگر وہ ان کے انجام دینے پر قادر ہی نہ ہو تو اس پر فرائض عائد کرنا عقلی طور پر صحیح نہیں اور اسے مکلف قرار دینا یعنی اس پر فرائض کی ادائیگی لازم قرار دینا ''تکلیف مالا یطاق'' کہلائے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے کام کا حکم دیا جائے جس کی انجام دہی کی طاقت ہی نہ ہو' اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی لازم آئے گی کہ مجبور ہو کر اطاعت کرنے والے کو بھی جزا دی جائے گی جو کہ ہرگز معقول نہیں اور نافرمانی پر مجبور کئے جانے والے کو سزا دی جائے گی جو کہ ظلم اور قبیح ہے اور اسی طرح کے دیگر امور لازم آئیں گے جو عقلی طور پر درست نہیں' لیکن قضاء وقدر کی بحث میں اختیاری افعال کی بابت انہیں واجب و ممتنع کی طرف تقسیم کرنے والے ارباب دانش نے مذکورہ تمام امور کو کہ جنہیں عقلی طور پر صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا' صحیح تسلیم کیا ہے اور اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ کوئی مکلف کوئی کام انجام دینے سے پہلے اس پر قادر نہیں ہوتا ... لہٰذا قادر نہ ہونے کے باوجود اسے مکلف قرار دینا یعنی اس پر فرائض عائد کرنا صحیح ہے..... اور یہ کہ حسن وقبح یعنی کسی کام کا اچھا ہونا یا برا ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ جو کام بھی خدا انجام دے خواہ وہ عقلی طور پر نادرست ہی کیوں نہ ہو وہ صحیح ودرست ہے لہٰذا جن

چیزوں کو ہم عقلی طور پر غلط و نادرست سمجھتے ہیں مثلاً ترجیح بلا مرجح، بے مقصد و بے فائدہ چاہت و ارادہ، تکلیف مالا یطاق (یعنی جس کام کی طاقت و قدرت ہی نہ ہو اس کا حکم دینا) گناہ پر مجبور کئے جانے والے شخص کو سزا دینا وغیرہ سب خدا انجام دے سکتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

خلاصہء کلام یہ کہ صدر اسلام میں قضا و قدر کا عقیدہ افعال کے ''حسن و قبح'' یعنی اچھے اور برے ہونے کے ا... اور ''استحقاق کی بنیاد پر جزاء و سزا'' کے انکار سے پیدا ہوا' چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جب اس معمر آدمی نے حضرت علیہ السلام سے یہ سنا کہ ''صفین کی طرف جانا خدا کی قضاء و قدر سے تھا'' تو اس سے رہا نہ گیا اور فوراً بول اٹھا کہ ''میں اپنے ا... آنے والی سختیوں اور سفر کی مشقت کو خدا کے حساب میں ڈالتا ہوں'' یعنی جب سب کچھ خدا کے ارادے سے ہوا اور اس میں ہمارے ارادے کا کوئی عمل دخل نہ تھا اور ہمیں اس سفر میں سوائے سختی و مشقت کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تو پھر میں ان مشقتوں کو بھی اسی کے حساب میں ڈالتا ہوں کیونکہ اس نے ہی مجھے اس مشقت میں ڈالا......، امام علیؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ''اگر ایسا ہو کہ جس طرح تو سوچ رہا ہے تو پھر ثواب و عذاب بے معنی ہو جائیں گے''۔ در حقیقت امامؑ نے ان ... اور عقلائی اصولوں کو بنیاد قرار دیا جن پر تمام شرعی احکام و قوانین استوار ہیں چنانچہ امامؑ نے اپنے بیان کے آخری جملوں میں یوں ارشاد فرمایا: خدا نے آسمانوں اور زمین کو بے مقصد و بے فائدہ خلق نہیں کیا''۔ گویا امام علیہ السلام اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے تھے کہ اگر بے مقصد ارادہ کہ جو بے اختیار ہونے کا لازمی امر ہے صحیح قرار پائے تو اس سے خداوند عالم کا بے مقصد و غرض کام انجام دینا بھی امکان کے دائرے میں آئے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات کی تخلیق کا کام بھی بے مقصد اور بے غرض ہونا ممکن تسلیم کیا جائے اور صرف ممکن ہی نہیں بلکہ لازم و ضروری مانا جائے کیونکہ اس صورت میں ''امکان'' ''وجوب و لزوم'' کے برابر ہو جائے گا کیونکہ جب کسی کام میں کوئی مقصد اور غرض ملحوظ نہ ہو تو پھر اس کا کسی مقصد و غرض سے کوئی تعلق بھی نہیں اور جب کوئی تعلق نہ ہوگا تو اس کام کا بے مقصد و بے غرض ہونا لازمی ہو جائے گا' لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ آسمانوں اور زمین اور کائنات کی تخلیق و ایجاد کا مقصد و غرض ہی کچھ نہیں اور خدا نے یہ سب کچھ باطل و بے فائدہ پیدا کیا ہے' اس کے ساتھ ساتھ نظریۂ معاد اور قیامت کو بھی باطل و بے مقصد قرار دے گا اور پھر اسی طرح کے کئی دیگر امور لازم آئیں گے جو کہ ہرگز درست نہیں۔

اور امام علیہ السلام کا یہ فرمان کہ ''خدا کی نافرمانی مغلوبیت کے ساتھ اور فرمانبرداری ناپسندیدگی کے ساتھ نہیں کی گئی'' اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص اس کی نافرمانی کرتا ہے وہ اس لیے نہیں کہ اسے اس نافرمانی پر مجبور کیا گیا ہے اور جو اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے وہ کراہت و ناپسندیدگی کی بناء پر نہیں کرتا۔

جبر و تفویض کی بابت امام رضاؑ کا ارشاد گرامی

کتاب ''التوحید'' اور کتاب ''عیون اخبار الرضاؑ'' میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ

سامنے جبر وتفویض کی بابت تذکرہ ہوا تو آپؑ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس سلسلے میں ایک ایسا پختہ اصول بتاؤں کہ تم پھر کبھی آپس میں نزاع واختلاف سے دوچار ہو گے اور نہ کوئی شخص تم پر اس کی بابت جھگڑا کرنے کی جرأت کرے گا اور اگر کوئی تمہارے ساتھ اس سلسلے میں جھگڑا بھی کرے گا تو تم اسے پچھاڑ دو گے حاضرین نے عرض کی مولاؑ! ضرور بیان فرمایئے! امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: "خدا کی اطاعت ناپسندیدگی سے اور نافرمانی بے بسی و مجبوری سے نہیں ہوتی (جو شخص خدا کی اطاعت کرتا ہے وہ اپنی مرضی واختیار سے کرتا ہے اور جو شخص نافرمانی اور معصیت کرتا ہے وہ بھی اپنے اختیار وارادے سے کرتا ہے) خدا نے بندوں کو اپنی حکومت ومملکت میں شتر بے مہار کی طرح نہیں چھوڑا ہے بلکہ وہ ہر اس چیز کا مالک ہے جس کا اس نے بندوں کو مالک بنایا ہے اور ہر اس چیز پر قادر ہے جس پر اس نے بندوں کو قدرت عطا کی ہے' لہٰذا اگر بندے اس کی اطاعت وفرمانبرداری کریں تو خداوند عالم انہیں نہیں روکتا اور اطاعت کے راستے ان پر بند نہیں کرتا' اور اگر لوگ اس کی نافرمانی کریں تو اگر وہ چاہے تو انہیں ایسا کرنے سے روک سکتا ہے اور اگر نہ روکے اور وہ نافرمانی کا ارتکاب کرلیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا نے ہی انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ (اس کے بعد امامؑ نے ارشاد فرمایا) جو شخص اس اصول کو اچھی طرح یاد کرلے وہ ہمیشہ اپنے مدمقابل پر غلبہ پائے گا۔

آپ مذکورہ بالا تمام مطالب سے اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ جبر کا عقیدہ رکھنے والوں کے نظریات کی بنیاد وہی مطالب ہیں جو انہوں نے قضا وقدر کی بحث میں پیش کئے ہیں اور اس بحث ومطالب سے انہوں نے قضا وقدر میں "وجوب و لزوم" ("ضروری ولازمی" ہونے) کا نتیجہ اخذ کیا ہے۔

تو اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ قضاء وقدر کی بحث بھی صحیح ہے اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ بھی صحیح ہے لیکن ان حضرات نے اس نتیجے کی تطبیق میں غلطی کی اور "حقائق" و "اعتباریات" میں تمیز نہیں کر سکے اور دونوں کو ایک جیسا سمجھ کر غلط نظریہ قائم کرلیا' اسی طرح وہ "وجوب اور امکان" کی بابت بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور ان کے معنی ومفہوم کو واضح طور پر نہ سمجھ سکے' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جبر کے غلط عقیدے کو اپنا گئے۔

اس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ اگر قضاء وقدر کا مسئلہ ثابت بھی ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات میں ہر چیز کی ایجاد وتخلیق "وجوب ولزوم" کی بنیاد پر ہوئی ہے لہٰذا تمام موجودات اور ان کے احوال واطوار کی تقدیر اور حدود، خداوند عالم کے نزدیک مقرر ومعین ہیں اور خدا نے ہر چیز کا وجود اور اس کے احوال واطوار کو خود معین کر دیا ہے لہٰذا کوئی چیز اس کے مقرر کئے ہوئے اندازے کے برعکس نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کی طے کی ہوئی حدود سے باہر جا سکتی ہے' اور یہ بات واضح ہے کہ "وجوب ولزوم" موجودات کے وجود میں آنے کی "علت" سے تعلق رکھنے والے امور ہیں اور "علت تامہ" کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ جب اس کے معلول کا اس کے ساتھ قیاس کیا جائے تو وہ معلول بھی اپنی "علت تامہ" کی طرح 'وجوب ولزوم' کی صفت سے متصف ہو جائے گا اور جب اسے اپنی "علت تامہ" کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ قیاس کر کے دیکھا جائے تو اسے "امکان"..... ممکن الوجود ہونے ..... کے علاوہ کسی دوسری صفت سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔

مذکورہ بالا علمی و فلسفیانہ بیان کی روشنی میں یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ اگر قضا وقدر کو تمام موجودات عالم میں وسعت دی جائے اور یہ کہا جائے کہ قضا وقدر کا نظام تمام اشیاء میں جاری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے میں ''علت و معلول'' کا اصول حکمفرما ہے اور ان کے درمیان وہی رابطہ ہے جو ''علیت تامہ'' اور ''معلولیت'' کے درمیان ہوتا ہے اور یہ نظریہ ایک لحاظ سے کائنات میں ''قوت و امکان'' کے نظام کی حکمفرمائی سے منافی بھی نہیں تو وہ اختیاری فعل جو انسان کے اپنے ارادے سے انجام پذیر ہوتا ہے ایک لحاظ سے ''واجب الوجود'' اور دوسرے لحاظ سے ''ممکن الوجود'' کہلائے گا یعنی اگر اسے اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ اس کے وجود میں آنے کے تمام اسباب مثلاً علم و ارادہ' صحیح آلات و مواد اور زمان و مکان کی تمام شرائط و تقاضے سب موجود ہیں تو وہ فعل واجب الوجود ہوگا اور وہ ایسا فعل ہے جس کا تعلق خدا کے ارادہ ازلیہ سے ہے اس لیے اس کا وجود میں آنا اور تحقق پذیر ہونا ضروری و لازمی ہے کیونکہ اس کے وجود میں آنے کی علت تامہ کے تمام اجزاء موجود ہیں لہٰذا اس کا وجود میں آنا ہر صورت میں ضروری ہے اور اگر مذکورہ بالا تمام اسباب و شرائط موجود نہ ہوں بلکہ اس کی علت تامہ کے بعض اجزاء پائے جائیں مثلاً اس کا فاعل اور انجام دینے والا ہی ملحوظ ہو اور اس کے علاوہ اس کی علت تامہ کے اجزاء و شرائط میں سے کچھ بھی نہ پایا جائے تو وہ فعل واجب الوجود نہیں ہوگا بلکہ ''ممکن الوجود'' رہے گا اور ''امکان'' کی حدود سے کبھی خارج نہ ہوگا لہٰذا یہ نتیجہ حاصل ہو کہ اگر کوئی فعل اپنی علت تامہ کی تمام شرائط کا حامل ہو اور ''ضروری'' و واجب الوجود ہو جائے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تمام شرائط کے موجود نہ ہونے کی صورت میں بھی واجب الوجود ہی رہے گا۔

اس بیان سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ جبر کا عقیدہ رکھنے والے حضرات نے قضا وقدر کی وسعت اور انسان کے اختیاری فعل کے ساتھ خدا کے ارادے کے تعلق پکڑنے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس صورت میں انسان اپنے افعال میں کوئی قدرت و اختیار نہیں رکھتا وہ ہرگز درست نہیں کیونکہ خدا کا ارادہ انسان کے فعل کی تمام خصوصیات اور اس کے وجود میں آنے کی تمام شرائط پر واقع ہوتا ہے اور ان شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ اس فعل کے وقوع پذیر ہونے کے تمام اسباب و علل اور اس کے وجود میں آنے کی تمام شرائط موجود ہوں اور وہ اپنی علل و وجود میں آنے کی تمام شرائط و لوازمات سے مربوط و وابستہ ہو۔ اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ خدا کا ارادہ کسی شخص مثلاً زید کے فعل پر اس طرح واقع ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ اس فعل کو بجا لائے اور یہ کہ وہ فعل فلاں وقت میں اور فلاں مقام پر واقع ہو' پس انسان کے فعل میں خدا کے ارادے کی تاثیر سے مراد یہ ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ یہ کام اس شخص کے ارادہ و اختیار سے انجام پذیر ہو' اور اگر وہ شخص اس کام کے انجام دینے میں بے اختیار ہو اور وہ اس کے ارادہ و اختیار کے بغیر انجام پذیر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا ارادہ پورا نہ ہوا (ارادہ اور مراد کے درمیان فرق پیدا ہو گیا) جو کہ محال و ناممکن ہے۔

پس کسی فعل کے ضروری الوجود ہونے میں خدا کے ارادے کی تاثیر سے مراد یہ ہے کہ فعل اپنے فاعل کے ارادہ و اختیار سے انجام پائے' یعنی خدا یہ چاہتا ہے کہ یہ کام انسان کے اپنے ارادہ و اختیار سے انجام پائے' اس لحاظ سے وہ فعل واجب و لازم الوجود بھی ہے اور ممکن الوجود بھی۔ لازم الوجود اس اعتبار سے ہے کہ خدا نے اسے چاہا اور اس کا ارادہ کیا کہ وہ انسان کے

ارادہ واختیار سے انجام پائے اور ممکن الوجود اس اعتبار سے ہے کہ انسان بحیثیت فاعل اپنے مکمل اختیار کے ساتھ اس کا ارادہ کرتا ہے' لہٰذا وہ ایک جہت سے لازم الوجود اور دوسری جہت سے ممکن الوجود ہے' ایک لحاظ سے ضروری اور ایک لحاظ سے اختیاری' یعنی خدا کے ارادہ کے حوالہ سے لازم وضروری اور انسان کے ارادے کی نسبت سے ممکن الوجود ہے' بنابرایں خدا کا ارادہ پہلے اور انسان کا ارادہ اس کے بعد ہے......اسے علمی اصطلاح میں سلسلہ ءطولیہ کہتے ہیں......نہ یہ کہ خدا کا ارادہ انسان کے ارادے کے آمنے سامنے ہو کہ جسے علمی اصطلاح میں سلسلہ ءعرضیہ کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں' خدا کا ارادہ اور انسان کا ارادہ ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں ہیں اس لیے ان دونوں کے درمیان کوئی تقابل اور تزاحم نہیں اور ایسا ہرگز نہیں کہ خدا کے ارادے کے موثر ہونے کی صورت میں انسان کا ارادہ بے اثر ہو جائے' یہی وہ امر ہے جو جبریہ...... جبر کا عقیدہ رکھنے والوں......کی غلط فہمی کا سبب ہوا ہے کہ انہوں نے خدا کے ارادہ کے انسان کے فعل کے ساتھ تعلق کی کیفیت کو ہی نہیں سمجھا اور ان دونوں ارادوں کے درمیان سلسلہ ءطولیہ اور سلسلہ ءعرضیہ کے فرق کا بھی اچھی طرح ادراک نہیں کیا' یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس غلط فہمی کے نتیجے میں یہ عقیدہ اور نظریہ قائم کر لیا کہ جب خدا کا ارادہ انسان کے فعل پر واقع ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اپنا ارادہ ختم ہو گیا' اس کا ارادہ باقی رہا اور نہ اس کی تاثیر باقی رہی۔

اب رہی معتزلہ کی بات' تو انہوں نے "مجبرہ"......جبر کا عقیدہ رکھنے والوں......سے اختلاف رائے کیا اور لوگوں کے افعال کے اختیاری ہونے یا نہ ہونے میں اور اسی طرح ان افعال کی بابت دیگر لوازم وآثار کے سلسلے میں مجبرہ کے نظریہ کو تسلیم نہیں کیا لیکن انہوں نے اپنے مدعا یعنی انسان کے افعال کے اختیاری ہونے کو ثابت کرنے کے لیے جو راہ اختیار کی وہ بھی غلط ونادرست ہونے میں مجبرہ کے نظریات اور دلائل سے ہرگز کم نہیں اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے تو مجبرہ کا یہ نظریہ صحیح تسلیم کر لیا کہ خدا کے ارادہ کا لوگوں کے افعال پر واقع ہونا ان کے اختیار کو ختم اور بے اثر کر دینے کا سبب بنتا ہے' لیکن چونکہ وہ (معتزلہ) لوگوں کے افعال کے اختیاری ہونے کو ثابت کرنے کے درپے تھے اس لیے انہوں نے مجبرہ کا مذکورہ بالا نظریہ صحیح تسلیم کرنے کے بعد یہ کہہ دیا کہ خدا کا ارادہ لوگوں کے افعال پر واقع ہی نہیں ہوتا اور اس کے ارادہ کا لوگوں کے افعال سے کوئی تعلق وربط ہی نہیں' لہٰذا وہ اپنے اس نظریے کی روشنی میں انسان ہی کو اس کے افعال کا خالق تسلیم کر بیٹھے' گویا وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ تمام موجودات کا خالق خدا ہے لیکن انسان کے افعال کا خالق خدا نہیں بلکہ خود انسان ہے' جبکہ وہ اس امر سے غفلت میں رہے کہ یہ تو "ثنویت"......دو خدا تسلیم کرنے کا عقیدہ ہے' اور یہ عقیدہ جبر کے عقیدہ کی نسبت زیادہ غلط ہے کیونکہ جبر کا عقیدہ رکھنے والے ایک خالق کے قائل ہیں اور معتزلہ نے انسان کو اپنے افعال کا خالق تسلیم کر کے دو خالق تسلیم کر لیے جیسا کہ امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ "قدریہ فرقہ کے لوگوں نے خدا کی عدالت کو ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بے چارے خدا کی قدرت وسلطنت کا انکار کر بیٹھے"۔

مذکورہ بالا بیان کی وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ مثلاً ایک آقا اپنے کسی غلام کے لئے پسند کرے کہ اس کی شادی اپنی کسی بیٹی کے ساتھ کر دے اور زمین' مکان' گھر کا سامان' مال ودولت اور گھریلو زندگی کے لیے

ہر وہ چیز جس کی عام طور پر ضرورت ہوتی ہے اسے دے تو اگر ہم یہ کہیں یہ غلام ان چیزوں میں سے کسی کا مالک نہیں کیونکہ وہ تو غلام ہے اور غلام کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا لہٰذا یہ تمام چیزیں اگرچہ اس کے استعمال میں آتی ہیں لیکن وہ ان کا مالک نہیں بلکہ ان کا مالک اس کا آقا ہے تو یہ وہی بات ہو جائے گی جو "مجبرہ"..... جبر کا عقیدہ رکھنے والے..... کہتے ہیں جو کہ درست نہیں اور اگر ہم یہ کہیں کہ چونکہ اس کے آقا نے اسے یہ سب چیزیں دے دی ہیں اور اب یہ غلام ہی ان کا مالک ہے اور اب آقا ان چیزوں کا مالک نہیں رہا تو وہی "معتزلہ" والی بات ہو جائے گی جو کہ درست نہیں اگر ہم ان دونوں یعنی آقا اور غلام کے اختیارات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یوں کہیں کہ آقا بھی ان چیزوں کا مالک ہے اور غلام بھی ان کا مالک ہے اور وہ یوں کہ ایک لحاظ سے آقا مالک ہے کیونکہ وہ آقا ہے جو کہ غلام کا بھی مالک ہے اور ایک لحاظ سے غلام مالک ہے کیونکہ آقا نے اسے مالک بنا دیا ہے اور وہ خود آقا کی ملکیت میں ہوتے ہوئے ان چیزوں کا مالک ہے اس صورت میں دونوں کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور یہی بات درست ہے اسی کو آئمہ اطہار علیہم السلام نے اختیار کیا ہے اور یہ مسئلہ دلیل و برہان کے ذریعے بھی ثابت ہو چکا ہے کیونکہ اس سے "امر بین الامرین" کی حقیقت ثابت ہو جاتی ہے یعنی نہ وہ بات جو مجبرہ کہتے ہیں کہ سب اختیار خدا کے پاس ہے اور بندہ کوئی اختیار نہیں رکھتا اور نہ وہ بات جو معتزلہ کہتے ہیں کہ خدا کا بندے پر کوئی اختیار باقی نہیں لہٰذا ان دونوں نظریوں کے درمیان والا عقیدہ صحیح ہے اور وہ یہ کہ دونوں اختیار رکھتے ہیں خدا خالق ہونے کے لحاظ سے اور انسان ان افعال کو اپنے اختیار سے بجا لانے کے لحاظ سے یہی نظریہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے پیش کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔

استطاعت کے معنی کی وضاحت

کتاب الاحتجاج میں طبرسی نے عبایہ بن ربعی اسدی کے وہ سوالات ذکر کئے ہیں جو اس نے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے کئے ان میں سے ایک سوال "استطاعت" کے بارے میں ہے۔ جس کے جواب میں حضرت امیر المومنین نے ارشاد فرمایا: آیا آپ کے خیال میں اس استطاعت کا مالک صرف بندہ ہے یا بندہ اور خدا دونوں ہیں؟ عبایہ بن ربعی اس جواب نہ دے سکا اور خاموش ہو گیا تو امام علیہ السلام نے اس سے فرمایا: اے عبایہ! آپ خاموش کیوں ہو گئے ہیں اس جواب دیجئے تو اس نے کہا کہ مولا میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں امام نے ارشاد فرمایا: اس طرح کہو کہ قدرت استطاعت کا مالک صرف خدا ہے اور انسان صرف اس کی عطا کی ہوئی ملکیت رکھتا ہے یعنی جو ملکیت اور جس مقدار میں اسے خدا نے عطا کی ہے وہ اس سے زیادہ کا مالک نہیں اگر خدا اسے اس ملکیت سے محروم کر دے تو گویا اس نے انسان کی آزمائش کی اور جو کچھ خدا بندے کو دیتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پھر اسے اس پر کوئی ملکیت ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ انسان کی ملکیت کے باوجود خدا بھی اس سب کچھ کا مالک ہے جو اس نے اسے عطا کیا ہے، حقیقی ملکیت خدا کے پاس ہے اور جس پر اس نے انسان کو قدرت عطا کی اس پر وہ خود بھی قادر ہے۔

مذکورہ بالا روایت کا معنی و مفہوم ہمارے بیان کی روشنی میں نہایت واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔

مخلوق کے افعال کا خالق سے تعلق؟

کتاب شرح العقائد میں شیخ مفیدؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام ابوالحسن ثالث ...... امام علی نقی علیہ السلام...... سے روایت کی گئی کہ آپؑ سے لوگوں کے افعال کی بابت پوچھا گیا کہ آیا وہ خدا کی مخلوق (اس کے پیدا کئے ہوئے) ہیں؟ امامؑ نے جواب دیا کہ اگر خدا ہی ان افعال کا پیدا کرنے والا ہوتا تو پھر ان سے اظہار برائت کیوں کرتا جبکہ خدا نے ارشاد فرمایا ہے: "**ان اللہ بریءمن المشرکین**" (خدا مشرکوں سے بری ولاتعلق ہے) یہاں یہ مراد نہیں کہ خدا خود انہی سے لاتعلق ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے شرک اور برے کاموں سے بری ولاتعلق ہے (ان کی ذوات کی آفرینش سے نہیں بلکہ ان کے عقیدہ واعمال سے بری ولاتعلق ہے)

توضیح:

اس حدیث کی وضاحت میں عرض ہے کہ: افعال کی دو جہتیں ہیں (دو لحاظ اور حیثیتیں ہیں) ایک جہت ان کے ثبوت و وجود کی ہے یعنی ان کے وجود میں آنے اور تحقق پذیر ہونے کی جہت' اور دوسری ان افعال کے انجام دینے والے (فاعل) کی طرف نسبت کی ہے' اسی دوسری جہت (افعال کی نسبت فاعل کی طرف) کے حوالہ سے وہ افعال اطاعت یا معصیت اور نیکی یا برائی کہلاتے ہیں مثلاً نکاح اور زنا دونوں میں ثبوت وتحقق اور وقوع یعنی عمل کے واقع ہونے میں کوئی فرق نہیں، عمل وفعل کے لحاظ سے دونوں ایک جیسے ہیں لیکن دونوں میں جو بنیادی فرق پایا جاتا ہے وہ اس کا خدا کے حکم کے مطابق ہونا اور نہ ہونا ہے کہ اگر وہ فعل نکاح کے طور پر وجود میں آئے تو صحیح اور خدا کے حکم کے مطابق ہوگا اور اگر زنا کے طور پر انجام دیا جائے تو خدا کے حکم کے مخالف ہونے کی وجہ سے معصیت ہوگا' اسی طرح کسی انسان کو قصاص کے طور پر (قتل کے بدلے میں) قتل کیا جائے یا بغیر جرم کے قتل کیا جائے دونوں صورتوں میں "قتل" واقع ہوگا لیکن پہلی صورت میں صحیح اور دوسری صورت میں ناجائز ہے' یا یہ کہ کسی یتیم کو ظلم وزیادتی کے طور پر مارا پیٹا جائے یا اس کی تادیب واصلاح کے لیے اسے پیٹا جائے دونوں صورتوں میں مارنے پیٹنے کا عمل تو ایک جیسا ہوگا لیکن پہلی صورت میں ناجائز اور دوسری صورت میں جائز ہے' لہٰذا معاصی اور گناہوں میں معصیت وگناہ کرنے والا اس لیے عذاب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے کہ اس کا عمل صلاح ونیکی یا خدا کے حکم کی مطابقت یا اجتماعی ومعاشرتی فوائد سے خالی ہوتا ہے (یہی امر کسی عمل کے معصیت ہونے کا اصل سبب ومعیار ہے) لیکن اگر وہی عمل نیکی' خدا کی اطاعت وفرمانبرداری یا معاشرتی فوائد کی بنیاد پر انجام دیا جائے تو اگرچہ ظاہری طور پر دونوں کام ایک جیسے ہیں لیکن پہلی صورت میں نادرست اور دوسری صورت میں درست ہیں' یہ صرف اس جہت سے ہے کہ اس میں یہ امر ملحوظ ہوتا ہے کہ فعل کی نسبت انجام دینے والے کی طرف کیسی ہے؟ (فاعل کی حیثیت ہی تمام امور کی بنیاد ہے جبکہ خود فعل ایک عمل ہونے کے لحاظ سے برا نہیں کہلاسکتا) چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہء زمر، آیت ۶۲:

★ "اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ"

(خدا ہر چیز کا خالق...... پیدا کرنے والا...... ہے)۔

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز اس کی مخلوق ہے اور "فعل" بھی ایک شے ہے جو موجود بھی ہے اور ثابت بھی (اس کا وجود وثبوت اس کے "شے" ہونے کی دلیل ہے)۔

اور امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

★ "کل ما وقع علیه اسم شیئی فهو مخلوق ما خلا الله۔

(ہر وہ کہ جسے "شے" (چیز) کہا جاسکتا ہو وہ مخلوق ہے سوائے ایک کے کہ جو "خدا" ہے)۔

اس سے مراد یہ کہ اگر چہ اللہ پر بھی شے کا اطلاق ہوتا مگر وہ مخلوق نہیں، اس کے علاوہ ہر چے مخلوق ہے۔

پھر خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہء سجدہ، آیت ۷:

★ "اَلَّذِیْۤ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ"۔

(وہ خدا ہے کہ جس نے ہر شئے کی خلقت کو بہتر بنایا)۔

مذکورہ بالا آیات اور کلام امامؑ سے یہ ثابت ہوا کہ ہر شے چونکہ خدا کی مخلوق اور اس کی پیدا کی ہوئی ہے لہٰذا "خدا کی مخلوق" ہونے کے حوالہ سے "اچھی" بھی ہے پس خلقت اور حسن (اچھا ہونا) ایک دوسرے کے لازم وملزوم اور ساتھ ساتھ ہیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں وہ سکتے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خداوند عالم نے خود ہی بعض افعال کو "برا" کہا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

سورہء انعام، آیت ۱۶۰:

★ "مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤی اِلَّا مِثْلَهَا۔"

(جو شخص نیک عمل بجالائے اسے دس نیکیوں کی جزا دی جائے گی اور جو شخص برا عمل انجام دے اسے ایک ہی گناہ کی سزا دی جائے گی)۔

اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خداوند عالم نے ان افعال کو برا کہا ہے جو اس کی نافرمانی کرتے ہوئے انسان انجام دیتا ہے اور خدا نے ان افعال پر سزا مقرر کی ہے چونکہ اس نے ان افعال کے انجام دینے میں خدا کو چھوڑا اور اس سے روگردانی کر کے انہیں وجود میں لایا لہٰذا یہ "معصیت" اور گناہ کہلائے اس لیے انہیں خدا کی نسبت سے "عدمی" کہا جائے گا یعنی خدا نے انہیں "وجود" عطا نہیں کیا۔ اگر یہ افعال خدا کی مخلوق ہوتے اور خدا انہیں وجود عطا کرتا تو یقیناً اچھے ہوتے کیونکہ

خدا کی پیدا کی ہوئی کوئی شئے بری نہیں ہو سکتی۔

سورۂ حدید، آیت ۲۲:

★ "مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا"۔

(جو مصیبت روئے زمین پر یا خود تم پر نازل ہوتی ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوتی ہے)۔

سورۂ تغابن، آیت ۱۱:

★ "مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ"۔

(جو مصیبت آتی ہے وہ خدا کے اذن سے آتی ہے' اور جو شخص خدا پر ایمان لائے خدا اس کے دل کی ہدایت کرتا ہے)۔

سورۂ شوریٰ، آیت ۳۰:

★ "مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ"۔

(جو مصیبت تم پر آئے وہ تمہارے اپنے کیے کا نتیجہ ہے جبکہ خدا بہت سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے)۔

سورۂ نساء، آیت ۷۹:

★ "مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ"۔

(جو نیکی تمہیں نصیب ہو وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور جو برائی و تکلیف تمہیں پہنچے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے)۔

سورۂ نساء، آیت ۷۸:

★ "وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا"۔

(اگر انہیں کوئی نیکی و اچھائی حاصل ہو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انہیں کوئی تکلیف و پریشانی لاحق ہو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے' آپ کہہ دیں کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں)۔

مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ تمام تکلیفیں و مصیبتیں ایک نسبت سے برائیاں کہلاتی ہیں اور وہ یوں کہ خداوند عالم نے انسان کو جتنی نعمتیں عطا کی ہیں مثلاً امن و سلامتی' صحت و تندرستی' دولت و ثروتمندی تو انسان خود کو ان کا حامل اور ان سے مالا مال پاتا ہے لیکن جب انسان اپنے ہی ہاتھوں کسی ناگوار سبب و مصیبت کی وجہ سے ان نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ ناگوار واقعہ اور مصیبت اس کے لیے "برائی" قرار پاتی ہے کیونکہ وہ ان نعمتوں کے فقدان' محرومی اور ختم ہو

جانے کو بھی اپنے ساتھ لے آتی ہے پس ہرنا گوار واقعہ و مصیبت خدا کی طرف سے ہے البتہ اس واقعہ یا مصیبت کا برا ہونا اس حوالہ سے نہیں کہ وہ خدا کی طرف سے ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ انسان کے لیے ان نعمتوں سے محرومی کا سبب ہے جن سے وہ بہرہ ور تھا' پس ہر برائی ایک عدمی امر ہے اور عدمی ہونے کی وجہ سے وہ خدا کی طرف منسوب نہیں ہوسکتی جبکہ کسی اور لحاظ سے خدا کی طرف منسوب ہوتی ہے جیسے اذن وغیرہ۔

جبر و استطاعت کی مزید وضاحت، امام رضاؑ کی زبانی

کتاب قرب الاسناد میں بزنطی سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ ہمارے کچھ ساتھی جبر کا عقیدہ رکھتے ہیں اور کچھ استطاعت (انسان کے بااختیار ہونے) کے قائل ہیں' اس سلسلے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

(امامؑ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ: لکھو کہ خداوند عالم نے راشاد فرمایا ہے("اے ابن آدم! تو جو کچھ چاہتا ہے اور اپنے لیے جس چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ میری ہی مشیت و ارادہ سے ہوتا ہے' اور تو میری ہی عطا کی ہی قوت و طاقت سے میرے فرائض و واجبات کو ادا کرتا ہے' اور تو میری ہی عطا کی ہی نعمتوں کے ذریعے میری نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے' میں نے ہی تجھے سننے والا' دیکھنے والا اور طاقت والا بنایا ہے (یاد رکھ) کہ جو نیکی اور اچھائی تجھے حاصل ہو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی اور تکلیف تجھ پر آئے وہ خود تیری طرف سے ہے کیونکہ میں تیری نیکیوں کا تجھ سے زیادہ حقدار ہوں اور تو اپنی برائیوں کا مجھ سے زیادہ خود حقدار ہے اور یہ اس لیے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں اس کے بارے میں کوئی مجھ سے پوچھ گچھ نہیں کرسکتا اور لوگ جو کچھ کرتے ہیں ان سے ان کی بابت پوچھ گچھ ہوگی'') اس بیان سے میں نے تیرا مقصد پورا کر دیا ہے اور تو جو کچھ چاہتا تھا میں نے اس کی بابت سب کچھ ذکر کر دیا ہے۔

یہ روایت یا اس جیسی دیگر روایات شیعہ و سنی کتب میں ذکر کی گئی ہیں ان سب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے افعال میں سے جو فعل' معصیت و گناہ ہے اسے معصیت و گناہ ہونے کے لحاظ سے خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا' اس بیان سے امام علیہ السلام کے اس فرمان کا مطلب بھی معلوم ہو جاتا ہے جو آپؑ نے پہلی روایت میں فرمایا تھا کہ "اگر خدا ان افعال کا خالق ہوتا تو وہ ان سے نفرت و بیزاری یا لاتعلقی کا ہرگز اظہار نہ کرتا' خدا نے تو ان لوگوں کے شرک اور قبیح اعمال سے اظہار برائت و لاتعلقی کیا ہے۔

فضاء وخلاء سے زیادہ وسیع

کتاب التوحید میں امام ابوجعفرؑ اور امام ابوعبداللہؑ سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ ان دو بزرگواروں نے ارشاد فرمایا:

(ان اللہ عز و جل ارحم بخلقہ من ان یجبر خلقہ علی الذنوب ثم یعذبھم علیھا . واللہ اعز من ان یرید امراً فلا یکون)

خداوند عالم اپنے بندوں پر مہربان ہے اور وہ اس سے بالاتر ہے کہ انہیں گناہوں پر مجبور کرے پھر انہیں ان گناہوں کے ارتکاب پر سزا دے اور خدا اس سے زیادہ طاقت اور غلبہ رکھتا ہے کہ وہ کسی چیز کا ارادہ کرے اور وہ وقوع پذیر نہ ہو......راوی کہتا ہے کہ ان بزرگواروں سے پوچھا گیا کہ آیا جبر اور قدر کے درمیان کوئی تیسری شق بھی پائی جاتی ہے؟ انہوں نے ارشاد فرمایا: (نعم، اوسع مما بین السماء والارض) ہاں! وہ تیسری شق آسمان اور زمین کے درمیان پائی جانے والی فضا و خلا سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

محمد بن عجلان کی روایت سے استناد

اسی کتاب (التوحید) میں محمد بن عجلان سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ آیا خدا نے تمام امور لوگوں کے سپرد کر دیئے ہیں؟ امامؑ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ وہ تمام امور لوگوں کے سپرد کر دے، میں نے پھر پوچھا کہ آیا خدا نے اپنے بندوں کو ان کاموں پر مجبور کیا ہے جو وہ کرتے ہیں، امامؑ نے فرمایا: خداوند عالم اس سے کہیں زیادہ عدل و انصاف والا ہے کہ وہ کسی بندے کو کسی کام پر مجبور کرے اور پھر اسی کام کی وجہ سے اسے سزا دے اور عذاب میں مبتلا کرے۔

امام صادقؑ کا مہزم سے مکالمہ

کتاب التوحید میں ایک روایت مہزم سے منقول ہے اس نے کہا: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھ سے ارشاد فرمایا: (اخبرنی عما اختلف فیہ من خلفك من موالینا؟)

مجھے بتاؤ کہ تمہارے وطن میں ہمارے چاہنے والوں کے درمیان کس بات میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے؟

(قلت فی الجبر والتفویض!) میں نے عرض کی کہ جبر اور تفویض کے مسئلہ میں وہ آپس میں اختلاف رائے رکھتے ہیں؟

(قال: فاسالنی!) امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ تو اس سلسلے میں مجھ سے پوچھ لے!

(قلت: اجبر اللہ العباد علی المعاصی؟) میں نے پوچھا کہ آیا خداوند عالم نے اپنے بندوں کو گناہوں پر مجبور کیا ہے؟

(قال: اللہ اقھر من ذلك) امامؑ نے ارشاد فرمایا' خداوند عالم اپنے بندوں کو ایسا کرنے سے زیادہ طاقت و غلبہ رکھتا ہے (اسے ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہیں)

(قلت: ففوض اليهم ؟) میں نے عرض کی: تو کیا خدا نے تمام امور ان کے سپرد کر دیئے ہیں؟

(قال: الله اقدر عليهم من ذالك) امامؑ نے ارشاد فرمایا: خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔

(قلت: فاى شيى هذا؟) میں نے عرض کی کہ اگر خدا نے انہیں مجبور بھی نہیں کیا اور تمام امور ان کے سپرد بھی نہیں کئے تو پھر اس نے کیا کیا ہے؟

(راوی کہتا ہے کہ) (فقلب يده مرتين او ثلاثاً ثم قال: لو اجبتک فيه لكفرت) اس کے بعد امامؑ نے دو تین مرتبہ اپنے ہاتھوں کو الٹایا اور سیدھا کیا اور پھر فرمایا کہ اگر اس کا مفصل جواب بتاؤں تو تو کافر ہو جائے گا۔ (شاید اس سے مراد یہ ہو کہ ان مطالب کا صحیح ادراک نہ کر سکنے کے نتیجہ میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تو کافر ہو جائے)۔

توضیح:

امامؑ کے اس فرمان کہ "اللہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ طاقت اور غلبہ رکھتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو کسی کام پر مجبور کرتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس پر اتنا غلبہ و طاقت رکھتا ہو کہ مجبور کیا جانے والا شخص اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو تا کہ جو کام مجبور کرنے والا چاہے تو مجبور کیا جانے والا شخص اپنے ارادہ و اختیار کے بغیر اسے انجام دے دے (مجبور کیا جانے والا شخص مجبور کرنے والے کے مقابلہ میں ناتوان اور اپنی قوت ارادی کے استعمال کی تاب و طاقت سے محروم ہو جائے) اور اس سے زیادہ غلبہ و طاقت والا شخص وہ ہو گا جو کسی کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ ہر کام اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دے اور وہ شخص ہر کام اپنے مکمل ارادہ و اختیار سے انجام بھی دے اور اس طرح سے انجام دے کہ نہ تو خود اپنے ارادہ و اختیار کو کھو بیٹھے اور نہ ہی اس کا ارادہ حکم دینے والے کے ارادہ سے متصادم ہو۔

فرمان نبویؐ بزبان امامؑ

کتاب التوحید ہی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(قال رسول الله (ص): من زعم ان الله يأمر بالسوء والفحشاء فقد كذب على الله ومن زعم ان الخير والشر بغير مشية الله فقد اخرج الله من سلطانه) حضرت پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص یہ گمان کرے کہ خدا نے لوگوں کو برائیوں کا حکم دیا ہے اس نے خدا پر جھوٹ بولا اور جس نے یہ گمان کیا کہ خیر اور شر خدا کی مشیت کے بغیر وجود پذیر ہوتے ہیں اس نے خدا کو اس کی سلطنت کے دائرے سے خارج کر دیا۔

چار اصحاب کا ایک ہی بیان

کتاب "الطرائف" میں ہے کہ ایک روایت کے مطابق حجاج بن یوسف نے حسن بصری، عمرو بن عبید، واصل بن

عطاء اور عامر شعبی کو خطوط لکھے اور ان سے قضا وقدر کے بارے میں پوچھا اور لکھا کہ اس مسئلہ کی بات جو کچھ انہیں معلوم ہے وہ تحریر کریں۔

(۱) حسن بصری نے اپنے جواب میں لکھا: اس مسئلہ کی بابت سب سے بہتر بیان وہ ہے جو میں نے حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے سنا کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: (اتظن ان الذی نہاك دہاك ؟ وانما دہاك سفلك واعلاك والله بری ء من ذاك ؟) آیا تو نے گمان کرلیا ہے کہ جس نے تجھے گناہ سے روکا اسی نے تجھے گناہ پر مجبور کیا؟ ہرگز ایسا نہیں، درحقیقت تجھے تیرے ہی نیچے اور اوپر نے گناہ پر آمادہ کیا اور معصیت کی راہ پر لگایا، خدا اس سے مبرا ہے۔

(۲) عمرو بن عبید نے اپنے جواب میں یوں لکھا: قضا وقدر کے سلسلہ میں سب سے بہتر کلام جو میں نے سنا ہے وہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا کلام ہے، آپؑ نے ارشاد فرمایا: (لو کان الوزر فی الاصل محتوماً لکان الموزور فی القصاص مظلوماً) اگر خیانت و دھوکہ دہی اصل میں حتمی و لازمی امر ہوتا (خدا کی طرف سے طے شدہ ہوتا) تو خیانت کار شخص کا قصاص ظلم ہوتا (اسے سزا دینا روا نہ ہوتا) اور وہ اس میں مظلوم قرار پاتا، (جبکہ ہرگز ایسا نہیں)۔

(۳) واصل بن عطاء نے اپنے جواب میں یہ لکھا: قضاء وقدر کی بابت سب سے بہتر قول جو میں نے سنا ہے وہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا قول ہے۔ آپؑ نے ارشاد فرمایا، (ایدلك علی الطریق و یاخذ علیك المضیق ؟) آیا خداوند عالم تجھے سیدھا راستہ دکھا کر پھر خود ہی اسے تیرے لیے تنگ کرتا ہے تاکہ اس پر چل ہی نہ سکے؟ (ایسا ہرگز ممکن نہیں)۔

(۴) شعبی نے بھی اپنے جواب میں یوں تحریر کیا: قضا وقدر کی بابت سب سے بہتر کلام جو میں نے سنا وہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا کلام ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (کلما استغفرت الله منه فهو منك و کلما حمدت الله علیه فهو منه) ہر وہ کام جس کے انجام دینے کے بعد تو خدا سے طلب مغفرت کرے وہ تیری طرف سے ہے اور ہر وہ کام جس کے انجام دینے پر تو خدا کی حمد بجا لائے وہ خدا کی طرف سے ہے"۔

جب یہ چاروں خطوط حجاج بن یوسف کے پاس پہنچے تو وہ ان سب تحریروں کو دیکھ کر حقیقت امر سے آگاہ ہوا اور کہنے لگا کہ ان سب حضرات نے ان عمدہ مطالب کو حقائق کے پاکیزہ سرچشمہ سے حاصل کیا ہے (لقد اخذوها من عین صافیة) ۔

امام جعفر صادقؑ کا عظیم بیان

کتاب الطرائف میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام سے قضاء وقدر کے

بارے میں پوچھا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(ما استطعت ان تلوم العبد علیه فهو منه وما لم تستطع ان تلوم العبد علیه فهو من فعل الله، یقول الله للعبد: لم عصیت؟ لم فسقت: لم شربت الخمر؟ لم زنیت؟ فهو فعل العبد، ولا یقول له لم مرضت؟ لم قصرت؟ لم ابیضضت؟ لم اسوددت؟ لانه من فعل الله تعالیٰ)

ہر وہ کام جس کے انجام دینے پر تو اس کے انجام دینے والے کو ملامت کرے (اس کی مذمت کرے) وہ کام اس کی اپنی طرف سے ہے اور جس کام پر تو اس کے انجام دینے والے کو مورد ملامت قرار نہ دے وہ خدا کی طرف سے ہے۔ خداوند عالم اپنے بندے سے کہتا ہے کہ: تو نے کیوں میری نافرمانی کی؟ تو نے کیوں برا کام کیا؟ تو نے کیوں شراب نوشی کی؟ کیوں تو نے زنا کیا؟ یہ سب افعال بندے ہی کے ہیں، لیکن خدا کبھی اپنے بندے سے یہ نہیں کہتا کہ تو کیوں بیمار ہوا؟ تیرا قد کیوں چھوٹا ہے؟ تو کیوں سفید رنگ والا ہے؟ تو کیوں کالے رنگ والا ہے؟ کیونکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔

توحید کی بابت امام علیؑ کا جامع ارشاد

نہج البلاغہ میں مذکور ہے کہ کسی نے امیر المومنینؑ سے توحید اور عدل کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: (التوحید ان لا تتوهمه. والعدل ان لا تتهمه) توحید یہ ہے کہ اس کے بارے میں کسی قسم کا وہم نہ کرو اور عدل یہ ہے کہ اسے کسی سلسلہ میں مورد الزام نہ ٹھہراؤ۔

تبصرہ و تحقیق:

جبر و تفویض اور قضاء و قدر کی بابت مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل کثیر روایات موجود ہیں، اور ہم نے صرف وہی روایات ذکر کی ہیں جن میں وہ تمام مطالب بیان کر دیئے گئے ہیں جو ان کثیر روایات میں مذکور ہیں جنہیں ہم نے یہاں ذکر نہیں کیا، اگر قارئین کرام ان روایات میں مذکور مطالب پر اچھی طرح غور کریں تو اس امر سے آگاہ ہو جائیں گے کہ ان میں قضا و قدر کے سلسلہ میں استدلال کے چند خاص طریقے بیان کئے گئے ہیں، ان خاص طریقہ ہائے استدلال میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) امر و نہی اور ثواب و عقاب کے حوالہ سے استدلال

اس حوالہ سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ خداوند عالم نے جو احکامات بھیجے ان میں بندوں کو اختیار دیا ہے کہ وہ انجام دیں یا نہ دیں ان کی انجام دہی میں انہیں مجبور کیا اور نہ ہی سب امور ان کے سپرد کر دیئے (نہ جبر اور نہ تفویض) بلکہ امر و نہی کے ذریعے امتثال و اطاعت پر ثواب اور عصیان و نافرمانی پر عذاب سے آگاہ کیا ہے، یہ وہ طریقہ استدلال ہے جو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے اس بیان میں موجود ہے جو آپؑ نے اس بوڑھے آدمی کے جواب میں فرمایا جس نے آپؑ سے

جنگ کے لیے جانے کی بابت پوچھا تھا کہ آیا وہ خدا کی قضا وقدر سے تھا یا ہمارے اپنے اختیار سے؟ اسی طرح کا طریقہء استدلال ہمیں ان قرآنی آیات سے بھی حاصل ہوا ہے جو ہم سلسلہء بحث میں ذکر کر چکے ہیں۔

(۲)۔ قرآنی مطالب سے استدلال

ان امور کے ذریعے استدلال جو قرآن مجید میں ذکر کئے گئے ہیں' کہ اگر جبر یا تفویض کا نظریہ صحیح ہو تو وہ امور غلط ثابت ہوں گے (جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا) مثلاً خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہء شوریٰ، آیت:

★ " لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔۔ "۔

(خدا ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی ملکیت واقتدار)۔

سورہء فصلت، آیت ۴۶:

★ " وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ "۔

(تیرا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں)۔

سورہء اعراف، آیت ۲۸:

★ " قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ "۔

(کہہ دیجئے کہ اللہ کسی برے کام کا حکم نہیں دیتا)۔

اس آخری آیت کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کسی فعل کو فحشاء یا ظلم اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ ہم انسانوں کی طرف منسوب ہو لیکن اگر وہی فعل خدا کی طرف منسوب ہو تو پھر اسے فحشاء اور ظلم نہیں کہا جائے گا لہٰذا خدا سے فحشاء اور ظلم سرزد نہیں ہوتا' لیکن اگر آیت کے ابتدائی جملہ اور اس کے معنی و مدلول پر اچھی طرح غور کیا جائے تو اس کا جواب موجود ہے' خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

★ " وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ "۔

(جب وہ کوئی برا کام انجام دیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا وہ بھی ایسا ہی کرتے تھے اور خدا نے ہی ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے' آپ کہہ دیجئے کہ خدا ہرگز فحشاء اور برے کام کا حکم نہیں دیتا)۔

اس آیت میں کلمہ "ھذا" استعمال کیا گیا ہے اس سے اسی فحشاء کی طرف اشارہ ہے جو وہ کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ھذا یعنی "یہ" وہ کام ہے جس کا ہمیں خدا نے حکم دیا ہے' اور آیت کا آخری جملہ "کہہ دیجئے کہ خدا برے کام کا حکم نہیں دیتا" ان کے قول کی تردید کرتا ہے' تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ برا عمل جس کی نسبت وہ خدا کی طرف دیتے تھے خدا نے اس کی نفی کر دی' اب اس عمل کو فحشاء کا نام دیا جائے یا فحشاء کا نام نہ دیا جائے' دونوں صورتوں میں خدا نے اس عمل کی اپنی طرف نسبت کی نفی

کردی ہے' لہٰذا کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

(۳)۔صفات کے حوالہ سے استدلال

اس حوالہ سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ خداوند عالم کو اسماء حسنیٰ......اچھے ناموں......کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے وہ بلند و پاکیزہ اور عالی صفات کا حامل ہے' اور وہ صفات ایسی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے جبر یا تفویض ممکن نہیں' مثلاً خداوند عالم کی صفات میں سے یہ ہے کہ وہ قہار (بہت زیادہ غلبہ والا)، قادر (طاقت رکھنے والا)، کریم (عنایتوں والا)، رحیم (مہربان) ہے تو یہ ایسی صفات ہیں کہ ان کے حقیقی معانی خدا کی ذات کے لیے تبھی ثابت ہو سکتے ہیں جب یہ کہا جائے کہ ہر چیز کا وجود اس کی طرف سے ہے وہ تمام موجودات کا سرچشمہء وجود و ہستی ہے' اور کسی چیز کا نقص اور خرابی خود اسی چیز کی طرف منسوب کی جا سکتی ہے نہ کہ خدا کی مقدس و پاکیزہ ذات کی طرف' جیسا کہ ان روایات میں بھی ان مطالب کو بیان کیا گیا ہے جو ہم نے کتاب التوحید سے ذکر کی ہیں۔

(۴)۔استغفار اور ملامت کے حوالہ سے استدلال

استغفار اور ملامت کے حوالہ سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ اگر گناہ خود بندے کی طرف سے نہ ہو تو استغفار اور خدا سے طلب مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اور اگر جبر کا عقیدہ رکھتے ہوئے یہ کہا جائے کہ ہر کام خدا کی طرف سے ہے تو پھر اچھے اور برے کام میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے گا اور کسی بندے کو اس کے برے کام پر ملامت کرنا اور اچھے کام پر ملامت نہ کرنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ جب سب کام خدا کی طرف سے ہوں تو بندوں کو برا یا اچھا کہنے کا جواز ہی باقی نہیں رہے گا۔ اور نہ ہی برے کاموں پر استغفار کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔

بعض مربوطہ روایات:

اس مقام پر ان روایات میں سے بعض کو ذکر کیا جاتا ہے جو ان آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں جن میں اضلال (گمراہ کرنا) طبع (دلوں پر مہر لگا دینا) اغواء (دھوکہ دینا) اور اس قسم کے امور کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے: (ملاحظہ ہو)

کتاب العیون (عیون اخبار الرضاؑ) میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے آیہ "وترکھم فی ظلمات لا یبصرون" (سورہء بقرہ آیت ۱۷) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس آیت میں کہا گیا ہے کہ خداوند عالم انہیں چھوڑ دیتا ہے اندھیروں اور تاریکیوں میں کہ پھر وہ دیکھ نہیں سکتے' اس چھوڑ دینے سے مراد وہ چھوڑ دینا نہیں جس طرح لوگ کسی چیز کو چھوڑ دیتے ہیں' اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم جب یہ جان لیتا ہے کہ یہ لوگ اب کفر اور گمراہی سے منہ نہیں موڑتے تو وہ ان کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور ان پر اپنی عنایت کو روک لیتا ہے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے اختیار اور مرضی سے جو چاہیں کریں۔ (ان اللہ لا یوصف بالترك كما یوصف خلقه لكنه متی علم انهم لا یرجعون عن الكفر والضلال منعهم المعاونة واللطف و خلی بینهم

و بین اختیارھم)

اسی طرح کتاب العیون میں امام رضاؑ ہی سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے " خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ " ..... خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے...... کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: (الختم ھو الطبع علیٰ قلوب الکفار عقوبۃ علیٰ کفرھم کما قال اللہ تعالیٰ: بل طبع اللہ علیھا بکفرھم فلا یومنون الا قلیلا) کافروں کے دلوں پر مہر لگانے سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے کفر کی سزا کے طور پر ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے' جیسا کہ خدا نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے: (سورہ ءنساء آیت ۱۵۵) " بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا " -(بلکہ خدا ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے کہ پھر سوائے چند لوگوں کے ان میں سے کوئی ایمان کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہوتا)۔

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے آیت " ان اللہ لا یستحی " کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: (ھذا القول من اللہ رد علی من زعم ان اللہ تبارك و تعالی یضل العباد ثم یعذبھم علیٰ ضلالتھم) خدا کا یہ فرمان درحقیقت ان لوگوں کی رد میں ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ خداوند عالم ہی بندوں کو گمراہ کرتا ہے پھر اسی گمراہی کی وجہ سے ان پر عذاب کرتا ہے۔

اس روایت کی تشریح پہلے ذکر ہو چکی ہے۔

ایک فلسفیانہ بحث

یہ مطلب ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ہم جن امور کو عالم خارج میں "نوع" کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ درحقیقت ان چیزوں سے عبارت ہیں جو افعال نوعیہ رکھتی ہیں یعنی ان کے تمام افراد کا عمل ایک جیسا ہے' اور وہ "انواع" ان افعال کے موضوعات ہیں' لہٰذا جب ہم ان "انواع" کے وجود کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کے آثار وافعال کے ذریعے ثابت کرتے ہیں اور انہی آثار وافعال کے حوالہ سے ان "انواع" کو ایک دوسرے سے تمیز دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں نوع ہے اور یہ فلاں نوع ہے' چنانچہ ہم اپنے "حواس" کے ذریعے مختلف قسم کے افعال اور گوناگوں آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ہمارے حواس ان ظاہری افعال وآثار کے علاوہ کسی دوسری چیز کو اپنے دائرہ احساس میں نہیں لاتے' ان آثار وافعال کو دیکھنے کے بعد ہم قیاس اور دلیل وبرہان کے سہارے ان افعال کی علت فاعلیہ (انہیں انجام دینے والے) کو ثابت کرتے ہیں (کیونکہ ہر فعل فاعل کا محتاج ہوتا ہے اور کوئی اثر موثر کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا) وہ علت فاعلیہ ان آثار وافعال کا "موضوع" اور سرچشمہ کہلاتی ہے' ان آثار وافعال کی علت فاعلیہ کو ثابت ومعلوم کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ چونکہ یہ آثار وافعال جو ہمارے مشاہدہ میں آئے ہیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لہٰذا ان کے موضوعات یعنی "انواع" بھی ایک جیسے نہیں بلکہ وہ بھی مختلف ہیں' (آثار وافعال کے مختلف ہونے سے ان کے موضوعات وانواع کے مختلف ہونے کا پتہ ملتا

ہے) مثلاً انسان کے افعال دیگر انواع حیوانات کے افعال سے مختلف ہوتے ہیں لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ افعال کے مختلف ہونے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے انجام دینے والے بھی مختلف ہیں یعنی کئی قسم کی ''انواع'' موجود ہیں اور ہر ''نوع'' کے اپنے مخصوص افعال ہیں' پس جب آثار و افعال کے مختلف ہونے سے ہم نے ان کے انجام دینے والوں (موضوعات' انواع کے مختلف ہونے کو جان لیا تو یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ چونکہ انجام دینے والے (موضوعات) ایک جیسے نہیں لہٰذا ان کے آثار و افعال بھی ایک جیسے نہیں ہوں گے اور ہر فعل و اثر کی اپنی مخصوص صفت و خصوصیت ہے۔ گویا صفات خصوصیات اور اعراض و آثار فعل کا مختلف ہونا ان کے موضوعات کے مختلف ہونے کو واضح کرتا ہے۔

(مذکورہ بالا بیان کو سادہ الفاظ میں پیش کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والا ہر کام ایک فاعل کا محتاج ہوتا ہے۔ کوئی فعل فاعل کے بغیر رونما نہیں ہوتا اور چونکہ دنیا میں فاعل ایک جیسے نہیں لہٰذا ان کے افعال بھی ایک جیسے نہیں اور فاعل کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہر فعل مخصوص صفت اور خصوصیت کا حامل ہوتا ہے)۔

بہر حال تمام افعال اپنے موضوعات کے اعتبار سے ابتدائی تقسیم کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

(۱)۔ وہ افعال جو کسی چیز کی طبیعت (فطری مزاج) کہ جسے انگریزی زبان میں نیچر کہا جاتا ہے سے سرزد ہوتے ہیں اور ان کے وجود میں آنے کی بابت اس چیز کا علم دخیل نہیں ہوتا یعنی جس چیز کی طبیعت اس کام کو وجود میں لاتی ہے اس چیز کے علم کا عمل دخل نہیں ہوتا جیسے بدن کی نشوونما اور بڑھنا' نباتات کا غذا کھانا' اجسام کی حرکات (پانی کی روانی' آگ کی حرارت وغیرہ) اور صحت و تندرستی اور مرض و بیماری وغیرہ اگرچہ ہمیں یہ سب معلوم و محسوس ہوتے ہیں بلکہ ہمارے ہی ساتھ قائم و وابستہ ہوتے ہیں لیکن ہمارا انہیں جان لینا ان کے وجود میں آنے یا نہ آنے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ صرف اپنے طبیعی فاعل (اس چیز کی طبیعت اور نیچر) کے ذریعے وجود میں آتے ہیں اور طبیعت ہی ہے جو ان کے وجود میں آنے کی بنیاد ہے۔

(۲)۔ وہ افعال جو اپنے فاعل کے ذریعے اس طرح وجود میں آتے ہیں کہ ان کے وجود میں آنے کا تعلق فاعل کے علم سے ہوتا ہے یعنی فاعل کا علم ان کے وجود میں آنے میں دخیل ہوتا ہے جیسے انسان کے وہ تمام افعال جو وہ اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دیتا ہے اور اسی طرح وہ افعال جو شعور رکھنے والے حیوانات انجام دیتے ہیں' تو اس قسم کے افعال کا وجود میں آنا اپنے فاعل کے ذریعے اس سبب سے ہوتا ہے کہ وہ ان کے متعلق علم رکھتا ہے اور اپنے علم کے سہارے ان کی تشخیص و تمیز کرتا ہے' پس اس فعل کی بابت علم ہونا ہی اسے دوسرے فعل سے تمیز دیتا ہے اور اس کی پہچان کرواتا ہے اور اس کی تشخیص و تمیز شناخت و تعین کرواتا ہے یعنی یہ کہ اس کا وجود میں آنا انجام دینے والے کے لیے ایک ''کمال'' ہے صرف علم کے ذریعے ممکن ہوتا ہے' تو گویا علم' فاعل اور اس کے فعل کے درمیان ایک قسم کے واسطہ اور ذریعہ کا کام دیتا ہے کیونکہ اسی کی بناء پر فاعل نے اس فعل کو وجود میں لانے کا فیصلہ کیا اور ہر فاعل خواہ کوئی بھی ہو تب ہی کسی فعل کو بجا لاتا ہے جب اس کا ''کمال'' اس کے وجود میں آنے کا متقاضی ہو' بنابراین اس طرح پر انجام دیا جانے والا کام اس لحاظ سے علم کا محتاج ہوتا ہے کہ انجام د

والے کو اس امر سے آگاہی حاصل ہو سکے کہ کون سا کام اس کے لیے ''کمال'' اور کون سا ''کمال'' نہیں اور پھر وہ اس کو وجود میں لانے اور نہ لانے کا صحیح طور پر فیصلہ کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ افعال جو انسان کے وجود میں پائی جانے والی فطری صلاحیتوں کے ذریعے وجود میں آتے ہیں جیسے بولتے وقت ملے جلے اور مرتب و منظم حروف کی آوازوں کا نکلنا' اور وہ افعال جو ان فطری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ انسانی طبع کی بنیادی ضرورت کے طور پر وجود میں آتے ہیں جیسے انسان کا سانس لینا اور اسی طرح وہ افعال جو غم واندوہ اور خوف وہراس کی شدت کے عالم میں انسان سے سرزد ہوتے ہیں ان تمام افعال اور ان سے ملتے جلتے افعال میں انسان کو کسی قسم کے غور وفکر اور سوچ وبچار کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ان تمام افعال کی ایک ہی علمی وذہنی شکل ہوتی ہے اور وہی علمی و ذہنی صورت ہی ظاہر اور عالم خارج پر منطبق ہوتی ہے لہٰذا ان تمام افعال کے ایک جیسا ہونے کی وجہ سے فاعل کو غور وفکر کرنے اور سوچ وبچار کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور وہ بلاتوقف انہیں انجام دیتا ہے' لیکن وہ افعال جن کی ایک سے زیادہ علمی و ذہنی صورتیں ہیں ان میں سے بعض حقیقی معنوں میں یا انجام دینے والے کے خیال میں اس کے لیے ''کمال'' ہوتی ہیں اور بعض اس کے لیے ''کمال'' نہیں ہوتیں' جیسے روٹی کھانا اس شخص کے لیے جسے بھوک لگی ہو اگرچہ ایک لحاظ سے ''کمال'' کہلاتا ہے کیونکہ وہ اس کے سیر ہونے اور بھوک کے دور ہونے کا سبب ہے لیکن اس میں یہ امکان بھی پایا جاتا ہے کہ وہ روٹی کسی دوسرے کی ملکیت ہو یا اس میں زہر ملا ہوا ہو یا اس قدر خراب ہو کہ طبیعت اس کے کھانے سے کراہت کرے تو ان تمام صورتوں کے پیش نظر انسان اس روٹی کے کھانے میں غور کرتا ہے اور اچھی طرح دیکھ بھال کے بعد جو صورت مناسب نظر آئے اسے اختیار وترجیح دیتا ہے اور جب کسی ایک صورت کو اختیار کر لے تو پھر دوسری تمام صورتیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور صرف وہی صورت انسان کے لیے ''کمال'' کا درجہ رکھتی ہے جو اس نے اختیار کی اور غور وفکر اور سوچ وبچار کے بعد اسے دوسری صورتوں پر ترجیح دی۔

ہم مذکورہ بالا دو صورتوں میں سے پہلی قسم کے افعال کو ''اضطراری افعال'' کا نام دیتے ہیں جیسے طبعی تاثیرات وغیرہ' اور دوسری قسم کے افعال کو ''ارادی افعال'' کے نام سے یاد کرتے ہیں جیسے چلنا پھرنا اور بولنا وغیرہ۔ (اضطراری افعال یعنی وہ کام جن کا وجود میں آنا ہمارے ارادہ واختیار سے تعلق نہیں رکھتا اور ارادی افعال یعنی وہ کام جو ہمارے ارادہ واختیار کے بغیر وجود میں نہیں آتے)۔

''ارادی فعل'' کہ جو علم وارادہ سے تعلق رکھتا ہے اور فاعل کے علم وارادہ کے ذریعے وجود میں آتا ہے ایک تقسیم کی بنیاد پر اس کی دو قسمیں ہیں (کیونکہ فاعل جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے دوراہے پر پہنچتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اسے انجام دوں یا نہ دوں تو ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا اور اسے دوسرے پر ترجیح دینا دو طرح پر ہے):

(۱)۔ فاعل...... انجام دینے والا...... خود اس کا فیصلہ کرے اور اس کے ارادہ واختیار میں کسی دوسرے فاعل کا عمل دخل نہ ہو' جیسے وہ شخص جسے سخت بھوک لگی ہو اور اس کے سامنے روٹی رکھی ہو تو وہ اس کو کھانے یا نہ کھانے کے بارے میں اچھی

طرح سوچ کر یا تو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے نہ کھائے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روٹی کسی دوسرے کی ملکیت ہے اور اس کے مالک نے اس کے کھانے کی اجازت نہیں دی ہے لہٰذا کسی کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر استعمال میں لانا جائز نہیں اس لیے اس کے نہ کھانے کو ترجیح دیتا ہے' یا یہ کہ اس کے کھانے کو ترجیح دیتا ہے اور جان لیتا ہے کہ اس کا استعمال اس کے لیے جائز ہے' وہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب اپنے مکمل اختیار و ارادہ سے کرتا ہے۔

(۲)۔ فاعل (انجام دینے والا) کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ خود نہیں کرتا بلکہ کوئی دوسرا اس کے ارادہ و اختیار پر حاوی ہوتا ہے' مثلاً کوئی جابر و ظالم شخص اسے مجبور کرے کہ فلاں کام کرو ورنہ تمہیں قتل کر دوں گا تو قتل وغیرہ کی دھمکی کی وجہ سے وہ اس کام کو مجبور ہو کر انجام دے جبکہ وہ خود اس کام کو انجام دینا نہ چاہتا ہو۔

ان دو صورتوں میں سے پہلی قسم کے افعال کو ''اختیاری'' اور دوسری قسم کے افعال کو ''اجباری'' افعال کہا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب پر اچھی طرح غور کرنے سے آپ اس امر سے آگاہ ہو سکتے ہیں کہ ''اجباری فعل'' (کسی جابر کے ہاتھوں مجبور ہو کر انجام دیا جانے والا کام) اگرچہ جبر کرنے والے کے جبر کی وجہ سے وجود میں آتا ہے اور جبر کرنے والا شخص ہی اس فعل کے فاعل اور انجام دینے والے کو ''کرنے اور نہ کرنے'' کی دو صورتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے پر مجبور کر کے دوسری کو اس کے لیے ناممکن و ممنوع قرار دیتا ہے اور اسے اس طرح پر مجبور کرتا ہے کہ فاعل کے لیے اس کی مرضی پر چلنے کے سوا کوئی چارہ ءکار باقی نہیں رہتا' لیکن یہ اجباری فعل بھی اختیاری فعل کی طرح اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک کہ اس کا فاعل جو کہ مجبور ہے اس کام کے کرنے کو اس کے نہ کرنے پر ترجیح نہ دے' اگرچہ ایک لحاظ سے جبر کرنے والا شخص ہی اس بات کا سبب بنا ہے کہ وہ اس کام کو انجام دے تاہم اس کام کا وجود میں آنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ اسے انجام دینے والا اس کے کرنے کو اس کے نہ کرنے پر ترجیح نہ دے (خواہ اس کا ترجیح دینا جبر کرنے والے کے جبر اور دھمکی کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو) اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بات از روئے وجدان ثابت ہے اس کے لیے کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہیں' اور اس بیان اور وضاحت سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ ''ارادی افعال'' کو دو قسموں یعنی ''اختیاری افعال'' اور ''اجباری افعال'' میں تقسیم کرنا ان کی حقیقی تقسیم نہیں کہلا سکتا کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ '' مقسم'' (یعنی ''ارادی فعل'') کی دو قسمیں ہیں جو کہ ذات و آثار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں' کیونکہ ''ارادی فعل'' اس کام کو کہا جاتا ہے جسے کرنے کا ارادہ خود فاعل کرے خواہ وہ اس کا ارادہ اپنے اختیار سے کرے یا مجبور ہو کر کرے' اس مطلب کو علمی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''ارادی فعل'' علمی تعین و ترجیح چاہتا ہے کہ جس کی بنیاد پر فاعل اپنے فعل کی سمت متعین کرتا ہے اور ایسا کرنا اختیاری اور اجباری فعل دونوں میں یکساں ہوتا ہے' البتہ ان دو سمتوں اور جہتوں یعنی ''کرنے اور نہ کرنے'' میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا اختیاری فعل میں خود فاعل کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے جبکہ اجباری فعل میں وہ ترجیح کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے' اور یہ بات ایسی نہیں کہ جس کی بنیاد پر ان دونوں افعال کو ارادی فعل کی دو ایسی مختلف قسمیں بنا دیا جائے کہ ان میں سے ہر ایک کے ذاتی آثار دوسری قسم سے مختلف ہوں ایسا ہرگز نہیں' اس کی مثال یوں پیش کی جا سکتی ہے کہ کوئی

شخص کسی دیوار کے سایے میں بیٹھا ہو اور وہ دیکھے کہ دیوار گرنے والی ہے اور وہ فوراً وہاں سے اٹھ کھڑا ہو اور دور بھاگے' اس کا ایسا کرنا اس کا اختیاری فعل کہلاتا ہے' اور اگر وہ خود نہ اٹھے بلکہ کوئی اور شخص اسے دھمکی دے کہ اگر تو نہ اٹھا تو میں تجھ پر یہ دیوار گرا دوں گا اور وہ اس شخص کے ڈرانے دھمکانے سے وہاں سے اٹھ کھڑا ہو تو اس کا ایسا کرنا اجباری فعل کہلاتا ہے' جبکہ اس کے وہاں سے اٹھ کھڑا ہونے اور دور چلے جانے کا عمل ایک جیسا ہے یعنی اس نے خود ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہونے کو وہاں پر بیٹھے رہنے پر ترجیح دی فرق صرف یہ ہے کہ پہلی صورت میں اس کا وہاں سے اٹھ کھڑا ہونا اس کی اپنی ترجیح کی بنیاد پر تھا اور دوسری صورت میں کسی اور شخص کی مرضی پر! ۔

ایک احتمالی سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اختیاری و اجباری افعال کے درمیان جو فرق ذکر کیا گیا ہے وہ ان دونوں قسموں کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے میں کافی ہے' اور اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اختیاری فعل" وہ ہے جسے فاعل اپنے لیے بہتر سمجھتے ہوئے اختیار کرے اور وہ فعل اسی وجہ سے تعریف یا مذمت کا سبب بنتا ہے (یعنی اگر فاعل اسے اختیار کرے اور وہ اس کی بہتری کے لیے ہو تو اس پر اس کی تعریف اور اگر اس کے نقصان اور برائی میں ہو تو اس پر اس کی مذمت کی جاتی ہے) اسی طرح اگر وہ فعل اچھا ہو تو اس پر ثواب اور اگر برا ہو تو اس پر عقاب و سزا ہوتی ہے' گویا فعل کے اچھا یا برا ہونے کی وجہ سے اس پر اس کے مناسب آثار مترتب ہوتے ہیں' جبکہ "اجباری فعل" میں ایسا نہیں ہوتا اور اس کا فاعل تعریف یا مذمت اور ثواب یا عقاب کا سزاوار نہیں ہوتا۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ بات درست ہے کہ اختیاری و اجباری افعال کے درمیان وہی فرق ہے جو ذکر کیا گیا ہے لیکن ہماری بحث اس میں ہے کہ ان کے درمیان پایا جانے والا فرق ذاتی نہیں بلکہ یہ دونوں اصل و ذات کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں' اور آپ نے ان دونوں کی بابت جو آثار ذکر کئے ہیں وہ ان کے حقیقی آثار نہیں بلکہ یہ وہ آثار ہیں جو عقلاء کی طرف سے معاشرہ کے لیے طے کئے گئے کمالات سے ہم آہنگی رکھتے ہیں یعنی عقلاء نے اپنے طور پر کچھ امور کو معاشرے کے لیے "کمال" قرار دیا ہے۔ لہٰذا جو کام ان امور کے مطابق اور ان سے ہم آہنگ ہوں وہ ان پر فاعل کی تعریف کرتے ہیں اور اسے اجر و ثواب کا مستحق قرار دیتے ہیں' اور جو کام ان امور کے مطابق نہ ہوں اور ان سے ہم آہنگی نہ رکھتے ہوں ان کے انجام دینے پر فاعل کی مذمت کرتے ہیں اور اسے عقاب و سزا کا سزاوار سمجھتے ہیں' لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ ان دو افعال (اختیاری و اجباری) میں ذات کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں بلکہ صرف عقلاء کے طے کردہ اصولوں کی بناء پر فرق ہے اس لیے ان پر مترتب ہونے والے آثار کو علمی زبان میں "اعتباری" اور "غیر حقیقی" آثار کہا جائے گا۔ بنا برایں جبر و اختیار کی بحث کو علم فلسفہ کی بحث کا نام نہیں دیا جا سکتا اور اس کی بابت اظہار خیال کرنا فلسفہ کی حدود سے باہر ہوگا کیونکہ کسی فلسفی بحث کا دائرہ کار موجودات خارجیہ اور ان کے آثار عینیہ...... جو ان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں... تک محدود ہے اور وہ امور جو عقلاء کے طے کردہ

اصولوں کے مطابق ہونے یا مطابق نہ ہونے سے وابستہ ہوں اور ان کی انتہاء انہی اصولوں تک ہو وہ فلسفی بحث کے دائرہ کار میں نہیں آتے اور نہ ہی کسی عقلی دلیل و برہان کا ان سے کوئی ربط ہے اگرچہ وہ امور اپنے طور پر معتبر اور اپنی جہت میں اہمیت کے حامل ہیں اور اپنے مخصوص آثار بھی رکھتے ہیں لیکن وہ فلسفیانہ بحثوں کے باب میں نہیں آتے' اس لیے ضروری ہے کہ ہم جبر و اختیار کی بحث کو فلسفہ کے علاوہ کسی اور زاویہ ءنگاہ سے دیکھیں' لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ:

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ہر وہ شئے جو ممکن الوجود ہے وہ حادث و نو پیدا ہے اور وجود میں آنے کے لیے ''علت'' وسبب کی محتاج ہے' یہ بات دلیل و برہان کے ذریعے ثابت ہو چکی ہے اور یہ بات بھی ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ جب تک کوئی چیز ''واجب ولازم'' نہ ہو جائے (اس کا وجود میں آنا ضروری و لازم نہ ہو) وہ وجود میں نہیں آتی کیونکہ جب تک اس کا ''وجود میں آنا'' متعین نہ ہو جائے تو وجود اور عدم ..... ہونے اور نہ ہونے ..... دونوں پہلوؤں کی طرف اس کی نسبت برابر ہوگی' اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ شئے وجود اور عدم دونوں کی طرف برابر نسبت رکھنے کی حالت میں یعنی وجود میں آنے کی جہت کے تعین سے پہلے وجود میں آنے کے لیے کسی ''علت'' (وجود میں آنے کے سبب) کی محتاج نہیں تو یہ ناممکن اور محال کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے جو کہ ہرگز درست نہیں لہٰذا اگر ہم فرض کریں کہ فلاں چیز ''موجود'' ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کے لیے وجود...... ''ہونا'' ......ضروری ہے' اور اسی ضروری ہونے کو علمی اصطلاح میں ''وجوب'' سے تعبیر کیا جاتا ہے (ان الشیئی مالم یجب لم یوجد) ۔جب تک کسی شئے ل کے لیے وجوب اور ضروری ہونا یقینی نہ ہو جائے تو وہ وجود میں نہیں آتی ۔۔اور یہ ''ضروری ہونا'' دراصل اسے وجود میں آنے کی ''علت'' سے حاصل ہوا ہے' چنانچہ اگر ہم تمام عالم وجود کو ایک جگہ فرض کر لیں تو تمام موجودات ان حلقہ ہائے زنجیر کی مانند ہوں گے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور ایک دوسرے سے مربوط اور مخصوص ترتیب سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں' اور وہ سب ''واجب الوجود'' ہیں یعنی ان کے لیے ''ہونا'' ضروری ہے' اور زنجیر کے ان حلقوں میں..... جب تک کہ وہ زنجیر میں ہیں.....کوئی حلقہ ممکن الوجود نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس حال میں کسی حلقہ کے ممکن الوجود ہونے کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔

اب جبکہ یہ بات واضح ہو گئی کہ حلقہ ہائے زنجیر کی طرح تمام موجودات عالم...... جو کہ ''وجود'' رکھتی ہیں...... کے لیے ''وجوب ولزوم کی نسبت'' (ضروری ہونا) ایک ناقابل انکار حقیقت ہے تو اب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ''وجوب ولزوم کی نسبت'' درحقیقت' معلول اور اس کی علت تامہ کے درمیان پائے جانے والے رابطہ سے وجود میں آتی ہے خواہ وہ علت تامہ بسیط ہو یا کئی امور سے مرکب ہوئی ہو جیسے علل اربعہ (علت مادیہ' علت صوریہ' علت فاعلیہ اور علت غائیہ) اور دیگر شرائط و عوامل وغیرہ اور اگر اس معلول کو اس کی علت تامہ کے بعض اجزاء یا بالفرض کسی اور چیز کی طرف نسبت دے کر ملاحظہ کریں تو اس صورت میں یقیناً وہ نسبت ''امکان'' ہی کی ہو گی کیونکہ اگر وہ نسبت ''وجوب ولزوم'' کی ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اب علت تامہ کے وجود کی کوئی ضرورت ہی نہیں جبکہ ہم نے اسے ''علت تامہ'' فرض کیا ہے لہٰذا اس نسبت کو ''وجوب ولزوم'' کی نسبت نہیں کہا جا سکتا ورنہ علت تامہ کے وجود سے استغناء و نفی لازم آئے گی جو کہ محال و ناممکن ہے۔

ان مطالب کے واضح ہو جانے کے بعد اب ہم اپنے عالم طبیعت کی بابت بحث کرتے ہیں' ہماری اس طبیعی کائنات میں دو قسم کے نظام موجود ہیں: ایک نظامِ "ضرورت"...... وجوب ولزوم...... اور دوسرا نظامِ "امکان"۔ جہاں تک نظام "ضرورت" کا تعلق ہے تو وہ ہر علت تامہ اور اس کے معلول کے درمیان موجود ہے اور اس نظام کے کسی بھی جزء اور حصہ میں کوئی "امکانی" امر نہیں پایا جاتا، نہ ہی کسی ذات میں اور نہ ہی ذات کے کسی فعل میں' اور نظام امکان مادہ اور ان صورتوں پر جو مادہ کی صلاحیتوں کی حامل ہیں اور مادہ انہیں اختیار کر سکتا ہے اسی طرح وہ تمام آثار جو مادی آثار بن سکتے ہیں ان سب پر حاوی ہے' اب ہم ان دو نظاموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کے اختیاری فعل کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس فعل کی نسبت و تعلق اپنی علت تامہ کے ساتھ کیونکر ہے' اگر اس کی علت تامہ یعنی خود انسان' اس کا علم وارادہ' وہ مادہ جو فعل کو اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے اور زمان ومکان کی تمام شرائط وتقاضے موجود ہوں اور کسی قسم کی رکاوٹ ومانع بھی نہ ہو یعنی ہر وہ چیز جو اس فعل کے "وجود میں آنے کے لیے' ضروری ہے پائی جائے تو وہ فعل واجب وضروری' ہوگا یعنی اس کا وجود میں آنا لازمی ہوگا اور اس کا وجود "وجوب" کی صفت سے متصف ہوگا۔ (اس صورت میں اس کا "نہ ہونا" اور وجود میں نہ آنا قابل تصور ہی نہیں) لیکن اگر اس فعل کی نسبت صرف انسان کی طرف ہو تو اس کے اور اس کی علت تامہ کے درمیان جو نسبت پائی جائے گی وہ "امکان" کی نسبت ہوگی نہ کہ "وجوب" کی یعنی وہ صرف "ممکن الوجود" ہوگا کیونکہ انسان اس کی علت تامہ کا صرف ایک جزء ہے اور دیگر اجزاء کے بغیر اس کی علت تامہ کا اس سے تعلق "امکان" سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

بہر حال ان تمام مطالب کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ہر چیز اپنے وجود میں آنے کے لیے علت کی محتاج ہوتی ہے اور یہ بات اپنے مقام پر ثابت ہو چکی ہے کہ کسی چیز کا اپنے وجود میں آنے کے لیے علت کا محتاج ہونا اس لیے ہے کہ اس کے لئے وجود (بمقابلہ عدم) خود امکانی حیثیت رکھتا ہے یعنی حقیقت میں اس کی حیثیت صرف "رابطہ" کی ہے جو کہ خود کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا' لہٰذا جب تک اس کا تعلق ایسی ذات سے قائم نہیں ہو جاتا جو مستقل حیثیت کی حامل ہو اس وقت تک اس کی احتیاج ختم نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ:

(۱)۔ جب کسی معلول کو اس کی علت کی طرف منسوب کیا جائے مثلاً یوں کہا جائے کہ اس فعل کا فاعل فلاں ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ اب وہ معلول اس علت سے بے نیاز ہو گیا ہے جو "واجب الوجود" ہے کیونکہ تمام ممکن الوجود امور کا سلسلہ اس علت پر منتہی ہوتا ہے جو واجب الوجود ہے' (بنابریں کسی معلول کا اپنی علت کی طرف منسوب ہونا اس کے "واجب الوجود علت" سے بے نیاز ہونے کا باعث نہیں بن سکتا)۔

(۲)۔ چونکہ معلول اپنے وجود میں آنے کے حوالہ سے علت کا محتاج ہے لہٰذا وجود سے تعلق رکھنے والی تمام خصوصیات اور تمام علل واسباب اور زمان ومکان کی تمام شرائط وحالات میں اس کا محتاج ہوگا۔

اس بیان سے دو امور واضح ہو گئے:

(۱)۔جس طرح ہر انسان دیگر مادی موجودات اور ان کی طبیعی افعال کی مانند اپنے اصل وجود کی نسبت سے خداوند عالم کے ارادہ سے منسوب ہے اسی طرح انسان کے افعال بھی اپنے وجود میں خداوند عالم کے ارادہ سے منسوب ہیں (یعنی جس طرح انسان اور دوسری مادی و طبیعی مخلوق اور اس کے طبیعی افعال کا وجود خدا کے ارادہ کا مرہون منت ہے اسی طرح انسان کے افعال بھی اپنے وجود میں ارادۂ الٰہی کے مرہون ہیں) لہٰذا معتزلہ کا یہ کہنا کہ انسان کے افعال کا اپنے وجود کے لحاظ سے خداوند عالم سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی قدر و تقدیر کا کوئی وجود و مفہوم ہے' سرے ہی سے درست نہیں' اور پھر یہ نسبت چونکہ ''وجود'' کے حوالہ سے ہے لہٰذا معلول میں پائی جانے والی تمام وجودی خصوصیات اس میں دخیل و موجود ہیں' پس ہر معلول اپنے وجود کی حد تک اپنی علت کی طرف منسوب ہوتا ہے' اس لیے انسان بھی اپنے وجود کی تمام حدود و خصوصیات' مثلاً ماں باپ' زمان و مکان' شکل و صورت' کمیت و کیفیت اور دیگر تمام مادی عوامل و اسباب وغیرہ کے ساتھ چونکہ اپنی علت اولیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے اسی طرح انسان کا فعل بھی اپنی تمام وجودی خصوصیات کے ساتھ اسی ''علت اولیٰ'' کی طرف منسوب ہوتا ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فعل ''علت اولیٰ'' ......خدائے قدوس......اور اس کے ازلی و ابدی ارادہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اب انسان کے ارادہ سے بے نیاز ہے یا انسان کا ارادہ اس میں کوئی تاثیر نہیں رکھتا کیونکہ علت اولیٰ.....خداوند عالم...... کے ارادہ واجبہ کے اس فعل سے تعلق پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے چاہا کہ یہ فعل انسان کے ارادہ و اختیار سے وجود میں آئے لہٰذا اگر وہ فعل انسان کے ارادہ و اختیار کے بغیر وجود میں آئے تو اس سے خدا کے ارادہ کا پورا نہ ہونا لازم آئے گا جو کہ محال ہے۔اور اسے علمی اصطلاح میں یوں کہا جاتا ہے کہ ''ارادۂ الٰہی اپنے مراد سے مختلف ہو جائے گا'' یعنی خدا نے جو چاہا وہ پورا نہ ہو سکا' جبکہ ایسا ہونا ناممکن ہے کیونکہ خدا کا ارادہ ہر صورت میں پورا ہوتا ہے اور وہ اپنی مراد سے کبھی تخلّف پذیر نہیں ہو سکتا۔

اس بیان سے جبر کا عقیدہ رکھنے والے اشاعرہ کے اس نظریہ کا غلط ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کہ ''خدا کے ارادہ کا انسان کے افعال سے تعلق ہونا اس امر کا باعث بنتا ہے کہ پھر انسان کا ارادہ و اختیار بے اثر ہو جائے'' ان کا یہ نظریہ سراسر غلط و بے بنیاد ہے' اور اس سلسلہ میں صحیح نظریہ جو کہ لائق تصدیق ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے افعال کی دو نسبتیں ہیں: ایک نسبت خود اس کی اپنی طرف ہے اور دوسری خدا کی طرف' اور ان میں سے کوئی ایک نسبت دوسری نسبت کے بے اثر ہونے کا سبب نہیں بنتی' کیونکہ یہ دونوں نسبتیں ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہیں ایک دوسرے کے مدمقابل اور آمنے سامنے نہیں' علمی اصطلاح میں نسبتوں کے ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہونے کو ''سلسلۂ طولیہ'' کہتے ہیں اور ایک دوسرے کے مدمقابل اور آمنے سامنے ہونے کو ''سلسلۂ عرضیہ'' کہتے ہیں اور انسان کے فعل کی دو نسبتیں سلسلۂ طولیہ رکھتی ہیں نہ کہ سلسلۂ عرضیہ! ۔

(۲)۔جس طرح سے ہر فعل اپنی علت تامہ کی طرف منسوب ہوتا ہے (اس سلسلے میں آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ ہر فعل کی اپنی علت تامہ کے ساتھ ''ضرورت و وجوب'' کی نسبت ہے جیسا کہ دیگر تمام موجودات اپنی علت ہائے تامہ کی طرف ''وجوب'' کی نسبت رکھتے ہیں) اسی طرح وہ اپنی علت تامہ کے بعض اجزاء کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے مثلاً انسان کہ جو

اپنے فعل کی علت تامہ کا ایک جزء ہے تو اس کی طرف بھی فعل کی نسبت دی جا سکتی ہے' لیکن ہم نے یہ بات بیان کر دی ہے کہ جب کسی معلول کو اسکی علت تامہ کے کسی ایک جزء کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ نسبت ''وجوب'' کی نہیں بلکہ ''امکان'' کی نسبت ہوگی۔ ''وجوب'' کی نسبت تب ہوگی جب علت تامہ کے تمام اجزاء کی طرف یکجا نسبت دی جائے' لہٰذا کسی فعل کا صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنی علت تامہ کی طرف منسوب ہو کر ضروری الوجود کہلاتا ہے اس امر کا سبب نہیں کہ وہ کسی دوسرے لحاظ سے ممکن الوجود نہیں ہو سکتا' یعنی ایک ہی فعل ایک لحاظ سے واجب الوجود ہو اور دوسرے لحاظ سے ممکن الوجود ہو یہ عین ممکن ہے کیونکہ وجوب اور امکان کی دونوں نسبتیں اس کے لیے ثابت ہیں اور پھر یہ کہ ان دونوں نسبتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں یعنی ایسا نہیں کہ اگر ان میں سے ایک، موجود ہو تو دوسری کسی بھی لحاظ وصورت میں موجود نہیں ہو سکتی بلکہ دونوں نسبتیں دو الگ الگ لحاظوں سے صورت پذیر ہو سکتی ہیں لہٰذا ایک فعل کو ایک لحاظ سے واجب الوجود اور دوسرے لحاظ سے ممکن الوجود کہنے میں کوئی حرج نہیں (اس سلسلہ میں ہم تفصیلی مطالب ذکر کر چکے ہیں) لہٰذا ان تمام مطالب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نظریہ کا غلط ہونا واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے جو عصر حاضر کے ان فلاسفہ نے پیش کیا ہے جو مادہ کو تمام موجودات کی اصل واساس قرار دیتے ہیں اور یہ کہ ''جبر پورے نظام طبیعت پر حاوی ہے اور چونکہ انسان اسی نظام طبیعت کا حصہ اور دوسری مادی موجودات کی طرح ہے لہٰذا وہ بھی دوسری طبیعی و مادی موجودات کی طرح اپنے افعال میں مجبور ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں''۔ ان مفکرین کا یہ نظریہ غلط اور بے بنیاد ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جو چیز بھی وجود میں آئے اسے دو لحاظوں سے دیکھا جائے گا: ایک اس کے وجود میں آنے کی علت تامہ کے تمام اجزاء وشرائط کے پائے جانے کی بنیاد پر اور دوسرے اس کی علت تامہ کے بعض اجزاء مثلاً مادہ وصورت وغیرہ کی نسبت سے' پہلے لحاظ سے وہ چیز ضروری الوجود اور دوسرے لحاظ سے ممکن الوجود کہلائے گی' یہی دونوں لحاظ انسان کے افعال میں پائے جاتے ہیں اور اس کے تمام افعال واعمال کو اسی معیار پر پرکھا جائے گا لہٰذا جب دوسرے لحاظ کی روشنی میں اس کے اعمال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان اعمال کی بنیاد انسان کی امیدیں اور تعلیم وتربیت وغیرہ ہیں کیونکہ اس کے ان کاموں میں جو ''واجب الوجود'' اور ضروری ولازم ہیں اس کی تعلیم وتربیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کاموں میں اس کی تعلیم وتربیت وغیرہ کو بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی امیدوں وغیرہ کو ان کاموں کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے' اور یہ ایسا امر ہے جو نہایت واضح اور کسی دلیل وبرہان کا محتاج نہیں۔

اپنے فعل کی علت تامہ کا ایک جزء ہے تو اس کی طرف بھی فعل کی نسبت دی جاسکتی ہے' لیکن ہم نے یہ بات بیان کر دی ہے کہ جب کسی معلول کو اسکی علت تامہ کے کسی ایک جزء کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ نسبت ''وجوب'' کی نہیں بلکہ ''امکان'' کی نسبت ہوگی۔ ''وجوب'' کی نسبت تب ہوگی جب علت تامہ کے تمام اجزاء کی طرف یکجا نسبت دی جائے' لہٰذا کسی فعل کا صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنی علت تامہ کی طرف منسوب ہو کر ضروری الوجود کہلاتا ہے اس امر کا سبب نہیں کہ وہ کسی دوسرے لحاظ سے ممکن الوجود نہیں ہو سکتا' یعنی ایک ہی فعل ایک لحاظ سے واجب الوجود ہو اور دوسرے لحاظ سے ممکن الوجود ہو یہ عین ممکن ہے کیونکہ وجوب اور امکان کی دونوں نسبتیں اس کے لیے ثابت ہیں اور پھر یہ کہ ان دونوں نسبتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں یعنی ایسا نہیں کہ اگر ان میں سے ایک، موجود ہو تو دوسری کسی بھی لحاظ وصورت میں موجود نہیں ہو سکتی بلکہ دونوں نسبتیں دو الگ الگ لحاظوں سے صورت پذیر ہو سکتی ہیں لہٰذا ایک فعل کو ایک لحاظ سے واجب الوجود اور دوسرے لحاظ سے ممکن الوجود کہنے میں کوئی حرج نہیں (اس سلسلہ میں ہم تفصیلی مطالب ذکر کر چکے ہیں) لہٰذا ان تمام مطالب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نظریہ کا غلط ہونا واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے جو عصر حاضر کے ان فلاسفہ نے پیش کیا ہے جو مادہ کو تمام موجودات کی اصل واساس قرار دیتے ہیں اور یہ کہ ''جبر پورے نظام طبیعت پر حاوی ہے اور چونکہ انسان اسی نظام طبیعت کا حصہ اور دوسری مادی موجودات کی طرح ہے لہٰذا وہ بھی دوسری طبیعی و مادی موجودات کی طرح اپنے افعال میں مجبور ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں''۔ ان مفکرین کا یہ نظریہ غلط اور بے بنیاد ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جو چیز بھی وجود میں آئے اسے دو لحاظوں سے دیکھا جائے گا: ایک اس کے وجود میں آنے کی علت تامہ کے تمام اجزاء وشرائط کے پائے جانے کی بنیاد پر اور دوسرے اس کی علت تامہ کے بعض اجزاء مثلاً مادہ وصورت وغیرہ کی نسبت سے' پہلے لحاظ سے وہ چیز ضروری الوجود اور دوسرے لحاظ سے ممکن الوجود کہلائے گی' یہی دونوں لحاظ انسان کے افعال میں پائے جاتے ہیں اور اس کے تمام افعال و اعمال کو اسی معیار پر پرکھا جائے گا لہٰذا جب دوسرے لحاظ کی روشنی میں اس کے اعمال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان اعمال کی بنیاد انسان کی امیدیں اور تعلیم وتربیت وغیرہ ہیں کیونکہ اس کے ان کاموں میں جو ''واجب الوجود'' اور ضروری ولازم ہیں اس کی تعلیم وتربیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کاموں میں اس کی تعلیم وتربیت وغیرہ کو بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی امیدوں وغیرہ کو ان کاموں کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے' اور یہ ایسا امر ہے جو نہایت واضح اور کسی دلیل وبرہان کا محتاج نہیں۔

آیات ۲۸و ۲۹

○ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

○ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

ترجمہ

○ تم کس طرح خدا کا انکار کر سکتے ہو جبکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا' پھر تمہیں موت دے گا پھر زندہ کرے گا' پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ (۲۸)

○ وہی ہے جس نے زمین میں پائی جانے والی ہر شے تمہارے لیے پیدا کی' پھر آسمانوں کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو سات آسمان پیدا کئے' اور وہ ہر چیز کا اچھی طرح جاننے والا ہے۔ (۲۹)

تفسیر و بیان

ان آیات (۲۸۔۲۹) میں انہی مطالب کی دوبارہ یاد آوری کی گئی ہے جو گذشتہ آیتوں میں بیان کئے گئے تھے
سورت کی ابتداء میں خداوند عالم نے چند مطالب بیان فرمائے اور ان مطالب کو آیت ۲۱ "یَا اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ ۔۔۔" اور اس کے بعد والی چند آیات میں بطور خلاصہ ذکر کر دیا' اور اب دوبارہ انہی مطالب کو مزید تفصیل و وضاحت کے ساتھ ان آیتوں...... ۲۸' ۲۹...... میں بیان کیا گیا ہے اور ان مطالب کی ابتداء "کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ" کے الفاظ سے ہوتی ہے اور اس کے بعد بارہ آیتوں تک تمام مطالب اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔

ان آیات میں خداوند عالم نے درج ذیل مطالب بیان کئے ہیں:

(۱) انسان کی حقیقت۔

(۲) کمالات کے وہ خزانے جو خدا نے انسان کے وجود میں ودیعت کئے ہیں۔

(۳) انسان کے دائرہء وجود کی وسعت۔

(۴) وہ مراحل جنہیں انسان اپنے وجود کے سفر میں طے کرتا ہے۔

(۵) موت و حیات کی منزلیں۔

(۶) زندگی کے بعد موت اور پھر موت کے بعد زندگی اور پھر خداوند عالم کی طرف رجوع اور واپس جانا۔

(۷) اور یہ کہ آخری منزل خدا کے پاس جانا ہے (والی ربك المنتھٰی)

ان مطالب کے بیان کے ساتھ ساتھ خداوند عالم نے ان تکوینی و تخلیقی اور تشریعی خصوصیات اور نعمتوں کا ذکر بھی کیا جو اس نے انسان کو عطا فرمائی ہیں' مثلاً یہ کہ: انسان مردہ تھا خدا نے اسے زندگی عطا کی اور پھر اسے موت اور حیات کے مرحلوں سے گزارتا ہوا اپنے پاس لوٹا دیتا ہے' اور جو کچھ زمین میں ہے وہ خدا نے انسان کے لیے پیدا کیا اور آسمانوں کو اس کے لئے مسخر کر دیا اور اسے زمین میں اپنا خلیفہ و نائب اور جانشین قرار دیا' اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کریں' اور ابوالبشر آدمؑ کو بہشت میں جگہ دی اور اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھول دیا اور اسے عبادت اور ہدایت کی بناء پر عزت و احترام سے

زا ان تمام نعمتوں کے حوالہ سے خدا نے ارشاد فرمایا:

" كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ . . . "

(تم کیونکر خدا کا انکار کر سکتے ہو جبکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندگی عطا کی .....)۔

تو خدا کا یہ کہنا درحقیقت ان نعمتوں اور احسانات کی روشنی میں تعجب و شکوہ کے طور پر ہے کہ آیا اس سب کچھ کے جود تم اس کا انکار کرتے ہو!

دکا انکار ممکن نہیں

" كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا--- "

یہ آیت اپنے مطالب کی روشنی میں سورۂ مومن کی اس آیت سے مشابہ ہے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

رہ مومن، آیت ۱۱:

★ " قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ نْ سَبِيْلٍ "۔

(انہوں نے کہا پروردگار! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندگی دی، پس ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ں تو کیا نجات کا کوئی راستہ ہے؟)۔

یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جسے عالم برزخ یعنی اس دنیا اور عالم آخرت کے درمیان والی مدت کے ثبوت ے لیے دلیل کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں دو مرتبہ انسان کی موت کا تذکرہ کیا گیا ہے تو اگر پہلی موت سے مراد وہی ت ہو جو عام طور پر آتی ہے اور انسان کو دنیا سے نکال باہر کرتی ہے تو دوسری موت یقیناً وہی ہوگی جو اس پہلی موت کے بعد ا کی جانے والی دوسری زندگی کے بعد آئے گی اور اس دوسری زندگی ہی کو برزخ کی زندگی کہا جاتا ہے، یہ وہ زندگی ہے جو ا کی زندگی ختم ہونے کے بعد آنے والی موت کے بعد آتی ہے اور اس کے بعد پھر موت آتی ہے جس کے بعد خدا کے پاس ا یعنی آخرت کا مرحلہ ہے، اس زندگی کو برزخ کی زندگی کہا جاتا ہے جو دو موتوں کے درمیان واقع ہوتی ہے۔

برزخ کی بابت پیش کیا جانے والا یہ استدلال ہر لحاظ سے کامل ہے اور بعض روایات میں بھی اسے نہایت اہمیت ے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، تاہم برزخ کا انکار کرنے والوں میں سے کچھ حضرات نے ان آیتوں کی بابت یہ کہا ہے کہ یہ دو آیتیں ں " كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ " اور " قَالُوْا رَبَّنَآ " ایک ہی طرح کے سیاق کلام کی حامل ہیں اور دونوں میں دو موتوں اور دو دگیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے لہٰذا دونوں ایک ہی معنی و مطلب کو ثابت کرتی ہیں، پہلی آیت میں ذکر کی گئی پہلی موت سے مراد ان کی وہ حالت ہے جو اس کے بدن میں روح کے پھونکے جانے اور اس دنیاوی زندگی میں آنے سے پہلے تھی لہٰذا پہلی

موت اور پہلی زندگی سے مراد دنیا میں آنے سے پہلے کی حالت اور دنیا میں آنے کے بعد کی حالت ہے۔ دنیا میں آنے
پہلے کی حالت کو ''موت'' اور اس موت کے بعد دنیا میں آنے کو ''زندگی'' کہتے ہیں جبکہ دوسری موت اور دوسری زندگی سے
دنیا سے جانے کی حالت اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کی حالت ہے لہٰذا دوسری آیت میں موت وحیات کا جو ذ
کیا گیا ہے اس سے مراد بھی وہی ہے جو پہلی آیت میں مذکور ہے یعنی پہلی موت سے مراد دنیا سے آنے سے پہلے کی حالت
ردوسری موت سے مراد دنیا سے جانے کی حالت ہے اور پہلی زندگی سے مراد دنیا میں آنے کی حالت اور دوسری زندگی سے
مرنے کے بعد قیامت کے لیے دوبارہ زندہ ہونے کی حالت ہے لہٰذا ان دونوں آیتوں میں ''عالم برزخ'' کا کوئی ثبوت مو
نہیں اور انہیں برزخ کے ثبوت کے لیے دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

برزخ کے منکرین کا یہ بیان صحیح نہیں کیونکہ یہ دونوں آیتیں الگ الگ سیاق کلام رکھتی ہیں اور پہلی آیت میں اَ
موت ایک اماتہ (موت دینا) اور دو احیاء (زندگی عطا کرنا) مذکور ہیں جبکہ دوسری آیت میں دو اماتہ اور دو احیاء مذکور ہیں او
امر واضح ہے کہ اماتہ (موت دینا) اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس سے پہلے ''زندگی'' نہ ہو جبکہ ''موت'' میں
نہیں۔۔ کیونکہ ہر وہ چیز جسے زندگی حاصل نہ ہوئی ہو اسے مردہ کہا جاسکتا ہے اور لفظ ''موت'' کا استعمال اس کے لیے درس
ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے مردہ زمین وغیرہ۔۔ لہٰذا پہلی آیت میں ''پہلی موت'' سے مراد وہ نہیں جو دوسری آیت میں ''پہلے ا
سے مراد ہے کیونکہ ''موت'' اور ''اماتہ'' دو الگ الگ معنی رکھتے ہیں اس لیے دوسری آیت میں ''امتنا اثنتین واحی
اثنتین'' (خدایا تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی...... اماتہ...... اور دو مرتبہ زندہ کیا...... احیاء) سے مراد یہ لیا جائے گا کہ پہلا ا
(موت دینا) دنیا کی زندگی کے بعد اور پہلا احیاء (زندگی دینا) اس موت کے بعد والی زندگی ہے جو عالم برزخ میں حا
ہوتی ہے اور دوسرے اماتہ (موت دینا) اور دوسرے احیاء (زندگی عطا کرنا) سے مراد برزخ کے بعد والی موت اور قیام
کے لیے دی جانے والی زندگی ہے۔ جبکہ پہلی آیت میں دو اماتہ (دو مرتبہ موت دینا) ذکر نہیں کیا گیا بلکہ یوں کہا گیا ہے:
(ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ) یعنی پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت میں ایک موت ایک زندہ کرنا پھر ایک مرتبہ موت دینا اور پھر ایک دفعہ زندہ کرنا اور پھر اس کے بعد خد
طرف بازگشت کا ذکر ہے لہٰذا یہ امر نہایت واضح ہے کہ دنیا کی زندگی سے پہلے ''موت'' کا ذکر ہے ''اماتہ'' کا نہیں اور
موت کے بعد جس زندگی عطا کرنے کا ذکر ہے وہ دنیا کی زندگی ہے اس کے علاوہ عبارت کے لحاظ سے ''ثم'' کا لفظ
ہمارے مدعا کے ثبوت میں مدد دیتا ہے کیونکہ یہ لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب دو چیزوں کے درمیان فاصلہ اور وقف
اور آیت میں یوں ارشاد ہوا: ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ''جس کا ترجمہ یہ ہے کہ'' پھر (اس کے بعد) تم اس کی طرف لوٹائے
گے '' جبکہ اس سے پہلے '' يُحۡيِيۡكُمۡ '' مذکور ہے اگر ان دونوں یعنی احیاء اور خدا کی طرف بازگشت کے درمیان لفظ ''ثم''
بجائے یوں ہوتا '' اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ '' تو آیت کا معنی یہ ہوتا کہ '' وہ تمہیں زندگی دے گا اور تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ

لیکن خداوند عالم نے لفظ ''ثم'' استعمال کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''احیائی'' کے بعد ایک فاصلہ اور زمانی وقفہ موجود ہے جسے ''برزخ'' کہا جاتا ہے ورنہ ''احیاء'' کے بعد ''ثم'' (پھر اس کے بعد) کا لفظ استعمال کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

زندگی سے پہلے موت کا ذکر

''وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا...''

اس آیت میں انسان کی حقیقت کو اس کے وجود کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے اور اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ انسان کا وجود متحول اور متکامل ہے یعنی ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتا بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور اپنے تمام مراحل میں ''نقص'' سے ''کمال'' کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور ہمیشہ تغیر و تبدل سے دوچار ہوتا ہے اور لحمہ بہ لحمہ کمال تک پہنچنے کے مراحل کو تدریجی طور پر طے کرتا ہے' چنانچہ وہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ''مردہ'' تھا پھر خدا نے اسے زندگی دی تو زندہ ہو گیا اور اس کے بعد خدا کی طرف سے ''اماتہ'' اور ''احیاء'' کے مراحل طے کرتا رہتا ہے' اس مطلب کو خداوند عالم نے متعدد مقامات میں ذکر فرمایا ہے' ذیل میں چند آیات بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

سورہ سجدہ، آیت ۷-۸-۹:

★ '' وَ بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِیۡنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ''۔

(خدا نے مٹی سے انسان کی تخلیق کا آغاز کیا' پھر اس کی نسل کو ''بظاہر'' گندے و ناچیز پانی سے افزائش پانے کا نظام مقرر کیا' پھر اسے اچھی طرح سنوارا اور اس میں اپنی روح پھونکی)۔

سورہ مومنون، آیت ۱۴:

★ '' ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ''۔

(پھر ہم نے اسے دوسری صورت میں پیدا کیا' پس کس قدر برکتوں والا ہے خدا' کہ سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے)۔

سورہ سجدہ، آیت ۱۱:

★ وَ قَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ بَلۡ هُمۡ بِلِقَآئِ رَبِّهِمۡ کٰفِرُوۡنَ ۝۱۰ قُلۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ ''۔

(اور وہ کہتے ہیں کہ جب ہم زمین میں بالکل ختم ہو جائیں گے تو آیا پھر ہمیں خلقت عطا کی جائے گی؟ درحقیقت یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے جانے کے منکر ہیں' ان سے کہہ دیجئے کہ ملک الموت (موت کا فرشتہ) جو اسی کام کے لیے

تمہارے اوپر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کرے گا)۔

سورہ طہٰ، آیت ۵۵:

★ "مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى"۔

(ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اسی میں تمہیں واپس لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ باہر نکالیں گے

مذکورہ بالا آیات جس طرح آپ نے ملاحظہ فرمایا (ہم ان آیتوں کی بابت ان کی متعلقہ سورتوں میں مزید وضا کریں گے) اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ انسان زمین کا ایک حصہ اور جزء ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس مختلف ہے بلکہ زمین ہی سے اس کی نشوونما ہوئی پھر وہ اپنے تکامل کے مرحلوں کو یکے بعد دیگرے طے کرتا ہوا اس مقام پہنچا کہ اسے ایک مخصوص خلقت عطا کی گئی یہاں تک کہ وہ ایک نئی مخلوق بن گیا کہ جو لحظہ بہ لحظہ تغیر و تبدل کی حالت ہے اور اس نئے نویلے (جدید) کمال کی بناء پر تکامل (نقص سے کمال اور ایک کمال سے دوسرے کمال تک پہنچنے) کے تمام م طے کرنے کی صلاحیت پا گیا (جب وہ اپنے وجود کے کمال کی اس حد کو پہنچا اور اپنے وجود میں پائی جانے والی طاقتو استعمال کرنے پر قادر ہو گیا اور اپنی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرنے لگا) تو اس کے بعد اس کے وجود کا دوسرا مرحلہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ موت کا فرشتہ آتا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں اسے اس کے بدن سے مکمل طور پر الگ کر دیتا ہے اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یہ ہیں وہ تمام مراحل جو انسان کے وجود میں پائے جاتے ہیں اور یہی ہے اس کے کی اصل و اساس اور اس کی راہ ہستی! ۔

اس کے ساتھ ساتھ تقدیر نے انسان کو اس رنگ میں ڈھالا کہ تمام موجودات عالم خواہ وہ زمین کی مخلوق ہو یا آ ان کے بسیط عناصر اور ان عناصر کی بنیادی قوتیں ہوں یا مختلف عناصر سے مل کر وجود میں آنے والی موجودات ہو حیوانات، نباتات، معدن اور دیگر چیزیں مثلاً پانی، ہوا اور ان سے ملتی جلتی اشیائ، سب سے اس کا تعلق قائم ہے بلکہ عالم ط میں پائی جانے والی تمام موجودات کا یہی حال ہے یعنی خدا نے انہیں اس طرح پیدا کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسر ساتھ مربوط ہے اور سب ایک دوسرے کے وجود میں موثر ہیں تاکہ اس طرح سب کا وجود باقی رہ سکے اور ان کے درمیا انفعال کا سلسلہ قائم ہو البتہ ان تمام موجودات میں سے انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو دوسری تمام موجودات کی نسبت موثر اور اس کی تاثیر کا دائرہ دوسری ہر مخلوق سے زیادہ وسیع ہے کیونکہ انسان کا اپنے اس چھوٹے سے بدن کے باوجود دوسری تمام مادی موجودات کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور وہ اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ان موجودات سے انفرادی و اجتماعی استفادہ کرتا ہے اور اپنی طبیعت کے بسیط و سادہ مقاصد کی تکمیل کے لیے ان موجودات سے نہایت کے ساتھ استفادہ کر سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے فکر و ادراک کی جو قوت حاصل ہے اس کی بنیاد پر وہ ایسے امو دیتا ہے جو دوسری موجودات انجام نہیں دے سکتیں اور وہ اسی فکر و ادراک کی قوت سے استفادہ کرتے ہوئے ہر شے

بخرے کرنے اور اسے زیروزبر کر کے تجزیہ وترکیب اور تخریب وتعمیر کا ہر عمل انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے' یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی شئے ایسی نہیں جو انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہو لہٰذا ہر چیز میں تصرف کرنے کی طاقت اسے حاصل ہے چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو کام عالم طبیعت کے اختیار میں نہیں ہوتا وہ اسے اپنے لیے انجام دے دیتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ عالم طبیعت سے ٹکرا لے لیتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے ذریعے اپنا لوہا منوانے کے لیے کمربستہ ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔
بہر حال انسان اپنے ہر مقصد کی تکمیل کے لیے ہر چیز سے استفادہ کرتا ہے اور اسے اپنے کام میں لاتا ہے' اس کا ایسا کرنا اس امر کا سبب بنتا ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا چلا جاتا ہے اس کی ترقی اور اس کے افکار کی پختگی کی راہیں مزید ہموار ہوتی چلی جاتی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ خدا کی اس عجیب وغریب مخلوق (انسان) کے اکثر کاموں کی تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی ہمت میں اضافہ ہو جاتا ہے تاکہ خداوند عالم اپنے کلمات اور واضح نشانیوں اور پختہ دلیلوں کے ساتھ حق وحقیقت کو آشکار کرے اور اس کے اس اعلان اور واضح بیان کا عملی ثبوت فراہم ہو جائے جس میں اس نے ارشاد فرمایا:

سورہ جاثیہ، آیت ۱۳:

★ "سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ"

(اس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ مسخر کر دیا جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے جبکہ وہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے)

سورہ بقرہ، آیت ۲۹:

★ "ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ--"

(پھر اس نے آسمانوں کی تخلیق شروع کی)

ان آیتوں میں انسان پر خدا کے احسانات کا تذکرہ ہے اور ان نعمتوں کی یاد آوری مقصود ہے جو خدا نے انسان کو عطا کی ہیں' اور یہ آیتیں اس امر کو بیان کرتی ہیں کہ خدا نے آسمانوں کی تخلیق انسان کے لیے کی اور اسی کے لیے یہ سات آسمان خلق کیے۔

(آیات کے معانی ومطالب اور عظیم مفاہیم ومعارف پر مزید غور وفکر کریں)۔

پس جو مطالب ذکر کیے گئے ہیں ان سے انسان کے وجود اور اس کے سفر ہستی وتکامل کے مختلف مراحل کا سراغ ملتا ہے اور انہی سے کائنات میں اس کے دخل وعمل کی وسعتوں کا پتہ بھی چلتا ہے دراصل یہ وہی مطالب ہیں جو خداوند عالم نے عالم انسانیت کے بارے میں ذکر فرمائے ہیں اور ان میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ انسان کی ابتداء کہاں سے ہوئی اور اس کی انتہاء کہاں پر ہوگی' تاہم یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس سلسلہ میں قرآن مجید جس طرح انسان کی دنیاوی زندگی کے آغاز کو عالم طبیعت کے ساتھ مربوط ووابستہ قرار دیتا ہے اسی طرح خداوند قدوس کے ساتھ بھی اس کے ربط وتعلق کو ثابت کرتا

ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہء مریم، آیت ۹:

★ " وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا "

(میں نے ہی تجھے پہلے پہل پیدا کیا جبکہ تو کچھ بھی نہ تھا)

سورہء بروج، آیت ۱۳:

★ " إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ "

(وہی ہے جو ابتداء کرتا ہے اور وہی ہے جو واپس لوٹاتا ہے)۔

پس انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس نے گہوارہء تکوین (وآغوش آفرینش) میں تربیت پائی اور خدا کے سرچ صنعت وایجاد سے وجود وہستی کی پاکیزہ نعمت سے بہرہ ور ہوا اور وہ اپنے سفر وجود میں ہمیشہ گوناگوں مراحل طے کرنے مصروف رہتا ہے جبکہ اس کا سیر وسلوک "بے جان طبیعت" کے ساتھ مربوط ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی فطرت تخلیق میں خدا کے امر اور اس کی ملکوتیت سے وابستہ ہے کہ جس کے متعلق خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہء یس، آیت ۸۲:

★ " إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْـًٔا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ "۔

(اس کی شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں ارادہ کرتا ہے کہ اسے کہے کہ ہو جا، وہ ہو جاتی ہے)۔

سورہء نحل، آیت ۴۰:

★ " إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ "۔

(کسی چیز سے ہمارا کچھ کہنا یوں ہے کہ جب ہم اس کے ہونے کا ارادہ کرتے ہیں کہ اسے کہیں کہ "ہو جا" پس و جاتی ہے)۔

یہ آیتیں انسان کی تخلیق اور وجود میں آنے کے ابتدائی مراحل کو بیان کرتی ہیں، لیکن اس کی واپسی اور خدا کی طر لوٹ کر آنے کی بابت قرآن مجید نے اس کے راستہ کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: ایک سعادت وخوش بختی کا راستہ اور د شقاوت وبدبختی کا راستہ! پہلا راستہ یعنی سعادت والا راستہ تمام راستوں سے زیادہ نزدیک راستہ ہے جو عظمتوں کی آ منزل تک جاتا ہے اور وہ انسان کو ان رفعتوں اور معنوی بلندیوں تک لے جاتا ہے جہاں سے انسان اپنے پروردگار نہایت آسانی کے ساتھ پہنچ جاتا ہے لیکن دوسرا راستہ (یعنی شقاوت والا راستہ) عظمتوں اور معنوی بلندیوں سے کوسوں ہے اور وہ انسان کو پستیوں میں سے سب سے زیادہ پست مقام (اسفل السافلین) تک لے جاتا ہے تا کہ وہ اسی ط پروردگار عالم تک پہنچ جائے، تاہم خدا ان سب پر محیط اور انہیں گھیرے ہوئے ہے، یاد رہے کہ اس موضوع سے مربوط مطا

سورہ فاتحہ کی آیت "اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ" کی تفسیر کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں۔

یہ تمام مطالب " انسان کے راستہ " کی بابت ایک اجمالی بیان کی حیثیت رکھتے ہیں' ان سب کی تفصیلات اور انسان کی اس دنیا سے پہلے کی زندگی' دنیا کی زندگی اور دنیا کے بعد کی زندگی کا بیان اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ البتہ یاد رہے کہ قرآن مجید نے انسان کی زندگی کے ان تینوں مراحل (دنیا سے پہلے' دنیا میں اور دنیا کے بعد) کے سلسلہ میں صرف انہی مطالب کو بیان کیا ہے جن کا تعلق انسان کی ہدایت و گمراہی اور سعادت و شقاوت سے ہے اور اس سے کمتر اہمیت کے حامل مطالب کو یا تو بیان ہی نہیں کیا اور اگر کہیں ذکر بھی کیا ہے تو صرف اسی حد تک کہ جو قرآن مجید کے مذکورہ بالا مقصد سے کسی طرح تعلق رکھتے ہیں۔

سات آسمانوں کی تخلیق

O "فَسَوّٰىهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ۔۔"

(پھر اس نے انہیں سات آسمان بنائے)۔

سماء (آسمان) کی بابت تفصیلی بحث سورہ حم سجدہ میں آئے گی، انشاءاللہ تعالیٰ۔

آیات ۳۰ تا ۳۳

○ وَ اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً ؕ
قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ
نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾
○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَی الۡمَلٰٓئِكَةِ ۙ
فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۱﴾
○ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ
الۡعَلِیۡمُ الۡحَكِیۡمُ ﴿۳۲﴾
○ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ
قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ
مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ

○ اور یاد کرو اس وقت کو جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ و جانشین بنا رہا ہوں تو انہوں نے کہا' کیا تو اسے بنا رہا ہے جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں تو خدا نے فرمایا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ (۳۰)

○ اور خدا نے آدمؑ کو سب نام پڑھا دیئے' پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ تم مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو! (۳۱)

○ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہمیں پڑھایا ہے بے شک تو سب کچھ جاننے والا دانا ہے۔ (۳۲)

○ خدا نے فرمایا اے آدم! اب تم ان فرشتوں کو ان (افراد) کے نام بتا دو' پس جب آدمؑ نے فرشتوں کو ان کے نام بتائے تو خدا نے فرمایا کہ آیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کا غیب جانتا ہوں اور میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔ (۳۳)

تفسیر و بیان

یہ آیات اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ انسان کو زمین پر کیوں اتارا گیا اور یہ کہ زمین میں منصب خلافت (خدا کی نمائندگی) کی حیثیت وحقیقت اور اس کے آثار وفوائد اور خصوصیات کیا ہیں؟ ان مطالب کو قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہی مقام..... سورہء بقرہ...... ہے جبکہ قرآن مجید میں اس کے علاوہ جو واقعات وقصص مذکور ہیں وہ ایک سے زیادہ مقامات پر ذکر کئے گئے ہیں۔

فرشتوں سے خدا کا خطاب

○ "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ..."

اس آیت کی تفسیر میں خدا کا فرشتوں سے خطاب، فرشتوں اور شیطان کا جواب اور ان سب کی تفصیلات بعد میں بیان کی جائیں گی، انشاء اللہ۔

فرشتوں کے اظہارات

○ "قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ"

(فرشتوں نے کہا کیا تو اسے بنا رہا ہے جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں)۔

فرشتوں کے جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خدا کے اس بیان سے کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنا رہا ہوں" یہ سمجھا کہ خدا کا ایسا کرنا زمین میں فساد برپا ہونے اور خونریزی کا سبب بنے گا" کیونکہ.....وہ یہ سمجھتے تھے کہ زمین کی مخلوق چونکہ مادی ہے اور غضب وغصہ اور شہوت کی قوتوں کا مجموعہ ہے اور زمین بھی مسلسل کشمکش اور جھگڑے وفساد کا گھر اور طرح طرح کی مخلوق کے رہنے کی محدود الجہات جگہ ہے کہ جس میں مختلف مزاجوں کی حامل مخلوق کا آپس میں ٹکرا جانا اور دست وگریباں ہونا یقینی اور بے انتہا ہے اور اس میں بسنے والی مخلوق (تمام موجودات ارضی) ہر وقت تباہی کے کنارے پر کھڑی ہے

اور اس کے نظم و انتظام کی بنیادیں ہمیشہ متزلزل رہتی ہیں اس لیے اس میں زندگی باہمی تعاون اور معاشرتی روابط کے بغیر ممکن نہیں اور نہ ہی اجتماعی زندگی کے طور طریقوں کو اپنائے بغیر اس میں رہنا ممکن ہے لہٰذا اس قسم کی زندگی میں فساد و خونریزی کے سوا کیا ہو سکتا ہے! چنانچہ فرشتوں نے اس خیال کی بنیاد پر یہ سمجھا کہ وہ خلافت و نمایندگی جو خدا کسی بشر کو عطا کر رہا ہے اس کا زمین میں تحقق پذیر ہونا لوگوں کی کثرت اور ان کے اجتماعی و معاشرتی نظام اور باہمی میل جول سے مربوط ہے جو کہ بالآخر فساد اور خونریزی تک جا پہنچتا ہے' اور خلافت کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک چیز دوسری چیز کی جگہ پر آ جائے یعنی اس کی قائم مقام ہو اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب وہ خلیفہ اور قائم مقام جس کا قائم مقام ہو رہا ہے اس کے وجود کی تمام صفات' آثار اور خصوصیات کا حامل اور آئینہ دار ہو اور جس نظام' احکام اور تدابیر کے اجراء و نفاذ کے لیے اسے قائم مقام بنایا گیا ہے اسے اسی طرح پورا کرنے کا اہل ہو جس طرح وہ خود یعنی خلیفہ و قائم مقام بنانے والا اہل ہے اور چونکہ خداوند عالم اپنے مقدس وجود میں ''اسماء حسنیٰ'' سے موسوم اور جمال و جلال کی بلند پایہ صفات و اوصاف کا حامل ہے اور اپنی حقیقت میں ہر قسم کے نقص سے پاک اور اپنے افعال میں ہر طرح کی برائی' شر اور فساد سے پاک و منزہ ہے اور اس کا مقام و مرتبہ اور عظمت و شان بہت بلند ہے' جبکہ زمین میں رہنے والا شخص ایسا نہیں لہٰذا وہ خدا کا خلیفہ اور قائم مقام بننے کا اہل نہیں ہو سکتا اور وہ نقائص و عیوب سے بھرے ہوئے وجود کے ساتھ اس ذات کا آئینہ دار کیونکر ہو سکتا ہے جو ہر قسم کے نقص و عیب اور خامیوں سے پاک و منزہ ہے' جیسا کہ مشہور ہے کہ: خاک کہاں اور خدا کی ذات کہاں؟ (این التراب و رب الارباب؟)

یہ تھا فرشتوں کا جواب جو انہوں نے اپنی ناآگاہی کو دور کرنے اور حقیقت امر سے آگاہ ہونے کی غرض سے دیا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ خلافت کے سلسلے میں جو پیچیدگی ان کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہے اسے دور کر کے اصل حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہو سکیں' ان کا مقصد خداوند عالم کے کسی کام پر کوئی اعتراض یا کسی سلسلے میں نزاع و جھگڑا کرنا نہیں تھا جیسا کہ ان کے اس بیان سے ظاہر ہے جس میں انہوں نے کہا:

''اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ''

(خدایا' تو ہی علم و حکمت والا ہے) اس جملے میں انہوں نے خدا کے علم و حکمت کا واضح الفاظ میں اظہار و اعتراف کیا ہے اور یہ جملہ چونکہ ''اِنَّ'' کے لفظ سے شروع ہوتا ہے جو اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ متکلم کے نزدیک جملے کا مضمون یقینی اور مسلم الثبوت ہے۔ (غور کریں)

بہر حال فرشتوں کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ: خلیفہ و قائم مقام بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنے وجود و ہستی کے ساتھ خدا کی حمد و تسبیح و تقدیس کے ذریعے اس کی ذات والا صفات کا آئینہ دار ہو' جبکہ زمین کی مخلوق میں یہ صلاحیت موجود نہیں بلکہ زمینی زندگی اسے فساد اور برائیوں کی طرف کھینچتی ہے' اور جب خلیفہ مقرر کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ خلیفہ تسبیح و تقدیس کے ذریعے خدا کی صفات کا آئینہ دار ہو تو یہ مقصد ہماری تسبیح و تقدیس سے حاصل ہے اور ہم تیری تسبیح تیری حمد کے ساتھ کرتے

ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں' لہٰذا ہم ہی تیرے خلیفے ہیں یا یہ کہ ہمیں ہی اپنا خلیفہ بنا' اور اس زمینی مخلوق کو خلیفہ بنانے سے کیا حاصل ہوگا؟

خداوند عالم نے فرشتوں کے اس بیان کی رد میں یوں ارشاد فرمایا:

★ "اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ"

(حقیقت میں جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ اور خدا نے آدم کو سب کے سب نام تعلیم دے دیئے......)۔

اس سیاق کلام سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱)۔ مذکورہ خلافت سے مراد زمین میں خدا کی جانشینی تھی نہ کہ کسی زمینی مخلوق کی جانشینی' یعنی ایسا نہیں کہ انسان سے پہلے زمین میں ایک مخلوق موجود تھی جو ختم ہو گئی پھر خدا نے چاہا کہ ان کی جگہ انسان کو لے آئے (اگرچہ بعض مفسرین نے یہی خیال ظاہر کیا ہے) لیکن یہ درست نہیں' کیونکہ خداوند عالم نے فرشتوں کے جواب میں جو کچھ فرمایا کہ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ (خدا نے آدم کو سب نام پڑھائے اور پھر آدم کو حکم دیا کہ ان فرشتوں کو ان ناموں سے آگاہ کرو) تو یہ جواب اس خیال و احتمال سے جو پیش کیا گیا ہے ہرگز ہم آہنگ و ہم رنگ نہیں' لہٰذا خلافت صرف آدم علیہ السلام سے مخصوص اور انہی تک محدود نہیں بلکہ اولاد آدمؑ بھی اس میں برابر کے شریک ہیں' لہٰذا "ناموں کی تعلیم دینے" کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس علم کو "انسان" کے وجود میں ودیعت کیا تاکہ اس علم کے آثار ہمیشہ کے لیے تدریجی طور پر اس سے ظاہر ہوتے رہیں کہ اگر وہ سیدھے راستہ پر چلا تو اس علم سے پورے طور پر بہرہ ور ہو سکے گا گویا اس علم کو "قوت" کے مرحلہ سے "فعلیت" کے مرحلہ تک لے آئے گا' یاد رہے کہ "قوت کے مرحلہ سے فعلیت کے مرحلہ تک لانا" ایک خالص علمی و فلسفیانہ اصطلاح ہے جس سے مراد کسی چیز میں پائی جانے والی صلاحیت (قوت) کو عملی صورت (فعلیت) دینا ہے۔

اس معنی میں خلافت کسی ایک فرد سے مخصوص منصب کا نام نہیں بلکہ یہ منصب عمومیت رکھتا ہے اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جیسا کہ درج ذیل آیات سے بھی اس کی تائید ملتی ہے:

سورۂ اعراف، آیت ۶۹:

★ "اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ"۔

(جب خدا نے تمہیں قوم نوحؑ کے بعد خلیفے (جانشین) بنایا......)

سورۂ یونس، آیت ۱۴:

★ "ثُمَّ جَعَلۡنٰکُمۡ خَلٰٓئِفَ فِی الۡاَرۡضِ..."

(پھر ہم نے تمہیں زمین میں خلیفے بنایا...)

سورۂ نمل، آیت ۶۲:

★ "وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ۔۔"

(اور وہ تمہیں زمین میں خلیفے بنائے۔۔)۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ خلافت عمومیت رکھتی ہے اور کسی ایک فرد سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہے اور خدا جسے اس کا اہل سمجھتا ہے اسے عطا کرتا ہے اور اس کی اہلیت بھی خدا ہی عطا کرتا ہے)۔

(۲)۔ خداوند عالم نے زمین میں بنائے جانے والے خلیفہ سے فساد اور خونریزی کی نفی نہیں کی یعنی یہ نہیں کہا کہ وہ فساد برپا نہیں کرے گا اور خونریزی نہیں کرے گا اور نہ ہی فرشتوں کی طرف سے تسبیح و تقدیس کرنے کے اظہار کی تکذیب کی بلکہ ان کی تصدیق کی البتہ ایک اور بات پیش کردی اور وہ یہ کہ ایک ایسی مصلحت پیش نظر ہے جس کی تکمیل فرشتوں کے بس میں نہیں اور فرشتے اس مصلحت کے عظیم بوجھ کو اٹھانے سے قاصر ہیں جبکہ یہ زمینی خلیفہ اسے انجام دے سکتا ہے اور وہ خدا کا ترجمان اور اس کے اسرار کا حامل بن سکتا ہے لیکن فرشتے ایسا نہیں کرسکتے' اور اس مصلحت کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے لیے فساد اور خونریزی کو برداشت کیا جاسکتا ہے اور وہ ان کی تلافی کرسکتی ہے' چنانچہ خداوند عالم نے فرشتوں کے جواب میں پہلے یوں ارشاد فرمایا: اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے...... اور پھر دوسری مرتبہ اپنے بیان کی سمت کو تبدیل کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔۔۔ آیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو بہتر جانتا ہوں...... اس آیت میں "غیب" سے مراد وہ "اسمائ" نام...... ہیں جو خدا نے آدمؑ کو پڑھائے تھے نہ کہ ان اسماء (ناموں) کی آدمؑ کو تعلیم دینا' کیونکہ فرشتوں کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ کچھ ایسے نام بھی ہیں جن کا انہیں علم نہیں، نہ یہ کہ انہیں ان اسماء کا تو علم تھا لیکن اس بات کا علم نہ تھا کہ آدمؑ بھی انہیں جانتے ہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو خدا کو ان سے ان ناموں کے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی' اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے ان ناموں کا علم ہی نہیں رکھتے تھے' ورنہ خداوند عالم آدم کو یہ حکم دینے پر اکتفاء کرلیتا کہ اے آدم ان فرشتوں کو ان ہستیوں کے نام بتادو' تاکہ انہیں معلوم ہوجائے کہ تم ان ناموں کا علم رکھتے ہو' نہ یہ کہ فرشتوں سے پوچھے کہ ان کے نام کیا ہیں! اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے اپنے آپ کو مقام خلافت الٰہیہ کا اہل ہونے کا ادعاء کیا اور اس امر کا یقین کرلیا کہ آدم اس مقام کے اہل نہیں' لہٰذا ضروری تھا کہ خلیفہ ان اسماء کا عالم ہو' پس خدا نے فرشتوں سے وہ نام پوچھے لیکن وہ انہیں نہیں جانتے تھے جبکہ آدمؑ ان سے آگاہ تھے' اسی سے یہ ثابت ہوگیا کہ آدمؑ اس مقام کے اہل اور فرشتے اس کے نااہل ہیں' اس مقام پر یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ خدا نے فرشتوں سے نام پوچھنے کے ساتھ ہی ارشاد فرمایا: "اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ" ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو...... اس سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں نے جس چیز کا ادعاء کیا وہ اس میں سچے نہ تھے کیونکہ اس کے لیے اسماء کا علم ضروری تھا جبکہ وہ ان کا علم نہیں رکھتے تھے۔

آدم کو تعلیم اسماء

"وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ ..."

(اور اللہ نے آدم کو سب نام پڑھا دیئے، پھر انہیں پیش کیا۔۔)

آیت مبارکہ کے اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نام یا ان کے مسمٰی یعنی ان ناموں والے حیات اور عقل کی حامل موجودات تھے (زندہ اور صاحبان عقل) اور وہ پردہ غیب میں پوشیدہ تھے' اور یہ کہ ان کے ناموں سے آگاہ ہونا اس علم و آگاہی کی طرح نہیں تھا جو ہم موجودات عالم کے ناموں کی بابت رکھتے ہیں بلکہ اس سے قطعی مختلف تھا ورنہ جب آدم علیہ السلام نے فرشتوں کو وہ نام بتا دیئے تو فرشتوں اور آدم دونوں کا علم ایک جیسا ہو جاتا اور فرشتے اس علم کے حوالہ سے آدمؑ کے برابر ہو جاتے اور آدمؑ کے لیے کوئی دوسری خصوصیت ہی باقی نہ رہتی کہ جس کے سبب وہ فرشتوں سے برتر ہوتے' کیونکہ فرق صرف یہی تھا کہ خدا نے آدمؑ کو وہ نام پڑھا دیئے تھے جبکہ فرشتوں کو نہیں پڑھائے تھے اگر خدا فرشتوں کو بھی وہ نام پڑھا دیتا تو وہ بھی آدمؑ جیسے ہوتے یا ان سے بھی افضل و برتر' اور پھر یہ کہ اگر ان اسماء کا علم ہمارے علم جیسا ہوتا تو فرشتے صرف ان ناموں کے نہ جاننے کی بناء پر اپنی کمتری کا اعتراف نہ کرتے اور نہ صرف اسی بات سے ان کا استدلال غلط ثابت ہوتا کیونکہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ خدا کسی شخص کو خود ہی کسی زبان کی تعلیم دے اور پھر اسے فرشتوں کے سامنے پیش کر کے اس پر فخر و مباہات کرتے ہوئے اپنے پاک و پاکیزہ اور مخلص عبادت گزار فرشتوں پر کہ جو کبھی خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور ہمیشہ اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہتے ہیں اسے صرف اسی زبان یا ناموں کے جاننے کی وجہ سے برتری دے اور ان سے یہ کہے کہ یہ میرا خلیفہ اور میری فضیلتوں کا حامل ہونے کی صلاحیت و اہلیت رکھتا ہے جبکہ تم اس کے اہل نہیں ہو؟ اور پھر ان سے یہ بھی کہے کہ اگر تم میری بات کو نہیں مانتے اور اپنے دعوے میں سچے ہو کہ تم اس مقام کے اہل ہو یا پھر تم اس مقام کا مطالبہ کرتے ہو تو مجھے وہ زبانیں بتاؤ جو بنی نوع آدمؑ مستقبل میں اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کے لیے وضع کریں گے! اور اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ کسی زبان کا جاننا تو صرف اس لیے کمال و برتری کہلاتا ہے کہ اس کے ذریعے کلام کرنے والے شخص کے دل کا مقصد و مطلوب معلوم ہوتا ہے جبکہ فرشتے کسی کے دل کا راز جاننے کے لیے اس کی زبان جاننے کے محتاج نہیں بلکہ وہ زبان اور تکلم کے بغیر اور بلاواسطہ ہر شخص کے دل کی بات معلوم کر سکتے ہیں اور کسی کی لوح دل کا مطالعہ کرنا ان کے لیے ہرگز دشوار نہیں لہٰذا انہیں کسی زبان کے جاننے کی ضرورت نہیں وہ تکلم کے کمال سے مافوق کمال رکھتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو علم فرشتوں نے آدمؑ سے حاصل کیا وہ کچھ اور تھا اور جو علم خدا نے آدمؑ کو عطا کیا وہ کچھ اور' جو علم آدمؑ نے فرشتوں کو عطا کیا وہ "اسماء" کا ظاہری علم تھا، جو علم خدا نے آدمؑ کو عطا کیا وہ ان اسماء کے علم کی حقیقت تھی' اور اس حقیقی علم یا علم کی اصل حقیقت کا حاصل کرنا آدمؑ کے لیے تو ممکن تھا لیکن فرشتوں کے لیے ہرگز ممکن نہ تھا اور وہ اس علم کے حصول کی طاقت ہی نہیں رکھتے تھے' اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ خدا نے جو علم کی حقیقت آدمؑ کو عطا کی اس کی بدولت وہ خلافت الٰہیہ کے مستحق ٹھہرے نہ کہ فرشتوں کو ان اسماء کی تعلیم دینے کی وجہ سے' ورنہ جب آدمؑ نے فرشتوں کو سب نام بتا دیئے اور وہ

ان کا علم حاصل کر چکے تو پھر انہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ "سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا " (اے اللہ تیری ذات پاک ہے، ہمیں اس کے سوا کچھ علم ہی نہیں جو تو نے ہمیں پڑھایا ہے) اپنے اس بیان سے انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ "ہم علم نہیں رکھتے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ ظاہری طور پر ناموں کا جان لینا اور ہے اور علم کی حقیقت کچھ اور ہے (ان دونوں میں فرق ہے)۔

مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جن چیزوں کے نام خدا نے آدمؑ کو بتائے اور آدمؑ نے فرشتوں کو بتائے ان کا علم ایسا ہونا چاہیے جن سے ان کی حقیقتوں اور ان کے وجود کی اصل و اساس سے آگاہی حاصل ہو سکے نہ یہ کہ صرف ان کے نام اور وہ الفاظ کہ جو عام طور پر کسی چیز کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے بنائے جاتے ہیں، کے سوا کچھ بھی معلوم نہ ہو، لہٰذا حقیقت امر یہ ہے کہ وہ نام والے حضرات کہ جن کے نام حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم دیئے گئے تھے ان کا وجود صرف ذہنی حدود تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ ظاہر بظاہر دیکھے جا سکنے والے حقائق اور حقیقی موجودات تھیں جو کہ پردہ غیب یعنی آسمانوں اور زمین کے غیب میں پوشیدہ تھیں اور انہیں ان کی اس حالت اور عظیم حقیقت کے ساتھ جاننا ایک زمینی مخلوق کے لیے ممکن تھا نہ کہ آسمانی مخلوق اور فرشتوں کے لیے، اور دوسری بات یہ کہ وہ علم خلافت الٰہیہ میں دخیل تھا (اس لیے فرشتے اس مقام کے اہل نہیں بن سکتے تھے)۔

ناموں کا تذکرہ

○ "الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" (نام)

یہاں "اسماء" پر الف ولام ہے یعنی الاسمائ، جو کہ عربی زبان کے قواعد کی رو سے "جمع محلّی باللام" کہلاتی ہے (وہ جمع کا صیغہ جس پر الف ولام ہو) اور جب جمع کے صیغہ پر الف ولام آئے تو اس سے عمومیت (معنی و مصداق کے دائرہ میں وسعت) مراد لی جاتی ہے اور پھر اس کے ساتھ "کلھا" کا لفظ بھی ذکر ہوا ہے جس کا معنی "سب" ہے، گویا اس "کلھا" کے لفظ نے مزید تاکید کا فائدہ دیا ہے، لہٰذا "الاسماء کلھا"...... سب نام...... سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ نام جو کسی کا نام ہو سکتا ہے، اس جملہ میں کسی قسم کی قید اور عہد (پہلے سے معلوم نام، ذہنی طور پر یا بیان کئے گئے نام) بھی موجود نہیں جس کی بناء پر یہ کہا جا سکے کہ ان سے مراد وہ نام ہیں جو پہلے سے معلوم تھے، اس کے بعد خدا نے ارشاد فرمایا: "ثم عرضھم" (پھر خدا نے انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر نام یعنی اس کا مسمّی (نام والے) ایسی مخلوق تھے جو حیات اور علم بھی رکھتے تھے اور اس کے باوجود وہ پردۂ غیب، آسمانوں اور زمین کے غیب میں پوشیدہ تھے۔ آیت میں غیب کی بابت کہا گیا ہے: "آسمانوں اور زمین کا غیب" تو اگرچہ اس میں یہ امکان پایا جاتا ہے کہ یہ اضافت بعض موارد و مقامات میں تبعیض کے لیے ہو یعنی اس سے مراد بعض غیب ہو نہ کہ سارے کا سارا غیب، لیکن یہ مقام ایسا نہیں کہ یہاں بعض غیب مراد لیا جائے اور یوں کہا

ئے: ''آسمانوں اور زمین کے غیب سے کچھ، مراد ہے بلکہ یہاں آسمانوں اور زمین کے غیب سے مراد تمام اور سارا غیب ہے
یونکہ یہاں قدرت الٰہیہ کی وسعت وکمال اور فرشتوں کی ناتوانی وعجز ونقص کا اظہار مقصود ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ یہاں
ضافت من (تبعیض) کی بجائے اضافت لام مراد لی جائے جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ''اسماء''......نام......ایسے امور تھے
تمام آسمانوں اور زمین سے پوشیدہ تھے (عالم سماوی وارضی سے مخفی تھے) اور پورے طور پر عالم کون وکائنات کی حدود سے
رتھے۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں جب یہ معلوم ہوگیا کہ اسماء سے مراد سب نام ہیں اور ان ناموں والے افراد زندگی
علم رکھتے تھے اور پردۂ غیب' یعنی آسمانوں اور زمین کے غیب میں پوشیدہ تھے' تو مزید غور وفکر......کرنے سے آپ قطعی
ر پر یہ نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں کہ یہ حقائق مکمل طور پر درج ذیل آیت کے مضمون سے مطابقت رکھتے ہیں (ملاحظہ ہو)
رۂ حجر، آیت ۲۱:

★ ''وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ''

(ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں اور ہم ان خزانوں میں سے جچی تلی مقدار بھیجتے ہیں)۔

اس آیت میں خداوند عالم نے اس امر کو بیان فرمایا ہے کہ ہر وہ کہ جسے ''شے''......چیز......کہہ سکتے ہیں خدا کے
س اس کے بے شمار خزانے موجود ہیں۔ اور وہ خزانے صرف اسی کے پاس ہی محفوظ ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ باقی
ں نہ ہی ان کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کی حد اور حدود معین کی جا سکتی ہیں البتہ ان کی اندازہ گیری اور مقدار و
ود صرف خدا کی طرف سے نازل ہونے اور پیدا کئے جانے سے تعلق رکھتی ہیں یعنی ان کی مقدار اور حدود کے تعین کا عمل
رف ان کی تخلیق اور انہیں نازل کرنے ہی سے مختص ہے۔ اور ان خزانوں کی کثرت شماریات کے باب سے نہیں کہ جن میں
رازہ گیری وحد بندی کی گنجائش قطعی طور پر موجود ہوتی ہے بلکہ اندازہ گیری اس کا لازمی حصہ ہے۔ یعنی یہاں کثرت سے یہ
اد نہیں کہ ان کی تعداد زیادہ ہے کیونکہ اگر تعداد کی کثرت مراد ہوتی تو انہیں شمار کرنا اور ان کی مقدار اور حدود معین کرنا ممکن
۔ کیونکہ تعداد کے حوالہ سے اندازہ گیری کا عمل امکان پذیر ہوتا ہے بلکہ ان کی کثرت سے مراد مراتب اور درجات کی کثرت
ہے اس سلسلہ میں تفصیلی بحث سورہ حجر میں ہوگی انشاءاللہ تعالیٰ۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جن ہستیوں کو خداوند عالم نے فرشتوں کے سامنے پیش کیا وہ خدا کی عالی مرتبت مخلوق اور اس
کے دائرۂ حفظ وامان میں تھی اور غیب کے پردوں میں محجوب وپوشیدہ تھی' اور خداوند عالم نے دنیا میں انہی کی برکت سے ہر
اسم'' نازل کیا اور جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب انہی کے نور اور انہی کی بدولت ہے' اور وہ اس کثرت کے
جود افرادی تعداد کے لحاظ سے کثرت میں نہیں اور نہ ہی ان کی شخصیتوں میں کوئی فرق ہے یعنی ان کے درمیان ایسا فرق نہیں
عام طور پر لوگوں کے درمیان پایا جاتا ہے بلکہ حقیقت میں ان کی کثرت مراتب ودرجات کے لحاظ سے ہے' اور اسی لحاظ سے
ں میں سے ہر ''اسم'' کے نزول کا عمل انجام پاتا ہے۔

خدا ظاہر و باطن سے آگاہ ہے

○ "وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ "۔

(اور میں بہتر جانتا ہوں ہر اس چیز کو جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو)۔

اس جملے میں دو چیزوں کا ذکر ہے: ایک وہ کہ جسے فرشتے ظاہر کرتے ہیں اور دوسری وہ کہ جسے چھپاتے ہیں، اور دونوں غیب ہی کی دو قسمیں ہیں، جنہیں "نسبی غیب" کہا جاتا ہے یعنی آسمانوں اور زمین کے غیب کا ایک حصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے یوں ارشاد فرمایا: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ "یعنی میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو بہتر جانتا ہوں، تو اس جملے کے بالکل مقابل میں یہ کہنا کہ "وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ" (اور میں بہتر جانتا ہوں اس چیز کو جسے تم ظاہر کرتے ہو یا جسے تم چھپاتے ہو) اس بات کی دلیل ہے کہ اصل غیب کی دونوں قسمیں یعنی زمین و آسمان (عالم ارضی و سماوی) میں پایا جانے والا غیب اور ان سے باہر کا غیب علم الٰہی کے وسیع دائرہ میں ہیں۔

کتمان و پوشیدہ کئے گئے امور سے آگاہی

○ "وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ "۔

(اور جو کچھ تم چھپاتے ہو)

اس جملے میں کتمان اور چھپانے کو "كُنْتُمْ " کے لفظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور ان کے خلیفہ بنانے کی بابت کوئی خاص امر پوشیدہ تھا چنانچہ اس کی تصدیق بعد والی آیت سے بھی ہو سکتی ہے جس میں یوں کہا گیا ہے:

★ " فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ٞ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ " ۔ کہ سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کر دیا اور تکبر کیا اور وہ تھا ہی کافروں میں سے۔ ...اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس آدمؑ کی تخلیق کے واقعہ سے پہلے ہی کافر تھا کیونکہ آیت میں ہے "وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ" یعنی وہ تھا ہی کافر، تو گویا اس کا آدمؑ کو سجدہ نہ کرنا اس کے اسی کفر کی وجہ سے تھا کہ جسے اس نے چھپایا ہوا تھا۔

ان تمام مطالب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرشتوں کا سجدہ کرنا اور ابلیس کا سجدہ کرنے سے انکار کرنا ایک ایسا واقعہ تھا جو خداوند عالم کے ان دو بیانات کے درمیان میں رونما ہوا:

پہلا بیان: " اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ " (میں اسے بہتر جانتا ہوں جسے تم نہیں جانتے)

دوسرا بیان: " وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ " (اور میں بہتر جانتا ہوں جسے تم ظاہر کرتے ہو اور جسے چھپاتے ہو... تھے...)

اور اسی طرح یہ راز بھی آشکار ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم نے "اِنِّیٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ" کہنے کے بعد "اِنِّیٓ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ" کیوں کہا، یعنی پہلے یہ کہہ کر کہ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے پھر اسے تبدیل کر کے یوں کہا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو بہتر جانتا ہوں، اس کی وجہ تمام مذکورہ مطالب سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔

روایات پر ایک نظر

فرشتوں کے جواب کی وضاحت

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: اگر فرشتوں نے زمین میں فساد اور خونریزی کرنے والوں کو نہ دیکھا ہوتا تو خدا سے یہ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ: (اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ) آیا زمین میں اسے خلیفہ مقرر کر رہا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے گا۔

تجزیہ:

امام علیہ السلام کے بیان کی روشنی میں اس بات کا امکان نظر آتا ہے کہ اس سے مراد وہ دور ہو جو بنی نوع آدمؑ کے زمین میں بسنے سے پہلے تھا چنانچہ اس سلسلے میں روایات بھی وارد ہوئی ہیں اور یہ بات ہمارے اس بیان کے منافی بھی نہیں جو ہم نے پہلے ذکر کیا تھا کہ جب خدا نے ارشاد فرمایا "اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً" میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں تو فرشتوں نے یہ سمجھا کہ وہ زمین میں فساد و خونریزی کرے گا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اس بیان کے بغیر فرشتوں کی بات اسی طرح کے قابل مذمت قیاس جیسی ہو جائے گی جو قیاس ابلیس نے کیا کیونکہ آدمؑ سے پہلے اگر کسی نے فساد و خونریزی کی بھی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسری مخلوق بھی ایسا ہی کرے گی۔

قدریہ کا منہ توڑ جواب

تفسیر العیاشی میں مذکور ہے کہ زرارہ نے کہا میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، امامؑ نے مجھ سے پوچھا: کیا تیرے پاس احادیث شیعہ میں سے کچھ ہے؟ میں نے عرض کی: میرے پاس احادیث شیعہ میں سے بہت کچھ ہے اور میں نے سوچا تھا کہ ان سب کو آگ لگا دوں، امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ انہیں چھپا لو اور جو حدیث صحیح نہ لگے اسے بھلا دو، امامؑ کی یہ بات سن کر مجھے حضرت آدمؑ کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ یاد آ گئیں، امام محمد باقر علیہ

السلام نے ارشاد فرمایا کہ فرشتوں کو آدمؑ کے بارے میں کیا علم تھا کہ انہوں نے کہہ دیا "آیا اسے مقرر کر رہا ہے جو زمین
فساد اور خونریزی کرے گا" زرارہ نے کہا کہ جب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام یہ واقعہ ذکر کرتے تو فرمایا کرتے تھے
یہ واقعہ قدریہ کا منہ توڑ جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر اس کی تخلیق سے پہلے ہی معین ہو چکی تھی پھر اس کے بعد
جعفر صادق علیہ السلام نے اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ آدم علیہ السلام کا دوست
اور جب آدمؑ آسمان سے زمین پر اترے تو آپ کی جدائی اس فرشتہ کو ناگوار خاطر ہوئی اور اس نے خدا کے حضور گلہ کیا اور
سے اجازت طلب کی کہ وہ بھی زمین پر اتر جائے چنانچہ فرشتہ زمین پر اترا اور آدمؑ کے پاس پہنچا، اس نے دیکھا کہ آ
زمین کی ایک خشک اور بے آب و گیاہ جگہ پر بیٹھے ہیں آدمؑ نے جوں ہی اپنے آسمانی دوست کو دیکھا تو سر پر ہاتھ رکھ
نہایت زور سے چیخ ماری، امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: کہا جاتا ہے کہ آدمؑ نے اتنے زور سے چیخ ماری کہ تمام مخلو
نے سنی یعنی اس کی آواز فضائے عالم میں گونج اٹھی، فرشتہ نے آدمؑ کی یہ حالت دیکھی تو ان سے کہا کہ میں سمجھتا ہوں آپ
خدا کی نافرمانی کی ہے اور ایک ایسا بوجھ اٹھا لیا ہے جس کی آپ طاقت نہیں رکھتے" آیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے بار
میں خدا نے ہم سے کیا کہا اور ہم نے اس کا کیا جواب دیا؟ آدمؑ نے کہا: نہیں مجھے معلوم نہیں، فرشتہ نے کہا : خدا نے ہم
کہا ہے (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً) میں زمین میں خلیفہ مقرر کر رہا ہوں، تو ہم نے کہا (اَتَجْعَلُ فِیْهَا
یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ) آیا اسے مقرر کر رہا ہے جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے گا؟ اس سے پتہ چلتا ہے کہ
نے تجھے اس لیے پیدا کیا ہے کہ تو زمین میں رہے تو کیا اب بھی تو یہ چاہتا ہے کہ آسمان میں رہے؟..... امام جعفر صادقؑ
یہ واقعہ بیان کر کے تین مرتبہ فرمایا: خدا کی قسم، فرشتہ کی اس بات سے ہی آدمؑ کے دل کو تسلی ہوئی۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ کی بہشت (کہ جس میں پیدا ہوئے اور پھر وہاں سے زمین پر آئے
آسمان میں تھی، اس سلسلہ میں مزید روایات بھی ذکر کی جائیں گی۔

اسماء کے ایک مصداق کا ذکر

تفسیر العیاشی میں ایک روایت ابوالعباس سے ذکر کی گئی ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق
السلام سے پوچھا کہ آیت میں ہے: "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" خدا نے آدمؑ کو سب نام پڑھائے تو وہ نام کیا
امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ وہ زمینوں، پہاڑوں، غاروں اور وادیوں کے نام تھے، پھر امامؑ نے اپنے نیچے بچھے ہوئے قالین کو
اور فرمایا کہ یہ قالین بھی انہی چیزوں میں سے ہے جن کے نام خدا نے فرشتوں کو پڑھائے۔

فضیل بن عباس کی روایت

اسی تفسیر (العیاشی) میں فضیل بن عباس سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ خدا نے آدم علیہ السلام کو جو نام تعلیم دیئے وہ کیا تھے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: وہ وادیوں، نباتات، درختوں اور پہاڑوں کے نام تھے۔

داود بن سرحان کا بیان

اسی تفسیر (العیاشی) میں داؤد بن سرحان عطار سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا، امامؑ نے دسترخوان بچھانے کا حکم دیا، ہم نے کھانا کھایا، پھر آپ نے ہاتھ دھونے کے لیے طشت اور تولیہ منگوایا، میں نے امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ مولا میری جان آپ پر قربان ہو، یہ فرمایئے کہ خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کو سب نام تعلیم دیئے تو آیا یہ طشت اور تولیہ بھی ان ناموں میں شامل تھے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سب کچھ شامل ہے تمام درّے (پہاڑوں کے درمیان کے تنگ راستے) وادیاں اور بیابان سب شامل ہیں، اس کے ساتھ ہی امامؑ نے اپنے دست مبارک سے بلندیوں اور پستیوں کی طرف اشارہ کیا کہ یہ سب ان میں شامل ہیں۔

خلافت الٰہیہ کے استحقاق کی حامل شخصیات

کتاب معانی الاخبار میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا، خداوند عالم نے آدم علیہ السلام کو اپنی تمام حجتوں (انبیاءؑ و مرسلینؑ اور آئمۂ معصومینؑ) کے نام تعلیم دیئے، پھر انہیں جبکہ وہ اس وقت عالم ارواح میں تھے فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور ارشاد فرمایا کہ اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو کہ اپنی تسبیح و تقدیس کی وجہ سے تم آدمؑ سے زیادہ اس کے حقدار ہو کہ تمہیں زمین میں منصب خلافت عطا کیا جائے تو ان کے نام مجھے بتاؤ! فرشتوں نے جواب دیا: "سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ" (تیری ذات پاک ہے، ہمیں اس کے علاوہ کچھ معلوم نہیں ہے جو تم نے ہمیں تعلیم دیا ہے تو ہی دانا اور حکمت والا ہے) اس کے بعد خداوند عالم نے آدمؑ سے ارشاد فرمایا: "يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ" (اے آدمؑ اب تم انہیں ان کے نام بتاؤ) پس جب آدم علیہ السلام نے انہیں نام بتائے تو فرشتوں نے ان ہستیوں کی عظمت کو جان لیا اور اس امر سے آگاہ ہو گئے کہ ان شخصیتوں کا مقام و مرتبہ خدا کے نزدیک کتنا بلند ہے، لہٰذا یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو گئی کہ وہی ہستیاں اس کا حق رکھتی ہیں کہ زمین میں خدا کی خلافت اور اس کی مخلوق میں اس کی حجت اور نمائندہ ہونے کا منصب پائیں۔ اس کے بعد خدا نے ان ہستیوں کو فرشتوں سے پنہاں کر لیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ ان ہستیوں کی ولایت اور محبت کا اقرار کریں، اور پھر ان سے ارشاد فرمایا:

★ "اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ

تَكْتُمُونَ "۔

(آیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کا غیب جانتا ہوں اور میں ہر اس چیز کو بہتر جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم پنہاں کرتے ہو)۔

توضیح و تحقیق:

جو مطالب ہم نے پہلے بیان کئے ہیں ان کی روشنی میں آپ مذکورہ روایات کے معانی سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں اور اس حقیقت سے مطلع ہو چکے ہیں کہ ان روایات اور پہلے بیان کی گئی روایات میں کوئی تنافی نہیں پائی جاتی (یعنی ان میں ایک دوسرے کی نفی کا پہلو موجود نہیں) کیونکہ پہلے ہم نے ذکر کیا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

★ " وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ "

(ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس موجود و محفوظ ہیں)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو غیب کے خزانوں میں موجود نہ ہو اور یہ سب چیزیں ہمارے سامنے موجود ہیں انہی غیب کے خزانوں ہی سے آئی ہیں لہٰذا جو نام ان چیزوں کا یہاں ہے ان خزانوں میں بھی وہ نام ہے اس لیے اس حوالہ سے کوئی فرق نہیں کہ یوں کہا جائے: خداوند عالم نے آدمؑ کو جو کچھ بھی غیب کے خزانوں میں موجود ہے اس کی تعلیم دی کہ وہی آسمانوں اور زمین کا غیب ہے یا یوں کہا جائے کہ: خداوند عالم نے آدم علیہ السلام کو ہر چیز کے نام کی تعلیم دی اور وہی آسمانوں اور زمین کا غیب ہے دونوں صورتوں میں بات ایک ہے اور ایک ہی معنی و مفہوم سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

روایاتِ طینت کا تذکرہ

اس مقام پر مناسب ہے کہ ان روایات میں سے جنہیں "روایات طینت" کہا جاتا ہے کچھ روایات ذکر کی جائیں ہم وہ حدیث یہاں ذکر کرتے ہیں جو علامہ مجلسیؒ نے کتاب بحار الانوار میں جابر بن عبداللہ انصاری کے حوالہ سے ذکر کی ہے انہوں نے کہا:

(قلت لرسول الله (ص): اول شيی خلق الله ما هو؟)

میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ خدا نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا؟

(فقال: نور نبيک يا جابر! خلقه الله ثم خلق منه کل خير، ثم اقامه بين يديه في مقام القرب ما شا الله، ثم جعله اقساماً فخلق العرش من قسم، و الکرسی من قسم و حملة العرش و سکنة الکرسی من قسم، و اقام القسم الرابع في مقام الحب ما شا الله، ثم جعله قسماً فخ

القلم من قسم و اللوح من قسم و الجنة من قسم، و اقام القسم الرابع فی مقام الخوف ما شا اللہ، ثم جعله اجزاء فخلق الملائكة من جزء و الشمس من جزء و القمر من جزء، و اقام القسم الرابع فی مقام الرجاء ما شا اللہ، ثم جعله اجزاء، فخلق العقل من جزء و العلم و الحلم من جزء و العصمة و التوفيق من جزء، و اقام القسم الرابع فی مقام الحياء ما شا اللہ، ثم نظر اليه بعين الهيبة فرشح ذلک النور و قطرت منه ماة الف و اربعة و عشرون قطرة، فخلق اللہ من كل قطرة روح نبی و رسول، ثم تنفست ارواح الانبياء فخلق اللہ من انفاسها ارواح الاولياء و الشهداء و الصالحين)

پیغمبر اکرمؐ نے جواب دیا کہ اے جابر! خدا نے سب سے پہلے تیرے نبیؐ کے نور کو پیدا کیا پھر اسی نور سے ہر "خیر"......اچھائی اور اچھی چیز......کو پیدا کیا' پھر اس نے اس نور کو جب تک چاہا اپنے سامنے اور اپنے "قرب" میں رکھا' پھر اس نور کی کئی قسمیں کیں' ایک قسم سے عرش کو پیدا کیا' ایک قسم سے کرسی کو' ایک قسم سے عرش کے حاملین ...... اٹھانے والوں...... اور کرسی پر بیٹھنے والوں کو پیدا کیا' اور چوتھی قسم کو اپنے مقام محبت میں جب تک چاہا قرار دیا اور پھر اسے کئی قسموں میں تقسیم کر دیا، ایک قسم سے قلم کو' ایک قسم سے لوح کو' ایک قسم سے بہشت کو اور چوتھی قسم کو جب تک چاہا مقام "خوف" میں رکھا اور پھر اس کے کئی اجزاء و حصے بنائے' ایک جزء سے فرشتوں کو' ایک جزء سے سورج کو اور ایک جزء سے چاند کو پیدا کیا اور چوتھی قسم کو جب تک اس نے چاہا مقام "رجائ"......امید...... میں رکھا اور پھر اس کے کئی اجزاء بنائے ان میں سے ایک جزء سے عقل کو' ایک جزء سے علم و حلم' ایک جزء سے عصمت اور توفیق کو پیدا کیا اور چوتھی قسم کو مقام "حیا" میں جب تک چاہا رکھا اور پھر اس کی طرف نگاہ ہیبت سے دیکھا تو خدا کی ہیبت کے اثر سے اس سے نور کے قطرے ٹپکنے لگے یہاں تک کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار قطرے اس سے ٹپکے اور خدا نے ہر قطرہ سے نبی اور رسول کی روح کو پیدا کیا' پھر انبیاء کی ان روحوں نے سانس لینا شروع کی تو خدا نے ان کی سانسوں سے اولیاء' شہداء اور صالحین کی روحوں کو پیدا کیا۔

تفکر و تدبر:

مذکورہ بالا مطالب کی بابت کثیر روایات موجود ہیں' اگر آپ ان میں بھرپور توجہ کریں تو ملاحظہ فرمائیں گے کہ ان روایات میں ہمارے سابقہ بیانات کے شواہد اور ثبوت پائے جاتے ہیں' اور انشاء اللہ ان روایات میں سے بعض کی بابت ہم بہت جلد آئندہ آنے والے صفحات میں قدرے بحث کریں گے' اور آپ ان روایات کے معانی و مطالب پر پوری توجہ اور نہایت غور سے کام لیں اور ان احادیث کے بارے میں ہرگز یہ نہ سوچیں کہ یہ سب متصوفہ......اپنے آپ کو تصوف کی طرف منسوب کرنے والوں...... کی من گھڑت اور بے بنیاد باتیں ہیں بلکہ یہ کائنات کی تخلیق کے وہ اسرار ہیں جو علم و حکمت کے سرچشموں سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں چنانچہ آپ دیکھیں کہ کتنے صاحبان علم و دانش اور ارباب فکر و نظر دنیائے طبیعت کے

اسرار کی بابت اپنی تمام کاوشیں بروئے کار لا کر بحث و تحقیق میں بھرپور طور سے مصروف ہیں اور جب سے بشر اس مادی دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلنے لگا اور عالم طبیعت کی حقیقتوں سے آگاہی حاصل کرنے لگا تو وہ جس چیز سے بھی آگاہ ہوتا اسے کئی دیگر نامعلوم امور سے آگاہی مل جاتی' جبکہ اس کی تمام تر کوششیں عالم طبیعت ہی تک محدود تھیں اور اس نے جو معلومات حاصل کیں وہ عالم طبیعت ہی سے تعلق رکھتی ہیں جو کہ تمام عوالم سے نہایت پست اور سب سے چھوٹا اور ناچیز عالم ہے' اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ماورائے عالم طبیعت میں کیا کچھ ہے اور کس قدر عظیم حقائق اس عالم طبیعت کے علاوہ اس عالم میں موجود ہیں جو عالم نور اور وسعتوں کا حامل عالم ہے' یقیناً اس عالم کے حقائق بہت عظیم اور نہایت بلند ہوں گے۔

آیت ۳۴

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

ترجمہ

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے انکار کر دیا اور تکبر سے کام لیا اور وہ تھا ہی کافروں میں سے (۳۴)

تفسیر و بیان

اس سے پہلی آیت میں " وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ " کے الفاظ سے آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ جملہ ("او
جو کچھ تم چھپاتے ہو") اس امر کا ثبوت ہے کہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے فرشتے چھپائے ہوئے تھے جو کہ بعد میں ظاہر ہو
گئی یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے ابلیس کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

" اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ " یعنی اس نے انکار کیا اور تکبر سے کام لیا اور وہ تھا ہی کافروں میں سے'

آپ ملاحظہ کریں کہ خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ اس نے انکار کیا' اور تکبر کیا اور وہ اس انکار اور تکبر کی وجہ سے کاف
ہو گیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز فرشتے چھپائے ہوئے تھے اور خدا نے کہا کہ میں اسے جانتا ہوں جو تم چھپائے ہوئے ہو
وہ ابلیس کا کفر تھا۔

اسی طرح یہ امر بھی آپ پر واضح ہو چکا ہے کہ سجدہ کا واقعہ۔ گویا، بلکہ یقیناً۔ خدا کے ان دو بیانات کے درمیان
واقع ہوا ہے:

۱۔ " اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ " (جو کچھ میں بہتر جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے)

۲۔ " وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ " (اور میں بہتر جانتا ہوں اس چیز کو جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو
چھپائے ہوئے ہو)۔

لہٰذا یہ آیت " وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ " گویا ایک ایسے جملہ کی مانند ہے جسے چند جملوں کے
درمیان سے نکالا گیا ہوتا کہ اس کے ذریعے بہشت کے واقعہ کی طرف توجہ ہو سکے' کیونکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ یہ تمام
آیات انسان کے زمین میں خلیفہ بننے کی کیفیت' اس کا مقام و مرتبت' اس کے زمین پر اترنے کی کیفیت اور اس کے انجام کا
یعنی سعادت و شقاوت کو بیان کرتی ہیں اور اس مقام پر سجدہ کے واقعہ کا تفصیلی ذکر اہم نہیں بلکہ اس کا اجمالی تذکرہ ہی کافی
ہے اور وہ بھی اس لیے کہ بہشت کے واقعہ اور آدمؑ کے بہشت سے اتر کر زمین پر آنے کی داستان کو ذکر کیا جا سکے اور شاید
اسی وجہ سے غائب کے صیغہ کے بعد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ پہلے یوں فرمایا:

"واذقال ربك للملائكة انی جاعل یہاں غائب کا صیغہ استعمال کیا گیا یعنی "قال" (اس نے کہا) اور اس کے بعد یوں فرمایا:

"وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا... یہاں جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا یعنی "قلنا" (ہم نے کہا)۔

اور آیت مبارکہ میں "کتمان" اور چھپانے کی جو نسبت فرشتوں کی طرف دی گئی ہے "وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ" (وہ چیز کہ جسے تم چھپاتے ہو) دراصل وہ ابلیس کا فعل تھا نہ کہ تمام فرشتوں کا (یعنی ابلیس نے اپنا کفر چھپایا ہوا تھا) لیکن خدا نے اس فعل کی نسبت تمام فرشتوں کی طرف دی اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر اظہار سخن اور خطاب میں ایسا ہی کیا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کوئی کام انجام دے اور وہ ایک خاص گروہ کا فرد ہو تو اس کام کی نسبت پورے گروہ کی طرف دی جاتی ہے خاص طور پر جبکہ وہ فرد اس گروہ میں اس طرح شامل ہو کہ اس سے الگ کوئی امتیازی پہچان بھی نہ رکھتا ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی ایک اور وجہ ہو اور وہ یہ کہ جب خدا نے فرمایا: "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" میں زمین میں ایک خلیفہ بنا رہا ہوں تو چونکہ خدا کے کلام میں ظاہری الفاظ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے مراد کسی خاص شخص کی خلافت کا اعلان نہیں بلکہ مطلق اظہار ہے اور فرشتے ہرگز اس بات کا احتمال نہیں دیتے تھے کہ کوئی زمینی مخلوق خدا کی خلافت و نیابت کے عظیم منصب پر فائز ہونے کی اہلیت رکھتی ہے اور خدا نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ کس کو خلیفہ بنا رہا ہوں لہٰذا فرشتوں نے اپنی تسبیح و تقدیس کا حوالہ دے کر اپنے استحاق کا اظہار کر دیا اور خدا نے فرمایا کہ "جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے" اور پھر یہ کہ جب خدا نے فرشتوں کے بیان کو رد کر دیا اور آدمؑ کی خلافت کے استحقاق کو ثابت کر دیا تو اس کے بعد فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں کیونکہ ابھی تک فرشتوں کے دلوں میں خدشات باقی تھے اور وہ ہرگز یہ گمان نہیں کرتے تھے کہ ایک بشر کو فرشتوں سمیت سب پر برتری و اقتدار کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس مطلب کو بعض روایات میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو عنقریب ذکر کی جائیں گی۔

سجدۂ آدمؑ کا حکم

O "اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ۔۔"

(تم سجدہ کرو آدم کو۔۔)

اس جملہ سے اجمالی طور پر غیر خدا کو سجدہ کرنے کا جواز ملتا ہے یعنی خدا کے علاوہ بھی کسی کو سجدہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی عزت اور احترام کی خاطر ہو (اسے سجدہ تحیت و تعظیم کہا جاتا ہے) اور اس کے ساتھ ساتھ ایسا کرنے میں خدا کی طاعت و امتثال اور موافقت امر الٰہی کے سوا کوئی چیز ملحوظ خاطر نہ ہو جیسا کہ خداوند عالم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ارشاد فرمایا:

سورہ یوسف، آیت ۱۰۰:

★ "وَرَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّیۡ حَقًّا"

(یوسفؑ نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا تو وہ سب (والدین اور بھائی) اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، یوسفؑ نے اپنے والد سے کہا: بابا جان! یہ ہے میرے اس خواب کی تاویل جو میں نے پہلے دیکھا تھا اور میرے پروردگار نے اس خواب کو سچ کر دیا ہے)۔

اس سلسلہ میں مختصر بات یہ ہے کہ آپ نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمایا ہے کہ عبادت سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو مقام عبودیت و بندگی میں قرار دے اور عملی طور پر اپنی بندگی کا ثبوت بھی فراہم کرے اور ہمیشہ اپنی بندگی پر ثابت قدم رہنے کا خواہاں اور طلبگار ہو۔ لہٰذا جو کام عبادت کے طور پر کیا جائے وہ اس طرح کا ہو کہ اس سے مولا کی مولائیت بندے کی عبدیت کا اظہار ہو سکے جیسے رکوع و سجود اور جب وہ بیٹھا ہو تو اس کے سامنے اطاعت کے لیے حاضر ہونے کے طور پر کھڑا ہونا، اور جب وہ چل رہا ہو تو اس کے پیچھے چلنا وغیرہ، ان تمام کاموں یا ان جیسے دیگر اعمال میں جس قدر مولا کی مولائیت یا عبد کی عبدیت کے اظہار کی صلاحیت زیادہ ہوگی اتنی ہی عبادت زیادہ ہوگی اور عبودیت و بندگی کے مراتب کا تعین ہوگا اور سجدہ ایک ایسا عمل ہے جو ان تمام اعمال میں سے جن سے مولا کی مولائیت و برتری اور بندے کی عبدیت و کمتری کا اظہار ہوتا ہے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں بندہ زمین پر گر کر اپنی پیشانی اس پر رکھ دیتا ہے (گویا اپنے پورے وجود کو اپنے معبود کے سامنے جھکا دیتا ہے)۔

ایک اہم مطلب کی وضاحت

اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ کچھ لوگوں نے سجدہ کو مستقل عبادت قرار دیتے ہوئے یہ گمان کیا ہے کہ سجدہ ذات کے لحاظ سے یعنی سجدہ ہونے کے اعتبار سے ہی عبادت ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ سجدہ ہو اور وہ عبادت نہ ہو بلکہ سجدہ بذات خود عبادت ہے اور اسے عبادت کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

لیکن یہ خیال درست نہیں اور نہ ہی اس قابل ہے کہ اس پر توجہ دی جائے کیونکہ جو چیز اپنی ذات میں کوئی خصوصیت رکھتی ہو وہ خصوصیت اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کوئی اسے اس سے جدا کر سکتا ہے جبکہ سجدہ ایسا عمل نہیں کہ اسے عبادت کے علاوہ کسی دوسرے عنوان سے انجام نہ دیا جا سکے کیونکہ عین ممکن ہے کوئی شخص یہ عمل تعظیم و ادائے احترام اور عبادت کے علاوہ کسی اور عنوان سے انجام دے مثلاً کسی کا مذاق اڑانے کے لیے یا اس سے مذاق کرتے ہوئے سجدہ کیا جائے تو اگر وہ عمل سجدہ ہونے کے لحاظ سے بالکل ویسا ہی ہے جیسے عبادت و ادائے احترام کا سجدہ لیکن وہ عبادت نہیں کہلاتا، اگر عبادت ا

کی ذات اور حقیقت کا حصہ ہوتی تو کبھی اس سے جدا نہ ہو سکتی' البتہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ سجدہ میں ''عبادت'' کا معنی و مفہوم اور تصور دوسرے تمام اعمال کی نسبت زیادہ ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عبادت ہی سے مختص ہے اور کسی دوسرے عنوان پر انجام دینا ممکن ہی نہیں اور جب وہ ذاتی لحاظ سے (صرف سجدہ ہونے کے لحاظ سے) عبادت نہیں تو وہ خداوند عالم کی ذات اقدس سے مختص بھی نہیں ہوگا جبکہ معبود ہونا صرف خدا کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے سوا کسی کی ''عبادت'' نہیں ہو سکتی' اس لیے ''عبادت'' کے علاوہ اگر تعظیم واحترام وغیرہ کی غرض سے سجدہ کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ جو چیز عقلی اور شرعی طور پر ثابت ہے وہ یہ کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی خواہ وہ جس انداز میں کیوں نہ ہو لیکن عبادت کے علاوہ کسی اور غرض سے سجدہ کرنا عقلی وشرعی طور پر ممنوع قرار نہیں دیا گیا' لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کو خدا اور پروردگار نہ سمجھتے ہوئے صرف ادائے احترام اور ادب واکرام کی غرض سے سجدہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں' البتہ اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دینی ذوق اور مذہبی احساس اس امر کا متقاضی ہے کہ یہ عمل صرف خدا کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو اور خدا کے علاوہ کسی کے سامنے سجدہ کرنا صحیح نہیں خواہ سجدہ کرنے کا مقصد تعظیم اور ادائے احترام کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا کہ ذات الٰہی کے ساتھ اس کے اختصاص کا تحفظ واحترام ہو' لیکن آیا ہر وہ کام جو خدا کے ساتھ اخلاص کے اظہار کے لیے انجام دیا جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اور کے لیے انجام نہیں دیا جا سکتا مثلاً خدا کے نیک وصالح بندوں سے محبت یا اولیاء الٰہی کی قبور ومزارات مقدسہ اور پاکیزہ آثار سے اظہار محبت وعقیدت بھی صحیح نہیں؟ یہ بات ان امور میں سے ہے جس پر کوئی کوئی عقلی یا شرعی دلیل موجود نہیں اور عقلی وشرعی دلائل سے اس کی ممنوعیت کا کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا۔

بہرحال اس سلسلہ میں مزید بحث اس کے مخصوص ومناسب مقام پر پیش ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(سجدہ کے حوالہ سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ جس طرح بعض اعمال خاص غرض اور معین مقصد کا مظہر ہوتے ہیں اور انہیں اس کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے انجام نہیں دیا جاتا بلکہ اگر کسی دوسرے مقصد کے لئے انجام دیا جائے تو کسی غلط فہمی کا راستہ کھلنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس صورت میں اس کے اختصاصی حوالہ ہی پر اکتفاء سے ادب الاعمال کے تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے اور اس سے تعدی وتجاوز درست قرار نہیں پاتا، سجدہ بھی انہی اعمال میں سے ایک ہے کہ جس کی بابت شرعی دلائل سے قطع نظر ادب العبودیت اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے لئے مختص رکھا جائے، م)

روایات پر ایک نظر

تخلیق آدم اور حکم سجدہ

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(لما خلق الله آدم امر الملائکة ان یسجدوا له، فقالت الملائکة فی انفسها : ما کنا نظن ان الله خلق خلقاً اکرم علیه منا فنحن جیرانه و نحن اقرب الخلق الیه فقال الله : الم اقل لکم انی اعلم ما تبدون و ما کنتم تکتمون، فیما ابدوا من امر بنی الجان و کتموا ما فی انفسهم. فلاذت الملائکة الذین قالوا ما قالوا بالعرش)

(جب خداوند عالم نے آدمؑ کو پیدا کیا تو فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں، فرشتوں نے اپنے تئیں سوچا کہ ہم یہ گمان ہی نہیں کرتے تھے کہ خدا نے کسی ایسی مخلوق کو پیدا کیا ہے جو اس کے نزدیک ہم سے زیادہ بہتر اور عظمت والی ہے جبکہ ہم اس کے ہمسایے اور اس کی سب سے زیادہ مقرب مخلوق ہیں اور کوئی ایسا نہیں جو ہم سے زیادہ اس کا قرب رکھتا ہو، خدا نے ان سے فرمایا کہ آیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں ہر اس چیز کو جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو، یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ جو فرشتوں نے بنی نوع جنّ کے بارے میں یہ بات ظاہر کر دی کہ وہ زمین میں اس سے پہلے فساد برپا کرتے تھے اور یہ بات چھپائی کہ وہ اپنے آپ کو خلافت الٰہیہ کا حقدار سمجھتے ہیں۔ خدا نے فرمایا کہ میں تمہاری ظاہری اور چھپی ہوئی ہر بات کو بہتر جانتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے اپنے اس نامناسب بیان کے سبب عرش میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے)۔

اسی تفسیر میں امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام سے ایک روایت مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب فرشتوں نے جان لیا کہ ان سے خطاء سرزد ہوئی ہے تو انہوں نے عرش میں پناہ لی، اور وہ سب فرشتے نہ تھے بلکہ فرشتوں کا ایک گروہ تھا جو عرش کے گرد رہتے تھے۔۔۔ اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ وہ قیامت تک عرش میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس کا اشارہ فرشتوں کے اس بیان میں ملتا ہے جس میں انہوں نے خدا سے کہا کہ: "ہم تیری تسبیح و تقدیس بجالاتے ہیں"..... "تیری ذات پاک ہے ہمیں اس کے علاوہ کچھ علم نہیں جو آ

نے ہمیں تعلیم دیا تو ہی سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔ (نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۔۔۔ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ)۔

بہر حال عنقریب اس مطلب کو بیان کیا جائے گا کہ عرش سے مراد علم ہے اور اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات و بیانات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ (غور فرمائیں)

بنا بر ایں ابلیس کے بارے میں خدا کا یہ کہنا کہ " وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ " یعنی وہ تو تھا ہی کافروں میں سے' اس (کافروں) سے مراد ابلیس کی قوم و قبیلہ جن ہے کہ جو انسان سے پہلے پیدا کئے گئے اور انسان کی تخلیق سے پہلے زمین پر آباد تھے چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم کا صریح اور واضح ارشاد ہے:

سورہ حجر، آیت ۲۷:

★ " وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ﴿۲۶﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ " ۔

(ہم نے انسان کو خمیر۔۔ دی ہوئی سڑی مٹی۔۔ سے جو سوکھ کر کھن کھن بولنے لگا پیدا کیا' اور اس سے پہلے ہم نے جنوں کو زہریلی تیز آگ سے پیدا کیا)۔

بہر حال اس روایت کی روشنی میں "کتمان" اور چھپانے کی نسبت بہ آسانی تمام فرشتوں کی طرف دی جا سکتی ہے بلکہ یہ نسبت حقیقی طور پر ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ جو مکتوم اور چھپی ہوئی بات تھی وہ تمام فرشتوں کے دلوں میں آ چکی تھی' البتہ اس مقام پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اس سے پہلی روایت میں تو ذکر ہو چکا ہے کہ وہ مکتوم اور چھپی ہوئی بات ابلیس کا کفر تھا جو اس نے اپنے اندر چھپایا ہوا تھا تو اس طرح سے یہ دونوں روایتیں مختلف ہو گئیں اور ان میں تضاد اور منافات پیدا ہو گئی۔ تو اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان روایات میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا کیونکہ پہلی روایت میں یہ تھا کہ اس مکتوم اور چھپی ہوئی بات سے مراد ابلیس کا آدم کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار اور سجدہ کرنے کے حکم سے عدولی اور تکبر ہے اور اس دوسری روایت میں اس مکتوم اور چھپی ہوئی بات سے مراد وہ بات ہے جو تمام فرشتوں کے دلوں میں تھی اور ہم ان دونوں کا احتمال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دونوں باتیں ممکن ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ابلیس نے بھی فیصلہ کیا ہوا تھا کہ اگر اسے آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ انکار کر دے گا اور فرشتوں نے بھی اپنے دلوں میں بات چھپائی ہوئی تھی (لہٰذا دونوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام فرشتوں کی طرف "کتمان" کی نسبت دینا درست ہے)۔

سجدہ تعظیمی تھا

کتاب قصص الانبیاء میں ابو بصیر سے روایت ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی:

(سجدت الملائکۃ و وضعوا اجباھھم علی الارض؟) کہ آیا فرشتوں نے سجدہ کیا اور اپنی پیشانیاں زمین پر رکھیں؟

امامؑ نے ارشاد فرمایا: (نعم، تکرمۃ من اللہ تعالی) ہاں، انہوں نے خدا کے حکم کی اطاعت میں آدمؑ کی تعظیم واحترام کے طور پر ایسا کیا۔

کتاب تحف العقول میں ہے: (ان السجود من الملائکۃ لآدم انما کان ذلک طاعۃ للہ محبۃ منھم لآدم) کہ فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا خدا کی اطاعت اور فرشتوں کی آدمؑ سے محبت کی وجہ سے تھا۔

پیغمبر اسلامؐ کی فضیلت

کتاب احتجاج (طبرسی) میں ہے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنے آباء گرامیقدر علیہم السلام کے حوالے سے ارشاد فرمایا کہ ایک یہودی نے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے معجزات کے بارے میں پوچھا کہ دیگر انبیاءؑ اور آنحضرتؐ کے معجزات میں کیا فرق ہے؟ مثلاً آدمؑ اس قدر باعظمت تھے کہ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ انہیں سجدہ کریں آیا محمدؐ کے لیے بھی خدا نے اس طرح کا کوئی کام کیا؟ حضرت علی علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ درست ہے کہ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں اور یہ آدم علیہ السلام کی عظمت کا واضح ثبوت ہے لیکن فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا آدمؑ کی اطاعت وعبادت کے طور پر نہ تھا اور ایسا نہ تھا کہ فرشتوں نے خدا کے بجائے آدمؑ کی عبادت کی بلکہ خدا نے اس لیے انہیں حکم دیا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں تا کہ آدمؑ کی فضیلت و برتری کے قائل ہوں اور اس کا عملی اقرار کریں اور یہ بات آدمؑ کے لیے خدا کی طرف سے رحمت قرار پائے لیکن حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے بڑھ کر فضیلت عطا کی گئی اور وہ یہ کہ خداوند عالم نے اپنی تمام تر عظمتوں اور جلالت و بزرگی کے ساتھ آنحضرتؐ پر درود بھیجا اور تمام فرشتوں نے بھی آنحضرتؐ پر صلوٰت پڑھی اور مومنین نے آنحضرتؐ پر صلوٰت پڑھنے کی خدائی سنت کو اپنا لیا تو یہ بات یقیناً آنحضرتؐ کی برتری کی دلیل ہے اے یہودی!

امام موسیٰ کاظمؑ کا فرمان

تفسیر قمی میں ہے کہ خدا نے آدم کو پیدا کیا اور وہ چالیس سال تک تصویر کی طرح باقی رہے اور جب بھی ابلیس ملعون کا اس کے سامنے سے گزر ہوتا تو اس سے مخاطب ہو کر کہتا تھا کہ تجھے کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ عالم آل محمد (حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام) کا ارشاد گرامی ہے کہ ابلیس نے اپنے آپ سے کہا کہ اگر خدا نے مجھے اس کا سجدہ کرنے کا حکم دیا تو میں انکار کردوں گا اور اس سلسلے میں خدا کی نافرمانی کروں گا" (اس کے بعد عالم آل محمدؐ امام موسیٰ کاظمؑ نے ارشاد فرمایا کہ) پھر خدا نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدمؑ کو سجدہ کرو، انہوں نے سجدہ کیا تو اس وقت ابلیس نے اپنے دل میں چھپا۔

ہوئے حسد کو ظاہر کرتے ہوئے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

عبادت کی اصل و اساس

کتاب بحار الانوار میں علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے کتاب قصص الانبیاء کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

(امر ابلیس بالسجود لآدم فقال: یا رب و عزتك ان اعفیتنی من السجود لآدم لاعبدنك عبادة ما عبدك احد قط مثلها ، قال الله عزوجل : انی احب ان اطاع من حیث ارید و قال : ان ابلیس رن اربع رنات: اولهن یوم لعن، ویوم اهبط الی الارض، ویوم بعث محمد (ص) علی فترة من الرسل ،و حین انزلت ام الکتاب ، و نخر نخرتین : حین اکل آدم من الشجرة ، وحین اهبط من الجنة ، و قال تعالیٰ: فبدت لهما سوآتهما ، و کانت سوآتهما لا تریٰ فصارت تریٰ بارزة ، وقال (ع): الشجرة التی نهی عنها آدم هی السنبلة).

(ابلیس کو حکم دیا گیا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کرے تو اس نے جواب دیا کہ پروردگارا تجھے اپنی عزت کی قسم مجھے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے معاف رکھ، میں اس کے بدلے میں تیری اس طرح سے عبادت کروں گا کہ اس جیسی عبادت کبھی کسی نے نہ کی ہوگی' خداوند عالم نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ میری عبادت میری مرضی کے مطابق کی جائے اور میں چاہتا ہوں اسی طرح انجام دی جائے جس طرح میں اس کا حکم دوں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا کہ ابلیس نے چار مرتبہ چیخ ماری: پہلی مرتبہ اس وقت جب اس پر لعنت کی گئی' دوسری مرتبہ جب اسے زمین پر اتارا گیا' تیسری مرتبہ جب حضرت پیغمبر اکرم محمد مصطفیٰؐ کو خدا نے مبعوث فرمایا جبکہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے کافی عرصہ تک کوئی نبی نہیں بھیجا گیا تھا (اسے زمانۂ فترت کہا جاتا ہے) اور چوتھی مرتبہ جب ام الکتاب یعنی سورہ فاتحہ نازل کیا گیا' اور ابلیس نے دو مرتبہ خوشی سے قہقہہ لگایا: ایک اس وقت جب آدمؑ نے اس درخت سے پھل کھایا جس سے انہیں روکا گیا تھا' اور دوسری مرتبہ جب آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا' امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے "فبدت لهما سوآتهما" (ان کی شرمگاہیں انہیں نظر آنے لگیں) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ: اس درخت سے پھل کھانے سے پہلے ان کی شرمگاہیں پوشیدہ تھیں مگر اس کے بعد ظاہر ہو گئیں' اور جس درخت سے آدمؑ کو روکا گیا تھا وہ سنبل کا درخت تھا)۔

سجدہ کے سلسلہ میں جو مطالب ہم نے اب تک ذکر کئے ہیں ان کی تائید کثیر روایات سے ملتی ہے۔

☆ ☆ ☆

آیات ۳۵ تا ۳۹

○ وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

○ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

○ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

○ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

ترجمہ

○ اور ہم نے کہا اے آدمؑ! تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور اس سے جو کچھ چاہو سیر ہو کر کھاؤ' لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ (۳۵)

○ پھر شیطان نے انہیں بہکا دیا اور وہ جس سکون و آرام کی حالت میں تھے اس سے اس نے انہیں محروم کر دیا' ہم نے ان سے کہا کہ اب تم زمین پر اتر جاؤ کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو' اور تمہارے لیے زمین میں رہنے کی جگہ ہے اور ایک خاص مدت تک ہر قسم کا ساز و سامان موجود ہے۔ (۳۶)

○ اور پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے اور خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی' کہ بے شک وہی سب سے بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ (۳۷)

○ ہم نے کہا تم سب ہی بہشت سے نیچے اتر آؤ' پس جب میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر کوئی خوف آئے گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ (۳۸)

○ اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے اور انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا وہ جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ (۳۹)

تفسیر و بیان

بہشت میں قیام کرنے کا حکم

○ " قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ ":

اگرچہ فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنے کا واقعہ قرآن مجید میں کئی مقامات میں ذکر ہوا ہے لیکن بہشت کا واقعہ تین مقامات کے علاوہ کہیں مذکور نہیں:

۱۔ سورہ بقرہ کی انہی آیتوں میں! (جو ہمارے زیر بحث ہیں)

۲۔ سورہ اعراف کی ان آیتوں میں:

★ " وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ
الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا
بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ
اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ
تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى
حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ " (سورہ اعراف، آیات ۱۹ تا ۲۵)

(خدا نے کہا' اے آدمؑ! تم اور تمہاری زوجہ اس بہشت میں رہو' اور اس سے جس قدر چاہو سیر ہو کر کھاؤ لیکن اس درخت کے پاس ہرگز نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے انہیں وسوسہ میں ڈال دیا تا کہ ان کے اندام میں جو چیز ان سے پوشیدہ رکھی گئی ہے اسے ان پر ظاہر کر دے لہٰذا اس نے ان سے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے اس لیے روکا ہے کہ تم کہیں دو فرشتے نہ بن جاؤ یا اس بہشت میں ہمیشہ کے لیے نہ رہ سکو' شیطان نے ان کے

سامنے قسم کھائی کہ میں تو صرف تمہیں نصیحت کر رہا ہوں (تمہارا خیر خواہ ہوں)۔ اس طرح اس نے انہیں اپنے جال میں پھنس
لیا' چنانچہ انہوں نے اس درخت سے پھل کھا لیا' جوں ہی انہوں نے پھل کھایا تو انہیں ایک دوسرے کی شرمگاہیں نظر آنے
لگیں اور وہ فوراً اپنی شرمگاہوں کو بہشت کے پتوں سے چھپانے لگ گئے' اس وقت انہیں ان کے پروردگار نے یاد دلایا کہ آ
میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا تھا اور آیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے' انہوں نے کہ
اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم یقیناً گھاٹے میں
رہیں گے' خدا نے فرمایا کہ تم بہشت سے نیچے اتر جاؤ کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے زمین میں رہنے کے لیے جگ
موجود ہے اور وہاں ایک مدت کے لیے رہنے کا سامان بھی ہے' خدا نے فرمایا کہ اب تم اسی میں زندگی گزارو گے اور اسی میں
وفات پاؤ گے اور پھر اسی سے اٹھائے جاؤ گے)۔

۳۔ سورہ طٰہٰ میں:

★ " وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ
فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ
لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ
عَلٰى وَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا اٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫
عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ
فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَ
ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ ا وْا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُ
فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ " (سورۂ طہٰ، آیات ۱۱۵ تا ۱۲۶)

(اور ہم نے اس سے پہلے آدم ؑ سے وعدہ لے لیا تھا (کہ ابلیس کے دھوکہ میں نہ آنا) مگر اس نے وہ وعدہ بھلا د
اور ہم نے اسے وعدہ پر ثابت قدم نہ پایا۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم ؑ کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے
ابلیس کے' اس نے انکار کر دیا۔ اس وقت ہم نے آدم ؑ سے کہا کہ یہ تیرا اور تیری زوجہ کا دشمن ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بہشت
سے نکلوا دے ورنہ تم مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ یہاں بہشت میں تیرے کھانے اور پینے کے لیے سب کچھ ہے تم اس میں
بھوکے رہو گے اور نہ بے لباس ہو گے۔ اور نہ ہی یہاں تم پیاسے ہو گے اور نہ ہی یہاں دھوپ کھاؤ گے۔ مگر شیطان نے اس
کے دل میں وسوسہ ڈال دیا اور کہا کہ اے آدم آیا میں تجھے ہمیشگی دلانے والا درخت بتاؤں اور وہ سلطنت بتاؤں جو کبھی ختم نہ
ہو۔ شیطان کے بہکاوے میں آ کر آدم اور حوا نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو وہ دونوں ننگے ہو گئے اور پھر بہشت کے پتوں

سے اپنی شرمگاہوں کو چھپانے لگے اس طرح آدمؑ نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور بھٹک گئے۔ پھر اس کے پروردگار نے اسے برگزیدہ کیا اس کی توبہ قبول فرمائی اور اسے ہدایت عطا کی۔ خدا نے فرمایا کہ اب تم دونوں بہشت سے اتر جاؤ کہ تمہارے درمیان دشمنی و عداوت پیدا ہو چکی ہے۔ پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا اور نہ ہی کسی مصیبت میں پھنسے گا۔ اور جس نے میری یاد سے منہ پھیر لیا تو اس کی زندگی نہایت سختیوں میں ہوگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ اور وہ اس وقت کہے گا کہ پروردگارا تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں محشور کیا ہے میں تو آنکھوں والا تھا۔ خداوند عالم جواب دے گا کہ ایسا ہی ہونا تھا ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں مگر تو نے انہیں بھلا دیا۔ اور اسی طرح آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا)۔

ان آیات کے سیاق و سباق اور بالخصوص اس واقعہ کی بابت سب سے پہلی آیت جس میں خدا نے فرمایا "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" ...... میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں ...... سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آدمؑ کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ ان کی زندگی زمین میں بسر ہو اور زمین ہی میں ان کی موت واقع ہو اور یہ جو خدا نے انہیں اور ان کی زوجہ حوا کو بہشت میں جگہ دی وہ صرف ان کے امتحان اور انہیں آزمانے کے لیے تھا جس کے نتیجہ میں ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہوئیں اور وہ زمین پر اتر گئے۔

اسی طرح سورہ طٰہٰ کی مذکورہ آیت میں خدا کا یہ فرمان "فَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ" اور سورہ اعراف میں یہ کہنا "وَیٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ" ان میں بہشت کے واقعہ اور فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دینے کو ایک ہی واقعہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور دونوں کو ایک ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ آدمؑ کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ زمین میں سکونت پذیر ہوں تاہم اس مقصد کے لیے یہ طریقہ اپنایا گیا کہ پہلے آدمؑ کو فرشتوں پر برتری عطا کی گئی تاکہ ان کے استحقاق خلافت کا ثبوت فراہم ہو سکے، پھر فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں سجدہ کریں، پھر آدمؑ اور حوا کو بہشت میں سکونت پذیر کروایا اور ایک خاص درخت کے نزدیک جانے سے روکا گیا (انہوں نے شیطان کے بہکاوے میں آ کر) اس ممنوعہ درخت سے پھل کھایا جس کے نتیجے میں ان کی شرمگاہیں ظاہر ہوئیں اور اس طرح ان کے زمین پر اترنے کا سبب فراہم ہو گیا۔

بہر حال ان تمام واقعات کے مرحلہ وار جائزہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ و حواؑ کے زمین میں سکونت پذیر ہونے اور دنیاوی زندگی کو اپنانے کا سب سے آخری سبب ان دونوں کی شرمگاہوں کا ظاہر ہو جانا تھا۔ اور آیت شریفہ میں لفظ "سواۃ" سے مراد شرمگاہ ہے کیونکہ خدا نے فرمایا: "وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ" (وہ دونوں اپنے آپ کو بہشت کے پتوں سے چھپانے لگے) اور واضح ہے کہ شرمگاہیں ہی تمام حیوانی خواہشات کی بنیاد اور کھانے پینے اور نمو کرنے کا سبب بھی ہیں اس لیے ابلیس کی صرف یہ کوشش تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان دونوں کی شرمگاہوں کو ظاہر کر دے، اور ادھر خداوند عالم نے بھی آدمؑ اور حواؑ کو اگرچہ بشریت کے لباس میں زمین میں رہنے کے قابل بنا دیا تھا اور پھر انہیں بہشت میں قیام پذیر کیا لیکن انہیں بشری خلقت کی تکمیل کے بعد زیادہ دیر تک بہشت میں نہیں ٹھہرایا اور نہ ہی انہیں اتنی مہلت دی کہ وہ

دنیا میں اچھی طرح اپنی شرمگاہوں سے باخبر ہو سکیں اور اس کے علاوہ اپنی دنیاوی زندگی کی ضرورتوں وغیرہ سے بھی آگاہ سکیں۔ بلکہ ان کی بشری خلقت کی تکمیل کے بعد فوراً انہیں بہشت میں داخل کر دیا جبکہ اس وقت تک وہ ملکوتی روح کے حا تھے اور روح و فرشتوں کی پاکیزہ دنیا کا ادراک ان سے زائل نہیں ہوا تھا اس کا ثبوت خدا کے اس بیان میں موجود ہے "لیبدی لھما ما ووری عنھما" (تا کہ وہ ظاہر کر دے ان پر وہ کہ جو ان سے چھپا لیا گیا تھا) یوں نہیں کہا کہ "لیبد ما کان ووری عنھما" (تا کہ ظاہر کر دے وہ کہ جو ان سے پوشیدہ تھا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرمگاہوں کا چھپایا ج ایک عارضی امر تھا اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ دنیاوی زندگی میں وہ ہمیشہ کے لیے ہو بلکہ وہ دفعتہً اور لحہ بھر کے لیے تھا اور پھر انہ بہشت میں سکونت دے دی گئی اس سے یہ ثابت ہوا کہ شرمگاہوں کا ظاہر ہو جانا کہ جو ممنوعہ درخت سے پھل کھا لینے کے سبب ہوا در اصل زمین کی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک حتمی اور خدا کی طرف سے طے شدہ امر تھا اسی وجہ سے خداوند عالم۔ ارشاد فرمایا:

★ " فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ "

(کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ...... شیطان ...... تم دونوں کو بہشت سے نکلوا دے کہ پھر تم سخت نقصان میں رہو گے)۔

اور پھر ارشاد فرمایا:

★ " فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ "

(اور اس نے ان دونوں کو اس...... امن و سکون کی حالت...... سے نکال دیا (محروم کر دیا) کہ جس میں وہ تھے)۔

اس کے بعد خداوند عالم نے ان (آدمؑ و حواؑ) کی غلطی کو جب انہوں نے توبہ کی تو معاف کر دیا لیکن انہیں دوبا بہشت میں نہ لایا بلکہ زمین پر اتار دیا تا کہ وہ اس میں ہی زندگی بسر کریں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ حتمی اور خ کی طرف سے طے شدہ امر تھا کیونکہ اگر دنیا میں زندگی بسر کرنا ممنوعہ درخت سے پھل کھانے اور شرمگاہوں کے ظاہر ہونے وجہ سے خدا کا حتمی فیصلہ اور طے شدہ امر نہ ہوتا اور پھر بہشت میں دوبارہ جانا ناممکن نہ ہوتا تو وہ یعنی آدمؑ اور حواؑ توبہ قبو ہونے اور غلطی کی معافی کے بعد بہشت میں واپس آ جاتے جبکہ ان کے بہشت سے نکلنے اور زمین پر اترنے کا ظاہری سبب ا کا ممنوعہ درخت سے پھل کھانا اور اس کے نتیجے میں ان کی شرمگاہوں کا ظاہر ہو جانا ہی تھا جو کہ شیطان ملعون کی طرف سے ا کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے کی وجہ سے ہوا (اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم اپنے امور اسباب کے ذریعے انجام د ہے) خداوند عالم نے سورہ طٰہٰ میں اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا ہے:

★ " وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا "۔

(ہم نے پہلے ہی آدمؑ سے عہد لے لیا تھا مگر اس نے ہمارے عہد کو بھلا دیا اور ہم نے اسے اس عہد پر پ ارادے کا مالک نہیں پایا)۔

اس آیت میں "عہد و پیمان" کا ذکر ہوا ہے تو سوال یہ ہے کہ اس عہد اور وعدہ سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں ت

احتمالات موجود ہیں:

پہلا یہ کہ اس سے مراد ممنوعہ درخت کے قریب نہ جانے کا عہد ہے جو کہ خدا نے ان الفاظ میں ان سے لیا: اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے" (وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ)۔

دوسرا یہ کہ اس سے مراد آدمؑ وحواؑ کو ابلیس کی دشمنی سے آگاہ کرنا ہے چنانچہ خداوند عالم نے فرمایا۔ "اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ" (یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے)

تیسرا یہ کہ اس سے مراد وہ عام عہد و پیمان ہے جو انسان سے لیا گیا ہے اور انبیاء سے خاص طور پر نہایت تاکید کے ساتھ لیا گیا، یہ ہیں تین احتمالات جو اس عہد و پیمان کی بابت ذکر کئے گئے ہیں، اب ان کی صحت وسقم پر بحث کی جاتی ہے:

جہاں تک پہلے احتمال کا تعلق ہے تو وہ قطعی طور پر صحیح نہیں کیونکہ خداوند عالم نے فرمایا:

★ "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝٢٠ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝٢١"

(شیطان نے ان کو وسوسے میں ڈال دیا اور ان سے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے صرف اس لیے روکا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ یا یہ کہ ہمیشہ بہشت میں رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، اور شیطان نے ان کے سامنے قسم کھائی کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں)۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں ممنوعہ درخت سے پھل کھاتے وقت خدا کا حکم یاد تھا، لیکن ابلیس نے انہیں ورغلا کر درخت کے قریب جانے کی ترغیب دلاتے ہوئے کہا کہ خدا نے تو اس لیے روکا ہے کہ تم کہیں فرشتے نہ بن جاؤ یا یہ کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں نہ رہو، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آدم اور حوا کو خدا کا حکم اچھی طرح یاد تھا لیکن شیطان کے بہکاوے میں آ کر انہوں نے اس ممنوعہ درخت سے پھل کھا لیا جبکہ خدا نے اس عہد و پیمان کے بارے میں جو اس نے آدمؑ سے لیا تھا یوں فرمایا:

★ "فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" (کہ اس نے اس عہد کو بھلا دیا اور ہم نے اسے اس پر ثابت قدم نہیں پایا)۔

اس سے ثابت ہوا کہ وہ عہد، ممنوعہ درخت کے پاس نہ جانے کا عہد نہ تھا۔

اب رہا دوسرا احتمال، کہ خدا نے آدمؑ اور حواؑ کو ابلیس کی دشمنی سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ اس کی بات نہ مانیں اور اس کا اتباع نہ کریں، تو اگرچہ بظاہر یہ احتمال ممکن اور صحیح نظر آتا ہے اور اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن آیات کے ظاہری الفاظ سے اس کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ وعدہ صرف جناب آدم علیہ السلام سے لیا گیا تھا، جبکہ شیطان کے بہکاوے میں آنے سے بچنے کا حکم آدمؑ اور حواؑ دونوں کو دیا گیا اور وعدے کو بھول

جانے کی نسبت صرف آدمؑ کی طرف دی گئی' اور اس کے علاوہ یہ کہ سورہ طٰہٰ کی مذکورہ آیات کے ابتدائی جملے اور بعد والے جملے اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عہد و پیمان سے عام اور کلی عہد و پیمان مراد لینا موزوں اور مناسب ہے نہ کہ صرف وہ عہد اور وعدہ جو ابلیس سے بچ کر رہنے کی بابت لیا گیا' چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ طٰہٰ آیت ۱۲۴:

★ "فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى" -

(پس جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت پر چلے گا وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا اور نہ ہی نقصان اٹھائے گا' اور جس نے میرے ذکر سے منہ پھیرا تو اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے محشور کریں گے)

ان آیات کو جب زیر بحث آیات پر منطبق کیا جائے تو خدا کا یہ فرمان: "وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا" (جس شخص نے میری ہدایت سے منہ پھیرا اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی) اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اس عہد سے وہی عام میثاق اور وعدہ جو ہر انسان سے لیا گیا (یعنی توحید اور خدا کی ربوبیت و بندگی کا وعدہ) مراد لینا زیاد موزوں و مناسب ہے نہ کہ صرف ابلیس سے بچ کر رہنے کا وعدہ' کیونکہ یہاں دو باتیں ہیں: ایک خدا کی یاد سے منہ پھیر، دوسری ابلیس کی پیروی' تو ان دونوں کے درمیان مفہوم کے لحاظ سے کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی کیونکہ یہ دونوں الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں جبکہ ربوبیت کا میثاق اور وعدہ ایسا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ انسان اس بات کو ہرگز نہ بھلائے کہ خدا ہی اس کا رب اور پروردگار' مالک و حاکم اور اس کے نظام حیات کو چلانے والا ہے یعنی انسان کبھی اس حقیقت کو فراموش نہ کرے کہ وہ ہر لحاظ سے صرف خدا کی ملکیت میں ہے اور خود کسی چیز کا حقیقی مالک نہیں اور کوئی چیز اس کے اختیار میں نہیں نہ نفع نہ نقصان اور نہ ہی زندگی و موت اور حشر و نشر' گویا وہ خود نہ اپنی ذات میں نہ صفات میں اور نہ ہی افعال میں مالک ہے بلکہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہر چیز کا مالک اور صاحب اختیار ہے۔

بنابرایں اس عہد و پیمان کے مقابلے میں خطا اور غلطی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے پروردگار کی یاد سے منہ پھیر لے اور اس کے بلند مقام و مرتبہ کو بھول جائے اور اس کی مقدس ذات سے غافل ہو کر اپنے آپ میں گم ہو جائے اور اپنے آپ کو اس دنیاوی زندگی کی فنا پذیر اور نہایت پست و ناچیز لذتوں میں مصروف کر کے اپنے پروردگار کی عظیم المرتبت ذات کو بھلا دے۔

لیکن اگر آپ اس دنیاوی زندگی کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کریں اور اس کی مختلف جہتوں' گوناگوں پہلوؤں' طرح طرح کے زاویوں اور اس کا مومن و کافر کے لیے ایک جیسا ہونا ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنی حقیقت اور باطن کے لحاظ سے دو مختلف حیثیتیں رکھتی ہے، ایک حیثیت خدا کو جاننے کے حوالہ سے اور دوسری حیثیت خدا کو نہ

جاننے اور اس کی ذات سے جہل کے حوالہ سے پس جو شخص اپنے پروردگار کے عظیم مقام و مرتبہ سے آگاہ ہے جب وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور اسی طرح دنیاوی زندگی پر نظر کرتا ہے کہ جس میں ہر قسم کی آلودگیاں و تیرگیاں طرح طرح کے رنج و آلام مشکلات و مسائل تکلیفیں اور درد و غم موت و حیات صحت و بیماری تونگری و ناداری راحت و پریشانی اور نعمتیں و محرومی وغیرہ ہیں اور سب چیزیں (خواہ ان کا تعلق انسان کی ذات سے ہو یا کسی اور چیز سے) خدا کی ملکیت ہیں اور وہی ان سب کا مالک ہے اور اس دنیا کی کوئی چیز نہ اپنے وجود میں اور نہ کسی دوسرے پہلو میں کوئی مستقل حیثیت رکھتی ہے (یعنی خدا سے بے نیاز نہیں) بلکہ سب کچھ اس عظیم ذات کی ملکیت اور اس کے فیض و عنایت سے ہے کہ جس کے پاس صرف اور صرف حسن و جمال اچھائی اور خیر ہے اور وہ بھی اسی معنے و مفہوم میں جو اس کی ذات والا صفات کے شایان شان ہے اور اس کی عزت و عظمت اور قدر و جلالت کے عین مطابق ہے اور وہ ذات ایسی ہے کہ جس سے سوائے خیر اور اچھائی کے کوئی اور چیز نہیں ملتی وہ ہر چیز کا سرچشمہ ہے لہٰذا جب ان تمام اوصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی شخص اس دنیاوی زندگی پر نگاہ کرے تو وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو جائے گا کہ دنیا میں کوئی ایسا ناپسندیدہ امر ہی نہیں جسے وہ ناپسندیدگی اور کراہت کی نظر سے دیکھے اور نہ کوئی ایسی خوفناک شے ہے جس سے وہ وحشت زدہ ہو اور نہ ہی کوئی ڈراؤنی شے ہے جس سے وہ ڈرے بلکہ وہ جس چیز کو بھی دیکھتا ہے اسے حسین و جمیل اور قابل محبت نظر آتی ہے سوائے ان چیزوں کے کہ جن کے بارے میں خود خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ ان سے نفرت کی جائے اور دور رہا جائے اس کے نزدیک کسی چیز سے نفرت کا معیار بھی یہ ہے کہ خدا نے اس سے نفرت کرنے کا حکم دیا اور اسے ناپسند کیا یا اگر کسی چیز کو اچھا سمجھ کر اس سے محبت کی تو وہ بھی اس لیے کہ خداوند عالم نے اس چیز کو اچھا قرار دیا اور اس سے محبت کی گویا وہ خدا کے حکم کے مطابق اپنی چاہت اور نفرت کا معیار معین کرتا ہے اور اس کا دل اپنے پروردگار کے سوا کسی پر بھی نہیں آتا اور نہ ہی خدا کے علاوہ وہ کسی کو خاطر میں لاتا ہے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ وہ ہر چیز کو خدا کی ملکیت سمجھتا ہے اور کسی چیز کی کسی جہت اور پہلو میں خدا کے علاوہ کسی کو دخیل نہیں سمجھتا اور خدا کے سوا کسی کے لیے بھی کسی چیز میں کوئی حصہ قرار نہیں دیتا اس لیے اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ مالک اپنی مملوکہ چیزوں کے بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہے اور خدا جو کہ حاکم اور با اختیار و با اقتدار ہے وہ اپنی مخلوق کے بارے میں کیا ارادہ کرتا ہے؟ کیوں زندگی دیتا ہے؟ کیوں موت دیتا ہے؟ کیوں نفع پہنچاتا ہے؟ کیوں نقصان سے دوچار کرتا ہے؟ فلاں کام کیوں کرتا ہے اور فلاں کام کیوں نہیں کرتا؟ اسے اس سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی ملکیت ہے اور اسے ان کے بارے میں سب کچھ اپنی مرضی کے مطابق انجام دینے کا پورا پورا حق حاصل ہے!

یہ ہے اس پاک و پاکیزہ زندگی کی حقیقی صورت کہ جس میں سعادت و خوشبختی کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس میں شقاوت و بدبختی کا نام و نشان ہی نہیں ملتا۔ ایسی زندگی سراپا نور ہے اس میں کسی قسم کی ظلمت و تاریکی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ سراپا خوشی و سرور ہے کہ جس کے ساتھ کوئی غم و اندوہ نہیں اس میں سب کچھ ہے کسی قسم کی محرومیت نہیں اور ہر طرح سے بے نیازی ہی بے نیازی ہے، ایسی بے نیازی کہ جس کے ساتھ کسی طرح کا فقر و ناداری موجود ہی نہیں اور یہ سب کچھ خدا کی ذات پر بھرپور

اور کامل ایمان کا نتیجہ اور پاکیزہ اثر ہے اور اس کے مقابلے میں ایک اور زندگی ہے اور وہ ہے خدا کی معرفت نہ رکھنے والے شخص کی زندگی، یعنی اس شخص کی زندگی جو اپنے پروردگار کے عظیم مقام اور بلند مرتبے سے ناآگاہ ہے وہ ایسا بے چارہ شخص ہے کہ جو اپنے رب اور پروردگار سے دور ہونے کی وجہ سے جس چیز پر بھی نظر ڈالتا ہے خواہ اپنے آپ پر یا کسی دوسرے پر، اسے مستقل بالذات اور ہر ایک سے بے نیاز سمجھتا ہے خواہ وہ مضر اور نقصان دہ ہو یا نافع اور فائدہ مند ہو اور خیر ہو یا شر ہو، اسی احساس وتصور کے ساتھ وہ اپنی دنیاوی زندگی کے تمام مراحل طے کرتا ہے چنانچہ جس چیز سے محرومی کا خوف اس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ اس خوف سے دوچار رہتا ہے اور جس چیز سے ڈرنے لگتا ہے تو اس سے ہمیشہ ہی ڈرتا رہتا ہے اور جب کوئی چیز اس سے کھو جائے تو ہمیشہ ہی اس کے غم میں مبتلا رہتا ہے اور جو چیز اس کے ہاتھ سے چلی جائے اس پر حسرت کا شکار ہو جاتا ہے خواہ وہ جاہ واقتدار ہو یا مال ودولت یا اولاد و ساتھی ہوں یا ہر وہ چیز کہ جسے وہ دوست رکھتا ہے اس کا سہارا لیتا ہے اس پر بھروسہ کرتا ہے اور اس سے متاثر ہے، ایسا شخص جب کسی نامناسب کام کا عادی ہو جاتا ہے اور اس برے کام کی تلخی اس کے گوشت و پوست میں رچ بس جاتی ہے تو اس کے بدن پر ایک اور گوشت و پوست چڑھا دیا جاتا ہے تاکہ وہ پریشان، مضطرب اور بے چین دل کے ساتھ عذاب کا مزہ چکھے اور اس عذاب کی وجہ سے اس کا دل کباب اور سینہ تنگ ہو جائے اور وہ آسمان کی طرف اڑ کر چلے جانے کا متمنی ہو یہ وہ حالت ہے جس کے متعلق خداوند عالم نے فرمایا ہے:

سورۂ انعام آیت ۱۲۵:

★ "كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ"

(اسی طرح خدا رجس اور پلیدی کو ان لوگوں پر ڈال دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے)

مذکورہ بالا بیان سے یہ امر آپ پر واضح ہو گیا کہ ان دو چیزوں یعنی فطری میثاق کو بھلا دینا اور دنیاوی زندگی کی شقاوت وبدبختی کی بازگشت ایک ہی امر کی طرف ہے، اور دنیاوی زندگی میں شقاوت و بدبختی، فطری میثاق کو بھلا دینے ہی کی ایک فرع ہے۔ اور یہ وہ اہم نکتہ ہے جس کا اشارہ خداوند عالم کے مقدس کلام میں ہوا اور اس میں تمام اہل دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا:

سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲۴:

★ "فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى"

(پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ کبھی گمراہ بدبخت نہ ہو گا اور جو شخص میری یاد سے منہ پھیرے اس کی زندگی تباہ ہو گی اور ہم قیامت کے دن اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے)۔

لیکن سورہ بقرہ کی ان آیتوں میں جن کی تفسیر ہم بیان کر رہے ہیں اس طرح ارشاد فرمایا:

سورہ ءبقرہ آیت ۳۸:

★ "فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ"

(جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا اس پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے)۔

ہمارے ان تمام بیانات اور آیات شریفہ میں ذکر کئے گئے مطالب کی روشنی میں قارئین کرام بخوبی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ درخت کہ جس سے آدمؑ وحواؑ کو روکا گیا تھا دراصل اس کے قریب جانا دنیاوی زندگی میں تعب و مشقت اور تکلیف کا باعث تھا اور اس کی شقاوت و بدبختی یہی ہے کہ انسان دنیا میں اپنے پروردگار کو بھول جائے اور اس کے عظیم مقام و بلند مرتبہ سے غفلت کرے' اور حضرت آدم علیہ السلام نے گویا دونوں چیزوں کو اکٹھا کرنے کا ارادہ کیا یعنی یہ سوچا کہ اس درخت سے پھل کھا کر اس سے بھی لذت اندوز ہوں اور جو میثاق ان سے لیا گیا ہے اسے بھی پورا کریں لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور میثاق کو بھول گئے اور دنیاوی زندگی کی مشقتوں میں گھر گئے۔ تاہم ان کی غلطی کا تدارک توبہ کے ذریعے کر لیا گیا۔

سیر ہو کر کھانے کی اجازت

○ "وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا"

(اور اس سے سیر ہو کر کھاؤ)

لغت میں "رغد" کا معنی آسودہ اور خوش حال ہونا ہے' چنانچہ کہا جاتا ہے: "**ارغد القوم مواشیھم**" یعنی ان لوگوں نے اپنے جانوروں کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس طرح چاہیں سیر ہو کر کھالیں' اسی طرح جب کہا جاتا ہے کہ "قوم رغد" یا "نساء رغد" تو اس کا معنی ہے مرفہ و آسودہ حال قوم اور مرفہ و خوش حال زندگی والی عورتیں۔

درخت کے قریب جانے کی ممانعت

○ "وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ"

(اور اس درخت کے پاس نہ جانا)

اس جملہ میں درخت کے قریب جانے سے روکا گیا' اس سے مراد یہ ہے کہ اس درخت کا پھل نہ کھائیں اور درخت کے قریب جانے سے روکنا دراصل نہی میں شدت اور سخت تاکید کے طور پر تھا' چنانچہ سورہ اعراف کی آیت ۲۲ میں اس کا واضح ثبوت ملتا ہے' جس میں یوں ارشاد ہوا:

★ "فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا"

(پس جب انہوں نے اس درخت سے چکھ لیا تو ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں)

اسی طرح سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۱ نہایت واضح الفاظ میں اس امر کو بیان کرتی ہے کہ درخت کے پاس جانے سے روکنے کا مطلب اس کا پھل کھانے سے روکنا تھا' چنانچہ فرمایا:

★ "فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا"

(پھر انہوں نے اس درخت سے پھل کھایا تو ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں)۔

اس آیت میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس درخت سے پھل کھانے سے روکا گیا تھا جو "ولا تقربا" ...... اور اس کے قریب نہ جانا ...... کے الفاظ سے بیان کیا گیا۔

خدا کی حکم عدولی ظلم ہے

○ "فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"

(ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے)۔

اس جملہ میں لفظ "ظالمین"، ظلم سے (اسم فاعل۔ظالم۔کی جمع کا صیغہ) ہے نہ کہ "ظلمت" سے، اگرچہ بعض مفسرین نے اس کا احتمال دیا ہے کہ یہ ظلم سے نہیں بلکہ ظلمت سے ہے لیکن وہ صحیح نہیں کیونکہ آیت کے الفاظ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ اور حواؑ نے اپنے "ظلم" کا اعتراف کیا' چنانچہ خداوند عالم نے ان کے بیان کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے کہا: "رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا" (اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو......) البتہ خداوند عالم نے اس جملہ یعنی "فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" (ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے) کو سورہ طٰہٰ، آیت ۱۱۷ میں ان الفاظ میں ذکر کیا:

"فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى" (وہ تمہیں بہشت سے نکال ہی نہ دے کہ پھر تم شقاوت سے دوچار ہو جاؤ گے) اس آیت میں "ظلم" کی بجائے "شقاوت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' لغت میں "شقاوت" کا ایک معنی سختی اور تکلیف ہے چنانچہ اس کی وضاحت میں یوں فرمایا: "اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾" ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ظلم کا برا انجام دنیاوی زندگی کی سختیوں' بھوک' پیاس' ننگا پن اور دکھوں سے نڈھال ہونا قرار پایا لہٰذا آدمؑ و حواؑ کا ظلم دراصل اپنے آپ پر ظلم تھا نہ کہ خدا کی نافرمانی' کیونکہ اصطلاحی طور پر اس سے مراد خدا کی نافرمانی اور خدا پر ظلم کرنا مراد لیا جاتا ہے جبکہ ان دونوں کا ظلم خود ان کا اپنے آپ پر ظلم کرنا تھا' لہٰذا اس سے معصیت و نافرمانی خدا اور ظلم علی اللہ مراد نہیں'

اس بیان سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ خدا کی طرف سے نہی یعنی "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" (اس درخت کے پاس نہ جانا) دراصل ان کی خیر خواہی کے طور پر تھا (کہ جسے اصطلاح میں تنزیہی اور ارشادی نہی کہتے ہیں) نہ کہ حاکم

حکم اور لازم العمل فرمان کے طور پر کہ جسے اصطلاح میں "نہی مولوی" کہا جاتا ہے یعنی حاکمانہ ممانعت (کسی کام کے ارتکاب سے باز رہنے کا فرمان) کہ جس کی خلاف ورزی پر سزا و عذاب ہوتا ہے' (تنزیہی اور ارشادی نہی کی مثال یہ ہے جیسے کوئی طبیب کسی مریض سے کہے کہ فلاں چیز نہ کھاؤ' تو اس کا یہ کہنا مریض کی خیر خواہی اور بہتری کے لیے ہوتا ہے لہٰذا اگر وہ مریض طبیب کے اس حکم کی خلاف ورزی کرلے تو اسے سزا نہیں دی جاتی بلکہ صرف اس کی سرزنش ہوتی ہے اور اس خلاف ورزی کے نتیجے میں وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے جبکہ حاکم کے حکم اور مولا کے فرمان میں خلاف ورزی پر سزا ملتی ہے)۔ لہٰذا آدمؑ اور حواؑ نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اپنے آپ کو بہشت سے محروم کرلیا نہ یہ کہ خدا کی نافرمانی کے مرتکب ہو کر معصیت کار ہوئے ہوں۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی واضح ہے کہ اگر خدا کا انہیں درخت کے نزدیک جانے سے روکنا حاکم کے حکم اور مولا کے فرمان کے طور پر ہوتا تو توبہ کے ذریعے اس کی تلافی ہوجاتی کیونکہ اس طرح کے فرمان میں خلاف ورزی کرنے پر اگر توبہ کرلی جائے اور توبہ قبول بھی ہوجائے تو نافرمانی کے تمام آثار مٹ جاتے ہیں جبکہ آدمؑ اور حواؑ نے درخت کے قریب جانے اور اس کا پھل کھا لینے کے بعد توبہ کی اور ان کی توبہ قبول بھی ہوئی لیکن نافرمانی کے آثار باقی رہے اور انہیں بہشت میں واپس آنے کی اجازت نہیں دی گئی' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نہی تنزیہی اور ارشادی یعنی خیر خواہی و نصیحت کے لیے تھی ورنہ توبہ قبول ہونے کے بعد اس کے آثار مٹ جاتے اور وہ بہشت میں واپس آجاتے جبکہ ایسا نہیں ہوا کیونکہ ارشادی حکم میں طبعی اثرات باقی رہتے ہیں جبکہ مولا کے فرمان کے طور پر دیئے جانے والے حکم کی نافرمانی کے تشریعی اثرات توبہ کے قبول ہونے کی صورت میں ختم ہوجاتے ہیں' لہٰذا آدمؑ اور حواؑ کی توبہ قبول ہونے کے بعد انہیں بہشت میں واپس نہ لایا جانا اور خدا کے قرب کی منزل و مرتبہ کو دوبارہ حاصل نہ کرنا' اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حکم مولا کے فرمان کے طور پر نہ تھا بلکہ خیر خواہی کے طور پر تھا' بہرحال اس سلسلہ میں تفصیلی بحث آئندہ آئے گی' انشاء اللہ تعالیٰ۔

شیطان کا بہکاوہ

○ "فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ"

(پس شیطان نے انہیں پھسلا دیا)

یہ جملہ اپنے جیسے دیگر جملوں کی طرح بظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شیطان نے آدمؑ اور حواؑ کو دھوکہ دیا اور ان کے دلوں میں وسوسہ پیدا کر دیا' اس عبارت سے اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا آدمؑ وحواؑ کو دھوکہ میں ڈالنا اسی طرح سے تھا جس طرح وہ ہم بنی نوع آدمؑ کو دھوکہ دیتا ہے اور دلوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے جبکہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔

لیکن سورہ طٰہٰ میں خداوند عالم کے اس فرمان "فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ" (پس ہم نے کہا

اے آدم! یہ...... شیطان...... تیرا اور تیری زوجہ کا دشمن ہے) اور اس جیسی دیگر آیات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے آدمؑ اور حواؑ کو شیطان کی شکل دکھادی تھی اور اس کی اچھی طرح پہچان کروادی تھی نہ یہ کہ صرف اس کے اوصاف بیان کرنے پر اکتفاء کی بلکہ خود

اسے دکھا کر پہچان کروادی، جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں شیطان کا یہ قول ذکر فرمایا ہے کہ اس نے کہا:

★ "هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ"

(آیا میں تجھے ہمیشہ باقی رہنے کی نعمت والا درخت بتاؤں؟)

یہ جملہ شیطان نے آدمؑ سے کہا اور اس کا انداز "خطاب" کا انداز ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان آدمؑ کے آمنے سامنے ان سے مخاطب تھا کیونکہ اس طرح کے جملے اسی مقام پر استعمال ہوتے ہیں جہاں خطاب کرنے والا سامنے ہو۔

اسی طرح خداوند عالم نے شیطان اور آدمؑ وحواؑ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہ اعراف، آیت ۲۱:

★ "وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ"

(اور شیطان نے ان کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں)

اس آیت میں شیطان کے قسم کھانے کا ذکر ہے اور قسم میں عموماً قسم کھانے والا سامنے دکھائی دیتا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں یوں ارشاد ہوا:

★ "وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ"۔

(اور انہیں (آدمؑ وحواؑ کو) ان کے پروردگار نے آواز دی کہ آیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا تھا اور میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے)۔

ان تمام بیانات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شیطان انہیں دکھائی دے رہا تھا اور وہ اسے اپنے سامنے دیکھ رہے تھے، اور اگر وہ دونوں...... آدمؑ وحواؑ...... بھی ہماری طرح سے شیطان کے وسوسوں اور دھوکہ میں آجانے کی طرح اس کے فریب میں آئے ہوتے اور اسے ظاہر بظاہر نہ دیکھا ہوتا تو وہ یوں کہتے کہ: اے ہمارے پالنے والے! ہم نے تو شیطان کو دیکھا ہی نہیں ہے اور ہم نے یہ سمجھا کہ یہ وسوسے ہمارے اپنے افکار کی پیداوار ہیں اور ہم نے تو سوچا بھی نہیں کہ یہ شیطان کی طرف سے ہیں اور ہم نے تیرے اس تاکیدی ارشاد کی خلاف ورزی کے بارے میں ہرگز نہیں سوچا جو تو نے ہمیں شیطان کے وسوسے سے بچنے کی بابت کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آدمؑ اور حواؑ شیطان کو دیکھ رہے تھے اور اسے اچھی طرح پہچانتے بھی تھے جیسا کہ انبیاء

کرام ؑ کہ جو خدا کی طرف سے عطا کی گئی عصمت کی نعمت سے بہرہ ور تھے وہ بھی شیطان کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور جب بھی وہ ان انبیاء ؑ کو ورغلانے، بہکانے یا تنگ کرنے کی ناکام کوشش کرتا تو وہ اسے دیکھتے تھے جیسا کہ روایات میں ہے کہ اس نے حضرت نوح ؑ، حضرت ابراہیم ؑ، حضرت موسیٰ ؑ، حضرت عیسیٰ ؑ، حضرت یحیٰ ؑ، حضرت ایوب ؑ، حضرت اسماعیل ؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے دام فریب میں لانے کی جو کوششیں کیں ان سب میں وہ انبیاء ؑ کرام اسے دیکھتے اور پہچانتے تھے۔

اسی طرح زیر نظر آیات کے ظاہری الفاظ اور خدا کے اس ارشاد گرامی: "مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ" سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان جنت میں حضرت آدم ؑ اور حوا ؑ کے سامنے ہی درخت کے پاس تھا اور وہ پہلے ہی بہشت میں داخل ہو چکا تھا اور وہ ان کے ساتھ ہو لیا تھا اور اپنے وسوسوں سے انہیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ شیطان کیونکر بہشت میں داخل ہوا جبکہ وہ بہشت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تب درست ہو سکتی ہے جب اس بہشت سے مراد بہشت بریں...... جنۃ الخلد...... ہو کہ جس میں شیطان داخل نہیں ہو سکتا جبکہ وہ جنت الخلد نہیں تھی بلکہ ایک اور باغ تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ سب اس باغ سے باہر نکلے (اگر وہ بہشت بریں ہوتی تو آدم ؑ اور حوا ؑ اس سے ہرگز باہر نہ جاتے)۔

اور خدا کا ابلیس سے یہ کہنا: "فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ" (سورہ اعراف، آیت ۱۳) (یعنی تو اس بہشت سے اتر جا کہ اس میں تیرے لیے تکبر کی کوئی گنجائش نہیں لہٰذا اس سے باہر نکل جا) اگرچہ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو بہشت سے باہر نکالا گیا لیکن ممکن ہے اس سے مراد فرشتوں کی بزم سے باہر نکلنے کا حکم ہو یا پھر آسمان سے باہر نکلنے کا حکم ہو کہ وہ خدا کے قرب کا مقام اور عظمت و بزرگی والی جگہ ہے۔

بہشت سے نکلنے کا حکم

○ "وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ"

(اور ہم نے کہا کہ تم اتر جاؤ اس بہشت سے، کیونکہ تمہارے بعض، بعض کے دشمن ہیں)۔

اس آیت کے سیاق سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطاب آدم ؑ، حوا ؑ اور ابلیس ؑ سب کو تھا، لیکن سورہ اعراف میں صرف ابلیس کو مخاطب کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا" (تو اس سے اتر جا، کہ تیرے لیے اس میں تکبر کی کوئی گنجائش نہیں) لہٰذا خدا کا کہنا کہ "اهْبِطُوْا" تم سب اتر جاؤ، گویا اس طرح سے ہے کہ دونوں احکامات کو باقی رکھا گیا ہے (علمی اصطلاح میں اسے "جمع بین الخطابین" کہتے ہیں) اور یہاں دونوں احکام یکجا کر دیئے گئے ہیں اور یہ کہ یہ بیان اس دشمنی اور عداوت کے تذکرے کے طور پر ہے جو خدا نے ابلیس ملعون اور حضرت آدم ؑ، ان کی زوجہ اور ان دونوں کی نسل میں پائی اور اسی طرح اس امر کے بیان میں ہے کہ خدا نے بنی نوع آدم کے

لیے زمین میں زندگی بسر کرنا اور اسی میں ہی مرنا اور پھر اسی سے دوبارہ اٹھنا مقرر فرمایا ہے۔

اس مقام پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ آدمؑ کی ذریت اور نسل بھی مذکورہ حکم میں آدمؑ کے ساتھ شامل ہے جیسا کہ خداوند عالم کے اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے:

سورہ اعراف، آیت ۲۵:

"فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ"

(اسی میں ہی تم زندگی بسر کرو گے اور اسی میں ہی مرو گے اور اسی سے دوبارہ نکالے جاؤ گے)

اسی طرح ایک اور آیت میں یوں ارشاد فرمایا:

"وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ ---"

(اور ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر ہم نے تمہاری شکلیں بنائیں پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدم کو سجدہ کرو.....)

اس آیت کی تفسیر سورہ اعراف میں بیان کی جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

پس فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا اس لحاظ سے تھا کہ وہ زمین میں خدا کا خلیفہ تھا اور درحقیقت آدمؑ کو سجدہ کرنے میں تمام افراد بشر کو سجدہ کرنے کا حکم پوشیدہ تھا کیونکہ آدم علیہ السلام "بشر" کے نائب کے طور پر بطور نمونہ سامنے لائے گئے تھے اور انہیں سجدہ کرنا درحقیقت "بشر" کو فرشتوں کے سجدہ کرنے کے برابر تھا۔

خلاصہ یہ کہ بظاہر یہ سارا واقعہ یعنی آدمؑ اور حوا کو بہشت میں قیام کروانا اور پھر درخت سے پھل کھانے کی وجہ سے انہیں بہشت سے نیچے اتار دینا کہ جسے خداوند عالم نے بیان فرمایا ہے دراصل ایک طرح کی مثال اور نمونہ پیش کرنے کے مانند ہے جس میں خداوند عالم نے ایسا کر کے یہ بتایا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں آنے سے پہلے کس قدر سعادت و خوش بختی، کرامت و بزرگی خداوند عالم کے قرب اور پاکیزہ جوار میں حاصل تھی اور وہ اس بلند و عظیم مقام میں تھا کہ جو نعمت و سرور انس و محبت و پیار، پاک و پاکیزہ ساتھیوں، روحانی دوستوں اور پروردگار عالم کی ہمسائیگی کا مقام ہے، یہ سب کچھ بیان کر کے بتایا کہ اس کے بعد انسان نے اس مقدس و پاکیزہ مقام کو چھوڑ کر ایسا مقام اپنے لیے اختیار کیا کہ جس میں تکلیفیں، پریشانیاں سختیاں، مصیبتیں اور مشکلات ہی مشکلات ہیں اور اپنے پہلے مقدس مقام کی طرف لوٹ جانے کی بجائے اسی فانی، بے مزہ بدمزہ، قابل نفرت اور پست و ناچیز زندگی کی محبت میں مبتلا ہو گیا، البتہ اگر وہ اس کے بعد بھی اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آئے تو یقیناً خدا اسے اس کی عزت و سعادت کی منزل دوبارہ عطا کرے گا اور اگر وہ ایسا نہ کرے بلکہ زمین کی پستیوں کا شکار ہو کر اس میں ہی رہنے کا ارادہ کر لے اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا رہے تو گویا خود ہی اس نے خدا کی نعمت کا شکر ادا کرنے کی بجائے کفران نعمت کیا اور خود ہی اپنے لیے تباہی کی منزل اختیار کی جو کہ جہنم ہے وہ اس کی بڑھکتی ہوئی آگ میں جلتا رہے گا جو کہ نہایت برا مقام ہے۔

آدم کا کلمات سیکھنا

○ "فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ"

(پھر آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے اور خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی)۔

عربی زبان میں "تلقی" کا معنی کوئی چیز لینا' حاصل کرنا اور سیکھنا ہے' اور کسی سے کوئی بات یا کلام اور اس کے معنی و مفہوم کو اچھی طرح سمجھ کر حاصل کرنے کو "تلقی" کہتے ہیں' اور وہ "تلقی" آدم علیہ السلام کے لیے توبہ کو آسان بنانے کا بہترین طریقہ اور ذریعہ تھا۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کی دو قسمیں ہیں: ایک توبۂ خدا اور دوسری توبۂ عبد' پہلی توبہ سے مراد یہ ہے کہ خدا اپنے بندے کی طرف رحمت کے ساتھ لوٹ آئے اور دوسری توبہ سے مراد یہ ہے کہ بندہ، خدا کی طرف استغفار اور معصیت و نافرمانی سے دوری اختیار کرنے کے ساتھ لوٹ آئے۔

بندے کی توبہ خدا کی دو توبہ کے ساتھ ملی ہوئی ہے کیونکہ بندہ کسی حال میں بھی اپنے پروردگار سے بے نیاز نہیں ہو سکتا' لہٰذا اگر وہ چاہے کہ معصیت و گناہ کی وادی سے باہر نکل کر خدا کی طرف لوٹ آئے تو ایسا کرنے میں بھی وہ خدا کی طرف سے توفیق کے حصول کا محتاج ہے اور اس کی مدد اور رحمت کا حاجتمند ہے تاکہ صحیح معنی میں توبہ کر سکے' اور اس کے بعد پھر وہ اس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ خدا اس کی توبہ قبول کرے اور اسے اپنی عنایت اور رحمت سے نوازے' گویا بندے کی توبہ اگر شرف قبولیت حاصل کرلے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے دو توبہ کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ ایک توبہ کرنے کی توفیق اور دوسری توبہ کی قبولیت' جیسا کہ خداوند عالم کے اس ارشاد گرامی سے ثابت ہے:

سورۂ توبہ' آیت ۱۱۹:

"ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوْا" ...

(یعنی پھر خدا نے انہیں توبہ دی تاکہ وہ توبہ کرلیں)۔

اس مقام پر ایک ادبی نکتہ بھی ہے جس میں مذکورہ بالا مطلب کی تائید اور مناسبت ملتی ہے اور وہ یہ کہ آیت میں لفظ "آدم" کو زبر (نصب) کے ساتھ اور "کلمات" کو پیش (رفع) کے ساتھ پڑھا جائے' البتہ اگر دوسری قرائت یعنی لفظ "آدم" کو پیش (رفع) کے ساتھ اور "کلمات" کو زبر (نصب) کے ساتھ پڑھا جائے تب بھی اس میں مذکورہ اہم مطلب سے منافات نہیں پائی جاتی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اب رہا یہ سوال کہ وہ کلمات کیا ہیں؟ تو اس سلسلے میں یہ احتمال دیا جاتا ہے کہ ان سے مراد وہ چیز ہے جس کا ذ
خداوند عالم نے سورہ اعراف میں آدمؑ اور حواؑ کے حوالے سے کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

سورہ اعراف، آیت ۲۳:

☆ "قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ"۔

(انہوں ...... آدمؑ وحواؑ ...... نے کہا اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اگر تو ہمیں معاف کرے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم سخت نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے)

لیکن یہ کلمات یعنی "قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ۔" سورہ اعراف میں جملہ "قُلْنَا اهْبِطُوْا۔۔" سے پہلے ذکر کئے۔ ہیں جبکہ اس سورہ (بقرہ) میں "فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ ۔۔" کے الفاظ "قُلْنَا اهْبِطُوْا۔۔" کے بعد ذکر کئے گئے ہیں۔ اس لیے یہا مذکورہ احتمال کی تائید نہیں ہوتی۔

ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ

اس مقام پر ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ آپ نے اس واقعہ کی ابتداء میں اس امر سے آگاہی حاصل کی کہ جب خدا عالم نے فرشتوں سے کہا: "اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً" (میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں) تو فرشتوں نے کہ "اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ" (آیا تو اسے بنا رہا ہے زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون ریزی کرے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس بجالا ہیں) فرشتوں کے اس جواب پر خداوند عالم نے ان کے بیان کی تردید نہیں کی اور زمین میں بنائے جانے والے خلیفہ پر کی طرف سے دی گئی فساد برپا کرنے کی نسبت کی نفی نہیں کی اور یہ نہیں فرمایا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا بلکہ ان کے الزاما جواب دینے کی بجائے یوں فرمایا: "عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" اس نے آدمؑ کو سب نام پڑھا دیئے' تو اس سے معلوم ہے کہ اسماء کا تعلیم دینا ہی فرشتوں کے اعتراض کا اصل جواب اور ان کی طرف سے منسوب کئے گئے الزامات کی نفی کے کافی تھا' کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو فرشتوں کا اعتراض اپنے مقام پر باقی رہ جاتا اور ان پر حجت ہرگز پوری نہ ہوتی اور وہ کہہ د کہ ہمارا اعتراض ابھی باقی ہے اور تعلیم الاسماء کا ہمارے اعتراض سے کیا تعلق ہے! اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو ا خداوند عالم نے فرشتوں کو تعلیم دیئے ان میں وہ چیز بھی شامل تھی جو معصیت کرنے والے کو معصیت کرنے کے بعد سہارا د سکتی ہے اور گناہ کرنے والے کو گناہ کرنے کے بعد معافی کا راستہ دکھا سکتی ہے' لہٰذا یہ ممکن ہے کہ آدم علیہ السلام نے جو کلم

پروردگار سے سیکھے وہ انہی اسماء میں سے کسی اسم کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ (غور فرمائیں)۔

اس کے علاوہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے آپ پر ظلم اور زیادتی کی اور اپنے آپ کو ہلاکت و تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا اور سعادت و شقاوت کے دوراہے پر بیٹھ گئے یعنی دنیا کو اختیار کر لیا کہ اگر اپنی جائے ہبوط میں ٹھہر جاتے تو یقینا تباہ ہو جاتے اور اگر اپنی پہلی سعادت کی منزل کی طرف لوٹ جاتے تب بھی اپنے آپ کو مشقت اور تکلیف میں ڈالتے لہٰذا ہر حالت میں انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو سعادت کے راستے پر لا کھڑا کیا اور کمال کی منزل کو پانے کی راہ ہموار کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور زمین پر نہ اترتے یا خطا کئے بغیر اترتے تو ہرگز سعادت و کمال کی حقیقی منزل اور عظیم مقام کو نہ پا سکتے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر حضرت آدمؑ ابوالبشر زمین پر نہ آتے تو اپنے فقر و ناداری، فرومایگی، احتیاج و ناتوانی اور نقص و کمی کو کیونکر سمجھ سکتے تھے؟ اور کس طرح اس حقیقت کا ادراک کر سکتے کہ تکلیفوں، مشقتوں اور سختیوں کو جھیلنے کے بعد ہی خدا کی مقدس بزم اور پروردگار عالم کی ہمسائیگی کی پاکیزہ لذتوں سے لطف اندوز ہونا ممکن ہے؟ جبکہ یہ امر ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ خداوند عالم کی پاکیزہ صفات یعنی عفو و درگذر، مغفرت و بخشش، توبہ قبول کرنا اور عنایت و مہربانی، گناہوں کی پردہ پوشی، فضل و کرم اور رحمت و عنایت وغیرہ گناہگاروں ہی کے لیے مخصوص ہیں، اس نے یہ سب صفات اپنے خطا کار بندوں ہی کے لیے مقرر فرمائی ہیں، اور وہ ایام دہر اور زمانہ کے شب و روز میں اپنی رحمت و عنایت کی مقدس خوشبو سے انہی لوگوں ہی کو لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیتا ہے جو اس کی نافرمانی اور گناہ کرنے کے بعد اس کی رحمت کی آس لگا کر اس کی طرف سچے دل سے لوٹ آتے ہیں۔

یہ توبہ ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کو ہدایت کا راستہ دکھا کر اس سے اس پر چلنے کی توقع کی گئی، اور یہ توبہ ہی ہے جو اس مقام و منزل کی پاکیزگی کا سبب ہے جس میں قیام پذیر ہونے کی امید ہے، اور یہ توبہ ہی ہے جو تشریع دین اور راہ و روش زندگی کے تعین کا پیش خیمہ بنی، ان مطالب کے ثبوت کے لیے یہی کافی ہے (جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا) کہ خداوند عالم نے بار بار توبہ کا تذکرہ کیا ہے، اور اسے ایمان سے پہلے ذکر کیا چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہء ہود، آیت ۱۱۲:

★ "فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ"

(جس طرح سے آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ استقامت اختیار کریں...... ثابت قدم رہیں...... اور ہر وہ شخص بھی ایسا ہی کرے جس نے آپ کے ساتھ ہی توبہ کی)۔

سورہ ء طہٰ، آیت ۸۲:

★ "وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ"۔

(اور میں ہی معاف کرنے والا ہوں ہر اس شخص کو جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا)۔

اس مضمون کی متعدد آیات قرآن مجید میں موجود ہیں۔

سب سے پہلا دینی فرمان

○ "قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى . . ."

(ہم نے کہا تم اتر جاؤ اس سے سب کے سب، جب میری طرف سے کوئی ہادی تمہارے پاس آئے۔۔۔۔)

یہ آیت دراصل وہ پہلا فرمان ہے جو دین کے حکم اور قانون کے طور پر آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کے لیے صادر ہوا اس فرمان میں پورے کے پورے دین کو دو جملوں میں خلاصہ کر دیا گیا ہے کہ پھر قیامت تک اس میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہ ہو سکے گا۔

اگر آپ اس واقعہ (یعنی بہشت کی کہانی) اور بالاخص اسے جس طرح سے سورہ طٰہ میں ذکر کیا گیا ہے پر غور کریں اور اچھی طرح اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں تو آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس ماجرے سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ واقعہ خداوند عالم کی طرف سے آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت و نسل کے لیے دو فیصلوں کا موجب بنا:

(۱) یہ کہ ان کا درخت سے پھل کا کھا لینا اس بات کا سبب بنا کہ خداوند عالم بہشت سے اتر جانے اور انہیں زمین میں قیام پذیر ہو کر دنیا کی اس شقاوت آمیز زندگی کو اپنانے کا حکم دے جس سے آدمؑ اور حواؑ کو اس وقت ہی بچنے کی تاکید کی گئی تھی جب انہیں درخت کے پاس جانے سے روکا گیا تھا۔

(۲) ان کی توبہ اس امر کا سبب بنی کہ خداوند عالم نے اس کے بعد دوبارہ یہ فیصلہ کیا کہ آدمؑ اور ان کی ذریت و نسل کو عزت بخشے اور اپنی بندگی کی ہدایت و رہنمائی کر کے ان کی عظمت رفتہ کو بحال کر دے چنانچہ خداوند عالم نے ان کی عزت و احترام کی خاطر انہیں اپنی بندگی کی ہدایت کا سامان کیا، پس پہلا فیصلہ زمین میں زندگی بسر کرنے کا تھا اور پھر اس کے بعد توبہ کے ذریعے دنیا کی زندگی کو پاک و پاکیزہ بنانے کا تھا (توبہ کے بعد اسی زمینی زندگی کو خدا نے پاکیزہ زندگی میں بدل دیا) اور وہ اس طرح کہ اس زندگی کو اپنی بندگی کی ہدایت کے ساتھ ملا دیا جس کے نتیجے میں وہ زندگی دو زندگیوں یعنی زمینی زندگی اور آسمانی زندگی کا مجموعہ و مرکب بن گئی، اور یہی وہ اہم نکتہ ہے جو اس سورہ میں دو مرتبہ ہبوط یعنی بہشت سے اتر جانے کے حکم کے مکرر ذکر کئے جانے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے (ملاحظہ ہو) خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

★ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ " اور

★ " قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى . . . "

دو مرتبہ "ہبوط" کے حکم کو ذکر کیا گیا ہے اور ان دونوں کے درمیان "توبہ" کا ذکر ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ اور حواؑ نے جب توبہ کی تو ابھی وہ بہشت سے دور نہیں ہوئے تھے تاہم بہشت میں پہلے کی طرح مقام و منزلت سے

حامل نہیں تھے...... اسی امر کا اشارہ خداوند عالم کے اس ارشاد گرامی میں بھی ملتا ہے:

★ ”وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ“

(اوران کے رب نے انہیں پکار کر کہا کہ آیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے نہیں روکا تھا)۔

اس سے پہلے خدا نے ان سے فرمایا تھا:

★ ”لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ“۔

(تم دونوں اس درخت کے پاس ہرگز نہ جانا)۔

ان دونوں جملوں پر غور کریں کہ خداوند عالم نے پہلے ان سے فرمایا کہ تم دونوں ”اس“ درخت کے پاس نہ جانا“ پھر فرمایا ”آیا میں نے تم دونوں کو ”اس“ درخت کے پاس جانے سے روکا نہیں تھا؟“ تو پہلی مرتبہ ”ھذہ“ کا لفظ استعمال کیا جو کسی نزدیک چیز کی طرف اشارہ کے لیے ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری مرتبہ جب درخت کا ذکر کیا تو ”تِلْكُمَا“ کا لفظ استعمال کیا جو کسی دور چیز کی طرف اشارہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح پہلی مرتبہ ”قال“ کا لفظ ذکر کیا جو کہ نزدیک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور دوسری مرتبہ ”نادیٰ“ کہا (یعنی اس نے پکارا) جو کہ دور کے لیے استعمال کیا جاتا ہے‘ ان باریک ادبی نکات پر غور کریں تو بہت سے حقائق واضح وآشکار ہو جائیں گے۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

★ ”وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ...“

(ہم نے کہا کہ اب تم زمین ہی میں زندگی بسر کرو گے‘ اسی میں ہی مرو گے اور اسی سے دوبارہ اٹھائے جاؤ گے)۔

تو ان دونوں ارشادات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”ہبوط“ کے بعد والا طرز زندگی ”ہبوط“ سے پہلے کے طرز زندگی سے سراسر مختلف ہے‘ دنیا کی زندگی میں درحقیقت زمین کی بنیادی خصوصیات شامل ہیں۔ گویا اس زندگی کی حقیقت زمین کی حقیقت سے آمیختہ ہے یعنی اس میں سختیاں اور تکلیفیں ہی تکلیفیں ہیں اور اس میں اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ انسان زمین میں اپنی زندگی کے مراحل طے کرے اور پھر مرنے کے بعد دوبارہ زمین میں لوٹا دیا جائے اور پھر زمین ہی سے دوبارہ اٹھایا جائے‘ لہٰذا زمین والی زندگی بہشت کی زندگی سے سراسر مختلف ہے۔ کیونکہ بہشت کی زندگی ایک آسمانی زندگی ہے نہ کہ زمینی کہ جس میں لحظہ بہ لحظہ تغیرات اور تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔

اس بیان سے یہ نتیجہ یقینی طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہشت جس سے آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو نکالا گیا وہ آسمان میں تھی اور وہ آخرت والی بہشت یعنی جنت الخلد ...... ہمیشہ کی جنت ......نہ تھی کہ جس میں داخل ہونے والا کبھی اس سے باہر نہ جائے گا۔

اس مقام پر ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس آسمان سے کیا مراد ہے جس میں بہشت ہے‘ اس سلسلے میں ہم تفصیلی

بحث بہت جلد کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

آدم کی خطاء سے کیا مراد ہے ؟

یہاں ایک اور امر بھی غور طلب ہے اور وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی خطا کہ جس کے وہ مرتکب ہوئے سے کیا مراد ہے؟ تو اس سلسلے میں اگر چہ آیات کے ظاہری الفاظ سے ابتدائی طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان سے معصیت اور گناہ سرزد ہوا جیسا کہ خدا نے فرمایا: "فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" کہ اس درخت سے پھل نہ کھانا ورنہ "ظالموں" میں سے ہو جاؤ گے۔ اور فرمایا: "وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى" کہ آدمؑ نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور پھر گمراہ ہو گیا' اور اسی طرح وہ جملہ کہ جس میں آدمؑ اور حواؑ دونوں نے اعتراف کیا کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے چنانچہ خداوند عالم نے ان کے بیان کو اس طرح ذکر فرمایا (کہ انہوں نے کہا):

سورہ اعراف، آیت ۲۳:

"رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ"۔

(اے ہمارے پالنے والے ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا' اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم سخت نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے)۔

لیکن اس واقعہ کی تمام آیات میں اچھی طرح غور کرنے اور درخت کا پھل کھانے سے روکنے کے فرمان پر پوری توجہ کرنے سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فرمان یعنی درخت سے پھل کھانے سے روکنا حاکم اور آقا کی طرف سے صادر ہونے والے حکم کی طرح نہیں تھا (کہ جسے علمی اصطلاح میں "مولا کا فرمان" کہا جاتا ہے۔۔ الامر المولوی۔۔) بلکہ وہ ارشادی نہی تھی یعنی ان کی خیر خواہی کے طور پر بہتری کا راستہ دکھانا مقصود تھا اور اس بات کی رہنمائی مقصود تھی کہ جس چیز سے تمہیں روکا گیا ہے اس سے رکنے میں تمہاری بھلائی ہے' کیونکہ اگر وہ "مولا کے فرمان" کے طور پر ہوتا تو اس کی خلاف ورزی معصیت و گناہ قرار پاتی' اس مطلب کو تین دلیلوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے:

پہلی دلیل:

خداوند عالم نے اس سورہ اور سورہ اعراف میں نہی یعنی درخت کا پھل کھانے سے روکنے کے حکم، کی خلاف ورزی کو "ظلم" سے تعبیر کیا ہے' چنانچہ ارشاد ہوا:

★ "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"

(تم اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے)۔

پھر اسی کو سورہ طہٰ میں اس طرح بیان کیا: "فَتَشْقٰى" ورنہ تم شقی ہو جاؤ گے۔ یعنی بہشت کو چھوڑنا تمہاری شقاوت کا

سبب بنے گا' تو اس آیت میں ''ظلم'' کی بجائے ''شقاوت'' کا لفظ استعمال کیا گیا' اور ''شقاوت'' کا معنی تعب اور سختی ہے' شقاوت کا لفظ ذکر کرنے کے بعد چند جملے ایسے بیان کئے جو اس (شقاوت) کے معنے کی وضاحت اور اس کی تفسیر کے طور پر ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

★ ''اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى''۔

(یہاں بہشت میں تیرے کھانے پینے کے لیے سب کچھ ہے تم اس میں نہ بھوکے رہو گے نہ بے لباس ہو گے' نہ یہاں پیاسے ہو گے اور نہ ہی دھوپ کھاؤ گے)۔

ان جملوں میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ''شقاوت'' سے مراد تعب و مشقت اور دنیاوی زندگی کی سختی ہے اور وہ سختی یعنی بھوک' پیاس اور بے لباس ہونا وغیرہ زمینی زندگی کے ساتھ ساتھ اور اس کا لازمی حصہ ہے۔

پس دنیاوی زندگی کی انہی سختیوں سے بچنے کے لیے آدم علیہ السلام کو درخت کے قریب جانے سے روکا گیا۔ ورنہ اس کے علاوہ کوئی دوسری وجہ نہ تھی جس کی بناء پر کہا جا سکے کہ یہ روکنا ''مولا کے حکم'' کے طور پر تھا' لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ وہ نہی ارشادی...... خیر خواہی کے طور پر ...... تھی' اور یہ بات واضح ہے کہ ارشادی نہی کی خلاف ورزی کو مولا کی نافرمانی نہیں کہا جا سکتا اور اس کا مرتکب عبودیت و بندگی کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا' اور نہ اسے بندگی کے طور طریقوں سے تجاوز کرنا کہا جا سکتا ہے۔

اب جبکہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ نہی (درخت سے پھل کھانے سے روکنا) ارشادی تھی اور ارشادی نہی کی خلاف ورزی معصیت و گناہ نہیں ہوتی تو ''ظلم'' کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان آیات میں ان دونوں (آدمؑ اور حواؑ) کی طرف سے ''ظلم'' کا اعتراف اور خداوند عالم کا یہ فرمانا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو ''ظالموں'' میں سے ہو جاؤ گے' تو یہاں ''ظلم'' سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو سختی و مشقت اور ہلاکت میں ڈال دیا نہ یہ کہ ''ظلم'' مراد وہ ہے جو ربوبیت اور عبودیت کے باب میں قابل مذمت عمل شمار کیا جاتا ہے یعنی خدا کی نافرمانی اور اس کی حکم عدولی!

دوسری دلیل:

توبہ کا معنی بندے کا خدا کی طرف واپس آ جانا ہے' جب کوئی شخص معصیت اور خدا کی نافرمانی کرنے کے بعد سچے دل سے توبہ کر لے اور خدا کی طرف سے اس کی توبہ قبول ہو جائے تو اس سے اس معصیت اور گناہ کا نام و نشان مٹ جاتا ہے اور گناہ کرنے والا اس طرح ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو اور کوئی معصیت اس سے سرزد ہی نہ ہوئی ہو' لہٰذا ایسے شخص کے ساتھ جو گناہ و معصیت کا ارتکاب کرنے کے بعد توبہ کر لے اور سچے دل سے خدا کی طرف لوٹ آئے ایک فرمانبردار اور اطاعت گزار شخص جیسا سلوک کیا جاتا ہے اور اس کا عمل خدا کی اطاعت اور اس کے حکم کی فرمانبرداری قرار دیا جاتا ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر نہی یعنی درخت سے پھل کھانے سے روکنا ''مولا کے فرمان'' کے طور پر ہوتا اور آدمؑ

کی توبہ ''مولا کے حکم'' کی نافرمانی کرنے والے بندے کی توبہ کی طرح ہوتی یعنی جس طرح کوئی بندہ اپنے آقا کے فرمان خلاف ورزی کر کے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور پھر توبہ کر کے واپس اپنے آقا کی طرف لوٹ آتا ہے' تو ضروری تھا کہ وہ آدمؑ اور حواؑ ...... بہشت میں واپس آ جاتے جبکہ وہ واپس نہ آ سکے' اسی سے پتہ چلتا ہے کہ ممنوعہ درخت سے پھل کھانے وجہ سے بہشت سے نکل جانا دراصل ایک ایسا طبعی و تکوینی اثر تھا جو ہر حال میں اور خواہ و نا خواہ ہونا تھا جیسے زہر کھا لینے کا موت اور آگ لگنے سے جل جانا یقینی ہوتا ہے' چنانچہ ارشادی اوامر اور احکامات (مثلاً طبیب کا بیمار کو کسی چیز سے روکنا وغیر میں ان کے اثرات یقینی ہوتے ہیں اور یہ آثار ان احکامات کی خلاف ورزی کے طور پر دی جانے والی سزاؤں کی طرح نہ ہوتے جو ''مولا کے فرمان'' کے طور پر صادر ہوتے ہیں جیسے تارک الصلوٰۃ کا نماز نہ پڑھنے پر جہنم میں جانا اور ''مولا فرمان'' کے طور پر صادر ہونے والے عام معاشرتی احکامات کی خلاف ورزی کرنے پر مذمت کا سزاوار ہونا وغیرہ۔

تیسری دلیل:

خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

ان دو آیتوں میں شریعت کے ان تمام تفصیلی احکام اور قوانین کی تدوین کا جامع ذکر ہے جو خداوند عالم نے اس میں فرشتوں کے ذریعے اور کتابیں اور رسول بھیج کر نازل فرمائے' اور اسی سے خدا کی طرف سے بنائے جانے والے سب پہلے اس قانون ہدایت کا سراغ ملتا ہے جو اس نے اس دنیا میں جو کہ آدمؑ اور اولاد آدمؑ کی دنیا ہے انسان کے لیے بنایا او کام جیسا کہ خداوند عالم نے خود ہی بیان فرمایا ہے ''ہبوط'' کے دوسرے حکم کے بعد ہوا' اور یہ بات واضح ہے کہ ''ہبو (بہشت سے اتر جانے کا حکم) ایک تکوینی امر تھا جو کہ آدم علیہ السلام کے بہشت میں قیام پذیر ہونے اور خطا کا ارتکاب کر کے بعد صادر ہوا لہٰذا معلوم ہوا کہ جب آدمؑ نے ممنوعہ درخت کے پاس نہ جانے کے حکم کی خلاف ورزی کی اور درخت کا کھا کر خطا کے مرتکب ہوئے تو ابھی کوئی دین اور قانون نہیں بنا تھا اور نہ ہی ''مولا کے فرمان'' کے طور پر کوئی حکم صادر ہوا تھا کسی ایسے گناہ اور معصیت کے وقوع پذیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو ''مولا کے فرمان'' کی خلاف ورزی کر ہوئے کوئی بندہ انجام دے اور جہاں تک ''اسجدوا'' (سجدہ کرو) کے حکم کا تعلق ہے کہ جس کا مخاطب فرشتے اور ابلیس ہیں جو ''لاتقربا'' (اس درخت کے قریب نہ جانا) سے پہلے جاری ہوا تو اگرچہ وہ حکم ''مولا کے فرمان'' کے طور پر تھا لیکن دو کے مخاطب مختلف تھے'' اسجدوا'' کے مخاطب ملائکہ اور ابلیس جبکہ ''لاتقربا'' کے مخاطب آدم و حوا تھے' اس بناء پر اس ہمارے مدعا۔ کہ اس وقت تک کوئی دین و آئین شریعت نہیں بنا تھا' سے تصادم کا پہلو ہرگز موجود نہیں۔

اسے آسان لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں احکام میں فرق ہے' جو حکم خداوند عالم نے فرشتوں

ابلیس کو دیا وہ یقیناً ''مولا کے فرمان'' کے طور پر دیا جانے والا حکم تھا اور جو حکم آدمؑ اور حواؑ کو دیا گیا وہ ''مولا کے فرمان'' کے طور پر نہیں تھا کیونکہ دونوں احکام کے ''مکلف'' مختلف تھے' پہلے حکم کے مکلف فرشتے اور ابلیس' جبکہ دوسرے حکم کے مکلف آدمؑ اور حواؑ تھے لہٰذا آدمؑ اور حواؑ کے لیے حکم صادر ہوتے وقت عالمِ بشریت کے لیے دین و آئین کے نہ ہونے سے فرشتوں اور ابلیس کے لیے کوئی حکم صادر کرنے میں حرج لازم نہیں آتا اور ان دونوں احکام میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی کیونکہ دونوں کا تعلق مختلف قسم کی مخلوق سے ہے۔

ایک امکانی سوال اور اس کا جواب

اگر آپ یہ سوال کریں کہ جب ممنوعہ درخت سے پھل کھانے سے روکنا ارشادی نہی کے طور پر تھا نہ کہ ''مولا کے فرمان'' کے طور پر تو خداوند عالم نے آدم و حوا کے فعل کو ''ظلم'' و ''معصیت'' اور ''بھٹکنے'' کا نام کیوں دیا؟

تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ''ظلم'' کی بابت بیان کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد ان کا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے کیونکہ وہ خدا کے قرب میں رہتے تھے اور درخت سے پھل کھا کر اس قرب سے ہاتھ دھو بیٹھے' تو ان کا ایسا کرنا دراصل خود اپنے اوپر ہی ظلم کرنا تھا' اور جہاں تک ''معصیت'' کا تعلق ہے تو لغت میں ''عصیان'' کا معنی ''اثر قبول نہ کرنا'' یا ''مشکل سے اثر پذیر ہونا'' ہے مثلاً کہا جاتا ہے ''کسرتہ فانکسر و کسرتہ فعصی'' (میں نے اس چیز کو توڑا تو وہ ٹوٹ گئی اور اس چیز کو توڑا تو وہ نہ ٹوٹی) یعنی وہ اثر پذیر نہ ہوئی (عصیان کیا) تو گویا ''عصیان'' سے مراد اثر نہ لینا ہے (یعنی امر و نہی کا کوئی اثر نہ لینا) اور یہ معنی یعنی اثر نہ لینا جس طرح ''مولا کے فرمان'' کے طور پر جاری ہونے والے احکامات کی خلاف ورزی کرنے میں پایا جاتا ہے اسی طرح ارشادی احکامات و خیر خواہانہ و ناصحانہ دستورات میں بھی پایا جاتا ہے' البتہ عصر حاضر میں ہم مسلمانوں کے درمیان عصیان و معصیت کا معنی صرف ''مولا کے فرمان'' کے طور پر جاری ہونے والے خدائی احکامات کی خلاف ورزی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً خدا نے فرمایا: نماز پڑھو' روزہ رکھو' حج کرو' شراب نہ پیو' زنا نہ کرو اور اس قسم کے دیگر احکامات' تو ان میں عصیان اور معصیت کا معنی لغوی نہیں بلکہ شرعی یا دینداروں کے درمیان مروجہ معنی ہے' اور اس سے لغت یا عامۃ الناس کے درمیان رائج معنی کی نفی نہیں ہوتی' اب رہا ''غوایت'' یعنی بھٹکنے کا لفظ' تو اس کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنے مقصد کے تحفظ اور اپنی زندگی کے امور کی موزوں و مناسب طور پر تدبیر کرنے پر قادر نہ ہو اور واضح ہے کہ یہ معنی ہر مقام پر اس مقام کی مناسبت سے ہوگا کہ اگر وہ ارشادی اور خیر خواہانہ حکم کا مقام ہو تو اس میں ''غوایت'' کا معنی کچھ اور ہوگا اور اگر ''مولا کے فرمان'' کے طور پر جاری ہونے والے حکم کا مقام ہو تو اس میں ''غوایت'' کا معنی کچھ اور ہوگا۔

ایک نہایت اہم مطلب کی وضاحت

اگر آپ یہ پوچھیں کہ جب ''ظلم'' ''عصیان'' اور غوایت کے الفاظ استعمال کرنے کے باوجود آدمؑ اور حواؑ کو جانے والا حکم ارشادی تھا، نہ کہ ''مولا کے فرمان'' کے طور پر تو پھر ''توبہ'' کا مطلب کیا ہے؟ جبکہ ان دونوں..... آدمؑ اور ..... نے کہا ''وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ'' (کہ اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ فرما. تو ہم سخت خسارے میں واقع ہوں گے)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ توبہ کی بابت ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کا معنی خدا کی طرف لوٹ آنا ہے اور رجوع کرنا. لوٹ آنا ہر مقام اور مورد میں اپنا الگ معنی رکھتا ہے مثلاً کوئی سرکش غلام اپنے آقا و مولا کے حکم کی نافرمانی اور اس کے اراد. کی خلاف ورزی کرنے کے بعد توبہ کرسکتا ہے کہ جس سے مولا اسے اپنے قرب کا وہ مقام دوبارہ عطا کردے جو پہلے ا. حاصل تھا تو اسی طرح وہ بیمار شخص کہ جسے طبیب نے خیر خواہی کے طور پر بعض پھلوں اور کھانے پینے کی بعض چیزوں سے روکا تاکہ اسے صحت وسلامتی اور تندرستی وشفا حاصل ہو۔لیکن وہ بیمار شخص طبیب کے منع کرنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ چیزیں لے اور اس کی بیماری شدت اختیار کر جائے اور اس کی حالت قابو سے باہر ہو جائے جس سے اس کی موت کا خطرہ لاحق ہو تو ا شخص بھی توبہ کر کے دوبارہ طبیب کی طرف رجوع کرسکتا ہے تاکہ اس کے مشورے سے ایسی دوا استعمال کرے جس سے ا. شفا حاصل ہو اور اس کی اس غلطی کی تلافی ہو جائے اور طبیب اسے نئی دوا کے استعمال اور سخت احتیاط کا حکم دے اور اس سے کہے کہ اگرچہ اب تیرے لیے اس دوا کے استعمال اور سخت احتیاط کرنے میں کافی زحمت' مشقت' تکلیف اور ریاضت ضرورت ہے لیکن ایسا کرنے اور ان سختیوں کو برداشت کرنے سے تیری صحت بحال ہوسکتی ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ تو پہلے. بھی بہتر صحت وتندرستی پالے۔

اب رہی یہ بات کہ انہوں (آدمؑ اور حواؑ) نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے مغفرت ورحمت طلب کی اور کہ اے خدا اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم سخت خسارے میں رہیں گے' تو ان الفاظ یعنی ''مغفرت ''رحمت'' اور ''خسران'' کے بارے میں بھی ہمارا وہی موقف ہے جو ہم نے دیگر الفاظ کی بابت ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ یہ س. الفاظ اپنے مقام اور مختلف مورد استعمال کے لحاظ سے مختلف معنی دیتے ہیں اور ہر لفظ کا معنی اس مقام کی مناسبت سے ہ ہے جس میں اسے استعمال کیا جائے۔

روایات پر ایک نظر

حضرت آدمؑ کا قصہ، امام جعفر صادقؑ کی زبانی

کتاب تفسیر قمی میں مولف نے اپنے پدر بزرگوار کے حوالے سے ایک روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے راوی کا نام لیے بغیر کہا ہے کہ: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آدم علیہ السلام کی بہشت کے بارے میں پوچھا گیا کہ آیا وہ دنیا کی جنتوں میں سے تھی یا آخرت کی جنتوں میں سے؟

امام علیہ السلام نے جواب دیا کہ وہ دنیا کی جنتوں میں سے تھی اور اس میں سورج اور چاند طلوع کرتے تھے، اگر وہ آخرت کی جنتوں میں سے ہوتی تو آدم علیہ السلام ہرگز اس سے باہر نہ جاتے'

پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: جب خداوند عالم نے آدم علیہ السلام کو بہشت میں سکونت دی اور سوائے ایک درخت کے، باقی ہر چیز ان کے لیے مباح و جائز قرار دی کیونکہ وہ خدائی مخلوق تھے کہ جسے امر و نہی، طعام و لباس اور مکان اور ازدواجی زندگی وغیرہ کے بغیر بقا حاصل نہیں ہوسکتی اور وہ خدا کی توفیق کے بغیر اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ کون سی چیز اس کے لیے مفید ہے اور کون سی نقصان دہ' (یہی وجہ ہے کہ وہ شیطان کی جھوٹی قسموں پر اعتماد کر کے دھوکہ میں آ گئے) تو شیطان ان کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ اگر تم اس ممنوعہ درخت سے پھل کھا لو کہ جس سے تمہیں خدا نے روکا ہے تو تم فرشتے بن جاؤ گے اور پھر ہمیشہ بہشت میں رہو گے' اور اگر تم نے اس سے پھل نہ کھایا تو خدا تمہیں اس بہشت سے نکال باہر کرے گا۔ شیطان نے ان کے سامنے قسم کھا کر کہا کہ میں تمہاری خیر خواہی کے لیے یہ کہہ رہا ہوں اور مجھے تمہاری بھلائی مطلوب ہے۔ چنانچہ خداوند عالم نے شیطان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نے ان (آدمؑ اور حواؑ) سے کہا:

سورہ اعراف، آیت ۲۰، ۲۱:

★ "مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾"۔

(شیطان نے ان سے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے صرف اس لیے روکا ہے کہ تم کہیں فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ کے لیے اس بہشت میں نہ رہو' شیطان نے ان کے سامنے قسم کھا کر کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں)۔

حضرت آدم علیہ السلام نے شیطان کی بات مان لی اور آدمؑ اور حواؑ دونوں نے اس درخت سے پھل کھایا اور پھر

وہی ہوا جس کا ذکر خداوند عالم نے ان الفاظ میں کیا: " فَبَدَتۡ لَهُمَا سَوۡءٰتُهُمَا " کہ ان کو اپنی شرمگاہیں نظر آنے لگیں اور ان کے وہ لباس اتر گئے جو خداوند عالم نے انہیں بہشت میں پہنائے تھے اور وہ اپنے جسموں کو درخت کے پتوں سے چھپانے لگے " وَنَادٰهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمۡ اَنۡهَكُمَا عَنۡ تِلۡكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلۡ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ " اور انہیں ان کے پروردگار نے پکار کر کہا کہ آیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا تھا اور تم سے نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، تب انہوں نے کہا " رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٚ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ " ۔اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم سخت نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ پھر خداوند عالم نے ان سے فرمایا: تم اس بہشت سے نیچے اتر جاؤ کہ تم میں سے بعض دوسرے بعض کے دشمن ہیں اور تمہارے لیے زمین میں رہنے اور زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مقررہ وقت تک جگہ ہے۔ (امامؑ نے فرمایا) مقررہ وقت سے مراد قیامت کا دن ہے، پھر امام علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کے بعد آدمؑ کوہ صفا پر اتر آئے اور اسی مناسبت سے اس پہاڑ کو کوہ صفا کا نام دیا گیا کیونکہ "صفی اللہ" اس پر اترے تھے، اور حواؑ کوہ مروہ پر اتریں اسی مناسبت سے اس پہاڑ کو "مروہ" کا نام دیا گیا کیونکہ وہ عورت تھیں اور عورت کو عربی زبان میں "مرئۃ" کہتے ہیں لہٰذا جس پہاڑ پر وہ اتریں اسے "مروہ" کے نام سے موسوم کیا گیا، اور حضرت آدم علیہ السلام چالیس دن تک سجدے میں رہے اور بہشت سے نکالے جانے پر روتے رہے، یہاں تک کہ حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے اور ان سے کہا کہ آیا خداوند عالم نے آپ کو اپنے دست قدرت سے پیدا نہیں کیا تھا اور اپنی روح آپ میں نہیں پھونکی تھی اور فرشتوں کو آپ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا؟ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: کیوں نہیں، بالکل ایسا ہی تھا جو تم نے کہا ہے! تو جبرئیلؑ نے کہا کہ جب خدا نے آپ کو درخت سے پھل کھانے سے روکا تھا تو آپ نے کیوں نافرمانی کی؟ آدمؑ نے جواب دیا کہ ابلیس نے میرے سامنے خدا کی جھوٹی قسم کھائی تھی جس کی وجہ سے میں نے اعتماد کر کے درخت سے پھل کھا لیا۔

اس روایت کے علاوہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے مذکور دیگر روایات میں بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی بہشت دنیا کی جنتوں میں سے تھی، تاہم یاد رہے کہ ان میں سے کئی روایتیں ایسی ہیں جن کے سلسلہ روایت میں ابراہیم بن ہاشم کا نام آتا ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ دنیا کی بہشت سے کیا مراد ہے؟ تو اس سلسلہ میں مذکورہ روایت کے بعض جملوں سے ظاہر ہو ہے کہ اس سے مراد برزخ والی بہشت ہے جو کہ بہشت خلد کے مقابل ذکر کی جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

"فهبط آدم علی الصفا" آدمؑ کوہ صفا پر اتر آئے۔ اور "ونزلت حوا علی المروۃ" ......حوا کوہ مروہ پر اتریں اور (امامؑ کا یہ فرمان کہ) "مَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ" اس میں لفظ "حین" سے مراد قیامت دن ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موت کے بعد برزخ میں رہنا دراصل زمین میں رہنا ہے۔ جیسا کہ بعث یعنی مرنے کے

بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے بیان میں وارد ہونے والی آیات میں برزخ میں رہنے کو زمین میں رہنے سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورہ ءمومنون، آیت ۱۱۴:

★ "قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾"۔

(خدا نے کہا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہم ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ وہاں رہے البتہ تو شمار کرنے والوں سے خود ہی پوچھ لے خدا نے فرمایا تم بہت ہی تھوڑی دیر وہاں رہے ہوا ے کاش تمہیں معلوم ہوتا)۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

سورہ ءروم، آیت ۵۶:

★ "وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾"۔

(جس دن قیامت بپا ہوگی تو مجرم (گنہگار لوگ) قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ لمحہ بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے وہ اسی طرح افترا پردازی کرتے رہتے تھے اور جن لوگوں کو علم وایمان عطا کیا گیا وہ کہیں گے کہ خدا کی کتاب کے مطابق تم لوگ قیامت کے دن تک ٹھہرے ہو اور یہی قیامت کا دن ہے مگر تم جانتے ہی نہیں تھے)۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ برزخ کی زندگی اسی زمین میں ہے اس کے علاوہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے ذکر کی گئی متعدد روایات میں اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ آدمؑ کی بہشت آسمان میں تھی اور وہ اپنی زوجہ کے ہمراہ آسمان ہی سے اترے تھے جو حضرات روایات کے لب ولہجہ سے مانوس اور ان کے اسلوب اظہار کی معرفت رکھتے ہیں وہ اس سلسلے میں کسی طرح کے تعجب کا شکار نہیں ہوں گے کہ مذکورہ بہشت آسمان میں تھی اور آدمؑ وحواؑ اسی سے زمین پر اترے جبکہ ان کی تخلیق زمین میں ہوئی اور انہوں نے زمین ہی میں زندگی بسر کی اور اسی طرح جن روایات میں ذکر ہوا ہے کہ وہ بہشت آسمان میں تھی وہاں یہ بھی ذکر ہوا ہے کہ سوال قبر بھی قبر ہی میں ہوگا اور قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا پھر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا! بہرحال اس سلسلہ میں مذکورہ اعتراض اور اس طرح کے دیگر اعتراضات اور شبہات وغلط فہمیاں اس وقت خود بخود دور ہو جائیں گی جب ہم عنقریب ''آسمان'' کی بابت تفصیلی بحث کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

ابلیس کی آدم تک رسائی کا مسئلہ

اس مقام پر ایک سوال یہ ہے کہ ابلیس کس طرح آدمؑ وحواؑ تک پہنچا اور اس مقصد کے لیے اس نے کون۔ طریقہ اختیار کیا؟ تو اس سلسلے میں اگرچہ صحیح اور معتبر روایات میں کوئی خاص بات مذکور نہیں البتہ بعض روایات میں ہے کہ سانپ اور مور نے ابلیس کی آدمؑ اور حواؑ کو دھوکہ دینے میں مدد کی لیکن وہ روایتیں معتبر نہیں اس لیے ہم نے ان کے ذکر سے اجتناب کیا ہے اور شاید وہ روایتیں جعلی ہوں کیونکہ یہ ساری کہانی تورات سے لی گئی ہے ہم ذیل میں تورات کی اصل عبارت ذکر کرتے ہیں تا کہ قارئین کرام کو اس واقعہ کی اصل حقیقت معلوم ہو سکے' ملاحظہ ہو:

تورات کی دوسری فصل کے پہلے سفر یعنی سفر خلقت میں یوں مذکور ہے: خداوند عالم نے آدمؑ کو زمین کی خاک سے پیدا کیا اور اس کی ناک میں زندگی کی روح پھونکی جس سے وہ نفس ناطقہ (بولنے والے) ہو گئے' اور خداوند عالم نے عدن کے مشرق میں جنتیں بوئیں اور آدم کو جسے خدا نے پیدا کیا تھا اسے وہاں لے گیا اور خدا نے زمین سے ہر طرح کا درخت اگا اور ان درختوں کو نہایت خوبصورت اور دلکش بنایا اور ان کے پھلوں کو پاکیزہ کر دیا اور زندگی کے درخت کو ان جنتوں .. باغوں..... کے درمیان میں قرار دیا اور اسی طرح خیر وشر کی معرفت کے درخت کو بھی، اور عدن سے ایک نہر نکالی تا کہ ان باغوں کی آبیاری کرے' اور اس نہر کو چار حصوں میں تقسیم کیا' ایک حصہ کا نام نیل ہے اور وہ ذویلہ نامی شہر کے پورے علاقہ کو گھیرے ہوئے ہے، ذویلہ وہ شہر ہے جس میں سونے کے معادن ہیں اور اس کا سونا عمدہ اور نہایت قیمتی ہے ،اسی طرح اس شہر کے لؤلؤ اور سنگ مرمر بھی عمدہ ہیں۔' دوسری نہر کا نام ''جیحون'' ہے اور وہ شہر ''حبشہ'' کے پورے علاقے کو گھیرے ہوئے ہے۔' تیسری نہر کا نام ''دجلہ'' ہے جو موصل کے مشرق میں بہتی ہے اور چوتھی نہر کا نام '' فرات'' ہے۔' پھر خداوند عالم نے آدمؑ کو عدن کے باغوں میں قیام کروایا تا کہ وہ کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہو سکیں اور انہیں تحفظ حاصل ہو' خدا نے آدمؑ کو دستور دیا کہ ان تمام باغوں کے پھل آپ کھا سکتے ہیں اور یہ سب آپ کے لیے مباح اور حلال ہیں لیکن خیر وشر کی معرفت کے درخت سے ہرگز پھل نہ کھائیں ورنہ جس دن اس درخت کا پھل کھالیں گے اسی دن موت کے مستحق قرار پائیں گے' اس کے بعد خداوند عالم نے کہا کہ آدمؑ کا تنہا رہنا بہتر نہیں لہٰذا اس کا کوئی مددگار بنا دوں جو اس کے ساتھ رہے' چنانچہ خداوند عالم نے زمین سے تمام جنگلی جانوروں اور آسمان سے تمام پرندوں کو آدمؑ کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان کے لیے جو نام مناسب سمجھے قرار دے'۔ پس آدم علیہ السلام نے ان میں سے جس جاندار کے لیے جو نام تجویز کیا وہی نام آج تک اس کے لیے باقی ہے' پھر آدمؑ نے تمام چوپایوں' پرندوں اور صحرائی جانوروں کے نام لیے مگر کسی کو اپنا مددگار نہ پایا کہ جو اس کے ساتھ رہ سکے۔ اس کے بعد خدا نے آدمؑ پر اونگھ مسلط کر دی تا کہ وہ کچھ بھی محسوس نہ کریں چنانچہ وہ سو گئے'۔ خدا نے ان کی ایک پسلی کو نکال کر اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور جس پسلی کو نکالا تھا اس سے ایک عورت کو بنایا اور اسے آدمؑ کے پاس لے آیا تو آدمؑ نے کہا کہ اب میں نے اپنی ایک ہڈی اور اپنے گوشت کا ایک ٹکڑا دیکھا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ اس کا نام ''امرأۃ'' (عورت) رکھ

دیا جائے کیونکہ اسے مجھ سے ہی لیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر اپنی بیوی کے ساتھ ہو لیتا ہے اور وہ دونوں ایک جان ہو جاتے ہیں۔'اس دن آدمؑ اور ان کی زوجہ دونوں عریان و بے لباس تھے اور انہیں اپنے عریان ہونے کی کوئی پرواہ تک نہ تھی۔

تیسری فصل: اس دن سانپ تمام صحرائی جانوروں میں سے زیادہ سمجھدار نکلا' اس نے عورت سے کہا: آیا تمہیں یقین ہے کہ خدا نے تم دونوں کو اس باغ کے تمام درختوں کے پھل کھانے سے روکا ہے؟ عورت نے سانپ کو جواب دیا کہ ہم اس باغ کے تمام درختوں سے پھل کھا سکتے ہیں لیکن صرف وہ درخت جو باغ کے درمیان میں ہے خدا نے فرمایا کہ اس سے پھل نہ کھاؤ بلکہ اس کے قریب ہی نہ جاؤ تا کہ موت سے بچ سکو' سانپ نے ان دونوں سے کہا کہ تم ہرگز نہیں مرو گے' خدا جانتا ہے کہ تم نے جس دن اس درخت سے پھل کھایا تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور فرشتوں سے بھی زیادہ خیر و شر سے آگاہ ہو جاؤ گے' جب عورت نے دیکھا کہ وہ درخت نہایت خوبصورت و دلکش اور نہایت عمدہ پھل والا ہے تو اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا اور اس نے اس کا پھل توڑ کر کھا لیا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اس نے بھی اس کے ساتھ مل کر کھایا' پھل کھاتے ہی ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے جان لیا کہ وہ عریان و بے لباس ہیں چنانچہ انہوں نے فوراً انجیر کے پتوں سے تہبند بنائی اور اپنے آپ کو اس سے ڈھانپ لیا' پھر انہوں نے خدا کی آواز سنی جو کہ صبح کے وقت باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا' آدمؑ اور ان کی زوجہ خدا کی آواز سننے سے پہلے ہی باغ کے درختوں کے درمیان چھپ گئے تھے' پس خدا نے آدمؑ کو آواز دی اور اسے اپنا بھرپور احساس دلا کر کہا: تو کہاں ہے؟ آدمؑ نے جواب دیا: میں نے باغ میں تیری آواز سن لی ہے لیکن چونکہ میں ننگا تھا اس لیے میں نے اپنے آپ کو چھپا لیا ہے' خداوند عالم نے پوچھا: تجھے کس نے بتایا ہے کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت سے پھل تو نہیں کھا لیا جس سے میں نے تجھے روکا تھا؟ آدمؑ نے جواب دیا کہ وہ عورت جسے تو نے میرا ساتھی قرار دیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا تو میں نے کھا لیا' خدا نے عورت سے کہا: تو نے یہ کیا کیا ہے؟ عورت نے جواب دیا: مجھے سانپ نے دھوکہ دیا اور میں نے اس کے دھوکہ میں آ کر وہ پھل کھا لیا' خدا نے سانپ سے کہا: چونکہ تو نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے لہٰذا اب تمام حیوانوں اور صحرائی وحشی جانوروں میں سے تو میری لعنت کا سزاوار ٹھہرا اور اب تو ہمیشہ اپنے سینے کے سہارے زمین پر چلے گا اور زندگی بھر مٹی ہی کھائے گا اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت و دشمنی قرار دیتا ہوں اس کی نسل تیرا سر کچلے گی اور تو پیچھے سے اسے ڈسے گا' پھر خدا نے عورت سے کہا کہ میں تیری مشقت اور تیرا بوجھ زیادہ کر دوں گا جس کی وجہ سے تو مشقت کے ساتھ بچے جنے گی اور میں تیری زندگی کی باگ ڈور تیرے شوہر کے ہاتھوں میں دوں گا تا کہ وہ ہمیشہ تجھ پر مسلط رہے۔ اور خدا نے آدمؑ سے فرمایا کہ چونکہ تو نے اپنی بیوی کی باتوں میں آ کر اس درخت سے پھل کھایا ہے جس سے میں نے تجھے روکا تھا اور کہا تھا کہ ہرگز اس سے پھل نہ کھانا کیونکہ اس پر میری لعنت برستی ہے لہٰذا اب مشقت و تکلیف کا سامنا کرو گے اور زندگی بھر اسی سے کھاؤ گے اور وہ زمین تیرے لیے کانٹے ہی کانٹے اگائے گی اور تو صحرا کی گھاس پھوس کھائے گا اور منہ کے ذریعے غذا کھائے گا اور تیری یہ حالت اس وقت تک رہے گی جب تک کہ تو اس زمین

میں واپس نہ چلا جائے جس سے تجھے بنایا گیا ہے کیونکہ تو اصل میں مٹی ہی ہے اور تیری بازگشت بھی مٹی کی طرف ہوگی' آدمؑ نے اپنی زوجہ کا نام 'حوا' اس لیے رکھا کہ وہ ہر صاحب حیات انسان کی ماں تھی' خدا نے آدمؑ اور ان کی زوجہ کے لیے لباس پیدا کیا اور انہیں پہنایا تاکہ وہ اپنا بدن ڈھانپ سکیں' پھر خداوند عالم نے کہا: اب یہ آدمؑ ہماری طرح ہی خیر و شر کی معرفت رکھتا ہے لہٰذا اب ضروری ہے کہ وہ ان باغوں سے باہر آ جائے تاکہ پھر کہیں زندگی کے درخت کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے اور اس سے پھل نہ کھا لے ورنہ ہمیشہ زندہ رہے گا' پس خدا نے اسے عدن کے باغات سے نکال باہر کیا تاکہ وہ زمین کہ جس سے اسے پیدا کیا گیا ہے اس کی وجہ سے آباد ہو سکے' اور جب آدمؑ کو وہاں سے نکال دیا گیا تو خدا نے فرشتوں کو عدن کے باغوں کے مشرق میں جگہ دی اور ایک چمکتی ہوئی تلوار رکھ دی تاکہ فرشتے شجر حیات کے راستے کی حفاظت و نگرانی کر سکیں۔

یہ تھی ۱۸۱۱ عیسوی میں عربی زبان میں چھپی ہوئی تورات کی تیسری فصل۔

اب آپ خود اس واقعہ کا دونوں حوالوں سے جائزہ لیں یعنی قرآن اور تورات دونوں کے بیانات کو مدنظر رکھ کر اس واقعہ کو تحقیقی نگاہ سے دیکھیں اور پھر ان روایات پر بھی غور کریں جو اس واقعہ کی بابت شیعہ و سنی علماء نے اپنی معتبر کتب میں ذکر کی ہیں تو آپ کے سامنے اس کے تمام حقائق کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ اور ہم نے اس کتاب میں اس طرح کا تفصیلی جائزہ لینے سے اس لیے اجتناب کیا ہے کہ ہماری اس کتاب کا موضوع اس سے مختلف ہے۔ ہماری یہ کتاب صرف قرآن کی تفسیر کے لیے ہے نہ کہ تاریخی واقعات کی تحقیق و جائزہ کے لیے!

ابلیس کیونکر بہشت میں پہنچا؟

زیر بحث واقعہ میں ایک اہم نکتہ غور طلب یہ ہے کہ ابلیس کیونکر بہشت میں داخل ہوا اور وہاں آ کر اس نے آدمؑ کو دھوکہ دیا؟ جبکہ بہشت خدا کے قرب کا مقام اور نہایت پاک و پاکیزہ جگہ ہے اور خدا نے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

سورہ طور، آیت ۲۳:

"لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ"

(اس میں لغو و بیہودہ کاموں اور گناہ کی کوئی گنجائش نہیں)

اس کے علاوہ یہ کہ بہشت آسمان میں ہے اور جب ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو خدا نے اسے آسمان سے نکال باہر کیا اور اس سے فرمایا تھا:

سورہ حجر، آیت ۳۴:

"فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ"

(تو بہشت سے نکل جا کہ تو راندۂ درگاہ ہے)

اور ارشاد فرمایا:

سورہ اعراف، آیت ۱۳:

"فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا"

(تو یہاں سے اتر جا کہ یہاں تیرے لیے تکبر کی کوئی گنجائش نہیں)

ان آیتوں کے تناظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس کیونکر بہشت میں دوبارہ داخل ہوا اور وہاں آ کر آدمؑ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا؟

پہلی آیت: "بہشت میں لغو اور گناہ کی کوئی گنجائش نہیں" تو اس کی بابت توضیحی جواب یہ ہے (جیسا کہ بعض دیگر علماء نے بھی بیان کیا ہے) کہ قرآن نے بہشت میں لغو اور گناہ کی نفی کی ہے تو اس بہشت سے مراد وہ "جنت الخلد" ہے جس میں قیامت کے دن مومنین داخل ہوں گے اور وہ "جنت برزخ" ہے کہ جس میں مومنین مرنے اور اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد داخل ہوں گے، لیکن وہ بہشت کہ جس میں آدمؑ اور ان کی زوجہ کو داخل کیا گیا تھا اور یہ اس وقت کی بات ہے کہ ابھی انسان پر اس دنیا میں خداوند عالم کے اوامر ونواہی اور احکامات الٰہیہ عائد نہیں کئے گئے تھے قرآن نے اس "جنت" کے متعلق کچھ بھی بیان نہیں کیا، بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ وہ جگہ جسے قرآن نے "جنت" کے نام سے یاد کیا ہے اس میں لغو اور گناہ ممکن تھا اس کی دلیل وثبوت کے لیے یہی کافی ہے کہ خود قرآن نے اس میں آدمؑ کے عصیان کو بیان کیا ہے اس کے علاوہ یہ کہ لغو اور گناہ ان امور میں سے ہیں جو امر ونہی کی نسبت سے وقوع پذیر ہوتے ہیں لہٰذا ان کا وجود میں آنا انسان کے دنیا میں آنے اور اس پر خدا کی طرف سے اوامر ونواہی کے عائد کئے جانے پر موقوف ہے۔

دوسری بات یہ کہ وہ بہشت آسمان میں ہے تو اس کا جواب تین طرح سے دیا جا سکتا ہے:

(۱) یہ امر قابل قبول نہیں کہ آیت کے الفاظ "فَاخْرُجْ مِنْهَا" اور "فَاهْبِطْ مِنْهَا" میں ضمیر "ها" کی بازگشت "سماء" کی طرف ہے (یعنی آیت سے ہرگز یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ ضمیر "ها" سے مراد "سماء" ہو اور یہ معنی کیا جائے کہ خدا نے شیطان کو حکم دیا کہ آسمان سے نکل جا، آسمان سے نیچے اتر جا) کیونکہ اس سے پہلے "سماء" .. آسمان کا کوئی ذکر نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی بابت ذہن میں موجود کوئی سابق اشارہ ملتا ہے، لہٰذا کسی مخصوص حوالہ کی بنیاد پر مجازاً صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے درمیان سے نکل جانا اور ان سے ھبوط کرنا ہے، یا پھر یہ کہ اس سے مراد مقام و مرتبت اور بزرگی وکرامت کے دائرہ سے نکلنا اور ھبوط کرنا ہے۔

(۲) ممکن ہے "نکل جانے" اور ہبوط (نیچے اترنے) کا حکم ایک لطیف اشارہ (کنایہ) ہو فرشتوں کے درمیان بہشت میں قیام کرنے کی ممانعت کا، نہ کہ وہاں آنے اور عبور کرنے اور گزر جانے کی ممانعت کا حکم، چنانچہ ان آیات میں بھی اس امر کی بابت اشارہ بلکہ صریح شہادت ملتی ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ ابلیس، آسمان میں آ کر کان لگا کر باتیں سنا کرتا تھا، اور روایات میں بھی مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے تک شیاطین ساتویں آسمان تک آیا جایا کرتے تھے لیکن جب عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو شیاطین کو چوتھے آسمان سے اوپر جانے سے روک دیا گیا اور جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تو شیاطین کو تمام آسمانوں سے روک دیا گیا اور وہ جوں ہی آسمانوں کی طرف بڑھتے ان پر چنگاریاں پڑتی تھیں۔

(۴) کلام الٰہی میں ابلیس کے بہشت میں داخل ہونے کا ذکر ہی نہیں ہوا لہٰذا اس سلسلے میں کسی قسم کے سوال یا اعتراض کی گنجائش ہی موجود نہیں' اور اس کی بابت جو کچھ بیان ہوا ہے وہ صرف بعض روایات میں مذکور ہے اور چونکہ وہ روایات قبولیت کے علمی معیار پر پوری نہیں اترتیں یعنی ''اخبار آحاد'' ہیں جو کہ تواتر کی مطلوبہ حد تک نہیں پہنچی ہیں لہٰذا ان کی بنیاد پر کوئی نظریہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ روایات راوی کی طرف سے نقل بالمعنی کے طور پر وارد ہوئی ہوں یعنی راویوں نے حضور نبیؐ اکرم یا آئمہ علیہم السلام سے مطالب سن کر انہیں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو' اس لیے ان روایات کو حجت یا سند کا درجہ نہیں دیا جاسکتا کیونکہ عین ممکن ہے کہ راوی نے اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر دیا ہو۔

البتہ پورے قرآن میں صرف ایک آیت ایسی ملتی ہے جس سے ابلیس کے بہشت میں داخل ہونے کا اشارہ ملتا ہے اور وہ یہ ہے:

سورہ اعراف، آیت ۱۹:

★ ''وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ''۔

(ابلیس نے ان دونوں (آدمؑ اور حواؑ) سے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت کے قریب جانے سے نہیں روکا مگر اس لیے کہ تم کہیں فرشتے نہ بن جاؤ یا تم ہمیشہ کے لیے بہشت میں رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ)۔

اس آیت میں لفظ ''هٰذِهِ الشَّجَرَةِ'' استعمال کیا گیا ہے یعنی ''اس درخت''، تو چونکہ ''ھذہ'' نزدیک چیز کی طرف اشارہ کے لیے استعمال ہوتا ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس درخت کے قریب تھا (اور اس نے آدمؑ وحواؑ سے درخت کی طرف اشارہ کر کے بات کی)۔

لیکن اس آیت کو ابلیس کے بہشت میں داخل ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اگر اس آیت میں ''ھذہ'' کے لفظ کو مکانی قرب ونزدیکی کے لیے استعمال کیا جائے اور کہا جائے کہ اس سے ابلیس کے درخت کے پاس موجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے تو اس سے پہلی آیت (یعنی آیت ۱۸) میں بھی ''ھذہ'' کے لفظ کو مکانی قرب میں استعمال کرنا پڑے گا جو کہ ہرگز درست نہیں' ملاحظہ ہو:

سورہ اعراف، آیت ۱۹:

★ ''وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ''

(خدا نے فرمایا) اور تم اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے)۔

اس آیت میں بھی اگر ''ھذہ'' سے مکانی قرب مراد لیا جائے تو خداوند عالم کا بھی بہشت میں درخت کے پاس

کھڑنا ہونا تسلیم کرنا پڑے گا جو کہ ہرگز ممکن نہیں' لہٰذا آیت ۱۹ کو ابلیس کے بہشت میں داخل ہونے کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ممنوعہ درخت کے بارے میں ایک روایت

کتاب ''عیون اخبار الرضا ؑ'' میں عبدالسلام ہروی سے روایت کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت اقدس میں عرض کی: اے فرزند رسولؐ! مجھے اس درخت کے بارے میں بتائیں جس سے آدم ؑ اور حوا ؑ نے پھل کھایا تھا وہ کونسا یا کس چیز کا درخت تھا؟ کیونکہ اس کے بارے میں مختلف آراء پیش کی جاتی ہیں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ گندم کا درخت تھا' بعض روایات میں ہے کہ وہ ''درخت حسد'' تھا؟

حضرت امام رضا علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ دونوں باتیں صحیح ہیں' میں نے عرض کی کہ دونوں بیانات کیونکر درست قرار پا سکتے ہیں جبکہ دونوں میں الگ الگ چیزیں ذکر کی گئی ہیں؟ امام ؑ نے جواب میں فرمایا: اے ابوصلت! بہشت کا درخت کئی خصوصیات کا حامل ہو سکتا ہے' وہ گندم کا درخت تھا اور اس میں انگور بھی تھے' کیونکہ وہ دنیا کے درختوں کی طرح نہیں ہے' اور جب خداوند عالم نے آدم ؑ کو عزت بخشی اور انہیں فرشتوں پر برتری عطا فرماتے ہوئے فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور آدم علیہ السلام کو بہشت میں داخل کیا تو اس وقت آدم ؑ نے اپنے آپ سے کہا کہ آیا کوئی ایسا بشر ہے جسے خدا نے مجھ سے بھی افضل و برتر پیدا کیا ہو؟ خداوند عالم نے آدم ؑ کے دل میں پیدا ہونے والے احساس کو جان لیا اور اس سے فرمایا کہ اے آدم! اپنا سر اٹھاؤ اور عرش کی طرف دیکھو' اس وقت آدم علیہ السلام نے سر اٹھا کر عرش کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ عرش پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

★ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی بن ابی طالب امیر المومنین و زوجتہ فاطمہ سیدۃ نساء العالمین و الحسن و الحسین سیدا شباب اهل الجنۃ''۔

(کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے' محمد اللہ کے رسول ہیں' علی ابن ابی طالب امیر المومنین ہیں اور ان کی زوجہ فاطمہ ؑ عالمین کی خواتین کی سردار ہیں اور حسن ؑ و حسین ؑ جوانان جنت کے سردار ہیں)۔

آدم ؑ نے پوچھا: پروردگارا یہ حضرات کون ہیں؟ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: اے آدم ؑ! یہ تیری ہی ذریت و نسل سے ہیں' یہ تجھ سے اور میری تمام مخلوق سے بہتر ہیں' اگر یہ نہ ہوتے تو میں نہ تجھے پیدا کرتا' نہ بہشت و دوزخ کو پیدا کرتا اور نہ ہی آسمان و زمین کو پیدا کرتا' خبردار! انہیں حسد کی نظر سے نہ دیکھنا ورنہ میں تجھے اپنے جوار و قرب سے محروم کر دوں گا' لیکن آدم ؑ نے ان کی طرف حسد کی نظر سے دیکھا اور ان کے مقام و منزلت کو پانے کی تمنا کی' پھر شیطان آدم ؑ پر مسلط ہوا اور آدم ؑ نے ممنوعہ درخت سے پھل کھا لیا' اور شیطان حوا ؑ پر بھی مسلط ہوا اور حوا ؑ نے بھی شیطان کے بہکاوے میں آ کر حضرت فاطمہ ؑ کی طرف حسد کی نظر سے دیکھا اور آدم ؑ کی طرح ممنوعہ درخت سے پھل کھانے کا ارتکاب کر لیا' جس کے نتیجے میں خداوند عالم

نے ان دونوں کو بہشت سے نکال باہر کیا اور اپنے جوار و ہمسا یگی سے محروم کر کے انہیں زمین پر اتار دیا۔

مذکورہ بالا مطالب کئی دیگر روایات میں بھی مذکور ہیں بلکہ بعض روایات میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ وا ق
بیان کیا گیا ہے اور بعض روایات میں اجمالی اور مختصر طور پر اس کا ذکر ہے۔

مذکورہ بالا روایت میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امام علیہ السلام نے اس امر کا ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر اظہار
ہے کہ وہ درخت' گندم کا درخت بھی تھا اور حسد کا درخت بھی' اور آدم ؑ وحوا ؑ نے گندم کے درخت سے پھل کھایا جس کے
میں حسد کرنے لگے اور محمدؐ وآل محمد علیہم السلام کے مقام و منزلت کو پانے کی تمنا' ان کے دلوں میں موجزن ہوگئی۔

پہلے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت اس قابل ہی نہ تھا کہ اہل بہشت اس کی طرف رغبت کرتے اور اس
پھل کھانے کی خواہش دل میں لاتے' اور دوسرے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ درخت اس قدر بلند مرتبہ کا حامل تھا کہ آدم
حوا ؑ اسے پا ہی نہیں سکتے تھے جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے کہ وہ درخت علم محمدؐ وآل محمد ؐ علیہم السلام کا درخت تھا۔

بہر حال اگرچہ گندم اور حسد کے دو مختلف معانی ہیں لیکن اگر میثاق کے سلسلے میں ذکر کئے گئے مطالب کو ملحوظ ر
جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس مقام پر درخت کے حوالہ سے دونوں کا معنی و مطلب ایک ہے۔ اور وہ یوں کہ آدم علیہ السلا
نے چاہا کہ دونوں چیزوں سے بہ یک وقت لطف اندوز ہوں' یعنی بہشت سے بھی لطف اندوز ہوں جو کہ خدا کے قرب کی
ہے اور اسی جگہ یہ عہد و میثاق ہوا کہ وہ خدا کے سوا کسی کی طرف مائل نہ ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ اس ممنوعہ درخت
پھل کھا کر بھی لطف اندوز ہوں جو دنیا سے تعلق قائم ہونے کے مشقت بار آثار کا باعث ہے' لیکن آدم ؑ ایسا کرنے
کامیاب نہ ہو سکے اور زمین پر اتر آئے اور میثاق کو فراموش کر بیٹھے لہٰذا دونوں چیزیں (یعنی درخت سے لطف اندوز ہونا
پیغمبر اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آل محمد علیہم السلام کا مقام و مرتبہ) انہیں حاصل نہ ہو سکیں' ہاں آخر خداوند عالم
اپنی نگاہ انتخاب کے ذریعے ان کی ہدایت کی اور توبہ کے ذریعے ان کے دل میں دنیا کی محبت کا چراغ گل کر دیا' اور انہیں
میثاق کی منزل تک پہنچا دیا جسے وہ بھول چکے تھے' (غور فرمائیں)۔

اور امام علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی کہ آدم ؑ نے ان ہستیوں کو حسد کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے مقام و منزلت کی
کی' تو اس حسد سے مراد ان کے مقام و منزلت کو پانے کی آرزو کرنا ہے جسے اردو میں رشک کرنا کہتے ہیں نہ کہ وہ حسد جو
صفات اور مذموم عادات میں سے ایک ہے۔

اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب کمال الدین اور کتاب تفسیر العیاشی میں جو دو روایتیں ذکر کی
ہیں ان کے درمیان کوئی منافات و تضاد موجود نہیں' ذیل میں ہم ان دونوں روایتوں کو ذکر کرتے ہیں:

۱۔ کتاب کمال الدین میں ابوحمزہ ثمالی نے روایت کی کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: (ان اللہ عز و ج
عهد الى آدم ان لا يقرب الشجرة. فلما بلغ الوقت الذى فى علم الله ان ياكل منها ن
فاكل منها و ذلك قول الله عز و جل : ولقد عهدنا الى آدم فنسى ولم نجد له عزما)۔۔۔

طٰہٰ آیت ۱۱۵۔

(خداوند عالم نے آدم علیہ السلام سے عہد لیا کہ وہ اس درخت کے پاس نہ جائیں گے اور جب وہ وقت آپہنچا جس کا خدا کو علم تھا کہ اس وقت آدمؑ اس درخت سے پھل کھائیں گے تو آدمؑ اس عہد کو بھول گئے جو خدا سے کر چکے تھے اور اس درخت سے پھل کھالیا' اس سلسلے میں خدا نے ارشاد فرمایا: "وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" (ہم نے آدم سے عہد لیا پھر وہ اس عہد کو بھول گئے اور ہم نے انہیں پختہ ارادے والا نہیں پایا)

۲۔ تفسیر العیاشی میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ میں سے کسی ایک امامؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ سے پوچھا گیا: (كيف اخذ الله آدم بالنسيان ؟ فقال: انه لم ينس و كيف ينسىٰ وهو يذكره و يقول له ابليس : ما نهيكما ربكما عن هذه الشجرة الا ان تكونا ملكين او تكونا من الخالدين)

(خداوند عالم نے نسیان اور بھول جانے پر آدمؑ کا مواخذہ کیوں کیا...... جبکہ بھول جانے والا معذور ہوتا ہے؟...... امام علیہ السلام نے جواب دیا کہ آدمؑ بھولے نہیں تھے اور یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھول گئے جبکہ ابلیس نے انہیں یہ بات یاد دلائی کہ خدا نے تمہیں اس درخت سے اس لیے روکا ہے کہ تم دونوں ہمیشہ کے لیے یہاں نہ رہ جاؤ یا تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ)۔

ان دونوں روایتوں کو سابقہ بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی (ان میں سے ایک، دوسری کی نفی نہیں کرتی) کیونکہ اس بیان میں کہا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام دونوں چیزیں حاصل کرنا چاہتے تھے مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے' لہٰذا کمال الدین اور تفسیر العیاشی میں ذکر کی گئی روایتوں کے مطالب کے درمیان کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

مفکرین و دانشوروں کا امام رضاؑ سے مناظرہ

کتاب امالی میں شیخ صدوقؒ نے ابو صلت ہروی سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ جب مامون رشید عباسی نے اسلامی مفکرین و دانشوروں' یہودی علماء' نصاریٰ' مجوس' صابئین اور دیگر مذاہب کے پیروکار ارباب دانش کو امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے ساتھ مناظرہ اور علمی بحث کے لیے اکٹھا کیا تو ان میں سے جس نے بھی امام علیہ السلام سے بحث کی اس نے منہ کی کھائی اور امامؑ کے دلائل کے سامنے لاجواب ہو گیا اور یوں لگتا تھا جیسے امامؑ نے اپنے مد مقابل کے منہ میں پتھر ڈال دیا ہے جس کی وجہ سے وہ بات ہی نہیں کر سکتا۔ اس اثناء میں علی ابن محمد بن جہم نے اٹھ کر امام علیہ السلام سے پوچھا: اے فرزند رسولؐ! کیا آپؑ انبیاءؑ کی عصمت کے قائل ہیں؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ہاں' ابن جہم نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو آپؑ خداوند عالم کے اس ارشاد گرامی کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جس میں اس نے فرمایا: "وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى"

(آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور گمراہ ہو گئے) یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا: اے علی ابن محمد بن جہم! تم افسوس ہے کہ تم نے ایسا کیا سوچ لیا ہے' خدا سے ڈرو اور انبیاءؑ الٰہی کی طرف بری نسبت نہ دو اور نہ ہی کتاب خدا کی تاویل اپنی رائے کے مطابق کرو کیونکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: "وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" کتاب الٰہی کی تاویل (اور حقیقی معنے) خداوند عالم اور راسخون فی العلم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا' اور یہ جو تم نے خدا کے ارشاد کے بارے میں پوچھا ہے کہ "وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ" (آدم نے اپنے پروردگار کی معصیت کی اور گمراہ گئے) تو اصل بات یہ ہے کہ خداوند عالم نے آدم کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ زمین میں اس کی حجت اور اس کا خلیفہ و جانشین ہو نہ اس لیے کہ وہ بہشت میں رہیں' اور آدم کی معصیت و نافرمانی بہشت میں واقع ہوئی نہ کہ زمین میں' اور یہ سب کچھ خدا تقدیر کے تقاضوں کی تکمیل کے طور پر ہوا' چنانچہ جوں ہی خدا نے انہیں زمین پر اتارا اور اپنی حجت و خلیفہ قرار دیا تو وہ مقام عصمت پر بھی فائز ہو گئے جیسا کہ خدا نے ان کی عصمت کی بابت ارشاد فرمایا:

سورہ آل عمران، آیت ۳۳:

★ "إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ"

(خدا نے آدم' نوح' آل ابراہیم و آل عمران کو تمام عالمین پر چن لیا)

اس روایت میں امام علیہ السلام کا یہ فرمان کہ "آدم کی معصیت و نافرمانی بہشت میں واقع ہوئی۔ اس امر کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے جس کا تذکرہ ہم نے پہلے کیا تھا اور وہ یہ کہ ممنوعہ درخت سے پھل نہ کھانے کا حکم "مولا کے فرمان" کے طور پر نہ تھا بلکہ رہنمائی و نصیحت کے طور پر تھا کیونکہ ابھی بہشت میں شرعی و دینی احکام وضع ہی نہیں کئے گئے تھے اور "مولا کے فرمان" کے طور پر صادر ہونے والے احکام کا مورد و مقام وہ زمینی زندگی ہے جو خداوند عالم نے آدم علیہ السلام کے لیے زمین پر اترنے کے بعد مقرر فرمائی' لہٰذا جس حکم کی نافرمانی کی گئی وہ "رہنمائی اور نصیحت کے طور پر" جاری ہونے والے حکم کی خلاف ورزی تھی نہ کہ "مولا کے فرمان" کے طور پر صادر ہونے والے حکم کی نافرمانی' بنا برایں مذکورہ حدیث کی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور حدیث کی تاویل کے سلسلے میں بعض مفسرین کرام نے جو زحمت گوارا کی ہے وہ ایک غیر ضروری عمل ہے۔

مامون رشید کے دربار میں امام رضاؑ کے ارشادات

کتاب "عیون اخبار الرضاؑ" میں علی بن محمد بن جہم سے روایت کی گئی ہے اس نے کہا میں مامون رشید عباسی کے دربار میں آیا تو دیکھا کہ وہاں امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام موجود تھے' مامون نے آنجنابؑ سے پوچھا:

آیا آپؑ اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ انبیاءؑ معصوم تھے؟

امامؑ نے جواب دیا: کیوں نہیں' میں قائل ہوں کہ انبیاءؑ مقام عصمت پر فائز تھے۔

مامون نے پوچھا: تو پھر خداوند عالم کے اس فرمان کا کیا معنی ہے "وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ" کہ آدم نے ا

پروردگار کی نافرمانی کی اور گمراہ ہو گئے؟

امام علیہ السلام نے جواب دیا کہ خداوند عالم نے آدم سے ارشاد فرمایا: تم اور تمہاری زوجہ بہشت میں سکونت پذیر ہو اور اس میں سے جو چاہو سیر ہو کر کھاؤ لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا (خدا نے گندم کے درخت کی طرف اشارہ کیا جو اس بہشت میں تھا)۔ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے' خدا نے یہ تو نہیں فرمایا کہ اس قسم کے درخت کے نزدیک نہ جانا یا اس جنس کے درخت سے پھل نہ کھانا' اور آدمؑ نے بھی یہی سمجھا کہ شاید اس خاص درخت کے قریب نہیں جانا اور اس سے پھل نہیں کھانا ہے چنانچہ انہوں (آدم اور حوا) نے اس خاص و معین درخت سے پھل نہ کھایا بلکہ اس کے علاوہ ایک درخت سے کھایا اور وہ بھی شیطان کے وسوسے کے نتیجے میں، جو اس نے آدم کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ کیونکہ شیطان نے آدم اور حوا سے کہا کہ تمہیں تمہارے پروردگار نے اس...... خاص و معین...... درخت سے پھل کھانے سے نہیں روکا بلکہ اس نے تو کہا ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی درخت کے پاس نہ جانا اور یہ جو درخت سے پھل کھانے سے روکا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا یہ کہ بہشت میں ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور شیطان نے آدم اور حوا کے سامنے قسم کھا کر کہا کہ میں تمہاری خیر خواہی کے طور پر کہہ رہا ہوں' اور چونکہ آدم و حوا نے اس سے پہلے کسی کو جھوٹی قسم کھاتے ہوئے دیکھا ہی نہ تھا لہٰذا وہ شیطان کے دھوکہ میں آ گئے۔ ان کا ایسا کرنا دراصل خدا کی قسم پر اعتماد کے نتیجہ میں تھا' اور پھر یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب ابھی آدم علیہ السلام کو نبوت عطا نہیں کی گئی تھی اور یہ کوئی اتنا بڑا گناہ بھی نہ تھا جس سے وہ جہنم کے مستحق قرار پاتے بلکہ ایک معمولی سی غلطی تھی کہ جس پر خداوند عالم کسی کو سزا نہیں دیتا اور انبیاءؑ پر وحی آنے سے پہلے کے زمانے میں اس طرح کی غلطیوں کا سرزد ہونا ممکن اور قابل تصور ہے' یہی وجہ ہے کہ جب خداوند عالم نے آدم علیہ السلام کو نبوت کے لیے چنا تو وہ مقام عصمت پر فائز تھے اور معصوم کبیرہ گناہ کرتا ہے نہ صغیرہ' اسی لیے خداوند عالم نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا: "وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰی" (کہ آدم نے اپنے رب کا عصیان کیا اور بھٹک گئے، پھر خدا نے انہیں...... نبوت کے لیے...... چن لیا تو ان کی توبہ قبول کی اور انہیں ہدایت فرمائی)۔ اور پھر خدا نے یہ بھی فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِيْنَ" (کہ خدا نے اصطفیٰ کی منزل پر فائز کیا (چن لیا) آدم کو اور نوح کو اور آل ابرہیم کو اور آل عمران کو پوری کائنات پر)۔

حضرت شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ نے اس طویل حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ مجھے تعجب ہے کہ علی بن محمد بن جہم نے اس طرح کی حدیث کیونکر بیان کر دی ہے جبکہ وہ تو ناصبی اور اہل بیتؑ سے بغض و عناد رکھنے والا شخص تھا۔

شیخ صدوقؒ کو ابن جہم سے اس طرح کی روایت کا ذکر ہونا اس لیے تعجب آور تھا کہ اس حدیث میں انبیاءؑ کی تنزیہ اور ان کا گناہوں سے پاک ہونا مذکور ہے جبکہ اگر وہ اس حدیث میں اچھی طرح غور کرتے اور جو اصول و نظریات اس میں ملحوظ رکھے گئے ہیں ان کو تحقیقی نظر سے دیکھتے تو اس امر کی طرف متوجہ ہو جاتے کہ اس حدیث میں امام رضا علیہ السلام سے منسوب جو جواب ذکر کیا گیا ہے وہ مذہب اہل بیتؑ کے مسلمہ اصولوں سے متصادم ہے کیونکہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف

سے یہ بات نہایت واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں اور وہ کسی صغیرہ و کبیرہ گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے نہ ہی نبوت سے پہلے اور نہ نبوت کے بعد۔

اس کے علاوہ یہ کہ اس ناصبی اور دشمن اہل بیتؑ شخص نے جس طرح سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ آیت میں کچھ الفاظ حذف ہو چکے ہوں اور گویا یہ آیت ("مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا۔۔۔") کی بجائے اس طرح ہونی چاہیے تھی ("ما نہا کما ربکما عن ہذہ الشجرۃ وانما نہا کما عن غیرہا وما نہا کما عن غیرہا الا ان تکونا") یعنی خدا نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا بلکہ اس نے تمہیں اس کے علاوہ کسی اور درخت سے روکا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ یا بہشت میں ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ...... جبکہ یہ آیت شریفہ (یعنی "مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ") اور سورہ طہٰ کی آیت ۱۲۰ یعنی "قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۔۔۔" اس نے کہا اے آدم کیا میں تمہیں ایسا درخت بتاؤں جو خلد اور ہمیشگی والا ہے اور وہ ملکیت یا مملکت جو کبھی ختم نہ ہونے والی ہے۔۔۔ دونوں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ابلیس آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو اسی ممنوعہ خاص درخت سے پھل کھانے کی ترغیب دلا رہا تھا اور اس طرح انہیں بہشت میں ہمیشہ رہنے اور لازوال اقتدار کے حصول کا لالچ دے رہا تھا نہ یہ کہ اس کے علاوہ کسی اور درخت سے' اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس راوی یعنی علی بن محمد بن جہم نے اس روایت میں جو کہ اس نے پہلے ذکر کی ہے امام رضا علیہ السلام سے مامون رشید کے دربار میں اسی موضوع کی بابت مکمل اور صحیح جواب سن لیا تھا لہٰذا یہ روایت کہ جسے شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے مکمل طور پر صحیح قرار نہیں دی جا سکتی بلکہ اس پر اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس کی بعض شقیں قابل جواب ہیں لیکن مجموعی طور پر اس کی صحت کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔

شیخ صدوقؒ نے ایک اور روایت بھی ذکر فرمائی ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے آباء کرام کے حوالے سے حضرت علی علیہ السلام کی روایت کردہ حدیث میں بھی فرمایا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدم و حوا بہشت میں صرف سات گھنٹے (دنیاوی شب و روز کے اوقات کے مطابق) ٹھہرے۔ اور خداوند عالم نے انہیں اسی روز بہشت سے نکال کر زمین پر اتارا۔

بہشت میں حضرت آدمؑ کے قیام کی مدت

تفسیر العیاشی میں عبداللہ بن سنان سے روایت ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپؑ سے پوچھا گیا:

آدم اور حوا اپنی خطا کے سبب بہشت سے نکالے جانے تک کتنی دیر بہشت میں رہے؟

امام علیہ السلام نے جواب دیا: خداوند عالم نے جمعہ کے دن ظہر کے بعد آدم میں اپنی روح پھونکی پھر ان کی

پسلیوں سے ان کی زوجہ کو پیدا کیا پھر اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں اور پھر اسی روز انہیں اپنی بہشت میں داخل کیا' خدا کی قسم وہ اس دن چھ گھنٹوں سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہرے یہاں تک کہ خدا کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے اور پھر خدا نے ان دونوں کو جنت سے نکالا تو مغرب کا وقت تھا' اور وہ دونوں (آدم وحوا) بہشت کے باہر صبح نمودار ہونے تک بیٹھے رہے پھر وہ ننگے ہو گئے...... ان کی شرمگاہیں ان کے سامنے ظاہر ہو گئیں...... تو ان کے پروردگار نے انہیں ندا دی: آیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا تھا؟ اس وقت آدم نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور بارگاہ الٰہی میں اس طرح گویا ہوئے: اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور ہم اپنے گناہوں کا اقرار واعتراف کرتے ہیں پس ہمیں معاف فرما' خداوند عالم نے ان سے فرمایا: تم دونوں میرے آسمانوں سے زمین پر چلے جاؤ کہ میری بہشت میں اور نہ ہی میرے آسمانوں میں کوئی معصیت کار و نافرمان میری ہمسائیگی کا شرف نہیں پا سکتا۔

مذکورہ بالا روایت میں ذکر کئے گئے مطالب سے اس امر کا استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ آدم وحوا کیونکر بہشت سے نکلے اور یہ کہ وہ پہلے بہشت سے نکلے اور بہشت کے باہر ٹھہرے' پھر بہشت کے بیرونی علاقہ سے زمین پر اترے کیونکہ آیت شریفہ میں دو مرتبہ ''ھبوط'' اور زمین پر اترنے کا حکم ذکر کیا گیا ہے (آیت ۳۶ اور آیت ۳۸ ملاحظہ ہو) اور وہ حکم بھی تکوینی تھا (شرعی و تکلیفی نہیں تھا) جس کی خلاف ورزی ناممکن ہے (اس کی تاثیر یقینی اور تکمیل لازمی امر ہے) (تکوینی حکم کی مثال آسمانوں' زمین' چاند' ستارے' انسان' حیوان وغیرہ موجودات عالم کی تخلیق کا فیصلہ' اور شرعی و تکلیفی حکم کی مثال نماز و روزہ وغیرہ احکام کا جاری کرنا ہے) اس کے علاوہ کلام الٰہی میں اسلوب سخن کا مختلف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ''ھبوط'' کا حکم دوبار جاری ہوا ملاحظہ ہو: پہلی آیت میں یوں ہے۔

(''وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ... وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ '') اور پھر اس طرح اس میں تبدیلی ہوئی: (''وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا...... (سورہ اعراف، آیت ۲۲) پہلے جملے میں ''وقلنا'' ہے جو کہ جمع متکلم کا صیغہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ''اور ہم نے کہا'' اور دوسرے جملے میں ''وناد یھما'' ہے جو کہ واحد غائب کا صیغہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ''اور انہیں آواز دی'' تو پہلے جملے میں قول و کلام کرنے کا انداز اختیار کیا گیا جبکہ دوسرے جملے میں ندا اور پکارنے کا انداز ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پہلے جملے میں ''ھذہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ نزدیک کے اشارہ کے لیے مخصوص ہے اور دوسرے جملے میں '' تلکما'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ دور کے اشارہ کے لیے استعمال ہوتا ہے' (وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ) (أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ) ان تبدیلیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ھبوط'' کا حکم دو مرتبہ دیا گیا: ایک دفعہ اس وقت جب وہ بہشت کے اندر تھے اور ''ھبوط'' کے حکم کے بعد بہشت سے باہر کے علاقہ میں آ گئے اور دوسری مرتبہ جب وہ بہشت سے باہر تھے اور اس حکم کے بعد وہ زمین پر اتر آئے۔

یہ تھا آیت شریفہ کے الفاظ میں تبدیلی کے تناظر میں ''ھبوط'' کے حکم کا دو مرتبہ صادر ہونے کا ثبوت۔ اور اب روایت' تو اس میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ حوا کو آدم کی نچلی پسلیوں سے پیدا کیا گیا اور یہی بات تورات میں بھی مذکور ہے جبکہ

آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات اس کی تکذیب کرتی ہیں جیسا کہ آدم کی خلقت کی بحث میں ان روایات کو آپ ملاحظہ فرمائیں گے' تاہم ممکن ہے نچلی پسلیوں سے حوا کی تخلیق کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے یہ تاویل کی جائے کہ اس سے مراد نچلی پسلیاں نہیں بلکہ آدم کی بچی ہوئی وہ مٹی مراد ہے جس سے نچلی پسلیاں خلق کی گئیں' باقی رہی بہشت میں قیام کی مدت کی بات یعنی چھ گھنٹے یا سات گھنٹے تو اس سلسلے میں کوئی پیچیدگی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اندازتاً ایسا کہا گیا ہے۔

کلمات کے بارے میں ایک روایت

کتاب کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام میں سے ایک امامؑ کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ آنجنابؑ نے آیت شریفہ " فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ " کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ وہ کلمات یہ تھے:

★ " لا اله الا انت سبحانك اللهم وبحمدك عملت سوءاً وظلمت نفسي فاغفرلي وانت خير الغافرين. لا اله الا انت سبحانك اللهم وبحمدك عملت سوءاً وظلمت نفسي فارحمني وانت خير الغافرين. لا اله الا انت سبحانك اللهم و بحمدك عملت سوءاً وظلمت نفسي فارحمني وانت خير الراحمين. لا اله الا انت سبحانك اللهم وبحمدك عملت سوءاً وظلمت نفسي فاغفرلي وتب علّي انك انت التواب الرحيم "۔

(تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تیری ذات پاک ہے اے میرے پروردگار' میں تیری حمد بجالاتا ہوں' مجھ سے خطا ہوئی اور میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے' تو مجھے معاف فرما کہ تو ہی بہتر معاف کرنے والا ہے' تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تیری ذات پاک ہے، اے میرے پروردگار میں تیری حمد بجالاتا ہوں، مجھ سے خطا ہوئی ہے اور میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے' تو مجھ پر رحم فرما کہ تو ہی سب سے بہتر معاف کرنے والا ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک ہے، اے میرے پروردگار میں تیری حمد بجالاتا ہوں، مجھ سے خطا ہوئی ہے اور میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے پس تو مجھ پر رحم کر کہ تو ہی سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک ہے، اے میرے پروردگار میں تیری حمد بجالاتا ہوں، مجھ سے خطا سرزد ہوئی ہے اور میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے پس تو مجھے معاف کردے اور میری توبہ قبول کرلے کہ تو ہی سب سے بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

مذکورہ بالا مطالب شیخ صدوق" 'العیاشی" 'قمی" اور دیگر مفسرین ومحدثین کرام نے بھی ذکر فرمائے ہیں اور اہل سنت والجماعت کی کتابوں میں بھی اسی سے مشابہ روایات ذکر کی گئی ہیں' اور اس واقعہ (قصۂ آدم وحوا) سے تعلق رکھنے والی آیات

سے بھی اسی طرح کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

پنجتن پاکؑ کے واسطہ سے طلب مغفرت

کلینی مرحوم نے کتاب کافی میں فرمایا ہے کہ آیت شریفہ "فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ" کی تفسیر میں ایک روایت موجود ہے جس میں مذکور ہے کہ آدم علیہ السلام نے پنجتن پاکؑ حضرت محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ کا واسطہ دے کر طلب مغفرت کی۔

تبصرہ و تحقیق: یہ مطلب شیخ صدوق، العیاشی، "قمی" اور دوسرے بزرگ علماء نے بھی ذکر کیا ہے اور اس سے مشابہ روایات اہل سنت والجماعت کے محدثین و محققین نے بھی ذکر کی ہیں جیسا کہ تفسیر "درمنثور" میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جب آدم سے خطا سرزد ہوئی۔ جو بھی ہوئی۔ تو انہوں نے آسمان کی طرف منہ کر کے بارگاہ الٰہی میں عرض کی: پروردگارا میں تجھے محمدؐ کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ مجھے معاف فرما دے، خداوند عالم نے آدم کو وحی کی اور پوچھا کہ محمدؐ کون ہیں؟ آدم نے عرض کی: خدایا پاک ہے تیرا نام، جب تو نے مجھے پیدا کیا تو میں نے اپنا سر اٹھا کر عرش کی طرف دیکھا تو وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ "**لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ**" یہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ تیری بارگاہ میں اس سے برتر اور جلیل القدر شخصیت کوئی نہیں کیونکہ تو نے اس کا نام اپنے نام کے ساتھ قرار دیا ہے، تب خداوند عالم نے انہیں وحی کی کہ اے آدم! وہ شخصیت تیری اولاد سے ہیں اور آخری نبی ہیں، اگر وہ نہ ہوتے تو تمہیں بھی پیدا نہ کرتا۔

اگرچہ آیات کے ظاہری الفاظ سے ابتدائی طور پر مذکورہ بالا مطالب کی صحت بعید نظر آتی ہے لیکن اگر اچھی طرح ان میں غور کیا جائے اور ان کے معانی میں تدبر سے کام لیا جائے تو ممکن ہے ان مطالب کی صحت و درستی کا ثبوت مل جائے کیونکہ جملہ "فتلقی ادم"... (آدم نے سیکھے) میں ان کلمات کے روبرو حاصل کرنے اور قبول و استقبال کا معنیٰ پایا جاتا ہے (یعنی آدمؑ نے ان کلمات کو دیکھا اور یاد کر لیا) اور یہ جملہ اس امر کی دلیل بھی ہے کہ آدم علیہ السلام نے وہ کلمات اپنے پروردگار سے حاصل کئے اور ظاہر ہے کہ توبہ سے پہلے ان کلمات سے آگاہی حاصل کی جبکہ اس سے پہلے انہوں نے اپنے پروردگار سے تمام اسماء کا علم حاصل کر لیا تھا جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

★ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا..."

(میں زمین میں ایک خلیفہ بنا رہا ہوں، فرشتوں نے کہا آیا اسے بنا رہا ہے جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خوں ریزی کرے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں، خدا نے جواب دیا کہ میں اس چیز کو زیادہ بہتر جانتا ہوں جسے تم نہیں جانتے، اور آدم کو خدا نے سب کے سب نام پڑھا دیئے)۔

اس آیت کے الفاظ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام اسماء کے علم سے مرا
وہ علم ہے جس کی خصوصیت ہر طرح کے ظلم و معصیت کا قلع قمع کرنا ہے اور وہ ہر درد کی دوا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو فرشتوں کے
اعتراض کا مکمل جواب نہیں بنتا اور نہ ہی ان پر حجت پوری ہوتی ہے کیونکہ خداوند عالم نے فرشتوں کے اس اعتراض پر کہ "و
فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا" کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا کہ "خدا نے اسے سب نام پڑھ
دیئے ہیں" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علم میں تمام مفاسد کی اصلاح کی صلاحیت و خصوصیت پائی جاتی ہے' اور اسماء کی
حقیقت سے بھی آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ وہ ایسی بلند پایہ موجودات ہیں جو آسمانوں اور زمین کے پردوں میں پوشیدہ تھیں او
وہی خداوند عالم کے فیوضیات اور پوری کائنات کے درمیان واسطہ و وسیلہ تھیں' کوئی کمال چاہنے والا ان کی برکتوں کے بغی
کمال کی بلندیوں کو نہیں پا سکتا' چنانچہ بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اسماء کا علم حاصل کرنے
وقت اہل بیتؑ کی پاکیزہ صورتیں اور انوار مقدسہ دیکھے' اور اس کے علاوہ بعض دوسری روایات میں مذکور ہے کہ آدم علیہ السلا
نے اہل بیت علیہم السلام کے انوار مقدسہ کو اس وقت دیکھا جب خداوند عالم نے آدم کی
نسل کو ان کی پشت سے نکالا (وجود عطا کیا)۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آدم نے اہل بیتؑ کے انوار مقدسہ کو اس وقت
دیکھا جب وہ بہشت میں تھا' بہر حال آپ خود ان تمام روایات کو اچھی طرح پڑھیں اور ان پر غور کریں' خداوند عالم حقیقت
امر کی ہدایت کرنے والا ہے۔

بہر حال خداوند عالم نے "کلمات" کا مسئلہ واضح نہیں فرمایا بلکہ اسے پردۂ ابہام میں رکھ دیا' یہی وجہ ہے کہ "فَتَلَقّٰٓى
اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ" میں لفظ "کلمات" کو نکرہ کے انداز میں ذکر فرمایا تاہم قرآن مجید میں لفظ "کلمۃ" کا استعمال "موجو
عینی" (جاندار چیز / شخص) پر صراحت کے ساتھ ہوا ہے جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہء آل عمران، آیت ۴۵:

"بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ"

(اور اپنے کلمہ کے ساتھ، کہ جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے!)

اس آیت میں صراحت کے ساتھ لفظ "کلمة" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔

"کلمات" کی بابت بعض مفسرین کرام کا یہ بیان درست نہیں کہ ان سے مراد وہ کلمات ہیں جن کا ذکر خداوند عا
نے آدم و حوا کی زبانی سورہ اعراف آیت ۲۳ میں فرمایا ہے کہ ان دونوں نے کہا: "قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّ
تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ"۔ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اگر تو ہمیں معاف نہ
کرے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے)۔ کیونکہ اس سورہ یعنی بقرہ کی آیات
سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ توبہ زمین پر ھبوط اور اترنے کے بعد واقع ہوئی ہے نہ کہ اس سے پہلے!۔ آیات ملاحظہ ہوں

خدا نے ارشاد فرمایا: "وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" ... (پس ہم نے کہا کہ اتر جاؤ کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو)۔ پھر فرمایا۔ "فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ" (آدم نے اپنے پروردگار سے کلمات سیکھے پس خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی) تو وہ کلمات ھبوط اور زمین پر اترنے سے پہلے کے ہیں کہ جنہیں ان دونوں نے ورد زبان کیا جبکہ وہ اس وقت بہشت میں تھے جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے "وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ" (پس انہیں ان کے پروردگار نے آواز دی کہ آیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا تھا) اس کے بعد فرمایا: "قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا" انہوں نے کہا پروردگارا! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے......) پھر فرمایا "قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (خدا نے کہا تم زمین پر اتر جاؤ کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو) ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم وحوا نے اپنی غلطی کا اعتراف بہشت میں کیا نہ کہ زمین پر اترنے کے بعد' جبکہ کلمات کا سیکھنا زمین پر اترنے کے بعد تھا' بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان کا کہنا کہ "رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا" (پروردگارا، ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے) درحقیقت ان کی طرف سے انکساری اور خضوع کے طور پر تھا جو انہوں نے خدا کی ندا" آیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روکا تھا" پر کیا اور اس امر کے اظہار کے لیے تھا کہ ہم خدا کی ربوبیت کا اقرار اور اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ ہم سے جو خطا سرزد ہوئی ہے اس سے ہمیں نقصان اور خسارے کا شدید خطرہ لاحق ہے کہتے ہیں کہ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے وہ جس طرح چاہے انجام دے (وہی مالک و صاحب اختیار ہے)۔

حضرت موسیٰ اور حضرت آدم کی ملاقات

کتاب تفسیر قمی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ حضرت آدم علیہ السلام سے میری ملاقات کا انتظام کیا جائے' چنانچہ خداوند عالم نے موسیٰ علیہ السلام اور آدمؑ کی ملاقات کروائی' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدمؑ سے کہا: اے پدر بزرگوار! آیا خداوند عالم نے آپ کو اپنے دست قدرت سے خلق نہیں فرمایا اور آپ کے وجود میں اپنی روح نہیں پھونکی اور آپ کے سامنے فرشتوں کو سر بہ سجدہ ہونے کا حکم نہیں دیا اور جب آپ کو حکم دیا کہ اس درخت سے پھل نہ کھانا تو پھر آپ نے کیوں نافرمانی کی؟ حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا اے موسیٰ! مجھے یہ بتاؤ کہ تورات میں میری خطا کا واقعہ میری پیدائش سے کتنا عرصہ قبل ذکر کیا گیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تیس ہزار سال پہلے' حضرت آدم علیہ السلام نے کہا' بالکل درست ہے' یہ بیان کرنے کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: آدمؑ نے اپنی اسی بات سے موسیٰ علیہ السلام کو مطمئن کر لیا۔

مذکورہ بالا مطلب کو علامہ سیوطی نے تفسیر "در منثور" میں متعدد راویوں کے حوالے سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

آدم کی تخلیق، دنیا کے لئے ہوئی

کتاب علل الشرائع میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے، آپ ؑ نے ارشاد فرمایا:

(واللہ لقد خلق اللہ آدم للدنیا واسکنہ الجنۃ لیعصیہ فیردہ الی ما خلقہ لہ)

خدا کی قسم! خداوند عالم نے آدم علیہ السلام کو دنیا کے لیے پیدا کیا اور بہشت میں اس لیے قیام کروایا کہ وہ نافرمانی کا ارتکاب کرے گا جس کے نتیجے میں خدا اسے اس جگہ واپس لوٹا دے گا جس کے لیے اسے پیدا کیا تھا۔

مذکورہ بالا مطلب تفسیر العیاشی کی روایت میں بھی جو کہ ذکر ہو چکی ہے امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے مذکور ہے جس میں ایک فرشتہ کی آدم سے دوستی کا تذکرہ ہے۔

زمین پر سب سے باعظمت جگہ؟

کتاب الاحتجاج میں شام کے رہنے والے ایک شخص کے ساتھ حضرت علی ؑ کی بحث کے ضمن میں مذکور ہے کہ اس نے آنجناب ؑ سے پوچھا کہ روئے زمین پر سب سے باعظمت جگہ کون سی ہے؟ آپ نے جواب دیا وہ وادی کہ جسے ''سراندیب'' کہا جاتا ہے، حضرت آدم ؑ آسمان سے اسی میں اترے تھے۔

مذکورہ روایت کے مقابلے میں متعدد روایات ایسی موجود ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام سرزمین مکہ میں اترے، ان روایات میں سے بعض ذکر کی جا چکی ہیں؛ تاہم ان روایات میں مذکور مختلف مطالب کا حل اس طرح ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ وہ پہلے وادی ''سراندیب'' میں اترے پھر وہاں سے سرزمین مکہ میں ہبوط کیا اس طرح دو نزول فرض کر کے دونوں جگہوں میں اترنے کا نظریہ قائم کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پیغمبر اسلام ؐ کا ارشاد گرامی

کتاب ''درمنثور'' میں طبرانی کے حوالہ سے اور ابوالشیخ نے کتاب ''عظمت'' میں اور ابن مردویہ نے ابوذر غفاری ؓ کے حوالہ سے ذکر کیا کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ آیا آپ ؐ کی نظر میں حضرت آدم ؑ نبی تھے؟ آنحضرت ؐ نے جواب دیا: ہاں وہ نبی بھی تھے اور رسول بھی؛ خداوند عالم نے ان سے براہ راست بات بھی کی اور فرمایا: ''یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ''

مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل متعدد روایات مختلف راویوں کے حوالوں سے اہل سنت والجماعت نے بھی ذکر کی ہیں۔

آیات ۴۰ تا ۴۴

○ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ۚ وَ اِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾

○ وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ وَ لَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ ۪ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۫ وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۴۱﴾

○ وَ لَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَ تَکۡتُمُوا الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۲﴾

○ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾

○ اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَ تَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ

O اے بنی اسرائیل! تم یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر کی ہے اور تم میرے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کرو تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو پورا کروں اور تم صرف مجھ سے ہی ڈرو۔ (۴۰)

O اور تم ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے کہ جو اس...... کتاب...... کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے نہ بنو اور نہ ہی میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت پر بیچو اور تم صرف...... میری ناراضگی اور عذاب...... سے بچ کر رہو۔ (۴۱)

O اور تم حق کو باطل کے ساتھ آمیختہ نہ کرو اور نہ ہی حق کو چھپاؤ جبکہ تم سب کچھ جانتے ہو۔ (۴۲)

O اور تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ (۴۳)

O کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو جبکہ تم قرآن پڑھتے ہو؟ آیا تم عقل سے کام نہیں لیتے (۴۴)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں خداوند عالم نے یہودیوں کی سرزنش کی اور ایک سو سے زیادہ آیتوں میں انہیں مورد عتاب قرار دیا ہے ان آیات میں خدا نے یہودیوں کو عطا کی گئی نعمتوں کا تذکرہ کیا اور ان عنایات کو ذکر کیا ہے جو ان پر کیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کی طرف سے خدا کی ان نعمتوں کے مقابلے میں کفر، معصیت، عہد شکنی، نافرمانی وتمرد اور لجاجت وہٹ دھرمی کے ارتکاب کا تذکرہ بھی کیا ہے، انہی آیات میں خداوند عالم نے انہیں ان کی گوناگوں داستانوں اور واقعات میں سے بارہ واقعات بھی یاد دلائے ہیں مثلاً آل فرعون سے انہیں نجات دلانے کے لیے دریا کو چیر کر اس میں راستہ بنانے کا واقعہ، فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہونے کا واقعہ، کوہ طور کے وعدے کا واقعہ، موسیٰ علیہ السلام کے میقات پر جانے کے بعد بچھڑے کی پوجا کرنے کا واقعہ اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انہیں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم دینے کا واقعہ اور ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا کو ظاہر بظاہر دکھانے کے مطالبہ اور اس کے نتیجے میں ان پر بجلی گرنے اور پھر خداوند عالم کا انہیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے کا واقعہ، اور اس طرح کے دیگر واقعات کہ جو ان آیات میں اشارۃً بیان کئے گئے ہیں وہ سب ان لوگوں پر خدا کی عظیم عنایات اور الطاف ومہربانیوں کے عکاس ہیں، اسی طرح ان آیات میں خداوند عالم نے انہیں وہ تمام وعدے اور میثاق یاد دلائے ہیں جو ان سے لیے گئے تھے مگر انہوں نے ان کی خلاف ورزی کی اور سب کچھ پس پشت ڈال دیا اور وہ نافرمانیاں بھی یاد دلائیں جن کا انہوں نے ارتکاب کیا اور وہ جرائم جو انہوں نے کئے اور وہ گناہ جن کے انجام دینے سے ان کے دل زنگ آلود ہو گئے جبکہ انہیں ان گناہوں اور جرائم کے ارتکاب سے ان کی اپنی کتاب.....تورات...... میں منع کیا گیا تھا اور ان کی عقلیں بھی صریح طور پر انہیں ایسا کرنے سے روکتی تھیں مگر وہ اپنی سنگدلی، شقاوت وبدبختی اور غلط کوششوں کے باعث سب کچھ کرتے رہے، خدا نے وہ سب کچھ انہیں یاد دلایا۔

ایفاء عہد کا حکم

○ ''وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ''

(اور تم میرا عہد (معاہدہ) پورا کرو......)۔

''عہد'' کا حقیقی معنی حفاظت کرنا ہے اور اس کے دیگر تمام معانی اسی معنے سے لیے گئے ہیں مثلاً عہد بمعنی میثاق اور

بمعنی قسم، وصیت، ملاقات اور منزل وغیرہ۔

رہبت کا حکم

O "فَارْهَبُوْنِ"

(مجھ سے ہی ڈرو)۔

"رہبت" کا معنی ڈر اور خوف ہے، اس کے مقابل "رغبت" ہے جس کا معنی ہے چاہت۔

قرآن کا انکار نہ کرو

O "وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ"

(اور تم پہلے کافر نہ بنو اس کے)

اس سے مراد یہ ہے کہ تم اہل کتاب میں سے اور پہلی قوموں اور آئندہ آنے والی نسلوں میں سے سب سے پہلا گروہ نہ بنو جو قرآن کے منکر ہوئے بلکہ یہ کام انہیں ہی کرنے دو جنہوں نے اس سے پہلے آسمانی کتابوں کا انکار کیا اور وہ کفار مکہ ہیں کہ جنہوں نے یہودیوں سے پہلے قرآن مجید کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

آیات ۴۵و۴۶

○ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾

○ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ:

○ صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو اگرچہ ایسا کرنا بوجھ ہے مگر ان لوگوں کے لیے نہیں جو خضوع و خشوع کرنے والے ہیں۔ (۴۵)

○ وہی ہیں جو اپنے پروردگار کے حضور پہنچنے پر یقین رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ اس کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ (۴۶)

تفسیر و بیان

صبر اور نماز کے ذریعے استعانت

○ "وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ"

(اور تم صبر اور نماز کے ذریعے استعانت کرو)۔

استعانت کا معنی، مدد طلب کرنا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان تنہا اپنی قوتوں کے سہارے اہم ا نہایت ضروری کام انجام دینے یا مشکلات پر قابو پانے میں قاصر ہو، اور چونکہ حقیقی معنے میں خدا کے سوا کوئی معین و مددگا نہیں اس لیے مشکلات و مسائل میں مدد سے مراد یہ ہے کہ انسان ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر۔ صرف خدا کی طرف توجہ رکھتے ہوئے اسی سے وابستہ ہو جائے اور اپنے آپ کو اس کی بارگاہ عظمت میں پیش کر دے یہی ص اور یہی صلوٰۃ...... نماز...... ہے اور یہ دونوں ہی حقیقی معنے میں کامیابی کے بہترین اسباب ہیں کیونکہ صبر ہر بڑی سے بڑ مشکل اور مصیبت کو چھوٹا کر دیتا ہے اور نماز جو کہ خدا کے حضور جھک جانا اور اس کا سہارا لینا ہے اس سے روح ایمان بید ہوتی ہے اور انسان اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ اس نے جس چیز کا سہارا لیا ہے وہ نہایت مضبوط و پائدار اور ناقا شکست و ریخت ہے۔

نماز اور خشوع کا ربط

○ "وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ"

(اور یہ بوجھ ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جو خشوع کرنے والے ہیں)۔

اس آیت میں "انھا" کی ضمیر (ھا) کی بازگشت "صلاۃ" کی طرف ہے اور اسے "اسْتَعِيْنُوْا" کے الفاظ کی و سے "استعانت" کی طرف لوٹانا درست نہیں کیونکہ اس سے جملہ "الا علی الخاشعین" سے منافات لازم آتی ہے کیو "خشوع" کا "صبر" سے کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ خشوع اور خضوع اگرچہ دونوں میں تواضع و انکسا کا معنی پایا جاتا ہے لیکن خضوع کا تعلق اعضاء و جوارح سے ہے جبکہ خشوع کا تعلق دل سے ہے (یعنی اعضاء و جوارح سے جانے والی انکساری کو خضوع کہتے ہیں اور دل سے کی جانے والی انکساری کو خشوع کہا جاتا ہے)۔

خدا سے ملاقات کا یقین

O "الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ"

(وہ لوگ اپنے پروردگار کے حضور حاضری پر یقین رکھتے ہیں)۔

یہ مسئلہ یعنی آخرت پر اعتقاد ایسا امر ہے جس کے لیے "یقین" ضروری ہے اس میں ظن و گمان اور خیال وغیرہ کافی نہیں جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے "وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ" ......اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں......

اس آیت " الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ... " میں یقین کی بجائے "ظن" ......گمان و خیال......کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سے "خشوع" کی راہ ہموار ہوتی ہے کیونکہ جو علوم تدریجی اسباب کے ذریعے تدریجی طور پر لوح دل پر ثبت ہوتے ہیں ان کے مراحل یہ ہیں کہ سب سے پہلے توجہ والتفات، پھر مد مقابل کی دو طرفوں میں سے ایک کی ترجیح یعنی ظن اور پھر سب سے آخر میں یکے بعد دیگرے تمام مخالف احتمالات کا ختم ہونا یہاں تک کہ قطعی طور پر تمام امور واضح ہو جائیں کہ جسے علمی اصطلاح میں "ادراک جازم" یعنی پختہ و ٹھوس ادراک کہتے ہیں اور اسی کا نام "علم" ہے اور اس طرح کے علم کا تعلق جب کسی خوفناک اور وحشت انگیز چیز سے ہو کہ جو اضطراب نفس اور اس کے قلق و خشوع کا باعث بنے تو اس وقت وہ خشوع حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے جو ٹھوس ادراک اور "علم" کے حصول کے مراحل کی تکمیل سے پہلے دو مد مقابل طرفوں میں سے ایک کی ترجیح کے مرحلہء آغاز میں اس کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا "علم" کی جگہ "ظن" کے لفظ کا استعمال درحقیقت اس امر کی جانب اشارہ کے طور پر ہے کہ اگر انسان اس بات کی طرف متوجہ ہو کہ اس کا رب و پروردگار بھی ہے کہ ممکن ہے ایک دن اس کے حضور جانا اور اس کی طرف لوٹنا ہو تو پھر وہ اس کے اوامر کی خلاف ورزی کے موارد میں بھرپور احتیاط سے کام لیتا ہے، یہ سب کچھ اسی "ظن" کا نتیجہ ہے جو اسے اپنے پروردگار کے حضور جانے کے بارے میں حاصل ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فقلت لهم ظنوا بالفی مذحج سراتهم فی الفارسی المسرد

(میں نے ان سے کہا کہ گمان کرو کہ قبیلہ مذحج کے دو ہزار جنگجو تمہارے اوپر حملہ آور ہو گئے ہیں کہ ان کے سردار فارس کی بنی ہوئی ذرہ پہنے ہوئے ہیں)۔

اس شعر میں شاعر نے لوگوں کو دشمن کے حملہ آور ہونے کے گمان ہی سے خوفزدہ کیا ہے جبکہ دشمن کا خوف اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب اس کا یقین حاصل ہو جائے نہ کہ شک کی صورت میں، لیکن شاعر نے یقین کی بجائے ظن کا لفظ استعمال کر کے انہیں دشمن سے خوف دلانے کی جو کوشش کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر دشمن کے حملہ آور ہونے کا گمان ہی انسان کو بیدار کرنے میں کافی ہوتا ہے اور اسے محتاط رہنے کی راہ پر لا کھڑا کرتا ہے لہٰذا اس سلسلے میں اسے یقین حاصل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اس لیے دشمن کا خوف دلانے والے شخص کو لوگوں میں اس کی بابت یقین دلانے کے لیے کوئی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی۔

خدا سے ملاقات کا یقین

○ "الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ"

(وہ لوگ اپنے پروردگار کے حضور حاضری پر یقین رکھتے ہیں)۔

یہ مسئلہ یعنی آخرت پر اعتقاد ایسا امر ہے جس کے لیے "یقین" ضروری ہے اس میں ظن و گمان اور خیال وغیرہ کافی نہیں جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے "وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ"......اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں......،

اس آیت "الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ..." میں یقین کی بجائے "ظن"......گمان و خیال......کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سے "خشوع" کی راہ ہموار ہوتی ہے کیونکہ جو علوم تدریجی اسباب کے ذریعے تدریجی طور پر لوح دل پر ثبت ہوتے ہیں ان کے مراحل یہ ہیں کہ سب سے پہلے توجہ و التفات، پھر مد مقابل کی دو طرفوں میں سے ایک کی ترجیح یعنی ظن اور پھر سب سے آخر میں یکے بعد دیگرے تمام مخالف احتمالات کا ختم ہونا یہاں تک کہ قطعی طور پر تمام امور واضح ہو جائیں کہ جسے علمی اصطلاح میں "ادراک جازم" یعنی پختہ و ٹھوس ادراک کہتے ہیں اور اسی کا نام "علم" ہے اور اس طرح کے علم کا تعلق جب کسی خوفناک اور وحشت انگیز چیز سے ہو کہ جو اضطراب نفس اور اس کے قلق و خشوع کا باعث بنے تو اس وقت وہ خشوع حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے جو ٹھوس ادراک اور "علم" کے حصول کے مراحل کی تکمیل سے پہلے دو مد مقابل طرفوں میں سے ایک کی ترجیح کے مرحلۂ آغاز میں اس کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا "علم" کی جگہ "ظن" کے لفظ کا استعمال درحقیقت اس امر کی جانب اشارہ کے طور پر ہے کہ اگر انسان اس بات کی طرف متوجہ ہو کہ اس کا رب و پروردگار بھی ہے کہ ممکن ہے ایک دن اس کے حضور جانا اور اس کی طرف لوٹنا ہو تو پھر وہ اس کے اوامر کی خلاف ورزی کے موارد میں بھرپور احتیاط سے کام لیتا ہے، یہ سب کچھ اسی "ظن" کا نتیجہ ہے جو اسے اپنے پروردگار کے حضور جانے کے بارے میں حاصل ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فقلت لهم ظنوا بالفی مذجج سراتهم فی الفارسی المسرد

(میں نے ان سے کہا کہ گمان کرو کہ قبیلہ مذجج کے دو ہزار جنگجو تمہارے اوپر حملہ آور ہو گئے ہیں کہ ان کے سردار فارس کی بنی ہوئی ذرہ پہنے ہوئے ہیں)۔

اس شعر میں شاعر نے لوگوں کو دشمن کے حملہ آور ہونے کے گمان ہی سے خوفزدہ کیا ہے جبکہ دشمن کا خوف اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب اس کا یقین حاصل ہو جائے نہ کہ شک کی صورت میں، لیکن شاعر نے یقین کی بجائے ظن کا لفظ استعمال کر کے انہیں دشمن سے خوف دلانے کی جو کوشش کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر دشمن کے حملہ آور ہونے کا گمان ہی انسان کو بیدار کرنے میں کافی ہوتا ہے اور اسے محتاط رہنے کی راہ پر لا کھڑا کرتا ہے لہٰذا اس سلسلے میں اسے یقین حاصل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اس لیے دشمن کا خوف دلانے والے شخص کو لوگوں میں اس کی بابت یقین دلانے کے لیے کوئی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی۔

بنا برایں یہ آیت یعنی (اَلَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ ...) سورہ کہف کی آیت ۱۱۰ سے ملتی جلتی ہے کہ ج
میں ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

(فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا)

(جو شخص اپنے پروردگار کے حضور جانے کی امید رکھتا ہے اسے چاہیے کہ نیک عمل بجالائے)

اس آیت میں نیک عمل انجام دینے کے لیے خدا کے حضور حاضری کی "امید" ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے البتہ یہ س
اس صورت میں درست ہوگا جب آیت میں "مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ" یعنی پروردگار کی ملاقات سے مراد قیامت کے دن کی حاضر
ہو اور اگر اس سے مراد وہ کچھ ہو جو سورۂ اعراف میں ذکر کیا گیا ہے جیسے اس کے مقام پر واضح طور پر بیان کیا جائے گا (انہ
اللہ تعالیٰ) تو پھر "ظن" وگمان اور "رجائ" وامید کے الفاظ کے استعمال کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے اور اس میں کوئی حرج لا
نہیں آتا۔

روایات پر ایک نظر

نماز حاجت کا بیان

کتاب کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (کان علی (ع) اذا اھا
امر فزع قام الی الصلاۃ) کہ جب کبھی حضرت علیؑ کو کوئی مشکل اور خوفناک امر درپیش ہوتا تو فوراً کھڑے ہو جاتے ا
نماز پڑھتے اور یہ آیت تلاوت کرتے تھے: "وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ" (خدا سے مدد مانگو صبر اور نماز کے ذریعے)

حاجت روائی کا روزہ

اسی طرح کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک اور روایت مذکور ہے کہ آپؑ نے آیت شر
"وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا (الصبر الصیام و قال: اذا نزلت بالرج
الشدۃ او النازلۃ فلیصم ان اللہ عز وجل یقول: واستعینوا بالصبر) کہ صبر سے مراد روزہ
اور آپؑ نے فرمایا کہ جب کسی شخص پر کوئی سخت مصیبت آپڑے تو وہ اس سے نجات پانے کے لیے روزہ رکھے کیونکہ خداو
عالم نے ارشاد فرمایا ہے: "واستعینوا بالصبر" صبر کے ذریعے مدد طلب کرو تو صبر سے مراد روزہ ہے۔

مذکورہ بالا دو روایتوں میں ذکر کیے گئے مطالب تفسیر العیاشی میں بھی بیان کیے گئے ہیں تاہم یہ بات یاد رہے کہ ص
سے روزہ مراد لینا صبر کے معنی و مفہوم کو اس کے واضح مصداق پر منطبق کرنے کے باب سے ہے (جسے علمی اصطلاح میں
"جری" کہتے ہیں)۔

خاشعین سے مراد کون ہیں؟

تفسیر العیاشی میں حضرت ابوالحسن علیہ السلام سے منقول ہے آپ ؑ نے ارشاد فرمایا: آیت "وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ" میں صبر سے مراد روزہ ہے' لہٰذا جب کسی شخص کو کوئی مشکل درپیش ہو یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے کیونکہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے "وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ وَ اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ" اور "خاشع" (خشوع کرنے والا) اسے کہتے ہیں جو نماز کی حالت میں نہایت کمتری و انکساری کا اظہار کرے' اور اس آیت میں "خاشعین" سے مراد حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں۔

امام ؑ نے اس آیت (وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ) کے حوالہ سے مصیبت و مشکلات میں روزہ اور نماز کے استحباب کو بیان فرمایا ہے اور اسی طرح شدائد و مشکلات میں رسول اللہؐ اور ولی اللہ کو وسیلہ قرار دینے کے استحباب کو ذکر کیا ہے تو ایسا کرنا درحقیقت "صوم وصلوٰۃ کے الفاظ" سے رسول اللہؐ اور امیر المومنین مراد لینے سے عبارت ہے۔

(اس طرح کے مصداقی تعین کا عمل اعتقادی حوالوں کا امین ہے اور یہ بات محبت و عقیدت کی روحانی معراج کہلاتی ہے جیسا کہ اس سلسلہ میں تطبیقی عمل کی بابت اشارہ ہو چکا ہے۔م)

امام علیؑ کا ارشاد گرامی

تفسیر العیاشی میں "اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ..." کی تفسیر میں حضرت علی ؑ کا یہ ارشاد مذکور ہے کہ وہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر یقین رکھتے ہیں' اس میں ظن سے مراد یقین ہے۔

اس روایت کو شیخ صدوقؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔

آیت کا شان نزول؟

ابن شہر آشوب نے امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ ؑ نے ارشاد فرمایا: یہ آیت حضرت علی ؑ ' عثمان بن مظعون' عمار بن یاسر اور ان کے اصحاب و ساتھیوں کی شان میں نازل ہوئی۔

آیات ۴۷و۴۸

○ يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۷﴾

○ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔـا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

ترجمہ

○ اے بنی اسرائیل! تم میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی ہے اور یہ کہ میں نے تمہیں عالمین پر برتری عطا کی ہے۔ (۴۷)

○ اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا اور نہ کسی کی سفارش مانی جائے گی اور نہ کسی سے کوئی عوض لیا جائے گا اور نہ ہی کسی کی مدد کی جائے گی۔ (۴۸)

تفسیر و بیان

قیامت کے دن کا تذکرہ

○ "وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي..."

(اور تم ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی......)

دنیاوی سلطنت وحکمرانی کا نظام اپنی تمام انواع و اقسام متعلقہ امور اور اپنے تمام شعبوں مقننہ (قانون سا ادارے) حاکمہ اور انتظامیہ کے ساتھ زندگی کی ضرورتوں اور احتیاجات کی بنیاد پر استوار ہے اور یہ دنیاوی زندگی میں پائ جانے والی احتیاجات ہی ہیں جو تمام قوانین کی تدوین کی اصل واساس ہے اور حکومتی قوانین واحکامات کا بنیادی مقصد ہی یہ ہو ہے کہ ان کے ذریعے ضرورتوں کو پورا کیا جائے اور ان کے سہارے زندگی کے گوناگوں شعبوں میں پائے جانے والے مسائل حل کئے جائیں اور حالات کے بدلتے ہوئے اطوار سے جو مشکلات وجود میں آئیں انہیں متقضائے احوال کی روشنی میں دو کیا جا سکے۔ چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز (متاع و مال) کو دوسرے متاع و مال سے اور ایک منفعت کو دوسری منفعت سے اور ایک حکم و دستور کو دوسرے حکم و دستور سے بدل دیا جاتا ہے جبکہ یہ سب کسی کلی ضابطہ واصول کے بغیر ہوتا ہے یہاں تک کہ عدالتی احکامات اور فیصلوں کا بھی یہی حال ہے مثلاً جو شخص کسی جرم کا ارتکاب کرے وہ قانون کی رو سے سزا کا مستحق قرار پاتا ہے لیکن حاکم اس کی سزا کو کسی خاص وجہ سے تبدیل کر دیتا ہے جیسے مجرم، جج کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے بھرپور اصرار کے ساتھ رحم کی استدعا کرے یا یہ کہ جج کو رشوت دے کہ وہ اپنے صحیح فیصلے میں جائز رائے سے انحراف کر کے سزا کا فیصلہ بدل دے یا یہ کہ مجرم کسی کو سفارشی کے طور پر حاکم کے پاس بھیجے جو اس کی سزا کے فیصلے میں تبدیلی کروا سکے او اگر جج ان امور کی کوئی پرواہ نہ کرے تو مجرم سزا کے فیصلے میں تبدیلی کے لیے انتظامیہ اور سزا پر عملدرآمد کروانے والے ادارے کے پاس اپنا سفارشی بھیجے یا اپنی سزا کے بدلے میں عدالت کو معاوضہ ادا کرے کیونکہ عین ممکن ہے کہ حا (حکومت) کو اس کی سزا سے زیادہ اس کے مال کی احتیاج ہو یا مجرم اپنی قوم و قبیلہ سے مدد طلب کرے اور وہ بھی اس کی حمایت و مدد کے لیے عملی اقدامات کریں اور اسے سزا سے بچا لیں تو یہ سب اسباب ایسے ہیں جو دنیاوی نظام حکومت کے احکامات اور قوانین میں تبدیلی لاتے ہیں اور یہ تبدیلیاں انسانی معاشرے کی عام عادت اور ایک طرح سے معمول کا حصہ بن

چکی ہیں' چنانچہ زمانہء قدیم میں "وثنیین" اور دوسری قومیں یہ عقیدہ رکھتی تھیں کہ آخرت کی زندگی بھی دنیا کی زندگی کی طرح ہے اور اس میں بھی قانون کی وہی صورت حال ہے جو یہاں ہے اور جس طرح مادی اسباب وعوامل دنیاوی نظام حکومت کے قوانین واحکامات میں اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح اخروی زندگی کا نظام بھی گونا گوں مادی عوامل واسباب کے زیر اثر ہوگا' اسی عقیدہ کی روشنی میں وہ لوگ اپنے خود ساختہ خداؤں اور بتوں کے لیے طرح طرح کے ہدیے اور قربانیاں پیش کرتے تھے تا کہ ان کے جرائم سے درگزر ہو یا ان کی حاجات پوری ہو جائیں یا وہ جرائم پر ملنے والی سزا کو ختم کروانے میں ان کی شفاعت کریں' یا پھر وہ لوگ کوئی مال اپنے جرائم کے عوض میں فدیہ کے طور پر دیتے تھے' یا کسی جان کی قربانی دے کر یا اسلحہ کے ذریعے اپنے خود ساختہ خداؤں سے مدد طلب کرتے تھے اور ان کی اس فکری پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ وہ لوگ اپنے مردوں کے ساتھ قیمتی زیورات وجواہرات دفن کر دیتے تھے تا کہ ان قیمتی اشیاء سے اپنی اخروی زندگی میں لطف اندوز ہو سکیں اور طرح طرح کے اسلحے بھی ان کے ساتھ دفن کئے جاتے تھے تا کہ اس عالم میں اپنا دفاع خود کر سکیں' اور اس سے بالاتر یہ کہ بعض لوگ اپنے مردوں کے ساتھ کسی کنیز کو بھی زندہ دفن کر دیتے تھے تا کہ مردہ اس کے ساتھ انس ومحبت کے ماحول میں رہے یا کسی بہادر شخص کو مردے کے ساتھ دفن کر دیتے تھے تا کہ وہ اس کا مددگار بن کر رہے' چنانچہ ان کے بارے میں آج کئی عجائب گھروں میں آثار قدیمہ کے حوالہ سے بہت سی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں اور حد تو یہ ہے کہ ان جیسے عقائد ونظریات اور بے بنیاد افکار وخیالات مسلمان قوموں میں بھی اپنے رنگ ونسل کے اختلافات کے باوجود واضح طور پر نظر آتے ہیں اور یہ سب نظریات ان میں نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں' البتہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں جدت اور نیا رنگ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے لیکن قرآن مجید نے ان تمام موہوم اور بے بنیاد عقائد ونظریات اور من گھڑت باتوں کو سراسر غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورہء انفطار، آیت ۱۹:

"وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ..." (اس دن سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے)۔

اور ارشاد فرمایا:

سورہء انعام، آیت ۹۴:

"وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ"،

(آج تم اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے ہو اسی طرح پر جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ خلق کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا تھا وہ سب کچھ تم چھوڑ آئے ہو اور اب ہم تمہارے ساتھ ان شفیعوں اور سفارشیوں کو نہیں دیکھ رہے جن کے بارے میں تم نے اپنے معاملہ میں شریک ہونے کا گمان کر لیا تھا اب تمہارے اور ان کے درمیان کوئی تعلق ورابطہ ہی باقی نہیں رہا ہے اور جس چیز کا تم گمان کرتے تھے اب اس کا نام ونشان تک باقی نہیں ہے)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

سورہ یونس، آیت ۳۰:

"هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝٣٠"

(اس وقت ہر شخص اپنے کردار کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوگا اور سب لوگ خداوند عالم کہ جو ان کا حقیقی مولا و آقا ہے کی طرف لوٹائے جائیں گے اور وہ سب کچھ ناپید ہو جائے گا جو وہ جھوٹ اور افتراء کے طور پر کہتے تھے)

اس کے علاوہ متعدد آیات اور بھی ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ عالم آخرت میں دنیاوی اسباب و عوامل میں سے کچھ بھی موجود نہ ہوگا اور ہر قسم کے مادی رابطے منقطع ہو جائیں گے جو کہ اس دنیا میں موجود ہیں' یہ بات ایک مضبوط بنیاد اور ٹھوس اصول کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی سے اجمالی طور پر ان تمام باطل نظریات اور بے بنیاد عقائد کی قلعی کھل جاتی ہے جن میں عالم آخرت میں مادی وسائل و اسباب اور ذرائع و عوامل کو اسی طرح موثر سمجھا گیا ہے جس طرح وہ اس دنیا میں موثر ہیں اور قرآن مجید نے ان تمام باطل نظریات کی ایک ایک کر کے نفی کی اور تفصیل کے ساتھ ان کے غلط ہونے کو بیان کیا ہے' چند آیات ملاحظہ ہوں:

سورہ بقرہ آیت ۴۸:

"وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ"

(اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی کسی کی مدد و نصرت کی جائے گی)

سورہ بقرہ آیت ۲۵۴:

"يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ"

(اس دن نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ ہی کوئی دوستی اور شفارش)۔

سورہ دخان، آیت ۴۱:

"يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْئًا"

(اس دن کوئی دوست کسی دوست کے لیے کچھ نہ کر سکے گا)۔

سورہ مومن، آیت ۳۳:

"يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ مَا لَكُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ"

(اس دن تم خدا کے عذاب سے بھاگو گے مگر تمہارے لیے خدا کے سوا کوئی بچانے والا نہ ہوگا)

سورہء صافات، آیت ۲۶:

"مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ"

(اب تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے' بلکہ آج وہ سب اپنے آپ کو سپرد کر چکے ہیں یعنی سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں)

سورہء یونس، آیت ۱۸:

"وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾"

(وہ خدا کو چھوڑ کر ان کی عبادت و پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کے لیے نقصان دہ ہے اور نہ ہی فائدہ مند' اور وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس ہماری شفاعت و سفارش کرنے والے ہیں۔ آپؐ ان سے کہہ دیجئے کہ آیا تم خدا کو وہ کچھ بتانا چاہتے ہو جس سے وہ آسمانوں اور زمین میں بے خبر ہے' خداوند عالم پاک اور بالاتر ہے اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں)۔

سورہء مومن آیت ۱۸:

"مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ"

(ظالموں کے لیے کوئی ہمدرد نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا سفارشی ہے جس کی بات سنی جائے)۔

سورہء شعراء آیت ۱۰۱:

"فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ"

(وہ کہیں گے کہ...... ہمارا کوئی سفارشی ہی نہیں اور نہ ہی کوئی ہمدرد و مخلص دوست ہے)۔

ان کے علاوہ متعدد آیات ایسی ہیں جن میں قیامت کے دن شفاعت و سفارش کی نفی کی گئی اور ہر قسم کے رابطوں کے منقطع ہو جانے کو بیان کیا گیا ہے، اور ہر طرح کے ذرائع اور وسیلوں کو بے اثر قرار دیا گیا ہے۔

ان آیات کے باوجود قرآن مجید کلی طور پر شفاعت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس مقدس کتاب میں شفاعت کو فی الجملہ ثابت کیا گیا ہے' شفاعت کے اثبات کی بابت قرآنی آیات ملاحظہ ہوں۔

سورہء سجدہ، آیت ۴:

★ "اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۚ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ"۔

(وہ خدا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر قائم ہو گیا' اس کے سوا تمہارا کوئی سرپرست اور سفارشی نہیں آیا تم توجہ نہیں کرتے (غور و فکر سے کام نہیں لیتے)۔

سورہء انعام، آیت ۵۱:

★ "لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ"

(اس کے سوا کوئی ان کا سرپرست اور شفاعت کرنے والا نہیں)۔

سورہء زمر آیت ۴۴:

★ "قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا"

(کہہ دیجئے کہ شفاعت سب کی سب خدا کا حق ہے)۔

سورہء بقرہ آیت ۲۵۵:

★ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ"

(اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے' کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس شفاعت کر سکے' وہ تمام لوگوں کے اعمال...... پہلے اور آئندہ...... کو جانتا ہے)۔

سورہء یونس آیت ۳:

★ "اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ"

(تمہارا پروردگار خدا ہی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر عرش پر قائم ہو گیا' وہی ہے جو تمام امور کی تدبیر کرتا ہے' اس کے اذن و اجازت کے بغیر کوئی شخص شفاعت نہیں کر سکتا)۔

سورہء انبیاء، آیت ۲۸:

★ "وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ"۔

(انہوں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بنایا ہوا ہے' خدا اس سے پاک و منزہ ہے بلکہ وہ...... فرشتے...... خدا کے مکرم بندے ہیں جو اس کی بات سے پہل نہیں کرتے اور وہ خدا کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں' خدا جانتا ہے ہر اس چیز کو جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے' اور وہ کسی کی شفاعت نہیں کرتے مگر اس کی کہ جسے خدا پسند کرے' اور وہ ہر حال میں خدا کی خشیت اور اس کی نافرمانی کا خوف دل میں رکھتے ہیں)۔

سورہء زخرف، آیت ۸۶:

★ "وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ "۔

(مشرکین، خدا کے سوا جن لوگوں کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کرنے کا حق ہی نہیں رکھتے، صرف وہی لوگ خدا کے حضور شفاعت کر سکتے ہیں جو حق کی گواہی اپنے بھرپور علم کے ساتھ دیں)۔

سورہ مریم، آیت ۸۷:

★ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا "

(کوئی بھی شفاعت کا حق نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ جو خدا کے حضور عہد رکھتا ہو)۔

سورہ طہ۔ ۱۱۰:

★ " يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا "

(آج کوئی شفاعت فائدہ نہیں پہنچا سکتی سوائے اس شخص کی شفاعت کے کہ جسے خداوند عالم نے شفاعت کرنے کی اجازت دے دی ہو اور اس کی بات کو پسند کر لیا ہو، خدا ہی ہے جو لوگوں کے پہلے اعمال اور آئندہ کردار سے آگاہ ہے جبکہ لوگ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے)۔

سورہ سبا، آیت ۲۳:

★ " وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ "۔

(خدا کے حضور کوئی شفاعت فائدہ مند نہ ہوگی سوائے اس کی شفاعت کے کہ جسے وہ اذن و اجازت دے)۔

سورہ نجم، آیت ۲۶:

★ " وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ "

(آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ جن کی شفاعت ہرگز کوئی فائدہ نہیں دے سکتی سوائے ان کے کہ جنہیں خدا خود چاہے اور پسند کرے)۔

یہ آیات جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا دو طرح کی ہیں : بعض آیات میں شفاعت کو خداوند عالم کے ساتھ مختص کیا گیا ہے جیسے پہلی تین آیتیں، اور بعض میں خدا اور غیر خدا سب کے لیے شفاعت کے حق کا اثبات ہوا ہے تاہم غیر خدا کی شفاعت خدا کے اذن و رضایت پر موقوف ہے۔

بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ یہ آیات اصل شفاعت کو ثابت کرتی ہیں اور اس سلسلے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں تاہم بعض آیات میں شفاعت کو اصالۃً خدا کے ساتھ مخصوص کر کے ذکر کیا گیا ہے کہ جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں جبکہ بعض آیات میں شفاعت کے دائرہ کو وسعت دے کر اسے غیر خدا کے لیے بھی ثابت کیا گیا ہے مگر خدا کے اذن و

رضایت کے ساتھ!

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ پہلے ذکر کی گئی آیات میں شفاعت کی سرے ہی سے نفی کی گئی ہے جبکہ بعد والی آیات میں اس کا اثبات ہے' تو ان دو طرح کی آیتوں کا حال وہی ہے جو علم غیب کی آیتوں کا ہے کہ جن میں سے کچھ آیات خدا کے سوا ہر ایک سے علم غیب کی نفی کرتی ہیں اور کچھ آیات خدا کے ساتھ علم غیب کے اختصاص اور دوسروں کے لیے خدا کی رضا پسندیدگی کے ساتھ علم غیب کو ثابت کرتی ہیں' ملاحظہ ہو:

سورہء نمل، آیت ۶۵:

★ "قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ"

(کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو)۔

سورہء انعام، آیت ۵۹:

★ "وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ"

(اسی کے پاس ہیں غیب کی چابیاں کہ انہیں سوائے خدا کے کوئی بھی نہیں جانتا)۔

سورہء جن، آیت ۲۷:

☆ "عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ "۔

(وہ غیب کا عالم ہے اور کسی کو اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا سوائے اس رسول کے جسے پسند کر لے)۔

یہ ہیں علم غیب کے سلسلے میں دو مختلف قسم کی آیتیں' اور ان کی مانند دیگر کئی موضوعات ہیں جن کی بابت قرآن مجید میں دو قسم کی آیتیں موجود ہیں مثلاً موت دینا' پیدا کرنا' روزی دینا' اثر انداز ہونا' حکمرانی' ملکیت وغیرہ' تو ان تمام موضوعات کے سلسلے میں دو قسم کی آیتیں موجود ہیں: بعض آیتوں میں ان امور کا اختصاص خدا کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جبکہ بعض آیات میں خدا کے علاوہ دوسروں کے لیے خدا کی رضا و خوشنودی یا اذن و اجازت کے ساتھ ان کا اثبات ہوا ہے' اور یہ اسلوب سخن قرآن مجید میں اکثر موضوعات کی بابت اپنایا گیا ہے کہ پہلے ہر کمال کی خدا کے علاوہ سب سے نفی کی گئی پھر اسے خدا کے لیے ثابت کیا گیا اور پھر خدا کے علاوہ دوسروں کے لیے خدا کے اذن اور مشیت کے ساتھ اس کا اثبات ہوا' تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند عالم کے سوا تمام موجودات ہستی میں سے کوئی شے بھی ایسی نہیں جو اپنے طور پر ان کمالات کی حامل و مالک ہو بلکہ شے بھی کوئی کمال رکھتی ہے وہ اسے خدا کی طرف سے عطا کیا ہوتا ہے' یہاں تک کہ قرآن مجید حتمی اور طے شدہ امور میں بھی بعض حوالوں سے خدا کی مشیت کو ثابت کرتا ہے جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہء ہود، آیات ۱۰۶ تا ۱۰۸:

★ " فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ۚ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ''

(پس جو لوگ بد بخت ہوئے وہ جہنم کی آگ میں ہوں گے اور اسی میں چیخ و پکار کرتے رہیں گے اور جب تک آسمان وزمین باقی ہے وہ اسی میں رہیں گے مگر جب تیرا پروردگار انہیں نجات دینا چاہے، بے شک تیرا رب وہ سب کچھ کرتا ہے جو وہ خود چاہتا ہے۔ اور جو لوگ سعادتمند وخوش نصیب ہیں وہ بہشت میں ہوں گے اور جب تک آسمان وزمین باقی ہے وہ اسی میں رہیں گے مگر جب تیرا پروردگار چاہے (کہ وہ وہاں نہ رہیں) کہ یہ کبھی ختم نہ ہونے والا عطیہ ہے)۔

ان آیات مبارکہ میں شقاوت و بدبختی کی سزا کے طور پر جہنم میں ہمیشہ رہنے اور سعادت وخوش بختی کی جزا کے طور پر بہشت میں ہمیشہ رہنے کی بابت یہ بھی فرمادیا کہ ''یہ کبھی ختم و منقطع نہ ہونے والا عطیہ ہے'' لیکن اس کے باوجود وہاں ہمیشہ رہنے کا معاملہ اپنے ہاتھ میں رکھا اور فرمایا کہ ''اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ'' (مگر یہ کہ خداوند عالم کچھ اور چاہے) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شقاوت و بدبختی کے حامل افراد کے لیے دوزخ میں ہمیشہ رہنے کا حتمی فیصلہ اور سعادت وخوش بختی والوں کے لیے بہشت میں ہمیشہ رہنے کا طے شدہ امر کہ جو خود خدا نے ہی طے کیا ہے ایسا نہیں کہ اب خدا اس فیصلے میں بے بس ہو گیا ہے اور اس سلسلے میں اس کا اب کوئی اختیار ہی باقی نہیں رہا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر حال میں بااختیار ہے اور ہر شے پر اس کی سلطنت وحکمرانی ہے، یہاں تک کہ اپنے طے شدہ فیصلوں کو مصلحت یا اپنے علم کی بنیاد پر تبدیل کرنے میں بھی اسے مکمل اختیار حاصل ہے جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ'' (یعنی تیرا پروردگار وہ سب کچھ کرتا ہے جو وہ خود چاہتا ہے)۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہ کسی کو کچھ عطا کرے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس پر اس کا کوئی اختیار ہی باقی نہیں رہا اور جو کچھ دیا ہے اب وہ اس سے محروم ہو گیا ہے یعنی وہ شے اب اس کے اختیار میں نہیں رہی بلکہ اس سے اس کی ناداری کا سبب فراہم ہو گیا ہے، اور اگر کچھ نہ دے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب وہ اس شے کی حفاظت پر مجبور ہو گیا ہے اور اب اس کے بارے میں اپنا اختیار کھو چکا ہے (گویا کچھ عطا کرنا اس کے بے اختیار و نادار ہونے کا سبب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی عطا نہ کرنا اس کے اقتدار کی بنیادوں کو متزلزل کر سکتا ہے)۔

مذکورہ بالا مطالب سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ جن آیات میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے اگر ان میں شفاعت سے مراد قیامت کے دن کی شفاعت ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن خدا کے سوا کوئی شخص اپنی مستقل حیثیت میں شفاعت کا حق نہیں رکھتا، اور جو آیات شفاعت کو ثابت کرتی ہیں ان میں خدا کی نسبت شفاعت کا ثبوت حقیقی اور بالاصالہ ہے جبکہ دوسروں کے لیے خدا کے اذن و اجازت کے ساتھ! پس شفاعت کی کلی طور پر نفی نہیں کی گئی بلکہ خدا کے علاوہ جن کے لیے بھی شفاعت کو ثابت کیا گیا ہے وہ خدا کے اذن پر موقوف ہے، لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ خدا کے علاوہ دوسرے بھی شفاعت کر سکتے ہیں؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید میں شفاعت کا معنی کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ اور کن لوگوں کی شفاعت ہو سکتی ہے؟ کون شفاعت کر سکتا ہے؟ کب شفاعت ہو گی؟ اور شفاعت کا خدا کی بخشش ومغفرت اور درگزر کرنے سے کس حد تک ربط ہے اور کہاں تک اس کا اثر وفائدہ ظاہر ہو گا؟ ان تمام امور کو ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ شفاعت سے کیا مراد ہے؟

شفاعت کا معنی اجمالی طور پر ہم سب کو معلوم ہے کیونکہ معاشرتی زندگی کی بنیاد ہی تعاون پر استوار ہے اور سب کا ایک دوسرے کے تعاون سے انجام پذیر ہوتے ہیں لہٰذا کوئی فرد ایسا نہیں جو شفاعت کے مفہوم و معنی سے آگاہ نہ ہو۔

شفاعت کا لغوی معنی: شفاعت لفظی طور پر "شفع" سے ہے (جس کا معنی دو یا باہم ہے) اور یہ "وتر" (ایک) کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ اور دو کا یکجا ہونا اس طرح پر ہے کہ شفاعت کرنے والا اپنی توانائیاں شفاعت طلب کرنے والے کے ساتھ ملاتا ہے اور وہ "دو" باہم مل جاتے ہیں اور شفاعت طلب کرنے والا، شفاعت کرنے والے سے مل کر اپنے مقصود کو حاصل کرنے پر قادر ہو جاتا ہے کہ اگر یہ شفاعت کرنے والا نہ ہوتا تو شفاعت طلب کرنے والا اپنی ناتوانی اور کمزور و ناقص ذرائع کے ساتھ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکتا اور اس کی اپنی قوتیں اسے اس کے مقصود و مراد تک پہنچانے میں ناکافی تھیں

شفاعت ان امور میں سے ایک ہے جنہیں ہم اپنی اجتماعی و معاشرتی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس کا سہارا لیتے ہیں' عام طور پر جن موارد میں شفاعت کا سہارا لیا جاتا ہے وہ دو قسم کے ہیں: ایک وہ کہ جن میں خیر و نفع کا حصول مقصود ہوتا ہے اور دوسرے وہ کہ جن میں شر اور ضرر و نقصان سے بچنا مطلوب ہوتا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ ہر قسم کے نفع و ضرر میں ہم شفاعت کا سہارا لیتے ہوں کیونکہ جو خیر و شر اور نفع و ضرر طبیعی اسباب اور تکوینی عوامل کے ذریعے وجود میں آتے ہیں ان میں ہم شفاعت کا سہارا ہرگز نہیں لیتے جیسے بھوک' پیاس' گرمی' سردی' صحت بیماری وغیرہ، ان سب میں ہم طبیعی اسباب کا سہارا لیتے ہیں اور ان امور کی بابت ان کے مناسب و موزوں وسائل مہیا کرتے ہیں جیسے کھانا' پانی' لباس' مکان' دوائیں وغیرہ لیکن خیر و شر اور نفع و ضرر کے وہ امور کہ جن میں ہم شفاعت اور غیر طبیعی وسائل کا سہارا لیتے ہیں ان کا تعلق معاشرے کے ان قوانین و احکامات سے ہوتا ہے جنہیں معاشرے میں موجود ہیئت حاکمہ اور ارباب اقتدار مقرر و معین اور جاری کرتے ہیں' اور یہ بات ہر آقا و غلام اور حاکم و رعایا کے درمیان پائی جاتی ہے کہ آقا اپنے غلام اور حاکم اپنی رعایا کو بعض امور کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور بعض امور کی انجام دہی سے روکتا ہے کہ اگر غلام اپنے آقا اور رعایا اپنے حاکم کے احکامات پر عمل کرے اور اس کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرے تو اس کی تعریف اور مدح کی جاتی ہے یا اسے مالی منفعت یا عزت و احترام حاصل ہوتا ہے اور اگر غلام یا رعایا اپنے آقا یا حاکم کے احکامات کی خلاف ورزی کرے اور حکم عدولی کا ارتکاب کرے تو اس کی مذمت کی جاتی ہے اور مادی یا معنوی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لہٰذا جب آقا اپنے غلام یا سردار و حاکم اپنی رعایا و عوام کو کچھ کرنے یا نہ کرنے کے احکامات جاری کرے اور غلام یا رعایا و عوام بھی احکامات کی پیروی کرے تو اسے عزت و احترام کے ساتھ اجر و جزا ملتی ہے اور اگر خلاف ورزی کرے تو اسے سزا و عقوبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے...... اس سے دو قسم کے امور کی نشاندہی ہوتی ہے: ایک احکامات کا تعین اور دوسرا احکامات پر عمل کرنا

اور نہ کرنے کی صورت میں جزاوسزا کا تعین' اسی اصول یعنی احکامات اور ان پر جزاوسزا کی بنیاد پر دنیا بھر کی حکومتوں کے نظام اور ہر شخص کے اپنے ماتحت افراد کے ساتھ مربوط امور کا دارومدار ہے۔

بنابرایں اگر کوئی شخص کسی مادی یا معنوی کمال اور خیر کے حصول کا خواہاں ہو لیکن وہ اس کمال وخیر کے حصول کے لیے مقرر کئے گئے معاشرتی معیاروں پر پورا نہ اترے اور نہ اس کے پاس اس کمال وخیر کے حصول کے وہ ظاہری اسباب موجود ہوں جو عام طور پر اس کمال وخیر کے حصول کی اہلیت کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں اور اسی طرح اگر کوئی شخص احکامات کی خلاف ورزی کرنے پر سزا کا مستحق قرار پایا ہو لیکن اس سزا سے بچنے کی کوئی صورت اسے نظر نہ آئے یعنی احکامات پر عمل کرنے اور فرائض کی ادائیگی کے ذریعے سے سزا سے بچنے کی راہ دکھائی نہ دے تو ان دونوں صورتوں میں وہ شفاعت کا سہارا لیتا ہے' گویا جو شخص مناسب وضروری اسباب فراہم کیے بغیر اجر وثواب کے حصول کا خواہاں ہو یا اپنے اوپر عائد کی گئی ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور احکامات پر عمل کئے بغیر سزا وعقوبت سے بچنا چاہتا ہو تو وہ شفاعت وسفارش کا محتاج ہوتا ہے۔ اور یہی وہ مورد ومقام ہے جہاں شفاعت موثر واقع ہوتی ہے، البتہ مطلق طور پر اور ہر حال میں نہیں بلکہ صرف اسی صورت میں شفاعت اثر آفرین ہوتی ہے جب شفاعت کا سہارا لینے والا اس کا مستحق بھی ہو' لیکن اگر اس میں کمال وخیر کے حصول کی بنیادی صلاحیت ہی موجود نہ ہو جیسے کوئی جاہل مطلق اور ان پڑھ آدمی بلند پایہ علمی مقام ومنصب پر فائز ہونا چاہے جبکہ اس نے ذرہ بھر علم حاصل نہ کیا ہو اور نہ ہی علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور نہ ہی اس کے پاس کوئی ایسا وسیلہ وذریعہ ہو جس کے سہارے وہ شفاعت وسفارش کرنیوالے تک رسائی حاصل کر سکے تو ایسی صورت میں شفاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ موثر واقع ہو سکتی ہے' یہی حال اس غلام اور نوکر کا ہے جو اپنے آقا و مالک کے احکامات پر عمل نہ کرنے کی ٹھان لے اور کسی صورت میں اس کے فرمان پر عمل کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو بلکہ خلاف ورزی پر ڈٹ جانے کے ساتھ ساتھ شفاعت کا سہارا لے تا کہ آقا و مالک کی طرف سے دی جانے والی سزا وعقوبت سے بچ جائے تو ایسے شخص کی بابت شفاعت موثر واقع نہیں ہو سکتی کیونکہ شفاعت نامکمل اسباب کی تکمیل تو کر سکتی ہے لیکن خود مستقل طور پر اسباب کی جگہ نہیں لے سکتی یعنی ایسا ہرگز نہیں کہ کسی قسم کی صلاحیت ولیاقت کے بغیر کوئی جاہل سفارش کے ذریعے سب سے بڑے علمی مقام ومنصب کو پالے یا آقا و مالک کا سرکش غلام ونوکر اپنے مالک کے ہاں عزت واحترام حاصل کر لے۔

دوسری بات یہ کہ شفاعت کرنے والے کی بات حاکم وآقا کہ جس کے پاس سفارش کی جا رہی ہو، کے نزدیک بے بنیاد وغیر موثر نہ ہو اور وہ اسے فضول ونامعقول قرار نہ دے بلکہ ضروری ہے کہ شفاعت کرنے والا حاکم وآقا سے اس چیز کو بنیاد قرار دے کر بات کرے جس کے ساتھ اس کی بات حاکم وآقا کے پاس موثر واقع ہوتا کہ جس کے لیے شفاعت کی جا رہی ہو اسے اجر وثواب کے حصول یا سزا وعقوبت سے نجات پانے کی نوید مل سکے' لہٰذا شفاعت کرنے والا کسی آقا سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اپنے آپ کو آقا اور غلام کو غلام نہ سمجھتے ہوئے سزا نہ دے' اور نہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا حکم واپس لے لے اور اپنے احکامات سے دستبردار ہو جائے یا اپنے حکم کو سب کے لیے یا خاص طور پر اسی ایک شخص کے لیے جس کے لیے

سفارش کی جارہی ہے منسوخ کرکے اسے سزا نہ دے اسی طرح شفاعت وسفارش کرنے والا اس بات کا مطالبہ بھی نہیں کرتا کہ حاکم اپنے قانون مجازات اور سزاؤں کے ضوابط کو سرے سے ہی ختم کردے اور کسی کو کوئی سزا نہ دے یا پھر خاص طور اس ایک شخص کے لیے سزا کا قانون بے اثر قرار دے کہ جس کی وہ سفارش کررہا ہے۔

بہرحال شفاعت وسفارش کرنے والا شخص، حاکم کی حاکمیت اور عبد کی عبدیت میں موثر واقع نہیں ہوسکتا اور ان امور میں اس کی شفاعت ہرگز نافذ وموثر نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح نہ کسی حکم یا اس پر مقررہ جزا وسزا کی بابت اس کا کوئی اثر۔ بلکہ شفاعت کرنے والا جب ان تینوں امور (یعنی حاکم کی حاکمیت، حکم وفرمان کی برقراری اور قانون سزا کی بالادستی) کو ملحو رکھتے ہوئے دیگر امور کے حوالہ سے شفاعت کرے تو اس کی شفاعت موثر واقع ہوسکتی ہے مثلاً حاکم وآقا کی عظمت وبزر اور خاندانی شرف کا حوالہ دے کیونکہ یہ خصوصیات اس امر کی سبب بنتی ہیں کہ آقا اپنے غلام کی غلطی سے درگزر کرے اور اس نافرمانی کے باوجود اسے اپنی بزرگواری کے ساتھ مورد عفو قرار دے یا عبد وغلام میں پائی جانے والی ان چیزوں کا حوالہ د کر سفارش کرے جو اس پر رحم کرنے اور اسے معاف کردینے کا سبب بن سکتی ہوں جیسے اس کی بیچارگی بدحالی ناداری و ماندگی وغیرہ یا شفاعت کرنے والا اپنی خصوصیات کے حوالہ سے بات کرے مثلاً اپنا مقام ومرتبہ اور حاکم وآقا کے ساتھ ا قریبی تعلقات اور اس کی نظر میں اپنی عزت واحترام کی بنیاد پر شفاعت کرتے ہوئے اس سے اس طرح کہے کہ میں آپ ہرگز اس بات کا خواہاں نہیں کہ آپ اپنی حاکمیت سے دستبردار اور اس غلام کی عبدیت کو نظرانداز کردیں اور نہ ہی یہ چاہتا ہو کہ آپ اپنے حکم وفرمان کو واپس لے لیں یا قانون سزا کو ختم کردیں بلکہ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنی عظمت وبزر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اس نافرمان غلام سے درگزر کریں کیونکہ اس بیچارے اور حالات کے مارے کو سزا دینے سے آپ کوئی فائدہ نہیں اور اگر آپ اس کی غلطی کو معاف کردیں تو آپ کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا یا یہ کہ یہ جاہل، بے چارہ مسکین آدمی ہے اسے سزا دینا آپ کے شایان شان نہیں اور آپ جیسے عظیم انسان تو اس جیسے بے چارے آدمی کی غلطیوں کسی حساب میں نہیں لاتے یا یوں کہے کہ میں آپ سے اپنے قرب ومنزلت کے حوالہ سے اس بات کی توقع کرتا ہوں کہ آ اس شخص کے بارے میں میری سفارش قبول کریں اور اس کی غلطی سے درگزر کرتے ہوئے اس کی سزا معاف کردیں گے۔

مذکورہ بالا مطالب پر اچھی طرح غور وفکر کرنے سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ شفاعت وسفارش کرنے والا شخ مذکورہ تین چیزوں میں سے سب سے زیادہ مضبوط چیز کے حوالے سے نافرمانی کے مرتکب شخص کی سزا کے خاتمہ کے لیے اقد کرتا ہے مثلاً ان تین امور یعنی حاکم وآقا کی بزرگی یا عبد وغلام کی بیچارگی یا حاکم وآقا کے نزدیک اپنے قرب ومنزلت میں۔ اس کی نظر میں جو چیز سزا کا موجب بننے والے امر کی نسبت زیادہ قوی وموثر ہو اس کے حوالہ سے سزا کے خاتمہ کی سفارش ہے یعنی اس حوالہ سے وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ سزا کے مورد کو اس طرح پیش کرے کہ وہ سزا کے مورد کی جگہ عفو ودرگزر کا مقام جائے کہ جس پر سزا آ ہی نہ سکے نہ یہ کہ اس پر سزا کا اطلاق تو ہو لیکن اس کے باوجود سزا کے حکم کو ختم کردیا جائے ورنہ تضاد لا

آئے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر سزا کا اطلاق تو صحیح ہو لیکن اسے سزا نہ دی جائے‘ اور یہ تضاد اسی طرح ہو گا جس طرح متضاد طبیعی اسباب ایک دوسرے پر غالب آ جاتے ہیں اور ایک سبب دوسرے سبب کے مقابلے میں زیادہ موثر واقع ہوتا ہے‘ پس شفاعت درحقیقت کسی کو نفع پہچانے یا نقصان سے بچانے کے لیے واسطہ ووسیلہ بننے کا نام ہے البتہ ایسا کرنا سزا کے عوامل پر سزا کے خاتمہ کے عوامل کو غلبہ دینے کے ذریعے ہو، نہ یہ کہ ان کے درمیان تضاد پیدا کر کے!

ان مطالب سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ’’شفاعت‘‘ بھی اسباب میں سے ایک سبب ہے (سببیت کا ایک مصداق ہے) اور وہ اس عمل سے عبارت ہے جس کے ذریعے مسبب اور اس کے دور والے سبب کے درمیان اس سبب کو لا کھڑا کیا جائے جو اپنے مسبب سے زیادہ قریب ہوتا کہ وہ دور والے سبب کی تاثیر کا راستہ روک سکے‘ گویا شفاعت وسفارش کرنے والے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسا سبب لائے جو اپنے مسبب سے دوسرے ہر سبب کی نسبت زیادہ نزدیک ہوتا کہ اس کے ہوتے ہوئے دوسرا کوئی سبب اثر انداز نہ ہونے پائے‘ یہ ہے وہ اہم نکتہ جو ہم نے شفاعت کے معنی کا تجزیہ وتحلیل کر کے سمجھا ہے تاہم یہ بات یاد رہے کہ یہاں شفاعت سے ہم نے وہی معنی مراد لیا ہے جس کے ہم قائل ہیں۔

اب جبکہ یہ بات واضح ہو گئی کہ شفاعت‘ سببیت کا ایک مصداق ہے تو اس سببیت میں خداوند عالم کی بابت دو صورتیں اور حیثیتیں قابلِ تصور ہیں:

(۱) تکوینی حیثیت (۲) تشریعی حیثیت

تکوینی حیثیت کی وضاحت!

خداوند عالم ہر سبب کا مبدأ اور نقطۂ آغاز ہے‘ ہر سبب کی اثر آفرینی کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے اور وہی سببیت کا منتہا ہے یعنی ہر سبب اپنے سبب ہونے کے لحاظ سے اسی تک جا پہنچتا ہے لہٰذا خلق کرنے اور وجود عطا کرنے کا مطلق اختیار وملکیت اسی کے پاس ہے یعنی وہی ہر چیز کو وجود عطا کرنے والا ہے اور تخلیق وایجاد کا مکمل اختیار اسے حاصل ہے اور تمام علل واسباب اس کے اور اس کے علاوہ دیگر چیزوں کے درمیان وسیلہ وواسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی وہ خدا کی ہمیشہ باقی رہنے والی رحمت اور شمار نہ کی جا سکنے والی نعمت کو اس کی مخلوق تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔

تشریعی حیثیت کی وضاحت!

خداوند عالم اپنی خاص عنایتوں کے ساتھ ہم پر احسان کرتے ہوئے اپنی تمام تر بلندیوں اور عظیم مرتبے کے باوجود اس طرح ہمارے قریب ہوا کہ اس نے ہمارے لیے دین وآئین زندگی مقرر کر دیا اور اس میں قوانین واحکامات قرار دیئے کہ جو اوامر ونواہی اور فرامین وارشادات پر مشتمل ہیں اور ان احکامات کی پیروی پر آخرت میں ثواب وجزاء اور نافرمانی پر عقاب وسزا مقرر کر دی‘ اور ہماری ہدایت ورہنمائی کے لیے رسول وپیغمبر بھیجے جنہوں نے ہمیں فرمانبرداری واطاعت کرنے پر انعام

آئے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر سزا کا اطلاق تو صحیح ہو لیکن اسے سزا نہ دی جائے' اور یہ تضاد اسی طرح ہوگا جس طرح متضاد طبیعی اسباب ایک دوسرے پر غالب آ جاتے ہیں اور ایک سبب دوسرے سبب کے مقابلے میں زیادہ موثر واقع ہوتا ہے' پس شفاعت درحقیقت کسی کو نفع پہچانے یا نقصان سے بچانے کے لیے واسطہ و وسیلہ بننے کا نام ہے البتہ ایسا کرنا سزا کے عوامل پر سزا کے خاتمہ کے عوامل کو غلبہ دینے کے ذریعے ہو، نہ یہ کہ ان کے درمیان تضاد پیدا کرکے!

ان مطالب سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ''شفاعت'' بھی اسباب میں سے ایک سبب ہے (سببیت کا ایک مصداق ہے) اور وہ اس عمل سے عبارت ہے جس کے ذریعے مسبب اور اس کے دور والے سبب کے درمیان اس سبب کو لا کھڑا کیا جائے جو اپنے مسبب سے زیادہ قریب ہوتا کہ وہ دور والے سبب کی تاثیر کا راستہ روک سکے' گویا شفاعت و سفارش کرنے والے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسا سبب لائے جو اپنے مسبب سے دوسرے ہر سبب کی نسبت زیادہ نزدیک ہوتا کہ اس کے ہوتے ہوئے دوسرا کوئی سبب اثر انداز نہ ہونے پائے' یہ ہے وہ اہم نکتہ جو ہم نے شفاعت کے معنی کا تجزیہ و تحلیل کر کے سمجھا ہے تاہم یہ بات یاد رہے کہ یہاں شفاعت سے ہم نے وہی معنی مراد لیا ہے جس کے ہم قائل ہیں۔

اب جبکہ یہ بات واضح ہوگئی کہ شفاعت' سببیت کا ایک مصداق ہے تو اس سببیت میں خداوند عالم کی بابت دو صورتیں اور حیثیتیں قابلِ تصور ہیں:

(۱) تکوینی حیثیت (۲) تشریعی حیثیت

تکوینی حیثیت کی وضاحت!

خداوند عالم ہر سبب کا مبدأ اور نقطۂ آغاز ہے' ہر سبب کی اثر آفرینی کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے اور وہی سببیت کا منتہا ہے یعنی ہر سبب اپنے سبب ہونے کے لحاظ سے اسی تک جا پہنچتا ہے لہٰذا خلق کرنے اور وجود عطا کرنے کا مطلق اختیار و ملکیت اسی کے پاس ہے یعنی وہی ہر چیز کو وجود عطا کرنے والا ہے اور تخلیق و ایجاد کا مکمل اختیار اسے حاصل ہے اور تمام علل و اسباب اس کے اور اس کے علاوہ دیگر چیزوں کے درمیان وسیلہ و واسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی وہ خدا کی ہمیشہ باقی رہنے والی رحمت اور شمار نہ کی جاسکنے والی نعمت کو اس کی مخلوق تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔

تشریعی حیثیت کی وضاحت!

خداوند عالم اپنی خاص عنایتوں کے ساتھ ہم پر احسان کرتے ہوئے اپنی تمام تر بلندیوں اور عظیم مرتبے کے باوجود اس طرح ہمارے قریب ہوا کہ اس نے ہمارے لیے دین و آئین زندگی مقرر کر دیا اور اس میں قوانین و احکامات قرار دیئے کہ جو اوامر و نواہی اور فرامین و ارشادات پر مشتمل ہیں اور ان احکامات کی پیروی پر آخرت میں ثواب و جزاء اور نافرمانی پر عقاب و سزا مقرر کر دی' اور ہماری ہدایت و رہنمائی کے لیے رسول و پیغمبر بھیجے جنہوں نے ہمیں فرمانبرداری و اطاعت کرنے پر انعام

وجزا کی خوشخبری وبشارت دی اور نافرمانی ومخالفت کرنے پر سزا سے خوف دلایا' ان پیغمبروں نے خدا کے دین واحکام کو نہایت احسن طور پر ہم تک پہنچایا اور اس طرح ہم پر حجت پوری ہوگئی:

سورہ ءانعام، آیت ۱۱۵:

"وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ"۔

(تیرے پروردگار کی بات سچائی اور عدل کے ساتھ پوری ہوگئی' خدا کے کلمات کو کوئی شخص تبدیل نہیں کرسکتا)

اب مذکورہ بالا دوصورتوں اور پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھنا یہ ہے کہ "شفاعت" ان دونوں میں سے کس کے ساتھ قابل انطباق ہے' تو جہاں تک پہلی صورت یعنی تکوین (خلق وایجاد) کا تعلق ہے تو اس کے تناظر میں شفاعت کے معنیٰ کا وجود کے اسباب وعلل پر منطبق ہونا نہایت واضح امر ہے کیونکہ ہر سبب اپنے مافوق سبب اور اپنے مسبب کے درمیان واسطہ و ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وجود کے تمام اسباب وعلل خداوند عالم کی عظیم وبلند صفات: مثلاً رحمت' خلق وایجاد' احیاء (زندگی عطا کرنا) رزق دینا وغیرہ ہی سے کسب فیض کرتے ہیں اور پھر ان سب کو خدا کی مخلوق میں سے ہر حاجتمند تک پہنچاتے ہیں' یعنی وہ خدا کی طرف سے گوناگوں نعمتوں اور فضیلتوں کو ان کے حاجتمندوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں' اور شفاعت کے اس معنیٰ کا اشارہ قرآن مجید میں بھی ملتا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ ءبقرہ، آیت ۲۵۵:

★ "لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ"

(خدا ہی کے لیے ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے' کون ہے جو اس کے پاس شفاعت کرسکے اس کی اجازت واذن کے بغیر!)

سورہ ءیونس، آیت ۳:

★ "اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۗ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ"

(یقیناً تمہارا پروردگار خدا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں خلق کیا' پھر وہ عرش پر مستقر ہوگیا' امور کی تدبیر اور نظام عالم اسی کے ہاتھ میں ہے' کوئی شخص اس کی اجازت واذن کے بغیر شفاعت کا حق نہیں رکھتا)۔

ان دونوں آیتوں میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق وایجاد کا تذکرہ کیا گیا ہے' لہٰذا تکوین یعنی تخلیق وایجاد کے باب میں شفاعت سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وجود کے اسباب خدا اور اپنے مسببات (وہ مخلوق کہ جسے وجود عطا کیا گیا) کے درمیان ان کی تدبیر اور ان کے وجود وبقاء کے نظام کی ترتیب میں واسطہ وذریعہ کا کام دیتے ہیں' اسی کا نام "تکوینی شفاعت" ہے۔

اور دوسری صورت یعنی تشریعی پہلو میں شفاعت کی بابت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے مفہوم کے بارے میں ہم نے

جو تجزیہ و تحلیل پہلے پیش کی ہے اس کی روشنی میں تشریعی پہلو میں بھی شفاعت کا ثبوت ملتا ہے اور اس میں کوئی حرج لازم نہیں آتا۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں جن میں صراحت کے ساتھ اس امر کو بیان کیا گیا ہے:

سورہ طہٰ، آیت ۱۰۹:

★ "يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا"۔

(اس دن (روز قیامت) کسی کی شفاعت کام نہ آئے گی سوائے اس کی شفاعت کے، کہ جسے خدائے رحمان نے اذن و اجازت دی اور اس کی بات پر راضی ہوا)

سورہ سباء، آیت ۲۳:

★ "لَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ"

(اس کے پاس کوئی شفاعت کام نہ آئے گی سوائے اس کے، کہ جسے اس نے اجازت دیدی)۔

سورہ نجم، آیت ۲۶:

★ "لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ"

(ان کی شفاعت کسی کام نہ آئے گی مگر بعد اس کے، کہ خدا جسے چاہے اذن دے اور اس سے راضی ہو)۔

سورہ انبیاء، آیت ۲۸:

★ "وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ"

(اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کی، کہ جس سے خدا راضی ہوا)۔

سورہ زخرف، آیت ۸۶:

★ "وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ"

(خدا کے علاوہ وہ جن لوگوں کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کے مالک نہ ہوں گے سوائے اس کے، کہ جس نے علم و آگاہی کے ساتھ حق کی گواہی دی)۔

مذکورہ بالا تمام آیات تشریعی پہلو میں شفاعت کو ثابت کرتی ہیں اور ان میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ شفاعت، خدا کے کئی بندوں مثلاً فرشتوں اور بعض انسانوں کے لیے خدا کے اذن و اجازت اور رضایت کی بنیاد پر ثابت ہے یعنی جنہیں خدا ایسا کرنے کا اذن و اجازت دے اور ان سے راضی ہو وہی شفاعت و سفارش کر سکتے ہیں اور یہی شفاعت کی تملیک ہے یعنی خدا نے ان افراد کو شفاعت کرنے کا حق دیا ہے اور وہ ایسا کر بھی سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز کا مالک ہے اور ہر طرح کا اختیار بھی رکھتا ہے جسے جو چاہے عطا کرے یہ اس کے اختیار میں ہے جیسا کہ اس نے خود ہی فرمایا ہے: "ولله الملك وله الامر" کہ خدا ہی ہر چیز کا مالک اور صاحب اختیار ہے اور سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے لہٰذا جنہیں خداوند عالم نے شفاعت کا حق

دیا ہے وہ خدا کی رحمت، عفو و مغفرت اور اس طرح کی دیگر عظیم صفات الٰہی سے تمسک اختیار کر سکتے ہیں تا کہ وہ صفات، خد کے اس بندے کے شامل حال ہو جائیں جو معصیت و گناہ کی وجہ سے بدحالی کا شکار ہو چکا ہو اور اسے نافرمانی کی سزا و عقوبت کی زنجیروں نے جکڑ لیا ہو تا کہ وہ خدا کی رحمت و بخشش اور عفو و مغفرت کے ذریعے اس سزا سے نجات پا لے اور جو جرم اس نے کیا ہے اس کے آثار سے بچ سکے، یہی وہ اہم نکتہ ہے جو ''شفاعت'' کے معنی و مفہوم میں پایا جاتا ہے اور ہم نے اس سلسلہ میں شفاعت کی بحث کے آغاز میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ شفاعت، رحم کی سفارش و استدعا کی ایک صورت ہے نہ کہ سزا کے فیصلے کی نفی یا اس سے تضاد و تعارض (تصادم) کی کوئی شکل! لہٰذا سزا کی تبدیلی یا بخشش جو کہ شفاعت کا اثر و نتیجہ ہے اس میں مجرم و گناہگار کے لیے مقرر کی گئی سزا کی نفی یا تضاد نہیں پایا جاتا بلکہ یہ ایک طرح کی ''تبدیلی'' ہے جس کا تذکرہ خود خداوند عالم نے قرآن مجید میں فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ فرقان، آیت ۷۰:

★ فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ''

(خداوند عالم ان لوگوں کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم ایک عمل کو دوسرے عمل کی صورت میں بدل سکتا ہے اور یہ بالکل اسی طرح پر ہے جس طرح خداوند عالم کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی عمل کو سرے ہی سے ختم کر دے اور اسے وجود سے محروم کر کے وادیٔ عدم میں ڈال دے جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا:

سورہ فرقان، آیت ۲۳:

★ '' وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا''

(اور ہم ان کے ہر عمل کو نیست و نابود کر کے ہوا میں اڑتی ہوئی خاک بنا دیں گے)۔

سورہ محمد، آیت ۹:

☆ ''فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ـــ''

(پس اس نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا)۔

سورہ نساء، آیت ۳۱:

★ '' اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ''

(اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہاری ...... چھوٹی چھوٹی ...... خطاؤں سے درگزر کریں گے)۔

سورہء نساء، آیت ۴۸:

★ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ"

(خداوند عالم کبھی اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے البتہ اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے)۔

یہ آخری آیت یقیناً ایمان اور توبہ کے بارے میں نہیں کیونکہ ایمان اور توبہ جس طرح دوسرے گناہوں کی بخشش کا سبب بنتے ہیں اسی طرح شرک کے گناہ کی بخشش کا سبب بھی ہیں اور ان کی وجہ سے شرک کا گناہ بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی خداوند عالم کے اختیار میں ہے کہ وہ تھوڑے عمل کو زیادہ کر دے، جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا:

سورہء قصص، آیت ۵۴:

★ "اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَہُمۡ مَّرَّتَیۡنِ"

(یہی وہ لوگ ہیں کہ جنہیں ان کا اجر دو مرتبہ (دگنا) دیا جائے گا)۔

سورہء انعام، آیت ۱۶۰:

★ "مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِہَا"

(جو شخص ایک نیکی کرے، اسے اس جیسی دس نیکیاں دی جائیں گی)۔

اور جس طرح خداوند عالم ایک عمل کو دوسرے عمل میں تبدیل کر سکتا ہے اور تھوڑے عمل کو زیادہ کر سکتا ہے، اسی طرح کسی معدوم عمل کو وجود بھی عطا کر سکتا ہے جیسا کہ اس سلسلہ میں اس کا ارشاد گرامی ہے:

سورہء طور، آیت ۲۱:

★ "وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ اتَّبَعَتۡہُمۡ ذُرِّیَّتُہُمۡ بِاِیۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ وَ مَاۤ اَلَتۡنٰہُمۡ مِّنۡ عَمَلِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ کُلُّ امۡرِیٴٍۭ بِمَا کَسَبَ رَہِیۡنٌ"

(جو لوگ ایمان لائے اور ان کی ذریت و اولاد نے ان کی پیروی کی تو ہم ان کی اولاد و ذریت کو ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے اور انہیں ان کے اعمال میں سے کسی چیز سے محروم نہیں کریں گے کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے)۔

اس آیت میں "لحوق" اور الحاق سے مراد یہی ہے کہ انہیں عمل کی نعمت عطا کی جائے گی' خلاصۂ کلام یہ کہ خداوند عالم جو چاہے کر سکتا ہے اور جو حکم صادر کرنا چاہے اسے اختیار حاصل ہے' البتہ یہ امر ملحوظ ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس مصلحت و بہتری کی بنیاد پر کرتا ہے جو اس کے اور اس کام کے درمیان پائی جاتی ہے' لہٰذا یہ ممکن ہے کہ ان مصلحتوں اور اسباب میں سے ایک مصلحت و سبب انہی شفاعت کرنے والوں مثلاً انبیاء و اولیاء الٰہی اور اس کے نیک و مقرب بندوں کا شفاعت کرنا ہو' اس میں کوئی حرج و بیجا امر لازم نہیں آتا اور نہ ہی ظلم و زیادتی کا کوئی پہلو پایا جاتا ہے۔

مذکورہ مطالب سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ شفاعت 'شافعیت یعنی ''شفاعت کرنے والا ہونے'' کے معنی میں حقیقی طور پر خداوند عالم کے لیے ثابت ہے اور صرف اسی ذات پر منطبق ہوتی ہے کیونکہ خدا کی صفات میں سے ہر صفت اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان وجود کی فیض رسانی اور عطا و عنایت میں واسطہ و وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا حقیقی معنی میں شفاعت کرنے والا وہی ہے اور وہی شفیع علی الاطلاق ہے جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا:

سورہء زمر، آیت ۴۴:

★ '' قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا''

(کہہ دیجئے کہ سب کی سب شفاعت خدا کے لیے مخصوص ہے)۔

سورہء سجدہ، آیت ۴:

★ '' مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ''

(تمہارے لیے خدا کے سوا کوئی سرپرست نہیں اور نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا ہے)۔

سورہء انعام، آیت ۵۱:

★ '' لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ''

(ان کے لیے خدا کے سوا کوئی سرپرست اور شفاعت کرنے والا نہیں)۔

اور یہ امر بھی واضح و ناقابل انکار ہے کہ خدا کے علاوہ جو بھی شفاعت کرے وہ خدا کے اذن اور اس کی طرف سے دی گئی اجازت و حق کی بنیاد پر کرے گا۔

شفاعت کے سلسلہ میں اب تک جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خدا کے حضور، شفاعت کرنا صرف اسی حد تک ثابت ہے کہ جس سے خدا کی ذات والا صفات کی عظمت و کبریائی پر کوئی حرف نہ آتا ہو (اس کی وضاحت یوں ہے کہ اگر خداوند عالم اپنے کسی نیک و مخلص بندے کے شفاعت کرنے کی وجہ سے کسی گناہگار و معصیت کار کی سزا معاف کر دے تو اس میں کوئی حرج لازم نہیں آتا کیونکہ خدا کا حق تھا کہ وہ نافرمانی کرنے والے کو سزا دے اور خدا نے اپنے حق کو معاف کر دیا اور اپنے نیک و مخلص بندے کی شفاعت پر اور اسے اپنی خاص عنایت سے نوازتے ہوئے اپنے حق سے دستبردار ہو گیا' ایسا کرنا عقلی طور پر ہرگز غلط نہیں اور اس سے خدا کی عظمت و کبریائی پر کوئی حرف نہیں آتا)۔

شفاعت پر کئے جانے والے اعتراضات

شفاعت کے بارے میں اب تک جو مطالب ذکر کئے گئے ہیں ان سے آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ شفاعت 'فی الجملہ ثابت ہے یعنی ایک حد تک نہ کہ ہر طرح سے اور کلی طور پر' اور عنقریب آپ یہ ملاحظہ کریں گے کہ قرآن مجید

اوراحادیث وروایات میں بھی اس سے زیادہ کا ثبوت نہیں ملتا' بلکہ اگر ہم شفاعت کے لفظ پر غور کریں تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کلی طور پر نہیں بلکہ فی الجملہ اور ایک حد تک ثابت و ممکن ہے کیونکہ شفاعت جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے درحقیقت سبب اور مسبّب کے درمیان واسطہ بننے کے عمل کو کہتے ہیں تاکہ اس کی وجہ سے دوروالا سبب نزدیک والے سبب کے باعث مسبب پر اثر انداز نہ ہوسکے' گویا شفاعت' سببیت اور تاثیر میں واسطہ بننے کا دوسرا نام ہے اس لیے اس کا علی الاطلاق اور کلی طور پر ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور یہ امر معقول ہی نہیں کہ کوئی چیز کسی قید وشرط کے بغیر کسی چیز کا سبب اور اس میں موثر واقع ہو لہٰذا سبب اور واسطہ بننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ ہر طرح کی شرط وشروط سے خالی نہیں' بنا برایں یہ ممکن نہیں کہ ایک سبب کسی شرط وقید کے بغیر ہر مسبب کے لیے سبب کا کام دے اور ایک مسبب ہر طرح کے سبب کا مسبّب بن جائے' ایسا ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ کوئی چیز کسی چیز کا سبب ہی نہ بن سکے یا پھر ہر چیز ہر چیز کا سبب ہو' تو اس طرح سے سببیت کا نظام ہی درہم برہم ہوجائے اور اس کی اساس و بنیاد ہی ختم ہوکر رہ جائے جو کہ کسی صورت میں درست نہیں' یہی وجہ ہے کہ شفاعت کے منکرین اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں کہ شاید شفاعت کا عقیدہ رکھنے والے اسے علی الاطلاق اور ہر طرح کی قید وشرط کے بغیر ثابت کرتے ہیں' لہٰذا ان لوگوں (منکرین) نے شفاعت پر کئی اعتراضات کئے اور انہی اعتراضات کی بنیاد پر انہوں نے شفاعت ایسی قرآنی حقیقت کا انکار کردیا جبکہ انہوں نے کلام الٰہی میں جو کچھ شفاعت کے معنی ومفہوم کی بابت ذکر کیا گیا ہے اس پر صحیح طرح سے غور وفکر نہیں کیا بلکہ شفاعت کے معنی کو غلط رنگ دے کر اور اس کی بابت غلط فہمی کا شکار ہوکر اس کی اصل کے ہی منکر ہوگئے' ہم ذیل میں ان لوگوں کے بعض اعتراضات ذکر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

پہلا اعتراض:

خداوند عالم نے ہر جرم کرنے والے اور گناہ ومعصیت کا ارتکاب کرنے والے کے لیے سزا مقرر فرمائی ہے جو قیامت کے دن اسے دی جائے گی' اور اس سزا کے بارے میں خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے لوگوں کو ڈرایا اور اس سے خوف دلایا ہے' تو اب سوال یہ ہے کہ اگر خدا قیامت کے دن کسی مجرم اور گناہگار و معصیت کار کو وہ مقررہ سزا نہ دے تو اس کا ایسا کرنا انصاف ہوگا یا ناانصافی؟' اگر آپ کہیں کہ ایسا کرنا انصاف ہوگا تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلے حکم اور سزا کا فیصلہ ناانصافی اور ظلم تھا جو کہ خدا کی ذات والا صفات کے ہرگز شایان شان نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کا ایسا کرنا ظلم وناانصافی کہلائے گا کیونکہ مجرم کو سزا دینا ہی عدل وانصاف ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام یا کسی دوسرے شفاعت کرنے والے کا شفاعت کرنا خدا سے ظلم وناانصافی کرنے کا مطالبہ واستدعاء ہے جو کہ ایک نہایت جاہلانہ فعل ہے اور اس طرح کے فعل کی نسبت انبیاء علیہم السلام اور خدا کے خالص ومخلص بندوں کی طرف ہرگز نہیں دی جاسکتی۔

جواب

اس اعتراض کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے۔ نقضی اور حلی، دونوں کی تفصیلات ملاحظہ ہوں:

۱۔ (نقضی جواب)

سب سے پہلے ہم ان معترضین حضرات سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ آپ خداوند عالم کی طرف سے صادر ہونے والے ان احکامات کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو صرف کسی کو آزمانے کے لیے اس نے جاری کئے اور پھر انہیں تبدیل کر دیا جبکہ پہلے خود ہی انہیں صادر فرمایا اور پھر خود ہی انہیں واپس لے لیا' تو آیا اس کا ایسا کرنا یعنی پہلے حکم دے کر پھر واپس لے لینا اور صرف بندے کو آزمانے کے لیے ایسا کرنا عدل ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا کا ایسا کرنا ناانصافی اور ظلم ہے بلکہ دونوں احکامات عدل وانصاف پر مبنی ہیں' اور احکامات کی تبدیلی یا حکم صادر کرنے کے بعد اسے واپس لے لینے میں اصل راز یہ ہے کہ خداوند عالم اپنے بندے کا امتحان لینا چاہتا ہے اور اس کے باطن کو پرکھنا چاہتا ہے یا اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا چاہتا ہے لہٰذا اسے کچھ کرنے کا حکم دیتا ہے اور پھر وہ حکم واپس لے لیتا ہے' یہی صورت حال شفاعت میں بھی ممکن ہے کہ مثلاً خداوند عالم نے تمام مومنین کے لیے نجات مقرر کر دی ہو پھر ان کے لیے کچھ احکامات صادر کئے ہوں اور ان احکامات کی خلاف ورزی پر سزا مقرر کر دی ہو تا کہ کفار اپنے کفر کی وجہ سے تباہ ہوں اور مومنین ان احکامات کی پیروی اور اطاعت کے سبب بلند درجات پالیں اور گناہگار بندے شفاعت کے ذریعے اپنی اس نجات کی منزل کو پائیں جو خداوند عالم نے ان کے لیے مقرر کی ہے خواہ وہ نجات عذاب وسزا کی بعض قسموں یا بعض افراد کے لیے ہی کیوں نہ ہو لیکن بعض دوسری سزائیں اور عذاب مثلاً برزخ کی سختی اور قیامت کے دن کی وحشت وغیرہ ان پر طاری ہو' اگر ایسا ہو تو اس صورت میں خداوند عالم کی طرف سے احکامات کا صادر ہونا بھی عدل پر مبنی ہوگا اور پھر ان احکامات کی مخالفت پر سزا نہ دینا بھی (شفاعت کی وجہ سے) عدل ہی کہلائے گا۔

(۲) (حلی جواب)

شفاعت کے ذریعے سزا کو ختم کر دینا اسی صورت میں پہلے صادر کئے گئے حکم سے متصادم سمجھا جائے گا اور یہ سوال پیدا ہوگا کہ آیا ایسا کرنا عدل ہے یا ظلم وناانصافی' جب شفاعت کے ذریعے سزا وعذاب کو ختم کرنا پہلے حکم کی نفی اور اسے نقض کرنے یا اس کے آثار کو ختم کرنے کے مترادف ہو' جبکہ ایسا ہرگز نہیں اور آپ نے سابقہ بیانات اور شفاعت کے معنی ومفہوم کے بارے میں ذکر کئے گئے مطالب سے اچھی طرح اس امر سے آگاہی حاصل کر لی ہے کہ شفاعت خدا کے احکامات کی نفی کا سبب نہیں بلکہ شفاعت کا اثر صرف یہ ہے کہ وہ مجرم کو سزا کے مستحق قرار پانے والوں کے دائرے سے نکال کر خدا کی رحمت اور عفو ومغفرت کا مستحق بنا دیتی ہے' یا یہ کہ خداوند عالم شفاعت کرنے والے کی عزت واحترام کے پیش نظر اس پر نظر کرم فرما

ہے.....تو اس صورت میں شفاعت کے سبب سزا کی نفی نہیں بلکہ خدا کی رحمت کی وسعت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

دوسرا اعتراض

شفاعت کے سلسلہ میں دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ خداوند عالم کا اصول اور طریقۂ عمل تغیر پذیر نہیں بلکہ اس کے تمام افعال نہایت مضبوط اور ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں کہ جن میں کسی قسم کی تبدیلی یا اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس کے تمام فیصلے اور احکامات یکساں طور پر جاری و نافذ ہوتے ہیں اور ان میں استثناء کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی' یہی حال دیگر اسباب کا ہے یعنی دنیا میں سبب اور مسبب کا نظام بھی اسی بنیاد پر چل رہا ہے اور یہ سنت الٰہی تمام اسباب کی اصل و اساس ہے' جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہء حجر، آیت ۴۳:

★ "قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ" ۔

(خدا نے فرمایا یہی میرا سیدھا راستہ ہے' میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار حاصل نہیں سوائے ان لوگوں کے، کہ جنہوں نے گمراہوں میں سے تیری پیروی کی' اور ان سب (گمراہوں) کے لیے جہنم ہی وعدہ گاہ ہے)۔

سورہء انعام، آیت ۱۵۳:

★ "وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ" ۔

(یہی میرا سیدھا راستہ ہے پس تم اس کی پیروی کرو......اس پر چلو......اور دوسرے راستوں پر نہ چلو ورنہ وہ تمہیں پراکندہ کر دیں گے)۔

سورہء فاطر آیت ۴۳:

★ "فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا" ۔

(پس آپ ہرگز خدا کی سنت و روش میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے اور آپ ہرگز خدا کے طریقے میں کوئی تبدیلی نہ دیکھیں گے)۔

مذکور بالا آیات مبارکہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی سنت و طریقہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پائی جاتی جبکہ شفاعت ، خداوند عالم کے طریقے اور اصول کو توڑ دینے کا سبب بنتی ہے کیونکہ تمام مجرمین کو سزا نہ دینا اور ان کے تمام جرائم سے درگزر کرنا مقصد و ہدف اور اصولوں سے دستبردار ہونے کے مترادف ہے جبکہ خداوند عالم کی ذات والا صفات ایسا کرنے سے بالاتر ہے اور یہ ممکن ہی نہیں بلکہ ایسا کرنا اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین سے کھیلنے کے برابر ہے جو کہ خدا کی حکمت کے منافی ہے اور وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتا' وہ صاحب حکمت اور دانا ہے اس کا ہر حکم اپنے صحیح موارد میں جاری و نافذ ہوتا ہے لہٰذا مجرموں

کے جرائم سے چشم پوشی کرنا اس کی پاکیزہ و عظیم حکمت سے ہرگز ہم آہنگ نہیں ہو سکتا اور اس کا بعض مجرموں کے بعض جرائم
گناہوں سے درگزر کرنا اور ان پر انہیں سزا نہ دینا بھی اسی طرح پر ہے، یعنی ایسا کرنے سے بھی خداوند عالم کے نہایت مضب
اور ٹھوس اصولوں کا متزلزل ہونا لازم آتا ہے اور اس کی ہمیشہ سے جاری سنت و روش میں لچک پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے دا
طریقہ کار میں تبدیلی کی راہ نکلتی ہے جو کہ ہرگز ممکن نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے تمام قوانین و احکامات میں یکسانیت پ
جاتی ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ کچھ احکام تو قابل عمل ہوں اور کچھ نہ ہوں، اور کچھ مجرموں کو سزا دی جائے اور کچھ کو سزا نہ دی جا۔
خدا کے قانون میں یہ بات ممکن نہیں کیونکہ اس کے ہاں مجرموں کے درمیان مجرم ہونے کے حوالہ سے کوئی فرق نہیں پایا جاتا ا
نہ ہی گناہوں کے درمیان گناہ و جرم ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق ہے اور ہر گناہ خدا کی بندگی کے پاکیزہ دائرے سے باہر ق
رکھنے کے برابر ہے لہٰذا کسی مجرم کو سزا دینا اور کسی کو شفاعت و سفارش کی وجہ سے سزا نہ دینا خدا کی ذات سے قابل تصور نہیں ا
وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتا کہ کچھ مجرموں کو ان کے گناہوں اور جرائم پر سزا دے اور کچھ مجرموں کو صرف اس لیے سزا نہ دے کہ ا
کی سفارش و شفاعت کی گئی ہے، یہ بات خداوند عالم کے عظیم مقام و مرتبہ اور بلند پایہ ذات کے شایان شان نہیں لہٰذا یہ تسلیم ک
پڑے گا کہ شفاعت خدا کے قانون اور احکامات کا مذاق اڑانے اور ان سے کھیلنے کا سبب بنتی ہے، البتہ شفاعت و سفارش ا
دنیاوی زندگی میں یقیناً کام آتی ہے اور ہماری معاشرتی زندگی میں شفاعت و سفارش اہم کردار ادا کرتی ہے کیونکہ اس ۃ
ہمارے تمام کام ہماری نفسانی خواہشات اور ایسے موہوم نظریات پر استوار ہوتے ہیں جن کے سبب ہم حق و باطل کی پہچان ا
ان کے درمیان تمیز نہیں کر سکتے بلکہ دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور حکمت و دانائی اور جہالت و نادانی کے درمیان فر
نہیں کرتے، ایسے حالات میں شفاعت و سفارش کام آتی ہے لیکن جہاں تک خدا کے احکامات کا تعلق ہے اور اس کے قوانۂ
اور ان کی نافرمانی پر سزاؤں کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں کسی قسم کی لچک نہیں پائی جاتی اور نہ ہی شفاعت و سفارش کی وجہ۔
ان میں کوئی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے کیونکہ ایسا ہونا خدا کی حکمت کے منافی ہے۔

جواب

یہ بات درست ہے کہ خداوند عالم کا راستہ سیدھا اور اس کے طریقۂ عمل میں یکسانیت ہے اور اس کی روش ایک۔
لیکن اس کی یہ وحدت آمیز اور اختلاف ناپذیر روش اس کی عظیم و بلند پایہ صفات میں سے کسی ایک صفت کے ساتھ محد
نہیں اور ایسا نہیں کہ اس کا طریقۂ عمل اس کی ایک ہی صفت مثلاً قانون سازی اور "حکم صادر کرنے" کی بنیاد پر استوار ہوَ
اس کا کوئی حکم یا کسی حکم کی نافرمانی پر مقرر کی گئی سزا میں کسی قسم کی تبدیلی نہ آسکتی ہو، ایسا ہرگز نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسَ
روش اور طریقۂ عمل اس کی تمام مربوط صفات کے بنیادی تقاضوں کی بنیاد پر قائم و استوار ہے۔
اس کی وضاحت یوں ہے کہ یہ امر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ خداوند عالم ہی دنیائے ہستی میں پائی جا۔
والی تمام موجودات کو زندگی، موت، رزق، نعمتیں وغیرہ عطا کرنے والا ہے اور یہ سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے جبکہ یہ تمام ام

ایک جیسے نہیں بلکہ مختلف حیثیت کے حامل ہیں لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ سب امور خدا کے ساتھ ایک ہی حیثیت سے تعلق رکھتے ہوں اور ایک ہی جہت میں اس کے ساتھ ان کا ربط ہو کیونکہ اگر ایسا ہو کہ یہ سب امور ایک ہی نسبت سے خدا کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں تو پھر سبب اور مسبب کا نظام ہی باقی نہ رہے جبکہ کوئی کام سبب و مسبب کے نظام کے بغیر انجام پذیر ہی نہیں ہوتا مثلاً خداوند عالم جب کسی بیمار کو شفا دیتا ہے تو کسی ظاہری سبب اور شفا کی متقاضی مصلحت کے بغیر شفا نہیں دیتا اور نہ ہی اس حیثیت میں کہ وہ موت دینے والا' انتقام لینے والا اور نہایت قوی و طاقتور ہے بلکہ اسے اپنی اس حیثیت میں شفا دیتا ہے کہ وہ مہربان' رحم والا' نعمتیں دینے والا' شفا عطا کرنے والا اور عفو و درگزر کرنے والا پروردگار ہے' اسی طرح اگر وہ کسی جابر و ستمگر کو ہلاک و تباہ کرتا ہے تو اسے بھی کسی ایسے ظاہری سبب کے بغیر ہلاک نہیں کرتا جو اس کی ہلاکت کا موجب ہو اور نہ ہی اسے اپنی اس حیثیت میں اسے ہلاک کرتا ہے کہ وہ مہربان اور رحم والا ہے بلکہ اپنی اس حیثیت میں اسے ہلاک کرتا ہے کہ وہ انتقام لینے والا' سخت طاقتور اور قہار و غالب ہے' اور قرآن مجید نے نہایت صراحت کے ساتھ اس امر کو بیان کیا ہے کہ خدا کا ہر کام ظاہری سبب کے ساتھ اور مصلحت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور وہ دنیا میں رونما ہونے والے جس امر کو بھی اس کے وجود کی نسبت سے اپنی طرف منسوب کرتا ہے تو اپنی کسی ایک یا ان چند صفتوں کے حوالے سے منسوب کرتا ہے جو اس امر سے مناسبت رکھتی ہوں اور انہی جہات کی بنیاد پر اپنی طرف نسبت دیتا ہے جو اس امر اور واقعہ سے ایسی مناسبت رکھتی ہوں جس کے نتیجے میں وہ امر اور واقعہ وجود میں آ جائے' اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہر چیز اور ہر کام کی نسبت اپنی مصلحتوں اور خوبیوں کے حوالہ سے خدا کی طرف ہوتی ہے یعنی انہی خوبیوں کی وجہ سے اس کا تعلق خدا کے ساتھ ہوتا ہے' اب جبکہ آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ہر کام کی نسبت خدا کی طرف اس کام میں پائی جانے والی مصلحت اور خوبی کے حوالہ سے ہوتی ہے تو اس کی روشنی میں یہ نتیجہ حاصل کرنا آسان ہے کہ خدا کے راستے کا سیدھا (مستقیم) ہونا اور اس کی سنت و روش کا تغیر ناپذیر ہونا اور اس کے کسی کام میں اختلاف و دورنگی کا نہ پایا جانا اس وجہ سے ہے کہ وہ ہر کام ظاہری سبب و مصلحت اور اپنی تمام صفات عالیہ میں سے مربوط و مناسب صفت کے ساتھ انجام دیتا ہے نہ یہ کہ اپنی ایک ہی صفت اور حیثیت کے ساتھ' لہٰذا مصلحتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے اس کا ہر کام ایک ہی مصلحت کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ ہر چیز کی مناسبت کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو بلکہ سب کام ایک ہی جہت و صفت کے ساتھ انجام پذیر ہوں تو پھر خدا کا حکم اپنے سبب کی وجہ سے نیک و بد اور مومن و کافر سب کے لیے یکساں ہو جبکہ ان میں فرق پایا جاتا ہے اور چونکہ اسباب زیادہ ہیں لہٰذا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ متعدد اسباب یکجا ہو کر کسی چیز کے وجود میں آنے کے متقاضی ہوتے ہیں جبکہ بعض اسباب و عوامل اس کے وجود میں آنے کے متقاضی نہیں ہوتے' لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر حکم کا سبب ایک ہے اور اسی ایک سبب کی بنیاد پر سب کام انجام پذیر ہوتے ہیں۔ بنابرایں شفاعت و سفارش کی وجہ سے کسی سزا کا معاف کر دیا جانا خدا کی سنت و روش اور اصول میں تبدیلی نہیں کہلا سکتا اور نہ ہی اسے اس کے سیدھے راستہ (صراط مستقیم) میں کسی قسم کی کجی و انحراف کا موجب قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شفاعت کی وجہ سے سزا کی معافی، دراصل کئی عوامل کا نتیجہ اور کئی اسباب کا اثر ہے مثلاً رحمت' عفو و بخشش' حکم' فیصلہ'

حقدار کو اس کا حق دینا وغیرہ' تو یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنیاد پر شفاعت کے ذریعے سزا معاف ہو سکتی ہے اور اس سے سنت الہٰ
میں کسی قسم کی تبدیلی لازم نہیں آتی۔

تیسرا اعتراض

شفاعت کے سلسلے میں تیسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ عام طور پر لوگ شفاعت سے یہ مراد لیتے ہیں کہ شفاعت سفارش کرنے والا شخص حاکم و آقا کو اس بات پر آمادہ کرے کہ اس نے جس کام کے کرنے یا نہ کرنے کا ارادہ کیا ہے اس سے دستبردار ہو جائے اور اپنے ارادے کو بدل دے یعنی اگر اس نے کسی کام کے کرنے کا ارادہ کیا ہے، اسے نہ کرے اور جس کے نہ کرنے کا ارادہ کیا ہے اسے انجام دے' گویا شفاعت و سفارش کی وجہ سے آقا و حاکم اپنا ارادہ بدل دیتا ہے جبکہ کوئی عاد حکمران ہرگز ایسا نہیں کرتا اور وہ اس طرح کی شفاعت و سفارش کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک کہ اسے اس بات اچھی طرح یقین حاصل نہ ہو جائے کہ اس کا ارادہ اور حکم و فیصلہ غلط تھا اور اب مصلحت یہ ہے کہ وہ اسے بدل دے لیکن اگر حا ظالم و ستمگر ہو تو وہ اپنے مقرب درگاہ لوگوں کی شفاعت اور سفارش کو یقینا قبول کرتا ہے جبکہ وہ جانتا بھی ہے کہ یہ ناانصافی اور ظ ہے کیونکہ اس کے نزدیک شفاعت و سفارش کرنے والے کو راضی رکھنا عدل و انصاف کرنے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے ا لیے وہ انصاف و عدل کی پرواہ کئے بغیر شفاعت و سفارش کو قبول کر لیتا ہے اور یہ دونوں صورتیں خداوند عالم کی بابت ممکن نہیں کیونکہ خدا کا ارادہ اس کے علم کی بنیاد پر ہوتا ہے' اس کا علم ازلی اور ناقابل تغیر ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' بنا برایں خدا کا کسی کی شفاعت و سفارش کو قبول کرنا ناممکن ہے۔

جواب

شفاعت و سفارش کو قبول کرنا خدا کے ارادہ و علم میں تبدیلی کا سبب نہیں بنتا اور نہ ہی اس کے حکم و فیصلے کے غلط ثابت ہونے کا ثبوت بنتا ہے بلکہ جس چیز پر اس کا علم و ارادہ واقع ہو (مراد و معلوم) اس میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وضاحت یوں ہے کہ خداوند عالم کو علم ہے کہ فلاں شخص آئندہ کن حالات میں ہوگا یعنی فلاں وقت میں وہ فلاں حال میں ہ کیونکہ اس کے اسباب پیدا ہو جائیں گے جو کہ اسے اس حال سے دوچار کریں گے لہٰذا خدا بھی اب اس کے لیے دوسرا ارا کرتا ہے' جیسا کہ اس نے فرمایا ہے:

سورہ رحمان، آیت ۲۹:

★ "کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ"

(وہ ہر دن نئے کام میں ہے)۔

سورہء رعد، آیت ۳۹:

★ " یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَہٗۤ اُمُّ الْکِتٰبِ "

(خداوند عالم جو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اسی کے پاس اصل کتاب ہے)۔

سورہء مائدہ، آیت ۶۴:

★ " بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ "

(بلکہ اس کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہے انفاق کرتا ہے)۔

ان مطالب کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے یہ مثال دی جا سکتی ہے کہ مثلاً ہمیں یقین ہے کہ عنقریب فضا میں تاریکی چھا جائے گی اور ہم کچھ نہیں دیکھ پائیں گے جبکہ ہم دیکھنا بھی چاہتے ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس تاریکی کے بعد پھر سورج طلوع ہوگا اور روشنی آ جائے گا' ان دونوں چیزوں کا علم و یقین رکھنے کے باوجود ہم رات کی تاریکی آتے ہی چراغ جلانے اور تاریکی ختم ہونے پر چراغ بجھا دینے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس صورت میں ہمارے علم و ارادہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ جس چیز پر علم و ارادہ واقع ہوا ہے اس میں تبدیلی آئی ہے یعنی رات، دن میں اور دن، رات میں بدل گیا ہے (معلوم و مراد میں تبدیلی آئی ہے) نہ کہ ہمارے علم و ارادہ میں' گویا وہ (معلوم و مراد) اب ہمارے علم و ارادہ کا تطبیقی مصداق نہیں ہے بلکہ ان کے دائرہ انطباق سے باہر ہو گئے، تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہر علم ہر ''معلوم'' پر اور ہر ارادہ ہر ''مراد'' پر منطبق ہو' معلوم یعنی وہ چیز جس پر علم واقع ہوا اور ''مراد'' یعنی وہ چیز جس سے ارادہ تعلق پکڑے) البتہ علم و ارادہ کی جو تبدیلی خداوند عالم کی بابت محال و ناممکن ہے وہ یہ ہے کہ جن چیزوں پر خدا کا علم و ارادہ واقع ہوا ہے (معلوم' مراد) وہ تو اپنی حالت پر باقی ہیں لیکن خدا کا علم و ارادہ ان پر منطبق نہ ہو سکے' ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے غلطی و غلط فہمی اور ارادے کا ٹوٹ جانا کہا جاتا ہے جو کہ خداوند عالم کے لیے محال ہے' دوسرے لفظوں میں یہ کہ خدا کا علم غلط ثابت ہو جائے اور اس کا ارادہ پورا نہ ہو سکے یہ ہرگز ممکن نہیں' البتہ ایسا ہونا ہم انسانوں کے لیے ممکن ہے مثلاً آپ دور سے کسی چیز کو دیکھیں اور یہ سمجھیں کہ یہ انسان ہے لیکن جب وہ نزدیک آئے تو معلوم ہو کہ یہ گھوڑا ہے' تو اس صورت میں یقیناً ہمارا علم کہ یہ انسان ہے بدل جائے گا جبکہ وہ چیز اپنی اصلی حالت پر باقی رہے گی یعنی وہ گھوڑا انسان نہیں بن جائے گا بلکہ ہمارے علم میں تبدیلی آ جائے گی اور غلط فہمی دور ہو جائے گی' یہ تو ہے علم کی مثال' ارادے کی مثال بھی ایسی ہی ہے مثلاً آپ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور اسے انجام دینا بہتر سمجھتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام نہ دینا بہتر ہے تو ہم اپنے پہلے ارادے کو توڑ دیتے ہیں اور اس کام کے نہ کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اس صورت میں ہمارا ارادہ بدل گیا نہ کہ اس کام میں کوئی تبدیلی آئی' لیکن یہ دونوں صورتیں یعنی علم و ارادہ کی تبدیلی (غلطی و غلط فہمی اور ارادے کا ٹوٹ جانا) خداوند عالم کی بابت ہرگز ناممکن و نادرست ہے۔

مذکورہ مطالب میں غور کرنے سے آپ کو اس امر سے آگاہی حاصل ہو چکی ہے کہ شفاعت اور سفارش اور اس کی وجہ سے سزا کا معاف کر دینا اس طرح نہیں ہے بلکہ اس میں کئی دیگر عوامل و اسباب کارفرما ہوتے ہیں جن کی وجہ سے خداوند

عالم مجرم وگناہگار کو سزا نہیں دیتا نہ کہ غلطی وغلط فہمی یا ارادے کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے!۔

چوتھا اعتراض

لوگوں کے ساتھ شفاعت کا وعدہ کرنا اور انہیں شفاعت وسفارش کی امید دلانا اور انبیاء کرام علیہم السلام کا لوگوں کی شفاعت کی بابت بار بار یاد دہانی کرانا انہیں گناہ ومعصیت کی راہ پر آنے کی جرأت دلانے اور خدا کے احکامات کو نظر انداز کر دینے کی راہ ہموار کرنے کا سبب ہے اور یہ دین کی تبلیغ کے مقصد یعنی لوگوں کو خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کی طرف مائل کرنے کے سراسر منافی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ شفاعت کے بارے میں جو کچھ آیات وروایات میں ذکر کیا گیا ہے اس کی اس طرح سے توجیہ وتاویل کی جائے جس سے دین کے مقصد کی نفی نہ ہو۔

جواب

اس اعتراض کا جواب ہم دو طرح سے دیتے ہیں، نقضی اور حلی:

۱۔ (نقضی)۔اگر آپ شفاعت کی آیات کو گناہ ومعصیت کی ترغیب دلانے کا سبب سمجھتے ہیں تو ان آیات کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے جن میں عفو ومغفرت اور خدا کی وسیع رحمت کا تذکرہ کیا گیا ہے جبکہ عفو وبخشش والی آیات میں شرک کے علاوہ دیگر تمام گناہوں کی معافی کی گنجائش مذکور ہے جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا:

سورۂ نساء، آیت ۴۸:

★ ”اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ“

(خداوند عالم کبھی اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے البتہ اس کے علاوہ جسے چاہے معاف کر دیتا ہے)۔

اس آیت کے بارے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ توبہ کے سلسلے میں نہیں کیونکہ اس میں شرک کے گناہ کی بخشش نہ ہونے کا ذکر ہے جبکہ توبہ کے ذریعے شرک کا گناہ بھی معاف ہو سکتا ہے۔

۲۔(حلی)۔لوگوں کے ساتھ شفاعت کا وعدہ کرنا اور انبیاء کرام علیہم السلام کا شفاعت کی تبلیغ کرنا اس صورت میں لوگوں کو گناہ ومعصیت کی رغبت دلانے اور خدا کی نافرمانی کرنے میں جرأت کا سبب بن سکتا ہے جب اس میں یہ دو چیزیں پائی جائیں:

۱۔ مجرم وگناہگار اور اس کی نشانیاں معین کر دی گئی ہوں یا کم از کم اس گناہ کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہو جس میں شفاعت وسفارش قابل قبول ہو سکتی ہے اور ان دونوں صورتوں کی اس طرح صراحت ووضاحت کر دی گئی ہو کہ کسی قسم کا مغالطہ نہ ہونے پائے۔

۲۔ شفاعت ہر طرح کی سزا و عقاب کو ختم کرنے میں ہر وقت موثر واقع ہو یعنی اس کا قلع قمع کر دے۔

پس اگر یوں کہا جائے کہ فلاں قسم کے لوگ یا سب لوگ کسی جرم کی سزا نہیں پائیں گے اور انہیں ان کے کسی گناہ کی کبھی سزا نہیں دی جائے گی' یا یوں کہا جائے کہ فلاں گناہ پر کسی قسم کا کوئی عذاب اور سزا کبھی کسی کو نہیں دی جائے گی تو یہ دونوں صورتیں غلط اور احکام و فرائض کے ساتھ کھلا مذاق ہیں' لیکن اگر وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان نہ کیا جائے یعنی صریح الفاظ میں نہ کہا جائے کہ کن کن گناہوں میں اور کس قسم کے گناہوں کے لیے شفاعت قابل قبول ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس بات کی وضاحت کی جائے کہ آیا شفاعت کے ذریعے تمام سزائیں اور عذاب و عقاب تمام حالات و اوقات میں معاف کئے جا سکتے ہیں یا کچھ گناہ اور بعض سزائیں معاف ہو سکتی ہیں تو اس صورت میں کسی گناہ کرنے والے شخص کو اپنے بارے میں یہ اطمینان حاصل نہ ہو گا کہ آیا جس شفاعت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ اسے حاصل ہو گی یا نہ؟ تو ایسی صورت میں وہ شخص کبھی گناہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا اور کسی فعل حرام کے ارتکاب کا سوچ بھی نہیں سکتا' لہٰذا شفاعت کا وعدہ کرنے کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ اس شخص کے دل میں مغفرت و بخشش کی ایک امید باقی رہے اور اپنے گناہوں اور خطاؤں کو دیکھ کر خدا کی رحمت سے مایوسی کا شکار نہ ہو جائے جبکہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہء نساء، آیت ۳۱:

★ "اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ"

(اگر تم کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو تو ہم تمہاری غلطیاں (صغیرہ گناہ) معاف کر دیں گے)۔

اس آیت میں خداوند عالم نے وعدہ فرمایا ہے کہ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے دور ہو جاؤ تو ہم تمہاری چھوٹی چھوٹی خطاؤں سے درگزر کر لیں گے' تو جب خداوند عالم ایسا وعدہ کر سکتا ہے تو وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اگر تم اپنے ایمان پر قائم ہے اور قیامت کے دن میرے پاس سچے مومن بن کر آئے تو میں تمہارے لیے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت قبول کروں گا اور خداوند عالم کا اس طرح کہنا صحیح ہے کیونکہ اصل بات ایمان اور اس پر قائم رہنے کی ہے جبکہ گناہ و معاصی، ایمان کو کمزور اور دل میں قساوت پیدا کر دیتے ہیں یہاں تک کہ انسان کو شرک کی راہ پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ چنانچہ خدا کا ارشاد ہے:

سورہء اعراف، آیت ۹۹:

★ "فَلَا يَاۡمَنُ مَكۡرَ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخٰسِرُوۡنَ"

(خدا کے مکر (عذاب) سے کوئی شخص بے خوف نہیں ہو سکتا، سوائے نقصان اٹھانے والے لوگوں کے)۔

سورہء مطففین، آیت ۱۴:

★ "كَلَّا بَلۡ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ"

(نہیں' بلکہ ان کے دلوں میں ان کے گناہوں کی وجہ سے قساوت پیدا ہو گئی ہے)۔

سورہء روم، آیت ۱۰:

★ " ثُمَّ کَانَ عَاقِبَةَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآٰی اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ "

(جن لوگوں نے برے کام کئے ان کا نتیجہ یہی ہوا کہ انہوں نے خدا کی آیات کو جھٹلا دیا)۔

لہٰذا عین ممکن ہے کہ شفاعت کے وعدے سے کسی شخص کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے اور وہ گناہوں سے بالکل دور ہو جائے اور تقویٰ و پرہیز گاری کا راستہ اختیار کر لے اور نیک و صالح لوگوں میں سے ہو جائے کہ پھر اسے...... مذکور معنی میں...... شفاعت کی ضرورت ہی نہ پڑے' تو یہ بات شفاعت کے اہم ترین فوائد میں سے ایک ہے' یہی حال اس صورت میں بھی ہے کہ اگر وضاحت و صراحت کے ساتھ مجرم و گناہگار شخص کا تعین کر کے کہا جائے کہ اس کے حق میں شفاعت قابل قبول ہے یا کسی خاص گناہ و جرم کے بارے میں کہا جائے کہ اس میں شفاعت قبول ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی کہا جائے کہ شفاعت کے باوجود کچھ سزا ضرور دی جائے گی یا بعض اوقات میں سزا ہو سکتی ہے تو اس صورت میں شفاعت و سفارش جرم و گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے ہرگز گناہ کرنے کی جرات کا سبب و باعث نہیں ہو گی کیونکہ اس صورت میں ہر لحہ اس بات کا امکان باقی رہے گا کہ شاید اس گناہ کی سزا اور عقاب پورے طور پر شفاعت کے ذریعے معاف نہ ہو سکے اس لیے اس کے ارتکاب سے پرہیز کیا جائے گا۔

اور جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو اس میں نہ تو مجرم و گناہ کرنے والوں کی کوئی نشاندہی کی گئی ہے کہ فلاں قسم کے افراد کو شفاعت کی وجہ سے عذاب و سزا نہیں دی جائے گی اور نہ ہی کسی مخصوص گناہ کی سزا کی معافی کا اعلان کیا گیا ہے' بلکہ اس قدر بیان کیا گیا ہے کہ کچھ لوگوں کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ (اس سلسلے میں عنقریب مزید مطالب بیان کئے جائیں گے)۔ لہٰذا قرآن مجید میں جو کچھ شفاعت کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے اس میں کسی قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

پانچواں اعتراض

عقل، شفاعت و سفارش کو صحیح قرار نہیں دیتی اور اگر صحیح قرار بھی دے تو صرف اسی حد تک کہ ایسا ہونا ممکن ہے نہ یہ کہ ایسا ہوا بھی ہے یا یہ کہ وہ ایک یقینی امر ہے' یعنی عقل صرف اس قدر ثابت کر سکتی ہے کہ شفاعت کا وقوع پذیر ہونا ممکن ہے لیکن یہ بات ہرگز ثابت نہیں کرتی کہ وہ واقع بھی ہو گی' اور جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہے تو جن آیات میں شفاعت کا ذکر ہے وہ تین قسم کی ہیں' ایک وہ آیات ہیں جن میں شفاعت کی سرے ہی سے نفی کی گئی ہے اور قیامت کے دن شفاعت کے وجود کا واضح اور صریح الفاظ میں مطلقاً انکار کیا گیا ہے' مثلاً:

سورہ ءبقرہ، آیت ۲۵۵:

★ " لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ "

(قیامت کے دن کوئی خرید وفروخت ہوگی' نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ ہی کوئی شفاعت)۔

دوسری وہ آیات کہ جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر شفاعت ہو بھی سہی تب بھی وہ کوئی فائدہ نہیں دے گی' مثلاً:

سورہ ءمدثر، آیت ۴۸:

★ " فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ "

(انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کوئی فائدہ نہ دے گی)۔

اور تیسری وہ آیات ہیں کہ جن ٹیں شفاعت کو خدا کے اذن واجازت کے ساتھ مشروط قرار دیا گیا ہے مثلاً:

سورہ ءبقرہ، آیت ۲۵۵:

★ " ... اِلَّا بِاِذْنِهٖ "

(مگر خدا کے اذن کے بعد!)۔

سورہ ءیونس، آیت ۳:

★ " ... اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ "

(مگر خدا کے اذن واجازت کے بعد!)۔

سورہ ءانبیاء، آیت ۲۸:

★ " ... اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى "

(مگر اسے کہ جس پر خدا راضی ہو۔ (اس کو اس کام کے لیے پسند کرے)۔

یہ آیات اور اس طرح کی دوسری وہ آیات کہ جن میں کسی کام کو خدا کے اذن وارادہ کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے سب اس بات کی دلیلیں ہیں کہ قرآن مجید کا اسلوب وطرز کلام ہی یہ ہے کہ جب کسی چیز کی مکمل طور پر اور یقینی صورت میں نفی کرنا مقصود ہو تو اسے خدا کے اذن واجازت اور مشیت وارادہ کے ساتھ مشروط کر دیا جاتا ہے اور ان آیات میں بھی اسی طرز کلام کو اپنایا گیا ہے تاکہ اس بات کو واضح کر دیا جائے کہ شفاعت کی کوئی حیثیت ہی نہیں بلکہ جو کچھ بھی ہے وہ خدا کا اذن اور اس کی مشیت وارادہ ہے' مثلاً:

سورہ ءاعلیٰ، آیت ۶:

★ " سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ "

(ہم عنقریب آپ کو پڑھا دیں گے پھر آپ ہرگز نہ بھولیں گے مگر وہ کہ جو خدا چاہے)۔

سورہء ہود، آیت ۱۰۷:

★ " خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ "

(وہ ہمیشہ اسی رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین باقی ہے مگر وہ کہ جو تیرا پروردگار چاہے)۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت ہی نہیں جو شفاعت کے قطعی و یقینی طور پر وقوع پذیر ہونے کا ثبوت بن سکے۔

اس کے علاوہ احادیث و روایات (سنت) میں بھی شفاعت اور اس کی خصوصیات کی بابت جو کچھ ذکر ہوا ہے اس کا سہارا لے کر شفاعت کو صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا اور جس حد تک اس کا سہارا لیا جا سکتا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جو قرآن مجید میں شفاعت کے بارے میں موجود و مذکور ہے، بنا بر ایں نتیجہ یہ ہوا کہ شفاعت کے صحیح ہونے پر نہ تو عقلی دلیل موجود ہے اور نہ ہی کتاب و سنت سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

جواب

ہم سب سے پہلے ان قرآنی آیات کے سلسلے میں وضاحت کرتے ہیں کہ جن میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے، ان کی بابت ہم نے تمام پہلوؤں کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور آپ اس حقیقت سے آگاہ بھی ہو چکے ہیں کہ وہ آیات، شفاعت کی سرے سے نفی نہیں کرتیں بلکہ اس شفاعت کی نفی کرتی ہیں جو خداوند عالم کے اذن و اجازت اور اس کی رضا و مشیت کے بغیر ہو اور وہ آیات جن میں شفاعت کے فائدہ مند ہونے کی نفی کی گئی ہے تو ان کی بابت اعتراض کرنے والے کے خیال کے بالکل برعکس شفاعت کی نفی کی بجائے اس کا اثبات ہوتا ہے اور وہ آیات شفاعت کو ثابت کرتی ہیں نہ کہ اس کی نفی، مثلاً سورہ مدثر کی آیات میں مجرم و گناہگار لوگوں کے ایک خاص گروہ کے لیے شفاعت کے فائدہ مند ہونے کی نفی کی گئی ہے نہ کہ سب کے لیے اور پھر اس کے علاوہ یہ کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ "شفاعت فائدہ نہ دے گی" بلکہ کہا گیا ہے کہ "شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی" تو گویا شفاعت کے لفظ کو "شافعین" یعنی شفاعت کرنے والوں کے ساتھ اضافت دے کر ذکر کیا گیا ہے لہٰذا اس سے اصل شفاعت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ ان دونوں جملوں میں فرق ہے یعنی "فلا تنفعھم الشفاعۃ" (انہیں شفاعت فائدہ نہ دے گی) اور "فلا تنفعھم شفاعۃ الشافعین" (انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی) دونوں میں فرق ہے، پہلے جملے سے اصل شفاعت کے فائدہ مند ہونے کی نفی ہوتی ہے جبکہ دوسرے جملے سے خاص قسم کے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کی نفی ہوتی ہے کیونکہ (علم نحو کے قواعد کی روشنی میں) جب کسی مصدر کو اضافت کے ساتھ (مضاف بنا کر) ذکر کیا جائے تو اس سے فعل کے وقوع پذیر ہونے کا ثبوت ملتا ہے جبکہ اضافت کے بغیر ذکر کئے جانے والے مصدر میں ایسا نہیں ہوتا، چنانچہ شیخ عبدالقاہر نے کتاب "دلائل الاعجاز" میں بھی اس امر کو نہایت وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے لہٰذا یہ جملہ "شفاعۃ الشافعین" اس بات کو اجمالی

ر پر ثابت کرتا ہے کہ قیامت کے دن شفاعت وقوع پذیر ہو گی لیکن یہ لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے' اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ لفظ۔۔شفاعت کرنے والوں۔۔یعنی "شافعین" جمع کا صیغہ استعمال کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ قیامت کے دن شفاعت ہو گی جیسا کہ کئی دیگر آیات میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا اور اس سے یہی مراد لیا گیا' مثلاً: "و کانت من الغابرین" ۔۔اور وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔۔۔۔۔اور "و کان من الکافرین" اور وہ کافروں میں سے تھا۔۔۔۔اور "و کان من الغاوین" اور وہ گمراہوں میں سے تھا' اور "لاینال عهدی الظالمین" میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔۔۔۔۔ یہ سب اور اس طرح کے دیگر جملے اس امر کا واضح ثبوت فراہم ہیں کہ جمع کے صیغہ کا استعمال متعلقہ امر کے وقوع پذیر ہونے کے بیان کے لیے ہے ورنہ جمع کے صیغہ کا ذکر جو کہ مفرد یعنی ایک سے زائد افراد کے لیے ہوتا ہے بے فائدہ ہوتا جبکہ خدا کے کلام میں کوئی لفظ بے فائدہ نہیں' لہٰذا آیت شریفہ "فما تنفعهم شفاعة الشافعین" (انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہیں دے گی) ان آیات میں سے ہے جو شفاعت کو ثابت کرتی ہیں نہ کہ شفاعت کی نفی کرنے والی آیات میں سے!۔

اور وہ آیات کہ جن میں شفاعت کو خدا کے اذن و اجازت اور رضایت کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے اور کہا گیا "الا باذنه" اور "الا من بعد اذنه" تو یہ جملے شفاعت کے ممکن الوقوع ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کیونکہ جب مصدر کو مضاف بنا کر ذکر کیا جائے تو اس سے متعلقہ امر کے وقوع پذیر ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور یہ ایسا امر ہے کہ اسلوب کلام کا علم رکھنے والے ہرگز اس کا انکار نہیں کر سکتے' اسی طرح یہ کہنا کہ "الا باذنه" اور "الا لمن ارتضی" دونوں کا معنی ایک ہے یعنی "مگر یہ کہ خدا چاہے"، ہرگز درست نہیں۔اس کے علاوہ یہ کہ شفاعت کی بابت جو موارد استثناء ذکر کیے گئے ہیں وہ ایک جیسے نہیں بلکہ مختلف عبارتوں کے ساتھ ہیں مثلاً کسی مقام پر ارشاد فرمایا: "الا باذنه" اور کسی مقام پر ارشاد فرمایا: "الا من بعد اذنه" اور کسی مقام پر ارشاد فرمایا: "الا لمن ارتضی" اور کسی مقام پر ارشاد فرمایا: "الا من شهد بالحق وهم یعلمون" تو ان آیات میں استثناء کی عبارتیں مختلف ہیں' اگر "اذن" اور "ارتضاء" کا ایک معنی ہی کیا جائے یعنی خدا کی مشیت و رضایت' تو آیا یہی معنی "الا من شهد بالحق وهم یعلمون" میں بھی کر سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ "الا من شهد بالحق وهم یعلمون" یعنی "مگر وہ کہ جو حق کے ساتھ گواہی دے اور علم رکھتا ہو" میں بھی "الا باذنه" (مگر خدا کے اذن و اجازت کے ساتھ) والا معنی مراد ہے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ "اذن و اجازت" اور چیز ہے اور "حق کے ساتھ گواہی دینا اور علم رکھتے ہوئے ایسا کرنا" اور چیز ہے' اور دونوں سے ایک معنی مراد نہیں لیا جا سکتا' بنابرایں دونوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ اظہار سخن میں تساہل سے کام لیا گیا ہے اور بات کرنے کے صحیح طریقے اور اصول کو نہیں اپنایا گیا جو کہ کسی عام آدمی کے کلام میں بھی نہیں ہوتا تو پھر ایک فصیح و بلیغ کلام میں ایسا ہونا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے اور پھر اس کلام میں ایسا ہونا کیونکر ممکن ہے جو ہر کلام سے زیادہ فصیح و بلیغ ہو یعنی خدا کا کلام' پس حقیقت امر یہ ہے کہ قرآنی

آیات شفاعت کو ثابت کرتی ہیں' اور جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو اس میں بھی وہی کچھ ثابت کیا گیا ہے جو قرآن مجید میں ۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں احادیث و روایات عنقریب ذکر کی جائیں گی۔

چھٹا اعتراض

قرآنی آیات میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا کہ قیامت کے دن مجرمین کو ان کے جرائم ثابت ہونے اور سزا کے معین ہو جانے کے بعد بھی شفاعت کی وجہ سے سزا نہیں دی جائے گی بلکہ ان آیات سے صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام شفاعت کرنے والے ہیں اور اس سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خداوند عالم ا لوگوں کے درمیان واسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی خدا کے احکامات کو وحی کے ذریعے حاصل کرتے ہیں اور لوگوں تک پہنچا ہیں اور انہیں ہدایت کرتے ہیں' ان کا ایسا کرنا اس طرح پر ہے جیسے کوئی بیج بویا جاتا ہے اور وہ بڑھتا اور نمو کرتا ہے اور پھر وہ چیزوں اور اوصاف و احوال کا سبب بن جاتا ہے' پس انبیاء کرام علیہم السلام مومنین کے لیے دنیا و آخرت میں شفیع ہیں یعنی ا کی وجہ سے اہل ایمان پھلتے' پھولتے اور نمو کرتے اور ہدایت و سعادت کی راہ پاتے ہیں' ان کے شفیع ہونے کا مطلب اس سوا کچھ بھی نہیں۔

جواب

شفاعت کا جو معنی ذکر کیا گیا ہے وہ صحیح ہے اس میں کوئی کلام نہیں لیکن شفاعت کو اسی میں منحصر قرار نہیں دیا جا سکتا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں بلکہ یہ معنی، شفاعت کے معانی میں سے ایک ہے جس کے صحیح ہونے پر سب کا اتفاق ہے ا ہم سب اسے صحیح سمجھتے ہیں' تاہم شفاعت کو اسی میں منحصر کر دینا ہرگز درست نہیں' اس سلسلے میں ہمارے سابقہ بیانات کے علا سورہ نساء کی آیت ۴۸ میں واضح طور پر مذکور ہے:

★ "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ"

(خداوند عالم اس بات کو کبھی معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے لیکن اس کے علاوہ جو چاہے معاف کر دیتا ہے)۔

اس آیت کی بابت ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ آیت ایمان اور توبہ کے بارے میں نہیں ہے جبکہ اعتراض کرنے والے نے انبیاءؑ کے شفیع ہونے کا جو معنی کیا ہے اور آیت کو اس معنی میں منحصر قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاءؑ لوگوں کو ایمان توبہ کے ذریعے خدا کی طرف بلاتے ہیں' حالانکہ آیت میں شفاعت کو اس معنی میں منحصر قرار دینے کا کوئی اشارہ موجود نہیں اس میں ایمان اور توبہ کے علاوہ بھی مغفرت و بخشش کی گنجائش کا ذکر ہے۔

ساتواں اعتراض

اگر ہم عقل کو معیار قرار دیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ عقل شفاعت وسفارش کو صحیح قرار نہیں دیتی اور جہاں تک آیات کا تعلق ہے تو ان میں بھی وضاحت موجود نہیں بلکہ بعض آیتوں میں شفاعت کا سرے سے انکار کیا گیا ہے اور بعض میں اسے ثابت کیا گیا ہے' بعض آیات میں اسے مشروط طور پر ذکر کیا گیا ہے اور بعض میں مطلق اور غیر مشروط طور پر! لہٰذا ایسی صورت حال میں دینی آداب اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان آیات پر ایمان لایا جائے اور ان (آیات متشابہات) کے بارے میں کسی قسم کے اظہار خیال کی بجائے انہیں خدا کے علم پر چھوڑ دیا جائے۔

جواب

آیات متشابہات کے سلسلے میں یہ اصول ہے کہ انہیں محکمات سے ملایا جائے (ان کی طرف لوٹایا جائے) تو وہ بھی محکمات کے زمرے میں آ جاتی ہیں اور ایسا کرنا یعنی آیات متشابہات کو آیات محکمات کے ساتھ ملانا (ان کی طرف لوٹانا) ایسا کام نہیں جو ہم انجام نہ دے سکتے ہوں بلکہ یہ امر ہمارے لیے ممکن ہے' اس سلسلے میں مزید وضاحت سورہ آل عمران کی آیت ۷ میں کی جائے گی کہ جس میں آیات کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ایک محکمات اور دوسری متشابہات' چنانچہ ارشاد ہوا:

★ "مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ"

(اس میں کچھ آیات محکمات ہیں جو کہ اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہات ہیں)۔

(یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ متشابہات کو محکمات سے ملانے کا مطلب یہ ہے کہ متشابہات کے معانی کو سمجھنے کے لیے محکمات کی طرف رجوع کیا جائے اور ان کو سامنے رکھ کر متشابہات کے معانی سمجھے جائیں' کیونکہ محکم آیتیں وہ ہیں جن کے معانی واضح ہیں جبکہ متشابہ آیتوں کے معانی واضح نہیں لہٰذا واضح معانی والی آیات کو غیر واضح معانی والی آیات کے سامنے رکھ کر ان سے مطلب ومقصود کو سمجھا جائے تو وہ متشابہات بھی محکمات کی طرح ہو جاتی ہیں اور ان کے معانی بھی واضح ہو جاتے ہیں)۔

بہر حال آیات محکمات اور آیات متشابہات کی بابت مذکورہ آیت (سورہ آل عمران۔ ۷) کی تفسیر میں تفصیلی بحث کریں گے۔

۳۔ شفاعت کن لوگوں کی ہوگی؟

شفاعت کے بارے میں اب تک جو مطالب ذکر کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ قیامت کے دن جن لوگوں کی شفاعت کی جائے گی ان کا تعین ونشاندہی کسی صورت میں مناسب نہیں اور نہ ہی ان لوگوں کی

نشاندہی کرنا دینی اخلاق وتربیت سے کوئی نسبت رکھتا ہے بلکہ دینی اخلاق وتربیت اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان لوگوں کے بارے میں مبہم اور مجمل وغیر واضح طور پر مطالب بیان کئے جائیں اور ان کی صریح نشاندہی نہ کی جائے اسی لیے قرآن مجید میں ان لوگوں کا تذکرہ نہایت ابہام اجمال کے ساتھ کیا گیا، چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ مدثر، آیت ۴۸:

★" كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ إِلَّآ أَصْحَٰبَ ٱلْيَمِينِ ۝ فِى جَنَّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ۝ عَنِ ٱلْمُجْرِمِينَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ ۝ قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ ٱلْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ ٱلْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ ٱلْخَآئِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ ٱلدِّينِ ۝ حَتَّىٰٓ أَتَىٰنَا ٱلْيَقِينُ ۝ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَٰعَةُ ٱلشَّٰفِعِينَ "۔

(ہر شخص اپنے اعمال میں جکڑا ہوا ہے سوائے ان لوگوں کے، کہ جو "اصحاب یمین" ہیں، وہ بہشت میں ہوں گے اور وہ (قیامت کے دن) گناہ ومعصیت کا ارتکاب کرنے والوں سے پوچھیں گے کہ تمہیں کس چیز نے جہنم میں لایا ہے؟ (گناہگار) جواب دیں گے کہ چونکہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہمیشہ سوچنے والوں کے ساتھ گہری سوچوں میں غرق رہتے تھے اور قیامت کے دن کو جھٹلاتے تھے اور بال آخر ہمیں یقین آ گیا (موت آ گئی) پس ایسے لوگوں کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں دے گی)۔

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص اپنے ہی کئے ہوئے گناہوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوگا' اور جو غلطیاں کر چکا ہے ان کی باز پرس کے لیے پکڑا جائے گا' سوائے "اصحاب یمین" کے (وہ لوگ کہ جن کے نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے)، وہ اپنے گناہوں کے گرو نہیں ہوں گے بلکہ معصیت کی زنجیروں سے آزاد اور بہشت میں ٹھکانہ کئے ہوں گے' اس کے بعد خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ "اصحاب یمین" اپنی اسی حالت میں ان مجرمین اور معصیت کار لوگوں کو دیکھ رہے ہوں گے جو اپنے اعمال اور گناہوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے جہنم میں پڑے ہوں گے اور ان سے جہنم میں ڈالے جانے کی وجہ پوچھیں گے اور وہ لوگ ان اصحاب یمین کو اشاروں کے ساتھ ان امور کے متعلق بتائیں گے جن کے سبب سے وہ جہنم میں ڈالے گئے' اس کے بعد خدا نے ارشاد فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے کہ جو جہنم میں ڈالے جانے کے اسباب کے بارے میں "اصحاب یمین" کو اشاروں کے ساتھ مطلع کریں گے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ مند نہ ہوگی (گویا وہ اسباب شفاعت کی قبولیت کی راہ میں رکاوٹ بن گئے)۔

اس بیان سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ "اصحاب یمین" میں وہ چیزیں نہیں پائی جاتیں جن کے متعلق آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ شفاعت کی قبولیت کے راستے میں رکاوٹ ہیں (یعنی جو صفات جہنم میں ڈالے جانے والوں کے لیے شفاعت سے محرومی کا باعث ہیں وہ اصحاب یمین میں موجود نہیں) اور چونکہ وہ (اصحاب یمین) ان صفات سے پاک ہیں جو شفاعت کی قبولیت کی راہ میں رکاوٹ ہیں تو خدا نے انہیں گناہوں اور معصیت کی ناپاک زنجیروں میں جکڑے ہونے سے رہائی دی جبکہ مجرم ومعصیت کار لوگ شفاعت سے محروم ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

پس اصحاب یمین کا گناہوں کی زنجیروں میں جکڑا نہ ہونا، شفاعت کا نتیجہ ہے۔ گویا "اصحاب یمین" شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے بہرہ مند ہونے کی وجہ سے اپنے اعمال اور گناہوں کے عذاب و کیفر کا شکار نہیں ہوں گے (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کی وجہ سے ان کے گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا کیونکہ وہ ان چیزوں سے پاک ہوں گے جو شفاعت کی قبولیت کے راستے میں مانع و رکاوٹ ہیں جبکہ دوسرے لوگ کہ جن میں وہ اوصاف پائے جاتے ہیں انہیں شفاعت کوئی فائدہ نہ دے گی) پس آیات شریفہ میں "اصحاب یمین" کی اس طرح پہچان کروائی گئی ہے کہ وہ جہنم میں ڈالے جانے والوں کی صفات سے مبرا ہیں (یعنی وہ صفات کہ جن کی وجہ سے شفاعت قبول نہیں ہوگی وہ اصحاب یمین میں موجود نہیں)۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ مذکورہ آیات (۳۸......۴۸) سورہ مدثر میں ذکر کی گئی ہیں اور سورہ مدثر ان سورتوں میں سے ایک ہے جو بعثت کے ابتدائی دور میں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں جیسا کہ اس میں ذکر کی گئی آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے، اور اس دور میں ابھی تک نماز اور زکوٰۃ کا حکم اس طرح پر نہیں آیا تھا جیسے اب ہے، یعنی جس کیفیت سے ہم نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اس کیفیت کے ساتھ احکام صادر نہیں ہوئے تھے، لیکن اس کے باوجود آیات میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ دوزخ میں ڈالے جانے والے کہیں گے کہ ہمیں اس لیے جہنم میں ڈالا گیا ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ" نماز (صلوٰۃ) سے مراد، بندگی کے احساس کے ساتھ خدا کی طرف مکمل توجہ و التفات رکھنا ہے اور "وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ" میں مساکین کو کھانا کھلانے سے مراد خدا کی راہ میں حاجتمندوں کی مالی اعانت کرنا ہے نہ کہ وہ نماز اور زکوٰۃ مراد ہے کہ شریعت اسلامیہ میں جن کا حکم دیا گیا ہے، اور "وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ" میں "خائضین" یعنی "گہری سوچ میں رہنے" سے مراد دنیاوی زندگی کی فریب کاریوں میں مبتلا ہونا اور دنیا کے ظاہری و زوال پذیر حسن و جمال سے دل لگانا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں انسان کو آخرت سے دور کر دیتی ہیں اور قیامت کے دن کے حساب و کتاب کی یاد دل سے مٹا دیتی ہیں، یا اس سے مراد قیامت کے دن کی یاد تازہ کر دینے والی آیات کہ جن میں بہشت کی خوشخبری اور جہنم سے خوف دلایا گیا ہے کے متعلق لب کشائی اور اعتراض کی راہ نکالنا ہے، ظاہر ہے کہ ان چار صفات یعنی خدا کے لیے نماز نہ پڑھنا، خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنا، دنیاوی زندگی کے ساتھ دل لگانا اور قیامت کے دن کو جھٹلا دینا ایسے امور ہیں جن سے دین کی بنیادیں گر جاتی ہیں جبکہ ان کے برعکس عمل کرنا یعنی نماز پڑھنا، خدا کی راہ میں خرچ کرنا، دنیاوی زندگی کی عیش و عشرت کو خاطر میں نہ لانا اور قیامت کے دن پر ایمان لانا ایسے امور ہیں جن پر دین کی بنیاد استوار ہے کیونکہ دین سے مراد ہی یہ ہے کہ زمین کی پستیوں میں گرنے کی بجائے پاک و پاکیزہ ہادیوں آئمہ اطہارؑ کی اقتداء و پیروی کرتے ہوئے خدا کے حضور شرفیاب ہونے کے دن کی طرف قدم بڑھایا جائے اور درحقیقت یہی ترک خوض اور تصدیق روز جزا سے عبارت ہے اور انہی سے دنیا کی فریب کاریوں میں مبتلا ہونے اور قیامت کے دن کی تکذیب سے دوری حاصل ہو سکتی ہے اور پھر ان دو صفتوں یعنی آئمہ اطہارؑ کی پیروی کرتے ہوئے دنیاوی زندگی کی لذتوں سے دل نہ لگانے اور

قیامت کے دن پر ایمان لانے کا نتیجہ دو چیزیں ہیں:

(۱)۔ خدا کی عبودیت و بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے اس کی طرف عملی طور پر مکمل توجہ والتفات کرنا۔

(۲)۔ معاشرے کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے حاجتمندوں کی حاجت روائی کرنے کی بھرپور کوشش کرنا۔

انہی دونوں چیزیں کو ''صلوٰۃ......نماز......اور'' انفاق فی سبیل اللہ''...... خدا کی راہ میں خرچ کرنا...... سے تعبیر کیا گیا ہے' پس علم وعمل کے لحاظ سے دین، انہی چار چیزوں پر قائم ہے اور دین کے باقی ارکان مثلاً توحید و نبوت بھی انہی کے ساتھ وابستہ ہیں' بنا برایں ''اصحاب یمین'' ہی شفاعت سے بہرہ مند ہوں گے اور وہی دین واعتقاد کے لحاظ سے خداوند عالم کے پسندیدہ افراد ہیں خواہ ان کے اعمال ہی ایسے ہوں کہ خدا ان سے راضی ہو اور انہیں قیامت کے دن شفاعت کی ضرورت ہی نہ پڑے یا ایسے نہ ہوں بلکہ شفاعت کے محتاج ہوں اور قیامت کے دن شفاعت ہی ان کا سہارا بنے' دونوں صورتوں میں یہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ شفاعت ''اصحاب یمین'' ہی میں سے گناہگار اور خطا کار افراد کے لیے سودمند ہو گی جیسا کہ قرآن مجید میں خداوند عالم نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا:

سورہ نساء، آیت ۳۱:

★ ''اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ''

(اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے)۔

اس آیت سے مراد یہی ہے کہ خداوند عالم چھوٹے گناہوں (گناہان صغیرہ) کو معاف کر دے گا اور ان کے لیے شفاعت کی ضرورت ہی نہیں' لیکن وہ شخص جس کا گناہ قیامت تک باقی رہے گا تو یقیناً اس کا شمار کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والوں میں ہوگا کیونکہ اگر اس کا گناہ چھوٹا ہوتا تو معاف کر دیا جاتا لہٰذا اسے اپنے اس بڑے گناہ کی معافی کے لیے شفاعت کی ضرورت ہوگی' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شفاعت انہی لوگوں کے لیے ہوگی جو ''اصحاب یمین'' میں سے گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں' چنانچہ اس سلسلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میری شفاعت میری امت میں سے انہی لوگوں کو ہی پہنچے گی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے' اور جو نیک کام کرنے والے ہیں وہ کسی قسم کی پریشانی کا شکار نہ ہوں گے۔ (انما شفاعتی لاھل الکبائر من امتی فاما المحسنون فما علیھم من سبیل)

اور دوسری جانب یہ کہ ان افراد کو ''اصحاب یمین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے جبکہ ان کے مقابل میں دوسروں کو ''اصحاب شمال'' سے موسوم کیا گیا ہے جو کہ بدکار و معصیت کار ہیں گویا ''اصحاب شمال'' کے مقابلے میں ان لوگوں کو ''اصحاب یمین'' سے موسوم کیا گیا ہے اور کبھی ان اصحاب یمین کو ''اصحاب میمنہ'' اور دوسروں کو ''اصحاب مشئمہ'' بھی کہا گیا ہے

سحاب میمنہ یعنی خوش قسمت اور اصحاب مشئمہ یعنی بدقسمت لوگ) اور یہ تمام الفاظ دراصل قرآن مجید کی خاص
طلاحات ہیں ان کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ قیامت کے دن کچھ لوگوں کو ان کے نامہء اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے
ئیں گے اس لیے انہیں اصحاب یمین یعنی دائیں طرف والے کہا گیا ہے اور کچھ لوگوں کو ان کے نامہء اعمال ان کے بائیں
ھ میں دیئے جائیں گے اس لیے انہیں ''اصحاب شمال'' یعنی بائیں طرف والے کہا گیا ہے جیسا کہ اس سلسلے میں خداوند عالم
رشاد گرامی ہے:

رہء اسریٰ، آیت ۷۲:

★ ''يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۖ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُولَٰئِكَ يَقْرَءُونَ كِتَابَهُمْ وَلَا يُظْلَمُونَ
وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا'' ۔

(یاد کرو اس دن کو جب ہم سب لوگوں کو ان کے امام کے نام سے پکاریں گے' پس جن لوگوں کو ان کے نامہء اعمال
کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے تو وہ اپنے نامہء اعمال کو پڑھیں گے اور دیکھیں گے کہ ان کے ساتھ ذرہ بھر ناانصافی
ں ہوئی' اور جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے ایسے لوگ آخرت میں بھی اندھے اور سب سے زیادہ گمراہ ہوں گے)۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں انشاءاللہ ہم عنقریب بیان کریں گے کہ دائیں ہاتھ میں نامہء اعمال دیئے جانے سے
د ان لوگوں کا امام برحق کی پیروی کرنا ہے اور بائیں ہاتھ میں نامہء اعمال دیئے جانے سے مراد گمراہ لوگوں کی پیروی کرنا
' جیسا کہ خداوند عالم نے فرعون کے بارے میں ارشاد فرمایا:

رہء ہود، آیت ۹۸:

★ ''يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ''

(قیامت کے دن فرعون اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور سب کو جہنم میں گرا دے گا)۔

خلاصہء کلام یہ کہ ''اصحاب یمین'' کی وجہ تسمیہ خداوند عالم کا ان کے دین و اعتقاد سے راضی ہونا ہے جیسا کہ مذکورہ
ت کی بازگشت بھی اسی امر یعنی دین و اعتقاد سے خدا کی رضایت کی طرف ہے۔

ایک اور بات یہاں قابل ذکر ہے کہ خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں ایک مقام پر یوں ارشاد فرمایا ہے:

رہء انبیاء، آیت ۲۸:

★ ''وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ''

(اور وہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے سوائے ان کے کہ جن سے خدا راضی ہو)۔

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے صرف انہی کے لیے شفاعت کو ثابت کیا ہے جن سے وہ راضی ہوا' اور
رتضاء'' یعنی راضی ہونے کو کسی چیز کے ساتھ مشروط کر کے ذکر نہیں کیا اور یہ بیان نہیں کیا کہ ان لوگوں کے اعمال کیسے ہوں

گے اوران کی نشانیاں وصفات کیا ہیں؟ جیسا کہ ایک اور مقام پر اس طرح بیان فرمایا ہے:

سورہ طہ، آیت ۱۰۹:

★ ''اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوۡلًا''

(سوائے اس کے، کہ جسے خدا نے اجازت دی ہو اور اس کی بات اسے پسند آئی ہو)۔

اس آیت مبارکہ میں بھی ان لوگوں کی نشانیاں ذکر نہیں کی گئیں' تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ''پسند افراد'' ہونے کی وجہ ان کے دین و اعتقاد کا پسندیدہ ہونا ہے نہ کہ ان کے اعمال کا پسندیدہ ہونا' بہر حال اہل شفاعت وہی ہ کہ خدا جن کے دین و اعتقاد سے راضی ہو' لہٰذا اس آیت سے بھی وہی کچھ سمجھا جاتا ہے جو اس سے پہلے ذکر کی گئی آیات ـ سمجھا گیا ہے گویا سب کا مقصد و مراد ایک ہی ہے۔

ایک اور مقام پر خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ مریم، آیت ۸۷:

★ ''یَوۡمَ نَحۡشُرُ الۡمُتَّقِیۡنَ اِلَی الرَّحۡمٰنِ وَفۡدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوۡقُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ اِلٰی جَهَنَّمَ وِرۡدًا ﴿۸۶﴾ لَا یَمۡلِکُوۡ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا''۔

(اس دن ہم پرہیزگاروں کو اپنی رحمت کے دسترخوان پر اکٹھا کریں گے اور مجرمین و گناہگاروں کو جہنم میں ڈا ـ کے لیے گھسیٹ کر لائیں گے اور اس دن شفاعت ان کے اختیار میں نہیں ہوگی سوائے اس کے، کہ جس نے خدا کے پاس ع لے لیا ہو)۔

اس آیت میں شفاعت کا لفظ ''مصدر مبنی بر مفعول'' واقع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد شفاعـ حاصل کرنا ہے' یعنی کوئی شخص شفاعت حاصل نہیں کر سکے گا سوائے اس کے، کہ جس نے خدا کے پاس عہد کر لیا ہو اور شفاعت وعدہ لے لیا ہو' اور یہ امر بھی واضح ہے کہ ہر مجرم کافر نہیں کیونکہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہ طہ، آیت ۷۵:

★ ''اِنَّهٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّهٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا یَمُوۡتُ فِیۡهَا وَلَا یَحۡیٰی ﴿۷۴﴾ وَمَنۡ یَّاۡتِهٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِکَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰی''۔

(جو بھی خدا کے پاس مجرم کے طور پر آیا تو اس کے لیے جہنم مقرر ہے وہ اس میں مرے گا اور نہ ہی زندہ ہوگا' اور شخص ایمان کے ساتھ خدا کے حضور حاضر ہوا اور اس نے نیک اعمال بھی کئے ہوں تو ایسے لوگوں کے لیے بہت بلند درجا ہیں)۔

اس آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ایمان کے بغیر عمل صالح کرنے والا بھی مجرم ہے خواہ وہ ایمان لایا؛ نہ ہو یا ایمان تو لایا ہو لیکن عمل صالح نہ کیا ہو' دونوں برابر ہیں' لیکن مجرمین میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو دین حق پر ہوتے ہو۔

یعنی ایمان لانے کے باوجود عمل صالح بجا نہیں لائے جبکہ ان کا خدا کے پاس عہد ہے چنانچہ خدا کا ارشاد ہے:

سورہ یٰس، آیت ۶۱:

★ " اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ " -

(آیا میں نے تم سے عہد نہیں لے لیا اے بنی آدم! کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا بہت بڑا دشمن ہے اور تم صرف میری عبادت کرنا یہی میرا سیدھا راستہ ہے)۔

اس آیت میں جس عہد کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے " ان اعبدونی " یعنی تم صرف میری عبادت کرنا' اس میں " عہد سے مراد حکم ہے' اور " هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ " کے عہد سے مراد التزام اور ذمہ داری قبول کرنا ہے کیونکہ " صراط مستقیم " سعادت ونجات کے راستے کی ہدایت پر مشتمل ہے' پس اہل ایمان میں سے یہ لوگ اپنے گناہوں اور بداعمالیوں کے سبب جہنم میں جائیں گے لیکن خدا سے لیے ہوئے عہد کی بدولت شفاعت کے ذریعے جہنم سے نجات پالیں گے' اسی مطلب کی طرف سورہ بقرہ کی آیت ۸۰ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے:

★ " قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا " -

(انہوں نے کہا کہ ہم چند دنوں سے زیادہ جہنم کی آگ میں نہیں رہیں گے آپ ان سے کہیں کہ آیا تم نے خدا سے کوئی عہد لے لیا ہے؟)۔

پس یہ تمام آیات ایک ہی مطلب کو بیان کرتی ہیں اور سب کی بازگشت ایک ہی امر کی طرف ہے اور سب اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ قیامت کے دن جن لوگوں کی شفاعت کی جائے گی وہ دینداروں میں سے ہی گناہگار افراد ہیں' یعنی جو دین حق پر ایمان لائے لیکن بداعمالیوں کا شکار ہوئے اور گناہ کا ارتکاب کیا' اور وہی ہیں کہ خدا نے جن کے دین واعتقاد کو پسند کیا ہے۔

۴۔ کون شفاعت کرے گا؟

شفاعت کے سلسلے میں اب تک مذکورہ تمام مطالب کی روشنی میں آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ شفاعت کی دو قسمیں ہیں: ایک تکوینی اور دوسری تشریعی' تکوینی شفاعت کی بابت واضح ہے کہ تمام آفاقی اسباب (عالم وجود میں پائے جانے والے اسباب) شفاعت کا کام دیتے ہیں کہ وہ سب خدا اور دیگر تمام موجودات کے درمیان واسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور تشریعی شفاعت کہ جو احکامات اور ان کی خلاف ورزیوں پر مقررہ سزاؤں کے سلسلے میں واقع ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وہ شفاعت جس کا اثر دنیا ہی میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کی بدولت دنیا ہی میں خدا کی طرف سے گناہوں کی بخشش ہوجاتی ہے یا اس کی بارگاہ میں تقرب حاصل ہوجاتا ہے اس طرح کی شفاعت کی کئی صورتیں ہیں:

(۱) ۔ توبہ: اس سلسلے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ زمر، آیت ۵۴:

★ "قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ" ۔

(کہہ دیجئے! اے میرے وہ بندو کہ جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں خداوند عالم تمام گناہوں کو معاف کر دینے والا ہے کہ وہی سب سے بڑا بخشش والا رحم کرنے والا ہے اور تم اپنے پروردگار کے حضور توبہ کرو)۔

اس آیت میں شرک سمیت تمام گناہوں کے بخشے جانے کا ذکر ہے یعنی توبہ کے ذریعے شرک سمیت تمام گناہوں اور خطاؤں کی مغفرت و بخشش ہوسکتی ہے۔

(۲)۔ ایمان: اس سلسلے میں خداوند عالم نے فرمایا:

سورہ حدید، آیت ۲۸:

★ "اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ ... وَيَغْفِرْ لَكُمْ"

(تم اللہ کے رسول پر ایمان لے آؤ اور خدا تمہارے گناہ معاف کر دے گا)۔

(۳)۔ ہر عمل صالح: چنانچہ خدا نے فرمایا:

سورہ مائدہ، آیت ۹:

★ "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ" ۔

(خدا نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے کہ ان کے لیے مغفرت اور بلند اجر ہے)۔

اور ارشاد فرمایا:

سورہ مائدہ، آیت ۳۵:

★ "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ" ۔

(اے ایمان والو' تقوائے الٰہی اختیار کرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو)۔
عمل صالح کے سلسلے میں کثرت کے ساتھ آیات موجود ہیں جن میں اسے مغفرت و بخشش کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے' گویا وہ شفاعت کرنے والا ہے۔

(۴)۔ قرآن مجید' خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:
سورہء مائدہ، آیت ۱۶:
★ "یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَیَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ"۔
(خداوند عالم قرآن مجید کے ذریعے ان لوگوں کو سلامتی کے راستوں کی رہنمائی کرتا ہے جو اس کی رضا و خوشنودی کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں اور انہیں اندھیروں سے نکال کر اپنے اذن سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور انہیں "صراط مستقیم"... سیدھے راستے... کی ہدایت کرتا ہے)۔

(۵)۔ ہر وہ چیز جس کا تعلق عمل صالح سے ہے جیسے مساجد' مقامات مقدسہ اور عظمت والے ایام۔

(۶)۔ انبیاء و پیغمبران الٰہی' کہ وہ اپنی امتوں کے لیے استغفار اور گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں جیسا کہ خدا وند عالم نے ارشاد فرمایا:
سورہء نساء، آیت ۶۴:
★ "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ لَا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَا وَلَهُمُ الرَّسُوْلُ فَما اوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا۔
(اور اگر وہ اپنے اوپر ظلم کرکے آپ کے پاس آئیں اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور رسول بھی ان کے لیے گناہوں کی معافی طلب کریں تو خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے)۔

(۷)۔ فرشتے' کہ وہ اہل ایمان کے لیے بخشش طلب کرتے ہیں جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا:
سورہء مومن، آیت ۷:
★ "اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا"

(وہ فرشتے کہ جنہوں نے عرش کو اٹھایا ہوا ہے اور جو عرش کے اردگرد ہیں سب اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح لاتے ہیں اور اہل ایمان کے لیے استغفار کرتے ہیں)۔

سورہ شوریٰ، آیت ۵:

★ "وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُ الرَّحِيْمُ"۔

(فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بجالاتے ہیں اور زمین میں رہنے والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں' رکھیں کہ خداوند عالم سب سے بڑا مغفرت کرنے والا مہربان ہے)۔

(۸)۔ مومنین' کہ وہ اپنے اور اپنے اہل ایمان بھائیوں کے لئے طلب مغفرت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بار میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا (کہ وہ کہتے ہیں):

سورہ بقرہ، آیت ۲۸۶:

★ "وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا"

(ہم سے درگزر فرما' ہمیں معاف کردے اور ہم پر رحم کر' کہ تو ہی ہمارا آقا و مولا ہے)۔

بہرحال یہ آٹھ امور، گناہوں کی بخشش کے لیے شفاعت کا کام دیتے ہیں یعنی:

توبہ۔

ایمان۔

ہر عمل صالح۔

قرآن مجید۔

عمل صالح سے تعلق رکھنے والی ہر چیز۔

فرشتوں کا اہل ایمان کے لیے طلب مغفرت کرنا۔

انبیاء و مرسلین کا اپنی امتوں کے لیے طلب مغفرت کرنا۔

اہل ایمان کا اپنے اور اپنے اہل ایمان بھائیوں کے لیے طلب مغفرت کرنا۔

دوسری قسم: شفاعت کی دوسری قسم قیامت کے دن شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کرنا ہے کہ جس کے متعلق آپ آگاہ ہو چکے ہیں تو جو لوگ قیامت کے دن شفاعت کریں گے' ان میں سے:

(۱)۔ انبیاءؑ

ان کی شفاعت کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے:

سورہ ء انبیاء، آیت ۲۹:

★ "وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۔ ۔ ۔ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى"

(مشرکین نے کہا کہ خدا نے بیٹا بنالیا ہے' خدا پاک ہے اس بات سے کہ بیٹا بنائے بلکہ وہ (فرشتے) خدا کے معزز بندے ہیں...... اور وہ کسی کی شفاعت نہیں کرتے سوائے اس کے، کہ جسے خدا پسند فرمائے)۔

انہی میں سے ایک حضرت عیسیٰ بن مریمؑ ہیں جو کہ نبی ہیں۔

ایک اور آیت میں ارشاد فرمایا:

سورہ ء زخرف، آیت ۸۶:

★ "وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ"۔

(مشرکین، خدا کے علاوہ جن کو بھی پکارتے ہیں وہ شفاعت کے مالک نہیں' صرف وہی لوگ شفاعت کے مالک ہیں جو حق کے ساتھ گواہی دیتے ہیں جبکہ وہ سب کچھ جانتے ہیں)۔

یہ دونوں آیتیں انبیاءؑ کے شفیع ہونے کے ساتھ ساتھ فرشتوں کے شفیع ہونے کو بھی ثابت کرتی ہیں کیونکہ مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے (اور یہودیوں و نصرانیوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور عزیرؑ کو خدا کے بیٹے قرار دیا تھا) لہٰذا ان کے ان نظریات کی تردید میں یہ آیتیں فرشتوںؑ اور انبیاءؑ کے شفیع ہونے کو بیان کرتی ہیں۔

(۲)۔ فرشتے

ان کی شفاعت کے سلسلے میں خداوند عالم نے اس طرح ارشاد فرمایا:

سورہ ء نجم، آیت ۲۶:

★ "وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى"۔

(آسمانوں میں کتنے ایسے فرشتے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں دے گی مگر بعد اس کے کہ خدا جسے چاہے اذن

دے اور راضی ہو)۔

سورہء طہ، آیت ۱۱۰:

★ "يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ خَلْفَهُمْ"

(قیامت کے دن کسی کی شفاعت فائدہ نہ دے گی سوائے اس کے، کہ جسے خدائے رحمان نے اجازت دے اور اس کی بات کو پسند فرمالیا' خداوند عالم وہ سب کچھ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے)۔

(۳)۔ شہداء

ان کی شفاعت کے متعلق خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا:

سورہء زخرف، آیت ۸۶:

★ "وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ"۔

(مشرکین، خدا کے علاوہ جن لوگوں کو پکارتے ہیں وہ شفاعت نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ جنہوں نے حق ساتھ شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہیں)۔

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے ان کا تذکرہ کیا ہے جو حق کے ساتھ شہادت دیں' اور ظاہر ہے کہ ہر گواہ حق کے ساتھ شہادت دیتا ہے وہ بھی قیامت کے دن شفیع ہوگا' اور اس "شہادت" کے سلسلے میں سورہء فاتحہ کی تفسیر میں بیا چکا ہے اور سورہء بقرہ کی آیت ۱۴۳ (وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) کی تفسیر میں بھی کیا جائے گا کہ اس سے مراد اعمال کی گواہی ہے نہ کہ میدان جنگ میں قتل ہونا۔

اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کے دن مومنین بھی شفاعت کریں گے کیونکہ خداوند عالم نے فرما کہ قیامت کے دن مومنین بھی شہداء کے ساتھ ہوں گے' چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہء حدید، آیت ۱۰:

★ "وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ"

(وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے وہی سچے اور شہداء ہیں اپنے پروردگار کے پاس!)۔

اس آیت کی تفسیر میں مزید مطالب عنقریب ذکر کئے جائیں گے۔

(۵) شفاعت کا تعلق کس چیز سے ہے؟

آپ اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ شفاعت کی دو قسمیں ہیں ایک تکوینی اور دوسری تشریعی۔

تکوینی شفاعت کا تعلق عالم اسباب میں پائے جانے والے ہر سبب سے ہے اور تشریعی شفاعت کا تعلق ثواب و عقاب سے ہے اور اس تشریعی شفاعت کی دو قسمیں ہیں' ایک کا تعلق شرک سمیت تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے ہے یعنی وہ تمام گناہوں کی بخشش میں موثر ہے جیسے توبہ اور ایمان' کہ یہ دونوں ہر طرح کے گناہ کی بخشش کا سبب ہیں بشرطیکہ یہ دونوں اسی دنیا ہی میں وقوع پذیر ہوں یعنی قیامت کے دن سے پہلے' اور دوسری قسم کا تعلق بعض گناہوں کے آثار سے ہے جیسے بعض نیک اعمال کہ جو گناہوں کے آثار کو ختم کر دینے کا سبب ہیں' اس کے علاوہ وہ شفاعت کہ جو متنازعہ ہے وہ انبیاءؑ اور دیگر حضرات کی شفاعت ہے کہ جو قیامت کے دن اس شخص کی سزا معاف کرنے سے متعلق ہے جو اس دن اپنے اعمال کے محاسبہ میں سزا کا مستحق قرار پایا جائے' اس سلسلے میں آپ اس بحث کی تیسری شق (شفاعت کن لوگوں کی ہوگی؟) میں آگاہ ہو چکے ہیں کہ وہ شفاعت ان لوگوں کے بارے میں ہوگی جو بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے اور ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کا عقیدہ صحیح اور ان کا دین خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوگا۔

(۶)۔ شفاعت کب فائدہ دے گی؟

اس بحث میں بھی شفاعت سے مراد گناہوں کی سزا اور عذاب کو دور کر دینے والی شفاعت ہے' چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہء مدثر، آیت ۴۲:

★ "كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿۳۸﴾ إِلَّا أَصْحٰبَ الْيَمِينِ ﴿۳۹﴾ فِي جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ" ۔

(ہر شخص اپنے کئے کا گرو ہے سوائے اصحاب یمین کے' کہ وہ بہشت میں مجرمین و گناہگاروں سے پوچھیں گے کہ کس چیز نے تمہیں جہنم میں ڈالا ہے؟)۔

اس آیت کی بابت پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس میں قیامت کے دن شفاعت سے بہرہ مند ہونے والوں اور اس سے محروم افراد کی نشاندہی کی گئی ہے البتہ اس آیت سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن شفاعت عذاب کی سختیوں اور

دوزخ کے زندان میں ہمیشہ قیدی ہو کر رہنے سے آزادی اور نجات دلانے میں کام آئے گی لیکن اس سے پہلے قیامت کے د
کا خوف، ہولناکیاں اور اس کی سختیاں شفاعت کے ذریعے ہرگز ختم نہیں ہوں گی، یعنی شفاعت کا اثر اس کے علاوہ کچھ نہیں
اس کے سبب گناہگار کو جہنم میں ہمیشہ رہنے سے نجات مل جائے گی لیکن قیامت کے دن اور حساب و کتاب کا خوف اور سختیا
اسے جھیلنی پڑیں گی اور وہ شفاعت کے ذریعے ہرگز ختم نہیں ہوں گی۔

یہاں یہ امر معلوم رہے کہ سورہ مدثر کی مذکورہ آیات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ "اصحاب یمین" کا جہنم میں ڈا
جانے والوں سے سوال و جواب اس وقت ہوگا جب حساب و کتاب کا مرحلہ طے ہو جائے گا اور بہشت والے بہشت میں ا
دوزخ والے دوزخ میں جا چکے ہوں گے تو اس وقت بعض گناہگاروں کو کہ جو اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں ہوں
شفاعت کے ذریعے جہنم کے عذاب سے نجات مل جائے گی یعنی شفاعت اس وقت کام آئے گی جب وہ لوگ حساب و کتا
کے مراحل سے گذر چکے ہوں گے اور اپنے اپنے ٹھکانوں میں جا چکے ہوں گے جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے "فی جنات" (بہشت
میں)۔ تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ بہشت میں داخل ہو چکے ہوں گے۔

"مَا سَلَكَكُمْ" "کس چیز نے تمہیں جہنم میں ڈالا ہے یہ الفاظ یعنی "مَا سَلَكَكُمْ" اس بات کا ثبوت فرا
کرتے ہیں کہ گناہگار جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے کیونکہ عربی زبان میں "سلوک" کا لفظی ترجمہ "چلنا" اور اسی مناسب
سے یہاں اس کا مطلب "ڈالنا"، داخل کرنا ہے لیکن ہر ڈالنا اور داخل کرنا مراد نہیں بلکہ ترتیب اور نظم و نظام کے ساتھ ڈ
مقصود ہے (جیسا کہ تسبیح کے دانوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ ڈالا جاتا ہے) اور اس طرح کے ڈالنے اور داخل کرنے
استقرار کا معنی پایا جاتا ہے۔

اسی طرح آیت شریفہ میں "فَمَا تَنْفَعُهُمْ" (انہیں فائدہ نہیں دے گی) کے الفاظ بھی ہمارے مدعاء کو ثا
کرتے ہیں کیونکہ لفظ "ما" نفی حال کے لیے استعمال کیا جاتا ہے (مزید غور کریں)۔

اب رہی برزخ کی بات، تو اس سلسلے میں جو روایات اس امر کو بیان کرتی ہیں کہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآ
وسلم اور آئمہ اطہار، مرنے والے کے پاس موت کے وقت اور قبر میں سوال و جواب کے وقت تشریف لاتے ہیں اور اس
مدد کرتے ہیں تاکہ موت کی سختی اور سوال و جواب کے بوجھ کی وجہ سے اس پر کوئی پریشانی نہ آئے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ نساء آیت ۱۵۸:

★ "وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ"

(اہل کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا مگر یہ کہ اس پر ایمان لائے گا)۔

اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا جائے گا کہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہار علیہم السلام کا مو
کے وقت اور قبر میں سوال و جواب کے وقت تشریف لانے کا تعلق خدا کے ہاں شفاعت کرنے سے ہرگز نہیں، بلکہ یہ اس اختی

اقتدار سے استفادہ کرنے کے ضمن میں آتا ہے جو خداوند عالم نے انہیں عطا فرمایا ہے تاکہ وہ خدا کے اذن واجازت کی بنیاد پر جو چاہیں کرسکیں، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ ءاعراف، آیات ۴۶ تا ۴۹:

★ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ... وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿۴۸﴾ أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۚ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ "۔

(اعراف...... بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک جگہ کا نام۔۔ پر ایسے لوگ ہوں گے جو سب کو ان کی نشانیوں سے پہچانیں گے اور بہشت والوں کو بلند آواز سے پکار کر سلام کریں گے جبکہ وہ خود ابھی تک بہشت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ بہشت میں جانے کے امیدوار ہوں گے...... اعراف کے مقام پر بیٹھے ہوئے لوگ ان لوگوں کو پکار کر کہیں گے کہ جنہیں وہ ان کی نشانیوں سے پہچانتے ہوں گے کہ تم نے دیکھ لیا کہ تمہاری کثیر تعداد کہ جس پر تم فخر کیا کرتے تھے اس نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ آیا یہ وہی لوگ نہیں ہیں کہ جن کے متعلق تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ یہ خدا کی رحمت سے بہرہ ور نہیں ہوں گے لیکن وہی آج بہشت میں داخل ہوئے ہیں (پھر بہشت والوں سے مخاطب ہو کر کہیں گے) اب تم پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ ہی تم حزن وغم میں مبتلا ہوگے)۔

اسی طرح ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ ءاسریٰ، آیت ۷۱:

★ " يَوْمَ نَدْعُو كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۖ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ... "

(اس دن ہم سب لوگوں کو ان کے اماموں کے ساتھ بلائیں گے، پس جس شخص کو اس کا نامہ ءاعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ......)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام لوگوں کے بلائے جانے اور انہیں نامہ ءاعمال کے دائیں ہاتھ میں دیئے جانے کی بابت واسطہ وذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اس سبب سے ہے کہ خداوند عالم نے امام وپیشوا کو اختیار واقتدار عطا فرمایا ہے وراسی اختیار واقتدار کی بدولت وہ خدا اور مخلوق کے درمیان واسطہ کا کام دیتا ہے۔

پس شفاعت کے سلسلے میں مذکور تمام مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ شفاعت قیامت کے دن سب سے آخری مرحلہ میں واقع ہوگی اور اس کے سبب یا تو گناہگار کو معاف کر کے اسے جہنم کے عذاب سے نجات مل جائے گی اور وہ دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے سے نجات پائے گا یا یہ کہ جہنم میں ڈالے جانے کے بعد شفاعت کے ذریعے

وہاں سے باہر نکالا جائے گا اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے سے نجات پالے گا" گویا خداوند عالم شفاعت کی وجہ سے اپنی رحمت دامن پھیلا دے گا یا شفاعت کرنے والے کے احترام میں گناہگار کو معاف کردے گا۔

روایات پر ایک نظر

شفاعت کی بابت فرمانِ نبویؐ

شیخ صدوق کی کتاب "امالی" میں حسین بن خالد کے حوالہ سے امام رضا علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپ نے اپنے آباء کرام علیہم السلام کے حوالے سے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا یہ بیان ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا حضر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(من لم یومن بحوضی فلا اوردہ اللہ حوضی و من لم یومن بشفاعتی فلا اناله ا شفاعتی، ثم قال (ص) انما شفاعتی لاھل الکبائر من امتی، فاما المحسنون منھم ف علیھم من سبیل)

"جو شخص میرے حوض کوثر پر ایمان نہ لائے تو خدا اسے میرا حوض نصیب نہیں کرے گا اور جو شخص میری شفاعت ایمان نہ لائے تو خداوند عالم اسے میری شفاعت سے بہرہ ور نہیں فرمائے گا"۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا: مے شفاعت میری امت میں سے صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جو بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے لیکن میں سے نیک اعمال کرنے والے افراد کسی طرح کی پریشانی کا شکار نہیں ہوں گے"۔ یہ سن کر حسین بن خالد نے کہا کہ میں حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ اے فرزند رسول! یہ فرمایئے کہ خدا کے اس ارشاد گرامی کا مطلب کیا "وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى" (وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کی، کہ جسے خدا پسند فرمائے؟) تو امام رضا السلام نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے سوائے اس کے، کہ جس کے دین کو خدا پسند فرمالیا ہو۔

آنحضرتؐ کا یہ ارشاد گرامی کہ "میری شفاعت انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہ گے" الخ..... تو اسے شیعہ وسنی دونوں کی کتب میں متعدد راویوں کے حوالوں سے ذکر کیا گیا ہے اور شفاعت کی بحث میں آیات ذکر ہو چکی ہیں ان سے بھی اس روایت کے معنی ومفہوم کی تصدیق ہوتی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے لیے خدا کی خاص عنایت

تفسیر العیاشی میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ سماعہ بن مہران نے کہا کہ ابوابراہیم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے خداوند عالم کے اس ارشاد گرامی (عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا) عنقریب تیرا پروردگار تجھے نہایت پسندیدہ مقام۔۔محمود۔۔عطا فرمائے گا) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

(یقوم الناس یوم القیامة مقدار اربعین عاماً و یوم الشمس فیرکب علیٰ رووس العباد و یلجمهم العرق، یوم الارض لا تقبل من عرفهم شیئاً فیائتون آدم فیستشفعون منه فیدلهم علیٰ نوح و یدلهم نوح علیٰ ابراهیم. و یدلهم ابراهیم علیٰ موسیٰ، ویدلهم موسیٰ علیٰ عیسیٰ، ویدلهم عیسیٰ فیقول: علیکم بمحمد (ص) ختم البشر. فیقول محمد (ص): انا لها. فینطلق حتیٰ یاتی باب الجنة فیدق فیقال له: من هذا؟ والله اعلم فیقول: محمد. فیقال: افتحوا له. فاذا فتح الباب استقبل ربه فخر ساجداً فلا رفع راسه حتیٰ یقال له: تکلم و سل تعط واشفع تشفع. فیرفع راسه و یستقبل ربه فیخر ساجداً فیقال له مثلها. فیرفع راسه حتیٰ انه لیشفع من قد احرق بالنار فما احد من الناس یوم القیامة فی جمیع الامم اوجه من محمد (ص)، و هو قول الله تعالیٰ: عسیٰ ان یبعثك مقاماً محموداً)

"قیامت کے دن سب لوگ چالیس سال کی مدت کے برابر کھڑے رہیں گے اور خداوند عالم سورج کو حکم دے گا کہ ان کے سروں پر اس طرح نزدیک سے چھا جائے کہ سب لوگ پسینے میں شرابور ہو جائیں' اور زمین کو حکم دے گا کہ ان کے پسینے کو اپنے اندر جذب نہ کرے' پسینے میں ڈوبے ہوئے سب لوگ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور ان سے مدد کی درخواست کریں گے اور شفاعت طلب کریں گے' حضرت آدم علیہ السلام لوگوں کو حضرت نوحؑ کے پاس جانے کا کہیں گے اور حضرت نوح علیہ السلام انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس' اور حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس' حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جانے کا حکم دیں گے' اس وقت حضرت محمدؐ ارشاد فرمائیں گے کہ میں اس کام کے لیے تیار ہوں اور میں ان لوگوں کی شفاعت کرتا ہوں' چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور بہشت کے دروازے پر آ کر دق الباب کریں گے تو بہشت سے آواز آئے گی: کون ہے؟ خدا بہتر جانتا ہے کہ کون ہے! حضرت محمدؐ جواب دیں گے کہ: محمدؐ ہوں' پھر اندر سے آواز آئے گی کہ ان کے لیے دروازہ کھول دیا جائے' جب دروازہ کھولا جائے گا تو آنحضرتؐ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو کر اس کے حضور سجدے میں گر جائیں گے اور اس وقت تک سجدے سے سر نہیں اٹھائیں گے جب تک کہ یہ نہ کہا جائے گا کہ آپ بات کریں اور جو چاہتے ہیں وہ مانگیں آپ کی مراد پوری کی جائے گی

اور آپ جس کی شفاعت کریں وہ مورد قبول واقع ہوگی، اس کے بعد آنحضرتؐ سجدے سے سر اٹھائیں گے اور خدا کی طرف متوجہ ہو کر اس کی عظمت کے سبب دوبارہ سجدے میں گر جائیں گے یہاں تک کہ پھر وہی کچھ کہا جائے گا جو پہلے کہا گیا تھا یعنی شفاعت کی اجازت دی جائے گی، تب آنحضرتؐ اس قدر شفاعت کریں گے کہ آپ کی شفاعت کا دائرہ ان لوگوں تک پہنچ جائے گا جو جہنم کی آگ میں جل رہے ہوں گے اور سب کے لیے خدا سے طلب مغفرت کریں گے۔ پس قیامت کے دن تمام لوگوں اور تمام امتوں میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو آنحضرتؐ سے بلند مقام و مرتبہ کا حامل ہو، اور یہی مقام مراد ہے خدا کے اس فرمان سے کہ "عَسَىٰٓ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا" (عنقریب تیرا رب تجھے نہایت پسندیدہ مقام عطا فرمائے گا)۔

یہ مطلب متعدد روایات میں مختصر اور مفصل دونوں طور پر شیعہ و سنی کتب میں مذکور ہے اور ان تمام روایات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آیت شریفہ میں "مَقَامًا مَّحْمُودًا" (پسندیدہ ترین مقام و مرتبہ) سے مراد مقام شفاعت ہے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ آنحضرتؐ کے علاوہ دیگر انبیاء علیہم السلام اور اولیاء و آئمہؑ شفاعت نہیں کر سکیں گے لہٰذا ان روایات سے دیگر انبیاء کی شفاعت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ عین ممکن ہے کہ ان سب کی شفاعت آنحضرتؐ کی شفاعت کی فرع ہو اور شفاعت کا آغاز آنحضرتؐ سے ہو۔

اسی طرح تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام یا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس آیت شریفہ "عَسَىٰٓ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد مقام شفاعت ہے۔

شفاعت کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا ارشاد

تفسیر العیاشی میں عبید بن زرارہ کی روایت مذکور ہے انہوں نے کہا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آیا قیامت کے دن مومن کے لیے شفاعت ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ہاں، تو وہاں حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ آیا مومن بھی قیامت کے دن حضرت محمدؐ کی شفاعت کا محتاج ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ہاں، کیونکہ مومنین بھی خطاؤں اور گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، کوئی ایسا نہیں جو آنحضرتؐ کی شفاعت کا محتاج نہ ہو، راوی کہتا ہے کہ اس وقت ایک شخص نے امامؑ سے پوچھا کہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا کیا مطلب ہے کہ "انا سید ولد ادم ولا فخر" (میں بنی نوع آدم کا سردار ہوں لیکن اس پر مجھے فخر (تکبر) نہیں؟) امامؑ نے فرمایا کہ ہاں یہ ہے، آنحضرتؐ بہشت کا دروازہ کھول کر اپنے پروردگار کے حضور سجدے میں گر جائیں گے اور اس وقت خداوند عالم ارشاد فرمائے گا کہ "ارفع رأسك اشفع تشفع اطلب تعط" (اپنا سر سجدے سے اٹھائیں اور جس کے لیے شفاعت کرنا چاہتے ہیں شفاعت کریں آپ کی شفاعت قبول ہوگی اور جو مانگیں گے وہ عطا کیا جائے گا)۔ آنحضرتؐ سجدے

سے سر اٹھائیں گے اور پھر سجدے میں گر جائیں گے اور پھر خداوند عالم فرمائے گا:

"ارفع رأسك اشفع تشفع، اطلب تعط" (اپنا سر سجدے سے اٹھائیں اور شفاعت کریں آپ کی شفاعت قبول ہوگی اور جو مانگیں آپ کو عطا کیا جائے گا)۔ تب آنحضرتؐ شفاعت کریں گے اور آپ کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا اور آپؐ جو بھی مانگیں گے وہ عطا کیا جائے گا۔

سب سے زیادہ امید دلانے والی آیت

تفسیر "فرات" کوفی میں محمد بن قاسم بن عبید کے حوالہ سے تمام راویوں کے ناموں کا ذکر کرتے ہوئے بشر بن شریح بصری سے روایت کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت محمد بن علی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ قرآن مجید میں کون سی آیت سب سے زیادہ امید دلانے والی ہے؟ امامؑ نے فرمایا کہ تمہاری قوم اس سلسلے میں کیا کہتی ہے؟ سب نے جواب دیا کہ وہ اس آیت کو پیش کرتے ہیں:

سورہء زمر، آیت ۵۳:

★ "يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ "

(اے میرے وہ بندو کہ جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو)۔

امامؑ نے فرمایا کہ ہم اہل بیتؑ یہ نہیں کہتے! (راوی کہتا ہے کہ) میں نے عرض کی: پھر آپ کس آیت کو سب سے زیادہ امید دلانے والی آیت سمجھتے ہیں؟ امام نے جواب دیا: ہم اس آیت کو زیادہ امید و سہارا دلانے والی آیت سمجھتے ہیں:

سورہء ضحیٰ آیت ۵:

★ "وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى "۔

(عنقریب تجھے تیرا پروردگار عطا فرمائے گا کہ تو راضی ہوگا)۔

خدا کی قسم اس سے مراد شفاعت ہے، خدا کی قسم وہ شفاعت ہے خدا کی قسم اس سے مراد شفاعت ہے۔

آیت شریفہ " عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا " میں "مقام محمود" سے مقام شفاعت مراد لینے کی وجہ ان متعدد روایات کے علاوہ کہ جن میں آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "اس سے مراد مقام شفاعت ہے"، عین ممکن ہے کہ آیت کے الفاظ بھی اس کا ثبوت ہوں اور وہ یہ کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے: " اَنْ يَّبْعَثَكَ " .... تجھے دے گا ..... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مقام قیامت کے دن آنحضرتؐ کو عطا کیا جائے گا، اور لفظ "محمود" مطلق ہے، ہر طرح کی حمد اس میں آتی ہے کیونکہ اسے کسی خاص حمد کے ساتھ مقید کر کے ذکر نہیں کیا گیا، لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایسا مقام ہے کہ اولین و آخرین میں

سے سب لوگوں کے نزدیک پسندیدہ ہے اور سب اس کی حمد وتعریف کریں گے"۔ اور حمد چونکہ اس تعریف کو کہتے ہیں جو کسی اچھے اور پسندیدہ کام پر کی جائے اور اس کام کو انجام دینے والے شخص نے اسے اپنے اختیار سے انجام دیا ہو تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ قیامت کے دن ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیں گے جس سے سب لوگ بہرہ مند ہوں گے اور سب اس کام پر ان کی حمد وتعریف کریں گے اور اسے سراہیں گے۔ کہ عبید بن زرارہ کی مذکورہ روایت میں ذکر ہو چکا ہے کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ہر شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا محتاج ہوگا' بہر حال اس سلسلے میں مزید وضاحت عنقریب کی جائے گی۔

اور جہاں تک قرآن مجید میں سب سے زیادہ امید دلانے والی آیت کا تعلق ہے کہ یہ آیت شریفہ: "وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى" سب سے زیادہ امید دلانے والی ہے نہ کہ آیت "يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ"، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم کی رحمت سے ناامید ہونے کی ممانعت اگرچہ قرآن مجید میں کئی بار ذکر ہو چکی ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ کہنا کہ "وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ".. سورۂ حجر، آیت ۵۶..... (کون ہے جو خدا کی رحمت سے ناامید ہو سوائے گمراہ لوگوں کے) اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا کہنا کہ "اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ"...... سورۂ یوسف، آیت ۸۷...... (خدا کی رحمت سے کوئی مایوس وناامید نہیں سوائے کافروں کے!) تو یہ دونوں آیتیں ثابت کرتی ہیں کہ وہ لوگ (گمراہ اور کافر) خدا کی تکوینی رحمت سے ناامید ہیں کیونکہ ان آیتوں کے سیاق عبارت اور مضمون ومورد سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

اور یہ آیت مبارکہ "قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ"......سورۂ زمر۔ آیت ۵۴......(کہہ دیجئے اے میری وہ بندو! کہ جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو' خداوند عالم سب گناہ بخش دے گا وہ گناہوں کو معاف کر دینے والا مہربان ہے اور تم اپنے پروردگار کے حضور توبہ کرو) اور اس کے بعد والی آیات شریفہ میں اگرچہ خدا کی تشریعی رحمت سے ناامید ہونے کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ آیت میں جملہ "اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ" اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقام پر "ناامید ہونے" سے مراد خدا کی معصیت اور اس کے احکام کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے اس کی رحمت سے ناامید ہونا ہے' اسی بناء پر خدا نے کسی استثناء کے بغیر تمام گناہوں کے بخشے جانے کی امید دلائی ہے لیکن آیت کے آخری جملے "وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ" میں توبہ کرنے اور خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دینے اور احکام الٰہی کی پیروی کرنے کا حکم دے کر اس بات کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ جس بندے نے خدا کی نافرمانی کر کے اپنے اوپر ظلم کیا اسے خدا کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے اور جب وہ توبہ کر کے خدا کے حضور سر تسلیم خم کرتے ہوئے دین اسلام کی حقانیت پر پختہ یقین کے ساتھ نیک اعمال بجالا سکتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ایسا کرلے اور اس طرح اپنے گناہوں کی بخشش کا راستہ ہموار کرے۔

بہر حال اس آیت میں جس ''رحمت'' کی امید دلائی گئی ہے وہ مشروط و مقید ہے اور خدا نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے تو وہ توبہ کر کے خلوص دل کے ساتھ نیک اعمال بجالائے تو اس کی بخشش ہو سکتی ہے لہٰذا مغفرت و بخشش کو چند امور کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے اس لیے اسے عام و غیر مشروط بخشش نہیں سمجھنا چاہیے۔ البتہ جس رحمت کا وعدہ خداوند عالم نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا ہے اور فرمایا کہ ''ہم نے آپ کو عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے'' تو اس سے مراد خدا کی عام اور غیر مشروط (مطلق و غیر مقید) رحمت ہے اور یہ آنحضرتؐ کی خوشی اور انہیں مسرت و سرور قلب عطا کرنے کے لیے دی گئی ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا : ''وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى'' کہ عنقریب تیرا پروردگار تجھے (وہ کچھ) عطا فرمائے گا کہ (جس سے) تو خوش ہو جائے گا۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ یہ آیت شریفہ ''وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى'' خدا کی طرف سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خاص عنایت و احسان کے ذکر پر مشتمل ہے اور اس میں ایک ایسے وعدے کا تذکرہ ہے جو آنحضرتؐ کے ساتھ مختص و مخصوص ہے اور اس طرح کا وعدہ خداوند عالم نے اپنی پوری مخلوق میں سے کسی کے ساتھ کبھی نہیں کیا اور یہ خدا کی طرف سے آنحضرتؐ پر خاص عطیہ و عنایت ہے، خدا نے اس عطیہ و عنایت کو کسی چیز کے ساتھ مشروط و مقید نہیں کیا (یعنی یہ نہیں کہا کہ اگر آپ فلاں کام کریں گے تو آپ کو یہ عطا کروں گا) بلکہ وہ مطلق یعنی ہر طرح کی شرط و قید سے خالی وعدہ ہے، اسی طرح کا وعدہ خداوند عالم نے اپنے ان بندوں سے کیا ہے جو اہل بہشت ہیں چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ شوریٰ، آیت ۲۲:

''لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ''

(بہشت میں ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہیں گے)

سورۂ ق، آیت ۳۵:

''لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ''

(بہشت میں وہ جو کچھ چاہیں گے انہیں ملے گا اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے)

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے بہشت میں ان کی چاہت سے بھی زیادہ نعمتیں موجود ہوں گی، اور یہ امر واضح ہے کہ ''چاہت''...... مشیت...... ہر اس خیر و سعادت...... سے تعلق پکڑتی ہے جو انسان کے دل میں آئے، پس یہ بھی معلوم ہوا کہ بہشت میں جو خیر و سعادت انسان کے لیے موجود ہے وہ اس کے قلبی احساسات سے ماوراء اور بالاتر ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ سجدہ، آیت ۱۷:

''فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ''

(کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ ان کے لیے جو آنکھوں کی ٹھنڈک ...... خیر وسعادت ...... چھپا کے رکھی گئی ہے وہ کیا ہے!)

بنابراین جب خداوند عالم نے اپنے مومن اور اعمال صالحہ بجالانے والے بندوں کے لیے ان کے دائرہ افکار سے بالاتر نعمتیں مقرر کر رکھی ہیں تو جو کچھ اپنے حبیب اور تمام انبیاءؑ کے سردار حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاص عنایت واحسان کے طور پر عطا فرمائے گا وہ یقیناً تمام نعمتوں سے برتر وعظیم اور وسیع تر اور زیادہ ہوگا۔ (غور فرمائیں)

یہ ہے خداوند عالم کی عطا وعنایت کا بیان، اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت پیغمبر اکرم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضایت وخوشنودی کی صورت کیا ہے! اس مقام پر یہ بات واضح اور ناقابل انکار ہے کہ اس رضایت سے خدا کے فیصلوں اور اس کی قضاء وقدر اور تقدیر پر راضی ہونا مراد نہیں کیونکہ وہ امر الٰہی کے باب سے ہے اور خدا تو مالک اور ہر لحاظ سے غنی و بے نیاز ہے جبکہ بندہ سراپا نیاز واحتیاج ہے اور اس کے پاس فقر وناداری اور حاجتمندی کے سوا کچھ بھی نہیں، وہ ہر چیز میں ہر لحاظ سے اور ہر لحہ احتیاج رکھتا ہے لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی ہر چیز پر راضی ہو خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ، اور وہ ہر اس فیصلے اور تقدیر پر راضی ہو جو اس کا پروردگار اس کے لیے مقرر کر دے، خواہ اسے وہ فیصلہ اور تقدیر اچھی لگے یا بری، دونوں صورتوں میں اسے اپنے مالک و پروردگار کے فیصلوں اور قضاء وقدر پر راضی ہونا ضروری ہے، تو یہ صورت حال عام بندوں اور اہل ایمان کی ہے اور پیغمبر اکرم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امر سے دوسروں کی نسبت زیادہ آگاہ اور اس پر عمل کرنے والے ہیں اور وہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں چاہتے جو خدا ان کے لیے چاہتا ہے، ان کی چاہت خدا کی چاہت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جس رضا و چاہت اور خوشی کا ذکر اس آیت شریفہ "وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ" ...... کہ خدا تجھے عنقریب وہ کچھ دے گا جس سے تو راضی وخوش ہوگا میں کیا گیا ہے اس سے مراد وہ عام رضایت نہیں جو ایک بندہ، خدا کے فیصلوں اور تقدیر پر کرتا ہے کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پروردگار سے ہر حال میں راضی ہیں خواہ وہ کچھ دے یا نہ دے، جبکہ اس آیت شریفہ میں آنحضرتؐ کی رضایت کا ذکر اس عطیہ کے ساتھ کیا گیا ہے جو خدا کی طرف سے آنحضرتؐ کو دیا جائے گا، تو اس سے یہ معنی سمجھا جاتا ہے کہ "تیرا پروردگار تجھے اس قدر عطا فرمائے گا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے" گویا یہ اس طرح پر ہے کہ جیسے کسی فقیر سے کہا جائے کہ میں تجھے اتنا مال دوں گا کہ پھر تجھے کوئی احتیاج باقی نہ رہے، کسی بھوکے سے کہا جائے کہ میں تجھے اس قدر کھانا کھلاؤں گا کہ تو سیر ہو جائے، تو اس صورت میں مال دینے یا کھانا کھلانے کی کوئی حد مقرر نہیں ہوئی بلکہ عطیہ احتیاج کی آخری حد تک وسیع ہوگا اور آنحضرتؐ کو خدا کی طرف سے جو کچھ دیا جائے گا اس کا حال بھی یہی ہے کہ پھر احتیاج کا کوئی پہلو باقی نہ رہے گا اس لیے اس عطیہ کی تحدید اور اندازہ گیری بھی نہیں ہو سکتی، اور قرآنی آیات کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے اسی طرح کے وسیع عطیہ کا وعدہ اپنے بندوں میں سے کچھ لوگوں کے ساتھ کیا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ بینہ، آیت ۷:

" اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ ؕ جَزَآؤُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ "۔

(جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے وہی "خیر البریہ" (ساری مخلوق سے بہتر) ہیں ان کی جزا واجر ان کے پروردگار کے پاس وہ باغات عدن ہیں کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ انہی میں ہمیشہ رہیں گے خداوند عالم ان سے راضی و خوش ہے اور وہ خدا سے راضی وخوش ہیں۔ یہ سب کچھ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے پروردگار کی خشیت میں ہو)۔

اس آیت مبارکہ میں جس عظیم عطیہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی خدا کی طرف سے خصوصی احسان وانعام کے طور پر ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ وہ عام مومنین کو دیئے جانے والے اجر سے کہیں زیادہ عظیم اور وسیع تر ہو ورنہ اس کی خصوصیت اور امتیازی حیثیت ختم ہو کر رہ جائے گی اور پھر یہ کہ خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اس طرح ارشاد فرمایا: " بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ "......سورہء توبہ۔ آیت ۱۲۸ ....(وہ مومنین کے ساتھ رأفت اور مہربانی کرنے والے ہیں) گویا خداوند عالم نے اس امر کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ میرا رسولؐ اہل ایمان پر مہربان ہے لہٰذا آنحضرتؐ کی رأفت ورحمت کے واضح ذکر کے بعد یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود تو بہشت کی نعمتوں سے اچھی طرح بہرہ ور ہوں اور جنت کی نہایت پاکیزہ وخوشگوار فضا سے لطف اندوز ہوں جبکہ ان کے دین وآئین پر ایمان لانے والوں میں سے ایک گروہ جہنم کی پستیوں میں گرا ہو اور آگ کے شعلے زنجیروں کی طرح انہیں جکڑے ہوئے ہوں حالانکہ وہ خدا کی ربوبیت، آنحضرتؐ کی نبوت وشریعت کو تسلیم اور اس پر ایمان واعتقاد کا واضح الفاظ میں اظہار کر چکے ہوں لیکن جہالت کی تاریک راہوں میں گم ہونے کی وجہ سے شیطان نے انہیں اپنے دام تزویر میں پھنسا دیا جس کے نتیجے میں وہ کچھ گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھے تاہم ان کا ایسا کرنا کسی عناد وتکبر کے سبب نہیں تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی ایک بھی اپنے ماضی کا ملاحظہ کرے اور اپنی زندگی کے گزرے ہوئے ایام پر نظر ڈالے اور اس بات پر غور کرے کہ اس نے کتنے کمالات اور بلند مراتب کے حصول میں کوتاہی کی اور کتنی رفعتوں اور عظمتوں سے بہرہ ور ہونا اس کے لیے ممکن تھا مگر اپنی بے توجہی کے سبب وہ ان سے محروم ہوا تو اس صورت میں وہ اپنے آپ کو ملامت کئے بغیر نہیں رہتا اور اپنی زیادتی کا اپنے تئیں اعتراف کرتے ہوئے اس تلخ وناگوار حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے کہ اس نے حصول کمالات میں اپنی توانائیاں صرف نہیں کیں، وہ اس وقت اپنی جوانی کی نادانیوں اور ناتجربہ کاریوں سے آگاہ ہو کر اپنے اوپر اپنے غصے کی بھڑکتی ہوئی آگ پر قابو پاتے ہوئے اپنے آپ کو مورد ملامت قرار دینے اور برا بھلا کہنے کی بجائے اپنے اوپر رحم کرنے لگتا ہے، اسے اپنی حالت زار پر رحم آتا ہے، اس کا یہ احساس اور اپنے اوپر رحم کھانا اسی معمولی وناچیز قوت رحمت کے سبب سے ہوتا ہے جو خداوند عالم نے اس کی فطرت میں ودیعت فرما دی ہے، تو جب خدا کی عطا کی ہوئی فطری رحمت انسان کے وجود میں اتنا بڑا احساس وانقلاب پیدا کر سکتی ہے تو پھر اس کریم ورحیم پروردگار عالم اور کائنات کے مالک کی رحمت کتنی عظیم ہو گی کہ جس کے سامنے انسان اپنی جہالت ونادانی اور کمزوریوں کے ساتھ رحمت کی امید لیے کھڑا ہو اور اپنے نبیؐ کی رأفت ومہربانی اور اس عظیم شخصیت کی عنایت وکرم نوازی کی آس لگائے

ہوئے ہو کہ جو مجسم رحمت کردگار ہیں، اس کی حالت زار پر کردگار عالم اور ارحم الراحمین کی رحمت کے دروازے کیونکر بند ہو سکتے ہیں اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک مومن کی اس کیفیت اور قابل رحم حالت پر نبی کریمؐ کی رحمت جوش میں نہ آئے اور اسے سخت ترین و ناگوار حال اور موت کی تلخ صورت سے لے کر قیامت کے ہولناک منظر تک کی دشوار گزار کیفیتوں میں مبتلا دیکھنے کے باوجود رحمۃ للعالمین کی عنایت اس پر سایہ فگن نہ ہو؟

شفاعت کے وسیع دائرہ کا تذکرہ

تفسیر القمی میں آیت شریفہ "وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ" کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ ابو العباس مکبر نے کہا کہ حضرت علی بن الحسین علیہ السلام کی ایک زوجہ کا آزاد کردہ غلام کہ جس کا نام "ابوایمن" تھا ایک دن امام ابوجعفر علیہ السلام کی خدمت اقدس میں آیا اور کہنے لگا کہ آپ، لوگوں کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے اور انہیں دھوکہ دینے کے لیے ہمیشہ شفاعت محمدؐ شفاعت محمدؐ یاد دلاتے رہتے ہیں! یہ سن کر حضرت امام ابوجعفر علیہ السلام سخت غضبناک ہوئے اور آپ کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا' اسی حالت میں امام علیہ السلام نے فرمایا: تجھ پر سخت افسوس ہے اے ابوایمن! تو اپنے آپ کو عفت و پاکدامنی کا حامل سمجھتے ہوئے غلط فہمی کا شکار ہے جس کے نتیجے میں تو اس قدر جسارت کر رہا ہے' یاد رکھ کہ تو جب قیامت کے ہولناک منظر کو دیکھے گا تو اس وقت تجھے معلوم ہوگا کہ تو حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا کس قدر محتاج ہے' خدا تجھے سمجھے! کیا آنحضرتؐ اس شخص کے علاوہ کسی کی شفاعت کریں گے جو اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کے باعث جہنم کی آگ کا مستحق قرار پا چکا ہوگا؟ یاد رکھ کہ قیامت کے دن اولین و آخرین میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا محتاج نہ ہو' (اس کے بعد امامؑ نے فرمایا) قیامت کے دن حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ساری امت کی شفاعت کریں گے اور ہمیں اپنے شیعوں و پیروکاروں کی شفاعت کا حق حاصل ہے' اسی طرح ہمارے شیعوں کو اپنے اہل خاندان و متعلقین کی شفاعت کا حق حاصل ہوگا' (پھر امامؑ نے فرمایا) قیامت کے دن مومن' ربیعہ اور مضر (عرب کے دو بزرگ قبیلوں کے سردار) جیسے لوگوں کی شفاعت کرے گا اور مومن اپنے نوکر و خادم کی بھی شفاعت کرے گا اور خدا کے حضور عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار اس شخص نے میری خدمت گزاری کا پورا پورا حق ادا کیا ہے یہ مجھے گرمی و سردی میں راحت و آرام پہنچاتا رہا' اس کے گناہوں کو معاف فرما دے۔

اس روایت میں امام علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ "قیامت کے دن اولین و آخرین میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا محتاج نہ ہو" اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمومی شفاعت (یعنی وہ شفاعت کہ جو ہر ایک کے لیے ہوگی) کے علاوہ ہے جس کا ذکر اسی روایت کے ذیل میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: "اے ابوایمن! خدا تجھے سمجھے' کیا آنحضرتؐ اس شخص کے علاوہ کسی کی شفاعت کریں گے جو اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کے سبب جہنم کی آگ کا مستحق قرار پا چکا ہے۔" یہی مطلب تفسیر العیاشی کے حوالے سے عبید بن زرارہ کی روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ

السلام کے فرمان میں ذکر کیا جا چکا ہے، اور اسی مطلب کو کئی دیگر روایات میں بھی ذکر کیا گیا ہے جو کہ عامہ و خاصہ (سنی و شیعہ) دونوں کی کتب میں مذکور ہیں، اور ان سب سے بالاتر قرآن مجید میں خداوند عالم کے ارشاد گرامی سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے ملاحظہ ہو:

سورۂ زخرف، آیت ۸۶:

"وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ"۔

(اور یہ خدا کے علاوہ جن لوگوں کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کے مالک نہ ہوں گے سوائے ان لوگوں کے، کہ جنہوں نے علم رکھتے ہوئے حق کی شہادت دی)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کا معیار شہادت (گواہی دینا) ہے لہٰذا شہداء ہی قیامت کے دن شفاعت کریں گے اور شفاعت ان کی ملکیت و اختیار میں ہوگی، ہم عنقریب آیت شریفہ "وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" ...... بقرہ ۱۴۳...... کی تفسیر میں اس امر کی وضاحت کریں گے کہ انبیاءؑ شہداء ہیں اور آنحضرتؐ انبیاءؑ پر شہادت دینے والے ہیں لہٰذا حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام شہداء (گواہوں) پر شہید (گواہ) ہیں اور وہی تمام شفیعوں کے شفیع ہیں اور اگر ان شہداء کی شفاعت نہ ہوتی تو قیامت کا وجود ہی نہ ہوتا۔

محمد مصطفیٰؐ شفیع روز جزا

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ "وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ" کی تفسیر میں امام علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی ذکر کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن کوئی نبی اور رسول اس وقت تک شفاعت نہیں کرے گا جب تک کہ خدا اسے شفاعت کرنے کی اجازت نہ دے دے سوائے حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفیٰ صلی الہ علیہ وآلہ وسلم کے، کیونکہ خداوند عالم نے انہیں قیامت کے دن سے پہلے ہی شفاعت کرنے کی اجازت دے دی ہے لہٰذا وہ اور ان کی اولاد میں آئمہ اطہارؑ قیامت کے دن شفاعت کریں گے اور پھر اس کے بعد انبیاء علیہم السلام خدا کی طرف سے اجازت و اذن پا کر شفاعت کریں گے۔

شفاعت کرنے والے تین گروہ

کتاب خصال میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن تین قسم کے لوگ شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی، پہلے انبیاءؑ، پھر علمائ، پھر شہدائ۔

بظاہر اس روایت میں شہداء سے مراد "میدان جنگ میں جان قربان کرنے والے" ہیں جیسا کہ عام طور پر آئمہ اطہار علیہم السلام کی روایات میں اس لفظ سے میدان جنگ میں قتل کئے جانے والے شہداء ہی مراد ہوتے ہیں، نہ کہ وہ شہداء کہ

جو اعمال کی گواہی دینے والے ہیں جو کہ قرآنی اصطلاح ہے۔

حدیث الاربعمأۃ سے استناد

کتاب خصال میں مشہور و معروف "حدیث الاربعمأۃ" میں ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ ہم بھی شفاعت کریں گے اور ہماری مودت رکھنے والے بھی شفاعت کریں گے۔

شفاعت کے باب میں متعدد روایات ایسی ہیں جن میں حضرت سیدہ نساء عالمین فاطمہ زہراء علیہا السلام کی شفاعت اور آنجنابؑ کی اس اولاد کی شفاعت کا ذکر ہے جو مقام امامت پر فائز نہیں، اور مومنین کی شفاعت کا بھی ذکر ہے یہاں تک کہ وہ بچہ جو سقط ہو جائے' چنانچہ اس سلسلے میں مشہور و معروف حدیث سے واضح طور پر اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ جس میں آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے: "تناكحوا تنا سلوا فاني اباهي بكم الامم يوم القيامة ولو بالسقط يقوم محبنطئاً على باب الجنة فيقال له ادخل فيقول لا حتى يدخل ابواى" (نکاح کرو اور اپنی نسل کو زیادہ کرو کہ میں قیامت کے دن تمہاری وجہ سے دوسری امتوں کے مقابلے میں فخر و مباہات کروں گا یہاں تک کہ تمہارے سقط شدہ بچے پر بھی فخر کروں گا کہ وہ بچہ بہشت کے دروازے پر رک جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ اندر جاؤ' مگر وہ کہے گا کہ میں اس وقت تک بہشت میں داخل نہیں ہوں گا جب تک کہ میرے والدین داخل نہ ہوں (گویا وہ اپنے ماں باپ کی شفاعت کرے گا)۔

بہشت کے آٹھ دروازے

اسی طرح کتاب خصال میں ہے کہ حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے اپنے والد بزرگوار اور دادا محترم کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

(ان للجنة ثمانية ابواب : باب يدخل منه النبيون والصديقون ، وباب يدخل منه الشهداء والصالحون، وخمسة ابواب يدخل منها شيعتنا و محبونا . فلا ازال واقفاً على الصراط ادعوا و اقول : رب سلم شيعتي و محبي و انصاري و من تولاني في دار الدنيا ،فاذا النداء من بطلان العرش: قد اجيبت دعوتك و شفعت في شيعتك و يشفع كل رجل من شيعتي و من تولاني و نصرني و حارب من عاداني بفعل او قول في سبعين الفاً من جيرانه و اقرباءه ، وباب يدخل منه ساير المسلمين ممن يشهد ان لا اله الا الله و لم يكن في قلبه مقدار ذرة من بغضنا اهل البيت،

''بہشت کے آٹھ دروازے ہیں:

ایک دروازہ انبیاء وصدیقین کے لیے ہے وہ اس سے بہشت میں داخل ہوں گے۔

دوسرا دروازہ شہداء وصالحین کے لیے ہے وہ اس سے بہشت میں داخل ہوں گے۔

پانچ دروازے ہمارے شیعوں اور ہمیں دوست رکھنے والوں کے لیے ہیں وہ ان سے بہشت میں داخل ہوں گے اور میں پل صراط پر کھڑا رہوں گا اور بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ اے میرے پروردگار! میرے شیعوں اور مجھ سے محبت کرنے والوں اور میرے مددگاروں اور ان تمام لوگوں کو سلامتی عطا فرما جو دنیا میں میری ولایت کا دم بھرتے تھے' اور انہیں جہنم میں گرنے سے محفوظ فرما''۔ اس وقت عرش سے آواز آئے گی کہ ''آپ کی دعا مستجاب ہوئی اور آپ کی شفاعت قبول ہوئی'' پس قیامت کے دن میرے شیعوں' میرے مددگاروں' میری محبت رکھنے والوں اور اپنے قول وفعل کے ذریعے میرے دشمنوں سے جنگ کرنے والوں میں سے ہر ایک شخص اپنے ہمسایوں اور اپنے قریبیوں میں سے ستر ہزار افراد کی شفاعت کرے گا۔

ایک دروازہ ایسا ہوگا جس سے وہ دیگر اہل اسلام اور کلمہ گویان توحید بہشت میں داخل ہوں گے جن کے دلوں میں ہم اہل بیتؑ سے ذرہ بھر بغض نہیں ہوگا۔

امام جعفر صادقؑ کا ایک خط

کتاب کافی میں حفص موذن سے ایک روایت منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے اصحاب کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا:

(واعلموا انه ليس يغني عنكم من الله احد من خلقه لا ملك مقرب ولا نبي مرسل ولا من دون ذالك، من سره ان ينفعه شفاعة الشافعين عند الله فليطلب الى الله ان يرضى عنه)

''جان لو کہ پوری مخلوق میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو تمہیں خدا سے بے نیاز کر دے نہ کوئی مقرب فرشتہ اور نہ کوئی نبی ورسول اور نہ ہی کوئی دوسرا' لہٰذا جو شخص شفاعت کرنے والوں کی شفاعت حاصل کرنے کا خواہشمند ہو اور یہ چاہتا ہو کہ خدا کے پاس اس کے حق میں شفاعت قبول ہو وہ خداوند عالم سے اس کی رضا وخوشنودی طلب کرے اور اپنے قول وفعل کے ذریعے استدعا کرے کہ خدا اس سے راضی ہو۔

سیدہ فاطمہ زہراءؑ کی شفاعت کے بارے میں!

تفسیر فرات کوفی میں مولف نے اپنے اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ

آنجناب نے فرمایا کہ جابر انصاری نے حضرت ابوجعفر امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: اے فرزند رسولؐ! میری جان آپ پر قربان ہو آپ مجھے اپنی جدہ محترمہ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کے متعلق کچھ بیان فرمائیں! جابرؓ نے امام علیہ السلام کے بیانات ذکر کیے جن میں آنجناب نے قیامت کے دن حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی شفاعت کا تذکرہ کیا (اور یہاں تک پہنچے) کہ امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا کی قسم...... قیامت کے دن...... لوگوں میں سے کوئی باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ یا وہ دین کے بارے میں شک کرنے والا ہوگا یا کافر ہوگا یا منافق ہوگا' اور جب وہ سب جہنم میں ڈالے جا چکے ہوں گے تو وہاں فریاد کریں گے اور پکار پکار کر یہ کہیں گے: (خداوند عالم نے ان کی پکار کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے) "فما لنا من شافعین ولا صدیق حمیم فلو ان لنا کرۃ فنکون من المومنی ن" (اب شفاعت کرنے والوں میں سے کوئی ہماری شفاعت کرنے والا نہیں اور نہ ہی کوئی ہمارا مخلص دوست ہے پس اگر ہمیں دوبارہ واپس بھیجا جائے تو ہم ضرور ایمان لے آئیں گے) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: لیکن افسوس کہ وہ اپنی مراد نہ پا سکیں گے اور اگر بالفرض انہیں دنیا میں واپس بھیجا بھی جائے تب بھی جن چیزوں سے انہیں روکا گیا ہے انہی کی طرف پلٹ جائیں گے اور وہ ہیں ہی جھوٹ بولنے والے!۔

امام علیہ السلام نے اپنے بیان میں آیت شریفہ "فما لنا من شافعین" سے استدلال کیا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ امامؑ کی نظر میں یہ آیات قیامت کے دن شفاعت کے وقوع پذیر ہونے کو ثابت کرتی ہیں جبکہ شفاعت کے منکرین نے اس آیت کو شفاعت کی نفی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے' اور ہم نے اس سے پہلے آیت شریفہ "فما تنفعھم شفاعۃ الشفاعین" کی تفسیر میں جو مطالب ذکر کیے ہیں ان کی روشنی میں اس آیت مبارکہ (فما لنا من شافعین) سے شفاعت کے وقوع پذیر ہونے کا اشارہ ملتا ہے کیونکہ اگر خداوند عالم شفاعت کی سرے ہی سے نفی کرنا چاہتا تو یوں فرماتا: "فما لنا من شفیع ولا صدیق حمیم" کہ کوئی ہماری شفاعت کرنے والا نہ تھا اور نہ ہی کوئی ہمارا مخلص دوست' تو نفی کے بعد مفرد کے صیغہ (شفیع) کی بجائے جمع کے صیغہ (شافعین) کا ذکر کرنا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے وقوع پذیر ہونے کی دلیل ہے اور اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ کچھ لوگوں کی شفاعت قابل قبول ہوگی' اور اس کے علاوہ یہ کہ "فما لنا من شافعین ولا صدیق حمیم" کے بعد ان کا یہ کہنا کہ "فلو ان لنا کرۃ فنکون من المومنین" (اے کاش کہ ہمیں دوبارہ واپس بھیجا جاتا تو ہم ضرور ایمان لاتے) ایک طرح کی آرزو اور تمنا ہے کہ جو مقام حسرت میں واقع ہوئی ہے اور یہ امر واضح ہے کہ مقام حسرت میں اس طرح سے تمنا کرنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ جس چیز سے وہ محروم ہیں وہ ان کے لیے ضروری تھی اور اب وہ حسرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اے کاش ہم اس سے بہرہ مند ہوتے' لہٰذا ان کا یہ کہنا کہ "اے کاش ہم دوبارہ دنیا میں واپس بھیجے جاتے تو ایمان لے آتے ان کی اس خواہش کو ثابت کرتا ہے کہ اے کاش! ہم بھی مومنین کی طرح شفاعت کے مستحق قرار پاتے' (دنیا میں واپس جا کر ایمان لاتے اور ایمان والوں کی

رح شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے بہرہ ور ہوتے) بنابرایں یہ آیت مبارکہ ان آیات میں سے ایک ہے جو فاعت کے وقوع پذیر ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

فاعت پیغمبرؐ کا تذکرہ

کتاب توحید (شیخ صدوق) میں ہے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنے پدر بزرگوار اور انہوں نے اپنے آباء کرام کے حوالے سے حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ذکر فرمایا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: انما شفاعتی لاھل الکبائر من امتی، فاما المحسنون فما علیھم من سبیل) "میری امت میں سے یری شفاعت صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے لیکن جن لوگوں نے نیک اعمال کئے ہوں گے انہیں شفاعت کی ضرورت ہی نہ ہوگی" امامؑ سے پوچھا گیا کہ اے فرزند رسولؐ! یہ فرمایئے کہ کبیرہ گناہوں کا رتکاب کرنے والے کیونکر شفاعت سے بہرہ ور ہوں گے جبکہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے "وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (اور وہ شفاعت نہیں کریں مگر اس کی، کہ جسے خدا پسند فرمالے) اور یہ بات واضح ہے کہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے کبھی خدا کے پسندیدہ افراد قرار نہیں پا سکتے' امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے جواب دیا کہ: "مومن جب بھی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا ایسا کرنا اسے دکھ دیتا ہے اور وہ اپنے کئے پر کف افسوس ملتا ہے اور اپنے تئیں نادم و پشیمان ہوتا ہے ر آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ندامت و پشیمانی ہی اصل میں توبہ ہے' اور یہ بھی آنحضرتؐ کا ارشاد ہے: (من سرته حسنة سائته سیئة فھو مومن، فمن لم یندم علی ذنب یرتکبه فلیس بمومن و لم تجب له لشفاعة و کان ظالماً والله تعالیٰ ذکره یقول: مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ،) کہ ومن وہی ہے جو اپنے نیک عمل سے خوش و مسرور اور اپنے برے عمل سے پریشان و مغموم ہو' لہٰذا جو شخص اپنے ارتکاب گناہ سے نادم و پشیمان نہ ہو وہ مومن ہی نہیں اور وہ شفاعت سے ہرگز بہرہ ور نہ ہوگا بلکہ وہ ظالم ہے اور خداوند عالم نے انہی کے تعلق فرمایا ہے: "مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ۔ سورۂ غافر آیت ۸۔۔ ظالموں کا نہ کوئی مخلص دوست ہے او نہ ہی کوئی ان کی شفاعت کرنے والا ایسا ہے کہ جس کی بات مانی جاتی ہو' پھر کسی نے امام علیہ السلام سے پوچھا کہ اے فرزند سولؐ! یہ کیونکر ہے کہ جو شخص اپنے ارتکاب گناہ سے نادم و پشیمان نہ ہو وہ مومن ہی نہیں؟ امامؑ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو اس یقین کے باوجود کہ گناہ کے ارتکاب پر سزا اور عقاب ہوگا گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد سزا کے وف سے اس پر نادم و پشیمان نہ ہو (جس شخص کو یقین ہو کہ گناہ پر سزا ہوگی وہ یقیناً سزا کے خوف سے اپنے کئے پر پشیمان ہو) اور جوں ہی وہ نادم و پشیمان ہوا گویا اس نے توبہ کرلی اور توبہ کرنے والا شخص شفاعت کا مستحق قرار پاتا ہے' لیکن اگر وہ یمان نہ ہو تو وہ دوبارہ اس گناہ کا مرتکب ہوگا اور جو بار بار گناہ کرے تو اس کی بخشش نہیں ہوسکتی کیونکہ اسے گناہ کی سزا پر ایمان یقین نہیں اگر اسے اس پر ایمان و یقین ہوتا تو یقیناً نادم و پشیمان ہوتا' اور حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد

فرمایا ہے کہ توبہ و استغفار کے بعد کوئی کبیرہ گناہ باقی نہیں رہتا اور نہ ہی کوئی صغیرہ گناہ بار بار انجام دینے کے باوجود صغیرہ کہلا
ہے اور خداوند عالم کا یہ فرمان کہ "وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ" (وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کی
جسے خدا پسند فرمالے) تو اس سے مراد یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے قیامت کے دن کسی کی شفاعت نہیں کریں گے سوا
اس کے، کہ جو خدا کے نزدیک پسندیدہ دین رکھتا ہو۔ اور حقیقت امر یہ ہے کہ دین نیک اعمال پر جزا اور برے اعمال پر سزا
عقیدہ اور اقرار ہی کا دوسرا نام ہے۔ پس جو شخص پسندیدہ دین رکھتا ہو وہ یقیناً اپنے گناہ پر نادم و پشیمان ہوگا کیونکہ وہ جانتا
کہ گناہ کرنے والے کا قیامت کے دن کیا انجام ہوگا اور وہ اس پر ایمان بھی رکھتا ہے۔ (کتاب التوحید، صفحہ ۴۰۷ حدیث
باب ۶۳)

روایت کی تشریح

اس روایت میں امام علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ "جو شخص ارتکاب گناہ کے بعد نادم و پشیمان نہ ہو وہ مومن نہیں اور نہ
وہ شفاعت کا مستحق ہے بلکہ "وہ ظالم ہے" تو اس جملے میں امام علیہ السلام نے قیامت کے دن ظالم کی پہچان کروائی ہے اور ا
امر کو واضح کیا ہے کہ قیامت کے دن کسے "ظالم" کے نام سے موسوم کیا جائے گا" اس جملے میں اس قرآنی بیان کی طرف اشا
ہے جس میں "ظالم" کی پہچان اس طرح کروائی گئی ہے: "فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَن لَّعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿٤٤﴾ الَّذِي
وْنَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُم بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ" ۔۔۔۔۔ سورہ اعراف، آیات ۴۳ تا ۴۵
(پس اعلان کرنے والے نے ان کے درمیان اعلان کر کے کہا کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے کہ جو لوگوں کو خدا کے راستے
روکتے ہیں اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کے راستے کو ٹیڑھا کر دیں اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں)۔ اس آیہ
میں "ظالم" کی واضح طور پر پہچان کروائی گئی ہے اور یہ وہی ہے جو جزا و سزا کے دن کا اعتقاد نہیں رکھتا، اس لیے اگر خدا
اوامر و احکامات میں سے کوئی چیز انجام نہ دے تو اسے دکھ نہیں پہنچتا، وہ خدا کے حکم سے روگردانی پر کف افسوس ملتا ہے نہ
حرام کام کو انجام دینے پر نادم و پشیمان ہوتا ہے یہاں تک کہ تمام معارف الٰہیہ اور تعلیمات دینیہ کا سرے سے انکار کر
خدا کے احکام و فرامین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قیامت کے دن کی جزا و سزا کو خاطر میں نہ لانے پر کسی ملال و ندامت کا ش
نہیں ہوتا اور اگر احکام خداوندی اور جزا و سزا کی کوئی بات بھی کرتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے اور اس کی تکذیب کے
پر کرتا ہے۔

اور امام علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ "جب وہ اپنے تئیں نادم و پشیمان ہو تو گویا اس نے توبہ کر لی اور وہ شفاعت کا مستح
ٹھہرا" تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے کیئے پر ندامت و پشیمانی کے بعد پسندیدہ دین و عقیدہ کا حامل بن کر خداوند عالم
طرف پلٹ آتا ہے اور اس طرح شفاعت کا استحقاق پالیتا ہے۔ لیکن اگر امامؑ کے بیان میں "ندامت" سے مراد وہی توبہ
جائے جو اصطلاح عام میں معروف ہے تو وہی توبہ اس کی شفاعت کرنے اور اسے جہنم سے نجات دلانے میں کافی ہے،

اور امام علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ "پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ استغفار کے بعد کوئی کبیرہ گناہ، کبیرہ نہیں رہتا" تو دراصل اس جملے کے ذکر سے اس کے بعد والے جملے کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود تھا اور وہ یہ کہ "کسی صغیرہ گناہ کو بار بار انجام دینے سے وہ صغیرہ ہونے کی حالت پر باقی نہیں رہتا" کیونکہ جو شخص صغیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے سے نادم و پشیمان نہیں ہوتا وہ گناہ اس کی نسبت دوسرا عنوان اختیار کر لیتا ہے اور وہ یہ کہ یہ شخص معاد اور قیامت کا منکر ہے اور آیات الٰہی کے ساتھ ظلم کرتا ہے لہٰذا اس کی بخشش نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی گناہ کی بخشش اسی صورت میں ممکن ہے جب گناہ کا مرتکب شخص اپنے کئے کی توبہ کرے یا اسے شفاعت حاصل ہو جائے جبکہ دونوں صورتیں بار بار گناہ کرنے والے کی بابت قابل تصور نہیں یعنی جو شخص بار بار معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ نہ تو نادم و پشیمان ہوتا ہے اور نہ ہی تائب' اسی طرح وہ شفاعت سے بھی بہرہ ور نہیں ہوتا کیونکہ شفاعت اسے حاصل ہوتی ہے جس کا دین و عقیدہ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہو' تو جو شخص احکام الٰہی کی پرواہ کئے بغیر اور جزا و سزا کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بار بار گناہ و معصیت کا مرتکب ہو اس کا دین و عقیدہ خدا کے نزدیک کیونکر پسندیدہ ہو سکتا ہے؟ اس لیے جب اس کا دین و عقیدہ خدا کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو تو وہ شفاعت سے بھی محروم رہے گا' پس نہ توبہ اور نہ شفاعت اس کی بخشش کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔

یہی مطلب اس روایت میں بھی بیان کیا گیا ہے جو کتاب علل الشرائع میں ذکر کی گئی ہے کہ ابو اسحاق لیثی نے کہا:

میں نے حضرت ابو جعفر امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ اے فرزند رسولؐ! مجھے اس امر سے آگاہ فرمائیں کہ جب کوئی شخص ایمان کی روشنی دل میں رکھتا ہو اور معرفت کی بلندیوں میں کمال کی حد تک پہنچ جائے تو آیا وہ بھی زنا جیسے قبیح فعل کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ امامؑ نے جواب دیا کہ: "خدا کی قسم ہرگز نہیں! پھر میں نے پوچھا کہ آیا وہ لواط کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: "خدا کی قسم' ہرگز نہیں! پھر میں نے پوچھا آیا وہ چوری کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: نہیں' پھر میں نے پوچھا آیا وہ شراب خواری کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ امام نے فرمایا: نہیں' میں نے پوچھا آیا وہ ان کبیرہ گناہوں میں سے کسی کا ارتکاب کر سکتا ہے یا ان قبیح اعمال میں سے کسی عمل کو انجام دے سکتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: "ہرگز نہیں"۔ تو میں نے عرض کی کہ آپ کا مقصد یہ ہے کہ ایسا شخص کوئی کبیرہ گناہ نہیں کر سکتا؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں ایسا شخص ہرگز کوئی کبیرہ گناہ نہیں کر سکتا' میں نے پوچھا تو آیا وہ ان کبیرہ گناہوں کے علاوہ کوئی گناہ کر سکتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں' کسی مومن مسلمان سے کسی گناہ کا سرزد ہونا ممکن ہے! میں نے پوچھا کہ اگر ایسا ہے تو پھر مسلمان کسے کہتے ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: مسلمان اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے اور نہ ہی ایک بار گناہ سرزد ہونے کے بعد اسے بار بار انجام دے۔

قیامت کے دن تجلّیٔ پروردگار

کتاب خصال میں متعدد اسناد کے ساتھ حضرت امام رضا علیہ السلام کے حوالے سے مذکور ہے کہ آنجنابؑ نے اپنے آباء کرامؑ کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد گرامی بیان کیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:

(اذا کان یوم القیامة تجلی الله عزوجل لعبده المومن فیوقفه علیٰ ذنوبه ذنباً ذنباً ثم یغفر الله له لا یطلع الله له ملکاً مقرباً و لا نبیاً مرسلاً و یستر علیه ا
یقف علیه احد، ثم یقول لسیأته : کونی حسنات)

"قیامت کے دن خداوند عالم اپنے مومن بندے کے سامنے تجلی فرمائے گا (اپنی عظمت کا جلوہ دکھائے گا) او اسے اس کے تمام گناہوں سے آگاہ کرے گا اور پھر اس کی مغفرت کرے گا' اور یہ سب کچھ اس لیے کرے گا کہ کوئی مقرب درگاہ فرشتہ اور نبی و رسول اس کے مومن بندے کی خطاؤں اور گناہوں سے آگاہ نہ ہونے پائے اور خداوند عالم اپنے موم بندے کی پردہ پوشی فرمائے گا تاکہ کوئی اس کی لغزشوں کے آثار سے مطلع نہ ہونے پائے' اس کے بعد خداوند عالم اس ک خطاؤں اور گناہوں کو حکم دے گا کہ وہ نیکیوں میں بدل جائیں۔

(اس روایت کی تمام تر اسناد کے باوجود اس کے مندرجات کئی پہلوؤں سے قابل تاویل ہیں اور اس کے ظاہر الفاظ و عبارات سے کسی اہم مطلب کا استناد درست نہ ہوگا۔ مترجم)۔

پیغمبر اسلامؐ کا کھلکھلا کر ہنسنا!

کتاب صحیح مسلم میں راویوں کے اسماء گرامی ذکر کئے بغیر حضرت ابوذر غفاری سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں ۔ کہا: حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا اور حکم دیا جائے کہ اس کے سامنے اس کے صغیرہ گناہوں کو پیش کرو اور اس کے کبیرہ گناہ اس سے دور رکھو' پس جب اس کے سامنے اس ۔ صغیرہ گناہ پیش کئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ تو نے فلاں دن یہ کام کیا اور فلاں دن یہ کام کیا تو وہ ان تمام گناہوں اعتراف و اقرار کرے گا اور کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرے گا لیکن وہ صغیرہ گناہوں کے اقرار و اعتراف کے ساتھ ساتھ اپ کبیرہ گناہوں سے خوفزدہ ہوگا کہ کہیں وہ اس کے سامنے پیش نہ کئے جائیں پھر (اس کے اس خوف اور کبیرہ گناہوں کے پیش کئے جانے کی صورت میں احساس شرمندگی کی وجہ سے) حکم دیا جائے گا کہ اس کی ہر خطا و لغزش کی جگہ ایک نیکی اسے دے د وہ شخص کہے گا کہ میں نے تو بہت سے گناہ کئے تھے مگر انہیں یہاں نہیں دیکھ رہا ہوں' حضرت ابوذر نے کہا کہ آنحضرتؐ ۔ جب یہ واقعہ سنایا تو آپؐ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

(اس روایت میں بھی کتاب خصال میں مذکور روایت کی شباہت پائی جاتی ہے' م)۔

ابلیس کی تمنائے شفاعت

کتاب امالی میں مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اذا کان یوم القیامة نشر الله تبارك وتعالیٰ رحمته حتی یطمع ابلیس فی رحمته)

''جب قیامت کا دن ہوگا تو خداوند عالم اپنی رحمت کا دامن پھیلا دے گا اور خدا کی رحمت اس قدر وسعت اختیار کرے گی کہ شیطان بھی اس کے حصول کا متمنی ہو جائے گا۔

مذکورہ بالا تین روایات (دیگر روایات کے برعکس) مطلق ہیں کیونکہ ان میں گناہوں کی بخشش کے لیے کوئی شرط وغیرہ ذکر نہیں کی گئی جبکہ دیگر روایات میں مغفرت و بخشش کو مشروط طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم قیامت کے دن پیغمبر اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے وقوع پذیر ہونے کی بابت آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے اور اہل سنت والجماعت کے مستند راویوں کے حوالوں سے کثیر تعداد میں روایات موجود ہیں بلکہ ان کی کثرت ''تواتر'' کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور وہ سب مجموعی طور پر ایک ہی مطلب کو بیان کرتی ہیں کہ قیامت کے دن اہل ایمان میں سے گناہگار لوگوں کی شفاعت ہوگی' یا تو انہیں جہنم میں ڈالے جانے سے نجات دلائی جائے گی یا یہ کہ اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جانے کے بعد انہیں وہاں سے نکالا جائے گا' بہرحال ان تمام روایات سے جو بات یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ اہل ایمان میں سے گناہگار افراد ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رہیں گے' اور آپ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہیں کہ اس موضوع کی بات قرآن مجید میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے بھی اسی مطلب کا ظبوت ملتا ہے اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا (یعنی قرآنی آیات میں بھی اسی امر کو بیان کیا گیا ہے کہ اہل ایمان میں سے گناہگار افراد جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے)۔

فلسفیانہ بحث

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ معاد (قیامت) کے متعلق جو تفصیلی مطالب قرآن وسنت میں ذکر کئے گئے ہیں عقلی دلائل ان کے اثبات سے قاصر ہیں' اس کی وجہ بقول ابوعلی سینا یہ ہے کہ وہ بنیادی اصول (مقدمات) کہ جن کے ذریعے حقائق تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے وہ انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہیں' عقلی دلائل انہیں نہیں پا سکتے' لیکن بدن سے روح کے نکل جانے کے بعد انسان جس عقلی ومثالی تجرد کا حامل ہوتا ہے اس کے ثبوت پر عقلی دلائل موجود ہیں کہ جو ان عقلی ومثالی کمالات کا بھی ادراک کر سکتے ہیں جن کا حصول سعادت وشقاوت کے دو راستوں میں سے کسی ایک پر چلنے پر موقوف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ابتدائے امر ہی سے ایسا ہے کہ جب بھی کوئی کام انجام دیتا ہے تو اس کے آغاز ہی میں اس کی بابت اس کی لوح دل وصفحۂ جاں پر سعادت وشقاوت کی ایک تصویر بن جاتی ہے اور سعادت وشقاوت کی ایک خاص حالت وکیفیت اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے' یاد رہے کہ یہاں ''سعادت'' سے ہماری مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان ہونے کے ناطے اس کے لیے بہتر (خیر) ہے اور ''شقاوت'' سے مراد اس کے برعکس ہر وہ چیز ہے جو انسان کے لیے انسان ہونے کے حوالے سے (شر) بری ہے' اب اگر وہ اس کام کو بار بار انجام دے تو اس کی وہ حالت وکیفیت شدت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے باطن میں چھا جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو جاتی ہیں کہ پھر وہ انسان کی طبع کا ایک حصہ بن جاتی

ہے اور اس کے سبب نفس انسانی میں سعادت و شقاوت کی ایک ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے جو کئی دوسری نفسانی صورتوں کے وجود میں آنے کی بنیاد بنتی ہے پس اگر وہ حالت و کیفیت سعادت سے تعلق رکھتی ہو تو اس کے آثار "وجودی" اور نئی صورت کے ساتھ ہم رنگ اور اس "نفس" کے ساتھ بھی بھرپور مناسبت کے حامل ہوں گے جو اس نئی صورت کے لیے ایک بنیاد اور ظرف کی حیثیت رکھتا ہے (یعنی ایسے "مادہ" کی طرح کہ جو ان صورتوں کو قبول کر سکتا ہے) اور اگر اس کا تعلق شقاوت سے ہو تو اس کے آثار "عدمی" ہوں گے کہ جن کی بازگشت...... عقلی تجزیہ و تحلیل کی روشنی میں..... فقدان و محرومیت اور برائی و شر کی طرف ہے اور انہی دونوں صورتوں میں سے وہ نفس (روح) کہ جو سعادت سے بہرہ ور ہو وہ اس سعادت کے آثار سے انسانی نفس ہونے کے ناطے لطف اندوز ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے یہ بات بھی لذت بخش اور سرور آور ہوگی کہ اس کی انسانیت اب سعادت کی منزل پر..... بالفعل فائز ہو چکی ہے لیکن وہ نفس کہ جس پر شقاوت چھا چکی ہو اگرچہ اس کے آثار خود اسی سے ہم آہنگ و ہم رنگ ہوں گے لیکن وہ اپنی انسانیت کے حوالہ سے (کہ وہ نفس انسانی ہے) ان آثار سے سخت رنجیدہ و متالم اور مغموم ہوگا' البتہ یہ دونوں باتیں ان نفوس کی بات ہیں جو سعادت و شقاوت دونوں میں کمال کی حد تک پہنچے ہوئے ہوں (نفوس کاملہ) یعنی وہ انسان کہ جو سعادت کے اس درجہ کمال پر فائز ہوا ہو کہ اپنی ذات میں بھی سعادت مند ہو اور اپنے عمل کے حوالے سے بھی نیک و صالح ہو' اور اسی طرح وہ انسان کہ جو شقاوت کی آخرت حد تک پہنچا ہو کہ اپنی ذات میں بھی شقی ہو اور اپنے عمل کے لحاظ سے بھی برا ہو' لیکن وہ نفوس کہ جو سعادت و شقاوت میں سے کسی ایک میں بھی کامل اور آخری حد تک نہ پہنچے ہوں بلکہ دونوں میں ناقص و ادھورے ہوں تو ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ انسان کہ جو ذات کے لحاظ سے سعادت مند ہے لیکن عمل و کردار کے لحاظ سے شقی و بدبخت ہے۔

اور دوسرا وہ کہ جو ذات کے لحاظ سے شقی مگر عمل و کردار کے حوالے سے نیک و سعادت مند ہے۔

پہلی قسم کا انسان اس اعتبار سے اپنی ذات میں سعادت مند ہے کہ اس کا باطن سچے اور ثابت و غیر متزلزل عقیدے کا حامل ہے اور اعتقاد کی پاکیزگی اس کی ذات پر چھائی ہوئی ہے لیکن دنیا میں آ کر لباس بدن زیب تن کرنے اور آزادی و اختیار سے بہرہ ور ہونے کے بعد گناہوں اور خطاؤں و لغزشوں کے انجام دینے کی وجہ سے اس کی لوح نفس پر شقاوت و بدبختی کی مکروہ تصویریں نقش ہو گئی ہیں اور چونکہ وہ سب تصویریں اور ناپسندیدہ و مکروہ شکلیں ایسی ہیں کہ جو اس کی ذات کے ساتھ کسی صورت میں بھی ہم رنگ نہیں لہٰذا ان صورتوں کا اس کی لوح نفس پر باقی رہ جانا بھی ناقابل قبول ہے بلکہ عقلی دلائل سے یہ امر ثابت ہے کہ جو چیز ذات سے ہم رنگ و ہم آہنگ نہ ہو اسے بقا و دوام حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر آن رو بہ زوال ہوتی ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ نفس بالآخر یا برزخ اور یا قیامت میں گناہوں کے اثر سے پیدا ہونے والی مکروہ صورتوں سے پاک ہو جائے گا' تاہم یہ سب کچھ اس امر پر موقوف ہے کہ وہ صورتیں لوح نفس پر کس حد تک ثبت ہو چکی ہیں'

اسی طرح اس کے برعکس دوسری قسم کے انسان کا حال بھی یہی ہے کہ جو ذات کے لحاظ سے شقی و بدبخت ہے لیکن

چھے اعمال بجالانے کی وجہ سے اس کی لوح نفس پر سعادت وخوش بختی کے عارضی نشانات ظاہر ہو چکے ہیں تو وہ سب نشانات چونکہ اس کی ذات سے ہم آہنگ وہمرنگ نہیں اس لیے انہیں بھی بقاء حاصل نہیں اور وہ تدریجی طور پر اس سے دور ہو جائیں گے وراس کی لوح نفس سے محو ہو جائیں گے البتہ ان کا لوح نفس سے محو ہو جانا بھی ان کے ثبت ونقش ہونے کی مقدار اور حد کے برابر ہو گا' ان نفوس کاملہ اور نفوس ناقصہ کے علاوہ کچھ وہ نفوس بھی ہیں جو اس دنیاوی زندگی میں سعادت وشقاوت کے کسی مرحلے تک بالفعل نہیں پہنچے اور اپنی لڑکھڑاتی زندگی کی کمزوریوں کے ساتھ اس دنیا سے چل بسے' ایسے لوگ خدا کے امر وفیصلے کی راہ تکنے والوں......مرجئین...... میں سے ہیں کہ جو اپنے خالی کشکول اٹھائے ہوئے قیامت کے دن خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور خدا کے رحم وکرم کی آس لگائے ہوئے پیش ہو جائیں گے' اور یہ وہ حقیقت ہے جو ثواب وعقاب اور جزا وسزا کے باب میں مضبوط دلائل سے ثابت ہے کہ وہ (ثواب وعقاب) اعمال ہی کا اثر ونتیجہ ہے کیونکہ عقلی دلائل اس امر کو ثابت کرتے ہیں کہ ہر طرح کے......وضعی واعتباری......امور کی بازگشت حقیقی وجودی امور کی طرف ہے اور ہر عمل نے بالآخر پنی حقیقت اور حقیقی وجود کو پانا ہے۔

اور یہ امر بھی عقلی دلائل سے ثابت ہے کہ وجودی کمال ایک جیسا نہیں بلکہ کمال ونقص اور شدت وضعف کے اعتبار سے اس کے مراتب ودرجات مختلف ہیں یعنی کسی میں کمال پایا جاتا ہے اور کسی میں نقص' کسی میں شدت پائی جاتی ہے اور کسی میں ضعف' یہ وہی امر ہے جسے علمی اصطلاح میں ''تشکیک'' کہا جاتا ہے جس طرح نور کہ جس میں کمال ونقص اور شدت و ضعف کے مراتب مختلف ہوتے ہیں کہ وہ (نور) ایک ہی چراغ کا نور ہوتا ہے لیکن اس میں شدت وضعف کے درجات پائے جاتے ہیں کہیں زیادہ روشنی ہوتی ہے اور کہیں کم' یہی صورت حال تمام نفوس کی ہے کہ وہ بھی اپنے سفر کمال میں اپنے مبداء ومنتہائے کمال (خدا) سے نزدیک اور دور ہونے کے حوالے سے مختلف مراتب ودرجات کے حامل ہوتے ہیں، کچھ لوگ خدا سے قرب کی اس منزل پر فائز ہوتے ہیں کہ ارتقاء کے تمام مراحل طے کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ قرب الٰہی سے اس حد تک محروم ہوتے ہیں کہ کمال کی پہلی منزل تک بھی نہیں پہنچ پاتے' یہی حال علل فاعلیہ کا ہے کہ جو فیض رسانی کی راہ میں ''واسطہ'' کی حیثیت رکھتی ہیں کہ جنہیں فلسفی اصطلاح میں ''مابہ'' کہا جاتا ہے...... کہ جسے اردو میں سبب' ذریعہ اور فیض رسانی کا وسیلہ کہتے ہیں...... پس بعض نفوس ایسے ہیں جو ارتقاء کے تمام مراحل طے کر چکے ہیں جیسے انبیاءؑ کے نفوس کاملہ اور خاص طور پر وہ ہستیاں جو کمالات کے بلند ترین مراتب کو پا چکی ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو حصول کمال کی راہ میں بھرپور طور پر عمل میں لا کر ارتقاء کی آخری منزل تک پہنچنے میں عملی کامیابی حاصل کر چکی ہیں تو ایسے نفوس، کمزور وضعیف اور شقاوت وبدبختی سے دوچار ہونے والے نفوس کے اور سرچشمۂ کمال ذات ذوالجلال کے درمیان فیض رسانی کا وسیلہ ہیں تاکہ ان کے لیے خدا کی رحمت' عفو ومغفرت اور بخشش وعنایت کے حصول کی راہ ہموار کرنے میں کردار ادا کر سکیں' اسی کو ''شفاعت'' کہا جاتا ہے' یعنی وہ شفاعت کہ جو گناہگاروں کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔

ایک معاشرتی بحث

اجتماعی و معاشرتی اصولوں سے یہ امر ثابت ہے کہ انسانی معاشرے کی بقاء و استحکام کا راز ان قوانین ہی میں مض
ہوتا ہے جو لوگوں کے درمیان رائج و نافذ اور معتبر و قابل احترام سمجھے جاتے ہوں اور وہ قوانین معاشرے کے تمام شعبوں
نگران کی حیثیت رکھتے ہیں اور تمام افراد کے اعمال و احوال پر انہی قوانین کو حکمرانی و بالا دستی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ
قوانین معاشرے کے فطری تقاضوں اور افراد کے معاشرتی مزاج کی بنیاد پر بنائے گئے ہوں اور ان میں معاشرے کے تہ
پہلوؤں اور حالات کو ملحوظ رکھا گیا ہو' تو ان قوانین کی روشنی میں معاشرے کے تمام افراد اپنے اپنے حالات کے مطابق ا
سفر حیات کو طے کرتے ہیں جس کے نتیجے میں معاشرہ، کمال کی جانب رواں دواں ہوتا ہے اور سب لوگ باہمی تعاون ا
اجتماعی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کی راہ ہموار کر دیتے ہیں' اور یہ امر مسلّ
ناقابل انکار ہے کہ افراد کے باہمی تعاون سے معاشرتی عدل و انصاف کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے جب معاشرے
حکمفرما قوانین مادی اور معنوی دونوں مصلحتوں کی بنیاد پر بنائے گئے ہوں' یعنی ان قوانین میں معاشرے کے ان ما
تقاضوں کے ساتھ ساتھ کہ جو معاشرتی ترقی میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں ان معنوی کمالات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہو جو معاشر
کی بھلائی و بہتری اور صلاح و فلاح کے لیے ضروری ہیں کیونکہ یہی اچھے اور پاکیزہ اعمال و اخلاق ہی ہیں جو معاشرے
سچائی' وفاداری' خیر خواہی اور معاہدوں کی پاسداری وغیرہ جیسے اہم امور کی راہ ہموار کرتے ہیں اور انہی امور ہی سے انس
معاشرہ، عدل و انصاف کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے' لہٰذا پہلی بات یہ ہے کہ وہ قوانین، معاشرے کی مادی و معنوی مصلحتو
اور تقاضوں کی روشنی میں بنائے جانے چاہیں کیونکہ اگر یہ دونوں پہلو ملحوظ نہ ہوئے تو معاشرے کی بقاء و استحکام کی ضمانت ک
صورت میں نہیں دی جا سکتی' اور دوسری بات یہ کہ چونکہ یہ سب قوانین اور معاشرتی ضوابط و احکام بنیادی طور پر اپنی تاثیر
مستقل حیثیت کے حامل نہیں ہوتے بلکہ انسانی فکر کے وضع کردہ وہ قوانین اپنی اثر آفرینی میں اس امر کے محتاج ہوتے ہ
کہ جزا و سزا کے کچھ احکام بھی ان کے ساتھ ساتھ وضع کیے جائیں تاکہ قانون کی پاسداری و احترام نہ کرنے والوں اور نفس
خواہشات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کی قانون شکنی کے مقابلے میں قانون کی بالا دستی اور معاشرتی اصولوں ا
ضوابط کے نفاذ کی مکمل ضمانت فراہم ہو سکے اور اجتماعی قوانین کو تحفظ حاصل ہو' لہٰذا جب معاشرے میں حکومت......خواہ وہ ج
طرح کی ہو......اپنے جزا و سزا کے قوانین کے نفاذ و اجراء کی بابت مضبوط و مستحکم ہو تو اس معاشرے کا سفر حیات جاری
ساری رہتا ہے اور کوئی فرد اپنے اصلی راستہ اور مقصد حیات تک پہنچنے میں ناکام یا گمراہ نہیں ہوتا' اس کے برعکس اگر حکومت
و سزا کے قوانین کے نفاذ و اجراء میں کمزور ہو تو معاشرے کے اندر ہرج و مرج اور بحرانی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور معا

اپنے (اصلی راستے سے دور ہو جائے گا) اس لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کو جزا و سزا کے قوانین سے آگاہ کیا جائے تا کہ سب لوگ متوجہ رہیں کہ معاشرے میں حکمفرما قانون کی خلاف ورزی کی سزا کیا ہے! اور یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کے دلوں میں قانون کے احترام کا عقیدہ پیدا کیا جائے تا کہ وہ قانون کی بالا دستی پر پختہ یقین رکھتے ہوئے اس کے جملہ تقاضوں کو ملحوظ رکھیں اور اس کی خلاف ورزی کے مرتکب نہ ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات کا بھی یقین دلایا جائے کہ قانون شکنی اور ضوابط و احکام کی خلاف ورزی پر جو سزا مقرر کی گئی ہے وہ کسی صورت میں اس سے بچ نہیں سکتے یعنی نہ تو کسی کی سفارش انہیں قانون شکنی کی سزا سے بچا سکتی ہے اور نہ ہی رشوت یا دیگر حیلے اور ذرائع قانون کی خلاف ورزی پر مقرر کی گئی سزا سے نجات دلا سکتے ہیں' اس لیے انہیں ہر صورت میں قانون کی بالا دستی پر یقین رکھتے ہوئے اس کا پورا پورا احترام کرنا ہوگا کیونکہ قانون شکنی اور احکام کی خلاف ورزی کی صورت میں سزا سے چھٹکارے ہی کی غلط امید دلانے کی وجہ سے پوری دنیا میں عیسائی مسلک و مذہب کی مذمت کی جاتی ہے اور اس مسلک کے اصولوں کو نا قابل قبول اور نا قابل عمل قرار دیا جاتا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح ؑ نے تختۂ دار پر چڑھ کر اپنی جان لوگوں کے گناہوں کے بدلے میں قربان کی اس لیے وہ لوگ قیامت کے دن اپنے گناہوں کی سزا کی بابت کوئی خوف دلوں میں نہیں رکھتے بلکہ حضرت مسیح ؑ پر بھروسہ کرتے ہیں جبکہ ظاہر ہے کہ اس طرح کا عقیدہ انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور معاشرتی تمدن کو تباہ کر دینے کا سبب ہے اور انسان کو پستی کی جانب لے جانے کا باعث ہے' چنانچہ اب تک پیش کی جانے والی رپورٹیں اور دنیا بھر میں جرائم کی شماریات اس امر کو ظاہر کرتی ہیں کہ جھوٹ بولنے والوں اور ناانصافی کرنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو "دیندار" ہیں جبکہ دین سے دور لوگ ایسے اعمال کے ارتکاب میں ان کی نسبت کم ہیں جو جھوٹ اور ناانصافیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ اپنے دین..... مسیحیت..... کی حقانیت پر پختہ یقین اور قیامت کے دن اپنے لئے شفاعت و سفارش سے بہرہ ور ہونے کا بھرپور اعتماد رکھتے ہیں لہٰذا وہ اپنے فعل و عمل میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے اور اپنے کسی بھی کام کی بابت کسی طرح کا خوف دل میں نہیں لاتے' جبکہ دوسرے لوگ ایسا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی فطرت کے پاکیزہ اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے دین مسیحیت کے ان پیروکاروں کے غلط طرز تفکر کو ہرگز نہیں اپناتے جو اپنے افکار و اعمال کو فطری اقدار سے ہم آہنگ نہیں کرتے بلکہ قانون کی بالا دستی پر مکمل یقین رکھتے ہوئے اس کی خلاف ورزی کو انسانیت کی توہین اور پاکیزہ معاشرے (مدینۂ فاضلہ) کی بنیادوں کو ہلا دینے کا سبب سمجھتے ہیں۔

مسیحیت کے پیروکاروں ہی کے غلط طرز تفکر کو بنیاد قرار دیتے ہوئے کئی دانشوروں اور اہل بحث نے اسلام کے بیان کئے ہوئے مسئلہ شفاعت کی تاویل کی اور شفاعت کے ایسے معنی بیان کئے جو کسی صورت میں شفاعت کی حقیقت سے ہم آہنگ نہیں جبکہ شفاعت کا مسئلہ ایک ایسی پاکیزہ حقیقت ہے جسے قرآن مجید اور متواترہ روایات و احادیث میں وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پس جو معانی ان حضرات نے وضع کئے ہیں ان کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں کیونکہ اسلام شفاعت کو قانون شکنی سے ہرگز تعبیر نہیں کرتا اور نہ ہی شفاعت کے سہارے پر ہر طرح کے اعمال کو کسی قسم کے خوف و

خطر کے بغیر انجام دینے کی تائید کرتا ہے۔ بنابریں دینی حقائق کی بابت بحث وتحقیق کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کی مقدس تعلیمات اور علوم ومعارف کو صحیح مصادر ومنابع سے حاصل کر کے انہیں نیک وصالح اور پاکیزہ معاشرے پر اسی انداز میں منطبق کریں جس طرح اسلام کے بنیادی اصولوں کا تقاضا ہے اور معاشرے میں قانون کی بالادستی کی بنیاد پر شفاعت کے مسئلہ کی تحقیق کریں کہ اسلام نے جس شفاعت کا وعدہ کیا ہے وہ کیا ہے اور کب، کیونکر اور کس صورت میں تحقق پذیر ہوگی؟ اور اسلام کے دیگر معارف وحقائق میں اس کی حیثیت ومقام کیا ہے؟ اگر اس بنیاد پر شفاعت کے مسئلہ کی تحقیق کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ:

(۱) قرآن مجید نے جس شفاعت کو ثابت کیا ہے وہ یہ ہے کہ اہل ایمان قیامت کے دن جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے بشرطیکہ وہ اپنے پروردگار کے حضور پختہ ایمان' خدا کے نزدیک پسندیدہ دین اور سچے عقیدے کے ساتھ حاضر ہوں' پس شفاعت کا جو وعدہ قرآن نے کیا ہے وہ غیر مشروط نہیں بلکہ مشروط ہے (صحیح ایمان وعقیدہ اور دین حق کے ساتھ) اور پھر یہ کہ قرآن مجید میں اس امر کو بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ ایمان وصحیح عقیدے اور دین حق پر قائم رہنے کے لیے دل کی پختگی اور ارادہ کی قوت ضروری ہے کیونکہ انسان کو ہر قدم پر خطاؤں اور کبیرہ گناہوں کی یلغار کا سامنا ہوتا ہے، خاص طور پر بار بار گناہ و معصیت کا ارتکاب کرنا لمحہ بہ لحمہ انسان کو تباہی وہلاکت کی جانب دھکیلتا ہے جس کے نتیجے میں انسان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے' یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کو ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا قیمتی سرمایہ یعنی ایمان اس کے ہاتھ سے چلا جائے تاہم اس کے دل میں یہ امید بھی ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ غلطی وگناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد توبہ واستغفار سے اس کی تلافی کر دے تو اپنے عقیدے وایمان کا تحفظ کر سکتا ہے' لہٰذا وہ اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں امید اور خوف کے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے اور اپنے پروردگار کی عبادت بجالاتے ہوئے بھی اس کے دل میں وہی امید اور خوف دونوں موجود رہتے ہیں اس لیے وہ اپنا سفر حیات ایک ایسے درمیانی راستے سے طے کرتا ہے کہ نہ تو مکمل طور پر ناامیدی اسے گھیرے ہوئے ہوتی ہے اور نہ ہی شفاعت کے سہارے اطاعت الٰہی وعبادات سے سرتابی کرنے کا جذبہ اس پر محیط ہوتا ہے یعنی وہ نہ تو نجات سے ناامید ہوتا ہے اور نہ شفاعت کی امید پر معصیت کے ارتکاب کی جانب بڑھتا ہے۔

(۲) اسلام نے جو معاشرتی قوانین بنائے ہیں ان میں لوگوں کے مادی ومعنوی دونوں تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور وہ قوانین انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہیں اور اس کے تمام انفرادی ومعاشرتی اعمال پر چھائے ہوئے ہیں اور ہر قانون کی خلاف ورزی پر مناسب سزا بھی مقرر کی گئی ہے مثلاً دیت' حد' تعزیر' یہاں تک کہ اگر کوئی شخص قانون کی خلاف ورزی میں اس حد تک پہنچ جائے کہ اسے معاشرتی سہولتوں سے محروم کر کے مورد ملامت ومذمت قرار دینا پڑے تو اسلام ایسا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا' پھر اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے معاشرتی احکام وقوانین کی پاسداری کے لیے باصلاحیت افراد کو حکمرانی کا حق عطا کیا اور انہیں اقتدار دے کر قانون کی بالادستی کو یقینی بنانے کی راہ ہموار کی اور صرف یہی نہیں بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے معاشرے کے تمام افراد کو ایک دوسرے پر مسلط ونگران بنا دیا تاکہ وہ آپس میں قانون کی پاسداری کو عملی صورت دینے میں تعاون کر سکیں' خداوند عالم نے اسی امر کو زندہ رکھنے کے لیے دین کی تبلیغ کا سامان کیا اور

آخرت میں جزاو سزااور ثواب وعقاب کی خبر دے کر قانون کے احترام اور معاشرتی ضوابط واحکام کی پاسداری کے کام کو مزید وسعت وقوت اور استحکام عطا کیا' پس اسلام نے اپنے تربیتی پروگرام کی بنیاد مبداء ومعاد سے مربوط مطالب ومعارف سے آگاہی پر رکھی یعنی خدائے قدوس کی ذات والاصفات اور قیامت کے دن اس کے حضور پیش ہونے کے عقیدہ ہی کو اسلام کے تربیتی نظام کی بنیاد قرار دیا۔

یہ ہے وہ بنیادی نقطہ جو اسلام کی مقدس و پاکیزہ تعلیمات کی اصل واساس اور دین اسلام کے اعلیٰ ترین معارف کا خلاصہ ہے اور یہی وہ عظیم چیز ہے جسے حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے اور انہی مقدس تعلیمات کا عملی تجربہ آنحضرتؐ کے عہد مبارک اور اس کے بعد کے زمانے میں ہوا۔لیکن تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد اموی سلطنت کے والیوں اور ان کے رسوائے زمانہ حکمرانوں کے جیرہ خواروں نے اپنے ظلم واستبداد اور دین کے احکام کا مذاق اڑا کر اسلامی تعلیمات کی شکل وصورت بگاڑ دی اور حدود الٰہی اور دینی سیاست کی دھجیاں بکھیر دیں' اسلامی سیاست کی جگہ شیطانی حیلہ بازیوں نے لے لی اور اس طرح اسلام اور اس کی پاکیزہ تعلیمات کا جو حشر ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں' اس کے نتیجے میں آج ملت اسلامیہ جن مشکلات سے دو چار ہے وہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ یہ بنی امیہ کے شیطان صفت حکمرانوں کی کارستانیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کی عطا کی ہوئی مقدس آزادی یورپ کے فاسد مزاج اور پلید افکار کی بھینٹ چڑھ گئی اور انسانی معاشرہ، اسلامی تعلیمات کی بجائے غیر اسلامی تہذیب وتمدن کو اپنانے کی راہ پر گامزن ہو گیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے پاس دین اسلام صرف اسی مقدار میں باقی رہ گیا جتنا کہ برتن کو دھونے کے بعد اس میں پانی کی تری باقی رہ جاتی ہے' دینی سیاست کے غلط استعمال ہی کا واضح نتیجہ ہے کہ ان رجعت پسند مسلمانوں کی کوتاہ اندیشی اور عملی کمزوری اور ترقی کی بجائے تنزلی اور بلندی کی بجائے پستی کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے آج امت اسلامیہ فضیلتوں' کمالات' پاکیزہ صفات اور پسندیدہ اخلاق وآداب سے متصف ہونے کی بجائے نفسانی خواہشات' لہو ولعب اور نہایت پست وگھٹیا کاموں اور ہر طرح کی برائیوں میں سرگرم ومصروف ہے' یہ سب کچھ اہل اسلام کی ہتک حرمت اور ہر قسم کی عزت ووقار سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا باعث ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ان نام نہاد مسلمانوں کی غلط روش اور بد اعمالی کے سامنے وہ لوگ بھی شرم سے سر جھکا لیتے ہیں جو دین کے پیروکار نہیں' یہ وہ سب امور ہیں جو مسلمانوں کے انحطاط کا سبب بنے اور ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئے نہ کہ دینی تعلیمات کہ جن میں سے بعض احکام ومعارف کی طرف نسبت دے کر معترضین لب کشائی کرتے ہیں کیونکہ دینی تعلیمات انسان کی سعادت وخوش بختی کی ضمانت دیتی ہیں اور خداوند عالم نے ان تعلیمات پر عمل کرنے کا حکم دے کر انسان کو دنیا وآخرت میں کامیابی کی نوید دی ہے اور معترضین نے جن رپورٹوں کا ذکر کیا ہے اگر ان کے بارے میں اچھی طرح غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ جن ''دیندار'' لوگوں کے اعمال کو بیان کیا گیا ہے وہ ایسے افراد ہیں جن کا نہ تو کوئی سرپرست ورہبر ہے اور نہ ہی وہ کسی مضبوط نظام کے پیروکار تھے' بلکہ چند نام نہاد اہل دین کے اعمال کا تذکرہ کر دیا گیا کہ جن کا درحقیقت دین سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ لہٰذا جو رپورٹیں پیش کی گئی ہیں ان سے معترضین کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور وہ اپنے ان بیانات سے اپنے مدعا کو ثابت نہیں کر سکتے۔

آیات ۴۹ تا ۶۱

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

○ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا
مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

○ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا
عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا
تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

○ وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ
الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ
اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
وَالْمَسْكَنَةُ ق وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ
يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

ترجمہ

○ اور تم اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے چھٹکارا عطا کیا کہ وہ تمہیں سخت ترین مظالم کا شکار کیے ہوئے تھے، وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری خواتین کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے سخت آزمائش تھی۔ (۴۹)

○ اور اس وقت کو خاطر میں لاؤ جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو چیر دیا اور تمہیں ڈوبنے سے بچا لیا جبکہ ہم نے آل فرعون کو تمہاری آنکھوں کے سامنے دریا میں غرق کر دیا (۵۰)

○ اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا، پھر تم نے ان کے جانے کے بعد ایک بچھڑے کی پوجا شروع کر دی جبکہ تمہارا ایسا کرنا ظلم اور سراسر زیادتی تھا۔ (۵۱)

○ پھر اس سب کچھ کے باوجود ہم نے تمہیں معاف کر دیا تاکہ تم شکر گزار بن سکو۔ (۵۲)

○ اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والا قانون دیا تاکہ تم ہدایت پا سکو۔ (۵۳)

○ اور اس وقت کو خاطر میں لاؤ جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اے میری امت! تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے لہٰذا تم اپنے پیدا کرنے والے برحق معبود کے حضور توبہ کرو اور اپنے آپ (ایک دوسرے) کو قتل کرو، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لیے بہتری ہے، تم نے ایسا ہی کیا تو تمہارے پروردگار نے تمہاری توبہ قبول کر لی کہ حقیقت میں وہی توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔ (۵۴)

○ اور اس وقت کو یاد کرو جب تم نے موسیٰؑ سے کہا: اے موسیٰؑ! ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، تمہارے اس مطالبے کی وجہ سے تم پر بجلی آ پڑی اور تم دیکھتے رہ گئے۔ (۵۵)

○ پھر ہم نے تمہارے مر جانے کے بعد تمہیں دوبارہ اٹھایا تاکہ تم شکر گزار ہو سکو۔ (۵۶)

○ اور ہم نے تم پر ابر کے ساتھ سایہ کر دیا' اور تمہارے لیے من و سلویٰ بھیجا اور کہا کہ ہم نے تمہیں جو رزق عطا کیا ہے اس میں سے جو تمہیں پسند آئے جی بھر کر کھاؤ' ان لوگوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ (۵۷)

○ اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا کہ تم اس بستی میں چلے جاؤ اور اس میں سے جو چاہو سیر ہو کر کھاؤ اور دروازے سے داخل ہوتے ہوئے سجدہ ریز ہو کر اپنی مغفرت کی دعا مانگو ہم تمہاری سب خطائیں معاف کر دیں گے' اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ اجر عطا کریں گے"۔

(۵۸)

○ پس جو کچھ ان سے کہا گیا تھا اسے ظالم لوگوں نے بدل دیا تو ہم نے ان (ظالم لوگوں) پر ان کے غلط کردار کی وجہ سے آسمان سے عذاب نازل کیا۔ (۵۹)

○ اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب موسیٰ ؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا (بارش کی دعا کی) تو ہم نے ان سے کہا کہ تم اپنا عصا پتھر پر مارو' جب موسیٰ ؑ نے ایسا کیا تو پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور سب لوگوں نے اپنے اپنے گھاٹ کو جان لیا' اور ہم نے ان سے کہا کہ تم خدا کے عطا کئے ہوئے رزق سے جی بھر کر کھاؤ اور پیو' لیکن زمین میں فساد اور گڑبڑ نہ پھیلاؤ"۔ (۶۰)

○ اور اس وقت کو یاد کرو جب تم نے موسیٰ ؑ سے کہا کہ ہم ایک ہی کھانے پر قناعت نہیں کر سکتے لہٰذا آپ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے زمین سے سبزیاں اگائے مثلاً ترکاری' ککڑی' لسن' دالیں اور پیاز وغیرہ' موسیٰ ؑ نے ان سے کہا آیا تم اچھی چیز (من و سلویٰ) کی بجائے ادنیٰ شے کو چاہتے ہو؟ تو پھر تم کسی شہر میں چلے جاؤ وہاں تمہارے لیے وہ سب کچھ موجود ہے جو تم مانگ رہے ہو' اس طرح ان پر ذلت و رسوائی اور ناداری و محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ خدا کے غیض و غضب کا شکار ہو گئے' اور یہ سب اس لیے ہوا کہ انہوں نے آیات الٰہی کا انکار کر دیا تھا اور انبیاء ؑ کو ناحق قتل کر دیتے تھے' یہ سب کچھ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے ہوا۔ (۶۱)

تفسیر و بیان

آلِ فرعون کے مظالم

○ " وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ... "

یعنی وہ ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے تا کہ ان سے خدمت اور کام لے سکیں اور انہیں قتل نہیں کرتے تھے جبکہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے' اس جملے میں "استحیائ" کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کا لفظی معنی "طلب حیات" یعنی زندگی کو چاہنا ہے' اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ وہ لوگ ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے کہ ان عورتوں میں برائیوں کی بابت کسی قسم کا احساس حیا ہی باقی نہ رہے۔

"يَسُوْمُوْنَكُمْ" کا معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں الٹا پلٹا دیتے تھے۔

بنی اسرائیل پر خدائی عنایت

○ " وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ... "

عربی زبان میں "فرق" بمقابل "جمع" آتا ہے' "فرق" یعنی الگ الگ اور "جمع" یعنی اکٹھا' جیسے "فصل" (جدا) بمقابل "وصل" یعنی ساتھ ساتھ۔ جب "فرق" کا لفظ دریا کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا معنی چیرنا اور شگاف ڈالنا ہے اس آیت میں "بکم" پر، حرف ب سببیت کے لیے ہے یا ملابست کے لیے' دونوں صورتیں صحیح ہیں اور معنی یوں ہوگا:

"ہم نے تمہاری نجات کے لیے دریا کو چیر دیا" (سببیت کی معنے میں) اور یا یوں ہوگا: "ہم نے تمہارے دریا میں داخل ہونے کے ساتھ ہی اسے چیر دیا"۔ (ملابست کے معنے میں)۔

چالیس راتوں کا وعدہ

○ " وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً... "

(اور ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا)۔

خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کئے جانے والے وعدے کا تذکرہ سورہ اعراف آیت ۱۴۲ میں ان

الفاظ میں کیا:

"وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً"

(اور ہم نے موسٰی سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور پھر دس راتوں کا اضافہ کر کے اسے مکمل کر دیا' اس طرح اس ـ
پروردگار کا چالیس راتوں کا وعدہ مکمل ہو گیا)۔

مورد بحث آیت میں چالیس راتوں کے وعدے کا تذکرہ یا تو تغلیب اور مجموعی طور پر وعدے کے ذکر کے طور
ہے یا یہ کہ دراصل دو وعدے تھے ایک تیس راتوں کا اور دوسرا دس راتوں کا' اور چالیس راتوں کا ذکر دونوں وعدوں کو ـ
صورت میں ذکر کرنے کے طور پر ہے جیسا کہ اس سلسلے میں وارد ہونے والی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

توبہ کا حکم

○ "فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ..."

الباری' خداوند عالم کے اسمائے حسنٰی میں سے ایک ہے جیسا کہ سورہ حشر آیت ۲۴ میں ارشاد حق تعالٰی ہے:

(هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى)

وہ اللہ' خالق' باری (موجد) اور صورتیں عطا کرنے والا ہے اسی کے لیے ہیں اسماء حسنٰی .....'

اس آیت میں "باری" کو خداوند عالم کے اسماء حسنٰی میں ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ خداوند عالم کا یہ اسم مبارک "باری" قرآن مجید میں تین مرتبہ ذکر ہوا ہے' دو مرتبہ اسی آیـ
میں اور ایک مرتبہ سورہ حشر کی مذکورہ آیت (۲۴) میں' اس مقام پر تمام اسماء حسنٰی میں سے خصوصیت کے ساتھ اس اسم مبارک
(باری) کا ذکر شاید اس وجہ سے ہو کہ اس کا معنی خالق اور موجد سے ملتا جلتا ہے' اس کا اشتقاق (لفظی بناوٹ
"ب۔ر۔ئ" سے ہے لہٰذا عربی گرائمر میں (علم لغت وادب کی رو سے) یوں کہا جاتا ہے: "برء یبرء برواتا" اس کا مـ
الگ کرنا ہے' خدا کے لیے اس کا استعمال اس لحاظ سے ہے کہ وہ مخلوق کو عدم سے جدا کرتا ہے (نکالتا ہے) یا انسان کو زمین ـ
جدا کرتا ہے' تو گویا اس آیت میں خداوند عالم یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم نے جو توبہ کا حکم تمہیں دیا ہے کہ تم اپنے آپ...... ایک
دوسرے......کو قتل کر دو اگرچہ بظاہر یہ تمہارے لیے دشوار اور سخت حکم ہے لیکن تم غور کرو کہ وہ خدا کہ جس نے تمہیں اپنے آپ
ختم کر دینے کا حکم دیا ہے وہی ہے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور وجود عطا کیا ہے یعنی تمہیں عدم سے نکال کر وجود میں لا
ہے' تو اس وقت تمہیں وجود عطا کرنا تمہارے لیے بہتر تھا اور اب اس کی نظر میں تمہاری بہتری اپنے آپ.... ایک
دوسرے.....کو قتل کر دینے میں ہے' اور وہ تمہاری بہتری کے سوا کوئی چیز کیونکر پسند کر سکتا ہے جبکہ وہ تمہارا "باری" یعنی موـ
ہے' پس اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے لیے لوگوں کی طرف اضافت کے ساتھ (بَارِئِكُمْ) لفظ "باری" کا استعمال اس لیے
گیا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنے پیدا کرنے والے اور وجود عطا کرنے والے کے لیے محبت کے احساسات جنم لیں۔

خدا کے نزدیک بہتری

○ "ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ"

اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطابات اور وہ زیادتیاں و نافرمانیاں جو بنی اسرائیل کی طرف نسبت دے کر ذکر کی گئی ہیں ان سب کا تعلق پوری قوم...... بنی اسرائیل ...... سے ہے اور وہ تمام گناہ ان سب نے کئے' جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ پوری قوم نے ان تمام نافرمانیوں اور گناہوں کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ ان میں سے چند لوگوں نے زیادتیاں اور نافرمانیاں کیں لیکن ان اعمال کی نسبت سب کی طرف دی گئی اور سب کو مخاطب قرار دے کر بات کی گئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب ایک بن کر رہتے تھے اور اتحاد و یگانگت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور پوری قوم ایک ہی راہ پر گامزن تھی اور قوم پرستی اس حد تک ان پر غالب تھی کہ وہ ایک دوسرے کے کاموں کو اپنا کام کہتے اور ایک دوسرے کے اعمال کو پوری قوم کی طرف منسوب کرتے تھے' وہ اپنی انفرادی حیثیت کی بجائے اجتماعی حیثیت کے قائل تھے' اگر ان میں سے کوئی ایک، کسی کام کو انجام دیتا تو پوری قوم اس کام کو اپنا کام کہتی تھی' ورنہ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ بنی اسرائیل کے تمام افراد نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی اور نہ ہی سب نے انبیاءؑ کو قتل کیا اور نہ ہی سب نے زیادتیاں اور نافرمانیاں کیں' لٰہذا خداوند عالم کا یہ حکم کہ "فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" ...... تم اپنے آپ (ایک دوسرے) کو قتل کر دو ..... ان کے لیے صادر ہوا جنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ" ...... تم نے بچھڑے کو خدا مان کر اپنے اوپر ظلم کیا...... اور یہ کہ "ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ" (ایسا کرنا ..... اپنے آپ (ایک دوسرے) کو قتل کرنا...... تمہارے پروردگار کے نزدیک تمہارے لیے بہتر ہے) یہ جملے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کے تذکرے کے تتمہ کے طور پر ہیں۔ اور "فَتَابَ عَلَيْكُمْ" (اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی) کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں توبہ کا حکم دیا گیا اور ان کی توبہ قبول کی گئی۔ روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمام مجرمین کے قتل سے پہلے توبہ کا حکم آیا' تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کرنے کا حکم صرف انہیں آزمانے کے لیے صادر ہوا تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں اسماعیلؑ کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور پھر ان سے کہا گیا "يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا" (اے ابراہیم! آپ نے خواب کو سچا کر دیا...... جو حکم آپ کو خواب میں دیا گیا تھا آپ نے اسے انجام دے دیا)...... سورہ صافات۔ ۱۰۵...... اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت سے کہا: "فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ" ...... تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنے آپ (ایک دوسرے) کو قتل کر دو۔ یہی تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک بہتر ہے...... تو خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو پورا کر دیا اور بعض لوگوں کے قتل کرنے کو سب کا عمل قرار دے کر توبہ کا حکم دیا اور ان کی توبہ قبول کر لی چنانچہ ارشاد ہوا: "فَتَابَ عَلَيْكُمْ" (اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی)۔

O "رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ"

اس مقام پر "رجز" سے مراد عذاب ہے۔

O "وَلَا تَعۡثَوۡا"

عربی زبان میں "عیث" اور "عثی" دونوں کا معنی "سخت فساد" ہے۔

O "وَقِثَّآئِهَا وَفُوۡمِهَا"

قثاء کا معنی ککڑی اور فوم کا معنی لسن یا گندم ہے۔

O "وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ"

یعنی وہ لوٹ گئے خدا کے غضب کی طرف۔

O "ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ"

یہ جملہ ان کے اعمال کے سبب (کفر) کو بیان کرتا ہے۔

O "ذٰلِكَ بِمَا عَصَوۡا"

یہ جملہ ان کے کفر اختیار کرنے کے سبب (نافرمانی) کو بیان کرتا ہے' گویا ان کا نافرمانی کرنا اور بار بار زیادتیاں کر ہی ان کے آیات الٰہی کے انکار اور انبیاءؑ کو قتل کرنے کا سبب بنا' جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

"ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيۡنَ اَسَآءُوا السُّوۡٓاٰى اَنۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا بِهَا يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ" (روم ۱۰)

(پس جن لوگوں نے برے اعمال کئے ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے آیات الٰہی کی تکذیب کی اور ان کا مذاق اڑایا)۔

انشاءاللہ آئندہ صفحات میں اس امر کی وضاحت کی جائے گی کہ معصیت کو کفر کا سبب کیوں قرار دیا گیا ہے۔

روایات پر ایک نظر

بدا کا ایک مصداق

آیہ شریفہ "وَاِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤى اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً" کی بابت تفسیر العیاشی میں حضرت امام ابوجعفر علیہ السلام سے

منقول ہے آنجناب ؑ نے ارشاد فرمایا: علم و تقدیر الٰہی میں تیس راتیں ہی تھیں لیکن اس کے بعد خدا کو بدا ہوا تو اس نے دس راتوں کا اضافہ کر دیا' اس طرح خداوند عالم کا پہلا اور دوسرا' دونوں وعدے (چالیس راتیں) پورے ہو گئے۔

اس روایت سے سابقہ بیان کی تصدیق ہوتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ چالیس راتیں، دونوں وعدوں کے مجموعہ سے عبارت ہیں۔

ایک دوسرے کے قتل کا حکم

تفسیر ''در منثور'' میں آیہ شریفہ ''وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ...'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: بنی اسرائیل نے موسیٰ ؑ سے پوچھا کہ ہماری توبہ کس طرح ممکن ہے؟ انہوں نے فرمایا: تمہاری توبہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ تم ایک دوسرے کو قتل کر دو' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب سن کر بنی اسرائیل نے چھریاں ہاتھ میں لے لیں اور ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا' بھائی بھائی کو' باپ بیٹے کو' بیٹا باپ کو' سب ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے' کسی کو اس بات کی پرواہ نہ رہی کہ کون مارا جا رہا ہے' یہاں تک کہ ستر ہزار افراد قتل کر دیئے گئے' پھر خداوند عالم نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ اب انہیں حکم دیں کہ ایک دوسرے کو قتل کرنا بند کر دیں کیونکہ جو قتل کئے جا چکے ہیں خدا نے انہیں معاف کر دیا ہے اور جو زندہ بچ گئے ہیں ان کی توبہ قبول ہو چکی ہے۔

دس ہزار افراد کا قتل

تفسیر قمی میں ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: جب موسیٰ علیہ السلام میقات الٰہی کی طرف گئے اور واپس آئے تو دیکھا کہ ان کی قوم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی ہے' آنحضرت ؑ نے ان سے کہا: اے میری قوم! تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے لہٰذا تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور (اس کا طریقہ یہ ہے کہ) ایک دوسرے کو قتل کر دو کہ یہی تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لیے بہتر ہے' انہوں نے پوچھا کہ ہم کیونکر ایک دوسرے کو قتل کریں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: صبح کے وقت تم سب بیت المقدس میں اکٹھے ہو جاؤ' اور ہر شخص چھری یا تلوار یا لوہے کی بنی ہوئی کوئی چیز ہاتھ میں لے لے اور جب میں منبر پر جاؤں تو تم سب اپنے چہروں کو ڈھانپ لو تا کہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکو اور پھر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے حملہ آور ہو جاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات سن کر بچھڑے کی پوجا کرنے والے ستر ہزار آدمی دوسرے دن صبح کے وقت بیت المقدس میں اکٹھے ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی اور نماز سے فارغ ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام منبر پر گئے تو وہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے میں مصروف ہو گئے' یہاں تک کہ جبرئیل نازل ہوئے اور حضرت موسیٰ ؑ سے کہا کہ اب آپ انہیں حکم دیں کہ ایک دوسرے کو قتل کرنا بند کر دیں کہ خداوند عالم نے ان لوگوں کی توبہ قبول فرمالی ہے' اس وقت تک دس ہزار افراد قتل ہو چکے تھے' اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی: ''ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

عِنۡدَ بَارِئِكُمۡ ؕ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ " (یہ تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک بہتر ہے' پس اس نے تمہاری توبہ قبول کرلی ہے کہ وہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے)۔

آپ اس روایت کے الفاظ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ میں جملہ "ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ عِنۡدَ بَارِئِكُمۡ" (یہ تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لیے بہتر ہے) کلام موسیٰؑ بھی ہے اور کلام خدا بھی' لہٰذا یہ حکم دراصل موسیٰ علیہ السلام نے دیا تھا جسے خداوند عالم نے نافذ العمل قرار دے دیا' اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم مکمل تھا نہ کہ ناقص' جیسا کہ ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب کے قتل کو ان کے لیے ان کے خالق کے نزدیک بہتر قرار دیا جبکہ سب قتل نہیں ہوئے' تاہم خداوند عالم نے اس مقدار میں قتل ہونے والوں کو ان کے لیے اس خیر او بہتری کا نام دیا جو موسیٰؑ نے ان سے کہی تھی' (یاد رہے کہ اس سلسلے میں ہم پہلے بھی مطالب بیان کر چکے ہیں اور مورد بحث موضوع کی بات ضروری وضاحت کر چکے ہیں)۔

من وسلویٰ کا نزول اور بارہ چشموں کا پھوٹنا

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ "وَظَلَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡغَمَامَ وَاَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ..." کی تفسیر میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو دریا سے گزار دیا اور وہ لوگ ایک بیابان میں پہنچ گئے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ! تو نے ہمیں تباہ کر دیا' تو نے ہمیں مار ڈالا اور ہمیں آباد جگہ سے نکال باہر کر کے بیابان میں لے آیا کہ جہاں نہ کوئی سایہ ہے نہ درخت اور نہ ہی پانی ہے' تو دن میں انہیں دھوپ سے بچانے کے لیے بادل ان پر سایہ فگن ہوتے تھے اور رات کھانے کے لیے آسمان سے "من" (مخصوص طعام) آتا تھا اور وہ گھاس' جھاڑیوں اور پتھروں پر اترتا تھا جسے وہ لوگ خوب سیر ہو کر کھاتے تھے اور اسی طرح رات کے آخری پہر میں "سلویٰ" (پرندے کا بھنا ہوا گوشت) ان کے دستر خوان آ جاتا تھا اور جب وہ کھا پی کر سیر ہو جاتے تو وہ پرندہ اڑ جاتا تھا۔ اور حضرت موسیٰؑ کے پاس ایک پتھر تھا جسے وہ ہر روز لشکر کے درمیان رکھ دیتے تھے اور اس پر اپنا عصا مارتے تو اس پتھر سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ پڑتے تھے...... اس کا ذکر خداوند عالم نے قرآن مجید میں فرمایا ہے..... اور بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں میں سے ہر ایک کی طرف ایک چشمہ چلا جاتا تھا (یاد رہے کہ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں اور خاندانوں میں منقسم تھے)۔

تنزیل کی مصداقی تصویر

کتاب کافی میں آیت مبارکہ کے اس جملے "وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ" کی تفسیر میں حضرت ابوالحسن امام موسیٰ بن جعفر الکاظم علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آنجنابؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس پر ظلم کر سکے یا وہ اپنی طرف ظلم کی نسبت دے لیکن اس نے ہمیں اپنے آپ سے اس قدر ملا دیا کہ ہم

کئے جانے والے ظلم کو اپنے اوپر ڈھایا جانے والا ظلم اور ہماری ولایت کو اپنی ولایت قرار دیا' اس سلسلے میں قرآن مجید میں اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ فرماتے ہوئے یہ آیت نازل کی: "وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ"۔ راوی کہتا ہے میں نے امامؑ سے پوچھا کہ آیا آپ کا یہ ارشاد گرامی ہی قرآن مجید کے ظاہری معنے سے عبارت ہے؟ (تنزیل)۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: ہاں' یہ تنزیل (وحی) ہے

(یاد رہے کہ لفظ تنزیل' وحی والہام اور کشف حقیقت کے معنے میں آتا ہے اس کا مقابل لفظ تاویل ہے جو باطنی معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے)۔

اسی طرح کی ایک روایت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ بن جعفر الکاظم علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ "خدا اس سے بالاتر ہے کہ اس پر ظلم کیا جا سکے" (مفعول کا صیغہ..... یظلم ......) دراصل خدا کے اس قول کی تفسیر ہے جس میں اس نے فرمایا: "وما ظلمونا" (یعنی ان لوگوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا)۔ اسی طرح امام موسیٰ کاظمؑ کا یہ فرمانا کہ "خدا اس سے بالاتر ہے کہ اپنی طرف ظلم کی نسبت دے" یہ فاعل کا صیغہ ہے یعنی ظلم کرنے والا' اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس پر ظلم کرے یا وہ خود کسی پر ظلم کرے۔ اور امام موسیٰ کاظمؑ کا یہ فرمانا کہ ضمیر "نا" استعمال کر کے "اس نے ہمیں اپنے ساتھ اس قدر ملا دیا ہے......" تو اس میں "ہمیں" کے لفظ سے مراد تمام انبیاءؑ' اوصیاءؑ اور آئمہؑ ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم نے "مجھ پر" کے لفظ کے بجائے "ہم پر" کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے تا کہ اس بات کو بیان کرے کہ یہ سب میرے ہیں اور ان پر ظلم کرنا گویا مجھ پر ظلم کرنا ہے اور ان کی ولایت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا دراصل میری ولایت کو تسلیم کرنا ہے۔ اور امامؑ کا یہ فرمانا کہ "ہاں یہ آیت کا ظاہری معنی ہے" تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے موارد میں کسی امر کی نفی کرنا تب صحیح ہوتا ہے جب اس کا اثبات بھی صحیح ہو یا اس کے اثبات کے صحیح ہونے کا گمان کیا جا رہا ہو' اس لیے کبھی یوں نہیں کہا جاتا کہ "دیوار نہیں دیکھتی' یا دیوار کسی پر ظلم نہیں کرتی" لہٰذا جب تک اس کی طرف "دیکھنے" یا "ظلم کرنے" کی نسبت دینے میں کوئی اہم نکتہ یا راز پوشیدہ نہ ہو ایسا نہیں کہا جا سکتا (اس کی طرف یہ نسبتیں نہیں دی جا سکتیں) خداوند عالم اس سے بالاتر ہے کہ اپنے مقدس کلام میں اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے گمان کا عندیہ دے یا اسے اپنی بابت روا قرار دے' اور جو اہم نکتہ آیت کے جملے "وما ظلمونا" (انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا) میں موجود ہے وہی ہے جسے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا "اس نے ہمیں اپنے آپ سے ملا دیا" اس لفظ "ملانے" پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ عام طور پر بزرگ افراد اپنے خدامت گزاروں اور ساتھیوں کو اپنے ساتھ ملا کر جمع کا صیغہ "ہم" استعمال کرتے ہیں اس لیے خداوند عالم نے ہمیں یعنی اپنے انبیاءؑ واوصیاءؑ وآئمہؑ کو اپنے ساتھ ملا کر فرمایا کہ "انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔ (وَمَا ظَلَمُوْنَا)۔

انبیاءؑ کے قتل کی حقیقت

تفسیر العیاشی میں " ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ... " کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آنجنابؑ نے اس آیت (ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ) کی تلاوت فرما کر اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: خدا کی قسم ان لوگوں نے انبیاءؑ کو اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا اور نہ ہی انہیں تلواروں سے شہید کیا بلکہ ان کی باتیں سن کر ان کے دشمنوں کو بتائیں اور ان دشمنوں نے ان باتوں کی وجہ سے انبیاءؑ کو قتل کیا۔ اور انہیں اپنے مظالم کا نشانہ بنایا' تو یہ قتل' حد سے تجاوز اور ایک سانحہ تھا۔

کتاب کافی میں بھی اسی طرح کی ایک روایت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے' گویا امامؑ نے آیت کے الفاظ " ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ " سے راز فاش کرنا (یا جاسوسی کرنا) مراد لیا ہے' ورنہ صرف عصیان کو قتل بالخصوص انبیاءؑ کے قتل اور آیات الٰہی کے انکار کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ حقیقت امر اس کے برعکس ہے کیونکہ قتل کفر میں عصیان کے مقابلہ میں زیادہ شدت پائی جاتی ہے' لیکن اگر عصیان کا معنی راز فاش کرنا کیا جائے تو اس صورت میں اسے قتل انبیاءؑ اور کفر آیات کا سبب قرار دینا ممکن ہوگا۔

آیت ۶۲

o اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

ترجمہ

o وہ لوگ جو ایمان لائے، اور وہ جو یہودی ہیں، نصرانی ہیں، صائبین (لامذہب یا بت پرست) ہیں جو بھی ایمان لے آئے خدا پر اور قیامت کے دن پر اور نیک اعمال بجالائے، ایسے لوگوں کا اجران کے پروردگار کے پاس..... محفوظ..... ہے، وہ نہ خوف زدہ ہوں گے اور نہ ہی رنجیدہ خاطر ہوں گے"۔ (۶۲)

تفسیر و بیان

اس آیت مبارکہ میں دو مرتبہ ایمان لانے کا تذکرہ کیا گیا ہے' آیت کے سیاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوسری مرتبہ ذکر کئے جانے والے "ایمان" کی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے حقیقی معنی میں ایمان لانا مراد ہے اور پہلے ذکر کئے جانے والے "ایمان" سے مراد ظاہری طور پر ایمان لانا ہے' یعنی پہلے جملہ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (وہ لوگ جو ایمان لائے) میں ظاہری طور پر ایمان لا کر اپنے آپ کو "اہل ایمان" کہلانے والے مقصود ہیں اور دوسرے جملہ "مَنْ اٰمَنَ" (جو ایمان لے آئے) میں "حقیقی معنے میں ایمان لانے" کا ذکر ہے لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ لوگوں کا اپنے آپ کو اہل ایمان' یہودی' عیسائی اور صابئین کے نام سے موسوم کرنا ہی خدا کے نزدیک کسی اجر و ثواب کے حصول کا سبب یا سزا و عذاب سے نجات دلانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا جیسا کہ یہودی اور عیسائی کہتے ہیں: "لا یدخل الجنۃ الا ھودًا او نصاریٰ" کہ سوائے یہودیوں اور نصرانیوں کے کوئی بھی بہشت میں نہیں جائے گا' بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ اجر و ثواب کے حصول اور سزا و عذاب سے نجات کا واحد معیار اور سعادت و عزت کی اصل بنیاد خدا پر ایمان لانا' قیامت کے دن پر ایمان لانا اور نیک اعمال کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے "مَنْ اٰمَنَ" (جو ایمان لائے) فرمایا ہے نہ کہ "من امن منھم" (یعنی جو ان میں سے ایمان لائے) تو "منھم" کے ذریعے "ھم" کی ضمیر کو "الذین" کی طرف نہیں لوٹایا گیا جبکہ قواعد ادب کی رو سے ہر موصول کے لیے صلہ ضروری ہوتا ہے اور اس میں ضمیر کو موصول کی طرف لوٹایا جاتا ہے مگر خداوند عالم نے اس آیت مبارکہ میں ضمیر "ھم" کو "الذین" (موصول) کے صلہ میں ذکر نہ کر کے مذکورہ مذاہب کے پیروکاروں کی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ وہ اپنے اس غلط نظریہ پر قائم و باقی نہ رہیں کہ ان کے ظاہری طور پر ایمان لانے کی کوئی حیثیت ہے' کیونکہ اگر خداوند عالم ایسا نہ کرتا اور "ھم" کی ضمیر کو "الذین" کے صلہ میں ذکر کر دیتا تو وہ لوگ کلام الٰہی سے اپنے غلط افکار اور اپنے آپ کو نام کی حد تک ان مذاہب کے پیروکار کہلانے پر اکتفاء کرتے ہوئے نجات و سعادت کے حصول کے دعویدار بنے رہتے' لیکن خداوند عالم نے ان کے ظاہری عقیدے کی کفایت کے نظریہ کو اپنے مخصوص انداز سخن کے ذریعے غلط قرار دے دیا' یہ انداز بیان قرآن مجید میں متعدد مقامات میں اپنایا گیا ہے اور اس بنیاد پر اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ سعادت و کامیابی اور کرامت و بزرگی کا معیار، حقیقی عبودیت و بندگی کے سوا کچھ نہیں' بنابرایں ان ناموں میں سے کوئی نام اور اوصاف کمال میں سے کوئی وصف کسی کا

فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اس کے ساتھ عبودیت و بندگی عملی طور پر مجسم نہ ہو یہ بات عام لوگوں ہی تک محدود نہیں بلکہ اس سلسلے میں عام افراد اور انبیاء الٰہی سب برابر ہیں' تو جب خدا کے برگزیدہ افراد کے لیے نام کی حد تک ایمان و اوصاف کمال فائدہ مند نہیں تو ان سے کمتر لوگوں اور عام افراد کے لیے نام کی حد تک اہل ایمان کہلانا کیونکر فائدہ مند ہو سکتا ہے' چنانچہ قرآن مجید میں خداوند عالم نے اپنے برگزیدہ افراد یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کے تذکرے میں ان کے تمام تر اوصاف و کمالات بیان کرنے کے بعد یوں ارشاد فرمایا:

سورہ انعام، آیت ۸۸:

"وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"

(اگر وہ شرک کریں تو ان کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے)۔

اسی طرح خداوند عالم نے اصحاب پیغمبرؐ اور آنحضرتؐ پر ایمان لانے والوں کی قدر و منزلت اور عظمت و بلند مقام کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ یوں ارشاد فرمایا:

سورہ فتح، آیت ۲۹:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا"

(خداوند عالم نے ایمان لانے والوں اور نیک اعمال بجالانے والوں میں سے بعض کے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ ان کے لیے مغفرت و بخشش اور بہت عظیم اجر ہے)

اس آیت میں "مِنْهُمْ" (ان میں سے) کے لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ تمام ایمان لانے والوں اور نیک اعمال بجالانے والوں سے نہیں کیا گیا' اسی طرح ان کے علاوہ ان کے بارے میں جنہیں آیات الٰہی عطا کی گئیں یوں ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورہ اعراف، آیت ۱۷۶:

"وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ"

(اگر ہم چاہتے تو اسے اپنی آیات کے ذریعے بلند مقام عطا کرتے' لیکن وہ خود ہی زمین کی پستیوں میں گر گیا اور اس نے اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کی)

یہ اور اس طرح کی دیگر متعدد آیات میں وضاحت و صراحت کے ساتھ اس امر کو بیان کیا گیا ہے کہ حقیقی معنی میں عزت و بزرگی اور سعادت و کامیابی کا تعلق حقیقت سے ہے نہ کہ ظاہر سے' یعنی ظاہری طور پر ایمان لانے اور نیک اعمال بجا لانے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ حقیقی معنی میں ایمان لانا اور نیک اعمال بجالا کر عبودیت و بندگی کا عملی ثبوت فراہم کرنا ہی اجر و ثواب کے حصول اور نجات و سعادت پانے کا سبب ہے۔

روایات پر ایک نظر

سلمان فارسی کے سوال کا جواب

تفسیر در منثور میں حضرت سلمان فارسیؓ سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآ
وسلم سے ان اہل دین کے بارے میں پوچھا جن کے ساتھ میں پہلے تھا' تو آنحضرتؐ نے ان کے متعلق بتانا شروع کیا اور ا
کی نماز و روزہ کا تذکرہ کر رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی: "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا ..."

اس آیت کے شان نزول کی بابت متعدد روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ حضرت سلمان فارسیؓ کے (قبل ا
اسلام) ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

نصاریٰ کی وجہ تسمیہ

کتاب معانی الاخبار میں ابن فضال سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے دریافت کیا ک
نصاریٰ کو نصاریٰ کیوں کہا جاتا ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ "ناصرہ" نامی بستی میں رہتے تھے
کہ مملکت شام میں واقع ہے اور یہ وہ بستی ہے جہاں مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے مصر سے واپس آ کر قیام فرمایا تھا۔

اس روایت کے بارے میں تفصیلی تذکرہ اور بحث سورہء آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے تعلق
رکھنے والی آیات کی تفسیر میں کریں گے۔

یہودیوں کی وجہ تسمیہ کی بابت ایک روایت میں ہے کہ انہیں اس لیے اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت
یعقوبؑ کے بیٹے یہودا کی نسل سے ہیں۔

صابئین کا دین

تفسیر قمی میں مذکور ہے کہ امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: "صابئین" ایک قوم کا نام ہے جو نہ مجوسی ...... آتش
پرست ...... ہیں نہ یہودی اور نہ نصرانی ہیں اور نہ ہی مسلمان ہیں بلکہ وہ ستاروں اور سیاروں کے پوجاری ہیں۔

''صابئین'' درحقیقت بت پرستوں ہی کا ایک گروہ ہے البتہ بت پرستی کا عمل انہی سے مختص نہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی بت پرستوں کے کئی گروہ ہیں' تاہم یہ (صابئین) بت پرستی کے ساتھ ساتھ ستاروں اور سیاروں کی پوجا بھی کرتے ہیں۔

ایک تاریخی بحث

مشہور مورخ ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب ''آثار باقیہ'' میں لکھا ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے والوں میں سے جس کا نام سب سے پہلے تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے وہ ''یوذاسف'' ہے' وہ ''طہورث'' کی سلطنت کے ایک سال بعد سرزمین ہند میں ظہور پذیر ہوا اور اسی نے فارسی رسم الخط کی بنیاد ڈالی اور اسی نے لوگوں کو ''صابئین'' کا مذہب اپنانے کی دعوت دی' چنانچہ کثیر تعداد میں لوگ اس کی پیروی کرنے لگے' بلخ میں رہنے والے بیشدادی اور بعض کیانی بادشاہ سورج، چاند اور ستاروں وغیرہ کی تعظیم و تقدیس کرتے تھے' یہاں تک کہ ''زردشت'' ظہور پذیر ہوا یعنی 'بشتاسب'' کی حکومت کے تیس سال گزر جانے کے بعد' اور ان ایام میں ''صابئین'' میں سے جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ ''حیران'' میں تھے اور انہیں اسی شہر کی نسبت سے ''حرانی'' کہا جاتا تھا' البتہ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حرانی کا انتساب حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے بھائی اور تارخ کے بیٹے ''ہاران'' کی وجہ سے ہے' کیونکہ وہ حرانی حکمرانوں اور سرداروں میں سے اپنے دین میں سب سے زیادہ متعصب اور بنیاد پرست تھے' اس کے بارے میں نصرانی مورخ ابن سنکلا نے اپنی کتاب میں ''صابئین'' کے نظریات کی رد کے ضمن میں مطالب درج کئے ہیں' اگرچہ اس نے اس کتاب میں ان کے عقائد کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب جھوٹ اور بے بنیاد و من گھڑت باتوں کا مجموعہ ہے' اس نے اس کتاب میں ''صابئین'' کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ لوگ (حرانی) یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ''حرانیوں'' میں سے تھے اور چونکہ ان کے عضو تناسل کی جلد میں برص کا مرض پیدا ہو گیا تھا اور حرانیوں کے عقیدے کے مطابق جو شخص اس مرض میں مبتلا ہوا سے نجس سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس کے ساتھ رہنا روا نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سے قطع تعلق کر لیتے تھے' لہٰذا ابراہیمؑ ان سے دور ہو گئے اور انہوں نے ختنہ کروایا اور پھر ایک بت خانے میں گئے تو وہاں ایک بت سے یہ آواز سنی: ''اے ابراہیم! تو ایک عیب کے ساتھ ہم سے دور ہوا تھا اور اب واپس آیا تو دو عیب اپنے ساتھ لے آیا ہے لہٰذا اب ہم سے دور چلا جا اور ہمارے پاس ہرگز واپس نہ آنا''۔ ابراہیمؑ کو بت کے یہ الفاظ سن کر شدید غصہ آیا اور انہوں نے اس بت کو پاش پاش کر دیا' پھر حرانیوں سے دور چلے گئے' لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہیں اپنے کئے پر ندامت ہوئی اور انہوں نے اپنی غلطی کی تلافی کے طور پر اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کر لیا تا کہ اسے ''مشتری'' نامی ستارے کے لیے قربان کر دیں کیونکہ ''صابئین'' میں اپنی اولاد کو ستاروں کے لیے قربانی کے طور پر ذبح کرنے کا عام رواج تھا' پس جب ستارہ ''مشتری'' ابراہیمؑ کے ارادے سے آگاہ ہوا کہ وہ صدق

دل سے اپنے کئے پر نادم ہیں اور تائب ہو چکے ہیں تو ان کی قربانی کو قبول کر کے ان کے بیٹے کی جگہ مینڈھے کو فدیہ کر دیا"۔

عبداللہ بن اسماعیل ہاشمی کی کتاب کے جواب میں عبدالمسیح بن اسحاق کندی نے لکھا ہے کہ "حرانی" لوگ انسانوں کو ذبح کرنے کے حوالہ سے مشہور ہیں لیکن عصر حاضر میں وہ علانیہ طور پر ایسا نہیں کر سکتے تاہم ان کے عقائد کے بارے میں ہمیں صرف یہی معلوم ہے کہ وہ ایک خدا کی پوجا کرتے ہیں اور خدا کی توحید و یگانگت کے قائل ہیں، خدا کو ہر طرح کے قبیح و ناز امور سے پاک و منزہ سمجھتے ہیں اور خدا کی توصیف، ایجاب کی بجائے نفی کے حوالے سے کرتے ہیں یعنی خدا کے لیے صفات ثابت کرنے کی بجائے اس سے ان صفات کی نفی کر کے اس کی توصیف کرتے ہیں جو اس کے شایان شان نہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ خدا محدود نہیں، وہ دیکھا نہیں جا سکتا، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، وہ کسی سے زیادتی و ناانصافی نہیں کرتا وغیرہ، اور وہ (حرانی) خداوند عالم کے اسماء حسنیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ سب اسماء مجازی ہیں، کیونکہ وہ قائل ہیں کہ دنیا میں کوئی حقیقی صفت موجود ہی نہیں، وہ کائنات کے امر تدبیر کی نسبت افلاک و نجوم کی طرف دیتے ہیں اور ان افلاک و نجوم کی بابت معتقد ہیں کہ وہ زندہ ہیں، بولتے، سنتے اور دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ (حرانی) انوار یعنی روشنیوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کے باقی ماندہ آثار میں سے ایک وہ گنبد ہے جو دمشق کی جامع مسجد کے محراب پر بنایا گیا ہے، اسی جگہ وہ لوگ نمازیں ادا کرتے تھے اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان اور روم کے لوگ بھی انہی کے عقیدوں پر تھے، جس گنبد کا ذکر کیا گیا وہ جگہ جب یہودیوں کے قبضہ میں آئی تو انہوں نے اسے اپنی عبادت گاہ قرار دے دیا، پھر اس پر نصرانیوں کا قبضہ ہو گیا انہوں نے اسے گرجا بنا لیا، بالآخر جب اسلام ظہور پذیر ہوا تو اہل اسلام نے اسے مسجد قرار دے دیا، "صابئین" نے ستاروں کے ناموں پر کئی مجسمے اور بت بنا رکھے تھے۔ ابو معشر بلخی نے اپنی کتاب "بیوت العبادات" (عبادت گاہیں) میں ان شکلوں، مجسموں اور بتوں کے بارے میں جو "صابئین" نے سورج کے نام پر بنا رکھے تھے لکھا ہے کہ ان بتوں میں سے ہر ایک کی ایک خاص شکل تھی مثلاً "بعلبک" کا مجسمہ سورج کے بت کے طور پر مشہور تھا، اور "قران" کا مجسمہ "قمر" (چاند) کے نام منسوب تھا جسے انہوں نے چاند کی شکل میں اس طرح بنایا تھا جیسے سر اور کندھوں پر ڈالی جانے والی شال ہوتی ہے، اور اس کے نزدیک "سلمسین" نامی ایک گاؤں ہے جسے زمانہ قدیم میں "صنم سین" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا یعنی چاند کا بت، دوسرے گاؤں کا نام "ترع عوز" ہے یعنی زہرہ کا دروازہ۔ اور وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کعبہ اور اس میں رکھے ہوئے بت انہی (صابئین) کے تھے اور وہی (صابئین) کعبہ میں عبادت کرتے تھے، اور لات و عزیٰ..... جو کہ مشہور و معروف بتوں کے نام ہیں۔ میں سے لات ستارہ زحل کے نام پر اور عزیٰ ستارہ زہرہ کے نام پر بنائے گئے تھے، اور ان میں متعدد انبیا تھے جن میں سے اکثر یونان کے مشہور فلاسفر تھے جیسے ہرمس مصری، اغاذیمون، والیس، فیثاغورث، بابا سوار (افلاطون کا نانا) اور ان جیسے دیگر فلاسفر، اور "صابئین" میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مچھلی کھانے کو اس لیے حرام سمجھتے تھے کہ ممکن ہے اس میں جھاگ ہو، اور مرغ کو بھی حرام سمجھتے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ گرم ہوتا ہے، اور لسن کو اس لیے حرام قرار دیتے تھے کہ اس سے کھانسی ہوتی ہے اور وہ خون کو یا منی کو جلا دیتا ہے کہ جس پر پوری انسانی کائنات کا دارومدار ہے، باقلا (پھلیوں) کو اس

حرام قرار دیتے تھے کہ وہ ذہن کو آلودہ (گندہ) کرتا ہے اور یہ کہ وہ سب سے پہلے ایک مردہ شخص کی کھوپڑی میں اگا تھا' نماز کے متعلق صابئین کا یہ عقیدہ تھا کہ شب وروز میں صرف تین نمازیں واجب ہیں: پہلی آٹھ رکعت' سورج نکلنے کے وقت' دوسری پانچ رکعت زوال آفتاب کے وقت یعنی اس وقت جب سورج وسط آسمان سے عبور کرتا ہے' ان کی نمازوں میں ہر رکعت میں تین سجدے ہیں' اس کے علاوہ وہ دن کے دو اور نو بجے نماز نافلہ بھی بجالاتے ہیں' تیسری نماز رات کے تیسرے پہر میں ہے' وہ لوگ نماز کو طہارت و پاکیزگی کے ساتھ اور وضو کر کے بجالاتے ہیں' غسل جنابت بھی کرتے ہیں' اور وہ ختنہ بھی نہیں کرتے۔

اس کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کی بابت کوئی حکم صادر نہیں ہوا' ان کے اکثر فقہی احکام عام مسلمانوں کے فقہی احکام کی مانند ہیں مثلاً نکاح اور حدود و تعزیرات وغیرہ' البتہ مس میت اور اس طرح کے دیگر مسائل میں ان کے احکام تورات کے احکام سے ملتے جلتے ہیں' وہ لوگ ستاروں' سیاروں اور بتوں و مجسموں کے نام پر قربانیاں بھی کرتے تھے اور ان قربانیوں کے جانوروں کو ان کے کاہن (علمائ) اور اطباء ذبح کرتے تھے اور وہ علماء و اطباء کے ذریعے اس کام کو انجام دینے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس طرح سے مستقبل میں خدا کے پسندیدہ احکام سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور وہ (عالم و طبیب) اپنے سوالوں کے جوابات......غیب سے...... پاتا ہے) ان کے عقیدے کے مطابق ہرمس کو ادریس بھی کہا جاتا تھا کہ جسے تورات میں ''زحنوخ'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے' جبکہ بعض مورخین کے خیال میں ''یوذاسف'' ہی ہرمس ہے۔

بعض مورخین کا کہنا ہے کہ یہ حرانی لوگ حقیقت میں ''صابئین'' نہیں بلکہ کتابوں میں انہیں ''حنفائ'' اور ''وثنیہ'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے کیونکہ ''صابئین'' وہ لوگ ہیں جو ''کورش'' کے عہد میں بابل میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور پھر ارطحشت کے دور میں بیت المقدس چلے گئے اور وہاں جا کر انہوں نے مجوسیوں کے دین کو اپنا لیا اور ان کی شریعت پر عمل پیرا ہو گئے' پھر وہ بخت نصر کے دین کے پیروکار بن گئے' انہوں نے مجوسیت اور یہودیت کے امتزاج سے ایک تیسرا مذہب بنا لیا جیسا کہ شام کے سامریوں نے کیا تھا' ان کے اکثر افراد، واسط میں اور عراق کے دیہی علاقوں جعفر اور جامدہ میں موجود ہیں اور وہ اپنے آپ کو ''انوش بن شیث'' کی نسل اور حرانیوں کے مخالف قرار دیتے ہیں اور حرانیوں کے بعض نظریات و عقائد کے علاوہ اکثر عقائد کو غلط و نادرست سمجھتے ہیں' یہاں تک کہ وہ (صابئین) قطب شمالی کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں جبکہ حرانی قطب جنوبی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

بعض اہل کتاب کا کہنا ہے کہ متوشلخ بن غیر کا ایک فرشتہ تھا جس کا نام ''صابی'' تھا اور ''صابئین'' کی نسبت اسی کی طرف ہے' ادیان و شریعتوں کے ظہور پذیر ہونے اور ''یوذاسف'' کے قیام سے قبل لوگ مشرقی خطہ ارضی میں سکونت پذیر تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے' انہی کے باقیماندہ افراد اس زمانے میں ہندوستان' چین اور تغزغز میں موجود ہیں' اہل خراسان ان لوگوں کو ''شمنان'' کے نام سے یاد کرتے ہیں' ان کے آثار قدیمہ میں سے کئی عبادت گاہیں' بت اور مجسمے ہندوستان سے ملحقہ خراساں کے سرحدی علاقہ میں موجود ہیں' وہ لوگ عالم کے قدیم ہونے اور تناسخ ارواح (یعنی کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی روح کے کسی دوسرے شخص میں منتقل ہونے) اور فلک کے غیر متناہی فضا میں گرنے کی حالت میں ہونے کے قائل ہیں'

اور یہ کہ فلک کے اس حالت میں ہونے کی وجہ سے اس میں حرکت پائی جاتی ہے یعنی وہ گھومتا رہتا ہے کیونکہ ہر گول چیز جب اوپر سے نیچے کی طرف گرتی ہے تو اس میں گھومنے جیسی حرکت پائی جاتی ہے' بعض مورخین کے نزدیک ان لوگوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو عالم (کائنات) کے حدوث کا قائل ہے اور وہ کہتے ہیں کہ کائنات کو وجود میں آئے ہوئے ایک ملین برس گزر چکے ہیں''۔

یہ تھی مورخ ابوریحان کی تحقیق جو اس کی کتاب میں ''صابئین'' کے بارے میں مذکور ہے۔

''صابئین'' کے بارے میں بعض مورخین و محققین کی طرف منسوب کی گئی یہ رائے بظاہر درست معلوم ہوتی ہے کہ ان کا مذہب مجوسیت' یہودیت اور حرانیت کے بعض نظریات کا مجموعہ ہے اور یہ رائے مورد بحث آیت مبارکہ کے موضوع سے ہم آہنگ بھی ہے کیونکہ اس کے سیاق میں اقوام' ادیان و مذاہب کے پیروکاروں کا شماریاتی تذکرہ کیا گیا ہے۔

(مترجم: مولّف نے ابوریحان اور دیگر مورخین کی نگارشات ذکر کی ہیں ان سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ان تمام تحریروں سے اتفاق رائے رکھتے ہیں بلکہ تذکرہ تاریخ کے طور پر ان کو ذکر کر دیا ہے جبکہ ان نگارشات میں متعدد مطالب کہ جن کی نسبت بعض انبیاءؑ کی طرف دی گئی ہے وہ خرافات کے سوا کچھ نہیں۔ اسی سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ تاریخ کے ہاتھوں سے لکھی گئی اور عقائد و نظریات کے باب میں کس قدر خرافات موجود ہیں۔)

آیات ۶۳ تا ۷۴

○ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾

○ ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَكُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۶۴﴾

○ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِيۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡكُمۡ فِى السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِئِيۡنَ ۚ ﴿۶۵﴾

○ فَجَعَلۡنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۶۶﴾

○ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَةً ؕ قَالُوۡٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۶۷﴾

○ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكۡرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيۡنَ ذٰلِكَ ؕ فَافۡعَلُوۡا مَا تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۸﴾

○ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا لَوۡنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفۡرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ﴿۶۹﴾

○ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا ؕ وَاِنَّآ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾

○ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي
الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا
كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ؑ

○ وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ۚ

○ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

○ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ
وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ
مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

ترجمہ

O ''اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا جبکہ کوہ طور کو تمہارے اوپر آویزاں کر دیا تھا کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے لے لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے اچھی طرح پڑھو تاکہ تم پرہیزگار ہو سکو''۔ (۶۳)

O ''پھر تم نے عہد کرنے کے بعد اس سے منہ موڑ لیا' پس اگر تم پر خدا کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم سخت نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے''۔ (۶۴)

O ''تم میں سے جن لوگوں نے ہفتہ کے دن کے بارے میں حکم عدولی کی تم نے ان کے متعلق جان لیا کہ ہم نے...... ان کی اس نافرمانی پر...... ان سے کہا کہ تم دھتکارے ہوئے بندر ہو جاؤ'' (۶۵)

O ''اس عذاب کو ہم نے اس وقت کے لوگوں اور بعد میں آنے والوں کے لیے درس عبرت قرار دیا اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے نصیحت بنایا''۔ (۶۶)

O ''اس وقت کو خاطر میں لاؤ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے کو ذبح کرو' انہوں نے جواب دیا: کیا تم مذاق اڑا رہے ہو؟ موسیٰ نے کہا: خدا کی پناہ! کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں''۔ (۶۷)

O '' انہوں نے کہا...... اگر ایسا ہے تو...... ہمارے لیے اپنے پروردگار سے کہو کہ ہمیں وضاحت کے ساتھ بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ موسیٰ نے کہا: خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بہت بوڑھی اور نہ جوان بلکہ درمیانی عمر کی ہو' پس جو تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرو''۔ (۶۸)

○ "انہوں نے کہا ہمارے لیے اپنے پروردگار سے کہو کہ ہمیں وضاحت کے ساتھ بتائے کہ اس گائے کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا! خدا فرماتا ہے کہ اس کا رنگ زرد ہو' اس کا رنگ دیکھنے والوں کے دل پسند ہو"۔ (۶۹)

○ "انہوں نے کہا: ہمارے لیے اپنے پروردگار سے کہو کہ ہمیں وضاحت کے ساتھ بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو' کہ اس کی پہچان ہمارے لیے مشکل ہو گئی ہے' اگر خدا نے چاہا تو ہم ضرور ہدایت حاصل کریں گے"۔ (۷۰)

○ "موسیٰ نے کہا: خدا فرماتا ہے وہ گائے نہ اتنی سدھائی ہوئی ہو کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی سینچے' صحیح وسالم ہو' اور اس پر داغ دھبہ نہ ہو' انہوں نے کہا: اب تم نے واضح بات کی ہے' پس انہوں نے وہ گائے ذبح کی' جبکہ وہ ایسا کرنے پر مائل نہ تھے"۔ (۷۱)

○ "اس وقت کو یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا پھر اس کی بابت تم آپس میں الجھ پڑے تاہم خدا نے اس بات کو ظاہر کر دیا جسے تم چھپا رہے تھے"۔ (۷۲)

○ "پھر ہم نے تم سے کہا کہ اس گائے کا ایک ٹکڑا اس (مقتول) سے مس کرو' خدا اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی واضح نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ سکو"۔ (۷۳)

○ "پھر اس کے بعد تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے یا اس سے بھی زیادہ' کیونکہ کچھ پتھر ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹتی ہیں اور کچھ پتھر ایسے ہیں کہ جب ان میں شگاف پڑتا ہے تو ان میں سے پانی نکلتا ہے' اور بعض پتھر ایسے ہیں جو خوف خدا میں بلندی سے نیچے گر پڑتے ہیں' یاد رکھو خدا تمہارے اعمال سے ہرگز غافل نہیں"۔ (۷۴)

تفسیر و بیان

کوہ طور کا تذکرہ

○ "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ"

طور ایک پہاڑ کا نام ہے' چنانچہ خداوند عالم نے اس کے متعلق سورہ اعراف کی آیت ۱۷۱ میں یوں ارشاد فرمایا:
"وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ"
(اور ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو سائبان کی طرح مسلط کر دیا)

اس آیت میں "طور" کی بجائے جبل (پہاڑ) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ "نتق" کا معنی جذب اور اکھڑنا ہے۔

زیر بحث آیت مبارکہ کے سیاق میں پہلے وعدہ لینے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اسے یاد کر کے اس کی پاسداری کا حکم دیا گیا ہے' اور آیت کے آخری جملے میں ان مقدس تعلیمات وحقائق کو یاد دلایا گیا ہے جو انہیں عطا کردہ پاکیزہ کتاب میں موجود ہیں' ان مطالب کے درمیان پہاڑ کو ان پر مسلط و آویزاں کرنے کی وجہ اور سبب کا ذکر کئے بغیر اسے سائبان کی طرح ان پر لٹکانے کا ذکر ہوا ہے جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ پہاڑ کو ان کے سروں پر آویزاں کرنے میں ان لوگوں کو قدرت الٰہی کی عظمت سے آگاہ کرتے ہوئے خدا کی معصیت سے دور رہنے کا تاکیدی اشارہ اور نافرمانی کی صورت میں خوف دلانا مقصود تھا' ایسا کرنا انہیں احکام الٰہی پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کے لیے نہیں تھا کیونکہ اگر پہاڑ کو مسلط کرنا انہیں خداوند عالم کے فرامین واحکام پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کی غرض سے ہوتا تو ان سے وعدہ لینے اور عہد و پیمان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ گویا آیت میں تین امور ذکر کئے گئے ہیں:

(۱) سب سے پہلے عہد و پیمان لینے کا ذکر۔

(۲) اس کے بعد کوہ طور کو ان کے سروں پر مسلط کرنے کا ذکر۔

(۳) اور آخر میں احکام الٰہی پر عمل کرنے کے حکم کا ذکر۔

ان مطالب کے تذکرے کی ترتیب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عہد و پیمان لینے کے بعد پہاڑ کو ان کے سروں

پر آویزاں کرنے کی وجہ اس کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے کہ خداوند عالم انہیں اپنی عظیم قدرت کا نمونہ دکھا کر عہد و پیمان کی خلاف ورزی سے باز رہنے کی تاکید کرنا چاہتا تھا اور انہیں معصیت و نافرمانی کے تباہ کن آثار و نتائج سے ڈرانا چاہتا تھا، نہ یہ کہ انہیں اپنی تعلیمات و احکام پر عمل کرنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا کیونکہ اگر اس کا مقصد ان لوگوں کو جبری طور پر اپنی تعلیمات و احکام پر عمل کروانا ہوتا تو انہیں اپنے احکام پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کے لیے پہلے ہی سے پہاڑ کو ان پر مسلط کر دیتا جس سے وہ خواہ ناخواہ اس کے احکام پر عمل کرتے، لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنی عظیم قدرت کے مظاہرے سے پہلے ان سے وعدہ لیا تا کہ وہ "خدا" سے کئے ہوئے وعدے کی پاسداری کریں اور اس کی خلاف ورزی سے اجتناب کریں۔

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

بنی اسرائیل کے سروں پر کوہ طور کو آویزاں کرنے کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ ایک معجزہ کے طور پر تھا تا کہ اس کے ذریعے لوگوں کو ایمان لانے اور تعلیمات الٰہی پر عمل کرنے پر مجبور کیا جا سکے جبکہ خداوند عالم نے عقیدہ و عمل میں آزادی کے سلسلے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

سورہ بقرہ، آیت ۲۵۶:

"لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" (دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں)

سورہ یونس، آیت ۹۹:

"اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ"

(آیا تم لوگوں کو اس بات پر مجبور کر سکتے ہو کہ وہ ایمان لے آئیں)

لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ آیت مبارکہ کے سلسلے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سے ان لوگوں کو ..... خدا کی نافرمانی اور وعدہ خلافی کرنے سے...... ڈرانا مقصود تھا تا کہ وہ خدا سے کئے ہوئے عہد و پیمان سے سرتابی نہ کریں، کیونکہ اگر پہاڑ کو ان کے سروں پر مسلط کرنا انہیں ایمان و عمل پر مجبور کرنے کے معنے میں لیا جائے تو پھر حضرت موسیٰؑ کے اکثر معجزات کے بارے میں بھی یہی تسلیم کرنا پڑے گا جبکہ یہ ہرگز درست نہیں کیونکہ یہ بات آیت کے ظاہری معانی سے روگردانی سے عبارت ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ بنی اسرائیل پہاڑ کے دامن میں تھے اور ایک زلزلہ آیا جس سے پہاڑ لرز اٹھا اور ان کے سروں پر اس طرح سے آویزاں ہو گیا کہ انہوں نے سمجھا کہ اب یہ ان پر گرنے والا ہے، اس واقعہ کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا: "ہم نے ان پر پہاڑ کو مسلط کر دیا اور اسے سائبان کی طرح ان کے سروں پر آویزاں کر دیا"۔

(یہ بات اس لیے صحیح قرار نہیں دی جا سکتی) کہ اس سے معجزات اور خارق العادت امور کی نفی و انکار لازم آتا ہے جبکہ ہم اس موضوع (معجزات) کے بارے میں تفصیلی تذکرہ کر چکے ہیں اور عقلی دلائل سے اسے ثابت کر چکے ہیں، آیات سے

بارے میں اس طرح کی تاویلیں کرنے سے کلام الٰہی کا ظاہر متاثر ہوتا ہے اور آیات کے ظاہری معانی کی کوئی قدر و قیمت و حیثیت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی کلام کی فصاحت و بلاغت کی بنیاد قائم رہ سکتی ہے' بنابراین کلام الٰہی کی عظمت اور معجزات و خارق العادت امور کی حقیقت اس امر کی متقاضی ہے کہ پہاڑ کے مسلط کرنے کو کسی قسم کے ڈرانے دھمکانے کا عمل قرار نہ دیا جائے بلکہ اس سے قدرت الٰہی کا مظاہرہ اور عہد و پیمان کی پاسداری کا تاکیدی اشارہ مراد لینا صحیح ہوگا۔

تقویٰ کے حصول کی ترغیب

○ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ"

عربی زبان میں لفظ "لعل" امید و آرزو کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کسی چیز کی امید و آرزو کرنے میں یہ امر ضروری ہے کہ کلام میں اس کا اظہار درست ہو خواہ اس امید و آرزو کرنے والا...... متکلم...... کلام کرنے والے...... یا مخاطب...... جس سے کلام کیا جا رہا ہو...... یا مقام سخن اس کا متقاضی ہو کہ امید کے انداز میں بات کی جائے چونکہ بنیادی طور پر امید' جہل و نادانی اور مستقبل سے ناآگاہی کی وجہ سے جنم لیتی ہے لہٰذا کلام الٰہی میں اس کا تصور متکلم کے حوالہ سے ہو ہی نہیں سکتا اور امید یا آرزو کی نسبت خدا کی طرف کسی صورت میں صحیح نہیں کیونکہ وہ مستقبل کا علم رکھتا ہے اور تمام امور کے نتائج سے پوری طرح آگاہ ہے۔ بنابراین خدا کے کلام میں امید و رجاء دراصل مخاطب یا مقام سخن کے حوالہ سے ہے۔

راغب اصفہانی نے اپنی کتاب "المفردات" میں بھی اس کی وضاحت اسی طرح کی ہے جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔

"كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ"

"خاسئین" یعنی ذلیل و خوار اور بے قدر و قیمت۔

"فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا ..."

یعنی ہم نے انہیں مسخ کر کے دوسروں کے لیے اسے درس عبرت قرار دیا' (تا کہ کوئی دوسرا اس طرح سے خدا کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کی خلاف ورزی نہ کرنے پائے)۔

عربی زبان میں لفظ "نکال" سے مراد کسی شخص کے ساتھ ایسا توہین آمیز اور ذلت خیز سلوک کرنا ہے جس سے دوسرے عبرت حاصل کریں۔

گائے ذبح کرنے کا حکم

○ "وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ..."

یہاں بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ ذکر ہوا ہے اور اسی حوالہ سے اس سورہ کو سورۂ بقرہ (گائے والی سورت) کے

نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کی گائے کے واقعہ کا تذکرہ جس انداز میں قرآن مجید میں کیا گیا ہے وہ اپنی نوعیت میں منفرد و عجیب ہے اور وہ یوں کہ واقعہ کے تذکرے میں تسلسل کی بجائے مربوطہ مطالب کو علیحدہ علیحدہ اور ایک دوسرے سے الگ مقامات میں مختلف و مخصوص اندازِ سخن کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے' مثلاً واقعہ کی ابتداء میں حضرت پیغمبر اسلامؐ سے مخاطب کرار شاد فرمایا: "۔۔وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ . . ." (یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا......) اس کے بعد ارشاد فرمایا: "۔۔وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا . . ." (اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور اس کی بابت آپس میں الجھ گئے...) پھر واقعہ کا ایک حصہ درمیان سے نکال کر شروع میں ذکر کر دیا اور پھر دوبارہ واقعہ کے ابتدائی اور درمیانی حصے کو ذکر کیا' اس کے علاوہ یہ کہ سابقہ آیات میں بنی اسرائیل کو مخاطب قرار دے کر بات کی گئی تھی اور کہا گیا تھا: "(یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا)" (پھر اس کے بعد تم نے اپنے عہد و پیمان سے روگردانی کی) "(اور تم نے زیادتی کرنے والوں کو جان لیا....")۔ ان آیات میں تمام بنی اسرائیل کو مخاطب قرار دیا گیا' اس کے بعد اندازِ سخن تبدیل کر کے یوں کہا گیا ("یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا.....") اس آیت میں بنی اسرائیل کو مخاطب قرار دے کر بات کرنے کی بجائے (حضرت پیغمبر اسلامؐ سے مخاطب ہو کر بنی اسرائیل کو) "موسیٰؑ کی قوم" کے لفظ سے ذکر کر کے بات کی گئی' پھر دوبارہ بنی اسرائیل کو مخاطب قرار دے کر یوں کہا گیا: "اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور اس کی بابت آپس میں الجھ پڑے"۔ اس آیت میں موسیٰؑ کی قوم کے لفظ کی بجائے "تم" کا لفظ استعمال کیا گیا جو اندازِ سخن میں واضح تبدیلی کا ثبوت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا اور ایک ہی واقعہ کے تذکرے میں مخاطب سے غائب اور پھر غائب سے مخاطب کے انداز بیان کو کیوں اپنایا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عام طور پر کسی واقعہ کے بیان کے لیے مقدمہ و تمہید کی ضرورت ہوتی ہے اور خداوند عالم کا ارشادِ گرامی: "وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً" (جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم گائے کو ذبح کرو) مقدمہ و تمہید کے طور پر ہے اور اس کے مخاطب حضرت پیغمبر اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور یہ امر بعد میں ذکر کئے جانے والے مطالب کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہے، جبکہ گائے کے ذبح کرنے کا حکم اور گائے کی نشانیوں کا تذکرہ اصل واقعہ سے مربوط ہے' یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد واقعہ کے اصل کردار یعنی بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے ارشادِ الٰہی ہوا:

"وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ"

یہ دونوں آیتیں واقعہ سے پہلے ذکر کی جانے والی آیات کے باب میں آتی ہیں اور یہ پانچ آیتیں یعنی آیت نمبر ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱ (وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى . . . سے لے کر وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ تک) پورے واقعہ کے تذکرے

"جملہ معترضہ" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (جملہ معترضہ کسی کلام کے وسط میں موضوع سخن سے مربوط جہات کی وضاحت یا ان کے درمیان پائی جانے والی نسبت کو بیان کرتا ہے) تو یہ آیات بعد والے خطاب کے معنے کی وضاحت بھی کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس امر کو بھی بیان کرتی ہیں کہ بنی اسرائیل کس قدر بے ادب' بداخلاق' اپنے نبی کو اذیت و آزار دینے والے' اپنے نبی کی طرف غیر ضروری و فضول باتیں کرنے اور بے معنی و مبہم گفتگو کرنے کی نسبت دینے والے' بات بات میں ٹوکنے اور اپنے نبی کا مذاق اڑانے والے اور خدا کے اوامر و احکامات اور انبیاء علیہم السلام کے واضح بیانات کی وضاحت طلب کرنے کے لیے اہانت آمیز انداز اپنانے والے تھے' ان کے ایسا کرنے میں ان کی بدباطنی اور خداوند عالم کے بلند و بالا مقام و منزلت کی بیحرمتی کے ارتکاب کا ثبوت ملتا ہے' ملاحظہ فرمائیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: "... اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ..." (خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم گائے کو ذبح کرو)۔

انہوں نے اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: "ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ ..." (اپنے پروردگار سے کہو کہ وہ ہمیں گائے کے بارے میں واضح طور پر بتائے)۔

اس کے بعد دوبارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: "ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُھَا ..." (اپنے پروردگار سے کہو کہ وہ ہمیں واضح طور پر بتائے کہ وہ گائے کس رنگ کی ہے)۔

پھر تیسری مرتبہ اسی انداز میں کہا: "ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَہَ عَلَیْنَا ..." (اپنے رب سے کہو کہ وہ ہمیں واضح طور پر بتائے کہ وہ گائے کیسی ہے کیونکہ ہم اس کی بابت اشتباہ کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ ہمارے لیے مشتبہ و مبہم ہو گئی ہے)۔

مذکورہ تمام بیانات میں انہوں نے "ربنا" (ہمارے رب) کے بجائے "رَبَّکَ" (اپنے رب) کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے ان کی بے ادبی اور اہانت آمیز انداز سخن کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ انہوں نے بار بار کہا کہ گائے کا مسئلہ ہمارے لیے واضح نہیں ہوا اور ہم یہ نہیں سمجھ پائے کہ وہ کیا ہے جبکہ حقیقت امر یہ ہے کہ خداوند عالم نے واضح طور پر اس کے متعلق بیان کر دیا تھا' اگر وہ کہتے کہ: (ہم سمجھ نہیں سکے کہ وہ کون سی گائے ہے) تو شاید ان کے بیانات کی تاویل کی جا سکتی تھی لیکن انہوں نے کہا کہ "وہ کیا ہے"؟ یعنی ہم گائے کے لفظ سے کچھ نہیں سمجھ سکے' اپنے اس انداز سخن اور طرز کلام میں انہوں نے خداوند عالم اور اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیانات کے واضح ترین الفاظ کو مبہم اور غیر واضح قرار دے کر کہا کہ "اس سے مقصد و مطلوب کی وضاحت نہیں ہوتی اور چونکہ مردے کو زندہ کر کے اس سے قاتل کا سراغ پانے کا کام ہر گائے سے نہیں لیا جا سکتا اس لیے ہم گائے کے لفظ سے کچھ نہیں سمجھ سکتے"۔ حالانکہ خداوند عالم نے انہیں کسی خاص اور مخصوص گائے کے ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ صرف "گائے" کا لفظ (بقرہ) استعمال کیا جس سے کسی خاص گائے کا اشارہ ہی نہیں ملتا کیونکہ گائے کسی مردے کو کیونکر زندہ کر سکتی ہے یہ تو صرف ایک

ذریعہ وطریقہ کے طور پر کہا گیا تھا' یہ کام تو خداوند عالم کے ساتھ مخصوص ہے نہ کہ گائے یا کسی اور چیز کے ساتھ' یعنی گائے کو ذبح کرکے اس کا ایک ٹکڑا مقتول شخص کے ساتھ مس کرنے سے اس میں زندگی کا آ جانا خدا کی طرف سے تھا، نہ کہ گائے میں کوئی ایسی قوت تھی کہ اس کا اثر ایسا ہو' حق تو یہ تھا کہ وہ خدا کے حکم پر گائے کو ذبح کر دیتے اور جس طرح ان سے کہا گیا تھا اسی طرح عمل کرتے اور بار بار گائے کے بارے میں سوال کرنا اور اس کی بابت اشتباہ وابہام کا اظہار کرنا کلام الٰہی کو مبہم وغیر واضح قرار دینے کے مترادف ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ملاحظہ کریں کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جہالت اور فضول و بے معنی باتیں کرنے کی نسبت بھی دی چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ: (خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم گائے کو ذبح کرو) تو انہوں نے کہا: آیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے! (اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی طرف سے اس طرح کے عمل (مذاق کرنے) کی نفی میں فرمایا: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ" کہ میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں' اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی طرف سے ہر بات کو واضح طور پر بیان کر دیا تو انہوں نے کہا: "اَلْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ" (اب تم نے سچ بات کی ہے) 'تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں اس سے پہلے کی جانے والی بات سچ اور برحق نہ تھی' گویا انہوں نے سابقہ تمام بیانات کی حقانیت وصداقت کی نفی کی' جبکہ خدا کے بیان اور نبی کے اندازِ سخن وطرز کلام کی طرف باطل کی نسبت دینا کسی طرح صحیح نہیں۔

بہرحال گائے کے واقعہ کے تذکرے میں اس حصے کو پہلے بیان کرنا بعد میں ذکر کئے جانے والے حصے کی وضاحت کے لیے ہے اور ایک اہم نکتہ کے اظہار کے لیے بھی' اور وہ یہ کہ گائے کا واقعہ تورات میں ذکر ہی نہیں کیا گیا یعنی یہ تورات جو اس دور میں یہودیوں کے پاس ہے اس میں اس واقعہ کا تذکرہ ہی نہیں ہے' لہٰذا ضروری تھا کہ اس واقعہ کے ذکر میں انہیں مخاطب قرار نہ دیا جائے' اور اگر انہیں مخاطب قرار بھی دی جائے تو موجودہ تورات میں ان کی طرف سے ہونے والے ردوبدل اور تحریف کے عمل کی وضاحت کے بعد ہو' اس لیے سب سے پہلے یہودیوں سے مخاطب ہونے کی بجائے حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرکے اس واقعہ کے تذکرے کی ابتداء کی گئی اور جب واقعہ کے اصل پہلو واضح ہو گئے تو اندازِ بیان کو تبدیل کرکے دوبارہ یہودیوں کو مخاطب قرار دیا گیا' البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ تورات میں ایک حکم کے بیان کے ضمن میں کچھ مطالب ذکر کئے گئے ہیں جن سے گائے کے واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کا ثبوت ملتا ہے' تورات کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

سفر "تثنية الاشتراع" کی فصل ۲۱ میں مذکور ہے کہ "اگر تو اس سرزمین میں جو تجھے تیرا پروردگار عطا کرے کسی مقتول کی لاش پائے کہ جو صحرا میں پڑی ہو اور اس کا قاتل معلوم نہ ہو تو تیرے مشائخ و بزرگ افراد اور قاضی حضرات جائے وقوعہ پر جا کر اس کے اردگرد کے قریبی شہروں اور حادثہ کے وقوع پذیر ہونے کی جگہ کے درمیان فاصلے کی پیمائش کریں' پس جو شہر سب سے زیادہ نزدیک ہو اس کے بزرگ و معمر افراد گائے کے ایک بچھڑے کو اس جگہ لے جائیں

جہاں زراعت و کھیتی باڑی نہ ہوئی ہو اور وہ بزرگ و معمر افراد اس بچھڑے کو ندی پر لے جا کر اس کی گردن توڑیں (ذبح کریں) اس وقت بنی لاوی قبیلہ کے کاہن (علماء) آئیں کیونکہ تیرے پروردگار و معبود نے انہیں اس کام کے لیے منتخب کیا ہے تا کہ وہ اس کی خدمت کریں اور پروردگار کے نام سے برکت پائیں' لہٰذا ان کے حکم کے مطابق جھگڑے و نزاع کا فیصلہ ہو اور جائے وقوعہ سے نزدیک ترین شہر کے بزرگ و معمر افراد اس ذبح کی ہوئی گائے پر اپنے ہاتھ دھوئیں اور بلند آواز سے کہیں: "ہمارے ہاتھوں سے یہ خون نہیں بہا...... ہم نے اسے قتل نہیں کیا...... اور ہماری آنکھوں نے ایسا ہوتے نہیں دیکھا' پروردگارا اپنی ملت اسرائیل کو معاف کر دے اور اپنی قوم اسرائیل میں یہ خون ناحق قرار نہ دے' پس اگر وہ اس طرح عمل کریں تو ان سے وہ خون (قتل) معاف کر دیا جائے گا۔

اس طویل تذکرے سے آپ آگاہ ہو سکتے ہیں کہ قرآن مجید میں اس واقعہ کو جس مخصوص انداز میں ذکر کیا گیا ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے ٹکڑوں اور حصوں میں بیان کیا گیا ہے بلکہ اس کے تذکرہ میں "اجمال" مقصود و مدنظر تھا اس لیے سب سے پہلے یوں ارشاد ہوا: "وَ اِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا . . ." پھر اس کے دیگر حصوں کو تفصیلی طور پر اور ایک مستقل واقعہ کی صورت میں ایک خاص مقصد کے پیش نظر بیان کیا گیا' (لہٰذا قرآن مجید نے جس انداز میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے اس میں اہم راز اور حکمت پوشیدہ ہے اور یہی امر قرآنی بیانات میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے کہ اس کے انداز سخن میں حکیمانہ اسرار نہفتہ ہیں)۔

بہر حال اس آیت شریفہ: "وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖۤ . . ." میں پیغمبر اسلامؐ کو مخاطب کر کے ایک واقعہ کے بیان کی صورت میں مطالب پیش کئے گئے ہیں جو دراصل بعد میں ذکر کئے جانے والے مطالب کی وضاحت کے لیے ایک مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ اس مقدمہ و تمہیدی بیان میں گائے کے ذبح کرنے کی وجہ اور اس سے مطلوبہ نتیجے کا تذکرہ نہیں کیا گیا بلکہ اتنا ہی کہا گیا کہ "خدا نے حکم دیا ہے کہ گائے کو ذبح کرو" اور یہ انداز اس لیے اپنایا گیا تا کہ سننے والے کو اجمالی طور پر واقعہ سے آگاہی دلاتے ہوئے ابتدائی مراحل میں غور و فکر کی دعوت دی جائے کہ وہ اسے سنتے ہی اس کے تمام پہلوؤں سے مطلع ہو کر گفتگو کی دونوں صورتوں کے درمیان پائے جانے والے ارتباط سے آشنا ہو سکے' یہی وجہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے سنا کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ گائے کو ذبح کریں تو وہ حیرت زدہ ہو گئے اور نہایت تعجب کے ساتھ یہ سوچنے لگے کہ خدا کے نبی موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ساتھ مذاق تو نہیں کیا؟ کیونکہ انہیں بظاہر ان دونوں امور کے درمیان کوئی ربط دکھائی نہیں دے رہا تھا' یعنی گائے کو ذبح کرنے اور قتل کے واقعہ کی حقیقت معلوم کر کے قاتل کی پہچان کے بعد جھگڑے و نزاع کے حتمی فیصلے کے درمیان کوئی ربط ہی نہیں بلکہ وہ دو الگ الگ اور ایک دوسرے سے...... بظاہر...... قطعی طور پر غیر مربوط دکھائی دیتے ہیں' اس لیے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: "اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا" (آیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے)...... ہمارا مذاق اڑاتا ہے...... یہ امر واضح ہے کہ ان کا اس طرح کہنا دراصل ان میں روح اطاعت و فرمانبرداری کے

فقدان اور تکبر ونخوت اور سرکشی کے رجحانات کے سبب سے تھا' گویا وہ یہ بات باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ ہرگ اندھی تقلید کے قائل نہیں اور جب تک کسی چیز کا مشاہدہ نہ کرلیں اسے تسلیم نہیں کرسکتے' جیسا کہ انہوں نے خدا پر ایمان لا۔ کے بارے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: "لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" (ہم تیرے کہنے پر ہرگ ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ خدا کو اپنی آنکھوں سے ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں)' حقیقت امر یہ ہے کہ وہ اس غلط و نادرست طرز تفکر کا شکار اس لیے ہو گئے کہ وہ تمام امور میں اپنی مستقل حیثیت کے قائل تھے اور ہر مسئلے میں اپنی آراء کو حرف آخر سمجھے ہوئے نظریہ قائم کرنے کے عادی تھے اور ہر مربوط و نامربوط امر کی بابت اظہار خیال کرتے اور رائے قائم کر لیتے تھے چنانچ وہ محسوسات و معقولات کے درمیان فرق نہ کرتے ہوئے ان کے احکام و اوصاف کی تطبیق میں غلطی کے مرتکب ہو جاتے تھ اس کے نتیجے میں انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ظاہر بظاہر دیکھے جاسکنے والے خدا کا مطالبہ کیا اور کہا:

سورہ اعراف، آیت ۱۳۸:

"يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۚ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ"

(اے موسیٰ! ہمارے لیے ایسا خدا بنا جیسے اور لوگوں کے خدا ہیں' موسیٰ نے کہا تم لوگ جاہل و نادان ہو.. جہالت میں ہی رہنا چاہتے ہو)۔

وہ لوگ اپنے نبی کو اپنے ہی جیسا سمجھتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ وہ ان کی طرح ہوس پرست' فضول گو او شیخیاں مارنے والا ہے' چنانچہ انہوں نے اپنے نبی (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کو استہزاء و مذاق اڑانے' مزاح کرنے' نادانی بیوقوفی اور جہالت کی نسبت دینے سے بھی دریغ نہیں کیا اور کہا کہ "آیا تو ہم سے مزاح کرتا ہے' ہمارا مذاق اڑاتا ہے؟"۔

بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے اس الزام اور غلط نسبت کے جواب میں یہ کہنا پڑا: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ" (میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ خدا کی پناہ طلب کی اس سے کہ انہیں جاہلوں میں شمار کیا جائے' یہ نہیں کہا کہ: میں جاہل نہیں" کیونکہ آنجناب نے جاہلوں میں سے شمار نہ کئے جانے کے لیے خدا کی عصمت و پناہ کا سہارا لیا کہ جس میں کسی طرح کی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی (جو خدا کی پن میں ہو وہ کبھی گمراہ نہیں ہوسکتا' جہالت کی تاریکی میں نہیں گرسکتا) جبکہ مخلوق کی حکمت و دانائی میں تبدیلیوں کے امکانات پا۔ جاتے ہیں (علم پر عمل نہ کرنے کی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں)۔

بنی اسرائیل اس بات کے معتقد تھے کہ "کوئی بات دلیل کے بغیر تسلیم نہیں کی جاسکتی"۔ اگرچہ یہ نظریہ صحیح و درست ہے اور اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں لیکن وہ اس اصول کی بنیاد پر جس غلط فہمی کا شکار ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے گمان کرلیا ک انسان کو ہر چیز کی تفصیلی دلیل سے اچھی طرح آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے اور اجمالی بیان کافی نہیں' اسی وجہ سے انہوں۔ گائے کے اوصاف و نشانیوں کی تفصیلات بیان کرنے کا مطالبہ کیا کیونکہ ان کی نظر میں یہ تھا کہ "گائے میں کسی کو زندہ کرنے ک

صلاحیت ہی نہیں پائی جاتی اور اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ گائے ایسا کر سکتی ہے تو وہ عام گائے نہیں ہو سکتی بلکہ کوئی خاص قسم کی گائے ہوگی کہ جس کی پہچان کے لیے اس کے مکمل اوصاف اور نشانیوں سے آگاہ ہونا ضروری ہے''۔ اس لیے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ہمارے لیے اپنے پروردگار سے کہو کہ وہ ہمیں گائے کے بارے میں واضح طور پر بتائے کہ وہ کیسی ہے؟ ان کا اس طرح اپنے آپ کو تنگی وسختی میں ڈالنا اور بلاوجہ پریشانی میں مبتلا کرنا اس بات کا سبب بنا کہ خدا نے بھی ان پر سختی کی' لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے سوال کے جواب میں فرمایا: خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے بہت بوڑھی نہ ہو یعنی اتنی سن رسیدہ نہ ہو کہ بچہ نہ دے سکے اور نہ ہی نوجوان کہ جس نے ابھی تک بچہ ہی نہ دیا ہو' بلکہ ان کے درمیان میں ہو (درمیانی عمر کی ہو)... قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ...،

عربی زبان ''عوان'' عورتوں اور مادہ چوپایوں میں سے اسے کہتے ہیں جو درمیانی عمر میں ہو یعنی باکرہ پن اور بوڑھاپے کے درمیانی سن میں ہو۔

اس کے بعد خداوند عالم نے ان پر رحم فرماتے ہوئے انہیں نصیحت کی کہ گائے کے بارے میں زیادہ سوالات نہ کریں اور اپنے آپ کو تنگی و پریشانی میں مبتلا نہ کریں بلکہ جو نشانیاں بتائی گئی ہیں انہیں کافی سمجھتے ہوئے جو حکم انہیں دیا گیا ہے اس پر عمل کریں چنانچہ ارشاد ہوا:

''فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ'' (پس جو حکم تمہیں دیا گیا ہے اس پر عمل کرو)۔

لیکن وہ اپنی بدباطنی کے اظہار سے باز نہ آئے اور خدا کی نصیحت پر کان نہ دھرتے ہوئے دوبارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے:

''ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ''

(اپنے پروردگار سے کہو وہ ہمیں وضاحت کے ساتھ بتائے کہ اس گائے کا رنگ کیسا ہے؟ موسیٰؑ نے کہا: خدا فرماتا ہے اس کا رنگ گہرا چمکدار زرد ہے جو دیکھنے والوں کو خوش کر دیتا ہے)۔

اس بیان سے گائے کے تمام اوصاف اور نشانیاں واضح ہو گئی تھیں اور معلوم ہو گیا تھا کہ وہ گائے کیسی ہے اور اس کا رنگ کیسا ہے' لیکن اس کے باوجود بنی اسرائیل مطمئن نہ ہوئے اور اپنی ڈھٹائی پر قائم رہے' چنانچہ کسی شرم وحیا کے بغیر دوبارہ حضرت موسیٰؑ سے اپنی پہلی باتیں دھرانے لگے اور کہا:

''ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ''

(اپنے پروردگار سے کہو کہ وہ ہمیں گائے کی مزید پہچان کروائے کہ وہ کس طرح کی ہے کیونکہ ہم ابھی تک اسے اچھی طرح پہچان نہیں سکے اور ہم انشاء اللہ ضرور ہدایت پالیں گے)۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بار پھر ان کے جواب میں گائے کی مزید نشانیاں اور اس کا رنگ بتایا اور اس

طرح ارشاد فرمایا:

"اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ فِیْهَا"

(خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے اتنی کمزور نہ ہو کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی سینچے صحیح و سالم...... تندرست...... اور صاف ستھری و بے داغ ہو)۔

پس جب گائے کی تمام نشانیاں مکمل طور پر بیان ہو گئیں اور اب ان کے پاس کرنے کی کوئی بات نہ رہی اور مزید کچھ پوچھنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ کہ جس سے بہانہ جوئی کی راہ ہموار ہو سکے...... تو انہوں نے کہا:

"اَلْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ" کہ اب آپ نے صحیح بات کی ہے

ان کا یہ کہنا اس شخص کی مانند تھا جو نہایت ٹھوس دلائل کے سامنے بے بس ہو کر حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کسی صورت میں اس کا انکار نہیں کر سکتا تو خواہ و ناخواہ حق و حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور پھر اسے کسی طرح سے لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی جبکہ وہ دل سے اسے تسلیم نہیں کرتا بلکہ مضبوط دلائل کے سامنے عاجز و بے بس ہو کر اعتراف کر لیتا ہے۔ بنی اسرائیل کے بے بس ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے گائے کو ذبح کرنے کی دلیل آیت کا آخری جملہ ہے:

"فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ"

(انہوں نے گائے کو ذبح تو کیا لیکن وہ ایسا کرنے والے نہ تھے)

اس جملے میں ان کے باطن اور دل کے حال کی خبر دی گئی ہے جو کہ ان کی طرف سے بار بار سوالات کرنے سے ظاہر تھا، گویا وہ اپنی تمام تر ڈھٹائی کے باوجود حق کو تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکے اور اس کا انکار کرنے کی کوئی صورت ان کے لیے باقی نہ رہی لہٰذا انہوں نے گائے کو ذبح کیا۔

بنی اسرائیل کا قتل کی بابت تنازع

○ "وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا..."

اس آیت سے اصل واقعہ کے تذکرے کا آغاز ہوتا ہے، خدا نے فرمایا: "جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا پھر اس کے...... قاتل کے...... بارے میں آپس میں الجھ گئے......" عربی زبان میں "تدارء" کا معنی جھگڑے و تنازعہ میں بات کو ایک دوسرے پر ڈال دینا ہے (ایک دوسرے پر الزام تراشی کرنا)۔ لغت میں اس کی لفظی اصل "دریٰ" ہے جس کا معنی دفع کرنا اور دور پھینکنا ہے، اس مقام پر آیت مبارکہ میں "فَادّٰرَءْتُمْ" کا صیغہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور ان میں سے ہر گروہ اس قتل کا الزام اپنے سے دور کر کے دوسرے پر لگا رہا تھا، یعنی اپنے آپ کو بری

الذمہ قرار دے کر دوسروں کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا' لہٰذا خدا نے فرمایا کہ "تم آپس میں الجھ پڑے"، یعنی ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے لگے' تو خدا نے چاہا کہ حقیقت امر کا اظہار ہو اور جس بات کو وہ چھپا رہے تھے وہ آشکار ہو ' (وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ) خدا اس امر کو ظاہر کرنے والا ہے جسے تم چھپا رہے ہو۔

قاتل کا سراغ لگانے کا طریقہ

○ "فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا..."

"اضربوہ" میں ضمیر (ہ) کی بازگشت "وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا" میں مذکور "نفس" کی طرف ہوتی ہے۔

اس مقام پر ایک ادبی سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ عربی زبان میں لفظ "نفس" مونث ہے تو اس کے لیے ضمیر مذکر (ہ) کیوں ذکر کی گئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "نفس" سے مراد مقتول ..... قتیل ..... ہے جو کہ مذکر ہے' اس لیے لفظ "نفس" سے مرادی معنے کی بنیاد پر ضمیر کو مذکر ذکر کیا گیا ہے۔

اور "بِبَعْضِهَا" میں ضمیر (ھا) کی بازگشت "بقرۃ" کی طرف ہے' اس آیت کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس واقعہ کے تذکرے کا اصل مقصد ایک شرعی حکم کے اصول کو بیان کرنا ہے (ایک قانون کی تدوین کے پس منظر کا تذکرہ) تاکہ اس کی تطبیق تورات میں مذکورہ حکم پر کی جا سکے... تورات میں مذکور حکم کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ..... اور وہ یہ کہ اس اصول کی بنیاد پر قاتل کا سراغ لگایا جا سکتا ہے تاکہ قتل جیسے غیر انسانی فعل کا ارتکاب کرنے والے کی شناخت ہو سکے اور واقعہ کے اصل پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہو' جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں قصاص کے بارے میں ارشاد فرمایا: سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۹:

"وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ" (تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے)

لہٰذا گائے کو ذبح کر کے مقتول کو اس کے ساتھ مس کرنے سے مقتول کا زندہ ہو جانا معجزہ کے طور پر ہرگز نہیں تھا۔

لیکن آپ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ سیاق کلام بالخصوص آیت "فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى" ..... پس ہم نے کہا کہ اس (مقتول) کو اس گائے کے جسم سے مس کرو' اسی طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے ..... کے الفاظ سے مذکورہ قول کی نفی ہوتی ہے۔

بنی اسرائیل کی سنگدلی کا تذکرہ

○ "ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً"

(پھر تمہارے دل سخت ہو گئے پتھر کی طرح یا اس سے بھی زیادہ سخت)۔

دل میں "قسوت" سے مراد پتھر جیسی سختی ہے' اس آیت میں لفظ "او" (جس کا ترجمہ "یا" کیا جاتا ہے) "بل"......بلکہ......کے معنے میں ذکر ہوا ہے (کیونکہ یہ مقام ہی "بلکہ" کے استعمال کا ہے)۔

اس آیت میں خداوند عالم نے بنی اسرائیل کے دلوں کی سختی (ان کے سنگدل ہونے) کو بیان کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: "وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ" (کچھ پتھر ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے نہریں پھوٹ پڑتی ہیں) اس میں پتھر اور پانی کا تقابلی تذکرہ نہایت خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے کیونکہ عام طور پر سخت چیز کو پتھر کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے جبکہ نرم چیز کی مثال پانی سے دی جاتی ہے گویا خداوند عالم نے بنی اسرائیل کی سنگدلی اور قساوت قلب' بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ پتھر کی تمام تر سختی کے باوجود جب اسے توڑا جائے تو اس سے پانی کی نہریں جاری ہوتی ہیں جبکہ پانی کی نرمی اور پتھر کی سختی دو مدمقابل چیزیں ہیں تاہم ان کے درمیان بھی کسی قدر قرب پایا جاتا ہے لیکن بنی اسرائیل کے دل اس قدر سخت ہیں کہ ان میں حق سے قرب کی کوئی صورت اور کسی حق بات اور حقیقی کمال سے ہم آہنگ ہونے کی کیفیت ہی نہیں پائی جاتی' (ان کے دل حق سے اس قدر دور ہیں کہ وہ کوئی حق بات تسلیم ہی نہیں کرتے)۔

خشیت الٰہی کا حوالہ

○ "وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ"

(اور کچھ پتھر ایسے ہیں جو خوف الٰہی سے گر پڑتے ہیں)

اس آیت مبارکہ میں پتھروں کے گرنے کا سبب خشیت وخوف الٰہی ذکر کیا گیا۔

"ہبوط" یعنی پتھروں کے گر پڑنے سے مراد چٹانوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں کا ریزہ ریزہ ہونا ہے کہ جو زلزلوں کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتے ہیں اور سخت سردیوں کے بعد موسم بہار میں برف کے تودے پگھل کر پانی بن کر بہہ جاتے ہیں' خداوند عالم نے ان کے اپنے طبیعی اسباب کی وجہ سے اس طرح گر پڑنے کو خشیت وخوف الٰہی کے سبب گرنے سے تعبیر کیا ہے کیونکہ وہی تمام اسباب کا منتہا ہے (سب اسباب اسی کے ایجاد کردہ اور اسی کی قدرت واختیار میں ہیں) لہٰذا پتھروں کا ان مخصوص اسباب سے گر پڑنا درحقیقت ان کا خدا کے امر وحکم کی عملی اطاعت سے عبارت ہے کیونکہ ان میں تکوینی وتخلیقی طور پر اپنے پروردگار کے احکامات کو سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے اور ان کا تخلیقی شعور ہی اس امر کا سبب بنتا ہے کہ وہ خدا کے فرمان سے ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑتے ہیں' ان کے اس تخلیقی شعور کا ذکر خداوند عالم نے اس طرح فرمایا:

سورہ اسریٰ، آیت ۴۴:

"وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ"

(کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بجا نہ لاتی ہو لیکن تم ان کے تسبیح کرنے کو نہیں سمجھ سکتے)

سورہ بقرہ، آیت ۱۱۶:

"كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ" ...... سب اس کی عبادت میں مصروف ہیں۔

پس حکم الٰہی کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے اس کی عملی اطاعت (شعوری انفعال) کا نام ہی "خشیت الٰہی" ہے کہ جس کے سبب پتھر گر پڑتے ہیں لہٰذا زیر بحث آیت شریفہ درج ذیل آیات کے مانند ہے:

سورہ رعد، آیت ۱۳:

★ "وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ"۔

(اور بجلی کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے اور فرشتے خوف الٰہی سے اس کی تسبیح کرتے ہیں)

سورہ رعد، آیت ۱۵:

★ "وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ"۔

(آسمانوں اور زمین میں رہنے والے سب لوگ چاہتے ہوئے اور نہ چاہتے ہوئے دونوں صورتوں میں خدا کے لیے سجدہ کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے سائے بھی صبح و شام بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوتے ہیں)۔

ان آیتوں میں آسمانی بجلی کے کڑکنے کی آواز کو حمد الٰہی کے ساتھ تسبیح کرنے کا نام دیا گیا ہے اور سایوں کو خدا کے حضور سجدہ ریز کہا گیا ہے اسی طرح دیگر آیات میں بھی تجزیہ و تحلیل کے ساتھ اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ زیر بحث آیت مبارکہ کا جملہ "وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ . . ." بنی اسرائیل کی سنگدلی کی بابت دوسرا بیان ہے جو اس امر کو ثابت کر رہا ہے کہ ان کے دل پتھر بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہیں کیونکہ پتھروں میں خشیت و خوف الٰہی پایا جاتا ہے اور وہ خوف خدا سے گر پڑتے ہیں لیکن ان لوگوں کے دلوں میں خشیت و خوف الٰہی نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔

روایات پر ایک نظر

قلبی و بدنی قوتوں سے استفادہ

کتاب المحاسن (برقی) میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے "خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰ بِقُوَّةٍ۔۔۔" کی تفسیر میں ایک شخص کے سوال پر کہ اس آیت میں بدنی قوت مراد ہے یا قلبی (دل کی قوت)؟ فرمایا: دو قوتیں مراد ہیں۔

اس روایت کو تفسیر العیاشی میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

حلبی کی روایت

تفسیر العیاشی میں حلبی سے روایت کی گئی ہے کہ "وَّاذْكُرُوْا مَافِيْهِ" کی تفسیر میں انہوں نے کہا: اس کا مطلب ہے کہ جو احکام اس میں ہیں اور ان احکام کے ترک کرنے پر جو سزا مقرر کی گئی ہے اس کو یاد کرو۔

یاد رہے کہ جملہ: "وَّاذْكُرُوْا مَافِيْهِ" میں جس اہم مطلب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس کا اشارہ "وَرَفَ فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا۔۔۔" میں بھی ملتا ہے۔

ایک حدیث نبویؐ

تفسیر "درمنثور" میں ابوہریرہ سے منقول ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر ب اسرائیل گائے کے ذبح کرنے کی بابت یہ نہ کہتے کہ "ہم انشاء اللہ ضرور ہدایت پالیں گے" (وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ ا لَمُهْتَدُوْنَ) تو وہ کبھی ہدایت نہ پا سکتے' اور اگر وہ شروع ہی میں ایسا کر لیتے کہ جو گائے بھی میسر آتی اسے ذبح کر دیتے تو کی طرف سے وہ عمل قابل قبول ہوتا لیکن انہوں نے بار بار سوالات کر کے اپنے آپ کو سختی و پریشانی میں ڈال دیا لہٰذا خدا بھی ان پر سختی کی۔

بنی اسرائیل کے بیجا سوالات کا نتیجہ

تفسیر قمی میں ابن فضال سے منقول ہے کہ میں نے حضرت امام ابوالحسن علیہ السلام سے سنا آنجناب ؑ نے فرمایا: ''خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا کیونکہ انہیں اس گائے کی دم کی ضرورت تھی (تا کہ اسے مقتول کے ساتھ مس کر کے قاتل کی پہچان کر سکیں) تاہم ان کی طرف سے بیجا سوالات کی وجہ سے خدا نے ان پر سختی کی۔

قتل کے واقعہ کا تذکرہ

کتاب معانی الاخبار اور تفسیر العیاشی میں مذکور ہے کہ بزنطی نے کہا: میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے سنا ہے آنجناب ؑ نے ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل کے ایک شخص نے اپنے ایک رشتہ دار کو قتل کر کے اس کی لاش بنی اسرائیل کے ایک نامور قبیلہ کے راستہ میں پھینک دی اور پھر خود ہی اس کے مقدمے کا مدعی بن گیا' لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ فلاں قبیلہ کے لوگوں نے فلاں شخص کو قتل کر دیا ہے آپ ہمیں اس کے قاتل کے بارے میں بتائیں! حضرت موسیٰ ؑ نے فرمایا: ایک گائے میرے پاس لے آؤ تا کہ میں تمہیں قاتل کی پہچان کرواسکوں' انہوں نے کہا: آیا آپ ہمارے ساتھ مزاح کر رہے ہیں۔ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں؟ حضرت موسیٰ ؑ نے جواب دیا: ''میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں''!۔ اگر وہ لوگ حضرت موسیٰ ؑ کے کہنے پر گائے لے آتے تو بات ختم ہو جاتی اور ان کی پریشانی دور ہو جاتی مگر انہوں نے خود اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا کر دیا اور گائے کے بارے میں اتنے سوالات کئے کہ گائے کی پہچان میں دشواری کا شکار ہو گئے لہٰذا خدا نے بھی ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا' انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا: ''ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ''؟ اپنے پروردگار سے کہو وہ ہمیں واضح طور پر بتائے کہ وہ گائے کیا ہو (کیسی ہو)؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا خدا فرماتا ہے: ''إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ '' کہ وہ گائے نہ بہت بڑی ہو اور نہ بہت چھوٹی بلکہ درمیانی عمر کی ہو' اپنے اس سوال سے انہوں نے اپنے لیے پریشانی مول لے لی' ورنہ اگر کوئی ایک گائے لے آتے تو بات پوری ہو جاتی' لیکن انہوں نے سختی کی تو خدا نے بھی ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا' چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ ؑ سے کہا: ''ادع لنا ربک یبین لنا ما لونھا'' کہ اپنے پروردگار سے کہو وہ ہمیں واضح طور پر بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: خدا فرماتا ہے: ''إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ '' کہ اس گائے کا رنگ گہرا چمکدار زرد ہو کہ جو دیکھنے والوں کو خوش کر دینے والا ہے۔ حالانکہ اگر وہ لوگ کوئی ایک گائے لے آتے تو بات پوری ہو جاتی لیکن انہوں نے سختی کی تو خدا نے بھی ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کر لیا' چنانچہ انہوں نے ایک بار پھر حضرت موسیٰ ؑ سے کہا: ''ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّآ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ '' کہ اپنے پروردگار سے کہو ہمیں

واضح طور پر بتائے کہ وہ گائے کیسی ہے کیونکہ اس کے بارے میں ہم اشتباہ میں مبتلا ہو گئے ہیں اگر خدا نے چاہا تو ہم ضرور ہدایت پالیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا خدا فرماتا ہے: "اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا" کہ وہ گائے اتنی لاغر و کمزور نہ ہو کہ نہ زمین جوتے اور نہ ہی کھیتی سینچے، صحیح سالم...... تندرست...... اور صاف ستھری و بے داغ ہو، حضرت موسیٰ کا یہ جواب سن کر انہوں نے کہا: "اَلْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ" اب آپ نے صحیح بات کی ہے، اس کے بعد انہوں نے اس گائے کی تلاش شروع کر دی، ان تمام اوصاف و نشانیوں کی حامل گائے بنی اسرائیل کے ایک نوجوان کے پاس تھی، انہوں نے اس نوجوان سے اس گائے کی قیمت پوچھی تو اس نے کہا: اس کی قیمت سونے کی بھری ہوئی مشک ہے، وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور انہیں گائے کی مطلوبہ قیمت کے بارے میں بتایا، حضرت موسیٰ علیہ اسلام نے فرمایا: اسے خرید لو! چنانچہ انہوں نے وہ گائے خریدی اور اسے لے آئے۔ حضرت موسیٰ نے حکم دیا کہ اسے ذبح کریں، پھر حکم دیا کہ مقتول کو اس کی دم کے ساتھ مس کریں، انہوں نے گائے کو ذبح کیا اور مقتول کو اس کی دم سے مس کیا تو وہ زندہ ہو گیا اور بول اٹھا کہ اے رسول خدا! مجھے میرے چچازاد بھائی نے قتل کیا تھا، نہ کہ ان لوگوں نے کہ جن پر قتل کا الزام لگایا جا رہا ہے، پس اس طرح قاتل کی پہچان ہو گئی، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب میں سے ایک شخص نے حضرت موسیٰ سے کہا: اس گائے سے مربوط ایک واقعہ بھی ہے! حضرت موسیٰ نے پوچھا وہ کیا واقعہ ہے؟ اس نے کہا: اس کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک نوجوان اپنے باپ کا بیحد احترام کرتا تھا اور اس کے ساتھ نہایت نیک سلوک کرتا تھا، ایک دن اس نے خرید و فروخت میں ایک معاملہ طے کیا اور اس کی بابت رقم لینے کے لیے اپنے باپ کے پاس آیا، اس وقت اس کا باپ سو رہا تھا اور صندوق کی چابیاں اس کے سرہانے کے نیچے تھیں، بیٹے نے سوچا کہ باپ کو بیدار کرے لیکن باپ کی بے آرامی کا سوچ کر اس نے اس معاملے کو انجام دینے کا ارادہ ترک کر دیا، جب اس کا باپ بیدار ہوا تو اس نے سارا حال اسے سنایا، بیٹے کی نیک نیتی اور حسن سلوک کے پیش نظر باپ بہت خوش ہوا اور بیٹے کو دعائیں دیں اور گائے اسے دی اور کہا کہ یہ اس نفع کے بدلے میں انعام کے طور پر تجھے دیتا ہوں جو تیرے ہاتھ سے چلا گیا ہے، یہ واقعہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص سے کہا غور کرو کہ نیکی کرنے کا صلہ کتنا زیادہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا روایات کو غور سے پڑھیں تو آپ کو اس بات سے آگاہی حاصل ہو گی کہ یہ سب انہی مطالب کے اجمالی بیان پر مشتمل ہیں جو ہم نے آیات کریمہ سے سمجھے۔

ایک فلسفیانہ بحث

اس سورہ مبارکہ...... بقرہ...... میں بنی اسرائیل کے واقعات اور دوسری اقوام کے حالات کے بیان میں متعدد معجزات ذکر کیے گئے ہیں، مثلاً:

(۱)...... دریا کا چیرنا اور آل فرعون کو اس میں غرق کرنا۔

آیت: "وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ . . ." ۔

(جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو چیرا اور آل فرعون کو...... اس میں...... غرق کر دیا)۔

(۲)...... بنی اسرائیل پر آسمانی بجلی کا گرنا اور انہیں دوبارہ زندہ کرنا۔

آیت: "وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ . . ." ۔

(جب تم نے کہا: اے موسیٰ ہم تیرے کہنے پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ خدا کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں، پھر تم پر آسمانی بجلی آ گری......)

(۳)...... بنی اسرائیل پر بادلوں سے سایہ کرنا اور من وسلویٰ (مخصوص طعام) ان کے لیے بھیجنا۔

آیت: "وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى . . ."

(اور ہم نے تم پر بادلوں سے سایہ کر دیا اور تمہارے لیے من وسلویٰ بھیجا)۔

(۴)...... پتھر سے چشموں کا پھوٹنا۔

آیت: "وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا"

(جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا (بارش کی دعا کی) تو ہم نے کہا اپنا عصا پتھر پر مارو ... موسیٰ نے عصا پتھر پر مارا...... تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے)۔

(۵)...... کوہ طور کا بنی اسرائیل کے سروں پر آویزاں کر دینا۔

آیت: "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ"

(ہم نے تم پر طور کو آویزاں کر دیا)۔

(۶)...... بنی اسرائیل میں سے بعض افراد کا مسخ ہونا۔

آیت: "فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ"

(پھر ہم نے ان سے کہا تم دھتکارے ہوئے...... بے قدر و قیمت...... بندر ہو جاؤ)

(۷)......گائے کی دم سے مس کرنے سے مقتول کا زندہ کرنا۔

آیت: "فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا"

(پھر ہم نے کہا کہ مقتول کو گائے کے ساتھ مس کرو)۔

(۸)......دیگر اقوام کو زندہ کرنا۔

آیت: "أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ..."

(آیا تو نے انہیں نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے نکلے......)

(۹)......اس شخص کا زندہ کرنا جو تباہ شدہ بستی سے گزرا۔

آیت: "أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا..."

(یا اس شخص کی طرح جو اس بستی سے گزرا جو الٹی پڑی تھی)

(۱۰)......ابراہیمؑ کے ہاتھ پر ذبح شدہ پرندے کا زندہ کرنا۔

آیت: "وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ..."

(جب ابراہیم نے کہا: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے)۔

مذکورہ بالا معجزات اور خارق العادت امور میں سے اکثر بنی اسرائیل میں رونما ہوئے اور ان سب کو قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے' ہم نے سابقہ بیانات میں اس بات کو واضح طور پر ذکر کیا ہے کہ عقلی طور پر معجزہ کا وقوع پذیر ہونا ممکن ہے اور خارق العادت امور کا وجود میں آنا ناممکن نہیں' اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ معجزہ اپنے معجزہ اور خارق العادت امر ہونے کے حوالے سے علت و معلول کے کلی اصول کے منافی بھی نہیں اور نہ ہی اس سے متصادم ہے۔

ہمارے سابقہ بیانات سے یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ جن آیات میں معجزہ کے وقوع پذیر ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کی تاویل و توجیہ کرنا بلا جواز ہے اور آیات کو ان کے ظواہر سے پھیر دینا اس وقت تک درست قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ ان سے مربوط واقعات کا عقلی طور پر ناممکن ہونا ثابت نہ ہو' لہٰذا جن واقعات کا وقوع پذیر ہونا عقلی طور پر ممکن ہو ان کے تذکرے پر مشتمل آیات کی توجیہ و تاویل اور ان کے ظاہری معانی کے علاوہ کوئی معنی کرنا بلا جواز ہے' البتہ وہ امور جن کا وقوع عقلی طور پر ممکن نہیں جیسے تین کے عدد کا دو برابر اعداد میں تقسیم کرنا' اور اسی طرح کسی ایسے بچے کا تولد جو خود اپنا باپ بھی ہو تو اس طرح کے امور کے وجود میں آنے اور وقوع پذیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ عقلی طور پر ناممکن ہیں (لہٰذا انہیں خارق العادت امور کے باب میں مورد بحث قرار دینا درست نہیں)۔

تاہم مذکورہ بالا معجزات میں سے دو معجزوں کو مستقل طور پر زیر بحث لایا جاسکتا ہے: ایک مردوں کو زندہ کرنا اور دوسرا لوگوں کا مسخ ہونا' ان دو معجزوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ بات اپنے مقام پر ثابت ہو چکی ہے کہ ہر وہ چیز (موجود) جو کمال کی قوت و استعداد اور فعلیت کی حامل ہو جب قوت و استعداد کے مرحلہ سے فعلیت کے مرحلہ تک پہنچ جائے تو اس کا دوبارہ قوت کے مرحلہ میں واپس جانا محال و ناممکن ہے' اسی طرح جو چیز اپنے وجود میں کمال کے بلند مرتبہ تک پہنچ چکی ہو اس کا اپنے سفر کمال میں وجود کے لحاظ سے اپنے سے کمتر چیز میں بدل جانا جبکہ اس کی اپنی پہلی حیثیت بھی باقی ہو ممکن نہیں' پس انسان جب مر جاتا ہے تو اس کا نفس مادہ سے جدا اور خالی ہو جاتا ہے اور وہ ایک مجرد مثالی یا عقلی (موجود) چیز بن جاتا ہے' جبکہ مثالی اور عقلی ہونے کا درجہ، مادی ہونے کے درجے سے یقیناً بلند ہے اور ان دونوں میں مادی ہونے کے درجے کی نسبت زیادہ قوی وجود پایا جاتا ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ نفس کمال کی ان بلندیوں تک پہنچنے کے باوجود اپنی موت کے بعد دوبارہ مادہ کی پستی میں گر جائے' ورنہ یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ ایک چیز قوت و استعداد سے فعلیت میں آنے کے بعد دوبارہ قوت کے مرحلہ میں چلی جائے جو کہ محال و ناممکن ہے' اور انسان کہ جو اپنے وجود میں دوسرے تمام حیوانات سے قوی اور کمال کے بلند مرتبہ کا حامل ہے اس کے لیے یہ بات ممکن ہی نہیں کہ مسخ ہو کر دوسرے حیوانوں کے پست و ناقص درجے میں آ جائے۔ (انسان سے حیوان بن جائے)!

یہ وہ اعتراض ہے جو مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے اور انسانوں کے مسخ ہو کر حیوان بن جانے پر کیا گیا ہے' لیکن یہ درست نہیں' اس کی وضاحت کے لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ بات درست ہے کہ جو چیز قوت و استعداد کے مرحلہ سے نکل کر فعلیت کے مرحلہ میں آ جائے اس کا دوبارہ قوت کے مرحلہ میں واپس جانا ناممکن و محال ہے' اس میں کسی کو کلام ہی نہیں لیکن مردوں کا دوبارہ زندگی پا کر فی الجملہ دنیاوی حیات سے بہرہ ور ہونا اور اسی طرح انسان کا مسخ ہو کر حیوان بن جانا اس محال و ناممکن امر کے زمرے میں نہیں آتا' اس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ حس و برہان اور تجربات و دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ جب نباتات میں سے کوئی مادی جوہر، ترقی و کمال کے مراحل طے کرتا ہوا حیوان بننے کی راہ پر پہنچتا ہے تو اس راہ میں اس کے سفر کمال کی آخری منزل حیوان ہو جانا ہوتا ہے اور اس حیوانی صورت میں آ جاتا ہے جو برزخ کے تجرد کی حامل ہوتی ہے کہ جو حقیقت میں کسی کے اپنے آپ کے ادراک سے عبارت ہے البتہ یہ ادراک جزئی و معمولی اور خیال و تصور کی حدود سے باہر نہیں' اور یہ صورت نباتی جوہر کا کامل وجود ہے اور اس میں پائی جانے والی قوت و استعداد کا جوہری حرکت کے ذریعے کمال تک پہنچنا ہی اس کی ''فعلیت'' کا دوسرا نام ہے' لہٰذا قوت کے مرحلے سے فعلیت کے مرحلے میں داخل ہو جانے کے بعد دوبارہ قوت و استعداد کے مرحلے میں لوٹ جانا ہرگز ممکن نہیں' (یعنی گھاس میں پائی جانے والی قوت و استعداد، حصول کمال کی منزلوں سے گزرتی ہوئی فعلیت اختیار کر کے حیوان کی صورت میں آ جائے تو اس کا دوبارہ گھاس (نبات) کی سابقہ قوت میں پلٹ جانا محال ہے) البتہ ایسا ہونا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب وہ حیوانی مادہ سے محروم ہو جائے اور مادہ اپنی اصل ...... مادی...... صورت میں قرار پا لے مثلاً حیوان مر جائے اور ایک بے جان جسم ہو جائے ...... کہ جس میں کوئی حرکت ہی نہیں ہوتی ......،

دوسری بات یہ کہ حیوانی صورت ہی ان تمام افعال کے صادر ہونے کا مبداء وسرچشمہ ہے جو شعور وادراک کے ذریعے اس سے سرزد ہوتے ہیں اور پھر ان افعال پر علمی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں اور یہ علمی کیفیتیں ہی ہیں جو لوح نفس پر ثبت ہوجاتی ہیں اور ان افعال کے بار بار انجام پذیر ہونے اور پھر علمی کیفیتوں کے لوح نفس پر یکے بعد دیگرے ثبت ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان پائی جانے والی مماثلت ومشابہت کے سبب ایک ''ثابت'' وناقابل زوال صورت وجود میں آجاتی ہے جو کہ ٹھوس استعداد...... ملکہ ءراسخہ...... کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور ایک نئی ''نفسانی صورت'' بن جاتی ہے کہ جس سے حیوانی نفس کا تنوع ممکن ہوجاتا ہے' اس کے نتیجے میں اس امر کی راہ ہموار ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی تنوع پذیر طبع کے ساتھ ایک مخصوص صورت جیسے مکروفریب' بغض وکینہ' شہوت'' وفا' درندگی وغیرہ میں سے کسی کی حامل ہوجائے اور اس کے حوالہ سے وہ مخصوص نوع کے حیوان کی صورت اختیار کرلے۔ تاہم یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہوگا جب افعال کے بار بار سرزد ہونے اور ان پر علمی کیفیات واحوال کے مترتب ہونے کی وجہ سے ملکہ ءراسخہ حاصل ہوجائے' لیکن اگر یہ ملکہ ءراسخہ حاصل نہ ہوتو وہ ''حیوانی نفس'' اپنی سابقہ بے مایہ خالی حالت پر باقی رہے گا اور اس کی حیثیت نبات...... گھاس...... سے زیادہ نہ ہوگی کہ جو اپنی جوہری حرکت سے محروم ہوکر نباتات کے ایک فرد ہونے کی حالت میں باقی ہے اور اس میں پائی جانے والی حصول کمال کی قوت، فعلیت کے مرحلے تک نہیں پہنچے گی یعنی وہ نبات سے حیوان ہونے کے ارتقائی مرحلے میں داخل نہیں ہوگی بلکہ حصول کمال کی قوت کے ہوتے ہوئے نباتات ہی کے دائرے میں محدود رہے گی' اور اگر یہ برزخی نفس اپنے احوال وکیفیات اور افعال کے اثر سے حصول کمال کے مرحلوں کو طے کرتا رہتا تو یقینا بدن سے اس کا تعلق اس کے وجود کے ابتدائی مرحلے ہی میں منقطع ہوجاتا' لیکن بدن سے اس کے تعلق کا برقرار رہنا صرف اسی وجہ سے ہے کہ وہ ابھی ملکہ ءراسخہ..... ٹھوس استعداد.... میں تبدیل نہیں ہوا بلکہ اس کا حصول کمال کے سفر کو طے کرنا اس کے ان مادی افعال کے سبب سے ہے جو شعور وادراک کے ساتھ تدریجی طور پر مرحلہ بہ مرحلہ سرزد ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک خاص حیوان کی صورت اختیار کرلیتا ہے' اگر اسے طبیعی ع یا طبیعی عمر کے بھاری بھر کم (معتد بہ) حصہ کے درمیان موت ایسی چیز حائل ہوجائے تو وہ ایک سادہ حیوان سے زیادہ کسی حیثیت کا حامل نہ ہوگا اور کسی قسم کی نوعی صورت اختیار کئے بغیر ہی اس کا سفر حیات تمام ہوجائے گا' تاہم جب حیوان انسانیت کی راہ تک پہنچ جائے۔ انسان ہونے کے مرحلے میں داخل ہوجائے یا وادی ئ ''انسانیت'' میں قدم رکھ لے...... کہ جو اس وجود سے عبارت ہے جس کی ذات قابل تعقل ہے تو وہ اپنی ذات کو سمجھ سکتا ہے اور اپنے آپ کا ادراک کرسکتا ہے ایسا کہ تعقل جو مادہ' اس کے لوازم اور ہر طرح کے اندازہ ورنگ وغیرہ سے خالی وجدا ہے تو اس صورت میں وہ اپنی جوہری حرکت کے ساتھ ''مثال'' کی فعلیت (کہ جو قوت عقل سے عبارت ہے) کے دائرے سے باہر نکل کر تجرد عقلی کی فعلیت کی جانب جائے گا، یہاں تک کہ اسے ''بالفعل'' انسان کی صورت حاصل ہوجائے گی..... ''انسان'' بن جائے گا..... اور جب اس مرحلے تک پہنچ جائے تو پھر یہ بات محال وناممکن ہوگی کہ یہ فعلیت دوبارہ اپنی قوت میں پلٹ جائے کہ جو ''تجرد مثالی'' سے عبارت ہے جیسا کہ حیوان کی بابت ذکر ہوچکا ہے' اس کے علاوہ یہ کہ اس انسانی صورت میں آنے کے بعد اس کے کچھ افعال واحوال

ہیں جن کے بار بار انجام پذیر ہونے اور وجود میں آنے سے ایک نئی صورت وجود پذیر ہوجائے گی کہ جو انسانیت کی گونا گوں انواع کے وجود میں آنے کا سبب بنے گی جیسا کہ ہم نے حیوانیت کی انواع کے وجود میں آنے کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔

مذکورہ بالا بیانات ومطالب کی روشنی میں آپ اس امر سے آگاہ ہوئے کہ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ اس دنیا میں لوٹ آئے گا اور ایک بار پھر مادہ سے اس کا تعلق قائم ہوجائے گا خاص طور پر اسی مادہ سے کہ جس سے اس کا تعلق پہلے تھا تو ایسا ہونا اس بات کا سبب نہیں بنے گا کہ اس کے تجرد کی بنیاد ہی ختم ہوجائے کیونکہ وہ تجرد تو اسے مادہ سے تعلق قائم ہونے سے پہلے بھی حاصل تھا اور مادہ سے تعلق قائم ہونے کے دوران بھی' اور اب مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی حالت میں بھی وہی تجرد اسے حاصل رہے گا' البتہ موت کی وجہ سے صرف یہ تبدیلی آئے گی کہ جو آلات ووسائل، مادہ سے استفادہ کرنے اور اس سے مربوط امور کی انجام دہی کے لیے اسے حاصل تھے ان سے محروم ہوجائے گا اور کوئی فعل مادی انجام نہ دے پائے گا جیسا کہ کوئی صنعت کار اپنی صنعت کے ضروری آلات ووسائل کھو بیٹھتا ہے اور ان آلات سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنی صلاحیتوں سے استفادہ نہیں کرسکتا لیکن جونہی اسے وہ آلات ملیں وہ دوبارہ اپنی فنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے لگے گا بلکہ اپنی پہلی زندگی میں اپنی قوتوں وتوانائیوں سے بار بار استفادہ کرنے کے نتیجے میں جو کیفیتیں اور بھرپور صلاحیتیں حاصل کرچکا تھا ان میں مزید قوت وپختگی حاصل کرے گا اور مزید حصول کمال کی راہ پر گامزن ہوجائے گا، نہ یہ کہ ترقی کی بجائے تنزلی کرتے ہوئے دوبارہ پیچھے کی طرف لوٹ جائے گا یعنی ایسا نہیں کہ کمال سے نقص اور فعلیت سے قوت کی طرف پلٹ جائے گا۔

اگر اس مقام پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مذکورہ بالا نظریہ دائمی محرومیت کے عقیدے کی راہ ہموار کرتا ہے جبکہ اس کا غلط ونادرست ہونا ایک نہایت واضح ونا قابل انکار امر ہے' کیونکہ وہ نفس مجرد کہ جس کا تعلق بدن سے منقطع ہوچکا ہو اگر پھر بھی اس کی طبع میں اس بات کا امکان پایا جائے کہ مادہ سے دوبارہ تعلق قائم ہوجانے کی وجہ سے اور اس سے مادی افعال سرزد ہونے کے نتیجے میں ایک بار پھر حصول کمال کی راہ پر گامزن ہوجائے تو اس سے یہ بات ثابت ہوگی کہ کمال سے ہمیشہ کی محرومی اس کے طبعی تقاضوں سے محرومی سے عبارت ہے اور وہ ہمیشہ اپنے طبعی تقاضوں کی تکمیل اور طبعی صلاحیتوں سے استفادہ سے محروم ہے کیونکہ یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ مرنے کے بعد ہر شخص معجزہ کے ذریعے اور غیر معمولی طور پر دوبارہ دنیا میں واپس نہیں آئے گا' اور یہ دائمی محرومیت ہی ہے جسے اصطلاحی طور پر ''قسر دائم'' کہا جاتا ہے جس کے متعلق ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ ناممکن ہے۔

اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ یہ نفوس جو دنیا میں ''قوت'' کے مرحلہ سے نکل کر ''فعلیت'' کے مرحلہ میں داخل ہوئے اور ''فعلیت'' کی ایک حد تک پہنچ کر انہیں موت نے آلیا تو وہ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے حصول کمال کے امکان کے حامل نہیں بلکہ اپنی موجودہ ''فعلیت'' ہی پر باقی ہیں' یا پھر یہ کہ اس...... فعلیت...... سے نکل کر اپنی مناسب وموزوں صورت عقلیہ کے حامل ہیں اور اسی پر باقی رہیں گے' اور پھر اس کے بعد حصول کمال کا امکان ختم ہوجائے گا' لہٰذا جو شخص اس

دنیا سے چلا جائے (مرجائے) جبکہ اس نے اس دنیا میں رہ کر کچھ نیک و بداعمال بھی انجام دیئے ہوں اگر وہ مزید کچھ عرصہ زندہ رہتا تو اس بات کا امکان تھا کہ وہ اپنی لوح نفس پر نیک یا بد صورت ثبت کر لیتا اور اسی طرح اگر مرنے کے بعد دوبارہ اس دنیا میں لوٹ آئے اور کچھ عرصہ زندہ رہے پھر بھی یہ بات ممکن ہوگی کہ وہ اپنی پہلی صورت کے ساتھ ساتھ ایک خاص نئی صورت حاصل کر لے لیکن اگر مرنے کے بعد اس دنیا میں واپس نہ آئے تو عالم برزخ میں اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائے گا یہاں تک کہ اسے اس کی سابقہ مثالی صورت کے مناسب عقلی صورت حاصل ہو جائے گی اور حصول کمال کا مذکورہ امکان ختم ہو جائے گا اور صرف عقلی کمالات کے حصول کے امکانات باقی رہ جائیں گے کہ اگر اس حالت میں وہ دنیا میں لوٹ آئے تو مادہ سے دوبارہ تعلق قائم ہونے اور اس سے مربوط افعال کے انجام پذیر ہونے کے نتیجے میں دوسری عقلی صورت کے حصول کا امکان پیدا ہو جائے گا جیسا کہ انبیاءؑ و اولیاءؑ ہیں کہ اگر مرنے کے بعد دنیا میں لوٹ آئیں تو مادہ سے دوبارہ تعلق قائم ہونے اور اس سے مربوط افعال کے انجام پذیر ہونے کے نتیجے میں ایک اور عقلی صورت کے حصول کے امکان کے حامل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ دنیا میں واپس نہ آئے تو پہلے حاصل کیئے ہوئے کمال اور اس کمال کے بلند مراتب کے سوا کوئی نئی صورت حاصل نہ ہوگی اور نہ ہی مزید حصول کمال کی راہ ملے گی' اور واضح ہے کہ اس طرح کی صورت حال کو دائمی محرومیت (قسر دائم) نہیں کہا جا سکتا' اگر کسی شخص کی صرف ممکنہ کمال سے محرومی کو کہ جو کسی عمل کے نتیجے میں یا کسی موثر علت وسبب کی وجہ سے ہوئی ہو ''قسر دائم'' اور دائمی محرومیت کا نام دے دیا جائے تو اس مادی دنیا کہ جو تزاحم و تضاد کا گھر اور آماجگاہ ہے کے اکثر یا سب کے سب حوادث کو ''قسر دائم'' ...... دائمی محرومیت...... سے تعبیر کرنا پڑے گا' پس اس عالم طبیعت کے تمام اجزاء ایک دوسرے میں موثر واقع ہوں گے' جبکہ ''قسر دائم'' اور دائمی محرومیت سے مراد یہ ہے کہ کسی طبع کو کمالات میں سے کسی کمال کے حصول کی خواہش یا صلاحیت عطا کر دی جائے لیکن تا ابد اس کی اس وجودی خواہش یا صلاحیت کے کوئی آثار ظاہر نہ ہو سکیں اور کسی قسم کے آثار ظاہر نہ ہونے کی وجہ یا تو یہ ہو کہ اس کی ذات ہی میں کوئی ایسی چیز پائی جاتی ہے جو اسے اس صلاحیت سے استفادہ نہیں کرنے دیتی یا پھر یہ کہ اس کی ذات سے باہر کی کوئی چیز اس کی طبعی استعداد وصلاحیت کو ناکارہ کر دیتی ہے' دونوں صورتوں میں اسے کمال کا اقتضاء و خواہش یا صلاحیت و استعداد عطا کرنا بے سود اور بے مقصد کام ہوگا کیونکہ ان کا ہونا اور نہ ہونا دونوں یکساں ہو جائیں گے' اسے ''دائمی محرومیت''...... قسر دائم...... کہتے ہیں' اسے سادہ لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کسی چیز کو کوئی صلاحیت عطا کی جائے جس سے وہ کمال حاصل کر سکے لیکن اس کی ذات ہی میں یا ذات سے باہر ایسی رکاوٹیں موجود ہوں جن کی وجہ سے وہ کبھی اس صلاحیت سے استفادہ نہ کر سکے تو اس صورت میں اسے کوئی صلاحیت عطا کرنا بے سود ہوگا کیونکہ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حصول کمال سے محرومیت کا شکار ہے' (غور فرمایئے) اور اسی طرح اگر کسی انسان کے بارے میں یہ فرض کر لیں کہ اس کی انسانی صورت حیوانات میں سے کسی حیوان مثلاً بندر' خنزیر وغیرہ کی صورت میں بدل گئی ہے اور اب وہ حیوانی صورت اس کی انسانی صورت پر چھا گئی ہے تو ایسے شخص کو بندر آدمی یا سور آدمی کہا جائے گا' نہ یہ کہ اب اس کی انسانیت سرے ہی سے ختم ہو گئی ہو اور اس کی جگہ حقیقی معنے میں وہ بندر یا سور بن گیا ہو لہٰذا جب کوئی شخص کسی کام کو بار بار انجام دینے

سے کوئی ٹھوس صلاحیت حاصل کر لے تو وہ صلاحیت اس کی لوح نفس پر اپنا نقش (صورت) ثبت کر دے گی اور وہی ثبت شدہ صورت اس کی پہچان بن جائے گی' لہٰذا کسی دلیل سے اس بات کو محال و ناممکن قرار نہیں دیا جا سکتا کہ جس طرح مرنے کے بعد آخرت میں لوح نفس پر ثبت شدہ صورتیں باطن کے پردوں سے باہر نکل کر منظر عام پر ظہور پذیر ہوں گی اسی طرح وہ دنیا میں بھی عالم باطن سے عالم ظاہر میں آ جائیں' (ایسا ہونا ناممکن نہیں)۔

ہم سابقہ بیانات میں اس امر کو ذکر کر چکے ہیں کہ نفس انسانی میں اپنے وجود میں آنے کے پہلے مرحلے میں جبکہ کسی قسم کی کوئی صورت اس کی لوح طبع پر ثبت نہ تھی کسی ایسی مخصوص صورت کے حامل ہونے کا امکان پایا جاتا ہے جو اسے وادیء ابہام سے نکال کر تشخص عطا کرے اور اس کی پہچان کے مخصوص اسباب فراہم کر دے جس کے نتیجے میں وہ اپنی خصوصیات اور نشانیوں کے ساتھ پہچانا جا سکے' لہٰذا وہ انسان جو مسخ ہو چکا ہو اسے مسخ شدہ انسان ہی کہا جائے گا نہ یہ کہ اب وہ انسان ہی نہیں رہا اور اپنی اصل انسانیت ہی سے محروم ہو گیا' (ان مطالب پر اچھی طرح غور کریں تا کہ اصل موضوع کے بنیادی پہلو واضح ہو سکیں) اس کے علاوہ یہ کہ اکثر رسائل و جرائد میں یورپ و امریکہ کے علمی و تحقیقی اداروں کی رپورٹیں بھی ہماری نظر سے گزرتی ہیں جن میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے امکان کو تسلیم کیا جاتا ہے اور وہ محققین اپنی علمی تحقیقات میں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی انسان اپنی اصلی صورت سے کسی دوسری صورت میں تبدیل ہو جائے یعنی اگر مسخ ہو کر اس کی انسانی صورت کسی اور صورت میں بدل جائے تو ایسا ہونا ممکن ہے' اگرچہ ہم اپنی علمی بحثوں میں اس طرح کی رپورٹوں کا سہارا نہیں لیتے اور نہ ہی انہیں اپنے استدلال میں بنیادی حیثیت کا حامل قرار دیتے ہیں لیکن ہم ان کا تذکرہ کر کے جدید نظریات کے حامل ارباب تحقیق کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ آج ان باتوں کو طاق نسیاں میں نہ رکھیں جو کل انہوں نے پڑھی تھیں۔

اس مقام پر شاید آپ یہ کہیں کہ آپ نے جو مطالب ذکر کئے ہیں اس سے تو "تناسخ" کے عقیدے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی!

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں کہ ہمارے بیان کردہ مطالب سے "تناسخ" کے عقیدے کی راہ ہموار ہوتی ہے بلکہ ہمارے بیانات کا "تناسخ" کے مسئلہ سے کوئی تعلق و ربط ہی نہیں کیونکہ "تناسخ" سے مراد یہ ہے کہ وہ نفس انسانی جو حصول کمال سے متعدد مراحل طے کر چکا ہو جب بدن سے جدا ہو تو کسی دوسرے بدن میں منتقل ہو جائے یہ محال و ناممکن ہے' کیونکہ وہ نفس انسانی جس بدن میں منتقل ہوا ہے اس کی دو صورتیں قابل تصور ہیں: ایک یہ کہ وہ پہلے ہی نفس (روح) کا حامل تھا' دوسری یہ کہ وہ اس سے پہلے نفس (روح) کا حامل نہیں تھا' پہلی صورت میں تناسخ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک بدن کے دو نفس ہوں اور اسے "وحدۃ الکثیر" اور کثرۃ الواحد" کہتے ہیں جبکہ ایسا ہونا ناممکن ہے' دوسری صورت میں تناسخ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو چیز قوت (صلاحیت) کے مرحلے سے نکل کر فعلیت (اس صلاحیت کی عملی صورت) میں آ ئی تھی وہ دوبارہ قوت (صلاحیت) کے مرحلے میں لوٹ جائے مثلاً بوڑھا شخص دوبارہ بچہ ہو جائے' ایسا ہونا ناممکن ہے' اسی طرح انسان کے کمال یافتہ نفس کا بدن سے جدا

ہونے کے بعد نباتات میں سے کسی نبات یا حیوانات میں سے کسی حیوان کے بدن میں منتقل ہونا بھی ناممکن ہے کیونکہ یہ وہ بات ہے جو ابھی ہم نے ذکر کی ہے کہ ایک چیز قوت کے مرحلے سے فعلیت کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ قوت کے مرحلے میں چلی جائے۔ (ایسا ہرگز ممکن نہیں)۔

ایک علمی واخلاقی بحث

اہل مطالعہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے واقعات تمام سابقہ امتوں اور قوموں کے واقعات کی نسبت زیادہ ذکر کئے گئے ہیں' اسی طرح تمام انبیاء کرام میں سے سب سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے' چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسم گرامی قرآن مجید میں ایک سو چھتیس (۱۳۶) مقامات میں ذکر ہوا ہے جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کے ذکر سے دگنا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ جس نبی کا تذکرہ قرآن مجید میں ہوا ہے وہ حضرت ابرہیم علیہ السلام ہیں یعنی ان کا اسم گرامی انہتر (۶۹) مقامات پر ذکر کیا گیا ہے' اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام ہی وہ پاکیزہ دین ہے جو توحید کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کے موسس حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اسی دین اسلام کو خداوند عالم نے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مکمل کیا' چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ حج، آیت ۷۸:

"مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ"۔

(دین اسلام تمہارے پدر بزرگوار ابراہیم کا دین ہے' انہوں نے ہی تمہیں "مسلمان" کے نام سے موسوم کیا تھا)۔

بنی اسرائیل کے بارے میں تاریخی شواہد سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ تمام قوموں سے زیادہ ضدی اور جھگڑالو قوم تھی' وہ حق کو تسلیم کرنے کی بابت تمام قوموں کی نسبت سب سے زیادہ دوری اختیار کرنے والے لوگ تھے' یہی حال کفار عرب کا تھا کہ جن سے حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پالا پڑا' وہ بھی بنی اسرائیل کی مانند ضدی' جھگڑالو اور حق سے دوری اختیار کرنے والے افراد تھے بلکہ ان کی تو یہ حالت ہو چکی تھی کہ خداوند عالم نے ان کے متعلق آنحضرتؐ سے یوں ارشاد فرمایا:

سورہ بقرہ، آیت ۶:

"اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاۗءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ"

(جو لوگ کافر ہیں ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انہیں انذار کریں یا انذار نہ کریں (خوف خدا سے ڈرائیں یا نہ

ڈرائیں) وہ نہیں مانیں گے)۔

حقیقت امر یہ ہے کہ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کی جن برائیوں اور بری صفات وقبیح عادات کا تذکرہ کیا ہے مثلاً ان کی سنگدلی، ظلم وستم وغیرہ، وہ سب کفار عرب میں موجود تھیں، بہر حال اگر آپ قرآن مجید میں مذکور بنی اسرائیل کے واقعات پر غور کریں اور پوری توجہ کے ساتھ ان کی عادات واخلاق پر نظر کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ لوگ نہایت دنیا پرست، لالچی، ظاہری زندگی کی فنا پذیر لذتوں کے اسیر اور نفسانی خواہشات میں پوری طرح گھرے ہوئے تھے، وہ لوگ اپنی عیاشیوں میں اس قدر سرمست تھے کہ عیش وعشرت کے سوا کسی چیز کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے، محسوسات کے علاوہ کسی چیز پر ایمان نہ لانا اور ماورائے طبیعت کا کلی طور پر انکار کرنا ان کے اعتقادات کی بنیادیں تھیں، وہ مادی لذتوں اور دنیاوی کمالات کے سوا کسی چیز کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور وہ اب بھی اسی حال

میں ہیں، ان کی یہ حالت وعادت اور غلط اعتقادی وعملی بنیادیں ہی اس بات کا سبب بنیں کہ وہ اپنی عقل وارادہ میں حس و مادہ......محسوسات ومادیات......کے تابع ہوئے اور حس ومادہ ہی کو ہر چیز کی بنیاد قرار دے کر غیر مادی ونامحسوس امور کے منکر ہوئے، یہاں تک کہ اگر کسی چیز کے بارے میں حس ومادہ سے تصدیق حاصل نہ ہوتی تو وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے تھے خواہ وہ حق اور صحیح ہی کیوں نہ ہو، مادہ پرستی میں اس حد تک پہنچ جانا ہی اس بات کا موجب بنا کہ وہ اچھے اور برے کام کی تمیز و پہچان بھی مادی ومحسوس ہونے کی بنیاد پر کریں، اور جس چیز کو ان کے بزرگوں نے اچھا سمجھا یعنی دنیاوی لذتیں اور مادی آسائشیں وغیرہ، وہ بھی اسے اچھا قرار دیں خواہ وہ ناحق وباطل ہی کیوں نہ ہو، ان کے اس غلط ونادرست نظریات وافکار اور اعمال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے قول وفعل میں تضاد پیدا ہو گیا چنانچہ انہوں نے نامحسوس امور میں ہر قسم کے اتباع وپیروی کو اندھی تقلید کا نام دے کر اسے مورد مذمت قرار دیا خواہ وہ کام ہر لحاظ سے صحیح ہی کیوں نہ ہو جبکہ ہر محسوس ومادی اور ان کی نفسانی خواہشات سے مطابقت رکھنے والے امور میں ہر طرح کے اتباع وپیروی اور دوسروں کے نقش قدم پر چلنے کو روا سمجھا خواہ وہ کام کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، ان کے اس غلط نظریہ وروش کو مصر میں ان کے طویل عرصہ تک قیام پذیر رہنے نے مزید تقویت دی جبکہ مصریوں نے انہیں ہر طرح سے ذلت سے دوچار رکھا، انہیں اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا، ان پر ہر طرح سے سختیاں کیں، انہیں گوناگوں مظالم کا نشانہ بنایا، یہاں تک کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی بیٹیوں کو......گھروں میں کام کاج کرنے کے لیے...... زندہ رہنے دیتے تھے اور یہ سب کچھ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے لیے بہت بڑا امتحان تھا۔

بہر حال وہ اپنی مذکورہ عادات واعمال اور افکار وروش کی وجہ سے اپنے انبیاءؑ کے احکامات اور اپنے علماء کی ہدایات ونصیحتوں پر کان ہی نہ دھرتے تھے جبکہ انبیاءؑ وعلماء نے ہمیشہ انہیں اچھی زندگی بسر کرنے اور آخرت سنوارنے کے لیے بہترین رہنمائیاں کیں (اس سلسلے میں ان کی طرف سے حضرت موسیٰؑ اور دیگر انبیاء کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو خاطر میں لائیں تو صورت حال واضح ہو جاتی ہے) اس کے برعکس وہ لوگ خود غرض حکام اور متکبر وستمگر افراد کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے تھے، یہی صورت حال آج بھی پائی جاتی ہے اور عصر حاضر میں بھی حق وحقیقت کا انہی مادی افکار ونظریات اور تباہ کن

عادات وروش سے سامنا ہے جو ہمیں مغربی ممالک سے تحفہ کے طور پر دی گئی ہیں کہ جن کی بنیاد حس و مادہ کے سوا کچھ نہیں بلکہ ان (اہل مغرب) کی تہذیب وثقافت کی اصل واساس ہی حس و مادہ ہے اور ان کے ہاں نامحسوس وغیر مادی چیز کسی طرح بھی قابل قبول نہیں سمجھی جاتی اور نہ ہی اس کی بابت کسی دلیل وثبوت کو درخور اعتناء قرار دیا جاتا ہے جبکہ لذت بخش مادی ومحسوس چیزوں کے صحیح ہونے میں کسی دلیل وثبوت کی تلاش کو ضروری ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اسی وجہ سے تمام تر انسانی فطرتی تقاضے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور ان کی تکمیل نہیں ہوسکتی اور ہم بلند پایہ علوم ومعارف اور پاکیزہ اخلاق سے محروم ہوتے ہیں بلکہ اس سے انسانیت کی عظیم عمارت کے منہدم ہونے اور دنیائے بشریت کی تباہی کا اندیشہ ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ تمام لوگ بہت جلد اس خطرہ سے باخبر ہوجائیں گے اور پوری ایمانی وانسانی قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں گے جس کے نتیجے میں ان غلط و نادرست نظریات کا قلع قمع ہوجائے گا' اگر علم اخلاق کی رو سے بھی دیکھا جائے تب بھی ان کے افکار ونظریات کی نفی ہوتی ہے کیونکہ یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ ہر دلیل قابل قبول اور ہر تقلید (دوسروں کے نقش قدم پر چلنا) مذموم ہے' اس کی وضاحت کے لیے یوں کہا جاسکتا ہے: کہ ہر انسان' انسان ہونے کے حوالے سے اپنے ان ارادی افعال کے ذریعے جو اس کی قوت فکر وارادہ پر موقوف ہیں کہ ان کے بغیر اس کا کوئی کام انجام پذیر نہیں ہوسکتا اپنی زندگی کے سفر کمال کو طے کررہا ہے۔ پس فکر ونظر ہی ایسی پختہ اساس وبنیاد ہے جس پر انسان کے وجود کا حقیقی کمال استوار ہے لہٰذا ہر انسان کے لیے ضروری ولازم ہے کہ جو کچھ بھی اس کے وجودی کمال سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی بھی طرح سے تعلق رکھتا ہو اسے عمل یا فکر ونظر کی قوتوں سے ہم آہنگ کرے یعنی جن عملی یا فکر ونظر کی قوتوں سے اس کے وجودی کمال کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ربط ہو ان سے ہم آہنگی ضروری ہے اور یہ عملی ونظری تصدیقات دراصل اپنی بنیادی مصلحتوں کا دوسرا نام ہے جنہیں ہم اپنے روزمرہ کے انفرادی واجتماعی کاموں کی اصل واساس قرار دیتے ہیں اور اپنے تمام افعال کے موجب وعلت کے طور پر یاد کرتے ہیں' یا یہ کہ پہلے ان مصلحتوں وحکمتوں کو ذہنی طور پر اپنے افعال سے ہم آہنگ کرتے ہیں پھر اس کے بعد وہ کام سرانجام دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ان مصلحتوں اور متوقع نتائج کے حصول میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی انسان کی فطری طبع کا حصہ ہے کہ وہ ہر واقعہ کی علت وسبب کی جستجو میں رہتا ہے اور جو واقعہ رونما ہو اس کے اسباب سے آگاہ ہونا چاہتا ہے' بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ جو چیز بھی اس کے ذہن میں آئے اس کی بابت طرح سے آگاہی حاصل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب تک اپنے ذہن میں آنے والی چیز کی علت وسبب سے آگاہ نہ ہوجائے اسے عملی جامہ نہیں پہناتا۔ اسی طرح کسی علمی نظریہ کی تصدیق اس وقت تک نہیں کرتا جب تک کہ اس کی علت وسبب سے آگاہ ہوکر اس کی علمی تصدیق کے مراحل طے نہ کرلے' یہ روش اس کی فطری طبع کے جزو لاینفک کا درجہ رکھتی ہے جس سے وہ ہرگز روگردانی نہیں کرتا اور نہ ہی کسی سلسلے میں اسے نظر انداز کرتا ہے۔ تاہم اگر چند موارد ایسے نظر آئیں کہ جن میں اس کے اس فطری اصول کی بظاہر خلاف ورزی کا مظاہرہ دکھائی دے تو اگر اس میں بھی عمیق نظروں سے دیکھا جائے تو غلط فہمی دور ہوجائے گی اور معلوم ہوجائے گا کہ ان موارد میں بھی فطری طبع کا وہ جذبہ کارفرما تھا اور علت وسبب کی جستجو کے فطری تقاضے

کی تکمیل ہوئی تھی کیونکہ یہ "جستجو" درحقیقت فطری طبع کا جزو لاینفک (کبھی جدا نہ ہونے والا حصہ) ہے کہ جسے نظرانداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' فطرت میں تبدیلی ممکن ہی نہیں اور نہ ہی اس کے بنیادی تقاضوں میں کوئی خلل واقع ہوسکتا ہے' بلکہ اگر حقیقت بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی فطری جذبہ اس امر کا سبب بنا کہ انسان اپنی وسیع طبیعی احتیاجات کے پیش نظر اپنی طاقت وقوت سے بالاتر فکری وعملی میدان میں تحقیقی کاوشیں بروئے کار لائے لیکن چونکہ وہ اکیلا اپنی تمام تر احتیاجات اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی انفرادی صلاحیتوں کا سہارا لے کر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا تھا اس لیے فطرت نے اسے معاشرتی شاہراہ پر لا کھڑا کیا اور تہذیب وتمدن کے اجتماعی اصول اپنانے کی راہ دکھائی اور فطرت ہی نے زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تمام افراد معاشرہ کے درمیان ذمہ داریاں تقسیم کرنے کی ترغیب دلائی' اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ انسان کے لیے اپنی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنا انفرادی طور پر ممکن نہ تھا اس لیے فطرت نے اس کی احتیاجات کی وسعت اور ان کی تکمیل کے لیے انفرادی قوتوں کی عدم توانائی کے پیش نظر اسے اجتماعی قوتوں سے استفادہ کی راہ دکھائی اور اسے اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنے ہمنوع افراد کی صلاحیتوں سے باہمی طور پر فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرے اور ہر کام کے لیے کچھ افراد کو مخصوص کر کے اس کام کو انجام دینا ان کے سپرد کیا جائے اور معاشرہ کے تمام افراد اس طرح عمل کریں جس طرح ایک بدن کے اعضاء اپنی قوتوں سے باہمی استفادہ کرتے ہوئے بدن کی سلامتی و بقا کے اسباب فراہم کرتے ہیں' انسانی معاشرہ میں بھی ہر شخص اپنی قوتوں و صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اجتماعی و معاشرتی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے جس کے نتیجے میں ہر شخص کی انفرادی زندگی کی احتیاجات کی تکمیل بھی ممکن ہے اور معاشرہ کی بقاء واستحکام کی ضمانت بھی مل سکتی ہے' اور یہ بھی ناقابل انکار امر ہے کہ انسانی زندگی کی ضرورتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے جس کے نتیجے میں علوم و فنون اور صنعت وحرفت میں ترقی ہوتی ہے اور پھر ہر شعبہ میں ماہرین کی ضرورت بھی ہوتی ہے جس کے لیے ماہرین کی تربیت کا بندوبست کرنا بھی ناگزیر ہوجاتا ہے' اس معاشرتی ضرورت کی واضح مثال موجودہ دور میں پائے جانے والے علوم وفنون کی کثرت ہے ان میں سے کتنے ایسے علوم ہیں جو پہلے زمانے میں ایک "علم" کی صورت میں تھے اور ایک ہی شخص اس علم کا ماہر ہوتا تھا لیکن اب ایک علم کے متعدد شعبوں کے قیام کی وجہ سے ہر شعبہ میں ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً علم طب کہ جو زمانہ قدیم میں ایک ہی علم تھا اور علم طبیعیات کی ایک فرع کے طور پر پہچانا جاتا تھا لیکن موجودہ دور میں اس کی متعدد قسمیں ہوچکی ہیں اور وہ کئی علوم وفنون اور شعبوں میں بٹ چکا ہے کہ ایک شخص خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو لیکن ایک سے زیادہ علم میں مہارت حاصل نہیں کرسکتا' بنابرایں ہر شخص کو فطری طور پر اس بات کا اشارہ ملا کہ جن امور میں اسے مہارت حاصل ہے ان کی بابت اپنے علم وآگہی کی بنیاد پر تحقیق وجستجو کے عمل کو جاری رکھے اور اپنی معلومات کو اساس قرار دیتے ہوئے عملی اقدام کرے او رجن چیزوں میں دوسرے افراد کو مہارت حاصل ہے ان میں انہی کی بات کو تسلیم کر کے ان کی مہارت علمی کا سہارا لے' اسی حوالہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عقلائے عالم کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہر شخص ہر فن میں اس کے ماہرین کی طرف رجوع کرے او

ر یہ رجوع کرنا دراصل ''تقلید'' ہی کے معروف ومشہور معنی سے عبارت ہے کہ جس سے مراد ہر اس مسئلہ وموضوع میں اجما
دلیل کا سہارا لینا ہے جس کی تفصیلی دلیل تک دسترس حاصل نہ ہو سکے' جیسا کہ دوسری جانب یہ امر بھی مسلم ہے کہ انسان فطر
طور پر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ جس چیز کی بابت اسے قوت وصلاحیت حاصل ہے اس میں دوسروں کی تقلید نہ کرے بلکہ
بذات خود اس کے بارے میں بحث وتحقیق کر کے اس کے تفصیلی دلائل سے آگاہی حاصل کرے۔

بہرحال دونوں صورتوں (اپنی تحقیق اور دوسروں کی تقلید) میں اصل معیار عمل یہ ہے کہ کوئی شخص ''علم'' کے علاوہ کس
چیز کی پیروی نہ کرے' اگر اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو تو اجتہاد کرتے ہوئے ہر اس مسئلہ وموضوع کی تفصیلی دلیلوں سے آگاہ
حاصل کرے جو اسے روزمرہ کی زندگی میں درپیش ہو' اور اگر اجتہاد کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس شخص کی تقلید کرے جو اس مسئلہ
موضوع کا علم رکھتا ہو' اور چونکہ یہ امر محال وناممکن ہے کہ دنیائے انسانیت کا کوئی ایک فرد، زندگی کے تمام امور اور مسائل
موضوعات میں علمی مہارت کا حامل ہو اور زندگی کے تمام بنیادی امور میں کسی کا سہارا لیے بغیر اجتہاد کرلے۔ لہٰذا یہ بات بھی
محال وناممکن ہوگی کہ پوری دنیا میں کوئی ایسا شخص پایا جائے جو کسی کی تقلید نہ کرتا ہو' اور اگر کوئی شخص اس کے برعکس ادعاء کر
یا اپنے بارے میں اس کے علاوہ کچھ سوچتا ہو مثلاً اپنے تئیں یہ سمجھتا ہو کہ زندگی کے کسی مسئلہ میں کسی دوسرے کی تقلید یا کسی
علمی مہارت کا سہارا لینے کا محتاج نہیں تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے اور اس نے خود اپنی حماقت وبے وقوفی کا ثبوت فراہم
کردیا ہے۔ البتہ اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن مسائل میں دلیل وسبب سے آگاہی حاصل کرنا انسان کے اختیار
میں ہو ان میں اندھی تقلید ہرگز درست نہیں اور اسی طرح جن مسائل میں بحث وتحقیق کی اہلیت ہی حاصل نہ ہو ان میں اجتہاد
کرنا...... یا اجتہاد کا دعویٰ کرنا...... نہایت گھٹیا وپست اور غیر اخلاقی حرکت ہے کہ جس سے معاشرہ تباہ وبرباد ہو جاتا ہے ا
دنیائے بشریت کی پاکیزہ صورت بگڑ جاتی ہے' بہرحال یہ بات ہرگز تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ معاشرہ کے تمام افراد، زندگی کے
تمام مسائل میں مجتہد ہوں اور کسی مسئلہ میں دوسرے کی تقلید نہ کرتے ہوں اور نہ ہی یہ کہ زندگی کے تمام مسائل میں دوسروں کی
تقلید کریں اور دوسروں کی تقلید اور ان کی علمی صلاحیتوں کا سہارا لینا ہی ان کی زندگی کا اوڑھنا' بچھونا قرار پائے کیونکہ اس طرح
کی پیروی، خدا کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی یعنی خدا کی ذات ہی وہ عظیم ذات ہے جس کی پیروی کرنے میں کوئی محدودیت نہیں
بلکہ ہر مسئلہ میں اس کے احکام کی اطاعت وپیروی کرنا ہی کمال انسانیت ہے اور اسی کی مطلق اطاعت وپیروی کرنی چاہیے
کیونکہ وہ ایسا مضبوط سبب ہے کہ تمام اسباب اسی تک پہنچتے ہیں' وہی ہر سبب کا منتہا ہے۔

آیات ۷۵ تا ۸۲

○ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ
يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

○ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا
اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

○ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

○ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾

○ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

○ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا
فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

○ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

آیات ۷۵ تا ۸۲

○ أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ
يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۷۵﴾

○ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا
أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۷۶﴾

○ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۷۷﴾

○ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾

○ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ
لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ﴿۷۹﴾

○ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا
فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾

○ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ
فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۸۱﴾

○ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا
خَالِدُونَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ

○ "آیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے کہنے پر ایمان لے آئیں گے جبکہ ان میں سے کچھ لوگ خدا کا کلام سن کر اس میں تحریف کر دیتے تھے اور اسے اچھی طرح سے سمجھنے اور علم رکھنے کے باوجود اسے تبدیل کر دیتے تھے"۔ (۷۵)

○ "جب وہ ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ...... بھی...... ایمان لائے ہیں اور جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آیا تم ایمان لانے والوں کو وہ سب کچھ بتا دیتے ہو جو خدا نے تمہیں...... تورات میں...... واضح طور پر بتایا ہے تاکہ وہ انہی باتوں کے حوالہ سے اپنے پروردگار کے سامنے تمہارے خلاف ثبوت پیش کر سکیں ... حجت قائم کر سکیں ... کیا تم عقل نہیں رکھتے (معاملہ کی نزاکت سے آگاہ نہیں ہو)"۔ (۷۶)

○ "آیا وہ نہیں جانتے کہ خدا ہر اس چیز سے آگاہ ہے جو وہ اپنے دلوں میں چھپا کر رکھتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں"۔ (۷۷)

○ "ان میں سے کچھ لوگ "امی" ہیں جو کتاب خدا کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں رکھتے سوائے ان باتوں کے جو ان کی خواہشات کے مطابق ہوں، اور وہ ہمیشہ خیالی باتوں میں لگے رہتے ہیں (۷۸)

○ "پس سخت عذاب ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب کو خود لکھ کر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اس سے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں، پس سخت عذاب ہے ان کے لیے بسبب اس کے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا... اور پھر اسے خدا کی طرف نسبت دے دی اور پھر سخت عذاب ہے ان کے لیے بسبب اس کے جو وہ کماتے ہیں"۔ (۷۹)

○ "اور وہ کہتے ہیں کہ جہنم کی آگ چند دنوں کے سوا ہمیں نہ چھوئے گی، ان سے کہہ دیجئے آیا تم نے خدا سے کوئی وعدہ لیا ہوا ہے...... اگر ایسا ہے تو...... پھر خدا ہرگز اپنے وعدے سے روگردانی نہیں کرے گا، یا پھر تم خدا کے بارے میں وہ کچھ کہتے ہو جو جانتے ہی نہیں ہو"۔ (۸۰)

○ "ہاں! جس نے برا کام کیا اور اس کے گناہ نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا تو اس طرح کے لوگ ہی جہنم میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے"۔ (۸۱)

○ "اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے وہی بہشت میں ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے" (۸۲)

تفسیر و بیان

زیر نظر آیات کے اسلوب بیان اور یکے بعد دیگرے ذکر کئے جانے والے مطالب سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہودی عام کفار بالخصوص کفار مدینہ کی نظروں میں کہ جو ان کے پڑوسی تھے بعثت سے پہلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حامی و مددگار کے طور پر پہچانے جاتے تھے کیونکہ وہ (یہودی) دین و کتاب کا علم رکھتے تھے اس لیے ایمان لانے کی توقع دوسروں کی نسبت ان سے زیادہ تھی اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے جس سے دین اسلام کی تائید و حمایت کا حلقہ وسیع ہوگا' اسلام کی روشنی دنیا بھر میں پھیل جائے گی اور اس کی مقدس تعلیمات عام ہو جائیں گی' لیکن جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو یہودیوں کے طرز عمل سے ان سے وابستہ تمام امیدیں خاک میں مل گئیں اور تمام توقعات پر پانی پھر گیا' یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے ان (یہودیوں) کے متعلق یوں ارشاد فرمایا:

"اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ ..."

(آیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے کہنے پر ایمان لے آئیں گے۔)۔

خدا کے اس ارشاد گرامی سے ثابت ہوتا ہے کہ حقائق کی پردہ پوشی اور کلام الٰہی میں تحریف و تبدیلی کرنا ان (یہودیوں) کی پرانی عادت ہے لہٰذا اپنی ہی کی ہوئی باتوں سے انکار کر دینا اور اپنے ہی کئے ہوئے مضبوط عہد و پیمان کو توڑ دینا ان سے بعید قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہودیوں سے بیجا توقعات کا ذکر

○ "اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ ..."

(آیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے کہنے پر ایمان لے آئیں گے)۔

اس آیت میں بنی اسرائیل سے مخاطب ہونے کے بجائے رسول خدا اور اہل ایمان سے خطاب کیا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے والی آیات میں بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر بات کی جا رہی تھی لیکن اس آیت میں گفتگو کا انداز تبدیل کر کے ان (یہودیوں) کا ذکر غائب کے صیغہ (یومنوا) کے ذریعے کیا گیا تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب خداوند عالم نے گائے کے واقعہ کو

بیان کیا تو اس میں بھی بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے مخاطب کے لہجے کو چھوڑ کر غائب کا لہجہ اختیار کر لیا گیا کیونکہ انہوں نے تورات میں مذکور اس واقعہ میں تحریف کر دی تھی اور اسے تورات سے حذف کر دیا تھا جیسا کہ اس سلسلے میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں' لہٰذا خداوند عالم نے اس آیت (۷۵) میں یہودیوں کی طرف سے کلام الٰہی میں تحریف کرنے کا ذکر کر کے غائب کے صیغہ میں ان کا ذکر کیا تا کہ انہیں مخاطب کرنے کے بجائے غائب کے طور پر ان کا تذکرہ کر کے اصل بات کر دی جائے۔

اہل کتاب کے نفاق کا بیان

○ "وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا . . ."

(جب وہ ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو......)

اس آیت میں دو جملہ شرطیہ ذکر ہوئے ہیں کہ جن سے پہلے حرف "اذا" آیا ہے:

۱۔ "وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا"

۲۔ "وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ"۔

البتہ ان دو جملوں میں جو مطالب ذکر کیے گئے ہیں ان میں کوئی تقابل نہیں پایا جاتا یعنی ایسا نہیں کہ ایک جملہ دوسرے جملہ کی نفی کرتا ہو' مثلاً پہلے جملہ میں یہ کہا گیا ہو کہ "جب وہ مومنین سے ملتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں"۔ اور دوسرے جملے میں یہ کہا گیا ہو کہ "جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائے"۔ بلکہ یوں کہا گیا ہے: پہلا جملہ: "جب مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں"۔ دوسرا جملہ: "جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم تورات میں ذکر کی گئی بشارتوں کو مسلمانوں کے سامنے کیوں بیان کرتے ہو"۔ جبکہ سورہ بقرہ کی آیت (۱۴) میں ان کے بارے میں دو جملہ شرطیہ ذکر کیے گئے ہیں اور دونوں میں تقابل پایا جاتا ہے یعنی ایک جملہ دوسرے جملے کی نفی میں ہے ملاحظہ ہو:

پہلا جملہ: "وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا"۔

(جب وہ مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں)۔

دوسرا جملہ: "وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ"

(اور جب اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو (ان کے ساتھ) مذاق و تمسخر کرتے ہیں)۔

اس آیت (۱۴) میں بھی دو جملہ شرطیہ "اِذَا" کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں اور آیت ۷۵ میں بھی دو جملہ شرطیہ "اذا"

کے ساتھ مذکور ہیں لیکن دونوں آیتوں میں فرق یہ ہے کہ آیت ۷۶ میں دونوں جملوں میں تقابل ہے جبکہ آیت ۷۵ میں ایسا نہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت (۷۵) میں ان (بنی اسرائیل) کے مزید دو جرائم اور جاہلانہ حرکتوں سے پردہ اٹھانا مقصود ہے:

(۱) یہ کہ وہ نفاق کرتے ہیں اور ظاہری طور پر اس لیے ایمان لاتے ہیں کہ اپنے آپ کو اذیت و آزار، لعن و تشنیع اور قتل ہونے سے بچا سکیں۔

(۲) یہ کہ حقیقت حال اور اپنے دل کے راز کو خدا سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے خدا کو ابہام میں ڈال دیں گے جبکہ یہ ان کی جہالت کا واضح ثبوت ہے کیونکہ خدا تو ان کے ظاہر و باطن دونوں سے آگاہ ہے۔

بہر حال ان کے ایسا کرنے کا پس منظر یہ ہے کہ ان کے سادہ لوح عوام جب مسلمانوں سے ملتے تھے تو اپنی خوشی کے اظہار کے طور پر مسلمانوں کے سامنے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تورات کی بشارتیں ذکر کرتے تھے یا تورات کے وہ مطالب بیان کرتے تھے جو اہل ایمان کے لیے حضرت پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کی تصدیق کی بابت مفید ثابت ہوتے تھے جیسا کہ ان کے طرز سخن سے بھی ظاہر ہوتا تھا لہٰذا ان کے بزرگ انہیں ایسا کرنے (تورات کی بشارتیں ذکر کرنے) سے یہ کہہ کر منع کرتے تھے کہ یہ باتیں تو خدا نے صرف انہی کے لیے بیان کی ہیں لہٰذا انہیں مومنین کے سامنے بیان نہ کیا جائے کیونکہ اگر وہ (اہل ایمان) ان باتوں سے آگاہ ہو گئے تو وہ انہیں اپنے پروردگار کے سامنے ہمارے خلاف دلیل و حجت کے طور پر پیش کر دیں گے، گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر اہل ایمان، خدا کے سامنے ان مطالب کو ہمارے خلاف دلیل و ثبوت کے طور پر پیش نہ کریں تو خدا ان باتوں سے آگاہ ہی نہیں لہٰذا وہ ہمارا مواخذہ ہی نہ کرے گا اور ان باتوں کی بابت ہم سے کسی قسم کی کوئی پوچھ گچھ نہ کر پائے گا۔ ان کی اس خام خیالی اور غلط سوچ سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ خدا صرف ظاہر بظاہر امور سے آگاہ ہو اور دلوں کے رازوں اور باطن کے امور سے بے خبر ہو جبکہ ایسا سوچنا نہایت درجہ کی جہالت ہے، لہٰذا خداوند عالم نے ان کی اس غلط سوچ اور جاہلانہ طرز تفکر کو رد کرتے ہوئے یوں فرمایا:

"اَوَلَا يَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ"۔

(آیا وہ نہیں جانتے کہ خدا وہ سب کچھ جانتا ہے جو وہ اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں)۔

خدا کے اس فرمان کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا علم یعنی وہ علم جس کا تعلق صرف ظاہر سے ہو باطن سے نہ ہو اس کا منتہا حس کے سوا کچھ نہیں اور حس مادی بدن کی محتاج ہے یعنی وہ بدن جو مادی آلات و اعضاء رکھتا ہو اور زمان و مکان کی قیود میں گھرا ہوا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی طرح کے دوسرے مادی علل و اسباب کے ذریعے وجود میں آیا ہو، ظاہر ہے کہ جو چیز اس طرح کی ہو وہ خود مخلوق ہے نہ کہ خالق کائنات، کیونکہ وہ چیز خود اپنے وجود میں کسی کی محتاج ہے، نہ یہ کہ وہ دوسروں کو وجود عطا کر سکتی ہو۔

یہ بیان ہمارے اس بیان کی صحت کی ایک دلیل ہے جس میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ خود مادہ کو کائنات کے وجود کی علت وسبب سمجھتے تھے اس لیے خداوند عالم کے بارے میں بھی مادہ کے حوالے سے نظریہ رکھتے تھے اور مادہ ہی کے خواص کا خدا پر اطلاق کرتے تھے وہ خدا کو ایسی ذات مانتے تھے جو مادہ میں فعال و موثر اور اس پر حاوی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی حیثیت بعینہ ایک مادی علت کی ہے کہ جو اپنے مادی معلول پر حاوی و غالب ہوتی ہے البتہ خدا کے بارے میں یہ طرز تفکر یہودیوں ہی سے مختص نہیں بلکہ دیگر اقوام میں سے بھی مادہ کی اصالت کے قائل افراد کا خدا کے بارے میں یہی نظریہ ہے اور وہ لوگ خدا کے جو اوصاف بیان کرتے ہیں ان میں بھی اپنے اسی نقطہ نظر کو بنیاد قرار دیتے ہیں جو مادی چیزوں کے اوصاف کے بارے میں رکھتے ہیں مثلاً حیات، علم قدرت اختیار ارادہ قضاء حکم واقتدار تدبیر امور اور حتمی فیصلہ کی قوت وغیرہ کے جن معانی کو مادی امور کی بابت درست سمجھتے ہیں وہی معانی خدا کی ذات کے لیے قائل ہیں ان کا یہ طرز فکر ایک ایسی بیماری ہے جس کے لیے کوئی دوا کارگر ثابت نہیں ہوسکتی "وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ" (بے عقل لوگوں کو واضح نشانیاں کچھ فائدہ دے سکتی ہیں اور نہ ڈرانے والے امور ان پر اثر کر سکتے ہیں) حد تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے اس طرز فکر اور خدا کے بارے میں اس طرح کے خیالات رکھنے پر ایسے افراد نے بھی ان کا مذاق اڑایا ہے جو کسی طرح بھی دین حق اور اس کے بلند پایہ علوم و معارف سے کوئی سروکار نہیں رکھتے چنانچہ انہوں نے کہا کہ "مسلمان اپنے نبی کے حوالہ سے یہ بیان کرتے ہیں کہ خدا نے آدم کو اپنی شکل وصورت پر پیدا کیا جبکہ وہ خود (مسلمان) کہ جو اپنے نبی کی امت ہیں خدا کو آدم کی شکل پر پیدا کرتے ہیں (خدا کو آدم کی طرح مادی مخلوق سمجھتے ہیں) پس یہ لوگ ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اور ان کے لیے ان دو راستوں میں سے ایک کا اختیار کرنا ناگزیر ہے:

ایک یہ کہ اپنے پروردگار کے لیے مادہ کے تمام اوصاف ثابت کریں اور یہ کہیں کہ جو کچھ مادہ کے لیے ثابت ہے وہی خدا کے لیے ثابت ہے جیسا کہ مسلمانوں کے ایک گروہ "مشبہ" نے یا ان لوگوں نے جنہیں "مشبہ" تو نہیں کہا جاسکتا لیکن انہوں نے "مشبہ" کے مسلک کو اختیار کیا۔ (مشبہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جنہوں نے خدا کو اپنے ساتھ تشبیہ دی)۔

دوسرا یہ کہ خداوند عالم کے اوصاف جمال (صفات جمالیہ) کے کچھ معنے نہ کریں بلکہ ان اوصاف کی اس طرح نفی کریں کہ ان کا رخ سلبی معانی کی طرف یہ کہہ کر موڑ دیں کہ جو الفاظ خدا کے اوصاف کو ظاہر کرتے ہیں وہ اس کی بابت مشترک لفظی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا وہ ذات ہے جو موجود ثابت عالم قادر زندہ ہے تو ہم اس کے وجود ثبات علم قدرت اور حیات کے معانی کو سمجھ ہی نہیں سکتے اور نہ ہی ان معانی تک ہماری عقلوں کی رسائی ہوسکتی ہے اس لیے ہم ان الفاظ کو معانی کی نفی کے حوالے سے خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں مثلاً "خدا موجود ہے" کے بجائے یوں کہتے ہیں: "خدا معدوم نہیں" اور "خدا کو ثبات حاصل ہے" کے بجائے "خدا کو زوال نہیں" کہتے ہیں۔ "خدا عالم ہے" کے بجائے "خدا جاہل نہیں" "خدا قادر ہے" کے بجائے "خدا عاجز نہیں" اور "خدا زندہ ہے" کے بجائے خدا مردہ نہیں" کہتے ہیں وغیرہ۔

یہ وہ مقام ہے جہاں صاحبان بصیرت ان مادہ پرست لوگوں کے نظریات سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں کہ ان کا

مادہ پرستی نے انہیں یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں جسے جانتے ہی نہ ہوں اور اس کی عبادت کریں جسے پہچانتے ہی نہ ہوں اور پھر یہ کہ ایسے امور کا ادعاء کریں جنہیں نہ خود سمجھتے ہوں اور نہ ہی کوئی دوسرا ان کا تعقل کر سکے' حالانکہ حقیقت امر یہ ہے کہ دین حق اور اس کی مقدس تعلیمات و معارف نے ان لوگوں کے بے بنیاد نظریات کی قلعی کھول دی ہے اور ان کے عقائد و خیالات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ عوام الناس کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کے بارے میں "تشبیہ" و "تنزیہ" کے مابین درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے ان نظریات میں حق اور حقیقت کو اس طرح اپنائیں کہ خدا کے بارے میں یوں عقیدہ رکھیں کہ "خدا سبحانہ وتعالیٰ شے ہے کہ جس کی مانند کوئی شے نہیں' وہ عالم ہے لیکن اس کا علم ہمارے علوم کی طرح نہیں' وہ قادر ہے لیکن ہمارے قادر ہونے کی طرح نہیں' وہ زندہ ہے لیکن اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں' وہ ارادہ کرتا ہے لیکن اس کا ارادہ ہمارے ارادے کی طرح نہیں' وہ متکلم ہے (بولتا ہے) لیکن اس طرح سے نہیں جیسے ہم منہ کھول کر بولتے ہیں۔ اور خواص الناس کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی آیات و نشانیوں میں تدبر و تفکر کریں اور اس کے دین کی بابت غور و فکر اور تفقہ سے کام لیں چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:

سورہ ءزمر' آیت ۹:

"هَلْ يَسْتَوِى الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ"

(آیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے دونوں برابر ہیں؟ اس بات کو صاحبان عقل ہی سمجھ سکتے ہیں)۔

قرآن مجید کی اس تصریح اور واضح بیان کی روشنی میں عالم و جاہل کے یکساں نہ ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے' لہٰذا جب عوام الناس اور خواص' علم و معرفت کے حوالہ سے ایک جیسے نہیں بلکہ خواص کا درجہ عوام سے بالاتر ہے تو وہ (خواص) تکالیف شرعیہ (خدا کی طرف سے عائد ذمہ داریوں اور فرائض و واجبات) میں بھی برابر نہیں ہوں گے اور ان کی ذمہ داریاں اور فرائض عوام الناس کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوں گے اور یہی وہ دینی امتیاز ہے جو انہیں خداوند عالم کی طرف سے عطا کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ اس امتیاز و فضیلت کی قدر دانی کریں اور دین کی مقدس و پاکیزہ تعلیمات کو اپنی عملی زندگی میں اپنائیں۔

من گھڑت باتیں کرنے والے لوگ

○ "وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ..."

(ان میں سے کچھ "امی" ہیں جو کتاب کا علم ہی نہیں رکھتے' وہ تو صرف من گھڑت و جھوٹی باتوں کو جانتے ہیں)۔

"امی" اسے کہا جاتا ہے جو نہ پڑھ سکتا ہو اور نہ لکھ سکتا ہو' "امی" کی نسبت "ام" یعنی ماں کی طرف ہے کیونکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ماں کی ممتا اور عطوفت و شفقت بچے کو معلم واستاد کے پاس جانے کی زحمت گوارا کرنے سے روکتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ تربیت کے مراحل طے نہیں کر پاتا اور اسے صرف اور صرف ماں کا سایہ شفقت و محبت حاصل ہوتا ہے اور وہ بچہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہ کر کے ہر طرح کی تعلیم و تربیت سے محروم رہتا ہے۔

''امانی'': ''امنیہ'' کی جمع ہے جس کا معنی ہے من گھڑت باتیں' پس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ یہودیوں میں دوطرح کے لوگ ہیں: کچھ وہ ہیں جو پڑھے لکھے ہیں وہ کتاب خدا کو پڑھتے ہیں اسے لکھتے ہیں لیکن اس میں تحریف کر دیتے ہیں' اور کچھ وہ ہیں جو ان پڑھ ہیں' نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں اور وہ کتاب خدا کا کچھ علم نہیں رکھتے سوائے تحریف کرنے والوں کی من گھڑت و بے بنیاد باتوں کے!۔

سخت عذاب کا شکار افراد

O ''فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ...''

(پس سخت عذاب ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب کو خود لکھ کر کہتے ہیں کہ ....)

اس آیت میں لفظ ''ویل'' ذکر ہوا ہے جو ہلاکت اور سخت عذاب کے معنے میں آتا ہے اور غم و اندوہ' ذلت و رسوائی خواری و پستی اور ہر اس چیز کو بھی ''ویل'' کہتے ہیں جس سے انسان سخت خوف کھائے (خوفناک چیز)۔

تحریف کرنے والوں کی سزا

O ''فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ...''

(پس سخت عذاب ہے ان کے لیے بوجہ ان کے اپنے ہی کئے کے، اور وہ.....)

اس آیت میں جمع کی ضمیر (ھم) کی بازگشت یا تمام بنی اسرائیل کی طرف ہے، یا صرف تورات میں تحریف کرنے والوں کی طرف ہے' بہرحال دونوں احتمالات کے اسباب موجود ہیں جن کی بناء پر ان کی توجیہ و تاویل ممکن ہے' تاہم پہلے احتمال کی صورت میں بنی اسرائیل کے ان افراد کے لیے بھی ''ویل'' (عذاب) ثابت ہوگا جو ''امی'' ہیں۔

برے کام کا برا انجام

O ''بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ...''

(ہاں جو شخص برا کام کرے اور اس کی غلطی..... غلط کاری..... اسے گھیر لے......)

عربی زبان میں ''خطیہ'' اس حالت کو کہا جاتا ہے جو غلط و برا کام انجام دینے کی وجہ سے انسان کی روح اور اس کے دل پر طاری ہو جائے' اسی وجہ سے آیت مبارکہ میں ''کسب سیئۃ'' یعنی ''جس نے برا کام انجام دیا'' کہنے کے بعد یوں کہا گیا ''وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ'' کہ اس کا گناہ اسے گھیر لے' گناہ کے گھیر لینے کا مطلب یہ ہے کہ جس انسان کو اس کا گناہ گھیر لے اس کے سامنے نجات کا ہر راستہ بند ہو جاتا ہے اور اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ گناہ کے گھیر لینے کے باعث ہدایت اس تک پہنچ ہی نہیں سکتی اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہو جاتا ہے اور دوزخ کی آگ میں جلنا ہی اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

کیونکہ اگر اس کے دل میں ذرہ بھر ایمان ہوتا یا کم از کم وہ ایسے پاکیزہ اخلاق واوصاف کا حامل ہوتا جو اسے حق وحقیقت سے محروم ہونے سے بچا لیتے مثلاً عدل وانصاف اور حق کے سامنے خضوع وسر تسلیم خم کرنا وغیرہ تو یقیناً یہ بات ممکن تھی کہ اس کا دل ہدایت کی روشنی سے منور ہو جائے اور وہ ایمان وعمل صالح کے سبب سعادت و خوش بختی کی منزل پر فائز ہو جائے' لہٰذا معلوم ہوا کہ ایمان اور پاکیزہ اخلاق واوصاف جمیلہ سے محروم شخص ہی کو اس کا گناہ گھیر لیتا ہے اور وہ اپنے برے کام کے نتیجہ میں اس حالت تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کی ہدایت وسعادت کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہونا یعنی گناہ کا اسے اس طرح گھیر لینا دراصل صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ شخص شرک اختیار کرتا ہے اور خدا کی وحدانیت کی نفی کرتے ہوئے کسی کو خدا کا شریک قرار دیتا ہے جس کے نتیجہ میں ہدایت وسعادت کی نعمتوں سے محرومی اس کا مقدر بن جاتی ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ ءنساء، آیت ۴۸:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ"

(حق یہ ہے کہ خداوند عالم ہرگز اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے' البتہ اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے)۔

اس کے علاوہ کفر اور آیات الٰہی کی تکذیب کرنا بھی اس بات کا سبب بنتا ہے کہ ایسا کرنے والے کو اس کا گناہ گھیر لے اور وہ ہدایت وسعادت کی نعمتوں سے محروم ہو جائے' جیسا کہ خدا نے فرمایا:

سورہ ءبقرہ، آیت ۳۹:

"وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ"

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی وہی جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے)۔

بنا برایں "كَسَبَ سَيِّئَةً" ...... برا کام انجام دینا ...اور "احاطة الخطيئة" ...... گناہ کا گھیر لینا...... کے الفاظ ایسے جامع کلام کی مانند ہیں جس میں "خلود فی النار" یعنی دوزخ کی آگ میں ہمیشہ جلتا رہنے کے تمام اسباب مذکور ہیں۔ (یعنی یہ دو چیزیں (برا کام کرنا اور گناہ کا گھیر لینا) جہنم میں ہمیشہ رہنے کے تمام اسباب کا خلاصہ ونچوڑ اور مجموعہ ہے)۔

یہاں اس بات کی یاد دہانی ضروری ہے کہ یہ دو آیتیں معنی کے لحاظ سے سورہ بقرہ کی آیت ۶۲ سے مشابہ ہیں جس میں یوں کہا گیا ہے:

★ "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٔيْنَ"،

(جو لوگ ایمان لائے اور وہ جو یہودی ہیں اور نصاریٰ وصابئین ہیں)۔

اس کی تفسیر پہلے ذکر ہو چکی ہے' تاہم اس آیت اور ان دو آیتوں میں صرف یہ فرق ہے کہ یہ دو آیتیں یعنی (۸۱۔ ۸۲) "بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً..." "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" اس امر کو بیان کر رہی ہیں کہ سعادت و

خوش بختی کا معیار، حقیقت ایمان اور عمل صالح ہے، نہ کہ صرف زبانی دعوے' اور پہلی آیت یعنی (۶۲) اس بات کو بیان کرتی ہے کہ سعادت و کامیابی کے حصول کا معیار، حقیقی معنے میں ایمان لانا اور نیک اعمال بجالانا ہے، نہ کہ صرف نام کی حد تک مسلمان ہونا اور اپنے آپ کو اہل ایمان کہلوانا..... بہر حال یہ لفظی فرق ہے ورنہ معنی و مفہوم کے لحاظ سے ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

روایات پر ایک نظر

یہودیوں کے ایک گروہ کا تذکرہ

تفسیر مجمع البیان میں آیت شریفہ "وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ..." کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: یہودیوں میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو مسلمانوں سے کسی قسم کا عناد اور دشمنی نہیں رکھتا تھا اور اس کے اور مسلمانوں کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ جب بھی وہ مسلمانوں سے ملے تو انہیں تورات میں مذکور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات سے آگاہ کرے گا' چنانچہ وہ لوگ ایسا ہی کرتے تھے لیکن ان کے بزرگوں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا اور ان سے کہا کہ تورات میں حضرت محمدؐ کی جو صفات ذکر کی گئی ہیں وہ مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کریں ورنہ وہ ان صفات کے حوالے سے قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے تمہارے خلاف حجت قائم کریں گے' اسی سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی: "وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ"۔

ولایت کے منکرین کا انجام

کتاب کافی میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہ السلام میں سے کسی ایک امام سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے آیت مبارکہ "بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ "اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ حضرت امیر المومنین علیؑ کی ولایت کا انکار کریں تو وہ جہنمی ہو جائیں گے اور ہمیشہ دوزخ کی آگ میں جلتے رہیں گے"۔

اس روایت سے قریب المعنی ایک روایت کتاب "الامالی" میں شیخ صدوقؒ نے بھی ذکر فرمائی ہے جو حضرت پیغمبر اسلامؐ کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے' بہر حال یہ دونوں روایتیں (جو کافی اور امالی میں مذکور ہیں) درحقیقت ایک کلی کے واضح

مصداق کے بیان پر مشتمل ہیں کیونکہ خداوند عالم نے ......اہل بیتؑ کی ......ولایت کو ''حسنۃ'' (نیکی) کا نام دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

سورہ شوریٰ، آیت ۲۳:

" قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا "

(کہہ دیجیے کہ میں تم سے رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ تم میرے قریبوں سے محبت کرنا' اور جو شخص نیکی کرے ہم اس کی نیکی میں ایک نیکی کا اضافہ کر دیں گے)۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دو روایتیں (جو کافی و امالی میں مذکور ہیں) درحقیقت اس مطلب کی تفسیر کے طور پر ہوں جو سورہ مائدہ میں ذکر کیا جائے گا کہ ولایت کا اقرار اصل میں توحید کے تقاضوں کی تکمیل سے عبارت ہے' اور اس (ولایت) کی نسبت حضرت علی علیہ السلام کی طرف اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اس امت کے سب سے پہلے فرد ہیں جن سے اس مقدس سلسلے کا آغاز ہوا ہے۔ بہر حال اس کی تفصیل سورہ مائدہ میں آئے گی۔

آیات ۸۳ تا ۸۸

○ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ
إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ (۸۳)
○ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ
دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ (۸۴)
○ ثُمَّ أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ
تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَٰرَىٰ تُفَٰدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ
عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ
يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ
الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۸۵)
○ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ
وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۸۶)
○ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ
مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ
أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ (۸۷)
وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ (۸۸)

ترجمہ

O ''اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا کہ تم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیکی کرو اور اقربائ‘ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ (نیکی کرو) اور لوگوں سے اچھی باتیں کرو اور نماز پڑھو اور زکوۃ ادا کرو‘ پھر اس (وعدہ کرنے) کے بعد تم نے منہ موڑ لیا (عہد شکنی کی) سوائے چند لوگوں کے‘ جبکہ تم سب ہی منہ موڑنے والے ہو ''۔ (۸۳)

O ''یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے وعدہ لیا کہ تم ایک دوسرے کا خون مت بہاؤ (خونریزی و قتل و غارت نہ کرو) اور ایک دوسرے کو اپنے دیار سے نکال باہر نہ کرو‘ پھر تم نے ان سب باتوں کا اقرار کیا اور تم نے گواہی بھی دی ''۔ (۸۴)

O ''پھر اس کے بعد اب تم ہی ہو کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں سے ایک گروہ کو اپنے دیس و دیار سے نکال باہر کرتے ہو اور ایک دوسرے کی مدد و تعاون سے ان پر ناجائز طور سے اور زیادتی کر کے رعب ڈالتے ہو‘ اور اگر وہ قیدی بن کر تمہارے پاس آ جائیں تو ان سے فدیہ...... تاوان...... لیتے ہو جبکہ فدیہ لینا اور انہیں اپنے دیس سے نکال باہر کرنا تمہارے لیے حرام قرار دیا گیا تھا‘ آیا تم کتاب خدا کے کچھ حصہ کو تو مانتے ہو اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو‘ پس تم میں سے جو ایسا کرے اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں رسوا ہوگا اور آخرت میں ..... قیامت کے دن..... سخت عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا‘ اور یاد رکھو کہ خداوند عالم تمہارے اعمال سے ہرگز غافل نہیں ہے''۔ (۸۵)

O ''یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے آخرت کے بدلے میں دنیا کی زندگی خریدی ہے لہٰذا ان پر عذاب کی سختی میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی ''۔ (۸۶)

O ''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے رسول بھیجے‘ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح نشانیاں دیں اور روح القدس کے ذریعے ان کی تائید و مدد کی‘ تو کیا یہ بات درست ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری مرضی اور پسند کے مطابق احکام نہ لائے تو تم تکبر کرنے لگو اور ان میں سے کچھ کو جھٹلا دو اور کچھ کو قتل کر دو؟ ''۔ (۸۷)

O ''انہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر دے پڑے ہوئے ہیں‘ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے خدا نے ان پر لعنت کی ہے‘ بہر حال ایمان لانے والے بہت ہی تھوڑے ہیں ''۔ (۸۸)

تفسیر و بیان

بنی اسرائیل سے عہد و پیمان

○ " وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ... "

(یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا......)

یہ آیت مبارکہ نہایت خوبصورت و دلکش اسلوب وطرز بیان کی حامل ہے' اس کی ابتداء غائب کے لہجہ سے اور انتہا مخاطب کے لہجہ پر ہوئی' ملاحظہ ہو:

سب سے پہلے یوں ارشاد ہوا: " وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ... " (اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا)۔

اس کے بعد انہیں مخاطب قرار دے کر یوں فرمایا: " ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ " (پھر تم نے منہ پھیر لیا عہد شکنی کی .....سوائے تم میں سے چند لوگوں کے' جبکہ تم سب ہی منہ موڑنے والے (عہد شکنی کرنے والے) ہو)۔

اس کے علاوہ یہ کہ سب سے پہلے "میثاق" کا تذکرہ ہوا جس سے مراد وعدہ لینا ہے' اور ظاہر ہے کہ وعدہ لینا بات کرنے (بذریعہ سخن و کلام) سے ہی ممکن ہوتا ہے' پھر اس کے بعد خود ہی اس میثاق کو بیان کر دیا کہ وہ کیا ہے چنانچہ پہلے "میثاق" کا تذکرہ، جملہ خبریہ کے ذریعے کیا اور یوں فرمایا: " لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ " ......تم کسی کی عبادت نہ کرو گے سوائے خدا کے...... اور پھر آخر میں جملہ انشائیہ سے (حکم کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے) یوں فرمایا: " وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا " ......اور لوگوں سے اچھی باتیں کرو......

ممکن ہے مذکورہ بالا جملوں میں لہجوں اور انداز سخن کی تبدیلی کی وجہ یہ ہو کہ سابقہ آیات میں بنی اسرائیل کے احوال کا ذکر "مخاطب" کے انداز سے شروع ہوا کیونکہ ان آیات میں بنی اسرائیل کی مذمت اور سرزنش مقصود تھی لہٰذا مخاطب کا لہجہ اختیار کر کے ساری بات کی گئی اور ابتداء سے لے کر گائے کے واقعہ کے ذکر تک یہی انداز رہا' لیکن گائے کے واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد اس انداز میں تبدیلی لائی گئی اور مخاطب کے لہجہ کو چھوڑ کر "غائب" کا لہجہ اختیار کیا گیا اور اس تبدیلی کی وجہ ہم

پہلے بیان کر چکے ہیں، ہاں آخر زیر بحث آیت تک یہی (غائب کا) لہجہ باقی رہا اور اس کی ابتداء بھی اسی انداز سے ہوئی چنانچہ ارشاد فرمایا: "اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا....." لیکن "میثاق" (وعدہ لینا) چونکہ بذریعہ گفتگو تھا اور اسے ذکر کرنا بھی مقصود تھا اس لیے اصل میثاق کا ذکر کرتے ہوئے "مخاطب" کا لہجہ اختیار کیا گیا چنانچہ یوں فرمایا: "لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ"، یہ نہی جملہ خبریہ کی صورت میں ہے اور یہ انداز یعنی نہی کو جملہ خبریہ کی صورت میں لانا موضوع کی اہمیت کا واضح ثبوت ہے اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ نہی کرنے والا جس کام سے منع کر رہا ہے اس کے وقوع پذیر نہ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں اور یہ کہ جس .... مکلف..... سے عہد و پیمان اور وعدہ لیا گیا ہے وہ اس کے منع کئے ہوئے کام سے باز نہ آئے گا اور وہ (مکلف) اس کام کو ہرگز انجام نہ دے گا، لہٰذا خداوند عالم کا یہ فرمانا کہ "لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ" یعنی تم خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو گے، اور اس کے بعد: "وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْيَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِيْنِ..."

(والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو گے اور قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ.... نیک سلوک کرو گے یہ سب جملہ خبریہ کی صورت میں ہے جبکہ پہلا فقرہ یعنی "لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ" (تم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اصل میں نہی ہے اور دوسرے فقرے یعنی "وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا..." میں امر (حکم) ہے لیکن دونوں (امر و نہی) میں جملہ خبریہ لانے کے حوالہ سے صورت حال یکساں ہے کیونکہ امر کسی کام کو انجام دینے کے حکم اور نہی کسی کام کے انجام نہ دینے کے حکم کو کہتے ہیں اور دونوں میں "حکم" کا معنی پایا جاتا ہے (لہٰذا اگر ان کے مخصوص صیغوں کی بجائے جملہ خبریہ استعمال کیا جائے تو اس سے حکم کرنے والے کے مذکورہ بالا دو تصورات کی نشاندہی ہوتی ہے جبکہ امر کو امر کے صیغہ میں اور نہی کو نہی کے صیغہ میں لانے سے ان تصورات کی عکاسی نہیں ہوتی)۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "غائب" کے لہجہ سے (جو کہ میثاق کا تذکرہ کرنے سے پہلے تھا "مخاطب" کے لہجہ میں آنا اصل موضوع کی طرف واپس آنے کی راہ ہموار کرنے کے لیے ہے اور اصل موضوع بنی اسرائیل سے کلام کرنا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ دوبارہ انہی سے مخاطب ہو کر بات کی جائے تاکہ بعد والے جملے یعنی "وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ..." (اور تم نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو، پھر تم نے منہ پھیر لیا....) کا پہلے کلام سے ربط قائم ہو اور "مخاطب" کے لہجہ کا تسلسل برقرار رہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک

○ "وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا"

اس جملہ کی تفسیر دو طرح سے ممکن ہے:

(۱)۔ امر ہے۔

(۲)۔ ایک خبر ہے جو امر کے معنے میں آئی ہے۔

پس اس کی اصل بھی دو طرح سے قابل تصور ہے،

(۱): ابتداء میں ایک جملہ (صیغہء امر) فرض کیا جائے اور اس طرح کہا جائے:

"واحسنوا بالوالدین احساناً و ذی القربی و الیتامی والمساکین"

(اور تم والدین کے ساتھ نیکی کرو، اور قریبوں، یتیموں و مسکینوں کے ساتھ (نیکی کرو)۔

یہاں جملہ (احسنوا) کا فرضی تصور کر کے آیت کا معنیٰ واضح ہو جاتا ہے۔

(۲): ابتداء میں ایک جملہ خبریہ کا تصور کر کے یوں کہا جائے:

"و تحسنون بالوالدین احساناً"

(اور تم والدین کے ساتھ نیکی کرو گے)۔

بہر حال اس آیت مبارکہ میں احسان و نیکی اور نیک سلوک کرنے کے موارد کا ذکر خاص ترتیب کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس میں اس مورد اور طبقہ کا ذکر پہلے ہوا ہے جس کی اہمیت دوسرے موارد و طبقات کی نسبت زیادہ ہے اور جس کا تعلق و قرب دوسروں کے مقابلے میں عمیق و وسیع اور فزوں ہے یعنی جو افراد احسان و نیک سلوک کا استحقاق و اہلیت زیادہ رکھتے ہیں ان کا تذکرہ پہلے ہوا اور اس کے بعد ترتیب اور استحقاق کے مراتب کے حوالہ سے دوسرے موارد و افراد کا تذکرہ کیا گیا' چنانچہ سب سے پہلے والدین کا تذکرہ کیا گیا کیونکہ ان کا مقام و مرتبہ اور احسان و نیکی کرنے کا استحقاق دوسروں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے اور وہ دونوں ایسی مضبوط بنیادوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر انسان کے وجود کی عمارت قائم ہوتی ہے اور انہی کے سہارے انسان اپنی وجودی قوتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے جبکہ عزیز و اقارب اور دیگر افراد میں سے یہ خصوصیت کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ والدین کے بعد دیگر قرابت داروں کا تذکرہ کیا گیا' پھر یتیموں کا ذکر ہوا کیونکہ وہ کمسن ہونے اور بے سہارا و بے سرپرست ہونے کی وجہ سے مسکینوں کی نسبت اور اور نیک سلوک کئے جانے کا زیادہ استحقاق رکھتے ہیں۔

"یتامیٰ"، عربی زبان میں لفظ "یتیم" کی جمع کا صیغہ ہے' یتیم اسے کہتے ہیں جس کا باپ انتقال کر گیا ہو' لیکن جس کی ماں انتقال کر گئی ہو اسے "یتیم" نہیں کہا جاتا' (شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عمومی طور پر اور شرعی لحاظ سے بچوں کی ذمہ داری اور سرپرستی کا فریضہ باپ ادا کرتا ہے اس لئے اس کی وفات کے بعد بچہ اپنے اصل و حقیقی سرپرست سے محروم ہونے کی بناء پر یتیم کہلاتا ہے اور یہ سب کچھ عرفی طور ہوتا ہے ورنہ ماں کی شفقت سے محرومی زیادہ مشکلات کا سبب بنتی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض معاشروں میں ماں سے محروم ہونے والے بچے کو بھی یتیم کہا جاتا ہے یا اس کے ساتھ یتیم جیسا سلوک یعنی شفقت و محبت کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔م)

یتیم کے معنے میں ایک قول یہ بھی ذکر ہوا ہے کہ انسانوں میں "یتیم" اسے کہتے ہیں جس کا والد فوت ہو چکا ہو لیکن انسان کے علاوہ دوسرے حیوانوں میں "یتیم" اسے کہتے ہیں جس کی ماں فوت ہو چکی ہو۔

"مساکین" ، مسکین سے جمع کا صیغہ ہے' "مسکین" اس فقیر و نادار کو کہتے ہیں جس کے پاس کوئی مال و سرمایہ

نہ ہو اور (وہ مال کمانے سے) عاجز و لاچار ہو۔

''حسنا'' مصدر ہے جو کہ صفت کے معنی میں آتا ہے، اس مقام پر مبالغہ کے طور پر ذکر ہوا ہے' ۔ اسے ''حسنا'' ......ح اور س پر زبر کے ساتھ...... بھی پڑھا گیا ہے جو کہ ''صفت مشبہ'' ہے' بہر حال آیت مبارکہ میں ''قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا'' کے جملہ کا معنی یہ ہوگا: ''قولوا للناس قولا حسناً'' یعنی لوگوں سے اچھی بات کرو' یہ حکم تمام لوگوں کے ساتھ حسن معاشرت اور اچھا سلوک کرنے کی طرف کنایہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور لوگوں میں مومن و کافر سب شامل ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر آیت میں ''لِلنَّاسِ'' سے تمام لوگ مراد لیے جائیں کہ جن میں مومن و کافر سب شامل ہیں اور حسن معاشرت کا حکم سب کی بابت ہو تو پھر کافروں کے ساتھ جنگ و قتال کرنے کے حکم پر مشتمل آیت کا معنی کیا ہوگا؟ اور آیا یہ آیت وجوب قتال کے حکم پر مشتمل آیت کے ذریعے منسوخ سمجھی جائے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں اور حسن معاشرت کا حکم وجوب قتال کے حکم سے منافات نہیں رکھتا اور نہ ہی کافروں کے ساتھ جنگ و قتال کے حکم پر مشتمل آیت، حسن معاشرت کے حکم پر مشتمل زیر بحث آیت کو منسوخ و بے اثر کرتی ہے کیونکہ یہ دو الگ الگ موضوع ہیں اور دونوں کے موارد مختلف ہیں لہٰذا کوئی ایک حکم، دوسرے حکم کی نفی نہیں کرتا اور یہ بات ممکن ہے کہ حسن معاشرت کا حکم بھی موجود ہو اور قتال کا حکم بھی دیا جائے (دونوں کی شرائط و حالات اور اقتضائے زمان و مکان مختلف ہیں) جیسا کہ یہ ممکن ہے کہ حسن معاشرت کے باوجود تادیبی طور پر سخت کلامی کی جائے اور ان دونوں میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی (حسن معاشرت کرنے کا حکم تادیبی طور پر سخت کلامی کرنے کے حکم کی نفی نہیں کرتا)۔

خوں ریزی کی ممانعت

○ ''لَا تَسْفِكُونَ دِمَآءَكُمْ''

(ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ)

یہ جملہ بھی پہلے جملہ ''لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ'' کی طرح انشاء ہے جو کہ خبر کی صورت میں ذکر ہوا ہے' یعنی یہ جملہ خبریہ، حکم کے معنی میں ہے اور اصل میں یوں ہے: ''تم ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ''۔ جبکہ جملہ خبریہ کا ظاہری ترجمہ یوں ہے: ''تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاتے / نہیں بہاؤ گے''۔

عربی زبان میں ''سفک'' بہانے اور انڈیلنے کے معنے میں آتا ہے۔

باہمی پشت پناہی!

○ "تَظٰهَرُونَ عَلَيْهِم ..."

"تَظٰهَرُ" ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے معنی میں آتا ہے اور "ظهیر" کا معنی مددگار ہے جو کہ "ظہر" سے بنا ہے جس کا معنی ہے پشت (پیٹھ) اس کی وجہ مناسبت یہ ہے کہ مددگار انسان کی پیٹھ مضبوط کرتا ہے (پشت پناہ ہوتا ہے)۔

ایک ممنوع عمل کا ذکر

○ "وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ"

اس جملہ میں ضمیر "ھو" ادبی اصطلاح میں ضمیر شان وضمیر قصہ کہلاتی ہے اگر چہ ظاہری طور پر اس کا ترجمہ "وہ" کیا جاتا ہے لیکن ضمیر شان وقصہ ہونے کے حوالہ سے اس کا ترجمہ "وہ" کی بجائے (درحقیقت)۔ "حقیقت یہ ہے"۔ کیا جائے گا جیسا کہ "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" میں ہے یعنی اس میں بھی ضمیر "ھو" کا معنی "وہ" کی بجائے ضمیر شان وقصہ کا معنی مراد ہے: "کہہ دیجئے (حقیقت میں) خدا ایک ہے"۔

ایمان اور کفر کا ساتھ ساتھ ہونا کیونکر؟

○ "أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ ..."

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ: فدیہ لینے اور انہیں نکال باہر کرنے میں کیا فرق ہے کہ تم نے فدیہ لینے کے حکم پر تو عمل کرلیا ہے اور انہیں نکال باہر کرنے کی حرمت میں صادر ہونے والے حکم کو چھوڑ دیا ہے جبکہ وہ دونوں حکم کتاب الٰہی مذکور ہیں، تو آیا تم کتاب خدا کے کچھ حصہ کو مانتے ہو اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو؟

○ "وَقَفَّيْنَا ..."

"قَفَّيْنَا" صیغۂ جمع متکلم ہے اور اس کا مصدر "تقفیہ" ہے جس کا معنی پیروی کرنا اور پیچھے چلنا ہے (ایک کا دوسرے کی پشت گردن کو نظر میں رکھ کر پیچھے چلنا)

○ "وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ"

(اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح دلیلیں دیں)

اس جملہ کی تفسیر سورہ آل عمران میں بیان کی جائے گی۔

دلوں پر پردے!

O "وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ..."

"غلف"، اغلف کی جمع کا صیغہ ہے جو کہ "غلاف" سے مشتق ہے اس جملہ کا معنی یوں ہوگا: ہمارے دل غلافوں پردوں اور حجابوں میں ہیں (قلوبنا محفوظة تحت لفائف واستار و حجب)، یہ جملہ سورہ حم سجدہ میں مذکور جملہ کی مانند ہے جس میں کہا گیا ہے:

"وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ" (سورہ حم سجدہ۔آیت ۵)

(انہوں نے کہا: ہمارے دل پردوں میں ہیں اس چیز کی بابت جس کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے)

بہرحال یہ الفاظ اس بات کا کنایہ۔۔اور اشارہ کے طور پر۔۔ ہیں کہ جس چیز کی طرف انہیں بلایا جا رہا ہے وہ اس بلاوے کو سن ہی نہیں سکتے۔

روایات پر ایک نظر

اچھی باتیں کرنے کا حکم

کتاب اصول کافی میں حضرت امام ابوجعفر علیہ السلام نے آیت مبارکہ "وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

(قولوا للناس احسن ما تحبون ان يقال فيكم)

(لوگوں سے اس سے بھی اچھی باتیں کرو جو اپنے بارے میں چاہتے ہو کہ تمہارے لیے کی جائیں)۔

یعنی تم جو کچھ اپنے لیے پسند کرتے ہو کہ لوگ تمہارے بارے میں اس طرح بات کریں تو اس سے بھی زیادہ اچھی بہتر بات لوگوں کے لیے کرو۔

کتاب کافی ہی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(قولوا للناس، ولا تقولوا الا خيرا حتى تعلموا ما هو؟)

(لوگوں سے باتیں کرو۔ان کے متعلق اظہار رائے کرو۔لیکن بات کرنے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لو آیا وہ بہتر ہے یا نہیں)۔۔اگر بہتر ہے تو ضرور کرو، ورنہ کچھ نہ کہو۔۔۔

امام محمد باقر کا ارشاد گرامی

کتاب معانی الاخبار میں ہے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

(قولوا للناس احسن ما تحبون ان یقال لکم ، فان الله عزوجل یبغض السباب اللعان الطعان علی المومنین الفاحش المفحش السائل و یحب الحیی الحلیم العفیف المتعفف)

(لوگوں کے بارے میں اس سے بھی اچھی بات کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو کہ تمہارے بارے میں کی جائے کیونکہ خداوند عالم مومنین پر سب وشتم، طعن وتشنیع، فحش کلامی کرنے اور بیہودہ باتیں کرنے والے کا سخت دشمن ہے۔۔اور اس سے نفرت کرتا ہے۔۔جبکہ اس کے مقابلے میں صاحب حیا، حلیم وبردبار اور پاکدامن وباکردار شخص سے محبت کرتا ہے)۔

تبصرہ: کافی میں مذکور حدیث کی مانند ایک حدیث دوسرے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی بیان کی گئی ہے، اسی طرح تفسیر العیاشی میں بھی اس طرح کی ایک حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔اور دوسری حدیث کی مانند ایک اور حدیث بھی کافی میں حضرت امام جعفر صادق ؑ سے منقول ہے اور تیسری حدیث کی مانند تفسیر العیاشی میں ایک حدیث حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے، ان تمام احادیث سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آئمہ علیہم السلام نے یہ تمام مطالب آیت مبارکہ میں مذکور لفظ "حسنا" سے استفادہ کئے ہیں جو کہ متکلم کے حوالہ سے بھی مطلق ہے اور مورد کے لحاظ سے بھی مطلق ہے لہٰذا اس "اطلاق" (ہر طرح کی قیدوشرط سے خالی) سے استفادہ کرتے ہوئے آئمہ ؑ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "جو کچھ" اپنے لیے پسند کرتے ہو کہ لوگ تمہارے بارے میں اس طرح بات کریں تو اس سے زیادہ بہتر بات لوگوں کے بارے میں کرو۔

پانچ تلواروں میں سے ایک!

کتاب تفسیر العیاشی میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپ ؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پانچ تلواریں دے کر مبعوث فرمایا ان میں سے ایک تلوار (شمشیر اخلاق) اہل ذمہ کے لیے دی جس کی بابت یوں ارشاد فرمایا: "وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" یہ آیت اہل ذمہ کے بارے میں نازل ہوئی، پھر اس آیت کو دوسری آیت نے منسوخ کر دیا جس میں یوں ارشاد فرمایا: "قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ" ۔۔جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے۔۔۔

اس روایت میں امام علیہ السلام نے آیت مبارکہ کے لفظ "قُوْلُوْا" کے "اطلاق" سے استفادہ کیا کیونکہ اس سے کلام کرنا اور ہر طرح کا ربط وتعلق قائم کرنا سمجھا جاتا ہے مثلاً جب یہ کہا جائے کہ "فلاں شخص سے نیکی اور اچھائی کے علاوہ کوئی بات نہ کرو" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ربط وتعلق قائم نہ کرو سوائے نیکی اور اچھائی کے اور اس سے کسی

طرح کی چھیڑ چھاڑ نہ کرو۔ سوائے نیکی اور نیک سلوک کرنے کے اسے چھوؤ تک نہیں۔' البتہ ہماری یہ بات اس صورت میں درست قرار پاسکتی ہے جب امام علیہ السلام کی مراد لفظ "نسخ" سے اس کا مخصوص معنی ہو یعنی وہ معنی جو اصطلاح میں کیا جاتا ہے' تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد "نسخ" کا عام معنی ہو کہ جس کی بابت سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۶ "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا" کی تفسیر میں تفصیلی بحث کریں گے۔ بہر حال "نسخ" اپنے اس عام اور وسیع معنی کے ساتھ آئمہ علیہم السلام کے بیانات میں کثرت کے ساتھ مذکور ہے لہٰذا یہ دو آیتیں یعنی زیر بحث آیت "وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" اور آیت "قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ" اپنے مورد کے لحاظ سے یکساں نہیں بلکہ دونوں کے موارد مختلف ہیں اور ان میں کسی قسم کا تعارض اور ایک دوسرے کی نفی کا پہلو موجود نہیں...... جبکہ "نسخ" میں مورد کا ایک ہونا ضروری ہوتا ہے۔

آیات ۸۹ تا ۹۳

○ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ
يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

○ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ
مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

○ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

○ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ
وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا
يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

ترجمہ

O ''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب آئی جو کہ اس...... کتاب...... کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے اور وہ اس سے پہلے...... اسی کتاب کی وجہ سے...... کافروں پر غلبہ پانے کی تمنا کرتے تھے' پس جب وہ...... کتاب...... کہ جسے وہ پہچانتے اور اس کی معرفت رکھتے تھے ان کے پاس آ گئی تو انہوں نے اس پر ایمان لانے سے انکار کر دیا' پس کافروں پر خدا کی لعنت ہے''۔ (۸۹)

O ''کس قدر برا سودا کیا ہے ان لوگوں نے کہ اپنے آپ کو ہی بیچ ڈالا ہے اس بات کے بدلے میں کہ جو کچھ بھی خدا نے نازل کیا ہے ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیں اور انہوں یہ سب کچھ اس حسد کی بناء پر کیا کہ خدا نے (اپنی کتاب کو اپنی خصوصی عنایت کے ذریعے) اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہا اس پر کتاب کیوں نازل کر دی اور اسے اپنی عنایات کا مستحق قرار دے دیا' پس وہ لوگ اپنے اس عمل کی وجہ سے (خدا کے) غضب سے دوچار ہو گئے اور کافروں کے لیے تو ہے ہی ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب''۔ (۹۰)

O ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل فرمایا ہے اس پر ایمان لے آؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اسی چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے۔ اور وہ اس کے سوا ہر چیز کا انکار کرتے ہیں' جبکہ وہ (قرآن) حق ہے اور جو ان کے پاس ہے (تورات) اس کی تصدیق کرتا ہے' ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے تھے تو تم اس سے پہلے خدا کے پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے تھے''؟۔ (۹۱)

O ''یقیناً تمہارے پاس موسیٰ واضح نشانیاں لے کر آئے' پھر تم نے ان کے بعد بچھڑے کو خدا مان لیا اور تم نے اس طرح سے اپنے اوپر ظلم کر لیا''۔ (۹۲)

O ''یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لے لیا اور کوہ طور کو تمہارے اوپر آویزاں کر دیا...... اور تم سے کہا کہ...... جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے لے لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے سنو' تو کہنے لگے کہ ہم نے سب کچھ سن لیا ہے مگر (سننے کے باوجود) اس کی نافرمانی کی ہے' اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کفر کی وجہ سے بچھڑے کی محبت اپنے دل میں ڈال لی' ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم ایمان والے ہو تو تمہارا ایمان تمہیں بہت ہی برا حکم دیتا ہے (بری راہ پر لگاتا ہے)''۔ (۹۳)

تفسیر و بیان

نزول قرآن کا ذکر

○ "وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ"

سیاق کلام و اسلوب سخن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں لفظ "کتاب" سے مراد قرآن ہے۔

یہودیوں کی تمنا و انتظار

○ "وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا..."

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام محمدؐ کی بعثت سے پہلے، کفار عرب یہودیوں کو تنگ کرتے تھے اور ان سے جھگڑتے رہتے تھے چنانچہ یہودی آنحضرتؐ کے تشریف لانے کی آرزو و تمنا کرتے رہتے تھے یعنی اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ جب پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ تشریف لائیں گے اور ہجرت کریں گے تو ان کی وجہ سے ہماری پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور ہم ان کے سایۂ عنایت میں رہ کر کفار عرب پر غلبہ پالیں گے' یہودیوں کی یہ تمنا و اظہار اس قدر عام ہو گیا کہ ہجرت سے پہلے ہی کفار عرب بھی ان کے ارادوں سے مطلع ہو گئے اور وہ اس بات سے باخبر ہو گئے کہ یہ لوگ (یہودی) پیغمبر اسلامؐ کی بعثت اور ہجرت کے منتظر ہیں، چنانچہ لفظ "وکانوا" اس بات کی دلیل ہے کہ کفار عرب کے سامنے وہ (یہودی) آنحضرتؐ کے ذریعے ان (کفار) پر فتح پانے کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

پہچاننے کے بعد انکار

○ "فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ"

اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ جب ان...... یہودیوں...... کے پاس وہ آ گیا جسے وہ پہچانتے تھے یعنی پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں جو نشانیاں انہیں معلوم تھیں اور وہ یہ جانتے تھے کہ ان اوصاف کا حامل شخص، پیغمبر اسلامؐ ہے تو جب وہ (پیغمبر اسلامؐ) تشریف لے آئے اور انہوںؑ (یہودیوں) نے ان تمام اوصاف اور نشانیوں کو آنحضرتؐ میں پالیا تو اس کے باوجود ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا' گویا جاننے اور پہچاننے کے باوجود اور توریت میں مذکور نشانیوں اور صفات کی تطبیق کے بعد بھی

انہوں نے آنحضرتؐ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور کافر ہو گئے۔

بغاوت اور حسد کا نتیجہ

○ ''بِئْسَمَا اشْتَرَوْا''

یہ جملہ ان (یہودیوں) کے کفر اختیار کرنے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے سے انکار کرنے کی وجہ اور سبب کو بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ ان کے ایسا کرنے کی واحد، وجہ بغاوت اور حسد تھا۔

آیت مبارکہ میں لفظ ''بغیاً'' ادبی قواعد کی رو سے مفعول مطلق نوعی ہے کہ جو اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کا کفر اختیار کرنا ایک خاص وجہ سے تھا (حسد کرتے ہوئے)۔ اور جملہ ''ان ینزل اللہ'' کا تعلق ''بغیاً'' سے ہے یعنی ان کا حسد اس لیے تھا کہ خداوند عالم نے اپنے فضل وکرم اور خاص عنایت سے اپنی کتاب بندوں میں سے اپنے ہی ایک پسندیدہ بندے پر کیوں نازل کی ہے۔

پے در پے غضب الٰہی

○ ''فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ''

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے پے در پے غیض وغضب کا شکار ہو گئے یعنی تورات کے انکار کی وجہ سے پہلے ایک غضب کا شکار ہوئے، پھر اس کے بعد دوسرا غضب الٰہی اس وقت ان پر آیا جب انہوں نے قرآن کا انکار کر دیا۔

بہر حال آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ (یہودی) حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت وہجرت سے پہلے آنجنابؐ کے حامی ومددگار گردانے جاتے تھے اور آنحضرتؐ کے وجود مسعود اور آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب کے سہارے کافروں پر غلبہ پانے کا اظہار کرتے تھے لیکن جب آنحضرتؐ تشریف لے آئے اور ان پر قرآن بھی نازل ہو گیا اور انہوں نے آنحضرتؐ کو ان اوصاف ونشانیوں کا حامل پا لیا جو انہیں آپؐ کے بارے میں معلوم تھیں اور اچھی طرح اس بات سے آگاہ ہو گئے کہ یہ وہی شخصیت ہیں جن کے حوالے سے وہ کافروں پر فتح وغلبہ پانے کی امید رکھتے تھے اور ان کی تشریف آوری کے شدت کے ساتھ منتظر تھے تو ان کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ غرور وتکبر کا شکار ہو گئے چنانچہ انہوں نے آنحضرتؐ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور ان کی بابت انجان بن گئے' صرف یہی نہیں بلکہ اپنی کی ہوئی باتوں کے بھی منکر ہو گئے' ان کا ایسا کرنا اسی طرح تھا جیسے انہوں نے اس سے پہلے تورات کا انکار کر دیا تھا' تو گویا یہ ان کا دوسرا کفر تھا اس طرح سے وہ کفر پر کفر کے مرتکب ہو گئے۔

تورات کے منکر

○ "وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ"

یعنی وہ تورات کے سوا ہر چیز کا انکار کرتے ہیں اور اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ صرف تورات کو مانتے ہیں۔۔لیکن یہ ان کا زبانی دعویٰ ہے۔۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس (تورات) کو بھی نہیں مانتے جو ان پر نازل کی گئی ہے۔

انبیاء الٰہی کا قتل؟

○ "قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ"

"فلم" میں حرف (ف) تفریع کے لیے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جملہ ان (یہودیوں) کے دعوے کی فرع ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ "نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا" ہم اسی پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے' تو خداوند عالم فرما رہا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے تھے تو پھر تم انبیاء الٰہی کو کیوں قتل کرتے تھے؟ اور تم نے موسیٰ کا انکار کر کے بچھڑے کی پرستش کیوں کی؟ اور تم نے عہد و پیمان کے وقت اور اس وقت جب کوہ طور کو تمہارے سروں پر آویزاں کر دیا گیا تھا یہ کیوں کہا کہ "ہم نے سن لیا ہے اور ہم نے نافرمانی کی ہے؟ "۔

بچھڑے کی محبت

○ "وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ"

"اشراب" (۔۔اشربوا۔۔کا باب افعال) سے مراد پلانا' سیراب کرنا ہے'

اور آیت مبارکہ میں لفظ "الْعِجْلَ" استعمال کیا گیا ہے تو "العجل" (بچھڑے) سے یہاں مراد اس کی محبت ہے اور "حب العجل" یعنی بچھڑے کی محبت کے الفاظ کی جگہ "العجل" (بچھڑے) کا لفظ ذکر کر دیا گیا ہے تو یہ مبالغے کی نشاندہی کرتا ہے یعنی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت اس حد تک سرایت کر گئی تھی کہ گویا خود بچھڑا ہی ان کے دلوں میں جاگزین ہو گیا ہے، اس لیے "فِي قُلُوبِهِمُ" (ان کے دلوں میں) کہا گیا' پس کلام الٰہی میں دو استعارے یا ایک استعارہ اور ایک مجاز استعمال ہوا ہے۔

خدائی سرزنش واستہزاء

○ " قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ "

یہ جملہ ایک طرح کا نتیجہ اور بطور خلاصہ، بنی اسرائیل کے اعمال یعنی انبیاء کو قتل کرنے' موسیٰ کا انکار کرنے اور تکبر کرتے ہوئے معصیت کے ارتکاب کا اظہار کرنے پر خدا کی طرف سے ان کی سرزنش کا بیان ہے' اور اس میں ان کے ساتھ استہزاء یعنی ان کا مذاق اڑانے کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ تمہارا ایمان تمہیں کس طرح کے اعمال انجام دینے کا حکم دیتا ہے!

روایات پر ایک نظر

یہودیوں کی کہانی، امام جعفر صادق ؑ کی زبانی

کتاب تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ " وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ . . . " کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: یہودیوں نے اپنی کتب میں پڑھ رکھا تھا کہ رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام ہجرت "عیر" اور "احد" کی پہاڑیوں کے درمیان ہوگا، اس لیے وہ اس مقام کی تلاش میں نکل پڑے اور چلتے چلتے ایک پہاڑ تک پہنچ گئے جسے "حداد" کہا جاتا تھا اور کہنے لگے کہ "حداد" اور "احد" ایک ہی ہیں (ایک ہی پہاڑ کے دو نام ہیں یا پھر تلفظ کا فرق ہے)۔ پھر وہاں سے گروہ گروہ بن کر مختلف مقامات میں چلے گئے' کچھ لوگ "تیما" کے علاقے میں کچھ "فدک" میں اور کچھ لوگ "خیبر" میں قیام پذیر ہو گئے۔ ایک دفعہ "تیما" میں مقیم لوگوں نے اپنے دوسرے بھائیوں (اور ساتھیوں) سے ملاقات کی خواہش کی' اس دوران ایک اعرابی وہاں سے گزرا تو انہوں نے اس سے کچھ اونٹ کرایہ پر لیے' اس دیہاتی عرب نے ان سے کہا کہ میں تمہیں "عیر" اور "احد" کی پہاڑیوں کے درمیان سے لے جاؤں گا انہوں نے کہا کہ جب "عیر" اور "احد" کے درمیانی علاقے سے عبور کرنے لگیں تو ہمیں آگاہ کر دینا۔ چلتے چلتے جب وہ سرزمین مدینہ میں پہنچا تو اس نے ان سے اشارہ کر کے کہا کہ وہ "عیر" ہے اور یہ "احد" ہے..... اور یہ جگہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان میں واقع ہے..... وہ لوگ اس جگہ پر اترے اور انہوں نے اس عرب سے کہا کہ اب ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے ہیں اب ہمیں آپ کی سواری ..... اونٹ ..... کی ضرورت نہیں، اب آپ جہاں جانا چاہتے ہیں چلے جائیں، اس کے بعد انہوں نے اپنے ان بھائیوں کو جو "فدک" اور "خیبر" میں قیام پذیر تھے خط لکھا کہ ہم اس مقام ..... مقام ہجرت ..... پر پہنچ

گئے ہیں آپ بھی ہمارے پاس آ جائیں' انہوں نے جواب بھیجا کہ ہم نے یہاں پر مستقل سکونت اختیار کر لی ہے اور کام کاج و روزگار میں مصروف ہیں اور ہم فاصلے کے لحاظ سے آپ سے زیادہ دور بھی نہیں لہٰذا جب بات پوری ہو جائے...... پیغمبر اسلامؐ ہجرت کر کے تشریف لے آئیں...... تو ہم فوراً آپ کے پاس آ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ اسی مقام پر قیام پذیر ہو گئے اور کافی مال و دولت جمع کر لی' جب ان کے بہت زیادہ مالدار ہونے کی اطلاع ''تبع'' نامی بادشاہ کو ہوئی تو اس نے ان پر حملہ کر دیا' وہ اس سے بچنے کے لیے قلعوں میں چھپ گئے' ''تبع'' نے ان کا محاصرہ کر لیا اور پھر انہیں امان دے دی' وہ اس کے پاس آئے تو اس نے ان سے کہا کہ مجھے یہ علاقہ بہت پسند آیا ہے اور میں یہاں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں' انہوں نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اللہ کے نبی کی ہجرت کا مقام ہے لہٰذا جب تک وہ ہجرت کر کے یہاں نہ آ جائیں کوئی شخص...... بادشاہ کے طور پر...... یہاں قیام پذیر نہیں وہ سکتا' ان کا جواب سن کر ''تبع'' نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر میں اپنے خاندان کے کچھ افراد یہاں چھوڑ جاتا ہوں وہ تم لوگوں کے ساتھ یہاں قیام کریں گے تا کہ جب وہ (پیغمبر) تشریف لائیں تو یہ ان کی مدد کریں اور ان کا ساتھ دیں' چنانچہ اس نے دو قبیلوں ''اوس'' اور ''خزرج'' کو ان کے پاس ٹھہرا دیا' اور جب ان دو قبیلوں نے وہاں اپنا ٹھکانہ مضبوط کر لیا اور ان کی تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ ان (یہودیوں) کے اموال پر ٹوٹ پڑے اور طرح طرح سے ان کے مال و دولت پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا۔ بالآخر یہودی ان سے کہنے لگے کہ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائیں گے تو ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال باہر کریں گے اور اپنے اموال تم سے واپس لے لیں گے' پس جب خداوند عالم نے حضرت محمدؐ کو مبعوث فرمایا تو وہی انصار (اوس اور خزرج قبیلوں کے افراد) آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے مگر یہودیوں نے آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا' اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۚ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ'' (اور وہ اس سے پہلے...... حضرت محمدؐ کی بعثت و ہجرت اور آپؐ کی تشریف فرمائی کے حوالہ سے...... کافروں پر فتح و غلبہ پانے کی امید و اظہار کرتے تھے' پس جب ان کے پاس وہ (محمدؐ) آ گئے کہ جنہیں وہ پہچان چکے تھے تو انہوں نے ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا پس خدا کی لعنت ہو کافروں پر)۔

ابن عباس کی روایت

تفسیر درمنثور میں ابن اسحاق' ابن جریر' ابن منذر' ابن ابی حاتم' اور ابونعیم کے حوالوں سے ذکر کیا گیا ہے کہ ابن عباس نے کہا: یہودی حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے ''اوس'' اور ''خزرج'' قبیلوں کے افراد پر فتح و غلبہ پانے کے لیے آنحضرتؐ کی تشریف آوری کے منتظر رہتے تھے اور ''اوس'' و ''خزرج'' والوں سے کہا کرتے تھے کہ جب وہ (محمدؐ) تشریف لائیں گے تو ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال باہر کر دیں گے' لیکن جب خدا نے آنحضرتؐ کو عربوں میں سے مبعوث فرمایا تو انہوں (یہودیوں) نے ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور آنحضرتؐ کے بارے میں جو کچھ کہہ

چکے تھے اس کے منکر ہو گئے' چنانچہ "معاذ بن جبل" اور "بشر بن ابی البراء" اور "داؤد بن سلمہ" نے ان سے کہا کہ اے یہودیو! خدا سے ڈرو اور اسلام قبول کرلو تم تو ہم پر فتح و غلبہ پانے کے لیے ان کی تشریف آوری کے منتظر تھے جبکہ ہم اس وقت شرک اختیار کئے ہوئے تھے اور تم ہمیں پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کے بارے میں بتاتے رہتے تھے اور ان کے اوصاف ہمارے سامنے بیان کرتے تھے' اس کے جواب میں "بنی نضیر" کے ایک شخص "سلام بن مشکم" نے کہا کہ یہ شخص (محمدؐ) وہ کچھ نہیں لائے جو ہم جانتے ہیں اور یہ وہ نہیں جس کے بارے میں ہم تمہیں بتاتے تھے اور جس کا تذکرہ کیا کرتے تھے' اس وقت خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: "وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ..."

اسی طرح تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ ابونعیم نے کتاب دلائل میں "عطاء" اور "ضحاک" کے حوالہ سے ذکر کیا۔ کہ ابن عباس نے کہا: بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہودی حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل خداوند عالم سے کفار پر فتح و غلبہ پانے کی دعا کرتے تھے اور کافروں سے اظہار نفرت کرتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے تھے: پروردگارا! اپنے پیارے نبی (محمدؐ) کے حق کا واسطہ! ہمیں کافروں پر فتح و غلبہ عطا فرما اور انہیں (کفار کو) شکست دے" جب وہ تشریف لائے کہ جنہیں پہچان چکے تھے (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان (یہودیوں) کو کسی طرح کا کوئی شک وشبہ باقی نہ رہا تو انہوں نے ان (محمدؐ) پر ایمان لانے سے انکار کر دیا (کفر اختیار کر گئے)۔

مذکورہ بالا دو روایتوں میں جو مطالب ذکر کئے گئے ہیں ان سے ملتے جلتے مطالب پر مبنی دیگر روایات بھی وارد ہوئی ہیں جو اسناد کے لحاظ سے ان روایتوں سے مختلف ہیں' بعض مفسرین نے دوسری روایت اور اس جیسی دیگر روایات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ روایت، اسناد اور راویوں کے حوالے سے بھی ضعیف ہے اور قابل اعتماد نہیں اور اس سلسلے میں دیگر روایات وارد ہوئی ہیں ان سے بھی مطابقت نہیں رکھتی اور معنی و مفہوم کے لحاظ سے بھی "شاذ" ہے (کسی دوسری روایت میں اس جیسے مطالب مذکور نہیں' یا بہت کم موجود ہیں) کیونکہ اس (دوسری روایت) میں "استفتاح" یعنی کافروں پر فتح و غلبہ پانے کی تمنا کی تفسیر حضرت محمدؐ کی ذات کے حوالہ سے دعا کرنے اور بعض روایات میں آنحضرتؐ کے حق کا حوالہ دے کر دعا کرنے سے کی گئی ہے جبکہ اس طرح دعا کرنا (یعنی خدا کو کوئی "حق" جتلا کر کچھ طلب کرنا) جائز نہیں اور نہ کسی کا کوئی حق خدا پر بنتا ہے کہ اس کا حوالہ دے کر دعا کی جائے۔

یہ تھا بعض مفسرین کا بیان' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ بیان اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انہوں نے "حق" اور "قسم" کے معنے پر اچھی طرح غور نہیں کیا' اس کی وضاحت یوں ہے کہ "قسم" درحقیقت کسی خبر یا انشاء کو کسی باعظمت حرمت والی چیز کے ساتھ اس کی عظمت و حرمت کی وجہ سے وابستہ کر کے بیان کرنے سے عبارت ہے یعنی قسم کھانے والا جب کوئی واقعہ بیان کرے یا کسی کو کسی کام کے کرنے کا حکم یا کسی کام سے منع کرے تو اسے کسی پاکیزہ و بلند پایہ شخص یا چیز سے اس طرح وابستہ کرے کہ اس واقعہ کی صحت اور حکم یا منع کرنے کی اہمیت اس پاکیزہ و بلند پایہ شخص یا چیز سے مربوط ہو جائے'

اگر وہ واقعہ (جس کی خبر دی گئی ہے) صحیح نہ ہو یا امر و نہی کی اطاعت نہ کی جائے تو اس پاکیزہ و بلند پایہ شخص یا چیز کی عظمت و حرمت پامال ہو جائے گی، مثلاً جب آپ کسی سے کہیں: مجھے میری زندگی کی قسم! زید کھڑا ہے' تو اس جملے میں آپ نے اپنے بیان کا صحیح ہونا اپنی زندگی کی عظمت وحرمت کے ساتھ مربوط کر دیا ہے کہ اگر آپ کی بات غلط ثابت ہو جائے تو اس سے آپ کی زندگی کا آپ کی نظر میں بے قدر و قیمت ہونا ثابت ہوگا' اسی طرح اگر آپ کسی کو کچھ کرنے کا حکم دیں یا کسی کام سے روکیں اور یوں کہیں: تمہیں میری جان کی قسم! یہ کام انجام دو' یا یوں کہیں: تمہیں میری جان کی قسم! یہ کام انجام نہ دو' تو گویا آپ نے اپنے حکم یا منع کرنے کی اہمیت کو اپنی جان سے وابستہ و مربوط کر دیا ہے کہ اگر وہ شخص آپ کے حکم پر عمل نہ کرے یا آپ کے منع کرنے پر کان نہ دھرے تو گویا اس نے آپ کی جان کو اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھا اور اس کی نظر میں آپ کی جان کی اتنی اہمیت ہی نہیں کہ وہ اس کے حوالہ سے آپ کی بات پر عمل کرے۔

اس بیان سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں:

۱۔ ''قسم''، کسی بیان کی تاکید کے لیے سب سے بلند مرتبہ انداز کی ایک صورت ہے' (جیسا کہ اہل ادب نے بھی اس کی تصدیق کی ہے)۔

۲۔ جس چیز کی قسم کھائی جائے وہ اس کام یا واقعہ کی صحت سے زیادہ اہمیت کی حامل ہو جس کے لیے وہ قسم کھائی گئی ہے' ورنہ جس چیز کی قسم کھائی جائے اگر وہ عظمت وحرمت کے لحاظ سے اس چیز یا کام سے کم درجہ اہمیت کی حامل ہو جس کے لیے وہ قسم کھائی گئی ہے تو یہ درست نہ ہوگا بلکہ بے معنی کہلائے گا' یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں کہیں اپنی مقدس ذات کی قسم کھائی اور کہیں اپنی پاکیزہ صفات کی' چنانچہ ارشاد فرمایا:

سورہء انعام آیت ۲۳:

''وَاللّٰهِ رَبِّنَا'' (اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے)

سورہء حجر آیت ۹۲:

''فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ'' (تیرے پروردگار کی قسم! ہم ضرور ان سے سوال کریں گے)

سورہء ص آیت ۸۲:

''فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ'' (شیطان نے کہا: تیری عزت کی قسم! میں ضرور انہیں گمراہ کردوں گا)

اور کبھی اپنے پیغمبر' اپنے فرشتوں' اپنی مقدس کتابوں کی قسم کھائی اور کئی مقامات میں اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کی قسم کھائی مثلاً: آسمان' زمین' سورج' چاند' ستارے' رات' دن' پہاڑ' دریا' شہر' انسان' درخت' انجیر و زیتون وغیرہ' اور یہ سب کچھ صرف اس لیے ہے کہ ان تمام چیزوں کو ذاتی حیثیت میں خدا کی خاص توجہ کا مرکز قرار پانے کی وجہ سے عزت وحرمت حاصل ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک چیز یا تو خداوند عالم کی پاکیزہ صفات میں سے کسی ایک صفت کی عکاس ہے یا پھر کوئی ایسا کام ہے جو اس مقدس و عظیم سرچشمہء فیض و کرم سے منسوب ہے...... بہرحال تمام چیزیں ذات حق تعالیٰ کی عظمت و بزرگی کے پرتو

سے عزت وحرمت کا شرف رکھتی ہیں...... لہٰذا اگر کوئی دعا مانگنے والا خدا سے کچھ طلب کرے اور اپنی دعا میں ان چیزوں میں
سے...... اس حیثیت سے کہ انہیں خدا نے شرف عطا فرمایا ہے اور ان کی قسم کھائی ہے...... کسی کا حوالہ دے کر مانگے تو اس میں
کیا حرج ہے؟ آیا ایسی صورت میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود مسعود کو اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ قرار
جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، مجھے اپنی جان کی قسم! حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت خدا کے نزدیک عرا
کی زنجیر کے درخت یا شام کے زیتون (کہ جن کی قسم خدا نے کھائی ہے) سے ہرگز کم نہیں، جبکہ خداوند عالم نے خود
آنحضرتؐ کی جان کی قسم کھائی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

سورہ حجر آیت ۷۲:

"لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ"۔

(اے رسول! تیری جان کی قسم! لوگ اپنی مستیوں میں کھوئے ہوئے ہیں)۔

اور "حق"...... کہ جس کے مقابل میں "باطل" ہے...... دراصل عالم خارج میں پائی جانے والی ایک ایسی حقیقت
سے عبارت ہے جو وجود اور "ہونے" کی صفت کی حامل ہے اور اسے "حق" بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ "ہے" یعنی ثابت
واقع ہے، مثلاً زمین، انسان وغیرہ۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اپنے وجود میں "ثبوت" اور تحقق کے مقام تک پہنچی ہوئی ہو اور ا
"ہے" کہا جاسکتا ہو اسے "حق" کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے، چنانچہ مالی حقوق اور دیگر تمام معاشرتی حقوق اسی باب
ہیں کیونکہ ان کا وجود (ہونا) ثابت ہو چکا ہوتا ہے اس لیے انہیں "حق"...... یا حقوق...... سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآ
مجید نے "حق" کی تمام قسموں میں سے...... خواہ ان کا تعلق عالم تخلیق وایجاد سے ہو یا عالم تشریع وقانون سازی سے...... صر
اسی "حق" کو صحیح ودرست قرار دیا ہے جسے خداوند عالم نے "وجود" عطا کیا اور "ہونے" کا شرف بخشا، خواہ اس کا تعلق تخلیق
ہو یا قانون سازی سے۔ لہٰذا قانون سازی کے دائرے میں اور دینی معاشرے میں "حق" صرف اسے کہا جائے گا
خداوند عالم نے "حق" قرار دیا ہے، مثلاً: مالی حقوق، بھائیوں کے ایک دوسرے پر حقوق اور اولاد پر والدین کے حقوق وغیر

اس مقام پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ خداوند عالم کسی کے حکم کے تابع وزیر اثر نہیں اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ک
پر حکمرانی کرے اور اس کے لیے حکم صادر کرے اور اس پر کسی کام کی انجام دہی ضروری قرار دے جیسا کہ فرقہ معتزلہ
بعض افراد نے اپنے استدلالات وبیانات میں ذکر کیا ہے، تاہم یہ ممکن ہے کہ خداوند عالم خود اپنے اوپر کسی کی بابت کوئی "
معین کرے اور اسے "قانونی" حیثیت کا حامل بنادے تو وہ کسی کا خدا پر "حق" کہلائے گا جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہ یونس آیت ۱۰۳:

★ "حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ"۔

(اور ہم پر یہ حق بنتا ہے کہ ہم مومنین کو نجات عطا کریں)۔

ایک اور مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

سورہ صافات آیت ۱۷۱۔ ۱۷۳:

"وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ إِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾"۔

(ہم نے پہلے ہی اپنے بھیجے ہوئے بندوں...... پیغمبروں ...... سے وعدہ کر لیا ہے کہ ان کی مدد کی جائے گی اور یقیناً ہمارا لشکر ہی کامیاب ہوگا)۔

پہلی آیت (یونس ۱۰۳) میں مومنین کو نجات دلانا اپنے اوپر "حق" قرار دے کر بیان کیا اور دوسری آیات میں پیغمبروں کی مدد کرنے کو اپنے اوپر مسلّم "حق" کے طور پر ذکر کیا' اور جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ پیغمبروں کی مدد کرنے کو مطلق یعنی ہر قسم کی قید و شرط کے بغیر ذکر کیا (جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر صورت میں ان کی مدد کی جائے گی' بنا برایں نجات عطا کرنا خدا پر مومنین کا حق ہے اور "مدد کرنا" خدا پر نبی کا حق ہے اور یہ حق خدا نے خود ہی اپنے اوپر ضروری قرار دیا ہے، اور چونکہ یہ خدائے قدوس ہی کے افعال میں سے ایک ہے جو اس کی طرف منسوب ہے اور اسی کے نام کی نسبت کے شرف کا حامل ہونے کی وجہ سے حرمت رکھتا ہے لہٰذا خدا کو اس کی قسم دینے اور اس کی قسم دے کر اس سے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

ان بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند عالم کو پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات یا آنحضرتؐ کے حق کی قسم دینے میں کوئی حرج نہیں اور اسی طرح اولیائے طاہرین علیہم السلام یا ان کے حق کی قسم دینا بھی صحیح ہے کیونکہ خداوند عالم نے خود ہی اپنے اوپر ان کا حق قرار دیا ہے کہ ان کی مدد کرے' لہٰذا یہ کہنا کہ کسی کا خدا پر کوئی "حق" ہی ثابت نہیں جس کا حوالہ دے کر اس سے کچھ مانگا جائے' بے بنیاد اور نہایت بے معنی بات ہے' البتہ یہ درست ہے کہ کسی کو خدا پر اپنا "حق" ثابت کرنے کا حق نہیں پہنچتا ورنہ وہ "کسی" کے حکم کے تابع ہو جائے گا جو کہ ہرگز صحیح نہیں اور کوئی شخص خدا پر کسی طرح سے کوئی حکم نہیں لگا سکتا یا اس کے لیے کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتا' اور اس طرح کی بات کہ کوئی شخص خدا پر حکم لگا سکتا ہے یا اس پر اپنے لیے کوئی "حق" قرار دے سکتا ہے کسی نے بھی نہیں کی' اور خدا کے حضور دعا کرنے والا کوئی شخص اسے کسی ایسے "حق" کا حوالہ ہی نہیں دیتا جو خدا کے علاوہ کسی اور نے اس پر ثابت کیا ہو بلکہ ہر دعا مانگنے والا جب بھی خدا کو کسی "حق" کا حوالہ دے کر اپنی حاجت طلب کرتا ہے تو اس سے مراد وہی حق ہوتا ہے جو خدا نے خود اپنے اوپر عائد کیا ہے اور اس کے پورا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور خدا کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

آیات ۹۴ تا ۹۹

○ قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا
الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۹۴﴾

○ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۹۵﴾

○ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ
أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ
بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

○ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۹۷﴾

○ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ
عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ﴿۹۸﴾

○ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ﴿۹۹﴾

ترجمہ

○ " (اے رسول) ان سے کہہ دیجئے: اگر خدا کے ہاں آخرت کا گھر تمہارے ہی لیے مخصوص ہے نہ کہ دوسرے لوگوں کے لیے تو پھر موت کی تمنا کرو اگر اپنی بات میں سچے ہو"۔ (۹۴)

○ " (یاد رکھو) وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے بہ سبب اپنے اعمال کے جو انہوں نے انجام دیئے ہیں' جبکہ خدا ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے"۔ (۹۵)

○ "آپ ان (یہودیوں) کو تمام لوگوں کی نسبت یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی زیادہ اس بات کا لالچی پائیں گے کہ اس دنیا میں زندہ رہیں' بلکہ ان میں سے تو ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے ایک ہزار سال عمر ملے جبکہ وہ ایک ہزار سال عمر پا کر بھی عذاب الٰہی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا' خدا ان کے اعمال سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ (۹۶)

○ "(اے رسول) ان سے کہہ دیجئے کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہے .....وہ تو خدا کا دشمن ہے ... کیونکہ اس (جبریل) نے (قرآن کو) آپ کے دل پر خدا کے اذن و اجازت کے ساتھ اتارا ہے وہ قرآن کہ جو اپنے سے پہلے ...... نازل ہونے والی کتابوں ..... کی تصدیق کرتا ہے اور وہ مومنین کے لیے ہدایت ..... کا ذریعہ ...... اور بشارت و خوشخبری ..... دینے والا ..... ہے"۔ (۹۷)

○ "جو شخص خدا' اس کے فرشتوں' اس کے بھیجے ہوئے رسولوں' جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے...... وہ تو خدا کا دشمن ہے اور خدا کافروں کا دشمن ہے"۔ (۹۸)

○ "یقیناً ہم نے آپ پر واضح نشانیاں اتاری ہیں کہ جن کا انکار سوائے منافقوں کے اور کوئی نہیں کر سکتا"۔ (۹۹)

تفسیر و بیان

یہودیوں کے اظہارات کا جواب

○ "قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَكُمُ۔۔۔"

(کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے لئے آخرت میں کوئی ٹھکانہ ہے۔۔۔)

اس سے پہلے ذکر کی گئی آیات میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ یہودیوں نے کہا: چند ہی دنوں کے سوا دوزخ کی آگ ہم تک نہ پہنچے گی' (لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً) اور جب ان سے کہا گیا: تم اس چیز پر ایمان لے آؤ جو خدا نے نازل فرمائی ہے (قرآن) (اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ) تو انہوں نے جواب دیا: ہم تو صرف اسی پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے (تورات) (نُؤۡمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا)، ان کے ان بیانات سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ آخرت میں اپنے سوا کسی کو نجات کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور یہ دعویٰ کرتے تھے کہ صرف انہی کو نجات حاصل ہوگی اور ان کے علاوہ کسی کو نجات نہ ملے گی۔ وہ یہ بھی ادعاء کرتے تھے کہ ان کی نجات وسعادت آخرت میں کسی طرح کی ہلاکت وشقاوت سے آمیختہ نہیں ہوگی کیونکہ...... ان کے گمان کے مطابق...... وہ صرف چند دن ہی عذاب کا شکار رہیں گے یعنی انہی دنوں کے برابر جن میں انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی' لہٰذا ان کے ان بے بنیاد دعووں اور غلط بیانات کی قلعی کھولنے اور ان کے جھوٹ کو بے نقاب کرنے اور اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ اپنے دعووں میں سچے نہیں، یوں ارشاد فرمایا: "قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَكُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ۔۔۔" (اے رسول! ان سے کہو کہ اگر خدا کے ہاں آخرت کا گھر تمہارے لیے ہی مخصوص ہے نہ کہ دوسروں کے لیے' تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنی بات...... دعوے...... میں سچے ہو)' یعنی اگر تم یہ کہتے ہو کہ آخرت میں تم ہی سعادت وخوش بختی کے حامل ہو گے تو موت کی آرزو کرو کیونکہ جو شخص کسی گھر کا مالک ہوتا ہے وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق اپنے استعمال میں لاتا ہے اور نہایت خوبصورت واحسن انداز میں اس سے استفادہ کرتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس...... گھر...... کے ذریعے اپنی آسائش وآرام کا سامان کرتا ہے۔

اللہ کے پاس!

O "عِنۡدَ اللّٰهِ"

(یعنی اللہ کے پاس)

تو اس سے مراد یہ ہے کہ خدا کے نزدیک مستقر اور اس کے حکم و اجازت کے ساتھ ثابت ہے'

اس فقرہ "عنداللہ" میں "عند"...... پاس یا نزدیک...... کا معنی سورہ آل عمران کی آیت (۱۹) میں مذکور "عند" کی طرح ہے جس میں خدا نے فرمایا: "اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ"، دین تو خدا کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

دعوائے اختصاص

O "خَالِصَةً"

(یعنی اگر آخرت کا گھر تمہارے ساتھ مخصوص و مختص ہے۔)

اس سے مراد ہر طرح کے عذاب' ذلت و پریشانی اور ناگوار کیفیتوں سے خالی ہونا ہے' یعنی جیسا کہ تم گمان کرتے ہو کہ آخرت کا گھر تمہارے لیے مخصوص ہے اور تم آخرت میں چند دنوں کے سوا عذاب میں مبتلا نہ رہو گے...... تو پھر موت کی تمنا کرو تاکہ اپنے مخصوص اور ہمیشہ کی نعمتوں والے گھر میں جلد سے جلد پہنچ جاؤ۔

O "مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ"

(یعنی تمام لوگوں کے سوا)

یہ الفاظ اس لیے کہے گئے ہیں کہ وہ (بنی اسرائیل) یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہی حق پر ہیں اور یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے دین کے علاوہ دیگر تمام ادیان، باطل و نادرست ہیں۔ اس لیے خدا نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ آخرت کا گھر تمہارے لیے مخصوص و مختص ہے اور تمام لوگوں میں سے کوئی اور شخص اس سے استفادہ نہ کر سکے گا...... تو پھر موت کی آرزو کرو۔

تمنائے موت، سچا ہونے کی دلیل!

O "فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ"

(پس تم موت کی آرزو کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو)۔

یہ جملہ، درج ذیل آیت کے مانند ہے:

سورہ ء جمعہ آیت ۶:

" قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ "

(اے رسول! ان سے کہہ دیجئے کہ اے یہودیو اگر تم گمان کرتے ہو کہ تم ہی تمام لوگوں کے سوا خدا کے دوست ہو تو پھر موت کی آرزو کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو!)

ان آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ایک فطری موضوع کو پیش کر کے اور ان فطری تقاضوں کی بنیاد پر ..... کہ جن کے آثار واضح ہیں اور کوئی شخص ان میں کسی طرح سے شک وشبہ کا شکار نہیں ہوتا..... یہودیوں کا مواخذہ کیا ہے' وہ فطری موضوع یا تقاضا بلکہ اصول یہ ہے کہ ہر انسان اور باشعور مخلوق جب راحت وآرام اور زحمت وتکلیف کے دوراہے پر ہو یعنی اسے ان دونوں (آرام وتکلیف) میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو وہ یقینی طور پر اور کسی شک وشبہ سے دوچار ہوئے بغیر راحت وآرام کا انتخاب ہی کرے گی اور زحمت وتکلیف کو ہرگز پسند نہ کرے گی' اسی طرح اگر اسے ایک جانب صاف ستھری' پاکیزہ وآسودہ زندگی اور دوسری جانب بامشقت وناگوار وغلاظت آلود زندگی میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو یقیناً پہلی قسم کی زندگی کا انتخاب ہی اس کی ترجیح قرار پائے گا' اور اگر وہ اپنی چاہت و مرضی کے برعکس شقاوت آمیز وذلت خیز زندگی کے پنجے میں پھنس جائے تو ہمیشہ اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کرتا رہے گا کہ اس ناپاک زندگی سے نجات پا کر پاک و پاکیزہ اور سعادت بخش زندگی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے، اس ... مقصد..... کے لیے اس کا دل بے تاب رہے گا' وہ اپنی زبان سے اس کا تذکرہ کرتا رہے گا اور اس کے حصول کے لیے بھرپور طریقہ سے عملی طور پر کوشاں رہے گا' اس فطری اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو بنی اسرائیل اگر اپنے اس دعوے میں سچے ہوتے کہ آخرت کی سعادت وخوش بختی انہی کے ساتھ مخصوص ہے اور ان کے سوا کسی کو حاصل نہ ہوگی تو یقیناً اس کے حصول کے لیے دل' زبان اور عمل سے اس کی آرزو کرتے، لیکن وہ ایسا کیونکر کر سکتے تھے جبکہ وہ انبیاءؑ کے قتل' موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر ان کا انکار کر دینے اور نہایت پختہ عہد و پیمان کو توڑنے جیسے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کر چکے تھے' بہرحال خدا تو ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

اعمال کا نتیجہ

○ " بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ "

یعنی بہ سبب اس کے، جو ان کے ہاتھوں نے پیش کیا،

یہ فقرہ کنایہ کے طور پر ان کے "اعمال" کے بیان میں ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ "بہ سبب ان کے اعمال کے"۔ اور یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ عام طور پر ہاتھوں ہی کے ذریعے کام انجام دیئے جاتے ہیں اور ان کاموں کو ان لوگوں کے سامنے

"پیش" کیا جاتا ہے جو ان سے استفادہ کرتے ہوں یا ان کے خواہاں ہوں۔

اس فقرے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں دو طرح سے "کنایہ" کے طور پر بات کی گئی ہے ایک یہ کہ اس میں پیش کرنے کی نسبت ان کے ہاتھوں کی طرف دی گئی ہے...... بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ...جو کچھ ان کے ہاتھوں نے پیش کیا...... ، نہ کہ خود ان کی اپنی طرف' اور دوسری یہ کہ ہر کام کو "ہاتھوں کا عمل" قرار دیا گیا ہے...... بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ... جو کچھ انہوں نے انجام دیا...۔

بہر حال انسان کے تمام اعمال بالخصوص وہ کام جو عام طور پر وہ انجام دیتا ہے اس کے باطنی جذبات واحساسات کے مظہر اور اس کے مافی الضمیر کی واضح نشانی وعلامت ہوتے ہیں' دوسرے لفظوں میں اس کے اعمال ہی اس کے اچھا اور برا ہونے کی پہچان کرواتے ہیں اور اس کے برے اعمال سے اس کی اندرونی پلیدگی کا اظہار اور اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ شخص خدائے قدوس سے ملاقات اور اولیائے الٰہی کے پاکیزہ گروہ میں شامل ہونے کا خواہاں ہی نہیں اور اس کے دل میں بارگاہ الٰہی میں شرفیاب ہونے اور خدا کے نیک وصالح وپسندیدہ بندوں میں شامل ہونے کا جذبہ واحساس ہی موجود نہیں۔

زندگی کے لالچی لوگ!

○ "وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ"

(آپ ضرور انہیں تمام لوگوں کی نسبت دنیاوی زندگی پر زیادہ حریص پائیں گے)۔

یہ جملہ خداوند عالم کے پہلے ارشاد گرامی کی دلیل کے طور پر ہے جس میں فرمایا:

"وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا" ...... یہ لوگ ہرگز موت کی آرزو نہیں کریں گے...... یعنی وہ اس لیے موت کی آرزو نہیں کریں گے کہ وہ دنیاوی زندگی میں تمام لوگوں کی نسبت زیادہ حریص ہیں جبکہ ان کا دنیاوی زندگی میں اس قدر حریص ہونا اور اس فانی زندگی کی معمولی لذتوں وآسائشوں سے دل لگانا ہی انہیں آخرت کے ابدی ٹھکانے کی آرزو نہیں کرنے دیتا'

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ جملہ (وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ) میں لفظ "حَيٰوةٍ" کو نکرہ کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے جس سے دنیاوی زندگی کی تحقیر اور اس کی بے وقعتی کا اظہار مقصود ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر دنیاوی زندگی کی بے وقعتی کے بارے میں یوں ارشاد الٰہی ہے:

سورہ عنکبوت، آیت ۶۴:

"وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ"،

(یہ دنیاوی زندگی لہو ولعب اور کھیل کود کے سوا کچھ بھی نہیں جبکہ آخرت کی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے' کاش یہ لوگ اس...... حقیقت...... سے آگاہ ہوتے)۔

شرک کرنے والے!

O "وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا"

(اور ان لوگوں سے بھی جو مشرک ہیں!)

بظاہر یہ عبارت لفظ "الناس" پر عطف کی صورت میں ہے (اس کا اشارہ الناس کے لفظ کی طرف ہے) اس طرح آیت کا معنی یوں ہوگا کہ "آپ ان ...... یہودیوں ...... کو تمام لوگوں سے اور ان لوگوں سے بھی جو مشرک ہیں اس دنیاوی زندگی پر زیادہ حریص پائیں گے"۔

عذاب الٰہی سے چھٹکارہ ممکن نہیں

O "وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ--"

(اور وہ عذاب سے ہرگز نہیں بچ سکتا خواہ اسے ہزار سال عمر بھی دی جائے)۔

بظاہر اس جملے میں حرف "ما" نافیہ ہے (نفی کا معنی دیتا ہے)۔ اور ضمیر "ھو" یا تو ضمیر شان وقصہ ہے اور "ان یعمر" مبتدا ہے اور "بمزحزحہ" اس کی خبر ہے...... اور یہ جملہ خبر یہ ہے ...... یا یہ (ضمیر "ھو") جملہ "یود احدھم" کے مدلول کی طرف لوٹتی ہے تو اس صورت میں آیت کی عبارت اس طرح تصور کی جائے گی: "**وما الذی یود ہ بمزحزحہ من العذاب**" یعنی وہ جس چیز کو چاہتا ہے وہ اسے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ بنابرایں جملہ "اَنْ يُّعَمَّرَ"، اس "چیز" (جسے وہ چاہتا ہے) کے بیان پر مشتمل ہے (یعنی طویل عمر، ہزار سال)۔ پس آیت کا معنی یوں کیا جائے گا: "وہ ہرگز موت کی آرزو نہیں کریں گے اور میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ انہیں اس نہایت معمولی، پست وگھٹیا اور حقارت آمیز دنیاوی زندگی کہ جو آخرت کی پاک و پاکیزہ اور سعادت بخش زندگی سے منحرف و روگرداں کر دینے والی ہے کی بابت تمام لوگوں بلکہ ان لوگوں سے بھی زیادہ حریص پائیں گے جو مشرک ہیں اور قیامت وحساب کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے، ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اسے لمبی سے لمبی عمر عطا کی جائے جبکہ طویل ترین عمر بھی اسے عذاب سے دور نہیں رکھ سکتی کیونکہ وہ جتنی لمبی ہی کیوں نہ ہو بالآخر اس کی حد معین ہے اور وہ اس ...... حد ...... سے آگے نہیں بڑھ سکتی بلکہ وہاں تک پہنچ کر ختم ہو جائے گی"۔

ایک ہزار سال زندگی کی آرزو!

O "يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ"

(ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے ایک ہزار سال عمر دی جائے)۔

اس جملے میں "ایک ہزار سال" طویل ترین عمر کی طرف اشارہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ "ہزار" کثرت کی

علامت ہے اور یہ (ہزار) عربوں کے نزدیک، تعداد کی گنتی میں آخری حد ہے اور اس سے زائد عدد کے لیے اسے مکرر ذکر
جاتا ہے یا کسی دوسرے عدد کے ساتھ ملا کر بولا جاتا ہے یعنی جب ایک ہزار سے زائد عدد کی گنتی مقصود ہو تو یا "ہزار" کو بار با
ذکر کیا جاتا ہے یا کسی دوسرے عدد کے ساتھ ملا کر اس طرح ذکر کیا جاتا ہے جس سے ایک ہزار سے زائد عدد کا اظہار ہو سکے مثلاً
یوں کہا جاتا ہے: "عشرۃ آلاف"......دس ہزار......، "ماۃ الف"......سو ہزار (ایک لاکھ)......،اور "الف الف"...
ہزار ہزار (ملین)۔

علم الٰہی کی وسعت

○ " وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ "

(اور خداوند عالم اچھی طرح اس سے آگاہ ہے جو وہ عمل کرتے ہیں)۔

" بصیر"، خداوند عالم کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ہے' اس کا معنی دیکھی جانے والی چیزوں کا عالم ہونا ہے' لہٰذا
اسم، "علیم" کے باب سے ہے۔(بصیر میں دیکھی جانے والی چیزوں سے آگاہی اس حوالہ سے ملحوظ ہے کہ اس کا لفظی اشتقاق
بصر ہے اور اسی سے بصیرت بھی ہے، ورنہ اس کا معنیٰ علم و آگاہی سے یکساں ہے۔)

جبریلؑ سے دشمنی کیوں؟

○ " قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ "

(کہہ دیجئے! کون ہے جو دشمن ہو جبریل کا' اس نے تو ....قرآن کو.....آپ کے دل پر اتارا ہے)۔

آیت کے سیاق اور طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یہودیوں کے اس بیان کے جواب میں ہے جس میں انہوں
نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی جانے والی مقدس آسمانی کتاب (قرآن مجید) پر ایمان لانے سے
صاف صاف انکار کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہم اس پر ایمان اس لیے نہیں لاتے کہ ہم تو جبریل کے دشمن ہیں کہ جو یہ وحی ا
(محمدؐ) پر لے کر آتا ہے'

اور آیت کے سیاق و طرز بیان کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے ان دو آیتوں میں قرآن مجید ا
جبریلؑ دونوں کے بارے میں یہودیوں کے بیانات کا جواب دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں نے جبریلؑ سے
دشمنی کو قرآن مجید پر ایمان نہ لانے کی وجہ قرار دیا تھا' اس کے ساتھ ساتھ آیت کے شان نزول سے بھی اسی بات کا ثبوت
ملتا ہے۔

بہر حال خداوند عالم نے یہودیوں کے اس بیان کا کہ ہم قرآن پر اس لیے ایمان نہیں لاتے کہ ہم جبریل کے دشمن
ہیں کہ جو محمدؐ پر وحی لے آتا ہے یوں جواب دیا ہے:

☆ پہلی بات یہ ہے کہ "فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ" ۔اس نے اس..... کتاب ... کو آپؐ کے دل پر اپنی طرف سے نہیں اتارا بلکہ خدا کے اذن..... اور حکم..... سے اتارا ہے' لہٰذا ان کی جبریل کے ساتھ دشمنی اس بات کا سبب ہرگز نہیں بن سکتی کہ وہ خدا کے اذن و حکم سے نازل ہونے والی کتاب پر ایمان نہ لائیں اور اس سے روگردانی کریں۔

☆ دوسری بات یہ کہ قرآن مجید اس کتاب (تورات) کی تصدیق کرتا ہے جو ان..... یہودیوں..... کے پاس ہے لہٰذا یہ بات بے معنی ہے کہ وہ کسی چیز پر ایمان لائیں اور جو اس چیز کی تصدیق کرنے والی ہو اس پر ایمان لانے سے انکار کریں۔

☆ تیسری بات یہ کہ قرآن مجید ان لوگوں کے لئے ہادی و رہنما کی حیثیت رکھتا ہے جو اس پر ایمان لائیں۔

☆ چوتھی بات یہ کہ قرآن مجید خوشخبریاں دیتا ہے' تو آیا کوئی عقلمند ہدایت اور خوشخبریوں سے صرف اس لیے منہ موڑ سکتا ہے کہ اس کے لانے والے سے دشمنی ہے۔

اس کے علاوہ خداوند عالم نے یہودیوں کے اس کہنے کا کہ "ہم جبریل کے دشمن ہیں" یوں جواب دیا کہ "جبریل تو فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اور اس کا کام دوسرے فرشتوں مثلاً میکائیل وغیرہ کی طرح خدا کے فرامین پر عمل کرنے اور احکام الٰہی کو انجام دینے کے سوا کچھ بھی نہیں' اور یہ سب فرشتے خدا کے نہایت با احترام بندے ہیں کہ جو "لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ" ۔۔جو کچھ خدا انہیں حکم دیتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ وہ تو صرف وہی کچھ انجام دیتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔۔ یہی حال خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کا ہے کہ ان کا ہر کام خدا کے حکم کے مطابق ہوتا ہے اور وہ جو بات کرتے ہیں وہ دراصل خدا ہی کا حکم ہوتا ہے لہٰذا ان کے ساتھ دشمنی رکھنا خدا کے ساتھ دشمنی رکھنے کے برابر ہے اور جو شخص خدا' اس کے فرشتوں' اس کے پیغمبروں اور جبریل و میکائیل سے دشمنی رکھے تو خدا بھی اس کا دشمن ہو جاتا ہے' بہرحال مذکورہ دو آیتوں میں انہی مطالب کا تذکرہ ہوا ہے اور یہ تمام مطالب یہودیوں کے جواب کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔

جبریلؑ کی وساطت سے قرآن کا نزول

○ "فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ"

(اس نے تو اسے آپ کے دل پر اتارا ہے)

اس آیت میں بھی "متکلم" کی بجائے "مخاطب" کا انداز اپنایا گیا ہے جبکہ بظاہر یوں کہنا چاہیے تھا: "علی قلبی" ... میرے دل پر.... لیکن اس کی بجائے "عَلَىٰ قَلْبِكَ" ..... آپ کے دل پر..... کہا گیا یعنی "میرے دل پر" کے بجائے "تیرے دل پر" کہا گیا تاکہ اس اہم نکتہ کو بیان کیا جا سکے کہ جس طرح سے جبریلؑ کی قرآن مجید کے نازل

کرنے میں سوائے اس کے اور کوئی حیثیت نہیں کہ انہیں خدا نے ایسا کرنے کا حکم دیا اور وہ خدا کے فرمان کے تابع ہیں اس طرح حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی قرآن مجید کو جبریلؑ سے لے لینے اور اس کی تعلیمات و احکام کو لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہیں اور آنحضرتؐ کا قلب مبارک وحی کے ظرف کی حیثیت رکھتا ہے نہ یہ کہ آپؐ قرآن کی تبلیغ کے علاوہ اس پر کسی طرح کا اختیار رکھتے ہوں۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات کے آخری حصوں میں بیان کے انداز تبدیل کئے گئے ہیں یعنی مخاطب سے غائب، غائب سے متکلم اور متکلم سے مخاطب کا انداز (صیغہ) اختیار کیا گیا ہے جبکہ ان تمام آیات میں بنی اسرائیل ہی سے خطاب کرنا مقصود تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام بیانات بنی اسرائیل کی مذمت اور ان کی سرزنش کے لیے ہیں اور علم بلاغت کی رو سے یہ امر مسلم ہے کہ گفتگو کے تسلسل میں مخاطب کی تحقیر کی غرض سے بیان کے انداز کو تبدیل کر دیا جاتا ہے تا کہ اس بات کا اظہار ہو سکے کہ متکلم جن لوگوں سے بات کر رہا ہے ان میں ذوق سماعت کے فقدان اور ان کے بے وقعت ہونے کی وجہ سے ان سے زیادہ دیر تک مخاطب رہنا پسند نہیں کرتا لیکن ان سے بات کرنے کو ترک بھی نہیں کرنا چاہتا، اس لیے کبھی مخاطب، کبھی غائب اور کبھی متکلم کا انداز اپناتا ہے اور بار بار اپنے طرز بیان اور اسلوب سخن کو بدلتا رہتا ہے۔

خدا کی کافروں سے عداوت

O ''عَدُوٌّ لِّلْکٰفِرِیْنَ''

(خدا کافروں کا دشمن)

اس جملہ میں ''عدولہم'' (ان کا دشمن) کی بجائے ''عَدُوٌّ لِّلْکٰفِرِیْنَ'' (کافروں کا دشمن) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یعنی ضمیر ''ھم'' کی جگہ اس کا اسم ظاہر ''کافرین'' ذکر کر دیا گیا، یہ اس لیے کیا گیا کہ اس میں عداوت و دشمنی کی وجہ بھی یکجا طور پر بیان کی جا سکے، تو گویا یوں کہا گیا ہے: ''ان اللہ عدولھم لا نھم کافرون واللہ عدوللکافرین'' (خدا ان کا دشمن ہے کیونکہ وہ کافر ہیں اور خدا تو ہے ہی کافروں کا دشمن)۔

فسق، کفر کی اصل وجہ!

O ''وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ''

(اور فاسقوں کے سوا کوئی اس کا انکار نہیں کرتا)

اس جملے میں کفر کی وجہ بھی بیان کر دی گئی ہے یعنی فسق، لہٰذا معنی یہ ہوگا کہ ان کا کفر، ان کے فاسق ہونے کی نشانی ہے

اس مقام پر یہ بھی ممکن ہے کہ "اَلْفٰسِقُوْنَ" پر الف ولام عہد ذکری کے لیے ہو (جس کے ذریعے ان لوگوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہو) یعنی اس جملہ "وَمَا یَکْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ" میں "اَلْفٰسِقُوْنَ" سے مراد وہی فاسق ہوں جن کا ذکر اس سورہ مبارکہ کے اوائل میں ان الفاظ میں ہو چکا ہے:

"وَمَا یُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ . . ." خدا اس کے ذریعے کسی کو گمراہ نہیں کرتا سوائے ان لوگوں کے، جو فاسق ہیں کہ جو خدا کے ساتھ کیے ہوئے پختہ وعدوں کو توڑ دیتے ہیں ....

اب رہے حضرت جبریل اور ان کے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر قرآن نازل کرنے کی کیفیت' اور اسی طرح میکائیل اور دیگر فرشتے' تو ان کے بارے میں موزوں ومناسب مقامات پر تفصیلی مطالب ذکر کیے جائیں گے انشاءاللہ۔

روایات پر ایک نظر

یہودی عالم کے آنحضرتؐ سے سوالات

تفسیر مجمع البیان میں ان دو آیتوں: "قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ . . ."، "مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ . . ." کی تفسیر میں مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ان آیتوں کے نازل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ جب حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں کا ایک عالم جس کا نام "عبداللہ بن صوریا" تھا، وہ فدک کے چند یہودیوں کے ہمراہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا ان لوگوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا:

(یا محمد، کیف نومك؟ فقد اخبرنا عن نوم النبی الذی یاتی فی آخر الزمان)

اے محمد! آپ اپنی نیند کی کیفیت سے آگاہ کریں! کیونکہ ہمیں آخر الزمان میں آنے والے نبی کی نیند کے بارے میں کچھ باتیں بتائی گئی ہیں۔

آنحضرتؐ نے جواب دیا:

(تنام عینای و قلبی یقظان)

میری نیند کی کیفیت یہ ہے کہ میری آنکھیں سو جاتی ہیں ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے جبکہ میرا دل بیدار رہتا ہے۔

انہوں نے کہا:

(صدقت یا محمد، فاخبرنا عن الولد یکون من الرجل او المراۃ؟)

اے محمدؐ! آپ نے بالکل سچ کہا ہے اب یہ بتایئے کہ بچہ مرد سے ہے یا عورت سے؟

آنحضرتؐ نے جواب دیا:

(اما العظام والعصب والعروق فمن الرجل واما اللحم والدم والظفر والشعر فمن المراۃ)

ہڈیاں پٹھے اور رگیں مرد (باپ) سے، اور گوشت خون ناخن اور بال عورت (ماں) سے ہوتے ہیں۔

انہوں نے کہا:

(صدقت یا محمد فما بال الولد یشبه اعمامه ولیس له من شبه اخواله شیء او یشبه اخواله ولیس فیه من شبه اعمامه شیء؟)

یہ بھی آپ نے درست بتایا ہے اے محمدؐ! اب یہ بتایئے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بچے میں یا تو اپنے چچاؤں کی شباہت پائی جاتی ہے اور ماموں کی شباہت نہیں پائی جاتی یا ماموں کی شباہت پائی جاتی ہے اور چچاؤں کی شباہت نہیں پائی جاتی؟

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: (ایهما علا ماءه کان الشبه له)

دونوں (مرد اور عورت) میں سے جس کا پانی (نطفہ) بلندی میں ٹھہرے (زیادہ طاقتور ہو) بچے میں اسی کی شباہت پائی جائے گی

انہوں نے کہا: (صدقت یا محمد، فاخبرنا عن ربك ما هو؟)

یہ بھی آپ نے صحیح بتایا اے محمدؐ! اب آپ اپنے پروردگار کے بارے میں بتایئے وہ کیا ہے؟

آنحضرتؐ نے خدا کے بارے میں بتانا چاہا تو سورہء اخلاص نازل ہوا: "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝" ... کہہ دیجئے اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے اس نے کسی کو نہیں جنا کسی نے اسے نہیں جنا اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

اس کے بعد یہودی عالم ابن صوریا نے کہا:

(خصلة واحدة ان قلتها آمنت بك واتبعك، ای ملك یاتیك بما ینزل علیك؟)

اب ایک بات رہ گئی ہے اگر آپ نے اس کا صحیح جواب دے دیا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کی پیروی کریں گے اور وہ یہ کہ کونسا فرشتہ آپ پر خدا کی طرف سے وحی لے کر آتا ہے؟

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: جبرئیل!

یہ سن کر ابن صوریا نے کہا:

(ذالك عدونا ینزل بالقتال والشدة والحرب، و میکائیل ینزل بالیسر والرخاء، فلو کان میکائیل ھو الذی یاتیك لآمنا بك) وہی ہمارا دشمن ہے وہ جنگ کا حکم اور نہایت سخت قسم کے احکامات لے کر آتا ہے جبکہ میکائیل آسانی اور نرمی کے پیغامات لاتا ہے اگر میکائیل خدا کی وحی آپ کے پاس لے آتا تو ہم ضرور آپ پر ایمان لے آتے۔

روایت کی تشریح:

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ ''میری آنکھیں سوتی ہیں مگر میرا دل بیدار رہتا ہے''، فریقین (شیعہ وسنی) کی معتبر کتب وحدیث میں کثرت کے ساتھ مذکور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ نیند کے عالم میں اپنے آپ سے غافل نہیں ہوتے تھے بلکہ خود اس بات سے آگاہ ہوتے تھے کہ سو رہے ہیں اور جو کچھ نیند کی حالت میں دیکھ رہے ہیں وہ خواب ہے نہ کہ بیداری میں دیکھنا، بہر حال یہ خصوصیت آنحضرتؐ کے علاوہ دیگر کئی نیک وصلاح افراد میں بھی پائی جاتی ہے کہ وہ نیند کی حالت میں اپنے آپ سے غفلت میں نہیں ہوتے یعنی جب وہ اپنے پاکیزہ دل کو اپنے پروردگار کی مقدس یاد سے منور کرتے ہیں اور اپنی سوچ کی راہوں میں خالق کائنات کے تذکرے کی خوشبو بکھیرتے ہیں تو ان کا خدا کی طرف اس قدر متوجہ ہونا انہیں اپنے آپ کے بارے میں اور دنیاوی زندگی کے خدا کے ساتھ تعلق کی بابت غافل نہیں ہونے دیتا اور یہ کیفیت ایک طرح کا مشاہدہ ہے جو انسان پر اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ یہ عالم دنیا، سراپا نیند ہے خواہ اس میں لوگ اپنے تئیں نیند کی حالت میں ہوں یا بیداری کی حالت میں اور اس بات کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ اس دنیا میں حس وحسیات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے نادان لوگ کہ جو مادہ کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اگرچہ اپنے آپ کو بیدار سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں غفلت کی گہری نیند ان پر طاری ہے جیسا کہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا ہے:

(الناس نیام، فاذا ماتوا انتبھوا)

''لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں جب موت آئے گی تو بیدار ہو جائیں گے''۔ (لوگ سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تو جاگ جائیں گے)۔

بہر حال زیر بحث حدیث (میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل بیدار رہتا ہے) کی بابت اس کے تمام متعلقہ پہلوؤں کو واضح کرنے کے لیے موزوں ومناسب موارد میں تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا، انشاءاللہ۔

آیات ۱۰۰ و ۱۰۱

○ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

○ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ

○ ''آیا ایسا نہیں ہے کہ جب بھی انہوں نے کوئی پختہ وعدہ کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اس وعدے کو توڑ دیا' بلکہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے''۔ (۱۰۰)

○ ''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے پیغامبر آیا کہ جو ان کے پاس موجود ..... کتاب کی تصدیق کرتا تھا تو ان لوگوں میں سے کہ جنہیں کتاب دی گئی تھی ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پس پشت ڈال دیا جیسے کہ وہ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں''۔ (۱۰۱)

تفسیر و بیان

"نبذہ"

"نبذ" کا معنی ڈال دینا اور پھینک دینا ہے (اور یہ وعدہ توڑنے کے معنے میں بھی آتا ہے)۔

پیغمبر اسلامؐ کی آمد کا حوالہ!

○ "وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ..."

اس آیت میں "رسول" سے مراد حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں نہ کہ ہر رسول، کیونکہ آنحضرتؐ ہی ایسی کتاب (قرآن مجید) لائے جو ان (یہودیوں) کے پاس موجود کتاب الٰہی (تورات) کی تصدیق کرتی ہے، اور آیت کے پہلے الفاظ "وَلَمَّا جَآءَهُمْ" (اور جب ان کے پاس آیا) بھی اسی امر کی دلیل ہے کہ اس سے مراد آنحضرتؐ ہیں کیونکہ یہ الفاظ استمرار اور مسلسل آنے کا معنی نہیں دیتے بلکہ ان سے ایک دفعہ کا آنا ہی سمجھا جاتا ہے۔

بہرحال یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہودیوں نے حضرت پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں تورات میں مذکور بشارتوں اور خوشخبریوں کو چھپا کر اور اس شخصیت پر ایمان نہ لا کر کہ جس نے ان کے پاس موجود کتاب خدا (تورات) کی تصدیق کی، حق کی مخالفت کا عملی مظاہرہ کیا۔

آیات ۱۰۲ و ۱۰۳

○ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ
الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ
وَمَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ
فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ
اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ
مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

○ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ

○ ''اور انہوں نے ان مطالب کی پیروی کی جو کہ شیاطین سلیمان کے زمانے میں لوگوں کے سامنے بیان کیا کرتے تھے' حالانکہ سلیمان نے کفر اختیار نہیں کیا لیکن شیطانوں نے کفر اختیار کیا اور وہ (شیاطین) لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور وہ منتر سکھاتے تھے جو دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر بابل میں نازل کیا گیا تھا جبکہ وہ دو فرشتے اپنے اوپر نازل ہونے والا منتر جب بھی کسی کو سکھاتے تو اس سے کہہ دیتے تھے کہ ہم تو...... تم لوگوں کی...... آزمائش کا ذریعہ بنا کر بھیجے گئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس...... منتر کی وجہ سے...... کافر ہو جاؤ (اس منتر کے ذریعے ہرگز کفر کی جانب نہ جانا) تاہم لوگ ان سے وہ کچھ سیکھتے تھے جس کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان جدائی و تفرقہ ڈال سکیں جبکہ وہ خدا کے اذن کے بغیر کسی کو نقصان پہنچانے پر قادر ہی نہ تھے اور...... اس کے علاوہ...... لوگ ان (دو فرشتوں) سے وہ کچھ سیکھتے تھے جو خود ان کے لیے نقصان دہ تھا نہ کہ فائدہ مند' حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اچھی طرح اس بات سے آگاہ تھے کہ جو شخص ان...... مطالب...... کا خریدار ہو اس کے لیے آخرت میں کوئی چیز نہ ہو گی' بہر حال جس چیز کے بدلے میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا وہ ان کے لیے بہت ہی بری تھی اے کاش وہ یہ سب کچھ جان لیتے''۔ (۱۰۲)

○ ''اور اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ...... ہر چیز سے...... بہتر ہے' کاش وہ اس سے آگاہ ہوتے''۔ (۱۰۳)

تفسیر و بیان

عہد سلیمانؑ میں جادو کی تعلیم کا ذکر

O "وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ . . ."

(اور انہوں نے پیروی کی اس شیئ کی کہ جو سلیمان کے عہد میں شیاطین لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کرام جس قدر اختلاف رائے رکھتے ہیں اتنا پورے قرآن میں کسی آیت کی بابت نہیں رکھتے، ہم ذیل میں چند جہتوں کا ذکر...... بطور خلاصہ...... کرتے ہیں جن سے آپ کو مفسرین کرام کے اختلاف رائے کی کثرت کا اندازہ ہو جائے گا ملاحظہ ہو:

پیروی کرنے والے؟

(۱)۔"اتَّبَعُوْا " (انہوں نے پیروی کی) میں "ان" سے مراد کون سے یہودی ہیں؟

آیا حضرت سلیمانؑ کے زمانہ والے یہودی مراد ہیں؟ یا حضرت پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ کے یہودی مراد ہیں؟ یا دونوں ہی زمانوں کے یہودی مراد ہیں؟

تلاوت ؟

(۲)۔"تَتْلُوْا" سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ "پیروی" کرتے تھے؟

یا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ "پڑھا کرتے تھے" (چونکہ یہ "تلاوت" سے مشتق ہے)۔

یا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ "جھوٹ بولتے تھے"؟ (شیاطین جھوٹ اور نادرست باتیں کرتے تھے)۔

شیاطین کون ؟

(۳)۔"شیاطین" سے مراد جنوں میں سے شیاطین ہیں یا انسانوں میں سے شیاطین؟ یا دونوں کے شیاطین مراد ہیں؟

سلیمان کا ملک ؟

(۴)۔ "عَلٰی مُلْكِ سُلَيْمٰنَ" ..... سلیمان کے ملک پر..... اس میں "ملک" سے مراد یہ ہے کہ "سلیمان کی حکومت میں"؟ یا اس سے مراد ہے "سلیمان کے زمانہ میں"؟ یا اس سے مراد ہے "سلیمان کے ملک پر"؟ (کیونکہ لفظ "علیٰ" کا ترجمہ "پر" (اوپر) ہے اور اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے) اور یا اس سے مراد عہد و مملکت سلیمان ہے؟

شیطانوں کا کفر؟

(۵)۔ "وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا" میں شیطانوں کے کفر اختیار کرنے سے کیا مراد ہے؟
آیا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ (شیاطین) لوگوں کو جادو کی تعلیم دینے کی وجہ سے کافر ہو گئے؟۔
یا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اس وجہ سے کافر ہو گئے کہ انہوں نے جادو کی نسبت حضرت سلیمانؑ کی طرف دی؟۔
اور یا یہ کہ "کفر" سے مراد جادو ہی ہے؟

جادو کی تعلیم ؟

(۶)۔ "يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ" میں جادو کی تعلیم دینے سے کیا مراد ہے؟
آیا اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کے سامنے جادو پیش کر دیا جسے لوگوں نے یاد کر لیا (سیکھ لیا)؟۔
یا اس سے مراد یہ ہے کہ جادو کے مطالب حضرت سلیمان کی کرسی کے نیچے مدفون و پوشیدہ تھے اور شیاطین نے لوگوں کو ان سے مطلع و باخبر کر دیا تا کہ وہاں سے نکال انہیں یاد کر لیں (سیکھ لیں)؟

کیا نازل ہوا؟

(۷)۔ "وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ . . ." میں حرف "ما" سے کیا مراد ہے؟
آیا یہ موصولہ ہے اور یہ پورا جملہ یا تو "ما تتلوا ....." پر عطف کے طور پر ہے؟ یا "السحر" پر عطف (لوٹا) ہے اور اس طرح اس کا معنی یہ ہے کہ شیاطین لوگوں کو جادو اور وہ مطالب تعلیم دیتے تھے جو ان دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) پر نازل ہوئے تھے؟۔
یا یہ کہ "ما" موصولہ نہیں بلکہ نافیہ ہے اور "و" استیناف کے لیے ہے (نئے مطلب کے بیان میں ہے) تو اس صورت میں اس کا معنی یہ ہے: "اور ان دو فرشتوں پر جادو نازل نہیں ہوا" یعنی جیسا کہ یہودی خیال کرتے ہیں ایسا نہیں ہے؟

نازل کیا جانا؟

(۸)۔"وَمَآ اُنْزِلَ" میں نازل کئے جانے سے مراد کیا ہے؟ آیا اس سے مراد آسمان سے نیچے اترنا ہے؟ یا اس سے مراد زمین کی بلندیوں اور بلند مقامات......اونچی چٹانوں وغیرہ...... سے نیچے آنا ہے؟

دو فرشتے؟

(۹)۔"الْمَلَكَيْنِ" سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے دو آسمانی فرشتے مراد ہیں یا دو بادشاہ؟ اگر دو فرشتے مراد ہوں تو (ملکین) لام پر زبر کے ساتھ اس کی قرائت کی جائے گی کیونکہ "ملک"...... لام پر زبر کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے فرشتہ اور "ملکین" اس کا تثنیہ ہے جو دو کے عدد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اگر اسے "ملکین"...... لام کے نیچے زیر کے ساتھ پڑھیں تو اس کا معنی ہے: دو بادشاہ"، کیونکہ "ملک"...... لام کے نیچے زیر کے ساتھ...... مفرد ہے اور اس سے تثنیہ "ملکین" ...... "علی" حرف جار کی وجہ سے "ملکان" کی بجائے ملکین آتا ہے اور یہ غیر معروف قرائت ہے یعنی "ملکین" کو لام کے نیچے زیر کے ساتھ پڑھنا غیر معروف ہے جبکہ لام پر زبر کے ساتھ پڑھنا معروف عام ہے۔

"ملکین" (دو فرشتے) کے بارے میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد دو نیک بندے ہوں یا جو ظاہری طور پر اچھے ہوں!

بابل شہر یا علاقہ؟

(۱۰)۔آیت مبارکہ میں "بِبَابِلَ" سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے مراد عراق کا شہر بابل ہے؟ یا اس سے "دماوند" کا شہر بابل مراد ہے؟ یا اس سے مراد "نصیبین" سے "رأس العین" تک کا علاقہ ہے؟

تعلیم اور سکھانا؟

(۱۱)۔"مَايُعَلِّمٰنِ" (وہ تعلیم نہیں دیتے تھے) میں "تعلیم" سے کیا مراد ہے؟

آیا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو سکھاتے نہیں تھے؟

یا اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اظہار نہیں کرتے تھے؟ کیونکہ اگر "یعلمان" کو لام پر شدہ کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ باب تفعیل...... تعلیم...... سے ہوگا اور اگر "یعلمان" کو لام کے نیچے زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ باب افعال...... اعلام...... سے ہوگا، پہلی صورت میں تعلیم دینا اور سکھانا مراد ہوگا اور دوسری صورت میں اعلان و اظہار کرنے کے معنے میں آئے گا۔

کفر اختیار کرنا؟

(۲۱)۔ ''فَلَا تَكْفُرْ'' (تو کفر اختیار نہ کر) میں کفر اختیار کرنے سے کیا مراد ہے؟

آیا اس سے مراد یہ ہے کہ جادو کر کے کافر نہ ہو؟

یا اس سے مراد یہ ہے کہ جادو سیکھنے کی وجہ سے کافر نہ ہو؟

یا اس سے مراد یہ دونوں ہیں یعنی جادو کرنے اور جادو کے سیکھنے کی وجہ سے کافر نہ ہو؟

لفظ (ان دونوں)؟

(۳۱)۔ ''مِنْهُمَا'' (ان دونوں) سے کیا مراد ہے؟

آیا اس سے مراد ہاروت و ماروت ہیں؟ یا

اس سے مراد جادو اور کفر کے مطالب ہیں؟

یا اس کا معنی یہ ہے کہ ''جن چیزوں سے ان دو فرشتوں نے منع کیا تھا ان کی بجائے لوگ ایسی چیزیں اور مطالب یاد کرتے تھے...... سیکھتے تھے...... جن کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ ڈال سکیں؟

میاں و بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالنے والی چیز؟

(۴۱)۔ ''مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ'' سے کیا مراد ہے؟

آیا اس سے مراد یہ ہے کہ جادو کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ و جدائی ڈالنے کے اسباب فراہم کرتے تھے؟

یا یہ کہ میاں بیوی میں سے کسی ایک کو دھوکہ و فریب دے کر کفر اختیار کرنے کی ترغیب دلاتے تھے اور پھر ان کے درمیان ان کا مذہبی و دینی اختلاف باہمی تفرقہ و جدائی کا سبب بن جاتا تھا؟

یا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے درمیان چغلخوری کر کے ان میں تفرقہ ڈالتے تھے؟

یہ چودہ جہتیں ہیں جن میں مفسرین کرام زیر بحث آیت کی بابت اختلاف رائے رکھتے ہیں اور ہر ایک نے اپنی رائے و نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلائل بھی دیئے ہیں اور ان مذکورہ جہات کے علاوہ بھی آیت مبارکہ کے آخری حصول کی بابت مفسرین کرام کسی ایک نظریہ و رائے پر متفق نہیں بلکہ ان میں بھی ان کی آراء مختلف ہیں بلکہ اس سے بالاتر یہ ہے کہ آیت میں مذکور واقعہ کے اصل موضوع کی بابت بھی ان کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ آیا یہ ایک حقیقی واقعہ ہے، اسے بطور مثال ذکر کیا گیا ہے اور یا اس میں کوئی اور راز پوشیدہ ہے؟

بہر حال اگر اس آیت مبارکہ کی بابت گوناگوں جہات میں پائے جانے والے اختلاف رائے اور تمام مذکورہ احتمالات کو ایک دوسرے سے ضرب دیں تو ان کی تعداد حیرت انگیز حد تک پہنچ جاتی ہے یعنی تقریباً ۱۲۶۰۰۰۰ احتمالات بنتے ہیں۔ ! (2^4x3^9x4) (اور وہ اس طرح کہ ہم نے جو احتمالات ذکر کئے ہیں ان کی تعداد چودہ ہے اور پھر ان میں سے ہر ایک میں کئی اقوال واحتمالات ہیں مثلاً کسی میں چار احتمال، کسی میں دو احتمال اور کسی میں تین احتمال' یعنی ان چودہ احتمالات میں سے ایک احتمال میں چار احتمالات ذکر کئے گئے' اور چار احتمالات میں سے ہر ایک میں دو احتمال اور نو احتمالات میں سے ہر ایک میں تین احتمالات ذکر کئے گئے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم آیت کی بابت تمام احتمالات کو یکجا کرنا چاہیں اور ان تمام احتمالات کو ایک دوسرے میں ضرب دیں تو یہ تعداد بارہ لاکھ ساٹھ ہزار کے لگ بھگ بنتی ہے، یعنی ایک مرتبہ چار کا عدد لکھیں پھر نو مرتبہ تین کا عدد لکھیں اور چار مرتبہ ۲ کا عدد لکھیں اور پھر ان سب کو آپس میں ضرب دیں (جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے: $1260000=2^4x3^9x4$) تو نتیجہ، مذکورہ عدد ہوگا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ سب کچھ قرآن مجید کی محیر العقول ترتیب واسلوب بیان کی منفرد صورت ہے کہ ایک آیت سے اس قدر معانی سمجھے جاتے ہیں اور وہ سب معانی ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اپنی اپنی مخصوص جہت میں صحیح نظر آتے ہیں اور ان کا مختلف ہونا' قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت پر نہ صرف یہ کہ اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ اس کلام الٰہی کی بلند پایہ فصاحت وبلاغت کو نمایاں طور پر واضح کرتا ہے' اور یہ صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ دیگر کئی آیات میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے، مثلاً:

سورۂ ہود، آیت مبارکہ ۱۷:

"اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً"

(آیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل کا حامل ہو اور اس کے پیچھے خود اس کا اپنا گواہ بھی ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب۔ بھی گواہی دے چکی ہو۔ جو کہ رہبر اور رحمت ہے۔۔۔۔)

اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا جائے گا کہ اس کی بابت کس جہت میں کیا احتمال دیا گیا ہے اور آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس میں بھی بے شمار آراء پیش کی گئی ہیں جو اپنے اپنے مقام پر صحیح نظر آتی ہیں اور آیت کے اصل موضوع سے متصادم بھی نہیں ہیں۔

بہر حال اس مقام پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ آیت (زیر بحث) اپنے سیاق واسلوب بیان کی رو سے یہودیوں کے بارے میں یہ انکشاف کرتی ہے کہ ان کے درمیان جادو رائج تھا اور وہ اس ...... جادو ...... کی اصل بنیاد ایک یا دو واقعات کو سمجھتے تھے جو ان کے درمیان مشہور تھے یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ اور بابل میں آنے والے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کا واقعہ' بنابراین یہ آیت اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو یہودیوں کے درمیان مشہور تھا اور وہ اس سے باخبر تھے اور اسے "جادو" کی اصل واساس سمجھتے تھے' لیکن قرآنی بیانات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ وہ لوگ (یہودی)

بنیادی طور پر حقائق کی توڑ مروڑ اور مطالب میں ردوبدل کرنے (تحریف) میں خوب مہارت رکھتے تھے اور ان کی اس مکرو عادت کے پیش نظر ان سے یہ بات بعید نہیں کہ مذکورہ واقعہ میں بھی تبدیلی کے مرتکب ہوئے ہوں اور ایسے تاریخی واقعات پیش کر دیں جن میں ہر طرح کی تحریف و تغیر اور تبدیلی کر کے ان کی ترتیب میں اپنے مفادات کو بنیاد قرار دیں کیونکہ اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے حقائق و معارف میں توڑ مروڑ کرنا ان کی عام عادت ہے اسکی دلیل زیر بحث آیت ہی ہے کہ جس کا انداز بلکہ صریح و واضح بیانات یہودیوں کے اس مذموم طرز عمل کو ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے اس واقعہ کے بیان میں بھی تحریف و تبدیلی کے عمل کو ترک نہیں کیا' بہر حال زیر بحث آیت سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہودیوں کے درمیان ایک عرصہ تک جادو رائج تھا اور وہ اس کی اصل بنیاد حضرت سلیمانؑ کو قرار دیتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ حضرت سلیمانؑ کی حکومت واقتدار اور جنوں' انسانوں' درندوں اور پرندوں کے ان کے تابع فرمان ہونا اور طرح طرح کے دیگر غیر معمولی امور جو حضرت سلیمانؑ نے پیش کئے ان سب کی بنیاد جادو ہے اور جادو ہی کے ذریعے انہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اور اسی (جادو) کا کچھ حصہ ان کے ہاتھ لگا ہے' اور کچھ حصہ بابل میں آنے والے دو فرشتوں ہاروت و ماروت سے لیا گیا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے ان کے ان غلط خیالات اور بے بنیاد و من گھڑت باتوں کی واضح الفاظ میں تردید کی اور اس امر کو صاف و صریح طور پر بیان کیا کہ یہودیوں کے نظریات قطعاً غلط و نادرست ہیں چنانچہ دونوں باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن مجید نے حضرت سلیمانؑ اور دو فرشتوں ہاروت و ماروت کے بارے میں جو کچھ بیان کیا اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ حضرت سلیمانؑ کے بارے میں:

قرآن مجید نے حضرت سلیمانؑ کے بارے میں یہ بیان کیا کہ انہوں نے کسی قسم کا کوئی جادو نہیں کیا اور وہ قطعی طور پر جادوگر نہ تھے اور وہ جادوگر کیونکر ہو سکتے تھے جبکہ جادو خدا کا انکار کرنے کا دوسرا نام ہے (جادو کفر ہے) کیونکہ یہ خدا کے مقرر کردہ ان اصولوں اور عالم طبیعت میں پائی جانے والی مخلوق کے لیے طے کردہ ان ضابطوں میں دخل انداز ہونے سے عبارت ہے جن کی خداوند عالم نے تمام زندہ موجودات کو نشاندہی کر دی ہے' تو حضرت سلیمانؑ علیہ السلام اس طرح کا کفر کیونکر اختیار کر سکتے ہیں' انہوں نے ہرگز کفر اختیار نہیں کیا کیونکہ وہ معصوم نبی ہیں اور کسی معصوم سے کفر اختیار کرنے کا امکان نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ" سلیمان نے کفر اختیار نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے ہیں' اور "وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" انہوں نے اس بات کو اچھی طرح جان لیا کہ جس شخص نے بھی اسے ...... جادو کو ... خریدا اس کے لیے آخرت میں کچھ بھی نہ ہو گا۔ لہٰذا سلیمانؑ کا مقام و مرتبہ اس سے بالاتر ہے کہ ان کی طرف جادو اور کفر کی نسبت دی جائے' جبکہ خدا نے ان کے بارے میں قرآن کی ان متعدد سورتوں جو اس سورۃ (بقرہ) سے پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں جیسے سورۃ انعام' سورہ انبیاء' سورہ نمل اور سورہ ص میں بیان کیا ہے کہ وہ خدا کا نیک و صالح بندہ (عبد صالح) اور خدا کا بھیجا ہوا نبی تھا، خدا نے اسے علم و حکمت عطا کی

اور ایسی حکومت واقتدار سے نوازا جو اس کے بعد کسی کے لیے سزاوار نہیں۔

قرآن مجید میں حضرت سلیمانؑ کے بارے میں اس طرح واضح و صریح بیانات کے باوجود ان کے بارے میں جادو اور کفر کی نسبت دینا عقل کے اندھے پن اور ناپاک سوچ کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا' وہ نبی تھے، معصوم تھے، خدا کی برگزیدہ شخصیت تھے، عبد صالح تھے، وہ کبھی جادو جیسے کفر آمیز عمل کو انجام نہیں دے سکتے۔ ان کے بارے میں جو بیہودہ باتیں کی گئیں اور خرافات پر مبنی کہانیاں گھڑی گئیں وہ سب شیاطین کے کام ہیں کہ انہوں نے جنوں اور انسانوں میں سے اپنے دوستوں کو یہ کہانیاں سنا کر اور انہیں جادو کی تعلیم دے کر لوگوں کو گمراہ کیا اور کافر ہو گئے۔

ورنہ حضرت سلیمانؑ کی بلند پایہ شخصیت کہاں اور یہ کفر آمیز اعمال کہاں۔

۲۔ ہاروت و ماروت کے بارے میں!

قرآن مجید نے بابل میں آنے والے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کے بارے میں یہودیوں کے بیانات و نظریات کی ان الفاظ میں تردید کی کہ اگرچہ ان دو فرشتوں پر جادو کا علم نازل کیا گیا تھا لیکن اس میں اس لحاظ سے کسی طرح کوئی حرج لازم نہیں آتا کہ ممکن ہے یہ صرف لوگوں کی آزمائش اور انہیں آزمانے کے لیے نازل کیا گیا ہو (جیسا کہ خود انہوں نے بھی کہا " اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ " ہم تو صرف آزمائش کے طور پر آئے ہیں) اور اس ذریعے سے خدا لوگوں کا امتحان لینا چاہتا ہو جس طرح خداوند عالم نے بنی نوع آدم کے دلوں میں شر اور برائی کی طرف جھکاؤ کا احساس پیدا کر دیا ہے اور اسے ان کی آزمائش وامتحان کا ذریعہ بنا دیا ہے کہ جسے "قدر" (تقدیر الٰہی) کا نام دیا جاتا ہے تو یہ سب کچھ آزمانے کے طور پر ہوتا ہے نہ یہ کہ خدا کسی انسان سے شر اور برائی کے ارتکاب کا خواہاں ہے ... بنابرایں وہ دو فرشتے بھی امتحان اور آزمائش کے طور پر بھیجے گئے تھے اور ان پر جادو کا علم بھی نازل کیا گیا تھا لیکن وہ جب بھی کسی کو جادو کی تعلیم دیتے تو پہلے ہی اس سے یہ کہہ دیتے تھے کہ ہم تمہاری آزمائش وامتحان کے طور پر بھیجے گئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اس جادو کو کہ جسے تم سیکھ رہے ہو غلط مقام پر استعمال کرنے لگو اور اس کے اصل موارد (یعنی ابطال سحر (جادو کو توڑنے اور اس کا اثر زائل کرنے اور جادوگروں کی غلط کاریوں کو بے نقاب کرنے) کے علاوہ اس سے استفادہ کرو لیکن لوگوں نے ان (فرشتوں) کی نصیحتوں پر کان نہ دھرے اور ایسے مطالب واعمال سیکھنے کے درپے رہے جن کے ذریعے خداوند عالم کی طرف سے عالم طبیعت کے معمولات میں مقرر کی جانے والی مصلحتوں کو ضائع کر دیں اور فتنہ وفساد پیدا کریں، چنانچہ وہ لوگ جادو کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ و جدائی ڈالنے اور فتنہ وفساد برپا کرنے کے اسباب فراہم کرتے تھے' اور ایسے امور کا علم حاصل کرتے تھے (حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے تھے) جو ان کے لیے سراسر نقصان دہ ہو نہ کہ فائدہ مند' پس خداوند عالم کا یہ فرمانا کہ "وَاتَّبَعُوا" ..... انہوں نے پیروی کی ... تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو یہودی حضرت سلیمانؑ کے زمانہ کے بعد آئے انہوں نے اپنے پیشرو بزرگوں کے طرز عمل کی تقلید کرتے ہوئے انہی غلط و نادرست اور جھوٹی باتوں کی پیروی کی جو حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں شیاطین

اپنی طرف سے گھڑ کے پیش کرتے رہتے تھے۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ آیت میں " تَتْلُوا " کو "عَلٰی" کے ساتھ متعدی کر کے ذکر کیا گیا ہے جس سے مذکور بالا مطالب کی صحت کا ثبوت ملتا ہے یعنی یہ کہ شیاطین غلط و جھوٹی باتیں لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے (تتلوا تکذب کے معنے میں ہے) اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ "شیاطین" سے مراد جن ہیں کیونکہ وہ حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں مسخر اور رام کئے گئے تھے اور آنجنابؑ کی طرف سے ناگوارترین سختیوں کا شکار تھے اور آنجنابؑ ان کی شرانگیزیوں کو روکنے کے لیے ان پر عرصہ حیات تنگ رکھتے تھے چنانچہ اس سلسلے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ انبیاء آیت ۸۲:

★ "وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ"۔

(اور ہم نے شیاطین میں سے ان افراد کو سلیمان کے تابع کر دیا جو ان (سلیمان) کے لیے دریا سے جواہرات نکالتے تھے اور اس کے علاوہ دیگر کام بھی انجام دیتے تھے اور ہم نے ان کو اپنی حفاظت و نگرانی میں رکھا ہوا تھا)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورہ سبا آیت ۱۴:

★ "فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ"۔

(جونہی سلیمان گرے تو جنوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر وہ غیب کا علم رکھتے تو اس طرح سے..... سلیمان کی طرف سے..... سختیوں اور ذلت آمیز سلوک سے دوچار نہ رہتے)

ان دو آیتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس..... زیر بحث..... آیت میں شیاطین سے مراد جن ہیں۔

سلیمانؑ سے کفر کی نفی!

O "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ"

(اور سلیمان نے کفر اختیار نہیں کیا)

یعنی سلیمانؑ نے جادو کا عمل کیا ہی نہیں کہ وہ اس کی وجہ سے کافر ہو گئے ہوں البتہ شیاطین نے کفر اختیار کیا کیونکہ وہ لوگوں کو گمراہ کرتے تھے اور انہیں جادو کی تعلیم دیتے تھے۔

ہاروت وماروت پر نازل ہونے والی چیز

○ "وَمَآ اُنْزِلَ..."

(اور جو کچھ نازل کیا گیا......)۔

یعنی یہودیوں نے اس کی پیروی کی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت وماروت پر بذریعہ الہام نازل کیا گیا تھا جبکہ وہ دونوں جب بھی کسی کو جادو کی تعلیم دیتے تو پہلے ہی اسے اس..... جادو..... پر عمل کرنے سے روکتے تھے اور اس سے کہتے تھے کہ ہم تو لوگوں کی آزمائش کے لیے بھیجے گئے ہیں یعنی خدا چاہتا ہے کہ ہمارے ذریعے تمہاری آزمائش کرے..... تمہیں آزمائے..... لہٰذا اس (جادو) پر عمل کر کے کافر نہ ہو جانا۔

فرشتوں سے تعلم

○ "فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا..."

(ان دونوں سے تعلیم حاصل کرتے تھے)۔

اس جملہ میں "مِنْهُمَا" (ان دونوں) سے مراد دو فرشتے ہیں یعنی ہاروت و ماروت اور "مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ" (جس کے ذریعے تفرقہ ڈالتے تھے) سے مراد وہ جادو ہے جس پر عمل کر کے اس کے اثر سے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ و جدائی اور اختلاف ڈالتے تھے۔

جادو کی تاثیر اور اذن خدا

○ "وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ"

(جبکہ وہ اس (جادو) کے ذریعے خدا کے اذن کے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے)۔

یہ جملہ درحقیقت ایک سوال کے جواب کے طور پر ہے کہ جو ممکن ہے کسی کے ذہن میں پیدا ہو اور وہ یہ کہ اگر جادو موثر ثابت ہو سکتا ہو تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ جادوگر اس کے ذریعے کائنات کی تخلیق و تکوین کے نظام میں خلل اندازی کر سکیں اور خدا کی تقدیر پر سبقت لے جائیں اور نظام عالم کو درہم برہم کر دیں، تو گویا اس کے جواب میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ جادو خود "قدر"..... تقدیر الٰہی..... کے باب سے ہے لہٰذا اس کا اثر خدا کے اذن کے بغیر ممکن ہی نہیں اور جادوگر اس کے ذریعے..... خدا کے اذن کے بغیر..... کسی کو ذرہ بھر نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس جملہ (وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ) کو جملہ (وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ جو کچھ وہ سیکھتے ہیں وہ ان کے لیے نقصان دہ ہے نہ کہ فائدہ مند......) سے پہلے اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ جملہ یعنی "فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ" ہی جادو کے موثر ہونے اور

جادوگروں کے عمل کی تاثیر کے بیان پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی تاثیر کی بابت وضاحت ضروری تھی تا کہ کوئی شخص کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونے پائے لہٰذا یہ ارشاد فرمایا: "یہ تاثیر خدا کے اذن کے ساتھ ہی ممکن ہے"۔

جادو اور آخرت

O " لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ "

(اور انہیں معلوم ہو گیا کہ جس نے بھی اسے خریدا اس کے لیے آخرت میں کچھ نہ ہوگا)۔

اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عقل سے اس بات کو سمجھ لیا کہ جادو کا خریدار آخرت میں کچھ بھی نہ پا۔ گا کیونکہ عقل اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے.... عقلی طور پر یہ بات مسلم اور ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے.... کر جادو، انسانی معاشرے میں برائیوں اور فتنہ وفساد کی جڑ ہے اور اس کے ذریعے معاشرتی امن وامان تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔ اس عقلی فیصلے کے علاوہ بھی یہودیوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واضح بیان سے جادو کی بری تاثیر کے بارے میں اچھ طرح معلوم ہو چکا تھا کہ انہوں نے فرمایا: " وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى " (سورہ طٰہٰ، آیت ۶۹)...... جادوگر جہاں بھ جائے یا جو کچھ بھی پیش کرے، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا...... یہ جملہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا ج موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے بیان کیا۔

نہایت برا سودا

O " وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ "

(بہت ہی برا ہے وہ کہ جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ دیا' کاش وہ اس کو اچھی طرح جان لیتے)

یعنی انہوں نے اس بات سے آگاہ ہونے کے باوجود کہ یہ کام (جادو) فتنہ انگیز' نقصان دہ اور آخرت میں ان تباہی کا باعث ہے اسے انجام دیا لہٰذا انہیں جاہل ہی کہنا چاہیے کیونکہ انہوں نے اپنے علم پر عمل نہیں کیا (جادو کی بری تاثیر۔ آگاہ ہونے کے باوجود اسے اپنایا)...... اور جو شخص اپنے علم پر عمل نہ کرے وہ حقیقی "عالم" کیونکر کہلا سکتا ہے۔ اور جسے ا کا علم راہ راست پر نہ لا سکے وہ جاہل ہے نہ کہ عالم' اور اس کا علم درحقیقت گمراہی و جہالت کے سوا کچھ نہیں جیسا کہ خداوند عا نے ارشاد فرمایا:

سورہ جاثیہ آیت ۲۳:

" اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ "

(آیا آپ نے اسے دیکھا ہے کہ جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور خدا نے اسے علم کے باو: راہ راست سے دور کر دیا)۔

بہر حال ایسے علم رکھنے والوں کے لیے علم و ہدایت کی تمنا کرنی چاہیے۔

ایمان اور تقویٰ

○ "لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا..."

(اور اگر وہ ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کر لیں....)۔

یعنی اگر وہ لوگ شیاطین کی پیروی کرنے اور جادو کا عمل کر کے کفر اختیار کرنے کے بجائے ایمان لے آئیں اور متقی و پرہیزگار بن جائیں تو یقیناً ان کے لیے جو اجر و ثواب خدا کے پاس ہوگا، اس میں ان کی بہتری و بھلائی ہے' اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ "جادو کے سبب کفر" سے مراد اعتقادی طور پر کافر ہونا نہیں بلکہ عمل کے مرحلہ میں کفر اختیار کرنا ہے جیسے زکوٰۃ نہ دینے والے کا کفر' کیونکہ اگر اس سے اعتقادی طور پر کافر ہونا مراد ہوتا تو خداوند عالم "لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا لَمَثُوْبَةٌ" کہہ کر ایمان کو اجر و ثواب کے لیے کافی قرار دیتا اور "وَ اتَّقَوْا" کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی' جبکہ خدا نے "اٰمَنُوْا" کے بعد "وَ اتَّقَوْا" فرما کر ایمان اور تقویٰ دونوں کو اجر و ثواب کے استحاق کی شرط کے طور پر ذکر فرمایا ہے' اس کا سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اگرچہ ایمان لائے لیکن انہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار نہ کی...... اور اپنے ایمان پر عمل نہ کیا...... اس لیے ان کے ایمان کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہو سکی اور وہ ایمان پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے کافر قرار دیئے گئے۔

خدائی اجر و ثواب

○ "لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ"

(اللہ کے پاس جو اجر و ثواب ہے وہ بہتر ہے' کاش وہ اس سے آگاہ ہوتے)۔

اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ اس امر کی طرف متوجہ ہوتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ جادو کے ذریعے جو فوائد حاصل کرنے کے درپے ہیں ان سے کہیں بہتر فوائد اس اجر و ثواب میں موجود ہیں جو خدا کے پاس ہے۔

روایات پر ایک نظر

جادو کی کہانی امام محمد باقرؑ کی زبانی

تفسیر العیاشی اور تفسیر قمی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے منقول ہے کہ آنجنابؑ نے آیۂ مبارکہ "وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

جب حضرت سلیمان علیہ السلام انتقال کر گئے تو ابلیس نے جادو وضع کیا اور اسے ایک کتاب کی صورت میں یکجا کر دیا' پھر اسے لپیٹ کر اس کی جلد پر یہ لکھ دیا: "یہ وہ علم ہے جسے آصف بن برخیا نے سلیمان بن داؤد بادشاہ کے لیے علمی خزانوں

کے ذخیروں سے حاصل کیا ہے لہٰذا جو شخص فلاں کام میں کامیابی چاہتا ہو وہ یوں کرے اور جو فلاں کام میں کامیابی چاہتا ہو وہ یوں کرے (جادو سے استفادہ کرنے کے طریقے اور مقاصد ذکر کئے) پھر اس نے اسے حضرت سلیمانؑ کے تخت کے نیچے دفن کر دیا' اس کے بعد اسے وہاں سے نکالا اور لوگوں کے سامنے اسے پڑھا' تو کافروں نے کہا کہ "اب معلوم ہوا کہ سلیمان نے اس ...... علم ...... کے ذریعے ہم پر غلبہ حاصل کیا ہے"۔ لیکن مومنین نے کہا "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام خدا کے بندے اور اس کے نبی تھے" اس مطلب (واقعہ) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ" کہ ان لوگوں نے اس چیز کی پیروی کی جسے شیاطین' سلیمانؑ کے دور اقتدار میں پڑھا کرتے تھے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مذکورہ بالا روایت میں جادو کی اصل بناوٹ اور اس کا کتابی صورت میں لکھنا اور اسے لوگوں کے سامنے پڑھنا وغیرہ سب کچھ ابلیس کی طرف منسوب کیا گیا ہے لیکن اس نسبت سے اس (جادو) کی دیگر شیاطین جن وانس کی طرف نسبت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ ہر طرح کی شرارت و برائی کا اصل منبع و سرچشمہ وہی (ابلیس) ہے' اور وہی ملعون اسے (جادو کو) وسوسوں اور دیگر ذرائع سے اپنے پیروکاروں اور چاہنے والوں کے ذہنوں میں ڈالتا رہتا ہے اور یہ بات روایات واحادیث میں کثرت کے ساتھ مذکور ہے۔

اس کے علاوہ جو بات اس روایت کی بابت قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اس میں "تتلوا" کا اشتقاق (لفظی بناوٹ) "تلاوت" سے کر کے اسے "پڑھنے" کے معنے میں لیا گیا ہے' گویا اس سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ شیاطین لوگوں کے سامنے "پڑھتے تھے"۔ تاہم "تتلوا" سے "تلاوت" یعنی قرائت کرنے اور پڑھنے کا معنی مراد لینا ہمارے سابقہ بیان کی نفی نہیں کرتا جس میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ "تتلوا" کا ایک معنی یہ ہے کہ "وہ جھوٹ بولتے تھے" کیونکہ "جھوٹ بولنے" کا معنی ضمنی طور پر مراد لیا گیا ہے نہ یہ کہ لغت میں اس کا یہی معنی ہے' تو اس صورت میں "تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ" و اس طرح سمجھا جائے گا کہ گویا اصل میں یوں ہے: "یقرؤنه کاذبین علی ملك سلیمان" یعنی وہ سلیمانؑ کے دور اقتدار میں لوگوں کے سامنے جھوٹ بیان کیا کرتے تھے...... جھوٹی باتیں پیش کرتے تھے...... اور جہاں تک "تلا' یتلو" کا تعلق ہے تو اس کا معنی اصل میں "ولی' یلی' ولایۃ" کے معنے کی طرف لوٹتا ہے جس سے مراد کسی چیز کے اجزاء کی ترکیب و ترتیب (اجزاء کے یکے بعد دیگرے لانے) میں صاحب اختیار ہونا ہے' بہر حال "ولایت" اور اس کے معنی و مفہوم کا تفصیلی ذکر سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ "اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" کی تفسیر میں کیا جائے گا۔

امام رضاؑ اور مامون رشید کے مکالمہ سے اقتباس

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں "حضرت امام رضا علیہ السلام کے مامون رشید عباسی کے ساتھ مکالمے" میں ذکر کیا گیا ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"ہاروت و ماروت" دو فرشتے تھے کہ جنہوں نے لوگوں کو اس لیے جادو کی تعلیم دی کہ وہ اس (جادو) کے ذریعے جادوگروں کی بیہودہ حرکتوں کے مقابلے میں اپنا دفاع کر سکیں اور ان کی مکاریوں' چالبازیوں اور فریب کو بے اثر کر سکیں' یہی وجہ ہے کہ انہوں (ہاروت و ماروت) نے اس وقت تک کسی کو جادو کی تعلیم نہیں دی جب تک اس سے یہ نہیں کہہ لیا کہ ہم صرف تم لوگوں کی آزمائش و امتحان کے لیے بھیجے گئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کفر اختیار کر لو (جادو کے غلط استعمال سے کفر کی راہ پر چل پڑو) لیکن لوگوں نے ان کی نصیحتوں پر کان نہ دھرے اور کئی لوگوں نے جادو کو انہی کاموں میں استعمال کیا جن سے انہیں روکا گیا تھا اور جادوگروں کی چالبازیوں سے بچنے کے لیے استعمال کرنے کی بجائے خود جادوگروں کی مانند مکاریوں اور چالبازیوں میں مصروف ہو گئے چنانچہ انہوں نے ایسے کام کرنے شروع کر دیئے جن کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ و اختلاف ڈال سکیں' اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "وَمَا هُم بِضَآرِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ" کہ وہ جادو کے ذریعے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر یہ کہ خدا کا حکم آ جائے۔

حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی کا واقعہ

تفسیر "درمنثور" میں ابن جریر سے منقول ہے کہ جناب عبداللہ بن عباس نے فرمایا: "جب حضرت سلیمانؑ بیت الخلاء جانا چاہتے یا کوئی اس طرح کا کام انجام دینا چاہتے تو اپنی انگشتری اپنی بیوی کہ جس کا نام "جرادہ" تھا کے سپرد کر دیتے' پس جب خداوند عالم نے گوناگوں آزمائشوں کے ذریعے سلیمانؑ کا امتحان لینا چاہا تو اس طرح ہوا کہ ایک دفعہ حضرت سلیمانؑ اپنی انگوٹھی حسب معمول اپنی بیوی "جرادہ" کو دے کر گئے تو شیطان، حضرت سلیمانؑ کی شکل اختیار کر کے اس کے پاس آ گیا اور اس سے کہنے لگا "مجھے میری انگوٹھی دو"۔ جرادہ نے اسے سلیمان سمجھ کر وہ انگوٹھی اسے دے دی' شیطان نے اس انگوٹھی کو پہن لیا' جوں ہی اس نے وہ انگوٹھی پہنی تمام شیاطین جن و انس اس کے تابع فرمان ہو گئے' اس کے بعد حضرت سلیمانؑ تشریف لائے انہوں نے جرادہ' سے فرمایا: میری انگوٹھی لے آؤ! جرادہ نے کہا: تو جھوٹ بولتا ہے تو سلیمان نہیں ہے۔' جرادہ کی بات سن کر حضرت سلیمانؑ سمجھ گئے کہ یہ ایک آزمائش ہے کہ جس سے وہ دوچار ہوئے ہیں اور خدا کی طرف سے انہیں اس میں مبتلا کیا گیا ہے' اسی دوران شیاطین نے جادو اور کفر پر مشتمل کتب رکھ دیں اور انہیں حضرت سلیمانؑ کے تخت کے نیچے دفن کر دیا (چھپا دیا) پھر انہیں نکال کر لوگوں کے سامنے پڑھا' تب لوگوں نے کہا کہ اب معلوم ہوا کہ سلیمان نے ان کتب کے ذریعے ہم پر غلبہ پایا تھا' چنانچہ لوگ ان سے بیزار ہو گئے اور ان کی تکفیر کرنے لگے (انہیں کافر کہنے لگے) یہاں تک کہ خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور یہ آیت ان پر نازل کی: "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا ..."۔

یہ واقعہ دیگر روایات میں بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور یہ ان واقعات کے باب میں مذکور ہے جن میں انبیاءؑ کی لغزشوں کو بیان کیا گیا ہے۔

(مترجم) انبیاءؑ ہر طرح کی لغزشوں سے پاک ہیں جن روایات میں لغزشوں کی نسبت انبیاءؑ کی طرف دی گئی ہے وہ قابل قبول نہیں ہو سکتیں، آئمہ معصومینؑ سے اس طرح کے بیانات کا صادر ہونا قطعاً بعید ہے، یہ سب نادان دوستوں یا شیطان صفت دشمنوں کی جعل کردہ روایات کے سوا کچھ نہیں چنانچہ مولفؒ نے اس طرح کی روایات کی نفی کی ہے (آئندہ بحثوں میں ذکر ہوگا)

ہاروت و ماروت اور زہرہ کی داستان

تفسیر ''در منثور'' ہی میں اور سعید بن جریر اور خطیب خوارزمی نے اپنی کتاب تاریخ میں ''نافع'' کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں ایک سفر میں عبداللہ بن عمر کے ہمراہ تھا جب رات ڈھل گئی تو عبداللہ نے مجھ سے کہا کہ دیکھو! آیا آسمان پر سرخ ستارہ نکل آیا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا: نہیں! اس نے دو تین مرتبہ مجھ سے پوچھا اور میں نے بھی نفی میں جواب دیا' پھر پوچھا تو میں نے کہا: ہاں' تو عبداللہ نے کہا: ہم اسے خوش آمدید نہیں کہتے اس کے طلوع ہونے پر اظہار مسرت نہیں کرتے ..... میں نے کہا: سبحان اللہ! یہ تو خداوند عالم کے تابع فرمان اور اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور خدا کے ہر حکم کی اطاعت کرتا ہے' عبداللہ نے کہا: میں نے جو بات تم سے کہی ہے وہ میں نے حضرت پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی ہے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا' آنحضرتؐ نے فرمایا: فرشتوں نے خدا کی بارگاہ میں عرض کی بارالہا! بنی نوع آدم کے گناہوں اور ان کی غلط کاریوں پر تو کیونکر صبر کرتا ہے؟ خدا نے ارشاد فرمایا: میں نے ان کی آزمائش بھی کی ہے اور انہیں عافیت بھی دی ہے۔ فرشتوں نے کہا' اگر ہم ان کی جگہ پر ہوتے تو کبھی ایسا نہ کرتے' ہرگز تیری نافرمانی نہ کرتے'۔ فرشتوں کی بات سن کر خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: پس تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرو'۔ فرشتوں نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش اور سوچ بچار کے بعد بالآخر دو فرشتوں ''ہاروت و ماروت'' کا انتخاب کرلیا' اور وہ دونوں زمین پر اتر آئے۔ خدا نے ان دو فرشتوں پر ''شق'' ڈال دی' میں نے پوچھا (نافع نے کہا): ''شق'' سے کیا مراد ہے؟ عبداللہ نے جواب دیا: اس سے مراد ''شہوت'' ہے! (انہیں شہوانی قوت و احساس عطا کیا)۔ پھر ان کے پاس ایک عورت آئی جس کا نام ''زہرہ'' تھا اس نے ان دونوں کو اپنا فریفتہ کرلیا اور ان کے دل خرید لیے' لیکن ان میں سے ہر ایک، دوسرے سے اپنے دل کا راز چھپاتا رہا اور یہ ظاہر نہ ہونے دیتا تھا کہ اس کے دل میں اس عورت کی محبت پیدا ہوگئی ہے' بالآخر ان میں سے ایک سے رہا نہ گیا اور اس نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ جو کچھ میرے دل میں آ گیا ہے آیا تیرے دل میں بھی وہی کچھ آ گیا ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں' پھر انہوں نے اسے بلایا اور وصل کی تمنا ظاہر کی' اس عورت نے کہا اس وقت تک اپنے آپ کو آپ کے اختیار میں قرار نہیں دے سکتی جب تک آپ مجھے یہ نہ بتا دیں کہ وہ کون سا نام ہے جس کے ساتھ آپ آسمان پر چلے جاتے ہیں اور پھر زمین پر اتر آتے ہیں؟ انہوں نے وہ نام بتانے سے انکار کر دیا' تاہم پھر اس سے ''وصل'' کی خواہش ظاہر کی مگر اس نے انکار کر دیا بالآخر انہوں نے اس کی بات مان لی اور اسے وہ نام بتا دیا جس کے ذریعے آسمان پر جاتے اور پھر زمین پر اتر آتے تھے

پس جب کام انجام ہو گیا تو خدا نے اس عورت کو ایک ستارے کی شکل میں اٹھا لیا اور ان دو فرشتوں کے پر کاٹ دیئے' پھر ان دونوں نے بارگاہ الٰہی میں اپنے کئے پر اظہار ندامت کیا اور توبہ کی' خداوند عالم نے انہیں اختیار دیا کہ ان دو باتوں میں سے ایک کو چن لو: (۱) میں تمہیں پہلی حالت میں پلٹا دوں مگر قیامت کے دن تمہیں سزا دوں گا (عذاب کروں گا)۔ (۲) میں تمہیں دنیا ہی میں سزا دے دوں اور پھر قیامت کے دن تمہیں تمہاری اصلی حالت میں لے آؤں' یہ سن کر ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ دنیا کا عذاب تو زوال پذیر ہے اور بالآخر ختم ہو جائے گا لہٰذا اسی کو قبول کر لیا جائے چنانچہ انہوں نے دنیا میں سزا پانے کو آخرت کے عذاب پر ترجیح دی' پھر خداوند عالم نے ان پر وحی فرمائی کہ تم "بابل" کی سرزمین میں اتر جاؤ' چنانچہ وہ "بابل" میں چلے گئے' وہاں خدا نے انہیں ذلت سے دوچار کر دیا اور وہ اب آسمان و زمین کے درمیان اوندھے منہ لٹکے ہوئے ہیں اور قیامت تک اسی حالت میں رہیں گے (عذاب میں مبتلا رہیں گے)۔

روایت کا تحقیقی جائزہ

مذکورہ بالا روایت کی مانند بعض شیعہ کتب میں بھی راوی کے حوالہ کے بغیر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ذکر کی گئی ہے' اور سیوطی نے ہاروت و ماروت اور زہرہ کی بابت اسی روایت سے ملتی جلتی بیس سے زیادہ روایات ذکر کی ہیں اور ان روایات کی اسناد کو بھی صراحت کے ساتھ "صحیح" کہا گیا ہے اور ان میں سے بعض روایات کی اسناد کا سلسلہ چند اصحاب (صحابہ کرام) تک جا پہنچتا ہے جن میں ابن مسعودؓ ابن عباسؓ' امام علیؑ' ابو درداءؓ' عمرؓ عائشہؓ اور ابن عمرؓ سرفہرست ہیں لیکن یہ بات مسلم اور ناقابل انکار ہے کہ یہ واقعہ بے بنیاد اور خود ساختہ ہے اور اس میں بیہودہ باتوں کی نسبت خدا کی پاک و پاکیزہ مخلوق فرشتوں کی طرف دی گئی ہے جبکہ قرآن ان کی پاکیزگی اور ہر طرح کے شرک اور معصیت و نافرمانی سے پاک ہونے کی کھلی گواہی دیتا ہے مگر ان روایات میں شرک کی بدترین قسم اور معصیت و نافرمانی کی قبیح ترین صورت کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے مثلاً بت پرستی' قتل' زنا اور شرابخواری وغیرہ' اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ ستارہ "زہرہ" کو ایک زانی عورت کی مسخ شدہ صورت کہا گیا ہے' حالانکہ ستارہ "زہرہ" ایک پاک و پاکیزہ آسمانی ستارہ ہے جسے ابتدائے آفرینش ہی سے ہر طرح کی آلائشوں سے منزہ قرار دیا گیا ہے' اور اس سے بالاتر یہ کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں اس کی قسم کھائی ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے: "اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ" سورہ تکویر، آیت ۱۶..... اور اس کے علاوہ یہ کہ عصر حاضر میں علم افلاک (ستارہ شناسی کے علم) نے اس کے بارے میں بھرپور وضاحت کر دی ہے اور اس کے عناصر' کیفیت و کمیت اور دیگر صفات و اوصاف کو واضح طور پر اور تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے' جس کے بعد اس کے بارے میں ہر قسم کے موہوم نظریات اور بے بنیاد افکار کی قلعی کھل جاتی ہے۔

بہر حال یہ واقعہ سابقہ روایات میں مذکور واقعہ کی مانند یہودیوں کی ان من گھڑت داستانوں کی طرح ہے جو وہ "ہاروت و ماروت" کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں' اور اس کے علاوہ یہ کہ خرافات اور بیہودہ باتوں پر مشتمل یہ واقعہ، یونانیوں

کے ان خودساختہ و بے بنیاد واقعات کی مانند ہے جو وہ ستاروں اور سیاروں کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں ارباب تحقیق پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس طرح کی جعلی و من گھڑت روایات کہ جن میں انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف نہایت بیہودہ قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں' دراصل یہودیوں کی چالبازیوں اور مکاریوں کا ایک نمونہ ہے۔ اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ (یہودی) صدر اسلام میں محدثین کی صفوں میں گھس کر نہایت پراسرار طور پر احادیث کی تدوین میں اپنا اثر استعمال کرتے تھے اور اپنی مرضی کے مطابق بے بنیاد باتیں احادیث میں درج کروا دیتے تھے اور اس گھناؤنے کام میں کئی دوسرے لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

لیکن اس کے باوجود خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب قرآن مجید کو اس طرح اپنی خصوصی حفاظت میں رکھا کہ چالباز اور مکار دشمن اس میں دخل اندازی کرنے میں ناکام رہے چنانچہ جب بھی کوئی شیطان جاسوسی کی کوشش کرتا تو اس کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو جاتا تھا اور اس کی مکاری عیاں ہو جاتی تھی اور خدا کا کلام ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رہتا تھا' چنانچہ خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب کی بابت یوں ارشاد فرمایا:

سورہ حجر آیت ۹:

"اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ"

(ہم نے ہی قرآن ...... ذکر ...... نازل کیا اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

سورہ فصلت، آیت ۴۲:

"وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيۡزٌ ۝ لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَ لَا مِنۡ خَلۡفِهٖ‌ ؕ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ"

(اور یہ عزت والی کتاب ہے' باطل نہ اس کے سامنے سے آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے' یہ حکمت والے اور تعریفوں والے ..... خدا ..... کی طرف نازل ہوئی ہے)۔

سورہ اسریٰ، آیت ۸۲:

"وَ نُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ‌ ۙ وَ لَا يَزِيۡدُ الظّٰلِمِيۡنَ اِلَّا خَسَارًا"۔

(اور ہم قرآن نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے شفا اور رحمت ہے' اور ظالموں کو سوائے خسارے کے کچھ حاصل نہ ہوگا)۔

ان آیات میں قرآن کی "حفاظت" کی بات کسی طرح کی قید و شرط کے ساتھ نہیں کی گئی بلکہ مطلق انداز بیان میں اس مطلب کو بیان کیا گیا کہ قرآن مجید کسی طرح کے جعل اور آمیزش کو اپنے قریب نہ آنے دے گا اور جو قرآن میں اپنی طرف سے کچھ شامل کرنے کی مذموم کوشش کرے گا قرآن اسے بے نقاب کر دے گا اور اس کی تباہی کا چرچا ساری دنیا میں ہو

جائے گا اور لوگ اس کے پس منظر و پیش منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیث بھی موجود ہے جسے فریقین (شیعہ و سنی) نے اپنی معتبر و مستند کتب میں تحریر کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

"ما وافق کتاب الله فخذوه وما خالف کتاب الله فاتر کوه۔ "(جو کچھ کتاب خدا (قرآن) کے مطابق ہو اسے لے لو اور جو کچھ کتاب خدا (قرآن) کے مطابق نہ ہو۔ اسے چھوڑ دو)۔

اس حدیث میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اصول اور معیار بیان فرمایا ہے تا کہ جو روایات آنحضرتؐ اور آپؐ کے اولیاء کرام..... آئمہ اطہار علیہم السلام..... کی طرف منسوب کر کے ذکر کی جائیں ان کی صحت و عدم صحت کو اس معیار پر پرکھا جائے کہ اگر اس کے مطابق ہوں تو انہیں صحیح مان لیا جائے ورنہ چھوڑ دیا جائے' یہ ایک بنیادی اصول ہے جس کی روشنی میں تمام احادیث و روایات کے معانی و مطالب کی چھان بین کرنا آسان ہے' بہر حال قرآن مجید ہی کو معیار قرار دے کر حق و باطل کی تمیز کی جا سکتی ہے اور اسی کے ذریعے باطل کو اس طرح محو و نابود کیا جا سکتا ہے کہ زندہ دلوں پر اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور وہ ہر دل سے اسی طرح اتر جائے جس طرح کہ ہر نظر سے گر چکا ہے' چنانچہ خداوند عالم نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہ انبیاء، آیت ۱۸:

"بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ"

(بلکہ ہم حق کے ذریعے باطل کو مٹا دیتے ہیں پھر وہ (حق) اس (باطل) کا نام و نشان ختم کر دیتا ہے)۔

سورہ انفال، آیت ۷:

"وَيُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّحِقَّ الۡحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ"

(اور اللہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات کے ذریعے حق کا بول بالا رکھے)۔

سورہ انفال، آیت ۸:

"لِيُحِقَّ الۡحَقَّ وَيُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ"

(تا کہ حق ثابت و مستقر ہو جائے اور باطل مٹ جائے خواہ بدکار و مجرم لوگ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں)۔

مذکورہ بالا آیات شریفہ میں احقاق حق اور ابطال باطل کا ذکر ہوا ہے' تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد سوائے اس کے نہیں کہ ان دونوں (حق و باطل) کی صفات و نشانیاں ظاہر ہوں جن کے ذریعے ان کے درمیان تمیز ممکن ہو سکے' لیکن افسوس ہے کہ کچھ لوگ بالخصوص ہمارے ہمعصر دانشوروں میں سے وہ حضرات جو اکثر مادی بحثوں میں منہمک رہتے ہیں اور جدید مغربی تہذیب و تمدن اور مادی ترقی سے مرعوب ہو چکے ہیں انہوں نے مذکورہ بالا حقیقت سے غلط استفادہ کرتے ہوئے سنت نبویؐ کو سرے ہی سے ترک کر دیا ہے اور صحیح روایات کے مضامین کو بھی نظر انداز کر دیا ہے گویا انہوں نے اس باب میں تفریط کا

راستہ اختیار کیا ہے جیسا کہ اخباری نظریہ کے بعض پیروکاروں، اہل حدیث اور حروریوں نے اس باب میں افراط کی راہ پر چلتے ہوئے ہر روایت کو خواہ وہ جس طرح سے بھی بیان کی گئی ہو قبول کیا، جبکہ حقیقت امر یہ ہے کہ دونوں نظریے غلط و نادرست ہیں یعنی نہ افراط صحیح ہے نہ تفریط، کیونکہ جس طرح ہر طرح کی روایت کو...... کسی قسم کے اصول وضابطہ کے بغیر...... تسلیم کرنا ان دینی معیاروں کی سراسر نفی کرنے کے برابر ہے جو حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کے لیے مقرر کئے گئے ہیں اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف غلط و نادرست باتوں کی نسبت دینے کے برابر ہے، اسی طرح کسی روایت کو سرے سے قبول نہ کرنا بھی درست نہیں کیونکہ اس سے نہ صرف ایک روایت کی نفی ہوتی ہے بلکہ اس معیار کو بھی پس پشت ڈال دینا لازم آتا ہے جو قرآن مجید نے ہمیں بتایا ہے جبکہ قرآن مجید ایسی مقدس کتاب ہے جس میں باطل و نادرست امور کے راہ پانے کی قطعی کوئی گنجائش موجود نہیں، قرآنی معیار ملاحظہ ہو۔

سورۂ حشر، آیت ۷:

"مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا"

(جو کچھ رسول تمہارے سامنے پیش کریں (دے دیں) اسے لے لو اور جس سے روک دیں رک جاؤ)۔

سورۂ نساء، آیت ۶۴:

"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ"

(ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر صرف اس لیے کہ خدا کے حکم پر اس کی اطاعت کی جائے۔)

یہ بات واضح ہے کہ اگر حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ارشادات یا آنحضرتؐ سے منقول روایات ہمارے لیے یا ان لوگوں کے لیے جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں موجود تو تھے مگر آپؐ کے حضور شرفیاب نہ ہو سکتے تھے قابل قبول (حجت) نہ ہوں تو دینی حقائق کی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی اور اس سے بالاتر یہ کہ بیانات اور خبروں پر اعتماد کرنے کا جو عام اصول انسانی معاشرے کی اجتماعی زندگی میں رائج ہے اور ہر شخص فطری و بدیہی طور پر اسے تسلیم کرتا ہے اس کی نفی ہو جائے گی جبکہ اس پر اعتماد کرنا ناگزیر ہے اور اس پر اعتماد کرنے کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ باقی رہی بیانات اور خبروں میں من گھڑت اور جعلی باتوں کو شامل کرنے کی بات، تو یہ صرف دینی بیانات وروایات ہی میں نہیں بلکہ ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے امور سے مربوط بیانات میں پائی جاتی ہے اور ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ہر زمانے میں معاشرتی مسائل کا دارومدار انہی خبروں اور بیانات پر ہوتا ہے اس کے باوجود ان...... بیانات اور خبروں...... میں طرح طرح کے من گھڑت اور بے بنیاد وخود ساختہ مطالب بھی پائے جاتے ہیں اور ان مطالب میں گوناگوں سیاسی وغیر سیاسی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جو کہ دینی بیانات میں پائے جانے والے من گھڑت مطالب کی نسبت کہیں زیادہ ہیں لیکن یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ ہمارا انسانی فطری اصول یہ ہے کہ ہر بیان یا خبر پر صحیح اعتماد نہیں کرتے بلکہ اسے ان معیاروں پر پرکھتے ہیں جو کسی بیان یا خبر کے صحیح یا غلط ہونے کی پہچان کے لیے ہمارے پاس موجود ہیں پس اگر وہ بیان یا خبر ان معیاروں کے مطابق ہوئی تو ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں ورنہ اسے چھوڑ دیتے

ہیں اور اس پر کان ہی نہیں دھرتے‘ لیکن اگر کوئی بیان یا خبر ایسی ہو جس کے بارے میں صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ نہ ہو سکے تو اس کی بابت تصدیق یا تردید کی بجائے احتیاط کی راہ اختیار کرتے ہوئے ’’توقف‘‘ کرتے ہیں کیونکہ خطرہ اور نقصان کے امکان کی صورت میں ’’احتیاط‘‘ کی راہ اختیار کرنا فطری امر و تقاضا ہے‘ البتہ یہ طریقہ یعنی احتیاط کی راہ اختیار کرنا اسی صورت میں صحیح ہے جب ہم اس بیان یا خبر (کہ جسے ہم نے سنا ہے) کی بابت اس کے صحیح یا غلط ہونے کی تشخیص کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں لیکن اگر ہم اس طرح کی اہلیت نہ رکھتے ہوں تو اس صورت میں ان افراد کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ایسا کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوں اور اس طرح کے بیانات اور خبروں کے صحیح یا غلط ہونے کی تشخیص کی مہارت رکھتے ہوں‘ ہمارا ایسا کرنا انسانی معاشرے میں ہماری فطرت کا تقاضا ہے اور ہمارے دین نے حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کے جو رہنما اصول و معیار ہمیں بتائے ہیں وہ بھی ایسا کرنے کی نفی نہیں کرتے بلکہ وہ اس کی تائید کرتے ہیں اور وہ (اصول و معیار) یہ ہے کہ جو بیان یا خبر ...... روایت یا حدیث ...... ہمارے سامنے آئے ہم اس کے صحیح یا غلط ہونے کے لیے قرآن کو معیار قرار دیں اگر وہ قرآن کے مطابق ہو تو اسے تسلیم کر لیں اور اگر اس کا صحیح یا غلط ہونا کسی ’’شبہ‘‘ کی وجہ سے واضح طور پر معلوم نہ ہو سکے تو اس کی بابت کسی قسم کا اظہار رائے (تصدیق یا تردید) کئے بغیر ’’توقف‘‘ (عملی سکوت) اختیار کریں کیونکہ ’’شبہ‘‘ کی صورت میں عملی سکوت (توقف) کی بابت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہار علیہم السلام کی روایات متواترہ موجود ہیں‘ تاہم یہ بات یاد رہے کہ مذکورہ بالا تمام مطالب ...... اور صحیح و غلط کے درمیان تمیز کے معیار ...... ان مسائل سے مربوط ہیں جن کا تعلق فقہ سے نہیں‘ فقہ سے مربوط مسائل میں ان معیاروں کی بابت تفصیلی بحث کے لیے علم ’’اصول فقہ‘‘ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

ایک فلسفیانہ بحث

یہ ایک واضح امر ہے کہ دنیا میں خارق العادت افعال وقوع پذیر ہوتے ہیں اور لوگ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں یا پھر ان کے بارے میں مطلع ہوتے ہیں اور ہم میں سے بہت ہی کم ایسے افراد ہوں گے جنہوں نے نہ تو کسی خارق العادت امر کا مشاہدہ کیا ہو یا اس سے مطلع نہ ہوئے ہوں۔ بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ ہر شخص اس کے بارے میں آگاہی رکھتا ہے ...... تاہم ان افعال ...... خارق العادت امور ...... کے سلسلے میں مکمل تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

(۱) ان میں سے اکثر افعال کے اسباب طبیعی و عادی ہیں یعنی خارق العادت ہونے کے باوجود ان کے اسباب ’’طبیعت‘‘ اور ’’عادت‘‘ کے دائرے سے خارج نہیں‘ چنانچہ ان افعال میں کئی ایسے ہیں جو ’’عادت‘‘ اور بار بار انجام دینے (مشق) کی وجہ سے انجام پذیر ہوتے ہیں مثلاً زہر ...... یا زہریلی چیزوں ...... کا کھانا‘ غیر معمولی بھاری چیزیں اٹھا لینا‘ فضا میں لٹکی ہوئی رسی پر چلنا وغیرہ‘ تو یہ سب کام ایسے ہیں جن کا انجام دینا عام طور پر آسان نہیں لیکن کچھ لوگ اپنی مضبوط مشق

اور بار بار انجام دے کر تجربہ حاصل کرنے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ انہیں انجام دیتے ہیں'

(۲) ان میں سے کچھ افعال ایسے ہیں جو بظاہر غیر معمولی یا خارق العادت معلوم ہوتے ہیں جبکہ ان کے اسباب عام لوگوں سے مخفی ہوتے ہیں اور عام لوگ ان اسباب سے آگاہ نہیں ہوتے مثلاً آگ میں کود جانا' کچھ لوگ جلتی ہوئی آگ میں کود جاتے ہیں مگر آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ان پر اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ انہوں نے اپنے بدن پر ایسا تیل لگایا ہوتا ہے جس کی وجہ سے آگ بدن پر اثر نہیں کرتی' اسی طرح کچھ لوگ سفید کاغذ پر کچھ لکھتے ہیں جس کے ظاہری نشان کاغذ پر نظر نہیں آتے اور جسے لکھنے والے شخص کے علاوہ کوئی نہیں پڑھ سکتا' اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اسے ایسے بے رنگ مائع سے لکھا جاتا ہے جو اسی صورت میں الفاظ کو ظاہر کرتا ہے جب اسے آگ کے سامنے لایا جائے' تو عام لوگ اس راز سے بے خبر ہوتے ہیں'

(۳) ان میں سے کچھ افعال ایسے ہیں جو ہاتھ کی صفائی اور بھرپور مہارت و ہوشیاری کی وجہ سے انجام پاتے ہیں اور انجام دینے والا شخص اس قدر سرعت و تیزی کے ساتھ کام کرتا ہے کہ دیکھنے والا شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ کام کسی طبیعی اور معمولی سبب کے بغیر انجام پذیر ہوا ہے جبکہ حقیقت امر یہ ہوتی ہے کہ دیکھنے والا اس کے سبب کو دیکھ نہیں پاتا ورنہ اس میں کوئی غیر طبیعی سبب کارفرما نہیں ہوتا جیسا کہ شعبدہ بازی کرنے والے حضرات غیر معمولی کام انجام دیتے ہیں اور ان کے خارق العادت افعال کے اسباب بظاہر نظر نہیں آتے لیکن وہ سب کام اپنے طبیعی اسباب ہی سے انجام پاتے ہیں'

(۴) ان خارق العادت افعال میں سے کچھ افعال ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں طبیعی و عادی اسباب کا مرہون منت قرار نہیں دیا جا سکتا مثلاً غیب کی خبریں دینا بالخصوص مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی پیشگوئی' یا دو آدمیوں کے درمیان محبت یا دشمنی پیدا کرنا' گرہیں کھولنا اور باندھنا' کسی پر نیند طاری کر دینا' کسی کو بیماری میں مبتلا کر دینا' روحوں کو حاضر کرنا اور مضبوط ارادے کے ساتھ کسی چیز کو حرکت میں لانا اور ان جیسے دیگر افعال کہ جو ریاضت کرنے والے افراد انجام دیتے ہیں کہ ان میں سے بعض افعال کو ہم نے خود بھی دیکھا ہے اور بعض افعال کے بارے میں ہمیں موثق و معتبر ذرائع سے بتایا گیا ہے' ایسے افعال انجام دینے والے اکثر حضرات آج بھی ہندوستان' ایران اور بعض مغربی ممالک میں پائے جاتے ہیں' اور کوئی شخص ان افعال کا انکار بھی نہیں کر سکتا بلکہ ان کا وقوع پذیر ہونا مسلم الثبوت ہے' تاہم اگر ان ریاضتوں کی بابت گہرا مطالعہ' تحقیق اور غور و فکر کی جائے کہ جن کے سبب سے وہ ..... خارق العادت و غیر معمولی ..... افعال انجام پذیر ہوتے ہیں اور ریاضت کرنے والے افراد کے ان محیر العقول کارناموں اور ان کے مضبوط ارادوں کے بارے میں عملی تجربات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ سب کچھ قوت ارادہ اور اس کی تاثیر پر ٹھوس اعتقاد کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتا ہے یعنی ان تمام خارق العادت و غیر معمولی افعال کا سرچشمہ، ارادہ کی مضبوطی اور اس کی اثر آفرینی پر بھرپور ایمان ہے اور وہ اس طرح کہ پہلے کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے کا علم و یقین حاصل ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد اس کے بارے میں ارادہ کیا جاتا ہے اور وہ ''ارادہ'' اسی علم و یقین کی بنیاد پر اپنا اثر ظاہر کرتا ہے' البتہ تمام موارد ایک جیسے نہیں ہوتے بعض موارد میں ارادے کے ساتھ کسی قسم کی کوئی قید و شرط نہیں ہوتی جبکہ بعض میں مخصوص شرائط موجود ہوتی ہیں مثلاً دوستی یا دشمنی پیدا کرنے

کے لیے مخصوص الفاظ کو خاص قسم کی چیز پر خاص قسم کی سیاہی یا پینسل سے لکھنا، یا روحوں کو حاضر کرنے کے لیے کسی مخصوص صفات کے حامل بچے کے سامنے آئینہ رکھ دینا، یا مخصوص تعویذات اور ورد وغیرہ کا پڑھنا' تو یہ سب کچھ ارادہ کی تاثیر کے مخصوص حالات اور شرائط ہیں جن کی وجہ سے خارق العادت اور غیر معمولی افعال انجام پذیر ہوتے ہیں' بنابرایں جب کسی چیز کے بارے میں علم و یقین حاصل ہو جائے تو اس سے حواس کو ایسی قوت مل جاتی ہے جس سے انسان اس چیز کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور وہ چیز جس کے بارے میں علم و یقین حاصل ہوا تھا اپنی مجسم صورت میں انسان کے سامنے آ جاتی ہے' آپ خود بھی اس کو آزما سکتے ہیں اور وہ اس طرح کہ آپ پہلے اپنے آپ سے کہیں کہ فلاں چیز یا فلاں شخص میرے سامنے موجود ہے اور میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں' اور اس بات کی بابت اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھائیں پھر عالم خیال میں اس طرح اس کا تصور کریں کہ اس کے بارے میں کسی طرح کا شک و شبہ باقی نہ رہے یعنی اس کے موجود نہ ہونے کا شائبہ تک نہ پایا جائے بلکہ اس کے موجود ہونے اور سامنے قرار پانے کا پختہ یقین کر لیں تو آپ اس طرح محسوس کریں گے کہ وہ آپ کے سامنے ہے اور جس طرح سے آپ چاہتے تھے اسی طرح آپ اسے اپنے سامنے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں' چنانچہ تاریخ میں کئی ایسے واقعات مذکور ہیں کہ بعض حکماء و اطباء اپنے مریضوں کا علاج اسی طریقہ سے کرتے تھے یعنی مریض کو صحت یابی کا اس طرح یقین دلاتے تھے کہ پھر اسے اپنی بیماری کا تصور تک باقی نہ رہتا تھا جس کے بعد وہ اپنے آپ کو صحت مند پاتا اور بیماری کے آثار تک باقی نہ رہتے' یعنی وہ صحیح معنے میں صحت مند ہو جاتا تھا' لہٰذا جب یہ سب کچھ ممکن ہے اور وقوع پذیر بھی ہو چکا ہے تو پھر یہ بات بھی خارج از امکان نہ ہوگی کہ اگر ارادہ قوی ہو تو جس طرح اس کا اثر ارادہ کرنے والے پر ظاہر ہوتا ہے اس طرح سے دوسروں پر بھی ظاہر ہو خواہ کسی مخصوص شرائط اور حالات کے ساتھ ہو یا ان کے بغیر ہو' یعنی ارادہ کی تاثیر میں مخصوص حالات و شرائط کارفرما ہوں یا نہ ہوں۔

مذکورہ بالا مطالب سے جو اہم نکات واضح ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

پہلا نکتہ۔ قوت ارادہ کی اثر آفرینی میں یہ معیار ملحوظ ہوگا کہ خارق العادت کام انجام دینے والے شخص کو اس چیز کے بارے میں علم و یقین حاصل ہو جو اس کے مدنظر ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کا یہ علم و یقین اصل حقیقت کے مطابق بھی ہو مثلاً جو لوگ ستاروں کو مسخر کرتے ہیں وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ آسمانی ستاروں کے ساتھ کچھ روحیں وابستہ ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے' تو عین ممکن ہے کہ ان حضرات کا یہ نظریہ اصل حقیقت سے مطابقت نہ رکھتا ہو لیکن چونکہ وہ اس کی بابت اپنے تئیں علم و یقین رکھتے ہیں اس لیے ان کا ارادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بات کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ روحانی علوم کے ماہرین اور عملیات و اوراد کرنے والے حضرات جن مخصوص فرشتوں اور شیاطین کے ناموں کے ذریعے اپنے مخصوص انداز میں دعائیں اور عملیات کرتے ہیں وہ بھی اسی زمرے سے ہوں' (یعنی جس طرح ستاروں کی تسخیر کرنے والے حضرات مفروضہ روحوں کی ستاروں کے ساتھ وابستگی کا نظریہ قائم کر کے ان سے استفادہ کرتے ہیں اسی طرح عملیات کرنے والے حضرات بھی مفروضہ ملائکہ و شیاطین سے استفادہ کرتے ہوں) روحوں کو حاضر کرنے والے حضرات کا نظریہ بھی ایسا ہی ہے کہ

جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ روحوں کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں جبکہ ان کے پاس سوائے اس کے اور کوئی دلیل وثبوت ہی نہیں کہ یہ روحیں ان کے عالم خیال یا عالم حس میں حاضر ہوتی ہیں (یعنی ان کا دعوی ہی ان کی دلیل ہے ورنہ اس کے علاوہ کوئی دلیل موجود نہیں) تو اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا واقعتا کچھ روحیں ایسی ہیں جو ان کے سامنے ہوتی ہیں اور وہ انہیں دیکھتے ہیں یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں ہم یہ کہیں گے کہ اگر ان کی بات صحیح ہوتی تو یقینا ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی روحوں کا مشاہدہ کر سکتے کیونکہ ہر شخص عالم خیال و عالم حس رکھتا ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ صرف چند افراد کے عالم حس ہی میں روحیں جلوہ فگن ہوسکیں' لہٰذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایسے افراد بھی اسی زمرے میں آتے ہیں جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں یعنی ستاروں کی تسخیر کرنے والے وغیرہ' بنابرایں روحوں کے حاضر کرنے کی بابت یہ چار شبہات وغلط فہمیاں بھی دور ہوجاتی ہیں:

۱۔ بعض اوقات لوگ اس شخص کی روح کو حاضر...... کرنے کا دعویٰ ..... کرتے ہیں جو زندہ ہے اور اپنے کام میں مصروف ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کی روح کو کسی جگہ حاضر کیا گیا ہے' حالانکہ ہر انسان کی ایک ہی روح ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ زندہ ہے، نہ یہ کہ ایک روح اس کے ساتھ رہتی ہے اور دوسری کو کسی جگہ حاضر کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ کہا جاتا ہے کہ روح تو مجردات میں سے ہے اور زمان و مکان سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں لہٰذا اسے کسی خاص جگہ حاضر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہی شخص کی روح دو مختلف افراد کے سامنے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

۴۔ کہا جاتا ہے کہ جو روحیں حاضر ہوتی ہیں وہ یا جھوٹی خبریں دیتی ہیں یا پھر ایک دوسرے کی تکذیب کرتی ہیں۔

بہر حال یہ چار قسم کے شبہات ...... غلط فہمیاں ...... روح کے احضار کی بابت موجود ہیں لیکن ان سب کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ روح صرف اسی شخص کے عالم خیال وحس میں ظاہر ہوتی ہے جو اسے حاضر کرنے کا عمل کرتا ہے نہ یہ کہ وہ (روح) عام مادی اشیاء کی طرح ظاہر بظاہر ہمارے مشاہدہ میں آنے والی چیزوں کی مانند ہے کہ جسے ہم اپنی حسی قوتوں کے ذریعے دیکھتے یا محسوس کر سکتے ہیں' (کیونکہ اگر روح، عام مادی اشیاء کی مانند ہوتی تو ہر شخص اسے محسوس یا اس کا مشاہدہ کر سکتا جبکہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ وہ صرف اسی شخص کے عالم خیال وحس میں آتی ہے جو اسے حاضر کرنے کا عمل کرتا ہے اور اس کے حاضر ہونے کے مخصوص حالات وشرائط وہی ہیں جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں)۔

دوسرا نکتہ۔ اپنے مضبوط وقوی ارادہ کی بنیاد پر خارق العادت ...... غیر معمولی ...... کام انجام دینے والا شخص یا تو اپنے ارادے میں اپنی ہی روحانی قوت کا سہارا لے گا جیسا کہ ریاضتیں کرنے والے اکثر افراد کا معمول ہے۔ تو لامحالہ اس کی قوت ارادہ اور اس کی اثر آفرینی نہایت محدود ہوگی' اور یا وہ اپنے ارادے میں اپنے پروردگار ...... خدائے متعال ...... کی ذات کا سہارا لے گا جیسا کہ انبیاء واولیائے الٰہی اور خدا کے نیک وصالح وصاحبان یقین کا معمول ہے کہ وہ جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں وہ صرف خدا کے لیے اور خدا ہی کی مدد وسہارے پر چاہتے ہیں اس کے علاوہ وہ کسی چیز کا ارادہ کرتے ہی نہیں اس لیے ان کا ارادہ خدائی ارادہ کہلاتا ہے جو کہ نہ محدود ہے اور نہ مقید' اور یہ ارادہ اس قدر پاک و پاکیزہ ہے کہ اس میں کوئی نفسانی قوت

کارفرما نہیں ہوتی بلکہ جس "نفس" سے یہ صادر ہوتا ہے اسے اس پر کسی طرح کا کنٹرول نہیں ہوتا اور وہ صرف ذات حق تعالیٰ کے سہارے پر قائم ہوتا ہے اسی لیے اسے ربانی ارادہ سے موسوم کیا جا سکتا ہے لہٰذا اگر وہ تحدی یعنی مخالفین کی طرف سے چیلنج کے مقام میں اپنی اثر آفرینی کرے جیسا کہ اکثر انبیاء علیہم السلام کی بابت منقول ہے تو اس کا اثر "معجزہ" کہلاتا ہے اور اگر "تحدی" کے مقام میں نہ ہو تو اسے کرامت یا استجابت دعا ...... جبکہ دعا بھی اس کے ساتھ ہو..... کہلاتا ہے' لیکن پہلی قسم والا ارادہ کہ جس میں ارادہ کرنے والا شخص صرف اپنی روحانی قوت کا سہارا لیتا ہے نہ کہ خدا کا' تو اگر اس کا اثر...... اور عمل .. جن یا روح وغیرہ کی مدد سے ظاہر ہو تو اسے اصطلاح میں "کہانت" کہا جاتا ہے اور اگر دعا' ورد وغیرہ کے ساتھ ظاہر ہو تو اسے "جادو" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

تیسرا نکتہ۔ چونکہ ان خارق العادت افعال کا دارومدار ارادہ کی قوت پر ہے لہٰذا ارادے میں قوت وضعف کی نسبت سے ان افعال میں بھی فرق پایا جائے گا اور یہ بات ممکن ہو گی کہ ان میں سے بعض افعال دوسرے بعض کا ابطال کر دیں ...... نہیں ختم کر دیں ...... جیسا کہ معجزہ جادو کو ختم کر دیتا ہے' یا یہ کہ ضعیف و کمزور ارادہ کے حامل افراد کا ارادہ ان افراد پر اثر نہ کرے جن کا ارادہ قوی و مستحکم ہے جیسا کہ تنویم یعنی کسی کو سلا دینے (اس پر نیند طاری کر دینے) اور روح کو حاضر کرنے کے اعمال میں دیکھا گیا ہے' بہرحال اس سلسلے میں مزید مطالب آئندہ مباحث میں ذکر کئے جائیں گے۔

ایک علمی بحث

اگرچہ ان علوم کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں خارق العادت افعال اور غیر معمولی و محیر العقول کاموں کی بابت بحث و تحقیق کی جاتی ہے' اور ان علوم کے بارے میں جامع بحث کر کے ان کی تمام قسموں اور خصوصیات وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ بھی نہایت مشکل امر ہے۔ تاہم ذیل میں ان چند علوم کا اجمالی تذکرہ و تعارف پیش کیا جاتا ہے جو عام شہرت رکھتے ہیں اور ارباب بحث و تحقیق کے درمیان متداول ہیں۔

ا۔ سیمیائی:

اس علم میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ قوت ارادی کو مخصوص مادی قوتوں کے ساتھ ملا کر عالم طبیعت میں پائی جانیوالی چیزوں پر کس طرح کنٹرول حاصل کیا جا سکتا ہے' اسی علم کی ایک قسم "عالم خیال پر کنٹرول حاصل کرنا" ہے کہ جسے آنکھوں کا جادو کہا جاتا ہے اور یہ جادو کی واضح ترین قسم ہے ...... اس کے ذریعے دیکھنے والے کے سامنے عجیب و غریب امور مجسم ہوتے ہیں......

۲۔لیمیاء:

اسے ''علم تسخیر'' بھی کہتے ہیں' اس میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ ارادی قوتوں کو قوی آسمانی ارواح کے ساتھ ملا کر کس طرح ان سے اثر حاصل کیا جا سکتا ہے یعنی وہ روحیں جو کواکب وستاروں اور حوادث روزگار سے وابستہ ہیں انہیں مسخر کر کے (اپنے کنٹرول میں لا کر) یا جنوں سے ارتباط واستمداد کرتے ہوئے یعنی انہیں مسخر کر کے کس طرح اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے' دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس علم میں روحوں اور جنوں کی تسخیر کے طریقوں کی بابت بحث وتحقیق کی جاتی ہے اسی وجہ سے اس علم کو ''علم تسخیرات'' یا ''مسخر کرنے کا فن'' کہا جاتا ہے۔

۳۔ہیمیاء:

اسے علم ''طلسمات'' بھی کہتے ہیں' اس علم میں عالم بالا کی قوتوں کے زمینی موجودات کے ساتھ اتصال کے ذریعے غیر معمولی افعال کی انجام دہی کے طریقوں کے بارے میں بحث وتحقیق کی جاتی ہے' کیونکہ جس طرح سے عالم طبیعت میں پائی جانے والی موجودات اور ان کی مختلف کیفیات، مختلف مادی حوادث وواقعات کے وقوع پذیر ہونے میں موثر ہوتی ہیں اسی طرح آسمانی ستاروں وسیاروں اور ان کی کیفیتوں کا معاملہ ہے کہ وہ بھی عالم مادہ وطبیعت میں رونما ہونے والے واقعات میں موثر ہیں' مثلاً کسی شخص کا زندہ ہونا یا مرنا وغیرہ اسی عالم مادہ وطبیعت کے واقعات میں سے ہے۔ پس اگر اس سے مناسبت کی حامل مخصوص آسمانی کیفیتوں کو اس واقعہ سے مربوط کر کے اسے ایک مناسب مادی صورت کے ساتھ ملایا جائے تو اس طرح کا واقعہ رونما ہو سکتا ہے' اسے ہی ''طلسم'' کہتے ہیں۔

۴۔ریمیاء:

اسے شعبدہ بازی بھی کہا جاتا ہے' اس میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ مادی قوتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے خواص سے آگاہی حاصل کر کے ایسے کام کیونکر انجام دیئے جا سکتے ہیں جو ظاہری طور پر ''خارق العادت'' اور غیر معمولی دکھائی دیں۔

مذکورہ بالا چار علوم وفنون، ایک اور علم وفن یعنی کیمیاء کے ساتھ مل کر پانچ ''سرّی علوم'' کہلاتے ہیں' کیمیاء ایسا علم وفن ہے جس میں عناصر کی صورتوں کو ایک دوسرے میں تبدیل کرنے کی کیفیتوں اور طریقوں پر بحث وتحقیق کی جاتی ہے۔ شیخ بہائیؒ نے فرمایا ہے کہ ان علوم کے بارے میں سب سے بہترین کتاب وہ ہے جو میں نے شہر ہرات میں دیکھی جس کا نام ''کلہ سرّ'' ہے اور یہ نام دراصل ان پانچ علوم کے پہلے حروف کا مجموعہ اور ان سے مرکب ہوا ہے یعنی ک، کیمیا سے' ل، لیمیا سے' ھ، ہیمیاء سے' س، سیمیا سے۔ اور ر، ریمیاء سے ہے جس کا مجموعہ مرکب ''کلہ سرّ'' بنتا ہے۔

ان علوم کی معروف ومستند کتب میں سے چند یہ ہیں:

۱۔خلاصۂ کتب بلیناس

۲۔ رسائل خسرو شاہی

۳۔ ذخیرہ اسکندریہ

۴۔ السر المکتوم...... رازی......

۵۔ التسخیر ات...... سکاکی......

۶۔ اعمال الکواکب السبعہ ..... حکیم طمطم ھندی......

اسی طرح کچھ علوم بھی ان سے ملحق ہوتے ہیں جن میں سرفہرست علم الاعداد ہے کہ جس میں اعداد اور حروف کے باہمی تعلق اور پھر ان دونوں کے دیگر مطالب کے ساتھ ارتباط اور مثلث یا مربع زائچے میں مطلوب مقاصد سے مناسب اعداد وحروف کو مخصوص خانوں میں قرار دینے کی ترتیب وترکیب کی بابت بحث ہوتی ہے اور ان علوم میں سے ایک علم ''خافیہ'' ہے اس میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ کسی چیز کے نام کے حروف کو تبدیل کر کے یعنی اسے توڑ مروڑ کر اور آگے پیچھے کر کے اس سے ان فرشتوں یا شیاطین کے ناموں کا استخراج کرتے ہوئے کہ جو ان پر موکل ہیں اپنے مقصد ومطلوب کو کیونکر حاصل کیا جاسکتا ہے اور اسی طرح ان ناموں سے ترتیب یافتہ اوراد کا پڑھنا بھی زیر بحث لایا جاتا ہے تا کہ ان کے ذریعے مقصد ومطلوب کا حصول ممکن ہو سکے اس علم کی معتبر ترین کتابوں میں سے شیخ ابو العباس تونی اور سید حسین اخلاطی کی تالیفات سرفہرست ہیں۔

ان علوم وفنون سے ملحقہ علوم میں سے دو اور بھی ہیں جو عصر حاضر میں عام رائج ہیں:

(۱) مسمریزم وہپناٹزم ہے۔

(۲) دوسرا احضار ارواح یعنی رحوں کو حاضر کرنے کا علم ہے۔

ان کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ سب کچھ ارادہ کی قوت اور عالم خیال پر اس کے کنٹرول کے نتیجے میں واقع ہوتا ہے اور ان کی بابت بیشمار کتابیں اور رسالے تحریر کئے گئے ہیں اور وہ اس قدر مشہور عام ہیں کہ اس مقام پر ان کے تذکرہ کی ضرورت ہی باقی نہیں بہر حال اب تک جو مطالب ہم نے ذکر کئے ہیں وہ صرف اس لیے کہ ان میں سے جو امور جادو اور کہانت پر منطبق ہوتے ہیں ان کی پہچان ہو سکے۔

آیات ۱۰۴ و ۱۰۵

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾

○ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿١٠٥﴾

ترجمہ

○ اے اہل ایمان! تم ..... رسول سے ..... یہ نہ کہو کہ ہماری رعایت کر (مہلت دے) بلکہ کہا کرو کہ ہم پر نظر فرمایئے اور تم ..... غور سے اس کی ہر بات کو ..... سنو (یاد رکھو) کافروں کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے۔ (۱۰۴)

○ اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور جو مشرک ہیں وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی خیر نازل ہو خدا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے اور خدا بہت بڑا فضل و عنایت کرنے والا ہے۔ (۱۰۵)

تفسیر و بیان

اہل ایمان سے خطاب

○ "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا..."

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔۔۔)

قرآن مجید میں یہ پہلا مقام ہے۔۔پہلی آیت ہے۔۔جس میں خداوند عالم نے مومنین سے "یا ایھا الذی امنوا" کے الفاظ میں خطاب کیا ہے اور پورے قرآن میں تقریباً ۸۵ مقامات ہیں جن میں مومنین سے خطاب میں ا انداز کو اپنایا گیا ہے۔

بہرحال یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس طرح کا انداز خواہ "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا" کے الفاظ میں مخاطب کا ل اختیار کرتے ہوئے ہو یا کسی دوسری صورت میں ہو اس سے صرف یہی امت ... امت محمدیہ ... مراد ہے بلکہ یہ با صرف اسی امت کی خصوصیات میں شامل ہے اس طرح کا انداز خطاب، قرآن مجید میں دوسری کسی امت کے لیے اخت نہیں کیا گیا۔اس کے مقابل سابقہ امتوں کے لیے لفظ "قوم" یا اصحاب وغیرہ استعمال کیا گیا ہے مثلاً: "قوم نوح" "ق ہود"، جیسے:

سورہ ہود، آیت ۲۸:

★ "قَالَ یٰقَوۡمِ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ..."

(اس نے کہا اے قوم۔۔میری قوم۔۔تمہاری کیا رائے ہے اگر میں دلیل کے ساتھ بات کروں۔۔)

سورہ توبہ آیت ۷۰:

★ "اَصۡحٰبِ مَدۡیَنَ"

(مدین کے اصحاب) یہاں امت یا قوم کی بجائے لفظ اصحاب ذکر کیا گیا ہے۔

سورہ ق، آیت ۱۲:

"وَّ اَصۡحٰبُ الرَّسِّ"

(رس کے اصحاب) یہاں قوم کو اصحاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سورہ طہ، آیت ۸۰:

★ "یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ"۔۔۔،

(اے بنی اسرائیل ۔۔) یہاں امت کو بنی کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

خطابات کے مختلف الفاظ سے معلوم ہوا کہ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا" (اے اہل ایمان) ایسا انداز تخاطب ہے جو امت محمدیہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک ہے' اور خداوند عالم نے اس انداز گفتگو سے اس امت کو نواز کر اسے شرف و عزت عطا فرمائی ہے' تاہم اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآنی خطابات اور انداز کلام میں اچھی طرح غور وفکر کرنے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ "الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا" (وہ لوگ جو ایمان لائے) کے الفاظ سے وہ لوگ مراد نہیں لیے گئے جو لفظ "المومنین" میں مقصود ہیں' یعنی اگرچہ بظاہر دونوں سے مراد اہل ایمان ہیں لیکن خطاب کے انداز میں فرق کی وجہ سے ان کے مصداق و مقصود میں بھی فرق ہے، ملاحظہ ہو۔

سورہ نور، آیت ۳۱:

★ "وَتُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيۡعًا اَيُّهَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ"۔

(اور تم سب خدا کے حضور توبہ کرو اے مومنین!)

سورہ مومن، آیت ۷، ۸:

★ "اَلَّذِیۡنَ یَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَ مَنۡ حَوۡلَهٗ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ رَبَّنَا وَسِعۡتَ کُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَةً وَّ عِلۡمًا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اتَّبَعُوۡا سَبِیۡلَکَ وَ قِهِمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا وَ اَدۡخِلۡهُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ ۣ الَّتِیۡ وَعَدۡتَّهُمۡ وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَ اَزۡوَاجِهِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِهِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۸﴾"۔

(جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو عرش کے اردگرد ہیں وہ اپنے پروردگار کی حمد وثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے مغفرت وبخشش کی دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! تو اپنی رحمت اور علم کے ساتھ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے پس ان لوگوں کو معاف فرما جنہوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چل پڑے اور انہیں جہنم کے عذاب سے بچا لے' اے ہمارے پروردگار! تو انہیں ان سدا بہار باغات میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور ان کے آباء واجداد' بیویوں اور اولاد میں سے جو بھی نیک و صالح ہوں ...... انہیں اپنے دامن مغفرت میں جگہ دے ...... کہ تو ہی طاقتور اور دانا ہے)۔

اس آیت شریفہ میں سب سے پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ حاملین عرش اور دیگر ملائکہ' لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا' (ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے) استغفار ...... مغفرت وبخشش کی دعا ...... کرتے ہیں'

اس کے بعد "الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا" کے الفاظ کو تبدیل کر کے ان کی بجائے "لِلَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اتَّبَعُوۡا" (وہ لوگ

جنہوں نے توبہ کی اور پیروی کی) کے الفاظ استعمال کئے گئے (توبہ کا معنی رجوع یعنی پلٹ آنا ہے)۔

اور اس کے بعد ان ...... حاملین عرش ملائکہ کی دعا جو انہوں نے "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (جو لوگ ایمان لائے) کے لیے کی اسے بیان کیا اور پھر اسے انہی ..... الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ..... کی طرف عطف کرتے ہوئے ان کے آباءواجداد ٔازواج واولاد کو ذکر کیا' تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر 'الذین امنوا' ان سب کے لیے کافی ہوتا جو حضرت پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لائے تو ان کے آباءواجداد، بیویوں اور اولاد کو علیحدہ صورت میں ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی بلکہ سب کے سب ایک ہی صف میں قرار پاتے' اور سب پر "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کا اطلاق ہوتا' لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" اور "وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ" کے افراد (مصداق) میں فرق ہے اور وہ دونوں ایک ہی صنف نہیں۔

یہی بات ایک اور آیت شریفہ میں غور کرنے سے بھی معلوم ہوتی ہے' ملاحظہ ہو:

سورہ طور، آیت ۲۱:

★ "وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍؕ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِیْنٌ"۔

(وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی تو ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے' ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ گرو ہے)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے مصداق میں ان کی ذریت واولاد شامل نہیں کیونکہ اگر اولاد بھی شامل ہوتی تو ان کا الگ تذکرہ کر کے انہیں "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے ملحق کرنے کے ذکر کی ضرورت ہی نہ ہوتی' یعنی یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ ہم 'انہیں' (اولاد وغیرہ کو) ان (الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) کے ساتھ ملا دیں گے'

اور اگر یہ کہا جائے کہ "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے مراد سب مومنین نہیں بلکہ مومنین کا ایک خاص گروہ مراد ہے کیونکہ "وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ" کے الفاظ اس بات کی دلیل ہے کہ وہی مومنین مراد ہو سکتے ہیں جو صاحبان اولاد ہوں نہ کہ تمام مومنین تب بھی اس صورت میں 'الحاق' کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی یہ کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے "وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ" ... ہم ان کے اعمال سے کچھ کم نہیں کریں گے کیونکہ وہ بھی ایمان لائے اور ان کی بھی ذریت اولاد ہوئی اور نسل درنسل ایمان موجود رہا' تو اس صورت میں 'الحاق' کا مسئلہ انہی مومنین سے مخصوص ہوگا جو صاحبان اولاد نہیں کہ جو ان کی پیروی کرتے ہوئے ایمان کے دائرے میں رہے لہٰذا وہ اپنے آباءواجداد کے ساتھ ملحق کئے جائیں گے' یہ بات بظاہر تو 'معقول' ہے لیکن آیت کا سیاق اور انداز اس کی تائید نہیں کرتا کیونکہ آیت کے انداز اور طرز بیان سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ..... مومنین کے ایک خاص گروہ کی تعظیم و تکریم کا بیان مقصود ہے اور ان کی امتیازی صفت و بزرگی کا تذکر مطلوب ہے جبکہ مذکورہ توجیہ کہ جسے ہم نے معقول کہا ہے اس سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بعض مومنین (ذریت اولاد)، دوسرے مومنین (آباءواجداد) سے ملحق ہوں گے اور وہ سب ایک جیسے ہیں اور ان میں کسی کو کسی پر کوئی فضیلت

برتری حاصل نہیں کیونکہ اصل معیار جو کہ ایمان ہے وہ سب میں پایا جاتا ہے اور وہ (ایمان) ایک ہی حقیقت ہے لہٰذا پہلے ایمان لانے والا، بعد میں ایمان لانے والے پر 'ایمان' کے حوالہ سے کوئی امتیاز نہیں رکھتا' لیکن یہ واضح ہے کہ آیت کے سیاق وطرز بیان سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس...... آیت...... میں مومنین کے ایک خاص گروہ کی فضیلت واعزاز کو بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ پہلے ایمان لائے انہیں یہ عزت واعزاز حاصل ہوا کہ ان کی ذریت واولاد بھی ان کے ایمان کی وجہ سے ان کے ساتھ ملحق کی جائے گی لہٰذا آیت کے الفاظ "وَ اتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّیَّتُهُمۡ بِاِیۡمَانٍ" اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ "الذین آمنوا" سے تمام مومنین مراد نہیں بلکہ مومنین کا ایک خاص گروہ مقصود ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صدر اسلام میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے میں دوسروں پر سبقت کی اور نہایت دشوار گزار حالات میں آنحضرتؐ کا ساتھ دیا یعنی مہاجرین وانصار۔ بنابرایں "اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا" کے الفاظ انہی لوگوں کے اعزاز اور عزت و شرف کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں اور ان الفاظ سے وہی (مہاجرین وانصار) مراد لیے گئے ہیں نہ کہ تمام اہل ایمان۔ چنانچہ ایک اور مقام پر بھی اس مطلب کا اشارہ ملتا ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ حشر، آیات ۸، ۹، ۱۰:

★ "لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَ اَمۡوَالِهِمۡ یَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضۡوَانًا وَّ یَنۡصُرُوۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ۚ﴿۸﴾ وَ الَّذِیۡنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الۡاِیۡمَانَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ یُحِبُّوۡنَ مَنۡ هَاجَرَ اِلَیۡهِمۡ وَ لَا یَجِدُوۡنَ فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوۡتُوۡا وَ یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ وَ لَوۡ کَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ ؕ وَ مَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۚ﴿۹﴾ وَ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَ لِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ وَ لَا تَجۡعَلۡ فِیۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّکَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۰﴾"

(اس (مال) میں ان نادار مہاجرین کا حصہ بھی ہے جو اپنے گھروں اور اپنے اموال سے محروم کئے گئے وہ تو صرف خدا کا فضل وخوشنودی چاہتے ہیں اور وہ خدا اور رسول خدا کی نصرت ومدد کرتے ہیں' یہی لوگ صدق دل سے ایمان لائے ہیں' اور وہ لوگ جو ان سے پہلے دار ہجرت میں موجود تھے اور اپنے ایمان پر قائم رہے وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے شہر میں آئے اور جو کچھ ان (مہاجرین) کو ملا اس کے بارے میں کسی قسم کا کوئی لالچ نہیں رکھتے بلکہ وہ تو ایسے ہیں کہ انہیں اپنے اوپر بھی ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے اور...... یہ حقیقت ہے کہ...... جس شخص کو اپنے نفس کے حرص میں مبتلا ہونے سے بچا لیا گیا تو اس جیسے لوگ ہی کامیاب وکامران ہوں گے اور وہ لوگ جو ان کے بعد میں آئے وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے۔(اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا) کوئی کینہ پیدا نہ ہونے دے پروردگارا! تو ہی مہربان اور رحمت کرنے والا ہے)۔

اس آیت میں سب سے پہلے "لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِيۡنَ" کہا گیا' پھر "وَالَّذِيۡنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالۡاِيۡمَانَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ" کہا گیا' پھر "وَالَّذِيۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ يَقُوۡلُوۡنَ......" کہا گیا' پھر "الَّذِيۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِيۡمَانِ" کہا گیا اور پھر آخر میں "لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا" کہا گیا ہے' توان سب جملوں میں اچھی طرح غور کرنے اوران کی ترتیب وترکیب میں پوشیدہ حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ "الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا" اور "الَّذِيۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِيۡمَانِ" کے مصداق میں فرق ہے......یعنی اس میں وہی لوگ مراد نہیں جو "الذین آمنوا" میں مراد لیے گئے ہیں......، کیونکہ اگر وہ سب ایک ہی ہوتے یعنی دونوں جملوں کا مصداق ایک ہوتا تو آخر میں "الذین آمنوا" کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ اس کی جگہ ضمیر جمع "ھم" ذکر کردی جاتی اور اس طرح کہا جاتا "غلالھم" (ان کے لیے کینہ) جبکہ ضمیر کی بجائے اسم ظاہر کو ذکر کیا گیا ہے جس سے عربی ادب اور فصاحت و بلاغت کے قواعد کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسم ظاہر کی ضرورت تھی اور اس کی جگہ ضمیر کا لانا درست نہ تھا کیونکہ دونوں کا مصداق ایک نہیں اور ضمیر کا استعمال ایسے مقام پر اس صورت میں صحیح ہوتا ہے جب ضمیر کا مرجع ایک ہو' لہٰذا ثابت ہوا کہ "الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا" کا مصداق اور ہے اور الَّذِيۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِيۡمَانِ" کا مصداق اور' ۔اور یہ بات درج ذیل آیت شریفہ سے بھی ثابت ہوتی ہے:

سورہء فتح، آیت ۲۹:

★ "مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ تَرٰهُمۡ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا ..... وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِيۡمًا"۔

(محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں' آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ رکوع و سجود میں مصروف رہتے ہوئے اللہ کا فضل و عنایت اور رضا و خوشنودی چاہتے ہیں ..... اللہ نے وعدہ کیا ہے ان میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیئے (الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡهُمۡ) کہ ان کے لیے مغفرت و بخشش اور اجر عظیم ہے)۔

اس آیت میں پہلے آنحضرتؐ کے ساتھیوں کی تعریف کی گئی ہے اور ان کی صفات بیان کی گئی ہیں ..... پھر یہ کہا گیا ہے کہ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...... (جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیئے)۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے تمام ساتھی "الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا مصداق نہیں ورنہ ان ..... ساتھیوں ..... کی تعریف کے بعد یہ الفاظ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی بلکہ یہ کہہ دیا جاتا کہ اللہ نے ان سے مغفرت و اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے لیکن اس کی بجائے یہ کہا گیا کہ جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیئے اللہ نے ان سے مغفرت و اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا مطالب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا" کے الفاظ ایک اعزاز کے طور پر ہیں کہ جو

صدر اسلام میں ایمان لانے والوں کی عزت و شرف کو بیان کرتے ہیں اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جہاں کہیں "الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں ان سے مراد وہی مشرکین مکہ ہوں جنہوں نے صدر اسلام میں کفر اختیار کرنے میں دوسروں سے پہل کی اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے سے انکار کرنے میں سبقت کی جیسا کہ اس آیت شریفہ میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے:

سورۂ بقرہ آیت ۶:

★ "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ"۔

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے یہ بات برابر ہے کہ آپ انہیں انذار کریں یا نہ کریں وہ ایمان نہیں لائیں گے)۔

گویا جس طرح سے "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" صدر اسلام میں حضرت پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لانے میں دوسروں پر سبقت کرنے والوں کی بابت ہے اسی طرح "الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" بھی صدر اسلام میں کفر اختیار کرنے میں دوسروں سے پہل کرنے والوں کے بارے میں ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس مقام پر ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ اگر "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ، صدر اسلام میں حضرت پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لانے میں دوسروں پر پہل کرنے والوں کے لیے مختص ہوں تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ قرآن مجید میں جہاں بھی "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ میں احکام صادر کئے گئے ہیں وہ سب حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں موجود اسلام لانے والوں کے لیے ہوں گے جبکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح کے الفاظ میں جو احکام صادر ہوئے ہیں وہ تمام اہل ایمان کے لیے ہیں خواہ وہ صدر اسلام میں موجود ہوں یا بعد میں آئیں کیونکہ سب کے سب مکلف ہیں اور سب کے لیے عبادات و فرائض کے احکام صادر ہوئے ہیں بالخصوص یہ کہ اگر اس طرح کے الفاظ سے صادر ہونے والے احکامات کو "قضیۂ حقیقیہ" کی صورت میں تسلیم کیا جائے کیونکہ اس سے احکام کی بابت یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا تعلق تمام ایمان لانے والوں سے ہے جبکہ "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے مخصوص مومنین مراد لینے سے اس کی نفی ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات درست ہے کہ "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ سے مومنین کا خاص گروہ مراد ہے اور یہ صدر اسلام میں ایمان لانے والوں میں سے ایک گروہ کے لیے اعزاز کے طور پر ہے لیکن اس سے قرآنی احکامات کے تمام اہل ایمان کے لیے ثابت ہونے کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ یہ دو الگ الگ موضوع ہیں یعنی احکامات کا تمام اہل ایمان کے لیے

ثابت ہونا اور انداز بیان میں مخصوص افراد کا مراد ہونا دو الگ باتیں ہیں اور ہر ایک کے اسباب و وجوہات مختلف ہیں' جیسا کہ کچھ احکام کسی مخصوص انداز بیان کے بغیر صادر ہوئے ہیں (جبکہ وہ تمام اہل ایمان کے لیے ہیں اور سب کے لیے ثابت ہیں اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس حکم میں چونکہ کسی کو مخصوص طور پر مخاطب نہیں کیا گیا لہٰذا یہ ہمارے لیے نہیں ہیں یا کسی کے لیے نہیں ہیں)۔ بنابریں "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ میں صادر ہونے والے احکام، اسی طرح تمام اہل ایمان کے لیے ہیں جس طرح "یَاَیُّهَا النَّبِیُّ" اور "یَاَیُّهَا الرَّسُوْلُ" کے الفاظ اور انداز خطاب میں صادر ہونے والے احکامات ہیں کیونکہ وہ احکام بھی حضرت پیغمبر اسلامؐ کے شرف و اعزاز کے طور پر انہیں مخاطب کر کے صادر ہوئے ہیں ورنہ ان کا تعلق بھی تمام اہل ایمان سے ہے لہٰذا "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" اور "یَاَیُّهَا النَّبِیُّ" اور "یَاَیُّهَا الرَّسُوْلُ" جیسے انداز ہائے خطاب، دراصل شرف و اعزاز کے طور پر ہیں جبکہ ان میں مذکور احکام سب کے لیے ہیں اور تمام مکلفین پر لاگو ہوتے ہیں تاہم اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ جو اعزاز و احترام کے طور پر ذکر ہوئے ہیں اور ان سے مخصوص افراد مراد لیے گئے ہیں تو اب ان الفاظ کا استعمال دوسرے اہل ایمان کے لیے صحیح نہیں خواہ ان کے ساتھ کوئی قرینہ لفظی اشارہ بھی موجود ہو' کیونکہ عین ممکن ہے کہ کسی قرینہ (لفظی و غیر لفظی اشارہ) کے ساتھ ان الفاظ (اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) سے مخصوص افراد کے علاوہ دیگر اہل ایمان مراد لیے گئے ہوں جیسا کہ درج ذیل آیات مبارکہ سے ثابت ہے:

سورہ نسآء، آیت ۱۳۷:

★ "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ"۔

(وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر اختیار کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر اختیار کیا، پھر کفر میں حد سے بڑھ گئے ایسے لوگوں کو خدا ہرگز معاف نہیں کرے گا)۔

سورہ ہود آیت ۲۹:

★ "مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ"۔

(میں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہرگز اپنے سے دور نہیں کروں گا وہ اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوں گے)۔

الفاظ حضرت نوحؑ کے ہیں۔

کلمہ کفر کہنے کی ممانعت

○ "لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا"

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ "راعنا" کی بجائے "انظرنا" کہو اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو گویا تم نے کلمہ کفر کہا

انظرنا، کی بجائے راعنا، کہتے رہنا موجب کفر ہوگا...... اور کافروں کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے لہٰذا اس...... راعنا......
سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے یہ بات ایک اور آیت میں بھی بیان کی گئی ہے اور اس میں "راعنا" کا معنی اجمالی طور پر
مذکور ہے: ملاحظہ ہو:

سورۂ نساء، آیت ۴۶:

★ "مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ ا قَاعَنْ نْا آ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَا ءِ غَیْرَ تُوْ
وَّرَاعِنَا لَیًّا بِاَ لِی وَجَمِیْعًا فِی الدِّیْنِ" ۔

(یہودیوں میں سے کچھ لوگ کلمات کو ان کے اصل موارد سے پھیر دیتے ہیں.... تحریف کرتے ہیں اور کہتے
ہیں کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی' تو بھی سن کہ تیری بات بھی سننے والا کوئی نہیں اور تو ہماری رعایت کر.... ہماری طرف توجہ
رکھ وہ لوگ یہ باتیں اپنی زبانوں کے ہیر پھیر اور دین میں طعن کرتے ہوئے کرتے ہیں)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا کہنا کہ "راعنا" دراصل "وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ" (تو سن کہ تیری
بات سننے والا کوئی نہیں) کا معنی دیتا ہے۔ اس لیے خداوند عالم نے مسلمانوں کو یہ لفظ (راعنا) کہنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا
ہے اور یہ بات آیت شریفہ کے شان نزول پر غور کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جب بھی حضرت پیغمبر اسلام صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں سے کچھ کہتے تو وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کرتے: راعنا یا رسول اللہ! (ہمیں مہلت دیں'
ہماری طرف توجہ کریں اے خدا کے رسول!) اگرچہ مسلمان ان الفاظ سے یہ ارادہ کرتے تھے کہ آنحضرتؐ انہیں مہلت دیں
تاکہ وہ آنحضرتؐ کے کلام کو سمجھ سکیں لیکن چونکہ یہ الفاظ یہودیوں کے ہاں دشنام وگالی کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے لہٰذا
انہوں نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آنحضرتؐ سے یہی الفاظ کہنے شروع کر دیئے اور بظاہر یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ
آنحضرتؐ کے ادب واحترام کے طور پر ایسا کہتے ہیں جبکہ باطن میں آنحضرتؐ کو برا بھلا کہنے کے لیے یہ الفاظ استعمال
کرتے تھے اور ان کی نظر میں ان الفاظ کا یہ معنی مراد ہوتا تھا: "اسمع لا اسمعت" سن کہ تیری بات سننے والا کوئی نہیں' لہٰذا خداوند
عالم نے اس موقعہ پر یہ آیت نازل فرمائی: مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ
عَصَیْنَا وَا ءِ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا... ، اور مومنین کو یہ لفظ "راعنا" کہنے سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ اس کی بجائے اس کا
ہم معنی "انظرنا" کہو: چنانچہ ارشاد ہوا: "لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا"، (تم راعنا، نہ کہو بلکہ انظرنا، کہو)

کافروں کے لئے دردناک عذاب

○ "وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ"

اس جملہ میں "کافرین" سے، اس آیت میں مذکور حکم کی نافرمانی کرنے والے مراد ہیں یعنی وہ لوگ کہ جنہوں نے

"راعنا" کی بجائے "انظرنا" کہنے کے حکم کو نہیں مانا۔ یہ ان موارد میں سے ایک ہے جن میں نافرمانی و معصیت اور کسی حکم الٰہی پر عمل نہ کرنے کو "کفر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اہل کتاب میں سے کافر لوگ

O "مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ . . ."

اس آیت مجیدہ میں "اہل کتاب" کے بارے میں دو احتمال دیئے گئے ہیں:

پہلا احتمال یہ کہ اس سے مراد صرف یہودی ہیں۔

اور دوسرا احتمال یہ کہ تمام اہل کتاب مراد ہیں خواہ یہودی ہوں یا عیسائی۔

اگر کہا جائے کہ پہلا احتمال صحیح ہے یعنی "اہل کتاب" سے مراد "یہودی" ہی ہیں کیونکہ یہ سب سلسلہء گفتگو انہی کے بارے میں ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہیں "اہل کتاب" کے نام سے یاد کرنا اس لیے ہے کہ اس کے ضمن میں یہ امر بھی بیان ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو ہی "اہل کتاب" سمجھنے کی وجہ سے یہ نہیں چاہتے کہ مومنین پر کتاب نازل ہو کیونکہ وہ اسے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتے ہیں لہٰذا اگر کوئی دوسرا بھی اس کا اہل قرار پائے تو ان کے لیے ناگوار خاطر ہوگا اور وہ اسے کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے، جبکہ ان کا یہ خیال قطعاً نادرست اور غلط فہمی پر مبنی ہے اور وہ اپنے بارے میں جس اعزاز کا گمان کرتے ہیں وہ ہرگز صحیح نہیں کیونکہ کسی کو کسی اعزاز سے نوازنا، خدا کے اختیار میں ہے اور وہ اپنی وسیع رحمت اور عظیم فضل وعنایت سے جسے بھی جو اعزاز دینا چاہے اسے کوئی مورد الزام قرار نہیں دے سکتا اور نہ ہی کسی طرح سے اس پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے۔ بنا بریں یہودیوں کا یہ باطل خیال درحقیقت خدا کے ساتھ جنگ وجدال اور اس کے معیار انتخاب پر انگلی اٹھانے کے مترادف ہے۔

اور اگر دوسرے احتمال کو صحیح قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ اہل کتاب سے مراد یہودی و نصرانی دونوں ہیں تو اسے علمی اصطلاح میں "تعمیم بعد التخصیص" کہا جائے گا یعنی یہودیوں کا بالخصوص ذکر کرنے کے بعد تمام اہل کتاب کا ذکر کر دیا جس میں نصاریٰ بھی شامل ہیں اور یہ اس لیے کیا کہ ان سب میں چند مشترک باتیں پائی جاتی ہیں کہ جن میں سے ایک اسلام دشمنی ہے یعنی وہ اسلام دشمنی میں برابر ہیں اور یہ (اسلام دشمنی) ان کے درمیان قدر مشترک ہے۔

اس دوسرے احتمال کی تائید کسی حد تک اسی سورہ کی درج ذیل آیات سے بھی ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

سورہء بقرہ، آیت ۱۱۱:

★ "وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى . . ."۔

(انہوں نے کہا کہ بہشت میں یہودیوں اور نصرانیوں کے سوا کوئی داخل نہ ہو سکے گا)۔

سورہء بقرہ آیت ۱۱۳:

★ "وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ

الْکِتٰبَ۔۔۔"۔

(یہودیوں نے کہا کہ نصرانی کچھ بھی نہیں......ان کے عقیدے کی بنیاد کچھ نہیں......اور نصرانیوں نے کہا کہ یہودی کچھ نہیں (یہودیوں کا عقیدہ صحیح نہیں) جبکہ وہ سب کتاب کی تلاوت کرتے ہیں)۔

روایات پر ایک نظر

اہل ایمان کے سردار علیؑ ہیں

تفسیر "درمنثور" میں مذکور ہے کہ ابونعیم نے حلیہ میں ابن عباس کے حوالہ سے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(ما انزل اللہ آیۃ فیھا : یا ایھا الذین آمنوا، الا و علی راسھا و امیرھا،)

خداوند عالم نے جس آیت میں بھی "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" ارشاد فرمایا ہے اس کے سردار و امیر علیؑ ہیں۔

اس روایت سے ان متعدد روایات کی صحت کا ثبوت ملتا ہے جن میں کئی آیات کا امام علیؑ اور اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہونا بیان کیا گیا ہے مثلاً:

سورہ آل عمران، آیت ۱۱۰:

★ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔۔۔"،

(تم بہترین امت ہو جنہیں لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہے)۔

سورہ بقرہ، آیت ۱۴۳:

★ "لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ۔۔۔"

(......تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو......)

سورہ توبہ، آیت ۱۱۹:

★ "وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ"۔

(اور تم سچوں کے ساتھ رہو)

ان آیات کی تفسیر میں مربوطہ روایات ذکر کی جائیں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

آیات ۱۰۶ و ۱۰۷

○ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ۗ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾

○ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ

○ ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں، کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱۰۶)

○ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی مالکیت و اقتدار، اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی ولی و حاکم اور ناصر و مددگار کوئی نہیں۔ (۱۰۷)

تفسیر و بیان

یہ دو آیتیں (۱۰۶۔۱۰۷) نسخ کے بارے میں ہیں، اور نسخ کا جو معنی، فقہاء عظام کے ہاں معروف و مشہور ہے یعنی کسی ......شرعی...... حکم کی مدت کے خاتمے اور اس کے نافذ العمل ہونے کے وقت کے پورا ہو جانے کا اظہار۔ تو یہ خاص اصطلاح، نسخ کی آیت ہی سے ماخوذ ہے اور آیت سے سمجھے جانے والے معنی کا ایک مصداق بھی ہے، چنانچہ آیت کے ظاہری الفاظ بھی اسی بات کو بیان کرتے ہیں۔

نسخ کا خدائی عمل

○ "مَا نَنسَخْ..."

لغت میں "نسخ" کا معنی زائل کرنا و ختم کرنا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے "**نسخت الشمس الظل**" سورج نے سایہ زائل کر دیا یعنی ختم کر دیا، ارشاد خداوندی بھی ہے:

سورہ حج، آیت ۵۲:

★ "وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ"

(ہم نے جس رسول یا نبی کو بھیجا تو جب بھی اس کے دل میں کوئی تمنا آئی تو شیطان نے اس کی آرزو میں دخل اندازی کی مگر خدا شیطان کی دخل اندازیوں ...... وسوسوں ...... کو ختم کر دیتا ہے)۔

اس آیت میں "نسخ" کا لفظ زائل کرنے اور ختم کر دینے کے معنے میں آیا ہے۔

اور اسی معنی کی مناسبت سے کہا جاتا ہے: "نسخت الکتاب" میں نے کتاب کو نسخ کیا یعنی اس سے ایک اور نسخہ بنایا اور یہ تب کہا جاتا ہے جب کسی کتاب کے ایک نسخہ سے دوسری کاپی بنائی جائے۔ تو گویا پہلے نسخہ کے بدلے دوسری کاپی تیار کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آیت میں لفظ "نسخ" کی بجائے "تبدیل" استعمال کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ نحل آیت ۱۰۱:

★ "وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ"

(ہم جب بھی کسی آیت کو دوسری آیت سے تبدیل کرتے ہیں (اس کی جگہ دوسری آیت لاتے ہیں) حالانکہ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا کچھ نازل کرتا ہے تاہم وہ (کافر) کہتے ہیں کہ تو نے خدا پر افتراء کیا ہے (اس کی طرف جھوٹی نسبت دے کر بات کی ہے) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت علم ہی نہیں رکھتی)۔

بہر حال کسی آیت کے نسخ (منسوخ ہونے) سے مراد یہ نہیں کہ اس کا وجود ہی ختم کر دیا جائے...... سرے سے اسے محو کر دیا جائے...... بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں مذکور حکم کو منسوخ کر دیا جائے کیونکہ کسی آیت کا آیت ہونا (علامت و نشانی ہونا) اس وجہ سے ہے کہ اس سے حکم کی پہچان ہوتی ہے لہٰذا اسے ہی حکم کی بنیاد و عنوان قرار دیا گیا اور کہا گیا ہے: "مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ" --- ہم جس آیت کو بھی منسوخ کرتے ہیں......، اور نسخ کی وجہ و سبب کا ذکر کہ جو آیت کے آخری الفاظ میں کیا گیا ہے (اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ) اس سے بھی یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ نسخ سے مراد یہ ہے کہ اصل آیت کو محفوظ رکھتے ہوئے اس میں مذکور حکم کو منسوخ کر دیا جائے...... اس کے اثر کو زائل کر دیا جائے...... بنا بر ایں، نسخ کی وجہ سے آیت میں مذکور حکم وغیرہ بے اثر ہو جائے گا لیکن اصل آیت باقی رہے گی، اور اس کے بعد ذکر کئے جانے والے جملہ "نُنۡسِهَا" سے بھی اسی امر کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ "نُنۡسِهَا" کا معنی ذہن سے نکال دینا ہے (بھلوانا)، جبکہ "نَنۡسَخۡ" کا معنی ختم کر دینا ہے۔ تو اس طرح آیت کا معنی یوں کیا جائے گا "ما نذهب بآية عن العين او عن العلم نأت بخير منها او مثلها" کہ ہم جس آیت کے ظاہری وجود کو ختم کرتے ہیں (اس کے اثر کو زائل کرتے ہیں، اس میں مذکور حکم کو منسوخ کرتے ہیں) یا اسے ذہنوں سے نکلوا دیتے ہیں تو اس سے بہتر آیت یا اس کے مثل لاتے ہیں۔

ایک قابل توجہ نکتہ

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی چیز کا کسی چیز کی آیت یعنی علامت و نشانی ہونا ہر مقام و مورد کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا موارد و مقامات کے مختلف ہونے کی وجہ سے آیت و نشانی ہونے کی وجوہات بھی مختلف ہوتی ہیں اور ہر چیز کی حیثیت اور مخصوص حالات و اوصاف کی بنیاد پر اس کی آیت یعنی نشانی کا تعین ہوتا ہے، مثلاً قرآن مجید کی آیات اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے وجود کی علامتیں اور نشانیاں ہیں کہ دنیائے بشریت کا کوئی فرد ان کی مثل و نظیر پیش نہیں کر سکتا، اسی طرح احکام و فرامین الٰہی اس لحاظ سے خدا کی نشانیاں ہیں کہ وہ خدا کے تقرب اور تقویٰ کے حصول کا ذریعہ ہیں، اور عالم ہستی میں پائی جانے والی ہر مخلوق اپنے وجود میں اپنے خالق و موجد کے وجود کی نشانی ہے اور اس مخلوق کی ہر صفت اور وجودی خصوصیت خدا کے اسماء مبارکہ اور صفات مقدسہ کی خصوصیات کی نشانی ہے، اور انبیاءؑ و اولیائے الٰہیؑ اس لحاظ سے خداوند عالم کی آیتیں و نشانیاں ہیں

کہ لوگوں کو اپنے اعمال و افعال اور گفتار و کردار کے ذریعے خدا کی طرف بلاتے ہیں' بہر حال ہر چیز مخصوص سبب اور وجہ سے کسی چیز کی نشانی (آیت) قرار پاتی ہے اور چونکہ تمام اشیاء ایک جیسی نہیں اس لیے ہر ایک کی علامت و نشانی بھی مختلف ہوتی ہے بنابرایں ہر آیت (نشانی) شدت و ضعف کے لحاظ سے دوسری آیت و نشانی سے مختلف ہوگی یعنی آیتوں (نشانیوں) کے درمیان مراتب کا فرق پایا جائے گا اور وہ فرق اس طرح ظاہر ہوگا کہ کوئی آیت (نشانی) خدا کے وجود کی علامت ہونے میں قوی و زیادہ مضبوط ہوگی اور کوئی اس سے کمتر' یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے آیات و نشانیوں کے مراتب کے مختلف ہونے کی طرف اس طرح اشارہ فرمایا ہے:

سورۂ نجم، آیت ۱۸:

"لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى" ...،

(اس نے (پیغمبر اسلامؐ نے) معراج کی رات اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیوں کو دیکھا)۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی قابل ذکر ہے کہ ہر آیت و نشانی علامت و نشانی ہونے کی تمام حیثیتوں اور پہلوؤں کی حامل نہیں ہوتی بلکہ بعض آیتیں صرف ایک حیثیت اور پہلو میں نشانی ہوتی ہیں اور بعض متعدد جہتوں اور پہلوؤں میں' تو اسی طرح ان کا نسخ (منسوخ ہونا) بھی عین ممکن ہے کہ صرف ایک پہلو اور جہت میں ہو یا متعدد جہتوں اور پہلوؤں میں' اس کی واضح مثال یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیتیں اپنے شرعی حکم کے لحاظ سے تو منسوخ قرار دی گئی ہیں (ان میں مذکور شرعی حکم نافذ العمل نہیں رہا) لیکن اپنے معجزہ ہونے اور اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے منسوخ نہیں ہوئیں بلکہ پہلے کی طرح اعجاز اور فصاحت و بلاغت کی حامل ہیں اور ان کی اس جہت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا' تو اس سے ثابت ہوا کہ کسی آیت کا منسوخ ہونا ایسا نہیں کہ وہ ہر لحاظ سے منسوخ ہوگئی ہے بلکہ اس کے منسوخ ہونے کی ایک یا متعدد جہتیں ملحوظ ہوں گی۔

اور "نسخ" کا جو وسیع معنی ہم نے ذکر کیا ہے اس کی بنیاد زیر بحث آیت کے آخری جملہ "اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"۔۔۔کیا آپ نہیں جانتے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے ۔۔۔اور آیت (۱۰۷) کے پہلے جملہ "اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" ...... کیا آپ کو علم نہیں کہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کا مکمل اختیار اقتدار؟.... میں مذکورہ نسخ کے سبب کی عمومیت ہے' اور اس سبب و وجہ کے وسیع معنے و مفہوم کی بنیاد پر نسخ کا وسیع معنی اور عمومیت کا حامل مفہوم، آیت کا مقتضاء ہے۔

نسخ پر اعتراض کی دو ممکنہ صورتیں

نسخ کے بارے میں جو اعتراض ممکن ہے یا وہ اعتراض جو یہودیوں نے نسخ کی بابت کیا ہے ... جیسا کہ زیر بحث آیت کے شان نزول میں مذکور ہے.... اسے دو طرح سے نسخ کے ساتھ مربوط کیا جا سکتا ہے اور درج ذیل دو جہتوں کے حوالے سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔اس لحاظ سے کہ جو آیت خداوند عالم کی طرف سے نازل ہوئی ہو وہ یقیناً کسی ایسی حقیقی مصلحت کی حامل ہوگی جس کا تحفظ اس آیت کے سوا کسی ذریعے سے ممکن نہیں۔ پس اگر وہ آیت منسوخ ہو جائے تو وہ مصلحت بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی اور اسے کوئی چیز تحفظ نہیں دے سکتی کیونکہ وہی آیت اس کے تحفظ کی ضمانت لے کر نازل ہوئی تھی اور کوئی چیز بھی اس کے مقام پر نہیں آ سکتی' لہٰذا اس آیت کے منسوخ ہو جانے کے نتیجے میں وہ تمام فوائد اور لوگوں کی بہتری و بھلائی کی ضامن مصلحتیں بھی ہاتھ سے نکل جائیں گی' اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہے کہ خداوند عالم کا علم اس کے بندوں کے علم جیسا نہیں کہ اس میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا رہے اور اسباب و عوامل کے مختلف ہونے کی وجہ سے اس میں تبدیلی آ جائے یعنی کبھی اس کا علم کسی کام میں مصلحت کی تشخیص کرے اور وہ اس کا حکم صادر کر دے پھر دوسرے دن اس کے علم میں تبدیلی آ جائے اور وہ پہلی مصلحت کی بجائے کسی اور مصلحت کی تشخیص کرے کہ جو کل اس کے علم میں نہ آ سکی تھی لہٰذا وہ پہلے حکم کو تبدیل کر کے دوسرا حکم صادر کرے اور اپنے پہلے حکم کے غلط و نادرست ہونے کا فیصلہ کر کے نئے حکم کا اعلان کرے اور یہ سلسلہ ہر روز جاری رہے خدا کی بابت ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ سب کچھ بندوں کے علم کی بابت تو قابل تصور ہے کیونکہ خدا مصلحت و بھلائی کے تمام پہلوؤں سے آگاہ ہے اور اس کا علم تمام جہتوں پر حاوی اور ان پر محیط ہے لہٰذا اس کے حکم میں روز بروز تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ لوگوں کا علم کسی چیز کے تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ اپنے فیصلے بدلتے رہتے ہیں اور مصالح و مفاسد کی بنیاد پر ان کے نقطہ ہائے نظر اور موقف میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے' گویا جس کام میں مصلحت نظر آتی ہے اسے انجام دینے کا فیصلہ کر لیتے ہیں اور انجام دیتے ہیں لیکن جب اپنی غلط فہمی کی طرف متوجہ ہو جائیں یا کوئی مفسدہ..... خرابی .... نظر آ جائے تو اسے ترک کر دیتے ہیں اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ان کا علم محدود ہے اور کسی امر کے جملہ پہلوؤں پر محیط نہیں جبکہ خدا کا علم تمام جہتوں اور ہر امر کی مصلحت اور معیاری و بہتر ہونے کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے جس کی وجہ سے وہ کسی طرح کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتا (اس لیے اس کے حکم میں تبدیلی کیوں؟)

یہ ہے نسخ کے بارے میں کئے جانے والے اعتراض کی ایک صورت' تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض اس صورت صحیح و درست تسلیم کیا جا سکتا ہے جب خدا کی قدرت کو محدود مانا جائے اور اس کی وسعت و لامحدود ہونے کا انکار کیا جائے' لیکن اگر خدا کی قدرت کو لامحدود تسلیم کیا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ ہر چیز پر ہر طرح سے قدرت رکھتا ہے تو پھر اس بات میں کیا حرج لازم آتا ہے کہ وہ ایک آیت یا حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسری آیت یا حکم نازل کرے جو منسوخ شدہ حکم سے بہتر یا کم از کم اس جیسا ہو' اور یہ بات اس کی وسیع قدرت اور لامحدود اختیار کے حوالہ سے ناممکن نہیں قرار دی جا سکتی' اسی لیے خداوند عالم نے زیر بحث آیت میں نسخ کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں یہ ارشاد فرمایا: " اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ " آیا تو نہیں جانتا کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۲۔اگرچہ خدا کی قدرت وسیع و لامحدود ہے اور اس کے اختیار و اقتدار میں کسی طرح کی محدودیت اور قید و شرط نہیں پائی جاتی تاہم یہ بات بھی اپنے مقام پر مسلم و ناقابل انکار ہے کہ جب وجود میں لانے اور وجود میں آنے کے تمام مراحل طے

ہو جائیں (کسی چیز کو وجود حاصل ہو جائے) تو پھر اس میں تغیر و تبدیلی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ جب کوئی چیز کسی حالت میں پورے طور پر آ جائے تو اس سے کسی دوسری حالت میں تبدیل نہیں ہو سکتی یعنی وجود میں آ جانے کے بعد اس میں تبدیلی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا...... ہر طرح کی تبدیلی کے امکانات وجود میں آ جانے کے تمام مراحل طے کرنے سے پہلے تک ہیں...... اور اس کی مثال انسان کے اختیاری افعال جیسی ہے کہ جب تک انسان کسی فعل کو اپنے اختیار سے انجام نہ دے اس وقت تک وہ اس کے اختیار میں رہے گا کہ اگر چاہے تو انجام دے اور اگر نہ چاہے تو انجام نہ دے اسے اختیار ہے لیکن جب اس نے اپنے اختیار کے ساتھ اسے انجام دے دیا تو پھر وہ کام اس کے اختیار کے دائرے سے باہر نکل جائے گا کیونکہ اب اسے وجود حاصل ہو چکا ہے اور وجود و ثبوت کے بعد اس میں کسی تبدیلی کا امکان باقی نہیں رہتا اس لیے اب وہ انسان کے اختیاری افعال کی فہرست میں شامل نہ ہوگا۔

یہ ہے نسخ کے بارے میں کئے جانے والے اعتراض کی دوسری صورت' تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض اس صورت میں صحیح و درست تسلیم کیا جا سکتا ہے جب خدا کے مطلق اور بلا قید و شرط مالک ہونے کا انکار کر دیا جائے اور یہ بات مان لی جائے کہ کسی چیز کو وجود عطا کرنے کے بعد اس چیز پر خدا کو کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا اور اب اس میں کسی طرح کا تصرف اور عمل دخل خدا کے ہاتھ میں نہیں جیسا کہ یہودی کہتے تھے: "**يد الله مغلولة**" خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے...... اب وہ بے اختیار ہو چکا ہے......، لہٰذا خداوند عالم نے زیر بحث آیت کے ذیل میں مذکورہ بالا اعتراض کی پہلی صورت کے جواب کے طور پر اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: " اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ " کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے' یعنی جو مصلحت ہاتھ سے نکل چکی ہے اس سے بہتر یا کم از کم اس جیسی عطا کرنے سے عاجز و ناتوان نہیں'

اور اعتراض کی دوسری صورت کے جواب کے طور پر آیت (۱۰۷) میں اپنی مطلق مالکیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا: " اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ " آیا تجھے معلوم نہیں کہ خدا ہی آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور تمہارے لیے خدا کے علاوہ کوئی ولی و حاکم اور مددگار نہیں' یعنی آسمانوں اور زمین کا مکمل اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے وہی ان کا مالک ہے اور اسے اپنی ملکیت میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہے وہ جس طرح چاہے اپنی مملوکہ چیز کو استعمال میں لا سکتا ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے' کوئی شخص یہ قدرت و اختیار نہیں رکھتا کہ خدا کی قدرت و اختیار کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر سکے یا اس کی ملکیت کی حد بندی کر کے اسے اپنی مملوکہ چیزوں میں عمل دخل سے روک سکے' بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی چیز کسی چیز پر مکمل اختیار نہیں رکھتی نہ اپنے طور پر اور نہ ہی خدا کی طرف سے عطا شدہ اختیار و ملکیت کے حوالہ سے' کیونکہ خداوند عالم جسے بھی کسی چیز کا مالک بناتا ہے اور اسے اس پر اختیار و قدرت عطا کرتا ہے تو وہ اس طرح سے نہیں جس طرح ہم ایک دوسرے کو کسی چیز کا مالک بناتے ہیں کہ پہلے مالک کا اس چیز پر کوئی اختیار ہی باقی نہیں رہتا بلکہ ساری ملکیت و اختیار دوسرے مالک کو حاصل ہوتا ہے لیکن خدا کا کسی کو کسی چیز کی ملکیت عطا کرنا ایسا نہیں

بلکہ وہ ہر حال میں مالک ہے اور اس چیز پر بھی مکمل اختیار وقدرت رکھتا ہے جو اس نے کسی کی ملکیت میں دے دی ہو بنا برایں اگر ہم حقیقت امر میں غور کریں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر طرح کی مالکیت واقتدار اور ہر طرح کا تصرف واختیار خدا کے پاس ہے اس کی مالکیت میں کوئی قید وشرط اور محدودیت نہیں پائی جاتی' اور جب ہم اپنی مالکیت واقتدار اور تصرف واختیار کی حدود پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمیں کسی طرح کا استقلال حاصل نہیں، وہی ہمارا ولی وحاکم مطلق ہے اور جب ہم اپنے ظاہری استقلال کہ جو حقیقت میں فقر واحتیاج ہے جسے استقلال و بے نیازی کی شکل میں اس نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ کو دیکھیں تو بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے امور کی تدبیر پر قدرت ہی نہیں رکھتے اور اس کی مدد ونصرت کے بغیر اپنے اقتدار و اختیار کو استعمال ہی نہیں کر سکتے لہٰذا وہی ہمارا "ولی" ہے اور وہی ہمارا "نصیر" و مددگار ہے ۔ یہی بات اس آیت شریفہ سے واضح طور پر سمجھی جاتی ہے: "اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ" کہ یہ سب خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس طرح کی وسیع ولامحدود مالکیت اس کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں اور وہ سب کا ولی و حاکم اور نصیر و مددگار ہے۔

بہر حال یہ دو جملے: "اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"، 'اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" نسخ کے بارے میں کئے جانے والے اعتراض کی دو صورتوں کے بالترتیب جوابات کی حیثیت رکھتے ہیں' اور ان دو جملوں کا الگ الگ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اعتراضات کے جواب کے طور پر ہیں اور آیۂ ۱۰۷ کے آخری الفاظ "ومالکم من ولی ولا نصیر" بھی دو امور پر مشتمل ہیں: ایک "ولی" اور دوسرا "نصیر"۔ اور یہ دراصل ان دو جوابات کی تکمیل کے طور پر ہیں' اس صورت میں آیت کا معنی یوں ہوگا کہ اگر تم خداوند عالم کے مالک علی الاطلاق ہونے کو خاطر میں نہ بھی لاؤ اور تمہاری توجہ صرف اس مالکیت پر ہو جو تمہیں عطا کی گئی ہے تب بھی صرف وہی تمہارا "ولی" ہے اور اس کے سوا کوئی تمہارا "ولی" وحاکم مطلق نہیں کیونکہ جو مالکیت تمہیں عطا کی گئی ہے وہ بھی اسی سے وابستہ ہے اور تمہیں اس میں کوئی استقلال حاصل نہیں یعنی تم اس میں بھی اس کے محتاج ہو لہٰذا اسے حق حاصل ہے کہ تمہاری بابت اور جو کچھ تمہارے پاس ہے..... تمہارے اختیار وملکیت میں ہے..... اس میں جس طرح چاہے دخل وتصرف کرے' اور اگر تم اپنی وابستگی اور عدم استقلال کو بھی خاطر میں نہ لاؤ بلکہ اپنے ظاہری اقتدار اور مالکیت وتسلط ہی کو مدنظر قرار دو تب بھی یہ حقیقت تمہارے سامنے واضح ہو جائے گی کہ تمہاری یہ ظاہری مالکیت واقتدار اور استقلال واختیار تمہاری کفایت نہیں کر سکتے اور ان کی بنیاد پر تمہارے مقاصد کی تکمیل ہو سکتی ہے نہ تمہارے ارادے پورے ہو سکتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کی اعانت ونصرت ضروری ہے اور وہی تمہارا "نصیر" و مددگار ہے۔ لہٰذا اس حوالہ سے کہ صرف وہی تمہارا مددگار ہے اسے حق حاصل ہے کہ تمہاری بابت اپنے اختیارات استعمال کرے اور تم جس راہ پر بھی چلو وہ تمہارے امور میں جس طرح سے چاہے تصرف کر سکتا ہے' (اس لحاظ سے کہ اس نے تمہیں مالکیت' اقتدار واختیار اور استقلال عطا کیا ہے اور وہی تمہارا مددگار ہے اس کے سوا کوئی تمہاری نصرت کرنے والا نہیں، وہ تمہارے بارے میں اور تمہارے تمام امور کی بابت ہر طرح کا اختیار رکھتا ہے اور ہر قسم کا فیصلہ کرنے کی

قوت رکھتا ہے)۔ بنابرایں ''نسخ'' کی بابت کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

ایک ادبی نکتہ

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ آیت (۱۰۷) کے آخری جملہ ''وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...'' میں اسم ظاہر کو ذکر کیا گیا ہے جبکہ ضمیر کو ذکر کر کے بھی بات پوری ہو سکتی تھی یعنی ''مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' کہا گیا ہے ''من دونہ'' نہیں کہا گیا' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جملہ ''وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ'' اپنے مقام پر ایک مستقل جملہ ہے اور اس کے بغیر بھی ''نسخ'' پر کئے جانے والے اعتراض کا جواب نامکمل نہیں رہتا (اس جواب کو مکمل کرنے کے لیے اس جملہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی) اس لیے ضمیر کی بجائے اسم ظاہر ذکر کرنا درست ہے۔

نسخ کی بحث میں مذکورہ بالا تمام مطالب سے درج ذیل اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ ''نسخ'' کا تعلق صرف شرعی احکام سے نہیں بلکہ تکوینی امور میں بھی نسخ ممکن ہے۔

۲۔ ''نسخ'' کے لیے ناسخ اور منسوخ دونوں ضروری ہیں (ان میں سے کسی ایک کے بغیر وہ تحقق پذیر نہیں ہو سکتی)۔

۳۔ ناسخ میں منسوخ کی ہر صفت کمال یا اس میں پائی جانے والی مصلحت موجود ہوتی ہے۔

۴۔ اگرچہ ناسخ ظاہری طور پر منسوخ سے مختلف بلکہ اس سے منافات رکھتا ہے لیکن اس لحاظ سے دونوں کے درمیان تناقض ختم ہو جاتا ہے کہ ان میں مشترکہ مصلحت پائی جاتی ہے یعنی جو مصلحت ان دونوں کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اس کی وجہ سے ان دونوں (ناسخ و منسوخ) میں ہر طرح کا تضاد و تناقض بھی دور ہو جاتا ہے' چنانچہ جب کوئی نبی وفات پاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نبی مبعوث ہوتا ہے جبکہ وہ دونوں خدا کی آیتیں ...... نشانیاں ...... ہیں اور ان میں سے ایک ناسخ اور دوسرا منسوخ کہلاتا ہے تو یہ سب کچھ عالم طبیعت میں پائے جانے والے نظام کے تقاضوں کی تکمیل کے طور پر ہوتا ہے یعنی زندگی' موت' رزق' عمر' مختلف ادوار میں لوگوں کی مصلحتوں کا مختلف ہونا' حالات کے گونا گوں تقاضے اور افراد بشر کا حصول کمال کے مدارج طے کرنا وغیرہ ہی نظام طبیعت کی اصل بنیادیں ہیں۔ بنابرایں جب بھی کوئی دینی حکم منسوخ ہوتا ہے اور اس کی جگہ نیا دینی حکم آتا ہے تو وہ دونوں اپنے اپنے مقام پر ایک دینی مصلحت کے حامل ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے وقت میں اپنی دینی مصلحت کو بہتر طور پر پورا کرتا ہے جس میں اہل ایمان اور دیندار لوگوں کی بہتری کا راز پوشیدہ ہوتا ہے جیسا کہ ابتدائے اسلام میں کفار کے لیے عام معافی کا حکم صادر ہوا کیونکہ اس وقت اہل اسلام کمزور تھے اور تعداد و طاقت کے لحاظ سے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے' پھر جب اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور مسلمانوں کی تعداد و قوت زیادہ ہو گئی اور وہ ہر طرح سے دشمنان اسلام کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پا چکے جس کی وجہ سے کافروں اور مشرکوں کے دلوں میں خوف پیدا ہوا تو جہاد کا حکم آ گیا' تو معلوم ہوا کہ حالات کے مطابق ہر حکم دینی مصلحت کی تکمیل کا سبب بنا اور عام معافی کے حکم کی منسوخی کے بعد جہاد کے حکم میں وہی مصلحت ملحوظ و مقصود تھی جو عام معافی کے حکم میں تھی لیکن حالات کے تقاضوں کی وجہ سے ایک حکم کو منسوخ کر کے اس کی

جگہ دوسرا حکم صادر کیا گیا' اس مقام پر یہ اہم نکتہ قابل ذکر ہے کہ جو آیات منسوخ ہوئیں ان کے انداز بیان میں ہی ان کے منسوخ ہونے کا اشارہ موجود ہے جیسا کہ عام معافی کے حکم پر مشتمل آیت کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکم کو ایک وقت تک کے لیے صادر کیا گیا جسے بعد میں منسوخ کیا جا سکے گا ملاحظہ ہو:

سورہ بقرہ، آیت ۱۰۹:

★ "فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ"

(معاف کردو اور درگزر کرو یہاں تک کہ خداوند عالم اپنا حکم صادر کردے)

پھر اس آیت کو جہاد کی آیت کے ذریعے منسوخ کردیا گیا۔

اسی طرح بدکار عورتوں کے متعلق یہ حکم صادر ہوا:

سورہ نساء، آیت ۱۵:

★ "فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا"۔

(انہیں گھر میں روکے رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا خدا ان کے لیے کوئی راہ بنادے)۔

پھر اس آیت کو بدکاری کی سزا مقرر کرکے "کوڑے مارنے" کے حکم پر مشتمل آیت کے ذریعے منسوخ کردیا گیا۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے انداز بیان میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان میں "حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ" (یہاں تک کہ خداوند عالم اپنا حکم صادر کرے) اور "اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا" (یا خدا ان کے لیے کوئی راہ بنادے) کے الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان آیتوں میں جو احکام صادر کئے گئے ہیں وہ عارضی اور ایک خاص وقت تک کے لیے ہیں اور اس کے بعد انہیں منسوخ کردیا جائے گا۔

۵۔ ناسخ اور منسوخ کے درمیان جو نسبت پائی جاتی ہے وہ اس نسبت سے قطعی مختلف ہے جو عام و خاص' مطلق و مقید اور مجمل و مبین کے درمیان پائی جاتی ہے کیونکہ ناسخ و منسوخ کے درمیان بظاہر ایک دوسرے سے تنافی پائی جاتی ہے (ناسخ، منسوخ کی نفی کرتا ہے) لیکن جو چیز اس تنافی کو دور کردیتی ہے وہ ان دونوں میں پائی جانے والی مشترکہ مصلحت ہے کیونکہ دونوں اپنے اپنے وقت میں ایک مخصوص مصلحت و حکمت کے حامل ہیں اور ظاہری طور پر لفظوں کے واضح معانی کی روشنی میں جو تنافی پائی جاتی ہے وہ اس مشترکہ مصلحت و حکمت کو ختم نہیں کرتی' جبکہ عام و خاص اور مطلق و مقید اور مجمل و مبین کے درمیان جو تنافی پائی جاتی ہے وہ خاص' مقید اور مبین کے الفاظ میں پائے جانے والے ظہور کی قوت کے ذریعے دور ہوجاتی ہے کیونکہ خاص، عام کی تخصیص' مقید، مطلق کی تقیید اور مبین، مجمل کی تبیین کرکے ان کے معانی کی وضاحت کرتے ہیں' یہ تمام مطالب، علم اصول فقہ میں واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں' بہر حال یہی صورت حال "محکم اور متشابہ" آیات میں پائی جاتی ہے کہ انشاء اللہ سورہ آل عمران کی آیت ۷ "مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ" کی تفسیر میں

اس حوالہ سے مزید مطالب بیان کئے جائیں گے۔

آیات کا بھلوا دیا جانا

○ "اَوْنُنْسِهَا..."

(یا ہم اسے بھلوا دیتے ہیں)

"نُنْسِهَا" کونون پر پیش اور سین کے نیچے زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور یہ مادہ "انساء" سے ہے جس کا م
ذہن سے نکال دینا (بھلوا دینا) ہے۔

اس جملہ میں دو جہتیں قابل تصور ہیں (۱) یہ مطلق کلام ہے اس میں کسی قسم کی کوئی قید و شرط نہیں پائی جاتی، (۲) ع
ہے۔۔عمومیت رکھتا ہے اور مصداقی وسعت کا حامل ہے۔۔، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مختص نہیں بلکہ ا
کسی طرح بھی آنحضرتؐ سے مربوط قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ آنجنابؐ کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہ اعلیٰ، آیت ۶:

"سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ۝ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ"

(عنقریب ہم آپ کے سامنے قرائت کریں گے پھر آپ ہرگز نہ بھولیں گے مگر جو کچھ خدا چاہے)

یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی جبکہ نسخ کی آیت مدینہ منورہ میں آئی لہٰذا آنحضرتؐ کے بارے میں بھلوا ۓ
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ "فلا تنسی" کے الفاظ واضح طور پر نسیان کی نفی کرتے ہیں اور آپؐ کو نسیان سے پاک و منزہ قر
دیتے ہیں، اور جہاں تک "اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ" (مگر جو کچھ خدا چاہے) کے الفاظ کا تعلق ہے تو یہ الفاظ استثنٰی کے لیے ض
ہیں لیکن اس سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ آنحضرتؐ پر نسیان کا غلبہ ممکن ہے بلکہ یہ تو خدا کی قدرت کاملہ کے اظہار و بیان کے طو
ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کا مقام عصمت پر فائز ہونا اس بات کا سبب نہیں کہ اب خدا کی قدرت محدو
جائے، اس کی مثال درج ذیل آیت میں موجود ہے:

سورہ ہود، آیت ۱۰۸:

"خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ"۔

(نیک و صالح افراد بہشت میں ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین باقی ہیں، مگر جو کچھ تیرا پروردگار چا
یہ تو ہمیشہ کا عطیہ و بخشش ہے جو ختم ہونے والا نہیں)۔

(اس آیت میں بھی "مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" کے بعد "اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ" کہا گیا ہے جس
خدا کی قدرت کاملہ اور مکمل اختیار کا اظہار مطلوب ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "جب تک آسمان و زمین باقی ہیں" کے ا
سے خدا کی قدرت کا محدود ہونا لازم نہیں آتا کہ اب "اس وقت تک" خدا کو کوئی اختیار حاصل نہیں اور وہ اس میں کوئی تبد

جگہ دوسرا حکم صادر کیا گیا' اس مقام پر یہ اہم نکتہ قابل ذکر ہے کہ جو آیات منسوخ ہوئیں ان کے انداز بیان میں ہی ان کے منسوخ ہونے کا اشارہ موجود ہے جیسا کہ عام معافی کے حکم پر مشتمل آیت کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکم کو ایک وقت تک کے لیے صادر کیا گیا جسے بعد میں منسوخ کیا جا سکے گا ملاحظہ ہو:

سورہ بقرہ، آیت ۱۰۹:

★ "فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ"

(معاف کر دو اور درگزر کرو یہاں تک کہ خداوند عالم اپنا حکم صادر کر دے)

پھر اس آیت کو جہاد کی آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا۔

اسی طرح بدکار عورتوں کے متعلق یہ حکم صادر ہوا:

سورہ نساء، آیت ۱۵:

★ "فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا"۔

(انہیں گھر میں روکے رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا خدا ان کے لیے کوئی راہ بنا دے)۔

پھر اس آیت کو بدکاری کی سزا مقرر کر کے "کوڑے مارنے" کے حکم پر مشتمل آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے انداز بیان میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان میں "حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ" (یہاں تک کہ خداوند عالم اپنا حکم صادر کرے) اور "اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا" (یا خدا ان کے لیے کوئی راہ بنا دے) کے الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان آیتوں میں جو احکام صادر کئے گئے ہیں وہ عارضی اور ایک خاص وقت تک کے لیے ہیں اور اس کے بعد انہیں منسوخ کر دیا جائے گا۔

۵۔ ناسخ اور منسوخ کے درمیان جو نسبت پائی جاتی ہے وہ اس نسبت سے قطعی مختلف ہے جو عام و خاص' مطلق و مقید اور مجمل و مبین کے درمیان پائی جاتی ہے کیونکہ ناسخ و منسوخ کے درمیان بظاہر ایک دوسرے سے تنافی پائی جاتی ہے (ناسخ، منسوخ کی نفی کرتا ہے) لیکن جو چیز اس تنافی کو دور کر دیتی ہے وہ ان دونوں میں پائی جانے والی مشترکہ مصلحت ہے کیونکہ دونوں اپنے اپنے وقت میں ایک مخصوص مصلحت و حکمت کے حامل ہیں اور ظاہری طور پر لفظوں کے واضح معانی کی روشنی میں جو تنافی پائی جاتی ہے وہ اس مشترکہ مصلحت و حکمت کو ختم نہیں کرتی' جبکہ عام و خاص اور مطلق و مقید اور مجمل و مبین کے درمیان جو تنافی پائی جاتی ہے وہ خاص' مقید اور مبین کے الفاظ میں پائے جانے والے ظہور کی قوت کے ذریعے دور ہو جاتی ہے کیونکہ خاص، عام کی تخصیص' مقید، مطلق کی تقیید اور مبین، مجمل کی تبیین کر کے ان کے معانی کی وضاحت کرتے ہیں' یہ تمام مطالب، علم اصول فقہ میں واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں' بہر حال یہی صورت حال "محکم اور متشابہ" آیات میں پائی جاتی ہے کہ انشاء اللہ سورہ آل عمران کی آیت ۷ "مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ" کی تفسیر میں

اس حوالہ سے مزید مطالب بیان کئے جائیں گے۔

آیات کا بھلوا دیا جانا

○ "اَوْ نُنْسِهَا..."

(یا ہم اسے بھلوا دیتے ہیں)

"نُنْسِهَا" کو نون پر پیش اور سین کے نیچے زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور یہ مادہ "انساء" سے ہے جس کا معنی ذہن سے نکال دینا (بھلوا دینا) ہے۔

اس جملہ میں دو جہتیں قابل تصور ہیں (۱) یہ مطلق کلام ہے اس میں کسی قسم کی کوئی قید و شرط نہیں پائی جاتی، (۲) عام ہے۔۔عمومیت رکھتا ہے اور مصداقی وسعت کا حامل ہے۔۔، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مختص نہیں بلکہ اسے کسی طرح بھی آنحضرتؐ سے مربوط قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ آنجنابؐ کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہ اعلیٰ، آیت ۶:

"سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ"

(عنقریب ہم آپ کے سامنے قرائت کریں گے پھر آپ ہرگز نہ بھولیں گے مگر جو کچھ خدا چاہے)

یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی جبکہ نسخ کی آیت مدینہ منورہ میں آئی لہٰذا آنحضرتؐ کے بارے میں بھلوا لئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ "فلا تنسی" کے الفاظ واضح طور پر نسیان کی نفی کرتے ہیں اور آپؐ کو نسیان سے پاک و منزہ قرار دیتے ہیں، اور جہاں تک "اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" (مگر جو کچھ خدا چاہے) کے الفاظ کا تعلق ہے تو یہ الفاظ استثنیٰ کے لیے ضرور ہیں لیکن اس سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ آنحضرتؐ پر نسیان کا غلبہ ممکن ہے بلکہ یہ تو خدا کی قدرت کاملہ کے اظہار و بیان کے طور پر ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کا مقام عصمت پر فائز ہونا اس بات کا سبب نہیں کہ اب خدا کی قدرت محدود ہو جائے، اس کی مثال درج ذیل آیت میں موجود ہے:

سورہ ہود، آیت ۱۰۸:

"خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ" -

(نیک و صالح افراد بہشت میں ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین باقی ہیں، مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے۔ یہ تو ہمیشہ کا عطیہ و بخشش ہے جو ختم ہونے والا نہیں)۔

(اس آیت میں بھی "مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" کے بعد "اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ" کہا گیا ہے جس سے خدا کی قدرت کاملہ اور مکمل اختیار کا اظہار مطلوب ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "جب تک آسمان و زمین باقی ہیں" کے الفاظ سے خدا کی قدرت کا محدود ہونا لازم نہیں آتا کہ اب "اس وقت تک" خدا کو کوئی اختیار حاصل نہیں اور وہ اس میں کوئی تبدیلی

نہیں لاسکتا، ایسا ہرگز نہیں، بلکہ وہ قادر مطلق ہے اور جب بھی جو کچھ کرنا چاہے، کرسکتا ہے' یہی حال " فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ " (آپ نہیں بھولیں گے مگر جو کچھ خدا چاہے) میں ہے کیونکہ اگر اس استثنیٰ (اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ) سے یہ مراد لیا جائے کہ آنحضرتؐ سے نسیان ممکن ہے تو پھر خدا کی طرف سے آنحضرتؐ کے لیے خاص منت واحسان کے طور پر "فلا تنسٰی" کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ یہ بات یعنی یاد رکھنا اور بھول جانا تو ہر اس مخلوق سے ممکن ہے جو قوت حافظہ رکھتی ہو خواہ وہ انسان ہو یا حیوان' کہ وہ کبھی یاد رکھتی ہے، کبھی بھول جاتی ہے اور ان کا یاد رکھنا اور بھول جانا دونوں من جانب اللہ اور اس کی مشیت وارادہ سے ہوتے ہیں' اور آنحضرتؐ بھی اس عام اصول اور عمومی ضابطہ کی روشنی میں اس وقت تک اس عام حالت کے حامل تھے جب تک خدا نے انہیں اس خاص منت واحسان کے وعدے سے نہیں نوازا تھا کہ " سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى "...... ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ ہرگز نہیں بھولیں گے...... اس خاص وعدہ کے ساتھ خداوند عالم نے آنحضرتؐ پر عظیم احسان کیا اور اس ذریعہ سے انہیں دوسروں پر امتیاز عطا کیا اور نسیان کو ان سے ہمیشہ کے لیے دور کردیا' بنابرایں " سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى " کے بعد " اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ " کے ذریعے استثنیٰ کرنا صرف خداوند عالم کے قادر مطلق ہونے کے اثبات کے لیے ہے، اس طرح آیت کا معنی یوں ہوگا: "سنقرئك فلا تنسٰى ابداً واللہ مع ذلك قادر علی انسائك " عنقریب ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ کبھی نہ بھولیں گے اور اللہ اس کے باوجود آپ کو بھلوا دینے پر قادر ہے......

" ننسأها " کو نون پر زبر اور ہمزہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اسے "نسئی نسیئا" سے مشتق کیا گیا ہے جس کا معنی موخر کرنا ہے' تو اس صورت میں آیت کا معنی یوں ہوگا: "ماننسخ من آیة باز التها او نؤخرها بتاخیر اظهارها نأت بخیر منها او مثلها' ہم جس آیت کو بھی منسوخ کرتے ہیں یا اس کے اظہار کو موخر کردیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس کی مثل آیت لے آتے ہیں"۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ خداوند عالم کا اپنی آیات میں تقدم وتاخر کرنا (کسی کو پہلے اور کسی کو بعد میں نازل کرنا یا کسی کے نزول میں تاخیر کرنا) کسی کمال یا مصلحت کے ضائع ہوجانے کا سبب نہیں بنتا' بلکہ یہ امر ثابت اور واضح ہے کہ خداوند عالم اپنی آیات میں جس طرح کا دخل وتصرف کرتا ہے اس کی بنیادی وجہ کمال ومصلحت ہی ہوتی ہے جیسا کہ " بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا " کے الفاظ سے ظاہر ہے کیونکہ کسی آیت کا بہتر ہونا اس کمال کے سبب سے ہے یا اس مصلحت کی وجہ سے ہے جو اس میں پائی جاتی ہے چنانچہ کمال کی مماثلت یا اس میں اضافہ کے حوالہ سے ایک آیت، دوسری آیت کی جگہ لیتی ہے تاکہ پہلی آیت کہ جو منسوخ ہوئی ہے اس میں پائی جانے والی حکمتوں کا تحفظ احسن طور پر ہوسکے' (اس علمی موضوع پر مزید غور کرنے کی ضرورت ہے)۔

روایات پر ایک نظر

قرآن مجید میں ناسخ اور منسوخ کے وجود کی بابت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و آئمہ اہل بیت علیہم السلام اور صحابہ کرام کی طرف سے کثرت کے ساتھ روایات ذکر کی گئی ہیں اور ان روایات کو شیعہ وسنی دونوں محدثین نے اپنی اپنی مستند و معتبر کتب میں درج کیا ہے جن سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ کچھ آیات ایسی بھی ہیں جو بعض دوسری آیات کے ذریعے منسوخ قرار دی گئی ہیں۔

ناسخ ومنسوخ آیات کی نشاندہی

تفسیر نعمانی میں مذکور ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے چند ناسخ و منسوخ آیات کو ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: آیت "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ"، اس آیت کے ذریعے منسوخ ہوگئی ہے: "وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ" یعنی انہیں رحمت کے لیے پیدا کیا گیا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے جس آیت کے ناسخ اور منسوخ ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے اس میں صرف شرعی احکام میں واقع ہونے والی نسخ مراد نہیں ...... اس سے کسی شرعی حکم کا منسوخ ہونا مقصود نہیں...... بلکہ شرعی احکام (تشریعات) اور موجودات عالم (تکوین) دونوں میں پائی جانے والی نسخ مراد ہے کیونکہ جس آیت کو امامؑ نے ناسخ قرار دیا ہے (وَلَا يَزَالُوْنَ......) وہ پہلی آیت (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ......) میں مذکور امر...... تخلیق کی غرض و غایت...... کے وسیع معنے کو محدود کرتی ہے (گویا اسے منسوخ کرتی ہے)۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ پہلی آیت (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) انسانوں اور جنوں کی تخلیق کا مقصد "عبادت" قرار دیتی ہے یعنی انہیں عبادت کے لیے پیدا کیا گیا' اور یہ ایسا مقصد و مقصود ہے کہ جن وانس کی تخلیق کے بعد اس کا حصول یقینی ہے کیونکہ خداوند عالم اپنے کسی کام میں کہ جس کا وہ ارادہ کرتا ہے ناکام نہیں ہوتا بلکہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے لیکن جو اہم نکتہ اس مقام پر قابل توجہ اور لائق ذکر ہے وہ یہ کہ دوسری آیت (ولا یزالون یختلفون) میں خداوند عالم نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ لوگوں کو اس طرح سے خلق کیا گیا ہے کہ ان میں اختلاف رائے کا امکان پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہدایت و گمراہی کے حوالہ سے ان میں عام طور پر اختلاف رائے ہوتا ہے اور اختلاف رائے کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے

یعنی کوئی ہدایت پالیتا ہے اور کوئی گمراہی کے راستے پر گامزن رہتا ہے اس حال میں جس شخص پر خدا کی خاص عنایت ہو جائے اور اس کی رحمت ہدایت اسے حاصل ہو جائے وہ ہدایت پا جاتا ہے' چنانچہ اسی دوسری آیت کے آخری جملوں میں یوں ارشاد ہوا: "وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ" یعنی اسی (رحمت) کے لیے انہیں پیدا کیا' بنابراین دوسری آیت کی رو سے تخلیق کی غرض و غایت "رحمت" ہے کہ جو عبادت اور حصول ہدایت کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور یہ "رحمت" ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی بلکہ چند خوش نصیب ہی اس عظیم نعمت الٰہی سے بہرہ ور ہوتے ہیں' جبکہ پہلی آیت (وما خلقت ......) میں "عبادت" کو تمام لوگوں کی تخلیق کا مقصد وغرض قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس آیت کے اطلاق (اس کے معنی کا تمام لوگوں کے لیے ثابت ہونا) کو دوسری آیت (ولا یزالون......) کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا اور اسے (تخلیق کی غرض کو) چند مخصوص افراد کے لیے مختص کر دیا گیا ہے اس لیے پہلی آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تمام لوگوں کی تخلیق کا مقصد اور غرض وغایت "عبادت" ہے اور وہ اس طرح کہ نیک وصالح افراد کی تخلیق، حقیقی معنے میں مقصود ومراد ہے اور وہی ہیں جن کی تخلیق کا مقصد وغرض مطلوب ہے جبکہ دیگر افراد ان کے سبب سے خلق کئے گئے ہیں یا ان کے لیے خلق کئے گئے ہیں لہٰذا یہ کہنا بجا اور درست ہے کہ سب لوگوں کو "عبادت" کے لیے خلق کیا گیا ہے' یعنی اصل افراد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی تخلیق کی غرض کو سب کے لیے ذکر کرنا صحیح ہے' اس کی مثال یہ ہے کہ باغ کو پھلوں کے لیے یا مخصوص مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے جبکہ باغ میں موجود ہر چیز سے پھل حاصل نہیں ہوتے بلکہ چند درختوں سے پھل حاصل ہوتے ہیں اور دیگر اشیاء مثلاً باغ کی دیواریں اور پانی دینے کی چیزیں وغیرہ ان پھلوں کے لیے بنائی یا مہیا کی جاتی ہیں تو یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ باغ پھلوں کے لیے بنایا گیا ہے' اسی طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ لوگوں کو "عبادت" کے لیے پیدا کیا گیا ہے جبکہ اس سے مراد ومقصود چند مخصوص لوگ ہوں جو نیک وصالح ہیں اور دوسرے افراد ان کے لیے پیدا کئے گئے ہوں۔

امام علیؑ کا ارشاد گرامی

اسی طرح تفسیر نعمانی میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ: آیت "**وان منکم الا واردها کان علٰی ربک حتما مقضیاً**" کو آیت "اَلَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ" کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا ہے۔

توضیح: ان دو آیتوں میں عام وخاص کی نسبت نہیں پائی جاتی یعنی ایسا نہیں کہ پہلی آیت عام ہے اور دوسری خاص اور خاص نے عام کی تخصیص کر دی ہے کیونکہ جملہ "**کان علٰی ربک حتماً مقضیاً**" سے یقینی اور طے شدہ امر کا ثبوت ملتا ہے اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی ممکن نہیں کیونکہ خدا کا حتمی فیصلہ (**القضاء الحتم**) تبدیل نہیں ہو سکتا، نہ اس میں تبدیلی کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ اس کو ختم کیا جا سکتا ہے' بہرحال مذکورہ بالا آیت یعنی "اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا

الْحُسْنٰىٓ ۙ أُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ . . . ‘‘ ......سورہ انبیاء، آیت ۱۰۱......کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ اس بات کو بیان کیا جائے گا کہ یہ آیت جس بات کو منسوخ کرتی ہے اس سے مراد کیا ہے۔

بداء اور نسخ

تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: بداء بھی نسخ کی ایک قسم ہے کہ جس کا ذکر خداوند عالم نے اس آیت میں فرمایا ہے: ’’یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۚ وَ عِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (خدا محو کر دیتا ہے جو چاہتا ہے اور باقی رکھتا ہے جو چاہتا ہے اور اسی کے پاس ہے ام الکتاب (اصل لکھا ہوا)، اسی طرح قوم یونسؑ کی نجات بھی نسخ کے باب سے ہے۔

قوم یونسؑ کی نجات کا، نسخ کے باب سے ہونا اس وجہ سے واضح ہے کہ ’’نسخ‘‘ احکام شرعیہ اور امور تکوینیہ دونوں پر محیط ہے یعنی دونوں میں اس کا امکان پایا جاتا ہے،

بعض روایات میں آئمہ اطہارؑ سے منقول ہے کہ ایک امام کا فوت ہونا اور اس کی جگہ دوسرے امام کا آنا بھی نسخ ہی کی ایک صورت ہے۔

ہم پہلے اس امر کو بیان کر چکے ہیں کہ ’’نسخ‘‘ کسی ایک موضوع یا مورد سے مختص نہیں بلکہ تمام امور میں ممکن ہے اور مذکورہ بالا وایات کی مانند کثیر روایات معتبر کتب میں مذکور ہیں۔

آنحضرتؐ کی طرف نسیان کی غلط نسبت

تفسیر ’’درمنثور‘‘ میں عبداللہ بن حمید کے حوالہ سے اور ابوداؤد نے اپنی کتاب ’’ناسخ‘‘ میں اور ابن جریر نے قتادہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب کوئی آیت کسی آیت کو منسوخ کرتی تھی اور حضرت پیغمبر خداؐ اس آیت و سورت یا سورت کے کچھ حصہ کی قرائت فرماتے پھر وہ آیت یا سورت اٹھالی جاتی تو خداوند عالم اس آیت یا سورت کو حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ذہن سے نکال دیتا تھا (بھلوا دیتا تھا) اسی لیے خدا نے قرآن مجید میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: ’’مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ . . . ‘‘ اور خدا فرماتا تھا کہ اس میں تخفیف و سہولت ہے، اس میں چھوٹ اور اختیار ہے، اس میں امر ہے، اس میں نہی ہے۔

مذکورہ تفسیر (درمنثور) میں متعدد روایات ذکر کی گئی ہے جن میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسیان کی نسبت دی گئی ہے لیکن ہم ایسی تمام روایات کو مسترد کرتے ہیں کیونکہ یہ سب قرآنی تصریحات کے سراسر منافی ہیں، اس سلسلے میں جملہ ’’نُنْسِهَا‘‘ کی تفسیر میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔

آیات :۱۰۸ تا ۱۱۵

○ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ
يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

○ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖۚ
حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ
اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾

○ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ
تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

○ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

○ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

○ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ
عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ
يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

○ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ
خَرَابِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۗ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ
وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

○ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ

○ ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اسی طرح سوال و جواب کرو جس طرح اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے' (یاد رکھو) جو شخص ایمان کے بدلے کفر اختیار کرے۔ یقیناً وہ ہدایت کے سیدھے راستے سے بھٹک گیا''۔ (۱۰۸)

○ ''بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف پلٹا دیں یہ ان کا حسد ہے جو ان کے اندر پایا جاتا ہے جبکہ ان کے سامنے حق واضح ہو چکا ہے' تم انہیں معاف کردو اور ان سے درگزر کرلو یہاں تک کہ خدا ان کے بارے میں اپنا حکم جاری کرے' خدا یقیناً ہر چیز پر قادر ہے''۔ (۱۰۹)

○ ''نماز ادا کرتے رہو اور زکوۃ دیتے رہو' (یاد رکھو) تم جو نیک کام انجام دیتے ہو اور اسے اپنے آئندہ (آخرت) کے لیے پیش کرتے ہو اسے ضرور اللہ کے پاس پاؤ گے' خدا تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے''۔ (۱۱۰)

○ ''انہوں نے کہا ہے کہ بہشت میں کوئی داخل نہ ہو گا سوائے یہودیوں اور نصرانیوں کے' یہ دراصل ان کی (دل بہلانے والی) آرزوئیں ہیں' ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو ثبوت پیش کرو''۔ (۱۱۱)

○ ''ہاں! جو شخص دل سے خدا کو تسلیم کرے اور نیک اعمال بجا لانے والا ہو تو اس کا اجر و جزا اس کے پروردگار کے پاس محفوظ ہے ایسے لوگوں پر نہ تو کوئی خوف طاری ہو گا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے''۔ (۱۱۲)

○ ''یہودیوں نے کہا ہے کہ نصرانیوں کا مذہب بے بنیاد ہے اور نصرانیوں نے کہا ہے کہ یہودیوں کا عقیدہ نادرست ہے حالانکہ وہ سب کتاب خدا پڑھتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی ان جیسی باتیں کرتے ہیں جو کچھ علم نہیں رکھتے' بہر حال خدا اس چیز کے بارے میں قیامت کے دن فیصلہ کرے گا جس میں یہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ (۱۱۳)

○ ''اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے جو مساجد الٰہی میں ذکر خدا سے روکے اور ان (مساجد) کی ویرانی کی کوشش کرے ایسے لوگوں کو ان میں داخل ہونے سے ڈرنا چاہیے' ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے''۔ (۱۱۴)

○ ''اللہ ہی کے لیے ہے مشرق و مغرب' تم جس طرف رخ کرو خدا موجود ہے' خدا یقیناً ہر چیز پر محیط اور ہر بات سے بخوبی آگاہ ہے''۔ (۱۱۵)

تفسیر و بیان

مسلمانوں کا اپنے نبیؐ سے طرزِ عمل

○ "اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَكُمۡ"

اس آیت کے سیاق اور لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ پر ایمان لانے والوں میں سے بعض مسلمانوں نے آپؐ سے اسی طرح کے سوالات پوچھے تھے (یا اسی انداز میں سوال و جواب کیا تھا) جس طرح یہودیوں نے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا تھا' لہٰذا خداوند عالم نے یہودیوں کے اپنے نبی موسیٰؑ اور ان کے بعد دیگر انبیاءؑ کے ساتھ اپنائے گئے طرزِ عمل کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ ان مسلمانوں کی بھی مذمت کی جنہوں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہودیوں کی طرز پر سوال و جواب کیا' اس سلسلے میں وارد ہونے والی روایات سے بھی مذکورہ موضوع کی تصدیق ہوتی ہے۔

○ "سَوَآءَ السَّبِیۡلِ"

اس سے مراد' مستوی الطریق' یعنی سیدھا راستہ ہے۔

○ "وَدَّ كَثِیۡرٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ"

اس آیت میں "کثیر" یعنی "بہت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی بابت بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مشہور یہودی "حی بن اخطب" اور اس کے متعصب یہودی ساتھی ہیں۔

○ "فَاعۡفُوۡا وَاصۡفَحُوۡا"

اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے اس آیت کے ذریعے منسوخ کیا گیا ہے جو قتال و جہاد کے حکم پر مشتمل ہے۔ (کیونکہ اس آیت میں عفو و درگزر کا حکم ہے اور جہاد کی آیت میں جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے)۔

○ "حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ"

اس سلسلے میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے یہ جملہ (حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ) ایک حکم کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے خداوند عالم اہل کتاب کے بارے میں عنقریب صادر کرے گا' اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے بعد میں ذکر کی جانے والی آیت میں ہے یعنی "اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ" میں "خَآئِفِيْنَ" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم میں تبدیلی (منسوخ ہونے) کی گنجائش موجود ہے لہٰذا سورہ توبہ کی آیت ۲۸ میں اس حکم کے منسوخ کئے جانے کا اس طرح ذکر ہوا: "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا"۔

باقی رہی اس آیت میں کلمہ "امر" (بامرہ) کی بحث کہ اس سے کیا مراد ہے؟ تو اس سلسلے میں تفصیلی تذکرہ سورہ اسریٰ کی آیت ۸۵ میں کیا جائے گا جس میں روح کے بارے میں یوں کہا گیا ہے:

"يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ"

(لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو ان سے کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کا امر ہے)۔

○ "وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ"

اس آیت میں یہودیوں کے ساتھ نصرانیوں کے ملحق ہونے اور ان دونوں کے جرائم کے تفصیلی تذکرے کا آغاز ہوا ہے' گویا یہ آیت ان کے بارے میں بحث کا حرف اول ہے۔

صدق دل سے ایمان لانے والے

○ "بَلٰى ۤ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ"

یہ تیسری آیت ہے جس میں خداوند عالم نے اس امر کو بیان کیا ہے کہ سعادت وخوش بختی اور کامیابی کا معیار نام کا مسلمان یا مومن ہونا نہیں اور نہ ہی کسی کو کسی پر خدا کے نزدیک کوئی فضیلت و برتری حاصل ہے سوائے حقیقی طور پر ایمان لانے اور صحیح عبادت کرنے کے' یعنی کوئی شخص اس وقت تک کامیاب وسعادت مند نہیں ہو سکتا جب تک کہ صدق دل سے ایمان نہ لائے اور عبادت انجام نہ دے' اس سے پہلے جن دو آیتوں میں یہ بات بیان کی گئی ہے وہ یہ ہیں:

سورہ بقرہ، آیت ۶۲:

۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٔيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"۔

(جو لوگ ایمان لائے اور وہ جو یہودی' نصرانی اور صابئین ہیں جو بھی اللہ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دے ایسے لوگوں کا اجر ان کے پروردگار کے پاس محفوظ ہے اور ان پر کوئی خوف ہوگا نہ وہ

غمگین ہوں گے)۔

سورہء بقرہ ۸۱:

۲۔ "بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ"۔

(ہاں جو شخص برا عمل انجام دے اور اسے اس کی برائی گھیر لے تو ایسے لوگ ہی جہنم میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے)۔

بہر حال یہ تینوں آیتیں (بقرہ ۶۲، ۸۱، ۱۱۲) اس امر کو بیان کرتی ہیں کہ حقیقی معنوں میں صحیح ایمان وعقیدہ اور عمل صالح ہی سعادت وخوش بختی اور کامیابی وکامرانی کا سبب ہے نہ کہ ظاہری طور پر نام کا مسلمان ومومن ہونا، ان آیات سے مجموعی طور پر جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان کا اصل معنی خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دینا ہے اور "احسان" (وھو محسن) سے مراد عمل صالح بجالانا ہے۔

تلاوتِ کتاب کا حوالہ

○ "وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ"

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جبکہ یہ جانتے ہیں کہ کتاب خدا میں کیا کچھ لکھا ہوا ہے تو ان مطالب کا علم رکھنے کے باوجود انہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیں جو وہ کرتے ہیں حالانکہ کتاب خدا انہیں حق وحقیقت کی واضح پہچان کرواتی ہے، اس کی دلیل "وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ" کے بعد والے الفاظ ہیں یعنی "كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ" (اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے، انہی کے کہنے جیسا،) اس میں "لَا يَعْلَمُوْنَ" (جو کچھ نہیں جانتے) سے مراد اہل کتاب کے علاوہ عرب کے کفار ومشرکین ہیں کہ جو کہتے تھے: "**ان المسلمین لیسوا علٰی شیئی او ان اھل الکتاب لیسوا علٰی شیئی**" (مسلمانوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں یا اہل کتاب کی کوئی حیثیت ہی نہیں......وہ بے بنیاد نظریات رکھتے ہیں......)۔

مسجدوں سے روکنے والے لوگ

○ "وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ . . ."

اس آیت کے ظاہری الفاظ وانداز (ظاہر سیاق) سے معلوم ہوتا ہے کہ "خدا کی مسجدوں سے روکنے والوں" سے مراد وہی کفار مکہ ہیں جو ہجرت سے قبل لوگوں کو مسجدوں میں جانے سے منع کرتے تھے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیات حضرت پیغمبر اکرمؐ کے مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے ابتدائی دنوں میں نازل ہوئیں۔

کفار کا مسجد الحرام میں داخل ہونا

○ "اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ"

اس آیت میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ انہیں یہ حق حاصل نہیں تھا یا ان کے لیے یہ بات جائز نہ تھی کہ وہ مساجد میں داخل ہوں مگر یہ کہ خوف کے ساتھ۔ اس میں لفظ "کان" ...... تھا ...... سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک گزرے ہوئے واقعہ کا بیان ہے لہٰذا اس میں جن لوگوں کے عمل (مساجد میں جانے سے روکنے) کا تذکرہ کیا گیا ہے ان سے مراد کفار قریش اور مکہ میں ان کے ہمنوا ہیں جیسا کہ روایات میں بھی ذکر ہوا ہے کہ یہ کفار مکہ ہی تھے جو لوگوں کو مسجد الحرام اور کعبہ کے ارد گرد بنائی جانے والی مساجد میں نماز ادا کرنے سے روکتے تھے بہرحال ان تمام شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کفار مکہ ہی کرتے تھے جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا کہ انہیں تو ان مساجد میں داخل ہونے کا حق ہی نہ تھا۔

مشرق و مغرب سمیت تمام سمتیں اللہ کے لئے ہیں

○ "وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مشرق و مغرب اور دیگر تمام جہتیں و سمتیں حقیقی معنے میں خدا کے دائرہ مالکیت میں ہیں اور کوئی شخص ان کا حقیقی مالک نہیں ہو سکتا کیونکہ حقیقی ملکیت کا معنی و مفہوم ہی یہ ہے کہ نہ تو اس میں کوئی تبدیلی کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ وہ کسی دوسرے کو منتقل ہو سکتی ہے جبکہ انسانی معاشرے میں "ملکیت" و "مالکیت" کا جو معنی و تصور موجود ہے اس کی رو سے کسی چیز کی ملکیت لوگوں کے درمیان منتقل ہو سکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جن چیزوں کے مالک ہوتے ہیں ان کی اصل ذات و حقیقت کے مالک نہیں ہوتے بلکہ ان کے فوائد و آثار اور منافع کے مالک ہوتے ہیں جبکہ خداوند عالم دونوں طرح سے ان کا مالک ہے یعنی اشیاء کی ذات و حقیقت اور فوائد و منافع سب کی حقیقی ملکیت اسی کے پاس ہے اور چونکہ کسی "ملکیت کا اصل وجود "مالک" ہی کے حوالہ سے ہوتا ہے بنابرایں خداوند عالم ان تمام جہتوں اور سمتوں پر حاوی اور محیط ہے ...... ان پر اسے مکمل تسلط حاصل ہے ...... اور وہ ان کے ساتھ ساتھ ہے ...... ان جہتوں و سمتوں کا اس کے بغیر تصور ہی ممکن نہیں ...... لہٰذا جو شخص ان میں سے کسی جہت و سمت کی طرف رخ کرے گویا وہ خدا کی طرف رخ کرتا ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ آیت میں صرف مشرق و مغرب کا تذکرہ ہوا ہے جبکہ اس سے مراد تمام جہتیں اور سمتیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنوب و شمال کی اصل جہتوں کے علاوہ دیگر تمام سمتیں ان دونوں میں شامل ہیں کیونکہ ان جہتوں (جنوب و شمال) کے علاوہ ہر جہت و سمت یا تو مشرق کے ساتھ ملحق ہوتی ہے یا مغرب کے ساتھ اسی لیے آیت میں "فاینما" کے ساتھ "منھما" نہیں کہا گیا بلکہ یوں کہا گیا ہے "فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا" (جس طرف بھی رخ کرو)۔ گویا اس سے مراد یہ ہے کہ انسان جس طرف بھی رخ کرے وہیں یا مشرق ہے یا مغرب لہٰذا خداوند عالم کا یہ کہنا: "وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ" (اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق و مغرب) درحقیقت یہ کہنے کے برابر ہے: "وللہ الجھات جمیعاً" (اللہ ہی کے لیے ہیں تمام

جہتیں وسمتیں)۔ اوران تمام جہتوں میں سے دو جہتیں یعنی مشرق ومغرب کا خاص طور پر اس لیے تذکرہ کیا گیا ہے کہ انسان جس جہت وسمت کے تعین کا ارادہ کرتا ہے' اسے سورج اور دیگر آسمانی ستاروں کے طلوع وغروب کے حوالہ سے متعین کرتا ہے اور مشرق ومغرب طلوع وغروب کی دوسمتوں ہی کے نام ہیں۔

ہر طرف خدا ہے

○ "فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"

یہ جملہ ......ادبی قواعد کی رو سے......غیر مذکورہ (محذوف) جزاء میں پائے جانے والے حکم کے طور پر ہے۔ لہٰذا اس غیر مذکورہ (محذوف) جزاء کوملحوظ رکھتے ہوئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ اصل میں یہ جملہ یوں ہے: **"فاینما تولوا جاز لکم ذلک فان وجه اللّٰه هناک"**... تم جس طرف بھی رخ کرو تمہارے لیے جائز ہے کیونکہ وہاں بھی خدا ہے......اس کی دلیل یہ ہے کہ اس جملہ "فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" کے بعد یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" (اللہ وسعتوں والا' دانا ہے)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت واقتدار وسیع ہے اور وہ تمہارے دلوں کے راز جاننے والا ہے تم جس طرف بھی رخ کرو وہ تمہارے ارادوں سے آگاہ ہے' ۔ وہ کسی انسان یا عام خدائی مخلوق کی طرح نہیں کہ صرف ایک ہی سمت سے اس کی طرف رخ کیا جاسکتا ہو اور وہ صرف ایک ہی سمت (سامنے) میں موجود شخص کو دیکھ کر اس کی توجہ کی جہت سے آگاہ ہوسکتا ہو' ایسا ہرگز نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرف بھی رخ کیا جائے وہ خدا کی طرف رخ کرنا ہے اور خدا اس سے آگاہ ہے۔

اس مقام پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں قبلہ کی سمت کی وسعت کا بیان مقصود ہے اس کی مکانی وسعت کا تذکرہ مطلوب نہیں، جیسا کہ "وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ" کے الفاظ اس حقیقت کی دلیل ہے' (یعنی سمت کی وسعت سے کعبہ کی مکانی وسعت مراد نہیں بلکہ اس کی حدود معین ہیں جن میں توسیع نہیں ہوسکتی لہٰذا سمت کی وسعت قبلہ کی طرف رخ کرنے کی جہت کے بارے میں ہے جسے اس طرح بیان کیا گیا ہے: "وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" (اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق ومغرب' لہٰذا تم جس طرف بھی رخ کرو وہاں اللہ موجود ہے' اللہ وسعتوں والا' دانا ہے)۔

روایات پر ایک نظر

صحراء میں سمت قبلہ کا مسئلہ

کتاب ''التہذیب'' میں محمد بن حصین سے منقول ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے عبد صالح (امام موسیٰ کاظم علیہ السلام) کی خدمت اقدس میں ایک خط لکھا اور یہ مسئلہ دریافت کیا کہ ایک شخص کھلے صحرا...... بیابان...... میں ہے اور فضا ابر آلود ہے وہ نماز پڑھنا چاہتا ہے مگر اسے قبلہ کی سمت معلوم نہیں لیکن وہ کسی ایک طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتا ہے اور جب نماز سے فارغ ہوتا ہے تو سورج نکل آتا ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے قبلہ رخ نماز ادا نہیں کی تو اس کے لیے شرعی حکم کیا ہے آیا وہ دوبارہ نماز ادا کرے یا اس کی نماز صحیح ہے؟

امامؑ نے جواب میں تحریر فرمایا: اگر نماز کا وقت باقی ہو تو دوبارہ ادا کرے، آیا وہ نہیں جانتا ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے...... اور خدا کا فرمان حق ہے...... کہ ''فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ'' تم جس طرف بھی رخ کرو وہاں خدا ہے۔

نافلہ نمازوں میں قبلہ رخ؟

تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے آیہ شریفہ ''وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ...'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے اس آیت کو صرف نافلہ نمازوں کے لیے نازل فرمایا ہے، لہٰذا ''فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ'' تم جس طرف بھی رخ کرو وہاں اللہ موجود ہے، اللہ ہی وسعتوں والا دانا ہے۔ اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب خیبر کی طرف جا رہے تھے اور اسی طرح جب مکہ سے واپس تشریف لا رہے تھے اور کعبہ کی سمت آنحضرتؐ کے پس پشت تھی اس وقت آنحضرتؐ اپنی سواری پر سوار تھے لہٰذا جس طرف بھی آپؐ کا رخ تھا اسی طرف آپؐ نے اشارہ کے ساتھ نماز ادا کی۔

اسی تفسیر (العیاشی) میں مذکورہ بالا مطلب و مضمون پر مشتمل ایک روایت زرارہ کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، نیز علی بن ابراہیم قمیؒ اور شیخ طوسیؒ نے حضرت ابوالحسن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے اور شیخ صدوقؒ نے امام جعفر صادقؑ سے ایسی ہی روایت ذکر کی ہے۔

آئمہ اطہارؑ کا طریقۂ تفسیر

اگر آپ آئمہ اطہار علیہم السلام کی روایات کا مطالعہ کریں اور ان کے الفاظ و معانی میں غور وفکر کریں تو آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں گے کہ قرآن مجید میں عام وخاص اور مطلق و مقید کے اکثر موارد و مقامات میں آئمہ اطہارؑ نے جب بھی کسی عام سے کسی شرعی حکم کی نشاندہی فرمائی تو خاص یعنی عام اور اس کے مخصص سے کسی دوسرے شرعی حکم کی نشاندہی کی' مثلاً عام سے اکثر استحباب کے حکم اور خاص سے وجوب کے حکم کی نشاندہی فرمائی اور اسی طرح کراہت اور حرمت میں' اور یہ وہ طریقہ ہے جو آئمہ اطہار علیہم السلام کی روایات میں تفسیر کی بابت اپنائے گئے اصولوں میں سے ایک ہے اسی کو بنیاد قرار دے کر تمام احادیث سے قرآن فہمی کا اصل معیار معلوم ہوتا ہے اور اسی سے تمام قرآنی معارف وحقائق سے آگاہی حاصل کرنے کے دو قاعدوں وضابطوں کی نشاندہی ہوتی ہے:

پہلا قاعدہ: ہر جملہ اپنے مقام پر ایک مستقل حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی ہر قید وشرط کے ذریعے ایک مستقل حقیقت یا حکم کو بھی بیان کرتا ہے مثلاً:

سورۂ انعام، آیت ۹۱:

"قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ" ......،

تو اس میں چار معانی پائے جاتے ہیں:

۱۔ "قُلِ اللّٰهُ" (کہہ دیجئے اللہ ہے)

۲۔ "قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ" (اس میں "ذرھم" کی قید کے ساتھ ایک مستقل معنی پایا جاتا ہے)۔

۳۔ "قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ" (اس میں "فی خوضھم" کے اضافہ کے ساتھ ایک اور معنی پایا جاتا ہے)۔

۴۔ "قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ" (اس میں "يَلْعَبُوْنَ" کے اضافہ کے ساتھ ایک اور معنی کا اضافہ ہو گیا)۔

اسی قاعدے کی روشنی میں جہاں بھی کسی آیت کا تجزیہ ممکن ہو وہاں اضافی قید وشرط کے ساتھ اضافی معنی پائے جائیں گے۔

دوسرا قاعدہ: جب کوئی دو معنی یا دو واقعے کسی ایک جملہ میں مشترک طور پر پائے جائیں تو ان دونوں کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہوگی۔

یہ دو قاعدے وضابطے کئی اسرار ورموز سے آگاہی دلا سکتے ہیں اور ان میں کثیر حقائق نہفتہ ہیں' تاہم ہدایت کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔

آیات ۱۱۶ و ۱۱۷

○ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

○ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

ترجمہ

○ ''اور انہوں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بنایا ہوا ہے۔ جبکہ وہ (خداوند عالم) اس سے بالاتر اور...... پاک و منزہ ہے بلکہ...... حقیقت امر یہ ہے کہ...... آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اسی کا ہے اور سب اس کے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں''۔ (۱۱۶)

○ ''وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب کسی کام کو انجام دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے ''ہو جا''! وہ ہو جاتا ہے''۔ (۱۱۷)

تفسیر و بیان

یہود و نصاریٰ کے باطل اظہارات

"وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا" ○

(انہوں نے کہا خدا نے بیٹا بنایا ہوا ہے)۔

آیت کے سیاق و طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات یہودیوں اور نصرانیوں (عیسائیوں) نے کی کیونکہ یہودیوں نے کہا تھا: عزیر ابن اللہ، عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور عیسائیوں نے کہا: المسیح ابن اللہ، عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے، اور اس مقام پر گفتگو بھی اہل الکتاب سے ہو رہی ہے لہٰذا یہ کہنا بجا ہے کہ "وَقَالُوا" (انہوں نے کہا) سے مراد وہی لوگ (اہل کتاب، یہودی و نصرانی) ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا، تو اس سلسلے میں تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے پہلے تو انبیاً کے احترام و عزت کے طور پر انہیں اللہ کے "بیٹے" ہونے کی نسبت دی جیسا کہ اپنے بارے میں کہتے تھے: "نحن ابناء اللہ و احبائه" ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں، لیکن بعد میں رفتہ رفتہ یہ نسبت ان کے اعتقاد کی بنیاد بنتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ اسے حق و حقیقت سمجھ بیٹھے اور یہ عقیدہ رکھنے لگے کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے، لہٰذا خداوند عالم نے ان دو آیتوں (۱۱۶۔۱۱۷) میں ان کے عقیدہ اور غلط نظریہ کی نفی کی اور ان الفاظ میں ان کے باطل اعتقاد کو رد کر دیا: "بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (بلکہ آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات اس کی ملکیت ہیں اور سب اس کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں) یہ آیت دو دلیلوں کی حامل ہے کہ جن سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ خدا کے ہاں بچہ جننے کا ہرگز امکان نہیں پایا جاتا، وہ اس طرح کے امور سے پاک و منزہ ہے:

پہلی دلیل یہ کہ کسی سے بچہ کا پیدا ہونا ایک مخصوص نظام کے تحت ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے مادی بدن کے مادی اجزاء میں سے کچھ اجزاء اس سے جدا ہوں اور پھر وہ اجزاء مخصوص تدریجی مراحل طے کر کے اس کے ہمنوع اور اس جیسے بدن کی شکل اختیار کر لیں، جبکہ اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے اور کوئی اس کی مثل و نظیر نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو چیز بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس کی مملوک ہے خدا اس کا حقیقی مالک ہے اور ہر چیز خدا کی ذات سے وابستہ ہے یعنی اس کا وجود و ہستی خدا کے سہارے باقی ہے اور وہ اس کے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور اپنے وجود کی تمام خصوصیات اور اپ

''ہونے'' کی اصل واساس میں اس کی محتاج ہے لہٰذا کسی چیز کا اس جیسا ہونا کیونکر ممکن ہے اور کوئی اس کا ''بیٹا'' ہو، یہ ہر گز ممکن نہیں......،

دوسری دلیل یہ کہ خداوند عالم ''بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ''، آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور وہ جو چیز بھی پیدا کرتا ہے اسے کسی نمونہ ومثال کے بغیر پیدا کرتا ہے لہٰذا اس کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز ایسی نہیں جس کی تخلیق اس سے پہلے کسی مخلوق کو دیکھ کر انجام پائی ہو اور نہ ہی خدا کا کوئی کام ایسا ہے جو کسی کے کام کی نقل یا اس کی طرح کا ہو بلکہ اس کا کام نہ تو وسائل و اسباب کا محتاج ہوتا ہے اور نہ اسے کسی طرح کے تدریجی مراحل طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ جب بھی کسی کام کے انجام دینے کا حتمی فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے: ''ہوجا''، وہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا کوئی بیٹا ہے کیونکر صحیح ہے! کیونکہ بچہ کا پیدا ہونا وجود کے تدریجی مراحل طے کرنے کا محتاج ہے اور وہ (بچہ) جس سے پیدا ہوتا ہے اس کے ہمنوع اور اس کی مثل ونظیر ہوتا ہے بلکہ اس کے بدن کا حصہ کہلاتا ہے' اس لیے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ'' اسی کے لیے ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اور سب اس کے حضور سر خم کئے ہوئے ہیں' اور ارشاد فرمایا: ''بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' وہ آسمانوں اور زمین کا موجد (بغیر کسی نمونہ ومثال کے وجود عطا کرنے والا) ہے پس جب وہ کسی چیز کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے: ''ہوجا''، وہ ہو جاتی ہے' بنا بر ایں خدا کی طرف بیٹے کے نسبت دینا کسی طرح سے بھی درست نہیں۔

مذکورہ دو آیتوں (۱۱۶۔۱۱۷) سے مزید دو مطالب بھی ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ عبادت کا حکم آسمانوں اور زمین میں موجود تمام مخلوق کے لیے ہے۔

۲۔ خدا کے افعال تدریجی طور پر سرزد نہیں ہوتے' لہٰذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ تمام تدریجی افعال ..... یا تدریجی طور پر وجود میں آنے والی مخلوق...... میں ایک غیر تدریجی پہلو بھی پایا جاتا ہے اور اسی غیر تدریجی پہلو کے حوالہ سے اس کی نسبت خداوند عالم کی طرف صحیح قرار پاتی ہے یعنی اس غیر تدریجی پہلو کی بنیاد پر اس فعل یا مخلوق کا وجود میں آنا خدا کی طرف منسوب ہوتا ہے چنانچہ درج ذیل آیات بھی اسی امر کو بیان کرتی ہیں ..... (ان آیات میں بھی اسی حقیقت کا اشارہ ملتا ہے):

سورہ یٰس آیت ۸۲:

★ ''اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ''۔

(خدا کا امر۔ طریقہء کار۔ یہ ہے کہ وہ جب بھی کسی چیز کو وجود عطا کرنا چاہتا ہے تو اس سے کہتا ہے: ''ہوجا''، وہ ہوجاتی ہے)۔

سورۂ قمر، آیت ۵۰:

★ "وَمَآ اَمۡرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمۡحٍۢ بِالۡبَصَرِ"۔

(ہمارا حکم ایک ہی مرتبہ......صادر......ہوتا ہے، آنکھ جھپکنے کی طرح سے)۔

بہرحال ان مطالب کا تفصیلی تذکرہ انشاء اللہ سورہ یس کی آیت ۸۲ کی تفسیر میں ہوگا (اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـئًا...)۔

پاکیزگیٔ خدا کا اظہار

O "سُبۡحٰنَهٗ"

یہ مصدر ہے جو کہ تسبیح کرنے اور پاک ومنزہ رکھنے کے معنے میں آتا ہے اور اسے ہمیشہ اضافت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ مفعول مطلق ہے جس کا فعل محذوف (غیر مذکور) ہے، اس حوالہ سے یہ اصل میں یوں ہے: "سبحته سبحانا"۔ پھر فعل "سبحته" کو حذف کر کے مصدر "سبحان" کو ضمیر مفعول "ہ" کے ساتھ مضاف کر دیا گیا اور اسے اس کا (فعل کا) قائم مقام بنا دیا گیا اور وہ "سبحانہ" ہو گیا۔ یہ جملہ (سبحانہ) دراصل خداوند عالم کی طرف دی جانے والی غلط و ناروا نسبتوں کی نفی میں ادب واحترام کے انداز کا حامل ہے اور اس میں خدا کے ان ناروا نسبتوں سے پاک ومنزہ ہونے کا اظہار ہے۔

خضوع کا عملی مظاہرہ

O "كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ"

اس جملہ میں "قانتون" یعنی قنوت کرنے والوں کا تذکرہ ہے، قنوت سے مراد عبادت اور انکساری کا اظہار ہے، لہٰذا معنی یہ ہوگا کہ سب اس کی عبادت کرتے ہیں، اس کے سامنے خضوع وانکساری کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔

تخلیقِ ارض وسماء

O "بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ"

اس جملہ میں لفظ "بدیع" استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں "بداعت" کا معنی یہ ہے: ایسا کام جس کی پہلے کوئی مثل و نظیر اور نمونہ موجود نہ ہو، لہٰذا آیت کا معنی یوں ہوگا: خدا آسمانوں اور زمین کا بدیع (موجد) ہے یعنی اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے جبکہ ان کی تخلیق سے پہلے اس قسم کی کوئی چیز موجود نہ تھی کہ جسے نمونہ قرار دے کر خدا نے انہیں خلق فرمایا ہو۔

قدرت الٰہی کا تذکرہ

"فَيَكُونُ" O

یہ جملہ شرط کی جزاء کے طور پر نہیں، اس لیے مجزوم بھی نہیں (کیونکہ جزائی، شرط کے تابع ہوتی ہے اور عربی ادب کے قواعد کی رو سے اگر یہ جملہ جزا کے طور پر ہوتا تو اس پر جزم ہوتی) بلکہ یہ "کن" کے نتیجہ کے طور پر ہے اور اس کا معنی یہ ہے: "لہٰذا وہ ہو جاتا ہے"۔ یعنی خدا کہتا ہے "ہو جا" لہٰذا وہ ہو جاتا ہے۔

روایات پر ایک نظر

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا معنی

کتاب "کافی" اور "بصائر الدرجات" میں سدیر صیرفی کے حوالہ سے مذکور ہے انہوں نے کہا کہ عمران بن اعین نے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے آیت شریفہ "بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے ارشاد فرمایا:

(ان الله عزوجل ابتدع الاشياء كلها بعلمه على غير مثال كان قبله .فابتدع السماوات والارضين ولم يكن قبلهن سماوات الا ارضون اما تسمع لقوله :وكان عرشه على الماء)

خداوند عالم نے تمام موجودات کو اپنے علم سے پیدا کیا جبکہ ان سے پہلے کوئی مثل ونمونہ موجود نہ تھا جسے دیکھ کر خدا نے انہیں پیدا کیا ہو یعنی آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے کوئی آسمان وزمین موجود نہ تھے جن کے نمونہ پر خدا نے یہ آسمان وزمین پیدا کئے بلکہ ان سب کو اپنے علم کی بنیاد پر پیدا کیا" آیا تو نے یہ نہیں سنا کہ خدا نے فرمایا: "و کان عرشہ علی الماء" عرش الٰہی پانی پر تھا۔

ایک نہایت دلچسپ حقیقت: مذکورہ بالا روایت سے ایک اور دلچسپ حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ آیت "وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ" میں لفظ "الماء" ..... پانی ..... سے مراد یہ پانی نہیں جسے ہم "پانی" کہتے ہیں کیونکہ ہر چیز کی تخلیق "بداعت" یعنی پہلے سے موجود کسی نمونہ کے بغیر ہوئی ہے اور پانی بھی موجودات میں سے ایک ہے لہٰذا اس کی تخلیق بھی "بداعت" کی بنیاد پر ہوئی اور چونکہ عرش الٰہی سے مراد خدا کا اقتدار اعلیٰ ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے ہی موجود تھا اس لیے "الماء" سے عام پانی مراد نہیں بلکہ کچھ اور مراد ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی ذکر مربوطہ آیت (وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ...... سورہ ھود، آیت ۷) کی تفسیر میں کیا جائے گا۔

ایک علمی و فلسفیانہ بحث

علمی تجربات و تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دو مختلف چیزیں اپنی مستقل انفرادی خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں خواہ ان دونوں میں حقیقت اور ذات کے لحاظ سے قدر مشترک ہی موجود کیوں نہ ہو یعنی وہ جامع و کلی حقائق میں بنیادی طور پر مشترک ہونے کے باوجود کچھ منفرد خصوصیات بھی رکھتی ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے امتیاز رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بات ان دو چیزوں میں بھی پائی جاتی ہے جن کی وجہ امتیاز کی تشخیص قوت حس بھی نہیں کر سکتی تاہم علمی تحقیق و دلائل کی مدد سے ان دونوں کے درمیان امتیاز و تشخیص ممکن ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ استدلال و براھین سے بھی اس کی تائید ملتی ہے کہ عالم ہستی میں پائی جانے والی کوئی دو چیزیں ایسی نہیں جن میں کسی نہ کسی لحاظ سے فرق نہ پایا جاتا ہو بلکہ جن دو چیزوں کا بھی تصور کریں اگر ان کے درمیان اصل ذات سے باہر کوئی امتیازی پہلو نہ پایا جاتا ہو کہ جس سے ایک کو دوسری سے امتیاز تمیز دے سکیں تو یقینی طور پر وہ دونوں اپنی اپنی ذات کے لحاظ سے ایک دوسری سے مختلف ہوں گی...... دونوں ذات و حقیقت میں ایک نہیں ہوں گی بلکہ "دو" چیزیں کہلائیں گی...... اور پھر یہ امر بھی مسلم الثبوت ہے کہ ہر چیز اپنی اصل ذات کے لحاظ سے...... ذات سے باہر ہر طرح کے امتیازی وصف سے قطع نظر...... "ایک" ہے (وحدت کی حامل ہے) کیونکہ کوئی "ایک" چیز اپنی اصل ذات و حقیقت میں تعدد (ایک سے زیادہ ہونا) نہیں رکھتی یعنی اس میں تعدد کا امکان ہی نہیں پایا جاتا لہٰذا اگر اسے "دو" فرض کیا جائے تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ جسے کثرت کی صفت سے متصف کیا گیا ہے وہ درحقیقت ایک ہو جبکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ کوئی "ایک" چیز اصل حقیقت و ذات میں "دو" نہیں ہو سکتی یعنی اس کا ایک سے زائد ہونا محال و ناممکن ہے ورنہ اسے ایک نہیں کہا جا سکتا، بنابرایں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر چیز (موجود) اپنی اصل ذات و حقیقت میں دوسری چیز (موجود) سے مختلف ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ دونوں کسی بھی پہلو میں کوئی فرق نہ رکھتی ہوں، پس دو مختلف چیزوں کا کئی مشترک جہات کا حامل ہونا اس بات کا ثبوت نہیں بن سکتا کہ ان میں ذات و حقیقت کے لحاظ سے مکمل یکسائیت پائی جاتی ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی اصل ذات میں کسی نمونہ و مثل کے بغیر وجود میں آئی ہے اور خداوند عالم نے ہر چیز کو ایسا ہی خلق فرمایا ہے کہ اس سے پہلے اس کا کوئی مکمل نمونہ موجود نہ تھا اور خدا ہی ایسا کر سکتا ہے کہ وہی "بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ" آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی نمونہ و مثل کے پیدا کرنے والا (موجد) ہے۔

آیات ۱۱۸ و ۱۱۹

○ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿١١٨﴾

○ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾

ترجمہ

○ جاہل و نادان لوگوں نے کہا کہ خدا ہم سے خود کلام کیوں نہیں کرتا یا ہم پر کوئی آیت کیوں نازل نہیں ہوتی، ایسی بات ان سے پہلے لوگوں نے بھی کہی تھی...... دراصل...... ان کے دل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، ہم نے تو یقین رکھنے والوں کے لیے تمام آیات و نشانیاں واضح کر دی ہیں۔ (۱۱۸)

○ یقیناً ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا۔۔ ایمان والوں کے لئے ۔۔ خوشخبری دینے والا، اور...... انکار کرنے والوں کو ہمارے عذاب سے...... ڈرانے والا بنا کر، اور آپ سے جہنمیوں کے بارے میں باز پرس نہیں ہوگی۔ (۱۱۹)

تفسیر و بیان

جاہل و نادان لوگوں کے اظہارات

○ " وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ "

اس آیت میں " الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ " (جاہل و نادان لوگوں) سے اہل کتاب کے علاوہ دیگر مشرکین مراد ہیں کیونکہ اس سے پہلے آیت (۱۱۳) میں یہودیوں اور نصرانیوں کے ایک دوسرے کے بارے میں منفی نظریہ کے اظہار کو اس طرح ذکر کیا گیا تھا:

" وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ... "

(یہودیوں نے کہا نصرانی ہیچ ہیں (بے بنیاد نظریات رکھتے ہیں) اور نصرانیوں نے کہا یہودی کچھ بھی نہیں (ان کے عقیدے بے اساس ہیں) حالانکہ وہ سب کتاب خدا کی تلاوت کرتے ہیں اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو کچھ علم نہیں رکھتے)

اس آیت میں خداوند عالم نے تین قسم کے گروہوں کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ یہودی (اَلْيَهُوْدُ)

۲۔ نصرانی (اَلنَّصٰرٰى)

۳۔ جاہل و نادان لوگ (اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ)

اس آیت میں اہل کتاب کو عرب کے کفار و مشرکین کے ساتھ ملحق کر کے یہ کہا گیا ہے کہ وہ (اہل کتاب) اس طرح عقیدہ رکھتے ہیں جیسا کہ جاہل و نادان لوگ عقیدہ رکھتے ہیں؟ جبکہ زیر بحث آیت یعنی (۱۱۸) میں مشرکین و کفار کو اہل کتاب کے ساتھ ملحق کر کے یوں کہا گیا ہے کہ جاہل و نادان لوگوں (مشرکین و کفار) نے کہا کہ خدا ہم سے خود کیوں کلام نہیں کرتا یا ہم پر کوئی آیت کیوں نازل نہیں ہوتی، اسی طرح ان لوگوں نے بھی کہا تھا جو ان سے پہلے تھے (اہل کتاب) تو اس آیت میں مشرکین و کفار کو اہل کتاب کے ساتھ ملحق اور ہم عقیدہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہودیوں نے بھی اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اسی قسم کے مطالبے اور ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ ...... اور کہا تھا کہ ہمیں خدا کا ظاہر بظاہر دیدار کراؤ......، بنابرایں یہ سب طرز تفکر میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں...... ان کے دل ایک جیسے ہیں...... اور یہ سب ایک جیسی

باتیں کرتے ہیں، ایک جیسے نظریات وعقائد رکھتے ہیں، اسی لیے خداوند عالم نے فرمایا: " تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ " ان سب کے دل ایک جیسے ہیں۔

بہرحال آیت ۱۱۳ میں اہل کتاب (یہودیوں ونصرانیوں) کو عرب کے مشرکین وکفار (الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ) کا ہم عقیدہ اور آیت ۱۱۸ میں " الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ " (کفار ومشرکین) کو اہل کتاب کا ہم عقیدہ کہا گیا ہے کیونکہ یہ سب ایک جیسی باتیں کرتے ہیں اور ایک جیسے خیالات رکھتے ہیں۔

اہل یقین کے لئے واضح نشانیاں

○ " قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ "

یہ آیت مشرکین یعنی " الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ " کے اعتراض کے جواب کے طور پر ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ خدا کی طرف سے ہم پر کوئی آیت کیوں نازل نہیں ہوتی، خدا نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے اہل یقین کے لیے تمام آیتوں، نشانیوں کو واضح کر دیا ہے یعنی جن آیتوں کے نزول کا وہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں وہ آ چکی ہیں اور واضح وروشن ہیں لیکن ان سے صرف وہی لوگ استفادہ کر سکتے ہیں جو آیات الٰہی کی حقانیت پر یقین رکھتے ہیں، لیکن جو لوگ بے علم ہیں (الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ) ان کے دلوں پر جہالت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور تعصب وعناد کے مہلک مرض نے انہیں گھیر لیا ہے اس لیے اب انہیں آیات الٰہی کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ کیونکہ ان پر چھائی ہوئی جہالت انہیں نور حقیقت سے مستفیض نہیں ہونے دیتی ...... اسی وجہ سے انہیں " بے علم " کہا گیا ہے (الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ) اور اسی مطلب کی مزید تائید کے طور پر بعد والی آیت (۱۱۹) میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر خداوند عالم نے اس طرح ارشاد فرمایا: ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بہشت کی خوشخبری دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر، آپ اسی پر خوش ہوں اور ان لوگوں (کفار ومشرکین) کے بارے میں جان لیں کہ یہ جہنمی ہیں اور عذاب الٰہی ہی ان کا مقدر بن چکا ہے اور ان کی ہدایت ونجات کی کوئی امید نہیں۔

جہنمیوں کے بارے میں!

○ " وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ "

یہ جملہ سورۂ بقرہ کی آیت ۶ کا ہم معنی ہے جس میں کافروں کے بارے میں یوں کہا گیا تھا:

" إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ "۔

(جو لوگ کافر ہیں ان کی نسبت یہ بات برابر ہے کہ آپ انہیں ...... عذاب الٰہی سے ...... ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے)۔

آیات ۱۲۰ تا ۱۲۳

O وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى
اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَالَكَ
مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

O اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ
يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

O يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

O وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا
تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

ترجمہ

O ''یہودی اور نصرانی آپ سے ہرگز خوش نہ ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب وملت کی پیروی نہ کریں' کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل میں ہدایت ہے۔ اگر آپ علم وآگاہی کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کریں تو پھر اللہ کی طرف سے آپ کا ساتھی ومددگار کوئی نہ ہوگا''۔ (۱۲۰)

O ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اسے پوری توجہ کے ساتھ پڑھتے ہیں وہی لوگ اس (محمدؐ) پر ایمان لائیں گے اور جو اس کا انکار کریں وہی خسارہ ونقصان میں ہوں گے''۔ (۱۲۱)

O ''اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی ہے اور یہ کہ میں نے تمہیں پوری کائنات پر برتری دی ہے''۔ (۱۲۲)

O ''اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا اور نہ اس سے کوئی عوض قبول کیا جائے گا نہ کوئی شفاعت اسے نفع دے گی اور نہ کسی کی کسی طرف سے کوئی مدد ونصرت کی جائے گی''۔ (۱۲۳)

تفسیر و بیان

یہود و نصاریٰ کی ہٹ دھرمی

○ "وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡكَ الۡيَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی..."

اس آیت میں ایک بار پھر یہودیوں اور نصرانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے ان کا تذکرہ کرنے کے بعد دوسرے لوگوں کا ذکر ہوا تھا لیکن اب گفتگو کے اصل موضوع کی طرف لوٹ کر بکھرے ہوئے مطالب کو یکجا کر دیا گیا اور ان دونوں (یہودیوں اور نصرانیوں) کے بارے میں کچھ باتیں بیان کرنے اور ان کی سرزنش کرنے کے بعد خداوند عالم نے اپنے نبی ...حضرت محمدؐ... سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: یہ لوگ ہرگز آپ سے خوش نہ ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کی پیروی نہ کریں وہ مذہب کہ جسے انہوں نے اپنے باطل خیالات کی بنیاد پر گھڑ لیا ہے اور اپنے غلط نظریات کو عقیدہ کی بنیاد بنا لیا ہے اس کے بعد خداوند عالم نے آنحضرتؐ کو ان لوگوں کے باطل عقیدہ کے رد کر دینے کا اس طرح حکم دیا: کہہ دیجئے! خدا کی ہدایت ہی حقیقی معنی میں ہدایت ہے یعنی کسی کی پیروی کرنا ہدایت پانے کی غرض سے ہوتا ہے اور یہ مقصد صرف، ہدایت خدا ...... خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے اور اس کے احکام کی پیروی کرنے ... سے حاصل ہو سکتا ہے اور وہی حق ہے کہ جس کی پیروی کرنا ضروری ہے اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے ... یعنی تمہارا من گھڑت مذہب ...... وہ ہدایت کا ضامن نہیں کیونکہ وہ تمہاری باطل خواہشات اور غلط و بے بنیاد خیالات و نظریات ہیں کہ جنہیں تم نے "دین" کا نام دے دیا ہے اور اسے مذہب و ملت کے نام سے موسوم کرتے ہو۔

بنابرایں "اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى" ...... اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے... کے جملہ میں "ہدایت" سے مراد، قرآن مجید ہے (ھدیٰ، کے لفظ سے قرآن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) اور اس ..... ہدایت ... کی نسبت خدا کی طرف دے کر (هُدَى اللّٰهِ)... خدا کی ہدایت ... کہا گیا ہے تا کہ "ہدایت" کا قرآن ہی میں منحصر ہونا ثابت و واضح ہو جائے (ہدایت کا حصول صرف قرآن کے ذریعے ممکن ہے) اس لیے یوں ارشاد ہوا: "اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى" یعنی حقیقی ہدایت صرف خدا کی طرف سے ہے اور اس کا حصول صرف قرآن مجید سے کہ جسے خدا نے نازل فرمایا ہے ممکن ہے اس کے ساتھ ساتھ "اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى" کے جملہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں کے

مذہب وملت سے ہدایت کا حصول ممکن نہیں کیونکہ وہ خود ہدایت کی نعمت سے بے بہرہ ہے۔ پھر اس جملہ کے بعد ''وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ'' (اگر آپ ان کی باطل خواہشات کی پیروی کریں) کے جملہ میں ان کے مذہب وملت کو ''اھواء'' یعنی باطل خواہشات کا نام دیا گیا ہے جس سے اس مذہب وملت کا ہدایت سے بے بہرہ ہونا مسلم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ''بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ'' کے الفاظ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو کچھ آنحضرتؐ پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا وہ حقیقی معنے میں ''علم'' ہے اور جو ان ...... یہودیوں اور نصرانیوں ...... کے پاس ہے وہ ''جہالت'' کے سوا کچھ بھی نہیں، بنا بر ایں یہ جملہ بجا و برمحل ہے کہ ''وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ'' اگر آپ نے ان کی باطل خواہشات کی پیروی کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس ''علم'' آ گیا ہے تو پھر آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی ناصر و مددگار نہیں ہوگا۔

قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیں کہ اس آیت مبارکہ میں مضبوط طریقۂ استدلال اور کسی امر کے اثبات کے لیے دلیل و ثبوت پیش کرنے کے بنیادی اصول پر مشتمل ہونے کے علاوہ کلام میں فصاحت و بلاغت اور اظہار سخن میں سلاست و خوبصورتی کے صحیح طور پر اپنانے کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

جن لوگوں کو کتاب دی گئی

○ ''اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ''

ممکن ہے یہ جملہ ایک سوال یا اعتراض کے جواب کے طور پر ہو کہ جو اس مقام پر کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ آیت ۱۲۶ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی ...'' (یہودی اور نصرانی ہرگز آپ سے خوش نہ ہوں گے......) یعنی وہ آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، تو جب ان کا ایمان نہ لانا یقینی امر ہے اور ان سے ایمان لانے کی کوئی توقع یا امید نہیں کی جا سکتی تو کیا انہیں ایمان لانے کی دعوت دینا بے فائدہ و بے مقصد کام ہے؟

خداوند عالم نے اس سوال کا جواب اس طرح دیا کہ ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی اور وہ اسے اچھی طرح پڑھتے ہیں وہی لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور پھر آپ پر بھی ایمان لائیں گے'' یا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ''وہی لوگ خدا کی طرف سے نازل کی گئی کتاب پر ایمان لائیں گے خواہ وہ کتاب کوئی بھی ہو'' یعنی قرآن ہو یا کوئی اور آسمانی کتاب، یا پھر آیت کا معنی یہ ہوگا: ''وہی لوگ خدا کی طرف سے نازل کی گئی کتاب یعنی قرآن مجید پر ایمان لائیں گے''۔

بنا بر ایں ''اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ'' (وہی لوگ اس پر ایمان لائیں گے) سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف وہی لوگ اس پر ایمان لائیں گے...... جنہیں کتاب عطا کی گئی اور وہ اسے اچھی طرح پڑھتے ہیں.... گویا ایمان لانے والے ''صرف'' وہی ہیں ان کے علاوہ کوئی ایمان نہ لائے گا، یہاں ''صرف'' کے لفظ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایمان لانے کا عمل انہی میں منحصر و محدود ہے اور اس طرح کے انحصار کو علمی اصطلاح میں ''حصر افراد'' کہا جاتا ہے (یعنی اس میں افراد کی تحدید) اور ''بِهٖ'' میں

ضمیر "ہ" بعض معانی کی بنیاد پر...... "استخدام" کے طور پر ہے (یاد رہے کہ علمی اصطلاح میں "ضمیر استخدام" سے مراد یہ ہے کہ ضمیر کا معنی اس کے مرجع سے مطابقت نہ رکھتا ہو مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کہے کہ "میں نے فلاں آدمی کو دیکھا اور اس سے یہ بات پوچھی" تو اس جملے میں "اس" سے مراد وہ شخص نہ ہو جسے دیکھا ہے بلکہ اس کے بیٹے یا اس کے کسی قریبی سے پوچھا ہو لیکن "اس" کا لفظ استعمال کر دیا جائے اسے "استخدام" کہتے ہیں اسی مثال کی روشنی میں "بِهٖ" کی ضمیر کے بارے میں تین معنے ذکر کئے گئے ہیں (۱) اس سے مراد یہودیوں ونصرانیوں کی اپنی آسمانی کتاب ہے (تورات یا انجیل) (۲) ہر آسمانی کتاب (۳) حضرت پیغمبر اسلام محمدؐ اگر پہلا معنی درست قرار دیا جائے تو اس سے "بِهٖ" کی ضمیر کا معنی اپنے مرجع کے مطابق ہوگا لہٰذا "استخدام" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر دوسرا یا تیسرا معنی مراد لیا جائے تو اس صورت میں "ضمیر" ہ استخدام کے طور پر ہوگی)۔

اب رہی یہ بات کہ "اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ" (وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی) سے کون لوگ مراد ہیں؟ تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مراد یہودیوں اور نصرانیوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی خواہشات اور باطل نظریات و اوھام کی پیروی کرنے کی بجائے حق وحقیقت کا اتباع کیا اور یہاں "کتاب" سے مراد تورات اور انجیل ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ان سے مراد حضرت پیغمبر اسلام محمدؐ پر ایمان لانے والے اور کتاب سے مراد قرآن ہے تو اس صورت میں آیت کا معنی یوں ہوگا: وہ لوگ جنہیں ہم نے قرآن عطا کیا اور وہ اسے نہایت غور سے پڑھتے ہیں صرف وہی اس پر ایمان لائیں گے نہ یہ لوگ کہ جو اپنی باطل خواہشات اور اوہام کی پیروی کرتے ہیں اس معنی کی روشنی میں "صرف وہی" (اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ) کے الفاظ سے جو انحصاری مفہوم سمجھا جائے گا اسے علمی اصطلاح میں "قصر قلب" کہتے ہیں۔

بنی اسرائیل کو یاد دھانی

○ "يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا..."

یہ آیت مبارکہ اور اس کے بعد والی یت دونوں بنی اسرائیل کے بارے میں گفتگو اور ان سے خطاب کے خاتمہ و اختتام کے طور پر ہیں اور یہ دونوں آیتیں ان پہلی آیات کی مانند ہیں جن میں بنی اسرائیل کے بارے میں اور ان سے مخاطب ہو کر مطالب بیان کئے گئے تھے اور اسی کے ساتھ ہی بنی اسرائیل سے خطاب کا ایک سلسلہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

روایات پر ایک نظر

تلاوت قرآن کی حقیقت

کتاب "ارشاد" دیلمیؒ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت مبارکہ "اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ"... کی تفسیر میں مذکور ہے، آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(یرتلون آیاته ویتفقهون به و یعملون باحکامه، ویرجون وعده، ویخافون وعیده، ویعتبرون بقصصه، ویأتمرون باوامره، وینتهون بنواهیه، ما هو والله حفظ آیاته، ودرس حروفه، وتلاوة سوره، ودرس اعشاره واخماسه، حفظوا حروفه واضاعوا حدوده، وانما هو تدبر آیاته والعمل باحکامه، قال الله تعالیٰ: کتاب انزلناه الیك مبارك لیدبروا آیاته.) اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ کتاب خدا کی آیات کو ترتیل وخوش الحانی کے ساتھ پڑھتے ہیں' اس کے معانی میں غور فکر کرتے ہیں' اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں' اس میں خدا کی طرف سے کئے گئے وعدوں پر امید رکھتے ہیں' خدا کے عذاب کا خوف دلوں میں رکھتے ہیں' قرآنی قصص وواقعات سے عبرت پاتے ہیں' اس کے اوامر واحکامات کی پیروی اوران پر عمل کرتے ہیں' اس کے نواہی وممنوعہ کاموں سے باز رہتے ہیں' خدا کی قسم! "یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ" سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ اس کی آیتوں کو حفظ کرلیا جائے، اس کے حروف کو پڑھ لیا جائے، اس کی سورتوں کی تلاوت کرلی جائے اوراس کے دسویں اور پانچویں حصے کو پڑھ لیا جائے' تاہم ان لوگوں نے قرآن کے حروف کو حفظ کرلیا مگراس کے احکام ودستورات کو بھلا دیا جبکہ قرآن نازل کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کی مقدس آیات میں غور وفکر اور تدبر کیا جائے اوراس کے احکام دستورات پر عمل کیا جائے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: "كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ" قرآن وہ کتاب مبارک ہے جسے ہم نے آپؐ پر نازل کیا تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر اور غور کریں: (سورہ ص، آیت ۲۹)۔

آیات میں تدبر و تفکر

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے آیت مبارکہ "یتلو نه حق تلاوته" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ان مقامات میں توقف کرتے ہیں جہاں بہشت و دوزخ کا تذکرہ ہوا ہے۔

''توقف'' سے مراد ان میں تدبر اور غور و فکر کرنا ہے۔

کافی میں انہی حضرت (امام جعفر صادقؑ) سے مذکورہ آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ ان سے مراد آئمہؑ ہیں۔ کہ جو کتاب خدا کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح اسے پڑھنے کا حق ہے۔

آیت میں مذکور افراد سے آئمہؑ مراد لینا ''جری'' اور تطبیق کے باب سے ہے یعنی جن حضرات کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ کتاب خدا کی صحیح طور پر تلاوت کرتے ہیں' اس کے معانی میں تدبر اور غور و فکر کرتے ہیں ان کے کامل مصداق، حضرات آئمہ علیہم السلام ہیں، اس لیے امام علیہ السلام نے اسی طریقہ ''جری و تطبیق'' کے طور پر فرمایا کہ ان سے مراد آئمہؑ ہیں یعنی وہی آیت میں مذکور لوگوں کا کامل مصداق ہیں (ان پر ہی یہ تمام صفات مکمل طور پر منطبق ہوتی ہیں)۔

آیت ۱۲۴

○ وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ
قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

ترجمہ

○ "یاد کرو: جب ابراہیم کو اس کے پروردگار نے کچھ کلمات کے ذریعے آزمایا اور اس نے انہیں پورا کر دیا تو خدا نے کہا: میں تجھے لوگوں کا امام و رہبر بناتا ہوں، ابراہیم نے عرض کی میری اولاد میں سے بھی...... امام بنانا......! خدا نے کہا: میرا عہد ظالموں کو نہ پہنچے گا۔ (۱۲۴)

تفسیر و بیان

اس آیت (۱۲۴) سے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں گفتگو اور ان سے متعلق واقعات کے تذکرہ کا آغاز ہو رہا ہے، گویا یہ آیت ایک مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتی ہے جس کے بعد وہ آیات ذکر کی گئی ہیں جن میں قبلہ کی تبدیلی، حج کے احکام اور دین مقدس اسلام کے پاکیزہ حقائق و معارف، اخلاق اور فقہی احکام و مسائل کو بیان کیا گیا ہے، ان آیات میں خداوند عالم کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عہدہء امامت سے نوازنا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کعبہ کو تعمیر کرنا اور بعثت پیغمبر اسلامؐ کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کرنا ذکر کیا گیا ہے۔

ابراہیمؑ کی آزمائش وعہدۂ امامت

○ "وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ..."

یہ آیت مبارکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عہدہء امامت عطا کئے جانے اور انہیں اس عظیم منصب سے اختصاصاً نوازے جانے کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ واقعہ یعنی عہدہء امامت عطا ہونے کا عمل اس وقت انجام پایا جب حضرت ابراہیمؑ اپنی زندگی کے سفر کے آخری مرحلوں میں تھے یعنی آپؑ نہایت بوڑھے ہو چکے تھے اور اسماعیلؑ و اسحاقؑ بھی پیدا ہو چکے تھے اور آپؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ گرامی کو سرزمین مکہ میں سکونت پذیر کر دیا تھا، جیسا کہ بعض مفسرین نے اس تاریخی حقیقت کی تصدیق کی ہے، اور اس کی دلیل بھی زیر بحث آیت میں موجود ہے اور وہ یہ کہ جب خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا: "اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" کہ میں تجھے لوگوں کا امام بناتا ہوں، تو حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی: "وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ" میری اولاد میں سے بھی! ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے عہدہء امامت کی درخواست کی، حالانکہ فرشتوں کی زبانی اسماعیلؑ و اسحاقؑ کی پیدائش کی خوشخبری سننے سے پہلے آنجنابؑ اپنے ہاں اولاد ہونے سے آگاہ ہی نہیں تھے بلکہ ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کے ہاں اولاد ہوگی یہاں تک کہ جب فرشتوں نے انہیں اولاد کی خوشخبری سنائی تو انہوں نے نہایت تعجب اور ناامیدی کا اظہار کیا، چنانچہ خداوند عالم نے اس کا تذکرہ یوں فرمایا:

سورۂ حجر، آیت ۵۵:

" وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ . . . "

(لوگوں کو ابراہیمؑ کے مہمانوں کا واقعہ سناؤ کہ جب وہ اس کے پاس آئے اور سلام کیا تو اس نے کہا: ہم تم سے خوفزدہ ہیں، انہوں نے کہا ڈریں نہیں ہم تو آپ کو ایک بلند پایہ صاحب علم فرزند کی خوشخبری دینے آئے ہیں، اس نے کہا آیا تم مجھے اب بیٹے کی خوشخبری دیتے ہو جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اب تم مجھے کیا خوشخبری دو گے، انہوں نے کہا ہم نے آپ کو صحیح خوشخبری دی ہے آپ ہرگز ناامید نہ ہوں)۔

اور جب حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ کو یہ خوشخبری دی گئی تو انہوں نے بھی تعجب کا اظہار کیا، ان کے بیان کو خداوند عالم نے اس طرح ذکر فرمایا:

سورۂ ہود، آیت ۷۳:

" وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ . . . "

(اس کی زوجہ وہاں موجود تھی وہ ہنس پڑی، پھر ہم نے اسے بھی اسحاقؑ کی خوشخبری دی اور اسحاقؑ کے بعد یعقوبؑ کی بھی، اس نے کہا: ہائے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بچہ پیدا کروں میں تو بوڑھی ہو چکی ہوں اور میرا یہ شوہر بھی بوڑھا ہے، یہ تو بہت عجیب بات ہے، انہوں نے کہا: کیا تم خدا کے فیصلہ پر تعجب کرتی ہو جبکہ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تم اہل بیت پر فراواں ہیں۔ وہ ہر طرح کی حمد وثناء کے لائق اور بزرگی کا سزاوار ہے)۔

بہرحال ان دونوں میاں بیوی کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہاں اولاد کی پیدائش سے ناامید تھے اور انہیں اپنے صاحب اولاد ہونے کی توقع ہی باقی نہ رہی تھی، لہٰذا ان کی مایوسی و ناامیدی کی حالت کو دیکھ کر فرشتوں نے انہیں تسلی دی اور اطمینان دلایا کہ ان کے ہاں اولاد ہوگی، گویا فرشتوں کا انہیں تسلی دلانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اولاد کے ہونے سے بےخبر تھے، جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ "وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ" (اور میری اولاد میں سے بھی!) اس وقت کہا جب خدا نے ان سے فرمایا "اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" میں تجھے لوگوں کا امام بناتا ہوں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اپنی اولاد کے ہونے کا یقین تھا کیونکہ اس طرح کے الفاظ وہی ادا کر سکتا ہے جسے اپنے صاحب اولاد ہونے کا یقین ہو، اور پھر آداب گفتگو اس بات کے متقاضی ہیں کہ مخاطب کی شخصیت کے مطابق اور اس کے مقام و منزلت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کی

جائے لہذا جو شخص بھی ان آداب سے معمولی طور پر ہی باخبر ہو وہ کوئی بات لاعلمی کی بنیاد پر نہیں کر سکتا خاص طور پر حضرت ابراہیم ؑ جیسی عظیم ہستی کا کردگار عالم کے حضور ایسی بات کرنا جس کا انہیں علم ویقین ہی نہ ہو کیونکر ممکن اور قابل تصور ہے؟ کیونکہ اگر انہیں اپنی اولاد کے ہونے کا یقین نہ ہوتا تو " وَمِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ " ...... اور میری اولاد میں سے بھی امام بنانا... کی بجائے یوں عرض کرتے: "ومن ذریتی ان رزقتنی ذریۃ" اور اگر تو نے مجھے اولاد عطا فرمائی تو میری اولاد میں سے بھی امام بنانا' یا اس طرح کے الفاظ!

بہر حال جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یہ واقعہ (عہدہ امامت کا عطا ہونا) حضرت ابراہیم ؑ کو اولاد کی خوشخبری ملنے کے بعد اور زندگی کے آخری دنوں میں رونما ہوا۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم کا یہ ارشاد "وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" (اور جب ابراہیم کا امتحان اس کے پروردگار نے کچھ کلمات کے ذریعہ لیا تو ابراہیم نے ان کلمات کو پورا کر دیا ۔۔ امتحان میں کامیابی حاصل کر لی ..... تو خدا نے ارشاد فرمایا میں تمہیں لوگوں کا امام بناتا ہوں) اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ مقام امامت جو خداوند عالم نے ابراہیم ؑ کو عطا فرمایا اس کے لیے انہیں خدا کی طرف سے سخت ترین آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور وہ سب آنجناب ؑ کی زندگی ہی میں پیش آئیں جن میں سب سے بڑی آزمائش و امتحان کہ جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں کیا گیا وہ اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کرنے کے بارے میں ہے:

سورہ صافات آیت ۱۰۶:

"قَالَ يٰبُنَىَّ اِنِّىۡۤ اَرٰى فِى الۡمَنَامِ اَنِّىۡۤ اَذۡبَحُكَ ۔۔۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِيۡنُ"

(ابراہیم نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں ۔۔۔۔ یقیناً یہ بہت بڑا امتحان ہے)

خلاصہ یہ کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑھاپے کے عالم میں پیش آیا جیسا کہ خداوند عالم نے اس سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے کہا:

سورہ ابراہیم آیت ۳۹:

"اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ وَهَبَ لِىۡ عَلَى الۡكِبَرِ اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَسَمِيۡعُ الدُّعَآءِ"

(حمد وثنا ہے اللہ کے لیے کہ جس نے مجھے عالم پیری میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے' بے شک میرا پروردگار دعاؤں کا سننے والا (قبول کرنے والا) ہے۔

آیت کے الفاظ کی تشریح

اب ہم زیر بحث آیت کے الفاظ کی تشریح کرتے ہیں:

○ "وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ"

عربی زبان میں ابتلاء اور بلائی، دونوں کا معنی ایک ہے یعنی آزمائش و امتحان' چنانچہ کہا جاتا ہے: "ابتلیته و بلوته بکذا" یعنی میں نے اس کا امتحان لیا اور اسے آزمایا' اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب آپ کسی سے کوئی کام کرنے کو کہیں یا آپ کی وجہ سے وہ کسی سختی سے گزرے' کسی مصیبت سے دوچار ہو جائے' اور اس طرح آپ اسے آزمانا چاہیں تاکہ اس کی باطنی صفتوں اور صلاحیتوں مثلاً اطاعت' شجاعت' سخاوت' عفت و پاکدامنی' علم' وفاداری وغیرہ سے آگاہی حاصل کر سکیں' لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ ابتلاء و آزمائش فعل و عمل کے ذریعہ ممکن ہے کیونکہ انسان کی باطنی صفات کا اظہار، فعل و عمل سے ہوتا ہے نہ کہ قول اور زبانی باتوں سے کہ جن میں سچ اور جھوٹ دونوں کا امکان پایا جاتا ہے جبکہ فعل و عمل میں اس طرح کے امکان و احتمال کی گنجائش نہیں' امتحان و آزمائش کے فعل و عمل سے مربوط ہونے کی بابت درج ذیل آیتوں میں واضح اشارہ موجود ہے:

سورہء ن، آیت ۱۷:

★ "اِنَّا بَلَوۡنٰہُمۡ کَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ"

(ہم نے انہیں (مکہ والوں کو) آزمایا .....ان کی آزمائش کی ..... جس طرح سے ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی)۔

(یاد رہے کہ تفسیر کے مطابق اس آیت میں مذکور جنت یعنی باغ سے مراد یمن کا ایک باغ ہے جس کا مالک ایک نیک بوڑھا آدمی تھا جو اس باغ کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ ناداروں میں تقسیم کر دیتا تھا اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں نے اس کی اس نیک عادت کو نہ اپنایا اور بخل سے کام لیتے ہوئے فقراء و نادار لوگوں کو باغ میں سے کچھ نہ دیا' خداوند عالم نے راتوں رات ان کے باغ کو آسمانی بجلی کے ذریعے جلا کر راکھ بنا دیا اور اسے آیندہ آنے والی نسلوں کے لیے درس عبرت قرار دے دیا۔م)

(یہ آیت امتحان و آزمائش کے عمل سے مربوط ہونے کا ایک ثبوت ہے)۔

سورہء بقرہ آیت ۲۴۹:

★ "اِنَّ اللّٰہَ مُبۡتَلِیۡکُمۡ بِنَہَرٍ" ۔

(خداوند عالم تمہیں (طالوت کے سپاہیوں کو) ایک نہر کے ذریعہ آزماتا ہے)۔

اس آیت میں بھی ابتلاء کا تعلق عمل سے ہے۔

بنابراین زیر بحث آیت میں خداوند عالم کا یہ ارشاد گرامی: "وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ" جب ابراہیم کو

اس کے پروردگار نے کچھ کلمات کے ذریعہ آزمایا' تو اگر اس میں کلمات سے مراد اقوال ہی ہوں تو ان کے ذریعے امتحان و آزمائش کی وجہ یہ ہوگی کہ چونکہ عام طور پر عہد و پیمان اور احکامات، الفاظ و اقوال اور کلمات کے ذریعے ہوتے ہیں اس لیے اعمال و افعال کی بجائے کلمات کہا گیا ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورہ بقرہ آیت ۸۳:

"وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" اور لوگوں سے اچھا کہو.....،

اس میں "اچھا کہنے" سے مراد یہ ہے کہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرو اور حسن معاشرت اپناؤ۔

کلمات کا تذکرہ

○ "بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ"

کلمات، جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد، کلمہ ہے جس کا لغوی معنی لفظ ......مفرد یا مرکب ...... ہے جو انسان بولے، اگرچہ قرآن مجید میں "کلمة" کا استعمال بعض موجودات کے لیے بھی ہوا ہے مثلاً:

سورہ آل عمران آیت ۴۵:

"... بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۙ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ"،

(اپنے ایک کلمہ کے ساتھ کہ جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے)۔

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے لیے "کلمة" کا استعمال ہوا ہے لیکن یہ مجازی معنی ہے کہ جسے کلام و قول کے حوالہ سے مراد لیا جاتا ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ آل عمران آیت ۵۹:

"اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" ...،

(بے شک عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ خدا نے اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے فرمایا "ہو جا"! وہ ہو گیا)۔

بہر حال قرآن مجید میں جس مقام پر بھی "کلمة" کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی گئی ہے وہاں اس سے مراد "قول" ہے، نمونہ کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

سورہ انعام آیت ۳۴:

★ "وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ"...، (کوئی خدا کے کلمات کو تبدیل نہیں کر سکتا)۔

سورہ یونس آیت ۶۴:

★ "لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ"...، (خدا کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی)۔

سورہ انفال آیت ۷:

★ "یُّحِقَّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِهٖ"...، (حق کو اپنے کلمات کے ذریعے ثابت کرتا ہے)۔

سورہ یونس، آیت ۹۶:

★ "اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡهِمۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ"...

(جن لوگوں پر تیرے پروردگار کا کلمہ پورا ہو چکا ہے وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے......)۔

سورہ زمر آیت ۷۱:

★ "وَ لٰکِنۡ حَقَّتۡ کَلِمَةُ الۡعَذَابِ"...، (لیکن عذاب کا کلمہ پورا ہو چکا ہے)۔

سورہ مومن، آیت ۶:

★ "وَ کَذٰلِکَ حَقَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّهُمۡ اَصۡحٰبُ النَّارِ"۔

(اسی طرح تیرے پروردگار کا کلمہ ان لوگوں پر پورا ہو گیا جنہوں نے کفر اختیار کیا کہ وہ جہنم میں جائیں گے)۔

سورہ شوریٰ آیت ۱۴:

★ "وَ لَوۡلَا کَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیۡنَهُمۡ"

(اور اگر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک مقررہ وقت تک کے لیے کلمہ (فیصلہ) نہ ہو چکا ..... ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ ہی ہو جاتا)

سورہ توبہ آیت ۴۰:

★ "وَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الۡعُلۡیَا"...، (اور اللہ کا کلمہ ہی اونچا ہے)۔

سورہ ص، آیت ۸۴:

★ "قَالَ فَالۡحَقُّ ۫ وَ الۡحَقَّ اَقُوۡلُ"...، (اس نے کہا پس یہی حق ہے اور میں تو حق ہی کہتا ہوں)۔

سورہ نحل، آیت ۴۰:

★ "اِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَیۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰهُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ"...،

(ہم جس چیز کو وجود عطا کرنا چاہتے ہیں تو اس سے ہمارا کہنا یوں ہوتا ہے کہ ہم اس سے کہتے ہیں "ہو جا"، وہ ہو جاتی ہے)۔

ان تمام آیات اور ان جیسی دیگر آیات میں "کَلِمَةُ" سے مراد قول و کلام ہے اور قول و کلام دو طرح پر ہوتا ہے: ایک کسی بات کے اعلان اور اس کے واقع ہونے کی خبر دینے کی صورت میں اور دوسرا حکم و فرمان کی صورت میں، یہی وجہ ہے کہ

بعض آیات میں خدا کے کلمہ کے پورا ہو جانے کا تذکرہ ہوا ہے کیونکہ اس سے مراد حکم و فرمان (یا فیصلہ) ہے اور خدا کا حکم و فرمان......اور فیصلہ...... ہر صورت میں پورا ہونے والا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک کسی حکم پر عمل نہ ہو جائے وہ ناقص و نامکمل اور ادھورا ہوتا ہے اور جب اس پر عمل ہو جائے تو اسے ''پورا ہو جانا'' کہا جاتا ہے اس سلسلے میں دو آیتیں ملاحظہ ہوں جن میں خداوند عالم کے کلمہ......قول و کلام...... (حکم و فرمان یا فیصلہ) کے پورا ہو جانے کا ذکر ہے:

سورہ ٔانعام، آیت ۱۱۵:

★ ''وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ''۔

(اور تیرے پروردگار کا کلمہ صدق و عدل کے ساتھ پورا ہو گیا، اس کے کلمات کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا)۔

سورہ ٔاعراف، آیت ۱۳۷:

★ ''وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ''۔

(اور تیرے پروردگار کا خوبصورت کلمہ بنی اسرائیل پر پورا ہو گیا)۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خداوند عالم کا قول ہی تو اس کا فعل ہے اور ان دونوں میں فرق ہی نہیں تو پھر ''کلمہ'' سے فعل کی بجائے قول مراد لینے میں کیا راز پوشیدہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل حقائق اور الفاظِ کلام میں پائی جانے والی خصوصیات و مناسبتوں میں بہت فرق ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ جب خداوند عالم کا فعل ہی اس کا قول ہے تو پھر ''کَلِمَةُ'' سے قول مراد لینے کا فائدہ ہی کیا کیونکہ نتیجہ ایک ہے، درحقیقت اصل حقائق کی رو سے تو صحیح ہے لیکن گفتگو اور بیان کے الفاظ میں ربط اور ارتباط کے مروجہ اصولوں کے حوالہ سے صحیح نہیں کیونکہ خداوند عالم اپنے انبیاءؑ میں سے کسی نبی یا کسی اور بندے پر کچھ حقائق آشکار کرنا چاہتا ہے یا اسے کوئی ذمہ داری سونپتا ہے تو اس کام (فعل) کو قول و کلام کے ذریعہ انجام دیتا ہے یعنی وحی کرتا ہے اور وحی کے ذریعے انبیاءؑ پر حقائق الٰہیہ آشکار ہوتے ہیں اور انہیں احکام و دستورات خدا سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے چونکہ اس طرح کے افعال (وحی و الہام وغیرہ) قول و کلام سے حاصل ہونے والی غرض و غایت کے حامل ہوتے ہیں (یعنی یہ وہی کام دیتے ہیں جو قول و کلام کا کام ہے) اس لیے انہیں قول و کلام سے تعبیر کرنا بیجا نہیں کیونکہ ان میں کسی امر واقعہ کا بیان اور حکم و فرمان کے اصل مقاصد پوشیدہ ہوتے ہیں، یعنی ان افعال میں قول و کلام کے حقیقی آثار و نتائج پائے جاتے ہیں اس لیے انہیں ...مجازی طور پر ... کلام کہا جاتا ہے اور یہ بات ہمارے روزمرہ کے افعال میں بھی پائی جاتی ہے کہ جو افعال قول و کلام کے آثار پر مشتمل ہوتے ہیں انہیں قول و کلام کا نام دیا جاتا ہے مثلاً آپ کہتے ہیں: میں نے کہا ہے کہ یہ کام ضرور انجام دوں گا اور ہرگز اسے ترک نہ کروں گا یعنی اپنے ارادے ... و فیصلے...... سے منصرف نہ ہوں گا' ... خواہ آپ نے زبان سے ایسا نہ بھی کہا ہو تب بھی اپنے قلبی ارادہ و عزم

کو قول وکلام کا نام دیتے ہیں' اور کوئی شخص آپ کو اس عزم سے باز نہیں رکھ سکتا یعنی آپ کے ارادہ کو توڑ یا کمزور نہیں کر سکتا' عرب کے مشہور شاعر ''عنترہ'' نے بھی اس بات کو اپنے شعر میں ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو:

''وقولی کلما جشأت وجاشت مکانك تحمدی او تستریحی''۔

(میدان جنگ میں جب میں بھرپور جوش میں ہوتا ہوں تو اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ ثابت قدم رہو کہ اگر قتل کئے جاؤ تو تمہاری تعریف کی جائے گی اور غالب آؤ تو راحت وآرام پاؤ گے)۔

اس شعر میں ''قول'' (اپنے آپ سے کہتا ہوں) سے مراد اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا اور عزم پر قائم رہنا اور اپنی جگہ پر باقی رہنا ہے تاکہ قتل کئے جانے کی صورت میں تعریف پائے اور غلبہ پانے کی صورت میں راحت وآرام حاصل کرے۔

مذکورہ بالا حقائق جاننے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زیر بحث آیت میں ''کلمات'' سے مراد وہ واقعات ہیں جن کے ذریعے خداوند عالم نے اپنے نبی ابراہیمؑ کی آزمائش کی اور وہ عہد و پیمان ہیں جو ان سے لیے' جن واقعات کے ذریعے خدا نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی' ان میں سے چند یہ ہیں: ستاروں اور بتوں کی پوجا کرنے والوں سے واسطہ پڑنا' آتش نمرود میں کود جانا' وطن کو چھوڑنا اور اپنے بیٹے (اسماعیلؑ) کو ذبح کرنا وغیرہ' تاہم آیت میں اس بات کو واضح نہیں کیا گیا کہ ''کلمات'' سے کیا مراد ہے کیونکہ اس مقام پر ان کے تذکرہ کی ضرورت ہی نہیں' البتہ یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ ان سے مراد وہ امور ہیں جن کے باعث حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام امامت کے اہل ہونا ثابت ہوا جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' میں تجھے لوگوں کا امام بناتا ہوں' تو اس سے پہلے ارشاد فرمایا: ''وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ'' اور جب ابراہیمؑ کو اس کے پروردگار نے کلمات کے ذریعے آزمایا اور اس نے ان کلمات کو پورا کر دیا (آزمائش میں پورا اترا)۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ مقام امامت اس وقت عطا ہوا جب حضرت ابراہیمؑ نے کلمات کو پورا کر دیا یعنی آزمائش میں پورا اترے تو اس کے نتیجے میں خدا نے انہیں امامت عطا فرمائی۔

یہ بحث کلمات کے بارے میں تھی' اب یہ دیکھنا ہے کہ ان کے پورا ہونے سے کیا مراد ہے؟ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: فَاَتَمَّهُنَّ'' یعنی ابراہیمؑ نے ان ''کلمات'' کو پورا کر دیا' اس میں ضمیر (فاعل مستتر) کے بارے میں دو آراء پائی جاتی ہیں:

۱۔ اس کی بازگشت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہے۔

۲۔ اس کی بازگشت خداوند عالم کی طرف ہے۔

پہلی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: جب خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو ''کلمات'' کے ذریعے آزمایا اور اس نے انہیں پورا کر دیا یعنی خدا نے جن کاموں کا ابراہیمؑ کو حکم دیا تھا انہوں نے وہ سب انجام دے دیئے۔

دوسری صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا! جب خداوند عالم نے ''کلمات'' کے ذریعے ابراہیمؑ کی آزمائش کی اور

اسے ان کلمات کو پورا کرنے کی توفیق بخشی اور اس کی مدد کی۔
بظاہر دوسری صورت صحیح نظر آتی ہے۔
اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "کلمات" سے مراد جملہ "اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔۔۔" ہے جبکہ یہ درست نہیں کیونکہ پورے قرآن میں کسی مقام پر بھی "کلمات" کو کلام میں پائے جانے والے جملوں کے لیے استعمال نہیں کیا گیا' یعنی الفاظ وعبارات کے لیے "کلمات" کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔

مقام امامت کا اعطاء

○ "اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا"

امام یعنی پیشوا اور مقتدا (جس کی اقتداء کی جائے)، تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ: میں تجھے لوگوں کا پیشوا ومقتدا بناتا ہوں تاکہ لوگ تیری اقتدا کریں اور گفتار وکردار..... قول وفعل..... میں تیری پیروی کریں' بنابراین امام اسے کہتے ہیں کہ لوگ جس کی اقتداء وپیروی کریں اور اسے اپنا پیشوا اور رہنما قرار دیں' اسی وجہ سے متعدد مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں "امام" سے مراد "نبی" ہے کیونکہ ہر نبی اپنی امت کا پیشوا ومقتدا ہوتا ہے اور لوگ اپنے دین کے امور میں اس کی پیروی کرتے ہیں جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:
سورہ نسآء آیت ۶۴:

★ "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ......"
(ہم نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر صرف اس لیے کہ خدا کے حکم کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے)۔
لیکن اس مقام پر "امام" سے "نبی" مراد لینا ہرگز درست نہیں کیونکہ:

۱۔ ادبی قواعد کی رو سے "اِمَامًا" اپنے عامل یعنی "جَاعِلُكَ" کا دوسرا مفعول ہے... پہلا مفعول ضمیر "ک" ہے.... یعنی اس جملہ میں "جاعل"، فاعل ہے اور "ک" پہلا مفعول اور "اِمَامًا" دوسرا مفعول ہے' اور اسم فاعل جب "ماضی" کے معنے میں ہو تو عمل ہی نہیں کرتا یعنی اپنے مفعول کو نصب کا اعراب نہیں دیتا لیکن جب حال یا مستقبل کے معنے میں ہو تو اپنے مفعول کو اعراب دیتا ہے لہٰذا "اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" میں خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے امامت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے کہ مستقبل میں اسے اس مقام پر فائز کرے گا کیونکہ یہ وعدہ، وحی کی صورت میں ہوا ہے اور اس طرح کی وحی نبی کے علاوہ کسی پر نہیں آتی یعنی وحی کے لیے مقام نبوت کا حامل ہونا ضروری ہے، بنابراین یہ بات ثابت ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام امامت پر فائز ہونے سے پہلے نبی تھے' اس لیے آیت میں امامت سے نبوت مراد لینا درست نہیں' (اسے بعض مفسرین نے بیان کیا ہے)۔

۲۔ ہم نے ابتداء کلام وآغاز سخن میں یہ بات واضح طور پر بیان کی ہے کہ امامت کا عظیم منصب حضرت ابراہیم

علیہ السلام کو ان کی زندگی کے آخری ایام میں عطا ہوا یعنی اسحاق ؑ و اسماعیل ؑ کی ولادت کی خوشخبری ملنے کے بعد' کیونکہ جب فرشتے قوم لوط ؑ کو تباہ کرنے جا رہے تھے تو راستے میں حضرت ابراہیم ؑ کو بیٹوں کی ولادت کی خوشخبری دے کر گئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت نبوت و رسالت کے حامل تھے (نبی بھی تھے اور رسول بھی) لیکن مقام امامت پر فائز نہیں ہوئے تھے' لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ ان کی امامت (جس کا تذکرہ آیت میں کیا گیا ہے) ان کی نبوت کے علاوہ ایک اور منصب سے عبارت ہے' اور جن لوگوں نے آیت کی تفسیر میں ''امام'' سے ''نبی'' مراد لیا ہے یا اس طرح کے موارد میں ایسی تفسیریں کی ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جو عرصہ دراز سے بار بار کے استعمال کی وجہ سے عوام الناس کے درمیان اپنے اصل معانی کھو چکے ہیں اور غلط و من گھڑت معانی میں استعمال کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک لفظ ''امامت'' ہے چنانچہ کچھ لوگوں نے اس کا معنی نبوت' پیشوائی اور مطلق (ہمہ جہت) مقتدائی کیا ہے' اور کچھ لوگوں نے اسے خلافت یا وصایت یا دین و دنیا کے امور میں ریاست و امارت کے معنے میں استعمال کیا ہے' جبکہ ان تمام معانی میں سے کوئی بھی درست نہیں کیونکہ ''نبوت'' کا معنی خدا کی طرف سے خبروں (احکام وغیرہ) کا حامل ہونا ہے اور ''رسالت'' کا معنی تبلیغ کی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے' اور مقتدائی کا معنی یہ ہے کہ اس کے فرامین و احکامات پر عمل کیا جائے اور یہ نبوت و رسالت کا لازمی امر ہے (کیونکہ نبی و رسول کے فرامین و احکامات پر عمل کرنا اور ان کی اطاعت فرض ہے)' اور خلافت و وصایت کا معنی کسی کی نیابت و جانشینی ہے' اور ریاست و امارت کا معنی بھی مقتدائی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ اس سے مراد معاشرے میں حکمرانی اور فرمان صادر کرنے والی قوت ہے' اور ان معانی میں سے کوئی ایک بھی ''امامت'' کے اصل معنی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ امام اسے کہتے ہیں جس میں یہ صلاحیت و اہلیت پائی جائے کہ لوگ اس کی اس طرح سے اقتداء و پیروی کرسکیں کہ ان کے تمام افعال و اقوال ..... گفتار و کردار..... مکمل طور پر امام کے اقوال و افعال ..... گفتار و کردار..... کے مطابق ہوں۔ لہٰذا خداوند عالم کا کسی واجب الاطاعت نبی سے یہ کہنا کہ (میں تجھے لوگوں کے لئے نبی بناتا ہوں)۔ یا (میں تجھے ان چیزوں میں واجب الاطاعت بناتا ہوں جن کی تو اپنی نبوت کے ذریعے تبلیغ کرے) یا (میں تجھے حاکم بناتا ہوں کہ تو دین و دنیا کے امور میں امر و نہی کرے یعنی فرمان جاری کرے) یا (میں تجھے وصی یا خلیفہ بناتا ہوں کہ تو لوگوں کے درمیان ان کے باہمی تنازعات میں اللہ کے حکم کے ساتھ فیصلہ کرے) ..... بے معنی ہوگا کیونکہ ہر نبی واجب الاطاعت ہوتا ہے' اس کے فرامین و احکامات پر عمل کرنا اور اس کی پیروی کرنا ضروری ہوتا ہے اور وہ دین و دنیا کے امور میں حکمرانی کا حق رکھتا ہے اور وہ روئے زمین پر خدا کا نائب و وصی اور جانشین ہوتا ہے' بنابریں اسے دوبارہ انہی ذمہ داریوں اور خصوصیات کا حامل قرار دینے کی بات بے معنی ہے' اور ''امامت'' کے حقیقی معنے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہ تمام خصوصیات ..... جن کا تذکرہ ہو چکا ہے..... پائی جاتی ہیں یعنی وہ واجب الاطاعت بھی ہوتا ہے' اس کے احکامات پر عمل کرنا فرض ہے' دین و دنیا کی ریاست و امارت بھی اس کے پاس ہے اور وہی روئے زمین پر خدا کا نائب و وصی بھی ہے تاہم ان تمام الفاظ و معانی کی خصوصیات کے باوجود امامت کا مقام و مرتبہ بلند ہے اور یہ تمام منصب (نبوت' رسالت' امامت) خدا کی طرف سے خصوصی عنایات کا درجہ رکھتے ہیں اور ان میں لفظوں ہی کا فرق

نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک، خدا کی طرف سے مخصوص حقائق و معارف کے عطا ہونے کی علامت ہے اور "امامت" ان سب میں سے بلند ترین مقام رکھتی ہے اور جو خصوصیات نبوت و رسالت میں موجود ہیں ان سے کہیں زیادہ "امامت" میں ہیں اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ "امامت" کا معنی و مفہوم دیگر ہر منصب سے اعلیٰ ہے۔

قرآنی آیات کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس مقام پر بھی "امامت" کا تذکرہ ہوا ہے وہاں اس کی تفسیر و تشریح کے طور پر "ہدایت" کو ذکر کیا گیا ہے گویا امامت سے رہبری کا معنی مراد لیا گیا ہے مثلاً:

سورہ انبیاء آیت ۷۳:

★ "وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ یَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ ﴿۷۲﴾ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا..."،

ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "اور ہم نے اسے اسحاقؑ و یعقوبؑ عطا کئے اور ہم نے سب کو نیک و صالح بنایا اور انہیں امام بنایا وہ ہمارے حکم کے ساتھ ہدایت و رہنمائی ..... کا فریضہ ادا ... کرتے ہیں"۔

سورہ سجدہ آیت ۲۴:

★ "وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۫ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ"۔

(اور ہم نے ان میں سے امام بنائے جو ہمارے حکم کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے صبر اختیار کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے)۔

ان آیات میں خداوند عالم نے امامت کی تفسیر ہدایت کے ساتھ کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ امامت کی اصل حقیقت میں ہدایت و رہنمائی کے فریضہ کی ادائیگی پوشیدہ ہے اور وہی اس کا حقیقی معنی ہے لیکن اسے اپنے امر و حکم کے ساتھ مقید کر کے فرمایا "بامرنا" جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہر طرح کی ہدایت نہیں بلکہ مخصوص ہدایت مقصود ہے کہ جو خدا کے امر کے ساتھ ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں "امر" سے کیا مراد ہے تو اس سلسلے میں دیگر آیات، "امر" کی وضاحت کرتی ہیں ملاحظہ ہو:

سورہ یٰس آیت ۸۲:

"اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ"....،

(خدا کا امر یہ ہے کہ وہ جب بھی کسی چیز کو وجود دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے "ہو جا"، وہ ہو جاتی ہے پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے"۔

سورہء قمر، آیت ۵۰:

★ "وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ" ...،

(اور ہمارا امر ایک پل میں ہوتا ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا......)

ان آیات میں "امر" کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ وہی "امر" ہے جو "یهدون بامرنا" (وہ ہمارے امر کت ساتھ ہدایت کرتے ہیں) میں مذکور ہے' دونوں کی حقیقت ایک ہے' بہرحال ان دو آیتوں (سورہء یس، ۸۲۔ سورہء قمر، ۵۰) کی تفسیر میں ہم وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے کہ "خدا کا امر" کہ جسے زیر بحث آیت میں "ملکوت" سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے مراد خلق کا ایک مخصوص انداز ہے کہ جس کے حوالہ سے مخلوق کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہوتی ہے اور یہ وہ انداز اور تخلیق کی مخصوص صورت ہے جس میں زمان و مکان کی قیود نہیں پائی جاتیں اور نہ ہی اس میں تغیر و تبدل کی کوئی گنجائش موجود ہے' اور لفظ "کن" کہ جو کسی چیز کے اصل وجود ہی کا دوسرا نام ہے سے مراد بھی یہی معنی ہے اور یہ تخلیق کی اس دوسری صورت کے عین مقابل معنی ہے جو مخلوق ...... اشیاء سے اس طرح مربوط ہے کہ اس میں تغیر و تبدل اور تدریجی مراحل کے تقاضے پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ قانون حرکت و زمان کے دائرے میں آتی ہے اور اس میں مقررہ اصول و ضابطے کی عملداری پائی جاتی ہے' بہرحال "امر" کے بارے میں فی الحال اسی اجمالی تذکرے پر اکتفاء کرتے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں تفصیلی بیان اس کے مربوط مقام پر ہوگا۔

خلاصہء کلام یہ کہ "امام"، اس ملکوتی امر کے ساتھ جو اس کے پاس ہوتا ہے لوگوں کی ہدایت و رہبری کرنے والی شخصیت کو کہتے ہیں۔ بنابرایں "امامت" ایک طرح کی باطنی ولایت ...... اور سرپرستی ..... سے عبارت ہے جو لوگوں کے اعمال پر ہوتی ہے کہ جس میں "ہدایت" کی اصل حقیقت پوشیدہ ہے' لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ اس میں "ہدایت" کا جو معنی و مفہوم پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے امر کے ساتھ لوگوں کو منزل مقصود ...... حقیقی مطلوب تک پہنچایا جائے نہ یہ کہ انہیں صرف راستہ دکھا دیا جائے کیونکہ یہ کام (راستہ دکھا دینا) تو نبی و رسول اور ہر مومن انجام دیتا ہے یعنی لوگوں کو نصیحت و موعظۂ حسنہ کے ذریعے خدا کی طرف بلاتے ہیں جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

سورہء ابراہیم، آیت ۴:

★ "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ" ...،

(ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی زبان پر بھیجا تا کہ وہ ان کے سامنے حق کو واضح و آشکار کرے' خداوند عالم جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے)۔

اس آیت میں پیغمبروں کی ذمہ داریوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کی طرف آنے کا راستہ دکھاتے ہیں (حق کی پہچان کرواتے ہیں) نہ یہ کہ انہیں منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔

سورۂ مومن آیت ۳۸:

★ "وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ"....،

(وہ شخص جو ایمان لایا اس نے کہا اے میری قوم میری پیروی کرو تا کہ میں تمہیں سیدھے راستے کی ہدایت کروں)۔

اس آیت میں بھی ہدایت کرنے سے مراد راستہ دکھانا ہے اور جس نے لوگوں سے کہا وہ مومن آل فرعون ہے (فرعون والوں میں سے وہ شخص جو ایمان لایا تھا)۔

سورۂ توبہ آیت ۱۲۲:

★ "فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَیْهِمْ لَعَلَّهُمْ یَحْذَرُوْنَ"......،

(ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر گروہ میں سے کچھ لوگ علم دین حاصل کرنے کے لیے جائیں اور جب واپس آئیں تو اپنی قوم کو انذار کریں (خدا کے عذاب سے ڈرائیں) تا کہ لوگ خدا کے عذاب سے ڈریں)۔

اس آیت میں بھی ہدایت کا وہی مفہوم ملحوظ ہے یعنی راستہ دکھانا' اس سلسلے میں عنقریب مزید وضاحت کی جائے گی۔

اس مقام پر ایک اور اہم مطلب قابل ذکر ہے کہ خداوند عالم نے مقام امامت عطا کرنے کی وجہ کا ان الفاظ میں تذکرہ فرمایا ہے: "لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ" (کیونکہ انہوں نے صبر اختیار کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے)' یعنی انہیں اس لیے امامت کا عظیم مقام ومنصب عطا کیا گیا کہ انہوں نے خدا کی راہ میں ہر طرح کے امتحان وآزمائش میں صبر اختیار کیا اور صبر کے ذریعے خدا کے حضور اپنی عبودیت و بندگی کا عملی ثبوت پیش کیا اور وہ اس سے پہلے (امتحان وآزمائش میں صبر کا مظاہرہ کرنے سے پہلے) یقین کی منزل پر فائز تھے' گویا ان کا صبر اختیار کرنا اور یقین کامل سے بہرہ ور ہونا ہی ان کے لیے مقام امامت کی اہلیت کا سبب تھا۔

اس کے علاوہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کا تذکرہ ہوا تو خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا:

سورۂ انعام، آیت ۷۵:

★ "وَ كَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ"۔

(اسی طرح ہم آسمانوں اور زمین کا ملکوت ابراہیمؑ کو دکھاتے ہیں تا کہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائے)۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کا "ملکوت" اس لیے دکھا کہ وہ یقین کی نعمت سے بہرہ مند ہوں' یعنی "ملکوت" کا مشاہدہ کروانا حصول یقین کے لیے بطور مقدمہ تھا جس سے یہ بات

واضح ہوتی ہے کہ "یقین" کا مقام و مرتبہ ملکوت کے مشاہدہ سے ہرگز جدا نہیں جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ ءِ تکاثر آیت ۶:

★ "۔۔۔ کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ" ۔۔۔،

(۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں، اگر تمہیں علم الیقین حاصل ہوتا تو تم جہنم کو دیکھ پاتے)۔

سورہ ءِ مطففین آیات ۱۴ تا ۲۱:

★ "کَلَّا بَلۡ ٜ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾ کَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ" ۔۔۔ کَلَّاۤ اِنَّ کِتٰبَ الۡاَبۡرَارِ لَفِیۡ عِلِّیِّیۡنَ ﴿۱۸﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا عِلِّیُّوۡنَ ﴿۱۹﴾ کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ﴿۲۰﴾ یَّشۡهَدُهُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ" ۔۔۔،

(ایسا نہیں...... جو وہ گمان کرتے ہیں...... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اعمال نے ان کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا ہے' ایسا نہیں کہ وہ قیامت کے دن اپنے پروردگار سے پوشیدہ رہیں گے...... یاد رکھیں کہ نیک و صالح لوگوں کے نامۂ اعمال "علیین" میں ہیں اور آپ کو کیا معلوم کہ "علیین" کیا ہے' وہ تو ایک کتاب ہے جو لکھی گئی ہے جس کے گواہ مقربین ہیں)۔

ان آیات مبارکہ سے مجموعی طور پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ "مقربین وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر گناہ و معصیت، جہالت اور گمان و شک کے پردے نہیں پڑے ہوئے کہ جن کی وجہ سے وہ اپنے پروردگار سے محجوب ہوں' بلکہ یہی لوگ حقیقت میں اہل یقین ہیں ...... خدا پر مکمل یقین رکھتے ہیں ...... اور یہی "علیین" کا اس طرح مشاہدہ کرتے ہیں جس طرح سے "جحیم" کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

خلاصہ ءِ کلام یہ کہ "امام" کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ ایسا انسان ہو جو "یقین" کے بلند مقام پر فائز ہو اور عالم ملکوت اس پر ظاہر و عیاں ہو...... عالم ملکوت کا اس پر ظاہر و عیاں ہونا خدا کی طرف سے عطا کئے ہوئے کلمات کی بدولت ہو...... اور ہم نے گزشتہ سطور میں یہ بات بیان کی ہے کہ عالم "ملکوت" سے مراد وہ امر ہے جو اس عالم ظاہر کی "باطنی حقیقت" کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا آیت میں "یَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا" (وہ ہمارے امر کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں) کے جملہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جن جن چیزوں سے ہدایت کا تعلق ہے (دل اور اعمال) امام ان سب کی باطنی حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے اور ان سب کی اصل و اساس...... اسرار و رموز...... دلوں کے راز اور اعمال کی حقیقت اس کے سامنے ظاہر و آشکار ہوتی ہے' اور اس میں کوئی شک و شبہ ہی نہیں پایا جاتا کہ دیگر تمام اشیاء کی طرح دلوں اور اعمال کی بھی دو جہتیں اور حیثیتیں ہیں اور امام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہوتا ہے اور دلوں کے راز اور اعمال کی اصل بنیادیں اس کے سامنے ظاہر و عیاں ہوتی ہیں اور اس کے حضور لوگوں کے تمام اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے پیش ہوتے ہیں اور اسے سعادت و شقاوت کے دونوں راستوں پر نگرانی و تسلط حاصل ہے' خداوند عالم نے "امام" کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

سورہء اسراء آیت ۷۱:

★ "یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ" ...،

اس دن ہم سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے......،

اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا جائے گا کہ یہاں "امام" سے مراد، امامِ حق ہے نہ کہ نامۂ اعمال کہ جس کا بعض مفسرین نے آیت کے ظاہری الفاظ سے گمان کیا ہے' بنا بر ایں اس آیت کی روشنی میں اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ قیامت کے دن کہ جب تمام راز آشکار اور اسرار ظاہر کئے جائیں گے امام اسی طرح لوگوں کو خدا کی طرف لے جائے گا جیسا کہ وہ دنیا میں یہ فریضہ انجام دیتا تھا (انہیں ظاہر و باطن میں خدا سے وابستہ رہنے کی راہ پر چلاتا تھا)' اور اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں خدا کی طرف سے "امام" کا ہونا ضروری ہے اور کوئی زمانہ و دور ایسا نہیں کہ جس میں امام موجود نہ ہو کیونکہ خدا نے فرمایا ہے "کل اناس" (تمام لوگوں کو......) یعنی ہر زمانے کے لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے' اس کی بابت تفصیلی بحث آیت کے مربوطہ مقام (سورہء اسراء) میں ہوگی اور وہاں اس امر کو واضح طور پر بیان کریں گے کہ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر دور میں خدا کی طرف سے امام کا ہونا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ جو اہم بات قابل ذکر و لائق توجہ ہے وہ یہ کہ امامت کا مقام نہایت بلند و بالا اور عظیم ہے، اس لیے یہ مقام اسے ہی حاصل ہو سکتا ہے جو اپنی ذات میں سعادتمند ہو یعنی پاکیزہ نفس اور مقدس کردار کا مالک ہو کیونکہ اگر وہ ایسا نہ ہو بلکہ ذاتاً شقی اور زندگی کے کسی حصہ میں ظلم کا ارتکاب کر چکا ہو تو وہ خود اپنی ہدایت کے لیے کسی اور کا محتاج ہو گا یعنی اس کا ہدایت یافتہ و سعادتمند ہونا کسی دوسرے کا مرہون منت ہوگا اور ایسا شخص امامت جیسے عظیم و جلیل القدر مقام پر فائز ہونے کا ہرگز اہل نہیں ہو سکتا کیونکہ خداوند عالم نے

ارشاد فرمایا ہے:

سورہء یونس آیت ۳۵:

★ "اَفَمَنْ یَّهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ یُّهْدٰی" ۔

(آیا وہ شخص جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے اس بات کے لائق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ کہ جو ...... ہدایت کا محتاج ہے ......اس وقت تک ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے ہدایت نہ کی جائے؟)

اس آیت میں دو طرح کے افراد کا ذکر ہوا ہے ایک وہ شخص کہ جو دوسروں کو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے اور دوسرا وہ کہ جو خود ہدایت کا محتاج ہے' تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی شخص میں یکجا نہیں ہو سکتیں یعنی وہ دوسروں کو ہدایت کرتا ہو اور خود بھی ہدایت کا محتاج ہو یعنی یہ کہ کوئی دوسرا اسے ہدایت کرے)' لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ جو شخص اپنی ہدایت میں دوسروں کا محتاج ہو وہ کسی کو ہدایت نہیں کر سکتا، اس لیے ضروری ہے کہ دوسروں کو حق کی طرف ہدایت کرنے والا خود ہدایت یافتہ ہو۔۔ اور ذاتاً سعادت مند ہو۔

مذکورہ بالا مطالب سے دو حقیقتیں آشکار ہوتی ہیں:

۱۔ ''امام'' کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر طرح کے گناہ و معصیت سے پاک ہو (معصوم ہو) کیونکہ اگر وہ معصوم نہ ہو تو خود ہدایت یافتہ نہ ہوگا بلکہ اپنی ہدایت میں کسی دوسرے کا محتاج ہوگا اور ایسا شخص ''امام'' نہیں بن سکتا' جیسا کہ درج ذیل آیت میں خداوند عالم نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

سورہ انبیاء آیت ۷۳:

★وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ'' ...،

(ہم نے انہیں امام بنایا وہ ہمارے حکم کے ساتھ ہدایت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور ہم نے انہیں نیک کام کرنے' نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے کی وحی کی اور وہ ہمارے عبادت گزار بندے تھے)۔

اس آیت میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ'' ہم نے انہیں نیک کاموں کی وحی کی' گویا امام کے تمام افعال نیک ہیں وہ انہیں خدا کی طرف سے حاصل ہونے والی تائید و ہدایت کے ذریعے انجام دیتا ہے یعنی وہ ذاتاً ہدایت یافتہ و سعادتمند ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے ان کے بارے میں یوں نہیں فرمایا: "واوحینا الیھم ان افعلوا الخیرات'' (کہ ہم نے ان کو وحی کی کہ تم نیک کام کرو۔ بلکہ یوں ارشاد فرمایا: ''وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ'' کہ ہم نے انہیں نیک کاموں کی وحی کی' کیونکہ ان دونوں جملوں میں بہت فرق ہے' پہلا جملہ (وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ) اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ خداوند عالم نے انہیں نیک کاموں کی وحی کی، لہٰذا وہ جو کام انجام دیں وہ نیک ہوگا اور اسے خدا کی طرف سے عطا ہونے والی تائید حاصل ہوگی جبکہ دوسرا جملہ (واوحینا الیھم ان افعلوا الخیرات) کہ ہم نے انہیں وحی کی کہ وہ نیک کام انجام دیں' اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ انہیں نیک کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے ممکن ہے وہ اسے انجام دیں یا انجام نہ دیں' بنابرایں امام کے تمام افعال خداوند عالم کی طرف سے حاصل ہونے والی تائید و وحی کی بنیاد پر انجام پاتے ہیں اس لیے وہ ذاتاً ہدایت یافتہ اور سعادتمند ہوتا ہے اور اپنی ہدایت میں کسی کا محتاج نہیں ہوتا' اسی لیے دوسروں کو ہدایت کرنے کا سزاوار و اہل قرار پاتا ہے۔

اس مقام پر ایک ادبی نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ آیت میں ارشاد خداوندی ہے: ''وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ''، اس جملے میں ''فِعْلَ الْخَيْرٰتِ'' کہا گیا ہے یعنی ''فعل''، مصدر کو ''الخیرات'' کی طرف اضافت دی گئی ہے (فعل، مضاف اور ''الخیرات'' مضاف الیہ ہے) اور عربی قواعد کی رو سے جب کوئی مصدر مضاف واقع ہو تو اس سے اس کام کے وقوع پذیر ہونے کا ثبوت ملتا ہے جبکہ "افعلوا الخیرات" میں ایسا نہیں کیونکہ وہ صیغہ امر ہے اور امر یعنی حکم میں انجام پذیر ہونے اور نہ ہونے میں سے دونوں کا امکان ہوتا ہے' اس لیے امام کی خصوصیت کے اظہار کے لیے صیغہ امر کی بجائے مصدر مضاف ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ امام ذاتاً ہدایت یافتہ اور خداوند عالم کی طرف سے عطا کی جانے

والی سعادت کا حامل ہوتا ہے۔۔اور اس کا ہر کام نیک اور خیر کا مصداق ہے۔۔،

۲۔ جو شخص معصوم نہ ہو وہ امام ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا یعنی وہ دوسروں کو حق و حقیقت کی طرف ہدایت کرنے کا اہل ہی نہیں۔

ان دو امور کے ثابت ہونے کے بعد یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ امام کے لیے معصوم ہونا ضروری ہے، کوئی غیر معصوم، امامت کے عظیم مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ خدا کی طرف سے مقرر کئے جانے والے ہادی و امام کے لیے معصوم ہونا اور ہر طرح کے ظلم و شقاوت سے منزہ و پاک ہونا ضروری ہے لہٰذا یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیت میں ''ظالمین'' سے مراد کیا ہے چونکہ جب خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''کلمات'' کے ذریعے آزمالیا اور آنجنابؑ نے ان کلمات کو پورا کر دیا تو خداوند عالم نے انہیں ''امام'' بنانے کی خوشخبری دی جس کا تذکرہ یوں ہوا (وَ اِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا: یہ مقام و منصب میری ذریت و اولاد میں بھی قرار دے (ومن ذریتی): تو خدا نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ''......میرا عہد ظالموں کو نہ پہنچے گا؟ اس میں لفظ ''ظالمین'' ذکر ہوا ہے اور ہم نے بیان کیا ہے کہ ''امام'' کے لیے ہر ظلم سے پاک ہونا ضروری ہے، لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس مقام پر ''ظالمین'' سے مراد ہر وہ شخص ہے جس سے کسی طرح کا بھی ظلم سرزد ہو خواہ وہ ظلم ''شرک ہو' یا گناہ و معصیت' اور خواہ پوری زندگی میں ایک لحہ کے لیے بھی انجام دیا ہو اور پھر اس کی توبہ کر لی ہو تب بھی وہ مقام امامت کا اہل نہیں ہو سکتا.... کیونکہ اس کا دامن داغدار ہو چکا ہے اور ظلم کے ارتکاب کے باعث اس کا شمار ''ظالموں'' میں ہو گیا ہے......اور وہ ذاتاً ہدایت یافتہ و سعادتمند نہیں ورنہ اس سے ظلم سرزد ہی نہ ہوتا' جس سے ظلم و معصیت سرزد ہو وہ اپنی اصلاح کے لیے کسی ہادی کا محتاج ہوتا ہے لہٰذا وہ امامت جیسے عظیم و جلیل القدر مقام و منصب کا اہل کیونکر ہو سکتا ہے؟

ہمارے ایک بزرگ استاد سے زیر بحث آیت کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس سے امام کی عصمت کا ثبوت کس طرح ملتا ہے تو انہوں نے جواب دیا:

عقلی طور پر لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ جنہوں نے ساری زندگی ظلم کا ارتکاب کیا۔

۲۔ جنہوں نے زندگی بھر کوئی ظلم نہیں کیا۔

۳۔ جنہوں نے زندگی کے صرف ابتدائی ایام میں ظلم کا ارتکاب کیا۔

۴۔ جو زندگی کے آخری ایام میں ظلم کے مرتکب ہوئے۔

اور یہ بات مسلم ہے کہ پہلی اور آخری قسم کے افراد (زندگی بھر ظلم کرنے والے اور زندگی کے آخری ایام میں ظلم کا

آیات ۱۲۵ تا ۱۲۹

○ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

○ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

○ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

○ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

○ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ

○ ''اس وقت کو یاد کرو۔ جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کی توجہ کا مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا......اور ہم نے کہا......مقام ابراہیمؑ سے اپنے لیے مصلّی......نماز قائم کرنے کی جگہ...... بنالو اور ہم نے ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اس کے مجاوروں اور اس میں رکوع و سجود بجالانے والوں کے لیے پاک و پاکیزہ رکھو''...... (۱۲۵)

○ ''اور جب ابراہیمؑ نے کہا: پروردگارا! اس شہر (مکہ) کو امن کا شہر بنا دے اور یہاں کے باسیوں کو......طرح طرح کے...... پھلوں سے رزق عطا فرما (یعنی ان باسیوں میں سے) جو بھی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے ...... اسے پھلوں سے رزق دے...... خدا نے کہا: لیکن جو کافر ہوا اسے تھوڑا سا رزق دوں گا پھر اسے جہنم کے عذاب کے لیے مجبور کر دوں گا جو کہ بہت ہی برا انجام ہے۔ (۱۲۶)

○ ''اور جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بیت اللہ کی بنیادیں کھڑی کر رہے تھے تو انہوں نے کہا، پروردگارا! ہمارا یہ عمل قبول فرما کہ تو ہی دعاؤں کو سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے''۔ (۱۲۷)

○ ''اے ہمارے پروردگارا! ہمیں اپنے حضور سر تسلیم خم کرنے والا بنا (مسلمان قرار دے) اور ہماری اولاد میں سے ایک امت مسلمہ بنا...... کہ جو تیرے حضور سر تسلیم خم کرنے والی ہو۔ اور ہمیں آداب عبادت سے آگاہ فرما اور ہماری توبہ قبول فرما کہ تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے''۔ (۱۲۸)

○ ''پروردگارا! ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما، جو ان کے سامنے تیری آیات کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، تو ہی عزت والا اور دانا ہے''۔ (۱۲۹)

تفسیر و بیان

خانہء کعبہ کا تذکرہ

O "وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا"

اس آیت میں دو امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ایک حج کا حکم اور دوسرا خانۂ کعبہ کا جائے امن ہونا۔

"مثابہ"، لوٹ کر آنے...... رجوع کرنے...... کی جگہ کو کہتے ہیں، چنانچہ یوں کہا جاتا ہے "ثاب' یثوب" یعنی وہ لوٹ آیا' وہ لوٹ آتا ہے۔

مقام ابراہیمؑ کا تذکرہ

O "وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى"

یہ جملہ، معنی کے لحاظ سے "جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً" کی طرف عطف ہے کیونکہ "جَعَلْنَا الْبَیْتَ" میں حج کے حکم کو بیان کیا گیا ہے لہٰذا اس کے بعد "وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى" یعنی تم مقام ابراہیمؑ کو مصلّی قرار دو' سے مراد گویا یہ ہے: "واذ قلنا للناس ثوبوا الی البیت مثابۃ و حجوا الیہ واتخذوا من مقام ابراھیم مصلّی" اور جب ہم نے لوگوں سے کہا کہ تم بیت اللہ کی طرف لوٹ آؤ اور حج انجام دو اور مقام ابراہیم کو "مصلّی" قرار دو۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس فقرے (وَ اتَّخِذُوْا......) میں "قلنا" مقدر (مفروض و مخفی) ہے یعنی دراصل جملہ یوں ہے "وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى' اور ہم نے کہا تم مقام ابراہیمؑ کو مصلّی قرار دو' گویا "اتَّخِذُوْا' جو کہ حکم ہے اس سے پہلے "قلنا"......ہم نے کہا...... پڑھیں تو معنی واضح ہو جائے گا۔

اور "مصلّی"......اسم مکان ہے......اس کا معنی ہے صلوٰۃ یعنی دعا کرنے کی جگہ' گویا اس سے مراد یہ ہے کہ "تم مقام ابراہیمؑ سے دعا کرنے کی جگہ بنا لو۔

اس مقام پر یہ اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ جملہ "وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً..." بظاہر مقام ابراہیمؑ میں نماز ادا کرنے کے حکم کی وجہ کو بیان کرنے اور لوگوں کو اس کی اہمیت سے آگاہ کرنے کے لیے ہے یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے یہ

نہیں کہا: ''صلوا فی مقام ابراھیمؑ'' تم مقام ابراہیم میں نماز ادا کرو' بلکہ فرمایا: وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ''تم مقام ابراہیمؑ سے نماز ادا کرنے کی جگہ بناؤ' یعنی براہ راست یہ حکم صادر نہیں فرمایا کہ تم مقام ابراہیمؑ میں نماز ادا کرو بلکہ وہاں جگہ بنانے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: تم مقام ابراہیمؑ سے نماز ادا کرنے کی جگہ بناؤ۔

ابراہیمؑ واسماعیلؑ سے لئے گئے عہد کا تذکرہ

○ ''وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا . . .''

اس آیت میں ''عہد'' سے مراد حکم ہے یعنی ہم نے ابراہیمؑ واسماعیلؑ کو حکم دیا' اور ''طَهِّرَا'' (پاک کرو) کے دو معنے ممکن ہیں:

۱۔ خانہ کعبہ کو عبادت اور اعمال حج بجا لانے کے لیے مخصوص کر دو' یعنی اسے طواف کرنے والوں' مجاوروں...... اعتکاف بیٹھنے والوں...... اور نماز ادا کرنے والوں کی عبادت اور حج کے اعمال انجام دینے کے لیے مختص کر دو۔

اس معنی کی روشنی میں ''مخصوص کر دینے'' کو ''تطہیر'' یعنی پاک کرنے سے تعبیر کرنا ''استعارہ بالکنایہ'' کہلاتا ہے' اس علمی اصطلاح کے حوالہ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''ہم نے ابراہیمؑ واسماعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو عبادت گزاروں کی عبادت کے لیے مخصوص کر دو...... اس میں عبادت ہی عبادت بجالائی جائے اور یہ بھی ایک طرح کا ''پاک کرنا'' ہے۔

۲۔ اسے ان گندگیوں اور غلاظتوں سے پاک اور صاف ستھرا کر دو جو لوگوں نے بے توجہی سے یہاں ڈال دی ہیں' یعنی لوگوں نے اسے صاف ستھرا رکھنے میں بے توجہی سے کام لیا ہے اس لیے اس میں گندگی ہوگئی ہے لہٰذا اسے صاف ستھرا کر دو۔

''رکع'' یعنی رکوع کرنے والے' سجود یعنی سجدہ کرنے والے۔ یہ لفظ (رکع) جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ''راکع'' ہے یعنی رکوع کرنے والا' اسی طرح ''سجود'' ساجد کی جمع ہے ساجد کا معنی ہے سجدہ کرنے والا' اور ان سے مراد نماز ادا کرنے والے ہیں' تو آیت کا معنی یوں ہوگا: اور ہم نے ابراہیمؑ واسماعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو عبادت بجالانے والوں اور نماز پڑھنے والوں کے لیے پاک کر دو۔

حضرت ابراہیمؑ کی اہل مکہ کے لئے دعا

○ ''وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ''

یہ آیت حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو بیان کر رہی ہے جو انہوں نے اہل مکہ کے امن و رزق کے لیے کی' اور خدا کے

حضور عرض کی کہ مکہ والوں کو امن و امان کی نعمت اور پاکیزہ روزی عطا فرمائے اور ان کی دعا مستجاب بھی ہوگئی اس کے مستجاب ہونے کی دلیل ہی یہ ہے کہ خدا نے اس دعا کا تذکرہ اپنے مقدس کلام میں کیا ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو دعا مستجاب ہی نہ ہوئی ہو اس کا ذکر قرآن مجید میں اہمیت کے ساتھ کیا جائے کیونکہ قبول نہ ہونے والی دعا کا کوئی اثر و فائدہ ہی نہیں اور جو چیز بے فائدہ ہو اس کا تذکرہ لغو و بے معنی ہے اور یہ جاہل لوگوں کا کام ہے کہ لغو و بے فائدہ باتیں کریں، قرآن مجید کلام الٰہی ہے اس میں لغو و بے فائدہ بات کا ذکر ممکن ہی نہیں جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہ ص آیت ۸۴:

"قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ" ... میں تو صرف حق کہتا ہوں.....،

سورہ طارق آیت ۱۴:

"اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ" ...

(یہ حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والا کلام ہے اور یہ کسی قسم کا مذاق (یا بے معنی) نہیں.....)

قرآن مجید میں ان جلیل القدر نبی (ابراہیم علیہ السلام) کی بہت دعائیں ذکر کی گئی ہیں جو انہوں نے اپنے پروردگار کے حضور کی ہیں مثلاً:

☆ وہ دعا جو انہوں نے اپنے مشن کے ابتدائی مرحلہ میں اپنے لیے کی۔
☆ وہ دعا جو انہوں نے اپنے شام کی طرف ہجرت کے وقت کی۔
☆ وہ دعا جو انہوں نے اپنی نیک نامی اور اپنے لیے ذکر خیر کی بقا کے لیے کی۔
☆ وہ دعا جو انہوں نے اپنے لیے، اپنی اولاد و نسل کے لیے، اپنے والدین کے لیے اور تمام مومنین و مومنات کے لیے کی۔
☆ وہ دعا جو انہوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اہل مکہ کے لیے کی۔
☆ وہ دعا جو انہوں نے اپنی نسل میں سے پیغمبر اسلامؐ کے مبعوث ہونے کے لیے کی۔
☆ وہ دعائیں جن سے ان کی آرزوؤں، تمناؤں، ذاتی فضائل و کمالات، خدا کے ساتھ گہرے تعلق اور اپنے مشن میں اخلاص و عزم کی نشاندہی ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان دعاؤں سے آنجنابؑ کے تقرب الٰہی اور زندگی کے تمام مراحل و مشاکل میں اپنے پروردگار کا شکر گزار بندہ بن کر رہنے کا ثبوت ملتا ہے اور آپؑ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں اور پاکیزہ جہات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ تاہم ان کی مقدس زندگی کی بابت کچھ مطالب سورہ انعام میں ذکر کیے جائیں گے۔

اہل ایمان کا خصوصی تذکرہ

○ "مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ..."

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شہر مکہ کے لیے امن کی دعا کی اور پھر مکہ والوں کے لیے پاکیزہ پھلوں کے رزق کی دعا کی تو انہیں خیال آیا کہ میں نے تو سب مکہ والوں کے لیے رزق کی دعا کی ہے جبکہ وہ سب کے سب تو ایمان لانے والے نہیں ہیں بلکہ ان میں کافر بھی ہوں گے اور وہ بھی رزق عطا کئے جانے کی دعا میں شامل ہو جائیں گے کیونکہ دعا تمام اہل مکہ کے لیے ہے اور میں نے تو کافروں اور جن کی وہ عبادت کرتے ہیں ان سے اظہار برأت کیا ہے ... جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں ابراہیمؑ کے کافروں سے اظہار برأت کا ذکر یوں فرمایا ہے "فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ" (سورۂ توبہ آیت ۱۱۴) یعنی جب اس کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ دشمن خدا ہے تو اس نے اس سے اظہار برأت کر لیا ... اور آزر جو کہ دیگر افراد کی نسبت حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ قرب رکھتا تھا اس سے اس لیے اظہار برأت کیا کہ وہ کافر تھا تو پھر دیگر کافروں کے لیے امن اور رزق کی دعا کیونکر کر سکتے ہیں لہٰذا انہوں نے فوراً "مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ" (ان میں سے جو مومن ہو) کہہ کر کافروں کو اپنی دعا سے خارج کر دیا اور انہوں نے یہ الفاظ اس لیے کہے کہ اپنا فطری و منصبی فریضہ ادا کر دیں ورنہ وہ خود اس حقیقت سے پورے طور پر آگاہ تھے کہ معاشرتی زندگی کے حوالہ سے امن اور پھلوں کے رزق سے مومن و کافر دونوں استفادہ کریں گے اور پھر یہ کہ خداوند عالم خود بہتر جانتا ہے کہ اپنے بندوں کے ساتھ کیسا سلوک کرے، بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مستجاب ہوئی اور مومنین و کفار سب نے امن کی نعمت اور پھلوں کے رزق سے استفادہ کیا اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ان کی دعا کا مستجاب ہونا خارق العادت اور غیر معمولی کام نہ تھا بلکہ خداوند عالم کی طرف سے عالم طبیعت میں جاری و ساری معمول کے مطابق تھا یعنی ایسا نہیں کہ خداوند عالم نے ابراہیمؑ کی دعا کی اجابت بطور معجزہ کی ہو کیونکہ خود حضرت ابراہیمؑ نے بھی امن اور رزق کی دعا مومنین کے ساتھ مخصوص کر کے نہیں کی یعنی یوں نہیں کہا: "وارزق من امن من اهله من الثمرات" (اور تو اہل مکہ میں سے پھلوں کا رزق اسے عطا فرما جو ایمان لائے) بلکہ انہوں نے پہلے اپنی دعا تمام اہل مکہ کے لیے کی کیونکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خدا کی برکت سے شہر مکہ آباد ہو جائے اور اس میں امن و امان ہو اور رزق کی فراوانی ہو، کیونکہ مکہ ایک غیر آباد علاقہ تھا اور اس کی زمین بنجر تھی جس سے پھل اگنے کی امید نہ تھی لہٰذا اگر ابراہیمؑ دعا نہ مانگتے تو یہ شہر کبھی آباد نہ ہوتا اور نہ ہی اس میں کوئی شخص سکونت اختیار کرتا، شہر کی آبادی اور اس میں امن و رزق کی فراوانی کی دعا کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کفار سے اظہار برائت کے طور پر "مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ" ... جو ان میں سے ایمان لائے ... کے الفاظ کہے تا کہ ان کی دعا صرف ایمان لانے والوں کے لیے مختص ہو جائے۔

کافروں کے لئے متاع قلیل

O "وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا . . ."

(اور جو کافر ہوا اسے تھوڑا بہت فائدہ دوں گا)۔

اس فقرے میں "فَأُمَتِّعُهُ" کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے: بعض مفسرین نے اسے باب افعال میں لا کر "م" کو ساکن اور "ت" کے نیچے زیر کے ساتھ پڑھا ہے یعنی "فَأُمْتِعُهُ"۔ اور بعض حضرات نے اسے باب تفعیل میں لا کر "م" پر زبر اور "ت" پر شدہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی "فَأُمَتِّعُهُ"۔ تاہم ان دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہے یعنی خواہ اسے باب افعال میں لا کر "امتاع" سے یا باب تفعیل میں لا کر "تمتیع" سے مشتق کریں اس کے معنے میں فرق نہیں آئے گا اور اس کا معنی ایک ہی رہے گا یعنی فائدہ پہنچانا۔

کافر کا انجام کار

O "ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ . . ."

اس جملہ میں بیت اللہ کی عظمت و شان اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خوشی کے اسباب فراہم کئے جانے کا اظہار ہے‘ اس جملہ کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ گویا خدا نے ابراہیمؑ سے فرمایا: تم نے بیت اللہ کی حرمت و عظمت کے پیش نظر اس شہر کے مومنین کو رزق عطا کرنے کی جو دعا مانگی وہ میں نے قبول کر لی ہے اور میں مومنین کے ساتھ ساتھ کافروں کو بھی اس رزق سے استفادہ کرنے کا موقعہ عطا کروں گا لیکن کافر ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ خدا نے انہیں کوئی شرف و اعزاز عطا کیا ہے کیونکہ یہ تو صرف اس شہر کی عظمت شان اور تمہاری دعا کی قبولیت کے وسیع آثار کے طور پر ہے‘ اور بہت جلد ان کافروں کو جہنم کے دردناک عذاب کی طرف لے جاؤں گا جو کہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

تعمیر کعبہ کا آغاز

O "وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ"

(اور جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے بیت اللہ کی بنیادیں کھڑی کیں)۔

اس آیت مبارکہ میں لفظ "قواعد" استعمال ہوا ہے جو کہ "قاعدۃ" کا صیغہ جمع ہے۔ عربی زبان میں "قاعدۃ" اس بنیاد کو کہتے ہیں جس پر عمارت کھڑی کی گئی ہو‘ اس کا مادہ "قعود" ہے جس کا معنی "بیٹھنا" ہے چونکہ کسی عمارت کی بنیاد در حقیقت عمارت کا وہ حصہ ہوتا ہے جو زمین پر بیٹھا ہوتا ہے اور باقی ساری عمارت اس پر کھڑی ہوتی ہے‘

آیت میں "رفع القواعد" یعنی بنیادیں کھڑی کرنے کے الفاظ اصل عمارت کھڑی کرنے کے لیے مجازی طور پر

استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ ''عمارت'' کھڑی کرنے کے لیے بنیادوں کا کھڑا کرنا ضروری ہوتا ہے اس لیے بنیادوں کو کھڑا کرنے سے مراد اصل عمارت کو کھڑا کرنا ہی لیا جاتا ہے۔ اس طرح عمارت کے ایک حصہ (بنیادوں) کے کھڑا کرنے کو پوری عمارت کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اس طرح کی نسبت کو ''مجاز'' کہا جاتا ہے' خداوند عالم نے بھی اس آیت میں ''من البیت'' کہہ کر اسی ''مجازی استعمال'' کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔

ابراہیمؑ واسماعیلؑ کی مشترکہ دعا

○ ''رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ''

(اے ہمارے پروردگار! ہمارا یہ عمل قبول فرما' کہ تو ہی ہر بات سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے)۔

یہ آیت مبارکہ حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ کی دعا کے اصل الفاظ ہیں جو انہوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت کی' اور اس جملہ میں لفظ 'قول' وغیرہ کے فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ اس دعا سے پہلے جملہ کی تکمیلی صورت میں یہ فرض کریں گے کہ ''انہوں نے کہا'' بلکہ اس کے بغیر بھی جملہ میں کلام کا حسن اپنی مخصوص کیفیت کے ساتھ موجود ہے' تاہم اس کا معنی یہ ہے کہ جب انہوں نے بیت اللہ کی بنیادیں کھڑی کر لیں تو کہا اے ہمارے پروردگار! ہمارا یہ عمل قبول فرما تو ہی ہر بات سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے' اور یہ واضح ہے کہ انہوں نے یہ دعا اس حال میں کی جب وہ بیت اللہ کی تعمیر کے عمل میں مصروف تھے اور وہ اس حال میں اپنے پروردگار کے حضور اس طرح متوجہ تھے کہ گویا وہ اپنے روبرو اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ وہ ان کے کام پر نظر جمائے ہوئے ہے اور ان کی بات سن رہا ہے لہٰذا اسی حال میں انہوں نے یہ دعا کی اور براہ راست اپنی تمنا کا اظہار کیا جسے قرآن نے بعینہٖ ذکر کر دیا' اس طرح کا خوبصورت ترین انداز بیان قرآن مجید میں بہت سے مقامات میں موجود ہے بلکہ قرآن اپنے ہر انداز و جہت میں خوبصورتی کا حامل ہے' اور اس طرح کے خوبصورت ترین انداز بیان سے پورے واقعہ کی تصویر مکمل طور پر سامنے آ جاتی ہے جبکہ (''انہوں نے کہا'') جیسے الفاظ کے فرض کرنے سے کلام میں مطلوبہ لطافت نہیں پائی جاتی۔

اور یہاں یہ امر بھی لطافت سے خالی نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اپنی دعا میں یہ کہا: پروردگارا! ہم سے قبول فرما! اور یہ ذکر نہیں کیا کہ ''کیا'' قبول فرما' یعنی جس چیز کی قبولیت کی دعا مانگی یعنی بیت اللہ کی تعمیر کا عمل، اسے لفظوں میں ذکر نہیں کیا' تو یہ بھی کمال عبودیت و بندگی کے اظہار کی ایک صورت ہے اور قادر مطلق ذات کے سامنے اپنے عمل کے ناچیز ہونے کے اعتراف کی ایک شکل ہے حالانکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارا یہ ناچیز عمل ہم سے قبول فرمالے' کہ تو ہی دعاؤں کا سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے' یعنی جو کچھ ہم اپنی زبان پر لا رہے ہیں تو اسے بھی سن رہا ہے اور جو کچھ ہمارے دلوں میں پوشیدہ ہے تو اس سے بھی آگاہ ہے۔

اسلام اور کمال بندگی کی دعا

"رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ"

(پروردگارا! ہمیں اپنا مسلمان قرار دے اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو مسلمان بنا)۔

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی اپنے لیے اور اپنی ذریت کے لئے "اسلام" کی دعا مذکور ہے' اور یقیناً اس سے مراد اسلام کا وہ معنی نہیں جو عام طور پر ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں اسلام کا معنی زبان سے مسلمان ہونے کا اظہار اور ظاہر میں اس کے احکام پر عمل پیرا ہونا ہی کیا جاتا ہے خواہ دل میں پختہ یقین وایمان ہو یا نہ ہو جبکہ یہ معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بابت قابل تصور ہی نہیں کیونکہ جب انہوں نے یہ دعا کی تو وہ نبی بھی تھے اور رسول بھی' بلکہ پانچ اولوالعزم انبیاء میں سے ایک تھے اور ایک مقدس آئین کے حامل بھی' تو ان کی بابت یہ بات کیونکر تصور کی جاسکتی ہے کہ وہ ابھی عبودیت کی پہلی منزل یعنی اسلام کے عام معنی کے حامل مرحلہ تک بھی نہ پہنچے تھے اور اسی طرح ان کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیلؑ کے بارے میں بھی یہ بات قابل تصور نہیں کیونکہ وہ بھی رسالت کے عہدہ پر فائز ہو چکے تھے اور "ذبیح اللہ" ہونے کا اعزاز بھی پا چکے تھے' اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس مرحلہ تک تو پہنچ چکے تھے لیکن خود اس سے آگاہ نہ تھے اس لیے انہوں نے اس کے حصول کے لیے دعا کی' اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس مرحلہ تک پہنچ چکے تھے اور اس سے آگاہ بھی تھے لیکن اس پر قائم رہنے کی دعا مانگ رہے تھے' یہ تمام باتیں ابراہیمؑ واسماعیلؑ جیسی جلیل القدر اور عظیم المرتبت ہستیوں کی بابت کسی طرح بھی قابل تصور نہیں' کیونکہ وہ اپنی ان تمام فضیلتوں کے ساتھ بیت اللہ کی تعمیر جیسے مقدس ترین عمل کے وقت دعا مانگ رہے تھے اور وہ اچھی طرح اس بات سے آگاہ بھی تھے کہ جس عظیم ذات کے حضور اپنی تمنا کا اظہار کر رہے ہیں وہ کس قدر فیاض وکریم ہے اور اس کی قدرت ورحمت کس قدر وسیع ہے' اور دعا بھی ایسی چیز کی مانگ رہے ہیں جو انسان کے اختیاری امور میں سے ہے یعنی اسلام' کیونکہ اسلام ان اختیاری امور میں سے ایک ہے جس میں امر ونہی پایا جاتا ہے......

اسلام خداوند عالم کی طرف سے صادر ہونے والے احکامات (امر ونہی) کا مجموعہ ہے اور اس میں انسان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جبر نہیں کیا گیا بلکہ اسے اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ اللہ کے فرامین واحکامات پر عمل کرے تو اسے جزا ورنہ سزا دی جائے گی اب اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جزاء کا راستہ اختیار کرے یا سزا کا......، اسلام کے "اختیاری امور" میں سے ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں فرمایا:

سورہء بقرہ، آیت ۱۳۱:

"إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"

(جب اسے اس کے پروردگار نے کہا کہ تو اسلام لے آ' تو اس نے کہا میں اسلام لاتا ہوں کائنات کے پروردگار پر)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام لانا اختیاری افعال میں سے ایک ہے لہٰذا کسی اختیاری فعل کی دعا مانگنا معقول نہیں ،اس لیے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ یہاں مجازی طور پر ''اسلام'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد اس کا وہ معنی نہیں جو عام طور پر ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے بلکہ اس سے بالاتر ایک ایسی حقیقت مراد ہے جس کا عطا کرنا ذات کردگار کے ہاتھ میں ہے نہ کہ انسان کے اپنے اختیار میں' کیونکہ اسلام کے کئی مراتب و مدارج ہیں اور جو آیت ابھی ہم نے ذکر کی ہے یعنی ''اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ...'' (سورہ بقرہ ۱۳۱) اس میں خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ اسلام لائیں' حالانکہ وہ یقیناً مسلمان تھے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''اسلام'' کے مراتب و مدارج ہیں اور جس اسلام کا حکم خداوند عالم نے دیا وہ اس اسلام کے علاوہ تھا جو ابراہیمؑ رکھتے تھے' اس طرح کی مثالیں قرآن مجید میں کثرت سے موجود ہیں جن سے اسلام کے گوناگوں مراتب و مدارج کے حامل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

بہرحال ان ''اسلام'' سے مراد...... جیسا کہ بعد میں اس کی تفسیر و وضاحت کی جائے گی...... کمال بندگی اور اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کر دینا...... اس کے حضور سر تسلیم خم کر دینا...... ہے' یعنی جو کچھ بندے کے پاس اور اس کے دائرہ اختیار میں ہے وہ سب اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش کر کے اپنے مکمل ''عبد'' ہونے کا ثبوت دے' ایسا کرنا اگرچہ انسان کے اختیاری افعال میں سے ہے اور اس کا انجام پذیر ہونا اس کے متعلقہ بنیادی مراحل طے کرنے سے ممکن ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود تجربہ اس امر کا گواہ ہے کہ ایک عام انسان کے لیے ایسا کرنا غیر اختیاری امر ہے یعنی اس کے بس کا روگ نہیں اور وہ اپنے عام قلبی جذبات و احساسات و صلاحیتوں کی بنیاد پر ایسا نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لیے غیر معمولی صلاحیتیں اور کٹھن ترین مراحل طے کرنا ضروری ہے جو کہ عام انسان کے لیے ممکن نہیں جیسا کہ مقام ولایت اور اس جیسے بلند و عظیم مراتب اور کمالات عالیہ کے حصول کا معاملہ ہے کہ وہ بھی عام بلکہ متوسط الحال انسان کی دسترس سے بالاتر ہے اور وہ اپنی تمام تر کوششوں توانائیوں کے باوجود ان عظیم مراتب کو حاصل نہیں کر سکتا' اسی وجہ سے اسے ایک خدائی عطیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو صرف خدا کی طرف سے حاصل ہوتا ہے اور انسان از خود اس کو نہیں پا سکتا بلکہ خدا کے حضور اس کے حصول کی التجا کرتا ہے اور عاجزانہ طور پر اس کی بارگاہ میں دست سوال دراز کرتا ہے کہ وہ اپنی خاص عنایات کے طفیل اسے اس عظیم مقام و مرتبہ سے نوازے بنابرایں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے جس اسلام کی التجا بارگاہ الٰہی میں کی وہ خداوند عالم کی خاص عنایت سے حاصل ہونے والے مقام...... کمال بندگی...... کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

ایک علمی نکتہ کا اشارہ

اس مقام پر ایک اہم اور نہایت باریک علمی نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ جن چیزوں کی نسبت انسان کی طرف دی جاتی ہے اور انہیں انسان کے دائرہ اختیار میں قرار دیا جاتا ہے وہ اس کے افعال ہیں لیکن جہاں تک اس میں پائی جانے والی صفات اور صلاحیتوں کا تعلق ہے کہ جو افعال کے بار بار انجام دینے سے حاصل ہوتی ہیں وہ اس کے دائرہ اختیار میں نہیں او

حقیقی طور پر اس کے دست ''اختیار'' کی رسائی سے بالاتر ہیں، لہٰذا یہ کہنا درست و بجا بلکہ لازم و ضروری ہوگا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے اور ان کا حصول، ذات کردگار کی خاص عنایتوں کا مرہون منت قرار دیا جائے خاص طور پر جب وہ صفات حسنات و خیرات یعنی نیکیوں اور خوبیوں میں سے ہوں کہ جن کی نسبت خداوند عالم کی طرف دینا انسان کی طرف انہیں منسوب کرنے سے یقیناً بہتر ہے، اور قرآنی اسلوب سخن اور اظہار کے مخصوص لب ولہجہ سے بھی اسکی تائید ملتی ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ ابراہیم، آیت ۴۰:

★ ''رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ'' ...،

(اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا قرار دے اور میری اولاد کو بھی)۔

سورہ شعراء، آیت ۸۳:

★ ''وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ'' ...،

(اور مجھے نیک و صالح افراد کے ساتھ ملحق کردے)۔

سورہ نمل، آیت ۱۹:

★ ''رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ'' ...

(پروردگارا! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت پر جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی شکر ادا کروں اور میں ایسا نیک عمل بجالاؤں جس سے تو راضی ہو)۔

★ ''رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ ...''

(اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنا مسلمان بنادے......)

مذکورہ بالا بیانات اور شواہد کے ذکر کے بعد یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ زیر بحث آیت میں ''اسلام'' سے اس کا وہ معنی مراد نہیں جس کا ذکر درج ذیل آیت میں ہوا ہے۔

سورہ حجرات، آیت ۱۴:

★ ''قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ'' ...،

(اعراب نے کہا ہم ایمان لے آئے ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ تم یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، اور ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا)۔

اس آیت میں ''اسلام'' کے بمقابل ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور زیر بحث آیت میں ''اسلام'' سے مراد اس سے بالاتر اور بلند تر معنی ہے، انشاء اللہ عنقریب اس سلسلے میں مزید وضاحت پیش کی جائے گی۔

اعمال کے مشاہدہ وتوبہ کی دعا

O" وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ "

(اور ہمیں ہمارے اعمال (آداب عبادت) سے آگاہ فرما' اور ہماری توبہ قبول فرما کہ تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے)

''اسلام'' کا جو ارفع واعلیٰ معنی ہم نے ذکر کیا ہے اس کی تائید وتصدیق اس جملہ سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں لفظ ''مناسک'' استعمال کیا گیا ہے جو کہ ''منسک'' کی جمع کا صیغہ ہے' اور ''منسک'' کا معنی ''عبادت'' ہے' جیسا کہ درج ذیل آیت میں اس کا حوالہ موجود ہے:

سورہء حج، آیت ۳۴:

★ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا "....

(اور ہم نے ہر امت کے لیے عبادت کے مخصوص اعمال مقرر کئے)۔

اس میں ''منسک'' عبادتی عمل کے لیے ذکر کیا گیا ہے جس کی نسبت خدا کی طرف ہے (جعلنا، ہم نے قرار دیا/ مقرر کیا)۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''منسك'' سے مراد وہ عمل ہو جو بطور عبادت انجام دیا گیا ہو' اور ''مناسکنا'' میں مصدر کو ضمیر جمع متکلم (نا) کی طرف مضاف کر کے ذکر کیا گیا ہے جس سے ان اعمال کے وقوع پذیر ہونے کا ثبوت ملتا ہے..... کیونکہ اس طرح کی اضافت سے واقع شدہ عمل کا ذکر مقصود ہوتا ہے.... لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ ''مناسکنا'' سے مراد ان کے وہ اعمال جو انہوں نے عبادت کے طور پر انجام دیئے ہیں نہ کہ وہ اعمال وافعال جن کے انجام دینے کا انہیں حکم دیا گیا' بنا بر ایں آیت کا معنی یوں کیا جائے گا: پروردگارا! ہم نے جو اعمال انجام دیئے ہیں وہ ہمیں دکھا' اور یہاں ''ارنا'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہمیں ان کی تعلیم دے یا توفیق دے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو اعمال ہم نے انجام دیئے ہیں ان کی ''حقیقت'' کا جلوہ دکھا' اور ہم اس سلسلے میں سورہ انبیاء کی آیت ۷۳ کے حوالہ سے اشارہ کر چکے ہیں جس میں ارشاد الٰہی ہے:

★ "وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ "۔

(اور ہم نے ان کی طرف وحی کی نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوۃ ادا کرنے کی)

اس کی مزید وضاحت مربوطہ مقام پر کی جائے گی کہ یہاں ''وحی'' سے مراد نیک کام انجام دینے کی تعلیم دینا نہیں بلکہ اس سے مراد بھرپور اور حقیقی معنے میں ... تائید ہے' اور شاید اسی بات کا اشارہ درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے:

سورہ ص، آیت ۴۶:

★ "وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ"۔۔۔،

(یاد کرو ہمارے بندوں ابراہیمؑ واسحاقؑ ویعقوبؑ کو، کہ جو قوت وبصیرت والے تھے کہ ہم نے آخرت کے ابدی ٹھکانے کی یاد اپنی خاص نعمت کے طور پر انہیں عطا کی)۔

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں "اسلام" اور "عبادت میں بصیرت" سے ان کا عام معروف ومشہور معنی مراد نہیں اور یہی حال "وَتُبْ عَلَيْنَا" (اور ہماری توبہ قبول فرما) میں "توبہ" کے معنی کا ہے کہ اس سے بھی اس کا عام مشہور ومعروف معنی مراد نہیں کیونکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے جب یہ دعا کی تو اس وقت وہ دونوں نبوت وعصمت کے حامل تھے اور ہر نبی خداوند عالم کی طرف سے عطا کی جانے والی "عصمت" کی وجہ سے گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ دونوں نبی ومعصوم اپنے کسی گناہ کی توبہ کے طور پر یہ کہیں کہ "ہماری توبہ قبول فرما"! یہ تو ہم ہیں کہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کی بخشش کے لیے خدا کے حضور "توبہ" کر کے اس کی قبولیت کی دعا مانگتے ہیں، لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس مقام پر "توبہ" سے اس کا عام مشہور معنی مراد نہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر یہ سوال ممکن ہے کہ آپ نے "اسلام"، "اعمال کا دکھانا" اور "توبہ" کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ ان کے عام مشہور ومعروف معانی مراد نہیں بلکہ ان سے بالاتر معانی مراد ہیں تو یہ بات حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ کی بابت صحیح ہے اور ان کے بلند وعالی مقام ومنزلت سے مطابقت بھی رکھتی ہے لیکن ان کی ذرّیت واولاد کے لیے بھی وہی معانی مراد لیے جائیں یہ ضروری نہیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیلؑ نے اپنے لیے دعا مانگنے کے بعد علیٰحدہ جملے میں اپنی ذرّیت واولاد کے لیے "اسلام" کی دعا کی اور یوں کہا: "وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ" (اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو اپنا مسلمان بنا) جبکہ اس سے پہلے اپنے لیے یوں کہا: "وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ" (اور ہمیں اپنا مسلمان بنا)، اگر اپنے اور اپنی ذرّیت واولاد کے لیے جس "اسلام" کی دعا مانگی وہ ایک ہی جیسا ہوتا تو اس طرح کہتے: **"واجعلنا ومن ذریتنا مسلمین"** (ہمیں اور ہماری ذریت واولاد کو مسلمان بنا)۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہاں "اسلام" سے اس کا وسیع معنی مراد ہے کہ جو اپنے تمام مراتب ومدارج کا حامل ہے اور ان مراتب میں سے ایک "ظاہری طور پر اسلام لانا" بھی ہے کیونکہ وہ بھی (ظاہری اسلام) اپنے مقام پر کئی خصوصیات وآثار رکھتا ہے اور انسانی معاشرے میں اسے مخصوص حیثیت حاصل ہے اور عین ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے انہی خصوصیات وآثار کے پیش نظر خدا کے حضور اس کی تمنا کی ہو اور اپنی

اسلام اور کمال بندگی کی دعا

"رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ"

(پروردگارا! ہمیں اپنا مسلمان قرار دے اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو مسلمان بنا)۔

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی اپنے لیے اور اپنی ذریت کے لئے "اسلام" کی دعا مذکور ہے' اور یقیناً اس سے مراد اسلام کا وہ معنی نہیں جو عام طور پر ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں اسلام کا معنی زبان سے مسلمان ہونے کا اظہار اور ظاہر میں اس کے احکام پر عمل پیرا ہونا ہی کیا جاتا ہے خواہ دل میں پختہ یقین وایمان ہو یا نہ ہو جبکہ یہ معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بابت قابل تصور ہی نہیں کیونکہ جب انہوں نے یہ دعا کی تو وہ نبی بھی تھے اور رسول بھی' بلکہ پانچ اولوالعزم انبیاء میں سے ایک تھے اور ایک مقدس آئین کے حامل بھی' تو ان کی بابت یہ بات کیونکر تصور کی جاسکتی ہے کہ وہ ابھی عبودیت کی پہلی منزل یعنی اسلام کے عام معنی کے حامل مرحلہ تک بھی نہ پہنچے تھے اور اسی طرح ان کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیلؑ کے بارے میں بھی یہ بات قابل تصور نہیں کیونکہ وہ بھی رسالت کے عہدہ پر فائز ہو چکے تھے اور "ذبیح اللہ" ہونے کا اعزاز بھی پا چکے تھے' اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس مرحلہ تک تو پہنچ چکے تھے لیکن خود اس سے آگاہ نہ تھے اس لیے انہوں نے اس کے حصول کے لیے دعا کی' اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس مرحلہ تک پہنچ چکے تھے اور اس سے آگاہ بھی تھے لیکن اس پر قائم رہنے کی دعا مانگ رہے تھے' یہ تمام باتیں ابراہیمؑ واسماعیلؑ جیسی جلیل القدر اور عظیم المرتبت ہستیوں کی بابت کسی طرح بھی قابل تصور نہیں' کیونکہ وہ اپنی ان تمام فضیلتوں کے ساتھ بیت اللہ کی تعمیر جیسے مقدس ترین عمل کے وقت دعا مانگ رہے تھے اور وہ اچھی طرح اس بات سے آگاہ بھی تھے کہ جس عظیم ذات کے حضور اپنی تمنا کا اظہار کر رہے ہیں وہ کس قدر فیاض وکریم ہے اور اس کی قدرت ورحمت کس قدر وسیع ہے' اور دعا بھی ایسی چیز کی مانگ رہے ہیں جو انسان کے اختیاری امور میں سے ہے یعنی اسلام' کیونکہ اسلام ان اختیاری امور میں سے ایک ہے جس میں امر ونہی پایا جاتا ہے...... اسلام خداوند عالم کی طرف سے صادر ہونے والے احکامات (امر ونہی) کا مجموعہ ہے اور اس میں انسان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جبر نہیں کیا گیا بلکہ اسے اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ اللہ کے فرامین واحکامات پر عمل کرے تو اسے جزا ورنہ سزا دی جائے گی اب اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جزاء کا راستہ اختیار کرے یا سزا کا......، اسلام کے "اختیاری امور" میں سے ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں فرمایا:

سورہء بقرہ، آیت ۱۳۱:

"إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ"

(جب اسے اس کے پروردگار نے کہا کہ تو اسلام لے آ' تو اس نے کہا میں اسلام لاتا ہوں کائنات کے پروردگار پر)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام لانا اختیاری افعال میں سے ایک ہے لہٰذا کسی اختیاری فعل کی دعا مانگنا معقول نہیں، اس لیے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ یہاں مجازی طور پر "اسلام" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد اس کا وہ معنی نہیں جو عام طور پر ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے بلکہ اس سے بالاتر ایک ایسی حقیقت مراد ہے جس کا عطا کرنا ذات کردگار کے ہاتھ میں ہے نہ کہ انسان کے اپنے اختیار میں' کیونکہ اسلام کے کئی مراتب ومدارج ہیں اور جو آیت ابھی ہم نے ذکر کی ہے یعنی "اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ . . ." (سورہ بقرہ ۱۳۱) اس میں خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ اسلام لائیں' حالانکہ وہ یقیناً مسلمان تھے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "اسلام" کے مراتب ومدارج ہیں اور جس اسلام کا حکم خداوند عالم نے دیا وہ اس اسلام کے علاوہ تھا جو ابراہیمؑ رکھتے تھے' اس طرح کی مثالیں قرآن مجید میں کثرت سے موجود ہیں جن سے اسلام کے گوناگوں مراتب ومدارج کے حامل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

بہرحال اس "اسلام" سے مراد...... جیسا کہ بعد میں اس کی تفسیر ووضاحت کی جائے گی...... کمال بندگی اور اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کر دینا...... اس کے حضور سر تسلیم خم کر دینا...... ہے' یعنی جو کچھ بندے کے پاس اور اس کے دائرہ اختیار میں ہے وہ سب اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش کر کے اپنے مکمل "عبد" ہونے کا ثبوت دے' ایسا کرنا اگرچہ انسان کے اختیاری افعال میں سے ہے اور اس کا انجام پذیر ہونا اس کے متعلقہ بنیادی مراحل طے کرنے سے ممکن ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود تجربہ اس امر کا گواہ ہے کہ ایک عام انسان کے لیے ایسا کرنا غیر اختیاری امر ہے یعنی اس کے بس کا روگ نہیں اور وہ اپنے عام قلبی جذبات واحساسات وصلاحیتوں کی بنیاد پر ایسا نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لیے غیر معمولی صلاحیتیں اور کٹھن ترین مراحل طے کرنا ضروری ہے جو کہ عام انسان کے لیے ممکن نہیں جیسا کہ مقام ولایت اور اس جیسے بلند وعظیم مراتب اور کمالات عالیہ کے حصول کا معاملہ ہے کہ وہ بھی عام بلکہ متوسط الحال انسان کی دسترس سے بالاتر ہے اور وہ اپنی تمام تر کوششوں و توانائیوں کے باوجود ان عظیم مراتب کو حاصل نہیں کر سکتا' اسی وجہ سے اسے ایک خدائی عطیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو صرف خدا کی طرف سے حاصل ہوتا ہے اور انسان از خود اس کو نہیں پا سکتا بلکہ خدا کے حضور اس کے حصول کی التجا کرتا ہے اور عاجزانہ طور پر اس کی بارگاہ میں دست سوال دراز کرتا ہے کہ وہ اپنی خاص عنایات کے طفیل اسے اس عظیم مقام ومرتبہ سے نوازے بنابرایں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے جس اسلام کی التجا بارگاہ الٰہی میں کی وہ خداوند عالم کی خاص عنایت سے حاصل ہونے والے مقام...... کمال بندگی...... کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

ایک علمی نکتہ کا اشارہ

اس مقام پر ایک اہم اور نہایت باریک علمی نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ جن چیزوں کی نسبت انسان کی طرف دی جاتی ہے اور انہیں انسان کے دائرہ اختیار میں قرار دیا جاتا ہے وہ اس کے افعال ہیں لیکن جہاں تک اس میں پائی جانے والی صفات اور صلاحیتوں کا تعلق ہے کہ جو افعال کے بار بار انجام دینے سے حاصل ہوتی ہیں وہ اس کے دائرہ اختیار میں نہیں اور

حقیقی طور پر اس کے دست "اختیار" کی رسائی سے بالاتر ہیں، لہٰذا یہ کہنا درست و بجا بلکہ لازم و ضروری ہوگا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے اور ان کا حصول، ذات کردگار کی خاص عنایتوں کا مرہون منت قرار دیا جائے خاص طور پر جب وہ صفات حسنات و خیرات یعنی نیکیوں اور خوبیوں میں سے ہوں کہ جن کی نسبت خداوند عالم کی طرف دینا انسان کی طرف انہیں منسوب کرنے سے یقیناً بہتر ہے، اور قرآنی اسلوب سخن اور اظہار کے مخصوص لب و لہجہ سے بھی اسکی تائید ملتی ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ ابراہیم، آیت ۴۰:

★ "رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي" ...،

(اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا قرار دے اور میری اولاد کو بھی)۔

سورہ شعراء، آیت ۸۳:

★ "وَّ اَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِيْنَ" ...،

(اور مجھے نیک و صالح افراد کے ساتھ ملحق کر دے)۔

سورہ نمل، آیت ۱۹:

★ "رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ" ...

(پروردگارا! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت پر جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی شکر ادا کروں اور میں ایسا نیک عمل بجالاؤں جس سے تو راضی ہو)۔

★ "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ" ...

(اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنا مسلمان بنادے......)

مذکورہ بالا بیانات اور شواہد کے ذکر کے بعد یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ زیر بحث آیت میں "اسلام" سے اس کا وہ معنی مراد نہیں جس کا ذکر درج ذیل آیت میں ہوا ہے۔

سورہ حجرات، آیت ۱۴:

★ "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" ...،

(اعراب نے کہا ہم ایمان لے آئے ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ تم یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، اور ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا)۔

اس آیت میں "اسلام" کے بمقابل ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور زیر بحث آیت میں "اسلام" سے مراد اس سے بالاتر اور بلند تر معنی ہے، انشاء اللہ عنقریب اس سلسلے میں مزید وضاحت پیش کی جائے گی۔

اعمال کے مشاہدہ وتوبہ کی دعا

○ ''وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ''

(اور ہمیں ہمارے اعمال (آداب عبادت) سے آگاہ فرما' اور ہماری توبہ قبول فرما کہ تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے)

''اسلام'' کا جو ارفع و اعلیٰ معنی ہم نے ذکر کیا ہے اس کی تائید وتصدیق اس جملہ سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں لفظ ''مناسک'' استعمال کیا گیا ہے جو کہ ''منسک'' کی جمع کا صیغہ ہے' اور ''منسک'' کا معنی ''عبادت'' ہے' جیسا کہ درج ذیل آیت میں اس کا حوالہ موجود ہے:

سورہء حج، آیت ۳۴:

★ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا ''....،

(اور ہم نے ہر امت کے لیے عبادت کے مخصوص اعمال مقرر کئے)۔

اس میں ''منسک'' عبادتی عمل کے لیے ذکر کیا گیا ہے جس کی نسبت خدا کی طرف ہے (جعلنا، ہم نے قرار دیا/ مقرر کیا)۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''منسك'' سے مراد وہ عمل ہو جو بطور عبادت انجام دیا گیا ہو' اور ''مناسکنا'' میں مصدر کو ضمیر جمع متکلم (نا) کی طرف مضاف کر کے ذکر کیا گیا ہے جس سے ان اعمال کے وقوع پذیر ہونے کا ثبوت ملتا ہے..... کیونکہ اس طرح کی اضافت سے واقع شدہ عمل کا ذکر مقصود ہوتا ہے.....' لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ ''مناسکنا'' سے مراد ان کے وہ اعمال جو انہوں نے عبادت کے طور پر انجام دیئے ہیں نہ کہ وہ اعمال وافعال جن کے انجام دینے کا انہیں حکم دیا گیا' بنا برایں آیت کا معنی یوں کیا جائے گا: پروردگارا! ہم نے جو اعمال انجام دیئے ہیں وہ ہمیں دکھا' اور یہاں ''ارنا'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہمیں ان کی تعلیم دے یا توفیق دے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو اعمال ہم نے انجام دیئے ہیں ان کی ''حقیقت'' کا جلوہ دکھا' اور ہم اس سلسلے میں سورہ انبیاء کی آیت ۷۳ کے حوالہ سے اشارہ کر چکے ہیں جس میں ارشاد الٰہی ہے:

★ ''وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ''۔

(اور ہم نے ان کی طرف وحی کی نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوۃ ادا کرنے کی)

اس کی مزید وضاحت مربوطہ مقام پر کی جائے گی کہ یہاں ''وحی'' سے مراد نیک کام انجام دینے کی تعلیم دینا نہیں بلکہ اس سے مراد بھرپور.....اور حقیقی معنے میں ..... تائید ہے' اور شاید اسی بات کا اشارہ درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے:

سورہ ص، آیت ۴۶:

★ " وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ اُولِی الْاَیْدِیْ وَ الْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ " ...،

(یاد کرو ہمارے بندوں ابراہیمؑ واسحاقؑ و یعقوبؑ کو، کہ جو قوت وبصیرت والے تھے کہ ہم نے آخرت کے ابدی ٹھکانے کی یاد اپنی خاص نعمت کے طور پر انہیں عطا کی)۔

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں "اسلام" اور "عبادت میں بصیرت" سے ان کا عام معروف ومشہور معنی مراد نہیں، اور یہی حال " وَ تُبْ عَلَیْنَا " (اور ہماری توبہ قبول فرما) میں "توبہ" کے معنی کا ہے کہ اس سے بھی اس کا عام مشہور ومعروف معنی مراد نہیں کیونکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے جب یہ دعا کی تو اس وقت وہ دونوں نبوت وعصمت کے حامل تھے اور ہر نبی خداوند عالم کی طرف سے عطا کی جانے والی "عصمت" کی وجہ سے گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ دونوں نبی ومعصوم اپنے کسی گناہ کی توبہ کے طور پر یہ کہیں کہ "ہماری توبہ قبول فرما"! یہ تو ہم ہیں کہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کی بخشش کے لیے خدا کے حضور "توبہ" کرکے اس کی قبولیت کی دعا مانگتے ہیں، لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس مقام پر "توبہ" سے اس کا عام مشہور معنی مراد نہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر یہ سوال ممکن ہے کہ آپ نے "اسلام"، "اعمال کا دکھانا" اور "توبہ" کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ ان کے عام مشہور ومعروف معانی مراد نہیں بلکہ ان سے بالاتر معانی مراد ہیں تو یہ بات حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ کی بابت صحیح ہے اور ان کے بلند وعالی مقام ومنزلت سے مطابقت بھی رکھتی ہے لیکن ان کی ذرّیت واولاد کے لیے بھی وہی معانی مراد لیے جائیں یہ ضروری نہیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیلؑ نے اپنے لیے دعا مانگنے کے بعد علیحدہ جملے میں اپنی ذرّیت واولاد کے لیے "اسلام" کی دعا کی اور یوں کہا: " وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ " (اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو اپنا مسلمان بنا) جبکہ اس سے پہلے اپنے لیے یوں کہا: " وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ " (اور ہمیں اپنا مسلمان بنا)، اگر اپنے اور اپنی ذرّیت واولاد کے لیے جس "اسلام" کی دعا مانگی وہ ایک ہی جیسا ہوتا تو اس طرح کہتے: **"واجعلنا ومن ذریتنا مسلمین"** (ہمیں اور ہماری ذریت واولاد کو مسلمان بنا)۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہاں "اسلام" سے اس کا وسیع معنی مراد ہے کہ جو اپنے تمام مراتب ومدارج کا حامل ہے اور ان مراتب میں سے ایک "ظاہری طور پر اسلام لانا" بھی ہے کیونکہ وہ بھی (ظاہری اسلام) اپنے مقام پر کئی خصوصیات وآثار رکھتا ہے اور انسانی معاشرے میں اسے مخصوص حیثیت حاصل ہے اور عین ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے انہی خصوصیات وآثار کے پیش نظر خدا کے حضور اس کی تمنا کی ہو اور اپنی

اولاد کے لیے اس کی آرزو کی ہو جیسا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسے (ظاہری اسلام لانے کو) اہمیت کی نظر سے دیکھا اور اسے کئی امور کے لیے کافی سمجھا مثلاً شہادتین (توحید ونبوت کے اقرار) کی بنیاد پر جان ومال کے محفوظ رہنے، شادی کرنے اور وراثت پانے کے احکامات صادر فرمائے یعنی زبان سے توحید ونبوت کا اقرار کرنے والے کو یہ تمام خصوصیات حاصل ہو جاتی تھیں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں اس کی جان محفوظ ہو اور اسے مسلمان عورت سے شادی کرنے کا حق اور وراثت پانے کا حق مل جاتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر اسلام لانے اور زبان سے شہادتین ادا کرنے کے مخصوص فوائد ونتائج ہیں،

بنابراین یہ بات درست قرار دی جاسکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لیے جو الفاظ استعمال کئے یعنی "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ" (پروردگارا! ہمیں اپنا مسلمان قرار دے) اس میں "اسلام" سے مراد اس کا وہ معنی ہے جو ان کے (ابراہیمؑ واسماعیلؑ کے) شایان شان ہے اور جو الفاظ انہوں نے اپنی ذرّیت واولاد کے لیے استعمال کئے یعنی "وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ" (اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو اپنا مسلمان بنا) ان میں "اسلام" سے اس کا وہ عام معنی مراد ہے جو "امت" کے شایان شان ہے کہ جس میں منافق ومومن، کمزور ایمان وعقیدہ رکھنے والے اور مضبوط اعتقاد والے سب شامل ہیں اور سب کو "مسلمان" کہا جاسکتا ہے۔

جواب:

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ "حکم" اور "دعا" کی الگ الگ حیثیتیں ہیں اور وہ دونوں مختلف آثار کے حامل ہیں لہٰذا ان میں سے کسی ایک کا دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ بنابراین حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی سے "ظاہری اسلام کو قبول کر لینا "حکم" کے باب سے ہے نہ کہ دعا کے باب سے، یعنی شریعت محمدیہؐ میں کسی شخص کا شہادتین ادا کرنا (توحید و نبوت کا زبان سے اقرار کرنا) اس کے "مسلمان" ہونے کے لیے اس لیے کافی ہے تاکہ معاشرے میں دین خدا کی پاکیزہ خوشبو پھیل جائے اور اس کی عظمت کا چراغ اپنی مقدس روشنی سے دنیائے انسانیت کے در و بام کو منور کر دے جس سے اس کے آئین ونظام حیات کے نفاذ واجراء کے لیے فضا سازگار ہو سکے اور اس کے سہارے اسلام کی اصل حقیقت کا تحفظ اور اسے ہر طرح کی سازشوں وآفتوں سے بچانا ممکن ہو۔

یہ تو ہے "حکم" اور دین کی قانونی خصوصیت، لیکن جہاں تک "دعا" کا تعلق ہے تو اس میں ظاہری خصوصیات وآثار کی بجائے اصل حقائق ملحوظ وحکم فرما ہوتے ہیں اور حقیقت الامر کا حصول مقصود ہوتا ہے اور حقیقی معنے میں خداوند عالم کی رضا و تقرب مطلوب ہوتا ہے اور اس میں کسی طرح کی ظاہرداری کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، اور انبیاءؑ کرام تو ویسے بھی ظاہرداری جیسے امور سے دور ومبرا ہیں اور انہیں ظاہری معیاروں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں بھی یہی کہا

جائے گا کہ انہیں اپنی ذرّیت واولاد کے لیے "ظاہرداری" کی حد تک اسلام کی دعا کرنے کی ہرگز ضرورت وخواہش نہ تھی ورنہ وہ اپنی اس خواہش کو اپنی ذرّیت واولاد میں پورا کرنے سے پہلے اپنے چچا (آذر) کے بارے میں پورا کرتے اوران سے اظہار برأت نہ کرتے اور جب انہیں معلوم ہوگیا کہ وہ خدا سے عداوت ودشمنی رکھتا ہے تو اس سے اظہار برائت کے طور پر اپنی دعا میں یوں نہ کہتے:

سورہ شعراء، آیت ۸۹:

"وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۸۸﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ" -

(اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جس دن لوگوں کو..... قبروں سے ..... اٹھا کر لایا جائے گا (قیامت کے دن)، وہ دن کہ جب مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد سوائے اس شخص کے کہ جو اپنے پروردگار کے حضور قلب سلیم (پاک وپاکیزہ دل) کے ساتھ حاضر ہوگا)۔

اور نہ ہی یہ دعا مانگتے کہ جس کا تذکرہ سورہ شعراء، آیت ۸۴ میں ان الفاظ میں ہوا:

"وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ"

(اور میرے لیے بعد میں آنے والوں میں سچی زبان قرار دے)

بلکہ اس طرح دعا کرتے: "واجعل لی لسان ذکر فی الآخرین" (اور میرے لیے بعد میں آنے والوں میں ذکر خیر قرار دے) لیکن انہوں نے "ذکر خیر" پر اکتفاء نہیں کی بلکہ "لسان صدق" کی دعا کی جس سے مراد حقیقی معنے میں نیک نامی ہے، اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توجہ قیامت کے دن حقیقی معنے میں نیک نامی کے حصول کی طرف تھی اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ انہوں نے ظاہری اسلام یا ظاہرداری کی حد تک اسلام لانے کی دعا...... اپنی ذریت واولاد کے لیے .. نہیں کی کیونکہ اس حد تک اسلام لانے میں نفاق ومنافقت کارفرما ہوتی ہے جو کہ قیامت کے دن کی خوفناک رسوائی کا سبب ہے۔

بنابرایں یہ بات ثابت ہوئی کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس اسلام کی دعا اپنی اولاد وذریت کے لیے کی وہ ظاہری اسلام...... ظاہرداری کی حد تک اسلام لانا...... نہیں تھا بلکہ حقیقی اسلام مقصود تھا اور انہیں حقیقت اسلام سے نوازنا مطلوب تھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کہا: "أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ"، اور اگر ظاہری اسلام اور نام کی حد تک مسلمان کہلانا مقصود ہوتا تو "لَّكَ" کا اضافہ نہ کرتے بلکہ یوں کہتے: "أُمَّةً مُّسْلِمَةً" لیکن انہوں نے "لَّكَ" کا اضافہ کرکے یہ ثابت کردیا کہ ان کی مراد ظاہری اسلام نہیں بلکہ حقیقی اسلام ہے جو ظاہر وباطن دونوں میں مکمل طور پر پایا جاتا ہے۔

بعثت نبوی ؐ کی دعا

O "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ"

(پروردگارا! ان میں ایک رسول کو انہیں میں سے مبعوث فرما)۔

یہ الفاظ حضرت ابراہیم ؑ کی حضرت پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں دعا پر مشتمل ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ ارشاد فرمایا کرتے تھے: انا دعوۃ ابراھیم ' میں ابراھیم ؑ کی دعا ہوں۔

روایات پر ایک نظر

حج سے متعلق ایک فقہی مسئلہ

کتاب کافی میں کنانی سے مروی ہے انہوں نے کہا میں نے حضرت ابوعبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ اگر کوئی شخص حج اور عمرہ کے طواف میں ان دو رکعتوں کو پڑھنا بھول جائے جو "مقام ابراہیمؑ" میں پڑھی جاتی ہیں تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ امام ؑ نے ارشاد فرمایا: اگر وہ ابھی تک مکہ شہر ہی میں ہو تو مقام ابراہیم ؑ میں آ کر دو رکعت نماز ادا کرے کیونکہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: "وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرٰهِمَ مُصَلًّى"، (اور تم مقام ابراہیم سے نماز کی جگہ بناؤ) اگر شہر مکہ سے کوچ کر چکا ہو تو میں اسے واپس لوٹنے کا حکم نہیں دیتا۔

مذکورہ بالا روایت سے مشابہ روایات کتاب "التہذیب" شیخ طوسیؒ اور تفسیر العیاشی میں متعدد اسناد کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں؛ اور "مقام ابراہیم ؑ" کے پاس یا اس کے پیچھے نماز ادا کرنے کے حکم کی "خصوصیت" کے بارے میں بعض روایات میں یوں ذکر ہوا ہے "لیس لاحد ان یصلی رکعتی الطواف الا خلف المقام" (کسی کو یہ حق حاصل نہیں (جائز نہیں) کہ وہ دو رکعت نماز طواف "مقام ابراہیم ؑ کے پیچھے" کے علاوہ کسی اور جگہ ادا کرے) اور اس خصوصیت کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں لفظ "من" اور لفظ "مصلی" ذکر ہوا ہے (وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرٰهِمَ مُصَلًّى)۔

بیت اللہ کی پاکیزگی کا معنی

تفسیر قمی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپ ؑ نے " اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ ... " (اور میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں کے لیے.....) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ "مشرکوں کو اس سے دور کر دو"۔

خانہء خدا میں داخل ہونے کی شرط

کتاب کافی میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے جس میں حضرت امام جعفر صادق ؑ نے ارشاد فرمایا کہ خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب میں ارشاد فرمایا ہے: "طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ" (میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں کے لیے اور اس کے مجاوروں ۔۔اعتکاف بیٹھنے والوں ۔۔اور اس میں رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے) لہٰذا کسی شخص کو اس وقت تک مکہ میں داخل نہیں ہونا چاہیے جب تک کہ وہ پاک و طاہر نہ ہو اور ہر طرح کی نجاست وغیرہ سے اپنے آپ کو پاک نہ کر لے۔

مذکورہ بالا روایت میں جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ کئی دیگر روایات میں بھی مذکور ہے' اس روایت میں خانہء کعبہ میں داخل ہونے والوں کے لیے پاک و پاکیزہ ہونے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ خانہء کعبہ پاک و پاکیزہ رہے۔اور یہ بات زیر بحث آیت کے ساتھ درج ذیل آیت کے ضمیمہ سے واضح طور پر ثابت و معلوم ہو سکتی ہے:

سورہء نور، آیت ۲۶:

"اَلطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ" ۔۔۔،

(پاک عورتیں، پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد، پاک عورتوں کے لیے ہیں)۔

داستان ابراہیمؑ کے تاریخی حوالے

تفسیر مجمع البیان میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسماعیلؑ اور ہاجرہؑ کو مکہ میں لائے اور وہ دونوں وہاں سکونت پذیر ہو گئے' کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد قبیلہ "جرہم" کے لوگ بھی وہاں آ کر آباد ہوئے' اس دوران حضرت اسماعیلؑ نے اس قبیلہ کی ایک خاتون سے شادی کی' پھر حضرت ہاجرہؑ کا انتقال ہو گیا' حضرت ابراہیمؑ نے ۔۔۔۔اسماعیلؑ سے ملاقات کرنے کے لیے۔۔۔۔۔جناب سارہ سے اجازت مانگی' حضرت سارہ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ وہ (ابراہیمؑ) اپنی سواری سے نیچے نہ اتریں' حضرت ابراہیمؑ مکہ تشریف لائے، حضرت ہاجرہؑ انتقال کر چکی تھیں لہٰذا آپؑ حضرت اسماعیلؑ کے گھر آئے اور ان کی زوجہ سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں وہ شکار کے لیے گئے ہوئے ہیں' کیونکہ حضرت اسماعیلؑ حدود حرم سے باہر نکل کر شکار کے لیے جایا کرتے تھے' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ آیا تمہارے پاس مہمان داری کے لیے کچھ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہ تو میرے پاس کچھ ہے اور نہ ہی کوئی آدمی میرے ہاں موجود ہے' حضرت ابراہیمؑ نے اس کا جواب سن کر فرمایا: جب تمہارا شوہر آئے تو اسے سلام کہنا اور اسے میرا پیغام دینا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو' حضرت ابراہیمؑ یہ کہہ کر وہاں سے چلے گئے' جب حضرت اسماعیلؑ گھر واپس آئے تو اپنے پدر بزرگوار کی خوشبو محسوس کی اور اپنی زوجہ سے پوچھا کہ آیا یہاں کوئی شخص

آ یا تھا؟ اس نے نہایت بے احترامی کے ساتھ کہا کہ ہاں! ایک بوڑھا آدمی آیا تھا' حضرت اسماعیلؑ نے پوچھا! تو انہوں نے تم سے کچھ کہا؟ اس نے جواب دیا: اس نے آپؑ کے لیے سلام کے بعد یہ پیغام دیا کہ ان سے کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو' حضرت اسماعیلؑ بات کو سمجھ گئے اور انہوں نے اسے طلاق دے کر ایک اور خاتون سے شادی کر لی' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ عرصہ کے بعد پھر اپنی زوجہ "سارہؑ" سے اجازت طلب کی تا کہ مکہ جا کر اسماعیلؑ سے ملاقات کریں' سارہؑ نے پہلے کی طرح اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ اپنی سواری سے نہ اتریں' حضرت ابراہیمؑ دوبارہ حضرت اسماعیلؑ کے گھر تشریف لائے اور دروازہ پر کھڑے ہو کر ان کی زوجہ سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ شکار کے لیے گئے ہوئے ہیں اور انشاء اللہ بہت جلد واپس آ جائیں گے' آپ آئیں اور تشریف رکھیں' حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا' آیا تمہارے پاس مہمان داری کے لیے کچھ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں' یہ کہہ کر وہ دودھ اور گوشت لے آئی اور ان کے سامنے حاضر کر دیا' حضرت ابراہیمؑ نے اس کے لیے خیر و برکت کی دعا کی' اگر وہ عورت اس دن روٹی یا جو یا کھجور لے آتی تو آج مکہ پوری دنیا میں گندم' جو اور کھجور کا سب سے بڑا مرکز ہوتا' بہر حال حضرت اسماعیلؑ کی زوجہ نے عرض کی کہ اے معزز مہمان! تشریف لائیے اور اپنی سواری سے اتریں تا کہ میں آپ کا سر دھو دوں' حضرت ابراہیمؑ سواری سے نہ اترے' وہ ان کے سر کو دھونے کے لیے "مقام" (مخصوص پتھر) لے آئی اور حضرت ابراہیمؑ نے اس پر اپنا پیر رکھا تو اس پر ان کے پاؤں کا نشان نقش ہو گیا' اس نے ابراہیمؑ کے سر مبارک کی دائیں جانب کو دھویا اور پھر "مقام" کو ان کے بائیں طرف رکھا اور ان کے سر مبارک کی بائیں جانب کو دھویا' تاہم اس پتھر پر حضرت ابراہیمؑ کے پاؤں کے نشان باقی رہ گئے' اس کے بعد ابراہیمؑ نے اس خاتون سے کہا کہ جب تمہارا شوہر آئے تو اسے ہمارا سلام کہنا اور اسے یہ پیغام دینا کہ تمہارے دروازہ کی چوکھٹ بالکل صحیح و پائیدار ہے' جب حضرت اسماعیلؑ تشریف لائے تو انہوں نے اپنے والد بزرگوار کی خوشبو سونگھی اور اپنی زوجہ سے دریافت کیا کہ آیا کوئی صاحب یہاں آئے تھے؟ اس نے کہا: جی ہاں ایک بزرگ شخصیت یہاں تشریف لائی تھیں اور وہ نہایت پاکیزہ و باکردار انسان تھے، ان کا چہرہ نورانی اور نہایت خوبصورت تھا' اور انہوں نے مجھ سے یہ کہا اور میں نے ان سے یہ کہا' یعنی حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہونے والی گفتگو بیان کی' اور کہا کہ میں نے ان کے سر مبارک کو دھویا اور یہ دیکھئے ان کے پاؤں کے نشان ابھی تک اس پتھر پر باقی ہیں' حضرت اسماعیلؑ نے اس کی بات سن کر فرمایا کہ وہ میرے (والد بزرگوار) ابراہیمؑ تھے۔

تفسیر قمی میں بھی اسی طرح کی ایک روایت ذکر کی گئی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا قصہ امام صادقؑ کی زبانی

تفسیر قمی ہی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام "بادیۃ الشام" میں تشریف لائے اور وہاں سکونت پذیر ہو گئے' جب حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی تو سارہؑ نہایت غمگین ہوئیں کیونکہ ان سے کوئی اولاد نہ تھی' لہٰذا وہ ہاجرہؑ...... سے حسد کرتے ہوئے ..... ابراہیمؑ سے لڑتی جھگڑتی

رہتی تھیں اور انہیں اذیت و آزار پہنچاتی رہتی تھیں' حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حضور شکایت کی' خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کو وحی کی کہ "عورت ٹیڑھی پسلی کی مانند ہے اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو تو اس سے استفادہ کر سکو گے اور اگر اسے سیدھا کرنے لگے تو وہ ٹوٹ جائے گی" پھر خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ اسماعیلؑ اور اس کی ماں کو یہاں (بادیۃ الشام) سے کہیں دور لے جاؤ' حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ انہیں کہاں لے جاؤں؟ خداوند عالم نے فرمایا: میرے حرم میں لے جاؤ کہ جسے میں نے امن کی جگہ قرار دیا ہے اور وہ "زمین" کا وہ علاقہ ہے جسے میں نے سب سے پہلے پیدا کیا ہے یعنی مکہ پھر خداوند عالم نے "جبرائیل" کو آسمان سے "براق" دے کر بھیجا' جبرائیلؑ نے اسماعیلؑ' ہاجرہؑ اور ابراہیمؑ کو اس میں بٹھایا اور چل پڑے' راستے میں جہاں بھی درخت' کھیت اور نخل (کھجور کے درخت) نظر آتے تو حضرت ابراہیمؑ، جبریلؑ سے کہتے کہ بس یہاں رک جائیں' جبریلؑ جواب دیتے کہ ابھی چلتے رہیں' چلتے رہیں' یہاں تک کہ مکہ پہنچ گئے اور جبریلؑ نے انہیں اس جگہ پر اتارا جہاں خانہ کعبہ ہے' حضرت ابراہیمؑ سارہؑ سے وعدہ کر چکے تھے کہ اس کے پاس واپس آنے تک سواری سے نیچے نہیں اتریں گے لہٰذا اسماعیلؑ اور ہاجرہؑ وہاں اتر گئے' وہاں ایک درخت تھا حضرت ہاجرہؑ نے اپنی چادر اس درخت پر تان دی اور اس کے سایہ میں بیٹھ گئے' جب حضرت ابراہیمؑ ان سے رخصت ہونے لگے تا کہ سارہؑ کے پاس واپس جائیں تو حضرت ہاجرہؑ نے کہا: اے ابراہیمؑ! آپؑ ہمیں ایسی جگہ چھوڑ کر جا رہے ہیں جہاں کوئی مونس و غمخوار نہیں اور نہ ہی پانی و سبزہ ہے' (بے آب و گیاہ جگہ!)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: خداوند عالم نے مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا وہ خود تمہارا نگہبان ہے اور وہ تمہاری مشکلوں کو آسان کر دے گا' ابراہیمؑ یہ کہہ کر روانہ ہو گئے' جب کداء (ذی طوی کے علاقہ میں ایک پہاڑ) پہنچے تو مڑ کر دیکھا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی: "رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ" (پروردگارا! میں نے اپنے پارۂ جگر کو ایک بے آب و گیاہ علاقہ میں تیرے گھر کے پاس سکونت دی ہے' پروردگارا! تا کہ وہ نماز قائم کر سکیں' لہٰذا لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف متوجہ کر دے اور انہیں طرح طرح کے پھلوں کا رزق عطا فرما تا کہ تیرے شکر گزار رہیں)۔ حضرت ابراہیمؑ یہ دعا مانگ کر چل پڑے' حضرت ہاجرہؑ اپنے فرزند اسماعیلؑ کے ساتھ وہاں ٹھہر گئیں' جب دن چڑھا تو اسماعیلؑ کو پیاس لگی' ہاجرہؑ پانی کی تلاش میں دوڑیں اور صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئیں، وہاں سے پانی کی چمک نظر آئی... سراب کو دیکھا..... تو اسے پانی سمجھا اور کوہ صفا سے اتر کر اس کی طرف دوڑیں' جب "مروہ" پہنچیں تو اسماعیلؑ ان کی نظروں سے غائب ہو گئے' واپس کوہ صفا کی طرف دوڑیں اور پھر پہلے کی طرح سراب کو دیکھا اور پانی سمجھ کر اس کی طرف دوڑیں اور پھر پہلے کی طرح سراب کو دیکھا اور پانی سمجھ کر اس کی طرف جلدی جلدی گئیں' سات مرتبہ انہوں نے ایسا کیا' ساتویں بار جب مروہ پہنچیں تو اسماعیلؑ کو دیکھا' اسماعیلؑ کے پاؤں کے نیچے سے پانی بہتا ہوا نظر آیا' جلدی جلدی واپس آئیں اور پانی کے گرد ریت جمع کر دی' کیونکہ پانی بہا جا رہا تھا لہٰذا اسے روک کر اس جگہ کو بھر دیا اسی لیے اس کا نام "زمزم" ہو گیا (کیونکہ "زم" کا معنی بھر دینا ہے) اس وقت قبیلۂ "جرہم" کے لوگ وہاں سے قریبی علاقہ "ذی المجاز" اور "عرفات" میں

آباد ہو چکے تھے۔ جب مکہ میں پانی نکلا تو پرندے اور جانور اس کے گرد جمع ہو گئے' قبیلہء ''جرھم'' کے لوگوں نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو وہاں آئے اور دیکھا کہ ایک خاتون اپنے کمسن بچے کے ساتھ وہاں سکونت پذیر ہے اور دونوں ایک درخت کے سایے میں بیٹھے ہیں اور یہ پانی انہی کے لیے زمین سے نکلا ہے تو انہوں نے حضرت ہاجرہؑ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور یہ بچہ جو آپ کے ساتھ ہے اس کا کیا ماجرا ہے؟ اور آپ اس حال میں یہاں کیونکر سکونت پذیر ہیں؟ حضرت ہاجرہؑ نے جواب دیا کہ میں حضرت ابراہیم خلیل الرحمانؑ کے بیٹے کی ماں ہوں اور یہ بچہ ان کا (ابراہیمؑ کا) بیٹا ہے۔ خدا نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ ہمیں یہاں سکونت پذیر کریں اور انہوں نے خدا کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے ہمیں یہاں چھوڑا ہے' قبیلہ کے لوگوں نے کہا اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم آپ کے قریب سکونت پذیر ہو جائیں' حضرت ہاجرہؑ نے جواب دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کے آنے کا انتظار کریں' تین دن کے بعد حضرت ابراہیمؑ اپنی زوجہ...... حضرت ہاجرہؑ ......اور اپنے بیٹے ......حضرت اسماعیلؑ ...... سے ملنے آئے تو حضرت ہاجرہؑ نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ قبیلہء ''جرھم'' کے لوگ اس علاقہ میں رہتے ہیں وہ یہاں آئے تھے اور آپ سے اس بات کی اجازت طلب کرتے تھے کہ یہاں ہمارے قریب آ کر سکونت پذیر ہو جائیں تو کیا آپ اس بات کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں؟ حضرت ابراہیمؑ نے ارشاد فرمایا: ہاں! کوئی حرج نہیں' حضرت ہاجرہؑ نے قبیلہ والوں کو اجازت دی اور وہ لوگ وہاں آ کر آباد ہو گئے اور انہوں نے اپنے خیمے لگا دیئے۔ اس طرح حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ ان لوگوں سے مانوس ہو گئے اور ان سے تنہائی کا احساس جاتا رہا' جب حضرت ابراہیمؑ دوبارہ تشریف لائے تو وہاں بہت سے لوگوں کو دیکھا اور ان کی چہل پہل کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے' جب حضرت اسماعیلؑ پاؤں چلنے کے قابل ہوئے تو قبیلہ ''جرھم'' سے ہر شخص نے ایک یا دو بکریاں انہیں ہدیہ وتحفہ کے طور پر دیں اور حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ ان بکریوں کے ذریعے اپنا گزر اوقات کرنے لگے۔ جب حضرت اسماعیلؑ بالغ ہو گئے اس وقت خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کو خانہء کعبہ تعمیر کرنے کا حکم دیا......'

(امامؑ نے ارشاد فرمایا) پس جب خدا نے ابراہیمؑ کو خانہء کعبہ تعمیر کرنے کا حکم دیا تو انہیں معلوم نہ تھا کہ کس جگہ پر بیت اللہ کو تعمیر کریں' خدا نے جبرئیلؑ کو بھیجا اور اس نے اس جگہ کی نشاندہی کی' حضرت ابراہیمؑ نے خانہء کعبہ تعمیر کرنا شروع کیا اور حضرت اسماعیلؑ ''ذی طویٰ'' سے پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے' خانہء کعبہ کی دیواریں نو ہاتھ اونچی تعمیر ہو گئیں' پھر ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو ''حجر الاسود'' کی جگہ بتائی اور اسے وہاں سے نکال کر اس جگہ نصب کر دیا جہاں اس وقت موجود ہے' جب عمارت کا کام مکمل ہو گیا تو ابراہیمؑ نے اس کے دو دروازے رکھے ایک مشرق کی جانب اور دوسرا مغرب کی جانب' مغربی دروازے کو ''مستجار'' کہا جاتا ہے۔ پھر درخت کی ٹہنیوں اور اذخر نامی خوشبودار گھاس اس پر ڈال دی اور حضرت ہاجرہؑ نے اپنی وہ عبا (چادر) جسے انہوں نے اپنے اوپر خیمہ کی مانند بنایا ہوا تھا اور اس کے نیچے زندگی گزار رہے تھے اسے کعبہ کے دروازہ پر لٹکا دیا' اس طرح خانہء کعبہ مکمل طور پر تعمیر ہو گیا اور ابراہیمؑ اس اہم ترین فریضہ سے عہدہ برا ہو گئے۔ اس کے بعد ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے ''حج'' ادا کیا' آٹھویں ذی الحجہ کو ''ترویہ'' کے دن حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے اور حضرت ابراہیمؑ سے کہا: اٹھیں اور پانی کا

بندوبست کریں: کیونکہ ''منیٰ'' اور ''عرفات'' میں پانی نہیں تھا' ابراہیمؑ نے پانی کا انتظام کیا اور اسے ایک جگہ ذخیرہ کر دیا اسی وجہ سے اس دن کو ''ترویہ'' یعنی سیراب کرنے ''پانی اکٹھا کرنے'' کا دن کہا جاتا ہے۔ جبرئیلؑ، ابراہیمؑ کو ''منیٰ'' میں لے گئے اور دوراتیں وہاں قیام پذیر رہے' جبرئیلؑ نے وہاں ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو آدمؑ کے ساتھ کیا تھا (جس طرح آدمؑ کو حج کے اعمال ومناسک بتائے تھے اسی طرح ابراہیمؑ کو بھی تعلیم دیئے)۔ بہرحال جب حضرت ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی تعمیر کے کام سے فارغ ہوئے تو انہوں نے خدا کے حضور یوں دعا کی: ''رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ ...'' (پروردگارا! اس شہر کو امن کی جگہ قرار دے اور یہاں کے باسیوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما جو بھی ان میں سے ایمان لائے......)۔ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا کہ ''پھلوں کے رزق'' سے مراد ''میوہ ہائے دل'' ہیں یعنی انہیں لوگوں کا محبوب بنا' (لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر) تاکہ لوگ ان سے مانوس ہوں اور جوق در جوق ان کی طرف آئیں۔

اب تک ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے سلسلے میں وارد ہونے والی روایات میں بیان کئے گئے مطالب کا خلاصہ ہے۔ لیکن بعض دیگر روایات میں اس واقعہ کے تذکرہ کے ضمن میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے دوران کئی معجزات...... خارق العادت امور بھی رونما ہوئے ہیں مثلاً بعض روایات میں ہے کہ کعبہ سب سے پہلے نور کا قبہ تھا جو آدمؑ پر نازل ہوا تھا اور اس جگہ پر اترا جہاں حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ تعمیر کیا اور طوفان نوحؑ سے پہلے تک اسی حالت میں باقی تھا' طوفان نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سب کچھ پانی کی طوفانی موجوں میں تباہ ہو گیا مگر خداوند عالم نے اس قبہ نور کو اٹھا لیا اور بیت اللہ کی جگہ غرق نہ ہوئی اسی وجہ سے اسے ''البیت العتیق'' کہا جاتا ہے (یعنی وہ گھر جو آزاد ہوا...... غرق ہونے سے بچ گیا.....)

بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ خداوند عالم نے بیت اللہ کی بنیادیں بہشت سے نازل کیں۔

بعض روایات میں ہے کہ ''حجر الاسود'' بہشت سے نازل ہوا اور شروع میں برف سے زیادہ سفید تھا لیکن کافروں کے نجس ہاتھ لگنے سے سیاہ ہو گیا۔

کوہ ابوقبیس نے امانت واپس کر دی

کافی میں حضرت امام محمد باقرؑ یا حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے انہوں نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ کعبہ کو تعمیر کریں' اس کی بنیادوں کو اونچا کریں اور لوگوں کو حج کے اعمال ومناسک سے آگاہ کریں' چنانچہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ ہر روز کعبہ کی تعمیر میں مصروف رہتے تھے یہاں تک کہ حجر الاسود کے مقام تک پہنچ گئے تو ''ابوقبیس'' نے آواز دے کر ان سے کہا کہ میرے پاس آپؑ کی ایک ''امانت'' ہے اور اس نے ''حجر الاسود'' ان کے حوالہ کر دیا' حضرت ابراہیمؑ نے اسے اس کے مخصوص مقام پر نصب کر دیا۔

بہشت کے تین پتھر

تفسیر العیاشی میں ''ثوری'' کے حوالہ سے مذکور ہے اس نے کہا کہ میں نے حضرت ابوجعفر امام محمد باقر علیہ السلام سے حجر الاسود کے متعلق دریافت کیا تو آنجناب ؑ نے ارشاد فرمایا: بہشت سے تین پتھر آئے تھے (۱) حجر اسود کہ جسے ابراہیم ؑ نے امانت کے طور پر لیا (۲) مقام ابراہیم ؑ (۳) حجر بنی اسرائیل (وہ پتھر جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کے چشمے بہائے تھے)۔

بعض روایات میں ہے کہ حجر الاسود دراصل ایک فرشتہ تھا۔

مذکورہ بالا مطالب شیعہ وسنی فریقین کی روایات میں مذکور ہیں اگر چہ وہ روایات تواتر کی حد تک نہیں پہنچتیں، نہ الفاظ کے اعتبار سے اور نہ معانی کے لحاظ سے لیکن ایسا بھی نہیں کہ دینی معارف کے باب میں اس طرح کی روایات موجود نہ ہوں ،حقیقت یہ ہے کہ ان سے مشابہ روایات دینی علوم و معارف میں کم وبیش مل ہی جاتی ہیں لہٰذا سرے سے ان کا انکار کر دینا درست نہیں۔

اور جہاں تک قبۂ نور کے آدمؑ پر نازل ہونے اور ابراہیم ؑ کے بذریعہ ''براق''، مکہ آنے اور ان جیسے دیگر واقعات کا تعلق ہے تو یہ سب کچھ کرامات اور معجزات (خارق العادت امور) میں سے ہیں اور ان کا ناممکن ومحال ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں، خاص طور پر جب یہ بھی ثابت ہے کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبروں کو ان جیسے کثیر معجزات عطا فرمائے ہیں اور کرامات سے نوازا ہے اور قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے تو ابراہیمؑ کے حوالہ سے مذکور واقعات پر تعجب وحیرت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اور جن روایات میں کعبہ کی بنیادوں...... یا دیواروں ......اور حجر الاسود اور حجر المقام کے بہشت سے نازل ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر مقام ابراہیمؑ کی موجودہ جگہ کے نیچے مدفون ہے اور ان جیسے دیگر مطالب! تو ان کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس طرح کے مطالب پر مشتمل کئی روایات دینی معارف کی بابت موجود ہیں یہاں تک کہ بعض نباتات اور پھلوں وغیرہ کے متعلق بھی روایات موجود ہیں کہ وہ بہشت سے نازل ہوئے ہیں یا یہ کہ فلاں چیز جہنم سے آئی ہے یا اس کا تعلق دوزخ کی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہے وغیرہ۔

اسی زمرے میں وہ روایات بھی آتی ہیں جن میں ''طینت'' کے بارے میں مذکور ہے کہ نیک وسعادتمند افراد کی طینت، بہشت سے ہے اور شقی و بدبخت لوگوں کی طینت ''جہنم'' سے ہے یا یہ کہ پہلے طبقہ یعنی نیک وسعادتمند افراد کی طینت، ''علیین'' سے اور دوسرے طبقہ (اشقیاء) کی طینت، ''سجین'' سے ہے اور اسی طرح وہ روایات بھی اسی باب سے ہیں جن میں مذکور ہے کہ برزخ کی بہشت زمین کے فلاں علاقہ میں اور برزخ کا جہنم فلاں علاقہ میں واقع ہے اور یہ کہ قبر یا تو بہشت کے باغات میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے اور اسی طرح کی دیگر روایات ایسی ہیں جن کے بارے

میں ہر صاحب بصیرت محقق اور روایات واحادیث کا تتبع و چھان بین کرنے والا آگاہ ہو سکتا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اس طرح کی روایات کثرت کے ساتھ موجود ہیں لہٰذا نہ تو ان سب کو مسترد کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کے سلسلہ سند اور آئمہ معصومینؑ کی طرف ان کی نسبت کا سرے سے انکار ممکن ہے کیونکہ ان تمام روایات کا تعلق معارف الٰہیہ سے ہے کہ جن سے آگاہی حاصل کرنے کی ترغیب قرآن مجید میں دلائی گئی ہے اور ان کی بابت معصومین علیہم السلام سے منقول معتبر روایات بھی موجود ہیں جن سے کلام الٰہی میں مذکور اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہم عالم طبیعت میں جن چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ سب خداوند عالم کی طرف سے نازل ہوئی ہیں بلکہ ان کے علاوہ دوسری تمام موجودات بھی خدا کی طرف سے آئی ہیں، تاہم ان میں سے جو چیزیں "خیر" اور اچھی ہیں یا "خیر" کا وسیلہ وسبب اور ظرف ہیں وہ بہشت سے آئی ہیں اور بہشت ہی کی طرف واپس جائیں گی، اور جو چیزیں "شر" اور بری ہیں یا "شر" کا وسیلہ وسبب اور اس کا ظرف ہیں وہ سب جہنم سے آئی ہیں اور اس کی طرف لوٹ جائیں گی، خداوند عالم کا ارشاد ہے:

سورۂ حجر، آیت ۲۱:

"وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ"

(ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں اور ہم ہر چیز کو معلوم اندازے کے مطابق نازل کرتے ہیں)

اس آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ عالم ہستی کی تمام موجودات، خداوند عالم کے پاس غیر محدود اور ہر طرح کی تقدیر و اندازے سے بالاتر وجود کے ساتھ موجود ہیں اور جب خدا انہیں نازل کرنا چاہتا ہے تو اس وقت ہر چیز کے وجود کی حد مقرر و معین کر کے نازل کرتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں لفظ "تنزیل" ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی تدریجی طور پر نازل کرنا ہے، بہر حال یہ آیت... سورۂ حجر، ۲۱... ہر چیز کے خدا کی طرف سے نازل ہونے کو بطور "عموم" بیان کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض آیات میں کئی چیزوں کا بالخصوص نام کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے کہ انہیں خدا نے نازل فرمایا ہے ملاحظہ ہو:

سورۂ زمر، آیت ۶:

★ "وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ أَزْوَاجٍ" .....،

(اور خدا نے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے تمہارے لیے نازل کئے)۔

سورۂ حدید، آیت ۲۵:

★ "وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ ...، (اور ہم نے لوہا نازل کیا)۔

سورۂ ذاریات، آیت ۲۲:

★ "وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ" ...،

(اور آسمان میں ہے تمہارا رزق اور وہ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے)۔

ان آیات کے معانی کی بابت تفصیلی تذکرہ بعد میں ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ

پس دنیا میں ہر چیز خداوند عالم کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور خدا نے ان تمام موجودات کی بازگشت کے بارے میں بھی واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ یہ سب خدا کی طرف لوٹ جائیں گی' ملاحظہ ہو:

سورہء نجم، آیت ۴۲:

★ "وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی" ...، (اور تیرے پروردگار کی طرف ہی بازگشت ہوگی)۔

سورہء علق، آیت ۸:

★ "اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی" ...، (تیرے پروردگار کی طرف واپس جانا ہے)

سورہء مومن، آیت ۳:

★ "اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ" ...، (اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے)

سورہء شوریٰ، آیت ۵۳:

★ "اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ" ...، (یاد رکھو اللہ کی طرف تمام امور کی بازگشت ہوگی)۔

ان کے علاوہ بھی کثیر تعداد میں آیات موجود ہیں جن میں خدا کی طرف سے نازل کی جانے والی اشیاء کا بالخصوص ناموں کے ساتھ یا بالعموم تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ آیت (سورہء حجر، ۱۲) اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ تمام اشیائ... موجودات عالم......اپنے وجود میں آنے کے بعد اور بازگشت تک کے مراحل میں انہی تقاضوں کی تکمیل کی راہ پر گامزن ہوتی ہیں جو ان کے وجود کے آغاز میں ان سے مربوط ہو جاتے ہیں اور انہی کی بنیاد پر ان کی تقدیر کی جہت وسمت متعین ہوتی ہے خواہ سعادت وخوش بختی ہو یا شقاوت وبختی' اور خیر ہو یا شر۔ چنانچہ درج ذیل آیات مبارکہ سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے:

سورہء اسریٰ آیت ۸۴:

★ "قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ" ...، (ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق کام کرتا ہے)۔

سورہء بقرہ، آیت ۱۴۸:

★ "وَلِکُلٍّ وِّجْھَۃٌ ھُوَ مُوَلِّیْھَا" ...، (ہر شخص کے لیے ایک سمت معین ہے وہ اس کی طرف منہ کئے ہوئے ہے)۔

ان آیات کی بابت تفصیلات بعد میں ذکر کی جائیں گی' یہاں ان آیات کے تذکرہ سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اجمالی طور پر اس امر کا ذکر کر کے اپنی بحث کو اختتامی صورت دیں کہ جن روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ مادی اشیائ.....عالم ماد وطبیعت میں پائی جانے والے موجودات..... یا تو بہشت سے آئی ہیں یا جہنم سے' انہیں اسی صورت میں صحیح قرار دیا جاسکتا

ہے جب ان موجودات کا تعلق لوگوں کی سعادت یا شقاوت سے ہو کیونکہ وہ اسی صورت میں قرآن مجید کے ان اصولوں سے ہم آہنگ ہوں گی جو کسی حد تک ...... فی الجملہ ...... مسلم الثبوت ہیں؛ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان تمام روایات کو صحیح قرار دیا جائے اور ان میں سے ہر ایک کو ہر طرح کے شبہ واعتراض سے پاک سمجھ کر اس کا سہارا لیا جائے (مزید غور کریں)۔

روایات کے متعلق ایک قول اور اس کا جواب

اس مقام پر کسی صاحب نے یہ بات بھی کہی ہے کہ یہ تمام روایات (جن میں کہا گیا ہے کہ تمام اشیاء یا تو بہشت سے آئی ہیں یا جہنم سے) درست نہیں کیونکہ آیت شریفہ "وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ . . ." سے بظاہر یہ مطلب ثابت ہوتا ہے کہ ان دو بزرگواروں (ابراہیمؑ واسماعیلؑ) نے بت پرستوں کی سرزمین میں خانہ کعبہ کو اس لیے بنایا تا کہ وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالائی جائے؛ لیکن بعض قصہ گو لوگوں نے جن کی پیروی کئی مفسرین نے بھی کی ہے ایسے مطالب پیش کئے ہیں جن کا اشارہ قرآن مجید میں کہیں نہیں ملتا بلکہ وہ قرآن مجید کے بیان کردہ مطالب کے بالکل برعکس ہیں اور ان قصہ ساز لوگوں نے ان روایات میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت زیرکی و چابکدستی کے ساتھ دلچسپ واقعات کا اضافہ کر کے کہیں تو خانۂ کعبہ کے قدیم ہونے کو بیان کیا اور کہیں آدمؑ کے حج کرنے کا تذکرہ کیا اور کہیں طوفان نوحؑ کے وقت خانۂ کعبہ کے آسمان کی طرف بلند ہو جانے کا ذکر کیا اور کہیں یہ بات بیان کی کہ حجر الاسود بہشت کے پتھروں میں سے ایک پتھر ہے وغیرہ وغیرہ؛ دراصل ان داستان گھڑنے والوں کا مقصد یہ ہے کہ دین میں من گھڑت وخود ساختہ باتیں داخل کر دی جائیں اور بے بنیاد واقعات کو دین کے حقائق کا حصہ بنا دیا جائے تا کہ ان کا کاروبار داستان سازی ترقی کرے اور "دین" خوشنما کہانیوں کا مجموعہ بن جائے؛ یہ درست ہے کہ ایسے بظاہر دلکش واقعات اور جاذب نظر داستانیں عوام الناس کے لیے دل پسند ہوتی ہیں لیکن صاحبان علم وبصیرت میں سے اہل فکر ونظر حضرات ایسی خوشنما داستانوں کے دلفریب اثر میں آنے کے بجائے اس امر سے آگاہ اور اس حقیقت کی طرف متوجہ رہتے ہیں کہ خداوند عالم نے جن چیزوں کو شرف وعظمت عطا فرمائی ہے وہ ان کی معنوی حیثیت کے حوالہ سے ہے اور ان کی معنوی حیثیت ہی ان کے لیے سب سے بڑا اور اصل اعزاز ہے لہٰذا خانۂ کعبہ کی عزت واعزاز اس وجہ سے ہے کہ اسے خدا کا گھر ہونے کی نسبت حاصل ہے اور حجر الاسود کی بزرگی وعزت اس وجہ سے ہے کہ خدا کے نیک وصالح بندے اسے چومتے اور اس پر پاکیزہ ہاتھ پھیرتے ہیں گویا وہ خدا کے ہاتھ کی مانند ہے ورنہ اس کا یاقوت، یا دُرّ (قیمتی موتی) ہونا اس کے متبرک ومعزز ہونے کا سبب نہیں اور نہ ہی اسے اس حوالہ سے حقیقی شرف کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ قدرت کی نگاہ میں سیاہ اور سفید پتھر میں حقیقی طور پر کوئی فرق نہیں؛ بنابریں یہ بات ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ خانہ کعبہ کی عزت صرف اس وجہ سے ہے کہ خداوند عالم نے اسے "اپنا گھر" کہا ہے اور اسے "بیت اللہ" کے نام سے موسوم کیا ہے اور اسے اپنی گونا گوں عبادات کے لیے مخصوص کر دیا ہے ایسی عبادات کہ جن کی بجا آوری اس کے علاوہ کسی اور مقام میں ممکن نہیں؛ نہ یہ کہ اس کے پتھر دوسرے پتھروں کی نسبت برتری کے حامل ہیں یا اس کا

محل وقوع خطہ ارضی میں سب سے زیادہ برکت و تقدس رکھتا ہے یا یہ کہ وہ آسمان سے اور عالم نور سے اترا ہے' ہرگز ایسا نہیں بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے شرف و بزرگی کے بارے میں بھی حقیقت حال یہی ہے کہ ان کی بزرگی اور فضیلت و برتری ان کی جسمانی خصوصیت یا ان کے لباس کی عمدگی کے باعث نہیں بلکہ ان کا دوسرے افراد بشر سے ممتاز ہونا اس وجہ سے ہے کہ خداوند عالم نے انہیں منتخب کیا ہے اور نبوت ایسے عظیم المرتبت اور جلیل القدر منصب سے نوازا ہے جو کہ ایک پاکیزہ ترین معنوی امر ہے ورنہ دنیا میں انبیاءؑ سے کہیں زیادہ حسین و جمیل اور مالدار ترین افراد موجود تھے۔

اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ ان روایات میں اس قدر تناقض و تعارض پایا جاتا ہے (ان میں مذکور مطالب ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں) کہ انہیں قابل قبول قرار نہیں دیا جا سکتا اور پھر یہ کہ ان کا سلسلہ سند بھی درست نہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ قرآن مجید کے ظاہری واضح مطالب سے متصادم ہیں' اور یہ کہنا بیجا نہیں بلکہ حقیقت کے عین مطابق ہے کہ ان روایات کو اسرائیلیوں نے جعل کیا ہے اور یہودی دہریوں نے مسلمانوں کے درمیان انہیں عام کر دیا تا کہ دین اسلام میں اس طرح کے خرافات اور بیہودہ و بے بنیاد باتیں شامل کر دیں جس کے نتیجے میں کوئی اہل کتاب اسلام کی طرف توجہ ہی نہ کرے اور اسلام کو محبت کی بجائے نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔

جواب:

روایات کے بارے میں مذکورہ بالا قول کی بابت عرض ہے کہ اگرچہ اس کے تمام مندرجات غلط نہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ بعض مطالب صحیح ہوں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس میں "بحث میں افراط اور حد سے گزر جانے" کی روش اپنائی گئی ہے اور اعتراض کا ایسا غلط و نادرست انداز اپنایا گیا ہے جس سے اعتراض کرنے والا خود ایک بہت بڑے اور نہایت گھمبیر اعتراض کا شکار ہو جاتا ہے مثلاً:

۱۔ اس کا یہ کہنا کہ یہ "روایات تناقض (مطالب کے آپس میں ٹکرانے اور ایک دوسرے کی نفی کرنے) کی وجہ سے اور ظاہر قرآن کے منافی ہونے کے سبب نادرست و ناقابل قبول ہیں" غلط ہے کیونکہ تناقض یا تعارض اسی صورت میں مضر اور نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے جب تناقض و تعارض کے باوجود تمام روایات کو قابل قبول و لائق عمل قرار دیا جائے اور ہر ایک کو صحیح قرار دیتے ہوئے تناقض یا تعارض کو ہرگز خاطر میں نہ لایا جائے' لیکن اگر ان تمام روایات سے ایک مشترک معنی اخذ کر کے "مجموعی طور پر" انہیں مورد عمل قرار دیا جائے تو اس صورت میں تناقض یا تعارض کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ روایات کو "مجموعی طور پر" مورد عمل قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ تناقض و تعارض کی وجہ سے ان "سب" کو نہ ٹھکرا دیا جائے کیونکہ وہ ایسے مطالب پر مشتمل نہیں جو عقلی طور پر یا دیگر مضبوط دلائل کی روشنی میں محال و ناممکن ہوں' اور پھر یہ کہ روایات سے ہماری مراد صرف وہی روایات ہیں جن کا سلسلہ سند معصوم و عصمت یعنی حضرت پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام تک پہنچتا ہے نہ کہ وہ روایات جو صحابہ اور تابعین میں سے مفسرین نے بیان کی ہیں کیونکہ ان مفسرین کا مقام عام لوگوں سے مختلف نہیں اور وہ روایات بیان کرنے کے حوالہ سے دوسرے لوگوں کے مساوی ہیں بلکہ ان کی بیان کردہ روایات تو ایسی

ہیں کہ اگر وہ تناقض یا تعارض سے خالی بھی ہوں تب بھی ان روایات سے زیادہ حیثیت واہمیت نہیں رکھتیں جن میں تناقض یا تعارض پایا جاتا ہے' خلاصہ یہ کہ صحابہ وتابعین کی روایات حجت (قابل قبول) نہیں خواہ ان میں تعارض وتناقض پایا جائے یا نہ پایا جائے بلکہ کسی روایت کے حجت (قابل قبول) ہونے کا معیار صرف قرآن مجید اور سنت قطعیہ ہے لہٰذا جو روایت قرآن و سنت کے منافی ہوگی وہ کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہوسکتی اور نہ وہ روایات حجت قرار دی جاسکتی ہیں جن میں جھوٹ اور جعل سازی کا پہلو نمایاں ہو' لیکن اگر کوئی روایت ایسی ہو جو نہ تو قرآن وسنت کے منافی ہو اور نہ ہی اس میں جھوٹ وجعل سازی کا پہلو پایا جاتا ہو تو اسے ٹھکرانے اور اس کا انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کیونکہ دینی معارف میں اصل معیار صرف قرآن وسنت اور ایسی روایات ہیں جن کا نبیؐ وآئمہؑ سے صادر ہونا یقینی طور پر ثابت ہو' اسی ضابطہ واصول کی بنیاد پر ہی تمام روایات کو پرکھا جائے گا اور قابل یا ناقابل قبول قرار دیا جائے گا' لہٰذا روایات میں پایا جانے والا تعارض وتناقض ان کے نادرست ہونے کا سبب نہیں بن سکتا بلکہ اصل معیار کی روشنی میں دیکھا جائے گا کہ آیا یہ اس کے مطابق ہیں یا نہیں اگر کتاب و سنت کے مطابق ہوں تو حجت اور قابل قبول ہوں گی ورنہ ان کی کوئی حیثیت نہیں' مذکورہ مطالب کی روشنی میں ''دلائل'' کو درج ذیل تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلی قسم:

لازم القبول: جن کا قبول کرنا ضروری ہے (ہر لحاظ سے قابل قبول ہیں) مثلاً کتاب (قرآن مجید) اور سنت قطعیہ (جس کا ثبوت یقینی طور پر ہو)۔

دوسری قسم:

لازم الطرح: جن کا قبول نہ کرنا ضروری ہے (کسی طرح سے بھی قابل قبول نہیں) مثلاً وہ روایات جو کتاب وسنت کے منافی ہیں۔

تیسری قسم:

وہ روایت جن کے قابل یا ناقابل قبول ہونے کی کوئی واضح دلیل موجود نہیں' یعنی نہ تو عقلی طور پر ان کے مطالب کو محال وناممکن قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کتاب وسنت قطعیہ سے ان کے ممنوع وناقابل قبول ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

بنابرایں یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی روایت کو تناقض یا تعارض کی وجہ سے ناقابل قبول قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اصل معیار قرآن مجید اور سنت قطعیہ ہے لہٰذا معترض کا یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ ان روایات کو اس لیے قبول نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا سلسلہء سند صحیح نہیں' صرف سند کے حوالہ سے بھی کسی روایت کو نادرست قرار دینا صحیح نہیں جب تک کہ اس کا عقل اور قرآن و سنت سے منافی ہونا ثابت نہ ہوجائے۔

۲۔ اس کا کہنا کہ یہ روایات آیت مبارکہ ''وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ...'' کے ظاہر سے متصادم ہیں نہایت مضحکہ خیز بات ہے کیونکہ اس آیت میں ان مطالب کی نفی ہی نہیں ملتی کہ حجر الاسود بہشت سے

آیا تھا یا آدمؑ کے زمانے میں خانۂ کعبہ کی موجودہ جگہ پر ''قبہ'' نازل ہوا تھا جو طوفان نوحؑ کے دوران آسمان کی طرف چلا گیا' یہ مسائل تو آیت سے مربوط ہی نہیں' یہ آیت اس سے زیادہ کسی مطلب کو بیان ہی نہیں کرتی کہ یہ گھر (خانۂ کعبہ) پتھروں اور مٹی سے بنایا گیا ہے اور اسے ابراہیمؑ ...... اور اسماعیلؑ ...... نے تعمیر کیا ہے اس کے علاوہ یہ آیت کسی چیز کی نفی یا اثبات سے تعلق ہی نہیں رکھتی لہٰذا روایات میں مذکور مطالب کو آیت سے متصادم قرار دینا کیونکر درست قرار دیا جاسکتا ہے؟ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ ان روایات میں مذکور مطالب، معترض کے مزاج و مذاقِ فکر سے ہم آہنگ نہیں اور نہ ہی اس کے مخصوص نظریات کی تائید کرتے ہیں کیونکہ اس کے نظریات و افکار کی بنیاد مذہبی تعصب و تنگ نظری ہے کہ جو انبیاءؑ سے معنوی حقائق کی نفی کرنے کے ساتھ ساتھ دینی احکام و ظواہر شریعت کے معنوی اصولوں پر استوار ہونے کو تسلیم نہ کرنے کا سبب ہے' یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ روایات میں مذکور مطالب کا سرے سے انکار کرنا اس وجہ سے ہے کہ معترض، عصر جدید میں سائنسی علوم کی ترقی سے متاثر ہو کر لاشعوری طور پر مادہ پرستوں کی اندھی تقلید کی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو چکا ہے کیونکہ یہ علوم اگرچہ عالم طبیعت میں رونما ہونے والے تمام حوادث و واقعات کو ان کے مادی علل و اسباب سے مربوط سمجھتے ہیں لیکن معنوی حقائق سے انکار پر مبنی اپنے اصولوں کی روشنی میں ان کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ ان مادی حوادث سے تعلق رکھنے والے معنوی حقائق مثلاً اجتماعی و معاشرتی تعلیمات کے علل و اسباب بھی مادی ہیں اور اگر وہ علل و اسباب مادی نہ بھی ہوں تب بھی ان کی بازگشت ہر صورت میں کسی مادی امر کی طرف ہی ہوگی کیونکہ مادی حوادث و واقعات میں ''مادہ'' کے سوا کوئی چیز حکم فرما نہیں ہوسکتی' معترض کا یہ طرز تفکر نہایت افسوس ناک ہے کیونکہ کسی محقق و دانشور کا فریضہ یہ ہے کہ وہ علوم طبیعی کے بارے میں غور و فکر اور تدبر سے کام لے اور یہ سمجھے کہ ان علوم کی بحث کا محور ''مادہ'' اور ''اس کے خواص و ترکیبات اور مادی و طبیعی آثار کا اپنے موضوعات سے ارتباط'' کے سوا کچھ بھی نہیں اور مادی علوم میں ان ارتباطات کی حدود و کیفیات ہی زیر بحث آتی ہیں، یہی حال معاشرتی و اجتماعی علوم کا ہے کہ ان میں معاشرتی حوادث و واقعات کی بابت ان کے معاشرتی ربط و ارتباط کی کیفیتیں ہی زیر بحث آتی ہیں لیکن جہاں تک ''مادہ'' کی حدود سے باہر کے حقائق کا تعلق ہے تو چونکہ وہ ''مادہ'' کے دائرہ عمل اور گرفت سے باہر ہیں اور طبیعت (نیچر) اور اس کے خواص پر محیط ہیں اور کائنات ہستی کے حوادث و واقعات سے معنوی و غیر مادی ربط رکھتے ہیں اس لیے ان کا ہمارے عالم محسوسات سے کوئی تعلق ہی نہیں لہٰذا نتیجتاً وہ علوم طبیعی و اجتماعی کے دائرہ بحث سے بھی خارج ہیں بلکہ ان علوم میں تو مادی امور کے علاوہ کسی موضوع کی بابت بحث کرنے کی گنجائش ہی نہیں پائی جاتی اور وہ اس امر سے عاجز ہیں کہ معنوی حقائق اور ماورائے مادہ امور کی نفی یا اثبات کرسکیں' طبیعی علوم کا دائرہ کار اس قدر محدود ہے کہ وہ صرف یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ گھر کی تعمیر کے لیے مادی اشیاء مثلاً مٹی' پتھر وغیرہ اور ایسے معمار کی ضرورت ہے جو ان اشیائ... کی ترکیب و ترتیب ... سے ایک گھر بنا سکے' یا پھر یہ کہ فلاں کمرہ سیاہ پتھروں کی ترکیب و ترتیب سے کیونکر تعمیر ہوا' یہی صورت حال اجتماعی ... معاشرتی ..... علوم کی ہے کہ وہ بھی رونما ہونے والے واقعات کی نشاندہی کرسکتے ہیں مثلاً ان واقعات کے بارے میں بتا سکتے ہیں جن کے نتیجے میں ابراہیمؑ کے ہاتھوں خانۂ کعبہ کی تعمیر کا عمل انجام پذیر ہوا یعنی ابراہیمؑ کی مقدس زندگی کی تاریخ، ہاجرہؑ و اسماعیلؑ کی زندگی

کے واقعات، سرزمین ''تہامہ'' کی تاریخ، قبیلہ ''جرھم'' کا مکہ میں سکونت پذیر ہونا وغیرہ' یہ وہ تمام واقعات ہیں جو معاشرتی علوم (کہ جن میں علم تاریخ بھی شامل ہے) کے دائرہ کار میں آتے ہیں یعنی ان کا دائرہ کار اس سے زیادہ وسیع نہیں اور یہ باتیں ان سے مربوط ہی نہیں کہ فلاں پتھر...... مثلاً حجر الاسود...... بہشت سے آیا ہے یا دوزخ سے' لہٰذا وہ علوم اس سلسلے میں کی جانے والی کسی بات کی نہ تو نفی کر سکتے ہیں اور نہ اثبات' اور جہاں تک قرآنی بیانات کا تعلق ہے تو آپ خود اس امر سے آگاہ ہیں کہ قرآن مجید واضح طور پر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ عالم طبیعت میں پائی جانے والی تمام مادی چیزیں خداوند عالم کی طرف سے اپنے موزوں و مناسب مقررہ مقام پر نازل ہوئی ہیں اور پھر دوبارہ اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گی' کچھ تو بہشت میں جائیں گی اور کچھ دوزخ میں' اور اسی طرح اعمال کے بارے میں بھی قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی طرف پرواز کرتے ہیں اور اسی کے حضور پیش کئے جاتے ہیں اور اسی تک پہنچتے ہیں جبکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ''اعمال'' حرکات و سکنات اور طبیعی کیفیات سے عبارت ہیں کہ جن کی ترتیب و ترکیب میں تکوینی و تخلیقی حقیقت کی بجائے ''معاشرہ کی نظر میں خاص مقام و اہمیت کا حامل ہونا'' کارفرما ہوتا ہے' چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ ءحج، آیت ۳۷:

★ ''وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ''...،

(لیکن خدا کے پاس تمہارا تقویٰ ہی پہنچتا ہے)۔

تقویٰ کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ یا تو ایک فعل...... عمل ...... ہے یا فعل...... عمل...... سے حاصل ہونے والی ایک صفت کا نام ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ ءفاطر، آیت ۱۰:

★ ''اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ''...،

(اسی کی طرف پاکیزہ کلام محو پرواز ہوتا ہے اور عمل صالح اسے اور زیادہ بلند کر دیتا ہے)۔

بنابرایں دینی علوم و معارف کی بابت بحث و تحقیق کرنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ان آیات میں غور و فکر اور تدبر سے کام لیں اور اس حقیقت کا ادراک کریں کہ دینی معارف و علوم کا طبیعی و معاشرتی مسائل سے...... ان کے طبیعی و معاشرتی مسائل ہونے کے حوالہ سے...... کوئی تعلق نہیں وہ صرف حقائق اور مافوق الطبیعہ امور سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ اس کا یہ کہنا کہ ''انبیاء کرامؑ، عبادتگاہوں اور دیگر وہ امور جو انبیاءؑ سے منسوب ہیں مثلاً بیت (گھر) اور حجر الاسود وغیرہ کی عظمت و شرف ان کے ظاہری وجود میں پائی جانے والی کسی صفت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس معنوی حیثیت کے حوالہ سے ہے جو خداوند عالم نے انہیں عطا فرمائی اور اس کی وجہ سے انہیں عزت و فضیلت حاصل ہوئی' بجا اور صحیح ہے' لیکن اسے اس امر کی طرف بھرپور توجہ رکھنی چاہئے کہ جس بنیاد پر یہ شرف و عظمت حاصل ہوئی وہ کیا ہے اور وہ معنوی حیثیت کیا ہے

جس کے سبب عزت وفضیلت ملی ہے؟ اگر اس کی بابت یہ کہا جائے کہ وہ معنوی حیثیت ان امور سے عبارت ہے جو معاشرتی ضرورتوں سے جنم لیتے ہیں مثلاً حکومتوں اور قوموں میں رائج منصب و مقام حکمرانی ورہبری وغیرہ، سونے اور چاندی کی قیمتوں کا معیار اور ان کا گراں قیمت ہونا، والدین کی عزت، قانون کا احترام اور ناموس کی حرمت وغیرہ ایسے امور ہیں جو دنیاوی ضرورت کی بنیاد پر معاشرے میں مخصوص حیثیت کے ساتھ مورد توجہ قرار پاتے ہیں اس کے علاوہ کسی تشخص وحیثیت کے حامل نہیں ہوتے یعنی معاشرتی ضرورتوں سے قطع نظر ان امور کی اہمیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ ان کا وجود انہی احتیاجات کا مرہون منت اور انہی حدود میں مقید ہوتا ہے جو معاشرے کی تشکیل کے حوالہ سے پیدا ہوتی ہیں جبکہ ذات احدیت اس بات سے کہیں بالاتر ہے کہ اسے بھی انسانی زندگی کی مانند احتیاجات اور ضرورتیں اپنی لپیٹ میں لے لیں اور اس کے امور کا معیار معاشرتی زندگی کی ضرورتوں کے سوا کچھ بھی نہ ہو، تاہم اس کے باوجود اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ نبی کا شرف وعظمت بھی اسی طرح کے غیر حقیقی سبب سے ہے (یعنی اس حیثیت کے حوالہ سے جو معاشرتی ضرورت کی وجہ سے وجود میں آئی ہے) اور وہ اس غیر حقیقی شرف کی بنیاد پر ہی عزت وفضیلت پاتا ہے تو پھر یہ تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے کہ کسی گھر یا پتھر کو بھی اس طرح کے غیر حقیقی شرف کی وجہ سے عزت واعزاز حاصل ہو؟

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ شرف وعزت اور عظمت واعزاز غیر حقیقی نہیں بلکہ واقعی اور حقیقی ہے اور اس نسبت کے باب سے ہے جو علم وجہل، نور وظلمت اور عقل وسفاہت کے درمیان پائی جاتی ہے یعنی جس طرح علم کو جہالت پر، نور کو ظلمت پر اور عقل کو سفاہت پر برتری حاصل ہوتی ہے اسی طرح پیغمبر کے وجود کی حقیقت دوسروں کے وجود کی حقیقت سے مختلف اور ان پر برتری رکھتی ہے یہ اور بات ہے کہ ہمارے ظاہری حواس اس امر (وجود کی حقیقت کے مختلف اور برتر ہونے) کا ادراک نہ کر سکیں، حقیقت بھی یہی ہے کہ اس شرف وعزت کو حقیقی شرف وعظمت تسلیم کیا جائے نہ کہ غیر حقیقی اور معاشرتی ضرورتوں سے جنم لینے والا شرف، کیونکہ خدا کی مقدس و پاکیزہ ذات کے شایان شان بھی یہ ہے کہ اس کے ہر کام اور حکم کی بنیاد "حقیقت" کو قرار دیا جائے نہ کہ فرضی وغیر حقیقی معیار کو، جیسا کہ اس کا اپنا واضح ارشاد گرامی ہے:

سورہ دخان، آیت ۳۹:

★ " وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ " ...،

(ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان موجود ہے بیکار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ..... ان کی تخلیق کھیل تماشہ نہیں ..... اور ہم نے انہیں صرف حق کے ساتھ خلق کیا ہے لیکن اکثر لوگ آگاہی نہیں رکھتے)۔

اس آیت کی تفسیر اور اس میں مذکور موضوع کی تشریح اس کے مربوط مقام پر ذکر کی جائے گی انشاء اللہ ..... تو اس صورت میں (شرف وعظمت کو واقعی وحقیقی سمجھنے میں) اس شرف وعزت کی بازگشت ایک معنوی حقیقت اور ماورائے الطبیعہ کی طرف ہوگی، اور جب ایسا ہونا انبیاءؑ کی بابت ممکن اور درست ہو تو پھر ان کے علاوہ دیگر اشیاء عالم مثلاً بیت (گھر) اور حجر

(پتھر) وغیرہ کی بابت کیوں ناممکن و نادرست ہوگا؟ یعنی جب انبیاءؑ کے لیے شرف و عظمت کے معیار اور سبب کو معنوی وغیر مادی تسلیم کرلیا جائے تو پھر انبیاءؑ کے علاوہ دوسروں کے لیے ایسا تسلیم کر لینے میں کوئی حرج لازم نہیں آتا' یہ اور بات ہے کہ ان حقیقی معنوی نسبتوں کو جن الفاظ کے ساتھ بیان و ذکر کیا جاتا ہے وہ معاشرے میں رائج اور عام...... روزمرہ...... استعمال میں آنے والے ظاہری معانی و مفاہیم سے مختلف نہیں...... اور یہ اس لیے ہے کہ ہم ان کے علاوہ کسی حقیقت کے ادراک سے عاجز ہیں۔

مذکورہ بالا وضاحت کے بعد اب یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ حضرات ان آیات کے بارے میں کیا اظہار خیال فرماتے ہیں جن میں بہشت کی زیب و زینت اور اہل بہشت کا سونے چاندی سے آراستہ ہونا مذکور ہے؟ آیا سونے چاندی کو اس کے علاوہ کوئی اہمیت حاصل ہے کہ وہ ایسی دو دھاتیں ہیں جن کا کثرت سے نہ پایا جانا ان کے مہنگا اور قیمتی...... گراں قیمت...... ہونے کا سبب ہے؟ جب ایسا ہے تو بہشت اور اہل بہشت کا ان سے مزین و آراستہ ہونا کیا وقعت و اہمیت رکھتا ہے اور بہشت میں ان کی مالیت کس شرف کی حامل ہے جبکہ معاشرے کی مقرر کردہ حدود اور معیاروں سے قطع نظر ان کی مالیت اور قدر و قیمت کچھ بھی نہیں؟ آیا اس کے علاوہ کوئی جواب ممکن ہے کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ آیات و روایات اور بیانات الٰہیہ و ظواہر دینیہ میں ایسی حقیقتیں پوشیدہ ہیں جن کا مشاہدہ ہم نہیں کر سکتے اور ان الفاظ کے پس منظر میں اسرار و معانی کی ایک وسیع کائنات موجود ہے جس تک پہنچنا ہمارے بس کا روگ نہیں' بنا بریں جب عالم آخرت میں شرف و عظمت کے معیاروں کی بابت اس طرح رائے قائم کرنا صحیح ہے تو پھر کیا حرج ہے کہ اس طرح کے امکانی پہلو اس دنیا کے بعض دیگر امور میں بھی تسلیم کئے جائیں!

امت محمدیہؐ کا انحصاری مصداق

تفسیر العیاشی میں مذکور ہے زبیری نے بیان کیا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی' یہ فرمایئے کہ ''امت محمدؐ'' سے کون لوگ مراد ہیں؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: امت محمدؐ صرف بنی ہاشم ہیں' میں نے عرض کی اس کی دلیل کیا ہے کہ امت محمدؐ آنحضرتؐ کے اہل بیتؑ ہی ہیں کہ جن کا آپ نے تذکرہ فرمایا ہے نہ کہ ان کے علاوہ کوئی اور؟ امامؑ نے جواب دیا کہ اس کی دلیل یہ آیت مبارکہ ہے:

''وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ۖ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾''

(اور جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ خانہ کعبہ کی دیواریں کھڑی کر رہے تھے تو انہوں نے کہا پروردگارا! ہمارا یہ عمل قبول فرما کہ تو ہی سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے' پروردگارا! ہمیں اپنا مسلمان قرار دے اور ہماری ذریت و نسل میں سے ایک

امت بنا جو تیری مسلمان ہو (امت مسلمہ) اور ہمیں ہمارے مناسک و اعمال سے آگاہ فرما اور ہماری توبہ قبول فرما کہ تو ہی توبہ قبول کرنیوالا مہربان ہے)

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا کا تذکرہ ہے' پس خداوند عالم نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کی ذریت میں سے ایک "امت مسلمہ" قرار دی اور اس امت میں ایک "رسول" معبوث فرمایا جو انہی میں سے تھا جو ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرتا تھا اور ان کے نفوس کو پاک کرتا تھا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا تھا' اس دعا کے بعد ابراہیمؑ نے ایک اور دعا مانگی اور اس میں "امت مسلمہ" کے لیے خدا کے حضور یہ درخواست کی کہ انہیں شرک و بت پرستی سے پاک رکھے تا کہ ان میں امر الٰہی نافذ ہو سکے اور وہ کسی کا اتباع و پیروی نہ کریں' چنانچہ انہوں (ابراہیمؑ) نے عرض کی:

سورہ ابراہیم، آیت ۳۶:

★ "وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" ۔

(اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے دور رکھ' پروردگارا! انہوں (بتوں) نے بہت لوگوں کو بھٹکا دیا ہے پس جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو ہی معاف کرنے والا مہربان ہے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آئمہؑ اور امت مسلمہ کہ جن میں حضرت محمدؐ کو معبوث کیا گیا حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہی ہیں کیونکہ آپؑ (ابراہیمؑ) نے دعا میں یوں کہا: "وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ... (مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے دور رکھ)۔

توضیح وتشریح:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا استدلال نہایت واضح ہے اور آنجنابؑ نے آیت مبارکہ کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ "امت محمدؐ" سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہی ہیں کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ ان کی ذریت و نسل سے ہی "امت مسلمہ" قرار دے' اور پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ انہوں نے اپنی دعا کے ذیل میں عرض کی "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا ......" پروردگارا! ان میں ایک رسول معبوث فرما جو انہی میں سے ہو' تو ثابت ہوا کہ "امت مسلمہ" سے مراد "امت محمدؐ" ہے اور "امت محمدؐ" سے مراد وہ سب لوگ نہیں جن کی طرف آنحضرتؐ کو معبوث کیا گیا اور نہ ہی اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جو آنحضرتؐ پر ایمان لائے کیونکہ اگر "امت محمدؐ" سے مذکورہ معانی مراد لیے جائیں تو اس میں ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی ذریت و نسل کے علاوہ دیگر افراد بھی شامل ہوں گے جبکہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی دعا میں صرف اپنی ذریت و نسل سے "امت مسلمہ" قرار دینے کی درخواست کی گئی ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ "امت مسلمہ"...... امت محمدؐ...... ابراہیمؑ کی ذریت و نسل ہی سے ہے' اور پھر حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ الٰہی میں یہ بھی عرض کی کہ انہیں اور ان کی ذریت و اولاد کو شرک و بت پرستی سے دور رکھ

یعنی مقام عصمت عطا فرما (معصوم قرار دے) جبکہ یہ بات واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ کی ذریت یعنی اعراب مضر اور بالخصوص قریش میں کافر و مشرک اور گمراہ لوگ بھی تھے بنابرایں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تمام "ذریت" مراد نہیں بلکہ صرف وہی افراد مراد و مقصود ہیں جو ان کی اولاد میں سے معصوم ہیں یعنی حضرت محمدؐ اور ان کی عترت اہل بیتؑ۔ لہٰذا یہ کہنا بجا اور درست ہوگا کہ جس "امت مسلمہ" کی دعا حضرت ابراہیمؑ نے مانگی اس سے مراد "امت محمدؐ" ہے اور "امت محمدؐ" سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہیں، شاید اسی وجہ سے آیت میں پہلے "ذریت" یعنی نسل کا لفظ استعمال ہوا پھر اسے بدل کر لفظ **"بنی"** (اولاد) استعمال کیا چنانچہ بعد والے جملہ "فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّهٗ مِنِّیۡ ۚ وَمَنۡ عَصَانِیۡ فَاِنَّكَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ "فمن" میں "ف" تفریع کے لیے ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے کی فرع یعنی شاخ اور اس سے مربوط نتیجہ کی حیثیت رکھتا ہے گویا انہوں نے یوں کہا: پس جس نے میری پیروی کی وہ میری ذات کا حصہ ہے...... وہ مجھ سے ہے......، ان کے علاوہ باقی تمام لوگوں کے بارے میں انہوں (ابراہیمؑ) نے سکوت اختیار کیا گویا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں، بہر حال آیت کے اس جملہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ "ذریت" سے مراد مخصوص ہستیاں ہیں۔

اور جہاں تک امامؑ کے اس ارشاد گرامی کا تعلق ہے کہ "حضرت ابراہیمؑ نے اپنی "ذریت" کے لیے شرک و بت پرستی سے پاک رہنے کی دعا مانگی" تو اگرچہ بظاہر اس طہارت و پاکیزگی سے مراد شرک و بت پرستی سے دور رہنا ہے لیکن چونکہ آنجنابؑ نے اس ...... بت پرستی ...... کا سبب ضلالت و گمراہی کو قرار دیا ہے اس لیے اس سے مراد یہ ہوگا کہ گمراہی کی تمام قسموں، بت پرستی اور ہر طرح کے شرک یہاں تک کہ ہر معصیت و گناہ سے پاک رکھنے کی دعا کی گئی ہے کیونکہ ہر معصیت و نافرمانی (جیسا کہ سورہ فاتحہ کی آیت ۶ (صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ) کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے) ایک طرح کا شرک ہے۔

اس مقام پر یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے مذکورہ بالا بیان میں ارشاد فرمایا ہے کہ "آئمہؑ اور امت مسلمہ" ابراہیمؑ کی ذریت و نسل ہی سے ہیں" تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دونوں ایک ہی ہیں، دونوں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے ہیں۔

ایک ممکنہ اعتراض اور اس کا جواب

یہاں ایک اعتراض ممکن ہے اور وہ یہ کہ اگر اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات مثلاً سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۰ (كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ . . .) میں "امت" سے مراد چند مخصوص افراد ہوں نہ کہ ساری امت، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "امت" کے لفظ کو کسی صحیح وجہ کے بغیر مجازی طور پر چند افراد کے لیے استعمال کیا گیا ہے جبکہ خدا کے کلام میں مجازی استعمالات کا تصور ہی نادرست ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قرآنی بیانات کے بارے میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ ان کا مخاطب ساری امت محمدیہ اور ہر وہ شخص ہے جو آنحضرتؐ پر ایمان لایا ہو نہ کہ چند مخصوص افراد۔ بنابرایں لفظ "امت" سے چند

مخصوص ہستیاں مراد لینا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ "امت" کے استعمال میں ہر وہ شخص مراد لینا جو آنحضرتؐ پر ایمان لایا ہو ایک نئی اصطلاح ہے جو نزول قرآن اور دعوت اسلامیہ...... اسلام کے آفاقی پیغام...... کے عام ہونے کے بعد وجود میں آئی ہے ورنہ "امت" کا اصل معنیٰ "قوم" ہے جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

سورہ ہود، آیت ۴۸:

★ "عَلٰٓی اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ"...،

(ان اقوام پر جو آپ کے ساتھ ہیں اور وہ اقوام جنہیں ہم اپنی عنایات سے بہرہ مند کردیں گے)۔

اس آیت میں لفظ "امم" جو کہ "امت" کی جمع ہے قوموں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس کے علاوہ بعض مقامات میں یہ لفظ (امت) صرف ایک فرد کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو:

سورہ نحل آیت ۱۲۰:

★ "اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ"...،

(ابراہیمؑ ایک امت تھا جو اطاعت الٰہی میں سرگرم عمل تھا)۔

اس آیت میں لفظ "امت" صرف ایک فرد (ابراہیمؑ) کے لیے استعمال ہوا ہے۔

بنابرایں یہ ثابت ہوا کہ لفظ (امت) مختلف موارد و مقامات میں موقع و محل کی مناسبت سے مختلف معنی رکھتا ہے اور صرف اسی معنے میں استعمال ہوتا ہے جو وہاں مراد لیا گیا ہو لہٰذا آیت مبارکہ "رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ..." جو کہ مقام دعا میں ہے اور اس کی بابت ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ اس میں "امت" سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں میں سے چند مخصوص افراد ہیں، اسی طرح آیت مبارکہ "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" جو کہ مقام امتنان و اعزاز اور تعظیم و تکریم میں ہے اور "امت" کی عظمت و شوکت کے اظہار کے لیے ہے اس میں لفظ "امت" سے ساری امت ہرگز مراد نہیں بلکہ اس سے مراد چند مخصوص ہستیاں ہی ہیں اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس آیت میں "امت" کا لفظ اس دور کے فرعونوں، سرکشوں اور دشمنان دین کہ جو ہمیشہ دین کے آثار محو کرنے اور اولیاء الٰہی کی اہانت و ہتک حرمت میں سرگرم عمل رہے ان پر صادق آئے، بہرحال اس آیت کی بابت تفصیلی تذکرہ اس کے مربوط مقام پر ہوگا اور ہم اس امر کی وضاحت کریں گے کہ "امت" کی بحث سورۂ بقرہ کی آیت ۴۷ کے مانند ہے جس میں خداوند عالم نے "بنی اسرائیل" سے مخاطب ہو کر یوں ارشاد فرمایا: "اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ" کہ میں نے تمہیں عالمین پر برتری عطا کی، جبکہ "بنی اسرائیل" میں سے "قارون" بھی تھا اور یہ ہرگز ممکن نہیں کہ وہ بھی برتری عطا کئے جانے میں شامل ہو لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ "بنی اسرائیل" کے لفظ سے پوری قوم مراد نہیں، جیسا کہ حضرت پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں سورۂ فرقان کی آیت (۳۰) میں یوں ذکر ہوا:

★ "وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا"۔

(رسولؐ نے کہا پروردگارا! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا ہے)

اور یہ بات واضح ہے کہ اس آیت میں لفظ "قوم" سے مراد پوری قوم نہیں کیونکہ اس میں ایسی جلیل القدر شخصیات بھی پائی جاتی ہیں جو "اولیائے قرآن" کہلاتی ہیں یعنی ان کا اوڑھنا بچھونا ہی قرآنی علوم و معارف ہیں اور وہ ہمیشہ قرآن کے ساتھ تمسک رکھتی ہیں اور دنیا کے امور انہیں خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے' اس سے ثابت ہوا کہ لفظ "قوم" ساری قوم کے لیے نہیں استعمال کیا گیا' لیکن جہاں تک سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۴ کا تعلق ہے تو اس میں "امت" سے مراد ساری امت ہے نہ کہ چند مخصوص افراد' ملاحظہ ہو:

★ "تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔۔۔،

(یہ امت جو گزر چکی ہے اسے وہی کچھ ملے گا جو اس نے عمل کیا اور تمہیں وہ ملے گا جو تم نے عمل کیا...... ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا ملے گی ......اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں ہرگز سوال نہ کیا جائے گا)۔

اس آیت کے مخاطب تمام اہل اسلام اور حضرت پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لانے والے سب حضرات ہیں' یا ہر وہ شخص مخاطب ہے جس کے لیے آنحضرتؐ کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔

ایک علمی بحث

جب ہم حضرت ابراہیمؑ کے حالات و واقعات میں ان کے آغازِ عمل' اسماعیلؑ و ہاجرہؑ کو سرزمین مکہ میں لا کر انہیں وہاں قیام پذیر کرانا' ان (اسماعیلؑ و ہاجرہؑ) کی سرگزشت' اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کا واقعہ اور خدا کی طرف سے اس کا فدیہ دینا اور پھر ان دونوں باپ بیٹے (ابراہیمؑ و اسماعیلؑ) کا خانۂ کعبہ کو تعمیر کرنے کے واقعہ کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام واقعات درحقیقت عبودیت و بندگی کے روحانی سفر کی ایسی پاکیزہ تاریخ ہیں جس میں بندہ اپنی ذات کے حصار سے باہر نکل کر اپنے پروردگار کے قرب کی منزل تک جا پہنچتا ہے اور دنیا کی فنا پذیر لذتوں' آسائشوں' زیب و زینت' آرزوؤں' تمناؤں' مادی خواہشوں' جاہ و جلال' اہل و عیال اور متاع و مال سے منہ موڑ کر اور شیطانی وسوسوں کو جو کہ دلوں کو ناپاک خواہشوں سے آلودہ کر دیتے ہیں پامال کر کے اپنی تمام تر توجہات کا رخ کردگار عالم کی کبریائی کے پاکیزہ مقام کی طرف کر دیتا ہے یعنی اپنے آپ کو دنیا کی پستی سے نکال کر مقام ربوبیت کے بلند ترین مقامات کے قریب کرنے میں کوشاں اور پھر بالآخر...... کامیاب ہو جاتا ہے۔

یہ تمام متفرق واقعات اپنی مخصوص ترتیب و تسلسل کے ساتھ ایک ایسی تاریخی داستان کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک بندے کے اپنے مولا و آقا تک پہنچنے کے سفر نامہ کا درجہ رکھتی ہے' اور وہ ایسے سفر کے ذکر پر مشتمل ہے جو بندے نے خدا کی

طرف کیا اور وہ "سیر و سلوک" کے آداب شوق دید رسم محبت اور خلوص و چاہت کی گہرائی کی امین ہے اس میں ایک سچے عاشق کے جذبات کی تصویر اور اپنے معشوق کی محبت میں کائنات کی ہر چیز قربان کر دینے والے محب کے عملی احساس کا عکس نظر آتا ہے کہ اس پاکیزہ سفرنامہ کا جس باریک بینی اور عمیق نظروں سے مطالعہ کیا جائے اور اس کے گونا گوں پہلوؤں کو عارفانہ نظر سے دیکھا جائے اتنا ہی حقائق و اسرار اور علوم و معارف کی روشنی حاصل ہوگی اور دل و دماغ اور فکر و نظر نور معرفت سے منور ہو جائیں گے۔

حج کے حکم کا اعلان

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ خداوند عالم نے اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں کو اعمال حج انجام دینے کا حکم دیں چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورہ حج، آیت ۲۷:

★ "وَ اَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ"...،

(لوگوں میں حج کا اعلان کرو تا کہ پا پیادہ اور سوار سب دور دور سے تمہارے پاس آئیں)۔

اگرچہ "حج" کے وہ اعمال جن کے بجالانے کا حکم حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں کو دیا ان کی تفصیلات سے ہم آگاہ نہیں لیکن اجمالی طور پر یہ بات معلوم ہے کہ زمانۂ جاہلیت یعنی ظہور اسلام سے پہلے عربوں کے درمیان "حج" ایک دینی فریضہ سمجھا جاتا تھا اور جب خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو انہوں نے بھی اپنی امت کو "حج" کے اعمال بجالانے کا حکم دیا اور وہ اعمال حضرت ابراہیمؑ کے بتائے ہوئے اعمال حج سے ہرگز مختلف نہ تھے بلکہ ان کی تکمیلی صورت تھی جیسا کہ درج ذیل آیات مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے:

سورہ انعام، آیت ۱۶۱:

★ "قُلۡ اِنَّنِیۡ هَدٰىنِیۡ رَبِّیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۚ دِیۡنًا قِیَمًا مِّلَّۃَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا"۔

(کہہ دیجئے کہ مجھے میرے پروردگار نے صراط مستقیم...... سیدھے راستہ...... کی ہدایت فرمائی ہے جو کہ مضبوط ترین دین اور ابراہیمؑ کا واضح آئین ہے۔

سورہ شوریٰ، آیت ۱۳:

★ "شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی"،

(تمہارے لیے جس دین کو مقرر کیا اسی کا حکم نوحؑ کو دیا، اور یہ وہی ہے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اور وہی ہے جس کا حکم ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا)۔

بہرحال حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعمال حج میں جن چیزوں کا حکم دیا یعنی احرام، عرفات میں ٹھہرنا، مشعر میں رات گزارنا، قربانی کرنا، رمی جمرات (شیطانوں کو پتھر مارنا) سعی (صفا ومروہ کے درمیان چلنا)، طواف اور مقام ابراہیمؑ میں نماز ادا کرنا، یہ سب حضرت ابراہیمؑ کے واقعات، بیٹے کی قربانی اور ان سے تعلق رکھنے والے دیگر حالات کی یاد تازہ کرتے ہیں، ان میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کام کس قدر معنوی وروحانی عظمت کے حامل ہیں اور ان میں خدا اور بندے کے درمیان پائے جانے والے پاکیزہ جذبوں کا کتنا دخل ہے، حقیقت یہ ہے کہ اعمال حج میں ایک طرف تو خدا کی مخصوص عنایتوں اور توجہات کی پاکیزہ کشش پائی جاتی ہے جو بندے کو خالق کے قریب کر دیتی ہے اور دوسری طرف خود بندے کی ذاتی احتیاج اور اقتضائے بندگی ان اعمال کی بجا آوری کی راہ ہموار کرنے کا سبب ہے۔

اگر حقیقت بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ بات نہایت واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ عبادات جن کے انجام دینے کا شریعت الٰہیہ میں حکم دیا گیا ہے وہ دراصل مقام بندگی میں درجۂ کمال پر فائز ہستیوں مثلاً انبیاء کرام علیہم السلام کے وہ پاکیزہ انداز واطوار ہیں جو انہوں نے اپنے پروردگار کے حضور آداب بندگی بجالانے کے لیے اختیار کئے اور ایسے نقوش وآثار ہیں جو ان مقدس ہستیوں کے پاکیزہ جذبات واحساسات کی عکاسی کرتے ہیں اور ہمیں ان سے اطاعت وحصول قرب الٰہی کا عملی درس ملتا ہے جیسا کہ خود پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ احزاب، آیت ۲۱:

★ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"۔

(رسولؐ خدا کی پاکیزہ زندگی تمہارے لیے بہترین نمونۂ عمل ہے)

یہی اطاعت وبندگی کی حقیقی بنیاد اور بنیادی اصول ہے، اور جن روایات میں عبادات کی حکمتوں اور احکام کے اسرار ورموز کو ذکر کیا گیا ہے ان سے بھی اسی امر کی تصدیق ہوتی ہے..... کہ یہ سب اعمال انبیاءؑ الٰہی کے وہ انداز ہائے بندگی ہیں جو انہوں نے اطاعت کردگار میں اپنائے۔

آیات ۱۳۰ تا ۱۳۴

○ وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي
الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

○ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

○ وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا
تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ؕ

○ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا
وَّاحِدًا ۖۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

○ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

ترجمہ

O ''کون ہے جو دین ابراہیمؑ سے روگردانی کرے سوائے اس کے کہ جو بے وقوف و ناسمجھ ہو' ہم نے تو اسے (ابراہیمؑ کو) دنیا میں منتخب کر لیا ہے اور وہ آخرت میں نیک و صالح لوگوں میں سے ہے''۔ (۱۳۰)

O ''جب اس سے اس کے پروردگار نے کہا اسلام لے آؤ تو اس نے کہا میں عالمین کے پروردگار پر اسلام لاتا ہوں''۔ (۱۳۱)

O '' اور اسی ...... دین ...... کے بارے میں ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی ...... اور کہا ...... میرے بیٹو! خدا نے اس دین کو تمہارے لیے منتخب کیا ہے اور تم دین اسلام ہی کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کرنا (زندگی بھر مسلمان رہنا)۔ (۱۳۲)

O ''آیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی موت کا وقت آیا جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا: ہم آپؑ کے خدا کی عبادت کریں گے جو کہ آپؑ کے آباء ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کا خدا ہے جو کہ ایک ہے اور ہم سب اس کے حضور سر تسلیم خم کرتے ہیں (اس کے مسلمان ہیں)۔ (۱۳۳)

O ''وہ ایک امت تھی جو گزر چکی' ان کے اعمال ان کے ساتھ اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں ہرگز سوال نہیں کیا جائے گا''۔ (۱۳۴)

تفسیر و بیان

ملت ابراہیمی سے منہ موڑنے والے

O "وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ"

(کون ہے جو ابراہیمؑ کے دین وآئین سے روگردانی کرے سوائے اس کے، جو سفیہ و بیوقوف ہو)۔

عربی زبان میں "رغبت" کا تعدیہ "عن" (سے) کے ساتھ ہو تو اس کا معنی "منہ پھیر لینا" اور نفرت کرنا ہے اور اگر اس کا تعدیہ "فی" (میں) سے ہو تو اس کا معنی، شوق واشتیاق اور توجہ والتفات ہے' زیر بحث آیت میں "رغبت" کا تعدیہ "عن" کے ساتھ ہوا ہے (یرغب عن) تو اس کا معنی روگردانی اور منہ پھیرنا ہے۔

"سفہ" کے بارے میں اہل ادب کا کہنا ہے کہ اسے لازم اور متعدی دونوں طرح سے استعمال کیا جاتا ہے (فعل لازم اسے کہتے ہیں جو اپنے فاعل کے ساتھ اپنا پورا معنی دیتا ہو اور فعل متعدی اسے کہتے ہیں جسے اپنے معنے کے لیے فاعل کے ساتھ ساتھ مفعول کی بھی ضرورت ہو) یہی وجہ ہے کہ بعض اہل ادب کا خیال ہے کہ آیت میں "نفسہ"، فعل "سفہ" کا مفعول ہے لیکن بعض حضرات اسے (نفسہ کو) مفعول تسلیم نہیں کرتے بلکہ "تمیز" مانتے ہیں' بہر حال دونوں صورتوں میں آیت کا معنی یوں ہوگا: آئین ابراہیمی سے روگردانی حماقت ہے اور نفع ونقصان کے درمیان تمیز نہ کر سکنے کی نشانی ہے' اسی سے اس مشہور و معروف حدیث شریف کے معنے کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے: "ان العقل ما عبدبه الرحمان "عقل وہ ہے جس کے ذریعے خدا کی عبادت و پرستش کی جائے' (یاد رہے کہ زیر نظر آیت میں آئین ابراہیمی سے روگردانی کرنے والوں کو سفیہ و بے عقل کہا گیا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حقیقی معنی میں "عقل" انسان کو خدا کی عبادت و بندگی کا حکم دیتی ہے اور جو خدا کی عبادت...... جس کا حکم آئین ابراہیمی میں دیا گیا ہے...... سے روگردانی کرے وہ عقلمند نہیں بلکہ بیوقوف و سفیہ ہے)۔

ابراہیمؑ کا خدائی انتخاب

O " وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا "

(یقیناً ہم نے اسے دنیا میں چن لیا ہے)۔

"اصطفائ" یعنی چن لینا' مخلوط اشیاء میں سے خالص چیز کا نکالنا (جب کوئی چیز کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط ہو جائے تو اسے اس دوسری چیز سے بالکل الگ کر لینا)۔

جب ہم "اصطفائ" کو مذکورہ معنی کے ساتھ مقام ولایت کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ لفظ خلوص بندگی اور اخلاص عبودیت کے اس عظیم مرتبہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں ایک بندہ اپنی زندگی کے تمام امور میں اپنے مقتضائے بندگی کے عین مطابق اپنے پروردگار کے حضور سر تسلیم خم کیے ہوئے ہو اور اس کا تن' من' دھن اپنے مولا و آقا کی اطاعت کا مکمل ترجمان ہو یعنی اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں دین پر مکمل عمل پیرا ہو کیونکہ "دین" حقیقی معنی میں مکمل اطاعت اور دنیا و آخرت کے امور میں تقاضائے بندگی کی تکمیل کے اصولوں کا مجموعہ ہے اور دینداری سے مراد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ بندہ اپنے تمام امور میں اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کو اساس و بنیاد قرار دے گویا اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے چنانچہ دین کی حقیقت کے بیان میں ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ آل عمران، آیت ۱۹:

★ " اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ "......

(بے شک خدا کے نزدیک دین صرف "اسلام" ہے)

اس سے ثابت ہوا کہ مقام "اصطفائ" حقیقت میں اور بعینہ مقام اسلام ہے' ان دونوں میں اصل و حقیقت کے حوالہ سے کوئی فرق نہیں جیسا کہ اس کی تصدیق بعد والی آیت (۱۳۱) سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے:

" اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "

(جب اسے اس کے پروردگار نے کہا اسلام لے آؤ' تو اس نے کہا میں عالمین کے پروردگار پر اسلام لاتا ہوں)

کیونکہ بظاہر اس میں "اذ" (جب) جو کہ ظرف زمان ہے کا تعلق "اصطفیناہ" (ہم نے اسے چن لیا) سے ہے' بنابراین آیت کا معنی یوں ہوگا: جب خداوند عالم نے ابراہیمؑ سے کہا اسلام لاؤ اور انہوں نے کہا میں اسلام لایا عالمین کے پروردگار پر' تو اس وقت خدا نے انہیں چن لیا (مقام اصطفاء عطا کیا)' گویا جملہ " اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ " دراصل "اصطفیناہ" کی تفسیر کے طور پر ہے۔

اس آیت میں دو طرح سے انداز بیان میں تبدیلی ہوئی ہے: ایک مرتبہ "متکلم" کے انداز کے بجائے "غائب" کا انداز اور پھر "مخاطب" کے انداز کے بجائے "غائب" کا انداز اختیار کیا گیا ہے ملاحظہ ہو:

پہلے کہا گیا: " اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ "
(جب اس کے رب نے اس سے کہا اسلام لاؤ)۔
اس میں "قلنا " (ہم نے کہا) کی بجائے "قال له ربه " (اس کے رب نے اس سے کہا) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔
پھر یوں کہا گیا: " قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "
(اس نے کہا میں عالمین کے رب پر اسلام لایا)۔
اس میں "اسلمت لک" (میں تجھ پر اسلام لایا) کی بجائے "اسلمت لرب العالمین" (میں عالمین کے رب پر اسلام لایا) کہا گیا۔
یعنی پہلی صورت میں یوں کہنا چاہیے تھا:
"اذقلنا له اسلم " (جب ہم نے اس سے کہا اسلام لاؤ)
اور دوسری صورت میں جواب یوں ہوتا:
"اسلمت لك " (میں تجھ پر اسلام لایا)۔
لیکن "قلنا" جو کہ جمع متکلم کا صیغہ ہے کی بجائے "غائب" کا انداز اختیار کیا گیا اور یوں کہا گیا: "اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ " (جب اس سے اس کے رب نے کہا) اور "اسلمت لک" جو کہ مخاطب کی ضمیر کے ساتھ ہے اس کی بجائے غائب کے انداز میں یوں کہا گیا: " اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " (میں عالمین کے رب پر اسلام لایا)۔
اندازِ سخن کی اس تبدیلی کو علمی اصطلاح میں "التفات" کہا جاتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس "التفات" کی وجہ یا اس کی حکمت کیا ہو سکتی ہے کیونکہ یہ کسی اہم نکتہ سے خالی نہیں ہوتا؟
تو جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے کہ اس میں "متکلم" کی بجائے "غائب" کا انداز اپنایا گیا ہے اس میں یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو ایک راز کے ساتھ ہو رہی ہے جو ابراہیمؑ اور خداوند عالم کے درمیان تھا اور کوئی تیسرا شخص اس سے آگاہ و مطلع نہیں، کیونکہ اگر "متکلم" کا انداز اپنا کر یوں کہا جاتا کہ "جب ہم نے ابراہیمؑ سے کہا" تو اس سے یہ ظاہر ہوتا کہ جس کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ بھی اس واقعہ سے آگاہ و مربوط ہے لیکن "غائب" کے انداز میں بیان کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ سننے والے اس واقعہ سے بے خبر ہیں گویا ان کے اور "متکلم" یعنی واقعہ بیان کرنے والے کے درمیان پردہ حائل ہے اور وہ ان اسرار آمیز واقعات میں سے ایک ہے جو انس و خلوت کے ماحول میں وقوع پذیر ہوتے ہیں اور چونکہ خدا کی ابراہیمؑ کے ساتھ اسلام لانے کے بارے میں گفتگو میں ایک ایسا راز تھا جو صرف ان دونوں ہی کو معلوم تھا اس لیے خداوند عالم نے اس کا تذکرہ اس انداز میں کیا جس سے سننے والے کی اس راز سے بے اطلاعی کا عندیہ مل جائے۔

اور دوسری صورت میں "مخاطب" کے انداز کے بجائے "غائب" کا انداز اپنانے میں بظاہر یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ جملہ "اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ" ... جب اس سے اس کے رب نے کہا... خداوند عالم کی ابراہیمؑ پر خاص نظر عنایت کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ خدا نے اس جملہ میں اپنے آپ کو "اس کا رب" کہہ کر بات کی ہے جس سے ایک خاص تعلق وعنایت کی عکاسی ہوتی ہے لیکن آدابِ بندگی اس بات کے متقاضی ہیں کہ ابراہیمؑ اظہار سخن میں مقام ربوبیت کی حرمت وعظمت کی پاسداری کریں اور اپنی "بندگی" کی حدود میں رہ کر تواضع وانکساری کے ساتھ جواب دیں تاکہ یہ ثابت ہو کہ وہ کسی غرور یا اس غلط فہمی کا شکار نہیں کہ صرف وہی ہیں جو خدا کی اس خاص عنایت کے حقدار ہیں اور ان کے سوا کسی کو یہ شرف اور انس کا اعزاز حاصل نہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو خدا کے ان حقیر وناچیز بندوں میں سے ایک سمجھتے ہیں جو ہر حال میں پروردگار عالم کے محتاج ہیں اور اسی کے سامنے سر تسلیم ونیاز خم کئے ہوئے ہیں اس لیے انہیں یہی کہنا چاہیے کہ میں عالمین کے پروردگار کے حضور سر تسلیم خم کرتا ہوں (اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ)۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ "اسلام" "تسلیم" اور "استسلام" تینوں ایک ہی معنی میں آتے ہیں اور یہ سب "سلم" سے مشتق ہوئے ہیں۔ اور یہ سب اس مقام پر استعمال ہوتے ہیں جہاں ایک چیز دوسری چیز کی سراپا اطاعت گزار ہو اور کسی بھی صورت میں اس کی معصیت اور اس سے روگردانی نہ کرے؛ چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورہ بقرہ، آیت ۱۱۲:

★ "بَلٰی ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ"

(ہاں! جس نے اپنا چہرہ (اپنے آپ کو) خدا کے سامنے جھکا دیا)۔

سورہ انعام، آیت ۷۹:

★ "وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا"۔

(میں نے اپنا رخ اس کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، خالص مسلمان ہو کر)۔

عربی زبان میں "وجہ" اس چیز کو کہتے ہیں جو آپ کے سامنے ہو، چونکہ انسان جب کسی کے سامنے ہوتا ہے تو اس کا چہرہ اس کے روبرو ہوتا ہے اس لیے لفظ "وجہ" یعنی چہرہ استعمال کیا جاتا ہے (تاہم "وجہ" سے مراد "طرف" اور "سمت" ہے) ۔ اور جہاں تک بندوں کے خدا کے سامنے...... روبرو اور مقابل ...... ہونے کا تعلق ہے تو اس میں "وجہ" سے مراد ان کا تمام وجود ہے یعنی وہ سراپا خدا کے سامنے ہیں، بنابراین کسی انسان کے "اسلام لانے" سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ خدا کا فرمانبردار اور اطاعت گزار ہے اور خدا کی طرف سے صادر ہونے والے ہر حکم وفرمان کو دل وجان سے قبول کرتا ہے خواہ وہ حکم تکوینی ہو یعنی قضا وقدر کے باب سے ہو یا تشریعی ہو یعنی امر ونہی (احکامات) میں سے ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور حکم، ہر حال میں وہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے، البتہ اس اطاعت وفرمانبرداری کی مختلف کیفیتوں کے حوالہ

سے ''اسلام'' کے کئی مراتب و درجات ہیں ملاحظہ ہو:

۱۔ ''اسلام'' کا پہلا درجہ...... اور مرتبہ...... زبان پر کلمہء شہادتین...... توحید و رسالت کی گواہی اور اقرار...... جاری کرتے ہوئے خدا کے احکام یعنی ہر امر و نہی کو ظاہری طور پر قبول کرنا ہے خواہ اس زبانی اقرار میں دل بھی ساتھ ہو یا نہ ہو' جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہء حجرات، آیت ۱۴:

★ ''قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۖ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ''......

(اعراب نے کہا ہم ایمان لائے' ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لائے' ابھی تو ایمان تمہارے دلوں میں آیا ہی نہیں ہے)۔

یہ ہے اسلام کا پہلا درجہ و مرتبہ یعنی زبانی اقرار' اس کے بعد ''ایمان'' کا پہلا مرتبہ آتا ہے اور وہ ہے ''شہادتین'' کے معنی کا اجمالی طور پر دل سے یقین و عقیدہ رکھنا کہ جس کے نتیجے میں اسلام کے اکثر عملی دستورات کو بجالانے کی راہ کھلتی ہے۔

۲۔ اسلام کا دوسرا مرتبہ...... درجہ...... ''ایمان'' کے پہلے درجہ کے بعد شروع ہوتا ہے جو کہ دل کی گہرائیوں سے دین کے بنیادی اصولوں کو تفصیل سے جاننے کے بعد ان پر پختہ عقیدہ رکھنا اور ان پر عمل کرنا ہے' اور اس درجہ و مرتبہ میں اعمال صالحہ بجالائے جاتے ہیں تاہم اس درجہ میں غلطیوں کا سرزد ہونا امکان پذیر ہوتا ہے' خداوند عالم نے ''متقین'' کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:

سورہء زخرف، آیت ۶۹:

★ ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ''......

(وہ لوگ جو ایمان لائے ہماری آیات پر جبکہ وہ مسلمان تھے)۔

سورہء بقرہ، آیت ۲۰۸:

★ ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً''......

(اے ایمان والو! تم سب اسلام...... سلامتی و صلح کے دائرے...... میں آجاؤ)۔

ان دونوں آیتوں میں اہل ایمان کے بارے میں خطاب ہوا ہے' اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ یہ اسلام کا دوسرا مرتبہ و درجہ ہے جو کہ ایمان کے پہلے مرتبہ کے بعد آتا ہے کیونکہ خطاب ہی ان سے ہے یا ان کے بارے میں ہے جو ایمان لا چکے ہیں (اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) اور اسلام کا یہ دوسرا مرتبہ پہلے مرتبہ سے یقیناً مختلف ہے' اسلام کے اس درجہ و مرتبہ کے بعد ایمان کا دوسرا مرتبہ شروع ہوتا ہے جو کہ تمام دینی حقائق...... معارف و احکام ...... پر پورے طور پر ایمان

لانے سے عبارت ہے چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورۂ حجرات، آیت ۱۵:

★ " اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ يَرۡتَابُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ " ۔

(مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے اور پھر کسی طرح کے شک کا شکار نہ ہوئے اور انہوں نے اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کیا' وہی لوگ ہی سچے ہیں)۔

سورۂ صف، آیت ۱۱:

★ " يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنۡجِيۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۞ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ " -----،

(اے اہل ایمان! آیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات عطا کرے' خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو)۔

ان دو آیتوں میں "اہل ایمان" سے خطاب ہوا ہے اور انہیں ایمان لانے کی نصیحت کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس ایمان لانے کی نصیحت کی گئی ہے وہ اس "ایمان" سے مختلف ہے جو وہ پہلے لا چکے ہیں۔

۳۔ اسلام کا تیسرا مرتبہ و مرحلہ جو کہ ایمان کے دوسرے مرتبہ کے بعد آتا ہے وہ یوں ہے کہ جب انسان ایمان کے دوسرے مرتبہ و درجہ میں کمال حاصل کر لے اور اس حد تک پہنچ جائے کہ اس مرتبہ کے تمام تقاضے پورے کرتا ہو تو اس کی تمام حیوانی قوتیں اس کے ہاتھوں رام ہو جائیں گی اور وہ ان پر مکمل طور پر قابو پالے گا بلکہ ان تمام قوتوں کو اپنے زیر فرمان لانے میں کامیاب ہو جائے گا اور دنیا کی فنا شعار لذتوں اور زوال آشنا زیبائشوں و آسائشوں کی طرف کھینچنے والی تمام قوتیں اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گی اور وہ خدا کی عبادت بجالانے میں معرفت و آگاہی کے اس مقام تک پہنچے گا کہ اسے یقین حاصل ہوگا کہ عبادت کرتے وقت گویا خدا کا دیدار کر رہا ہے اور اگر وہ خدا کا دیدار نہیں کر سکتا تو خدا اسے دیکھ رہا ہے (جیسا کہ ایک حدیث نبویؐ میں ہے: "اعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك" تو اللہ کی عبادت اس طرح سے بجالا گویا تو اسے دیکھ رہا ہے پس اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا (نہیں دیکھ سکتا) تو وہ تو یقیناً تجھے دیکھ رہا ہے) خلاصہ یہ کہ وہ اپنے ظاہر و باطن میں اطاعت الٰہی کی اس منزل و مقام پر فائز ہوتا ہے کہ کوئی طاقت اس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کر سکتی اور نہ اسے خدا کے اوامر و نواہی اور دستورات و فرامین کی بجا آوری سے باز رکھ سکتی ہے اور وہ ہر حال میں خدا کے احکام اور فیصلوں ۔۔ قضا و قدر...... کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے جیسے ایک مکمل فرمانبردار بندہ اپنے آقا کے حضور اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا عملی ثبوت پیش کرتا ہے' خداوند عالم کا ارشاد ہے:

سورہء نساء آیت ۶۵:

★ ” فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى لَّا كَ فِيْمَا اَبَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا وَافِيْ اَنْفُسِهِمْ مَنْ جَامِمَّا اِ وَ فِيْ اِ نَّ “ ...،

(تیرے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ تجھے اپنے تمام اختلافات میں فیصل تسلیم نہ کرلیں اور پھر آپ جو فیصلہ دیں اس کی بابت اپنے دلوں میں کوئی پریشانی وتنگی محسوس نہ کریں اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کردیں)۔

یہ ہے اسلام کا تیسرا مرتبہ: اور اسکے بعد ایمان کا تیسرا مرتبہ شروع ہوتا ہے چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہء مومنون، آیات ۱، ۲، ۳:

★ ”قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ “ ...،

(یقیناً اہل ایمان کامیاب ہوئے جو کہ اپنی نماز میں خشوع سے کام لیتے ہیں اور جو کہ لغو و بیہودہ باتوں سے منہ پھیرے رہتے ہیں)۔

انہی آیات (مومنون ۱، ۲، ۳) کے مانند ہی ہے زیر بحث آیت (اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)۔

البتہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسلام کے یہ دو مراتب یعنی دوسرا اور تیسرا دراصل ایک ہی ہیں اور فضیلت م آب صفات مثلاً رضا و تسلیم.... خدا کے ہر حکم وفیصلہ پر راضی رہنا اور اس کے ہر فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا خدا کی راہ میں آنے والی تکلیفوں پر صبر وتحمل سے کام لینا' زہد وتقویٰ میں درجہء کمال تک پہنچنا اور کسی سے دوستی و دشمنی کا معیار ”خدا“ کو قرار دینا وغیرہ بھی اسی مرتبہ و درجہ سے لازمی تعلق رکھنے والے امور میں شامل ہیں۔

۴۔ ایمان کے تیسرے مرتبہ ومرحلہ کے بعد اسلام کا چوتھا مرتبہ ومرحلہ شروع ہوتا ہے اور وہ اس طرح ہے کہ جب انسان اسلام کے تیسرے مرتبہ ومرحلہ میں ہوتو اس کی حالت ایک ایسے عبد وغلام جیسی ہوتی ہے جو اپنے مولا وآقا کا مکمل فرمانبردار ومطیع اور اس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہو اور جو کچھ بھی مولا اس سے طلب کرے یا مولا کی رضا و خوشنودی کے مطابق ہو وہ اسے انجام دیتا ہے' یہ تو ہے غلام کی اپنے آقا ومولا کا مملوک ہونے کے حوالہ سے اطاعت کی کیفیت' لیکن جہاں تک خداوند عالم کا عالمین کے مالک ہونے کا تعلق ہے تو وہ یقیناً اس سے کہیں بالاتر ہے کہ اس کا قیاس بندوں کی ملکیت اور اس کی حدود پر کیا جائے کیونکہ خدا کی ملکیت حقیقی ہے بلکہ ”ملکیت کی حقیقت“ ہی اسی کے پاس ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی کو کسی طرح کا استقلال ذات میں' صفات میں اور افعال میں حاصل ہی نہیں اور یہی بات خدا کے مقام کبریائی کے شایان شان ہے۔

بہر حال انسان جب اطاعت و فرمانبرداری اور تسلیم و رضا کے اس مرحلہ و مقام میں ہو تو اس بات کا قوی امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ خدا کی خصوصی عنایت اس کے شامل حال ہو جائے اور خدا اسے اس حقیقت کا مشاہدہ کروا دے "کہ پوری کائنات میں حقیقی مالکیت صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے" اور اس کے علاوہ کسی کو کسی چیز پر کوئی اختیار و مالکیت حاصل نہیں، جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی عنایت ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں...... تاہم یہ مقام "وہبی" ہے یعنی خدا کی طرف سے حاصل ہوتا ہے اس میں انسان کی چاہت کا کوئی عمل دخل نہیں لہٰذا عین ممکن ہے کہ آیت مبارکہ (رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا......) ...... پروردگارا! ہمیں اپنا مسلمان قرار دے اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسی امت بنا جو صرف تیرے سامنے سر تسلیم خم کرنے والی ہو اور ہمیں ہمارے مناسک و اعمال کا مشاہدہ کروا'...... میں اسلام کے اسی مرتبہ و مرحلہ کی طرف اشارہ مقصود ہے کیونکہ آیت "اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو اسلام لانے کا جو حکم دیا وہ تشریعی تھا تکوینی نہ تھا اور ابراہیمؑ نے اس حکم کو پورا کر دیا اور اپنے اختیار سے اسلام لا کر خدا کے فرمان کی اطاعت کی اور اپنے آپ کو اپنے رب کا فرمانبردار بندہ ثابت کیا' حالانکہ یہ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام کی بات ہے جبکہ انہوں نے اپنے اور اپنے فرزند اسماعیلؑ کے لیے اسلام اور مناسک و اعمال کے مشاہدہ کی جو دعا مانگی وہ ان کی زندگی کے آخری ایام میں تھی لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ دعا یقیناً ایک ایسی چیز کے بارے میں تھی جو ان کے دائرہ اختیار و قدرت سے باہر تھی اور وہ خود اس پر قادر نہ تھے یا یہ کہ وہ اس کے حصول پر تو قادر تھے لیکن اس کی بقا پر قادر نہ تھے اس لیے بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ ہمیں اپنا مسلمان قرار دے اور ہمیں ہمارے اعمال کا مشاہدہ کروا' بنابر ایں یہ بات ثابت ہوئی کہ زیر بحث آیت میں جس اسلام کی دعا مانگی گئی وہ اسلام کا یہی چوتھا مرحلہ و مرتبہ ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اور اس مرحلہ و مرتبہ کے بعد ایمان کا چوتھا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ حالت (اسلام کے چوتھے مرحلہ و مرتبہ میں حاصل ہونے والی کیفیت) انسان کے تمام احوال و افعال پر چھا جائے اور وہ بندگی کی اس معراج کو پالے کہ اس کا اوڑھنا' بچھونا ہی خدا کی فرمانبرداری ہو' چنانچہ خدا کا ارشاد ہے۔

سورہ یونس، آیت ۶۳:

★ "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ"...،

(یاد رکھو کہ خدا کے اولیاء..... سچے دوستوں.....کو کسی طرح کا خوف لاحق نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ غمگین ہوتے ہیں' وہی ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا)۔

یہ آیت بظاہر ایمان کے چوتھے مرحلہ و مرتبہ کو بیان کرتی ہے کیونکہ اس میں جن مومنین کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ یقیناً ایسے ہیں جو خدا کے علاوہ ہر چیز کے بے اختیار اور عاجز و ناتواں ہونے کا پختہ یقین رکھتے ہیں اور اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ خدا کے اذن کے بغیر کوئی سبب مؤثر واقع نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ نہ تو کسی ناگوار امر سے حزن و ملال کرتے ہیں اور نہ ہی امکانی خطرہ سے خوفزدہ ہوتے ہیں ورنہ اگر وہ "یقین" کے اس مقام تک نہ پہنچے ہوں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ کسی ناگوار واقعہ سے

محزون و غمگین اور کسی خطرے سے خوفزدہ نہ ہوں؛ بنا بر ایں ثابت ہوا کہ ایمان کا یہ مرحلہ و مرتبہ، اسلام کے چوتھے مرحلہ و مرتبہ کے بعد آتا ہے (غور کریں)۔

آخرت کا مقام و مرتبہ

O "وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ"

(اور وہ آخرت میں صالحین میں سے ہے)۔

عربی زبان میں "صلاح" کسی طرح کی بھی اہلیت ..... صلاحیت ..... کو کہتے ہیں؛ قرآن مجید میں یہ لفظ کہیں تو انسان کے عمل کے ساتھ اور کہیں خود اس کی ذات کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے؛ نمونہ کے طور پر دو آیتیں ملاحظہ ہوں:

سورہ ءکہف، آیت ۱۱۰:

★ "فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا" ...،

(پس اسے نیک کام ..... عمل صالح ..... انجام دینا چاہیے)۔

سورہ ءنور، آیت ۳۲:

★ "وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ ..."،

(اور تم ان کا نکاح کرو جو تم میں سے کنوارے ہیں اور تمہاری کنیزوں میں سے جو صالحین ہیں)۔

پہلی آیت میں عمل کو "صالح" کہا گیا ہے اور دوسری آیت میں خود انسان کو اس صفت سے موصوف کیا گیا ہے۔

عمل کے صالح ہونے کی بابت اگرچہ قرآن مجید میں کوئی خاص وضاحت و تفسیر موجود نہیں تاہم اس کے آثار کو بیان کیا گیا ہے جن سے اس کے معنی و مراد کی وضاحت ہو جاتی ہے؛ عمل صالح کے جو آثار قرآن مجید میں ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

☆ عمل صالح کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذات کردگار کی رضا و خوشنودی کے حصول کا سبب ہے؛ چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ ءرعد آیت ۲۲:

"صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ..."،

(انہوں نے صبر کیا اپنے رب کی رضا کی خاطر)

سورہ ءبقرہ آیت ۲۷۲:

"وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ" ...،

(اور تم انفاق نہیں کرو گے مگر خدا کی رضا کی خاطر)۔

ان آیات میں صبر اور انفاق کو جو کہ عمل صالح کے مصداق ہیں ذات الٰہی سے مربوط کر کے اس کی رضا کے حصول کا سبب بتایا گیا ہے۔

☆عمل صالح کے آثار وخصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اجر وثواب کا موجب بنتا ہے خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہ ء قصص، آیت ۸۰:

"ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا" ۔۔۔،

(خدا کا ثواب بہتر ہے ہر اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دے)۔

☆عمل صالح کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پاکیزہ کلمات کو خدا کی طرف بلند کرتا ہے ..... انہیں رفعت عطا کرتا ہے..... خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہ ء فاطر آیت ۱۰:

"اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ" ۔۔۔،

(پاکیزہ کلمات خدا کی طرف بلند ہوتے ہیں اور عمل صالح انہیں رفعت عطا کرتا ہے)۔

مذکورہ بالا آثار وخصوصیات سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ عمل کے صالح ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس میں یہ صلاحیت ولیاقت پائی جاتی ہے کہ وہ شرف وعزت کے زیور سے آراستہ ہو اور عظمت کے اس مقام کو پالے کہ پاکیزہ کلمات (اَلْكَلِمُ الطَّیِّبُ) کو خدا کی طرف بلند ہونے میں مدد دے سکے خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہ ء حج، آیت ۳۷:

★ "وَ لٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ" ۔۔۔،

(لیکن تمہارا تقویٰ خدا تک پہنچتا ہے)۔

سورہ ء اسراء آیت ۲۰:

★ "كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَ هٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا" ۔۔۔،

(اور ہم اِن کو اور ان کو (اہل دنیا و اہل آخرت کو) تیرے پروردگار کا عطیہ عام دیں گے اور تیرے رب کا عطیہ کسی سے روکا نہیں جائے گا)۔

خدا کی عطاء بمنزلہ "صورت" اور عمل کا صالح ہونا بمنزلہ "مادہ" ہے۔ (صورت اور مادہ کی فلسفی اصطلاح پر غور کریں)

یہ تو ہے عمل کے صالح ہونے کا مطلب اور جہاں تک کسی شخص کا ..... ذات کے لحاظ سے ..... صالح ہونے کا تعلق

ہے تو اس کا تذکرہ درج ذیل آیات میں ہوا ہے:

سورہ نساء، آیت ۶۹:

★ "وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا"،

(جو لوگ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کریں وہ ان لوگوں کے ہمراہ ہوں گے جن پر خدا نے انعام نازل کیا جو کہ انبیاءؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور یہ بہت ہی اچھے ساتھی ہیں)۔

سورہ انبیاء، آیت ۸۶:

★ "وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ"،

(اور ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کرلیا کیونکہ وہ صالحین میں سے ہیں)۔

حضرت سلیمانؑ کی دعا میں یوں مذکور ہے:

سورہ نحل، آیت ۱۹:

"وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ" ...،

(اور مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے صالح بندوں میں شامل کردے)۔

سورہ انبیاء، آیت ۷۵:

★ "وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ... وَ اَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ" ...،

(اور لوطؑ کو ہم نے حکومت اور علم عطا کیا اور ہم نے اسے اپنی رحمت میں داخل کرلیا کہ وہ صالحین میں سے تھا)۔

ان آیات میں "صالح" ہونے سے مراد خدا کی اس عام رحمت کا لائق وحقدار ہونا نہیں جو ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے ہر چیز کو حاصل ہے.....اور نہ ہی اس رحمت کا لائق ہونا مراد ہے جو مومنوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کا ذکر درج ذیل آیت میں ہوا ہے:

سورہ اعراف، آیت ۱۵۶:

★ "وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ" ...،

(اور میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے پس میں اسے مقرر کردوں گا ان لوگوں کے لیے جو پرہیزگار ہیں)۔

کیونکہ مذکورہ بالا آیات میں جن "صالحین" کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ پرہیزگار مومنین کا ایک خاص گروہ ہے اور

''رحمت'' سے مراد ایسی خاص رحمت ہے جو چند افراد کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورہء بقرہ، آیت ۱۰۵:

''یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ'' ---،

(وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے)۔

بنابرایں معلوم ہوا کہ ''صالحین'' سے مراد متقی و پرہیزگار مومنین کا وہ مخصوص گروہ ہے جسے خدا نے اپنی خاص رحمت عطا فرمائی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ اہم مطلب بھی قابل ذکر ہے کہ ''صالح'' ہونے سے مراد یہ بھی نہیں کہ ان میں خدا کی ولایت یعنی سرپرستی حاصل کرنے کی صلاحیت واہلیت پائی جاتی ہے (یعنی جس طرح خدا اپنے اولیاء کا سرپرست وولی ہے اسی طرح ''صالحین'' بھی اس ولایت وسرپرستی سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں) کیونکہ ''صالحین'' تو پہلے ہی اس شرف و اعزاز کے حامل ہونے کے حوالہ سے خدا کے معزز ومکرم اولیاء میں شامل ہیں جیسا کہ ہم ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' ...... سورہء فاتحہ آیت ۵ ...... کی تفسیر میں بھی واضح طور پر بیان کر چکے ہیں' لہٰذا خدا کی ولایت وسرپرستی کا لائق ہونا ایسی مشترک صفت ہے جو ''صالحین'' انبیائ' صدیقین اور شہداء سب میں پائی جاتی ہے' بنابرایں انہیں (صالحین کو) دیگر تین گروہوں (انبیائ' صدیقین' شہدائ) سے علیحدہ کوئی مخصوص گروہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

بہرحال ''صالح'' ہونے کا خاص اثر ''رحمت میں داخل کرنا'' ہے کہ جو ہر طرح کے عذاب سے محفوظ و مامون قرار دینے سے عبارت ہے' اور یہ دونوں یعنی رحمت میں داخل کرنا اور ہر طرح کے عذاب سے محفوظ کر دینا بہشت میں انہیں حاصل ہوں گے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہء جاثیہ، آیت ۳۰:

★ ''فَیُدْخِلُہُمْ رَبُّہُمْ فِیْ رَحْمَتِہٖ'' ...،

(ان کا رب انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا)۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

سورہء دخان، آیت ۵۵:

★ ''یَدْعُوْنَ فِیْہَا بِکُلِّ فَاکِہَۃٍ اٰمِنِیْنَ'' ...،

(وہ بہشت میں ہر طرح کے پھل طلب کریں گے امن وامان سے بہرہ ور ہو کر)۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ درج ذیل دو آیتوں میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''صالح'' ہونا خدا کی خاص

عنایت ہے نہ کہ صرف نتیجۂ عمل' ملاحظہ ہو:

سورہء انبیاء، آیت ۷۵:

★ " وَ اَدۡخَلۡنٰهُ فِیۡ رَحۡمَتِنَا " ...،

(اور ہم نے اسے اپنی رحمت میں داخل کرلیا)۔

سورہء انبیاء، آیت ۷۲:

★ " وَ كُلًّا جَعَلۡنَا صٰلِحِیۡنَ " ...،

(اور ہم نے سب کو "صالح" بنایا)۔

ان دو آیتوں میں خداوند عالم نے "رحمت میں داخل کرنے" اور "صالح" قرار دینے کی نسبت اپنی طرف دی ہے جبکہ دیگر آیات میں خدا نے "اجر و شکر" کو نتیجۂ عمل قرار دیا ہے' لہٰذا یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ ذاتی صلاحیت (ذات کے لحاظ سے صالح ہونا) اختیاری و نتیجۂ عمل نہیں بلکہ خداوند عالم کی خاص عنایت ہے' اس بیان سے یہ مطلب بھی واضح ہوا کہ آیت مبارکہ "لَهُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ فِیۡهَا " ... بہشت میں وہ جو کچھ چاہیں گے انہیں دیا جائے گا...... سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے نتیجۂ عمل اور اجر کے طور پر ہوگا' اور "وَ لَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ" ...... ہمارے پاس اس کے علاوہ بہت کچھ ہے...... سے مراد یہ ہے کہ ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ بلند مقام و مرتبہ ہے جس کا تعلق عمل سے نہیں' اس سلسلے میں مزید وضاحت آیت مبارکہ (لَهُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ فِیۡهَا...... سورہء ق، ۳۵......) کی تفسیر میں پیش کی جائے گی، انشاءاللہ۔

ایک اہم نکتہ

مذکورہ بالا تمام بیانات کے بعد ایک اہم نکتہ کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بارگاہ الٰہی میں یہ دعا کی کہ مجھے "صالحین" کے ساتھ ملحق کیا جائے تو اس وقت آنجناب ؑ نبوت و رسالت کے مقام و منصب پر فائز تھے اور اولوالعزم انبیاء ؑ میں سے ایک تھے' اس کے ساتھ ساتھ امام اور اپنے بعد آنے والے کئی انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے پیشوا بھی تھے' صرف یہی نہیں بلکہ قرآن مجید کی واضح تصریح کے مطابق "صالحین" میں سے بھی تھے جیسا کہ ارشاد ہوا " وَ كُلًّا جَعَلۡنَا صٰلِحِیۡنَ " (اور ہم نے سب کو صالحین بنایا)...... سورہء انبیاء آیت ۷۲......، اس آیت میں "صالح" قرار دینے سے مراد دنیا میں انہیں صالح قرار دینا ہے' اور جو انبیاء ؑ حضرت ابراہیم ؑ سے کمتر درجہ رکھتے تھے وہ بھی "صالحین" کی صفت دنیا ہی میں پا چکے تھے تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا اور درخواست کہ خدا انہیں "صالحین" کے ساتھ ملا دے' کیا معنی رکھتی ہے؟۔

اس کی بابت غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے کچھ ہستیاں ایسی موجود تھیں جو "صالحین" ہونے

کے اعلیٰ ترین مقام و مرتبہ تک پہنچ چکی تھیں اور حضرت ابراہیمؑ نے ان کے ساتھ ملحق ہونے اور ان کے مقام و مرتبہ کو پانے کی دعا کی چنانچہ خداوند عالم نے ان سے وعدہ فرمایا کہ آخرت میں انہیں "صالحین" کے ساتھ ملحق کر دے گا' اس کا ذکر قرآن مجید میں درج ذیل تین مقامات میں ہوا ہے:

سورہ بقرہ، آیت ۱۳۰:

"وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ"،

(اور ہم نے اسے اس دنیا میں مصطفیٰ بنایا (منتخب کرلیا) اور وہ آخرت میں "صالحین" میں سے ہوگا)۔

سورہ عنکبوت، آیت ۲۷:

"وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ"۔،

(اور ہم نے اسے دنیا میں اس کا اجر عطا کر دیا اور وہ آخرت میں "صالحین" میں سے ہوگا)۔

سورہ نحل، آیت ۱۲۲:

"وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ"،

(اور ہم نے اسے دنیا میں نیکی عطا کی اور وہ آخرت میں "صالحین" میں سے ہوگا)

ان تمام آیات میں اس امر کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ابراہیمؑ آخرت میں "صالحین" میں سے ہوں گے' اس مسئلہ میں اچھی طرح غور و فکر کرنے اور تدبر سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ "صالح" ہونا کئی مراتب و درجات رکھتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ ان مراتب و درجات میں سے بعض کے حامل تھے لیکن ان سے بالاتر درجات کے حصول کی تمنا کر رہے تھے' بنابرایں اگر یہ کہا جائے تو تعجب آور نہیں ہوسکتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کے حضور یہ التجا کر رہے تھے کہ انہیں محمد و آل محمد علیہم السلام کے ساتھ ملحق فرمادے' اور خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ آخرت میں یہ مقام انہیں عطا کیا جائے گا' اس کا مزید ثبوت اس سے ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خداوند عالم سے دعا کی کہ انہیں "صالحین" کے ساتھ ملحق کر دے جبکہ حضرت پیغمبر اسلام محمدؐ اپنے آپ کو "صالحین" کے مقام کا حامل سمجھتے تھے' چنانچہ خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہ اعراف، آیت ۱۹۶:

★ "اِنَّ وَلِیّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۡ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ"،

(کہہ دو کہ میرا ولی خدا ہے کہ جس نے کتاب (قرآن) کو نازل کیا اور وہی صالحین کی سرپرستی کرتا ہے)۔

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنے آپ کو "صالحین" میں سے سمجھتے تھے جبکہ ابراہیمؑ خدا سے اس بات کی دعا مانگ رہے تھے کہ انہیں ان "صالحین" کے ساتھ ملحق فرمادے جو ان سے پہلے "صالح" ہونے کا رتبہ پا چکے ہیں' گویا وہ خدا کے حضور اس بات کی تمنا کر رہے تھے کہ انہیں محمد و آل محمدؐ کا مقام و مرتبہ عطا کرے۔

ابراہیمؑ کی بیٹوں کو وصیت

○ " وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ "

(اور ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اس کی وصیت کی)۔

اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو آئین الٰہی کی پیروی کرنے کی وصیت کی۔

"بِهَآ" میں ضمیر (ھا) کا مرجع ..... اور مراد ..... "ملۃ" ہے یعنی دین اسلام آئین الٰہی۔

تاحیات اسلام کی پیروی

○ " فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ "

(پس تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہونے کی حالت میں)۔

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی وصیت کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں سے تاکید کی کہ تم مسلمان ہونے کے علاوہ کسی حال میں نہ مرنا)۔۔ تاحیات اسلام کی پیروی کرنا۔۔،

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو "نہ مرنے" کی وصیت کی جبکہ موت انسان کے اختیار میں ہی نہیں اور یہ اصول ہے کہ ہمیشہ اسی چیز کا حکم دیا جاتا ہے جو انسان کے اختیار میں ہو لہٰذا یہاں "نہ مرنے" کا حکم دینے سے کیا مراد ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی ایسے غیر اختیاری کام کا حکم دیا جائے جس کی بازگشت بالآخر ایک اختیاری فعل کی طرف ہو تو اس میں کوئی حرج لازم نہیں آتا اور حضرت ابراہیمؑ نے "نہ مرنے" کا جو حکم دیا ہے وہ بھی اسی باب سے ہے کیونکہ ان کا حکم اصل میں یوں ہے: " احذروا ان یغتالکم الموت فی غیر حال الاسلام "... ڈرو اس بات سے کہ کہیں موت تمہیں اس حال میں اپنی لپیٹ میں لے لے جب تم دائرہ اسلام سے باہر ہو..... یعنی تم ہمیشہ مسلمان رہنا تا کہ اس حال میں ہی تم پر موت آجائے۔

اس آیت سے مجموعی طور پر اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ "دین" صرف اسلام ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر واضح الفاظ میں ارشاد ہوا:

سورہ آل عمران، آیت ۱۹:

★ " اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ " ...،

(خدا کے نزدیک "دین" صرف اسلام ہے)۔

انبیاء کا دین و آئین

○ ” وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ “

اس آیت میں لفظ ”آباء“ استعمال ہوا ہے جو کہ ”اب“ سے جمع کا صیغہ ہے۔ ”اب“ کا معنی ”باپ“ ہے لیکن یہاں دادا، چچا اور والد تینوں کے لیے استعمال ہوا ہے (کیونکہ اس آیت کے مخاطب حضرت یعقوبؑ ہیں کہ حضرت اسحاقؑ ان کے والد، حضرت اسماعیلؑ ان کے چچا اور حضرت ابراہیمؑ ان کے دادا ہیں) اور یہ استعمال بنا بر تغلیب...... اکثریت یا اہمیت و اسبقیت کی وجہ سے...... نہیں ہوا کیونکہ یہاں ”تغلیب“ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی (یاد رہے کہ ”تغلیب“ سے مراد یہ ہوتا ہے کہ دو مختلف چیزوں کو ایک ہی عبارت کے ساتھ ذکر کیا جائے اور وہ عبارت ان دونوں میں سے اس ایک کے ذکر پر مشتمل ہو جو زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا تعداد میں زیادہ ہے مثلاً جب کسی محفل میں حاضرین مرد زیادہ ہوں جبکہ خواتین بھی وہاں موجود ہوں اور خطاب کرنے والا مردوں کی کثرت کے پیش نظر صرف مردوں کو مخاطب کر کے بات کرے تو اسے اصطلاحی طور پر ”تغلیب“ کہا جاتا ہے، زیر بحث آیت میں ”تغلیب“ کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آباء کے لفظ کا استعمال دادا اور چچا کے لیے ان کی اکثریت یا اہمیت کے طور پر ہوا ہے)۔ اور یہ آیت ہمارے لیے ایک دلیل و ثبوت کی حیثیت بھی رکھتی ہے کہ اس طرح کا استعمال صحیح ہے اور ہم اسے اس مقام پر دلیل کے طور پر ذکر کریں گے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا ”آزر“ سے ”اب“...... باپ...... کے لفظ سے بات کی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

معبود صرف ایک!

○ ” اِلٰهًا وَّاحِدًا “

یہ جملہ تفصیلی ذکر کے بعد خلاصہ کے طور پر ہے، کیونکہ اس سے پہلے یوں مذکور ہے: اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ ... جو تیرا معبود اور تیرے آباء کا معبود ہے......) اس کے بعد ” اِلٰهًا وَّاحِدًا ... ایک ہی معبود ہے...... کے الفاظ اس ابہام کو دور کرنے کے لیے ہیں کہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ اس کا معبود اور ہے اور اس کے آباء کا معبود کوئی اور، جیسا کہ بت پرستوں اور مشرکوں نے کئی خدا بنائے ہوئے ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ ان سب (اسحاقؑ، اسماعیلؑ ابراہیمؑ یعقوبؑ) کا معبود ایک ہی ہے۔ تو یعقوبؑ کے بیٹوں نے باپ سے یوں کہا: ہم عبادت کرتے ہیں تیرے معبود کی اور تیرے آباء ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ کے معبود کی جو کہ ایک ہی معبود ہے (یکتا ہے)

اسلام کا تاکیدی اقرار

○ "وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ"

(اور ہم اس کے مسلمان ہیں)۔

یہ جملہ درحقیقت پہلے جملہ کی وضاحت کے طور پر ہے جس میں انہوں نے کہا: "نَعْبُدُ اِلٰهَكَ" کہ ہم تیرے معبود کی عبادت کرتے ہیں، اور اس جملہ "وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ" میں انہوں نے وضاحت کر دی کہ ہم جو "عبادت" کرتے ہیں وہ اسلام کے نہج اور طریقہ پر ہے نہ کہ جس طرح سے بھی انجام پا جائے۔

بہرحال ان تمام مطالب اور بیانات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ابراہیمؑ کا دین ہی اسلام ہے اور وہی ان کی اولاد یعنی اسحاقؑ و یعقوبؑ اور اسماعیلؑ میں وراثت کے طور پر چلا آ رہا ہے اسی طرح جو دین بنی اسرائیل ...اولاد یعقوبؑ... اور بنی اسماعیلؑ ...... اسماعیلؑ کی نسل...... میں جو کہ آل ابراہیمؑ سے ہیں موجود اور میراث کی صورت میں چلا آ رہا ہے وہ صرف "اسلام" ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا دین و آئین نہیں، اور یہی وہ دین ہے جو حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام اپنے پروردگار کی طرف سے لائے لہٰذا کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ اس کے علاوہ کسی دین کی پیروی کرے یا اسے چھوڑ کر کسی دوسرے دین کی دعوت دے۔

روایات پر ایک نظر

اسلام اور ایمان کی مثال

کتاب کافی میں سماعہ سے مروی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

(الایمان من الاسلام بمنزلة الكعبة الحرام من الحرم قد يكون فی الحرم ولا يكون فی الكعبة ولا يكون فی الكعبة حتی يكون فی الحرم)

ایمان اور اسلام ایسے ہیں جیسے کعبہ اور حرم، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص حرم میں ہوتا ہے مگر کعبہ میں نہیں ہوتا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص کعبہ میں ہو اور حرم میں نہ ہو۔

شہادتین کے آثار و احکام

کتاب کافی میں سماعہ ہی سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: (الاسلام شهادة ان لا اله الاالله والتصديق برسول الله ،به حقنت الدماء وعليه جرت المنا كح

والمواریث وعلیٰ ظاهره جماعة الناس، والایمان الهدیٰ وما یثبت فی القلوب منصفة الاسلام)

اسلام سے مراد خدا کی وحدانیت کی گواہی (لا الہ الا اللہ) اور رسالت کی تصدیق (محمد رسول اللہ) ہے اور اسی سے حرمت نفس اور نکاح و میراث کے احکام کا نفاذ ہوتا ہے (جو شخص شہادتین یعنی توحید و رسالت کی گواہی کا کلمہ زبان پر جاری کرے اس کی جان و مال محفوظ، اسے قتل کرنا حرام ہو جاتا ہے اور نکاح و میراث کے اسلامی احکام اس پر لاگو ہوتے ہیں) اور عام لوگ اسی ظاہری صورت پر ہوتے ہیں، لیکن "ایمان" سے مراد کامل ہدایت اور اسلام کی حقیقت کا دل کی گہرائی میں جاگزین ہونا ہے۔

مذکورہ بالا مطلب دیگر روایات میں بھی بیان ہوا ہے اور وہ سب روایات اسلام و ایمان کے اسی پہلے مرحلہ و درجہ کو بیان کرتی ہیں جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔

امام علیؑ کا جامع فرمان

نیز کتاب کافی میں برقی سے مروی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

(الاسلام هو التسلیم والتسلیم هو الیقین)

اسلام سے مراد تسلیم (خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دینا اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینا) اور تسلیم سے مراد "یقین" ہے (اسلام کی حقیقت اور حقانیت کی بابت پختہ اعتقاد اور ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک ہونا ہی "یقین" کا دوسرا نام ہے)۔

شرک کی ایک صورت

کافی ہی میں کاہل سے مروی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

(لو ان قوما عبدوا الله وحده لا شریك له واقاموا الصلوة و آتوا الزكوة و حجوا البیت وصاموا شهر رمضان ثم قالوا لشیء صنعه الله او صنع رسول الله الا صنع بخلاف الذی صنع او وجدوا ذلك فی قلوبهم لكانوا بذلك مشركین)

اگر کچھ لوگ خدا کی عبادت کرتے ہوں ...... اسے ایک مانتے ہوں اور اس کے علاوہ کسی کو معبود تسلیم نہ کرتے ہوں ...... اور نماز ادا کرتے ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں، حج بیت اللہ انجام دیتے ہوں اور ماہ رمضان المبارک کے روزے بھی رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ خدا یا رسول خداؐ کے کسی حکم یا کام کے متعلق یہ کہیں کہ ایسا کیوں ہے اور اس کے علاوہ کیوں نہیں؟ (چوں و چرا کریں) یا زبان سے تو نہ کہیں لیکن اپنے دلوں میں ایسا سوچیں تو وہ مشرک کہلائیں گے۔

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں اسلام و ایمان کے تیسرے مرحلہ و مرتبہ کا اشارہ ملتا ہے۔

خدا کے چاہنے والوں کی صفات

کتاب بحار الانوار میں کتاب الارشاد...... دیلمیؒ...... کے حوالہ سے دو اسناد کے ساتھ یہ حدیث مذکور ہے جو کہ احادیث معراج میں سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

''خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: اے احمدؐ! آیا تمہیں معلوم ہے کہ کون سی زندگی خوشگوار اور بقا شعار ہے؟

حضرت محمدؐ نے عرض کی: بارالہا! نہیں!

خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: خوشگوار زندگی حقیقی معنے میں وہ ہے جس میں انسان میری یاد سے کبھی غافل نہ رہے' میری نعمتوں کو نہ بھلائے' میرے حق سے ناآگاہ نہ ہو اور دن رات میری رضا و خوشنودی کا طلبگار رہے' اور بقا شعار زندگی وہ ہے کہ جس میں انسان اپنے لیے مصروف عمل رہے یہاں تک کہ دنیا اس پر آسان اور وہ اسے آخرت کے مقابلے میں ہیچ و ناچیز سمجھے' آخرت کو عظمت و اہمیت کی نگاہ سے دیکھے' میری خواہش و چاہت کو اپنی آرزوں اور تمناؤں پر ترجیح دے۔ ہمیشہ میری خوشنودی کے حصول میں کوشاں ہو' میری نعمتوں کے حق کو عظیم جانے' اپنے لیے میری طرف سے انجام پانے والے اقدامات کو ہمیشہ یاد کرے' شب و روز معصیت و گناہ اور ناگوار حالتوں سے دوچار ہونے کے وقت مجھے مدنظر رکھتا ہو' اپنے دل سے ہر اس چیز کو نکال دے جو مجھے ناپسند ہو' شیطان اور اس کی وسوسہ انگیزی سے نفرت کرتا ہو اور اپنے دل کی مملکت میں شیطان کے تسلط کے تمام راستے بند کر دے' پس جب وہ یہ سب کچھ کر لے تو اس کے دل کو محبت کی نعمت سے اس قدر مالا مال کر دوں گا کہ اس کا دل' اس کی فرصت کی گھڑیاں اور اس کی مصروفیت کے اوقات' اس کی کوششیں و کاوشیں اور اس کی گفتگو کا محور صرف میری اس نعمت کی یاد آوری ہو گی جو میں نے ان ہستیوں کو عطا کی ہے جو مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں' اور میں اس کے دل کو اتنی قوت عطا کروں گا کہ وہ میری عظمت کا مشاہدہ اپنی نگاہ دل سے کرے گا' اور میرے جلال کی صدا اپنے گوشِ دل سے سنے گا' میں دنیاوی زندگی کا دائرہ اس پر تنگ کر دوں گا اور دنیاوی زندگی کی لذتوں سے نفرت کا بیج اس کے دل میں بو دوں گا اور میں اسے دنیا اور اس کی متاعِ زوال آشنا کے تباہ کن نشے میں مبتلا ہونے سے اس طرح خوف دلاؤں گا جیسے چرواہا اپنی بھیڑ بکریوں کو خطرناک چراگاہوں میں جانے سے ڈراتا ہے' پس جب وہ اس طرح کا ہو جائے گا تو لوگوں سے الگ تھلگ رہنے لگے گا اور فنا شعار دنیا کو چھوڑ کر بقا آشنا ابدیت نواز منزل کی جانب بڑھے گا یعنی شیطان کے گھر سے منہ موڑ کر رحمن کے خیمۂ عنایت میں آ بسے گا'۔ اے احمدؐ! پھر میں اسے ''ہیبت'' و ''عظمت'' کے زیور سے آراستہ کر دوں گا' اور یہی ہے حقیقی معنی میں پاکیزہ و خوشگوار زندگی اور بقا شعار و دوام آشنا حیات! جو کہ میری رضا پر راضی رہنے والے نیک نام لوگوں کا مقام و مرتبہ ہے' پس جو شخص اپنے ہر عمل کی بنیاد میری رضا کو قرار دے اور اس طرح عمل کرے جیسے میں پسند کرتا ہوں تو میں اسے یہ تین خصلتیں عطا کروں گا: ہر طرح کے جہل و نادانی سے پاک شکر' ہر قسم کے نسیان سے دور ذکر اور اپنی ایسی محبت جس پر مخلوق کی محبت کو ترجیح نہ دے' پس جب وہ مجھ سے محبت کرے گا تو میں بھی اس سے محبت کروں گا اور اس کی نگاہ دل کو اپنے جلال کا مشاہدہ کرنے کے لیے کھول دوں گا' اپنی مخلوق میں سے اپنے خاص بندوں کو اس سے پوشیدہ نہیں رکھوں گا' رات کی تاریکی اور

دن کی روشنی میں اس سے ہمکلام ہوں گا تا کہ وہ عام لوگوں سے بات چیت کرنے اور ان کی ہم نشینی سے بے نیاز ہو جائے' میں اسے اپنی اور اپنے فرشتوں کی باتیں سنواؤں گا اور اسے اس راز سے آشنا کر دوں گا جو میں نے لوگوں سے پوشیدہ کر رکھا ہے' اسے لباس حیا عطا کروں گا تا کہ لوگ اس سے حیا میں رہیں' وہ میری مغفرت و بخشش کا تاج پہنے ہر طرح کے گناہ سے پاک ہو کر زمین پر چلے گا' اس کے دل کو بصیرت و آگاہی کی روشنی سے منور کر دوں گا اور بہشت و دوزخ کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رکھوں گا اور اسے قیامت کے دن کی اس سختی و شدت سے آگاہ کر دوں گا جس سے لوگ دو چار ہوں گے' اسے امیروں' غریبوں' جاہلوں اور عالموں سب کے حساب و کتاب سے مطلع کر دوں گا' اسے قبر میں راحت و آرام کی نیند سلاؤں گا اور منکر و نکیر کو اس سے سوال و جواب کرنے کے لیے بھیجوں گا' وہ نہ تو موت کی سختی و غم دیکھے گا اور نہ ہی قبر و لحد کی تاریکی اور نہ قیامت کی وحشت اسے خوفزدہ کرے گی' پھر میں اس کے لیے میزان عدل نصب کروں گا اور اس کے نامہء اعمال کو کھول دوں گا، اس کی کتاب عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دے دوں گا وہ اسے خود ہی پڑھے گا اور میں اپنے اور اس کے درمیان کسی کو ترجمان قرار نہیں دوں گا۔

یہ ہیں میرے چاہنے والوں کی صفتیں! اے احمد! اپنی کوشش کو یگانہ کرو اور اپنی زبان کو بھی ''ایک'' کرو اور اپنے بدن کو اس طرح زندہ و بیدار رکھو کہ کبھی اس پر غفلت کا سایہ ہی نہ پڑے' جو شخص مجھ سے غافل ہو جائے اس کے بارے میں مجھے کوئی پرواہ نہ ہوگی کہ وہ کس وادی ہلاکت میں اپنے آپ کو ڈال دے۔

فرمودہء رسولؐ بزبان امامؑ

کتاب بحار الانوار میں کافی کے حوالہ سے اور معانی الاخبار اور نوادر راوندیؒ میں مختلف اسناد راویوں...... کے حوالہ سے حضرت امام جعفرؑ صادقؑ اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (یہ عبارت کافی کی ہے)

ایک دن حضرت پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حارثہ بن مالک بن نعمان انصاری کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا:

حارثہ بن مالک بن نعمان انصاری آپ کیسے ہیں؟

انہوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! میں مومن حقیقی ہوں'

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ہر چیز کی حقیقت اور دلیل ہوتی ہے آپ کے اس دعوے کی کیا دلیل ہے؟

انہوں نے عرض کی: اے پیغمبر خداؐ! میں نے اپنے آپ کو دنیا کی عیش و عشرت سے دور رکھا ہوا ہے میں نے رات جاگ کر...... خدا کی عبادت میں مصروف رہ کر...... بسر کی ہے اور میں نے سخت گرمی میں تشنہ لب رہ کر روزہ رکھا ہے' مجھے ایسا لگتا ہے گویا میں عرش الٰہی کو دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں کے حساب و کتاب کے لیے قائم کیا گیا ہے' گویا میں بہشت والوں کو دیکھ رہا

ہوں کہ بہشت میں ایک دوسرے کے پاس آ جا رہے ہیں اور گویا میں جہنمیوں کی چیخ و پکار کی آوازیں سن رہا ہوں جو کہ جہنم سے آ رہی ہیں۔

حارثہ کا جواب سن کر حضرت پیغمبر خداؐ نے ارشاد فرمایا: یہ خدا کا وہ بندہ ہے جس کے دل کو خدا نے نورانی کر دیا ہے اور اس نے سب کچھ دیکھا ہے اور ثابت قدم رہا ہے۔

تجزیہ:

مذکورہ بالا دو روایتیں اسلام اور ایمان کے اس چوتھے مرحلہ و مرتبہ کو بیان کرتی ہیں جسے ہم ذکر کر چکے ہیں اور ان دو روایتوں میں مذکور مطالب کی تفصیلات دیگر متعدد روایات میں بھی ذکر ہوئی ہیں ہم انشاء اللہ تعالیٰ ان میں سے چند روایات اپنی اس کتاب کے مختلف مقامات میں ذکر کریں گے اور انہی مطالب کی مزید تصدیق و تائید کئی آیات کریمہ سے بھی ہوتی ہے، ہم ان کی بابت بھی آیات کی وضاحت کے ضمن میں مطالب بیان کریں گے' یاد رہے کہ اسلام اور ایمان کے ہر ایک مرحلہ و مرتبہ کے مقابل کفر و شرک کا ایک مرحلہ و مرتبہ بھی آتا ہے' یعنی ایک طرف اسلام و ایمان کے مراتب و درجات ہیں اور ان کے عین مقابل میں کفر و شرک کے مراتب و طبقے ہیں اور یہ امر نہایت واضح ہے کہ اسلام و ایمان کے مراتب میں جس قدر گہرائی تک جائیں اور ان کے بلند مدارج کو پالیں اتنا ہی اس کے مقابل میں پائے جانے والے کفر و شرک کے مراتب و مراحل سے چھٹکارا پانے میں دشواری ہوگی...... کیونکہ ان میں مدمقابل ہونے کے حوالہ سے اتنی ہی شدت آ جائے گی......اور یہ بات بھی وضاحت کی محتاج نہیں کہ اسلام و ایمان کے نہایت چھوٹے مراتب اور انتہائی نچلے مراحل میں کفر یا شرک کے بلند ترین مراتب اور اعلیٰ ترین مراحل کا یکجا ہونا بھی ممکن ہوتا ہے اور ان دونوں میں منافات نہیں پائی جاتی کیونکہ ان دونوں کے آثار ایک ہی وقت میں ظاہر ہو سکتے ہیں' یہ دو بنیادی اصول (اسلام و ایمان کے مراتب میں بلندی و پستی اور کفر و شرک کے مراتب و درجات میں شدت و ضعف کا تقابلی عمل) ہیں کہ جن کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی آیات کے باطن ایسے موارد پر منطبق ہوتے ہیں جن پر ان آیات کے ظواہر منطبق نہیں ہوتے' بہر حال ابھی اسی مطلب کو اجمالی طور پر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں اس کی بابت تفصیلی مطالب بعد میں ذکر کئے جائیں گے۔

تفسیر قمی کی روایت

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ ''ولدینا مزید'' کی تفسیر میں مذکور ہے امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد خدا کی رحمت کی طرف نظر کرنا ہے۔

ایک حدیث نبویؐ

تفسیر مجمع البیان میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: خدا فرماتا

ہے کہ میں نے اپنے صالح (اہلِ صلاح) بندوں کے لیے وہ کچھ حاضر کر رکھا ہے جسے نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ ہی کسی بشر کے دل میں ان کے بارے میں کبھی کوئی خیال آیا ہے۔

مذکورہ بالا دو روایتوں کا مطلوب و مقصود "صالح" کے معنی کی وضاحت کے بعد واضح ہو جاتا ہے (" صلاح" کے معنے کی بابت جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس کی روشنی میں ان دو روایتوں کے مقصود و مراد سے پورے طور پر آ گاہی حاصل ہو جاتی ہے) تاہم اصل ہدایت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔

مصداق کی نشاندہی

تفسیر عیاشی میں مذکور ہے کہ آیت شریفہ " اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ " کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: یہ آیت حضرت "قائم آل محمدؑ" پر منطبق ہوتی ہے۔

تشریحی بیان:

تفسیر صافی میں ہے امام محمد باقر علیہ السلام کے مذکورہ ارشاد گرامی سے مراد شاید یہ ہو کہ یہ آل محمدؐ میں سے ہر امام قائم (امام وقت) کے بارے میں ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے وہی کچھ کہتے تھے جو حضرت یعقوبؑ نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا' اور اپنے بیٹوں سے وہی جواب سنتے تھے جو حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے سنا۔

آیات ۱۳۵ تا ۱۴۱

○ وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

○ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

○ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

○ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

○ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

○ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

○ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

ترجمہ

○ ''اور انہوں نے کہا کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی' ہدایت پا لو گے' ان سے کہہ دیجئے: بلکہ ابراہیمؑ کے آئین کی پیروی کرو جو کہ خالص دین ہے اور وہ (ابراہیمؑ) مشرکین میں سے نہ تھے''۔ (۱۳۵)

○ ''کہہ دو کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور اس پر (ایمان لائے ہیں) جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر (ایمان لائے ہیں) جو ابراہیمؑ' اسماعیلؑ' اسحاقؑ' یعقوبؑ اور اسباط پر نازل کیا گیا اور اس پر (ایمان لائے ہیں) جو کچھ موسیٰؑ' وعیسیٰؑ اور دیگر پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا کیا گیا' ہم ان...... پیغمبروں...... میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور ہم خدا کے فرمان پر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں''۔ (۱۳۶)

○ ''پس اگر وہ بھی تمہاری طرح اس چیز پر ایمان لائیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر وہ اس سے منہ موڑ لیں تو یقیناً وہ دشمنی و نفاق کی راہ پر ہوں گے' بہت جلد خدا ان کے مقابلے میں تیری کفایت کرے گا کہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ (۱۳۷)

○ ''(مسلمانوں سے کہو کہ) رنگ تو خدا ہی کا رنگ ہے جس میں تم رنگے گئے اور خدائی رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہوگا اور ہم تو اُسی کی عبادت کرتے ہیں''۔ (۱۳۸)

○ ''کہہ دو کہ آیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو، وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں اور ہم اس کے ساتھ خلوص رکھتے ہیں''۔ (۱۳۹)

○ ''کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیمؑ واسماعیلؑ واسحاقؑ ویعقوب واسباط یہودی یا نصرانی تھے؟ ان سے کہہ دیجئے آیا تم بہتر جانتے ہو یا اللہ؟ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنے پاس موجود خدائی گواہی پر پردہ ڈال دے حالانکہ خدا تمہارے اعمال سے ہرگز غافل نہیں''۔ (۱۴۰)

○ ''وہ ایک ''امت'' تھی جو گزر چکی ہے، ان کے اعمال ان کے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے گی''۔ (۱۴۱)

تفسیر و بیان

یہود و نصاریٰ کے تقابلی بیانات

○ ''قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا''

سابقہ آیات میں خداوند عالم نے اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ دین حق وہی آئین ابراہیمیؑ یعنی اسلام ہے کہ جس کی پیروی اولاد ابراہیمؑ یعنی اسماعیلؑ و اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کرتی تھی' بنابرایں زیر بحث آیت (۱۳۵) سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ یہ اختلافات اور گروہ بندیاں جو اپنے آپ کو ''یہودی'' اور ''نصرانی'' کہلانے والوں نے پھیلائی ہیں درحقیقت یہ سب کچھ ان کی ہوا و ہوس کا نتیجہ اور ان کے ہاتھوں کا کھیل تماشہ ہے اور انہوں نے یہ من گھڑت اور خود ساختہ فرقے اپنے درمیان پائے جانے والے اختلافات' نفاق اور دشمنیوں کے باعث ایجاد کئے اور ان فرقوں اور گروہوں کو دینی جماعتوں کی صورت میں پیش کیا اور خداوند متعال کے مقدس دین کو اپنے مفادات اور ذاتی و شخصی مقاصد کے تحفظ کے لیے غلط رنگ دے کر اس دین توحید و آئین وحدت کے تقدس کو پامال کر دیا جبکہ خدا کا دین صرف ایک ہے اس میں کسی طرح کے اختلاف کی کوئی گنجائش موجود نہیں اور دین کا ایک ہونا بالکل اسی طرح سے ہے جیسے خدا کا ایک ہونا، دین تو ہمیں صرف ایک معبود کے سامنے سر جھکانے کی دعوت دیتا ہے اور وہ دین آئین ابراہیمؑ ہی ہے' اس لیے تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسی سے وابستہ رہیں اور اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے درمیان پائے جانے والے اختلافات پر ہرگز توجہ نہ دیں۔

ایک علمی نکتہ کا بیان

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دنیا کی مادی زندگی اپنے جاری و ساری نظام کے باوجود طبعی طور پر ہمیشہ تغیر و تحول...... بدلنے بگڑنے...... سے دوچار رہتی ہے کیونکہ اس کی اصل و اساس یعنی ''طبیعت'' جو کہ اس کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہے جو ''مادہ'' اپنی صورت کے ساتھ رکھتا ہے، وہ بھی ہمیشہ تغیر و تحول میں رہتی ہے، تو جب کسی چیز کی اصل و اساس ہی دائمی طور پر تغیر و تبدل کی حالت میں ہو تو اس سے وابستہ ہر چیز اسی حالت میں ہوگی...... اسی وجہ سے قوموں کے درمیان مروجہ

رسومات بھی ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انہی رسم و رواج کی تبدیلی دینی حقائق سے انحراف اور ان میں تبدیلی کا سبب بن جاتی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر دین میں "بدعت" کی راہ ہموار ہو جاتی ہے یعنی جو چیز دین کا حصہ نہیں ہوتی اسے دین میں شامل کر دیا جاتا ہے اور جو چیز دین میں شامل ہوتی ہے اسے "دین" سے نکال دیا جاتا ہے (یاد رہے کہ "بدعت" سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں کو دین میں شامل کر دیا جائے جو بنیادی طور پر "دین" میں شامل نہیں) اور اقوام اور ان کے افراد کے مخصوص مفادات دینی حقائق و مقاصد کی جگہ لے لیتے ہیں، یہی بات "دین" کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے کیونکہ اسی صورت حال میں "دین" کو قومیت کا رنگ دینے کا خطرناک کھیل کھیلا جاتا ہے جس کے نتیجے میں دین کے اصل مقاصد کے حصول کی بجائے مخصوص مفادات حاصل کرنا مقصود قرار پاتا ہے اور اسلامی تربیت کی حقیقی روح مفقود ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دیگر تربیتی و اخلاقی اصول ...... جن کا تعلق دین سے نہیں ہوتا ...... معاشرے میں رواج پا جاتے ہیں، رفتہ رفتہ اچھے اور برے کے دینی معیار ختم ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ برائیاں جن کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا اچھائیاں شمار کی جانے لگتی ہیں اور لوگ ان میں بھرپور دلچسپی لینے لگتے ہیں کیونکہ وہ ان کی نفسانی خواہشات اور شیطانی شہوتوں کی تسکین کا سبب ہوتی ہیں، اسی طرح جو اچھائیاں اور نیک کام معاشرے کی صلاح و فلاح کا سبب ہیں انہیں "برائیاں" سمجھ لیا جاتا ہے اور کوئی ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا اور پھر نتیجہ وہی ہوتا ہے جس کا مشاہدہ آج کی دنیا میں ہم خود کر رہے ہیں۔

بہر حال آیت "وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا" کے اجمالی الفاظ کی تفصیل یوں ہے: "وقالت الیھود کونوا ھوداً تھتدوا" (یہودیوں نے کہا کہ تم سب یہودی ہو جاؤ ہدایت پا جاؤ گے) "وقالت النصاریٰ کونوا نصاریٰ تھتدوا" (اور نصرانیوں نے کہا کہ تم نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے) ان تمام باتوں کی اصل بنیاد ان کے باہمی اختلافات و گروہ بندیاں اور ذاتی دشمنیاں و نفاق کے سوا کچھ نہیں۔

آئینِ ابراہیمؑ کی پیروی کا حکم

○ "قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ"

یہ جملہ دراصل یہودیوں اور نصرانیوں کے بیانات و اظہارات کا جواب ہے کہ "ان سے کہہ دیجئے ہم آئین ابراہیمؑ کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ وہ واحد دین و آئین ہے کہ تمہارے تمام انبیاءؑ جن میں ابراہیمؑ اور دیگر سب نبی شامل ہیں اس دین و آئین کے پیروکار تھے، اور ابراہیمؑ کہ جنہوں نے اس آئین کو پیش کیا مشرک نہ تھے کیونکہ اگر ابراہیمؑ کے آئین میں یہ سب اختلافات اور گروہ بندیاں ہوتیں کہ جنہیں اہل بدعت نے ان کے آئین میں شامل کر دیا ہے تو وہ (ابراہیمؑ) بھی مشرک شمار کئے جاتے کیونکہ جو چیز خدا کے دین کا حصہ نہ ہو وہ لوگوں کو خدا کی عبادت و اطاعت کرنے کی دعوت پر مشتمل ہونے کی بجائے غیر خدا کی طرف بلاتی ہے اور اسی کو "شرک" کہتے ہیں۔ بنا بر ایں آئین ابراہیمؑ ہی توحید و یکتا پرستی کا دین ہے اور اس

میں خدا کی طرف سے آنے والے احکام و دستورات کے سوا کچھ نہیں (وہ غیر اللہ کے احکام وافکار پر ہرگز مشتمل نہیں)۔

کامل ایمان لانے کی تاکید

○ "قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا"

خداوند عالم نے جب یہ بیان کر دیا کہ یہودیوں اور نصرانیوں نے مسلمانوں کو اپنے مذہب کا اتباع کرنے کی دعوت دی، تو اس کے بعد خداوند عالم نے دین حق کی وضاحت کے طور پر اس حقیقت کو بیان کیا کہ "دین" خدا پر ایمان لانے اور خدا کی طرف سے آئے ہوئے تمام پیغمبروں پر...... ان میں کسی طرح کا فرق کئے بغیر...... ایمان لانے سے عبارت ہے او راسی کا نام "اسلام" ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ خدا نے ارشاد فرمایا: "قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا" (کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا) اس میں پہلے "خدا پر ایمان لانے" کا ذکر ہوا اور اس کے بعد "وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا" (اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا) کہا گیا جبکہ پہلی بات یعنی اللہ پر ایمان لانا "وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا" میں شامل ہے کیونکہ اللہ کی طرف سے جو احکام آئے ہیں ان میں توحید پر ایمان لانا نہ صرف یہ کہ شامل ہے بلکہ سب کی اصل و اساس اور بنیاد ہے تو اسے علیحدہ طور پر ذکر کرنے کی وجہ ایک نہایت لطیف حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے اور وہ یہ کہ خدا پر ایمان لانا ایک فطری حقیقت ہے جس کے ثبوت کے لیے نبوت و رسالت کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر انسان کی فطرت میں خالق کے وجود کو تسلیم کرنا شامل ہے۔

"خدا پر ایمان لانے" کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا: "وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا" (جو کچھ ہماری طرف نازل کیا گیا) اس سے مراد قرآن مجید یا قرآنی حقائق و معارف ہیں۔

اس کے بعد ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ پر نازل کئے گئے حقائق و معارف اور احکام کا ذکر ان الفاظ میں ہوا (وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ)۔

اس کے بعد موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو عطا کئے گئے امور و احکام کا ذکر ہوا (وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى) اور ان دو نبیوں (موسیٰؑ و عیسیٰؑ) کا ذکر ان کے ناموں کے ساتھ خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ گفتگو کے مخاطب یہود و نصاریٰ تھے اور وہ لوگوں کو صرف ان کی پیروی کرنے کی دعوت دیتے تھے۔

اس کے بعد تمام انبیاءؑ کو عطا کئے جانے والے احکام و حقائق و معارف کا ذکر ہوا (وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ) تاکہ تمام انبیاءؑ پر ایمان لانے کی گواہی مکمل ہو سکے اور اس امر کا ثبوت مل سکے کہ ہم خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے بلکہ خدا کی طرف سے آئے ہوئے ہونے کے حوالہ سے سب پر ایمان رکھتے ہیں (لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ)۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں دو طرح کے انداز ہائے بیان اختیار کئے گئے ہیں: ایک ''نازل کرنا'' اور دوسرا ''عطا کرنا''، ملاحظہ ہو:

۱۔ ''وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ'' (نازل کرنا)

۲۔ ''وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ'' (عطا کرنا)

پہلے فقرے میں ''انزل الینا'' اور دوسرے میں ''ایتای'' یعنی ''دینا'' کے الفاظ استعمال کئے گئے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اصل میں ''ایتای'' یعنی ''دینا'' و ''عطا کرنا'' کے مفہوم و معنی کو بیان کرنا مقصود تھا جیسا کہ سورہ انعام میں حضرت ابراہیمؑ اور ان سے پہلے اور بعد والے انبیاءؑ کا تذکرہ کرنے کے بعد خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا: ''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ'' سورہ انعام آیت ۸۹..... (یہ سب وہ ہیں جنہیں ہم نے کتاب و حکم اور نبوت دی) اس میں ''اتینا'' یعنی ہم نے دی، کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نازل کرنا اور عطا کرنا دراصل دینا ہی ہے اور اُولٰٓئِكَ (یہ سب) کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ ''اُنْزِلَ، اور، اُوْتِيَ'' تمام انبیاء کے لیے دینے اور عطا کرنے کے معنی میں ہے، تو اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اصل میں ''دینا'' کے معنے کو بیان کرنا مقصود تھا تو پھر سب کے لیے ''ایتای'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور کہیں ''انزل'' اور کہیں ''اوتی'' یا ''اتینا'' کے الفاظ استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ''ایتاء''......دینا......وحی کے معنے کو واضح طور پر ظاہر نہیں کرتا اس لیے ''انزل'' کے الفاظ سے اس حقیقت کو بیان کر دیا گیا کہ ان انبیاء کرامؑ کو جو کچھ ''دیا گیا'' وہ وحی تھا اور خدا کی طرف سے ''نازل کیا گیا'' تھا۔ ''ایتاء'' کے استعمال کے قرآنی موارد ملاحظہ فرمائیں:

سورہ لقمان آیت ۱۲:

★ ''وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ''......،

(اور ہم نے لقمان کو حکمت دی)

سورہ جاثیہ آیت ۱۶:

★ ''وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ''....،

(اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب و حکم اور نبوت دی)

پہلی آیت میں ''لقمان'' کو حکمت عطا کرنے کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں ''بنی اسرائیل'' کو کتاب و حکم اور نبوت عطا کرنے کا تذکرہ ہے جبکہ واضح ہے کہ لقمان نبی نہیں تھے اور نہ ہی تمام بنی اسرائیل کو نبوت عطا کی گئی اس لیے ''انزل'' کی بجائے ''ایتای''......آتینا......استعمال ہوا، اس کے علاوہ یہ کہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک اس بات کے دعویدار تھا کہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ اور اسباط سب ان کے مذہب و ملت کے پیروکاروں میں سے تھے، یہودی کہتے تھے کہ وہ

سب یہودی تھے اور نصرانی کہتے تھے کہ وہ وہ سب نصرانی تھے اور وہ (یہود و نصاریٰ) یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دین حق نصرانیت یا یہودیت ہی ہے اور وہ وہی کچھ ہے جو موسیٰ ؑ و عیسیٰ ؑ کو دیا گیا (مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی) لہٰذا اگر آیت میں یوں کہا جاتا ''وما اوتی ابراھیم و اسماعیل...'' تو اس سے یہ بات ثابت نہ ہو سکتی تھی کہ یہ حضرات خود نبوت کے مقام پر فائز تھے اور ان پر وحی ہوتی تھی اور احکام ''نازل'' ہوتے تھے بلکہ یہ امکان پیدا ہو جاتا کہ انہیں جو کچھ خدا نے دیا ہے وہ وہی ہے جو موسیٰ ؑ و عیسیٰ ؑ کو دیا گیا ہے اور یہ سب انہی دو کے پیروکار تھے جیسا کہ ''وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ......'' میں ''بنی اسرائیل'' کے لیے ''ایتائی'' دینے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جبکہ وہ نبیوں کے پیروکار تھے اس لیے خدا نے ابراہیم ؑ اور ان کے بعد جن انبیاء کے نام لیے ان کی بابت ''انزل'' (نازل کیا گیا) کا لفظ استعمال کیا لیکن جو نبی حضرت ابراہیم ؑ سے پہلے تھے ان کے لیے ''اُوْتِیَ'' (دیا گیا) کا لفظ استعمال کیا کیونکہ ان انبیاء ؑ کرام کے بارے میں کوئی ایسی بات ہی نہیں کی جاری تھی کہ جس کے جواب میں وضاحت ضروری ہوتی لہٰذا ''اُوْتِیَ'' کے لفظ پر اکتفاء کی گئی۔

بنی اسرائیل کے قبائل

○ ''وَالْاَسْبَاطِ''

اسباط سبط سے جمع کا صیغہ ہے، یہ لفظ ''قبیلہ'' اور ایسے افراد کے گروہ کا معنی دیتا ہے جو پدری سلسلہ نسب میں ایک ہی باپ کی اولاد ہوں، بنی اسرائیل کے ''اسباط'' کی مثال بنی اسماعیل کے قبائل کی طرح ہے اور وہ (اسباط بنی اسرائیل) بارہ گروہ و قبائل تھے جن میں سے ہر ایک حضرت یعقوب ؑ کے بارہ بیٹوں کی نسل سے تھا یعنی ہر گروہ و قبیلہ کا پدری سلسلہ ءنسب حضرت یعقوب کے بارہ بیٹوں میں سے ایک بیٹے تک پہنچتا تھا۔ اس طرح وہ قبائل ''بارہ اسباط بنی اسرائیل'' کہلاتے ہیں۔

آیت میں ارشاد حق تعالیٰ ہے کہ جو کچھ اسباط پر نازل کیا گیا، تو اگر ''اسباط'' کے لفظ سے گروہ اور قبائل مراد لیے جائیں تو ''ان کی طرف نازل کرنے'' کی نسبت اس وجہ سے درست ہوگی کہ ان میں سے انبیاء ؑ بھی تھے لہٰذا ان انبیاء ؑ کے حوالہ سے پورے قبیلہ کی طرف ''نازل کرنے'' کے الفاظ استعمال کئے گئے۔ اور اگر ''اسباط'' سے مراد افراد و اشخاص لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اسباط'' سے بنی اسرائیل میں سے ''انبیاء ؑ'' مقصود ہوں کہ جن پر وحی نازل ہوئی، البتہ یہ بات یاد رہے کہ اس صورت میں ''اسباط'' کے لفظ میں برادران یوسف ؑ شامل نہیں ہونگے کیونکہ وہ نبی نہیں تھے اس آیت کی مانند ایک اور آیت سورہ نساء میں بھی موجود ہے جس میں ''اسباط'' (اولاد یعقوب ؑ) کا تذکرہ ''انبیائ'' کی فہرست میں ہوا ہے ملاحظہ ہو:

سورۂ نساء، آیت ۱۶۳:

★ "وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِیْسٰی "۔۔۔،

(اور ہم نے وحی کی ابراہیمؑ کی طرف اور اسماعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ و اسباط و عیسیٰؑ کی طرف.....)

ایمان اور ہدایت کا ربط

○ "فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِہٖ فَقَدِ اھْتَدَوْا "

(پس اگر وہ ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے)۔

اس آیت میں "مثل" کا لفظ ایک قابل توجہ امر کے بیان کے لیے ہے جبکہ بظاہر ۔۔ اصل میں ۔۔ یوں کہنا چاہیے تھا: "اگر وہ اس پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے" لیکن اس کی بجائے یوں کہا گیا: "اگر وہ اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو"، یہ اس لیے کہا گیا تا کہ انہیں (یہودیوں اور نصرانیوں کو) لڑنے جھگڑنے اور جنگ و جدال کا بہانہ ہی نہ مل سکے کیونکہ اگر مسلمان ان سے یہ کہتے کہ تم بھی اس پر ایمان لے آؤ جس پر ہم ایمان لائے ہیں تو عین ممکن تھا کہ وہ یوں جواب دیتے..... جیسا کہ انہوں نے کہا بھی ہے... "ہم تو صرف اسی پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا اور اس کے علاوہ کسی چیز کو نہیں مانتے" لیکن اگر ان سے یہ کہا جائے کہ "ہم حق پر ایمان لائے ہیں پس تم بھی اسی طرح حق پر ایمان لے آؤ" تو اس صورت میں ان کے پاس لڑنے جھگڑنے اور دشمنی و خصومت کے لیے کوئی بہانہ باقی نہیں رہتا کیونکہ ان کے عقائد حق و حقیقت پر مبنی نہیں تھے۔

○ "فِیْ شِقَاقٍ"

عربی زبان میں "شقاق" کا معنی نفاق، جھگڑا و نزاع، آپس میں الجھنا اور افتراق و جدائی ہے۔

خدائی نصرت و مدد کا وعدہ

○ "فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ"

اس فقرے میں خداوند عالم نے اپنے نبیؐ سے یہود و نصاریٰ کے مقابلے میں مدد و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے جو کہ اس نے پورا کر دیا اور جب اس کی مشیت ہوگی تو وہ اپنی طرف سے مدد و نصرت کی یہ نعمت ملت اسلامیہ کے لیے مکمل کر دے گا۔

یاد رہے کہ یہ فقرہ (فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ) سابق اور لاحق (پہلے اور بعد میں ذکر ہونے والے دو فقروں) کے درمیان "جملہ معترضہ" کے طور پر ہے۔

خدائی رنگ

O "صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً"

"صبغۃ" یعنی ایک طرح کا رنگ، یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ایمان جس کا تذکرہ کیا گیا ہے ہمارے لیے ایک خدائی رنگ ہے اور یہ سب سے بہتر رنگ ہے کیونکہ خدائی رنگ سے بہتر کوئی رنگ نہیں ہو سکتا، اور یہ خدائی رنگ ہے یہودیت اور نصرانیت کا مخصوص رنگ نہیں جو کہ دین میں تفرقہ اور انحراف پر مبنی ہے۔

بندگی کا اقرار

O "وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ"

(اور ہم اس کی عبادت کرتے ہیں)۔

یہ جملہ حالیہ ہے اس لیے اس کا معنی یوں ہوگا: "حالانکہ ہم اس کی عبادت کرتے ہیں" گویا یہ پہلے جملہ "صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً" کی دلیل وسبب کی حیثیت رکھتا ہے، بنابرایں اس سے مراد یہ ہوگا "چونکہ ہم صرف اس کی عبادت کرتے ہیں اس لیے ہمارا دین خدائی دین اور ہر دین سے بہتر ہے"۔

خدا کے بارے میں جھگڑا کیوں

O "قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ"

(کہہ دیجیے کیا تم ہمارے ساتھ خدا کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو)۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کہو! اے اہل کتاب! تم ہمارے ساتھ خدا کے بارے میں جھگڑا کیوں کرتے ہو، تمہارا ایسا کرنا درست نہیں۔

اس کے بعد جھگڑا کرنے کے نادرست ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ: "وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ" (جبکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اور ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں اور ہم صرف اسی سے اخلاص رکھتے ہیں)۔

اب اصل موضوع کی وضاحت کے لیے عرض ہے کہ: جب دو پیروکار آپس میں اس شخصیت کے بارے میں نزاع اور جھگڑا کریں جس کی وہ پیروی کرتے ہوں تو ان کے جھگڑا کرنے کی وجہ درج ذیل تین وجوہات میں سے ایک ہوگی:

(۱)۔ دونوں پیروکاروں کا متبوع مختلف ہے یعنی ان میں سے ہر ایک الگ الگ شخصیت کی پیروی کرتا ہے اور

ہرایک یہ چاہتا ہے کہ اپنے متبوع (جس کی وہ پیروی کرتا ہے) کو دوسرے پیروکار کے متبوع پر برتری دے اور اپنے رب کو دوسرے کے رب سے بہتر اور افضل ثابت کرے جیسا کہ بت پرست اور مسلمان کرتے ہیں۔

(۲)۔ دونوں پیروکار ایک ہی شخصیت کی پیروی کرتے ہوں لیکن ہر ایک یہ چاہتا ہو کہ اپنے آپ کو اپنے متبوع سے قریب تر اور دوسرے کو دور تر ثابت کرے اور خود کو اپنے متبوع کے مقرب ہونے کی تمام تر خصوصیات کا حامل سمجھتا ہو جبکہ دوسرے کو ان سے محروم قرار دیتا ہو۔

(۳)۔ دونوں میں سے ایک پیروکار بری عادتوں اور بدخصلتوں کا حامل ہو کہ جن کی وجہ سے اس کا اپنے متبوع کی طرف منسوب ہونا ہرگز نامناسب و نادرست ہو بلکہ متبوع کی ہتک حرمت کا باعث ہو۔

یہ ہیں وہ تین اسباب و وجوہات جو عام طور پر فریقین اور دو پیروکاروں کے درمیان اختلاف و نزاع اور جھگڑے کا باعث بنتے ہیں جبکہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان اختلاف و نزاع کے ان تین اسباب میں سے کوئی ایک بھی موجود نہ تھا کیونکہ:

(۱) ان دونوں کا متبوع و رب اور معبود ایک ہے (وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ)۔

(۲) ہر ایک کے اعمال خود اس سے ہی تعلق رکھتے ہیں کسی ایک کے اعمال کا دوسرے کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں اور ہر ایک اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے (وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ)۔

(۳) مسلمان اپنے دین میں اخلاص رکھتے ہیں اور دین کی بابت کسی طرح کے کمزور موقف کے حامل نہیں (وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ)۔

بنابراین ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جس کی بناء پر اہل کتاب مسلمانوں سے نزاع کریں، اس لیے خداوند عالم نے زیر نظر آیت میں سب سے پہلے ان کے مسلمانوں سے جھگڑا و نزاع کرنے کی نفی کی (قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ)۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اختلاف و نزاع کے مذکورہ تین اسباب کی نفی کی تا کہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔

یہود و نصاریٰ کا انبیاء کے بارے میں اظہار

○ ”اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ ... كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى“

دونوں فریق (یہودی اور نصرانی) اس بات کے مدعی تھے کہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ و اسباط کا تعلق ان سے ہے یعنی وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے، فریقین کا یہ دعویٰ کہ وہ ان سے تعلق رکھتے تھے ان کے اپنے تئیں گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ انبیاء یہودیت کے مسلک پر تھے یا نصرانیت کے عقیدے پر تھے، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ”صراحت“ کے ساتھ کہا کہ وہ انبیاء یہودی یا نصرانی تھے جیسا کہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں ملتا ہے: ملاحظہ ہو:

سورہء آل عمران، آیت ۶۵:

"یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ مَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ"۔

(اے اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کی بابت نزاع و جھگڑا کیوں کرتے ہو جبکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل کی گئی ہیں، کیا تم عقلمندی سے کام نہیں لیتے!)

(اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے دعوؤں کی قلعی کھول دی گئی ہے۔)

علم خدا سے تقابل ممکن نہیں

○ "قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ"

اس آیت میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ ان یہودیوں اور نصرانیوں سے کہہ دیجئے کہ آیا تم زیادہ علم و آگاہی رکھتے ہو یا خدا؟ جبکہ خدا نے ہی ہمیں اور تمہیں اپنی مقدس کتاب میں اس بات سے مطلع و آگاہ کیا ہے کہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور ان پر نازل کی جانے والی کتابیں (تورات و انجیل) ابراہیمؑ اور دیگر مذکورہ انبیاء کے بعد آئیں۔

کتمان شہادت ظلم عظیم ہے

○ "وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ"

(اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اپنے پاس اس گواہی کو چھپائے جو خدا کی طرف سے آئی ہے)۔

اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ: اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو یہ دیکھ بھال کر کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت موسیٰؑ یا شریعت عیسیٰؑ کو ابراہیمؑ اور دیگر مذکورہ انبیاءؑ کے بعد نازل کیا، چھپالے اور اس پر پردہ ڈال دے۔

یا یہ کہ: اس سے بڑا ظالم اور کون ہے جو خدا کی اس گواہی کو چھپائے کہ یہ انبیاء (ابراہیمؑ اور دیگر) تورات و انجیل سے پہلے آئے تھے۔

آیت میں مذکور لفظ "شَهَادَةً" سے مراد اگر پہلا معنی لیا جائے تو اسے اصطلاحی طور پر "شہادت تحمل" کہا جاتا ہے اور اگر دوسرا معنی مراد لیا جائے تو اسے "شہادت ادا" کہتے ہیں تاہم پہلا معنی ہمارے نزدیک درست ہے۔

(یاد رہے کہ "شہادتِ تحمل" سے مراد دیکھنا، جاننا اور اچھی طرح آگاہ ہونا ہے اور "شہادت ادائی" سے مراد گواہی دینا ہے)۔

ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ ہے

O" تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ"...

اس آیت میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ تو اب گزر چکے ہیں ان کے اعمال ان کے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا' یعنی ان کے بارے میں تمہارا آپس میں الجھنا اور یہ بحث کرنا کہ وہ کس گروہ سے تعلق رکھتے تھے تمہارے لیے ہرگز فائدہ مند نہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں بحث و گفتگو اور اختلاف و نزاع نہ کرنا تمہیں کوئی ضرر و نقصان پہنچا سکتا ہے بلکہ تمہارے لیے تو صرف یہ ضروری ہے کہ تم ان کاموں میں مصروف رہو جن کی بابت قیامت کے دن تم سے پوچھ گچھ ہوگی۔

یاد رہے کہ یہ آیت اس سے پہلے بھی انہی الفاظ کے ساتھ ذکر کی جا چکی ہے (ملاحظہ ہو آیت ۱۳۴) اس کے دوبارہ ذکر کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ...... یہودی اور نصرانی ...... حضرت ابراہیمؑ اور دیگر انبیاءؑ کے بارے میں نزاع و جھگڑا کرنے کے بے سود کام میں حد سے زیادہ بڑھ چکے تھے جبکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ بھی ہو چکے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے پہلے تھے لیکن اس کے باوجود وہ لوگ ان کے یہودی یا نصرانی ہونے کے بارے میں بحث و نزاع کی آخری حدوں کو چھونے لگے تھے اس لیے خدا نے ارشاد فرمایا کہ تم اس بے فائدہ بحث میں نہ پڑو کیونکہ وہ تو اب گزر چکے ہیں ان کے اعمال ان کے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا جائے گا۔ لہٰذا صرف ان کے یہودی یا نصرانی ہونے کو ثابت کرنے سے تم کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہو' حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ لوگ (یہود و نصاریٰ) اپنی بحث کو اس بے فائدہ پہلو میں محدود کر کے نزاع و اختلاف کی راہ پر چلنے کی بجائے نبیوں اور پیغمبروں کے حالات زندگی اور ان کے پاکیزہ فضائل و خصائل اور کردار ساز صفات میں غور و فکر کرتے تو ان کے لیے زیادہ فائدہ مند ہوتا جیسا کہ قرآن مجید نے انبیاء کرامؑ کے واقعات و حالات کا تذکرہ کر کے ان کے بارے میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کی دعوت و تاکید کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اہل ایمان ان حالات و واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کریں...... تاکہ ان سے اپنی عملی زندگی میں سبق حاصل کر کے کردار سازی کے عمل میں کامیاب ہو سکیں۔

روایات پر ایک نظر

حنیفیت کی اصل واساس

تفسیر عیاشی میں آیت مبارکہ "قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا" ... کی بابت منقول ہے، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: (الحنیفیة فی الاسلام) حقیقت میں "حنیفیت" اسلام میں ہے۔

(حنیفیت یعنی خلوص و پاکیزگی اور پاک وطاہر ہونا)۔

حنیفیت کی وسعت

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا: "حنیفیت" کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہر چیز اس کے دائرہ میں آجاتی ہے یہاں تک کہ مونچھوں کا کاٹنا' ناخن اتارنا اور ختنہ کرنا بھی اسی کے باب سے ہے۔

حنیفیت یعنی پاکیزگی

تفسیر قمی میں مذکور ہے کہ: خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ پر "حنیفیت" نازل فرمائی اور اس سے مراد "طہارت و پاکیزگی" ہے اور وہ دس چیزیں ہیں:

ان میں پانچ سر میں اور پانچ بدن میں ہیں' سر کی پانچ چیزیں یہ ہیں:

(اخذ الشارب، اعفاء اللحی، طم الشعر، السواك، الخلال)

۱۔ مونچھوں کا کاٹنا ۲۔ داڑھی رکھنا۔ ۳۔ بالوں کا درست کرنا (سنوارنا) ۴۔ مسواک کرنا ۵۔ دانتوں میں خلال کرنا۔

اور بدن کی پانچ چیزیں یہ ہیں:

(اخذ الشعر من البدن، الختان، قلم الاظفار، الغسل من الجنابة والطهور بالماء)

۱۔ بدن کے زائد بال صاف کرنا۔ ۲۔ ختنہ کرنا۔ ۳۔ ناخن کاٹنا۔ ۴۔ جنابت کا غسل کرنا ۵۔ پانی سے طہارت استنجاء کرنا ... یہی پاکیزہ حنیفیت ہے جسے حضرت ابراہیمؑ لے آئے اور یہ اب تک منسوخ نہیں ہوئی اور نہ ہی قیامت تک منسوخ ہوگی۔

اس روایت میں "طم الشعر" سے مراد بالوں کا بنانا سنوارنا ہے' مذکورہ بالا روایت کے معنی ومفہوم پر مشتمل کثیر

روایات فریقین......شیعہ وسنی......کی کتب میں ذکر کی گئی ہیں۔

مخاطب ومصداق کا تعین

کتاب کافی اور تفسیر عیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے آیت مبارکہ "قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ..." کی تفسیر میں مذکور ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(انما عنیٰ بہا علیا و فاطمۃ والحسن والحسین وجرت بعدھم فی الائمۃ)

اس سے مراد علیؑ و فاطمہؑ وحسنؑ وحسینؑ ہیں اور ان کے بعد دیگر آئمہؑ بھی اس میں شامل ہیں (یعنی وہی اس کے مخاطب ہیں)۔

اس حدیث سے مذکورہ معنی مراد لینا اس لیے بھی صحیح اور درست قرار پاتا ہے کہ یہ خطاب (قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ...) حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کے بعد ہوا ہے جس میں انہوں نے اپنی ذریت میں "امت مسلمہ" قرار دینے کی تمنا کی (وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ) البتہ اس خطاب کا تمام مسلمانوں کے لیے ہونا مذکورہ معنی مراد لینے سے منافات نہیں رکھتا یعنی اگر دونوں معنے مراد لیے جائیں تب بھی کوئی حرج لازم نہیں آتا کیونکہ جہاں حضرت ابراہیمؑ کا اپنی ذریت ونسل میں سے "امت مسلمہ" قرار دینے کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں تو صورتِ امر واضح ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی مسلم الثبوت ہے کہ تمام مسلمان خدا پر ایمان لانے کے مکلف ہیں (ان پر لازم وضروری ہے کہ وہ خدا پر ایمان لائیں......) اس لیے اگر یہ کہا جائے تو کوئی حرج لازم نہیں آتا کہ "قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ..." کا مخاطب ایک لحاظ سے علیؑ وفاطمہؑ وحسنؑ وحسینؑ اور دیگر آئمہ اطہارؑ ہیں اور ایک لحاظ سے تمام مسلمان ہیں، اور یہ اس لیے صحیح ہے کہ اس طرح کے خطاب میں عام اور خاص دونوں پہلو ملحوظ ہوتے ہیں اور معنی ومفہوم کے مراتب کے مختلف ہونے کی وجہ سے مخاطب بھی مختلف ہو جاتے ہیں جیسا کہ ہم نے اسلام اور ایمان کے مراتب ودرجات کی بحث میں واضح طور پر بیان کیا ہے۔

خدائی رنگ یعنی اسلام اور ولایت

تفسیر قمی سے حضرت امام جعفر صادقؑ یا امام محمد باقر علیہ السلام اور کتاب معانی الاخبار میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے "صِبْغَةَ اللّٰهِ" (اللہ کا رنگ) کی تفسیر میں منقول ہے کہ اس سے مراد "اسلام" ہے۔

کتاب کافی اور معانی الاخبار میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا: "صِبْغَةَ اللّٰهِ" کی آیت سے مراد یہ ہے کہ میثاق کے وقت مومنین نے اپنے آپ کو "ولایت" کے رنگ سے مزین کرلیا۔

مذکورہ بالا حدیث دراصل زیر نظر آیت کی باطنی تفسیر کے باب سے ہے اور انشاء اللہ "باطنی تفسیر" کی بابت ہم بعد میں وضاحت کریں گے اور "ولایت" و "میثاق" کے معانی کو بھی بیان کریں گے۔

آیات ۱۴۲ تا ۱۵۱

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ
لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾
وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ
الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۭ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ
وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾
قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ
وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَ اِنَّ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾
وَ لَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَ مَآ اَنْتَ
بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

○ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِیْقًا
مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

○ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۱۴۷﴾

○ وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ
جَمِیْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۴۸﴾

○ وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

○ وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَیْثُ مَا
كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا
مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِیْ ۗ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

○ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَكِّیْكُمْ وَ یُعَلِّمُكُمُ
الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

ترجمہ

○ ''بہت جلد بے وقوف لوگ کہیں گے کہ انہیں (مسلمانوں کو) کسی نے اس قبلہ سے پھیر دیا ہے جس کی طرف یہ منہ کرتے تھے' کہہ دیجئے کہ مشرق ومغرب خدا ہی کے لیے ہیں' وہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ کی ہدایت کرتا ہے''...... (۱۴۲)

○ ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت قرار دیا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں' اور تو جس قبلہ کی طرف پہلے منہ کرتا تھا اسے ہم نے اس لیے قبلہ قرار دیا تھا تاکہ ان لوگوں کو جان لیں جو رسول کی پیروی کرتے ہیں اور ان لوگوں کو جو پچھلے پاؤں پلٹ جانے والے ہیں' اگرچہ یہ بات (قبلہ کی تبدیلی کے حکم کو تسلیم کرنا) بہت گراں ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جنہیں خداوند عالم نے ہدایت فرمائی اور خدا ہرگز تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرتا کیونکہ وہ لوگوں پر مہربان اور رحم کرنے والا ہے...... (۱۴۳)

○ ''ہم دیکھتے ہیں کہ تم آسمان کی طرف نگاہ کرتے رہتے ہو' پس ہم ضرور تمہارا رخ اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے تم خوش ہو' تم اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لو اور تم جہاں کہیں بھی ہو اس مسجد کی طرف رخ کر لو' جن لوگوں کو کتاب عطا کی گئی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ حکم صحیح ہے اور خدا کی طرف سے آیا ہے' خدا تمہارے اعمال سے ہرگز غافل نہیں''... (۱۴۴)

○ ''اگر تم ہر طرح کی دلیل وثبوت ان کے سامنے پیش کرو تب بھی یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور تم بھی ان کے قبلہ کی پیروی نہ کرو گے اور وہ بھی ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں' اور اگر تم ان کی نفسانی خواہشات کی پیروی کرو جبکہ تمہارے پاس علم بھی آ چکا ہے تو تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے''..... (۱۴۵)

○ ''جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ اس (پیغمبر اسلامؐ) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں تاہم ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو حق کو پہچاننے کے باوجود چھپاتا ہے۔..... (۱۴۶)

○ ''تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ (حکم) حق ہے اس کے بارے میں شک کرنے والوں میں سے نہ ہوجانا''...... (۱۴۷)

○ ''ہر گروہ کیلئے ایک سمت ہے اور وہ اس کی طرف رخ کرتا ہے' پس تم نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو تم جہاں بھی ہو گے خدا تم سب کو..... قیامت کے دن..... لے آئے گا' خدا ہر شئے پر قادر ہے''..... (۱۴۸)

○ ''تم جہاں سے بھی نکلو اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کو لو یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق کا حکم ہے اور خدا تمہارے اعمال سے ہر گز غافل نہیں''۔ (۱۴۹)

○ ''اور تم جہاں سے بھی نکلو اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لو' تم جہاں بھی ہو اپنے منہ مسجد الحرام کی طرف کرو تا کہ لوگ تمہارے خلاف حجت قائم نہ کر سکیں سوائے ظالم و ستمگر لوگوں کے کہ تم ان سے ہرگز نہ ڈرو بلکہ صرف میرا (میری نافرمانی کا) خوف اپنے دلوں میں رکھو' تا کہ میں تم پر اپنی نعمت کو مکمل کر دوں کہ شاید تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ''...... (۱۵۰)

○ (یہ اسی طرح ہے) ''جس طرح ہم نے تم میں سے ایک رسول تمہاری طرف مبعوث کیا تا کہ ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھے' تمہارا تزکیۂ نفس کرے' تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تمہیں اس کا علم عطا کرے''..... (۱۵۱)

تفسیر و بیان

ان آیات (۱۴۲......۱۵۱) میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرنے سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب اپنے مخصوص انداز، ترتیب و تسلسل کے ساتھ ایک ہی مطلب و حقیقت کو بیان کرتی ہیں اور وہ ہے کعبہ کو مسلمانوں کے لئے قبلہ قرار دینا، بنابرایں بعض محققین و مفسرین کا یہ کہنا کہ ان آیات میں تقدم اور تاخر پایا جاتا ہے یا یہ کہ ان میں ناسخ و منسوخ آیات بھی موجود ہیں قطعاً نادرست اور ناقابل توجہ بات ہے، یہاں تک کہ بعض محدثین حضرات نے اس سلسلہ میں کچھ روایات بھی ذکر کی ہیں تو یہ سب کچھ چونکہ آیات کے ظاہری الفاظ و معانی سے متصادم ہے اس لیے اسے کسی صورت میں قابل اعتناء قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قبلہ کی تبدیلی کا حکم اور اس پر اعتراض

○ "سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ..."

یہ آیت اس حکم کے بارے میں دوسرے تمہیدی بیان کی حیثیت رکھتی ہے جس میں خداوند عالم نے کعبہ کو قبلہ قرار دینے کا فرمان جاری کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس آیت میں مسلمانوں کو اس امر کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ وہ سفیہ و بے وقوف لوگوں یعنی ان یہودیوں کو جو اپنے قبلہ یعنی بیت المقدس کے سلسلے میں بیجا تعصب کا شکار ہیں اور عرب کے ان مشرکین کو جو جھگڑا و نزاع کرنے کے لیے بہانہ جوئی کرتے رہتے ہیں کس طرح دندان شکن جواب دیں اور ان کے اعتراضات کو کس طرح رد کریں، جبکہ اس سے پہلی آیات میں خداوند عالم نے قبلہ کی تبدیلی کے سلسلے میں پہلے حضرت ابراہیمؑ کے واقعات اور انہیں عطا کی جانے والی عزت و اعزاز، ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ پر ہونے والی عنایات، حضرت ابراہیمؑ کی وہ دعا جو انہوں نے کعبہ، مکہ، پیغمبر اسلامؐ اور امت مسلمہ کے لیے کی، ان دونوں (ابراہیمؑ و اسماعیلؑ) کا بیت اللہ کو تعمیر کرنا اور اسے عبادت کے لیے پاک و پاکیزہ کرنے کا حکم ذکر کیا ہے تو یہ سب تذکرے دراصل قبلہ کی تبدیلی کے سلسلے میں صادر ہونے والے حکم کے تمہیدی بیان کے طور پر تھے اور یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ دینی واقعات میں نہایت اہمیت کا حامل ہے اور ان شرعی احکامات میں سے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے جو

حضرت پیغمبر اسلامؐ کی مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد اور اسلام کے بنیادی اصولوں اور حقائق و معارف کے عام ہو جانے کے زمانے میں صادر ہوئے لہٰذا یہودی وغیرہ اس حکم پر کسی صورت میں خاموشی اختیار نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اس فرمان کو تسلیم کرنے پر تیار تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قبلہ کی تبدیلی سے ان کا ایک بہت بڑا اعزاز ان سے چھن جائے گا اور وہ جس چیز کی وجہ سے مسلمانوں اور دیگر مذاہب والوں کے سامنے فخر و مباہات کرتے ہیں (قبلہ) اس سے محروم ہو جائیں گے اور صرف یہی نہیں کہ قبلہ جیسے اہم دینی اعزاز سے محروم ہوں گے بلکہ یہ بہت بڑا اعزاز مسلمانوں کے دین کو حاصل ہو جائے گا اور وہ مزید ترقی پا لیں گے کیونکہ اس طرح وہ سب اپنی عبادات اور دینی فرائض کی ادائیگی کے وقت ایک ہی مرکزی نقطہ پر یکجا ہوں گے جس کے نتیجے میں ان کے درمیان ہر قسم کے اختلافات اور ظاہری و باطنی تفرقے ختم ہو جائیں گے اور وہ سب متحد، یک رنگ و یک صدا ہو کر اپنے دین ... اسلام کو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے عبادات بجالانے کا حکم مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر لے گا کیونکہ یہ حکم ان کی معنوی قدروں میں اضافہ و استحکام پیدا کر دے گا جو کہ طہارت و دعا وغیرہ جیسے احکام کی نسبت اہل اسلام کے نفوس میں زیادہ موثر ثابت ہو سکتا ہے اور یہ بات یہودیوں اور مشرکین عرب کے لیے سخت ناگوار ہے کیونکہ وہ سب اور خاص طور پر یہودی جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ان کے واقعات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے...... یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ عالم طبیعت میں نامحسوس امور کی کوئی حیثیت و وقعت ہی نہیں اس لیے جب بھی ان کے پاس کوئی ایسا حکم خدا کی طرف سے آتا جس کا تعلق ظاہری عمل سے نہ ہوتا تو وہ اسے کسی ضروری بحث و گفتگو اور سوچ و بچار کے بغیر فوراً قبول کر لیتے تھے اور اگر کوئی ایسا حکم آتا جس کا تعلق ظاہری عمل سے ہوتا مثلاً جنگ و جہاد، ہجرت اور سجدہ و تسلیم امر کا حکم وغیرہ کہ جس کا تعلق عالم محسوسات سے ہے اس کا فوراً انکار کر دیتے اور اس کی خلاف ورزی پر کمربستہ نظر آتے تھے اور اسے کسی صورت میں تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے، بنا برایں وہ قبلہ کی تبدیلی کے حکم پر کیونکر خاموش یا اسے تسلیم کر سکتے تھے؟

بہر حال خداوند عالم نے اس آیت میں قبلہ کی تبدیلی کے بارے میں یہودیوں اور نصرانیوں کے اعتراضات سے مسلمانوں کو پہلے ہی مطلع کر دیا اور اپنے نبیؐ کو ان کے اعتراضات کے جوابات سے بھی آگاہ کر دیا اور آنحضرتؐ کو اچھی طرح اس بات کی تعلیم دی کہ کس طرح یہود و نصاریٰ کے اعتراضات کا دندان شکن جواب دیں۔

اب دیکھیں کہ اس سلسلہ میں (قبلہ کی تبدیلی کی بابت) یہود و نصاریٰ کے اعتراضات کیا تھے اور خداوند عالم نے ان کے کیا جوابات دیئے؟

یہود و نصاریٰ کے اعتراض کا خلاصہ

قبلہ کی تبدیلی کا حکم اس لیے درست نہیں کہ یہ اس مقدس مقام سے روگردانی پر مشتمل ہے جسے خداوند عالم نے گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے لیے قبلہ قرار دیا اس مقام کی عظمت و تقدس کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ اس میں پائی جانے والی

خصوصیت کی وجہ سے خدا نے اسے تمام سابقہ انبیاءؑ کے لیے قبلہ ہونے کا شرف عطا فرمایا' لہٰذا اب اسے کسی وجہ کے بغیر تبدیل کر دینا کیونکر درست قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حکم خدا نے صادر فرمایا ہے تو یہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ خدا نے ہی تو بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا ہے اور وہ اپنے اس فیصلے کو کس طرح تبدیل کر سکتا ہے اور اپنے حکم کو کیونکر منسوخ کر سکتا ہے؟ (کیونکہ یہودی احکام میں نسخ کے قائل ہی نہیں اور وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا اپنے حکم کو منسوخ نہیں کرتا جیسا کہ ان کے اس عقیدہ کی بابت آیت "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا..." کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے) اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ حکم خدا کی طرف سے نہیں تو اس کو تسلیم کرنا سیدھے راستہ سے انحراف کرنے اور ہدایت سے گمراہی وضلالت کی طرف جانے کا باعث ہوگا' یاد رہے کہ یہود ونصاریٰ کے اعتراض کی بابت یہ تفصیل قرآن مجید میں اس ترتیب کے ساتھ صراحتا تو مذکور نہیں لیکن خدا کی طرف سے دیئے گئے جواب سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے!

اعتراض کا جواب:

یہ بات مسلم ہے کہ کسی گھر مثلاً کعبہ یا کسی مقام مثلاً بیت المقدس یا اس پتھر کو جو اس میں ہے قبلہ قرار دینا ان میں پائی جانے والی کسی ذاتی خصوصیت کی وجہ سے نہیں کہ جسے کسی صورت میں تبدیل نہ کیا جا سکتا ہو اور ہر حال میں ان کی ذاتی خصوصیت کے پیش نظر اس کے تمام تقاضے پورے کرنے ضروری ہوں اور اسی بناء پر بیت المقدس کا "قبلہ" ہونا ایک ابدی و دائمی اور ناقابل تبدیلی امر ہو' ایسا ہرگز نہیں بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ انسان جس سمت بھی رخ کر سکتا ہو اس کے لیے تمام سمتیں برابر حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں سے کسی ایک سمت کو کوئی ذاتی خصوصیت حاصل نہیں کہ جس کی وجہ سے انسان اس کے علاوہ کسی دوسری جانب رخ نہ کر سکے' یہ تو حکم الٰہی کی بناء پر ہے کہ انسان کسی ایک معین سمت کی طرف منہ کر کے عبادت بجا لاتا ہے ورنہ خدا کے حکم سے قطع نظر کسی سمت کی اپنی کوئی خصوصیت انسان کو مجبور نہیں کرتی کہ وہ اس کی طرف منہ کرے' خدا کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اور جب چاہے حکم دے اور خدا کا ہر حکم لوگوں کی ہدایت و رہنمائی اور صلاح و بہتری کے لیے ہوتا ہے تاکہ وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں حقیقی کمال حاصل کر سکیں' لہٰذا وہ صرف ہدایت و رہنمائی کی غرض سے حکم صادر فرماتا ہے اور اس کی ہدایت صراط مستقیم اور لوگوں کی صلاح وفلاح اور کمال وسعادت کی طرف ہوتی ہے۔

سفیہ و بیوقوف لوگوں کے اظہارات

O "سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ"

اس آیت میں "سفیہ" و بے وقوف لوگوں سے مراد یہودی اور مشرکین عرب ہیں اسی لیے ان کے لئے "الناس"......لوگ......کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' اور انہیں "سفیہ" و بے وقوف کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ شرعی حکم کے بارے میں صحیح طرز تفکر نہ رکھتے تھے اور اپنی غلط رائے پر ڈٹے ہوئے تھے' (قبلہ کی تبدیلی کا خدائی حکم تسلیم نہ کرنے کے لیے غلط طرز

تفکر اختیار کئے ہوئے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ بیت المقدس ہی کو ہمیشہ کے لیے قبلہ ہونا چاہیے) "سفاہت" کا معنی عقل سے درست کام نہ لینا اور کمزور و ناپختہ نظریہ رکھنا ہے (بے وقوفی اور نظریہ کی ناپختگی)۔

قبلہ کی تبدیلی کیوں؟

○ "مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا"

عربی ادب کے قواعد کی رو سے "ولّی" کا تعدیہ اگر حرف "عن" کے بغیر ہو اور یوں کہا جائے "تولیۃ الشیئی" یا "تولیۃ المکان" تو اس کا معنی اس چیز یا جگہ کو اپنے سامنے اور روبرو قرار دینا ہوتا ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا" (ہم تجھے اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے تو خوش ہو) اور اگر "عن" کے ساتھ ہو اور یوں کہا جائے: "التولیۃ عن الشیئی" تو اس کا معنی اس چیز سے منہ پھیر لینا...... روگردانی کرنا...... مثلاً اس کی طرف پشت کرنا وغیرہ ہوگا۔

بنابرایں آیت کا معنی یہ ہوگا: یہودی اور مشرکین عرب مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہیں گے کہ کس چیز نے اس قبلہ (بیت المقدس) سے ان کے منہ پھیر دیئے ہیں کہ جس کی طرف منہ کر کے ان کا نبی اور دیگر مسلمان مکہ میں قیام کے دوران اور ہجرت کے چند سال بعد تک عبادت بجالاتے رہے ہیں اور اپنی نمازیں اس کی طرف منہ کر کے ادا کرتے رہے ہیں؛

اس مقام پر ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ! کس نے انہیں "اپنے قبلہ" سے پھیر دیا ہے یعنی انہوں نے "قبلہ" کی نسبت مسلمانوں کی طرف دی جبکہ وہ خود (یہودی) ان سے پہلے اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے لیکن انہوں نے "ہمارے قبلہ" کہنے کی بجائے "ان کے قبلہ" کے الفاظ استعمال کئے، تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس لیے ایسا کیا ہے تا کہ مسلمانوں پر اپنے اعتراض کو پختہ کر سکیں اور اپنی بات کو مسلمانوں کے لیے مزید تعجب انگیز بنائیں کہ انہوں نے اپنے ہی قبلہ سے روگردانی کر لی ہے، اگر وہ یوں کہتے کہ "کس نے انہیں ہمارے (یہودیوں کے) قبلہ سے پھیر دیا ہے تو ان کے اعتراض میں وزن نہ ہوتا بلکہ ان کی بات اور اعتراض کا جواب خود بخود واضح ہو جاتا۔

ہر سمت خدا کیلئے ہے

○ "قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ"

(کہہ دیجئے کہ اللہ ہی کے لیے ہے مشرق اور مغرب)۔

اس فقرے میں صرف دو سمتوں...... مشرق و مغرب...... کا ذکر ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو سمتیں ہی دیگر تمام اصلی و فرعی سمتوں کے تعین کا ذریعہ ہیں اور شمال و جنوب کو انہی کے ذریعے مشخص و متعین کیا جاتا ہے بلکہ دیگر ہر سمت و جہت کا

تعین انہی کے حوالہ سے ہوتا ہے اور یہ دو سمتیں (مشرق و مغرب) سورج یا ستاروں کے طلوع وغروب کی نسبت سے "سمت" کہلاتی ہیں یعنی مشرق کو اس لیے مشرق کہا جاتا ہے کہ سورج کا شروق ..... طلوع ہونا...... اس طرف سے متحقق ہوتا ہے اور مغرب کو اس لیے "مغرب" کہا جاتا ہے کہ سورج اس طرف غروب کرتا ہے اور یہ دونوں ..... مشرق و مغرب..... روئے زمین کے تمام نقاط کو گھیرے ہوئے ہیں سوائے دو خیالی سمتوں یعنی حقیقی شمال وجنوب کی موہوم طرفوں کے کہ وہ یا تو مشرق کے نصف سمت میں واقع ہیں یا مغرب کی نصف سمت میں اور شاید اسی وجہ سے آیت مبارکہ میں دیگر سمتوں کے ذکر کی بجائے مشرق و مغرب کے ذکر پر اکتفاء کی گئی۔

صراط مستقیم کی ہدایت، خدا کی عنایت

○ "یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ"

(وہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے صراط مستقیم کی طرف!)

اس مقام پر لفظ "صراط" نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ "سیدھا راستہ" امتوں کے کسب کمال و حصول سعادت کی صلاحیتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف مراتب کا حامل ہوتا ہے اس لیے اسے "نکرہ" کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

درمیانی امت کا مقام ومرتبہ اور کردار

○ "وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا"

بظاہر آیت کا معنی یہ ہے کہ جس طرح ہم قبلہ کو تبدیل کر دیں گے تا کہ تمہیں صراط مستقیم سیدھے راستہ..... کی ہدایت کریں اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت قرار دیا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔

اس مقام پر بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے: جس طرح قبلہ کی تبدیلی ایک عجیب...... تعجب خیز...... کام ہے اسی طرح درمیانی امت قرار دینا بھی عجیب امر ہے اس قول کا نادرست ہونا کسی وضاحت کا محتاج نہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ قول بذاتِ خود عجیب ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ "درمیانی امت" قرار دینے سے کیا مراد ہے؟ بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ "امت اسلامیہ" دوسرے لوگوں ... یہود اور مشرکین ... کی نسبت درمیانی نقطہ پر ہے کیونکہ عربی زبان میں "وسط" کا معنی "درمیان" درمیانی نقطہ" ہے جو دو طرفوں کے بیچ میں قرار پاتا ہے یعنی نہ اس طرف ہے نہ اس طرف بلکہ "درمیان" میں واقع ہوتا ہے۔ اسی حوالہ سے مسلمانوں کو "درمیانی امت کہا گیا ہے کیونکہ وہ اہل کتاب اور مشرکین کے مسالک کے درمیان میں ہیں اور وہ یوں کہ ایک طرف مشرکین و بت پرست ہیں کہ جو صرف اسی دنیاوی زندگی کی لذتوں، آسائشوں اور مادی زیب وزینت سے دل لگائے

ہوئے ہیں اوران کی تمام تر توجہات کا مرکز جسمانی ونفسانی لذتوں کا حصول ہے اور وہ معنوی قدروں اور روحانی کمالات و فضائل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ وہ حشر ونشر اور قیامت کے دن حساب و کتاب کا عقیدہ ہی نہیں رکھتے' اور دوسری طرف نصاریٰ ہیں کہ رہبانیت کا راگ الاپے ہوئے ہیں اوران کی تمام تر توجہ روحانی امور کی طرف ہے اور وہ جسمانی کمالات کو یکسر ٹھکراتے ہیں جبکہ خداوند عالم نے ان جسمانی کمالات کو اس مادی دنیا میں انسان کے لیے ان معنوی عظمتوں کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے جن کے لیے انسان کی تخلیق عمل میں آئی' بنابرایں یہ لوگ (نصاریٰ) روحانی امور میں اپنی توجہات کو مرکوز کرتے ہوئے اسباب سے منہ موڑ کر نتیجہ سے محروم ہو گئے یعنی روحانی کمالات سے اس لیے محروم ہو گئے کہ ان کمالات کے حصول کے لیے جو ذرائع واسباب معین کئے گئے تھے یعنی جسمانی کمالات وصلاحیتیں ان سے انہوں نے منہ موڑ لیا تو ظاہر ہے کہ جب کسی چیز کے اصل ذریعہ وسبب ہی سے منہ موڑ لیا جائے تو اس کا حصول کیونکر ممکن ہو سکتا ہے' جبکہ وہ لوگ (مشرک و بت پرست) صرف دنیاوی آسائشوں اور جسمانی لذتوں سے دل لگانے کی وجہ سے روحانی ومعنوی عظمتوں وکمالات سے محروم ہو گئے یعنی انہوں نے اسباب سے تو دل لگا لیا مگر نتیجہ سے غفلت برتی' لیکن خداوند عالم نے اس امت ..... مسلمہ..... کو درمیانی نقطہ میں قرار دیا اوران کے لیے ایک دین وآئین بنایا جو انہیں اس سیدھے راستہ کی ہدایت کرتا ہے جو دونوں اطراف کے درمیان میں ہے نہ ادھر نہ ادھر..... نہ افراط کی طرف نہ تفریط کی طرف ..... بلکہ وہ ایسا آئین ہے جو انہیں روح وجسم دونوں کے تقاضوں کی تکمیل کی دعوت دیتا ہے اور روحانی عظمتوں وجسمانی کمالات دونوں کے حصول کی ترغیب دلاتا ہے کیونکہ انسان نہ تو صرف جسم ہے نہ صرف روح بلکہ ان دونوں کا مجموعہ ہے اور اسے اپنی سعادتمند زندگی کے لیے ان دونوں جہتوں مادی ومعنوی امور ..... میں کمال وخوش بختی کی ضرورت ہے اور وہ اسی صورت میں کامیاب و باکمال کہلا سکتا ہے جب ان دونوں میں درجہ کمال تک پہنچے' اسی لیے اسے ''درمیانی امت'' کہا گیا ہے کہ جسے افراط وتفریط کی دوسمتوں کے لیے مقیاس و پیمانہ کی حیثیت حاصل ہے اور اسی لحاظ سے وہ تمام لوگوں پر گواہ وناظرہ ''شہید وشاھد'' ہے' اور حضرت پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ اس امت کے سب سے باکمال فرد اور کامل واکمل نمونہ ہیں اس امت پر گواہ وناظر اور امت کے ہر فرد کے لیے میزان عمل ہیں جبکہ خود امت دوسروں کے لیے میزان عمل اوران کے افراط وتفریط کی تشخیص کے لیے مقیاس و پیمانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ ہے وہ بیان جو بعض مفسرین نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے' اور یہ بیان یوں تو بجا اور درست اور قابل توجہ وغور طلب بھی ہے لیکن زیر بحث آیت کے الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ ''امت اسلامیہ'' کا درمیانی امت ہونا اس بات کو تو ثابت کرتا ہے کہ یہ لوگوں کے افراط وتفریط کی دوطرفوں کے مابین میزان و پیمانہ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس حوالہ سے اس کا گواہ وناظر شاہد وشہید ..... ہونا ثابت نہیں ہوتا' یعنی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لوگوں کے افراط وتفریط کو دیکھتی ہے یا ان پر گواہ ہے کیونکہ ان دونوں باتوں میں کوئی تناسب ہی نہیں پایا جاتا ..... یعنی مذکورہ معنے کی رو سے ''درمیانی نقطہ'' میں ہونے اور گواہ ہونے کا ایک دوسرے سے ہرگز کوئی ربط نہیں ..... اور پھر حضرت پیغمبر اسلام محمدؐ کا اپنی امت کے لیے گواہ ہونا

اس امر سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا کہ امت اسلامیہ کو دیگر امتوں میں ''درمیانی امت'' قرار دیا گیا ہے جبکہ آیت میں یوں کہا گیا ہے کہ ''ہم نے تمہیں درمیانی امت قرار دیا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہوں'' یعنی ان دونوں باتوں میں ایسا کوئی تعلق و ربط نہیں جیسا کہ مقصد کا صاحب مقصد سے تعلق ہوتا ہے' اور اس کے علاوہ یہ کہ اس آیت میں جس ''شہادت'' وگواہی کا ذکر کیا گیا ہے وہ قرآنی حقائق میں سے ایک ایسی پاکیزہ حقیقت ہے جس کا تذکرہ کئی بار کلام الٰہی میں ہوا ہے اور ان موارد میں اس کا جو معنی مراد لیا گیا ہے وہ اس آیت میں مذکور لفظ شہادت کے معنے سے مختلف ہے' نمونہ کے طور پر یہ آیات ملاحظہ ہوں:

سورہ ءنساء، آیت ۴۱:

★ ''فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا'' ...،

(پھر وہ وقت کیسا ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان سب پر گواہ بنا کر لائیں گے)۔

سورہ ءنحل آیت ۸۴:

★ ''وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ'' ...،

(اور اس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے پھر کافروں کو نہ تو کوئی اجازت دی جائے گی اور نہ ہی ان سے معذرت طلب کی جائے گی)۔

سورہ ءزمر آیت ۶۹:

★ ''وُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ'' ...،

(اور کتاب (نامہء اعمال) رکھی جائے گی اور نبیوں اور گواہوں کو لایا جائے گا۔)

ان آیات میں ''شہادت'' کو بطور مطلق ذکر کیا گیا ہے یعنی وہ کسی مخصوص اور معین موضوع کے ساتھ مقید کر کے ذکر نہیں کی گئی تاہم اس کے مطلق ہونے کے باوجود بظاہر اس سے مراد امتوں کے اعمال اور پیغمبروں کی تبلیغ کی گواہی ہے جیسا کہ درج ذیل آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

سورہ ءاعراف، آیت ۶:

★ ''فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ'' ...،

(اور ہم ان سے بھی سوال کریں گے جن کی طرف پیغمبر کو بھیجا گیا اور پیغمبروں سے بھی سوال کریں گے)

اگرچہ اس آیت میں مذکور گواہی کا تعلق آخرت میں قیامت کے دن سے ہے لیکن اس کا حامل ہونا دنیا ہی میں ہے جیسا کہ خداوند عالم نے عیسیٰ بن مریمؑ کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ وہ آخرت میں یوں کہیں گے:

سورہ ءمائدہ، آیت ۱۱۷:

★ ''كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ

شَہِیۡدٌ"...،

(میں ان پر گواہ تھا جب تک ان میں موجود تھا' پس جب تو نے مجھے اٹھالیا .....میرا وقت پورا کر دیا ... تو پھر تو خود ان پر گواہ .....ونگران.....تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے)۔

ایک اور آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہوا:

سورہ ءنساء، آیت ۱۵۹:

★ "وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا"...،

(اور وہ (عیسیٰ) قیامت کے دن ان (اہل کتاب) پر گواہ ہوگا)۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہمارے یہ ظاہری حواس اور ان سے تعلق رکھنے والی دیگر قوتیں صرف "اعمال و افعال" کی صورتوں کا ادراک کرتی ہیں اور وہ بھی صرف اس چیز کی صورت کا جو ان کے سامنے حاضر و موجود ہو لیکن وہ چیزیں جو پہلے موجود تھیں مگر اب معدوم ہو چکی ہیں یا ابھی وجود میں آئی ہی نہیں بلکہ آئندہ وجود میں آئیں گی یا وجود میں تو آ چکی ہیں مگر ہمارے سامنے موجود نہیں تو ہمارے ظاہری حواس کی قوتیں ان کے ادراک سے قاصر ہیں' لہٰذا اعمال کی حقیقتیں اور نفس کے باطنی حقائق مثلاً کفر و ایمان اور اخروی کامیابی و ناکامی (سعادت و شقاوت) اور ہر وہ چیز جو ہمارے ظاہری حواس کی دسترس سے باہر ہے اور اس کا تعلق صرف دل اور باطن کی دنیا سے ہے..... البتہ قیامت کے دن کا حساب و کتاب کہ جب سب پردے ہٹا دیئے جائیں گے اور حقائق آشکار ہوں گے دل کی دنیا ہی سے مربوط ہے جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا: "وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ" (سورہ ءبقرہ، آیت ۲۲۵) یعنی خداوند عالم تمہارا مؤاخذہ انہی چیزوں کے بارے میں کرے گا جنہیں تمہارے دلوں نے کسب کیا ہے.....تو ایسی چیزیں ہم سے پوشیدہ ہیں اور ہمیں ان تک دسترس حاصل نہیں بلکہ ہم تو ان میں سے ان چیزوں کی تشخیص بھی نہیں کر سکتے جو اس وقت موجود ہیں اور جو ہمارے سامنے موجود ہی نہیں ہیں ان تک رسائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر یہ کہ خداوند عالم اپنی عنایت خاصہ کے ساتھ کسی کو ان سے آگاہ فرمائے اور اسے حقائق سے روشناس ہونے کی نعمت سے نوازے جیسا کہ درج ذیل آیت سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے:

سورہ ءزخرف، آیت ۸۶:

★ "وَلَا يَمۡلِكُ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ"...،

(اور وہ خدا کے علاوہ جسے پکارتے ہیں وہ شفاعت کے مالک نہیں سوائے ان کے کہ جو علم و آگاہی رکھتے ہوئے حق کے ساتھ گواہی دیں)۔

بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان افراد میں شامل ہیں جنہیں اس آیت میں "اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ" کہہ کر مستثنیٰ کیا گیا ہے کیونکہ اس سے پہلے دو آیتوں میں خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں واضح طور

پر بیان فرمادیا کہ وہ ''شہداء'' یعنی قیامت کے دن گواہوں میں سے ہوں گے' بنابرایں وہ حق کے ساتھ گواہی دینے والے (شہید بالحق) اور حقیقت سے آگاہ (عالم بالحقیقۃ) ہیں۔

خلاصہء کلام یہ کہ اس مقام پر شہادت یعنی گواہی کا یہ معنی کہ امت اسلامیہ ایک ایسے جامع دین کی حامل ہے جس میں جسمانی وروحانی دونوں کمالات یکجا ہیں' نہ صرف یہ کہ اس کے اصل لغوی معنے سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ قرآنی آیات مبارکہ کے ظواہر سے بھی ہم آہنگ وہم رنگ نہیں' جبکہ اس کا معنی دنیا میں لوگوں کے اعمال کی حقیقتوں یعنی سعادت وشقاوت' قبولیت وعدم قبولیت اور اطاعت وسرکشی ایسی باطنی کیفیتوں سے آگاہی اور قیامت کے دن ان کی گواہی دینا ہے وہ دن کہ جس میں خداوند عالم ہر چیز سے گواہی طلب کرے گا یہاں تک کہ انسان کے اعضاء سے بھی گواہی طلب کی جائے گی اس دن حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارگاہ الٰہی میں شکایت کریں گے کہ: خدایا میری قوم نے اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا(یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القران مھجوراً)۔

ایک اہم نکتہ!

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ''شہادت'' وگواہی کا مذکورہ مقام ومرتبہ امت کے تمام افراد کو حاصل نہیں ...۔ کیونکہ یہ اس قدر عظیم رتبہ ہے کہ اس میں لوگوں کے اعمال کی حقیقتوں کی گواہی دینے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے..... بلکہ امت کے پاکیزہ ترین اولیائے الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے یہاں تک کہ سعادتمند متوسط طبقہ یعنی عادل مومنین بھی اس مقام پر فائز نہیں لہٰذا امت کے معصیت شعار ظالم وستمگر اور فرعون صفت افراد کے لیے تو اس مقام کے حامل ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا' اس سلسلے میں مزید وضاحت درج ذیل آیت کی تفسیر میں پیش کریں گے:

سورہء نساء، آیت ۶۹:

★ ''وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَ الشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا''۔

(جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت کرے ایسے لوگ ان ہستیوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا نے نعمتیں نازل فرمائی ہیں یعنی انبیاء صدیقین' شہداء اور صالحین' اور یہ نہایت اچھے رفیق وساتھی ہیں)

تو معلوم ہوا کہ ان حضرات (اعمال کی حقیقتوں کے گواہوں) کی کم سے کم صفت یہ ہے کہ وہ خداوند عالم کی ولایت و سرپرستی کے سایے میں اور اس کی نعمتوں سے بہرہ مند اور صراط مستقیم والے افراد ہیں' اس سلسلے میں آیت ''اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ''... سورۂ فاتحہ، آیت ۶...... کی تفسیر میں اجمالی طور پر مطالب ذکر کئے جاچکے ہیں۔

بنابرایں یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ امت اسلامیہ کا دیگر امتوں پر گواہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس اُمت اسلامیہ کے بعض افراد اس خصوصیت کے حامل ہیں اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے قرآن مجید میں بنی اسرائیل کو تمام

عالمین...... پوری کائنات...... پر فضیلت و برتری دینے کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ان کے ہر فرد کو عالمین پر برتری عطا نہیں کی گئی بلکہ بعض افراد کو اس اعزاز سے نوازا گیا ہے اور ان ''بعض'' کی وجہ سے فضیلت و برتری عطا کرنے کی نسبت سب کے لیے ذکر کی گئی ہے کیونکہ وہ ''بعض'' انہی سب میں شامل بلکہ انہی میں سے تھے اس لیے سب کے لیے برتری کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، یہی حال امت اسلامیہ کا ہے کہ اس کے تمام افراد کو اعمال کی حقیقتوں کی گواہی کی ذمہ داری نہیں سونپی گئی بلکہ ان میں سے بعض افراد اس عظیم و مقدس مقام کے حامل ہیں اور انہی کی وجہ سے پوری امت کی طرف اس اعزاز اور مقام و مرتبت کی نسبت دی گئی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان افراد پر گواہ بنایا گیا ہے۔

ایک سوال:

اس مقام پر اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ سورہ حدید کی درج ذیل آیت میں تمام مومنین مراد ہیں کہ وہ سب شہادت و گواہی دینے والے ہیں لہٰذا یہ مقام (گواہ ہونا) بعض افراد سے کیونکر مخصوص قرار دیا جا سکتا ہے ؟ ملاحظہ ہو:

سورہ حدید، آیت ۱۹:

★ ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ''...،

(جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی سچے ہیں اور اپنے پروردگار کے حضور گواہی دینے والے ہیں)۔

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں خدا نے ارشاد فرمایا: ''عِنْدَ رَبِّهِمْ'' (اپنے پروردگار کے حضور) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ دنیا میں گواہ نہیں ہیں بلکہ خداوند عالم قیامت کے دن انہیں شہداء گواہوں...... کے ساتھ ملحق کرے گا اسی لیے فرمایا: عِنْدَ رَبِّهِمْ یعنی اپنے رب کے پاس' جیسا کہ ایک اور آیت میں ارشاد ہوا:

سورہ طور، آیت ۲۱:

★ ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ''...،

(جو لوگ ایمان لائے اور ان کی ذریت و اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی تو ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے)۔

یہ تو ہے ''عِنْدَ رَبِّهِمْ'' کے الفاظ سے سوال...... یا اعتراض کا جواب' اس کے علاوہ یہ کہ جو آیت پیش کی گئی ہے (سورہ حدید، ۱۹) وہ مطلق ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام امتوں میں سے سب مومنین اللہ کے پاس گواہ ہوں

گے یعنی ہر امت کے تمام مومنین کو یہ مقام و مرتبت حاصل ہے نہ کہ صرف امت اسلامیہ کے افراد کو لہٰذا سوال یا اعتراض کرنے والا شخص اس آیت سے استدلال ہی نہیں کر سکتا' اور یہ آیت اس کے دعوے کی صحت کا ثبوت نہیں بن سکتی۔

ایک اعتراض:

ایک اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ زیر بحث آیت میں امت اسلامیہ کو درمیانی امت قرار دیا گیا ہے (جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا) اور اسے (درمیانی امت قرار دینے کو) شہادت و گواہی دینے سے مربوط کر کے ذکر کیا گیا ہے (لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) تو اگر "شہادت" کا معنی اعمال کی گواہی دینا ہو تو اس کا درمیانی امت قرار دینے سے کیا ربط و تعلق ہے؟ یعنی درمیانی امت قرار دیا جانا اور بات ہے اور ان کا لوگوں پر اور رسولؐ کا ان پر گواہ ہونا اور بات ہے، ان دونوں امور کا آپس میں کوئی ربط ہی نہیں بنتا' لہٰذا یہ اعتراض اپنے مقام پر درست ہے جیسا کہ سابقہ معنے کی صورت میں بھی یہ اعتراض صحیح تھا!

جواب:

مذکورہ معنے کی روشنی میں شہادت و گواہی دینا درمیانی امت ہونے کے آثار و نتائج میں سے ہے لہٰذا ان دونوں کا آپس میں گہرا ربط ہے اور درمیانی امت ہونے کے بعد گواہ ہونے کے لازمی نتیجہ کا مرحلہ آتا ہے' جیسا کہ درج ذیل آیت میں بھی مذکور ہے:

سورہ حج، آیت ۷۸:

★ "وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ "....،

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع کرو' سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت بجا لاؤ' نیک کام انجام دو تا کہ تم کامیاب ہو سکو' اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا حق ادا کرو' اس نے تمہیں چن لیا ہے اور اس دین میں تم پر کوئی سختی نہیں برتی ہے یہ تمہارے باپ ابراہیم کا آئین ہے اسی نے اس سے پہلے اور اس عہد میں تمہیں مسلمان کے نام سے موسوم کیا ہے تا کہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو' پس نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو اور خدا کے ساتھ وابستہ رہو کہ وہی تمہارا مولا و آقا ہے وہ کتنا اچھا آقا و مولا اور کتنا اچھا مددگار ہے)۔

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی امت پر گواہ ہونا اور امت کا لوگوں پر گواہ ہونا امت اسلامیہ...... اہل ایمان...... کو منتخب و برگزیدہ قرار دینے اور ان سے دین میں ہر طرح کی سختی کی نفی کرنے کے اثر و نتیجہ کے طور پر ذکر کیا ہے یعنی انہیں اس لیے گواہ بنایا گیا چونکہ انہیں منتخب و برگزیدہ قرار دیا گیا اور انہیں دین میں کسی طرح کی سختی میں مبتلا نہ کرنے کی عنایت سے نوازا گیا' پھر اس کے بعد خداوند عالم نے دین ...... اسلام ...... کو "آئین ابراہیم" کے نام سے متعارف کرایا اور فرمایا کہ یہ دین دراصل وہی آئین ہے جو تمہارے پدر بزرگوار ابراہیم کا ہے وہ کہ جس نے تمہیں اس سے پہلے مسلمان کے نام سے موسوم کیا یعنی اس وقت جب اس نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ " وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ "... میری ذریت و نسل میں سے امت مسلمہ قرار دے...... چنانچہ خدا نے ابراہیمؑ کی دعا مستجاب فرمائی اور تمہیں "مسلمان" بنا دیا یعنی تم اس کے ہر حکم اور فیصلہ کو کسی چوں و چرا اور سرکشی و عصیان کے بغیر تسلیم کرتے ہو' اسی وجہ سے خداوند عالم نے دینی احکام میں تمہیں کسی تنگی و سختی میں مبتلا نہیں کیا بلکہ ہر طرح کا عسر و حرج دور کر دیا لہٰذا تم پر دین کا کوئی حکم گراں نہیں گزرتا اور نہ ہی تم کسی حکم یا خدائی فیصلہ کو اپنے لیے ناگوار سمجھتے ہو' پس تم ہی خدا کے منتخب و برگزیدہ اور صراط مستقیم کی ہدایت سے بہرہ ور اپنے پروردگار کے ہر فیصلہ و حکم پر سر تسلیم خم کرنے والے ہو' اور ہم نے تمہیں یہ سب خصوصیات اس لیے عطا کیں تاکہ رسولؐ تم پر گواہ اور تم لوگوں پر گواہ بنو یعنی تم پیغمبر اور لوگوں کے درمیان ...... وسط ...... میں قرار پاؤ، ایک طرف تمہارا رابطہ پیغمبرؐ سے ہو اور دوسری طرف لوگوں کے ساتھ مربوط و مرتبط رہو' اسی سے ابراہیمؑ کی دعا تمہارے اور پیغمبرؐ کے بارے میں استجابت کی عملی صورت ظاہر کر سکے گی کیونکہ ابراہیم نے اس طرح دعا کی تھی:

سورہ بقرہ آیت ۱۲۹:

"رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ"....،

(پروردگارا! ان میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیات کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرے ......)

لہٰذا تم ہی وہ امت مسلمہ ہو کہ پیغمبر اسلامؐ نے تمہارے دلوں میں کتاب و حکمت کا علم ودیعت فرمایا ہے اور خود سازی کی پاکیزہ روش کے ذریعے تمہارے نفوس کو ہر طرح کی گندگی سے پاک کر دیا ہے' تزکیۂ نفس سے مراد دلوں کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کر کے انہیں خدا کی خالص عبادت کی راہ پر لگانا ہے اور یہی اسلام کا اصل معنی و مفہوم اور مقصود و مطلوب ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی اس کی وضاحت کر چکے ہیں' بنابرایں تم عبودیت و بندگی میں سچے اور پکے مسلمان اور اپنے پروردگار کے ہر حکم پر دل و جان سے سر تسلیم خم کرنے والے ہو گے اور رسول خداؐ اس کام میں تمہارے پیشوا اور رہنما ہیں وہ سب پر تقدم رکھتے ہیں اور تم ان سے ملحق ہونے کی وجہ سے ان کے اور لوگوں کے درمیان...... حد وسط ...... میں قرار دیئے گئے ہو اور تمام لوگ تمہارے دوسری جانب ہیں۔

یہ ہے اس آیت شریفہ (سورہ حج، ۷۸) کا معنی و مقصود اور آیت کے پہلے الفاظ اور آخری الفاظ سے بھی اسی معنے کی تائید ملتی ہے، بہر حال اس کی مزید وضاحت اس کے مربوط مقام پر کی جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

اب تک ذکر کئے گئے مطالب سے درج ذیل تین اہم نکات واضح ہوتے ہیں:

پہلا نکتہ:

اس امت کا "درمیانی امت" ہونا بیک وقت دو باتوں کا سبب ہے:

(۱) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان پر گواہ ہونا۔

(۲) ان کا دوسرے لوگوں پر گواہ ہونا۔

چنانچہ آیت کے الفاظ خود اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں ("لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا")۔ "تمہیں اس لیے درمیانی امت بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں"۔ یعنی یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ وہ "درمیانی امت" ہیں۔

دوسرا نکتہ:

امت اسلامیہ کا "درمیانی امت" ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ رسول اور دیگر لوگوں کے درمیان ..... حد وسط ..... میں قرار پاتے ہیں یعنی ایک طرف رسول سے مرتبط ہیں اور دوسری طرف لوگوں سے ان کا ناطہ ہے، اس طرح وہ رسول اور لوگوں کے "درمیان" قرار پاتے ہیں، نہ یہ کہ ان کا درمیان میں قرار پانا افراط و تفریط کے درمیان میں ہونے یا روحانی کمالات اور جسمانی کمالات کے درمیان قرار پانے سے عبارت ہے۔

تیسرا نکتہ:

زیر بحث آیت مبارکہ معنی و مفہوم کے حوالہ سے حضرت ابراہیمؑ کی دعا پر مشتمل آیات اور اس حقیقت سے مربوط ہے کہ گواہ ہونا امت اسلامیہ کی خصوصیات میں شامل ہے۔

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآنی آیات کی روشنی میں اعمال پر گواہ ہونا صرف انسانوں ہی کی مخصوص صفت نہیں بلکہ ہر اس چیز کو یہ مقام و خصوصیت حاصل ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی حوالہ سے "عمل" سے ہے مثلاً فرشتے، زمان و مکان، دین، کتاب خدا، اعضاء بدن، حواس اور دل وغیرہ تو یہ سب اعمال پر گواہ ہوں گے، اور آیات شریفہ سے یہ مطلب واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز بھی اس دنیا میں موجود ہے وہ آخرت میں بھی موجود ہوگی اور اسے ایک طرح کا شعور بھی حاصل ہے جس کے سبب وہ اعمال کی صحیح پہچان کر کے ان کی گواہی دے سکتی ہے گویا ہر عمل اس کی لوح شعور پر ثبت ہو سکتا ہے البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز میں زندگی اور شعور ایک جیسا ہو یعنی سب کے سب حیوان و انسان میں پائی جانے والی حیات کے مانند

حیات رکھتے ہوں اور ان میں انسان وحیوان کی حیات وزندگی کے تمام خواص وآ ثار پائے جاتے ہوں کیونکہ "زندگی" کی..... تمام خصوصیات وآ ثار کے لحاظ سے......سب میں ایک جیسا ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

بہرحال یہ ہے اس موضوع کی بابت اجمالی بیان' انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تفصیل اور ہر پہلو کی وضاحت مربوطہ مقامات میں پیش کی جائے گی۔

تبدیلی قبلہ کا اصل مقصد

○ "وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ"

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ قبلہ کی تبدیلی سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم جان لیں کہ رسولؐ کی پیروی کرنے والے کون لوگ ہیں اور اپنے الٹے پاؤں پلٹ جانے والے کون ہیں'

اب سوال یہ ہے کہ یہاں ارشاد ہوا: "لِنَعْلَمَ" (تا کہ ہم جان لیں) تو اس سے مراد کیا ہے؟!

اس کی بابت دو امکان پائے جاتے ہیں:

(۱) اس سے مراد یہ ہے "تا کہ ہمارے نبی ورسول جان لیں" (یعنی انبیاء اور پیغمبروں کے جاننے کی نسبت خدا نے اپنی طرف دی) اور یہ اس طرح سے ہے جیسے عام طور پر بڑے لوگ جب کوئی بات کرتے ہیں تو اپنی اور اپنے مربوطہ افراد کی طرف سے بات کرتے ہیں مثلاً کسی قوم کا سربراہ کہتا ہے کہ "ہم نے فلاں شخص کو قتل کیا ہے یا اسے قید کر لیا ہے' جبکہ یہ کام اس کے کارندے اور تحت فرمان افراد نے انجام دیا ہوتا ہے۔

(۲) اس علم سے مراد خداوند عالم کا "علم عینی فعلی" ہے کہ جو خلقت وایجاد کے وقت موجود اور اس کے ساتھ ساتھ ہے نہ کہ ایجاد وخلقت سے پہلے والا علم جو کہ اشیاء کو وجود عطا کرنے سے پہلے ہی موجود تھا۔

اور آیت کے جملہ "مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ" میں الٹے پاؤں پلٹ جانے سے مراد منہ پھیر لینا ہے' کیونکہ جب کوئی شخص سیدھا کھڑا ہوتا ہے تو پاؤں کے تلووں کے سہارے پر کھڑا ہوتا ہے اور جب دوسری طرف رخ پھیرتا ہے تو پاؤں کے تلووں کو پھیر دیتا ہے اس لیے ارشاد ہوا "يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ" اور اسے منہ پھیر لینے کے لیے کنایہ کے طور ذکر کیا گیا ہے' اس طرح کی تعبیر ایک اور مقام پر بھی موجود ہے ملاحظہ ہو:

سورہ انفال، آیت ۱۶:

"وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ"...، (اور جو شخص اس دن پیٹھ پھیرلے)

اس آیت میں "پیٹھ پھیر لینے" کا لفظ "بھاگ جانے" کے معنے میں بطور کنایہ استعمال کیا گیا ہے'

بہرحال زیر بحث آیت میں ان ممکنہ خدشات کے جواب کے طور پر مطالب ذکر کئے گئے ہیں جو اہل ایمان کے دلوں میں پیدا ہو سکتے تھے کہ خدا نے قبلہ کی تبدیلی کا حکم کیوں دیا اور جو نمازیں قبلہ اول کی طرف منہ کر کے پڑھی گئی ہیں ان

کی حیثیت کیا ہوگی وغیرہ' لہٰذا خداوند عالم نے ان ممکنہ خدشات کے پیش نظر ارشاد فرمایا کہ "ہم نے قبلہء اول کو صرف اس لیے "قبلہ" قرار دیا تھا کہ رسولؐ کے پیروکاروں اور نافرمانوں میں تمیز کر سکیں......"

اس مقام پر یہ اہم نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ "قبلہء اول" کہ جس کی طرف منہ کر کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز ادا کیا کرتے تھے وہ "بیت المقدس" تھا کعبہ نہیں تھا، کیونکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ "بیت المقدس" کو دو مرتبہ "قبلہ" قرار دیا گیا ہو اور کعبہ کو دو مرتبہ "قبلہ" قرار دیا گیا ہو' لیکن اگر زیر بحث آیت میں "قبلہ" سے مراد کعبہ ہوتا تو اس صورت میں کعبہ کے دو مرتبہ قبلہ قرار دیئے جانے کی بات درست ثابت ہوتی' جبکہ ایسا نہیں ہے۔

بہرحال آیت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کے حکم سے دو باتیں مؤمنین کے دلوں میں سوال کے طور پر پیدا ہو سکتی تھیں:

۱۔ اگر خداوند عالم کے نزدیک پہلے ہی سے یہ طے تھا کہ کعبہ کو ہمیشہ کے لیے "قبلہ" قرار دیا جائے گا تو شروع ہی سے ایسا کیوں نہ کیا گیا اور "بیت المقدس" کو قبلہ قرار دے کر اور پھر اسے تبدیل کر کے کعبہ کو قبلہ قرار دینے کا حکم صادر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس خدشہ کو دور کرنے کے لیے خداوند عالم نے وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ خدائی احکامات دراصل لوگوں کی فکری و عملی تربیت اور انہیں سعادت و کمال کی منزل تک پہنچانے کی پاکیزہ و عظیم مصلحت کی بنیاد پر صادر ہوتے ہیں اور ان میں اس مقصد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ان احکامات کے سبب مومن وغیر مومن' فرمانبردار و نافرمان اور اطاعت گزار و سرکش افراد کے درمیان تمیز ہو سکے' اسی لیے خداوند عالم نے پہلے "بیت المقدس" کو لوگوں کے لیے قبلہ قرار دیا اور پھر اسے تبدیل کر دیا' بنابرایں زیر بحث آیت میں قبلہ کی بابت حکم کی وجہ یوں ذکر کی گئی: "لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ"... تا کہ ہم جان لیں کہ رسول کی پیروی کون کرتا ہے......یعنی اے رسول ہم نے یہ حکم اس لیے دیا تھا تا کہ ہم تیرے پیروکاروں کی تمیز کر سکیں'

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ خداوند عالم نے آیت مبارکہ میں "من یتبعك" (کون تیری پیروی کرتا ہے) کے بجائے مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ کے الفاظ کیوں استعمال کئے' یعنی "مخاطب" کی بجائے "غائب" کا انداز سخن کیوں اپنایا؟

بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خدا اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا تھا کہ "رسول ہونے" کی صفت لوگوں میں سے مومن وغیر مومن کی تمیز کرنے کے معیاروں میں سے ایک ہے یعنی کون ہے جو "رسول ہونے" کے حوالہ سے تیری پیروی کرتا ہے اور کون ہے جو تیرے رسول ہونے کو تسلیم نہ کر کے نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے' البتہ یہ بات اسی صورت میں درست قرار دی جا سکتی ہے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ "بیت المقدس" کو قبلہ قرار دینے کا حکم مسلمانوں کے لیے تھا لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ حکم مسلمانوں کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی تھا تو آیت میں "الرسول" سے مراد صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ ہوں گے بلکہ ہر رسول مراد ہوگا۔ تاہم یہ بات آیت کے ظاہری الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتی اور آیت کے سیاق و سباق سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

۲۔ مسلمانوں نے اب تک جو نمازیں "بیت المقدس" کی طرف رخ کر کے ادا کی ہیں ان کے بارے میں صورت حال کیا ہوگی کیونکہ وہ تو قبلہ رخ ہو کر ادا نہیں کی گئیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قبلہ جب تک قبلہ ہونے کی حیثیت میں ہو اس پر تمام احکام و آثار مرتب ہوتے ہیں اور جب اسے قبلہ ہونے کی حیثیت سے محروم کر دیا جائے (اس کے قبلہ قرار دیئے جانے کے حکم کو منسوخ کر دیا جائے) تو اس وقت سے اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم بھی ختم ہو جائے گا نہ یہ کہ اسے قبلہ قرار دینے کے حکم کی منسوخی سے پہلے ادا کی جانے والی نمازیں وعبادات رائیگاں جائیں گی اور گویا اس کی قبلہ ہونے کی حیثیت کی سرے ہی سے نفی ہو جائے گی' اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا اہل ایمان کی ان نمازوں اور عبادات کو ضائع کر دے جن کی ادائیگی کے لیے اس نے انہیں "بیت المقدس" کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تھا کیونکہ وہ تو اپنے مومن بندوں پر مہربان ہے، چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا نے ارشاد فرمایا: "وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ" کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خدا تمہارے ایمان کو ضائع کر دے کیونکہ خدا تو لوگوں کے ساتھ رأفت و رحمت سے پیش آتا ہے (ان پر مہربان اور رحیم ہے) یاد رہے کہ "رأفت" اور "رحمت" اگرچہ دونوں بنیادی طور پر ایک ہی معنی رکھتے ہیں لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ "رأفت" اس خاص مہربانی کو کہتے ہیں جو کسی بے چارے اور کڑی آزمائش کا شکار شخص کے ساتھ کی جائے جبکہ لفظ "رحمت" میں کسی مصیبت میں مبتلا ہونے اور بے چارہ ہونے کی صورت سے قطع نظر ہر حال میں کی جانے والی مہربانی وعنایت کا معنی پایا جاتا ہے۔

قبلہ کی تبدیلی اور رضائے رسولؐ

○ "قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا" . . .

(ہم آسمان میں تیرے چہرے کا پھیرنا دیکھتے ہیں پس ہم ضرور تجھے اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے تو خوش ہو)۔

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبلہ کی تبدیلی کے متوقع حکم پر مشتمل آیت (زیر بحث آیت) کے نازل ہونے سے پہلے آسمان کی طرف منہ کر کے خدا کی طرف سے نئے حکم کے منتظر یا قبلہ کی تبدیلی کے حکم پر مشتمل وحی کے نازل ہونے کا انتظار کرتے تھے کیونکہ آنحضرتؐ یہ چاہتے تھے کہ خداوند عالم انہیں ان کے ساتھ مختص و منسوب قبلہ کے بارے میں حکم صادر فرمانے کا اعزاز عطا فرمائے' اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ "بیت المقدس" کے قبلہ ہونے پر خوش نہ تھے، معاذ اللہ! یہ بات تو آنحضرتؐ کے عظیم مقام و مرتبت کے منافی ہے کہ وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے قبلہ کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کریں' البتہ اپنے اعزاز کی خواہش رکھنا اور بات ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا" . . . ہم تیرا رخ اس قبلہ کی طرف موڑ دیں گے کہ جس سے تو خوش ہوگا......

یہ ایک ناقابل انکار امر ہے کہ کسی چیز پر خوش ہونے کو کسی دوسری چیز سے ناخوش ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ حقیقت

امر یہ ہے۔۔ جیسا کہ زیر بحث آیت کے شان نزول کے بارے میں روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے۔۔ کہ یہودی مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے تھے کہ وہ (مسلمان) ان کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں اور اس وجہ سے ان پر برتری رکھتے ہیں اور یہ بات آنحضرتؐ کو ناگوار خاطر گزری اور آپؐ یہودیوں کی بار بار طعنہ زنی سے ملول ہو جاتے تھے، چنانچہ آپؐ رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکل کر آسمان کی طرف منہ کر کے خدا کی طرف سے ایسے حکم کے نازل ہونے کے منتظر رہتے تھے جس سے ان کا حزن و ملال ختم ہو اور ان کے سکون قلب کا سامان فراہم ہو جائے۔ بالآخر یہ آیت (زیر بحث) نازل ہوئی (قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ...) تاہم اگر سابقہ قبلہ ہی پر باقی رہنے کا حکم نازل ہوتا تب بھی آنحضرتؐ کے لیے یہودیوں پر حجت باقی رہتی اور اس سے نہ تو مسلمانوں اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت میں کوئی کمی آتی کیونکہ بندے کے لیے اپنے آقا کے فرمان پر عمل کرنا ہی سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے اور اقتضائے بندگی ہی یہ ہے کہ مولا کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر کے اس پر عمل کیا جائے۔

بہر حال نئے قبلہ کے بارے میں آیت نازل ہوئی اور یہودیوں کے طعن و تشنیع اور اظہار برتری کے موہوم عمل کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور اس سے بالاتر یہ کہ خدا کی طرف سے شرعی فریضہ کا تعین بھی ہو گیا گویا تسکین قلب کا سامان بھی ہو گیا اور دشمنوں کے مقابلہ میں حجت و دلیل بھی قائم ہو گئی۔

مسجد الحرام کی طرف رخ کرنے کا فرمان

○ "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ"

(پس تو اپنا منہ پھیر لے مسجد الحرام کی طرف، اور تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے رخ اس کی طرف کر لو)

"شطر" کا لغوی معنی "بعض" ہے، لہٰذا آیت کا معنی یوں ہوگا: "اپنا رخ مسجد الحرام کے بعض "حصہ" کی طرف کر لو "یعنی کعبہ کی طرف! اب سوال یہ ہے کہ "شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" کے بجائے "شطر الکعبہ" یا "شطر البیت الحرام" کیوں نہیں کہا گیا؟ تو بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں سابقہ قبلہ کے بارے میں صادر ہونے والے حکم کے انداز و الفاظ کو ملحوظ رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں یوں ارشاد ہوا تھا: "شطر المسجد الاقصیٰ"، جو کہ وہاں کی مشہور و معروف پہاڑی چوٹی ہے، اب اس کی جگہ یوں کہا گیا: شطر المسجد الحرام" جو کہ کعبہ ہے اور جہاں تک اضافت و توصیف کا تعلق ہے کہ "شطر" کی اضافت مسجد کی طرف اور مسجد کی توصیف "حرام" کے ساتھ کی گئی ہے تو اس سے حکم کی خصوصیات کی نشاندہی ہوتی ہے جبکہ اس کی جگہ "کعبہ" یا "بیت الحرام" کہنے میں وہ خصوصیات مفقود ہو جاتی ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں قبلہ کی تبدیلی کے حکم میں سب سے پہلے حضرت پیغمبر اسلامؐ کو مخاطب قرار دیا گیا چنانچہ ارشاد ہوا: "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" (تو اپنا منہ پھیر لے مسجد الحرام کی طرف) اس کے بعد آنحضرتؐ اور دیگر تمام مومنین کے لیے حکم عام صادر ہوا: "وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ" (تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے منہ

اس کی طرف پھیر لو) اس سے اس امر کی تائید ملتی ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم اس وقت صادر ہوا جب آنحضرتؐ مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے لہٰذا سب سے پہلے یہ حکم خود آنحضرتؐ کی اپنی نماز میں ان کے ساتھ مخصوص ہوا اور پھر دوسرا حکم آنحضرتؐ اور دیگر نمازیوں اور ہر زمانہ و ہر جگہ میں رہنے والوں کے لیے صادر ہوا۔

اہل کتاب کی حق آشنائی کا حوالہ

○ "وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ لَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ"

(جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ حکم حق ہے جو کہ ان کے پروردگار کی طرف سے آیا ہے)

اہل کتاب کی حق آشنائی کا حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ ان کی کتاب میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی سچائی کی تصدیق ملتی ہے' یا خاص طور پر اس امر کی تصدیق ملتی ہے کہ آنحضرتؐ کا قبلہ "شطر المسجد الحرام" (کعبہ) ہوگا'

بہر حال "اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ" (جنہیں کتاب عطا کی گئی) کے جملہ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان کی کتاب میں شریعت اسلامیہ کی حقیقت وحقانیت کا بیان موجود ہے خواہ وہ بیان صراحت کے ساتھ ہو یا ضمنی صورت میں ہو۔ اس کے بعد ارشاد ہوا: "وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعۡمَلُوۡنَ" یعنی اللہ غافل نہیں اس سے کہ جو وہ عمل کرتے ہیں یعنی حق کو چھپاتے ہیں اور جس بات کا علم رکھتے ہیں اس پر پردہ ڈالتے ہیں۔

اہل کتاب کی ڈھٹائی کا بیان

○ "وَ لَئِنۡ اَتَیۡتَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَۃٍ" ...

اس آیت میں قبلہ کی بابت یہودیوں کے عناد و ہٹ دھرمی پر ان کی مذمت کی گئی ہے اور اس امر کو بیان کیا گیا ہے کہ ان کا ایسا کرنا..... قبلہ کی تبدیلی کے حکم کو قبول نہ کرنا...... اس وجہ سے نہیں کہ وہ حق وحقیقت سے آگاہی نہیں رکھتے اور یہ حکم ان پر واضح نہیں ہوا بلکہ وہ اس موضوع کے بارے میں اچھی طرح علم رکھتے ہیں اور انہیں اس سلسلہ میں ذرہ بھر شک لاحق نہیں کہ یہ حکم حق ہے اور خدا کی طرف سے آیا ہے اس کے باوجود ان کی ہٹ دھرمی اور اس حکم کی مخالفت میں فتنہ انگیزی ان کی دین دشمنی اور حق کے انکار کا نتیجہ ہے، اس لیے نہ تو کوئی دلیل ان پر اثر کر سکتی ہے اور نہ ہی کوئی آیت ان کی ہٹ دھرمی وانکار کو ختم کر سکتی ہے لہٰذا اگر آپؐ ان کے سامنے ہر طرح کی آیت پیش کر دیں تب بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے کیونکہ ان کے دل دین دشمنی سے بھرے ہوئے ہیں اور وہ حق کے انکار پر تلے ہوئے ہیں' اور آپؐ بھی ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کر سکتے کیونکہ آپ کے سامنے خدا کی طرف سے واضح ثبوت وحکم آچکا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ: "وَ مَاۤ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَہُمۡ" (تو ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کرے گا) اگرچہ جملہ خبر

یہ ہے...... اس بات کی خبر دیتا ہے کہ آپؐ ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے ...... جبکہ حقیقت میں آنحضرتؐ کو اس انداز میں "نہی" کی گئی ہو کہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی نہ کریں......، گویا نہی کو "خبر" کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

"وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ" یعنی وہ بھی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتے' کیونکہ اہل کتاب...... یہودی اور نصرانی...... ایک قبلہ پر متفق نہیں ہیں۔ یہودی جہاں کہیں بھی ہوں "بیت المقدس" کی طرف رخ کرتے ہیں اور نصرانی جہاں کہیں بھی ہوں مشرق کی طرف منہ کرتے ہیں' کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا اور اسی سے ان کی نفس پرستی اور جھوٹی انا کا ثبوت ملتا ہے......، (اس جملہ میں "بعض" سے مراد یہودی اور نصرانی ہیں کہ جو ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتے)۔

خواہشوں کی پیروی ظلم ہے

○ "وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ"...

(اور اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی جبکہ تیرے پاس علم آچکا ہے)

اس جملے میں بظاہر پیغمبر اسلامؐ سے مخاطب ہو کر انہیں دھمکی آمیز لہجہ میں کہا گیا ہے کہ اگر تو نے ان...... یہودیوں اور نصرانیوں...... کی خواہشات کی پیروی کی جبکہ تو حقیقت امر سے آگاہی رکھتا ہے تو پھر تو ظالم و ستمگر لوگوں میں سے ہو جائے گا، تاہم معنی و مقصود کے لحاظ سے اس جملہ کا مخاطب امت ہے اور امت محمدیہؐ کو اس بات کی طرف متوجہ و متنبہ کیا گیا ہے کہ چونکہ یہود و نصاریٰ کی سرکشی اور حق سے انحراف کی وجہ ان کا اپنی خواہشات نفس کی پیروی کرنا ہے کہ جس کے سبب وہ ظالم قرار پائے ہیں (اس لیے اگر امت محمدیہؐ میں سے کسی نے ایسا کیا تو وہ بھی ان کی طرح ظالموں میں شمار کیا جائے گا)۔

اہل کتاب کی حق شناسی کا ذکر

○ "الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ"

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے جن لوگوں کو کتاب دی ہے وہ پیغمبر اسلامؐ کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں' اس آیت میں "يَعْرِفُونَهُ" میں ضمیر "ہ" کی بازگشت پیغمبر اسلامؐ کی طرف ہے نہ کہ "کتاب" کی طرف' اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میں پہچاننے کی مشابہت "بیٹوں" کے ساتھ ذکر ہوئی ہے اس طرح کی مشابہت کا ذکر انسانوں کے مابین صحیح ہوتا ہے کتاب اور انسان کے درمیان مشابہت کے لیے "پہچاننے" جیسے الفاظ استعمال نہیں کئے جاتے کیونکہ "معرفت" (پہچان) کے لیے ضروری ہے کہ اس حوالہ سے مشابہت میں دونوں کی نوع کو ملحوظ رکھا جائے یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہتا: فلاں آدمی اس کتاب کو اس طرح جانتا یا پہچانتا ہے جس طرح اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے'

اس کے علاوہ آیت کے سیاق کلام سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ضمیر "ہ" کی بازگشت کتاب کی طرف نہیں بلکہ پیغمبر اسلامؐ کی طرف ہے کیونکہ آیت میں گفتگو ہی آنحضرتؐ اور اس حکم کے بارے میں ہے جو قبلہ کی بابت آنحضرتؐ پر نازل ہوا لہٰذا کسی پہلو سے بھی اس کا تعلق اس کتاب سے نہیں جو انہیں (یہود و نصاریٰ کو) دی گئی اور نہ آیت میں اس کتاب کی بابت کچھ بیان ہوا ہے۔

بنا بر ایں آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا: اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اپنی کتابوں میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں مذکور بشارتوں کی وجہ سے آپؐ کو اس طرح بخوبی پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو بخوبی پہچانتے ہیں "وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ" البتہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو سب کچھ جاننے کے باوجود حق کو چھپاتے ہیں۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

اب جبکہ ہم نے "يَعْرِفُونَهُ" میں ضمیر "ہ" کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس کی بازگشت حضرت پیغمبر اسلامؐ کی طرف ہے (اس سے آنحضرتؐ مراد ہیں) تو اب سوال یہ ہے کہ آیت میں "مخاطب" کے بجائے "غائب" کی ضمیر کیوں ذکر کی گئی ہے؟ یعنی "یعرفونك" کی بجائے "يَعْرِفُونَهُ" کیوں کہا گیا ہے جبکہ پہلے اور بعد کی آیتوں میں آنحضرتؐ سے خطاب ہوا ہے اور آپؐ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا:

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ... ہم تجھے آسمان کی طرف رخ کرتا ہوئے دیکھتے ہیں......

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ... پس ہم تیرا رخ اس قبلہ کی طرف موڑ دیں گے جس سے تو راضی ہوگا ......،

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ... پس تو اپنا رخ مسجد الحرام (کعبہ) کی طرف پھیر لے ...،

(وَلَئِنْ أَتَيْتَ) اور تو پیش کرے ---،

(وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ) --- اور تو ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والا نہیں ---،

(وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم) --- اور اگر تو ان کی خواہشوں کی پیروی کرے ---،

(إِنَّكَ إِذًا ...) --- تب یقیناً تو ---،

ان آیتوں کے بعد ارشاد فرمایا: (الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ ...... جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اسے پہچانتے ہیں ---)

اور اس آیت کے بعد پھر آنحضرتؐ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: (الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ

الْمُمْتَرِيْنَ)-- حق تیرے پروردگار کی طرف سے ہے لہذا تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا)

ان تمام آیات میں آنحضرتؐ کو مخاطب قرار دیا گیا ہے جبکہ زیر بحث آیت میں ارشاد فرمایا: ''يَعْرِفُوْنَهٗ''--وہ اسے پہچانتے ہیں--،اس میں مخاطب کی ضمیر کی بجائے غائب کی ضمیر (ہ) ذکر کی گئی ہے حالانکہ اس ضمیر کی بازگشت بھی..... جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے..... آنحضرتؐ کی طرف ہے تو پھر مخاطب کو چھوڑ کر غائب کے اشارے کی کیا ضرورت تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: اس طرح مومنین کو اس امر سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ اہل کتاب آنحضرتؐ کو اچھی طرح پہچاننے کے باوجود ان کے بارے میں ہٹ دھرمی سے کام لیتے تھے' گویا اظہار سخن کے اس مخصوص انداز میں آنحضرتؐ کی عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مومنین کو آنحضرتؐ کے بارے میں اہل کتاب کے نادرست رویہ سے آگاہی دلائی گئی ہے اور اس طرح کے طرز بیان میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص کسی گروہ سے کلام کر رہا ہو وہ اس گروہ کی بزرگ و مقتدر شخصیت سے مخاطب ہو کر بات کرتا ہے جبکہ اس کا مقصد وہ بزرگ شخصیت نہیں ہوتی بلکہ اس گروہ کے دیگر افراد مقصود ہوتے ہیں اور جب وہ خطاب کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچتا ہے کہ جہاں اسی مقتدر شخصیت کے بارے میں اس کی فضیلت و عظمت بیان کرنا چاہتا ہے تو اپنے انداز سخن میں تبدیلی لا کر اس شخصیت کو مخاطب قرار دینے کے بجائے اس گروہ کے افراد کو مخاطب کر کے اس شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے اور جب اس شخصیت کی فضیلت کا تذکرہ ختم ہوتا ہے تو دوبارہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اسی شخصیت کو مخاطب قرار دیتا ہے اور اپنے بیان کو مکمل کرتا ہے' اسی قاعدہ ء کلیہ کا ایک نمونہ زیر بحث آیت میں پایا جاتا ہے لہذا اس سے پہلے اور بعد والی آیتوں میں آنحضرتؐ کو مخاطب قرار دیا گیا ہے لیکن درمیان والی آیت میں غائب کی ضمیر کے ساتھ آنحضرتؐ کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' تو یہ ہے انداز سخن کی تبدیلی کا اصل راز......اور یہ ہے کلام الٰہی کے کمال فصاحت و بلاغت کا ایک واضح نمونہ! ... ،

حق کا حقیقی سرچشمہ

○ ''اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ''

یہ آیت ایک بار پھر سابقہ بیان کی تاکید کے طور پر ہے اور حق کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ میں مبتلا ہونے کی سخت ممانعت کرتی ہے۔ اس آیت میں اگرچہ بظاہر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دیا گیا ہے لیکن اس بیان کے معنی و مقصود کے حوالہ سے اس کا مخاطب پوری امت ہے۔

نیکیوں کی طرف سبقت کرنے کا حکم

○ "وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ"

(ہر ایک کی ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے، پس تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو)

عربی زبان میں "وجهة" اس چیز کو کہتے ہیں جس کی طرف رخ کیا جائے یعنی جو چیز روبرو اور سامنے ہو جیسے قبلہ۔

یہ آیت دراصل سابقہ بیانات کے خلاصہ کے طور پر ہے اور ان بیانات کو نئے انداز میں پیش کرنے کی ایک صورت ہے تاکہ لوگوں کو قبلہ کی اصل حقیقت سے آگاہی دلا کر اس کی بابت مزید بحث و گفتگو میں پڑنے سے روکا جاسکے اور کرنے کے اصل کام کی ترغیب دلائی جائے' بنابریں آیت کا معنی یوں ہوگا: ہر قوم کا ایک قبلہ ہے جو ان کی بہتری و مصلحت کے مطابق ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور وہ ایسا تکوینی مسئلہ نہیں جو ان کی اصل ذات و حقیقت کا حصہ ہو کہ جسے کسی صورت میں بتدیل نہ کیا جا سکتا ہو لہٰذا اس کی بابت اس قدر بحث و گفتگو کرنا اور آپس میں نزاع و مخاصمت روا نہیں، اس کی بجائے تم اصل کام کی طرف توجہ کرو اور نیک کام انجام دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرو کیونکہ خداوند عالم بہت جلد تمہیں اس دن اکٹھا کرے گا جس کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں (قیامت کے دن) اور تم جہاں کہیں بھی ہوگے (اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) خداوند عالم تم سب کو میدان حشر میں لے آئے گا' خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یاد رہے کہ یہ آیت جس طرح قبلہ کے موضوع کی وضاحت کے سلسلہ سے مربوط ہے کیونکہ یہ قبلہ کے حکم پر مشتمل آیات کے درمیان میں واقع ہوئی ہے اور مطالب کے لحاظ سے بھی ان سے ربط رکھتی ہے اسی طرح اسے ایک حوالہ سے ایک تکوینی امر سے مربوط بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور اس میں اس بات کا شارہ بھی ملتا ہے کہ مسئلہ قضاء و قدر ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور تمام احکام و آداب، قضاء و قدر کے تقاضوں کی تکمیل کے سلسلے کی کڑی ہیں۔ اس موضوع کی بابت تفصیلی تذکرہ اس کے مربوط مقام میں ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم

○ "وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ"

(اور تو جہاں سے نکلا ہے پس اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرلے)

بعض مفسرین کرام نے اس آیت کا معنی یوں ذکر کیا ہے کہ: تو جس جگہ سے بھی باہر آئے اور جس جگہ میں بھی داخل ہو تو اپنا منہ کعبہ کی طرف کرلے" اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس کا معنی یہ ہے: تو جس شہر سے بھی باہر آئے اپنا رخ کعبہ کی طرف کرلے' تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ "مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ" سے مراد یہ ہو کہ "تو جہاں سے نکلا ہے" یعنی مکہ' کیونکہ آنحضرتؐ

مکہ سے باہر نکلے تھے جیسا کہ ایک آیت میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ محمد آیت ۱۳:

" مِّنۡ قَرۡیَتِكَ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَتۡكَ "......،

اس بستی سے کہ جہاں سے تجھے نکالا گیا ہے......،

بہرحال زیر بحث آیت میں اس امر کو بیان کرنا مقصود ہے کہ خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم تیرے لیے کسی مخصوص جگہ میں ہونے کے حوالہ سے نہیں بلکہ تو جہاں کہیں بھی ہو یہ حکم نافذ العمل ہوگا خواہ تو مکہ میں ہو یا دنیا کے کسی خطہ میں ہو ہر مقام پر یہی حکم ہوگا۔

اس کے بعد جملہ: " وَاِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ " (یہ تیرے پروردگار کی طرف سے حکمِ حق ہے اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں) ذکر کیا گیا ہے جو کہ قبلہ کے حکم کی تاکید مزید اور اہمیت کے بیان کے لیے ہے۔

قبلہ رخ کرنے کا عمومی حکم

O وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ... "

(اور تو جہاں سے نکلے پس اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرلے، اور تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے اس کی طرف کرلو)

اس آیت میں ایک بار پھر پہلی آیت کے الفاظ کو بعینہ ذکر کیا گیا ہے (وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ' یہی الفاظ اس سے پہلی آیت میں بھی اسی طرح سے مذکور ہیں) شاید اس کی وجہ اس میں مذکور حکم کی تاکید اور اس کے ہر حال میں ثابت و لازم ہونے کو بیان کرنا مقصود ہو' یعنی تم جس حالت میں بھی ہو تمہارا کعبہ کی طرف منہ کرنا لازم وضروری ہے اور یہ حکم تمہارے لیے ہر حال میں ثابت ہے' اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی سے یوں کہے: جب تو کھڑا ہو تو تقوائے الٰہی اختیار کر' اور جب تو بیٹھا ہو تو تقوائے الٰہی اختیار کر' جب بول رہا ہو تو تقوائے الٰہی اختیار کر اور جب خاموش ہو تو تقوائے الٰہی اختیار کر' گویا کہنے والا یہ چاہتا ہے کہ تو ہر حال میں تقوائے الٰہی اختیار کر اور کبھی اس سے غفلت نہ کر' اگر وہ اپنی بات کو اس طرح کہتا: تو تقوائے الٰہی اختیار کر جب کھڑا ہو' جب بیٹھا ہو' جب بول رہا ہو اور جب خاموش ہو' تو اس سے ہر حال میں کی جانے والی تاکید مزید ظاہر نہ ہوتی۔

بہرحال آیت کا معنی یہ ہے: تو جہاں سے بھی باہر نکلے اپنا رخ کعبہ کی طرف کرلے اور تم روئے زمین پر جس خطہ میں بھی ہو اپنے منہ کعبہ کی طرف کرلو۔

قبلہ کی تبدیلی کے فوائد کا بیان

○ "لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي"

(تا کہ لوگوں کو تم پر کوئی حجت نہ مل سکے، سوائے ان لوگوں کے کہ جنہوں نے ظلم کیا، پس تم ان سے مت ڈرو بلکہ صرف مجھ سے خشیت رکھو)

اس آیت میں قبلہ کی تبدیلی کے حکم سے تین فوائد کے حصول کی اہمیت کا تذکرہ اور اس امر کا بیان مقصود ہے کہ اس حکم میں مسلمانوں کو خدا کے احکام و فرامین بالخصوص...... قبلہ کے بارے میں صادر ہونے والے...... اس حکم پر عمل کرنے اور اس سے سرتابی نہ کرنے کی بھرپور تاکید کی گئی ہے جو تین فوائد اس حکم میں ملحوظ ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ چونکہ یہودی اپنی کتب میں مذکور مطالب سے یہ آ گاہی حاصل کر چکے تھے کہ جس نبی کے آنے کی خوشخبری دی گئی ...... (پیغمبر موعود)...... اس کا قبلہ، کعبہ ہوگا نہ کہ بیت المقدس جیسا کہ خداوند عالم نے آیت "وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ..." میں اس کی بابت اشارہ فرمایا ہے بنا بر ایں اگر مسلمان اس حکم سے سرتابی کریں تو گویا انہوں نے خود ہی یہودیوں کے لیے اپنے خلاف دلیل پیش کر دی اور انہیں یہ کہنے کا موقعہ دے دیا کہ یہ پیغمبر وہ نہیں جس کی بشارت دی گئی تھی یعنی مسلمانوں کا قبلہ کی تبدیلی کے حکم پر عمل نہ کرنا۔ یہودیوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ کہنے کی جرأت دے گا کہ یہ شخصیت وہ نبی نہیں کہ جن کا ذکر ہماری کتابوں میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کا قبلہ کعبہ ہوگا، لیکن اگر مسلمان اس حکم پر عمل کریں اور قبلہ کی تبدیلی کے بارے میں فرمان الٰہی کا امتثال کریں تو یہودیوں کو لب کشائی کا موقعہ نہ مل سکے گا اور وہ آنحضرتؐ کی تکذیب کی جرأت نہ کر سکیں گے اور ان کی بہانہ جوئی و طعنہ زنی کے تمام راستے بند ہو جائیں گے "إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ" سوائے ان لوگوں کے کہ جو ان میں سے ستمگر و ظالم ہیں یعنی وہ ہر حال میں مسلمانوں پر طعن اور آنحضرتؐ کی تکذیب کرتے رہیں گے، اس جملہ (إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ) میں یہودیوں کے ظالم و ستمگر افراد کا استثناء علمی اصطلاح میں...... استثناء منقطع ہے، بنا بر ایں اس جملے سے مراد یہ ہے: "لیکن جو افراد ان میں سے ظالم ہیں وہ اس کے باوجود بھی طعنہ زنی سے باز نہیں آئیں گے" لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو کیونکہ وہ ظالم و ستمگر اور اپنی خواہشات نفس کے پیروکار ہیں اور خداوند عالم ظالم لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا اس لیے ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ تم میرا خوف دل میں رکھو...... کہ کہیں میرے حکم کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہو جاؤ......،

۲۔ اس حکم پر عمل کرنا مسلمانوں کے لئے ان کے دین کی تکمیل کے حوالہ سے خدا کی نعمت کے پورا ہونے کا موجب ہے۔ نعمت کے پورا ہونے اور دین کی تکمیل کے معنی کی وضاحت سورۂ مائدہ کی آیت ۴ میں کی جائے گی جس میں کہا گیا ہے

" اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ "

(آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے)

۳۔اس حکم پر عمل کرنے سے صراطِ مستقیم کی ہدایت پانے کی امید پیدا ہو جائے گی۔صراط مستقیم کی ہدایت کے معنی کی وضاحت سورۂ فاتحہ کی آیت ۵ (اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ) کی تفسیر میں کی جا چکی ہے۔

زیر بحث آیت کے بارے میں ایک رائے

بعض مفسرین نے زیر بحث آیت (قبلہ کی تبدیلی کے حکم پر مشتمل آیت) کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ خداوند عالم نے اس آیت کے ذیل میں نعمت کے پورا کرنے اور ہدایت کے حصول کا جو ذکر فرمایا ہے اس سے مراد مسلمانوں کو فتح مکہ کی خوشخبری دینا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا۔ " وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ " (تا کہ خدا اپنی نعمت کو تم پر پورا کردے اور شاید تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ)۔ جبکہ یہی دو جملے خداوندِ عالم نے سورۂ فتح میں حضرت محمدؐ کو مخاطب کر کے اس طرح ارشاد فرمائے، ملاحظہ ہو:

سورہ فتح آیت ۲:

" اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ﴿۱﴾ لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ وَیَھْدِیَکَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا "۔

(یقیناً ہم نے تجھے فتح مبین عطا کی تا کہ خدا تیرے پہلے اور آئندہ کے تمام گناہ معاف کر دے اور اپنی نعمت کو تجھ پر پورا کر دے اور تجھے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے)۔

تو یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں لہٰذا یہ کہنا بے جا نہیں کہ تحویل قبلہ کی آیت میں بھی فتح مکہ کی بشارت و خوشخبری دی گئی ہے۔اس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ خانہ ءکعبہ صدرِ اسلام میں مشرکوں کے بتوں اور خود ساختہ خداؤں کے مجسموں سے بھرا ہوا تھا گویا خدا کے گھر میں بتوں کی حکمرانی تھی اور ابھی تک اسلام کو قوت و قدرت حاصل نہ ہوئی تھی۔اسلام اپنی نشوونما کے ابتدائی مراحل میں تھا۔اس دوران خداوند عالم نے اپنے نبی کو بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا چونکہ وہ یہودیوں کا قبلہ تھا جو کہ مشرکین کی نسبت اپنے دین میں اسلام سے زیادہ قریب تھے لیکن جب آنحضرتؐ کی مدینہ کی طرف ہجرت سے اسلام کی نشوونما اور اس کے پھیلاؤ کے عمل میں وسعت پیدا ہوئی اور دین اسلام کو استحکام حاصل ہونے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ فتح مکہ کا وقت بھی قریب آ گیا جس سے خانہ ءکعبہ کی، بتوں کی نجاست سے پاک ہونے کی امید پیدا ہو گئی تو اس وقت قبلہ کی تبدیلی کا حکم مسلمانوں کے ساتھ مختص خدا کی عظیم نعمت کے طور پر نازل ہوا اور اس حکم میں خداوند عالم نے مسلمانوں کو نعمت کے پورا ہونے اور ہدایت کے حصول یعنی کعبہ کی بتوں سے پاک ہونے اور مسلمانوں کے لئے مختص ہو جانے کی خوشخبری دی۔اور یہ وعدہ کیا کہ میں اسے قبلہ قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے اور اسے مسلمانوں کے لئے

مخصوص کردوں گا اور یہ ''قبلۂ مسلمین'' کہلائے گا۔ یہی وعدہ و بشارت ہی درحقیقت فتح مکہ کی خوشخبری تھی اور جب مکہ فتح ہو گیا تو خداوند عالم نے اس کے فتح ہو جانے کی خوشخبری دیتے ہوئے اپنے اس وعدہ کو یاد دلایا جو اس نے مسلمانوں سے کیا تھا کہ ان پر اپنی نعمت کو پورا کر دے گا اور انہیں صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے گا چنانچہ ارشاد ہوا۔ ''وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا.....''

یہ ہے آیت قبلہ کے بارے میں بعض مفسرین کی رائے۔ اگرچہ یہ رائے بظاہر بہت اچھی اور قابل قبول نظر آتی ہے لیکن اس میں اچھی طرح غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی وزن نہیں اور اسے کسی بھی صورت میں درست اور صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا اور آیات کے ظاہری الفاظ بھی اس کی صحت کی تائید و تصدیق نہیں کرتے کیونکہ اس آیت میں نعمت کے پورا کرنے کا وعدہ اور ہدایت کے حصول کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ''وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ'' (تاکہ میں اپنے نعمت تم پر پوری کر دوں اور شاید تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ) اس میں ''لِأُتِمَّ'' کے لفظ میں حرف لام سے قبلہ کی تبدیلی کے مقصد و ہدف کی نشاندہی ہوتی ہے، ادب و لغت میں سے لام غایت کہا جاتا ہے اور یہ لام سورۂ فتح کی آیت میں بھی مذکور ہے، ملاحظہ ہو:

''لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا.'' (تاکہ خدا تیرے سابقہ و آئندہ کے تمام گناہ معاف کر دے اور اپنی نعمت کو تجھ پر پورا کر دے اور تجھے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے)

یہ دونوں آیتیں (آیت قبلہ اور آیتِ فتح) نعمت کے پورا کرنے کے وعدۂ جمیل پر مشتمل ہیں یعنی دونوں آیتوں میں آئندہ فتح عطا کرنے اور نعمت کی تکمیل و ہدایت کی خوشخبری و وعدہ کا تذکرہ ہے لہٰذا یہ بات کیونکر درست ہو سکتی ہے کہ آیتِ فتح کو آیتِ قبلہ میں کئے گئے وعدہ کے ایفاء کے بیان پر مشتمل قرار دیا جائے؟

یہ تو ہے ایک جہت' اور دوسری یہ کہ آیتِ قبلہ میں نعمت کے پورا کر دینے' (اتمامِ نعمت) کا جو وعدہ کیا گیا ہے وہ تمام مسلمانوں کے لئے ہے (وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ) جبکہ آیتِ فتح میں یہ وعدہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کیا گیا ہے (وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا) ان دونوں آیتوں کے سیاق و انداز بیان کا مختلف ہونا بھی مذکورہ بالا رائے کے نادرست ہونے کی ایک دلیل ہے۔ البتہ قرآن مجید میں صرف ایک آیت ایسی ہے جو خدا کے وعدۂ اتمام نعمت کہ جو ان دو آیتوں۔ آیتِ قبلہ اور آیت فتح میں کیا گیا ہے کے ایفاء کے بیان پر مشتمل ہے وہ سورۂ مائدہ کی آیت ۳ ہے جس میں واضح و صریح الفاظ میں یوں ارشاد ہوا۔

''اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا''

(آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دیا)

تاہم اس آیت میں جس نعمت کے پورا کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے اس کے معنی و مراد کی وضاحت اس آیت کی تفسیر کے مقام میں کی جائے گی۔

ان دو آیتوں۔ آیت قبلہ اور آیت فتح۔ میں نعمت کے پورا کر دینے (اتمام نعمت) کا جو وعدہ کیا گیا ہے اس کا ذکر درج ذیل آیتوں میں بھی موجود ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ مائدہ آیت ۶:

O "..... وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ"

(لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کردے اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دے تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ)

سورۂ نحل آیت ۸۱:

O ــــ "كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ"

(اسی طرح وہ تم پر اپنی نعمت کو پورا کرتا ہے تاکہ تم حق کو تسلیم کرلو)

ان آیات کے بارے میں تفصیلی تذکرہ ان کی تفسیر کے مقام میں ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

بعثت نبویؐ کا تذکرۂ جمیل

O كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ

(جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے۔۔)

بظاہر اس آیت میں "کَمَآ" کا "کَ" تشبیہ کے لئے ہے اور "ما" مصدریہ ہے لہٰذا پوری آیت کا معنی یوں ہوگا۔ "ہم نے تم پر یہ انعام کیا ہے کہ تمہارے لئے اس گھر کو جسے ابرہیم نے بنایا تھا اور اس کے لئے خیر و برکت کی دعا مانگی تھی قبلہ قرار دیا جیسا کہ ہم نے تم میں سے ایک رسول تم میں بھیجا کہ وہ تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور تمہارا تذکیۂ نفس کرے' یہ سب کچھ ہم نے ابراہیم کی دعا کو مستجاب کرتے ہوئے کیا کیونکہ انہوں نے اور ان کے فرزند اسماعیل نے یوں دعا مانگی تھی :

"رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ"

(اے ہمارے پروردگار! ان میں سے ایک رسول ان میں مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیات کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیۂ نفس کرے)

بنابرایں تمہیں دو عظیم نعمتیں عطا کر کے تم پر عظیم احسان کیا گیا ہے: ایک یہ کہ تم میں سے ایک رسول تم میں مبعوث کیا گیا اور دوسرا یہ کہ کعبہ کو تمہارے لئے قبلہ قرار دیا گیا اور یہ دونوں کام ایک جیسے ہیں (خدا کی طرف سے تم پر عظیم احسان ہے)۔

اس بیان سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں "فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ" (تم میں ایک رسول تم میں سے) کا مخاطب امت مسلمہ ہے اور اس سلسلے میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اگرچہ بظاہر یہ خطاب پوری امتِ مسلمہ سے ہے لیکن حقیقت میں اس سے مراد امت کے خاص افراد یعنی اولیاء الٰہی ہیں۔ یعنی بظاہر آلِ اسماعیلؑ میں سے تمام مسلمان۔ اعراب مضر۔ اس آیت کا مخاطب ہیں اور اس میں مذکور حکم دنیا بھر کے عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے ہے لیکن حقیقت میں اس سے مراد امتِ مسلمہ کے خاص افراد ہیں۔

رسولؐ اور تلاوت آیاتِ الٰہی

○ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا

یہاں "اٰيٰتِنَا"۔ ہماری آیات۔ سے مراد بظاہر آیات قرآنی ہیں کیونکہ اس میں "یَتْلُوْا" کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ "تلاوت" کرتا ہے اور "تلاوت" الفاظ کی ہوتی ہے نہ کہ معانی کی۔

"وَيُزَكِّيْكُمْ" میں تزکیہ سے مراد تطہیر یعنی گندگیوں اور نجاستوں سے پاک کرنا ہے اس میں غلط اعتقادات مثلاً کفر اور شرک سے پاک کرنا' اخلاقی برائیوں مثلاً تکبر اور بخل سے پاک کرنا اور مذموم و قبیح اعمال مثلاً قتل' زنا اور شراب خوری سے پاک کرنا بھی شامل ہے۔

"وَيُعَلِّمُكُمْ" میں کتاب و حکمت کی تعلیم دینا اور جو کچھ نہیں جانتے اس کی تعلیم دینا کے الفاظ میں تمام اصول و فروع دین کی تعلیم دینا شامل ہے' (وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ)

یاد رہے کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں کئی مقامات پر اندازِ بیان کی تبدیلی (التفات) کا عمل اپنایا گیا ہے خدا کے بارے میں بھی اور غیر خدا کے بارے میں بھی؛ یعنی غائب کے صیغہ کی جگہ متکلم کا صیغہ اور مفرد کے صیغہ کی جگہ جمع کا صیغہ تبدیل کر کے بات کی گئی ہے اور غائب' مخاطب اور متکلم کے صیغوں کی تبدیلی میں جو اہم نکتہ پوشیدہ ہے اس سے تدبر و تفکر کرنے والے اور نکتہ سنج حضرات بخوبی آگاہ ہیں۔

روایات پر ایک نظر

تحویل قبلہ کا تاریخی پس منظر

تفسیر مجمع البیان میں تفسیر قمی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیت مبارکہ "سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ .... الخ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیرہ برس مکہ مکرمہ میں اور ہجرت کے بعد سات ماہ مدینہ منورہ میں "بیت المقدس" کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی، اس کے بعد قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا اور خدا نے انہیں کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دیا کیونکہ یہودی آنحضرتؐ پر طعنہ زنی کرتے ہوئے کہتے تھے کہ تو ہمارے اتباع میں ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتا ہے۔ آنحضرتؐ کو ان کی یہ باتیں سخت ناگوار گزرتی تھیں اور آپ سخت پریشان و مغموم ہو جاتے تھے چنانچہ آپ ایک رات گھر سے باہر تشریف لائے اور غمگین حالت میں آسمان کی طرف نگاہ کرنے لگے گویا خدا کی طرف سے اس سلسلہ میں کسی حکم کے نازل ہونے کے منتظر تھے۔ بالآخر صبح ہوگئی اور پھر نماز ظہر کا وقت ہوگیا آپؐ نماز ظہر ادا کرنے کے لئے "مسجد بنی سالم" میں تشریف لائے اور نماز ادا کرنے میں مصروف ہو گئے ابھی دو رکعت نماز ادا کی تھی کہ جبرئیلؑ نازل ہوئے اور آنحضرتؐ کے بازو تھام کر آپؐ کا رخ انور کعبہ کی طرف موڑ دیا اور یہ آیت آنحضرتؐ پر نازل کی۔ "قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" (ہم نے تجھے بار بار آسمان کی طرف منہ کرتے ہوئے دیکھا پس ہم تیرا رخ اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے تو خوش ہو تو اب اپنا رخ مسجد الحرام "کعبہ" کی طرف پھیر لے)۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے نماز ظہر کی دو رکعتیں بیت المقدس کی طرف اور باقی دو رکعتیں کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا کیں۔ اس موقعہ پر یہودیوں اور سفیہ و بے وقوف لوگوں نے کہا "مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا" انہیں کس چیز نے اس قبلہ سے پھیر دیا ہے جس پر یہ پہلے تھے (جس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے)۔

قبلہ کی تبدیلی کے حکم سے مربوط واقعہ کی بابت۔۔کہ آنحضرتؐ پر یہ حکم نماز ظہر کی حالت میں نازل ہوا۔ فریقین (عامہ و خاصہ)۔شیعہ و سنی۔۔کے حوالوں سے کتب احادیث میں کثرت کے ساتھ روایات مذکور ہیں اور ان سب کے مضامین

ایک جیسے ہیں تاہم واقعہ کی تاریخ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے جبکہ اکثر روایات میں جو کہ سند کے لحاظ سے صحیح ہیں مذکور ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے دوسرے سال یعنی سترہویں مہینے ماہ رجب المرجب میں پیش آیا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں تفصیلی مطالب اس کے مربوط مقام پر ذکر کئے جائیں گے۔

امت اسلامیہ کے لوگوں پر گواہ ہونے اور پیغمبر اسلامؐ کے امت پر گواہ ہونے کے مسئلہ کی بابت اہل سنت والجماعت کے اسناد سے مذکور ہے کہ قیامت کے دن تمام امتیں انبیاءؑ کے عمل تبلیغ کا انکار کریں گی اس وقت خداوند عالم انبیاءؑ سے فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی کا ثبوت طلب کرے گا۔ جبکہ وہ خود سب سے زیادہ آگاہ ہے۔ پھر امت محمدؐ کو لایا جائے گا پس وہ گواہی دے گی، امتیں ان سے پوچھیں گی کہ تم لوگ یہ سب کچھ کیونکر جانتے ہو؟ وہ (امتِ محمدؐ کے افراد) جواب دیں گے کہ ہمیں ان باتوں کا علم خدا کی برحق کتاب قرآن مجید میں سچے نبیؐ کی زبانی ہوا ہے۔ اس کے بعد حضرت محمدؐ کو لایا جائے گا اور ان کی امت کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا تو وہ ان کی تصدیق فرمائیں گے اور ان کی عدالت (سچا ہونے) کی گواہی دیں گے اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ.....''

مذکورہ بالا بیان میں۔۔ کہ جس کی تصدیق دیگران احادیث سے بھی ہوتی ہے جنہیں تفسیر ''الدرالمنثور'' وغیرہ میں ذکر کیا گیا ہے۔۔ یہ امر مذکور ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے دن اپنی امت کی صداقت و عدالت کی گواہی دیں گے، تو اس سے مراد امت کے بعض افراد ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ ساری امت، کیونکہ یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے اور اس کا ثبوت کتاب وسنت سے بھی ملتا ہے کہ ساری امت عادل نہیں اور آنحضرتؐ اپنی ساری امت کے عادل ہونے کی ہرگز تصدیق نہیں کریں گے، اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس امت کے مظالم اور ان انسانیت سوز اعمال کو صحیح قرار دیا جائے کہ جن کی مثال سابقہ امتوں میں بھی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ مظالم سابقہ امتوں کے مظالم سے قابل قیاس بھی نہیں۔ ان کی نوعیت وشدت سابقہ امتوں کے مظالم کی شدت ونوعیت سے کہیں زیادہ ہے اور اسی طرح یہ بات کیونکر درست قرار دی جا سکتی ہے کہ آنحضرتؐ اس امت کے فرعون صفت افراد اور سرکش وستمگر لوگوں کے عادل ہونے کی گواہی دیں؟ ہرگز نہیں، ورنہ اسلامی حقائق وتعلیمات اور آئین اسلام کی کوئی وقعت ہی باقی نہ رہے گی اور یہ سب کچھ کھیل تماشہ ہو جائے گا۔ اور جہاں تک ''گواہی'' دینے کا تعلق ہے تو مذکورہ بیان میں ''گواہی دینے'' سے مراد آنکھوں دیکھا حال بیان کرنا نہیں بلکہ اس سے مراد اعتقاد کی بنیاد پر گواہی دینا ہے یعنی قرآنی آیات میں مذکور واقعات کی صحت کا یقین رکھتے ہوئے ان کی تصدیق کرنا مقصود ہے اور امتِ محمدؐ صرف اسی صورت میں گواہی دے گی اور پھر حضرت محمدؐ اپنی امت کی اس گواہی کی تصدیق کریں گے۔

انبیاءؑ و آئمہؑ ہی گواہی دیں گے

کتاب ''المناقب'' میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(ولا یکون شهداء علی الناس الا الائمة والرسل، واما الامة فغیر جایز ان یستشهدها الله و فیهم من لا تجوز شهادته علی حزمة بقل)

(آئمہ وانبیاءؑ ہی ہیں کہ جو لوگوں پر گواہ ہوں گے اور جہاں تک امت کا تعلق ہے تو یہ ہرگز ممکن نہیں کہ خدا اس سے گواہی طلب کرے کیونکہ امت میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جن کی گواہی سبزی کے ایک گٹھے کی بابت بھی قبول نہیں کی جاسکتی)۔

درمیانی امت سے کون مراد ہے؟

تفسیر ''العیاشی'' میں منقول ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیت مبارکہ ''لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اگر تم یہ گمان کرو کہ خداوند عالم نے اس آیت میں تمام اہل قبلہ اور توحید پرست مراد لئے ہیں تو یہ بات خدا پر افتراء اور بہتان ہوگا کیونکہ جس شخص کی گواہی اس دنیا میں کھجور کے چند خوشوں کے بارے میں بھی قابل قبول نہیں اسے خداوند عالم قیامت کے دن ایک نہایت اہم موضوع کے بارے میں کیونکر گواہ قرار دے سکتا ہے اور اس کی گواہی تمام سابقہ امتوں کے سامنے کس طرح قابل قبول ہوسکتی ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے' خداوند عالم اس طرح کی بات کسی صورت میں نہیں کرسکتا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد وہی ہستیاں ہیں جن کی بابت خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مستجاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ''كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ'' پس درمیانی امت اور بہترین امت سے مراد وہی لوگ ہیں جنہیں لوگوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔

یاد رہے کہ امامؑ کے مذکورہ بالا بیان کی وضاحت آیت ''كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ......'' کے ذیل میں آیات قرآنیہ کے حوالہ سے پیش کی جاچکی ہے۔

امت مسلمہ کا خصوصی اعزاز

کتاب ''قرب الاسناد'' میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے اپنے پدر بزرگوار کے حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ذکر فرمایا کہ: خداوند عالم نے جو چیزیں میری امت کو عطا فرمائی ہیں اور ان کی وجہ سے اسے دیگر امتوں پر برتری دی ہے ان میں سے تین صفتیں اور اعزازات ایسے ہیں جو نبی و پیغمبر کے علاوہ کسی کو عطا نہیں کیے گئے...... ان میں سے ایک یہ ہے کہ خداوند عالم نے جب بھی کسی امت میں کسی نبی کو بھیجا تو اسے اس امت پر گواہ قرار دیا لیکن میری امت کو یہ اعزاز عطا فرمایا کہ اسے سب لوگوں پر گواہ بنا دیا چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہوا ''لِيَكُونَ

الرَّسُوْلُ شَہِیْدًا عَلَیْکُمْ وَ تَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ"

یہ حدیث سابقہ مطالب کی نفی نہیں کرتی کیونکہ اس میں ''امت'' سے مراد وہی امت مسلمہ ہے کہ جس کے حق میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول ہوئی۔

قیامت کے دن مقام رسولؐ

تفسیر ''العیاشی'' میں حضرت امام امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے قیامت کے دن کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: سب لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوں گے اور وہاں سب سے پوچھ گچھ کی جائے گی اور کسی کو بات کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا سوائے اس کے کہ جسے خدا اذن دے گا اور وہ حق بات کرے گا، اس وقت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لایا جائے گا اور آنحضرتؐ سے اظہار حق کے لئے کہا جائے گا' چنانچہ اس کا ذکر خدا نے قرآن میں یوں فرمایا۔ ''فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا'' (اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ بلائیں گے اور تجھے ان سب پر گواہ قرار دیں گے) 'پس آنحضرتؐ تمام گواہوں پر گواہ ہوں گے' اور وہ گواہ انبیاء ہوں گے (یہاں دیگر گواہوں کہ جن پر آنحضرتؐ گواہ ہوں گے سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں۔

بیت المقدس: قبلہء اول

کتاب ''تہذیب'' میں ابوبصیر کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت امام محمد باقرؑ میں سے ایک شخصیت سے منقول ہے، راوی نے کہا کہ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا: آیا خداوند عالم نے اپنے پیغمبر (محمدؐ) کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ ''بیت المقدس'' کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں؟ امامؑ نے جواب دیا: ہاں! کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی ہے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَۃَ الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْھَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْہِ......،

تجزیہ و تبصرہ:

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ میں ''الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْھَآ'' کے الفاظ جو کہ قبلہ کی صفت کی صورت میں ہیں ان سے مراد ''بیت المقدس'' ہے اور وہی قبلہء اول تھا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے جیسا کہ آیات کے سیاق اور ظواہر سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور اس کی بابت ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں، لہٰذا بعض مفسرین کا یہ کہنا کہ اس سے مراد بیت المقدس نہیں بلکہ ''کعبہ'' ہے کہ جسے دوبارہ قبلہ

قرار دیا گیا' ظواہر آیات سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا' اور اس کے علاوہ آیت مبارکہ میں ''اَلْقِبْلَةَ الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْهَاۤ'' سے بیت المقدس مراد لینے کی تائید و تصدیق بعض ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے منقول ہیں کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: اہلِ مکہ کا رجحان اور توجہ کعبہ کی طرف تھی اور ان کی خواہش یہ تھی کہ ''کعبہ'' کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں اور خدا یہ چاہتا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے فرمانبرداروں اور نافرمانوں کی پہچان ہو سکے لہٰذا اس نے قبلہ کے حکم کو اس کا معیار قرار دے دیا تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ جس قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم پیغمبرِ خدا دے رہے ہیں یعنی بیت المقدس تو اس حکم کی پیروی کرنے والے کون افراد ہیں اور جو اس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ بھی بے نقاب ہو جائیں۔ یہ تو ہے اہل مکہ کی خواہش اور ان کے امتحان کا بیان۔ اس کے ساتھ ساتھ اہل مدینہ کی خواہش یہ تھی کہ ''بیت المقدس'' ہی قبلہ رہے لیکن ان کی خواہش کے برعکس خدا نے انہیں ''کعبہ'' کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا تا کہ ان کا بھی امتحان لیا جا سکے کہ ان میں سے پیغمبر اسلامؐ کی پیروی و فرمانبرداری کرنے والے کون ہیں اور نافرمان کون؟

اس بیان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کا یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ ''اَلَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْهَاۤ''، جَعَلْنَا کا دوسرا مفعول ہے لہٰذا آیت کا معنی یوں ہوگا: ''ہم نے نہیں قرار دیا قبلہ اس کعبہ کو جس پر تو بیت المقدس سے پہلے تھا''۔ اور پھر اس قائل نے اپنے اس نظریہ کی صحت کے لئے بعد والے جملہ سے جو استدلال پیش کیا ہے اور کہا کہ ''اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ'' اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا تھا نہ کہ بیت المقدس کو' وہ بھی ہرگز درست نہیں اور ہمارے سابقہ بیان اور وضاحتوں سے اس نظریہ کے نادرست ہونے کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔

ایمان: مجموعۂ قول و عمل

تفسیر ''العیاشی'' میں زبیری سے منقول ہے اس نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: مولا مجھے ''ایمان'' کی حقیقت کے بارے میں آگاہ فرمائیں کہ آیا قول و عمل (گفتار و کردار) دونوں کے مجموعہ کو ایمان کہتے ہیں یا صرف قول بغیر عمل کے بھی ایمان کہلاتا ہے؟ امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

(الایمان عمل کله والقول بعض ذٰلك العمل ،مفروض من الله ،مبین فی کتابه ،واضح نوره ،ثابت حجته ،یشهد له بها الکتاب و یدعو الیه،و لما ان صرف الله نبیه الی الکعبة عن بیت المقدس قال المسلمون للنبی ارایت صلاتنا التی کنا نصلی الی بیت المقدس،ما حالنا فیها و ما حال من مضی من امواتنا وهم کانوا یصلون الیٰ بیت المقدس ؟ فانزل الله (وما کان لیضیع ایمانکم ان الله بالناس لرووف رحیم ، فسمی الصلوٰة ایماناً فمن اتقی الله حافظاً لجوارحه موفیاً کل جارحة من جوارحه بما فرض الله علیه لقی الله مستکملاً لایمانه من اهل الجنة ،ومن خان فی شیٔ منها او تعدی ما

امر اللہ فیہا لقی اللہ ناقص الایمان)

ایمان سراپا عمل ہے اور قول اس عمل کا ایک حصہ ہے اور وہ خدا کی طرف سے فرض و واجب قرار دیا گیا ہے اس کا ذکر قرآن مجید میں واضح طور پر ہوا ہے، اس کا نور نمایاں اور اس کی دلیل ثابت و قائم ہے، اور کتاب خدا اس کے بارے میں بھرپور گواہی اور اس کی دعوت دیتی ہے کیونکہ جب خداوند عالم نے اپنے نبی کو بیت المقدس سے کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا تو مسلمانوں نے آنحضرتؐ سے کہا: ہماری ان نمازوں کا کیا بنے گا جو ہم نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ادا کی ہیں اور اسی طرح ہم سے پہلے جو لوگ اس دنیا میں تھے اور بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے ہیں ان کی عبادات کا کیا حکم ہے؟ اس موقع پر خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ "وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ" (خدا تمہارے ایمان کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا' یقیناً خدا لوگوں کے ساتھ مہربانی کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے) اس آیت میں نماز کو "ایمان" کا نام دیا گیا ہے' بنا بریں جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے' اپنے اعضاء و جوارح کو گناہ و معصیت کے ارتکاب سے محفوظ رکھے اور خداوند عالم کی طرف سے فرض کئے گئے تمام امور کو انجام دے وہ قیامت کے دن ایمان کے درجہ کمال کے ساتھ اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوگا اور اہل بہشت میں سے شمار کیا جائے گا اور جو شخص ان امور میں ذرہ بھر خیانت و معصیت یا احکام الٰہی سے تجاوز و روگردانی کا مرتکب ہوگا وہ قیامت کے دن خدا کے حضور ناقص الایمان ہو کر جائے گا۔

اس حدیث کو کلینی مرحوم نے بھی ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ بات یاد رہے کہ اس میں "وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ......" کے الفاظ قبلہ کی تبدیلی کے حکم کے بعد نازل ہوئے تو اس سے ہمارے سابقہ بیانات کی نہ تو نفی ہوتی ہے اور نہ ہی ان کی صحت مخدوش ہوتی ہے۔

مسجد قبلتین کی وجہ تسمیہ

کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں مذکور ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں تیرہ برس اور مدینہ منورہ میں انیس (۱۹) ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی اور جب یہودیوں نے آنحضرتؐ پر طعن و تشنیع کی صورت میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ تو ہمارے قبلہ کی پیروی کرتا ہے تو آنحضرتؐ سخت غمگین و محزون ہوئے اور رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکل آئے اور بار بار آسمان کی طرف دیکھتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور آپ نے صبح کی نماز ادا کی اور جب نماز ظہر کا وقت ہوا تو آپؐ نے نماز شروع کی، اس اثناء میں جبریلؑ نازل ہوئے اور یہ آیت پڑھی "قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ......" اس کے بعد جبریلؑ نے آنحضرتؐ کا ہاتھ تھام کر آپؐ کا رخ کعبہ کی طرف موڑ دیا اور جو لوگ آنحضرتؐ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے سب نے اپنے رخ کعبہ کی طرف پھیر دیئے اور اس طرح کھڑے ہوئے کہ مردوں کی جگہ پر خواتین اور خواتین کی جگہ مرد آ گئے' تو یہ تھی

آنحضرتؐ کی وہ نماز جو آپؐ نے آدھی (پہلی دو رکعتیں) بیت المقدس کی طرف اور آدھی (آخری دو رکعتیں) کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا کی اور جب اس واقعہ کی خبر مدینہ کی ایک مسجد میں پہنچی تو وہاں بھی لوگ نماز عصر کی پہلی رکعتیں ادا کر چکے تھے تو انہوں نے بھی فوراً اپنے رخ کعبہ کی طرف کر لئے لہٰذا ان کی نماز بھی آدھی (پہلی دو رکعتیں) بیت المقدس کی طرف اور آدھی (آخری دو رکعتیں) کعبہ کی طرف ادا ہوئیں، اسی لئے اس مسجد کو "مسجد قبلتین" دو قبلوں والی مسجد کہا جانے لگا۔

علی بن ابراہیم قمیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اس سے مشابہ ایک حدیث ذکر کی ہے لیکن اس میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بابت مذکور ہے کہ آپؐ قبلہ کی تبدیلی کے وقت "مسجد بنی سالم" میں نماز ادا کر رہے تھے۔

امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی

تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؐ نے آیت مبارکہ "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ "قبلہ رخ ہو جاؤ اور قبلہ سے منہ نہ پھیرو ورنہ تمہاری نماز باطل ہو جائے گی"۔ کیونکہ خداوند عالم نے یہ حکم اس وقت نازل فرمایا جب آنحضرتؐ فریضۂ نماز ادا کر رہے تھے اور ان سے مخاطب ہو کر واضح الفاظ میں دستور دیا: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔

متعدد بلکہ کثیر روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم اس وقت نازل ہوا جب پیغمبر اسلامؐ فریضہ نماز ادا کر رہے تھے (نہ کہ نافلہ نماز)۔

اوصاف نبیؐ واصحاب نبیؐ

تفسیر قمی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؐ نے آیت مبارکہ "اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ یہ آیت یہودیوں اور نصرانیوں کے بارے میں ہے کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اس لئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا (جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ اسے (رسول خداؐ کو) اس طرح بخوبی جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) کیونکہ خداوند عالم نے تورات وزبور وانجیل میں آنحضرتؐ کے اوصاف، آپؐ کے اصحاب کی نشانیاں اور ہجرت کے واقعہ کا تذکرہ فرمایا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں ہوا۔ "محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم تريهم ركعاً سجداً يبتغون فضلاً من الله و رضواناً سيماهم في وجوههم من اثر السجود

ذلك مثلهم فی التوراة و مثلهم فی الانجیل" (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں آپ انہیں رکوع و سجود میں دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے فضل و کرم اور رضا و خوشنودی کے خواہاں ہوتے ہیں ان کی نشانی ان کی پیشانیوں میں پائے جانے والے نشاناتِ سجدہ ہیں یہی ان کی مثال تورات میں بھی ہے اور انجیل میں بھی)۔ یہ اوصافِ نبیؐ اور اوصاف اصحابِ نبیؐ تورات میں مذکور ہیں اسی وجہ سے جب خداوندِ عالم نے آنحضرتؐ کو مبعوث فرمایا تو اہل کتاب آپؐ کو پہچان گئے جیسا کہ ارشاد ہوا: "فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ" (پس جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی (پیغمبر خداؐ) کہ جسے وہ پہچان گئے تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا)۔

اسی طرح کی ایک حدیث کافی میں امیر المؤمنین امام علیؑ کے حوالہ سے مذکور ہے۔

شیعہ کتب میں کثرت کے ساتھ یہ روایات مذکور ہیں کہ آیتِ مبارکہ "اَیۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیۡعًا" حضرت امام زمانہ قائم آل محمدؐ کے اصحاب اور ساتھیوں کے بارے میں ہے' بعض روایات میں ہے کہ اس آیت سے اصحاب امام زمانہؑ مراد لینا "تطبیق و جری" کے باب سے ہے۔ جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

اہل سنت کے حوالہ سے ایک روایت میں حضرت علیؑ کا یہ قول منقول ہے کہ آپؑ نے آیت "وَ لِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡكُمۡ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: نعمت کے پورا ہونے سے مراد دینِ اسلام پر عقیدہ رکھتے ہوئے اس دنیا سے جانا ہے۔ (تا دمِ مرگ مسلمان رہنا ہی کمال نعمت سے عبارت ہے)۔

اسی طرح اہل سنت ہی کے حوالہ سے ایک حدیث میں مذکور ہے کہ نعمت کے پورا ہو جانے سے مراد بہشت میں داخل ہونا ہے۔

ایک علمی بحث

سمتِ قبلہ کے تعین کی تحقیق

اسلام میں سمت قبلہ کے تعین کا مسئلہ اس لئے پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی اہم ترین عبادت یعنی نماز میں قبلہ رخ ہونا ضروری ہے اسی طرح جانور ذبح کرتے وقت بھی اسے قبلہ رخ کرنے کا حکم ہے اس کے علاوہ دیگر مسائل بھی ہیں جن میں قبلہ رخ ہونا ملحوظ ہوتا ہے لہٰذا صدرِ اسلام ہی میں قبلہ کی سمت کے تعین کی بابت اہل اسلام نے اپنی کاوش بروئے کار لانا شروع کر دی تھی تا کہ اس کا صحیح تعین ہو سکے چنانچہ ابتداء میں ظن و تخمین (گمان اور نامکمل اندازہ و خیال) سے قبلہ کی سمت کا تعین کیا جاتا تھا مگر بعد میں روزمرہ کی ضرورتوں اور مسئلہ کی بھرپور اہمیت کے پیش نظر مسلمان دانشوروں اور علم حساب و ریاضی کے

ماہرین نے اس سلسلہ میں علمی تحقیق کے ذریعے صحیح سمت معلوم کرنے کے لئے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں، چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے ان جغرافیائی نقشوں سے استفادہ کیا جو ملکوں اور شہروں کے طول وعرض کی تشخیص و تعین کے لئے بنائے جاتے ہیں اور ان کی مدد سے ہر شہر و علاقہ کے لئے قبلہ کی سمت متعین کر دی اور وہ اس طرح کہ کسی شہر یا ملک کا طول وعرض معلوم کر کے علم مثلث اور علم ہیئت کی روشنی میں اس ملک اور مکہ مکرمہ کی سمت اور خط نصف النہار کے درمیان درجہء انحراف معلوم کیا، پھر اسی معیار پر تمام اسلامی ممالک میں درجہء انحراف کا تعین کرنے کے لئے مشہور زمانہ تقویم ہندی سے مدد لی جو کہ خط نصف النہار کے تعین کا رائج العام ذریعہ تھی، اس کے بعد درجہء انحراف کی مقدار کا تعین کرتے ہوئے ہر ملک و علاقہ کے لئے سمت قبلہ کا تعین کر لیا۔

پھر انہوں نے اس عمل یعنی سمت قبلہ کے تعین کی بابت آسانی وسرعت پیدا کرنے کے لئے ''قطب نما'' سے استفادہ کیا کیونکہ اس کی سوئی سے شمال وجنوب کی سمتوں کا تعین ہوتا ہے۔ اس طرح ''قطب نما'' نے تقویم ہندی کی جگہ لے لی لہٰذا قطب نما کے ذریعے کسی مقام کا مکہ مکرمہ سے درجہء انحراف معلوم کرنے کے بعد سمت قبلہ کا تعین آسان ہو گیا۔

سمت قبلہ کے تعین کی بابت ان دانشوروں کی یہ مساعیء جمیلہ یقیناً قابل قدر و لائق تحسین ہیں اور خدا سے دعا ہے کہ وہ انہیں اس عمل کی جزائے خیر عطا فرمائے لیکن یہ کاوشیں دونوں صورتوں میں اشتباہات اور فنی نقائص سے مبرا نہ تھیں یعنی جغرافیائی نقشوں کی مدد سے درجہء انحراف سے آگاہی حاصل کرنا اور قطب نما سے استفادہ کرتے ہوئے خط نصف النہار کے تعین کے بعد سمت قبلہ کا تعین کرنا دونوں میں علمی محاسبات کے حوالہ سے خامیاں پائی جاتی تھیں، مزید وضاحت کے لئے درج ذیل مطالب ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی صورت یعنی جغرافیائی نقشوں کی مدد سے درجہء انحراف سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے سمت قبلہ کا تعین اس لحاظ سے درست ثابت نہ ہوا کہ بعد میں آنے والے ریاضی دانوں اور جغرافیہ کے ماہرین نے اس سلسلے میں بھرپور تحقیق و مطالعہ کرنے کے بعد فنی حوالوں سے ثابت کیا کہ سابقہ ریاضی دان محققین علاقوں کے جغرافیائی حساب میں طول بلد کی بابت غلط فہمی کا شکار ہوئے جس کی وجہ سے درجہء جھکاؤ کے حساب میں غلطی واقع ہو گئی جو کہ سمت کعبہ کے تعین میں غلطی کا سبب بنی، دراصل وجہ یہ تھی کہ وہ کسی علاقہ کے جغرافیائی عرض کے تعین کے لئے قطب شمالی کی بلندی کو معیار قرار دیتے تھے جو کہ کسی مقام کے جغرافیائی عرض کے تعین کا بہترین ذریعہ وطریقہ اور کسی حد تک درست روش تھی لیکن کسی مقام کے جغرافیائی طول ''طول بلد'' کے تعین کے لئے جو کہ سمتِ قبلہ کے تعین میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے ان کے پاس کوئی ٹھوس ذریعہ اور موزوں طریقہ نہ تھا کیونکہ طول بلد کا تعین دو مقامات کے درمیان جغرافیائی فاصلہ کی مقدار کے تعین پر منحصر ہے لہٰذا اس مقصد کے لئے ان حضرات کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ آسمانی حوادث وسماوی واقعات مثلاً سورج گرہن، چاند گرہن وغیرہ، کی روشنی میں اس کا تعین کریں یعنی یہ دیکھا جاتا تھا کہ کسی ایک مقام پر سورج گرہن یا چاند گرہن کس وقت واقع ہوا اور اس کے کتنے وقفہ کے بعد دوسری جگہ پر اس کا مشاہدہ کیا گیا تاہم یہ سب کچھ اس دور میں موجود آلات و وسائل کے ذریعے معلوم کرنا نہایت

دشوار تھا اور ان قدیم آلات کے ذریعے اس حساب و کتاب اور علمی محاسبات کی باریکیوں سے آگاہی حاصل کرنا آسان نہ تھا لیکن سائنسی آلات تحقیق اور ذرائع ابلاغ عامہ میں ترقی کی وجہ سے یہ عمل آسان تر ہوتا چلا گیا مگر اس کے باوجود سمتِ قبلہ کے تعین کے لئے صحیح طریقہ ءکار کی ایجاد کی ضرورت اپنے مقام پر باقی رہی، بالآخر مشہور محقق اور بلند پایہ عالم دین شیخ حیدر علی المعروف سردار کابلی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں غیر معمولی کاوش بروئے کار لائی اور علوم جدیدہ کی روشنی میں مختلف مقامات کے درجہء جھکاؤ کا حساب لگایا' انہوں نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام ''تحفۃ الاجلہ فی معرفۃ القبلہ'' بھی تحریر فرمائی۔ یہ ایک اعلیٰ ترین تالیف ہے جس میں انہوں نے کسی مقام میں سمت قبلہ کے تعین کے طریقوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مختلف مقامات پر سمت قبلہ کے تعین کے لئے نقشہ جات بھی پیش کئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مساعی ءجمیلہ کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے، ان کی تحقیقی کاوش کے نتیجہ میں یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مسجد نبویؐ کے محراب کی سمتِ قبلہ درست ہے اور اس کا درست سمت میں واقع ہونا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظیم کرامت کا واضح ثبوت ہے کہ جو محقق سردار کابلیؒ کی تحقیقات اور علمی کاوش کے بعد آشکار ہوئی ہے، اسی سے مسجد نبویؐ کے محراب میں سمتِ قبلہ کے تعین کی طویل ترین بحث اپنے نتیجہ تک پہنچ گئی اور وہ یوں کہ جب قرونِ اولیٰ کے مسلمان محققین نے مدینہءمنورہ کے محلِ وقوع کا حساب لگایا تو انہوں نے اسے ۲۵ ڈگری شمالی عرض بلد اور ۷۵ ڈگری ۲۰ منٹ طول بلد پر واقع پایا جبکہ مسجد نبویؐ کے محراب کی سمت قبلہ اس حساب سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لہٰذا علماء دین اس سلسلہ میں نہایت تحیر کا شکار ہو گئے اور مسجد النبویؐ کے محراب کی سمتِ قبلہ کے تعین کی بابت بحث و تحقیق کا وسیع سلسلہ شروع ہو گیا اور انہوں نے اس انحراف کی کئی توجیہات و تاویلات بھی پیش کیں لیکن ان میں سے کوئی صورت بھی حقیقت پر مبنی نہ تھی یہاں تک کہ سردار کابلی رحمۃ اللہ علیہ نے مخصوص علمی تحقیق کے بعد واضح طور پر ثابت کر دیا کہ مدینہءمنورہ کا محل وقوع ۲۴ درجہ ۵۷ منٹ عرضِ بلد اور ۳۹ درجہ ۵۹ منٹ طولِ بلد ہے، نیز یہ کہ مکہءمکرمہ کی طرف درجہء جھکاؤ تقریباً صفر درجہ ۴۵ منٹ ہے' اس طرح مسجد نبویؐ کے محراب کی سمت قبلہ کی درستگی واضح طور پر ثابت ہوگئی اور اس حساب کے بعد حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور معجزہ سامنے آ گیا اور وہ یوں کہ جس سمت میں آنحضرتؐ نے تبدیلیء قبلہ کے وقت رخ کیا تھا وہ درست ثابت ہوئی کیونکہ آنجنابؐ نے حالت نماز میں اپنا رخ اس طرف (جانب کعبہ) موڑا تھا اور بعد میں فرمایا: کہ جبریلؑ نے میرا ہاتھ پکڑ کر میرا رخ کعبہ کی طرف کر دیا ہے' حق یہی تھا جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے فرمایا تھا۔

اس کے بعد مشہور ریاضی دان عبدالرزاق بغائری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور انہوں نے دنیا کے اکثر خطوں و علاقوں کی سمتِ قبلہ کا حساب لگایا اور اس کا تعین کر دیا چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں قبلہ کی پہچان کے عنوان سے ایک رسالہ بھی لکھا جس میں دنیا کے اکثر مقامات میں سمتِ قبلہ کی نشاندہی کی ان کے ایجاد کردہ نقشہ جات ۱۵۰۰ علاقوں کی سمت قبلہ کا تعین پیش کرتے ہیں' اس طرح سمت قبلہ سے متعلق پروردگارِ عالم کی عنایت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

اب رہی دوسری صورت یعنی قبلہ نما کے ذریعے سمتِ کعبہ کا تعین' تو اس سلسلہ میں محققین کے نزدیک یہ بات پایہء

ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ زمین کے مقناطیسی اقطاب اس کے جغرافیائی اقطاب سے مماثلت نہیں رکھتے یعنی قطب نما کے ذریعے قطب شمالی وجنوبی کی سمتیں جغرافیائی سمتوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ اقطاب مقناطیسی، امتدادِ زمانہ میں بدلتے رہتے ہیں اور مقناطیسی قطب شمالی اور جغرافیائی قطب شمالی کے درمیان تقریباً ایک ہزار میل کا فاصلہ واقع ہو جاتا ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ اس صورت میں قطب نما کے ذریعے صحیح سمت قبلہ معلوم نہیں ہو سکتی بلکہ کئی مقامات میں درجۂ انحراف اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' البتہ اس مشکل کے حل کے لئے دور حاضر کے ماہر ریاضی دان جناب حسین رزم آراء نے ۱۳۳۲ ہجری شمسی میں بیڑا اٹھایا اور انہوں نے مختلف مقامات پر مقناطیسی اور جغرافیائی اقطاب کے درمیان فاصلہ کے فرق کا حساب لگایا اور تقریباً ایک ہزار شہروں وعلاقوں میں مقناطیسی قطب کی طرف قبلہ کے درجۂ جھکاؤ کو متعین کر دیا اور اس حساب وکتاب اور علمی محاسبہ کی بنیاد پر انہوں نے ایک قطب نما ایجاد کیا جس سے نہایت آسانی کے ساتھ صحیح سمتِ قبلہ کا تعین ممکن ہو جاتا ہے' یہ قطب نما دورِ حاضر میں اسلامی دنیا میں عام طور استعمال ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعیٔ جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور انہیں اس علمی کاوش پر جزائے خیر مرحمت کرے۔

ایک اجتماعی ومعاشرتی بحث

جو شخص انسانی معاشرہ سے تعلق رکھنے والے امور اور معاشرتی مسائل کے مخصوص پہلوؤں اور اثرات کی بابت غور وفکر کرے وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے گا اور کسی شک وشبہ کا شکار نہ ہوگا کہ معاشرہ کی اصل واساس اور اس کے گوناگوں شعبوں کی بنیاد صرف انسانی طبیعت ہے اور معاشرے کی تمام خصوصیات وآثار اسی سے وابستہ ہیں کیونکہ اس نے فطری و خدائی الہام کے ذریعے اس امر کو بھانپ لیا ہے کہ اس کی بقاء واستحکام کے حصول اور ترقی وکمال کے مراحل طے ہونے کا راز اجتماعی افعال اور باہمی تعاون میں مضمر ہے اسی ادارک نے اسے معاشرہ کی تشکیل کے ضروری عمل کی راہ پر گامزن کیا ہے تا کہ وہ اپنے تمام افعال اور حرکات وسکنات کو معاشرہ کی پرورش وتربیت کے تقاضوں سے ہم آہنگ وہمرنگ کر سکے۔ پھر اس نے اپنے علوم اور ذہنی ادراکات وافکار کی مدد سے اپنی مادی احتیاجات اور ضرورتیں بدنی قوتوں کو بروئے لا کر پورا کرنے کی راہ نکالی، تاہم جو چیز ان علوم اور ذہنی افکار کو ظاہری افعال سے مربوط کرتی ہے وہ افعال کی جہات اور ان کے علل واسباب ہیں مثلاً کسی کام کے اچھا اور برا ہونے کا عقیدہ اور اسی طرح کسی کام کے انجام دینے کا ضروری و مناسب ہونا ان دونوں امور یعنی ذہنی ادراکات اور ظاہری افعال (فکر وعمل) میں باہمی ربط کو جنم دیتا ہے اور اسی ربط کی بنیاد پر ذہنی افکار کو عملی صورت مل جاتی ہے۔ اسی طرح دیگر تمام معاشرتی اصولوں اور بنیادوں کا معاملہ ہے کہ وہ بھی اسی طبیعت انسانیٔ کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں مثلاً ریاست ومرؤسیت، حاکم ورعایا ہونے کا عنوان، مالکیت واختصاص، مشترکہ اور

مخصوص معاملات، قوموں، علاقوں اور حالات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف طبائع و آداب و رسوم اور معاشرتی عادات اور ان کے اثرات وغیرہ سب ہی طبع انسانی کی پیداوار ہیں کہ اس نے خدائی الہام والقاء سے بہرہ ور ہوکر ان امور کو جنم دیا تا کہ اپنے مطلوبہ مقاصد کو ظاہری وجود میں لاسکے اور پھر فعل و ترک اور طلب کمال کے عملی راستوں پر گامزن ہوکر ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوسکے۔

اس تمہیدی بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ہم چاہیں کہ خدا کی عبادت اور اس کے حضور اظہار بندگی ۔۔جبکہ خدا کی ذات تمام مادی خصوصیات سے پاک و منزہ اور مادی حواس کی رسائی سے ماوراء ہے۔۔دل و ضمیر کی حدود سے گزر کر افعال کے دائرے میں آ جائے (اعتقاد کے مرحلہ سے عمل کے مقام میں آ جائے)۔۔دل کی عبادت کے ساتھ ساتھ بدن کی عبادت بھی انجام پائے۔۔جبکہ افعال کا محور مادی کیفیات ہی ہیں تو اس صورت میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ تمثیل یعنی مخصوص شکلیں (عملی انداز) اختیار کرنے کی راہ پر چلا جائے اور وہ یوں کہ قلبی توجہات کو ان کی مختلف خصوصیات کی روشنی میں مدنظر قرار دے کر ان کے اظہار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گوناگوں مخصوص عملی شکلیں اختیار کی جائیں مثلاً خضوع وخشوع اور اظہار عجز کے لئے سجدہ کی صورت، معبود کی تعظیم واحترام کے لئے رکوع کی صورت وغیرہ اختیار کی جائے البتہ ان تمام صورتوں میں یہ بنیادی نکتہ ملحوظ رہے کہ ایک بندے کے اظہار بندگی وعبودیت کی اصل روح اس کی قلبی توجہ والتفات ہے کہ اس کے بغیر عبادت وبندگی کی کوئی حقیقت وحیثیت ہی نہیں اور یہ قلبی توجہ والتفات ہی ہے کہ جس کے اظہار کے لئے اور عبادت کو معراج کمال اور روحِ ثبات عطا کرنے کے لئے گوناگوں عملی صورتوں کا اختیار کرنا ناگزیر ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بتوں، ستاروں اور دیگر اجسام مثلاً انسان وغیرہ کی پوجا کرنے والے افراد اپنے معبودوں اور خداؤں کی عبادت و پرستش کرنے کے لئے ان کی طرف رخ کرتے تھے اور ان کے نزدیک یا سامنے کھڑے ہو کر ان کے حضور آداب بندگی بجالاتے تھے لیکن ادیانِ الٰہی بالخصوص دین اسلام نے جو کہ تمام سابقہ ادیان کی تصدیق کرتا ہے اور ہر طرح کے شرک وبت پرستی کی ممانعت کرتا ہے لوگوں کو مادی خصوصیات سے پاک ومنزہ معبود برحق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اپنی قلبی توجہات کے اظہار کے لئے بدنی عبادات میں کعبہ کو قبلہ قرار دیتے اور حالتِ نماز میں اس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا اور تاکید کی کہ مسلمان دنیا کے جس خطہ میں بھی ہو نماز کو کہ جس کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہے کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا کرے، اور یہ بھی حکم دیا کہ مخصوص حالات مثلاً بیت الخلاء میں رفع حاجت کے دوران قبلہ کی جانب منہ یا پشت نہ کرے، اسی طرح بعض حالات میں قبلہ رخ ہونا مستحب قرار دیا اور یہ سب اس لئے کیا کہ انسان کی قلبی توجہ خانہء خدا کی طرف رہے اور وہ اپنے پروردگار کو اپنی خلوت وجلوت، قیام وقعود، اٹھتے بیٹھتے، نیند و بیداری کی حالتوں، عبادت واطاعت اور یہاں تک کہ اپنی معمولی سے معمولی کیفیت وحالات میں بھی فراموش نہ کرے، یہ تو ہے ایک فرد کی انفرادی قلبی توجہ کا مسئلہ اور جہاں تک اجتماعی ومعاشرتی توجہ کی بات ہے تو اس میں قلبی توجہات کے لئے قبلہ رخ ہونے کا معاملہ نہایت واضح اور اس

کی اہمیت ہر لحاظ سے آشکار ہے کیونکہ اس میں تمام لوگوں کا زمان و مکان کے مختلف ہونے کے باوجود ایک ہی نقطہ کی طرف متوجہ ہونا ان کے درمیان اتحاد و وحدت' فکری ہم آہنگی' باہمی روابط اور دلوں کے ایک دوسرے کے قریب تر ہونے کا ذریعہ ہے اور یہ ایک ایسی پاکیزہ ولطیف روح ہے کہ جسے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے مادی و معنوی تمام حالات و امور میں پھونکا جاسکتا ہے' اسی سے انسانی معاشرے کو بلند ترین مقام و مرتبہ اور لوگوں کے درمیان اتحاد و یک جہتی کی نعمت سے مالا مال کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی عظیم نعمت ہے جو خداوند عالم نے اپنے مسلمان بندوں کو عطا فرمائی اور اسے ان کے درمیان دینی وحدت وعزت کا ذریعہ بنا دیا چنانچہ اسی کے نتیجہ میں آج اہل اسلام میں اپنے درمیان پائے جانے والے تمام تر اختلافات' گروہ بندیوں اور فرقہ پرستیوں کے باوجود اور اس کے باوجود کہ دو مسلمان بھی کسی ایک نظریہ ورائے پر متفق نہیں لیکن قبلہ کے حوالہ سے ان میں اتحاد پایا جاتا ہے' ہم خدا کی اس عظیم نعمت پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور ہر حال میں اس کی نعمتوں کے شاکر ہیں۔

آیت ۱۵۲

○ فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

ترجمہ

○ پس تم مجھے یاد کرو تاکہ میں تمہیں یاد کروں اور میرا شکر ادا کرو، میری نعمتوں کا کفران نہ کرو۔ (۱۵۲)

تفسیر و بیان

خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کو اپنی خاص عنایت سے بہرہ ور کرتے ہوئے آنحضرتؐ کو جو کہ خود انہی مسلمانوں میں سے تھے ان کی طرف نبی بنا کر بھیجا اور یہ ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس کا اندازہ وشمار نہیں ہوسکتا اور یہ کئی دیگر نعمتوں کا سبب بنی، اس نعمت کا عطا کرنا خدا کا اپنے بندوں کو یاد رکھنے سے عبارت ہے کیونکہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کو سیدھے راستہ کی ہدایت ورہنمائی کرنے اور انہیں کمالات کی بلندیوں تک پہنچانے کی بابت کبھی فراموش نہیں کیا چنانچہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث بہ رسالت فرمانا اور پھر اس پر مزید یہ کہ اپنے گھر کو اہل اسلام کے لئے قبلہ قرار دینا جو کہ ان کی عظمت بندگی' کمال دین' یکتا پرستی اور دینی ومعاشرتی فضیلت کے استحکام کا سبب وذریعہ ہے یہ سب کچھ اس امر کی دلیل ہے کہ خدا نے ہمیشہ اپنے بندوں کو یاد رکھا ہے، لہٰذا زیر نظر آیت (۱۵۲) میں خدا نے مذکورہ دو نعمتوں (بعثت نبویؐ یعنی آنحضرتؐ کو نبی بنا کر بھیجنا اور کعبہ کو قبلہ قرار دینا) کے بعد اہل اسلام کو اپنا ذکر اور اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی دعوت دی تا کہ وہ بھی انہیں یاد رکھے اور ان کی طرف سے بندگی واطاعت کے نتیجہ میں ان پر اپنی نعمتیں فراوان کردے اور جب وہ اس کی نعمتوں کا کفران نہ کریں بلکہ ان پر اس کے شکر گزار ہوں تو انہیں مزید نعمتیں عطا فرمائے' اس سلسلے میں یوں ارشاد ہوا۔

سورہ ء کہف، آیت ۲۴:

O "وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَى أَنْ يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَذَا رَشَدًا"

(اور یاد کر اپنے پروردگار کو جب تو بھول جائے اور کہہ کہ عنقریب میرا پروردگار مجھے اس سے بہتر ہدایت کرے گا)۔

سورہ ء ابراہیم، آیت ۷:

O "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ"

(اگر تم شکر ادا کرو تو میں تمہیں زیادہ عطا کروں گا)۔

یاد رہے کہ یہ دونوں آیتیں (سورہ ء کہف، ۲۴، سورہ ء ابراہیم، ۷) سورۂ بقرہ میں مذکور "آیت قبلہ" سے پہلے نازل ہوئیں۔

ایک قابل توجہ نکتہ:

اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ لفظ ''ذکر'' دو چیزوں کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے: ایک غفلت' دوسری نسیان' ملاحظہ ہو۔

غفلت کے حوالہ سے ذکر کی مثال:

سورہ ء کہف، آیت ۲۸:

O ''وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا'' ۔

(اس شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے)۔

اس آیت میں ''ذکر'' بمقابلہ ''غفلت'' استعمال کیا گیا ہے۔ ''غفلت'' سے مراد اپنے علم و آگاہی سے ناآگاہی ہے یعنی اپنے ''جاننے'' کو ''نہ جاننا'' غفلت کہلاتا ہے جبکہ اس کے برعکس ''ذکر'' ہے جس سے مراد ''جاننے'' کو ''جاننا'' ہے۔

نسیان کے حوالہ سے ذکر کی مثال:

سورہ ء کہف، آیت ۲۴:

O ''وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ''

(اور جب بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کرو)۔

اس آیت میں ''ذکر'' بمقابلہ ''نسیان'' آیا ہے' نسیان سے مراد یہ ہے کہ صورتِ علم، لوحِ ذہن سے مٹ جائے جبکہ ''ذکر'' اس کے برعکس ہے اور اس سے مراد صورتِ علم کا صفحہء ذہن پر باقی رہ جانا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت (وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ) میں ذکر بمقابلہ نسیان اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ان دونوں میں ایک دوسرے کے متقابل معانی پائے جاتے ہیں بنا بر ایں اس طرح کے استعمالات میں ''ذکر'' اور ''نسیان'' کے الفاظ ایسے موارد و مقامات میں بھی استعمال ہوتے ہیں جہاں خود ان کی بجائے ان کے خواص و آثار پائے جاتے ہوں مثلاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ یہ جانتے ہوئے کہ آپ کے نہایت مخلص و قریبی دوست کو آپ کی طرف سے مدد کی ضرورت ہے لیکن آپ اس کی مدد نہیں کرتے تو آپ سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے اسے بھلا دیا ہے حالانکہ آپ نے اُسے بھلایا نہیں ہوتا بلکہ آپ تو ہر وقت اس کی یاد میں رہتے ہیں اس کے باوجود اس کی بابت آپ سے یہ کہنا کہ آپ نے اسے بھلا دیا ہے دراصل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ نسیان یعنی بھولنے کے آثار پائے جاتے ہیں گویا آپ کے دل میں اس کی یاد (ذکر) بے اثر ثابت ہوئی بلکہ اس کے برعکس نتیجہ ظاہر ہوا لہٰذا ایسے مقام پر یہ کہنا درست ہوگا کہ گویا آپ نے اسے یاد ہی نہیں کیا۔ اسے بھلا دیا ہے' یہی صورتِ حال لفظ ''ذکر'' کی ہے

کہ اس کا استعمال اس کے آثار کے حوالہ سے ہوتا ہے۔ بنابراین لفظ ''ذکر'' کا استعمال زبان سے کئے جانے والے ذکر کے لئے بھی اسی باب سے ہے یعنی اثر و نتیجہ کے حوالہ سے ہے نہ کہ خود اس کے اپنے وجود کے حوالہ سے' کیونکہ زبان سے کیا جانے والا ذکر در حقیقت قلبی ذکر کے آثار میں سے ہے جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد الٰہی ہے:

سورہء کہف، آیت ۸۳:

○ ''قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا''

(کہہ دیجئے کہ میں عنقریب تمہارے سامنے خدا کی طرف سے ''ذکر'' کی تلاوت کروں گا)۔

قرآن مجید میں اس طرح کی کئی مثالیں موجود ہیں، لیکن اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ زبان سے کیا جانے والا ذکر بھی حقیقی معنی میں ''ذکر' ہے نہ کہ اس کے آثار میں سے ہے تب بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ زبانی ذکر حقیقی ذکر کے مراتب میں سے ایک ہے (اس کی ایک قسم ہے) کیونکہ عام طور پر ''ذکر'' کا استعمال اسی کے لئے ہوتا ہے'

بہرحال ''ذکر'' کئی مختلف مراتب کا حامل ہے جیسا کہ درج ذیل آیات مبارکہ سے بھی ظاہر ہے:

سورہء رعد، آیت ۲۸:

○ ''اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ''

(یاد رکھو، اللہ کے ذکر سے دل مطمئن ہوتے ہیں)۔

سورہء اعراف، آیت ۲۰۴:

○ ''وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ''۔

(اپنے پروردگار کو یاد کر اپنے دل میں' عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ' اور آہستہ بول کر')

سورہء بقرہ، آیت ۲۰۰:

○ ''فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا''

(پس خدا کو یاد کرو اس طرح سے جیسے تم اپنے آباء کو یاد کرتے ہو یا اس سے بھی زیادہ)

اس آیت میں ''اَشَدَّ ذِكْرًا'' کے الفاظ سے ذکر کے لئے شدت کی نسبت بیان کی گئی ہے حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ زبانی ذکر میں شدت و ضعف کی نسبت ہی نہیں پائی جاتی یہ تو قلبی و باطنی ذکر کی کیفیتیں ہیں لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ یہاں ''قلبی ذکر'' مقصود ہے۔

سورہء کہف، آیت ۲۴:

○ ''وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا''۔

(اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے' اور کہو کہ عنقریب میرا رب مجھے اس سے بہتر ہدایت کرے گا)۔

اس آیت کے آخری الفاظ (وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ.......) سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کی امید دلائی گئی

ہے وہ موجودہ مقام و مرتبت (ذکر) سے بلند و اعلیٰ ہے' گویا آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تو ذکرِ خدا کے مراتب میں سے ایک مرتبہ تنزل کرے' نیچے کو آئے' اور نچلے مرتبہ تک پہنچے کہ وہی "نسیان" کا مرتبہ ہے (یعنی ذکرِ خدا کے بلند و عالی مقام و مرتبہ سے تنزل کرنا ہی "نسیان" ہے) لٰہذا اپنے رب کو یاد کر' اس کا ذکر کر' اور اس کے ذکر کے ذریعے اپنے پروردگار کے قرب اور اس کے نزدیک اعلیٰ مقام و منزلت کے حصول کی امید رکھ۔

(یہاں نسیان کے حوالہ سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ اولاً یہ آیت مبارکہ دیگر آیات کی طرح عمومی ضابطہ کو بیان کرتی ہے کہ جس میں آنحضرت سمیت تمام افرادامت شامل ہیں اور ثانیاً یہ کہ عمومی قانون کے بیان سے ہرگز یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ اسے کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے کی بناء پر قرار دیا گیا ہے بلکہ ممکنہ صورت اور مفروضہ حالت کی بناء پر بھی ایسا ہوتا ہے چنانچہ اکثر احکام وقوانین اسی طرح ہیں اور ثالثاً یہ کہ اس طرح کے موارد میں ضروری نہیں ہوتا کہ مخاطب اور مراد دونوں، ایک ہو جیسا کہ اکثر آیات میں ظاہری خطاب حضرت پیغمبر اسلامؐ سے ہے جبکہ اس سے مراد افرادامت ہیں ۔م)

اس آیت سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ "قلبی ذکر" بھی مراتب و مدارج رکھتا ہے۔ اس طرح "ذکر" کے بارے میں یہ قول بھی درست قرار پائے گا کہ "ذکر" سے مراد دل میں حقیقت کا جلوہ گر ہونا ہے' کیونکہ "حضور" اور جلوہ گر ہونا مختلف مراتب کا حامل ہوتا ہے۔

ایک اہم نکتہ

زیر بحث آیت مبارکہ کی ابتداء میں ارشاد ہوا ہے "فاذکرونی" (تم مجھے یاد کرو) یہ فعل امر ہے اور اس کے ساتھ متکلم کی یاء لگائی گئی ہے۔ اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ "تم مجھے یاد کرو"! اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) یہ جملہ "مجھے یاد کرو" مجازی طور پر کہا گیا ہے کیونکہ "دل میں خدا کو جلوہ گر کرنا" عملی حقیقت نہیں رکھتا لٰہذا اس سے مراد یہ ہے کہ "میری نعمتوں کو یاد کرو"۔

(۲) یہ الفاظ مجازی طور پر نہیں کہے گئے بلکہ حقیقی معنے میں ذکر کئے گئے ہیں تو آیت سے یہ ثابت ہوگا کہ انسان کا علم اس "علم" سے مختلف ہے جس کی تعریف ہم ان الفاظ میں کرتے ہیں "کسی چیز کی صورت کا لوحِ ذہن پر ثبت ہونا اور اس کے مفہوم سے آگاہی پانا" یعنی جب ہم کسی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں چیز کا عالم ہے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس چیز کی صورت اور اس کا مفہوم اس کی لوحِ ذہن پر ثبت ہو چکا ہے' علم کی یہ تعریف اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جس چیز کی صورت و مفہوم کے لوحِ ذہن پر ثبت ہو جانے کی بات ہوئی ہے اسے اس شخص (عالم) کے دائرۂ ذہن میں محدود کر دیا گیا ہے اور اس کی توصیف ایک "معلوم" (جس کا علم حاصل ہوا ہے) کے طور پر ہوئی ہے۔ یعنی اس عالم نے اس چیز کو اپنے دائرۂ ذہن میں محدود کر دیا ہے لٰہذا اب وہ چیز اس شخص (عالم) کی "معلوم" کہلاتی ہے اور جہاں تک خدا کا تعلق ہے تو وہ ایسا نہیں کہ اسے کسی کا "معلوم" کہا جاسکے یا کوئی اس کی توصیف کر سکے' اس کی ذاتِ مقدسہ توصیف کرنے والوں کے بیان و

اظہار کی کیفیتوں اور صورتوں سے ماوراء ہے کوئی اس کی توصیف نہیں کرسکتا جیسا کہ اس نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے۔

سورہء صافات، آیت ۱۶۰:

O ”سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ“

(پاک ومنزہ ہے خدا اس توصیف سے جو عام لوگ کرتے ہیں سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے)۔

سورہء طہ، آیت ۱۱۰:

O ”وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا“۔

(اور وہ از روئے علم اس کا ادراک نہیں کرسکتے)

مذکورہ بالا دونوں آیتوں کی تفسیر کے مقامات میں مزید وضاحت پیش کی جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

روایات پر ایک نظر

”ذکر“ کی فضیلت کے بیان میں فریقین (شیعہ وسنی) کی روایات کثرت کے ساتھ موجود ہیں اور مختلف اسناد کے ساتھ مروی ہے کہ ”خدا کا ذکر ہر حال میں اچھا ہے“۔

ذکرِ خدا اور اس کا مقصد

کتاب ”عدۃ الداعی“ میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہوکر فرمایا: (ارتعوا فی ریاض الجنۃ)

بہشت کے باغات میں گھومو پھرو اور ان سے لطف اندوز ہو۔

اصحاب نے عرض کی یارسول اللہؐ: ریاض الجنۃ یعنی باغ بہشت سے مراد کیا ہے؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا: (مجالس الذکر ،اغدوا و روحوا واذکروا ومن کان یحب ان یعلم منزلته عند الله فلینظر کیف منزلة الله عنده ،فان الله تعالی ینزل العبد حیث انزل العبد الله من نفسه ،واعلموا ان خیر اعمالکم عند ملیککم وازکاها وارفعها فی درجاتکم وخیر ما طلعت علیه الشمس ذکر الله تعالی فانه اخبر عن نفسه فقال: انا جلیس من ذکرنی ،وقال تعالی :فاذکرونی اذکرکم بنعمتی ،اذکرونی بالطاعة والعبادة

اذ کر کم بالنعم والاحسان والراحۃ والرضوان،

("ان سے مراد مجالس ذکر ہیں (جہاں خدا کا ذکر ہوتا ہو) صبح وشام ان مجالس میں جاؤ اور "ذکر" کرو' جو شخص یہ جاننا چاہتا ہو کہ اس کا مقام و مرتبہ خدا کے نزدیک کیا ہے تو اسے چاہیے وہ یہ دیکھے کہ اس کے دل میں خدا کی محبت وعظمت کتنی ہے؟ کیونکہ خداوند عالم اسی مقام و منزلت کے مطابق اپنے بندے کے ساتھ سلوک کرتا ہے جو مقام و مرتبہ اور عظمت و منزلت بندے کے دل میں خدا کی بابت ہوتی ہے' یاد رکھو کہ تمہارے مالک (خدا) کے نزدیک تمہارے اعمال میں سے سب سے بہتر' سب سے پاکیزہ' تمہارے درجات کی بلندی کا سب سے بہتر ذریعہ اور ہر اس چیز سے بہتر جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے (پوری کائنات) خداوند عالم کا ذکر ہے اور اس نے خود ہی اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں ہر اس شخص کا ہم نشین ہوں جو میرا ذکر کرے اور اس نے فرمایا "فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ" تم میرا ذکر کرو، مجھے یاد رکھو تا کہ میں تمہیں یاد رکھوں' تم مجھے میری اطاعت وفرمانبرداری اور عبادت کے ذریعے یاد کرو تا کہ میں تمہیں اپنی نعمتیں عطا کر کے' احسان کر کے' راحت وآرام پہنچا کر اور اپنی رضا وخوشنودی کی نعمتوں سے نواز کر یاد کروں" ۔

ذکرِ الٰہی کا بلند مقام و مرتبہ

کتاب "المحاسن" (البرقی) اور "الدعوات" (راوندیؒ) میں مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے: (من شغل بذکری عن مسئلتی اعطیہ افضل ما اعطی من سالنی) جو شخص میرے ذکر میں اس طرح سرگرم ہو کہ مجھ سے اپنی حاجتیں بھی طلب نہ کرے تو میں اسے اس سے بھی بہتر عطا کر دوں گا جو میں حاجات طلب کرنے والے کو عطا کرتا ہوں۔

سب سے اہم فریضہء بندگی

کتاب معانی الاخبار میں حسین بزاز سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھ سے ارشاد فرمایا: کیا میں تجھے ایسا فریضہ بتاؤں جو خدا نے سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اپنی مخلوق پر عائد کیا ہے؟ میں نے عرض کی۔ جی ہاں ارشاد فرمائیے۔ امامؑ نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلا کام اپنی بابت لوگوں کے ساتھ انصاف سے پیش آنا ہے (یا اپنی طرف سے لوگوں کو انصاف دینا) یعنی ان کے ساتھ اس طرح سلوک کرنا جس طرح اپنے بارے میں ان سے سلوک کی توقع کرتے ہو' دوسرا کام اپنے مؤمن بھائی کے ساتھ نیکی واحسان کرنا اور تیسرا کام ہر مقام پر خدا کا ذکر کرنا' البتہ خدا کے ذکر سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ یہ کلمات وردزبان کئے جائیں "سبحان اللہ و الحمد للہ ولا الہ الا اللہ و اللہ اکبر" اگرچہ یہ کلمات بھی ذکر خدا کا مصداق ہیں لیکن میری مراد یہ ہے کہ ہر مقام پر خدا کو یاد رکھا جائے، جب اس کی اطاعت کا مقام ہو تو اسے یاد کر کے اس کی فرمانبرداری کا عملی ثبوت دیا جائے اور جب اس کی معصیت کا خدشہ ہو تو اسے یاد کر

کے اس کی نافرمانی سے اجتناب کیا جائے۔

مذکورہ بالا روایت میں جس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کئی دیگر اسناد سے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں بھی مذکور ہے اور بعض روایات میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے کہ یہ حکم اس آیت کے مطابق ہے۔ "الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَيِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ" (جب ان پر شیطانی گروہ غلبہ کرتا ہے تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں پھر وہ بینا و بابصیرت ہو جاتے ہیں)۔

حقیقی اولیائے الٰہی کے اوصاف

کتاب "عدة الداعی" میں مذکور ہے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(اذا علمت ان الغالب علیٰ عبدی الاشتغال بی ،نقلت شهوته فی مسئلتی و مناجاتی، فاذا کان عبدی کذلك، واراد ان یسهو حلت بینه و بین ان یسهو، اولئك الابطال حقاً ،اولئك الذین اذا اردت ان اهلك اهل الارض عقوبة زویتها عنهم من اجل اولئك الابطال)

خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے جب میرا کوئی بندہ اکثر میری یاد میں رہتا ہو تو میں اس کی شہوانی قوتوں کو بھی دعا و مناجات کی جانب پھیر دیتا ہوں اور جب میرا بندہ اس وصف کا حامل ہو جائے تو پھر میں اس کے سہو کی راہ میں آڑے آ جاتا ہوں جس کے نتیجہ میں وہ سہو نہیں کر پاتا' ایسے افراد ہی میرے حقیقی اولیاء اور چاہنے والے ہیں اور یہی حقیقی معنے میں بہادر و عظیم المرتبت ہیں اور یہی وہ بابرکت شخصیات ہیں جن کی وجہ سے میں اہل زمین کو سخت عتاب و عذاب سے بچا لیتا ہوں۔

ذکر خدا کا خدائی صلہ

کتاب "المحاسن" (البرقی) میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا کہ: خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

(یابن آدم اذکرنی فی نفسك اذکرك فی نفسی، یابن آدم اذکرنی فی خلاء اذکرك فی خلاء ،اذکرنی فی ملاء اذکرك فی ملاء خیر من ملائك،)

اے ابن آدم! تو مجھے اپنے دل میں یاد کرتا کہ میں تجھے اپنے تئیں یاد کروں' اے ابن آدم! تو مجھے اپنی خلوت میں یاد کرتا کہ میں تجھے خلوت میں یاد کروں' اے ابن آدم! تو مجھے جلوت میں' لوگوں کے سامنے یاد کرتا کہ میں تجھے اپنے ان افراد کے سامنے یاد کروں جو تیرے لوگوں (بنی آدم) سے بہتر ہیں اور فرمایا: جو بندہ عام لوگوں میں اللہ کو یاد کرے تو خدا فرشتوں کی پاکیزہ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہے۔

اس روایت میں مذکور مطلب فریقین، شیعہ وسنی کی کتب میں متعدد اسناد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

چار چیزیں اور چار چیزیں

تفسیر "درمنثور" میں مذکور ہے کہ طبرانی، ابن مردویہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا، حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: جس شخص کو چار چیزیں عطا کی جائیں اسے چار دوسری چیزیں بھی عطا کی جائیں گی اور اس کی وضاحت کتابِ الٰہی قرآن مجید میں اس طرح ہوئی ہے:

(۱) جس شخص کو خدا کے ذکر کی توفیق دی جائے اسے یہ نعمت عطا ہو گی کہ خدا اسے یاد کرے گا چنانچہ ارشاد ہوا: "فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ" (تم مجھے یاد کرو تا کہ میں تمہیں یاد کروں)۔

(۲) جسے دعا کی توفیق حاصل ہو اسے دعا کے مستجاب ہونے کی نعمت بھی عطا کی جائے گی چنانچہ ارشاد ہوا: "ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ" (تم مجھ سے دعا کرو تا کہ میں تمہاری دعا کو مستجاب کروں)۔

(۳) جسے شکر کرنے کی توفیق نصیب ہو اسے نعمتوں میں اضافہ کی نعمت عطا کی جائے گی چنانچہ ارشاد ہوا "لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" (اگر تم میرا شکر ادا کرو تو میں تمہیں مزید عطا کروں گا)۔

(۴) جسے استغفار (طلب مغفرت) کی توفیق عطا کی جائے اسے مغفرت کی نعمت سے نوازا جائے گا چنانچہ ارشاد ہوا۔ "اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا" (تم اپنے پروردگار کے حضور طلبِ مغفرت کرو کہ یقیناً وہی مغفرت کرنے والا ہے)۔

ذکر واطاعت الٰہی

تفسیر "درمنثور" ہی میں ہے کہ سعید بن منصور، ابن منذر اور بیہقی نے "شعب الایمان" میں خالد ابن ابی عمران سے روایت کی ہے اس نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

(من اطاع الله فقد ذکر الله وان قلت صلوٰته وصیامه وتلاوته للقرآن . ومن عصی الله فقد نسی الله وان کثرت صلواته وصیامه وتلاوته)

"جو شخص خدا کا اطاعت گزار ہو وہی خدا کا ذکر کرنے والا ہے خواہ اس کی نمازیں، روزے اور تلاوتِ قرآن کم ہی کیوں نہ ہو، اور جو شخص خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہو گویا اس نے خدا کو بھلا دیا ہے خواہ اس کی نمازیں، روزے اور تلاوتِ قرآن زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

تشریح وتوضیح:

اس حدیث میں اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ معصیت ونافرمانی کا ارتکاب غفلت ونسیان (خدا سے غافل ہوجانے اوراسے بھول جانے) کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ جوشخص معصیت ونافرمانی کی حقیقت سے آگاہ ہواور یہ جان لے کہ اس کے آثار ونتائج کیا ہیں وہ ہرگز اس کا مرتکب نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ جوشخص خدا کی نافرمانی کا ارتکاب کررہا ہواور اس حال میں اسے خدا کی یاد دلائی جائے مگر وہ نہ تو اس کی پرواہ کرے اور نہ ہی مقام پروردگار کو درخورِ اعتناء قرار دے ایسا شخص سرکش وجاہل اور خدا کی عظیم ذات اس کی کبریائی اوراس کی وسیع قدرت واقتدار سے ناآگاہ ہوتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی موجود ہے جسے تفسیر "درمنثور" میں ابوہندداری کے حوالہ سے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

(اذکرونی بطاعتی اذکرکم بمغفرتی ومن ذکرنی وھو مطیع فحق علی ان اذکرہ بمغفرتی ومن ذکرنی وھو عاص فحق علی ان اذکرہ بمقت)

اے میرے بندو! تم مجھے میری اطاعت وفرمانبرداری کے ذریعے یاد کروتا کہ میں تمہیں اپنی طرف سے مغفرت و بخشش کے ذریعے یاد کروں اور جوشخص اطاعت گزار بن کر مجھے یاد کرے تو میرے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ میں اسے اپنی مغفرت وبخشش کے ساتھ یاد کروں اور جوشخص مجھے معصیت کار بن کر یاد کرے تو میرا حق بنتا ہے کہ اپنے غیض وغضب کے ساتھ اسے یاد کروں (الحدیث) اس حدیث میں جو اہم نکتہ قابل توجہ ہے وہ معصیت کی حالت میں خدا کی یاد ہے کہ جسے آیت مبارکہ (وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ) اور دیگر روایات شریفہ میں "نسیان" سے تعبیر کیا گیا ہے' کیونکہ اس صورت میں "ذکر" کے آثار اس پر مرتب نہیں ہوتے' تاہم اس موضوع کی بابت دیگر مطالب عنقریب بیان کئے جائیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

آیات ۱۵۳ تا ۱۵۷

○ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

○ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

○ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ۙ

○ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ۭ

○ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ترجمہ

○ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو یقیناً خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے'' (۱۵۳)

○ ''جو لوگ خدا کی راہ میں قتل کر دیے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کے زندہ ہونے کو نہیں سمجھتے'' (۱۵۴)

○ ''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے خوف، بھوک، اموال کی کمی، جانوں کی کمی اور پھلوں کی کمی کے ذریعے، اور (اے رسول) خوشخبری دو صبر کرنے والوں کو'' (۱۵۵)

○ ''وہ کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم خدا کی ملکیت ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے'' (۱۵۶)

○ ''انہی لوگوں پر ان کے پروردگار کی رحمت نازل ہوئی ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں'' (۱۵۷)

تفسیر و بیان

یہ پانچوں آیتیں (۱۵۳ تا ۱۵۷) ایک ہی طرز کی ہیں لفظوں کے اعتبار سے بھی اور معانی کے لحاظ سے بھی چنانچہ ان کے درمیان ہم رنگی کا یہ عالم ہے کہ پہلی آیت آخری آیت سے اور آخری آیت پہلی آیت سے اپنے مفہومی قرب کو واضح طور پر ظاہر کرتی ہے گویا پہلی، آخری کی ترجمان اور آخری، پہلی سے وابستہ نظر آتی ہے جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ پانچوں آیات مبارکہ یکجا نازل ہوئی ہیں، متفرق طور پر نازل نہیں ہوئیں اور ان کا سیاق اس امر کی دلیل ہے کہ یہ آیات قتال اور حکمِ جہاد صادر ہونے سے پہلے نازل ہوئیں کیونکہ ان میں ایسی آزمائش اور ابتلاء کا تذکرہ ہے جس سے اہلِ ایمان دوچار ہوں گے اور اس مصیبت کا ذکر ہے جو ان پر آئے گی البتہ اس سے ہر طرح کا ابتلاء و مصیبت سے مراد نہیں بلکہ عمومی ابتلاء مراد ہے اور وہ مصیبت معمولی و ہمیشہ رہنے والی بھی نہیں کیونکہ بنی نوع انسان دیگر موجودات عالم کی طرح اس عالمِ طبیعت اور مادی دنیا میں معمولی وعمومی حوادث کی یلغار سے محفوظ نہیں اور وہ حوادث انسان کی شخصی زندگی کے نظام کو درہم برہم کردیتے ہیں مثلاً وہ یا تو موت کا شکار ہو جاتا ہے یا اسے مرض لاحق ہو جاتا ہے یا پھر خوف، بھوک و افلاس، غم و اندوہ اور محرومیت و ناداری اس کے دامن گیر ہو جاتی ہے اور یہ سب کچھ خداوند عالم کے جاری کردہ اس نظامِ حیات کا حصہ ہے جو اس نے اپنے بندوں اور اپنی تمام مخلوق کے لئے مقرر کیا ہے کیونکہ یہ دنیا آزمائشوں و ابتلاءات اور مشکلات و مصائب کی آماجگاہ ہے اور اس میں تبدیلی و تغیر کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے (فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا خدا کی جارہ کردہ سنت و طریقہ اور نظام میں کسی طرح کی تبدیلی ہرگز نہیں پاؤ گے)۔

اور جہاں تک کسی ایک شخص پر آنے والی مصیبت کا تعلق ہے تو اگرچہ متاثرہ فرد کے لئے اس کا برداشت کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے اور وہ اس کے لئے سخت ناگوار ہوتی ہے لیکن وہ اس مصیبت و بلا کی مانند ہیبت ناک و وحشت انگیز نہیں ہوتی جو ایک فرد کی بجائے معاشرے کے تمام افراد پر آتی ہے کیونکہ جب کسی ایک شخص پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنی قوت عقل و تدبیر اور اپنے مضبوط ارادہ و ثبات و عزم میں دیگر افراد کا تعاون حاصل کرتا ہے جبکہ تمام افراد پر آنے والی مصیبت میں ایسا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہر فرد کی سوچ اور قوت فکر و تدبیر پر چھا جاتی ہے جس کے نتیجہ میں تمام قوتیں بے اثر ہو جاتی ہیں اور بالآخر معاشرے کا نظامِ زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے، ہر طرف خوف ہی خوف پھیل جاتا ہے، وحشت کا احساس بڑھ جاتا ہے اور پھر عقل و شعور کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، عزم و ثبات کی قوتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں لہٰذا ایسی صورت میں یہ کہنا بجا و درست ہے کہ سب افراد پر آنے والی مصیبت ایک فرد پر آنے والی مصیبت کے مقابلہ میں سخت دشوار اور نہایت ناگوار ہوتی ہے کہ زیر

بحث آیات بھی اسی (تمام افراد پر آنے والی) مصیبت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی واضح ہے کہ زیر بحث آیات جس عمومی (تمام افراد پر آنے والی) مصیبت کو بیان کرتی ہیں اس سے مراد ہر طرح کی عمومی مصیبت مثلاً وباء و قحط وغیرہ نہیں بلکہ اس سے مراد وہ مصیبت اور تمام افراد کے دل و دماغ پر اثر کرنے والا سخت ناگوار امر ہے جسے ایمان لانے والوں نے خود ہی اپنے لئے پسند و اختیار کیا ہے کیونکہ انہوں نے دینِ توحید کو اختیار کیا اور دعوتِ حق پر لبیک کہا جس کے نتیجہ میں اہل دنیا بالخصوص ان کی اپنی قوم و قبیلہ کے افراد ان کے مخالف ہو گئے اور اس مخالفت کا اصل مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ خدا کے نور کو بجھا دیا جائے' عدل وانصاف کی آواز کو دبا دیا جائے اور دعوتِ حق کا راستہ روکا جائے' چنانچہ ان شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کے سامنے جنگ وقتال کے سوا کوئی راستہ باقی نہ رہا کیونکہ انہوں نے اس کے علاوہ ہر ممکن طریقہ اپنایا مگر ناکام ہوئے مثلاً حجت و دلیل قائم کرنا' فتنہ و فساد برپا کرنا' لوگوں میں وسوسے اور شکوک وشبہات پھیلانا وغیرہ ان تمام حربوں میں ناکامی کے بعد ان کے سامنے ایک ہی راستہ باقی رہ گیا یعنی جنگ' جنگ کے علاوہ ان کے تمام وسائل بے اثر ثابت ہوئے کیونکہ حجت و دلیل سے تو پیغمبر اسلامؐ کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی اور وسوسوں' فتنوں اور چالوں و حیلہ بازیوں سے خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا دشمنانِ دین کے سامنے اپنے شیطانی مقاصد یعنی حق کا راستہ روکنے اور دین الٰہی کے درخشاں نور کو بجھانے کے لئے جنگ وقتال کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ تھا' یہ تو تھی اہل کفر کی حالت' اور جہاں تک اہل دین کا تعلق ہے تو ان کا معاملہ اس سے زیادہ واضح تھا ان کے سامنے بھی کلمہء توحید کی اشاعت' دین حق کے پھیلاؤ' عدل کی حکمرانی اور باطل کی بیخ کنی کے لئے جنگ وقتال کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا تھا کیونکہ جب سے انسان نے اس عالم آب و خاک میں قدم رکھا اسے پے در پے تجربات سے اس حقیقت کا علم ہو گیا کہ حق تب ہی اپنا حقیقی اثر ظاہر کر سکتا ہے جب باطل کی جڑیں کٹ جائیں اور اس کا نام و نشان مٹ جائے اور یہ سب کچھ طاقت کے عملی مظاہرے اور قوت کے بھرپور استعمال کے بغیر ممکن نہیں۔

خلاصہء کلام یہ کہ زیر بحث آیات میں اس عظیم امتحان کا تذکرہ خدا کی راہ میں قتل ہو جانے کے ضمن میں کیا گیا ہے اور اس مصیبت و آزمائش کی توصیف ایسے امر کے ساتھ کی گئی ہے جس کے پیش نظر اس آزمائش کے ناگوارِ خاطر ہونے یا ناپسندیدہ ہونے کا کوئی پہلو باقی نہیں رہتا اور وہ امر یہ ہے کہ اس طرح کی جنگ وقتال میں قتل ہونا موت و نابودی نہیں بلکہ زندگی میں ہی زندگی ہے اور پاکیزہ و سعادت مند زندگی!

بہرحال زیرِ نظر آیات شریفہ مؤمنین کو خدا کی راہ میں جنگ وقتال کی ترغیب دلاتی ہیں اور اس امر سے آگاہ کرتی ہیں کہ مؤمنین بہت جلد ایک بڑی آزمائش سے گزریں گے اور اس آزمائش میں اس وقت تک اعلیٰ ترین مراتب و مدارجِ کمال' اپنے پروردگار کی طرف سے رحمت و برکت اور حق کی حقیقی ہدایت سے بہرہ ور نہیں ہوں گے جب تک کہ اس آزمائش میں صبر سے کام نہ لیں اور اس کی سختیوں کو مطمئن دل کے ساتھ برداشت نہ کریں۔

یہ آیات مؤمنین کو اس بات کی تلقین اور درس دیتی ہیں کہ وہ اس آزمائش کی شدت و سختیوں میں صبر و نماز کے

ذریعے خدا کی مدد و نصرت کے طلبگار رہوں' صبر سے مراد جزع وفزع' چیخ وپکار اور آہ وفریاد کرنے سے اجتناب اور امرِ تدبیر کو مختل و درہم و برہم ہونے سے محفوظ رکھنا (تحمل و تدبر کا دامن نہ چھوڑنا) ہے اور نماز سے مراد مکمل طور پر خدا کی طرف توجہ رکھنا اور ہر ایک سے بے نیاز ہو کر صرف اس ایک سے وابستہ رہنا اور دل لگانا ہے جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے' بے شک سب کی سب طاقت اللہ کے پاس ہے۔ (اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا)۔

صبر وصلوٰۃ کے ذریعے استعانت

O "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ"

اس آیت مبارکہ میں "صبر" اور "صلوٰۃ" کا ذکر ہوا ہے اور اسی سورۂ بقرہ کی آیت ۴۵ (وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ) کی تفسیر میں صبر اور نماز کے بارے میں بعض مطالب بیان کئے جا چکے ہیں، مزید برآں یہ کہ صبر ان عظیم و پاکیزہ صفات و کیفیات میں سے ایک ہے جن کی مدح و ستائش قرآن مجید نے کی ہے اور بار بار اس کے بارے میں حکم دیا ہے یہاں تک کہ تقریباً ستر (۷۰) مقامات میں صبر کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کی بابت جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہ نہایت عظیم بلند پایہ ہیں، اس سلسلہ کی بعض آیات ملاحظہ ہوں:

سورہ لقمان آیت ۱۷:

"اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ"

(یہ انتہائی پختہ ومضبوط امور میں سے ہے)

سورۂ فصلت، آیت ۳۵:

"وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ"

(اس نصیحت کو کوئی قبول نہیں کرے گا مگر وہ لوگ جو صبر کریں اور اسے کوئی قبول نہیں کرے گا مگر عظیم حصہ والا' خوش قسمت)

سورہ زمر، آیت ۱۰:

"اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ"

(بے شک صبر کرنے والوں کو بغیر حساب کے پورا پورا اجر عطا کیا جائے گا)

اور "صلوٰۃ" (نماز) ۔ کے بارے میں یہ کہنا کافی ہے کہ وہ ان تمام عبادات سے زیادہ عظیم و افضل عبادت ہے جن کی ادائیگی کی بھرپور تاکید قرآنِ مجید میں کی گئی ہے یہاں تک کہ نماز کے متعلق کہا گیا ہے:

سورۂ عنکبوت، آیت ۴۵:

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ"

(نماز ہر برائی اور غلط کام سے روکتی ہے)

نماز کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ خداوندِ عالم نے اپنی مقدس کتاب میں جہاں بھی کسی اہم کام کا حکم دیا ہے وہاں سب سے پہلے نماز کا تذکرہ فرمایا ہے۔

ایک اہم نکتہ

زیر نظر آیت مبارکہ میں صبر وصلوٰۃ کا تذکرہ ہوا ہے اور ہم نے بیان کیا ہے کہ نماز تمام عبادات سے افضل و برتر ہے تو اب سوال یہ ہے کہ جب نماز اتنی عظمت واہمیت کی حامل ہے تو خداوندِ عالم نے آیت کے ذیل میں نمازیوں کی بجائے صبر کرنے والوں کے ساتھ ہونے کا ذکر کیوں کیا ہے (اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ)۔۔ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔۔ جبکہ آیت ۴۵ میں نماز کی بابت یوں ارشاد فرمایا۔ "وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ وَ اِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ۔ (تم صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو کہ نماز بہت گراں ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جو خشوع کرتے ہیں) تو بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ زیر بحث آیات میں صبر اور صبر کرنے والوں کا ذکر اس لئے خاص اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے کہ ان آیات میں جنگ وقتال کا تذکرہ ہوا ہے جو کہ خوف و وحشت کا مقام اور طاقتور لوگوں کے آمنے سامنے ہونے کا مقام ہے لہٰذا ایسی صورت میں صبر کی تلقین اور اس کی اہمیت کا ذکر ہی زیادہ مناسب ہے جبکہ سابقہ آیت (بقرہ، ۴۵) میں صورتِ حال اس طرح نہیں اس لئے مقتضائے حال کو ملحوظ رکھتے ہوئے ارشاد ہوا: "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ" خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس مقام پر ایک اور مطلب بھی قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ یہاں "معیت" یعنی ساتھ ہونے کا جو تذکرہ کیا گیا ہے (خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) تو اس "معیت" سے مراد وہ معیت اور ساتھ ہونا نہیں جو سورۂ حدید کی آیت ۴ میں مذکور ہے جس میں ارشاد ہوا۔ "وَ ہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ" (تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے) کیونکہ اس آیت (حدید ۴) میں جس معیت اور ساتھ ہونے کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد قدرت وتحفظ اور سرپرستی ہے یعنی تم جہاں کہیں بھی ہو اس کے سایۂ قدرت میں ہو اور وہ تم پر محیط ہے تمہاری بقاء واستحکام اسی سے وابستہ ہے جبکہ اس مقام پر (اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ) میں صابرین کے ساتھ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارا مددگار ہے وہ تمہارے ساتھ ہے یعنی اس خوف و وحشت اور جنگ وقتال کی ہولناک سختیوں میں تمہاری مدد کرنے والا ہے' گویا صبر کامیابی کی کنجی ہے (الصبر مفتاح الفرج) صبر کشائش وسکونِ قلب کا سبب ہے۔

شہداء کی حیات کا ذکر

○ "وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ"

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں بعض مفسرین نے یوں اظہار خیال کیا ہے کہ اس میں "لَا تَقُوْلُوْا" (تم نہ کہو) کے مخاطب "مؤمنین" ہیں یعنی یہ بات ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے جو خدا' رسولِ خداؐ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ اس دنیا کی زندگی کے بعد آخرت کی زندگی پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دینِ حق کو دل و جان سے تسلیم کرنے' دعوتِ حق کو قبول کرنے اور معاد (مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے) کے بارے میں متعدد قرآنی آیات سننے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ موت سے انسان محو و نابود ہو جاتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت عام لوگوں کے بارے میں نہیں ہے بلکہ خاص طور پر ان شہداء کی زندگی بعد از موت کو ثابت کرتی ہے جنہیں خدا کی راہ میں قتل کر دیا گیا ہو نہ کہ عام مومنین اور تمام کفار کی زندگی بعد از موت کو' کیونکہ زندگی بعد از موت صرف شہداء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ تو ہر ایک کو حاصل ہو گی لہٰذا یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ شہداء کے بارے میں جس زندگی بعد از موت کا ذکر اس آیت شریفہ میں کیا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا نام زندہ رہے گا اور صدیاں گزر جانے کے باوجود ان کا ذکرِ جمیل پرانا نہ ہو گا گویا شہداء کی زندگی سے مراد ان کے نام اور ذکر کا زندہ ہونا ہے۔

یہ ہے آیت میں مذکور شہداء کی زندگی بعد از موت کے بارے میں بعض مفسرین کا نظریہ! لیکن ہمارے نزدیک یہ نظریہ درست نہیں اور اس پر چار اعتراض ہو سکتے ہیں۔

پہلا اعتراض:

اس نظریہ کی رو سے جس زندگی کا ذکر کیا گیا ہے یعنی نام اور ذکر کا زندہ ہونا' تو اس کی کوئی حقیقت نہیں یہ ایک خیالی زندگی سے عبارت ہے کہ جسے نام کی حد تک تو "زندگی" کہا جا سکتا ہے حقیقت میں نہیں' اور اس طرح کے خیالی مطالب کا ذکر کلام الٰہی میں کسی طرح بھی موزوں نہیں نظر آتا، یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا اس طرح کے خیالی مطالب بیان کرے جبکہ وہ صرف "حق" کی بات کرتا ہے اور حق و حقیقت کی دعوت دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سورہ یونس، آیت ۳۲:

"فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ"

(حق کے علاوہ باقی سب کچھ گمراہی ہے)

جب حق کے علاوہ باقی سب گمراہی ہے تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ خداوندِ عالم اپنے بندوں سے کہے کہ تم میری راہ میں

شہید ہو جاؤ اور اپنی ظاہری زندگی کی پرواہ نہ کرو تا کہ مرنے کے بعد تمہارے بارے میں کہا جائے کہ "کتنے اچھے لوگ تھے" (تمہارا نام باقی رہ جائے)' اب رہی یہ بات کہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں مذکور ہے کہ انہوں نے خدا کے حضور عرض کی "وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ" (سورہ شعراء، آیت ۸۴) (اور میرے لئے بعد میں آنے والوں میں سچی زبان قرار دے) تو اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ میری دعوت حق کو بقاء عطا فرما اور میرے بعد میرے سچے بیان کو باقی رکھ نہ یہ کہ میرے بعد میرا ہی ذکر اچھائی کے ساتھ ہوتا رہے اور بس'

البتہ مذکورہ غلط نظریہ اور بے بنیاد خیال ان لوگوں کے افکار و عقائد سے ہم رنگ ضرور ہے جو اپنا سب کچھ مادہ اور مادی زندگی میں منحصر و محدود سمجھتے ہیں کیونکہ وہ نفوس کے مادی ہونے اور موت سے انسان کے نابود ہو جانے کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور اخروی زندگی پر ہرگز یقین نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انسان فطری طور پر نفوس کی بقاء اور مرنے کے بعد ان کے سعادت و شقاوت سے متصف ہونے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کیونکہ عظمتوں اور بلند و عالی مقاصد کے حصول کے لئے ایثار و قربانی دینا ناگزیر ہوتا ہے اور خاص طور پر جب مقصد اتنا اہم اور عظیم ہو کہ اس کے حصول کے لئے کئی افراد و اقوام کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے تا کہ دوسروں کو زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل سکے' لٰہذا اگر ہر شخص کی موت کو فنا و نابودی قرار دیا جائے تو پھر کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی کہ ایک انسان اپنے آپ کو اس لئے ختم کر دے کہ دوسرے زندہ رہ جائیں خصوصاً جب وہ موت کو فنا و نابودی سمجھتا ہو۔ ایسے شخص کے لئے یہ کیونکر قابل تصور ہے کہ وہ اس لئے مر مٹ جانے' قتل ہو جانے' کی راہ اختیار کرے کہ دوسروں کو زندگی ملے اور اپنی ان مادی لذتوں کو جنہیں وہ جبر و جور کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے نظر انداز کر دے (اپنے آپ کو ان سے محروم کر دے) تا کہ دوسرے لوگ عدل و انصاف کے ماحول میں ان مادی لذتوں و آسائشوں سے بہرہ مند ہوں' کوئی عقلمند اس وقت تک اپنی کوئی چیز کسی کو نہیں دیتا جب تک کہ اس کے بدلے میں کوئی چیز حاصل نہ کرے کیونکہ عوض کے بغیر کچھ دینا اور کچھ لئے بغیر کسی چیز کو چھوڑ دینا عاقلانہ عمل نہیں مثلاً موت کو اختیار کرنا تا کہ دوسرے زندہ رہیں اور خود محروم رہنا تا کہ دوسرے فائدہ اٹھائیں یہ بات فطرت کے اصولوں سے ہرگز مطابق نہیں رکھتی' بنا برایں جب ان لوگوں نے فطرت کے مذکورہ فیصلے کا شعور حاصل کر لیا تو اپنے آپ کو اس کمی و نقص سے پاک رکھنے کے لئے اس طرح کے بے بنیاد نظریات قائم کئے کہ جو خیالات کی دنیا سے باہر نہیں تا کہ ان کے ذریعے اپنے دل کو بہلائیں چنانچہ کہنے لگے کہ جو شخص اوہام و خرافات کی قید و بند سے آزاد ہو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے وطن اور انسانی شرف کے لئے قربان کر دے تا کہ اسے ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے اور وہ یوں کہ ہمیشہ اسے اچھے لفظوں سے یاد کیا جائے اور ہر جگہ اس کی تعریف ہو اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی معاشرتی زندگی کی لذتوں کو پس پشت ڈال کر خود ان سے محرومی اختیار کرے تا کہ دوسروں کو ان لذتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع مل سکے اور نتیجتاً معاشرہ مضبوط و مستحکم اور تہذیب و تمدن کی بلندیوں کو پانے میں کامیاب ہو جائے اور جس نے معاشرے کی عزت و استحکام کے لئے اپنی جان پیش کی وہ شرف و عظمت کی زندگی حاصل کر لے (نیک نامی کما لے)' یہ ہے وہ بے بنیاد نظریہ جو مادی افکار کے حامل لوگوں نے اپنے تئیں گھڑ لیا ہے' کاش کوئی ان

عقل کے اندھوں سے پوچھتا کہ جب قربانی دینے والا شخص خود اس دنیا میں باقی نہ رہے اور اس کے بدن کی مادی ترکیب ٹوٹ جائے اور زندگی کی تمام خصوصیات کہ جن میں احساسِ حیات و شعور بھی شامل ہے ختم ہو جائیں تو پھر وہ کون ہے جو شرف و عزت کی زندگی سے بہرہ ور ہوگا اور کون ہے جو "نیک نامی" کا ادراک اور اسے محسوس کرتے ہوئے اس سے لطف اندوز ہوگا؟ آیا اس طرح کی باتیں خرافات و بے بنیاد نہیں؟

دوسرا اعتراض:

آیت کے ذیل میں جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں یعنی "وَّلٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ" (لیکن تم نہیں سمجھتے) ان سے مذکورہ نظریہ کی تائید نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتے کیونکہ اگر قتل ہو جانے کے بعد کی زندگی سے مراد نیک نامی ہوتی ہے تو آیت اس طرح ہوتی "بل احیاء ببقاء ذکرھم الجمیل وثناء الناس علیھم بعدھم" (بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے اچھے ذکر کے ساتھ' نیک نامی کے ساتھ' اور ان کے مرنے کے بعد لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں) کیونکہ یہ دلجوئی اور ڈھارس دینے کا مقام ہے جبکہ ان کی بجائے ارشاد ہوا "بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّلٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ" (بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے)۔

تیسرا اعتراض:

اس آیت کی مانند ایک اور آیت بھی ہے جو دراصل اس کی تفسیر کے طور پر ہے اس میں قتل ہو جانے کے بعد شہداء کی زندگی کے بارے میں جو خصوصیات ذکر کی گئی ہیں ان سے مذکورہ نظریہ کی نفی ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ آل عمران، آیت ۱۶۹:

"وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ" ۝

(اور ہرگز گمان نہ کرو ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس رزق پاتے ہیں)۔

اس کے بعد والی آیت میں بھی ان کی دیگر خصوصیات مذکور ہیں لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی حقیقی معنی میں زندگی ہے اور ظاہر بظاہر محسوس ہونے والی زندگی ہے نہ کہ فرضی و خیالی زندگی'

چوتھا اعتراض:

مذکورہ نظریہ میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام مسلمان مرنے کے بعد کی زندگی سے آگاہ ہیں' لیکن یہ بات درست نہیں کیونکہ یہ آیت عہدِ رسالتؐ کے وسطی دور میں نازل ہوئی لہٰذا بعید نہیں کہ اس دور کے بعض مسلمان زندگی بعد از موت سے

نا آگاہ ہوں کیونکہ عام مسلمان آخرت کی جس زندگی کے بارے میں یقین رکھتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی اس کی بابت ناقابل تردید و تاویل بیان موجود ہے وہ قیامت کے لئے دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جانا ہے اور جہاں تک موت کے بعد اور حشر سے پہلے کی زندگی یعنی برزخ کی زندگی کا تعلق ہے تو اگرچہ اس کے متعلق قرآن مجید میں اجمالی بیان موجود ہے اور اس کا ذکر برحق موضوعات (معارف حقہ) میں کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا تذکرہ اتنی وضاحت کے ساتھ نہیں کیا گیا کہ اسے ''ضروریات القرآن'' قرآن کے بدیہی و واضح موضوعات میں شمار کیا جا سکے کہ جس سے نا آگاہی اور اس کا انکار ممکن نہ ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ اہل اسلام کے درمیان اجماعی و متفق علیہ بھی نہیں اور کئی مسلمان یہاں تک عصرِ حاضر میں بھی وہ لوگ اسے تسلیم نہیں کرتے جو نفس کے مادہ سے مجرد ہونے کا انکار کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نفس مادی ہے (روح غیر مادی نہیں) اور انسان موت کے آنے پر بالکل نابود و ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بدن کی ترکیب ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے پھر خداوندِ عالم قیامت کے دن دوبارہ بدن و روح کو خلق فرمائے گا' بنابرایں عین ممکن ہے کہ شہداء کی زندگی سے مراد عالم برزخ میں ان کا زندہ ہونا ہو یعنی مقصود یہ ہو کہ صرف یہی (شہداء) ہیں کہ جنہیں برزخ کی زندگی عطا کی گئی ہے کیونکہ اکثر مؤمنین اس سے نا آگاہ ہیں تاہم کچھ اہل ایمان اس سے باخبر بھی ہیں۔

خلاصہء کلام یہ کہ اس آیت میں ''زندگی'' سے مراد حقیقی زندگی ہے نہ کہ فرضی و خیالی زندگی' اور اس کا مزید ثبوت اس سے ملتا ہے کہ خداوندِ عالم نے کافر کی زندگی بعد از موت کو اپنے مقدس کلام میں کئی مقامات پر ''ہلاکت'' وتباہی سے تعبیر کیا ہے چنانچہ اس سلسلے کی ایک آیت ملاحظہ ہو۔

سورہء ابراہیم، آیت ۲۸:

○ ''وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ''

(انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کی وادی میں ڈال دیا)

اس طرح کی دیگر آیات بھی موجود ہیں جن میں کافروں کی زندگی بعد از موت کو ''ہلاکت وتباہی'' سے تعبیر کیا گیا ہے تو واضح ہے کہ اس کے مقابلہ میں سعادت کی زندگی ہے جو مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہء عنکبوت، آیت ۶۴:

○ ''وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ''

(یقیناً آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے اگر وہ اسے سمجھ پاتے!)۔

گویا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے آخرت کی زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوت فکر کو دنیا کی مادی زندگی سے متعلق امور اور اس کی خصوصیات کے ادراک میں منحصر کر دیا اور اس کے علاوہ کچھ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی لہٰذا آخرت کی زندگی کی حقیقت سے نا آگاہ رہے جس کے نتیجہ میں ان دونوں (دنیا کی مادی زندگی اور آخرت کی حقیقی زندگی) کے درمیان فرق نہ کر سکے اور اسے فنا و بودی سے تعبیر کر دیا' اس طرح کا سوچنا مؤمن

وکافر دونوں میں قدرِ مشترک بن گیا یعنی دونوں فریق اس سلسلہ میں غلط فہمی میں مبتلا ہوئے، یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں شہداء کی زندگی بعداز موت کے بارے میں دونوں کو مخاطب کر کے ارشادِ حق تعالیٰ ہوا: "بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ" (بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے) یعنی تم اپنے ظاہری حواس سے ان کی زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے جیسا کہ سورۂ عنکبوت آیت ۶۴ میں ارشاد ہوا "لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" (کہ وہی حقیقی زندگی ہے اگر وہ اسے سمجھ پاتے) اس میں "علم" سے مراد یقین ہے یعنی اگر وہ یقین حاصل کر لیتے تو سمجھ جاتے کہ وہی زندگی، حقیقی زندگی ہے، علم بمعنی یقین کا ثبوت درج ذیل آیت میں ملاحظہ ہو:

سورہ ءتکاثر، آیت ۶:

"كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ"

(اگر تم علم یقین کے ساتھ جان لیتے تو تم جہنم کو ضرور اپنی آنکھوں سے دیکھتے)

اس آیت میں آخرت سے آگاہی کو "علمِ یقین" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہرحال زیر بحث آیت کا معنی۔۔ "خدا خود بہتر جاننے والا ہے"۔۔ یہ ہوگا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو اور ان کے بارے میں ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ وہ نابود ہو گئے اور مر مٹ گئے کیونکہ "موت وحیات" کے دو لفظوں سے تم جو معانی سمجھتے ہو وہ ان شہیدوں کی موت پر صادق نہیں آتے اور تمہارے حواس جس کو "موت" سمجھتے ہیں یعنی فنا و نابودی تو اس معنی میں شہداء مردہ نہیں ہیں وہ تو زندہ ہیں اور ان کی (ظاہری) موت ایک طرح کی زندگی ہے کہ جس کی حقیقت کو سمجھنا تمہارے حواس کے بس میں نہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ زندگی بعداز موت کے بارے میں ناآگاہی کا مسئلہ کافروں کی بابت تو درست ہے لیکن مؤمنین کی بابت اسے کیونکر درست سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ وہ سب یا اکثر موت کے بعد کی زندگی سے آگاہی رکھتے ہیں اور موت کو انسان کے لئے فنا و نابودی نہیں سمجھتے لہٰذا ان سے یہ کہنا کہ "تم نہیں سمجھتے" (یعنی علمِ یقین نہیں رکھتے) کیا معنی رکھتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ ایمان زندگی بعداز موت کے بارے میں یقین رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود جب وہ اپنے قتل کئے جانے کا تصور کرتے ہیں تو خواہ و ناخواہ انہیں پریشانی لاحق ہوتی ہے اور وہ مضطرب ہو جاتے ہیں اور یہ تصور ان کے دلوں کو ہلا دیتا ہے اس لئے خداوند عالم نے ان کے علم و ایمان کا حوالہ دے کر انہیں متوجہ کیا اور جس کا انہیں علم ہے اس کا تذکرہ کر کے ان کے خوابیدہ احساس کو بیداری دی تاکہ ان کے دلوں پر چھایا ہوا اضطراب و پریشانی دور ہو جائے، اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے ان کے پسماندگان کے دلوں میں غم واندوہ کا بوجھ بھی اتر جاتا ہے کیونکہ وہ اس امر

سے آگاہو جاتے ہیں کہ ان کے پیارے چند ہی دنوں کے لئے ان سے جدا ہوئے ہیں اور یہ جدائی اس لئے ناگوار نہیں کیونکہ اس کے مقابلے میں انہیں خدا کی رضا وخوشنودی حاصل ہوئی اور ان کے پیاروں نے پاک و پاکیزہ زندگی اور ہمیشہ باقی رہنے والی نعمت اور خدا کے نزدیک پسندیدہ بندے ہونے کا شرف پایا جو کہ بہت بڑا اعزاز ہے اسی لئے جذبۂ جہاد دلوں میں موجزن ہوتا ہے اور خدا کی رضا کے حصول کی تمناؤں پر شباب آتا ہے زیر بحث آیت میں مؤمنین کو مخاطب کر کے بات کرنا ایسے ہے جس طرح خداوند عالم نے درج ذیل آیت میں پیغمبر اسلامؐ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

سورہ بقرہ، آیت ۱۴۷:

○ "اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ"

(حق تیرے پروردگار کی طرف سے ہے کہیں تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا)

حالانکہ آنحضرتؐ بھی جانتے تھے کہ حق ان کے رب کی طرف سے ہے اور نہ صرف یہ کہ جانتے تھے بلکہ اپنے پروردگار کی آیات پر مکمل یقین رکھنے والوں کے سرخیل اور سب سے پہلے فرد تھے لہٰذا اس طرح کے خطاب و اندازِ گفتگو دراصل کنایہ واشارہ کے طور پر ہیں جو اصل حقیقت کے نہایت واضح اور ناقابلِ انکار ہونے کو ثابت کرتے ہیں کہ پھر ان کی بابت کسی قسم کے شبہ وغلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

کچھ عالمِ برزخ کے بارے میں!

زیر بحث آیت شریفہ کی بابت مذکورہ مطالب سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد اور قیامت سے پہلے بھی ایک زندگی ہے جسے عالم برزخ کی زندگی کہا جاتا ہے جیسا کہ زیر بحث آیت (۱۵۶) کی مانند ایک اور آیت، شہداء کی زندگی کے بارے میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے ملاحظہ ہو:

سورہ آل عمران، آیت ۱۶۹:

○ "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ"

(اور تم گمان نہ کرو ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے حضور رزق پاتے ہیں)۔

اس آیت کے علاوہ بھی کثیر آیات موجود ہیں جو اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتی ہیں۔

اس مقام پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ زیر بحث آیت (۱۵۴) کی بابت بعض حضرات نے نہایت عجیب وغریب رائے کا اظہار کیا ہے اور وہ یہ کہ یہ آیت شہدائے بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور انہی کے ساتھ مختص ہے ان کے علاوہ کسی کے لئے نہیں۔

اس عجیب و تعجب آور رائے بلکہ یوں کہا جائے کہ مضحکہ خیز نظریہ کے جواب میں مفسرین میں سے بعض اہلِ تحقیق

نے نہایت دلچسپ بات کی ہے اور وہ یہ کہ جب انہوں نے آیت مبارکہ ''وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'' (اور تم صبر و نماز کے ذریعے خدا سے مدد طلب کرو) کے ذیل میں مذکورہ مضحکہ خیز رائے کا تذکرہ کیا تو اس کے بعد کہا: پروردگارا! ہمیں اس طرح کے بے سروپا اقوال کے سامنے صبر و تحمل کی توفیق عطا فرما۔

بہر حال مذکورہ نظریہ کی بابت میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی بے بنیاد آراء پیش کرنے والوں کا مقصد کیا ہے؟ اور وہ شہداء بدر کے بارے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں جو کہ انہی کے ساتھ مختص ہے جبکہ وہ عام آدمی کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ انسان موت یا قتل ہو جانے سے کلی طور پر محو و نابود ہوتا ہے اور اس کے بدن کے اجزاء ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کے بعد بالکل ختم ہو جاتے ہیں تو کیا ایسا نظریہ رکھنے والے حضرات، شہدائے بدر کے بارے میں کسی معجزہ کے قائل ہیں؟ آیا وہ یہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم نے شہدائے بدر کو اپنی خاص عنایت و کرامت سے نوازا ہے کہ جس سے اپنی سب سے عظیم مخلوق ختمی المرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر انبیاء کرام و مرسلین عظام و اولیاء مقربین کو بھی نہیں نوازا؟ آیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خداوند کریم نے صرف جنگ بدر کے شہداء کو قتل کئے جانے کے بعد زندگی کی ایسی نعمت عطا فرمائی ہے جو پوری کائنات میں کسی کو عطا نہیں کی؟ بہر حال یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ خدا نے بطور معجزہ ایسا نہیں کیا بلکہ ایسا کرنا تو ایک محال و ناممکن امر کو وجود عطا کرنے کے مترادف ہے (کیونکہ فنا و بقا کا یکجا ہونا قطعاً ناممکن ہے) اور محال بھی ایسا کہ جس کے بارے میں کسی پہلو سے کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا اور پھر یہ کہ معجزہ کسی محال و ناممکن امر کی بابت قابل تصور ہی نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ عقل اس واضح و بدیہی اصول کے بے اثر ہونے کو روا سمجھتی ہے تو پھر کون سا ایسا بدیہی و مسلم الثبوت امر ہوگا جسے نگاہِ اعتبار سے دیکھا جائے گا؟ یا پھر یہ کہیں کہ اگرچہ قوت حس و تفکر تمام امور میں صحیح فیصلہ کرتی ہے اور موضوع کی درست تشخیص کرتی ہے لیکن شہدائے بدر کے سلسلہ میں اسے غلط فہمی ہوئی ہے اور اس نے غلطی سے انہیں ''مردہ'' سمجھ لیا ہے جبکہ وہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس کھاتے پیتے اور دیگر لذائذ سے استفادہ کر رہے ہیں، بات صرف اتنی ہے کہ وہ ہمارے مشاہدے کی حدود سے باہر ہیں اور ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے اور جو کچھ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ قتل ہوئے ان کے اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور وہ بدن کے پارہ پارہ ہو جانے کی وجہ سے ظاہری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے یہ سب کچھ اشتباہ و غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں تو اگر یہ بیجا و بے بنیاد باتیں قوتِ حس سے ممکن ہوں تو نتیجتاً یہ لازم آئے گا کہ اس کے پاس صحیح و غلط کا کوئی معیار ہی نہیں اور وہ کسی چیز کے صحیح اور کسی کے غلط ہونے کا فیصلہ کسی بنیادی اصول کے بغیر ہی کرتی ہے لہٰذا کس صورت میں اس پر اعتماد و وثوق ہو سکتا ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ جنگ بدر کے شہداء کی بابت قوت حِس کی غلط فہمی بلاوجہ نہ تھی بلکہ اس کی وجہ اور سبب ارادۂ خداوندی تھا تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اگر ایسا ہے تو پھر ارادۂ الٰہی کا سبب کیا ہے خدا نے خاص طور پر شہدائے بدر کے لئے اس طرح کا ارادہ کیوں کیا؟ بہر حال قوتِ حس و ادراک پر وثوق و اعتماد ختم ہو جانے کا مذکورہ بالا اعتراض اپنے مقام پر باقی رہے گا اور یہ امکان موجود رہے گا کہ جو چیز حقیقت نہیں رکھتی اسے ہم حقیقت سمجھ لیں اور جو حقیقت رکھتی ہے اسے حقیقت نہ سمجھیں؛ ایک عقلمند انسان اس طرح کی بے بنیاد اور بے سروپا باتیں کیونکر کر سکتا ہے؟ آیا اس طرح سوچنا سفسطہ و حماقت

کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ شہداء بدر کی زندگی بعد از موت کے بارے میں اس طرح کے خیالات رکھنے والے مفسرین نے ان عام محدثین کا نظریہ اختیار کیا ہے جن کا خیال یہ ہے کہ یہ سب امور کہ جو ہمارے حواس کی دسترس سے باہر ہیں اور ہم ان کا مشاہدہ نہیں کر سکتے جبکہ ان کے بارے میں کتاب وسنت میں ٹھوس ثبوت موجود ہیں مثلاً ملائکہ اور ارواحِ مومنین اور اس طرح کی دیگر چیزیں' مادی' طبیعی اور اجسامِ لطیف ہیں کہ جو اجسامِ کثیف میں حلول ونفوذ کر سکتی ہیں اور تمام انسانی افعال انجام دے سکتی ہیں اور تمام انسانی قوتوں کی حامل بھی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں مادہ وطبیعت کے تقاضوں مثلاً تغیر وتبدل' ترکیب وانحلال اور موت وحیات میں سے کچھ بھی نہیں پایا جاتا لہٰذا اگر خدا کی مشیت ہو تو یہ سب ہمارے حواس پر ظہور پذیر ہوتی ہیں اور اگر خدا ان کا ظہور پذیر ہونا نہ چاہے یا ان کا ظہور پذیر نہ ہونا چاہے تو ظاہر نہیں ہوتیں یہ سب کچھ خدا کی مشیت پر موقوف ہے ان میں حواس یا ان موجودات کی بابت کسی وجہ وسبب کی احتیاج نہیں' (بنا بر ایں یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ ہم جب کہ ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں تو شہدائے بدر کو کیوں نہیں دیکھ سکتے اور شہدائے بدر دوسری چیزوں کی مانند ہمارے سامنے ظہور پذیر کیوں نہیں ہوتے) عام محدثین کے اس نادرست نظریہ کا سبب یہ ہے کہ وہ موجوداتِ عالم کے درمیان ''علت ومعلول'' کے نظام کو تسلیم نہیں کرتے جبکہ حقیقت امر یہ ہے کہ اگر ان کا یہ انتہائی بے بنیاد اور بے سرو پا نظریہ درست مان لیا جائے تو تمام عقلی حقائق وعلمی اصولوں تو کیا بلکہ دینی معارف کی بھی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی اور پھر ان اجسامِ لطیف کہ جو خدا کی طرف سے خاص عنایت وکرامت سے بہرہ ور ہوئے اور مادی وطبیعی قوتوں کی دسترس سے باہر ہیں ان کی وجودی تصدیق کی نوبت ہی نہ آئے گی۔

بہرحال اب تک مذکور تمام مطالب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زیر بحث آیۂ شریفہ عالمِ برزخ کی زندگی کو ثابت کرتی ہے کہ جسے ''عالمِ قبر'' کہا جاتا ہے اور وہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے کا عالم ہے' اس عالم میں قیامت سے پہلے تک میت کو یا تو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے یا پھر عذاب میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔

زیر بحث آیت کے علاوہ جو دیگر آیات، عالمِ برزخ کو ثابت کرتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

سورۂ آل عمران، آیت ۱۷۱:

O ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ''۔

(اور تم گمان نہ کرو ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ہیں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس رزق پاتے ہیں' جو کچھ انہیں خدا نے اپنے فضل وکرم سے عطا کیا ہے وہ اس پر خوش ہیں اور ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے ہیں ان لوگوں کی بابت کہ جو ابھی ان سے ملحق نہیں ہوئے کہ ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ ہی وہ غمگین

ہیں، وہ ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے ہیں اللہ کی نعمت اور فضل و کرم کی اور یہ کہ خدا مؤمنین کا اجر ضائع نہیں کرتا)

اس آیت کی بابت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس سے عالمِ بررخ کا ثبوت ملتا ہے اور جو حضرات ان آیات کو شہداء بدر کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں اگر وہ ان کے سیاق وسباق اور طرز واسلوب بیان پر غور کریں تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ شہدائے بدر کے ساتھ ساتھ دیگر تمام مؤمنین اس امر میں قدر مشترک رکھتے ہیں کہ سب مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے ایک زندگی پائیں گے اور نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

عالمِ برزخ کے ثبوت پر ایک اور آیت:

سورہ مومنون، آیت ۱۰۰:

O" حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ"

(یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی مرجائے تو اس وقت کہتا ہے پروردگارا! مجھے واپس لوٹا دے کہ شاید میں نیک اعمال بجالاؤں اور جو نہیں کرسکا اسے پورا کرسکوں، ہرگز نہیں، یہ صرف ایک بات ہی ہے جو وہ کرتا ہے حالانکہ ابھی تو انہیں عالمِ برزخ کا سامنا ہے جو کہ قیامت کے دن سے پہلے تک ہے)

اس آیت میں واضح الفاظ کے ساتھ عالمِ برزخ کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ آیت اس امر کا بین ثبوت فراہم کرتی ہے کہ دنیا کی زندگی اور قبر سے اٹھائے جانے کے بعد کی زندگی کے درمیان (دنیا کی زندگی کے بعد اور آخرت وقیامت کی زندگی سے پہلے) ایک زندگی ہے، تاہم اس سلسلے میں تفصیلی ذکر سورۂ مؤمنون کی تفسیر میں ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

عالمِ برزخ کے ثبوت پر ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

سورہ فرقان، آیت ۲۲-۲۶:

O" وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ نَرٰي رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰۗىِٕكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَاۗءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاۗءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰۗىِٕكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذِۨ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَي الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾"

(جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ فرشتے خود ہم پر کیوں نازل نہیں کئے جاتے یا ہم خود اپنے پروردگار کو کیوں نہیں دیکھتے؟ ان لوگوں نے اپنے تئیں تکبر کیا ہے اور بہت بڑے غرور و سرکشی کے مرتکب ہوئے ہیں؟

جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لئے کوئی خوشی و خوشخبری نہ ہوگی اور وہ پے در پے امان و پناہ چاہیں گے اور ہم ان کے اعمال کا جائزہ لے کر سب کچھ ہیچ و ناچیز بنا دیں گے اس دن اہل بہشت بہترین مقام اور بہترین منزل میں ہوں گے اور اس دن آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور فرشتے یکے بعد دیگرے نازل ہوں گے' اس دن حقیقی اقتدار خدا کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت دشوار ہوگا)۔

ان آیات میں خداوند عالم نے آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے پہلے اہلِ بہشت کے بہترین مقام و منزل میں ہونے کا تذکرہ کیا ہے جس سے ان کی زندگی کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ زندہ افراد ہی مقام و منزل پاتے ہیں اور اسی زندگی کو برزخ کی زندگی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' اس موضوع کی مزید وضاحت مذکورہ آیات کی تفسیر کے مقام پر ہوگی۔

جو آیات شریفہ عالمِ برزخ کا ثبوت فراہم کرتی ہیں ان میں سے ایک آیت مبارکہ یہ ہے:

سورۂ مومن، آیت ۱۱:

"قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ ۞"

(انہوں نے کہا پروردگارا! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور دو بار زندہ کیا تو اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں آیا ہمارے لئے کوئی راہِ نجات ہے؟)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ بیان قیامت کے دن ہوگا اور اس سے پہلے وہ دو بار موت اور دو بار زندگی پا چکے ہوں گے' یہ بات اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے جب عالمِ برزخ کو تسلیم کیا جائے تا کہ ایک بار موت اور ایک بار زندگی اور پھر ایک بار موت اور قیامت کے دن ایک بار زندگی ثابت ہو سکے یعنی ایک بار دنیا میں مرنا اور ایک بار برزخ میں زندہ ہونا اور پھر ایک بار برزخ میں مرنا اور پھر قیامت کے دن زندہ ہونا' اس طرح دو بار موت اور دو بار زندگی کی بات صحیح بنتی ہے ورنہ اگر زندگی صرف دو بار میں منحصر ہو یعنی ایک بار دنیا میں اور ایک بار آخرت میں تو دو بار موت کی بات درست نہ ہو گی کیونکہ اس صورت میں صرف ایک بار موت ہوگی' یاد رہے کہ عالمِ برزخ کے سلسلہ میں سورۂ بقرہ، آیت ۸۲ کی تفسیر میں بھی کچھ مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں' رجوع فرمائیں۔

عالمِ برزخ کے بارے میں ایک اور آیت، ملاحظہ ہو:

سورۂ مومن، آیت ۴۶:

"وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۞ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ"

(آلِ فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا، آگ کا عذاب ہر صبح و شام ان پر ڈالا جاتا ہے اور جس دن قیامت بپا ہوگی تو کہا جائے گا اے فرشتو! آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو)

واضح ہے کہ قیامت کے دن صبح وشام نہیں ہوگی اور وہ دن عام دنوں کی طرح کا نہیں ہوگا لہٰذا یہ کسی دوسرے صبح و شام کا ذکر ہے۔۔گویا عالمِ برزخ کے عذاب کا تذکرہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ عالمِ برزخ کے بارے میں کثیر آیات موجود ہیں جن سے اس قرآنی حقیقت کا واضح ثبوت ملتا ہے یا کم از کم ان میں اس مسلم الثبوت امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مثلاً:

سورۂ نحل، آیت ۶۳:

O " تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ"

(قسم بخدا ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول امتوں کی طرف بھیجے لیکن شیطان نے لوگوں کے سامنے ان کے اعمال خوبصورت کر کے پیش کئے آج بھی وہ ان کا سرپرست ہے اور انہیں سخت عذاب کا سامنا ہے)۔

تجردِ نفس کی بحث

زیر بحث آیت اور عالمِ برزخ کے سلسلہ میں ذکر کی گئی دیگر آیات میں تدبر اور غور وفکر کرنے سے ایک اور حقیقت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے جو کہ عالمِ برزخ کی حقیقت سے بھی زیادہ وسعت کی حامل ہے جسے "تجردِ نفس" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ نفس (روح) بدن سے علیحدہ ایک حقیقت کا نام ہے یعنی روح اور چیز ہے اور بدن اور چیز' اس کی خصوصیات و تقاضے بدن کی خصوصیات و تقاضوں بلکہ ہر جسمانی ترکیب کی حامل شے کے تقاضوں اور خصوصیات سے مختلف ہیں۔ بدن سے اس کا مخصوص تعلق و وابستگی اور یگانگت کا رشتہ ہے اور وہ قوتِ شعور و ارادہ اور دیگر ادراکات کے ذریعے بدن کے نظام کو چلاتی ہے' جو آیات ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ان میں غور وفکر کرنے سے بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ انسان صرف بدن سے عبارت نہیں لہٰذا بدن کے مرجانے سے انسان نہیں مرجاتا اور نہ ہی بدن کے نابود ہوجانے اور اس کی جسمانی ترکیب کے درہم برہم ہوجانے اور اجزاء و اعضاء کے ٹوٹ پھوٹ جانے سے انسان خود بھی محو و نابود ہوجاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان بدن کے ختم ہوجانے کے بعد بھی زندہ ہوتا ہے اور دو صورتوں میں سے ایک کا حامل ہوتا ہے: یا تو خوشی و خوشحالی، ہمیشہ کی پاکیزہ زندگی اور دائمی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے یا پھر شقاوت و بدبختی اور دردناک عذاب میں ہمہ وقت مبتلا رہتا ہے' اس صورت میں اس کی سعادت و خوش بختی یا شقاوت و بدبختی اس کی باطنی کیفیتوں اور اس کے اعمال سے وابستہ ہوتی ہے نہ کہ اس کی جسمانی کیفیتوں و حالتوں اور معاشرتی مقام و منزلت سے!۔

یہ وہ حقائق ہیں جو مذکورہ (زیر بحث) آیات سے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ یہ تمام خصوصیات جو نفس (روح) کی بابت بیان کی گئی ہیں جسمانی کیفیتوں و خصوصیات سے مختلف ہیں اور دنیاوی مادی خصوصیات سے ہر لحاظ سے منافی ہیں لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ انسانی نفس (روح) بدن سے مختلف چیز ہے اور صرف عالمِ برزخ سے مربوط آیات ہی نہیں

بلکہ دیگر آیات سے بھی یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے ملاحظہ ہو:

سورہ ءزمر، آیت ۴۲:

○ " اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰى "

(اللہ نفسوں کو قبض کر لیتا ہے ان کی موت کے وقت اور ان نفسوں کو بھی جن پر موت نہیں آئی ہوتی ان کی نیند کے عالم میں۔قبض کرتا ہے۔پھر جن کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے انہیں روک لیتا ہے اور باقی کو چھوڑ دیتا ہے)۔

اس آیت میں کلمہ "یتوفی" استعمال ہوا ہے۔ "توفی" اور استیفاء سے مراد مکمل اور پورا پورا حق لینا ہے چونکہ آیت میں لینے اور روکنے اور چھوڑ دینے کا ذکر ہوا ہے لہٰذا اس سے نفس اور بدن کے فرق کا واضح ثبوت ملتا ہے:

سورہ ءسجدہ، آیت ۱۱:

○ " وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱

(انہوں نے کہا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ نئے سرے سے خلق کئے جائیں گے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات پر ایمان ہی نہیں رکھتے' ان سے کہہ دیجئے کہ موت کا فرشتہ جسے تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہیں پوری طرح' اپنے قبضہ میں' لے لے گا پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے)۔

اس آیت میں خداوند عالم نے کفار کے معاد سے انکار کے نظریہ کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ آیا مرنے کے بعد ہم دوبارہ خلق کئے جائیں گے جبکہ ہمارے بدن کی ترکیب درہم برہم ہو چکی ہوگی اور اس کے اعضاء واجزاء متفرق اور شکل وصورت بدل وبگڑ چکی ہوگی اور ہم زمین کے اندر گم ہو چکے ہوں گے یہاں تک کہ ہمارے حواس اور ادراک واحساس کی تمام قوتیں ختم ہو چکی ہوں گی اور کوئی شخص بھی ہمیں نہ ڈھونڈ پائے گا اور نہ ہی کسی کے ادراکات ہمیں سمجھ پائیں گے ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ایک نئی مخلوق بن جائیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ نظریہ ایک غلط فہمی کے سوا کچھ بھی نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی ٹھوس بنیاد ہے انہوں نے ایک حقیقت کو بلاوجہ ناممکن تصور کر لیا ہے چنانچہ خداوند عالم نے اس کے جواب میں اپنے نبیؐ سے ارشاد فرمایا: ان سے کہہ دیجئے کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہیں پوری طرح اپنے قبضہ میں لے لے گا ....{قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ} خلاصہ ءجواب یہ ہے کہ ایک فرشتہ تم پر مقرر کیا گیا ہے جو تمہیں اپنے قبضہ میں لے کر پورے طور پر۔۔ مکمل صورت میں۔۔ تمہیں اپنے پاس اپنی حفاظت میں رکھے گا اور تمہیں گم نہ ہونے دے گا اور یہ تو تمہارے بدن ہیں جو زمین میں گم ہو گئے نہ کہ تمہارے نفوس، کیونکہ یہ تمہارے نفوس ہی ہیں جن کے لئے لفظ "کم" (تم) استعمال کیا گیا ہے **(فانه یتوفیکم)**

سورہء سجدہ، آیت ۹:

○ "وَ نَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوْحِهٖ"

(اور خدا نے اپنی روح اس میں پھونک دی)

یہ آیت انسان کی تخلیق سے مربوط آیات میں سے ایک ہے۔

سورۂ اسراء، آیت ۸۵:

○ "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۖ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ"

(وہ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں ان سے کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کا ایک امر ہے)

اس آیت میں روح کو "امرالٰہی" سے تعبیر کیا گیا ہے، پھر امر کے متعلق ارشاد ہوا:

سورہء یس، آیت ۸۳:

○ "اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ"

(اس کا امر یہ ہے کہ وہ جب بھی کسی چیز کے بارے میں ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا، وہ ہو جاتی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے)

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ روح، عالمِ ملکوت سے ہے اور اسے ہی لفظ "کن" سے تعبیر کیا گیا ہے، پھر ایک اور آیت میں "امر" کی توصیف ان الفاظ میں فرمائی:

سورہء قمر، آیت ۵۰:

○ "وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ"

(اور ہمارا امر نہیں ہے مگر ایک، آنکھ جھپکنے کی مانند!)

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ امر ایک، اور آنکھ جھپکنے کی مانند ہے (كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ) تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امر جسے لفظ "کن" سے تعبیر کیا گیا ہے ایک ہی دفعہ میں وجود میں آنے والی حقیقت ہے نہ کہ تدریجی طور پر، لہٰذا وہ دفعتاً وجود میں آنے کی وجہ سے اپنے وجود میں آنے کے لئے کسی زمان و مکان کی پابند نہیں، بنابراین یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ "امر" کہ جس کا ایک مصداق روح ہے، جسمانی و مادی چیز نہیں کیونکہ مادی و جسمانی موجودات کی بنیادی پہچان یہ ہے کہ وہ تدریجی طور پر وجود میں آتی ہیں نہ کہ دفعتاً، اسی لئے وہ زمان و مکان کی محتاج و پابند ہوتی ہیں، پس جو روح انسان میں پائی جاتی ہے مادی و جسمانی نہیں البتہ مادہ و جسم سے اس کا تعلق و ربط ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ وہ تعلق و ربط کس طرح کا ہے تو اس سلسلے میں کئی آیات موجود ہیں جو روح کے مادہ سے تعلق کو واضح کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

سورہ طٰہٰ، آیت ۵۰:

○ "مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ"۔

(اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا)

سورہ رحمن، آیت ۱۴:

○ "خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ"۔

(انسان کو ٹھیکری کی طرح کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا)

سورہ سجدہ، آیت ۸:

○ "وَ بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ"۔

(انسان کی تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی پھر اس کی نسل نطفہ جیسے گندے پانی سے۔ (ناچیز پانی کے جوہر (نچوڑ)۔ سے بنائی)۔

سورہ مومنون، آیت ۱۴:

○ "وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ۖ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ؕ"۔

(اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، پھر ہم نے اسے نطفہ بنا کر ایک محفوظ جگہ میں رکھا، پھر ہم نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا، پھر اس جمے ہوئے خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہم نے ان ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنایا' پھر ہم نے اسے دوسری صورت میں پیدا کیا' پس بابرکت ہے خدا کہ جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے)۔

اس آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان پہلے پہل ایک مادی و طبیعی جسم سے زیادہ کچھ نہ تھا پھر وہ مختلف مراحل طے کرتا ہوا اپنی تخلیق کے ابتدائی سفر میں یہاں تک پہنچا کہ خداوند عالم نے اس کے جامد و منجمد جسم میں روح پھونک کر اسے شعور وارادہ کی حامل نئی مخلوق بنا دیا چنانچہ اس نے ایسے کام انجام دینا شروع کر دیئے جو جسم و مادہ کے بس میں نہیں مثلاً کائنات کے بارے میں غور وفکر کرنا' موجوداتِ عالم سے بھرپور استفادہ اور ان کے تمام امور میں حسب منشاء تبدیلی وغیرہ، تو یہ سب کام شعور وارادہ کی قوت سے انجام پذیر ہوتے ہیں اور جسم و جسمانیات سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں' بنابراین نہ تو وہ افعال (ارادہ وتفکر وغیرہ) جسمانی ہیں اور نہ ہی ان کا موضوع کہ جو ان کے فاعل ہونے کی حیثیت رکھتا ہے (روح) جسمانی چیز ہے۔

بہرحال نفس، اس جسم کی نسبت کہ جو ابتداء میں اس کے وجود میں آنے کا سبب تھا ایسے ہے جیسے پھل کی نسبت

درخت سے ہوتی ہے اور روشنی کی تیل سے (تاہم اس تمثیل ومقایسہ میں بہت بُعد پایا جاتا ہے)۔ بہر حال اس بیان سے روح کے بدن سے تعلق اور بدن سے اس کے وجود میں آنے کی بابت مطالب واضح ہو گئے' پھر موت آنے سے یہ ربط و تعلق ختم ہو جاتا ہے اور بدن کا روح سے کوئی ربط باقی نہیں رہتا گویا ابتداء میں روح اور بدن دونوں ایک ہی چیز تھے، روح عین بدن تھی پھر خدا نے اسے بدن سے الگ حیثیت عطا کی اور بدن پر موت طاری ہونے سے وہ اس سے بالکل الگ ہوگئی' یہ تمام مطالب مذکورہ بالا آیاتِ شریفہ سے بظاہر معلوم ہوتے ہیں ان کے علاوہ دیگر آیات ایسی ہیں جن میں اشارہ و کنایہ کے ساتھ مذکورہ حقائق کو بیان کیا گیا ہے' اربابِ بصیرت ان آیات میں غور و فکر کر کے تمام حقائق سے آگاہ ہو سکتے ہیں' واللہ الہادی۔

اہل ایمان کا ابتلاء وامتحان

○ "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ"

اس سے پہلی آیت میں خداوند عالم نے اہلِ ایمان کو صبر وصلوٰۃ (نماز) کے ذریعے طلبِ نصرت کا حکم دیا اور پھر انہیں اس بات سے منع کیا کہ وہ خدا کی راہ میں قتل کئے جانے والوں کو مردہ کہیں اور فرمایا کہ وہ زندہ ہیں' اب زیر نظر آیت میں ان سب باتوں کی اصل وجہ بیان فرمائی یعنی اس بات کو واضح کیا کہ صبر وصلوٰۃ کے ذریعے استعانت کا حکم کیوں دیا اور شہداء کو مردہ کہنے سے کیوں منع کیا اور یہ کہ عنقریب انہیں آزمائش وامتحان میں مبتلا کیا جائے گا اور اس آزمائش وامتحان ہی کے ذریعے بلند مراتب وکمالات' عزت وشرف کی حامل زندگی اور دین اسلام کی پاکیزہ نعمت سے بہرہ ور ہونا ممکن ہوگا' اور وہ آزمائش وامتحان جنگ وقتال کی صورت میں ہے اور اس میں کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ ان دو مضبوط قلعوں یعنی صبر وصلوٰۃ میں پناہ لے کر اپنے تحفظ کو یقینی بنائیں اور ان دو قوتوں سے اپنے آپ کو لیس کر لیں تا کہ کامیابی ان کا مقدر بن جائے' اور ان دو کے علاوہ ایک تیسری قوت بھی ہے اس سے بھی اپنے آپ کو مزین کریں اور وہ ایسی قوت ہے کہ جس میں ہر قوم کی کامیابی کی ضمانت موجود ہے' جو قوم اس کی حامل ہوئی وہ اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوئی' کمالات کی بلندیوں کو پایا' عرصۂ کارزار میں ہمت وحوصلہ بڑھا اور جنگ کا میدان ان کے لئے حجلۂ عروسی (ڈولی) کی طرح پسندیدہ ہو گیا اور وہ قوت عبارت ہے اس عقیدہ ونظریہ سے کہ جنگ میں قتل کئے جانے والے افراد مرتے اور محو ونابود نہیں ہوتے، ان کی جان ومال کی قربانی ضائع نہیں جاتی، اگر وہ دشمن کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو غازی کہلائے اور ایسی زندگی پائی کہ اب دشمن اپنے ظلم وجور کے ساتھ ان پر حکومت نہیں کر سکتا، دشمن کی باطل نواز قوتیں ان کے سامنے مغلوب ہو گئیں اور اگر وہ دشمن کے ہاتھوں قتل ہوئے تب بھی وہ زندہ ہیں اور حقیقی زندگی پا چکے ہیں، اب ان پر جبر واستبداد اور باطل کا تسلط باقی نہیں رہا' گویا قتل کرنے یا قتل ہونے دونوں صورتوں میں وہ کامیاب ہوئے اور ہمیشہ کی زندگی پا گئے۔

زیر بحث آیت میں خداوندِ عالم نے اہل ایمان کو وہ تمام مصائب تکلیفیں اور سختیاں یاد دلائی ہیں جن کا جنگ میں عام طور پر سامنا ہوتا ہے یعنی خوف، بھوک اور جان و مال کی کمی،

آیت میں لفظ ''ثمرات'' (میووں) سے بظاہر اولاد مراد ہے کیونکہ میدانِ جنگ میں مردوں اور جوانوں کی موت سے نسل میں جو کمی واقع ہوتی ہے وہ درختوں کے میووں اور پھلوں میں واقع ہونے والی کمی سے کہیں زیادہ الم انگیز ہوتی ہے، تاہم بعض مفسرین کرام نے ''ثمرات'' کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے مراد کھجور کے درختوں سے حاصل ہونے والے فوائد ہیں اور ''اموال'' سے مراد کھجور کے علاوہ دیگر اموال ہیں یعنی چوپائے، اونٹ اور بھیڑ بکریاں۔

صبر کرنے والوں کے لئے خوش خبری

○ ''وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ''

خداوندِ عالم نے ایک بار پھر ''صبر کرنے والوں'' کا تذکرہ کیا تا کہ:

۱۔ انہیں بشارت وخوشخبری دے۔

۲۔ صبر کرنے کا طریقہ بتائے اور ''صبر جمیل'' کی حقیقت سے آگاہ کرے۔

۳۔ اس اصلی وجہ کو بیان کرے جس سے صبر کرنا واجب وضروری ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان کا حقیقی مالک خدا ہے اور مالک کو اپنی مملوکہ چیز میں ہر طرح کے تصرف کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

۴۔ صبر کرنے کے نتیجہ میں اس کی جزاء سے آگاہی دلائے کہ وہ خدا کی طرف سے درود، رحمت اور ہدایت پاتے ہیں۔

بنا بر ایں خداوندِ عالم نے سب سے پہلے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو خوشخبری دیں، البتہ صرف خوشخبری و بشارت دینے کا حکم دیا (وَبَشِّرِ....) لیکن خوشخبری دیئے جانے والے امر کی عظمت کے پیش نظر اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اس کی عظمت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کی خوشخبری خداوندِ عالم نے دی ہے اور جس چیز کی خوشخبری پروردگار خود دے وہ بجز خیر وجمیل نہیں ہوسکتی، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کی ضمانت بھی خداوندِ عالم نے خود دی ہے۔

اپنے نبیؐ کو خوشخبری دینے کا حکم دینے کے بعد خداوندِ عالم نے صبر کرنے والوں کی توصیف فرماتے ہوئے ان کے بارے میں بیان کیا کہ وہ مصیبت کی حالت میں یہ الفاظ وردِ زبان کرتے ہیں '' اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ '' (ہم اللہ کے لئے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)۔

''مصیبت'' سے مراد ہر وہ امر ہے جو انسان کو لاحق ہوتا ہے (انسان اس سے دوچار ہوتا ہے) تاہم یہ لفظ (مصیبت) صرف ناخوشگوار واقعہ و ناگوار امر کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جہاں تک مصیبت کی حالت میں '' اِنَّا لِلّٰهِ ...'' کہنے کا تعلق ہے تو یقینی بات ہے کہ اس سے مراد صرف زبان سے یہ الفاظ جاری کرنا نہیں جبکہ ان کے معانی کی طرف

توجہ والتفات ہی نہ ہو اور نہ ہی اس سے مراد ان الفاظ کے معانی کی طرف صرف توجہ والتفات کرتے ہوئے ان کو زبان پر لانا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان الفاظ کے معانی کی حقیقت پر ایمان بھی ہو اور وہ حقیقت یہ ہے کہ انسان حقیقی معنی میں خدا کا مملوک ہے اور خدا اس کا حقیقی مالک ہے اور اس کی بازگشت بھی اپنے حقیقی مالک یعنی خدائے قدوس کی طرف ہونی ہے' اسی ایمان و عقیدہ کی بنیاد پر ''صبر'' کی سب سے بہتر صورت وجود میں آتی ہے کہ جس سے چیخ و پکار اور جزع وفزع کا احساس پیدا ہی نہیں ہوتا اور غفلت و بے توجہی کی گندگی صفحۂ دل سے دور ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ انسان کا وجود اور اس سے وابستہ ہر شے خواہ اس کی قوتیں اور توانائیاں ہوں یا اس کے افعال و اعمال، سب خدائے ذوالجلال کی مقدس ذات سے مربوط و وابستہ اور اس کی عنایات کے محتاج ہیں کہ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے وادیٔ عدم سے نکال کر وجود کی نعمت عطا فرمائی لہٰذا انسان ہر لحہ اس کے رحم وکرم پر باقی ہے اور اپنے تمام امور واحوال میں اس کی عنایتوں کی احتیاج رکھتا ہے، نہ تو اپنے وجود میں آنے میں اور نہ ہی اپنی بقاء میں اس سے بے نیاز ہے بلکہ ہر لحاظ سے اس کا محتاج اور اس کے خوان عنایت کا خوشہ چین ہے اور اس کی نسبت ایسا فقیر و نادار ہے کہ اس کی کرم نوازی کے بغیر لحہ بھر زندہ نہیں رہ سکتا اگر خدا اپنی نظر عنایت اس سے پھیر لے تو اس کا وجود ہی ختم ہو جائے، وہ اس کا حقیقی مالک ہے لہٰذا اسے اس کے تمام امور میں مکمل اختیار حاصل ہے وہ جس طرح چاہے انسان کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے' انسان اپنے تئیں۔۔اس کی عنایتوں کے بغیر۔۔کوئی قدرت واختیار ہی نہیں رکھتا کیونکہ اس کی ہر چیز خدا کی ملکیت ہے، اس کا وجود، اس کی تمام توانائیاں اور اس کے تمام افعال حقیقی معنے میں خدا کی ملکیت اور اس کے دائرۂ اختیار میں ہیں تاہم خدائے قدوس نے اسے اذن واجازت اور اختیار عطا فرمایا ہے کہ وہ ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب کرے اسی وجہ سے وجود اور وجود کی قوتوں کی نسبت انسان کی طرف دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے: ''انسان کا وجود' انسان کی عقل' انسان کی جسمانی قوت' انسان کی آنکھیں' کان' ہاتھ پاؤں وغیرہ، اور اسی طرح انسان کے افعال مثلاً چلنا' بولنا' کھانا پینا وغیرہ کی نسبت خود اسی کی طرف دی جاتی ہے تو یہ تمام نسبتیں مالک حقیقی خداوند قدوس کے اذن واجازت سے ہیں ورنہ اگر وہ اذن نہ دیتا تو انسان اور نہ ہی کائنات میں کوئی مخلوق ان ظاہری نسبتوں کو پا سکتی کیونکہ کوئی فردِ کائنات خود سے کوئی استقلال نہیں رکھتا جو کچھ بھی ہے خدا کی ملکیت ہے سب اس کے مملوک ہیں حقیقی مالک وہی ہے، اور سب کچھ اس کا ہے یہ تو اس کی عنایت ہے کہ اس نے انسان کو وجود اور اس میں پائی جانے والی قوتوں کے استعمال اور انہیں اپنی طرف منسوب کرنے کا اذن واختیار عطا فرمایا ہے تاکہ وہ اپنی معاشرتی زندگی آسانی سے گزار سکے' لیکن افسوس کہ انسان غلط فہمی کا شکار ہو گیا اور اپنے آپ کو حقیقی مالک سمجھنے لگا جبکہ حقیقت امر اس سے قطعی طور پر مختلف ہے اور حقیقی مالک تو صرف خداوند عالم ہے، اگر اس کا اذن واجازت نہ ہو تو کوئی چیز کسی کی ظاہری ملکیت بھی نہیں کہلا سکتی اور یہ سب کچھ اسی دنیا تک ہے ورنہ آخرت میں سب کچھ خدا کی ملکیت میں ہوگا اور پھر صورتِ حال اسی طرح ہو جائے گی جیسے اذن واجازت سے پہلے تھی یعنی ظاہری و حقیقی دونوں نسبتیں اسی سے مخصوص ہو جائیں گی چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے خود ہی مطلع وآگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سورہ مومن، آیت ۱۶:

○ "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ"۔

(آج ملکیت کس کے پاس ہے؟ اللہ ہی کے پاس ہے جو ایک ہے اور قہار ہے)

اس دن (روز قیامت) ملکیت کی تمام نسبتیں ختم ہو جائیں گی اور انسان اپنی تمام ملکیتوں سمیت خدا کی طرف لوٹ آئے گا پھر سب نسبتیں، حقیقی مالک خدائے واحد وقہار کے ساتھ مخصوص ہو جائیں گی۔

مذکورہ بیان سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ملکیت دو طرح کی ہے: ایک حقیقی اور دوسری ظاہری و غیر حقیقی، حقیقی ملکیت خداوند قدوس کے ساتھ مختص ہے کہ جس کا اس ملکیت میں کوئی شریک نہیں، نہ کوئی انسان اس کے ساتھ اس ملکیت میں شریک ہے اور نہ دوسری کوئی مخلوق، اور جہاں تک انسان کا اپنی ذات، اپنی اولاد اور اپنے مال و دولت کے مالک ہونے کا تعلق ہے تو یہ ملکیت کی دوسری قسم یعنی ظاہری و غیر حقیقی ملکیت کے باب سے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سب کا حقیقی مالک تو خدا ہے لیکن اس نے انسان کو ظاہری مالک ہونے کا حق عطا فرمایا ہے تو انسان ان کا مجازی مالک ہے۔

بنا بریں جب انسان خداوند عالم کی ملکیت کے بارے میں غور وفکر کرے اور اس کے اصل معنی و مفہوم پر توجہ کرے اور پھر اس ملکیت کے اپنی ذات سے تعلق و ربط کو بھی ملحوظ رکھے تو اس بات سے آگاہ ہو جائے گا کہ وہ خود اپنے پروردگار کا مملوک اور ہر لحاظ سے مکمل طور پر اس کی ملکیت میں ہے اس کے بعد اس بات کی طرف توجہ کرے کہ انسانوں کے درمیان پائی جانے والی ملکیت کہ جس میں انسان کا اپنی ذات، اپنی اولاد اور اپنے مال و دولت وغیرہ کا مالک ہونا شامل ہے بہت جلد ختم ہو جائے گی اور اس کا کوئی اثر و نشان باقی نہ رہے گا اور سب کچھ خدا کی طرف لوٹ جائے گا تو اس حقیقت سے باخبر ہو جائے گا کہ بالآخر وہ کسی چیز کا بھی مالک نہیں ہے نہ حقیقی معنی میں اور نہ ہی مجازی طور پر، اور جب وہ کسی چیز کا نہ حقیقی مالک ہے نہ مجازی تو پھر ان کے چھن جانے اور ان سے محروم ہو جانے کی صورت میں غمزدہ بھی نہ ہوگا اور کسی مصیبت کے آنے پر مغموم و غمگین بھی نہ ہوگا کیونکہ اس چیز سے محروم ہونے پر افسوس ہوتا ہے جو انسان کی ملکیت میں ہو کہ اس کے حاصل ہونے پر خوش اور مسرور اور اس سے ہاتھ دھو بیٹھنے پر مغموم و محزون ہوتا ہے لیکن جب اسے اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ کسی چیز کا مالک ہی نہیں ہے تو وہ اس محرومی پر غمگین و افسردہ نہیں ہوتا، وہ مغموم و محزون ہو بھی تو کیوں جبکہ اس کا ایمان ہے کہ ہر چیز کا مالک صرف خدائے یکتا ہے اور اسے اپنی مملوکہ چیز میں ہر طرح سے کامل تصرف کا مکمل اختیار حاصل ہے۔

ایک اخلاقی بحث

اخلاقِ نفس، یعنی علم و عمل میں بلند پایہ کمالات کے حصول کی بنیادی صلاحیتوں کی اصلاح و بہتری، لوحِ دل کو پاکیزہ خصلتوں سے مزین کرنا اور پست عادات سے پاک کرنا صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے اور وہ ہے اعمال صالحہ کا بار بار بجا

لانا' یعنی ایسے اعمال کا مکرر در مکرر انجام دینا جو پاکیزہ عادات سے ہم رنگ ہوں اور انہیں اتنی کثرت سے انجام دیا جائے کہ ان کی اثر آفرینی بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے تمام موارد میں نمایاں طور پر ظاہر ہو، یہاں تک کہ وہ اعمال ان خوبیوں اور پاکیزہ عادات کی خصوصیات کے ساتھ لوح دل پر ثبت ہو جائیں کہ پھر نقش بر سنگ کی طرح یا تو بالکل ہی نہ مٹ سکیں یا کم از کم ان کا مٹانا آسان نہ ہو مثلاً اگر کوئی شخص بزدلی کی ناپسندیدہ صفت کو اپنے سے دور کر کے اس کی جگہ شجاعت و بہادری کی فضیلت حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ بار بار ایسے کام انجام دے جو عام طور پر انسان کو خوفزدہ کر دیتے ہیں اور اس کا دل ہلا دیتے ہیں ایسا کرنے سے رفتہ رفتہ اس کا دل مضبوط ہو جائے گا اور خوفناک حالات میں بھی وہ اپنے آپ پر قابو پالے گا۔ صرف یہی نہیں کہ اس کا دل مضبوط ہو جائے گا اور ہر طرح کا ڈر اور خوف اس کے دل سے نکل جائے گا بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ وہ اپنے تئیں لطف اندوز بھی ہوگا اور اس کا دل مطمئن و خوش ہوگا، وہ کسی سے خوف کھانے اور بھاگ جانے کو اپنے لیے ننگ و عار سمجھنے لگے گا یہاں تک کہ شجاعت و بہادری کے کارناموں کا بار بار انجام دینا اس کے دل میں ایک بھرپور شجاعانہ صلاحیت کو جنم دے گا' بنا بر ایں شجاعت و بہادری کی عظیم صلاحیت و مہارت کا حصول اگرچہ انسان کے اختیار میں نہیں تاہم اس کے اسباب اور ابتدائی مراحل (مقدمات) کی تکمیل یقیناً اس کے اختیار میں ہے لہٰذا مقدماتی و ابتدائی امور کے اختیاری ہونے کے حوالہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شجاعانہ صلاحیت و علمی مہارت کا حصول بھی بالواسطہ اختیاری ہے۔

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اخلاق کی پاکیزگی اور اخلاقی فضیلتوں کا حصول اعمال صالحہ کے مکرر در مکرر انجام دینے ہی سے ممکن ہے اور اس میں دو مسلک اور مکتب فکر ہیں کہ جن میں سے کسی ایک کا انتخاب و اختیار ناگزیر ہے:

پہلا مسلک: (دنیاوی فوائد کو ملحوظ رکھنا)

اس مسلک کی بنیاد تہذیب نفس میں فضیلتوں کے دیناوی فوائد اور ان علوم و نظریات اور آراء کو ملحوظ رکھنا ہے جو لوگوں کے پسندیدہ ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے:

عفت و پاکدامنی (اپنے آپ کو قبیح عادات و اعمال سے بچانا) اور قناعت کرنا، جو کچھ اپنے پاس ہے اس پر راضی رہنا اور جو کچھ دوسروں کے پاس ہے اس میں ہرگز توجہ و دلچسپی نہ لینا' دو اچھی صفتیں ہیں اور یہ لوگوں کی نظروں میں عزت و عظمت کے حصول کا سبب بنتی ہیں اور عوام الناس میں جاہ و احترام کا موجب ہیں جبکہ شہوت پرستی' ذلت و پستی اور فقر و ناداری کا سبب ہے۔

طمع و لالچ پاکیزہ نفس کو آلودہ کر دینے کا موجب ہے۔

علم، عوام میں مقبولیت اور خواص میں عزت و احترام اور انس و محبت دلاتا ہے۔

علم، آنکھ کی طرح ہے کہ ہر مکروہ و ناپسندیدہ چیز کی نشاندہی کرتا ہے تاکہ انسان اس سے بچ سکے اور ہر محبوب و پسندیدہ چیز کو انسان کے سامنے جلوہ گر کرتا ہے تاکہ انسان اسے حاصل کر سکے جبکہ جہالت اندھے پن کے سوا کچھ بھی نہیں۔

علم، انسان کی حفاظت کرتا ہے جبکہ مال کی حفاظت انسان خود کرتا ہے۔

شجاعت و بہادری، ثبات نفس لاتی ہے جس سے انسان پراکندگی افکار سے محفوظ ہو جاتا ہے اور غالب ہونے یا مغلوب ہونے دونوں صورتوں میں لوگوں کی طرف سے قدردانی و تحسین کا مستحق ٹھہرتا ہے جبکہ ڈرپوک آدمی ایسا نہیں ہوتا کیونکہ اگر وہ غلبہ پالے تو اسے اس کے لیے حسن اتفاق کا نام دیا جاتا ہے اور اگر شکست سے دوچار ہو تو اس کی مذمت ہوتی ہے۔

عدل و انصاف، راحت جاں اور سکون نفس سے عبارت ہے کہ اس سے انسان اذیت ناک سختیوں سے نجات پالیتا ہے اور یہی حقیقی معنی میں زندگی ہے جو مرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس میں نیک نامی ملتی ہے لوگ ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں خوبیاں بیان کرتے ہیں اور دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہے وہ مشہور و معروف مسلک کہ جسے قدیم زمانہ سے یونانیوں اور دیگر دانشوروں نے علم اخلاق کی بنیاد قرار دیا ہے لیکن قرآن مجید میں اسے اخلاقیات کی اساس نہیں بنایا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسلک و نظریہ میں عوام الناس کے نقطہء نظر کو اصلی و بنیادی حیثیت دی گئی ہے اور اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ عوام الناس کس چیز کو اچھا اور قابل تعریف اور کسی چیز کو برا اور لائق مذمت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے میں کون سی چیز مستحسن اور کون سی قبیح سمجھی جاتی ہے لہٰذا جس چیز کو معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہو اسے اختیار کیا جائے اور جسے برا سمجھا جاتا ہو اس سے اجتناب کیا جائے، لیکن قرآن مجید نے اخلاق کے معیار کو اس سے بالاتر قرار دیا ہے اور صرف عوام الناس کے ہاں قابل تعریف یا لائق مذمت ہونا اور دنیاوی فوائد کا حائل ہونا ہی نہیں بلکہ اخروی ثواب و جزا کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے اور قرآن میں جہاں کہیں بھی دنیاوی فوائد یا عوام الناس کے ہاں قابل تعریف و لائق مذمت ہونے کی بات ہوئی ہے اس کی بازگشت بھی اخروی ثواب و عقاب کی طرف ہوتی ہے ملاحظہ ہو:

سورہء بقرہ، آیت ۱۵۰:

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۝

(اور تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے منہ اس (کعبہ) کی طرف کرلو تاکہ لوگوں کو تم پر حجت قائم کرنے کا موقعہ نہ مل سکے انہیں تمہارے خلاف بات کرنے کا ثبوت نہ مل جائے)

اس آیت میں خداوند عالم نے ثبات نفس اور عزم و استقلال اختیار کرنے کی دعوت دی ہے اور اس کی وجہ لِئَلَّا يَكُونَ...... کے الفاظ سے لوگوں کو حجت قائم کرنے کا موقعہ فراہم نہ کرنا۔ قرار دیا ہے۔

سورہ انفال، آیت ۴۶:

○ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا۔۔۔،

(آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا جاتی رہے گی (طاقت ختم ہو جائے گی) اور تم صبر اختیار کرو)

اس آیت میں صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسکی وجہ یہ قرار دی گئی ہے کہ صبر نہ کرنا اور آپس میں جھگڑا کرنا معاشرے میں تمہاری پراکندگی و ضعف، آشفتگی احوال اور دشمن کے جری ہو جانے کا سبب بنتا ہے۔

سورہ شوریٰ، آیت ۴۳:

○ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔۔۔،

(جو شخص صبر اختیار کرے اور معاف کر دے تو یہی پختہ ارادہ (عظمت کی نشانی) ہے۔

اس آیت میں خداوند عالم نے صبر کرنے اور معاف کر دینے کی دعوت دی ہے اور اس کی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ ایسا کرنا عزم و بلند ہمتی اور عظمت سے عبارت ہے۔

مذکورہ بالا تینوں آیتوں اور ان جیسی دیگر آیات شریفہ میں اگرچہ بظاہر دنیاوی فوائد کو احکامات کی وجہ اور سبب و مقصد قرار دیا گیا ہے لیکن درحقیقت ان سب کی بازگشت آخرت کے ثواب و اجر اور عقاب و سزا کی طرف ہے۔

دوسرا مسلک :(اخروی فوائد کو مدنظر قرار دینا)

اخلاقیات کے باب میں دوسرا مسلک یہ ہے کہ انسان صرف اخروی فوائد کو ملحوظ رکھے، چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ مطالب موجود ہیں، چند آیات ملاحظہ ہوں:

سورہ توبہ، آیت ۱۱۱:

○ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

(خداوند عالم نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں تاکہ انہیں جنت ملے)

سورہ زمر، آیت ۱۰:

○ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ۔۔۔،

(صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر و ثواب بغیر حساب کے دیا جائے گا)

سورہ بقرہ، آیت ۲۵۷:

○ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ

الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمٰتِ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ،

(اللہ ولی وسرپرست ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے اور جولوگ کافر ہیں ان کے اولیاء وسرپرست طاغوت ہیں جو انہیں نور سے دور کر کے تاریکیوں میں ڈال دیتے ہیں یہی لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے)

سورہ ابراہیم، آیت ۲۲:

إِنَّ الظّٰلِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

(یقیناً ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے)

ان آیات کی مانند مختلف موضوعات کے ضمن میں دیگر کثیر آیات موجود ہیں اور انہی آیات سے ملحق دیگر آیات بھی ہیں مثلاً:

سورہ حدید، آیت ۲۲:

○ مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِيٓ أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ

(نہیں کوئی مصیبت ایسی جو زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں میں مگر یہ کہ وہ کتاب میں اس سے پہلے کہ ہم ان (جانوں) کو پیدا کریں موجود ہے یہ کام اللہ کے لیے بہت آسان ہے)۔

اس آیت مبارکہ میں کسی امر کی بابت افسوس کرنے یا خوش ہونے سے اجتناب کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے کیونکہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے، جو چیز کتاب تقدیر میں لکھی جا چکی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جو چیز مقدر نہیں کی گئی اسے کوئی لا نہیں سکتا سب کچھ خدا کے فیصلوں۔ قضاء وقدر کے ساتھ وابستہ ہے لہٰذا کسی مادی چیز سے محرومی پر افسوس کرنا اور کسی چیز کے حصول پر خوش ہونا بے سود ہے اور اس طرح کے لغو وبے فائدہ کام کسی مومن کو جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ تمام امور کی باگ ڈور خدائے قدوس کے ہاتھ میں ہے زیب نہیں دیتا جیسا کہ خدا نے خود ارشاد فرمایا ہے:

سورہ تغابن، آیت ۱۱:

○ مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَمَن يُؤْمِن بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ...،

(جو مصیبت بھی آتی ہے وہ خدا کے اذن سے آتی ہے اور جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے خدا اس کے دل کی ہدایت فرماتا ہے)

بنابرایں یہ آیات بھی پہلی آیات جیسی ہیں کہ جن میں اخلاقیات کی اصلاح کا ہدف اور مقصد اعلیٰ عظیم اخروی فوائد کا حصول قرار دیا گیا ہے اور وہ فوائد حقیقی کمالات ہیں نہ یہ کہ صرف خیال وگمان کی حد تک کمالات ہوں تاہم ان آیات میں اصلاح اخلاق میں ملحوظ اخروی فوائد...... حقیقی کمالات ...... کے حصول کی بنیاد قضاء وقدر پر پختہ اعتقاد، خدائی اخلاق اپنانا، خدا

کے اسماء حسنی اور عظیم و پاکیزہ صفات الٰہیہ اور ان جیسے دیگر امور کی طرف بھرپور توجہ و التفات رکھنا (انہیں ہمیشہ مدنظر رکھنا اور اساس عمل قرار دینا) ہے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

مذکورہ بالا مطالب کے پیش نظر یہ سوال ممکن ہے کہ اگر سب کچھ قضاء وقدر کی بنیاد پر ہوتا ہے اور ہم نے بھی تمام امور کو اسی اعتقاد کی روشنی میں دیکھنا ہے کہ ان کی اساس قضاء وقدر (خدائی فیصلہ) ہے تو پھر انسان کے (اختیار) کی کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہتی اور یہ بات بھی لغو و بے معنی ہوگی کہ یہ عالمٔ عالم اختیار ہے اور انسان اس میں اپنے اختیار کے ساتھ عمل کرتا ہے جب انسان کے اختیار ہی کی نفی ہو جائے تو فضیلتیں اور اخلاق حسنہ وصفات جمیلہ بے اثر ہو جائیں گی کیونکہ ان سب کی قدر واہمیت انسان کے اختیار کی وجہ سے ہے لہٰذا جب اختیار ہی نہ ہو بلکہ سب کچھ قضاء وقدر اور خدائی فیصلہ سے وقوع پذیر ہو تو اس صورت میں اخلاق وصفات کی کیا حیثیت باقی رہے گی بلکہ اس سے تو عالم طبیعت کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا اس کی وضاحت یوں ہے کہ اگر صفت صبر وثبات اور ترک مسرت وغم کی خوبی اس نسبت سے مانی جائے کہ یہ سب کچھ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور خدا کے حتمی و طے شدہ امر وفیصلہ سے ہے جیسا کہ سابقہ آیت (مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللہِ...) سے بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ بات صحیح ہوگی کہ انسان حصول رزق کی کوشش ہی نہ کرے (روزی کی تلاش میں نہ نکلے) اور نہ ہی کسی کمال کو حاصل کرنے کی سعی کرے اور نہ کسی برائی وقبیح فعل وعادت کو ترک کرے بلکہ ان سب کو قضاء وقدر سے منسوب کرے اور جب اس سے پوچھا جائے کہ تو نے مال ودولت یا کمال کے حصول کی کوشش کیوں نہیں کی یا اپنے آپ کو صفات جمیلہ سے مزین اور قبیح عادات سے منزہ کیوں نہیں کیا تو جواب میں کہے کہ یہ سب کچھ قضاء وقدر اور خدا کے حتمی فیصلہ سے ہوتا ہے اور جو ہونا ہے وہ وہو کر رہتا ہے اس لیے میری کوشش کا فائدہ ہی کیا؟ بنابرایں قضاء وقدر کا عقیدہ انسان کو طلب رزق سے باز رکھتا ہے اور حق کے دفاع سے رکنے کی ترغیب دلاتا ہے کیونکہ جب یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ سب کچھ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور جو کچھ مقدر...... خدائی فیصلہ...... ہو چکا ہے وہ واقع ہو کر رہے گا تو پھر کسی کمال کے حصول کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر چیز کو خدا کے حتمی فیصلے کے طور پر مان لیا جائے ظاہر ہے کہ اگر یہ سب درست ہو تو کسی کمال کے (کمال) ہونے کی حیثیت ہی ختم ہو جائے گی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ہم قضاء وقدر کی بحث میں اس سوال کا واضح جواب دے چکے ہیں اور یہ بات ذکر کر چکے ہیں کہ انسان کا عمل کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے کے علل واسباب میں سے ایک جزء ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر معلول ومسبب اپنے وجود میں آنے کے لیے علت وسبب اور علت وسبب کے تمام اجزاء کا محتاج ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ چونکہ میرا سیر ہونا یا سیر نہ ہونا قضاء وقدر الٰہی میں طے ہو چکا ہے اور کتاب تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اس لیے مجھے کھانے پینے کی کیا ضرورت ہے انتہائی غلط اور احمقانہ بات ہے کیونکہ سیر ہونا معلول ہے اور وہ علت کے بغیر حاصل نہیں

ہوسکتا بنابراین با اختیار کھانا پینا چونکہ سیر ہونے کی علل و اسباب میں سے ایک ہے اس لیے سیر ہونا کسی بھی ایک علت وسبب یا کسی سبب کے ایک جزء کے بغیر ممکن نہیں اور یہ تو نہایت نادانی و جہالت بلکہ واضح غلطی ہے کہ انسان کسی معلول کے وجود کو اس کے علل و اسباب یا کسی ایک علت وسبب کے بغیر تسلیم کرے۔

علت ومعلول کی بابت عام طور پر علم فلسفہ میں تفصیل کے ساتھ بحث کی جاتی ہے لیکن علم فلسفہ کے دیگر موضوعات و مطالب کی طرح یہ بھی ایک عقلی و فطری مسلمہ حقیقت ہے جس کا انکار بدیہیات کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ کسی چیز کا وجود میں آنا اس وقت تک کیونکر ممکن ہوسکتا ہے جب تک اس کے تمام علل و اسباب موجود نہ ہوں کہ اگر ایک سبب بھی کم ہو تو کسی چیز کا وجود میں آنا ناممکن ہوگا مثلاً اگر کسی چیز کے وجود میں آنے کے ایک سو علل و اسباب ہیں تو ان میں سے ننانوے اسباب پائے جائیں اور ایک سبب نہ پایا جائے تب بھی وہ چیز وجود میں نہیں آسکتی، انسان کا ارادہ واختیار اس کے افعال سے یہی نسبت رکھتا ہے یعنی وہ تمام علل و اسباب میں سے ایک ہے ،اگر اس کے علاوہ دیگر اسباب موجود بھی ہوں تب بھی انسانی افعال وجود میں نہ آسکیں گے، تاہم اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس ایک سبب ہی کو (مکمل) سبب سمجھ لیا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے سبب وعلت کی ضرورت ہی نہیں بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ انسان کا ارادہ و اختیار اس کے افعال کے وجود میں آنے کے دیگر متعدد اسباب وعلل میں سے ایک ہے اور اس کی اہمیت وحیثیت کسی فعل کی نسبت اسی طرح سے ہے جیسے اس کے علاوہ دیگر علل و اسباب کی ہے لہٰذا اس کے بغیر دیگر اسباب بے اثر ہیں اور دیگر اسباب کے بغیر اس کا کوئی وجودی اثر نہیں بلکہ ضروری یہ ہے کہ ہر سبب پایا جائے اور انسان سے منسوب کسی بھی فعل کی نسبت انسان کے ارادہ واختیار کے بغیر درست نہیں اور نہ ہی یہ صحیح ہوگا کہ اس کے ارادہ واختیار کے ہوتے ہوئے دیگر اسباب کو نظر انداز کر دیا جائے 'اور علت ومعلول کا عقلی اصول انسان کے تمام افعال اور اسی طرح اس کی معاشرتی زندگی کے تمام امور میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ انسان کی زندگی کے پورے نظام کی بنیاد ہی علت ومعلول کا ناقابل انکار اصول ہے کہ جس کا ثبوت عقل کے ساتھ ساتھ آیات وروایات میں واضح طور پر موجود ہے۔ (مترجم)

بنابراین یہ بات ہرگز درست نہیں کہ انسان (اختیار) کی مسلمہ حقیقت کو بے اثر سمجھ کر نظر انداز کردے جبکہ اسی پر انسان کی دنیاوی زندگی اور اخروی سعادت وشقاوت کا دارومدار ہے اور وہی (اختیار) انسان کے تمام افعال واحوال کی علتوں کے اجزاء میں سے ایک ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رہے کہ جس طرح انسان کے (ارادہ واختیار) کو اس کے افعال واعمال کی علتوں اور اسباب کی فہرست سے خارج نہیں کیا جاسکتا اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان کے افعال واحوال میں اس کے ارادہ واختیار کا کوئی دخل نہیں اسی طرح یہ بھی ہرگز صحیح نہ ہوگا کہ صرف ارادہ واختیار ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے اور اسے ہی تمام افعال واحوال کا واحد سبب اور علت تامہ قرار دے دیا جائے اور یوں کہا جائے کہ موجودات عالم اور کائنات کے علل و اسباب کا کہ جن میں سرفہرست ارادہ الٰہی ہے انسان کے ارادہ واختیار میں کوئی دخل ہی نہیں' اس طرح کا نظریہ کئی مذموم و ناپسندیدہ صفات کا سبب بن سکتا ہے مثلاً خود پسندی' تکبر' بخل' بیجا فرح وسرور اور غم واندوہ وغیرہ، یہ ا

نسان کی جہالت کی نشانی ہے کہ وہ کہے کہ یہ میں ہی ہوں جس نے یہ کام انجام دیا ہے اور میں ہی ہوں کہ جس نے فلاں کام کو ترک کر دیا ہے، اس کا یہ کہنا ہی اس کی خود پسندی' تکبر اور بڑائی یا بخل کا سبب بنتا ہے حالانکہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ اس کے ناقص و نہایت معمولی ارادہ و اختیار سے باہر ہزاروں اسباب موجود ہیں کہ اگر وہ سب کے یکجا نہ ہوتے تو اس کے ارادہ و اختیار کا اثر ہی ظاہر نہ ہوتا اور وہ ہرگز کچھ انجام نہ دے سکتا' جاہل ہے وہ جو یہ کہتا ہے کہ اگر میں فلاں کام کر لیتا تو مجھے یہ نقصان نہ پہنچتا یا میں فلاں نفع سے محروم نہ ہوتا' جبکہ وہ نادان' اور ناسمجھ آدمی اس بات سے غافل ہے کہ اسے نقصان پہنچنے یا نفع سے محروم ہونے کا صرف ایک سبب نہیں بلکہ ہزار ہا اسباب ہیں اور ان ہزاروں علل و اسباب میں سے اگر ایک سبب بھی کم ہو جائے تو نقصان پہنچنے یا نفع سے محرومی کی راہ ہموار ہو جاتی ہے خواہ انسان کا ارادہ و اختیار موجود ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اس کا ارادہ و اختیار خود بھی ان متعدد علل و اسباب سے وابستہ ہے جو انسان کے اختیار کی حدود سے خارج ہیں گویا اختیار خود اختیاری چیز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا مطالب جو کہ قرآنی حقائق کی جھلک اور تعلیمات الٰہیہ کا ماحصل ہے سے آگاہی حاصل کرنے اور زیر بحث موضوع سے مربوط آیات شریفہ میں غور و فکر اور تدبر کرنے سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن مجید صرف بعض اخلاقی امور کی اصلاح کی نسبت قضا وقدر اور (کتاب محفوظ) کی طرف دیتا ہے نہ کہ ہر چیز کو ان سے منسوب کرتا ہے' چنانچہ وہ افعال وصفات یا احوال و صلاحیتیں کہ جن کی نسبت قضاء وقدر کی طرف دینا انسان کے ارادہ و اختیار کی نفی اور اس کے بے اثر و بے دخل ہونے کا سبب بنتا ہے قرآن مجید ہرگز ان کی نسبت قضاء وقدر کی طرف نہیں دیتا بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ انہیں قضاء وقدر کی طرف منسوب کرنا غلط و نادرست قرار دیتا ہے اور اس کی سخت مذمت بھی کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا۔

سورہ اعراف، آیت ۲۸:

O وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ،

(اور جب وہ کوئی برا کام انجام دیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو بھی اسی پر پایا ہے (وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں) اور خدا نے بھی ہمیں اسی کا حکم دیا ہے ان سے کہہ دیجئے کہ خدا کسی برے کام کا حکم نہیں دیتا آیا تم خدا پر وہ کچھ کہتے ہو جو تم جانتے نہیں)۔ ۔خدا کی طرف غلط نسبت دیتے ہو اور اپنی جہالت کی وجہ سے اسے مورد الزام ٹھہراتے ہو؟......،

لیکن وہ امور کہ جن میں قضاء وقدر کی طرف نسبت نہ دینا انسان کے استقلال و اختیار کے اثبات کی دلیل بنتا ہے اور یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال و امور میں اپنی صلاحیتوں کے استعمال کی بابت خود مختار ہے اور کسی کا محتاج نہیں بلکہ ہر ایک سے بے نیاز ہے تو قرآن مجید ان کی بابت قضاء وقدر کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے لوگوں کو ہدایت کا سیدھا راستہ دکھاتا ہے وہ راستہ کہ جس پر چلنے والا کبھی بھٹک نہیں سکتا اور قرآن مجید میں ان امور کی قضاء وقدر کی طرف مخصوص

انداز میں نسبت دینے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قضاء وقدر کی بابت غلط نظریات کی بنیاد پر پیدا ہونے والی وناپسندیدہ ومذموم صفات کی بیخ کنی ہو جائے تاکہ انسان ناآگاہی کا شکار ہو کر کسی چیز کے حصول پر اپنے تئیں اتراتا نہ پھرے اور کسی چیز سے محرومی پر مغموم نہ ہو، مثلاً مالدار لوگوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے (انفاق) کی ترغیب دلانے کے لیے ان اموال کی نسبت خدا کی طرف دے کر یوں ارشاد فرمایا:

سورہ نور، آیت ۳۳:

○ وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ ۰۰۰،

(اور تم انہیں دو۔ اللہ کے۔ اس مال سے کہ جو اس نے تمہیں عطا فرمایا)

اس آیت میں مال کے عطا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف اس لیے دی گئی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو مال انسان حاصل کرے اسے اپنی نادانی کی وجہ سے اپنی قوت بازو کا نتیجہ سمجھ کر خوش ہو اور جو مال اس کے ہاتھ سے چلا جائے اس کی بابت بھی اپنی نادانی و جہالت کی بنیاد پر حزن و ملال کرے بلکہ اپنے اموال کو خدا کا عطیہ سمجھے اور اسے خدا کی راہ میں خرچ کرے تاکہ سخاوت کی پاکیزہ صفت سے مزین اور بخل کی مذموم عادت سے منزہ ہو۔

اسی طرح (انفاق) کے بارے میں واضح الفاظ میں ارشاد ہوا :

سورہ بقرہ، آیت ۳:

○ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ۰۰۰،

(اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا اس میں سے انفاق۔ اللہ کی رضا کے لئے۔ کرتے ہیں)

اس آیت میں انفاق یعنی اللہ کی رضا و خوشنودی کے لیے مال خرچ کرنے کی صفت کے ساتھ رزق عطا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے (رَزَقۡنٰهُمۡ) اور مال و دولت کو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے موسوم کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دلائی جاسکے۔

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورہ کہف، آیت ۶ و ۷:

○ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَسَفًا ۞ اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا،

(شاید آپ ان کے پیچھے اس غم میں ہی اپنی جان دے دیں گے کہ انہوں نے قرآن کو نہیں مانا ہم نے جو کچھ بھی روئے زمین پر موجود ہے اسے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ہم ان کا امتحان لیں کہ ان میں سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے)

اس آیت میں خداوند عالم نے پیغمبر اسلامؐ کو کفار کے اسلام نہ لانے پر غم کرنے سے اس لیے منع کیا ہے کہ ان کا

اسلام نہ لانا۔ کفر پر باقی رہ جانا۔ خدا پر ان کے غلبہ کی دلیل نہیں بلکہ ایک خدائی امتحان و آزمائش ہے کیونکہ خداوند عالم نے روئے زمین کی تمام چیزوں کو اس لیے بنایا تا کہ ان کے ذریعے لوگوں کو آزمائے کہ ان میں سے بہتر عمل کرنے والا۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی صحیح قدر کرتے ہوئے انہیں اس کے حکم کے مطابق استعمال میں لانے والا۔ کون ہے۔

یہ ہے دوسرے مسلک ونظریہ کا خلاصہ کہ جو اصلاح اخلاق کی بابت انبیاء الٰہی کا طریقہ ومکتب فکر وعمل رہا ہے اور اس مسلک ونظریہ کے بارے میں قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتب میں متعدد شواہد پائے جاتے ہیں۔

تیسرا مسلک ونظریہ

قرآن مجید میں اصلاح اخلاق کی بابت ایک اور مسلک ونقطۂ نظر پایا جاتا ہے جو صرف اسی مقدس وعظیم کتاب خدا سے مخصوص ہے اس کے علاوہ کسی دوسری آسمانی کتاب، گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی مقدس تعلیمات اور حکماء الٰہی کے آثار فکری میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا اور وہ یہ ہے کہ روحانی وعلمی لحاظ سے انسان کی تربیت اس طرح سے کی جائے کہ اس کے وجود میں علوم ومعارف گھر کر لیں تا کہ ان علوم ومعارف کے ہوتے ہوئے رذائل واخلاقی پستیاں جنم ہی نہ لے سکیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ رذائل واخلاقی پستیوں کی جڑیں ہی کاٹ دی جائیں نہ یہ کہ جب وہ پیدا ہو جائیں تو ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے جائیں بلکہ علوم ومعارف کی مدد سے صحیح تربیت کی بنیاد پر رذائل واخلاقی پستیوں کے جنم لینے کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں تا کہ وہ وجود ہی نہ پا سکیں۔

اس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ ہر وہ کام جو خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے انجام دیا جائے اس کا سبب ان دو میں سے کوئی ایک ہوگا:

۱۔ جس کے لیے وہ کام انجام دیا گیا ہے اس کے ہاں عزت کے حصول کی خواہش!

۲۔ اس سے ڈرتے ہوئے اور اس کی قوت وطاقت سے خوفزدہ ہو کر!

لیکن قرآن مجید میں خداوند عالم نے ان دونوں چیزوں کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

سورہ یونس، آیت ۶۵:

○ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا...،

(یقیناً ہر طرح کی عزت اللہ کے لیے ہے)

سورہ بقرہ، آیت ۱۶۵:

○ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا...،

(یقیناً ہر طرح کی قوت وطاقت اللہ کے لیے ہے)

جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ہر طرح کی عزت اور ہر طرح کی قوت وطاقت اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور اسے صحیح طور پر

اس پاکیزہ حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جائے تو اس کے دل میں نہ تو ریا کاری و ظاہر سازی کی کوئی خواہش پیدا ہو گی اور نہ ہی وہ غیر خدا سے خوف کھائے گا، نہ غیر خدا سے کوئی امید وابستہ رکھے گا بلکہ کسی بھی سلسلے میں غیر خدا کا سہارا نہیں لے گا' بہر حال جب یہ دو باتیں (ہر طرح کی عزت اور ہر طرح کی قوت و طاقت کا خدا کے پاس ہونا) کسی شخص کے دل میں یقین کی حد تک پہنچ جائیں اور وہ ان کی بابت کسی قسم کے شک و شبہ یا جہل و کم علمی کا شکار نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ دو پاکیزہ حقیقتیں اس کے لوح دل کو رذائل و اخلاقی پستیوں کی گندگی سے پاک کر دیں گی اور اس کے دامن وجود سے رزائل اور مذموم و مکروہ صفتوں کے داغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دھو دیں گی اور ان کی جگہ نہایت پاکیزہ صفات کو جاگزین کر کے اس کے دل کو ان صفات سے مزین کر دیں گی:

تقوائے الٰہی،
خدا کے ہاں عزت پانے کی تمنا،
عزت نفس،
جذبہء اطاعت پروردگار،
خضوع و خشوع،
دل میں خدائے قدوس کی عظمت و کبریائی و ہیبت کا زندہ احساس
اور خدا کے علاوہ ہر ایک سے بے نیازی و استغناء کا علمی و عملی اعتقاد وغیرہ۔

چنانچہ خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں بار بار اس بات کا تذکرہ فرمایا ہے کہ حقیقی ملکیت خدا ہی کے لیے ہے (ان الملك لله) اور جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب خدا کی ملکیت ہے (ان له مافی السموات والارض) اور آسمانوں و زمین کی مالکیت صرف خدا کے لیے ہے (ان له ملك السموات والارض) ان آیات کے بارے میں تفصیلی تذکرہ کئی بار ہو چکا ہے' ان آیات شریفہ میں ملکیت کا ذکر ہوا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تمام موجودات عالم اپنے استقلال سے محروم ہیں اور صرف خدا ہی ہے جو ہر چیز پر مکمل قدرت و اختیار رکھتا ہے ، وہی ہر چیز کا حقیقی مالک ہے، ہر چیز اس کی محتاج ہے، موجودات عالم میں سے کوئی شے اس سے بے نیاز نہیں، خداوند عالم ہر چیز کی ذات اور اس کی ذات سے مربوط تمام اشیاء کا مالک ہے' جو شخص ملکیت کی اس حقیقت کو تسلیم کر لے اور اس پر پختہ ایمان لے آئے تو اس کی نظر میں کوئی چیز اپنی ذات و صفات اور افعال میں استقلال کی حامل نہ ہو گی بلکہ اسے ہر شے استقلال و بے نیازی سے محروم دکھائی دے گی اور پھر وہ کسی صورت میں بھی غیر خدا کی خوشنودی اور اس کے ہاں عزت پانے کی تمنا نہ کرے گا اور نہ خدا کے علاوہ کسی سے دل لگائے گا' نہ کسی کے سامنے اظہار عجز و خضوع کریگا اور نہ کسی کا خوف و امید اس کے دل میں پیدا ہو گی' خدا کی رضا و خوشنودی کے بغیر نہ تو کسی چیز کے حصول پر خوش اور اس سے لطف اندوز ہو گا اور نہ کسی پر

سہارا و بھروسہ کرے گا اپنے تمام امور خدا کے سپرد کرے گا اور تمام موجودات عالم سے بے نیاز ہو کر اپنی تمام تر توجہ والتفات کا مرکز خدا کی ذات کو قرار دے گا' خلاصہ یہ کہ نہ تو اس کی نگاہ خدا کے سوا کسی پر جمے گی اور نہ اس کا دل خدا کے علاوہ کسی کو چاہے گا بلکہ وہ ہر لحہ اور ہر حال میں خدا کی طلب میں رہے گا وہ خدا کہ جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، جس پر فنا و نابودی سایہ فگن نہیں ہو سکتی، وہ خدا کہ جو تمام موجوداتِ عالم کے ختم ہو جانے کے بعد بھی باقی و موجود رہے گا' وہی اس کا مطلوب ہو گا اس کے سوا کوئی چیز اس بندہ، مومن کے دل کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے گی اور وہ ہمیشہ باطل سے دوری و نفرت اور ذات حق تعالیٰ سے قرب و محبت کو اپنا شعار بنائے گا کیونکہ اس کی نظر میں ذات اقدس خداوند عالم کے علاوہ کسی چیز بلکہ خود اپنے آپ کی کوئی وقعت و حیثیت نہیں اور اس کا مطلب و مقصود صرف ذات حق تعالیٰ ہے کہ جس نے اسے عدم سے وجود عطا فرمایا اور اسے نعمت حیات بخشی۔

بہر حال اصلاح اخلاق کی بابت قرآن مجید کے مخصوص مسلک و اصول کے بارے میں متعدد آیات موجود ہیں جن میں سے چند بطور نمونہ و مثال ذکر کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو:

سورہء طٰہ، آیت ۸:

○ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۔۔۔،

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کے لیے تمام اچھے نام ہیں)

سورہء انعام، آیت ۱۰۲:

○ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۔۔۔،

(یہی خدا تمہارا پروردگار ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے)

سورہء سجدہ، آیت ۷:

○ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۔۔۔،

(وہی ہے کہ جس نے ہر چیز کی خلقت اچھی بنائی ہے)

سورہء طٰہ، آیت ۱۱۱:

○ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۔۔۔،

(اور تمام چہرے خدائے حی و قیوم کے سامنے جھک جائیں گے)

سورہء بقرہ، آیت ۱۱۶:

○ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۔۔۔،

(اور سبھی اس کے حضور جھکے ہوئے ہیں)

سورہء اسراء، آیت ۲۳:

O وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ....،

(اور تیرے پروردگار کا حکم ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو)

سورہء فصلت، آیت ۵۳:

O اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ....،

(آیا یہ کافی نہیں کہ تیرا پروردگار ہر چیز پر گواہ (وناظر) ہے)

سورہء فصلت، آیت ۵۴:

O اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍ مُّحِيۡطٌ ....،

(یادرکھو کہ وہ ہر چیز کو اپنے قبضہ میں کئے ہوئے ہے)

سورہء نجم، آیت ۴۲:

O وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الۡمُنۡتَهٰى ....،

(اور تیرے پروردگار ہی کی طرف بازگشت ہے)

اور زیر بحث آیات شریفہ یعنی وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ۙ‏ الَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ .... بھی اسی باب سے ہیں یعنی ان میں بھی اسی تیسرے مسلک کا اشارہ پایا جاتا ہے جو قرآن مجید نے اصلاح اخلاق کی بابت پیش کیا ہے کیونکہ یہ اور ان جیسی دیگر آیات شریفہ جن عظیم و بلند پایہ معارف و مطالب اور مخصوص تعلیمات الہیہ پر مشتمل اور خاص اخلاقی نتائج کی حامل ہیں ان کی مثال نہ تو کسی علم اخلاق کے ماہر کے بیانات و تعلیمات میں ملتی ہے اور نہ ہی سابقہ شریعتوں میں کسی نبی و پیغمبر کے ارشادات عالیہ و احکام واخلاقی اصولوں میں پائی جاتی ہے، چنانچہ آپ نے پہلے اور دوسرے مسلک وطریقہء اصلاح اخلاق کے تذکروں میں ملاحظہ فرمایا ہے کہ پہلا مسلک عام معاشرتی نظریات پر مبنی ہے کہ جس کے مطابق کسی چیز یا کام کے اچھا یا برا ہونے کا معیار لوگوں کے افکار و مزاج اور ان کے نزدیک طے شدہ امور و اصول ہیں لہٰذا جسے لوگ اچھا کہیں وہ اچھا اور جسے لوگ برا کہیں وہ برا ہوگا' اور دوسر مسلک کہ جسے انبیاء الٰہی نے پیش کیا اس کی بنیاد لوگوں کے نزدیک طے شدہ اصول و معیار نہیں بلکہ وہ دینی عقائد و نظریات ہیں جو عام احکام و فرائض اور ان دستورات خداوندی سے عبارت ہیں جن پر ایمان لانا اور عمل کرنا ثواب و جزاء اور ان کا انکار و نافرمانی عتاب و سزا کا باعث بنتا ہے لیکن یہ تیسرا مسلک کہ جو قرآن مجید کے ساتھ مخصوص و مختص ہے صرف توحید اور خالص و کامل عقیدہَ یکتا پرستی کہ جو اسلام کے اختصاصات و امتیازات میں سے ہے، پر مبنی ہے۔

اس مقام پر یہ بات قابل تعجب ہے کہ مغرب کے ایک مستشرق دانشور نے اپنی کتاب تاریخ تمدن میں اسلامی تمدن کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک محقق و دانشور کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان معاشرتی مسائل اور

تمدن کے امور پر بحث و تحقیق کرے جنہیں دین اسلام نے اپنے پیروکاروں میں پھیلایا ہے اوران کی خصوصیات وامتیازات کے ساتھ اسے ترقی یافتہ تمدن کا نام دے کراس کا چرچا کیا ہے لیکن جہاں تک اسلام کے دینی معارف کا تعلق ہے توان میں کوئی خاص امتیازی پہلو موجود نہیں اور تمام انبیاء کرام نے ان اخلاقی قدروں کو اپنانے کی دعوت و ترغیب دلائی ہے اسلام نے ان میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔

یہ ہے ایک مستشرق مغربی دانشور کا نہایت بے بنیاد الزام اور غلط نقطہ نظر کہ جس کا نادرست ہونا ان مطالب سے واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے جو ابھی ہم نے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں کیونکہ یہ ایک مسلم اصول ہے کہ ہر نتیجہ اپنے مقدمات کی فرع ہوتا ہے یعنی مقدمات وابتدائی امور کی بنیاد ہی پر نتیجہ کا دارومدار ہوتا ہے یہی حال ان آثار کا ہے جو تربیت کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں کہ وہ بھی اپنے علوم و معارف کی پیداوار ہوتے ہیں جنہیں مکتب تربیت کا شاگرد اپنے استاد سے حاصل کرتا ہے بنا برایں یہ بات کیونکر درست قرار دی جاسکتی ہے کہ سب سے کم درجہء کمال کی طرف بلانے والا اور درمیانی درجہ کے کمال کی طرف دعوت دینے والا اور کمال مطلق ..... ہر طرح کے درجات سے بالاتر کمال...... کی طرف دعوت دینے والا سب برابر حیثیت رکھتے ہوں، چنانچہ ہم نے جو تین مسلک ذکر کئے ہیں ان میں بنیادی فرق یہی ہے کہ پہلے مسلک میں معاشرتی کمال کی دعوت ہے اور دوسرے مسلک میں حقیقی کمال کی دعوت ہے کہ جس میں انسان کی اخروی زندگی میں سعادت کے حصول کا راز پنہاں ہے، جبکہ تیسرے مسلک میں کمال مطلق ذات حق تعالیٰ کی طرف دعوت ہے اوراس کے تربیتی نظام کی بنیاد خالص توحید پر ہے اور اسی مضبوط بنیاد کا نتیجہ بھی خالص عبودیت و بندگی ہی ء اب آپ ملاحظہ کریں کہ ان تینوں مسلکوں میں کتنا فرق ہے۔

یہ تیسرا مسلک اتنا عظیم ہے کہ اس نے انسانی معاشرے میں اپنے زندہ وجاوید آثار ونتائج کے طور پر نیک وصالح افراد، خدا پرست و حق شعار علماء و دانشور اور مردوں وعورتوں میں پاکباز اولیائے الٰہی کا جم غفیر پیش کر کے اپنے تربیتی اصولوں کی حقانیت کا لوہا منوایا ہے اور یہ بات دین مقدس اسلام کی عظمت وصداقت کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ یہ مسلک پہلے اور دوسرے مسلک سے نتائج کے لحاظ سے ایک بنیادی فرق بھی رکھتا ہے کہ اس کی بنیاد اور اصل واساس بہت عظیم ہے لہٰذا اس کے نتائج بھی عظیم ہیں کیونکہ اس کی بنیاد محبت وعشق الٰہی اور مقام بندگی میں اپنے ارادہ پر خدا کے ارادہ کو ترجیح دینا ہے اور ظاہر ہے کہ محبت وعشق جب اپنے کمال پر ہو تو پھر محب کے سامنے اپنے محبوب کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا اور وہ ہر چیز کو اپنے محبوب کے آئینے میں دیکھتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ کبھی ایسے کام بھی کرتا ہے جو معاشرتی شعور وعقل کہ جو معاشرتی اخلاق کا اصل معیار ہے کے نزدیک صحیح نہیں ہوتے اور نہ ہی اس عام و معمولی فہم وادراک کے نزدیک قابل قبول ہوتے ہیں جو دینی احکام و دستورات کی اصل واساس ہے، بہر حال عقل کے اپنے معیار ہیں اور محبت کے اپنے اصول ہیں اس کی مزید وضاحت آئندہ آنے والی بحثوں میں کی جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

صلوٰت اور رحمت خداوندی سے فیضیاب لوگ

○ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ

(انہی پر ان کے پروردگار کی طرف سے درود اور رحمت ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)

اس آیت مبارکہ میں اچھی طرح غور وفکر اور تدبر وتفکر کرنے سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ صلوٰات" اور "رحمت" ایک حوالہ سے ایک دوسرے سے مختلف اور دو الگ الگ چیزیں ہیں، اسی وجہ سے "صلوٰۃ" کو جمع کے صیغہ (صلوات) اور "رحمت" کو مفرد کے صیغہ میں ذکر کیا گیا ہے چنانچہ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورۂ احزاب، آیت ۴۳:

○ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ....

(وہی ہے جو تم پر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے، تا کہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جائے اور وہ مومنین کے ساتھ رحیم ہے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ "وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا" کے الفاظ "هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ" کی علت وسبب کے طور پر ہیں لہٰذا آیت کا معنی یوں ہوگا "خداوند عالم تم پر صلوات ودرود بھیجتا ہے اور ایسا کرنا اس سے لازم و متوقع بھی ہے کیونکہ اس کی عادت ومعمول ہی مومنین پر رحمت بھیجنا ہے اور چونکہ تم مومن ہو اس لیے اس کے سزاوار ہو کہ وہ تم پر درود بھیجے تا کہ اس کی رحمت تمہارے شامل حاصل ہو جائے۔ بنا برایں "صلوات" (درود) ......اور "رحمت" کا ایک دوسرے سے وہی تعلق ہے جو مقدمہ اور ذوالمقدمہ کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے اور جیسے ملتفت ہونے (رخ کرنے) کا دیکھنے سے اور آگ میں ڈالے جانے کا جلا دینے سے تعلق ہے (کسی کو دیکھنے کے لیے اس کی طرح رخ کرنا ضروری ہے تو یہ رخ کرنے کا عمل "مقدمہ" اور دیکھنے کا عمل "ذوالمقدمہ" کہلاتا ہے یا جیسے کسی چیز کو جلانے کے لیے آگ میں ڈالنا' تو آگ میں ڈالنا مقدمہ کہلاتا ہے اور جلانا "ذوالمقدمہ") اسی طرح صلوات و درود بھیجنا "مقدمہ" اور رحمت "ذوالمقدمہ" ہے (مقدمہ اور ذوالمقدمہ کی علمی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ ایک کام دوسرے کام پر موقوف ہو کہ عملی طور پر اس سے مقدم ہونے کی نسبت سے اسے مقدمہ کہا جاتا ہے اور جس کام سے مقدم اور اس کے لئے ہو اسے ذوالمقدمہ کہتے ہیں۔م) اور یہ بات اس معنی سے بھی خوب مناسبت رکھتی ہے جو "صلوۃ" کے لیے ذکر کیا گیا ہے یعنی انعطاف وتوجہ (میلان) ' البتہ انعطاف اور توجہ ہر مقام ومورد میں مستقل مفہوم رکھتی ہے اور اس مفہوم کا تعلق اس نسبت سے ہوتا ہے جو اس میں پائی جاتی ہے مثلاً اگر "صلوات" کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنے بندے پر رحمت نازل کرتا ہے (رحمت کے ساتھ انعطاف وتوجہ)۔ اور اگر فرشتوں کی طرف ہو تو انعطاف وتوجہ کا معنی انسان تک خدا کی رحمت پہنچانے کا وسیلہ ہونا

ہے۔ اور اگر مومنین کی طرف ہو تو اس کا معنی خدا کی بارگاہ میں اظہار بندگی کرتے ہوئے طلب رحمت کرنا ہے۔ بہر حال ان تمام معانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ امر ملحوظ رہے کہ نسبتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے معانی کا مختلف ہونا اس بات سے منافی نہیں کہ ''صلوٰۃ'' خود رحمت ہے بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ ''صلوٰۃ'' خود رحمت اور ''رحمت'' کا ایک مصداق ہے کیونکہ قرآنی آیات میں غور و فکر اور تدبر کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس مقدس کتاب الٰہی میں ''رحمت'' کا جو معنی و مفہوم مراد ہے وہ خدا کی وسیع عنایت و بخشش اور فضل و کرم سے عبارت ہے جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ اعراف، آیت ۱۵۶:

O وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ...،

(اور میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے)

سورہ انعام، آیت ۱۳۳:

O وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ...،

(اور تیرا پروردگار غنی و بے نیاز صاحب رحمت ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں اس دنیا سے لے جائے اور تمہارے بعد جسے چاہے تمہاری جگہ پر لے آئے جیسا کہ اس نے تمہیں دوسری قوم کی ذریت و نسل سے پیدا کیا ہے)۔

اس آیت کی ابتداء میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ ''تیرا رب غنی و بے نیاز اور رحمت والا ہے'' اور ذیل میں فرمایا ''اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور جسے چاہے تمہاری جگہ لے آئے جس طرح سے اس نے تمہیں دوسری قوم کی ذریت و نسل سے پیدا کیا ہے تو اس میں لے جانے کا عمل اس کے غنی ہونے کی وجہ سے ہے اور ''لے آنے'' کا عمل اس کی رحمت کے سبب سے ہے۔ بہر حال یہ دونوں (لے جانا) اور کسی کو اس کی جگہ پر ''لے آنا'' (اذہاب و استخلاف) اس کے غنی ہونے کی وجہ سے بھی ہیں اور اس کی رحمت کے سبب سے بھی، یعنی دونوں کی نسبت دونوں کی طرف برابر ہے یہ دونوں کام اس کے غنی ہونے اور اس کے صاحب رحمت ہونے کے آثار ہیں (اس کا غنی ہونا اور اس کی رحمت ان دونوں کاموں کی علتیں و اسباب ہیں)۔

بنا برایں ہر چیز کی خلقت اور ہر کام (خلق و امر) اس کی ''رحمت'' ہے جیسا کہ ہر چیز کی خلقت اور ہر کام (خلق و امر) اس کی عنایت و عطا اور اس کی بے نیازی کا دست نگر ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ اسراء، آیت ۲۰:

O وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ...،

(تیرے پروردگار کی عطا و عنایت کسی سے روکی نہیں جاتی)

اور چونکہ ''صلوٰۃ'' بھی اس کا ایک عطیہ و عنایت ہے لہٰذا وہ بھی اس کی ''رحمت'' کا ایک مصداق ہے البتہ ایک

مخصوص رحمت ہے اسی بیان سے زیر بحث آیت مبارکہ میں "صلوۃ" کو جمع کے صیغہ (صلوات) اور "رحمت" کو مفرد کے صیغہ میں ذکر کرنے کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

خدائی ہدایت سے بہرہ ور افراد

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○

یہ جملہ درحقیقت پہلے جملہ "أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ" کے نتیجہ کے طور پر ہے، یہی وجہ ہے کہ خدا نے ان کے ہدایت پا جانے کا ذکر پہلے جملے سے الگ مستقل جملے کی صورت میں کیا لہٰذا یوں نہیں فرمایا: "اولئك عليهم صلوات من ربهم ورحمة وهداية" یہی ہیں کہ جن پر ان کے رب کی طرف سے صلوات 'رحمت اور ہدایت ہے اور نہ ہی یوں فرمایا "اولئك هم المهديون" (وہی ہدایت والے ہیں) بلکہ ان کے ہدایت پالینے کو "اهتدائ" کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ جس کا معنی قبول ہدایت ہی ہے لیکن وہ عام طور پر ہدایت کی فرع ولازمی نتیجہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے'

بہرحال ان تمام مطالب و بیانات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "رحمت" سے مراد خدا کی طرف ان کی ہدایت و رہنمائی اور "صلوات" سے مراد اس ہدایت کا نتیجہ ہے' بنابرایں یہ تینوں امور (صلوات' رحمت' اهتدائ) ایک لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف معنی رکھتے ہیں لیکن دوسرے لحاظ سے سب "رحمت" کا مصداق ہیں۔

زیر بحث آیت شریفہ میں خداوند عالم نے جن مومنین کا تذکرہ کیا ہے اور ان پر اپنی عنایات والطاف کریمہ کو بیان کیا ہے ان کی مثال اس دوست کی ہے جو آپ سے ملنے کے لیے آرہا ہو اور راستہ ہی میں آپ کی اس سے ملاقات ہو جائے اور آپ دیکھیں کہ وہ ہر ایک سے آپ کے گھر کا راستہ پوچھ رہا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ آپ کے گھر پہنچ جائے تو آپ اسے تنہا نہیں چھوڑتے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ راستہ بھول جائے اور گر آپ کے گھر تک کا راستہ طولانی ہو تو آپ دوران راہ اس کی آسائش وآرام اور بعافیت و بآسانی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے سواری' غذا وغیرہ کا مناسب انتظام واہتمام کرتے ہیں تاکہ اسے آپ کے گھر تک پہنچنے میں کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ نہایت سلامتی وآرام کے ساتھ آپ کے گھر پہنچ جائے تو یہ سب کچھ جو آپ اس کے لیے انجام دیتے ہیں دراصل آپ کی طرف سے اپنے دوست کی عزت و احترام کی مختلف صورتیں ہیں ورنہ ان سب میں ایک ہی قدر مشترک پائی جاتی ہے یعنی اس کی عزت واحترام، جبکہ ہر کام اپنے طور پر مستقل معنی رکھتا ہے مثلاً راستہ دکھانا، سواری کا انتظام کرنا' کھانے پینے کا بندوبست کرنا' ہر طرح کی تکلیف سے حفاظت کرنا' آسائش وآرام کی تمام ضرورتیں پوری کرنا وغیرہ' یہی حال زیر بحث آیت شریفہ میں مومنین کے لیے "رحمت" "صلوات" اور "اهتداء" کا ہے کہ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ معنی ہے لیکن سب ایک ہی حقیقت کی مختلف صورتیں اور انداز ہیں لہٰذا دوست کی عزت واحترام بمنزلہ "رحمت" کے ہے جو کہ تمام امور وافعال میں موجود وملحوظ ہے اور دوران راہ

اس کی آسائش و آرام کے لیے مناسب انتظامات بمنزلہ ''صلوات'' کے ہیں اور گھر تک پہنچ جانا بمنزلہ ''اہتدائ'' کے ہے ۔اگر اس مثال کو مومنین پر منطبق کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ جب کوئی شخص خدا تک پہنچنے کے لیے گھر سے نکل پڑے اور حقیقی ہدایت کے حصول کے لیے اپنی توانائیاں بروئے کار لائے تو خداوند عالم اسے ان کوششوں میں کامیابی کے لیے توفیق عطا فرماتا ہے اور اس کی ہدایت و رہنمائی کے مناسب انتظامات کرتا ہے یہاں آخر وہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور ہدایت یافتہ ہو جاتا ہے۔

موضوع سے مربوط ایک ادبی نکتہ

یہاں ایک ادبی نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ '' اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ'' جملہ اسمیہ ہے کہ جس کی ابتداء اسم اشارہ بعید (اُولٰٓئِكَ) سے ہوئی ہے اور اس کے بعد ضمیر فصل ''هم'' بھی ذکر کی گئی ہے اور پھر خبر پر الف و لام موصولہ لگا دیا گیا ہے کیونکہ ادبی قواعد کی بنیاد پر اس طرح کا انداز بیان تعظیم و اہمیت کے لیے ہوتا ہے واللہ اعلم۔

روایات پر ایک نظر

برزخ میں اور موت کے بعد روح کی زندگی کا بیان

تفسیر قمی میں سوید بن غفلہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا: جب فرزند آدم اس دنیا میں آخری دن اور قیامت میں پہلے دن میں ہوگا تو اس کا مال و دولت' اولاد اور اعمال اس کے سامنے مجسم ہو جائیں گے اس وقت وہ ان تینوں (اموال' اولاد' اعمال) کی طرف متوجہ ہو کر ان سے گفتگو کرے گا، سب سے پہلے مال سے مخاطب ہو کر کہے گا: خدا کی قسم میں نے تجھے جمع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور میں تیری بابت سخت حریص اور بخیل تھا، میں نے تیرے لیے نہایت حرص برتا اور تجھے خرچ کرنے میں کنجوسی سے کام لیا..... اب تو بتا کہ تو مجھے کیا دے سکتا ہے؟ پھر وہ اپنی اولاد کی طرف متوجہ ہو کر ان سے کہے گا خدا گواہ ہے کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور ہمیشہ تمہارا حامی و مددگار رہا اب تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم تیرے ساتھ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ تجھے تیری قبر تک اٹھا کر لے جائیں اور تجھے اس میں دفن کر دیں، اس کے بعد وہ اپنے اعمال کی طرف متوجہ ہو کر ان سے کہے گا: خدا کی قسم میں نے ہمیشہ تمہاری

بابت بے پرواہی کی اور تم مجھ پر سخت گراں اور بھاری گزرتے تھے اب تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم قبر میں بھی تیرے ساتھ رہیں گے اور قیامت کے دن بھی تیرے ساتھ ہوں گے' پس اگر وہ شخص اللہ والا ہوگا تو اس کے اعمال پاک و پاکیزہ' خوبصورت اور جاذب نظر شخصیت کی مانند اس کے پاس آئیں گے اور اس سے کہیں گے کہ تجھے خوشخبری ہو کہ اللہ کی طرف سے تیرے لیے رحمتیں' برکتیں' عنایتیں' نعمتیں اور بہشت بریں ہے۔ وہ شخص پوچھے گا کہ تم کون ہو؟ وہ جواب دیں گے ہم تیرے اعمال صالحہ ہیں، اب تو اس دنیا سے کوچ کر کے بہشت آ جا۔ وہ (مرنے والا) اپنے غسل دینے والے کو اچھی طرح پہچانے گا اور اپنی میت اٹھانے والے کو قسم دے کر کہے گا کہ جلدی جلدی مجھے قبر تک لیجا' اور جب وہ قبر میں داخل ہوگا تو اس کے پاس قبر میں جانچ پڑتال کرنے والے دو فرشتے آئیں گے کہ جو اپنے بال بکھیرے ہوئے ہوں گے اور اپنے دانتوں سے زمین کو چیریں گے، ان کی آوازیں لرزہ خیز، گن گرج والی اور ان کی آنکھیں چندھیا دینے والی بجلی کی طرح ہوں گی۔ وہ اس سے پوچھیں گے: تیرا رب کون ہے؟ تیرا نبی کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دے گا کہ اللہ میرا رب ہے 'محمدؐ میرے نبی ہیں اور اسلام میرا دین ہے۔ اس کا جواب سن کر وہ فرشتے کہیں گے کہ تو جس چیز کو چاہتا اور پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ تجھے اس پر ثابت قدم رکھے' دراصل یہ وہی بات ہے جو خداوند عالم نے قرآن مجید میں کی ہے: "یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (اللہ اہل ایمان کو اس دنیاوی زندگی میں گفتار و کردار میں ثبات قدم عطا فرماتا ہے) اس کے بعد وہ فرشتے اس شخص کی قبر کو تا حد نظر کشادہ و وسیع کر دیں گے اور اس کے لیے قبر میں بہشت کا ایک دروازہ کھول دیں گے اور اس سے کہیں گے کہ اب تو خوش و خرم نوجوان کی مانند بے فکر و پرسکون ہو کر سو جا۔ یہ وہی بات ہے جس کا ذکر خدا نے قرآن مجید میں یوں فرمایا "اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ یَوۡمَئِذٍ خَیۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا وَّ اَحۡسَنُ مَقِیۡلًا" (اس دن اہل بہشت بہترین ٹھکانہ پائیں گے اور نہایت اچھے آرام و سکون کی جگہ میں ہوں گے)۔ یہ تو ہے اس شخص کا حال جو نیک و صالح اور خدا کا اطاعت گزار ہوگا لیکن اگر وہ بدکردار اور خدا کا دشمن، خدا کی معصیت میں رہنے والا ہو تو اس کے اعمال اس کے سامنے خدا کی بدترین مخلوق کی مانند نہایت برے لباس میں ملبوس اور بدبودار حالت و کیفیت میں مجسم ہوں گے اور اس سے کہیں گے کہ ہم تجھے جہنم کے ابلتے ہوئے پانی اور دوزخ کے دہکتے ہوئے شعلوں میں جلنے کی خبر دیتے ہیں، وہ اپنے غسل دینے والے کو اچھی طرح پہچانے گا اور اپنی میت اٹھانے والے کو قسمیں دے دے کر رک جانے کا کہے گا بالآخر جب اسے قبر میں دفن کر دیا جائے گا تو قبر میں سوال و جواب کرنے والے دو فرشتے اس کے پاس آئیں گے اور اس کا کفن اتار دیں گے ، پھر اس سے پوچھیں گے تیرا پروردگار کون ہے، تیرا نبی کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دے گا کہ مجھے معلوم نہیں میں کچھ نہیں جانتا' فرشتے کہیں گے کہ ہاں تجھے کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی تو نے ہدایت حاصل کی ہے' اس کے بعد وہ فرشتے اسے آہنی گرز سے اس طرح قوت و شدت کے ساتھ ماریں گے کہ جنوں و انسانوں کے علاوہ دیگر تمام مخلوقات پر وحشت و خوف طاری ہو جائے گا۔ پھر وہ اس کے لیے قبر میں دوزخ کا ایک دروازہ کھول دیں گے اور اس سے کہیں گے کہ اب تو یہاں نہایت بدترین حال میں پڑا رہ!۔ اس وقت اس پر قبر نہایت تنگ ہو جائے گی یہاں تک کہ اس کی تنگی اس سوراخ جتنی ہو جائے گی کہ

جس میں نوک نیزہ کو ڈال کر پار کیا جاتا ہے اور وہ اس تنگ ترین جگہ میں اس قدر وحشت ناک حالت و کیفیت میں مبتلا ہوگا کہ اس کا دماغ اس کے ناخنوں اور گوشت سے باہر نکلے گا، خدا اس پر سانپوں، بچھوؤں اور حشرات الارض زمین کے کیڑوں مکوڑوں کو اس طرح مسلط کردے گا کہ وہ ہر طرف سے اس پر حملہ آور ہو کر اسے ڈسیں گے اور وہ قیامت تک اسی صورت حال سے دوچار رہے گا اور عذاب و سختی کی اس خوفناک کیفیت میں یکسر مبتلا رہنے کی وجہ سے ہر لمحہ قیامت آنے کی آرزو کرتا رہے گا۔

قبر میں مومن و کافر سے سوال و جواب

کتاب "منتخب البصائر" میں ابوبکر حضرمی کے حوالہ سے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

(لا یسئال فی القبر الا من الایمان محضاً او من الکفر محضاً) قبر میں صرف خالص مومن اور خالص کافر سے سوال و جواب ہوگا۔

راوی کہتا ہے: میں نے عرض کی کہ دیگر لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ امام نے ارشاد فرمایا: (یلھیٰ عنھم) کہ ان کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی جائے گی (ان سے سوال و جواب کرنے کی کوئی اہمیت و ضرورت نہ ہوگی، انہیں درخور اعتناء قرار نہ دیا جائے گا)۔

مومنین کی روحوں کا مقام و مرتبہ

کتاب "امالی" میں شیخ طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ظبیان کی روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے کہا:

کنت عند ابی عبد الله (ع) فقال: ما یقول الناس فی ارواح المومنین بعد موتهم؟ قلت: یقولون فی حواصل طیور خضر. فقال(ع): سبحان الله، المومن اکرم علی الله من ذلك! اذا كان ذالك اتاه رسول الله (ص) و علی (ع) و فاطمة(ع) و الحسن (ع) و الحسین(ع) و معهم ملائكة الله عز و جل المقربون، فان انطق الله لسانه بالشهادة له بالتوحید وللنبی بالنبوة والولایة لاهل البیت، شهد علی ذلك رسول الله (ص) و علی (ع) و فاطمة(ع) والحسن (ع) والحسین (ع) والملائكة المقربون (ع) معهم، وان اعتقل لسانه خص الله نبیه بعلم ما فی قلبه من ذٰلك فشهد به وشهد علی شهادة النبی(ص): علی و فاطمة و الحسن والحسین علی جماعتهم من الله افضل السلام، و من حضر معهم من الملائكة. فاذا قبضه الله الیه صیر تلك الروح الی الجنة فی صورة كصورته فیاكلون

ویشربون، فاذا قدم علیھم عرفھم بتلك الصورة التی کانت فی الدنیا)

میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر تھا، امامؑ نے پوچھا کہ لوگ مومنین کے مرنے کے بعد ان کی روحوں کے بارے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: وہ کہتے ہیں کہ ان کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے سینوں میں ہوتی ہیں، امام نے ارشاد فرمایا: سبحان اللہ یہ کیسی بات ہے، مومن کا مقام تو خدا کے نزدیک اس سے کہیں بالاتر ہے، جب مومن پر موت آتی ہے تو اس کے پاس حضرت پیغمبر خداؐ علیؑ مرتضیٰ فاطمہ زہراؑ، حسنؑ و حسینؑ علیہم السلام تشریف لاتے ہیں اور ان کے ساتھ خدا کے مقرب فرشتے بھی ہوتے ہیں اگر خداوند عالم اس کی زبان اپنی توحید، نبیؐ کی نبوت اور اہل بیت کی ولایت کے اظہار و گواہی کے لیے کھول دے اور وہ اپنی زبان پر کلمہء توحید و نبوت و ولایت اہل بیتؑ جاری کرے تو حضرت رسول خداؐ، علیؑ و فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ اور ان کے ساتھ آئے ہوئے ملائکہ مقربین اس کے گواہ ہوتے ہیں، لیکن اگر اس کی زبان بند رہے تو خداوند عالم صرف پیغمبر اسلامؐ کو اس بندہء مومن کے قلبی ایمان سے آگاہ کرتا ہے اور آنحضرتؐ اس کے ایمان کی گواہی دیتے ہیں اور پھر آنحضرتؐ کی گواہی کی بنیاد پر حضرت امیر المومنین علیؑ، فاطمہؑ، امام حسنؑ و امام حسینؑ اور ان کے ساتھ اللہ کے مقرب فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں۔ بنا بر ایں جب خداوند عالم اس بندہء مومن کی روح قبض کرتا ہے تو اس کی روح کو اس کی اصلی صورت میں بہشت میں بھیج دیتا ہے، اس طرح تمام مومنین کی روحوں کے ساتھ ہوتا ہے، لہٰذا وہ بہشت میں کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ہیں۔ اور جب کوئی نیا آدمی ان کے پاس آتا ہے تو وہ انہیں اسی شکل وصورت میں پاتا ہے جس میں وہ دنیا میں تھے اور انہیں پہچان لیتا ہے۔

ارواح مومنین کی مخصوص کیفیت

کتاب ''محاسن'' میں حماد بن عثمان سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارواح کے تذکرے میں مومنین کی روحوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ (مؤمنین) ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں، راوی نے کہا: میں نے امامؑ کی خدمت اقدس میں عرض کی کہ آیا وہ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: ہاں وہ ایک دوسرے سے سوال و جواب بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے بھی ہیں اور جب تم کسی کو وہاں دیکھو گے تو اسے پہچان کر کہو گے کہ یہ فلاں شخص ہے۔

مومن اور کافر کی روح کا فرق

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

(ان المومن لیزور اھله فیری ما یحب، و یستر ما یکرہ، وان الکافر لیزور اھله فیری ما یکرہ ویستر عنه ما یحب، منھم من یزور کل جمعة ومنھم یزور علی قدر عمله)

(مومن اپنے اقرباء کا دیدار کرتا ہے اور اپنی پسندیدہ چیز کو دیکھتا ہے اور جو چیز اسے ناپسند ہوتی ہے وہ اس سے پنہاں کردی جاتی ہے اور کافر بھی اپنے قریبیوں کا دیدار کرتا ہے اور جو چیز بھی اسے ناپسند ہوتی ہے وہ اسے دیکھتا ہے اور جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ اس سے چھپادی جاتی ہے)

اس کے بعد امامؑ نے ارشاد فرمایا: ان میں سے کچھ ہر جمعہ کے دن اپنے قریبیوں کا دیدار کرتے ہیں اور کچھ اپنے اعمال کے حساب سے اپنے قریبیوں کے دیدار کی توفیق پاتے ہیں۔

روحیں، جسموں کی صورت میں!

کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ ارشادِ گرامی مذکور ہے:

(ان الارواح فی صفة الاجساد فی شجر من الجنة ،تعارف و تسائل، فاذا قدمت الروح علی الارواح تقول: دعوها فانها قد اقبلت من هول عظیم ثم یسئلونها ما فعل فلان وما فعل فلان ؟ فان قالت لهم :تر کته حیاار تجوه،وان قالت لهم : قد هلك ،قالوا قدهوی هوی)

روحیں جسموں کی صورت میں بہشت کے ایک درخت میں موجود ہیں ایک دوسرے کو پہچانتی اور ایک دوسرے سے سوال و جواب کرتی ہیں اور جب کوئی نئی روح ان کے پاس آتی ہے تو وہ کہتی ہیں۔ اسے چھوڑ دو اسے ابھی اپنے حال میں رہنے دو۔ کیونکہ یہ ایک خوف و وحشت کے ماحول سے گزر کر آئی ہے پھر اس سے پوچھتی ہیں فلاں کا کیا ہوا؟ فلاں کا کیا ہوا؟ اگر وہ جواب میں کہے کہ جب میں وہاں سے آئی تو ابھی وہ زندہ تھا تو وہ (روحیں) خوش ہو کر اس کے آنے کی منتظر ہو جاتی ہیں لیکن اگر وہ جواب میں کہے کہ وہ دنیا سے چلا گیا تھا تو وہ کہتی ہیں تباہ ہوا، تباہ ہوا۔

برزخ کے بارے میں کثرت کے ساتھ روایات موجود ہیں اور ہم نے صرف انہی روایات کو ذکر کرنے پر اکتفاء کی ہے جن میں برزخ کی بابت بنیادی حقائق ذکر کئے گئے ہیں اور ان کے علاوہ وہ روایات بھی کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں جو معنی و مفہوم کے لحاظ سے ان سے مشابہت رکھتی ہیں، اور ان روایات میں غیر مادی عالم (مادہ سے مجرد جہان) کے وجود کا اشارہ بھی پایا جاتا ہے۔

ایک فلسفیانہ بحث

آیا نفس مجرد ہے مادہ سے؟ نفس مادی نہیں ہے؟۔۔۔(نفس سے ہماری مراد وہ "میں" ہے جو ہم میں سے ہر شخص بات کرتے وقت زبان پر لاتا ہے اور اس کے مادہ سے مجرد ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک مادی چیز کی طرح نہیں کہ جو قابل تقسیم ہوتی ہے اور زمان و مکان رکھتی ہے)۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ہمارے اندر ایک ایسی حقیقت پائی جاتی ہے جسے ہم لفظ "میں" سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ امر بھی ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ کوئی انسان اپنی زندگی کے کسی بھی لحہ میں اور اپنے شعور کے کسی بھی زاویہ میں اس باطنی حقیقت سے غافل نہیں ہوتا بلکہ اس سے آگاہ ہوتا اور اس کا ادراک کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم اس امر سے بھی آگاہ ہیں کہ وہ ایسی حقیقت ہے جو نہ تو ہمارے ان اعضاء و جوارح اور اجزائے بدن میں سے ہے جن کا ادراک ہم اپنی قوت حس وشعور اور استدلال ذریعے کرتے ہیں مثلاً آنکھ ہاتھ وغیرہ کہ جو ظاہری حواس کے ساتھ ظاہری طور پر محسوس کئے جانے والے اعضاء ہیں اور نہ ہی ہمارے باطنی اعضاء میں سے ہے کہ ہم جن کی پہچان قوت حس و تجربات کے ذریعے ان کے آثار کے حوالہ سے کرتے ہیں، اسی وجہ سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے بعض یا تمام اعضاء و جوارح یا اس سے بھی بالاتر یہ کہ اپنے بدن کو جو کہ ان تمام اعضاء کا مجموعہ ہے بھول جاتے ہیں اور اس سے غافل ہو جاتے ہیں جبکہ اس "حقیقت" سے ہرگز غافل نہیں ہوتے جسے ہم "میں" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ حقیقت بدن اور اجزاء بدن سے یکسر مختلف ہے (چونکہ بدن اور اس کے تمام اجزاء واعضاء مادی ہیں اس لیے "نفس" کو مادی نہیں کہا جا سکتا)۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اگر نفس بدن ہو یا بدن کے اجزاء و اعضاء میں سے ایک ہو یا بدن کی خصوصیات وصفات میں سے ہو تو اسے بھی مادی اور مادہ کی تمام خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے اور مادہ کی خصوصیات ولازمی اوصاف میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تدریجی تغیر و تبدل سے دوچار رہتا ہے (ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتا رہتا ہے) اور قابل تجزیہ و تقسیم ہوتا ہے جبکہ نفس ایسا نہیں اور اس میں تدریجی تغیر و تبدل اور تجزیہ و تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چنانچہ جب کوئی شخص اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے اور اپنی حقیقت ..... نفس ..... سے آگاہی وشعور حاصل کر لیتا ہے تو اسے اس مشاہدہ نفسانیہ سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حقیقت (نفس) ایک ثابت و ناقابل تغیر و تبدل چیز ہے یعنی نہ تو اس میں کوئی تبدیلی آتی ہے اور نہ ہی اس میں تعدد و کثرت پائی جاتی ہے جبکہ بدن اور اس کے اجزاء ایسے نہیں ہیں کیونکہ ان میں مادہ وصورت اور دیگر تمام پہلوؤں کے حوالہ سے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، یہ تو ہے اس کے تغیر و تبدیل کی صورت اور جہاں تک

اس کے نا قابل تقسیم وتجزیہ ہونے کا تعلق ہے تو وہ بھی ایسے ہی ہے کہ بدن کے بالکل برعکس اس میں کسی طرح کی تقسیم اور تجزیہ قابل تصور نہیں بلکہ وہ ایک بسیط چیز ہے جس کی تقسیم وتجزیہ ممکن ہی نہیں جبکہ بدن اور اس کے اجزاء واوصاف بلکہ ہر مادی شئے میں تجزیہ و تقسیم ممکن ہے' بنا برایں یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ "نفس" بدن اور بدن کے اجزاء وخواص ...... لازمی اوصاف ...... سے ماوراء ایک مستقل حیثیت کا نام ہے' خواہ ہم بدن کے اجزا کا ادراک اپنے حواس یا استدلال وغیرہ کے ذریعے کریں یا بالکل ہی نہ کر سکیں بہرحال ان کا مادی ہونا مسلم الثبوت ہے اور مادہ کی پہچان و وصف ہی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تغیر و تبدل اور تجزیہ و تقسیم کو قبول کرتا ہے جبکہ وہ حقیقت کہ ہم اپنے تئیں جس کا باطنی مشاہدہ کرتے ہیں اس میں ان چیزوں (تغیر و تبدل اور تجزیہ و تقسیم) میں سے کوئی بھی نہیں پائی جاتی لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ "نفس" کسی بھی لحاظ سے مادی نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی مسلم ہے کہ یہ حقیقت جس کا ہم باطنی مشاہدہ کرتے ہیں ہم اسے امر واحد و بسیط دیکھتے ہیں کہ جو ہر لحاظ سے "ایک" ہے اس میں نہ تو اجزاء کی کثرت پائی جاتی ہے اور نہ باہر سے کوئی چیز اس کے ساتھ آ ملتی ہے بلکہ وہ ایک اور صرف ایک ہے، ہر انسان اپنے تئیں اس "ایک" حقیقت کا مشاہدہ...... باطنی دیدار ...... کرتا ہے اور پھر اپنے آپ کو ہر ایک سے الگ مستقل حیثیت میں دیکھتا ہے لہٰذا یہ واضح ہوا کہ وہ (نفس) ایک مستقل حیثیت کی حامل حقیقت ہے، اس میں نہ تو مادہ کا کوئی رنگ وعکس پایا جاتا ہے اور نہ ہی مادہ کے لازمی اوصاف وآثار دکھائی دیتے ہیں یعنی وہ ایک "جوہر" ہے جو "مادہ" سے بالکل مجرد وخالی ہے تاہم بدن سے اس کا تعلق ایک خاص نوعیت کا حامل ہے (تعلقِ تدبیری) اور اسی تعلق کے حوالہ سے اس کے اور بدن کے درمیان ایک طرح کا اتحاد و یگانگت پائی جاتی ہے، یہی وہ امر ہے جس کا اثبات اس وقت ہمارا مقصد و مطلوب ہے' البتہ تمام مادیون یعنی مادہ کو ہر چیز کی اصل و اساس سمجھنے والے مسلمان دانشوروں کا ایک گروہ اور محدثین کی ایک جماعت کہ جو احادیث کے ظواہر کے علاوہ کسی اور امر کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے نفس (روح) کے مجرد ہونے کا انکار کرتے ہیں اور اپنے نظریہ کے اثبات کے لیے مربوط ونامربوط دلیلیں بھی پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان تمام دلائل کی رد میں بھی مطالب پیش کرتے ہیں جو ہم نے یہاں نفس کے غیر مادی ہونے کی بابت ذکر کی ہیں حالانکہ ان کی تمام تر کوششیں بے نتیجہ ہیں اور وہ اپنے مطلوب کو ثابت کرنے میں ناکام ہوئے ہیں۔

مادیون کا کہنا ہے کہ عصر حاضر کی علمی تحقیق کہ جس میں ہر چیز کے بارے میں غیر معمولی کاوش عمل میں لائی گئی ہے اور حقائق کے ادراک کی بابت کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی اس میں تمام بدنی قوتوں وصلاحیتوں اور اوصاف کی علتوں اور اسباب کا سراغ لگا لیا گیا ہے اور کوئی ایسا "روحی اثر" (روح سے تعلق رکھنے والا امر) بھی نہیں پایا گیا جس پر "مادہ" کے قوانین کی تطبیق اور اس کے تقاضوں کی تکمیل نہ ہو سکتی ہو بلکہ روح سے تعلق رکھنے والے تمام امور مادہ سے ہمرنگ ہیں اس لیے روح کو مادہ سے مجرد و خالی سمجھنے کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے تمام اعصاب ہمیشہ اور نہایت تیزی کے ساتھ تمام مطالب کہ جن کا وہ ادراک کرتے ہیں...... کو بدن کے مرکزی عضو یعنی دماغ تک پہنچاتے ہیں اور اس میں وہ تمام مطالب ...... ادراکات ...... ایک مجموعہ کی

صورت میں اس طرح یکجا ہوتے ہیں کہ پھر ان کے اجزاء کی پہچان اور ایک دوسرے سے تمیز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک جزء کے محو و مٹ جانے کے بعد کسی اور جزء کے اس کی جگہ پر آ جانے کا پتہ چلتا ہے اور یہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے اجزاء کا مجموعہ ہی "نفس" کہلاتا ہے کہ ہم جس کا باطنی مشاہدہ کرتے ہیں اور بات کرتے وقت اسے "میں" سے تعبیر کرتے ہیں اب ہمارا یہ کہنا کہ یہ "میں" ہمارے اعضاء وجوارح کے علاوہ ایک حقیقت کا نام ہے تو یہ درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ہمارے بدن اور اس کے خواص و لازمی اوصاف کے علاوہ کوئی اور چیز ہے بلکہ وہ ایک مجموعہ ہے کیونکہ اعصاب کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے جس کے نتیجہ میں مجموعہ ادراکات بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے لہٰذا ہم کبھی اس سے غافل نہیں ہوتے کیونکہ اگر ہم اس سے غافل ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اعصاب اپنا عمل چھوڑ گئے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اعصاب کے عمل چھوڑ جانے کا دوسرا نام موت ہے' جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اسے ثبات حاصل ہے تو یہ ایک لحاظ سے درست ہے لیکن اس کا ثبات خود اس کی اپنی ذات کے حوالہ سے نہیں جس کی بناء پر ہم یہ کہیں کہ وہ خود نا قابل تغیر ہے ایسا نہیں بلکہ یہ تو مشاہدہ کرنے والوں کی نظر کا دھوکہ ہے کہ وہ نفس کو ثابت اور نا قابل تغیر ہونے کی صورت میں دیکھتے ہیں اور ان کے اشتباہ و نظر کے دھوکہ کا سبب یہ ہے کہ وہ اس مجموعہ کے اجزاء کو پے در پے اور نہایت تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتا اور ایک دوسرے کی جگہ پر آتا دیکھ کر اسے "ثابت" سمجھتے ہیں، اس کی مثال اس حوض کی ہے جس میں ایک طرف سے تیزی کے ساتھ پانی داخل ہوتا رہتا ہے اور دوسری طرف سے اسی مقدار میں نکلتا رہتا ہے جبکہ حوض ہمیشہ پانی سے بھرا رہتا ہے اور دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ پانی اپنے مقام پر "ثابت" ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ پانی کے اجزاء و ذرات لحہ بہ لحہ ایک دوسرے کی جگہ پر آتے رہتے ہیں لہٰذا حقیقت میں وہ پانی نہ تو وحدت رکھتا ہے نہ ثبات' اسی طرح باہر کی چیزوں کی شکلیں جو پانی میں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً وہ درخت جو حوض کے کنارے پر ہو یا کوئی شخص لب حوض کھڑا ہو یا کوئی اور چیز جس کا عکس پانی میں نظر آئے۔ تو دیکھنے والا انہیں بھی وحدت و ثبات کا حامل سمجھتا ہے جبکہ ان میں بھی کثرت پائی جاتی ہے اور وہ بھی پانی کے ساتھ ساتھ تدریجی تغیر و تبدل سے دو چار ہوتی ہیں تو یہی حال نفس کے ثبات و وحدت اور تشخص کا ہے' بہر حال ان حضرات کا کہنا ہے کہ نفس (روح) کہ جس کا باطنی مشاہدہ کے حوالہ سے مادہ سے مجرد ہونا ثابت کیا جاتا ہے وہ درحقیقت طبعی خواص کا ایک مجموعہ ہے جو کہ "ادراکات عصبیہ" سے عبارت ہے کہ جو مادہ خارجیہ کے اجزاء اور اجزاء عصبیہ کے درمیان پائے جانے والے تاثیر و تأثر کے عمل کے نتیجہ میں وجود میں آتے ہیں، لہٰذا اس مجموعہ کی وحدت اجزاء کے یکجا ہونے کے حوالہ سے اجتماعی وحدت ہے نہ کہ حقیقی و ذاتی وحدت!۔

مادیون کا یہ کہنا درست ہے کہ حس و تجربہ کی بنیاد پر کی جانے والی علمی تحقیق اور عصر حاضر کی فکری و عملی پیش رفت روح کی حقیقت کے ادراک میں کامیاب نہیں ہوئی اور نہ ہی عملی تحقیق سے کوئی ایسی شے دیکھی گئی ہے جو روح کے علاوہ قابل تعلیل نہ ہو لیکن اس سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ ہم ان دلائل کو بھی نظر انداز کر دیں جن سے نفسِ مجرد (مادہ سے خالی روح) کا وجود ثابت ہوتا ہے اور اس (نفس مجرد) کی نفی کر دیں کیونکہ ان علوم جدیدہ کا دائرہ "مادہ" اور اس سے متعلقہ

امور واوصاف کی بابت بحث وتحقیق تک محدود ہے لہٰذا ان علوم میں جس قدر بھی پیش رفت اور ترقی ہو اور تحقیق کا دائرہ جتنا بھی وسیع ہو جائے تب بھی ان کی دسترس ''مادہ'' ہی تک ہوگی اور وہ اس سے زیادہ کسی چیز کے بارے میں اظہار خیال نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی اصل واساس اور تحقیق کی بنیاد ہی ''مادہ'' ہے اس لیے مادی امور میں تجربات کی وسعت کے تمام وسائل وذرائع کسی ایسی چیز کے بارے میں نفی یا اثبات کا فیصلہ کرنے میں مدد نہیں دے سکتے جو ماورائے مادہ وطبیعت ہو البتہ وہ اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ''ہماری مادی تحقیق'' نے ایسی کوئی چیز نہیں پائی جبکہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا نہ پایا جانا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ عدم الوجدان لا یدل علی عدم الوجود.......... کسی چیز کے بارے میں علم وادراک کا حاصل نہ ہونا اس کے موجود نہ ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ بنا بر ایں یہ علوم اس بات میں حق بجانب ہیں کہ وہ کسی ماوراء مادہ وطبیعت چیز کے بارے میں اس کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے سے عاجز ہوں لہٰذا اگر وہ مادی اشیاء اور ان سے تعلق رکھنے والے جملہ امور میں کسی ایسی چیز کا سراغ نہ لگا سکیں کہ جو مادی نہیں اور نہ ہی مادہ کے خواص ولازمی اوصاف میں سے ہو تو یہ تعجب آور بات نہیں۔ لیکن علوم مادی میں بحث وتحقیق کے ماہرین کا نفس مجرد۔۔۔ مادہ سے خالی اور ماوراء الطبیعہ حقیقت یعنی روح ..... کی نفی کرنے میں اظہار خیال کی جرأت کرنا دراصل اس سبب سے ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو حضرات نفس مجرد کا وجود ثابت کرتے ہیں وہ چونکہ اعضاء بدن سے تعلق رکھنے والے حیاتی آثار کے ادراک سے عاجز ہیں اور ان کی علتوں واسباب کو علمی تحقیق کے حوالہ سے سمجھ ہی نہیں سکے، اس لیے انہوں نے ان تمام امور کا سرچشمہ ایک ماورائے طبیعت چیز۔۔۔ نفس مجرد۔۔۔ کو قرار دے کر اس کا وجود ثابت کیا اور اسے اعضاء بدن کی تمام تر فعالیت کی بنیاد بنا کر پیش کیا لیکن اب جبکہ علوم جدیدہ نے تمام افعال اور مادی امور واعضاء بدن کی فعالیت کی مادی علتوں واسباب کا سراغ لگا لیا ہے تو اس۔۔۔ نفس مجرد۔۔۔ کے وجود کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یاد رہے کہ اس طرح کی غلط فہمی کا ارتکاب خالق کائنات کے بارے میں بھی ان سے ہوا لیکن حقیقت میں ان کے یہ نظریات ایک بہت بڑی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں کیونکہ نفس مجرد (مادہ سے خالی روح) کے وجود کو ثابت کرنے والوں نے اپنے مدعا ومطلوب کے اثبات میں وہ راہ ہرگز اختیار نہیں کی جو علوم مادی کے ماہرین نے ان کی طرف منسوب کی ہے اور نہ ہی انہوں نے ایسا کیا کہ بدن کے بعض وہ افعال کہ جن کے ظاہری علل واسباب معلوم ہوئے انہیں تو بدن سے نسبت دے دی اور جن افعال کی علتیں واسباب نامعلوم رہے انہیں روح سے منسوب کر دیا بلکہ انہوں نے تو بدن کے تمام افعال کو بلاواسطہ بدن (علل جسمانی) کی طرف اور بدن کے واسطہ سے روح کی طرف منسوب کیا البتہ انہوں نے ان چیزوں کی نسبت روح کی طرف دی جن کا بدن سے منسوب کرنا ممکن ہی نہیں مثلاً انسان کا خود اپنے بارے میں علم وآگاہی پانا اور اپنی ذات کا باطنی مشاہدہ کرنا۔

جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ وہ حقیقت کہ انسان جس کا مشاہدہ کرتا ہے (جسے ''میں'' سے تعبیر کیا جاتا ہے) وہ ان ادراکات عصبیہ کے مجموعہ سے عبارت ہے جو پے در پے اور نہایت تیزی کے ساتھ بدن کے مرکزی عضو یعنی دماغ تک پہنچتے ہیں اور اجتماعی وحدت کے حامل ہیں' ایک نہایت بے ربط بات ہے جو کہ ہمارے نفسانی مشاہدہ سے ہرگز تطبیق نہیں

کرتی، گویا ان حضرات نے خود اپنے نفسانی مشاہدے کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اس سے روگردانی کر کے صرف انہی مشاہدات کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنالیا جو حواس کے ذریعے دماغ تک پہنچتے ہیں اور پھر انہی سے مربوط آثار کے بارے میں بحث و تمحیص میں منہمک ہو گئے، یہ بات کس قدر تعجب انگیز ہے کہ ایسے کثیر امور فرض کئے جائیں جن میں حقیقی وحدت نہیں پائی جاتی اور وہ سب کے سب مادی ہیں اور ان کے ماوراء کوئی اور چیز (ماوراء الطبیعت) موجود نہیں اور ہم جس حقیقت واحدہ کا اپنے اندر مشاہدہ کرتے ہیں وہ اصل میں یہی کثیر ادراکات ہوں یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے، کیونکہ اگر یہ سب باتیں صحیح ہوں تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ یہ ''ایک'' کہ جس کے علاوہ ہمیں کچھ نظر نہیں آتا کہاں سے وجود میں آ گیا ہے؟ اور یہ وحدت کہاں سے آ گئی ہے جس کا ظاہر بظاہر مشاہدہ ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں ان کا یہ کہنا کہ یہ ''اجتماعی وحدت'' ہے مذاق سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ جو چیز اجتماعی وحدت رکھتی ہے (واحد اجتماعی) وہ در حقیقت اپنی ذات میں واحد نہیں بلکہ کثیر ہے اور جو ''وحدت'' اس کے لیے فرض کی جاتی ہے وہ یا تو عالم حس میں ہوتی ہے (کہ جس کے سبب غلطی سے اسے واحد کہا جاتا ہے) اور یا عالم خیال میں ہوتی ہے مثلاً ایک گھر کہ جس کے کئی اجزاء ہوتے ہیں لیکن اسے ''ایک'' سمجھا جاتا ہے' اسی طرح ایک لکیر کہ جو حقیقت میں کئی نقطوں سے مل کر بنتی ہے اسے ''ایک'' کہا جاتا ہے جبکہ وہ ''ایک'' نہیں ہوتی کیونکہ ہر وہ چیز جو محسوس ہو...... قوت حس کی دسترس میں آئے ...... وہ حقیقت میں ''ایک'' نہیں بلکہ اپنی اصل و ذات کے لحاظ سے متعدد اجزاء کے یکجا ہونے سے ''ایک'' سمجھی جاتی ہے اور ہماری بحث میں جن کثیر ادراکات کے دماغ تک پہنچنے کی بابت ہوئی ہے تو در حقیقت وہ اپنی ذات میں اپنے سوا کچھ بھی نہیں وہ جو کچھ بھی ہیں خود ہی ہیں، اس کے باوجود وہ اپنے تئیں ایک شعور کی صورت ہے اور یہ بات ان کی کثرت و تعدد سے مطابقت نہیں رکھتی۔ لہٰذا ان حضرات (مادیون) کے قول کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ ادراکات اپنی ذات میں کثرت رکھتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ صرف ایک نفسانی شعور ہے۔ اور دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سابقہ مثالوں میں ان کثیر امور کے ماوراء حس و خیال بھی موجود تھا کہ جو ان امور کی کثرت کو وحدت کے آئینے میں دیکھتا تھا یعنی وہ خارج میں...... ظاہر بظاہر...... کثیر اور عالم حس و خیال میں واحد تھے جبکہ ہمارے موضوع بحث میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں جو ان کثیر ادراکات کو وحدت کے آئینے میں دیکھے لیکن اس کے باوجود یہ سب ادراکات اپنے تئیں ...... اپنی ذات میں ...... واحد نفسانی ادراک کے سوا کچھ نہیں کہ جسے ''میں'' سے تعبیر کیا جاتا ہے' اگر وہ یہ کہیں کہ دماغ ان تمام ادراکات کی کثرت کو وحدت کے آئینے میں دیکھتا ہے تب بھی ہمارا اعتراض اپنے مقام پر باقی رہے گا کیونکہ دماغ ان ادراکات کثیرہ کے علاوہ کوئی دوسرا ادراک رکھتا ہی نہیں بلکہ یہی ادراکات ہیں کہ جو پے در پے اور نہایت تیزی کے ساتھ دماغ تک پہنچتے ہیں گویا دماغ کا ادراک بعینہ انہی پے در پے آنیوالے ادراکات کثیرہ سے عبارت ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دماغ کی ایک اور قوت ادراک ہے جو ان ادراکات کو وحدت کی صورت میں دیکھتی ہے جیسا کہ حسی قوتوں کے اپنی معلومات خارجیہ سے تعلق کا مسئلہ ہے کہ وہ ان معلومات سے حسی صورتوں کا انتزاع (حاصل) کرتی ہیں (مزید غور کریں)

یہ تمام مطالب جواب تک ذکر ہو چکے ہیں اس نفسانی حقیقت (میں) کی وحدت کی بابت تھے جس کا مشاہدہ ہر

انسان اپنے تئیں باطن میں...... کرتا ہے، یہی صورت حال بعینہٖ اس کے ''ثابت'' اور ''بسیط'' ہونے کی ہے (البسیط یعنی ناقابل تجزیہ و تقسیم،لہٰذا ان اوصاف کی توجیہ وتاویل کے لیے ''نفس مجرد'' کے وجود کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے)۔ بنابرایں اس قابل تجزیہ و تقسیم نفسانی حقیقت کہ جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اس کے ثبات و بساطت کے حصول کی کیفیت کے بارے میں وہی کچھ کہا جائے گا جو اس کی وحدت کے حصول کی بابت کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ دماغ ان کثیر ادراکات کو وحدت کے آئینے میں دیکھتا ہے یعنی جو مطالب پے درپے اور نہایت تیزی کے ساتھ دماغ تک پہنچتے ہیں اگرچہ وہ کثیر ہیں لیکن دماغ انہیں ''ایک'' کی صورت میں دیکھتا ہے' یہ بات سرے ہی سے غلط ہے کیونکہ یہ دماغ اور اس میں پائی جانے والے قوت اور اس کا شعور اور پھر وہ سب کچھ جو اس دماغی قوت کی لوح ادراک پر ثبت ہوتا ہے مادی امور ہیں اور مادہ بلکہ مادی شئے کی خصوصیت ولازمی صفت ہی یہ ہے کہ وہ کثیر' متغیر اور قابل تجزیہ و تقسیم ہوتی ہے بنابرایں وہ حقیقت کہ جس کا باطنی مشاہدہ ہم کرتے ہیں اس...... علمی صورت...... میں ان اوصاف میں سے کوئی وصف بھی نہیں پایا جاتا تو یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ وہ ماوراء مادہ چیز ہے جو مادی امور کے اوصاف سے بالاتر مستقل وجود رکھتی ہے۔

اور پھر ان کا یہ کہنا بھی قطعی طور پر غلط ونادرست ہے کہ بعض اوقات حس وقوت ادراک اشتباہ وغلط فہمی کا شکار ہو کر کثیر ومتعدد اور قابل تجزیہ وتغیر اشیاء کو ''ایک'' اور ثابت و بسیط سمجھتی ہے جیسا کہ ہمارے موضوع بحث اور ادراکات کثیرہ کہ جو پے درپے اور نہایت تیزی کے ساتھ دماغ وشعور میں آتے ہیں کے بارے میں ہوا ہے، یہ بات اس لیے صحیح نہیں کہ اشتباہ وغلط فہمی امور نسبیہ میں سے ہے کہ جو مقایسہ ونسبت سنجی سے حاصل ہوتے ہیں نہ کہ امور نفسیہ وحقیقیہ میں سے' کیونکہ ہر چیز اپنی ذات میں کسی دوسری چیز سے اس کا مقایسہ وموازنہ کئے بغیر...... اشتباہ وغلط فہمی سے پاک ہے اور اشتباہ وغلط فہمی تبھی پیدا ہوتی ہے جب اس کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مقایسہ وموازنہ کیا جائے' اس بات کی وضاحت کے لیے سب سے بڑی مثال آسمانی ستارے وسیارے (اجرام فلکی) ہیں جنہیں ہم چھوٹے چھوٹے سفید نقطوں کی طرح دیکھتے ہیں جب کہ ہم اپنے اس مشاہدہ میں غلط فہمی کا شکار ہیں کیونکہ علمی وسائنسی اور تحقیقی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ بہت ہی بڑے ہیں، اسی طرح دیگر موارد میں بھی یہ ہوتا ہے کہ ہمارے حواس کا مشاہدہ صحیح نہیں ہوتا، لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس اشتباہ وغلطی فہمی کا سبب کیا ہے؟ آیا آسمان پر نظر آنے والے یہ چھوٹے چھوٹے روشن نقطے کسی قسم کے مقایسہ کے بغیر بھی ایسے ہی ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ ان کی بابت یہ اشتباہ وغلط فہمی ان کے مشاہدے اور علمی استدلال کے ذریعے ثابت ہونے والے حقائق کے درمیان مقایسہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے ورنہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں جو ہمیں نظر آتا ہے یعنی وہ چھوٹے چھوٹے سفید وروشن نقطے ہی ہیں اور انہیں اس صورت میں ہمارا دیکھنا ہرگز اشتباہ وغلط فہمی نہیں البتہ اگر علمی حقائق ودلائل سے اپنے مشاہدات کا قیاس کریں تو غلط فہمی کا پتہ چلتا ہے کیونکہ ہمارا مشاہدہ ان کے حقائق سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا' یہی

صورت حال ہمارے زیر بحث موضوع کی بابت ہے کہ ہمارے حواس اور شعور وادراک کی قوتیں جب امور کثیرہ قابل تجزیہ و تغیر کو واحد بسیط وثابت کی شکل میں دیکھتی ہیں تو ان کی اس غلط فہمی کا سبب دراصل یہ ہوتا ہے کہ وہ انہیں ان کی ظاہری حقیقتوں (حقائق خارجیہ)...... سے مقایسہ کرتی ہیں جس کے نتیجہ میں ان کے اشتباہ سے پردہ اٹھ جاتا ہے ورنہ اگر اس مقایسہ سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو جو کچھ ان کے مشاہدہ میں آتا ہے وہ درست وصحیح ہوتا ہے، اس کے ''واحد بسیط اور ثابت'' ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا اور اس حوالہ سے حس وادراک کی قوتیں کسی اشتباہ وغلط فہمی کا شکار نہیں ہوتیں بنا برایں جو چیز ان کے مشاہدہ میں ''کثرت'' تغیر اور قابل تجزیہ ہونے'' کی صفات سے خالی ہو وہ کیونکر ''مادی'' کہلاسکتی ہے کیونکہ یہ سب اوصاف ''مادہ'' ہی سے تعلق رکھتے ہیں غیر مادی چیز میں ان کا پایا جانا ممکن ہی نہیں۔

اب تک جو مطالب ذکر ہو چکے ہیں ان سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ مادیون نے روح مجرد کی نفی میں حس وتجربہ کی بنیاد پر جو دلیل پیش کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تمام تر مادی وسائل سے استفادہ کرنے کے باوجود ایسی کوئی چیز نہیں پائی، یہی بات ان کی غلط فہمی کا سبب بن گئی کہ انہوں نے نہ پائے جانے کو نہ ہونا سمجھ لیا جبکہ ان دونوں میں فرق ہے، عدم الوجدان (کسی چیز کا پایا نہ جانا) اور ہے اور عدم الوجود (کسی چیز کا نہ ہونا) اور ہے، لیکن انہوں نے روح مجرد کے نہ ہونے کو اس کے پائے نہ جانے کی بنیاد پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ صریح غلطی ہے، ان کی دلیل ان کے مدعاء سے مطابقت نہیں رکھتی اور انہوں نے مشاہدہ نفسانی کی جو کہ تجرد روح کے اثبات کی دلیل ہے توجیہ وتاویل میں جو کچھ پیش کیا ہے وہ قطعی نادرست ہے، وہ نہ تو حس وتجربہ پر مبنی مسلمہ مادی اصولوں سے ہم رنگ ہے اور نہ ہی حقیقت امر کہ عقل جس کا ادراک کرتی ہے سے اس کی تائید ملتی ہے۔

جہاں تک اس مفروضہ کا تعلق ہے جو جدید علم نفسیات کے ماہرین نے نفس (روح) کے بارے میں پیش کیا ہے کہ وہ اس حالت کا دوسرا نام ہے جو مختلف نفسیاتی روحی کیفیتوں کی باہمی تاثیر وتاثر اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے سے پیدا ہوتی ہے مثلاً ادراک' ارادہ' رضا' حب و چاہت وغیرہ کہ ان کیفیتوں و حالتوں کے ایک دوسرے سے ملنے اور ہم رنگ ہونے سے ایک متحد حالت وجود میں آتی ہے جسے نفس کہا جاتا ہے (گویا وہ ان تمام روحی کیفیات وحالات کی ترکیب اور اکٹھا ہو جانے سے بنتی ہے) تو اس سلسلہ میں ہم کسی اظہار خیال کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیونکہ ہر محقق و بحث کرنے والا یہ حق رکھتا ہے کہ اپنے مربوطہ علم سے تعلق رکھنے والے موضوعات کو زیر بحث لائے اور اس کے بارے میں اظہار رائے کرے اور اس سے تعلق رکھنے والے فرضیوں کی بابت اثبات یا نفی پر استدلال قائم کرے لیکن جو چیز علم فلسفہ کے حوالہ سے ہمارے نزدیک اہمیت کی حامل ہے اور ہم اس پر غور وفکر اور اظہار خیال کرنا مفید وضروری سمجھتے ہیں وہ اصل حقائق ہیں جو عالم خارج میں کسی چیز کے وجود وعدم سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ہم کسی فرضیہ ومفروضہ کی روشنی میں بحث کرنے اور اس کے بارے میں

رائے قائم کرنے کو اپنے دائرہ تحقیق سے باہر سمجھتے ہیں، اس لیے علم نفسیات کے ماہرین کے فرضیہ کی بابت یہاں کسی قسم کے اظہار خیال کی کوئی ضرورت نہیں۔

تجرد نفس کی نفی میں بعض دیگر دانشوروں نے کہ جن کا تعلق بعض ادیان سے ہے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ انسانی زندگی کے بارے میں بحث و تحقیق کرنے والے علوم مثلاً: بدن کا تجزیہ کرنے والا علم اور فیزیالوجی (علم وظائف الاعضائ) کا مطالعہ کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام روحی کیفیتوں کا بنیادی تعلق ان خلیوں سے ہے جو انسان اور دیگر تمام حیوانات کی زندگی کی اصل واساس ہیں (انسان اور تمام حیوانوں کی زندگی انہی سے وابستہ ہے) اور روح دراصل ان خلیوں ہی کی ایک خاصیت واثر ہے اور جب یہ تمام حیاتی خلیے یکجا ہوتے ہیں تو ان سے ایک مجموعہ مرکب وجود میں آتا ہے جسے ''روح'' کہا جاتا ہے اور بات کرتے وقت اسے ''میں'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسے ہی انسان اپنے لیے ''روح'' سمجھتا ہے جبکہ یہ خود کئی روحوں کا ایک مجموعہ ہے جو یکجا ہو کر ایک روح کہلاتی ہیں لہٰذا جب تک یہ خلیے باقی ہوں گے اس وقت تک تمام روحی کیفیات وحیاتی حالات بھی باقی رہیں گے اور جب یہ ختم ہو جائیں گے (مر جائیں گے) تو تمام روحی کیفیتیں بھی ختم ہو جائیں گی اس لیے بدن کے ختم وفنا ہو جانے کے بعد روح مجرد کا باقی رہ جانا بے معنی بات ہے' البتہ چونکہ مادی علوم و معارف اور سائنسی اصول، زندگی کے اسرار و رموز اور اصل حقائق کے بارے میں تمام پہلوؤں کی وضاحت نہیں کر سکتے لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہء کار ہی نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ طبعی علتیں ایجاد روح کی بابت کچھ کرنے سے قاصر ہیں لہٰذا ماورائے طبعیت ایسی چیز کا ہونا ضروری ہے جو اس کے وجود کا سبب ہو اور جہاں تک عقلی طور پر تجرد نفس کے اثبات اور اس پر استدلال کا تعلق ہے تو اس امر کو عصر حاضر کے علوم کسی صورت میں تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی بنیاد حس و تجربہ پر ہے اور وہ حس و تجربہ کے علاوہ کسی چیز کو بھی درخور اعتناء نہیں سمجھتے اور نہ ہی اسے کوئی اہمیت دیتے ہیں۔

آپ اچھی طرح اس بات سے آگاہ ہیں کہ ہم نے مادیون کے استدلال کی رد میں جو ٹھوس موقف پیش کیا ہے وہ مذکورہ بالا استدلال کے جواب کے لیے بھی کافی ہے اس لیے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تاہم ان کے استدلال کی مکمل بیخ کنی کے لئے اور یہ کہ ان کے استدلال سے کوئی شخص مغالطہ کا شکار نہ ہونے پائے دو اہم نکات ذکر کئے جاتے ہیں:

(۱) وہ کہتے ہیں کہ چونکہ عصر حاضر کے علوم زندگی کے اسرار و رموز اور روح کی حقیقت کی پہچان نہیں کر سکے لہٰذا کسی ماورائے طبعیت چیز کے وجود کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں،

ان کی یہ رائے ہرگز درست نہیں کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کس طرح یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اگر اب تک علوم جدیدہ، روح کی حقیقت اور زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تو آئندہ بھی کبھی ان سے آگاہ نہ ہو سکیں گے اور حیاتی خلیوں کے خواص، طبعی علتوں کے ذریعے ہمیشہ ناقابل توجیہ وتاویل

رہیں گے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ طبعی علتوں اور مادی علوم کے مسلمہ اصولوں کے ذریعے ان حقائق کا ادراک ممکن نہیں تو اس سے یہ بات کہاں سے ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کا وجود ہی نہیں یہ تو ہماری ناآگاہی اور علوم جدیدہ کی کوتاہی ہے جس کی وجہ سے ہم ان حقائق کا انکار کرنے کی جرات کر لیتے ہیں ورنہ یہ تو علم بالعدم کی جگہ عدم العلم کا سہارا لینے والی بات ہے یعنی کسی چیز کے وجود کا انکار اس کے نامعلوم ہونے کے سبب کیا جائے گویا ''نہ پائے جانے'' کو ''نہ ہونے'' کی دلیل بنا دیا جائے جو کہ ہرگز صحیح نہیں۔

(۲) وہ کہتے ہیں کہ عالم مادی کی بعض موجودات کی نسبت ،مادی علتوں کی طرف اور بعض چیزوں مثلاً زندگی سے تعلق رکھنے والے امور وخواص کی نسبت ماورائے مادہ وطبیعت یعنی خدا کی طرف ہے، یعنی عالم مادہ میں جو کچھ پایا جاتا ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیں: بعض چیزوں کا سرچشمہ، مادہ وطبیعت اور بعض کا سرچشمہ ماورائے طبیعت (خدا) کو سمجھیں۔ ان کی یہ بات بھی ہرگز صحیح نہیں کیونکہ اس کے نتیجہ میں عالم ایجاد میں دو مبداء اور دو سرچشمے تسلیم کرنے پڑیں گے کہ جسے نہ تو مادیون اور نہ ہی خدا پرست کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا اور توحید کے دلائل سے بھی اس نظریہ کی واضح نفی ہوتی ہے۔

زیر بحث موضوع کی بابت ہمارا بیان اختتام کو پہنچا' اس کے علاوہ تجرد روح پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ علم فلسفہ وعلم کلام کی کتب میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں لیکن چونکہ ان تمام اعتراضات کی اصل واساس تجرد روح کے استدلال کو صحیح طور پر نہ سمجھنا اور اس میں اچھی طرح غور وفکر نہ کرنا اور اس کے حقیقی مقصد کا مکمل ادراک نہ کرنا ہے اس لیے ہم نے یہاں انہیں ذکر کرنے سے اجتناب کیا اور ان کے بارے میں اظہار خیال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی لہٰذا جو شخص تفصیلات جاننا چاہے وہ مربوطہ کتب کا مطالعہ کرے اسے حقیقت امر سے آگاہی حاصل ہو جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔ (واللہ الہادی)

علم اخلاق کی بحث

علم اخلاق وہ علم ہے جس میں انسان کی ان بنیادی صلاحیتوں کی بابت بحث وگفتگو ہوتی ہے جن کا تعلق اس کی نباتی' حیوانی اور انسانی قوتوں سے ہے، یہ علم انسان کو تمام اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں ......فضائل و رذائل.... سے آگاہ کر کے اسے ان کے درمیان تمیز کرنے کی راہ دکھاتا ہے تاکہ وہ ان میں سے پاک وپاکیزہ صفات اپنا کر اور اپنے آپ کو خوبیوں و

اچھائیوں سے مزین و آراستہ کر کے اپنی علمی سعادت وخوش بختی کے حصول وتکمیل میں کامیاب ہو سکے اور ایسے اعمال بجا لائے جو اسے انسانی معاشرہ میں قابل ستائش ولائق تعریف اور نہایت پسندیدہ شخصیت بنا دیں۔

یہ علم اپنی بحثوں میں اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ انسانی اخلاق کی اصل واساس اور بنیادی قوتیں تین ہیں۔

(۱) قوت شہوت

(۲) قوت غضب

(۳) قوت تفکر

یہ تینوں قوتیں نفس کو ان عملی علوم کے اختیار کرنے کی ترغیب دلاتی ہیں جو مربوطہ قوت کے موزوں ومناسب افعال کی انجام دہی کے اسباب فراہم کریں۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ انسان کے تمام افعال واعمال کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ افعال جن میں حصول فائدہ ملحوظ ہو جیسے کھانا پینا اور لباس پہننا وغیرہ۔

۲۔ وہ اعمال جن کے ذریعے نقصان وضرر سے بچنا مقصود ہو مثلاً اپنی جان، مال اور عزت وآبرو کا تحفظ و دفاع کے لئے اقدام کرنا وغیرہ۔

۳۔ وہ کاوشیں جو فکر ونظر۔ تصور وتصدیق۔ سے مربوط ہوں جیسے علمی قیاس واستدلال وغیرہ۔

پہلی قسم کے افعال کا تعلق قوت شہویہ سے، دوسری قسم کے اعمال کا تعلق قوت غضب سے اور تیسری قسم کے افعال کا تعلق قوت تفکر سے ہے، چونکہ انسان اپنی ذات کے حوالہ سے انہی تین قوتوں کے مجموعہ مرکب کی حیثیت رکھتا ہے اور انہی قوتوں کے یکجا ہونے اور ان کی اس باہمی ترکیب سے خاص نوعیت کے افعال انجام دیتا ہے جو اس کی سعادت وخوش بختی کے لیے مقرر کی گئی ہے لہٰذا ہر لحہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان قوتوں کی بابت نہایت توجہ والتفات سے کام لے تاکہ ان میں سے کسی میں افراط وتفریط نہ ہونے پائے اور کوئی قوت زیادتی یا کمی کی طرف نہ جانے پائے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو ان کے درمیان اعتدال برقرار نہ رہے گا اور اگر ان کے درمیان اعتدال قائم نہ رہا تو وہ مجموعہ مرکب اپنا وہ کام صحیح طور پر نہ کر سکے گا جس کے لیے اس کے اجزاء کی ترکیب ہوئی ہے اور بالآخر وہ اپنی مجموعی حیثیت کھو دے گا جس کے نتیجہ میں اسے اپنے وجود کے اصل ہدف ومقصد یعنی نوع انسانی کی سعادت سے محروم ہونا پڑے گا۔

علم اخلاق میں ان تین قوتوں کی حد اعتدال بھی واضح کر دی گئی ہے اور وہ یوں کہ:

(۱) عفت:

قوت شہوت کی حد اعتدال یہ ہے کہ اسے مقدار وکیفیت کے لحاظ سے مناسب ومعقول حد تک استعمال کیا جائے ،اسے "عفت" کہا جاتا ہے۔

(۲) شجاعت:

قوت غضب کی حد اعتدال کو "شجاعت" کا نام دیا جاتا ہے۔

(۳) حکمت:

قوت تفکر کی حد اعتدال کا نام "حکمت" (دانائی) ہے۔

اب ان کے افراط وتفریط کی حدیں ملاحظہ کریں:

قوت شہوت کے افراط کو "حرص" اور تفریط کو "سستی وکاہلی" کہتے ہیں۔

تہور و بزدلی:

قوت غضب کے افراط کو "تہور" اور تفریط کو "بزدلی" کہتے ہیں۔

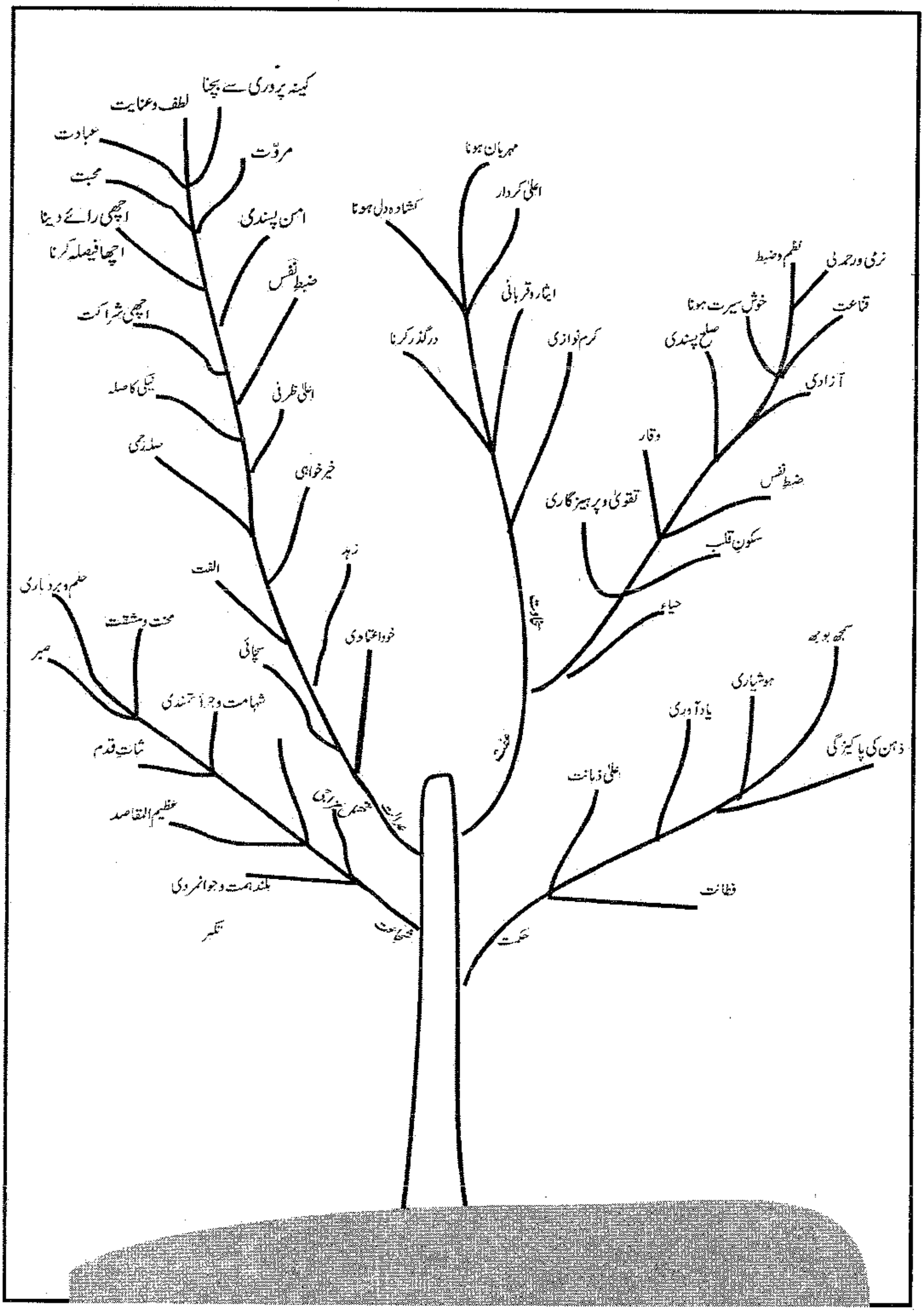
چالاکی وابلہ پن:

قوت تفکر کے افراط کو چالاکی اور تفریط کو ابلہ پن (کودن ہونا) کہتے ہیں۔

عدالت:

مذکورہ بالا تین قوتوں کے حد اعتدال میں ہونے سے نفس میں ایک چوتھی قوت واستعداد پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایسی ہوتی ہے جیسے کسی مجموعۂ اجزاء کا وجودی ذائقہ' اسے "عدالت" کہتے ہیں اور اس کی تعریف یہ ہے کہ ان قوتوں میں سے ہر ایک کو اس کا موزوں مقام دیا جائے' اس کے افراط کو "ظلم" اور تفریط کو "ظلم سہہ لینا اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا" کہتے ہیں۔

یہ ہیں بلند پایہ انسانی اخلاق کی بنیادیں یعنی عفت' شجاعت' حکمت' عدالت' اور ان سے بے شمار صفات نکلتی ہیں جن کی بابت غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان سب کی بازگشت انہی بنیادی اوصاف کی طرف ہے اور ان صفات کی نسبت ان چاروں اوصاف سے اسی طرح ہے جیسے فرع کو اصل اور نوع کو جنس سے ہوتی ہے، ان صفات میں سے چند یہ ہیں: جود وسخا' قناعت وشکر' صبر وجوانمردی، جرأت وہمت' حیا وغیرت' خیر خواہی' بزرگواری وتواضع وغیرہ، یہ سب صفات عظیم و پاکیزہ اخلاق فاضلہ کی شاخیں ہیں، ان کی بابت علم اخلاق کی کتب میں تفصیلات مذکور ہیں اور ہر ایک کی مکمل وضاحت وتشریح کی گئی ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر صفت ان چار بنیادی اوصاف میں سے کسی ایک سے جنم لیتی ہے اگلے صفحہ پر ان اصول وفروع یعنی چار بنیادی صفتوں اور ان سے تعلق رکھنے والی دیگر صفات کو ایک درخت کی شکل میں پیش کر دیا گیا ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔



کینہ پروری سے بچنا
لطف وعنایت
عبادت
مروّت
محبت
اچھی رائے دینا
اچھا فیصلہ کرنا
امن پسندی
ضبطِ نفس
اچھی شراکت
نیکی کا صلہ
اعلیٰ ظرفی
صلہ رحمی
خیر خواہی
الفت
زہد
حلم وبردباری
محنت ومشقت
خود اعتمادی
سچائی
صبر
شہامت وجرأتمندی
ثبات قدم
عظیم المقاصد
بلند ہمت وجوانمردی
تکبر
شجاعت
مہربان ہونا
اعلیٰ کردار
کشادہ دل ہونا
ایثار وقربانی
کرم نوازی
درگذر کرنا
عفت
نرمی ورحم دلی
نظم وضبط
خوش سیرت ہونا
قناعت
صلح پسندی
آزادی
وقار
ضبط نفس
تقویٰ وپرہیزگاری
سکونِ قلب
حیاء
سمجھ بوجھ
ہوشیاری
یادآوری
ذہن کی پاکیزگی
اعلیٰ ذہانت
فطانت
حکمت

علم اخلاق میں ان صفات کی حدود اور ان سے تعلق رکھنے والی صفات کے جملہ پہلوؤں کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ہر صفت کے افراط و تفریط کے بارے میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے اور ان چار بنیادوں اور ان سے وابستہ صفات کی حقیقت...... ان کے پاکیزہ صفات ہونے...... کے بارے میں دلائل کے ذکر کے ساتھ ان کے حصول اور علم و عمل کے ذریعے اپنے آپ کو ان سے آراستہ کرنے کے طریقے بھی بیان کئے گئے ہیں، یعنی علم اخلاق سب سے پہلے ایک صفت کی فضیلت کو ثابت کرتا ہے پھر علمی استدلال سے اس کی اہمیت بیان کرتا ہے تاکہ انسان اس کی اچھائی کا معتقد ہو جائے اور اسے اس کی عظمت پر پختہ یقین حاصل ہو جائے، اس کے بعد ان طریقوں کی وضاحت کرتا ہے جو اس صفت کے حصول کی بابت مؤثر ہیں اور آخر میں یہ بیان کرتا ہے کہ اس صفت کے بار بار اپنانے اور عملی طور پر اسے بار بار اختیار کرنے کے نتیجہ میں لوح نفس پر وہ صفت نقش بر سنگ کی مانند ثبت ہو جاتی ہے گویا انسان کی طبع ثانوی بن جاتی ہے مثال کے طور پر ڈرپوک ہونا دراصل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کا خوف اپنے دل میں پیدا کرتا ہے جبکہ ''خوف'' حقیقت میں اسی چیز کی بابت ہوتا ہے جس کے واقع ہونے کا امکان و اندیشہ پیدا ہو جائے اور یہ خیال ہو کہ ممکن ہے یہ چیز واقع ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقع نہ ہو یعنی دونوں طرفیں (اس کا واقع ہونا اور نہ ہونا) برابر ہوں تو اس صورت میں کسی ایک طرف کو کسی ٹھوس وجہ کے بغیر صحیح سمجھ کر اس سے اثر لینا ہرگز درست قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ جب تک کوئی مضبوط دلیل یا ٹھوس وجہ وسبب اور (مرجع) موجود نہ ہو کسی ایک طرف کو اہمیت دینا صحیح نہیں اور کوئی عقلمند شخص ایسا نہیں کرسکتا۔ بنابرایں جب کوئی ''ڈرپوک'' آدمی اپنے ڈر اور خوف کے بارے میں یہ سب باتیں سوچے تو یقیناً اس کی لوح دل سے یہ مذموم صفت محو ہو جائے گی، اسی طرح دیگر صفات مذمومہ بھی ختم ہوسکتی ہیں اور ان کی جگہ صفات حسنہ و فضیلتیں آسکتی ہیں یعنی کوئی ڈرپوک آدمی ان تمام باتوں کو اپنے دل میں لائے اور عملی طور پر خوف و ڈر کے خاتمہ کے لیے خوف انگیز و ہولناک کام بار بار انجام دے تو اس کا دل مضبوط ہو جائے گا اور پھر وہ کبھی کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہوگا اسی طرح ہر مذموم صفت کو اپنے سے دور کرنے کے لیے یہ علمی و عملی اقدامات کرے تو یقیناً اچھی و پاکیزہ صفات کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، البتہ یہ بات یاد رہے کہ یہ سب کچھ اخلاقیات کے باب میں ان تین مکاتب فکر میں سے پہلے مسلک و مکتب فکر سے ہم آہنگ ہے جن کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ ہم پہلے کر چکے ہیں، ان تین مکاتب فکر میں سے پہلے مسلک و مکتب فکر میں اخلاق حسنہ اور بلند پایہ صفات و کمالات سے آراستہ ہونے کا ہدف و مقصد معاشرہ میں نام پیدا کرنا اور لوگوں کے نزدیک لائق ستائش ہونا ہے اور دوسرا مسلک و مکتب فکر بھی اس سے ملتا جلتا ہے جو کہ انبیاء و صاحبان شریعت کا مسلک ہے لیکن ان دونوں مکاتب فکر میں غرض و غایت اور ہدف و مقصد کے لحاظ سے فرق ہے کیونکہ پہلے مسلک و مکتب فکر میں اصلاح اخلاق کی غرض و مقصد اعلیٰ لوگوں کی نظروں میں با فضیلت ہونا اور انہی سے داد تحسین پانا ہے جبکہ دوسرے مکتب فکر میں اصل مقصد اور پاکیزہ اخلاق سے متصف ہونے کا بنیادی ہدف انسان کی حقیقی سعادت کا حصول ہے جو کہ ذات احدیت سبحانہ وتعالیٰ اور اس کی آیات کریمہ پر کمال ایمان سے عبارت ہے اور وہی آخرت کی بھلائی و بہتری اور خیر و صلاح ہے اور وہی حقیقی معنیٰ میں سعادت و خوش بختی اور واقعی

کمال ہے نہ یہ کہ صرف لوگوں کی نظروں میں سعادت وفضیلت ہو۔ تاہم اس کے باوجود دونوں مسلک اور مکاتب فکر اپنی غرض ومقصد اور ہدف ومقصود کے لحاظ سے قدر مشترک رکھتے ہیں اور وہ ہے عمل کے لحاظ سے انسانی فضیلت وعظمت کا حصول لیکن جہاں تک اس تیسرے مسلک ومکتب فکر کا تعلق ہے کہ جس کی بابت تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے تو اس کا پہلے اور دوسرے مسلک ومکتب فکر سے فرق یہ ہے کہ اس میں اصلی ہدف اور حقیقی مقصد ومقصود اعلیٰ رضائے الٰہی کا حصول ہے نہ کہ صرف انسانی فضیلت پر اکتفاء کرنا، یہی وجہ ہے کہ یہ تیسرا مسلک دونوں مکاتب فکر سے یکسر مختلف ہو جاتا ہے اور اس میں اخلاقی صفات کے اعتدال کی صورتیں بھی ان دو مکاتب فکر کے ہاں مسلمہ حدود اعتدال سے مختلف ہیں۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ جب کسی بندہ مومن کو ایمان کی بلندیاں نصیب ہوں اور وہ کمال ایمان کی منزل پر فائز ہو جائے تو اس کے دل میں تمام تر توجہات اپنے پروردگار کی ذات احدیت اور اس کے اسماء حسنیٰ وصفات جمیلہ کی طرف ہو جاتی ہیں جو کہ ہر طرح کے نقص وعیب سے پاک ومنزہ ہیں' اس کی یہ حالت رفتہ رفتہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر خدا کی طرف اس کی توجہ کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت اس انداز میں کرتا ہے جیسے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو اور خدا اسے دیکھ رہا ہے اگرچہ وہ اپنے پروردگار کو دیکھ نہیں سکتا لیکن خدا تو اسے یقیناً دیکھ رہا ہوتا ہے...... اور توجہ والتفات کی اس غیر معمولی کیفیت میں وہ اپنے رب کی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے، جلوہ کردگار اس کے دل وجان کو نور محبت سے روشن کر دیتا ہے اور پھر اس کی محبت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کا انگ انگ خدا کی محبت سے سرشار ہو جاتا ہے' ایسا کیوں نہ ہو؟ آخر وہ انسان ہے اور جمال وکمال سے پیار کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے، ذات احدیت کمال مطلق اور جمال بے مثال ولازوال ہے اس لیے حقیقی محبت اسی سے ہوتی ہے اور محبت کی حقیقت اسی سے وابستہ ہے لہٰذا وہ بندہ مومن صرف اپنے پروردگار سے محبت کرتا ہے اور بہت زیادہ محبت کرتا ہے چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ بقرہ، آیت ۱۶۵:

والذین آمنوا اشد حبا للہ ،

(اور جو لوگ مومن ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں)

اور پھر خدا سے محبت کی اس منزل تک پہنچ کر وہ اپنے تمام افعال واعمال میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کی پیروی واتباع کا عملی دم بھرتا ہے اور اپنے آپ کو صحیح معنیٰ میں آنحضرتؐ کا پیروکار بنالیتا ہے، اس کی زندگی کا ہر کام حضرت حبیب کبریا کے فرامین واحکام کے مطابق ہی انجام پاتا ہے اور ایسا کیوں نہ کیونکہ جب کسی چیز سے محبت ہوتی ہے تو اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز اور اس کی نشانیوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے اور آنحضرتؐ پروردگار عالم کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہیں اور آپؐ کا وجود مبارک سب سے بڑی آیت خدا ہے جیسا کہ پوری کائنات خدائے قدوس کی آیات ونشانیاں ہیں، بہر حال اس بندۂ مومن کے دل میں آتش محبت مزید شعلہ ور ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ عشق الٰہی میں اتنا سرشار ہو جاتا ہے کہ پھر اس کی نگاہ التفات خدا کے سوا کسی پر نہیں جمتی' اس کی تمام تر توجہات کا مرکز ذات پروردگار رہتا ہے اور وہ خدائے

یکتا کے علاوہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتا اور ہر چیز اور ہر ایک سے بے نیاز اپنے پروردگار کے عشق کی دہلیز پر سر رکھ دیتا ہے ،اپنے خالق و حقیقی مالک کے سوا کسی کی محبت کا دم نہیں بھرتا کیونکہ وہ عبد ہے، بندہ ہے اور اپنے آقا و مولا سے حقیقی عشق و پیار کرتا ہے جو کہ اس کے عبد ہونے کا فطری تقاضا بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ جس چیز کو بھی دیکھتا ہے اس میں اپنے محبوب کا جلوہ پاتا ہے اور جہاں بھی کوئی جمال و کمال اسے نظر آتا ہے وہ اسے اپنے معشوق......ذات حق تعالیٰ...... کے حقیقی جمال و کمال کا آئینہ دار پاتا ہے کیونکہ اس کے خالق کے جمال و کمال کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ انتہا، اور نہ اسے فنا لاحق ہو سکتی ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے جو کچھ بھی کائنات میں ہے اس کے وجود کی نشانی اور ہر جمال و کمال اس کے جمال و کمال کی برکت و فیض سے ہے حقیقی کمال صرف اس کے لیے ہے، ہر چیز اس کے کمال کی نشانی و آیت ہے اور نشانی و آیت کہتے ہی اسے ہیں جو اپنے تئیں کوئی مستقل حیثیت نہ رکھتی ہو بلکہ صاحب آیت کے حسن و جمال کی ترجمان ہو، اس لئے بندۂ مؤمن کے دل میں خالقِ یکتا کی محبت گھر کر لیتی ہے اور اس کا عشق اس کی کائنات جان و دل کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے، پھر اسے جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ اپنے پروردگار کی عظمت کا شاہکار دکھائی دیتا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ ہر چیز سے اپنی محبت و پیار کا رشتہ ختم کر کے صرف اپنے معبود حقیقی سے وابستۂ عشق ہو جاتا ہے لہٰذا جس چیز سے بھی محبت کرتا ہے وہ خدا کے لیے اور خدا کی محبت کی بنیاد پر ہوتی ہے اور جب اس کی محبت اور ہر چیز سے پیار للہ اور فی اللہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کے سوچنے اور عمل کے انداز میں بھی فرق آ جاتا ہے، وہ دوسروں کی طرح ادراک و عمل کے انداز اور طور طریقے اختیار نہیں کرتا، اس کا طرز تفکر یکسر بدل جاتا ہے، وہ ہر چیز سے پہلے اور اس کے ساتھ خدا کو دیکھتا ہے، چنانچہ وہ کسی چیز کو استقلال کا حامل نہیں سمجھتا، ہر چیز کو ذات کردگار کا دست نگر سمجھتا ہے۔ اور پھر اس کے علم و ادراک کا معیار بھی لوگوں کے معیاروں سے کہیں بلند و بالا ہو جاتا ہے کیونکہ لوگ ہر چیز استقلال کے پردے کے پیچھے سے دیکھتے ہیں جبکہ وہ ہر شے کو حقیقت کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ یہ تو ہے علم و ادراک کے حوالہ سے اس کے اور لوگوں کے معیاروں کا فرق! یہی حال مقام عمل میں ہے اس میں بھی اس کا معیار لوگوں سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ وہ تو صرف خدا سے محبت کرتا ہے، لہٰذا صرف اسی کے لیے محبت کرتا ہے اور جس چیز کو بھی چاہتا ہے خدا کے لیے چاہتا ہے، ہر چیز میں اس کا مطمع نظر ذات پروردگار ہی ہوتا ہے، بنا بریں وہ خدا کے سوا کسی کی جستجو نہیں کرتا اور نہ کسی کی تمنا و آرزو کرتا ہے، اسے صرف خالق کی رضا و خوشنودی مطلوب ہوتی ہے اس لیے وہ خدا کے علاوہ نہ تو کچھ طلب کرتا ہے، نہ کسی کی چاہت دل میں لاتا ہے، نہ کسی کا ارادہ کرتا ہے، نہ کسی سے کوئی امید وابستہ کرتا ہے، نہ کسی سے خوف کھاتا ہے نہ کوئی چیز پسند کرتا ہے، اس کی پسند و ناپسند کا معیار خدا کی پسند و ناپسند ہے، اسی طرح اس کی انس و وحشت' محبت و نفرت' خوشی و ناراضگی سب کا معیار ذات کردگار کے سوا کچھ نہیں، اس لحاظ سے اس کی اغراض و اہداف اور لوگوں کے مقاصد و اغراض میں بہت فرق پایا جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ جس چیز کو بھی انسانی فضیلت سمجھتا تھا اس کے حصول کے لیے ہر ممکن اقدام کرتا تھا لیکن اب ایسا نہیں بلکہ اگر وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے یا کوئی کام انجام دیتا ہے تو اس کی نظر میں اس چیز یا اس کام کی خوبی و فضیلت نہیں ہوتی بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ آیا یہ چیز یا یہ کام اس کے پروردگار کو پسند ہے یا نہیں اگر وہ چیز یا کام خدا کو پسند

ہو تو اسے فضیلت سمجھتا ہے اور اسے اپنا لیتا ہے لیکن اگر وہ خدا کو ناپسند ہو تو وہ بھی اسے ناپسند کرتا ہے اور اسے بری چیز و برا کام......رذیلت ...... سمجھتا ہے اور اس سے دوری اختیار کرتا ہے' گویا اس کی تمام تر توجہ کسی چیز یا کام کے اچھا (فضیلت) یا برا (رذیلت) ہونے کی طرف نہیں ہوتی بلکہ صرف رضائے الٰہی اور معیارِ خداوندی کی طرف ہوتی ہے، اس لیے اسے اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ آیا لوگ اس چیز یا کام سے خوش ہوں گے یا ناراض' اور اس کی تعریف کریں گے یا بدگوئی' وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ آیا اس کا پروردگار اس سے خوش ہوگا یا نہیں اور آیا یہ چیز یا کام خدا کی خوشنودی کا باعث ہے یا نہیں؟ چنانچہ وہ دنیا و آخرت' بہشت' دوزخ وغیرہ کی کوئی فکر نہیں کرتا اور نہ ہی ان میں سے کسی چیز کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ اہمیت دیتا ہے، اس کی تمام تر کوشش و توجہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے حصول پر ہوتی ہے، وہ اپنے رب کو پانا چاہتا ہے، وہی اس کی منزلِ مقصود ہے، اس کی بندگی کی عظمت، عبودیت کے حقیقی تقاضوں کی تکمیل ہے اور اس راہ میں اس کی رہبری محبتِ خدا ہے یعنی اس کا زادِ راہ اس کی بندگی اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے اس کی راہنما اس کی اپنے پروردگار سے حقیقی محبت و عشق ہے، شاید اسی جذبۂ محبت کی عکاسی شاعر نے اپنے کلام میں یوں کی ہے:

روت لی احادیث الغرام صبابة — باسنادها عن جیرة العلم الفرد
و حدثنی مر النسیم عن الصبا — عن الدوح عن وادی الفضا عن ربی نجد
عن الدمع عن عینی القریح عن الجوی — عن الحزن عن قلبی الجریح عن الوجد
بان غرامی و الهوی قد تحالفا — علی تلفی حتی اوسد فی لحدی

عشق نے محبت کی غم انگیز داستانیں دامن کوہ کے باعلم وبصیرت باسیوں کے حوالہ سے مجھے سنائی ہیں اور نسیم سحر کے جھونکوں نے بھی مجھے بادِ صبا' وادی فضا' نجد کی بلندیوں' آنسوؤں' میری زخمی نظروں' میرے باطنی جذبات واحساسات کی گرمی' میرے غم و درد' میرے مجروح دل اور میرے پیار کی شدت کے حوالہ سے مجھے بتایا ہے کہ میرے عشق و محبت نے اب یہ قسم کھائی ہے کہ مجھے فنا کی وادی میں دھکیل دیں یہاں تک کہ میں اپنی لحد کی آغوش میں محوِ خواب ہو جاؤں)

بہر حال مذکورہ بالا مطالب کے بیان میں ہم نے اختصار سے کام لیا ہے اور اجمالی طور پر جو کچھ ذکر کیا ہے اگر اس میں اچھی طرح غور و فکر سے کام لیا جائے تو یقیناً اصل معانی و مفاہیم کے ادراک کا مرحلہ طے ہو جائے گا' ان تمام مطالب سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اصلاح اخلاق کی بابت تیسرے مسلک و مکتب فکر میں فضیلت و رذیلت (خوبی و بدی) کا معیار ہی کچھ اور ہے جس کا قیاس دیگر مکاتب فکر سے نہیں ہوسکتا کیونکہ بنیادی فرق غرض و مقصد میں ہے' دیگر مکاتب فکر میں انسانی فضیلت و کمال کا جو معیار ذکر کیا گیا ہے اسے اس (تیسرے) مسلک و مکتب فکر میں نہایت عظیم وجلیل القدر و بے نظیر معیار یعنی ذات کردگار اور رضائے پروردگار میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اسی تبدیلی کے سبب اس مسلک و مکتب فکر کے علمی و عملی نتائج بھی دیگر مکاتب فکر سے یکسر مختلف ہو جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو چیز دیگر مکاتب فکر میں "فضیلت"

ہو تو اسے فضیلت سمجھتا ہے اور اسے اپنا لیتا ہے لیکن اگر وہ خدا کو ناپسند ہو تو وہ بھی اسے ناپسند کرتا ہے اور اسے بری چیز و برا کام......رذیلت...... سمجھتا ہے اور اس سے دوری اختیار کرتا ہے' گویا اس کی تمام تر توجہ کسی چیز یا کام کے اچھا (فضیلت) یا برا (رذیلت) ہونے کی طرف نہیں ہوتی بلکہ صرف رضائے الٰہی اور معیارِ خداوندی کی طرف ہوتی ہے، اس لیے اسے اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ آیا لوگ اس چیز یا کام سے خوش ہوں گے یا ناراض' اور اس کی تعریف کریں گے یا بدگوئی' وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ آیا اس کا پروردگار اس سے خوش ہوگا یا نہیں اور آیا یہ چیز یا کام خدا کی خوشنودی کا باعث ہے یا نہیں؟ چنانچہ وہ دنیا و آخرت' بہشت' دوزخ وغیرہ کی کوئی فکر نہیں کرتا اور نہ ہی ان میں سے کسی چیز کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ اہمیت دیتا ہے، اس کی تمام تر کوشش و توجہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے حصول پر ہوتی ہے، وہ اپنے رب کو پانا چاہتا ہے، وہی اس کی منزلِ مقصود ہے، اس کی بندگی کی عظمت، عبودیت کے حقیقی تقاضوں کی تکمیل ہے اور اس راہ میں اس کی رہبری محبتِ خدا ہے یعنی اس کا زادِ راہ اس کی بندگی اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے اس کی راہنما اس کی اپنے پروردگار سے حقیقی محبت و عشق ہے، شاید اسی جذبۂ محبت کی عکاسی شاعر نے اپنے کلام میں یوں کی ہے:

روت لی احادیث الغرام صبابة باسنادھا عن جیرۃ العلم الفرد
و حدثنی مر النسیم عن الصبا عن الدوح عن وادی الفضا عن ربی نجد
عن الدمع عن عینی القریح عن الجوی عن الحزن عن قلبی الجریح عن الوجد
بان غرامی و الھوی قد تحالفا علی تلفی حتی اوسد فی لحدی

عشق نے محبت کی غم انگیز داستانیں دامن کوہ کے باعلم و بصیرت باسیوں کے حوالہ سے مجھے سنائی ہیں اور نسیم سحر کے جھونکوں نے بھی مجھے بادِ صبا' وادی فضا' نجد کی بلندیوں' آنسوؤں' میری زخمی نظروں' میرے باطنی جذبات واحساسات کی گرمی' میرے غم و درد' میرے مجروح دل اور میرے پیار کی شدت کے حوالہ سے مجھے بتایا ہے کہ میرے عشق و محبت نے اب یہ قسم کھائی ہے کہ مجھے فنا کی وادی میں دھکیل دیں یہاں تک کہ میں اپنی لحد کی آغوش میں محوخواب ہو جاؤں)

بہرحال مذکورہ بالا مطالب کے بیان میں ہم نے اختصار سے کام لیا ہے اور اجمالی طور پر جو کچھ ذکر کیا ہے اگر اس میں اچھی طرح غور و فکر سے کام لیا جائے تو یقیناً اصل معانی و مفاہیم کے ادراک کا مرحلہ طے ہو جائے گا' ان تمام مطالب سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اصلاح اخلاق کی بابت تیسرے مسلک و مکتب فکر میں فضیلت و رذیلت (خوبی و بدی) کا معیار ہی کچھ اور ہے جس کا قیاس دیگر مکاتب فکر سے نہیں ہو سکتا کیونکہ بنیادی فرق غرض و متصد میں ہے' دیگر مکاتب فکر میں انسانی فضیلت و کمال کا جو معیار ذکر کیا گیا ہے اسے اس (تیسرے) مسلک و مکتب فکر میں نہایت عظیم و جلیل القدر و بےنظیر معیار یعنی ذات کردگار اور رضائے پروردگار میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اسی تبدیلی کے سبب اس مسلک و مکتب فکر کے علمی و عملی نتائج بھی دیگر مکاتب فکر سے یکسر مختلف ہو جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو چیز دیگر مکاتب فکر میں "فضیلت"

سمجھی جاتی ہو وہ اس مکتب فکر میں ''رذیلت'' سمجھی جائے یا اس کے برعکس ہو جائے یعنی ان مکاتب فکر میں جس چیز کو ''رذیلت'' سمجھا جاتا ہو وہ اس مکتب فکر میں ''فضیلت'' ہو۔

اخلاق کی بابت ایک نظریہ

زیر نظر موضوع کی بابت ایک اور نظریہ بھی پیش کیا جاتا ہے جو کہ اب تک ذکر کیے گئے نظریات سے یکسر مختلف ہے اور عین ممکن ہے کہ اسے علم اخلاق میں اصلاح اخلاق کی بابت ایک مستقل مسلک و مکتب فکر کا نام دیا جائے اور وہ یہ ہے کہ علاقوں اور معاشروں کے مختلف ہونے سے اخلاقی اصول و معیار بھی مختلف ہو جاتے ہیں کیونکہ ہر معاشرہ اپنے طرز تمدن میں دوسرے معاشرہ سے مختلف ہوتا ہے اور حسن وقبح ۔۔کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے کے معیاروں میں بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی بلکہ ہر معاشرے میں اچھا یا برا ہونے کا معیار دوسرے معاشرے سے مختلف اور الگ الگ ہوتا ہے جس کی بنیاد پر علمی و عملی نتائج بھی بدلتے رہتے ہیں اس نظریہ کے قائل حضرات یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ مکتب فکر دراصل اس مشہور و معروف نظریہ واصول کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے جسے ''تحویل وتکامل مادہ'' کے نظریہ سے موسوم کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ''مادہ'' لحہ بہ لحہ تبدیلی وارتقاء اور کمال پانے کی حالت میں رہتا ہے وہ کہتے ہیں کہ انسانی معاشرہ، زندگی کی ان احتیاجات کے مجموعہ و یکجا ہونے سے وجود میں آیا ہے جنہیں انسان افراد معاشرہ کے ذریعے پورا کرنا چاہتا ہے، اسی لیے وہ معاشرہ کی بقاء کا خواہاں رہتا ہے کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ اس کی بقاء کا راز معاشرہ کی بقا میں پوشیدہ ہے اور چونکہ طبیعت، قانون تحول وتکامل کے تابع رہتی ہے اس لیے معاشرہ بھی ہمیشہ تغیر وتبدل سے دوچار ہوتا ہے اور لحہ بہ لحہ ارتقاء و کمال کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے لہٰذا حسن وقبح کا ایک ہی حال پر باقی رہنا ممکن ہی نہیں کیونکہ حسن کا مطلب یہ ہے کہ عمل، معاشرہ کی غرض وغایت (ترقی وکمال) کے عین مطابق ہو اور قبح کا مطلب یہ ہے کہ عمل، معاشرے کے مقصد وہدف سے مطابقت نہ رکھتا ہو اس لیے ان (حسن وقبح) کا بدلتا رہنا یقینی امر ہے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ جامد رہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ بنابرایں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مطلق حسن یا مطلق قبح نام کی کوئی چیز پائی ہی نہیں جاتی بلکہ وہ دونوں ہمیشہ نسبت واضافت کے حامل ہوتے ہیں اور چونکہ زمان ومکان کے لحاظ سے معاشروں میں بھی فرق پایا جاتا ہے، ہر معاشرہ دوسرے معاشرہ سے مختلف ہوتا ہے اس لیے ان دونوں میں بھی تبدیلی وتغیر پیدا ہوتا رہتا ہے اور ان دونوں کے نسبت واضافت کے حامل ہونے اور تغیر وتبدل پانے کی وجہ سے اخلاقیات اور فضائل ورذائل کے معیاروں میں بھی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا۔ نتیجتاً۔ یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ اخلاقیات کی اصل واساس وہ قومی غرض ومقصد ہے جسے اجتماعی ومعاشرتی حوالہ سے حصول کمال کا وسیلہ وسبب ہونے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ معاشرتی کمالات کو پانا اسی کے ذریعے ممکن ہوتا ہے کیونکہ حسن وقبح کا معیار بھی وہی ہے اور وہ اسی

سے وابستہ ہیں، اسی وجہ سے جو چیز بھی اجتماعی ترقی و معاشرتی کمال کے حصول کا ذریعہ ہو وہ ''فضیلت'' کہلاتی ہے اور وہی ''حسن'' رکھتی ہے اور جو چیز معاشرہ کے جمود و تنزلی کا سبب ہو اسے ''رذیلت'' (برائی) کہا جاتا ہے اور اسی میں ''قبح'' ہوتا ہے، اسی بنیاد پر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جھوٹ' تہمت و افتراء' بے ہودہ حرکتیں' سنگدلی' شقاوت' ڈاکہ زنی' دہشت گردی' چوری اور بے حیائی کو بھی فضیلت و اچھائی قرار دیا جاتا ہے کیونکہ وہ مخصوص معاشرتی مقاصد اور اجتماعی اغراض و اہداف کے حصول کی راہ میں مؤثر ثابت ہوتی ہے جبکہ اس کے مقابل صداقت و عفت۔ پاکدامنی اور رحمدلی جیسی صفات کو برا اور قبیح قرار دیا جاتا ہے کیونکہ وہ معاشرتی مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

یہ ہے اس عجیب و غریب نظریہ کا خلاصہ ولب لباب کہ جسے اخلاقیات کے باب میں مادہ پرست کیمونسٹوں نے اختیار کیا ہے حالانکہ ان کے خیال کے برعکس یہ نظریہ نیا نہیں ہے بلکہ یونان کے قدیم فلاسفہ میں سے کلبیوں کے بارے میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اسی نظریہ کے قائل تھے، اسی طرح ''مزدک'' کے پیروکاروں کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ وہ عملی طور پر اس نظریہ کو اپناتے تھے (یاد رہے کہ ''مزدک'' وہ مشہور و معروف شخص ہے جو کسریٰ کے عہد سلطنت میں ایران میں رہتا تھا اور اسی نے کیمونزم کا نظریہ پیش کر کے لوگوں کو اس کی پیروی اور اسے عملی طور پر اپنانے کی دعوت عام دی) اس کے علاوہ افریقہ کے بعض پسماندہ قبائل وغیرہ کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس نظریہ کے قائل ہیں۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ یہ اصل نظریہ بھی غلط ہے اور جو دلیل اس کے صحیح ہونے پر پیش کی گئی ہے وہ بھی بے بنیاد اور نادرست ہے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ موجودات عالم میں سے ہم جس چیز کو بھی دیکھیں وہ اپنے ظاہری وجود میں اپنی مخصوص خصوصیات کی حامل نظر آتی ہے اور انہی خصوصیات کی وجہ سے اسے دیگر موجودات سے امتیاز و تشخص حاصل ہوتا ہے مثلاً زیدؔ اپنے وجود میں اپنی مخصوص صفات کا حامل ہونے کی وجہ سے اپنی ایک مستقل شخصیت رکھتا ہے جس کے سبب عمروؔ سے مختلف ہو جاتا ہے اسی طرح عمروؔ بھی اپنے وجود میں بعض خصوصیات کا حامل ہے جن کی بنیاد پر اسے ایک طرح کا تشخص حاصل ہے لہٰذا اپنی خصوصیات اور شخصی صفات کے حوالہ سے ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے طور پر دوسرے سے الگ حیثیت میں پہچانا جاتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ زیدؔ ہی عمروؔ ہو جائے اور عمروؔ ہی زیدؔ بن جائے، دونوں اپنی اپنی شخصیت اور انفرادی وجود کے ساتھ پہچانے جاتے ہیں، اس لیے وہ ''دو'' کہلاتے ہیں ''ایک'' نہیں۔ اور یہ ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس میں کس طرح سے کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا (تاہم یہ یاد رہے کہ ہماری اس بات سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کہ اس سے عالم مادہ کے بارے میں ہمارے اس قول کی نفی ہو جاتی ہے جو اس کی وحدت کی بابت ہم کہتے ہیں کیونکہ ان دونوں امور میں بہت فرق ہے۔ عالم مادہ کی وحدت کا مسئلہ زیدؔ اور عمروؔ کے ایک دوسرے سے الگ مستقل حیثیت و تشخص کا حامل ہونے کے مسئلہ سے قطعی مختلف ہے۔

بہر حال ان تمام مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ کسی کا ظاہری وجود ہی اس کی شخصی خصوصیت و شخصیت سے عبارت ہے لیکن جہاں تک ذہنی مفاہیم کا تعلق ہے تو وہ اس سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ہر ذہنی مفہوم خواہ اس کا تعلق کسی بھی چیز سے ہو ایک سے زیادہ مصداقوں پر منطبق ہو سکتا ہے مثلاً انسان' بلند قد انسان' ہمارے سامنے کھڑا ہوا انسان' تو

ان سب کے مفاہیم ایک سے زیادہ افراد پر صادق آتے ہیں یعنی جب ہم ان مفاہیم میں سے کسی ایک کا تصور ذہن میں لاتے ہیں تو اس کی تطبیق صرف ایک فرد پر نہیں بلکہ متعدد افراد پر کر سکتے ہیں کہ جس میں بھی اس مفہوم کی خصوصیات وصفات پائی جائیں اسے اس نام سے موسوم کر سکتے ہیں جبکہ ظاہری وجود کی بابت صورت حال اس سے مختلف ہوتی ہے اس میں اتنی وسعت نہیں پائی جاتی کہ اس کی شخصی خصوصیات کو کسی دوسرے کے تشخص کے لیے ذکر کیا جا سکے بلکہ وہ خصوصیات صرف اس کی شخصیت کے اظہار سے وابستہ ہوں گی جس میں پائی جاتی ہیں جیسے زید اور عمرو وغیرہ، لیکن کسی چیز کے ''مفہوم'' میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس میں یہ وسعت وگنجائش پائی جاتی ہے کہ اسے ایک سے زیادہ افراد پر منطبق کیا جا سکے اور جس چیز میں بھی اس مفہوم کی شخصی خصوصیات نظر آئیں اسے اس مفہوم کا نام دیا جائے، اب رہی علم منطق کے ماہر علماء کی مفہوم کے بارے میں تقسیم کی بات کہ انہوں نے ''مفہوم'' کو ''کلی'' اور ''جزئی'' میں تقسیم کیا ہے اور پھر ''جزئی'' کو دو قسموں ''اضافی'' اور ''حقیقی'' میں تقسیم کیا تو یہ سب تقسیمیں اضافت ونسبت کے حوالہ سے ہیں یعنی ایک مفہوم کا دوسرے مفہوم سے قیاس کرنے اور ان کے درمیان نسبت سنجی کی بنیاد پر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ایک مفہوم کی دوسرے مفہوم کے ساتھ نسبت دیکھی جاتی ہے اور کبھی کسی مفہوم کا ظاہری موجودات میں سے کسی سے قیاس کیا جاتا ہے اور مفہوم میں پائی جانے والی صفت (یعنی اس کا ایک سے زیادہ افراد پر منطبق ہوسکنا) کو کبھی اصطلاحی طور پر ''اطلاق'' کہا جاتا ہے جبکہ اس کا نقطہ مقابل (اس کا ایک سے زیادہ افراد پر منطبق نہ ہوسکنا) شخصیت یا وحدت کہلاتا ہے۔

اب رہا مادی موجودات کا مسئلہ کہ جو ظاہری وجود کی حامل ہیں تو ان کے بارے میں بھی صورت حال یہ ہے کہ قانون تغیر وتبدل اور اصول تکامل وتحرک ان پر بھی لاگو ہوتا ہے کیونکہ ان کا تعلق ''مادہ'' سے ہے، اس لیے ان کا ہر طرح سے قابل تقسیم ہونا یقینی امر ہے اور ان میں سے ہر ایک کا کئی ٹکڑوں اور حصوں میں بٹ جانا ناقابل انکار مسئلہ ہے اور وہ سب حصے اور ٹکڑے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں خواہ کوئی حصہ یا ٹکڑا پہلے ہو یا بعد میں! لیکن اس کے باوجود وہ سب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، ہر ایک کا وجود دوسرے کے وجود کے ساتھ مرتبط ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر تغیر وتبدل کا معنی ومفہوم ہی باقی نہیں رہتا اور وہ یوں کہ اگر دو چیزوں میں سے ایک بالکل ہی ختم ہو جائے (پورے طور پر معدوم ہو جائے) اور دوسری نئے سرے سے وجود میں آئے تو یہ کہنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ یہ دوسری چیز پہلی سے تبدیل ہو کر نئے وجود میں آئی ہے (یعنی پہلی چیز ختم ہو کر دوسری چیز میں تبدیل ہوگئی ہے) کیونکہ یہ دونوں اپنے اپنے وجود میں مستقل حیثیت رکھتی ہیں اور کوئی ایک بھی دوسری سے وابستہ نہیں جبکہ تغیر وتبدل جو کہ ہر حرکت کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اس صورت میں واقع ہوتا ہے جب دو مختلف حالتیں باہم ایک قدر مشترک رکھتی ہوں اسی بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حرکت دراصل اپنے طور پر ایک حقیقت رکھتی ہے اور اس کی کثرت اس کی طرف منسوب ان حصوں وحدود کے حوالہ سے ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک اپنی مخصوص نسبت کے ساتھ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک ''حرکت'' کا تعلق ہے تو وہ اپنے طور پر (اپنی ذات وحقیقت میں) ایک ہی سلسلہ سے عبارت ہے اور اسی بنیاد پر ہم اسے ''مطلق'' کہتے ہیں اور اسے اس نام سے موسوم کرتے وقت ہماری توجہ

صرف اس کی ذات و حقیقت پر ہوتی ہے اور اس کے حصوں و حدود کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ان سب سے قطع نظر کر کے اسے "حرکت مطلقہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ اگر ان حدود و حصوں کی نسبت و اضافت کے حوالہ سے دیکھیں تو حرکت کو "اطلاق" کی صفت سے متصف نہیں کر سکتے۔ اس بیان کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ اس "اطلاق" (ہر قسم کی نسبت و اضافت سے خالی ہونا) میں اور مفاہیم کے اطلاق میں بہت فرق ہے کیونکہ یہ "اطلاق" ایک "حقیقت" سے عبارت ہے جو ظاہری وجود کی حامل ہے جبکہ مفاہیم کا "اطلاق" ایک ایسی صفت سے عبارت ہے جو ذہن ہی میں محدود ہے اور ذہن ہی کے دائرے میں پائی جانے والی چیزوں سے تعلق رکھتی ہے۔

اور یہ بات بھی ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ انسان ایک طبیعی و مادی مخلوق ہے جو کہ کئی افراد، خصوصیات و صفات رکھتا ہے اور کارخانۂ قدرت نے جسے لباس وجود عطا کیا ہے وہ صرف ایک فرد انسان ہے نہ کہ تمام افراد کا مجموعہ یعنی انسانی معاشرہ۔ مجموعی صورت میں۔ دست تخلیق کا شاہکار نہیں بلکہ کائنات انسانی کے ہر فرد کی بحیثیت ایک فرد کے تخلیق ہوئی۔ ایک ایک فرد کو خلق کیا گیا۔ لیکن علیم و حکیم آفریدگار عظیم نے ایک فرد کے وجود میں پائی جانے والی کمی کے پیش نظر اس کے لیے حصول کمال کو ضروری سمجھا مگر وہ تنہا ایسا نہیں کر سکتا تھا اس لیے خدا نے اسے ایسی عظیم قوتوں و صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا جو اسے معاشرہ میں دوسرے افراد کے ساتھ مل کر حصول کمال کی بابت ضروری تھیں تا کہ وہ ان قوتوں و صلاحیتوں اور وسائل کے ذریعے معاشرہ میں ان کمالات کو پانے میں کامیاب ہو جائے جو اس کے وجود کی تکمیل و بقاء کے لیے ضروری ہیں۔ بنا بر ایں سب سے پہلے صرف ایک فرد انسان کی تخلیق مقصود تھی پھر اس کے بعد معاشرہ کی تشکیل کا مرحلہ سامنے آیا تو اسے وجود مل گیا۔ کیونکہ معاشرہ درحقیقت افراد کے مجموعہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ گویا معاشرے کا وجود ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

اب جبکہ یہ بات واضح ہو گئی کہ نگاہ آفرینش میں فرد ہی مورد توجہ قرار پایا تو اب یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کا اس معاشرہ میں کیا مقام ہے جس کی ضرورت اس کے لیے ایک ناگزیر امر ہے اور اپنی انسانی طبع کے حوالہ سے وہ اسی جانب رواں دواں ہے؟ تاہم یہ بات اس وقت صحیح ہوگی جب معاشرہ کی بابت طبع انسانی کے اقتضاء اور فطری طور پر اسکی جانب رواں دواں ہونے کو حقیقی معنی میں تسلیم کیا جائے یعنی اقتضاء وعلیت اور تحرک کا "معاشرہ" پر اطلاق حقیقی معنی میں صحیح ہو تو اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر انسان جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اپنے وجود کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جو "وحدت" اور فردی تشخص کی حامل ہے اور اس کے باوجود ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے، لحہ بہ لحہ ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتا رہتا ہے اور کمال کی جانب رواں دواں ہے اسی وجہ سے اس کی وجودی حرکت کا ہر حصہ و جزء دوسرے حصہ و جزء میں تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود تغیر و تبدیل کے تمام مراحل میں اس کی طبعی وحدت کے ساتھ "اطلاق" اور تحرک کا حامل رہتا ہے اور یہی فردی تشخص کی حامل طبع وجود توالد و تناسل (تولید نسل) کے نتیجے میں تمام افراد انسان میں موجود و محفوظ ہوتی ہے، ایک فرد سے دوسرا فرد پیدا ہوتا رہتا ہے اسے ہی نوع انسانی کے وجود کا نام دیا جاتا ہے اور وہ تمام افراد انسان میں اپنی وحدت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اگرچہ اس میں تمام افراد دائمی طور پر تغیر و تبدل سے دوچار رہتے ہیں لیکن اس

کی نوعی وحدت ہر فرد کی وحدت کے باوجود اسی طرح کمال کی جانب رواں دواں رہتی ہے جس طرح تمام افراد اپنے وجود میں فردی تشخص کے ساتھ ساتھ کمال کی جانب متوجہ و رواں دواں ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات مقرون بہ صحت ہے کہ دونوں (فردی و نوعی طبیعتیں) بہ سوئے کمال حرکت میں رہتی ہیں تاہم ان دونوں میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ ہر فرد اپنے وجودی تشخص و وحدت کے ساتھ فردی کمال کی جانب بڑھتا رہتا ہے جبکہ نوع انسانی اپنے ''اطلاق'' (فردیت کی قید سے آزادی) کے ساتھ کمال کی جانب رواں دواں ہوتی ہے۔ بنابراین جس طرح فرد کے کمال کی جانب رواں دواں رہنے کا مسئلہ ناقابل انکار ہے اسی طرح نوع انسانی کا کمال کی جانب بڑھنا بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے اور نظام طبیعت میں اسے ہرگز نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور یہی وہ امر ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ نوع انسان ترقی و کمال کی جانب رواں دواں ہے اور یہ کہ آج کا انسان زمانہء قدیم کے انسان سے زیادہ ترقی یافتہ اور زیور کمال سے آراستہ ہے' اسی وجہ سے وہ نظریہ بھی وجود میں آیا ہے جس میں حیوانات و دیگر موجودات ہستی کی وجودی ترقی و کمال اور لحہ بہ لحہ تغیر و تبدل کے ذریعے اعلیٰ وجود پانے کا مفروضہ ذکر کیا گیا ہے (عام طور پر اس نظریہ کو ''ڈارون'' سے منسوب کیا جاتا ہے) بہرحال طبیعت نوعیہ ہی تمام امور میں مورد توجہ ہے جو کہ افراد یا انواع میں محفوظ ہوتی ہے ورنہ اگر اسے نظرانداز کر دیا جائے اور اس کے موجود ہونے کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر جو کچھ اب تک اس سلسلے میں ذکر ہوا ہے یا بیان کیا جاتا ہے وہ سب خیالی باتوں اور شاعرانہ تصورات کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہ تو ہے انسان کی فردی و نوعی حیثیت کا بیان، یہی صورت حال معاشرہ کی بابت بھی ہے کیونکہ معاشرہ کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ معاشرہ جس کا وجود کسی خاص قوم وقبیلہ کے افراد یا زمانہ یا علاقہ سے وابستہ ہے اور دوسرا وہ معاشرہ جو تمام بنی نوع انسان سے تعلق رکھتا ہے کہ جو نوع انسانی کی بقاء اور تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ بقا اور تغیر و تبدل پاتا رہتا ہے، البتہ یہ بات اس صورت میں صحیح و درست ہوگی جب معاشرہ کی بابت تغیر و تبدل کی نسبت اسی طرح درست ہو جیسے انسان کی بابت درست ہے یعنی یہ تسلیم کرلیا جائے کہ معاشرہ بھی اس طرح کی مخصوص حالت و کیفیت کا نام ہے جو موجودات ہستی کو لاحق ہوتی ہے۔ بہرحال مطلق و مقید ہونے کی بابت جو انفرادی و نوعی حیثیت انسان کے بارے میں تصور کی جاتی ہے بعینہٖ وہی حیثیت معاشرہ کی بابت قابل تصور ہے۔ بنابرایں معاشرہ ایک ایسی حقیقت سے عبارت ہے جو انسان کی حرکت اور تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ تحرک و تبدل اختیار کرتا رہتا ہے اور اسے وجود میں آنے کے نقطۂ آغاز سے ہی وحدت حاصل ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور اس میں تغیر و تبدل اس کے اجزاء کے حوالہ سے پایا جاتا ہے کہ اگر اس کی حدود کو مختلف و متعدد حصوں اور اجزاء میں تقسیم کیا جائے تو ہر حصہ و جزء اپنے طور پر ایک فرد معاشرہ ہے جو اپنا مستقل تشخص رکھتا ہے اور افراد معاشرہ کا استناد اپنے وجود میں افراد انسان کی طرف ہوتا ہے۔ اور یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے ''معاشرہ'' کو مطلق حیثیت کے حوالہ سے ''نوع انسانی'' یا انسانیت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ ایک فرد سے تعلق رکھنے والا حکم و ضابطہ اپنے حکم و ضابطہ ہونے میں فردی تشخص کا حامل ہوتا ہے جبکہ عام حکم و ضابطہ عمومیت و اطلاق کے حامل ہونے کی وجہ سے مطلق کہلاتا ہے البتہ یہاں مطلق حکم سے ہماری مراد کلی الحکم نہیں کیونکہ حکم کے اطلاق سے مفہومی اطلاق مقصود نہیں ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس طرح

سے پیش کی جاتی ہے کہ یہ بات ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ہر فرد انسان اپنی ایک منفرد ومخصوص حیثیت وشخصیت رکھتا ہے اسی سے اس کی پہچان ہوتی ہے اور اس کی بقاء انسان کی بقاء سے وابستہ ہوتی ہے تاہم اس انفرادی تشخص میں جو معمولی وجزئی تغیر وتبدل واقع ہوتا رہتا ہے اس کا سبب اس کی طبع انسانی میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے سوا کچھ نہیں مثلاً اس کا کھانا پینا، اپنے ارادہ سے کام کاج کرنا' احساس وتفکر وغیرہ ایسے امور ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور اس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں، جب تک وہ خود موجود ہے یہ سب کچھ اس کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور ان سب میں جو تبدیلی بھی واقع ہوتی ہے وہ اس کے اپنے وجود میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتی ہے، یہی حال مطلق انسان کا ہے کہ جو اپنے افراد کے وجود کے ساتھ موجود ہوتا ہے یعنی وہ کہ جس کا وجود افراد نوع انسانی کے ہر فرد کیساتھ وجودی وابستگی رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ "معاشرہ" کا وجود در حقیقت طبع انسانی کے وجودی تشخص سے وابستہ ہے اور اسی کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک ہے لہٰذا مطلق معاشرہ یعنی وہ معاشرہ جس کا وجود طبع انسانی کا مرہون منت ہے اور انسان کی ابتدائے خلقت اور وجود میں آنے کے وقت سے لے کر اب تک قائم وموجود ہے دراصل مطلق نوع انسانی کی وجودی خصوصیات کا نمایاں جزء ہے جو کہ نوع انسانی کے وجود کے ساتھ ہی وجود میں آیا اور اس کے ساتھ ہی باقی ہے، اس کی بقاء بھی اس کے ساتھ وابستہ ہے، اسی طرح معاشرہ سے تعلق رکھنے والی تمام نسبتیں بھی اس کے وجود سے وابستہ اور اسکی بقاء کے ساتھ باقی رہتی ہیں، معاشرہ کے تمام اصولوں اور قوانین وضوابط کا وجود اور ان کی بقاء بھی طبع انسانی کے وجود وبقا کی مرہون منت ہوتی ہے خواہ ان میں معمولی تبدیلیاں ہی کیوں نہ آتی رہیں لیکن ان کی اصل واساس خود نوع انسانی کی مانند محفوظ وباقی رہتی ہے۔ بنا برایں ہمارا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کچھ معاشرتی اصول واخلاقی ضوابط ایسے بھی ہیں جو ہمیشہ باقی اور ثابت رہتے ہیں ان میں کسی طرح بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی مثلاً مطلق حسن وقبح ہمیشہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہنے والے دو ایسے اصول ہیں جن میں کبھی کوئی تغیر وتبدل پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ خود مطلق معاشرہ ہے کہ وہ کبھی "فردیت" میں تبدیل نہیں ہوتا' البتہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے ایک خاص معاشرہ کا دوسرے خاص معاشرہ کی صورت میں تبدیل ہونا خارج از امکان نہیں۔ یہی حال مطلق حسن وقبح اور خاص حسن وقبح کا ہے کہ وہ بھی بعینہ عام اور خاص معاشرے کی طرح ہے یعنی جس طرح عام معاشرہ کبھی فردیت کا روپ نہیں دھار سکتا اسی طرح عام حسن بھی ہرگز تبدیل نہیں ہوسکتا اور جس طرح خاص معاشرہ دوسرے خاص معاشرہ میں تبدیل ہوسکتا ہے اسی طرح خاص حسن میں تبدیلی آسکتی ہے اور وہ دوسرے خاص حسن میں بدل سکتا ہے۔

مذکورہ مطالب کے بیان کے بعد اب ہم اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ ہر فرد انسان اپنے وجود اور اپنی بقاء میں ان کمالات وفوائد کی احتیاج رکھتا ہے جن کا حصول اس کی بنیادی ضرورت ہے تا کہ وہ ان سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اپنی وجودی حیثیت کا تحفظ اور اپنی بقا کی راہ ہموار کر سکے' اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے وجود وہستی کے لحاظ سے سراپا احتیاج ہے اور اس کی تخلیق ہی اس طرح ہوئی ہے کہ اسے ایسی قوتوں وصلاحیتوں سے مالا مال کر دیا گیا ہے جن کے ذریعے وہ حصول

کمالات وفوائد کی اپنی بنیادی ضرورت کو پورا کرسکتا ہے مثلاً خالق نے اسے کھانے پینے اور افزائش نسل کے لیے مخصوص نظام کی حامل صلاحیتوں سے نوازا ہے تو اب اس کا فرض ہے کہ ان قوتوں و وسائل کے ذریعے اپنی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے عملی اقدام کرے اور ان کی بابت افراط وتفریط سے ہرگز کام نہ لے یعنی ان وسائل وقوتوں کے استعمال میں نہ تو حد سے بڑھ جائے یعنی کھانے پینے میں اس قدر زیادتی نہ کرے کہ مرجائے یا بیمار ہو جائے یا دوسری قوتوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھے اسی طرح ان سے استفادہ کرنے میں کوتاہی و کاہلی بھی نہ برتے ورنہ حصول کمالات وفوائد کی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر رہے گا بلکہ اس کے لیے ضروری ولازم ہے کہ حصول کمالات وفوائد کے لیے درمیانی راستہ اختیار کرے اور اعتدال سے کام لے، اسی درمیانی راستہ کو علم اخلاق کے ماہرین نے عفت و پاکدامنی سے موسوم کیا ہے اور اس کے دونوں جانبوں یعنی افراط وتفریط کو ''حرص'' اور ''کاہلی'' سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ہے حصول کمالات وفوائد کی بابت وجودی وسائل وصلاحیتوں اور قوتوں وتوانائیوں سے استفادہ کرنے سے مربوط مسئلہ' اس کے علاوہ یہ امر بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر فرد انسان کو اپنے وجود اور اپنی بقاء کے حوالہ سے ایسے امور کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جو ہمیشہ اس کے لیے خطرات کی صورت میں ہوتے ہیں اور اس کے وجود وبقاء کو نابودی و ہلاکت میں بدلنے کے درپے ہوتے ہیں لہٰذا اس کے لیے ضروری ولازم ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ کرے اور اپنے آپ کو ان کے حملوں سے بچائے تاکہ امن وسکون اور بھرپور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرسکے چنانچہ قدرت نے اسے ان خطرات سے بچاؤ کے لیے بھی قوتوں وصلاحیتوں اور وسائل سے آراستہ کردیا ہے تاکہ ان کے ذریعے اپنے آپ کو نابودی وہلاکت سے محفوظ رکھ سکے اور پھر ان قوتوں کے استعمال میں نہ افراط (زیادتی) سے کام لے اور نہ تفریط (کوتاہی وکاہلی) برتے بلکہ معتدل راستہ اختیار کرے کیونکہ اگر افراط سے کام لے تو اپنے وجود میں پائی جانے والی دیگر قوتوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت کھو دے گا اور اگر تفریط برتے گا تو نہ اپنے اندر پائی جانے والی دفاعی صلاحیتوں و وسائل سے استفادہ کرنے میں کامیاب ہوگا اور نہ ہی اپنے اندر پائی جانے والی دفاعی صلاحیتوں و وسائل سے استفادہ کرنے کا حق ادا کرے گا لہٰذا ضروری ہے کہ درمیانی صورت اپنائے کہ جسے علم اخلاق کی لغت میں ''شجاعت'' کہا جاتا ہے اور اس کے دو جانبوں افراط اور تفریط کو تہور وجذباتیت اور ''بزدلی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے (افراط: تہور' تفریط: بزدلی) بعینہ یہی صورت حال علم وحکمت اور اس کے دو جانب (افراط وتفریط) یعنی چالاکی اور ابلہ پن کی ہے' اسی طرح ''عدالت'' اور اس کے دو جانبوں افراط وتفریط یعنی ظلم اور ظلم سہنے کا حال ہے یعنی علم وحکمت درمیانی راستہ ہے جبکہ اس کا افراطی پہلو ''چالاکی'' اور تفریط کا پہلو ابلہ پن (کودن ہونا) کہلاتا ہے اسی طرح ''عدالت'' درمیانی حد ہے جبکہ اس کی افراطی جانب ''ظلم وزیادتی کرنا'' اور تفریطی جانب ''ظلم کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے۔

بنابرایں یہ چاروں پاکیزہ صلاحیتیں اور بلند پایہ صفات واخلاق کی بنیادیں یعنی عفت' شجاعت' حکمت' عدالت ہی وہ فضیلتیں ہیں جو انسان کی طبع فردی جو کہ ان فضیلتوں کے وسائل سے آراستہ ہے۔ کے حقیقی تقاضے ہیں اور یہ سب

''حسن'' (اچھی) ہیں کیونکہ اچھا ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ وہ اصل غرض وغایت اور وجود کے حقیقی مقصد سے ہم رنگ ہوں اور ان صفات میں انسان کی فردی سعادت وکمال اور وجود کی غرض وہدف سے ہمہ جہت ہم رنگی وموزونیت پائی جاتی ہے، لہٰذا انہیں ''صفات حسنہ'' کہا جائیگا جبکہ ان کی نقطہء مقابل صفات کو ''صفات قبیحہ'' (بری صفتوں) کا نام دیا جائے گا کیونکہ وہ انسان کی اصل غرض خلقت سے ہم رنگ نہیں لہٰذا وہ ''قبیح'' ہیں۔ اب جبکہ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انسان اپنی فردی حیثیت اور انفرادی طبع وجود کے لحاظ سے ایسا ہے تو پھر اجتماع ومعاشرہ میں بھی وہ ایسا ہی ہوگا اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ معاشرہ جو کہ افراد انسان ہی کے مجموعہ سے عبارت ہے طبع انسانی کے حقیقی وبنیادی تقاضوں کی نفی کردے کیونکہ معاشرہ کا وجود خود طبع انسانی کے وجودی تقاضوں میں سے ایک ہے تو کیا وہ طبع انسانی کے دیگر تقاضوں کی نفی کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، اس لیے کہ اگر ایسا ہو تو یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ طبیعت واحدہ میں وجودی تقاضوں کے حوالہ سے تناقض ممکن ہے جو کہ ہرگز درست نہیں اور معاشرے کا وجود درحقیقت افراد کو باہمی تعاون کے ذریعے ان کے ہدف تخلیق اور حقیقی کمال تک پہنچانے کے لیے ایک وسیلہ کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا یہ بات کس طرح درست ہوسکتی ہے کہ جو چیز ہدف تخلیق تک پہنچنے کا وسیلہ ہو وہ طبع وجود کے تقاضوں کی نفی کا سبب بن جائے؟ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اب جبکہ فرد اور معاشرہ کی بابت مذکورہ مطالب سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ حصول کمالات وفوائد ہر فرد کی فطری ضرورت ہے تاکہ وہ وجود میں پائی جانے والی قوتوں ووسائل اور صلاحیتوں کے استعمال میں افراط وتفریط سے بچ کر درمیانی راستہ اختیار کرکے ہدف تخلیق کو پانے میں کامیاب ہوسکے تو یہی حال نوع انسانی کا ہے کہ اپنے نوعی معاشرہ میں اپنے وجودی تشخص کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرے یعنی ہر فرد کی مانند نوع انسانی کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہر فضیلت میں افراط وتفریط کے پہلوؤں سے دور ہوکر درمیانی راستہ۔ حد اعتدال۔ اپنائے یعنی اپنے وجودی تشخص کے تحفظ کے لیے عفت، شجاعت، علم وحکمت اور عدالت کی فضیلتوں سے آراستہ ہو، اپنے آپ کو ہر اس خطرہ سے بچائے جس سے اس کی وجودی حیثیت ختم ہوسکتی ہو اور ہر اس کمال اور فائدے کو حاصل کرے جس سے اس کی پہچان وابستہ ہو، علم وحکمت کی دولت سے اس قدر ہی مالا مال ہو کہ جس کے بغیر اس کے وجود کو بقاء سے محروم ہوجانے کا خطرہ لاحق ہو، عدل وانصاف میں ایسی روش اپنائے کہ ہر حقدار کو اس کا حق مل جائے نہ کوئی کسی پر ظلم کرسکے اور نہ ہی کوئی ظلم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو۔

بنابرایں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ چار بنیادی اصول معاشرتی اخلاق کی فضیلتیں ہیں جو مطلق معاشرہ کے وجودی تشخص وبقاء کی ضامن ہیں اور انسانی معاشرہ میں انہیں حسن (اچھا ہونے کی صفت) کا حامل سمجھا جاتا ہے جبکہ ان کے نقطہء مقابل امور کو قبیح قرار دیا جاتا ہے (قبح سے متصف کیا جاتا ہے) لہٰذا یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ انسانی معاشرہ میں ''حسن'' اور ''قبح'' کا وجود ہے اور وہ دونوں ہمیشہ اس میں موجود ہوتے ہیں اور یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ یہ چار اخلاقی اصول ہمیشہ اپنے حسن کے ساتھ فضیلت کی صفت کے حامل ہوتے ہیں (فضائل حسنہ)۔ جبکہ ان کے نقطہء مقابل امور وصفات ہمیشہ قبیح کہلاتی ہیں (رذائل قبیحہ)۔ ان کے حسن وقبح پر حوادث روزگار اور تغیرات زمانہ اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ معاشرتی طبع

انسانی ہمیشہ ان کے حسن وقبح کے بارے میں یہی فیصلہ کرتی ہے کہ ان کا حسن وقبح ذاتی ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ اسی کے حوالہ سے پہچانی جاتی ہیں یہی حال ان کی فروعات کا ہے کہ وہ بھی ان اصولوں ۔ بنیادوں ۔ کی مانند حسن وقبح سے متصف ہوتی ہیں یعنی جب ہم ان بنیادی فضیلتوں کو دیکھتے ہیں اور پھر ان صفات وافعال کو دیکھتے ہیں جو تجزیہ وتحلیل کے بعد انہی کی طرف لوٹتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں (اصول وفروع) میں حسن وقبح سے متصف ہونے کی صلاحیت یکساں ہے اور اگر کوئی تبدیلی ان کی جزئیات ومصادیق میں نظر آتی ہے تو اس کی وجہ ان کی تطبیق کی کیفیت کے سوا کچھ نہیں ہوتی ورنہ ایسا نہیں کہ ان کی اصل حقیقت میں کوئی تغیر وتبدل واقع ہوتا ہے' ان کی اصل ''ثابت'' و محفوظ ہوتی ہے اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اب تک ہم نے جو مطالب ذکر کئے ہیں ان سے اس نظریہ کی نادرستی ثابت ہو جاتی ہے جو علم اخلاق میں اصلاح کی بابت ''مخصوص'' مسلک ومکتب فکر کے طور پر بیان کیا جا چکا ہے، تفصیل ملاحظہ ہو:

(۱) وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں مطلق حسن وقبح نام کی کوئی چیز وجود ہی نہیں رکھتی بلکہ وہ دونوں حسن وقبح ہمیشہ نسبت واضافت کے حامل ہوتے ہیں اور دونوں میں زمان ومکان اور معاشروں کے مختلف ہونے کی وجہ سے تغیر وتبدل پیدا ہوتا رہتا ہے ان کا یہ کہنا درحقیقت ایک غلط فہمی ومغالطہ کا نتیجہ ہے۔ جو کہ مفہومی اطلاق اور وجودی اطلاق کے معانی میں خلط ملط سے پیدا ہوا ہے (مفہومی اطلاق سے مراد کلی مفہوم ہے جو ذہن کے دائرے میں ہوتا ہے اور وجودی اطلاق سے مراد ظاہری وجود کا استمرار ہے) بنابراین یہ درست ہے کہ حسن وقبح عالم خارج میں مطلق اور کلی ہونے کی صفت کے ساتھ ظاہری وجود نہیں رکھتے لیکن اس سے یہ ہرگز مراد نہیں لیا جا سکتا کہ وہ کبھی اور کسی صورت میں بھی عالم خارج میں وجود نہیں پا سکتے کیونکہ مطلق حسن وقبح ظاہری وجود کے استمرار کے معنی میں نوع انسانی کے اجتماعی وجود کے ساتھ ساتھ موجود ہیں تو جس طرح مطلق معاشرہ اپنے افراد کے وجود کے ساتھ بقاء واستمرار رکھتا ہے اسی طرح حسن وقبح بھی اس کے ساتھ ساتھ باقی ومستمر ہیں ان کا وجود معاشرہ کی طبع وجودی کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ معاشرے کا اصل ہدف ومقصد نوع انسانی کی سعادت ہے اور واضح ہے کہ معاشرے میں انجام پذیر ہونے والے تمام افعال اور حرکات وسکنات اس عظیم وبلند پایہ مقصد سے پورے طور پر ہم آہنگ نہیں ہوتے اور نہ ہی اس بات کا کوئی امکان ہے کہ جو کام بھی انجام پذیر ہو وہ نوع انسانی کی سعادت ایسے پاکیزہ ہدف کے حصول کی ضمانت دے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ میں دونوں قسم کے افعال انجام پذیر ہوتے ہیں، کچھ افعال نوع انسانی کی سعادت سے ہم آہنگ اور ہمیشہ اس کے حصول کے ضامن ہوتے ہیں اور کچھ افعال اس پاکیزہ ہدف سے ناہم آہنگ اور ہمیشہ اس سے متصادم ہوتے ہیں لہٰذا انہی کے حوالہ سے حسن وقبح کا وجود بھی ہمیشہ پایا جاتا ہے کیونکہ مذکورہ ہدف سے ہم آہنگی کا نام ہی حسن اور ناہم آہنگی کا نام قبح ہے۔

بنابراین یہ کیونکر ممکن ہے کہ اجتماعی ومعاشرتی عدل کی پاسداری ضروری نہیں سمجھتے یعنی وہ یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ ہر حقدار کو اس کا حق دیا جانا چاہیے یا یہ کہ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے فوائد وکمالات کا حاصل کرنا ضروری ہے' یا یہ

کہ وہ اجتماعی و معاشرتی فوائد و مصلحتوں کے تحفظ کو ضروری حد تک بھی اہمیت نہیں دیتے یا یہ کہ وہ علم کو جو کہ ان کی اجتماعی زندگی میں ان کی مصلحتوں و فوائد کی پہچان و تشخص کا ذریعہ ہے اچھا نہ سمجھیں یہ ہرگز ممکن نہیں۔ بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ یہ چار صفات عدالت، عفت، شجاعت، حکمت ہی ہر معاشرہ میں نوع انسانی کے لیے فضیلتیں کہلاتی ہیں اور ہر معاشرہ ان کے اچھا ہونے (حسن) پر یقین رکھتا ہے اور انہیں انسانی عظمت کے تحفظ کا سبب اور بنیادی اصول سمجھتا ہے، ہر معاشرہ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ:

(۱) حقدار کو اس کا حق ملنا چاہیے۔

(۲) اجتماعی مصلحتوں اور معاشرتی فوائد و کمالات حاصل کرنے چاہیں۔

(۳) اجتماعی مصلحتوں کا تحفظ ہونا چاہیے۔

(۴) علم حاصل کرنا چاہیے کیونکہ علم ہی نوع انسانی کی مصلحتوں و فوائد کی تشخیص کا ذریعہ ہے۔

یہ ہے معاشرتی فضیلتوں کا حال، یہی حال ان کے نقطہ ہائے مقابل اوصاف کا ہے کہ کوئی معاشرہ ان کے قبیح ہونے سے انکار نہیں کرتا کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ کسی معاشرہ میں فضیلتوں کے نقطہ ہائے کے مقابل اوصاف (قبیح امور) سے اجتناب ضروری نہ سمجھا جاتا ہو اور نازیبا حرکتوں کے کھلم کھلا ارتکاب سے دوری اختیاری کرنے کو لازمی امر قرار نہ دیا جاتا ہو اسی کو حیا کہتے ہیں جو کہ عفت و پاکدامنی کی ایک قسم ہے، یا یہ کہ اجتماعی تقدس اور معاشرتی حقوق کی پامالی پر غضب ناک ہونے اور عملی احتجاج کرنے کو ضروری نہ سمجھا جاتا ہو اسی کو غیرت کہتے ہیں جو کہ شجاعت و بہادری کی ایک قسم ہے۔ یا یہ کہ قناعت کو ضروری نہ سمجھتا ہو جو کہ اپنے حقوق کے حصول پر اکتفاء اور دوسروں کے حقوق کی پامالی سے اجتناب سے عبارت ہے۔ یا یہ کہ انکساری و ''تواضع'' کو ضروری نہ سمجھتا ہو جو کہ اپنی معاشرتی منزلت و مقام کی حدود میں رہتے ہوئے تکبر و بڑائی اور لوگوں سے ناحق برتاؤ اور زیادتی کرنے سے دوری اختیار کرنے سے عبارت ہے بہر حال مذکورہ چار بنیادی اصولوں اور بلند پایہ اخلاق کی فضیلتوں کی تمام فرعیں اور قسمیں اس طرح ہیں کہ ان کی بابت معاشرہ حسن کا عقیدہ رکھتا ہے اور ان کے نقطہ ہائے مقابل کے قبیح ہونے کا قائل ہے۔

(۲) وہ کہتے ہیں کہ معاشروں کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی وجہ سے حسن و قبح (کسی چیز یا کام کے اچھا یا برا ہونے) کے معیار بھی مختلف ہوتے ہیں، جس کے نتیجہ میں کچھ صفات ایسی ہوتی ہیں جنہیں ایک معاشرہ اچھا سمجھتا ہے جبکہ دوسرا معاشرہ انہیں برا سمجھتا ہے۔ ان کی یہ بات درست ہے لیکن اس کا سبب یہ نہیں کہ ایک معاشرہ اخلاقی فضیلتوں کے اپنانے کو ضروری سمجھتا ہے جبکہ دوسرا ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھتا، ایسا ہرگز نہیں بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ ہر معاشرہ، صفات حسنہ کے اپنانے اور صفات قبیحہ سے دور رہنے کو ضروی سمجھتا ہے البتہ اختلاف آراء کا تعلق صفات کی تطبیق سے ہے اور وہ یوں کہ عین ممکن ہے کہ ایک معاشرہ کسی کام کو فضیلت و صفت حسنہ کا مصداق نہ سمجھے جبکہ دوسرا معاشرہ اسے اس کا مصداق سمجھتا ہو اسی طرح اس کے برعکس عین ممکن ہے کہ ایک معاشرہ کسی کام کو ''رذیلت'' و صفت قبیحہ کا مصداق نہ سمجھتا ہو جبکہ دوسرا معاشرہ

اسے اس کا مصداق سمجھے لیکن اس حوالہ سے اختلاف رائے کا مطلب یہ نہیں کہ اصول و بنیادیں ہی مختلف ہیں یعنی ایک معاشرہ تو فضیلتوں کو اپنانے اور صفات قبیحہ سے دور رہنے کو اچھا اور ضروری سمجھے جبکہ دوسرا معاشرہ ضروری نہ سمجھے ایسا ہر گز ممکن نہیں مثلاً تاریخ کئی ایسے معاشروں کی نشاندہی بھی کرتی ہے جن سے استبدادی حکومتیں قائم تھیں اور لوگ بادشاہ کو ہر چیز میں مکمل طور پر صاحب اختیار سمجھتے تھے کہ وہ جو چاہے انجام دے اور جیسا چاہے فرمان جاری کرے۔ گویا اسے حاکم مطلق اور فعال مایشاء قرار دیتے تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اجتماعی عدل و معاشرتی انصاف کو اچھا نہیں سمجھتے تھے بلکہ حقیقت میں وہ اسے ہی عدل و انصاف سمجھتے تھے کیونکہ وہ اسے حاکم وقت کے مسلمہ حقوق میں شامل سمجھتے تھے اور بادشاہ کو اس طرح کے اختیارات کا حامل سمجھنا اپنے لئے حاکم کے حقوق کو پورا کرنے سے تعبیر کرتے تھے، نہ یہ کہ اسے صرف ظلم و زیادتی قرار نہ دیتے تھے بلکہ اس کے برخلاف کچھ کہنے یا سمجھنے کو نادرست کہتے تھے، تو دراصل یہ ان کی طرف سے تطبیق اور مصداق کی تشخیص میں غلطی تھی نہ کہ اصل عدالت یا ظلم میں فرق کی وجہ سے ایسا ہوتا تھا کیونکہ وہ ہر حال میں عدالت کو فضیلت اور صفت حسنہ جبکہ ظلم کو برائی اور صفت قبیحہ سمجھتے تھے جو کچھ تھا وہ ان صفات کے مصادیق کی تشخیص میں فرق کے باعث تھا۔

اسی طرح بعض معاشروں مثلاً قرون وسطی کی فرانسیسوی قوموں کے بارے میں ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں کے لیے علم و حکمت کا حصول معیوب سمجھتے تھے تو اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ حقیقت میں علم و حکمت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس کی فضیلت کے قائل نہ تھے بلکہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ سیاسی باریکیوں سے آگاہی اور انتظامی امور و حکومتی معاملات میں مہارت حاصل کرنے کے لیے تعلیمی مصروفیات بادشاہ کے سلطنتی کاموں میں رکاوٹ بنتی ہیں اس لیے یہ کام اسے نہیں کرنا چاہیے۔

اسی طرح بعض معاشروں میں عفت و پاکدامنی یعنی عورت کا اپنے شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد سے جنسی ملاپ سے دوری اختیار کرنا صنف نازک کا شرم و حیا سے کام لینا' مردوں کا غیرت (جنسی ہوس سے دوری) اختیار کرنا اور قناعت و انکساری ایسی پاکیزہ صفات کو ''فضیلتیں'' نہیں سمجھا جاتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عفت' حیا 'غیرت ' قناعت' انکساری وغیرہ کے فضیلت ہونے کو تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے مصادیق اور کیفیتوں کے تعین میں اختلاف نظر رکھتے ہیں گویا ان کے ہاں ان صفات کو دیگر معانی میں فضیلتیں سمجھا جاتا ہے مثلاً حکمران کا اپنے اقتدار میں اور قاضی کا قضاوت و فیصلہ کرنے میں ''عفت'' سے کام لینا لوگوں کا قوانین مملکت کی خلاف ورزی سے باز رہنا، وطن' تہذیب و تمدن و قومی و معاشرتی روایات کا تحفظ و پاسداری کرنا' عوام الناس کا اپنے ان حقوق پر قناعت کرنا جو قانون نے ان کے لیے مقرر کر دیئے ہیں اور اپنے رہبروں و حکمرانوں کا ادب و احترام بجا لانا اور ان کے احکامات پر سر تسلیم خم کر دینا وغیرہ ان کے نزدیک فضیلت سمجھا جاتا ہے اور وہ ان امور میں عفت' حیا' غیرت' قناعت اور انکساری وغیرہ کو صفات حسنہ سمجھتے ہیں، اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ ان فضیلتوں کی اصل بنیاوں کے قائل ہیں لیکن ان کا اختلاف رائے ان صفات کے موارد و مصادیق میں ہے۔

(۳) وہ یہ کہتے ہیں کہ اخلاق کے اچھا یا برا ہونے کا اصل معیار ان کا اجتماعی و معاشرتی اغراض و مقاصد سے

ہمرنگ وہم آہنگ ہونا یا نہ ہونا ہے، لہٰذا جو چیز اجتماعی ترقی و معاشرتی وقومی ارتقاء وکمال کا ذریعہ ہو وہ اچھی (فضیلت) اور جو چیز معاشرہ کے جمود وتنزلی کا سبب ہو وہ برائی (رذیلت) ہے، یہ بات بھی ایک واضح مغالطہ وغلط فہمی کا نتیجہ ہے کیونکہ ان حضرات کو ''معاشرہ'' کے معنی میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ''معاشرہ'' اصل میں ان قوانین وضوابط پر عمل کرنے سے حاصل ہونے والی حالت وصورت کا نام ہے جنہیں طبع انسانی نے فطری طور پر افراد معاشرہ کے لیے مقرر کر دیا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا معاشرہ اپنے افراد کو سعادت وخوش بختی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے بشرطیکہ اس میں بے نظمی' ہرج ومرج نہ ہو اور فطری قوانین کے عملی نفاذ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو کیونکہ معاشرہ، فطری تقاضوں کی تکمیل کی ایک عملی صورت ہے جس کی بنیادیں کبھی تغیر و تبدیل سے دوچار نہیں ہوتیں۔ اور یہ بات بھی ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ معاشرہ میں حسن وقبح اور فضیلت ورذیلت (اچھائی و برائی) کے کچھ اصول ہیں جو ہمیشہ معاشرہ کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں کبھی اس سے جدا نہیں ہوتے لیکن جہاں تک اجتماعی اہداف و معاشرتی اغراض ومقاصد کا تعلق ہے تو وہ ایسے تصوراتی امور ہیں جنہیں معاشرہ کو ایک نئی شکل وصورت میں ڈھالنے کے لیے فرض کر لیا جاتا ہے تاکہ افراد معاشرہ کو ان کا پابند کر دیا جائے گویا معاشرہ اور چیز ہے اور معاشرتی اغراض و مقاصد دوسری چیز' ان دونوں میں فعلیّت و قوت کا فرق ہے یعنی معاشرہ فطرت کے مقررہ اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے پیدا ہونے والی ایک صورت سے عبارت ہے جبکہ معاشرتی اہداف مخصوص فرضی امور ہیں جن کا وجود ابھی تک عالم تصورات سے باہر نہیں آیا ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھا جائے کیونکہ اول الذکر یعنی معاشرہ ایک ناقابل انکار واضح وجودی حقیقت ہے جبکہ مؤخر الذکر یعنی معاشرتی اہداف ایک تخیلاتی منصوبہ سے عبارت ہے جو ابھی وجودی حقیقت کے روپ میں نہیں ڈھلے، تو دونوں میں حقیقی وجود اور فرضی وتصوراتی وجود جیسا فرق پایا جاتا ہے لہٰذا وہ دونوں ایک جیسے کیونکر ہو سکتے ہیں اور پھر یہ کیونکر درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ حسن وقبح اور فضیلت ورذیلت کے جو معیار و اصول عام انسانی معاشرہ پر فطرت کے حوالہ سے حکم فرما ہیں وہ فرضی وتخیلاتی اہداف اور تصوراتی اغراض ومقاصد سے ہمرنگ وہم آہنگ ہو جائیں۔ ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ عام معاشرہ فطرتاً اپنے تئیں کوئی معیار واصول نہیں رکھتا جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ انہی اہداف اور اغراض ومقاصد کے حوالہ سے ہوتا ہے جو معاشرے کی تشکیل کی بنیادیں قرار پاتے ہیں بالخصوص جبکہ وہ اغراض ومقاصد افراد معاشرہ کی سعادت سے ہمرنگ بھی ہوں۔ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ ہم نے جو مطالب آغاز بحث میں حسن وقبح اور فضیلت ورذیلت کے معیاروں کی بابت ذکر کئے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ سب کچھ طبع انسانی کے فطری تقاضے وفیصلے اور معیار واصول ہیں جو ہمیشہ ''ثابت'' وغیر متغیر رہتے ہیں۔

ان تمام مطالب کے علاوہ زیر بحث مکتب فکر ونقطۂ نظر کو درست وصحیح تسلیم کرنے سے ایک نہایت پیچیدہ صورت حال پیدا ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ اگر حسن وقبح' فضائل ورذائل اور دیگر معاشرتی واجتماعی معیاروں واصولوں کو اجتماعی ومعاشرتی اہداف اور اغراض ومقاصد کے تابع قرار دیا جائے تو عالم ہستی میں معیاروں واصولوں کے حوالہ سے ایک لامتناہی جنگ شروع ہو جائے گی کیونکہ عین ممکن ہے بلکہ امر واقعہ ہے کہ دنیا میں گوناگوں اغراض ومقاصد اور ایک دوسرے سے یکسر مختلف اہداف و

اطوار پائے جاتے ہیں اوران سب کے اپنے مخصوص تقاضے ومعیار ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس صورت حال میں کوئی معاشرہ دوسرے معاشرہ کو مورد تنقید قرار نہیں دے سکتا اور کوئی ایک، دوسرے کے معیاروں واصولوں کے مقابلہ میں اپنے معیاروں واصولوں کو صحیح ودرست ثابت نہیں کرسکتا جس کے نتیجہ میں کوئی ایسا معیار ودلیل اور اصول نہیں پایا جائے گا جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور تمام معاشرے عمومی طور پر اسے تسلیم کریں اور پھر اپنے موقف ونقطہ نظر یا معیار واصول کو صحیح تسلیم کروانے کے لیے طاقت کے استعمال کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے گا اور عقلی وعلمی دلائل کی بجائے زور بازو آزمانے کا راستہ اختیار کیا جائیگا۔ کیا یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ طبع انسانی اپنے افراد کو ایسی اجتماعی زندگی کی طرف لے جائے جس میں نہ تو کوئی ایسا جامع ومشترک معیار ہو جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور نہ ہی تمام افراد کے درمیان کسی بھی حوالہ سے فکری ہم آہنگی پائی جائے بلکہ صرف ایک ہی ذریعہ ہو کہ جس سے وہ ایک دوسرے کو اپنے نقطہ ہائے نظر کے صحیح ہونے کا قائل کرسکیں یعنی طاقت کا استعمال؛ جو کہ معاشرہ کی تباہی کے سوا نتیجہ بخش ثابت نہیں ہوسکتا! آیا یہ بات فطرت کے معیاروں اور اس کے وجودی تقاضوں کے درمیان تضاد پیدا نہیں کرتی؟

اخلاق کے حوالہ سے روایات پر ایک اور نظر

مجاہد کے دو اجر

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ایک شخص حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی مجھے جہاد کا بہت شوق ہے اور یہ شوق ہمیشہ میرے دل میں موجزن رہتا ہے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا اگر تو جہاد کا مشتاق ہے تو پھر اللہ کی راہ میں جہاد کر کہ اگر تجھے قتل کردیا گیا تو تو خدا کے پاس زندہ ہوگا اور رزق پائے گا اور اگر اس دوران طبعی موت تجھ پر آ گئی تو تیرا اجر خدا پر ہوگا۔

اس حدیث مبارک میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کا یہ ارشاد گرامی کہ "اگر اس دوران طبعی موت تجھ پر آ گئی تو تیرا اجر خدا کے ذمہ ہوگا" دراصل اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ ہے:

سورہ نساء آیت ۱۰۰:

○ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ...،

(جو شخص اپنے گھر سے نکلے اس صورت میں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے والا ہو پھر اس پر

موت آجائے تو یقیناً اس کا اجر خدا کے ذمہ ہوگا)۔

بہر حال زیر نظر حدیث مبارک سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جہاد کی غرض سے گھر سے نکلنا درحقیقت خدا اور رسول خدا کی طرف ہجرت کرنے سے عبارت ہے۔

صادق الوعد کا ایک مصداق

کافی میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے حضرت اسماعیلؑ کے بارے میں پوچھا گیا کہ خداوند عالم نے انہیں صادق الوعد۔ سچا وعدہ کرنے والا۔ (وعدہ کو صحیح نبھانے والا) کے نام سے موسوم کیا اس کا کیا سبب ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے انہیں اس لیے اس مقدس نام (صادق الوعد) سے موسوم فرمایا کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک شخص سے وعدہ کیا کہ فلاں جگہ اس سے ملاقات کریں گے چنانچہ آنجناب اس شخص کے انتظار میں ایک سال تک وہاں رہے لہٰذا خدا نے انہیں صادق الوعد کا نام عطا فرمایا اس کے بعد وہ شخص وہاں آیا تو حضرت اسماعیلؑ نے اس سے فرمایا کہ میں ابھی تک تیرے انتظار میں بیٹھا ہوں۔

عین ممکن ہے کہ عام لوگ حضرت اسماعیلؑ کے اس عمل کو معقول نہ سمجھیں بلکہ اسے افراط کہیں اور اعتدال سے دور قرار دیں جبکہ خداوند عالم نے اسے آنجنابؑ کے لیے ایک فضیلت قرار دیا اور اس کی قدردانی کے طور پر قرآن مجید میں ان کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

سورہ مریم، آیت ۵۵:

O وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيْلَ ۚ إِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۖ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۔۔۔،

(اور یاد کرو قرآن میں اسماعیل کو وہ صادق الوعد تھے اور رسول و نبی تھے اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز و زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ خدا کے نزدیک نہایت پسندیدہ تھے)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے جس معیار شرف پر حضرت اسماعیلؑ کے عمل کو دیکھا ہے وہ اس معیار سے بہت مختلف ہے جو عام صاحبان عقل کے ہاں مورد توجہ ہوتا ہے، خدا کا معیار فضیلت اور ہے اور بندوں کا کچھ اور عام عقل اخلاق و فضیلتوں کو اپنے تدبر کے آئینے میں دیکھتی ہے جبکہ خداوند قدوس نے اپنے اولیاء کی فضیلتوں کو اپنی تائید کے حوالہ سے دیکھتا ہے لہٰذا دونوں کے معیاروں میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے اور ''کلمۃ اللہ ہی العلیا'' کے مصداق خدا کا معیار یقیناً بلند ہے، حضرت اسماعیلؑ کے واقعہ کی کئی مثالیں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ طاہرینؑ و اولیاء الٰہی کے بارے میں بھی موجود ہیں۔

یہاں ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ عقل جن امور میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے آیا ان میں شریعت اس

کے برعکس فیصلہ کرسکتی ہے؟ جبکہ شریعت و عقل کے درمیان بنیادی تضاد نہیں پایا جاتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات درست ہے کہ جن امور میں عقل فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ان میں اس کا فیصلہ و تشخیص صحیح و درست ہوتی ہے لیکن اسے کسی موضوع کی ضرورت ہوتی ہے جس پر اس کا حکم وفیصلہ جاری ہو سکے۔ اس سلسلے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اخلاقیات کے باب میں تیسرے مسلک و مکتب فکر کی بنیاد پر احکام عقلیہ کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں ہے اور حضرت اسماعیلؑ کا واقعہ احکام عقلیہ کے باب سے نہیں بلکہ معارف الٰہیہ سے تعلق رکھتا ہے، واقعہ یوں ہے کہ حضرت اسماعیلؑ نے اس شخص سے ان الفاظ میں اپنے منتظر رہنے کا وعدہ کیا تھا کہ میں یہاں تیرا انتظار کروں گا جب تک کہ تو میرے پاس واپس نہ آ جائے (میں تیرے واپس آنے تک یہاں تیرا انتظار کروں گا) چنانچہ انہوں نے اپنے بیان میں وقت کی قید ذکر نہیں کی تھی اس لیے اپنے آپ کو وعدہ خلافی اور جھوٹے وعدہ کی تہمت سے بچانے اور اپنے اس باطنی مقدس احساس کی لاج رکھنے کے لیے جو خداوند عالم نے اس کے قلب مبارک میں ڈال دیا تھا اور انہوں نے اس کا اظہار اپنی زبان سے بھی کر دیا تھا، اپنے دوست کی ملاقات کے لیے اس کے واپس آنے تک وہیں انتظار کرتے رہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت مسجد الحرام میں تشریف فرما تھے، ایک صحابی نے آپؐ سے وعدہ کیا کہ آپؐ کے پاس واپس آ جائے گا اور آنحضرتؐ نے بھی اس سے وعدہ فرما لیا کہ اس کے واپس آنے تک اس کا انتظار کریں گے، وہ صحابی اپنے کام کے لیے چلا گیا اور لوٹ کر نہ آیا، آنحضرتؐ چونکہ اس کی واپسی تک منتظر رہنے کا وعدہ فرما چکے تھے لہٰذا اسی جگہ پر تین دن تک قیام پذیر رہے بالآخر اس شخص کا گزر وہاں سے ہوا تو اس نے دیکھا کہ حضرت پیغمبر اکرمؐ اس کے انتظار میں بیٹھے ہیں وہ آپؐ سے کیا ہوا وعدہ بھول چکا تھا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا معنی

کتاب الخصائص میں سید رضی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے سنا کہ ایک شخص کہہ رہا تھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، آپ نے اس سے ارشاد فرمایا: یہ جو ہم کہتے ہیں "اِنَّا لِلّٰهِ" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا مالک اللہ ہے، ہم اس کی ملکیت ہیں۔ اور ہمارا یہ کہنا "وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" اس بات کا اقرار ہے کہ ہم فنا پائیں گے (مر جائیں گے)۔

سابقہ بیانات سے اس حدیث کا معنی و مقصود واضح ہو چکا ہے اور کتاب کافی میں یہ حدیث تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔

تین خدائی عطیوں کا تذکرہ

کافی میں اسحاق بن عمار اور عبداللہ بن سنان کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے

فرمایا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

(انی جعلت الدنیا بین عبادی قرضاً فمن اقرضنی فیھا قرضاً اعطیہ بکل واحدۃ عشراً الیٰ سبعۃ ماۃ ضعف ومن لم یقرضنی قرضاً واخذت منہ شیئاً قسراً اعطیتہ ثلاث خصال لو اعطیت واحدۃ منھن ملائکتی لرضوا بہ عنی)

(میں نے دنیا کو اپنے بندوں کے پاس قرض کے طور پر رکھا ہے جو شخص اس میں سے کچھ مجھے بطور قرض دے گا تو میں اسے ایک کے بدلے دس گنا سے سات سو گنا تک عطا کروں گا لیکن جو شخص مجھے قرض نہ دے گا اور میں جبراً اس سے کچھ لے لوں گا تو اس کے بدلے اسے تین چیزیں دوں گا کہ اگر ان تین چیزوں میں سے ایک بھی میں اپنے فرشتوں کو عطا کروں تو وہ مجھ سے بے حد خوش ہوں گے)۔

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم کا یہ فرمان: "الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ" ان تین چیزوں میں سے ایک، درود الٰہی (صلوٰت) اور دوسری رحمت۔ "وَرَحْمَةٌ"۔ اور تیسری ہدایت۔ "وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ"۔ ہے پھر امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ یہ سب اس شخص کے بارے میں ہے جس سے خداوند عالم نے کوئی چیز جبراً لے لی ہو، اسے امتحاناً کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہو۔

یہ روایت اسی مضمون و مندرجات سے ہمرنگ مطالب کے ساتھ دیگر اسناد کے ساتھ بھی بیان کی گئی ہے۔

صلوٰۃ کے تین معانی

کتاب معانی الاخبار میں شیخ صدوق نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی ذکر کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: (الصلوۃ من اللہ رحمۃ ، ومن الملائکۃ و من الملائکۃ التزکیۃ،ومن الناس دعاء) اگر "صلوات" کی نسبت خدا کی طرف ہو تو اس سے مراد رحمت، فرشتوں کی طرف ہو تو اس سے مراد تزکیۂ نفس ۔۔لوگوں کے لیے خدا سے ان کے تزکیۂ نفس و طلب مغفرت کی دعا کرنا۔ اور اگر لوگوں کی طرف ہو تو اس سے مراد دعا ہے

اسی مضمون و مطلب پر مشتمل دیگر روایات بھی ذکر کی گئی ہیں لیکن بظاہر مذکورہ بالا دو روایتوں میں ایک دوسرے سے تضاد کا شبہ ہوتا ہے کیونکہ پہلی روایت میں "صلواۃ" کی تفسیر رحمت کے ساتھ نہیں کی گئی جبکہ دوسری روایت میں "صلوات" کی تفسیر رحمت کے ساتھ کی گئی ہے اور پہلی تفسیر کی تصدیق آیت مبارکہ کے ظاہری الفاظ و ترتیب سے بھی ہوتی ہے کیونکہ "رحمۃ" کو "صلوات" پر عطف کیا گیا ہے (صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ) رَحْمَةٌ سے پہلے واو عاطفہ ہے، رحمۃ معطوف اور صلوات معطوف علیہ ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں تاہم ان دونوں لفظوں کی تفسیر میں جو مطالب پہلے ذکر کئے جا چکے ہیں ان میں غور کرنے سے تضاد کا شبہ دور ہو جاتا ہے۔

آیت ۱۵۸

○ اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۗ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

ترجمہ

○ (صفا اور مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں جو شخص حج بیت اللہ اور عمرہ بجالائے تو اس کے لیے کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دو (صفا ومروہ) کا طواف کرے اور جو شخص اپنی چاہت کے ساتھ کوئی نیک عمل انجام دے تو خدا یقینا شکر گزار (اس کے عمل کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے والا) اور دانا (دل کے راز کو جاننے والا) ہے) (۱۵۸)

تفسیر و بیان

صفا اور مروہ مکہ مکرمہ میں واقع دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حجاج کرام ''سعی'' کا عمل انجام دیتے ہیں، ان دونوں کے درمیان فاصلے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سات سو ساڑھے ساٹھ (۷۶۰/۱/۲) ذراع (بازو) کا فاصلہ ہے۔ تقریباً ۳۸۰ میٹر۔۔۔۔ اب صفا، مروہ، شعائر، حج اور عمرہ وغیرہ کے لغوی معانی ملاحظہ کریں:

(۱) لغت میں ''صفا'' کا معنیٰ سخت اور صاف پتھر ہے۔

(۲) ''مروہ'' کا معنیٰ سخت پتھر ہے۔

(۳) ''شعائر'' جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد'' شعیرہ'' ہے جس کا معنی علامت و نشانی ہے، اسی سے مشعر کا لفظ بنا ہے، (مشعر، مکہ کے مشرق میں واقع وہ مقام ہے جہاں حجاج کرام اعمالِ حج کے طور پر قیام کرتے ہیں) اور اسی معنے کی مناسبت سے یوں کہا جاتا ہے :''أشعر الهدی'' (اس نے اپنی قربانی پر نشانی لگادی)

(۴) حج کا معنیٰ بار بار قصد و ارادہ کرنا ہے، البتہ شریعت کی اصطلاح میں حج ان مخصوص اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جنہیں اہل اسلام مکہ مکرمہ میں انجام دیتے ہیں۔

(۵) اعتمار کا معنیٰ زیارت کرنا ہے اور یہ (اعتمار) ''عِمَارَةٌ'' سے ہے جس کا معنیٰ ''آباد کرنا'' ہے کیونکہ زیارت (دیدار) و ملاقات کرنا ہی گھروں و شہروں کو آباد کرنے کا موجب بنتا ہے، شریعت کی اصطلاح میں یہ بیت اللہ کی ایک مخصوص زیارت کا نام ہے۔ جسے ''عمرہ'' کہا جاتا ہے۔

(۶) جناح کا معنیٰ حق و عدل سے منہ موڑنا ہے اور اس سے مراد ''گناہ'' لیا جاتا ہے لہٰذا آیت میں ''لا جناح'' (کوئی گناہ نہیں) کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''جائز ہے'' (گناہ کی نفی جواز کا ثبوت ہے)

(۷) ''تطوف''، طواف سے ہے جس کا معنیٰ کسی چیز کے اردگرد چکر لگانا ہے، طواف دراصل ایک طرح کے ''چلنے'' کو کہتے ہیں ایسے چلنا کہ جہاں سے ابتداء ہوئی واپس اسی جگہ آجائیں (اس طرح آنا جانا (o o) بنا بر ایں اس میں یہ بات ضروری نہیں کہ کسی چیز کے اردگرد گھوما جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک جگہ سے چل کر دوسری جگہ جائیں اور پھر اسی راستہ سے واپس پہلی جگہ پر آجائیں لہٰذا کسی چیز کے اردگرد چکر لگانا چونکہ اس طرح کے آنے جانے کا واضح مصداق ہے اس لئے اسے ''طواف'' کہا جاتا ہے، آیت مبارکہ میں بھی اس کا واضح مصداق ہے اس لئے

اسے "طواف" کہا جاتا ہے، آیت مبارکہ میں بھی اس کا اصلی معنی اس طرح آنا جانا (٥ ٥) مراد لیا گیا ہے کیونکہ صفا اور مروہ کے درمیان "طواف" کرنے سے مراد ان دونوں پہاڑوں کے درمیان پے در پے سات مرتبہ چلنا (آنا جانا) ہے جسے "سعی" کہا جاتا ہے۔

(۸) "تطوع"، طوع سے ہے جس کا معنی "اطاعت" ہے، اس کی بابت یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اطاعت سے مختلف معنی رکھتا ہے کیونکہ اس لفظ (تطوع) کا استعمال مستحب اعمال میں ہوتا ہے جبکہ "اطاعت" مستحب عمل کا معنی نہیں دیتی، اگر یہ رائے صحیح ہو تو اس کی تاویل یوں کی جائے گی کہ جو عمل واجب ہو اس کا انجام دینا بہر صورت ضروری ہوتا ہے۔ (خواہ دل چاہے یا نہ چاہے) گویا وہ طوعاً انجام دیا جانے والا عمل ہوگا جبکہ مستحب عمل یقیناً طوعاً و اختیاراً انجام پذیر ہوتا ہے (کیونکہ اس میں خدا کے حکم کی ادائیگی میں بندے کا مکمل اختیار کارفرما ہوتا ہے خدا کی طرف سے اس کا انجام دینا لازمی و ضروری نہیں ہوتا) تاہم جہاں تک لفظ "طوع" کے اصل معنی کا تعلق ہے تو اس میں عمل کے "لازمی وضروری" ہونے کی صفت سے دوری کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے (لفظ طوع کو) "لازمی وضروری" کے مفہوم کے مقابل ذکر کرنا مجازی طور پر ہے جس کی وجہ بیان ہو چکی ہے ورنہ لغت میں لفظ "طوع" کراہت (ناپسندیدگی) کے مقابل میں ذکر کیا گیا ہے اور اس میں "لازمی وضروری" ہونے کی نفی کا کوئی اشارہ نہیں ملتا، قرآن مجید میں بھی ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ فصلت، آیت ۱۱:

٥ "فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا۔۔۔،

(اس (آسمان) سے اور زمین سے کہا کہ طوعاً یا کرھاً (چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے) آؤ......)

اس آیت میں (طوع) کو (کرہ)۔۔۔ ناپسندیدگی۔۔۔ کے مقابل ذکر کیا گیا ہے، یاد رہے کہ "تطوع"، تفعل کے باب سے ہے اور یہ باب کسی چیز کو اپنے لئے لے لینے (پسند کر لینے) کے معنے میں آتا ہے۔ مثلاً: تَمَيَّزَ (اس نے اپنے لئے الگ کر لیا)۔ تعلم الشئی (اس نے اس چیز کا علم حاصل کر لیا)۔ تطوع خیراً (اس نے نیک عمل کو طوعاً۔ اپنی چاہت و اختیار کے ساتھ۔ انجام دیا)۔ تو اس میں لغت کے لحاظ سے کوئی ایسا ثبوت نظر نہیں آتا جس کی بناء پر کہا جائے کہ لفظ "تطوع"، مستحب عمل کے لئے مختص ہے البتہ استحباب کے معنے میں اس کا استعمال ہونا اسی حوالہ سے صحیح و ممکن ہوگا جو ذکر کیا جا چکا ہے۔

صفا اور مروہ: اللہ کی دو نشانیاں!

٥ "إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ۔۔۔۔۔۔"

اس آیت مبارکہ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ صفا اور مروہ دو ایسے مقامات ہیں جن پر "خدا کی نشانی" ہونا ثبت کر دیا گیا ہے، وہ دونوں خدا کی نشانیاں ہیں، وہ خدا کی یاد دلاتی ہیں، ان کا دیدار خدا کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے اس آیت مبارکہ میں صفا و مروہ کو اپنی نشانیاں کیوں کہا ہے جبکہ پوری کائنات اور ہر مخلوق خدا کی نشانی اور خدا کی یاد دلاتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے یہ بات صحیح ہے کہ ہر چیز اپنے وجود کے لحاظ سے خدا کی نشانی و علامت اور اس کی یاد دلانے والی ہے لیکن سب چیزیں تخلیقی و تکوینی طور پر خدا کی نشانیاں ہیں یعنی ان کا "وجود" ہی اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا خالق موجود ہے کہ جس نے انہیں خلق فرمایا ہے جبکہ ان دو (صفا و مروہ) کو تخلیقی طور پر شعائر اللہ ۔۔۔ خدا کی نشانیاں ۔۔۔ نہیں کہا گیا بلکہ اس لحاظ سے وہ علامتیں ہیں کہ خداوند عالم نے انہیں دو عبادت گاہیں قرار دیا ہے تاکہ ان میں اس کی عبادت کی جائے اور لوگ انہیں دیکھ کر عبادت الٰہی بجا لائیں لہٰذا وہ دونوں خدا کی یاد تازہ کرتے ہیں اور ان کا اس وصف کا حامل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ خداوند عالم نے ان میں خاص عبادت بجا لانے کا حکم صادر فرمایا ہے چنانچہ اس کے بعد والے جملے میں یوں ارشاد ہوا: (فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِاعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا) (جو شخص حج بیت اللہ اور عمرہ بجا لائے اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دو کے درمیان سعی کرے) اس میں "لا جناح" کے لفظ سے عمل سعی کے مستحب ہونے کو بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ان دونوں .... صفا اور مروہ .... کے درمیان سعی کے وجوبی حکم کو بیان کیا گیا ہے کیونکہ اگر اس سے مراد عمل سعی کے مستحب ہونے کو بیان کرنا ہوتا تو ان کے درمیان طواف کرنے کو اچھا عمل قرار دیتے ہوئے یوں کہا جاتا کہ "ان کے درمیان طواف کرنا اچھا عمل ہے" جبکہ اس کے بجائے یوں کہا گیا ہے **"لا جناح"** (کوئی گناہ نہیں) جس سے اس کے جواز (وجوب) ..... کا ثبوت ملتا ہے۔

خلاصہء کلام یہ کہ اس آیت کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ "چونکہ صفا اور مروہ دو عبادت گاہیں ہیں جو خدا کی عبادت بجا لانے کے لئے مقرر کی گئی ہیں لہٰذا کوئی حرج نہیں کہ تم وہاں خدا کی عبادت بجا لاؤ" یہ انداز بیان درحقیقت لازمی و وجوبی "حکم" جاری کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے نہ کہ متعلقہ عمل کے مستحب ہونے کے بیان میں!، اگر اس سے عمل سعی کا استحباب بیان کرنا مقصود ہوتا تو اس طرح کہا جاتا "صفا اور مروہ چونکہ شعائر اللہ میں سے ہیں لہٰذا خدا ان کے درمیان سعی کرنے کو پسند کرتا ہے۔" چنانچہ قرآن مجید میں متعدد ایسے مقامات موجود ہیں جہاں صرف اس طرح کے انداز بیان سے وجوبی حکم کا ثبوت نہیں ملتا بلکہ ان سے وجوبی حکم کا استفادہ کرنے کے لئے دیگر دلائل کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً جہاد کی بابت یوں ارشاد ہوا:

سورہء صف، آیت ۱۱:

"ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ، ۔۔۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے......"

اور روزہ کی بابت یوں ارشاد فرمایا:

سورہء بقرہ، آیت ۱۸۴:

"وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ"

(اور تم روزہ رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔)

اور نماز قصر کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

سورہ ءنساء، آیت ۱۰۱:

"فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ"

(جب تم سفر میں ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز کو قصر کرو۔)

نیک عمل کا نیک صلہ

O "وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ"

(اور جو اچھا عمل کرے تو اللہ شاکر اور آگاہ ہے)

اگر اس جملے کو پہلے جملہ "فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِاعْتَمَرَ" پر عطف قرار دیں تو یہ جملہ (وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا...) صفا و مروہ کے درمیان عمل سعی کے وجوبی حکم کی دوسری علت وسبب ہوگا البتہ یہ اس حکم کی پہلی علت وسبب یعنی جملہ "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ" سے یوں مختلف ہوگا کہ پہلی علت، خاص (اسی حکم سے مخصوص) اور یہ دوسری علت، عام قرار پائے گی۔ (کہ جسے اس حکم اور اس کے علاوہ دیگر احکام کی علت بھی قرار دیا جا سکتا ہے) اس صورت میں "تطوع" سے مطلق اطاعت مراد لی جائے گی نہ کہ مستحب عمل کا انجام دینا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ (وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا) کو جملہ مست أنفہ (نیا مستقل جملہ) قرار دیا جائے اور اسے آیت مبارکہ کے ابتدائی فقرے پر عطف کیا جائے تو اس صورت میں صفا و مروہ کے درمیان عمل سعی کے اچھا اور "خیر" ہونے کا بیان مقصود ہوگا بشرطیکہ "تطوع" سے "سعی" مراد لیا جائے اور اگر اس سے حج وعمرہ مراد لیا جائے تو یوں کہنا پڑے گا کہ یہ جملہ حج وعمرہ کے اچھا و خیر ہونے کا بیان میں ہے۔

(مصنفؒ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جملہ "وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا" کے بارے میں دو صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ اسے "فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِاعْتَمَرَ......" پر عطف قرار دیا جائے اور دوسری یہ کہ اسے جملہ عاطفہ کی بجائے جملہ مستانفہ قرار دے کر ابتدائے آیت سے مربوط کیا جائے، پہلی صورت میں پھر دو صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ "تطوع" سے مراد صفا و مروہ کے درمیان سعی ہو دوسری یہ کہ اس سے مراد حج وعمرہ ہو۔ پہلی صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ آیت مبارکہ عمل سعی کے اچھا و پسندیدہ عمل ہونے کو بیان کرتی ہے اور دوسری صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ آیت مبارکہ حج وعمرہ کے اچھا و پسندیدہ عمل ہونے کو بیان کرتی ہے خواہ یہ اعمال واجب ہوں یا مستحب)

شاکر و علیم: خدا کے دو مقدس نام!

○ "فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ"

(بے شک اللہ شاکر اور آگاہ ہے)

شاکر و علیم، خداوند عالم کے اسماء حسنیٰ میں سے دو نام ہیں، شکر کا معنی یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی نعمت دی گئی ہو یا اس پر احسان کیا گیا ہو وہ نعمت عطا کرنے والے اور احسان کرنے والے کے عمل کی قدر دانی کے طور پر اس کا اظہار زبانی یا عملی صورت میں کرے مثلاً جس شخص کو کچھ مال دیا گیا ہو وہ مال دینے والے کا شکریہ دو صورتوں میں ادا کر سکتا ہے: ایک یہ کہ اس کی تعریف ایسے الفاظ میں کرے جس سے اس کے اس نیک عمل کا اظہار ہو اور اس کے احسان کا تذکرۂ جمیل ہو، دوسری یہ کہ اس مال کو ایسے امور میں خرچ کرے جن سے وہ خوش ہوتا ہو اور اس کے عطیہ و احسان کا اظہار بھی ہو جائے۔

اب شکر کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے اپنے آپ کو "شاکر" ذکر فرمایا ہے جبکہ وہ تو خود نعمتیں عطا کرنے والا اور احسان کرنے والا ہے، ہر ایک پر اس کا احسان ہے، اس نے سب کو نعمتیں عطا فرمائی ہیں کوئی ایسا نہیں جس نے خدا کو اپنا ممنون احسان بنایا ہو کہ اس کے احسان کی وجہ سے خدا پر اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہو، لیکن اس کے باوجود خداوند قدوس نے اپنے آپ کو "شاکر" کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کے اعمال صالحہ کو ان کی طرف سے اپنے لئے احسان قرار دیا ہے جبکہ حقیقت میں ان اعمال کی انجام دہی خدا کی طرف سے بندوں کو توفیق عطا کرنے کے حوالہ سے ان پر احسان سے عبارت ہے لیکن کریم و مہربان ذات احدیت نے اپنے اس احسان کو بندوں کے احسان کا درجہ عطا کر کے اس پر ان کا شکریہ ادا کرنے اور احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں دینے کا اعلان و اظہار فرمایا جو کہ اپنے مقام پر خود ایک احسان ہے یعنی ایک احسان کے بعد دوسرا احسان فرمایا چنانچہ قرآن مجید میں احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں دینے کا یوں ذکر ہوا:

سورہ رحمان، آیت ۶۰:

○ "ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ" ...،

(آیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ ہے؟)

سورہ دہر، آیت ۲۲:

○ "اِنَّ ھٰذَا کَانَ لَکُمْ جَزَآءً وَّ کَانَ سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا۔" ...،

(یہ سب کچھ تمہاری جزا ہے اور تمہاری کوششیں شکریہ کی مستحق ہیں)

بنا بر ایں خداوند عالم کو "شاکر" کہنا شکر کے حقیقی معنی کی بنیاد پر ہے نہ کہ مجازی معنی کے طور پر!

روایات پر ایک نظر

سعی کا وجوبی حکم

تفسیر ''العیاشی'' میں مذکور ہے کہ ہمارے ایک ساتھی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: آیا صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا واجب ہے یا مستحب؟ امام علیہ السلام نے جواب دیا: واجب ہے، پھر اس نے پوچھا: کہ خداوند عالم نے اس (عمل سعی) کے بارے میں تو یوں ارشاد فرمایا ہے: ''فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا'' کہ اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف (سعی) کرے؟ امامؑ نے فرمایا: یہ حکم ''عمرۃ القضاء'' کے بارے میں ہے کیونکہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار مکہ پر شرط رکھ دی تھی (ان سے وعدہ لے لیا تھا) کہ وہ بتوں کو اٹھا لیں گے لیکن ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی نے سعی شروع ہی کی تھی کہ بتوں کو دوبارہ ...... صفا و مروہ پر...... رکھ دیا گیا، اس واقعہ پر یہ آیت اتری۔ ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا'' یعنی بتوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی سعی کرنے میں کوئی گناہ (حرج) نہیں۔

(یاد رہے کہ ''عمرۃ القضا'' ۷ھ کو ادا کیا گیا اور اسے عمرہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جس سال (۶ھ) کفار مکہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو عمرہ ادا کرنے سے منع کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی قضا کے لئے جنگ خیبر سے واپسی پر مسلمانوں کی کثیر تعداد کے ساتھ مل کر ذیقعدہ کے مہینے میں ستر اونٹوں کی قربانیاں لے کر مکہ روانہ ہوئے اور عمرہ کی قضا بجالائی)۔

کافی میں بھی اسی طرح کی ایک روایت ذکر کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے ادائے حج کا حوالہ

کافی میں ایک روایت حضرت امام صادق علیہ السلام کے حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ادائے حج کے بارے میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانۂ کعبہ کے طواف اور دو رکعت نماز طواف سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا: ''ان الصفا و المروۃ من شعائر اللہ فابدأ بما بدأ اللہ'' کہ صفا اور مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں پس میں بھی اسی جگہ سے شروع کرتا ہوں جہاں سے خداوند عالم نے ابتداء کی ہے، اس سے پہلے مسلمان یہ گمان کرتے تھے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا مشرکوں کی ایجاد ہے لہٰذا خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی:

''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا'' (صفا و مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص حج بیت اللہ یا عمرہ بجالائے اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان

دونوں کا طواف...... سعی...... کرے۔)

واضح ہے کہ مذکورہ بالا دو روایتوں میں شانِ نزول کے حوالہ سے کوئی تضاد نہیں پایا جاتا، اور آنحضرتؐ کا یہ فرمانا کہ "میں بھی وہاں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے خدا نے ابتداء کی ہے۔" دراصل سعی کے حکم کی حقیقی بنیاد و معیار کی وضاحت کے باب سے ہے۔ حضرت ہاجرہؑ و حضرت اسماعیلؑ کے واقعہ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ حضرت ہاجرہؑ نے صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ تیز قدموں کے ساتھ چکر لگائے اور آنجنابؑ کا یہ عمل شریعت میں حج کا ایک حصہ قرار پا گیا (جسے عمل سعی کہا جاتا ہے)

صفا و مروہ پر رکھے ہوئے دو بتوں کی کہانی

تفسیر "درمنثور" میں عامر شعبی کے حوالہ سے مذکورہ ہے کہ دور جاہلیت میں ایک بت کوہ صفا پر رکھا ہوا تھا جسے "إساف" کہا جاتا تھا اور دوسرا بت جسے "نائلہ" کہا جاتا تھا مروہ پر رکھا ہوا تھا۔ اس دور کے لوگ جب خانہء خدا کا طواف کرتے تو صفا و مروہ کے درمیان سعی بھی کرتے اور اپنے آپ کو ان دو بتوں سے مس کرتے تھے، جب آنحضرتؐ تشریف لائے تو لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہؐ! صفا اور مروہ کے درمیان عملِ سعی ان دو بتوں کی وجہ سے تھا تو یہ طواف تو شعائر اللہ میں سے نہیں! اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ" (صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں)۔ بنابرایں "صفا" اور "مروہ" کا تذکرہ دراصل ان دو بتوں کی وجہ سے ہے جو ان پر رکھے ہوئے تھے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں جو گمان پیدا ہوتا تھا کہ شاید عمل سعی ان بتوں کی وجہ سے واجب کیا گیا ہے اسے ان کے ذہنوں سے دور کر دیا جائے اور انہیں آگاہ کیا جائے کہ ان بتوں کے ہوتے ہوئے عمل سعی انجام دینے میں کوئی حرج و گناہ نہیں۔ اور نہ ہی اس عمل کا ان سے کوئی تعلق و ربط ہے، گویا خداوند عالم نے مشرکین کے تصور و خیال اور عقیدہ کے رد اور نفی میں اور ان کے نظریہ کے بطلان کے طور پر ان دو مقامات کو اپنی نشانیاں (شعائر) قرار دیا۔

اس مضمون کی متعدد روایات فریقین (شیعہ و سنی) کی کتب میں اپنے اپنے راویوں کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہیں، اور ان سب سے مجموعی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ آیت مبارکہ، عمل سعی کے حکم کے ساتھ اس سال نازل ہوئی جب مسلمانوں نے حج ادا کیا۔ (فریضہء حج ادا کرنے مکہ مکرمہ آئے) حالانکہ یہ آیت سورۂ بقرہ میں ہے جو کہ مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سب سے پہلی سورت ہے لہٰذا یہ آیت ان آیات سے مختلف انداز کی حامل ہے جو اس سے پہلے قبلہ کی بابت ذکر ہو چکی ہیں اور سیاق کے حوالہ سے ان سے ہم رنگ نہیں، کیونکہ وہ آیات جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ہجرت کے دوسرے سال میں نازل ہوئیں، اور اسی طرح ان آیات سے بھی مختلف انداز کی حامل ہے جو ابتدائے سورہ میں ذکر ہو چکی ہیں کیونکہ وہ ہجرت کے پہلے سال میں نازل ہوئیں، بنابرایں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ان تمام آیات کا سیاق و طرز بیان اور مورد سخن ایک نہیں۔۔ بلکہ ہر آیت اپنے مستقل موضوع سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ سب کے موارد و شان نزول اور زمان و مکانِ نزول مختلف ہیں۔۔،

آیات ۱۵۹ تا ۱۶۲

○ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ
لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ
النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ

○ ''جو لوگ کتمان کرتے ہیں ان واضح نشانیوں اور ہدایت کی روشن دلیلوں کا جو ہم نے نازل کی ہیں جبکہ ہم نے انہیں کتاب میں تمام لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کر دیا ہے تو ایسے لوگوں پر اللہ لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔'' (۱۵۹)

○ ''مگر جو لوگ توبہ کر لیں اور اصلاح احوال کرتے ہوئے جو کچھ چھپایا تھا اسے واضح طور پر بیان کر دیں تو ایسے لوگوں کی توبہ میں قبول کرتا ہوں کہ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہوں۔'' (۱۶۰)

○ ''البتہ جو لوگ کفر اختیار کریں اور کفر کی حالت ہی میں مر جائیں تو ایسے لوگوں پر اللہ، فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت ہے۔ (۱۶۱)

○ ''یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے، ان کے عذاب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت دی جائے گی۔ (۱۶۲)

تفسیر و بیان

حقائق اوران پردہ ڈالنے والے لوگ

○ " اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی "

(جولوگ چھپاتے ہیں اس کو جو ہم نے واضح نشانیاں ودلائل اور ہدایت نازل کی ۔۔)

اس آیت مبارکہ میں "بینات" اور "ھدیٰ" کا تذکرہ ہوا ہے ان کے حقیقی معانی تو خدا خود بہتر جانتا ہے لیکن بظاہر"ھدیٰ" سے مراد دین الٰہی کے وہ تمام احکام ومعارف ہیں جن پر عمل کرنے سے سعادت وخوش بختی کی پاکیزہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اور "بینات" سے مراد وہ دلائل وشواہد ہیں جن سے حق وحقیقت اور دینی معارف واحکام کا ثبوت ملتا ہے لہٰذا قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ "بینات" ذکر ہوا ہے اس سے مراد آیات الٰہیہ ہیں جو ذات حق تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں ۔اور "کتمان" سے مراد مخفی و پوشیدہ کرنا ہے خواہ اصل آیات کو چھپایا اور لوگوں کے سامنے انہیں ظاہر نہ کیا جائے یا ت اُویلیں کرکے ان کے معانی ظاہر نہ ہونے دیئے جائیں، دونوں صورتوں میں "کتمان"...... چھپانا...... کہلائے گا جیسا کہ علماء یہود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اپنی کتابوں میں پائی جانے والی بشارتوں کی بابت کتمان کرتے تھے یعنی وہ ان باتوں کو لوگوں کے سامنے ظاہر ہی نہیں کرتے تھے جن سے لوگ ناآگاہ تھے اور جن باتوں سے لوگ آگاہ ہوتے تھے ان کی تاویلیں کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس سے مراد آنحضرتؐ نہیں ہیں۔

علم وآگاہی کے بعد انکار

○ " مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ "

اس جملے میں خداوند عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ علماء یہود کا بیّنات اور ھدیٰ کو چھپانا اس کے بعد تھا کہ ہم نے تمام لوگوں کے سامنے ان (واضح نشانیوں اور راہ ہدایت) کو واضح کر دیا تھا نہ کہ صرف علماء یہود کے لئے! تمام لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کر دینے سے مراد یہ نہیں کہ خدا نے ایک ایک فرد کو ان حقائق سے آگاہ کیا کیونکہ ایسا ہونا اس عالم طبیعت (مادی جہان) کے مقررہ ومروجہ نظام میں عام طور پر (بندوں کی وجودی حیثیت کی بناء پر) ممکن ہی نہیں نہ

صرف وحی کے طور پر اور نہ عام اعلان کی صورت میں، بلکہ عمومی طریقۂ کار یہ ہے کہ بعض لوگوں کو بلا واسطہ آگاہ کر دیا جاتا ہے پھر ان کے ذریعے دوسروں کو مطلع کیا جاتا ہے مثلاً جو لوگ حاضر و موجود ہوں انہیں آگاہ کر کے ان کے ذریعے غیر موجود لوگوں تک بات پہنچائی جاتی ہے یا عالم کے ذریعے جاہل (جاننے والے کے ذریعے نہ جاننے والے) کو آگاہ و مطلع کیا جاتا ہے گویا عالم ذریعہ ابلاغ و وسیلۂ تبلیغ ہوتا ہے۔ جیسا کہ زبان کی حیثیت جسم میں ہے کہ وہ مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے اسی طرح عالم، دیگر افراد کو حقائق سے آگاہ کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو آگاہ کرے (خصوصاً جب اس سے یہ عہد و میثاق بھی لیا جا چکا ہو کہ وہ دوسروں کو آگاہ کرے گا) اسی لئے اس کا حقائق سے آگاہ ہو جانا تمام لوگوں کا آگاہ ہو جانا کہلاتا ہے لیکن اگر وہ اپنے اس بنیادی فریضہ کو ادا نہ کرے، اپنے اس علم کا اظہار نہ کرے جس کے اظہار کا اس سے میثاق لیا جا چکا ہو تو اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ جن حقائق سے سب ہی آگاہ تھے انہیں چھپا دیا گیا' گویا عالم کا اپنے علم کو چھپانا سب لوگوں کا اپنی معلومات کو پوشیدہ کرنا کہلاتا ہے، یہی بات لوگوں کے درمیان اختلاف و تفرقہ، حق سے دوری اور حقائق سے انحراف کا سبب بنتی ہے اور خداوند عالم نے بھی اسے لوگوں کے گمراہ ہو جانے کی اصل وجہ قرار دیا ہے ورنہ دین تو ایک فطری امر ہے اس سے انکار ممکن ہی نہیں کیونکہ فطرت اسے دل و جان سے تسلیم کرتی ہے اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والی قوت اس کے سامنے خاضع ہوتی ہے بشرطیکہ اسے دین کی حقیقت سے مکمل طور پر آگاہ کیا جائے اور اسے حقائق کی واضح تصویر دکھائی جائے، دین کے فطری امر ہونے کی بابت ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ روم، آیت ۳۰:

"فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا‌ ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا‌ ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ‌ ؕ ذٰ لِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ"۔۔۔،

(اپنا رخ خالص دین کی طرف کر لو کہ وہی فطرت الٰہی ہے کہ جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، یہی مضبوط دین ہے لیکن اکثر لوگ ناآگاہ ہیں)

بہر حال دین ایک فطری حقیقت ہے، فطرت سلیمہ ہرگز اس کا انکار نہیں کر سکتی بشرطیکہ دین اپنی اصل حقیقت کے ساتھ فطرت کے سامنے جلوہ گر ہو، اس کی دو صورتیں ممکن ہیں: ایک صفائے قلب کے ذریعے جیسا کہ انبیاءؑ الٰہی میں ہے اور دوسری صورت بیان و اظہار کے ذریعے جیسا کہ عام لوگوں میں ہے، تاہم دوسری صورت کی بازگشت لامحالہ پہلی صورت کی طرف ہوتی ہے۔ اور وہ یوں کہ دینی حقائق کے بیان و اظہار سے عامۃ الناس اس فطری حقیقت پر تبھی ایمان لائیں گے جب یہ مقدس حقیقت ان کے دلوں میں جلوہ گر ہو جائے، تاہم انبیاء کرام علیہم السلام خدا کی طرف سے ہی صفائے قلب کے ذریعے حقیقت دین سے آگاہی پاتے ہیں، بنا برایں مذکورہ آیت مبارکہ میں دونوں امور کو ساتھ ساتھ ذکر کر کے دین کے فطری ہونے اور لوگوں کے ناآگاہ ہونے کے بارے میں یوں ارشاد ہوا: "فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا۔۔۔ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ" (یہ فطرت الٰہی ہے کہ جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے...... لیکن

اکثر لوگ علم نہیں رکھتے)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورہ ءبقرہ، آیت ۲۱۳:

"وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ"۔

(اور ہم نے نازل کی ان (پیغمبروں) کے ساتھ کتاب حق، تا کہ وہ لوگوں کے درمیان اس امر کے بارے میں فیصلہ کرے جس کی بابت وہ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں اور اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا سوائے ان لوگوں کے کہ جنہیں کتاب عطا کی گئی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ ان کے پاس واضح نشانیاں وٹھوس دلائل آچکے ہیں۔ ان کا ایسا کرنا آپس میں حسد کرنے کی بنیاد پر تھا.....)

اس بیان سے یہ ثابت ہوا کہ دینی حقائق ومعارف کی بابت لوگوں کے درمیان اختلاف وتفرقہ اور انحراف ان علماء ودانشوروں کے باہمی حسد وخیانت کا نتیجہ ہے جو کتب سماویہ کے علوم کے حامل اور انہیں لوگوں تک پہنچانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، وہی آیات الٰہیہ کو لوگوں سے پوشیدہ کرنے اور غلط و بیجا تاویلیوں وتحریفات کے ذریعے عوام الناس کو حق کے سیدھے راستہ سے دور کر دیتے ہیں، ان کا ایسا کرنا دراصل عامۃ الناس پر بہت بڑا ظلم ہے چنانچہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں ان کے ایسا کرنے (آیات الٰہیہ کے اخفاء اور ان کی غلط و بیجا تاویلیں کرنے) کو "ظلم" سے تعبیر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سورہ ءاعراف، آیت ۴۵:

"فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا"......،

(اور ایک اعلان کرنے والے نے ان کے درمیان اعلان کیا کہ خدا کی لعنت ہو ظلم کرنے والوں پر، وہ کہ جو خدا کے راستہ سے روکتے ہیں اور اسے ٹیڑھا ظاہر کرنا چاہتے ہیں)

اس طرح کی آیات قرآن مجید میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

جو مطالب اب تک ذکر کئے جا چکے ہیں ان سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ (اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ......) کی بنیاد یہ آیت شریفہ ہے:

سورہ ءبقرہ، آیت ۲۱۳:

"كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۠ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

بَغْيًا بَيْنَهُمْ "......،

(لوگ امت واحدہ تھے، خداوند عالم نے پیغمبروں کو خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا (ایمان و عمل صالح پر نیک جزاء کی خوشخبری دینے والے اور کفر و بداعمالیوں پر عذاب سے ڈرانے والے) بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب حق نازل کی تا کہ وہ لوگوں کے درمیان اس چیز کے بارے میں حق کا فیصلہ کرے جس کی بابت وہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں اور اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا سوائے ان لوگوں کہ جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل بھی آ چکے تھے ان کا ایسا کرنا آپس میں بغاوت وحسد کی بنیاد پر تھا) کیونکہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبران الٰہی کتب آسمانی کے ذریعے لوگوں کے درمیان اختلافات کو ختم کرنے آئے تھے لیکن جن لوگوں کو کتاب الٰہی کا علم عطا ہوا وہ لوگوں کے درمیان اختلاف وتفرقہ پیدا کرنے کا سبب بن گئے جو کہ بہت بڑا ظلم ہے، اور زیر بحث آیت میں ان کے ظلم کا تذکرہ ان کے انجام کو اس طرح ذکر کر کے ہوا: "اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ... " کہ یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی لعنت ہے.....)

لعنت کے حقدار لوگ

O " اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ "

(وہی ہیں کہ جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں)

اس جملے میں ان لوگوں کے کیفر کردار کا ذکر ہے جنہوں نے حق وحقیقت کو چھپایا اور آیات و بینات الٰہیہ و احکام و معارف دینیہ کا کتمان کیا، ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے، آیت مبارکہ میں دو مرتبہ لفظ "يَلْعَنُهُمْ" ذکر ہوا ہے ایک مرتبہ (يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ) کہا گیا اور دوسری مرتبہ (يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ) کہا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک کا معنی الگ و مستقل اور دوسرے سے مختلف ہے، کیونکہ "اللہ کی لعنت" سے مراد یہ ہے کہ وہ ان سے اپنی رحمت و سعادت کو دور کر دیتا ہے۔ اور "لعنت کرنے والوں کی لعنت" سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس بات کی استدعا کرتے ہیں کہ ان لوگوں (حق کا کتمان کرنے والوں) کو رحمت و سعادت سے محروم کر دے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آیت شریفہ میں "لعنت" اور "لعنت کرنے والوں" کا ذکر مطلق صورت میں ہوا ہے یعنی کسی قید و شرط یا خاص صورت و مخصوص افراد سے مختص کر کے ذکر نہیں ہوا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ "لعنت" سے مراد ہر طرح کی لعنت ونفرین اور بیزاری ونفرت کا اظہار ہے اور "لعنت کرنے والوں" سے مراد ہر لعنت کرنے والا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر طرح کی لعنت اور ہر ایک کی لعنت ان کے لئے ہے جو حق وحقیقت پر پردے ڈالتے ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ ہر لعنت کرنے والا ان کے لئے سعادت و خوش بختی سے دوری کا خواہاں ہوتا ہے اور حقیقی سعادت صرف دینی طور پر سعادت

مندی ہے کہ جس کی مکمل وضاحت خداوند عالم کی طرف سے ہو چکی ہے اور فطرتِ سلیمہ بھی اس سے ہم آہنگ ڈھمرنگ ہے لہٰذا واضح ہے کہ اس طرح کی واضح و مسلمہ حقیقت سے صرف وہی لوگ محروم ہو سکتے ہیں جو حق سے عناد رکھیں اور ڈھٹائی و دشمنی کی وجہ سے دین فطرت سے منہ موڑ لیں اور یقیناً وہی لوگ سزا وار نفرین و مستحق لعنت ہیں جو سب کچھ جانتے ہوئے اور علم و آگاہی کے باوجود حق پوشی کریں اور حقائق کا انکار کریں ورنہ جو شخص علم و آگاہی نہ رکھتا ہو اور اس پر حقائق پوری طرح واضح نہ ہوئے ہوں وہ بے قصور ہے لہٰذا سعادت سے محرومی کے سزاوار صاحبان علم ہی ہوتے ہیں کیونکہ ان سے عہد و پیمان لیا جا چکا ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم کو فروغ دیں، اپنی معلومات کو دوسروں تک پہنچائیں اور آیات بینات...... حق و حقیقت کے واضح و روشن دلائل اور علوم و معارف...... سے لوگوں کو آگاہ کریں لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں اور لوگوں کو نور علم و حقیقت سے بہرہ ور کرنے کی بجائے ان سے حقائق کا کتمان کریں اور نشر و فروغ علم کا فریضہ ادا نہ کریں تو گویا انہوں نے از روئے عناد حق سے منہ موڑا اور جان بوجھ کر حقائق کا انکار کیا ایسے لوگوں پر خدا کی لعنت اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے: (أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ) جیسا کہ بعد والی آیت (۱۶۱)...... "إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ..." میں بھی اس کی تائید ملتی ہے کیونکہ اس میں "انَّ" کے حرف سے زیر بحث آیت (۱۵۹) میں مذکور حکم کی تاکید یا اس کی علت کا بیان مقصود ہے کہ جیسے "الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ" کے الفاظ میں ایک بار پھر ذکر کیا گیا ہے یعنی ان الفاظ سے آیت ۱۵۹ کے مطالب کو دہرایا گیا ہے۔

توبہ اور اصلاح نفس کرنے والے افراد!

○ "إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا"

(جن لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح نفس کی اور واضح طور پر بیان کیا۔۔)

اس آیت میں سابقہ حکم سے استثناء کا ذکر ہے یعنی اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حق و حقیقت کا کتمان کرنے والوں کے لئے جو سزا لعنت کی صورت میں مقرر کی گئی ہے اس سے صرف وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو توبہ کریں اور صرف یہی نہیں کہ تنہائی میں بیٹھ کر توبہ کر لیں بلکہ ضروری ہے کہ اپنی توبہ کو لوگوں کے سامنے ظاہر کریں تاکہ لوگ ان کے عمل کتمان اور پھر اس پر ان کے پشیمان ہونے سے آگاہ ہو جائیں، یہی وجہ ہے کہ آیت میں تین الفاظ ذکر ہوئے ہیں: تَابُوا، أَصْلَحُوا، بَيَّنُوا، یعنی توبہ کی، اس کے بعد اصلاح نفس و اصلاح احوال کی اور بیان و وضاحت کی، تو یہاں توبہ کے ساتھ بیان و وضاحت کے ذکر سے یہ مقصود ہے کہ لوگوں کو اس بات سے آگاہ کریں کہ انہوں نے حق کا کتمان کیا تھا اور اب توبہ کر لی ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کی توبہ و پشیمانی کا ثبوت نہیں ملے گا کیونکہ یہ دوسرا کتمان ہو جائے گا، پہلا کتمان حق و حقیقت پر پردہ ڈالنا اور

دوسرا کتمان اپنے عمل حق پوشی کا کتمان، جبکہ توبہ وپشیمانی کے بعد اس کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

کفر کی حالت میں مرنے والے لوگ!

○ " اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ھُمۡ کُفَّارٌ "

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کافر ہونے کی حالت میں مر گئے)

اس آیت میں "وَ مَاتُوۡا وَ ھُمۡ کُفَّارٌ" کے الفاظ سے یہ مقصود ہے کہ جو لوگ کفر اختیار کرنے کے بعد تادم مرگ اپنے کفر پر قائم رہیں یعنی عناد و ڈھٹائی سے حق کو تسلیم نہ کرنے پر ڈٹے رہیں ان پر اللہ کی لعنت اور فرشتوں و تمام انسانوں کی لعنت ہے، گویا یہ آیت کنایۃً اس امر کو ذکر کرنا چاہتی ہے کہ لعنت کی سزا کے مستحق وہ کافر ہیں جو از روئے عناد و دشمنی اپنے کفر اور حق کو تسلیم نہ کرنے پر ڈٹے رہیں کیونکہ وہی حقیقی معنی میں کافر ہیں ورنہ جو شخص حق کا انکار عناد و دشمنی اور تکبر و ڈھٹائی سے نہ کرتا ہو بلکہ اس کے کفر و انکار کی وجہ ناآگاہی اور حق کی صحیح معرفت نہ ہونا ہو تو وہ حقیقی معنی میں کافر نہیں بلکہ "مستضعف" ہے (یاد رہے کہ "مستضعف" اسے کہا جاتا ہے جو جہالت و ناآگاہی یا انتہائی کند ذہن ہونے کی وجہ سے حق کی معرفت حاصل نہ کر سکا ہو۔۔۔ بے چارہ، ناتواں۔۔) ایسے شخص کا معاملہ خدا کے سپرد ہے وہ خود بہتر جانتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے، چنانچہ اس کی تصدیق ان تمام آیات قرآنیہ سے ہوتی ہے جن میں کافروں کے کفر کو "تکذیب" و انکار کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے، بالخصوص وہ آیات جن میں حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر اترنے کے واقعہ کا تذکرہ ہے کیونکہ وہ سب سے پہلی آیات ہیں جو بنی نوع انسان کے لئے خدا کی طرف سے صادر ہونے والے سب سے پہلے احکامات پر مشتمل ہیں۔ ملاحظہ ہو:

سورہ بقرہ، آیات ۳۸، ۳۹:

○ " قُلۡنَا اھۡبِطُوۡا مِنۡھَا جَمِیۡعًا ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ھُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَ لَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ۔ "......،

(ہم نے کہا تم سب اس (بہشت) سے اتر جاؤ پس جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہادی آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا ایسے افراد نہ خوف کھائیں گے اور نہ ہی حزن و غم کا شکار ہوں گے، اور جو لوگ کفر اختیار کریں۔ میری ہدایت کا انکار کر دیں ......اور ہماری آیات کی تکذیب کریں وہی جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔)

بنا بر ایں زیر بحث آیات مبارکہ میں "اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا" سے مراد وہی افراد ہیں جو از روئے عناد حق کا انکار کرتے ہیں اور آیات الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں (جو خداوند عالم نے نازل فرمایا ہے اسے چھپاتے ہیں، اس کا کتمان کرتے

ہیں) ایسے لوگوں کے کیفر کردار کا ذکر آیت کے ذیل میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: "أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ" (انہی پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے)، یہ خدائی فیصلہ ہے کہ ایسے لوگوں پر ہر لعنت کرنے والے کی لعنت ہو خواہ فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ ان پر لعنت کرے یا انسانوں میں سے کوئی انسان لعنت کرے کسی استثناء کے بغیر سب کی لعنت ان لوگوں پر ہوگی، درحقیقت وہ شیطان کے راستہ پر چل پڑے ہیں لہٰذا وہ شیطان سے مختلف نہیں۔ دونوں کا راستہ، ہدف اور انجام ایک جیسا ہے اور شیطان کے بارے میں بھی خداوند عالم نے یہی ارشاد فرمایا: "وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ" .....سورہ حجر، آیت ۳۵ .....(اور تجھ پر قیامت تک لعنت ہے۔) خداوند عالم نے ہر طرح کی لعنت کا حقدار شیطان کو قرار دیا ہے اور یہ لوگ (جو علماء اپنے علم کا کتمان کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں) بھی عمومی لعنت میں شیطان کے ساتھ شریک ہیں ان پر ہر ایک کی اور ہر طرح کی لعنت ہے، اس سے بڑھ کر ان کا انجام کار کیا ہو سکتا ہے کہ وہ حق وحقیقت کے چھپانے جیسا گھناؤنا عمل کر کے شیطان کی مانند ہو جائیں اور ان پر لعنت کرنے والے کی لعنت ہو! بہر حال اس سلسلہ میں دیگر مطالب درج ذیل آیت کی تفسیر کے مقام پر ذکر کئے جائیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ:

سورہ انفال، آیت ۳۷:

○ "لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ"

(تاکہ خداوند عالم پلید کو پاک سے علیحدہ کردے اور ایک پلید کو دوسرے پلید پر رکھ دے کہ وہ سب یکجا ہو جائیں پھر انہیں جہنم میں ڈالے)

جہنم کا دائمی عذاب

○ "خَالِدِينَ فِيهَا"

(وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ لعنت کا عذاب چکھیں گے، چنانچہ اس کے بعد کے الفاظ اس بات کی دلیل ہے کہ لعنت سے مراد عذاب ہے یعنی وہ عذاب کی صورت اختیار کرلے گی ملاحظہ ہو: "لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ" (ان سے عذاب کم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی) اس میں واضح طور پر یہ ثبوت پایا جاتا ہے کہ ان پر لعنت عذاب کی صورت اختیار کرلے گی کیونکہ اس سے پہلی آیات میں یہ ذکر ہوا کہ ان پر اللہ، فرشتوں اور سب

انسانوں کی لعنت ہے اور اس آیت میں کہا گیا کہ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور ان پر عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی تو ثابت ہوا کہ لعنت ہی عذاب بن جائے گی اور وہ ہمیشہ اس میں مبتلا رہیں گے۔

ایک اہم نکتہ!

اس مقام پر ایک اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیاتِ شریفہ (۱۵۹ تا ۱۶۲) میں تین مقامات پر طرز بیان و انداز گفتگو میں مخصوص تبدیلی ملحوظ ہے اور وہ یوں کہ پہلی آیت میں (ابتداء میں اور درمیان میں) جمع متکلم کا صیغہ استعمال ہوا ''اَنْزَلْنَا'' (ہم نے نازل کیا) ''بَیَّنّٰهُ'' (ہم نے اس کی وضاحت کی۔۔واضح طور پر بیان کیا۔۔) لیکن اس کے بعد فعل مضارع غائب کا صیغہ استعمال ہوا ''اُولٰٓئِكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ'' (اللہ ان پر لعنت کرتا ہے) یعنی بجائے اس کے کہ یوں کہا جاتا :''ہم ان پر لعنت کرتے ہیں''، یوں کہا گیا ہے:''اللہ ان پر لعنت کرتا ہے''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقام ناراضگی کی شدت کے اظہار کا مقام ہے ایسے مقامات میں اگر ناراض ہونے والے شخص کا نام لیا جائے تو اس سے غصہ و ناراضگی کی انتہائی شدت کا ثبوت ملتا ہے خاص طور پر جبکہ وہ شخص بزرگ و باعظمت ہو اور ظاہر ہے کہ خداوند عالم سے زیادہ باعظمت و بزرگ کون ہوسکتا ہے، لہٰذا خدا کے اسم گرامی کا ذکر غیض و غضب اور غصہ و ناراضگی کی شدت اور سخت ترین لعنت کا ثبوت ہے، دوسری آیات میں توبہ کرنے والوں کی بابت رحم و کرم کو بیان کرتے ہوئے غائب کے صیغہ کو چھوڑ کر دوبارہ واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور یوں کہا گیا: فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ''(انہی لوگوں کی توبہ میں قبول کرتا ہوں اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہوں) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقام رحم و کرم اور نرمی و عنایت کرنے کا ہے اس لئے رحم کرنے والے کا نام یا اس کی صفات کے ذکر کے بجائے خود اس کا اپنا بیان زیادہ موزوں ہے یعنی (''خدا ان کی توبہ قبول کرتا ہے'') یا ('ان کا رب ان کی توبہ قبول کرتا ہے') کی بجائے (''میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں'') کے الفاظ رحم و کرم اور عنایت و مہربانی کی اہمیت بڑھا دیتے ہیں اور ان میں خدا کی طرف سے توبہ کرنے والوں پر احسان و اظہارِ محبت و مہربانی نہایت مناسب و دلکش ہے، پھر تیسری آیت میں واحد متکلم کے صیغہ کو چھوڑ کر غائب کے لہجہ میں بات کی گئی اور یوں کہا گیا ہے ''اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ'' (انہی پر اللہ کی لعنت ہے) تو اس میں وہی راز پوشیدہ ہے جو پہلی آیات میں ذکر ہو چکا ہے کہ ناراضگی و غصہ کی شدت کا اظہار مقصود ہے۔(یاد رہے کہ اس طرح کے اہم نکات کلام الٰہی کی بے مثال فصاحت و بلاغت اور عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں ان سے قرآنی مطالب و معانی اور مفاہیم کے تقدس و اعجاز آمیز حیثیت کے واضح شواہد ملتے ہیں)

روایات پر ایک نظر

کتمان کرنے والوں کے مختلف مصادیق

تفسیر "العیاشی" میں بعض اصحاب کے حوالہ سے مذکور ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ آیت مبارکہ " اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ . . . " سے کون لوگ مراد ہیں؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ہم اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ جب ہم میں سے کسی ایک کو مقام ولایت ظاہری حاصل ہو جائے تو ہر صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بعد آنے والے امام کا تعارف لوگوں سے کروادے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں ایک روایت مذکور ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (آیت میں "مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی" کہ جسے لوگ چھپاتے ہیں) اس سے مراد "ہم" ہیں۔ خدا ہماری مدد کرے!

ایک اور روایت محمد بن مسلم کے حوالہ سے مذکور ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: اس سے مراد اہل کتاب ہیں۔

یہ تمام روایات تطبیق کی ایک صورت ہے یعنی آیت کے معنی کو مختلف موارد پر منطبق کرنے کے اطوار و انداز ہیں ورنہ آیت میں "اِطلاق" پایا جاتا ہے، اس میں کوئی قید و شرط موجود نہیں کہ جس کی وجہ سے اس کے معنی کو ایک سے زیادہ موارد پر منطبق نہ کیا جاسکتا ہو۔

بعض روایات میں حضرت امیر المومنینؑ سے منقول ہے آپؑ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ ان سے مراد وہ اہل علم ودانش ہیں جو راہ حق سے منحرف ہو جائیں۔

آیت کی تفسیر میں فرمان رسولؐ

تفسیر "مجمع البیان" میں اس آیت کی تفسیر میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی مذکور ہے آپؐ نے فرمایا: جب کسی سے کوئی بات پوچھی جائے کہ جس کا وہ علم رکھتا ہو اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی، اسی کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے "اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ" کہ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے اسی مطلب کی تصدیق ہوتی ہیں جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کہ آیت میں "اطلاق" پایا جاتا ہے کوئی قید و شرط موجود نہیں لہذا اسے کسی ایک مورد سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ اس سلسلے میں جس قدر روایات ذکر ہوئی ہیں وہ معنی و مفہوم آیت کو کسی ایک مورد پر منطبق کرنے کے باب سے ہیں (جسے اصطلاح میں "باب جری و تطبیق" کہتے ہیں)

لعنت کرنے والے افراد

تفسیر "العیاشی" میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے "وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ" کی تفسیر میں منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: لعنت کرنے والوں سے مراد ہم ہیں (یعنی ہم ہیں جو ان پر لعنت کرتے ہیں)۔ جبکہ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد حشرات الارض ہیں۔

یہ روایت درج ذیل آیت میں مذکور مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے:

سورہ ہود، آیت ۱۸:

O "وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ"

(گواہ کہیں گے کہ یہی ہیں وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا، یاد رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے)

یقیناً قیامت کے دن ان گواہوں کو کھل کر بات کرنے کی اجازت ہوگی اور وہ آئمہ علیہم السلام ہیں، وہی صحیح بات کرنے والے ہیں، وہ قیامت کے دن سب کچھ کھل کر بیان کر دیں گے، امامؑ نے روایت میں لوگوں کے اس قول کا جو ذکر فرمایا ہے کہ وہ کہتے ہیں: اس سے مراد حشرات الارض ہیں۔" تو یہ اس تفسیر کی طرف اشارہ ہے جو مجاہد اور عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے، البتہ بعض روایات میں اس قول کی نسبت حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دی گئی ہے۔

تفسیر "العیاشی" میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى" میں "الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى" سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔

یہ روایت بھی تطبیق کے باب سے ہے۔

آیات ۱۶۳ تا ۱۶۷

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٣﴾

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿١٦٤﴾

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

ترجمہ

○ ''اور تمہارا معبود خدائے یکتا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' (۱۶۳)

○ ''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، گردش لیل و نہار میں، اس کشتی میں جو لوگوں کے فائدے کے لئے دریا میں چلتی ہے، اس پانی میں جسے خداوند عالم نے آسمان سے نازل کیا اور اس کے ذریعے مردہ زمین کو دوبارہ زندگی عطا کی اور ہر جاندار کو اس میں جگہ دی، ہواؤں کے چلنے میں اور آسمان و زمین کے درمیان مسخر و معلق کئے ہوئے بادل میں عقلمند لوگوں کے لئے واضح نشانیاں موجود ہیں۔'' (۱۶۴)

○ ''کچھ لوگ خدا کے علاوہ معبود بناتے ہیں ان سے اتنی محبت رکھتے ہیں جیسے خدا سے محبت رکھنی چاہیے اور جو اہل ایمان ہیں وہ ان سے بھی زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں، کاش یہ ظالم (مشرکین) جب عذاب کو دیکھیں تو یہ یقین کرلیں کہ ہر طرح کی طاقت صرف خدا کے پاس ہے اور خدا سخت عذاب کرنے والا ہے۔'' (۱۶۵)

○ ''اس وقت وہ لوگ کہ جن کی پیروی کی گئی اپنے پیروکاروں سے اظہار لاتعلقی کریں گے اور عذاب کا مشاہدہ کریں گے اور ان سے تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے۔'' (۱۶۶)

○ ''اور جنہوں نے پیروی کی وہ کہیں گے کاش ہم ایک بار پھر دنیا میں واپس جاتے تو ان لوگوں سے اسی طرح لاتعلقی کا اظہار کرتے جس طرح انہوں نے ہم سے اظہار لاتعلقی کیا ہے، اسی طرح خدا انہیں ان کے حسرت دلانے والے اعمال دکھائے گا اور وہ کبھی دوزخ کی آگ سے نکل نہ سکیں گے۔'' (۱۶۷)

تفسیر و بیان

یہ پانچوں آیاتِ مبارکہ ایک نہایت مرتب و منظم سلسلۂ کلام کے ساتھ ایک ہی پاکیزہ حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ (یعنی توحید) اور خدا کی وحدانیت پر مخصوص انداز میں دلائل بھی پیش کرتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ شرک اور اس کے وحشت ناک انجام کی یاد بھی دلاتی ہیں۔

معبود کی وحدانیت

O ''وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ''

(اور تمہارا معبود، یکتا معبود ہے)

سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں سب سے پہلی آیت یعنی ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے ذیل میں ''اِلٰہ'' کا معنی بیان ہو چکا ہے لہٰذا یہاں دوبارہ اسے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، اور جہاں تک ''وحدت'' کا تعلق ہے تو اس کا مفہوم نہایت واضح ہے کہ وہ ایسے مفاہیم میں سے ہے جو بدیہی (روشن و واضح اور مسلم الثبوت و ناقابل انکار) ہیں کہ جن کے سمجھنے یا ان کا تصور کرنے کے لئے کسی سمجھانے والے اور پہچان کروانے والے کی ضرورت ہی نہیں لیکن جہاں تک کسی چیز کے وحدت کی صفت میں متصف ہونے کا تعلق ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اس کے کسی وصف وصفت کے حوالہ سے اسے واحد...... ایک...... کہا جاتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ اس کی ذات کے حوالہ سے اسے واحد کہا جاتا ہے، دونوں کی وضاحت یہ ہے:

(۱) وصف وصفت کے حوالہ سے وحدت سے متصف کرنا، مثلاً جب یوں کہا جاتا ہے: ''ایک مرد'' ''ایک عالم'' ''ایک شاعر''، تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص میں پائی جانے والی صفت اسی کے ساتھ مختص ہے کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں اور نہ ہی وہ صفت کثرت کی متحمل ہے مثلاً زید کا مرد ہونا (ایک مرد) ایسی صفت ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے اس کی اس صفت میں کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک نہیں اور نہ ہی اس کی اس صفت کو اس کے اور کسی دوسرے کے

درمیان تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ''مرد ہونے'' کی صفت کو زید اور عمر و دونوں کے لئے ذکر کیا جائے اور کہا جائے ''وہ دو مرد ہیں'' تو اس صورت میں ''مرد ہونے'' کی صفت دونوں میں قابل تسلیم ہوگی اور اسے کثرت حاصل ہو جائے گی۔ بنا براین زید اپنی اس صفت (مردانگی) کے حوالہ سے واحد (ایک) ہے اس میں کثرت کا تصور نہیں ہو سکتا، اگر چہ اس صفت کے ساتھ اس کی دیگر صفات مثلاً اس کا علم، اس کی قدرت و توانائی، اس کی حیات وغیرہ کو دیکھا جائے تو وہ واحد...... ایک نہیں بلکہ حقیقی معنی میں کثرت کا حامل ہے لیکن خداوند عالم اپنی صفات کے حوالہ سے ایسا نہیں بلکہ وہ واحد ہے اور وہ الوہیت (معبود ہونے) کی صفت کے لحاظ سے بھی یکتا ہے کوئی اس کے ساتھ اس صفت میں شریک نہیں اور اپنی دیگر صفات مثلاً علم، قدرت، حیات وغیرہ کے لحاظ سے بھی یکتا ہے کیونکہ اس کا علم دوسروں کے علم جیسا نہیں، اس کی قدرت دوسروں کی قدرت جیسی نہیں اور اس کی حیات دوسروں کی حیات جیسی نہیں، وہ واحد و یکتا ہے۔ اور جو مختلف صفات اس کی بابت تصور و ذکر کی جاتی ہیں وہ صرف مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے فرق رکھتی ہیں ورنہ اس کی ذات کی نسبت سے دیکھا جائے تو سب ایک ہیں ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا اس کا علم، اس کی قدرت، اس کی حیات سب اس کی عین ذات ہیں، وہ اپنی قدرت کے ساتھ عالم ہے، اپنی حیات کے ساتھ قادر ہے، اپنے علم کے ساتھ حی (زندہ) ہے، ایسا نہیں کہ اس کی ذات اس کی صفات سے مختلف ہو یعنی ذات کچھ ہو اور یہ صفات کچھ اور، وہ دوسروں کی طرح نہیں کہ ان کی صفات ان کی ذات سے مختلف ہوتی ہیں یعنی مصداق اور مفہوم کے لحاظ سے ان کی صفات فرق رکھتی ہیں بلکہ ذاتِ کردگار کی صفات عین ذات ہیں یعنی صفات کے درمیان پائے جانے والے مفہومی فرق کی وجہ سے مصداق میں کثرت نہیں پائی جاتی بلکہ وہ واحد و یکتا ہے۔ اس کی صفات ہی اس کی ذات ہیں اور ذات کی آئینہ دار بھی!۔

(۲) ذات کے لحاظ سے وحدت سے متصف کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات میں کسی طرح بھی کثرت اور اجزاء نہیں پائے جاتے، اس کی ذات ہرگز قابل تجزیہ و تقسیم نہیں یعنی اسے جزء جزء کے طور پر تصور نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ذات و نام وغیرہ کے عناوین سے (ہر ایک کو مستقل حیثیت دے کر) ایک کو دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے، اسی وحدت کو ''احدیت الذات'' کہا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے لفظ ''اَحد'' استعمال کیا جاتا ہے۔ سوائے ان مقامات کے کہ جہاں نفی یا نہی یا ان کے ہم معنی موارد میں استعمال ہو تو اس صورت میں اس کے ذریعے اصل ذات کی مکمل طور پر نفی سمجھی جائے گی مثلاً جب یہ کہا جائے: ''مَا جَائَنِی اَحَدٌ'' (میرے پاس کوئی ایک نہیں آیا) تو اس جملے میں اصل ذات کی نفی کی گئی ہے خواہ وہ ایک ہو یا زیادہ ہوں کیونکہ اس میں اصل ذات کو وحدت سے متصف کیا گیا ہے نہ کہ اس کے کسی ایک وصف و صفت کو، جبکہ اس کے برعکس ''مَا جَائَنِی وَاحِدٌ'' (میرے پاس ایک شخص نہیں آیا) کے جملے میں نہ آنے والے کو وحدت سے متصف کیا گیا ہے لہٰذا اس سے دو یا زیادہ افراد کے آنے کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ اس میں وحدت صفت کی صورت میں ہے نہ کہ ذات کے لحاظ سے، جیسا کہ ''رجل واحد'' (ایک مرد) میں ''مرد ہونے'' اور وحدت (ایک ہونے) کا مسئلہ ہے، ابھی آپ اسی اجمالی بیان پر اکتفاء کریں انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ اخلاص کی پہلی آیت ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' کی تفسیر میں ''اَحَدٌ''

کے معنی کی بابت تفصیلی مطالب ذکر کئے جائیں گے۔

بہرحال ''وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ'' کے الفاظ مجموعی طور پر خدائے قدوس کی الوہیت و یکتائی کو ثابت کرتے ہیں اور الوہیت کے ذاتِ کردگار کے ساتھ مخصوص ہونے کو بیان کرتے ہیں اور جس وحدت و یکتائی کا خداوند عالم کے لئے اثبات کرتے ہیں وہ وہی وحدت ہے جو اس کی مقدس و پاکیزہ ذات کے شایانِ شان ہے کیونکہ لفظ ''واحد'' سے عام طور پر وحدت کا عام وسیع مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ جس کا اطلاق وحدت کی مختلف قسموں پر ہوسکتا ہے کہ جن میں سے کچھ تو خداوند عالم کی ذاتِ اقدس کی بابت درست ہیں اور کچھ بالکل ہی درست نہیں۔ مثلاً وحدت کی یہ تین قسمیں: عددی وحدت، نوعی وحدت، جنسی وحدت ذاتِ کردگار کے لئے ہرگز درست نہیں ہر شخص ان تمام قسموں کے معنی اپنے ذوق فہم کے مطابق کرتا ہے اور ''واحد'' (ایک) کے وسیع مفہوم کو اپنے نظریہ و عقیدہ کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جاتا ''والله اله واحد'' (اللہ ایک معبود ہے) تو اس سے توحید۔ خدا کی وحدانیت...... ثابت نہیں ہوتی کیونکہ مشرکین بھی خدا کو اپنے دیگر معبودوں کی طرح ایک معبود سمجھتے ہیں۔ (یہ عددی وحدت کی مثال ہے۔) اسی طرح اگر یہ کہا جاتا: ''والهكم واحد'' (تمہارا معبود ایک ہے) تب بھی توحید و خدا کی یکتائی ثابت نہ ہوتی کیونکہ اس سے یہ مراد لیا جانا ممکن ہو جاتا کہ وہ اپنی نوع کے لحاظ سے واحد ہے یعنی الوہیت میں ایک نوع کی طرح ہے کہ جس کے متعدد افراد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حیوان کی مختلف قسموں کی تعداد کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ ''ایک گھوڑا ہے'' ایک خچر ہے'' تو اس میں ان کی نوع ذکر کی جاتی ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک، تعداد کے لحاظ سے ایک سے زیادہ افراد رکھتا ہے لہٰذا نوعی وحدت بھی خداوند عالم کے لئے درست نہیں اس لئے جملہ ''وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ'' ذکر کیا گیا جس کا معنی یہ ہے: ''تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے'' اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دو یا زیادہ معبود نہیں بلکہ ایک برحق معبود ہے اور یہاں ''اِلٰهُكُمْ'' کے لفظ سے خصوصیت کے ساتھ توحید کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اس میں الوہیت کی حقیقت کو صرف ایک ذات کے ساتھ مختص کیا گیا ہے۔

نفی اور اثبات کا خوبصورت انداز

O ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ''

(نہیں ہے کوئی معبود، مگر وہ!)

اس جملے میں اس مطلب کا تاکیدی بیان مقصود ہے جو اس سے پہلے جملے میں واضح طور پر ذکر کیا جا چکا ہے یعنی توحید، تاکہ سابقہ جملہ کی بابت کسی قسم کی تاویل کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور حرف ''لَا'' نفی جنس کے لئے ہے یعنی الوہیت کی اصل حقیقت و ذات کی نفی مقصود ہے اس کے کسی ایک وصف و صفت کی نفی مقصود نہیں۔ ''اِلٰهَ'' سے مراد حقیقی معبود ہے یعنی وہ ذات کہ جسے حقیقی معنی میں معبود کہا جاسکتا ہو، لہٰذا ادبی لحاظ سے حرف ''لَا'' کی خبر محذوف مانی جائے گی اور جملہ یوں تصور کیا جائے گا ''لَآ اِلٰهَ موجود'' یا ''لا اله كائن'' یعنی ''کوئی حقیقی معبود موجود نہیں۔'' اور ''حقیقتاً کوئی معبود نہیں۔'' اور چونکہ

"اِلَّا" کے بعد ضمیر "ھو" ذکر ہوئی ہے جو کہ مرفوع ہے اس لئے "اِلَّا" الٰہ کی صفت ہے اور "غَیر" کے معنی میں ہے۔ بنا بر این "لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ" کا معنی یہ ہوگا "لا الٰہ غیر اللّٰہ بموجود" (اللہ کے علاوہ کوئی حقیقی معبود نہیں)

ان مطالب سے یہ اہم نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جملہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ" صرف مشرکین کے خیالی و باطل معبودوں کی نفی کرتا ہے نہ یہ کہ غیر خدا کی الوہیت کی نفی کے ساتھ ساتھ خدا کے وجود کو بھی ثابت کرتا ہے جیسا کہ اکثر حضرات گمان کرتے ہیں، یعنی اکثر اہل ادب یہ گمان کرتے ہیں کہ اس جملہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ) کے ذریعے دو مطالب بیان کیے گئے ہیں: (۱) خیالی و باطل خداؤں کی نفی، (۲) اللہ تعالیٰ کے وجود کا اثبات، لیکن ان حضرات کا نظریہ درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس جملے سے صرف باطل خداؤں کی نفی مقصود ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ مقام بیان ہی مشرکین کے باطل خداؤں کی نفی کا متقاضی ہے۔ تا کہ ان کی نفی سے خدا کی وحدانیت ثابت ہو نہ یہ کہ ان کی نفی اور خدا کی وحدانیت کا اثبات دونوں یکجا مقصود ہوں کیونکہ ان کی نفی کے بعد خدا کی وحدانیت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے اس کے لئے مزید ثبوت و اثبات کی ضرورت باقی نہیں رہتی بالخصوص کہ حرف "اِلَّا" استثناء کے معنے میں نہیں بلکہ صفت کے طور پر ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید خداوند عالم کے وجود کو بدیہی (اور مسلم الثبوت و ناقابل انکار حقیقت) قرار دیتا ہے کہ جس کے لئے کسی دلیل و ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور اس میں خدا کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے وہ اس کی صفات مثلاً وحدت و یکتائی، خالقیت، علم، قدرت وغیرہ کے اثبات کے باب سے ہے نہ کہ اصل ذات و وجود کے اثبات کے بابت!

ایک سوال اور دو جواب

اس مقام پر ایک سوال ممکن ہے کہ اگر "لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ" کے جملہ میں "لَآ" کی خبر "موجود" یا "کائن" وغیرہ ہو تو اس سے خداوند عالم کی توحید و یکتائی ثابت نہیں ہوگی کیونکہ اس کا معنی یوں ہوگا: "خدا کے سوا کوئی معبود موجود نہیں" یا "خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔" یعنی اس میں خدا کے علاوہ دوسرے کسی کے وجود کی نفی ہوگی نہ کہ اس کے ممکن ہونے کی نفی! لہٰذا اس بات کا امکان باقی رہے گا کہ وہ کبھی وجود میں آ جائے؟

اس کا پہلا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کسی ایسے معبود کا وجود معقول ہی نہیں جو خود تو "ممکن الوجود" ہو اور کائنات کی تمام موجودات (جو کہ وجود میں آ چکی ہیں) اپنے وجود اور اپنے تمام امور میں اس سے وابستہ اور اس کی مرہون منت ہوں یعنی جو مخلوقات اس وقت وجود رکھتی ہیں ان کے وجود کا سلسلہ ایسی ذات تک پہنچے جو اپنی ذات میں "ممکن الوجود" ہے (وجود اور عدم کی نسبت اس کی بابت مساوی ہے) یہ ہرگز ممکن نہیں کیونکہ وہ ذات کہ جس پر تمام ممکن الوجود اشیاء کا سلسلہ منتہی ہوتا ہے اسے "واجب الوجود" ہونا چاہیے۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ" اصل میں یوں ہے "لا معبود حق الا ھو" (کوئی معبود

برحق نہیں سوائے خدا کے) گویا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی کو معبود مانا بھی جائے تب بھی وہ برحق معبود نہ ہوگا۔ برحق اور حقیقی معبود صرف خدا ہے۔

رحمت کے وسیع ودائمی ہونے کا بیان

○ "الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ"

سورۂ فاتحہ کی سب سے پہلی آیت "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کی تفسیر میں ان دو اسماء مبارکہ (رحمن، رحیم) کے بارے میں تفصیلی مطالب ذکر ہو چکے ہیں، ان دو اسماء مبارکہ کے اس مقام پر ذکر کرنے سے "ربوبیت" کا معنی مکمل ہو جاتا ہے کیونکہ "رحمان" میں رحمانیت سے پوری کائنات پر ہر طرح کی عنایات کے سلسلہ کا ذاتِ کردگار تک منتہی ہونا ثابت ہوتا ہے جبکہ "رحیم" میں رحیمیت اہل ایمان پر خدا کی خاص عنایتوں اور دنیا میں ہدایت اور آخرت میں سعادت کی نعمت عطا کرنے کو ثابت کرتی ہے، رحمن یعنی عام مہربان (ہر طرح سے مہربان اور ہر ایک پر مہربان)' رحیم یعنی خاص مہربان (اہلِ ایمان پر مہربان اور دنیا وآخرت میں مہربان)

وجودِ خالق کی آفاقی نشانیاں

○ "ان فی خلق السمٰوات والارض......الخ"

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ آیت مبارکہ (۱۶۴) پہلی آیت (۱۶۳) کے معنی ومطالب کی دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلی آیت میں یہ ذکر ہوا تھا کہ تمہارا برحق ایک ہی معبود ہے جو رحمتوں والا نہایت مہربان ہے۔ (وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ) اور اس آیت (۱۶۴) کا تجزیہ وتحلیل کرنے سے اس کا معنی ومفہوم یہ ہوگا کہ "کائنات ہستی کی ہر چیز کا ایک معبود ہے، وہ رحمان ہے عام عنایتوں والا سرچشمۂ فیوضات ہے، وہ رحیم ہے خاص عنایتوں والا یعنی اخروی سعادت عطا کرنے والا ہے اور یہ سب وہ بلند پایہ وناقابل انکار حقائق ہیں کہ آسمانوں وزمین کی خلقت، شب وروز کی گردش......الخ، صاحبان عقل کے سامنے ان کے واضح ثبوت پیش کرتی ہیں" بہرحال یہاں یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ پوری کائنات کا معبود ایک ہی ہے کیونکہ اگر صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہوتا کہ انسان کا معبود ایک ہے (یعنی صرف کائنات انسانی کے خدا کی یکتائی کا اثبات مقصود ہوتا) تو آیت (۱۶۴) میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب صرف ایک دلیل ونشانی قرار پاتیں کیونکہ ان سب کی تخلیق کا اصل مقصد حیات انسان کی تدبیر اور اس کی اخروی سعادت کے سوا کچھ نہیں اور وہ اسی حوالہ سے ایک ہی خالق ومدبر سے وابستہ ہیں۔ ان سب کو "ایک نشانی" قرار دینے کی بجائے ہر ایک کو ایک مستقل نشانی قرار دے کر ان سب کے لئے لفظ "آیات" ذکر کیا گیا جس کا معنی "نشانیاں" ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان

میں سے ہر ایک کو مستقل طور پر خالق و آفریدگار کے وجود کی دلیل و نشانی قرار دیا جائے اور اس کے بعد یہ ثابت کیا جائے کہ ان سب کا اور انسان کا خدا ایک ہی ہے، وہ یکتا ہے، وہی برحق معبود ہے، اور اگر اس آیت میں ان سب کے اور انسان کے معبود کے ایک ہونے کو ثابت کرنا مقصود نہ ہوتا تو ''وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' کی بجائے آیت کے الفاظ یوں ہوتے: ''وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' (یعنی تمہارا معبود ایک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں جبکہ لفظ ''اِلٰهَ'' (معبود) کو ''اِلٰهُكُمْ'' کے بعد دوبارہ ذکر کیا گیا ہے جس سے اس امر کا اثبات مطلوب ہے کہ انسانوں اور دیگر تمام موجودات اور کائنات کے عظیم و حکیمانہ نظم و نظام کا خالق و مدیر و مدبر ایک ہی ہے وہی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، وہی ہے جس نے پوری کائنات کو وجود عطا کیا اور وہی ہے جو کائنات کا عظیم مدبر ہے، وہی سب کا یکتا معبود ہے اس کے علاوہ کوئی برحق معبود نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آیت میں جن چیزوں کو خدا کے وجود اور اس کی یکتائی کی دلیل و نشانی کہا گیا ہے وہ کیونکر ذاتِ کردگار کے وجود اور اس کی یکتائی کی نشانیاں ہیں؟ ہر ایک کی بابت اجمالی بیان ملاحظہ ہو:

(۱): خلقت و آفرینش کے منفرد شاہکار!

یہ آسمان اپنی منفرد تخلیق کے ساتھ کہ جو ایک مخصوص حکمت آمیز نظام و ترتیب کے ساتھ ہم پر سایہ فگن ہیں، یہ زمین کہ جس نے اپنی شگفت انگیز خلقت کے ساتھ ہمارا بوجھ اٹھایا ہوا ہے، اور عالم ہستی میں پائے جانے والے دیگر حیرت انگیز منظم سلسلے مثلاً گردش لیل و نہار، پانی کے دوش پر سوار کشتیاں جو ہواؤں کے سہارے پر رواں دواں رہتی ہیں، آسمان سے نعمت حیات لے کر زمین پر اترنے والی بارشیں، تیز رفتار ہواؤں کے مخصوص انداز، فضا میں معلق بادل وغیرہ سب ایسے امور و موجودات ہیں کہ جنہیں خالق و آفریدگار کی ضرورت ہے ان میں سے کوئی بھی خود بخود وجود میں نہیں آیا بلکہ اسے کسی نے نعمتِ وجود عطا کی ہے اور وہ خدائے یکتا ہے، (یہ ہے خدا کے ایک ہونے کی پہلی دلیل)

(۲): ستاروں و سیاروں کے دلکش سلسلے!

فضائے فلک پر بکھرے ہوئے سیاروں و ستاروں کو دیکھیں کہ ان میں کچھ چھوٹے ہیں تو کچھ بڑے ہیں، اور کچھ دور ہیں تو کچھ نزدیک، یہاں تک کہ ان میں سے ایک سیارے کے بارے میں جدید سائنسی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ وہ اس قدر چھوٹا ہے کہ اس کا حجم ۳۳،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۱ سینٹی میٹر مکعب کے برابر ہے، اور ایک سیارے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اتنا بڑا ہے کہ اس کا حجم زمین کے حجم سے کئی ملین زیادہ ہے جبکہ زمین کا قطر تقریباً ۹۰۰۰ میل ہے، اور ان میں سے بعض سیارے ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر ہیں کہ دونوں کے درمیان تین ملین نوری سال کے لگ بھگ فاصلہ ہے اور ہر نوری سال مسافت کے لحاظ سے تقریباً (۳۶۵x۲۴x۶۰x۶۰x۳۰۰۰۰۰ کلومیٹر) کے

برابر ہے، آپ خود غور کریں کہ یہ وسیع و عریض عالم ہستی کہ جس کے بعض حصوں کے بارے میں سائنسی تحقیقات کے نتائج کی روشنی میں حجم و قطر اور فاصلوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو کہ عقلیں دنگ اور سوچیں حیرت زدہ ہو جائیں اور ان ستاروں و سیاروں کے درمیان مذکورہ بالا فاصلوں کے باوجود وہ روشنی، حرارت و کشش کے ذریعے ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور آپس میں موثر و متاثر کی مانند ہیں (مؤثر یعنی اثر کرنے والا، اپنی قوتیں وصلاحتیں دوسرے تک پہنچانے والا، اور متاثر یعنی اثر قبول کرنے والا، قوتوں وصلاحیتوں کو جذب کرنے والا) اور اسی سے ''زمانہ'' اور عام حرکت کا نظام وجود میں آتا ہے۔ اور یہ عام و وسیع (پورے عالم پر چھایا ہوا) نظام ہمیشہ ایک نا قابل تغیر و تبدل (ثابت و قائم) قانون و ضابطہ کے ماتحت چلتا ہے، یہاں تک کہ عالم جسمانی میں قانون حرکت کے قابل تغیر و تبدل ہونے کے نظریہ کے حامی بھی اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ یہ سب عام تغیرات و تبدیلیاں بھی ایک ثابت و نا قابل تغیر و تبدل قانون و ضابطہ کے تابع ہیں، اور یہاں یہ بات نہایت قابل توجہ ہے کہ یہ عام حرکت اور تغیر و تبدل کا سلسلہ عالم ہستی کے ہر جزء و حصہ میں (کائنات کے ذرہ ذرہ میں) مخصوص صورت و کیفیت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً منظومۂ شمسی: یہ مجموعی طور پر حرکت کے عام قانون و نظام کے تابع ہے کہ اس کی حرکت کا دائرہ بہت وسیع ہے پھر اس سے چھوٹے دائرے کو دیکھیں مثلاً کرۂ ارضی اور اس سے تعلق رکھنے والے امور و حالات، اور اجرام فلکی مثلاً چاند، رات دن، ہوائیں، بادل اور بارشیں وغیرہ، پھر اس سے چھوٹے دائرے پر نظر کریں مثلاً زمین سے نکلنے والے معدن، نباتات، حیوانات وغیرہ اور پھر ان میں سے ہر ایک کی انواع و اقسام کا ملاحظہ کریں، اسی طرح اپنے دائرہ نگاہ کو مزید کم کر کے دیکھیں مثلاً جسم کے عناصر و اجزاء، پھر ان اجزاء کے ذرات، پھر ان ذرات کے اجزائ' یہاں تک کہ سب سے چھوٹی چیز کہ عصر حاضر میں انسان جس کی بابت وسیع تحقیق میں منہمک ہے یعنی الیکٹرون اور پروٹون، اس میں غور کریں تو ان تمام چیزوں میں حرکت و تغیر کا عام قانون و نظام موجود ہے اور یہ سب اس نظام کے تابع ہیں اور ان میں سب سے چھوٹی چیز یعنی الیکٹرون و پروٹون میں بھی وہی نظام موجود ہے جو سب سے بڑی چیز یعنی منظومۂ شمسی میں پایا جاتا ہے یعنی جس طرح منظومۂ شمسی میں تمام سیارے و ستارے ایک برج میں گھومتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر ایک اپنے مدار کا چکر کاٹ کر سورج اور پھر افلاک و فضا میں مخصوص کیفیت کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں اسی طرح الیکٹرون و پروٹون کے ذرات واجزاء ستاروں و سیاروں کی مانند اپنے نقطۂ مرکزی کے گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں اور وہ نقطۂ مرکزی ان کی بابت وہی حیثیت رکھتا ہے جو سورج اپنے منظومہ سے رکھتا ہے، گویا یہ سب ایک ہی نظام و قانون حرکت و تغیر کے تابع ہیں،

بنابرایں اگر انسان ان موجودات اور گوناگوں چھوٹے بڑے عوالم کو نگاہ تحقیق سے دیکھے تو اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے گا کہ ان سب میں ایک عجیب و غریب اور محیر العقول نظام موجود ہے اور وہ نظام تغیر و تبدل کے وسیع سلسلہ کا حامل ہونے کے باوجود اپنے بنیادی اصول و قانون کے تابع ہے اور اسی سے وابستہ و منسلک ہے، اسی سے سنت الٰہیہ کا احیاء ہوتا ہے وہ سنت الٰہیہ کہ جس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے اور اس کے عام نظام و بنیادی اصولوں میں کوئی استثناء نہیں پایا جاتا

بلکہ کائنات کی ہر چیز اس کے تابع ہے، کوئی چیز اس کے دائرۂ اثر سے باہر نہیں اور نہ ہی اس کے جاری نظم و نظام میں کوئی اصولی و بنیادی تبدیلی واقع ہوتی ہے، اس کے دریائے اسرار و رموز کا کنارا دکھائی نہیں دیتا اور اس کی تہہ تک پہنچنا عقل انسانی کے بس میں نہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم چھوٹے چھوٹے متعدد عوالم کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دیکھیں اور ان میں پائے جانے والے نظام کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعی طور پر ایک ہی نظام کے تحت چلنے والا ایک ہی عالم ہے اور سب میں ایک ہی تدبیر کارفرما ہے، اسی طرح اگر اس وسیع کائنات پر نگاہ کریں اور اس کی وسعتوں پر محیط نظام کو غور سے دیکھیں۔ ۔جیسا کہ جدید علوم نے غیر معمولی ترقی و پیشرفت کے ساتھ مادی وسائل اور حساس خوردبینوں کے ذریعے عالم ہستی کی باریکیوں سے آگاہی حاصل کی ہے۔۔تو معلوم ہو جائے گا کہ وہی نظام و قانون اس میں حکمفرما ہے جو چھوٹے عوالم میں پایا جاتا ہے اور پھر ان تمام چھوٹے بڑے عوالم کا تجزیہ و تحلیل کریں اور ہر ایک کو الگ الگ حیثیت میں دیکھیں اور اس کی بابت تحقیق کریں یہاں تک کہ اس سلسلۂ تحقیق میں سب سے چھوٹی چیز یعنی مولیکیول میں نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں بھی وہی نظام و قانون موجود و حکم فرما ہے جو سب سے بڑے عالم اور پورے عالم پر چھایا ہوا ہے اور ان دونوں میں ذرہ بھر فرق نہیں پایا جاتا یعنی اس عام نظام کے ماتحت ہونے کے حوالہ سے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے عالم میں کوئی فرق نہیں بلکہ ان میں پایا جانے والا سلسلۂ تدبیر و تنظیم ایک ہے جبکہ تمام موجودات ہستی اپنے ذاتی تشخص اور انفرادی خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ سارا عالم ایک ہی چیز ہے اور ایک ہی نظام و قانون اس پر حکم فرما ہے اور اس عالم ہستی کے تمام اجزاء و موجودات اپنی کثرت اور انفرادی خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک ہی نظام کے تابع ہیں۔ ''وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ'' (سبھی خداوند حی و قیوم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں) (سورہ طہ آیت ۱۱۱)۔

بنابرایں یہ ثابت ہوا کہ اس عالم کا معبود اور اسے وجود عطا کرنے والا 'ایک' ہے اور وہی 'ایک' اس پورے عالم ہستی کو چلا رہا ہے۔ (یہ ہے خدا کی وحدت و یکتائی کی دوسری دلیل)

(۳): انسان: خدا کا عظیم شاہکار تخلیق

اب جبکہ آسمانوں و زمین اور تمام موجوداتِ عالم ہستی کے حوالہ سے خدا کی یکتائی ثابت ہو چکی ہے تو انسان کے بارے میں غور کریں، انسان جو کہ ایک زمینی مخلوق ہے زمین (کرۂ ارضی) میں زندگی بسر کرتا ہے۔ یہیں پیدا ہوا اور یہیں اس کا سفر حیات ختم ہوگا۔ اور مرنے کے بعد دوبارہ یہاں ہی لوٹ کر آئے گا لہٰذا اسے اپنے وجود و بقاء اور زندگی بسر کرنے کے لئے اسی نظام و عام قانون کی ضرورت ہے جو پورے عالم ہستی میں جاری و حکم فرما ہے اور سب موجودات اسی نظام کے ساتھ

وابستہ ومرتبط ہیں تو انسان بھی اسی عالم طبیعت کا حصہ ہے کیونکہ یہ آسمانی مخلوق ستارے وسیارے سب اسے روشنی وگرمی عطا کرتے ہیں اور زمین اپنی مخصوص گردش لیل ونہار، ہواؤں، بادلوں، بارشوں، سبزیوں، پھلوں اور اپنی دیگر مخلوقات کے ساتھ انسان کی غذا اور دوسری ضروریاتِ زندگی فراہم کرتی ہے کہ جن پر انسان کی زندگی اور نظام حیات کا انحصار و دار و مدار ہے...... درحقیقت خدا ہی اس کے پیش منظر وپس منظر میں ہے جو یہ سب کچھ پیدا کر رہا ہے......، بنابرایں وہی ذات احدیت کہ جس نے پورے عالم ہستی کو خلق فرمایا ہے اور تمام موجودات عالم اس کے حکم وفرمان کے تابع ہیں اسی نے انسان کو پیدا کیا اور وہی اس کا نظام حیات چلانے والا اس کا یکتا معبود ہے (یہ ہے خدا کی وحدانت و یکتائی کی تیسری دلیل)

ان تین دلائل سے خدا کی یکتائی ثابت ہوئی، پس وہ معبود کہ جس نے انسان اور سارے جہان کو پیدا کیا ہے وہی سب کو بقائے حیات وسعادت دنیا وآخرت...... بشرطیکہ وہ اخروی سعادت کا حقدار ہو...... عطا کرنے والا ہے اسی نے انسان کو دنیا میں بھی سعادت پانے کے وسائل وذرائع عطا کئے اور اخروی سعادت کے حصول کے اسباب بھی مہیا کر دیئے ہیں۔ کیونکہ آخرت اس دنیا ہی کے انجام کار سے عبارت ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ نتیجۂ عمل کی تدبیر اس کے ہاتھ میں نہ ہو جس کے ہاتھ میں اصل عمل کی تدبیر ہے، (اور یہی ہے خداوند عالم کے دو ناموں "رحمان ورحیم" کی دلیل)

ان بیانات سے ثابت ہوا کہ دوسری آیت (یعنی آیت ۱۶۴) پہلی آیت (یعنی آیت ۱۶۳) میں مذکور مطالب کی دلیل وثبوت کی حیثیت رکھتی ہے یعنی یہ بات ثابت ہوگئی کہ آیت ۱۶۴ آیت ۱۶۳ کے مضمون (خدا کی وحدانیت اور رحمان ورحیم ہونا) کی دلیل کے طور پر ذکر ہوئی ہے (واللہ العالم)، بنابرایں جملہ " اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ " سے آسمانوں، اجرام فلکی اور ستاروں وسیاروں کی تخلیق، زمین اور اس میں پائی جانے والی عجیب وغریب، دلکش ومحیر العقول مخلوقات کی آفرینش اور ان میں گوناگوں صورتوں اور شکلوں کے حوالہ سے مختلف ناموں اور انواع واجناس کا پیدا ہونا اور ان میں تغیر و تبدل، کمی واضافہ اور تجزیہ وترکیب کا پایا جانا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورہ رعد، آیت ۴۱:

○ " اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا "

(آیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کے اطراف وجوانب میں کمی کرتے رہتے ہیں)

سورہ انبیاء، آیت ۳۰:

○ " اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ......،

(آیا کفر اختیار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین کو جو کہ بند اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے ہم نے انہیں کھول دیا اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا)

گردش لیل ونہار کا حوالہ

O ''وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ...''

یہاں ''اختلاف'' سے مراد گھٹنا اور بڑھنا..... کمی وبیشی..... اور لمبا وچھوٹا (طویل وقصیر) ہونا ہے جو کہ ان دونوں (رات اور دن) کو دو طبعی اسباب کے یکجا ہونے سے لاحق ہوتا ہے۔ اور وہ دو اسباب یہ ہیں:

(۱) زمین کا ہر روز اپنے مرکز کے گرد گھومنا، اسی سے رات اور دن وجود میں آتے ہیں اور وہ یوں کہ زمین کی اس دائمی حرکت اور باقاعدہ طور پر اپنے محور کے گرد گھومنے کے نتیجہ میں کرۂ ارضی کا نصف یا اس سے کچھ زیادہ حصہ ہمیشہ سورج کے سامنے آتا ہے اور اس سے روشنی وحرارت حاصل کرتا ہے اسی دورانیہ کو ''دن'' کہتے ہیں۔ اور دوسری جانب کرۂ ارضی کا باقی حصہ مخروطی سایہ کے نیچے آنے کی وجہ سے تاریک رہتا ہے اور اسے ''رات'' کہا جاتا ہے اور یہ دو حالتیں کرۂ ارضی کو ہمیشہ لاحق ہوتی ہیں کیونکہ اس کا اپنے محور کے گرد گھومنا دائمی طور پر ان حالتوں کو وجود میں لاتا رہتا ہے۔

(۲) زمین کا اپنی حرکت کے دوران خط استواء سے شمال وجنوب کی طرف جھکاؤ، یہ حالت سورج کی سمت میں سال کے مختلف اوقات میں بدلتی ہے جس سے موسم وجود میں آتے ہیں چنانچہ جب شمالی کرہ کا سورج کی طرف جھکاؤ ہو تو اس میں گرمی اور جنوب میں سردی ہوتی ہے اور جب جنوبی کرہ سورج کی طرف جھکے تو اس میں گرمی اور شمالی کرہ میں سردی ہوتی ہے اور اسی جھکاؤ کے نتیجہ میں خط استواء اور قطب شمالی وجنوبی میں دن اور رات لمبائی میں ہمیشہ مساوی ہوں گے، البتہ دونوں قطبوں میں مکمل شمسی سال میں صرف ایک دن اور ایک رات ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک چھ مہینہ طویل ہوتا ہے جب قطب جنوبی میں دن ہوتا ہے تو قطب شمالی میں رات ہوتی ہے اور اس کے برعکس جب قطب شمالی میں دن ہوتا ہے تو قطب جنوبی میں رات ہوتی ہے، اس طرح خط استواء ایک شمسی سال میں تقریباً ۳۶۵ دن اور رات رکھتا ہے اور وہ تمام (دن اور رات) لمبائی میں مساوی ہوتے ہیں لیکن دوسرے حصوں میں دن اور رات تعداد اور لمبائی میں خط استواء اور دو قطبوں سے مختلف فاصلوں کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں، (اس موضوع کی تفصیلی بحث مربوطہ علوم میں کی گئی ہے)۔ اس فرق کی وجہ سے زمین کے مختلف حصوں میں روشنی وحرارت مختلف شدت کے ساتھ پہنچتی ہے جس کے نتیجہ میں زمین کی مختلف حالتوں کے مختلف عوامل میں وجود میں آتے ہیں اور اس تبدیلی سے انسان بے شمار طریقوں سے فائدے حاصل کرتا ہے۔

کشتی کی روانی: خدا کی نشانی

O ''وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ''

''فلک'' کا معنی کشتی وسفینہ ہے، یہ لفظ (فلک) واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ''**فلک**'' اور

"فلکۃ" ایک ہی معنی میں آتے ہیں جیسے **"تمر"** اور **"تمرۃ"** دونوں کا معنی "کھجور" ہے۔

"بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ" سے مراد ساز و سامان اور کھانے پینے کی چیزیں ہیں جو کشتیوں کے ذریعے دنیا کے مختلف علاقوں سے ساحل بہ ساحل لائی جاتی ہیں۔

اس مقام پر ایک نہایت اہم مطلب توجہ طلب ہے اور وہ یہ کہ اس آیت میں کشتی کو بھی عالم ہستی کی دیگر موجودات مثلاً آسمان و زمین اور طبعی نظم و نظام مثلاً رات اور دن کے آنے جانے کہ جس میں انسان کے ارادہ و اختیار کا ہرگز کوئی دخل نہیں کی فہرست میں ذکر کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کے تمام امور کی بازگشت بالآخر خداوند عالم کی قدرت وتخلیق کی طرف ہوتی ہے کیونکہ اگر اچھی طرح غور وفکر کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کے افعال کی نسبت خود اس کی طرف اس نسبت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو ان افعال کی دیگر طبیعی اسباب سے ہوتی ہے اور یہ ارادہ و اختیار کہ جس پر انسان اتنا فخر و مباہات کرتا ہے اور اس کے حوالہ سے اپنے آپ کو فاعل مختار سمجھتا ہے اس میں بھی وہ ہر لحاظ سے مستقل اور خدا سے بے نیاز نہیں بلکہ وہ دونوں کا محتاج ہے، خدا کا بھی اور طبیعی اسباب کا بھی اور وہ دونوں یعنی انسان اور طبیعی اسباب خدا کے محتاج ہیں، بنابرایں حقیقت میں ان دونوں کے درمیان خدا کا محتاج ہونے کے حوالہ سے کوئی فرق نہیں کیونکہ طبیعی اسباب اپنی مخصوص کیفیتوں اور تجزیہ و ترکیب کے ذریعے کسی چیز کو خاص شکل و صورت عطا کرتے ہیں مثلاً پتھر وغیرہ، اسی طرح انسان بھی طبیعی مواد میں اپنی کار آرائیوں کے ذریعے کوئی چیز بناتا ... اور ایجاد کرتا ... ہے مثلاً کشتی وغیرہ، جبکہ یہ سب اپنے تمام افعال و حرکات اور ایجادات و تخلیقات میں خدا کے محتاج ہیں نہ انہیں اپنی ذات میں کوئی استقلال حاصل ہے اور نہ اپنے افعال میں!

لہٰذا کشتی بھی دیگر طبیعی موجودات و مادی مخلوقات کی طرح اپنے اصل وجود اور تدبیر امر و نظم و نظام میں خالق کائنات کی محتاج ہے اور اس حوالہ سے اس میں اور دوسری چیزوں میں ذرہ بھر فرق نہیں پایا جاتا، جیسا کہ درج ذیل آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

سورہ صافات، آیت ۹۶:

○ "وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ"

(خدا نے تمہیں اور جو کام تم انجام دیتے ہو اسے خلق فرمایا ہے)

دراصل یہ بیان حضرت ابراہیمؑ کا ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے ان بتوں کی بابت کیا جنہیں ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر اپنے معبود قرار دیا ہوا تھا اور یہ بات واضح ہے کہ بت بھی کشتی کی طرح انسان ہی کی ایجاد ہے (تو جس طرح انسان اپنے وجود میں خدا کا محتاج ہے اسی طرح کشتی بھی اپنے وجود میں خدا کی محتاج ہے) ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورہ رحمان، آیت ۲۴:

○ "وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئَتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ"

(اوراسی کے لئے ہیں وہ رواں دواں کشتیاں جو دریا میں پہاڑ کی طرح کھڑی دکھائی دیتی ہیں)

اس آیت میں خداوند عالم نے کشتیوں کو اپنی ملکیت شمار کیا ہے، ایک اور آیت میں ان کی تدبیر امر اور نظم ونظام کو بھی اپنی طرف منسوب کیا ہے، ملاحظہ ہو:

سورہ ابراہیم ۳۲:

○ "وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ"

(اوراس نے کشتی کو تمہارے لئے مسخر کردیا تاکہ وہ اس کے حکم واذن سے دریا میں رواں دواں رہے۔)

انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کی خدا کی طرف نسبت کا مسئلہ

اب تک جو مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں ان سے اجمالی طور پر اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کو صرف انسان کا کارنامۂ تخلیق سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان اشیاء اور خداوند عالم کے درمیان کسی طرح سے کوئی ربط وتعلق نہیں پایا جاتا بلکہ یہ سب انسان کے اپنے ارادہ واختیار سے وجود میں آتی ہیں وہ نہایت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان کی نگاہ بصیرت پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ حضرات......یعنی مادہ کو سرچشمۂ وجود سمجھنے والے، خدا کے منکرین......کا گمان ہے کہ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے والوں کی دلیل صرف یہ ہے کہ انہوں نے عالم طبیعت میں پائی جانے والی نت نئی چیزوں اور مخلوقات کو دیکھا تو ان کی مادی علتوں واسباب سے ناآگاہی وجہالت کی وجہ سے اس بات کے قائل ہو گئے کہ چونکہ علت ومعلول کا عام قانون پورے عالم ہستی پر حکم فرما ہے (کوئی چیز بغیر علت وسبب کے وجود میں نہیں آسکتی) لہٰذا ان موجودات عالم کی علل واسباب بھی ہیں کہ جن سے ہم ناآگاہ ہیں ان کے اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودات عالم کی علل واسباب کے نامعلوم ہونے کی وجہ سے وہ لوگ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ان تمام موجودات کی ایک ہی علت ہے جس کی حقیقت معلوم نہیں اور وہ عالم ماوراء الطبیعت میں ہے کہ جسے "خدا" کہا جاتا ہے، بنابرایں خدا کے وجود کا عقیدہ درحقیقت ایک مفروضہ اور خیالی نظریہ ہے جو کہ اس دنیا میں آنے والے سب سے پہلے افراد بشر......ابتدائی زمانہ کے انسانوں......کی مادی موجودات کے اسباب سے ناآگاہی کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے مثلاً وہ لوگ عالم فضا میں ہونے والے واقعات اور روئے زمین پر نامعلوم اسباب سے وجود میں آنے والی متعدد اشیائ، اسی طرح روحانی خصوصیات وآثار کہ جن کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل ابھی تک جدید علوم کے ذریعے بھی معلوم نہیں ہو سکے ان سب سے ناآگاہ تھے اس لئے ایک غیبی طاقت کے وجود کو تسلیم کرلیا جبکہ موجودہ دور کی علمی وسائنسی ترقی نے عالم طبیعت کی تمام مادی موجودات کی بابت ان

کے وجود میں آنے کی علتوں واسباب سے ناآگاہی کا مسئلہ حل کر دیا ہے اور ان کو ڈھونڈ پایا ہے لہٰذا مذکورہ فرضی نظریہ کی ایک بنیاد کی بیخ کنی ہوگئی کہ جس میں کہا گیا تھا کہ "چونکہ عالم طبیعت کی مادی موجودات کی علتیں نامعلوم ہیں اس لئے اس کے سوا کوئی چارہء کار باقی نہیں کہ انہیں عالم ماوراء الطبیعت سے منسوب کریں" اب رہی اس کی دوسری بنیاد اور وہ یہ کہ روحانی موجودات و واقعات کی علتیں بھی روحانی اور غیر مادی ہونی چاہیں تو اس کی بابت اگر چہ ابھی تک ہماری علمی وسائنسی ترقی نے حقیقت حال کو واضح نہیں کیا لیکن کیمیاوی مواد کے بارے میں جدید وسیع تحقیق کی روشنی میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ مسئلہ بھی بہت جلد حل ہو جائے گا اور انسان روحانی علتوں سے آگاہ ہی نہیں بلکہ حیاتی جرثومے بھی تخلیق کر لے گا جس سے ہر جاندار چیز کو وجود میں لانا اور روح سے تعلق رکھنے والی تمام خصوصیات کا ایجاد کرنا آسان ہو جائے گا ، بنابرایں مذکورہ فرضیہ کی کوئی بنیاد ہی باقی نہیں رہی اور مستقبل میں انسان اس بات پر قادر ہو جائے گا کہ عالم طبیعت میں جس جاندار کو بھی چاہے گا اسے اسی طرح خلق کر سکے گا جس طرح اب بے جان چیزیں تخلیق کرتا ہے اور اب اسے پہلے کی طرح کائنات کے وجود اور موجودات عالم کی نسبت کسی ماوراء الطبیعت چیز کی طرف دینے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ اب وہ ان اشیاء کی مادی علتوں واسباب سے آگاہ ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں اس کا جہل و ناآگاہی ختم ہو چکی ہے، یہ ہے ان حضرات کے بیان کا خلاصہ جو خدا کے وجود کے منکر ہیں اور عالم ہستی کی موجودات کو مادی علتوں کی پیداوار سمجھتے ہیں۔

لیکن اگر یہ ناتواں و ناداں غفلت وغرور کے نشہ سے کچھ افاقہ پائیں تو اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں گے کہ خدا کے وجود۔ موجودات عالم کے خالق وآفریدگار...... کے قائل حضرات ابتدائے زمانہ ہی سے (جب سے وہ خدا کے وجود کے قائل ہوئے ہیں) اگر چہ اس کی ابتداء کسی کو معلوم نہیں...... عالم ہستی کی تمام موجودات کی بابت اس کے وجود کے قائل ہیں اور اسے کائنات کے وجود کی علت سمجھتے ہیں خواہ ان (موجودات عالم) کی مادی علتیں معلوم و واضح ہوں یا مجہول ہوں، وہ سب کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ پورے کا پورا عالم اپنے وجود میں ایک ایسی علت کا محتاج ہے جو اس مادی عالم سے باہر ہو (ماوراء الطبیعت) نہ یہ کہ وہ صرف انہی موجودات کے بارے میں ایک ماورائے طبیعت چیز کو...... کہ جس کی حقیقت معلوم نہیں...... ان کی علت سمجھتے ہوں اور صرف اپنے جہل و ناآگاہی کی وجہ سے ایک نامعلوم حقیقت کو تسلیم کر بیٹھے ہوں ایسا ہرگز نہیں کیونکہ جب وہ پورے عالم کے وجود اور اس میں موجود تمام چیزوں کی علت و موجد کے طور پر ماورائے عالم مادی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو اس عالم میں وہ موجودات بھی ہیں جن کی علت (مادی سبب) معلوم ہے اور وہ بھی ہیں کہ جن کی علت و مادی سبب مجہول و نامعلوم ہے، البتہ اگر وہ صرف انہی موجوات کے موجد کو ماورائے طبیعت میں تسلیم کرتے کہ جن کی مادی علتیں مجہول و نامعلوم ہیں تو اس صورت میں منکرین خدا کا اعتراض درست ہوتا جبکہ حقیقت حال اس طرح نہیں۔ بنابرایں یہ واضح ہوا کہ جس چیز کا اثبات خدا پرست حضرات کرتے ہیں وہ کچھ اور ہے اور جس کی نفی یہ منکرین خدا کرتے ہیں وہ کچھ اور ہے۔

بہر حال خدا کے وجود کا اثبات کرنے والے حضرت...... اگر چہ تاریخ بشریت ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ وہ

لوگ کب سے انسانی معاشرہ میں ظہور پذیر ہوئے ہیں...... یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ پورے عالم ہستی کا ایک یا کئی خالق و آفریدگار ہیں (اگر چہ قرآن مجید سے توحید و یکتا پرستی کے دین کا بت پرستی اور ایک سے زیادہ خداؤں جیسے باطل ادیان و نظریات سے مقدم و پہلے ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ بات سنسکرت زبان کے رموز کے ماہر ''میکس مولر''۔۔جرمن مورخ۔۔ نے بھی تسلیم کی ہے) اور وہ باوجود اس کے کہ بعض مادی موجودات کی مادی علتوں سے پورے طور پر آگاہ تھے بلکہ ان علتوں کا مشاہدہ کرتے تھے لیکن پورے عالم ہستی کی موجودات کے لئے مجموعی طور پر ایک خالق وموجد کہ جو ماورائے طبیعت ہے کے وجود کو بھی تسلیم کرتے تھے کیونکہ وہ علت و معلول کے عام قانون کے حوالہ سے ہر ''موجود'' کو کسی موجد کی تخلیق سمجھتے تھے اور اسی عام قانون و نظام علت و معلول کہ جس پر پورے عالم ہستی کا دارومدار ہے کی بنیاد پر خدا کو ماورائے طبیعت تسلیم کرتے ہوئے اسے موجودات ہستی کا موجد سمجھتے تھے لہٰذا ایسا نہیں تھا کہ وہ ان موجودات کی وجہ سے خدا کے قائل ہوئے ہوں جن کی مادی علتیں انہیں معلوم نہ تھیں اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہوں کہ بعض موجودات تو اپنے وجود میں خالق و آفریدگار کی محتاج نہیں وہ موجودات کہ جن کی مادی علتیں انہیں معلوم ہوئیں) اور بعض موجودات اس کی احتیاج رکھتی ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے خدا کے وجود...... ماورائے طبیعت...... کو تسلیم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ یقینی طور پر اس امر سے آگاہ تھے کہ یہ عالم جو کہ مادی علتوں اور معلولات سے بھرا ہوا ہے بلکہ انہی کا مجموعہ مرکب ہے، نہ مجموعی طور پر اور نہ اپنے تئیں کسی بھی حوالہ سے ایک ایسی علت و سبب سے بے نیاز نہیں جو تمام علل و اسباب سے مافوق ہے اور موجودات عالم کا نظام حیات و بقا اسی سے وابستہ ہے ،کوئی چیز اس کے دائرہ تخلیق سے باہر نہیں، وہی سب کا خالق و آفریدگار ہے۔ بنابرایں اس طرح کی ماورائے طبیعت علت کہ جو تمام علتوں سے مافوق ہو، کو تسلیم کرنے سے اس قانون علت و معلول کی نفی نہیں ہوتی جو اجزائے عالم میں جاری و نافذ اور حکم فرما ہے اور تمام موجودات ہستی اس کے تابع ہیں اور نہ ہی مادی موجودات کی مادی علتوں کے وجود کو تسلیم کرنا ان موجوات کو مجموعی طور پر کسی مافوق الطبیعت علت سے وابستہ ہونے سے بے نیاز سمجھنے کی دلیل ہے وہ علت کہ جو اس عالم مادی سے ماوراء ہے، البتہ ماوراء اور ''مادی علتوں کے دائرہ سے باہر'' ہونے سے مراد یہ نہیں کہ اس نے سب سے پہلی مادی علت کو پیدا کر دیا اور دیگر موجودات اس پہلی علت کے ذریعہ (ایک دوسرے کی علت بن کر) وجود میں آئیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ علل و اسباب کے پورے نظام پر حاوی اور ہر جہت و لحاظ سے ان پر قدرت و اختیار رکھتا ہے کوئی علت اس کے دائرہ اختیار و اقتدار سے باہر نہیں وہ سب میں ''موثر'' ہے۔

منکرین خدا کے بیانات میں ایک عجیب تضاد بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف تو وہ عالم مادی کی تمام موجودات و حوادث...... کہ جن میں انسانی افعال بھی شامل ہیں...... کے بارے میں...... ''جبر مطلق کے قائل ہیں یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر کام یا چیز اپنی علت کے ساتھ بالجبر وجود میں آتی ہے، اور دوسری طرف انسان کے افعال کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے تمام افعال خود اس سے مربوط ہیں لہٰذا اگر وہ کسی انسان کی تخلیق پر قادر ہو اور اپنے جیسا ایک انسان خلق کر لے تو وہ اس کی مخلوق کہلائے گا نہ کہ عالم مادی کی علت اولیہ کی مخلوق، ...... بشرطیکہ عالم مادی کے وجود کو سب سے پہلی علت

کا کارنامۂ تخلیق تسلیم کریں......، یہ واضح تضاد ہے، کیونکہ اگر پہلی بات درست تسلیم کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ انسان کہ جسے انسان نے خلق کیا ہے انسان کی مخلوق نہ کہلائے اور اگر دوسری بات تسلیم کی جائے تو ''جبر'' کے اس نظریہ کی نفی ہوتی ہے جسے وہ خود تسلیم کرتے ہیں۔

بہرحال خدا کے وجود کو تسلیم کرنے والوں کے عقیدہ کی وضاحت میں جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کی باریکیوں کو سمجھنا اگرچہ سادہ لوح افراد اور عوام الناس کی قوت فکر سے بالاتر ہے لیکن اس کی اصل حقیقت اجمالی طور پر ہر شخص کے ذہن و فکر میں موجود ہے یعنی سب یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ وسیع کائنات کہ جس میں بے شمار علتیں اور معلولات موجود ہیں ایک معبود و خالق کا شاہکار تخلیق ہے، یہ ایک بات!

دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان فلاسفہ علت و معلول کے عام قانون و نظام کو تسلیم و ثابت کرنے کے باوجود ہزاروں سال پہلے سے اب تک تمام ممکن الوجود علتوں کے ایک واجب الوجود علت سے مربوط و وابستہ ہونے کی بابت جو عقلی دلائل پیش کرتے چلے آ رہے ہیں (اور کسی فلاسفر نے اس میں اختلافات رائے ظاہر نہیں کیا کہ عالم طبیعت کی موجودات اپنی ممکن الوجود مادی علتوں کے ساتھ واجب الوجود علت سے وابستہ اور اس کا شاہکار تخلیق ہیں) ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ نظریہ عالم ہستی کی موجودات کی مادی علتوں سے ناآگاہی کے سبب وجود میں نہیں آیا اور نہ ہی وہ بعض مادی امور کی مادی علتوں سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے ایک مافوق المادۃ اور ماورائے طبیعت علت (خدا) کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ جو اس عالم طبیعت پر حکم فرما ہے اس حقیقت کے قائل ہوئے کہ تمام مادی موجودات اپنی تمام مادی علتوں کے باوجود اور تمام مادی علتیں اپنے تمام مادی معلولات کے ساتھ ایک واجب الوجود علت کا شاہکار تخلیق اور اس سے وابستہ ہیں جو اس مادی دنیا سے ماوراء و مافوق ہے،

تیسری بات یہ کہ قرآن مجید کہ جس میں توحید اور خدا کی یکتائی کا اثبات کیا گیا ہے اور متعدد آیات کریمہ میں خدا کے ''ایک'' ہونے کا تذکرہ ہوا ہے اس میں بھی موجودات عالم طبیعت میں علت و معلول کے عام قانون و نظام کے جاری و نافذ العمل ہونے کی تصدیق کے ساتھ ساتھ ہر چیز کے وجود میں آنے کو اس کی مخصوص علت کا عملی نتیجہ قرار دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں عقلی فیصلوں کو بھی صحیح تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ اس کتاب الٰہی میں کئی مقامات پر مادی و طبیعی امور و موجودات کو ان کی مادی و طبیعی علتوں سے مربوط و مستند قرار دے کر ذکر کیا گیا اور انسان کے اختیاری افعال (وہ کام جو وہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ انجام دیتا ہے) کی نسبت خود اسی کی طرف دی گئی ہے، پھر ان سب کی نسبت ۔۔کسی استثناء کے بغیر۔۔خداوند عالم کی طرف دی گئی ہے۔ مثلاً:

سورہ زمر، آیت ۶۲:

○ ''اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ۔۔۔''

(خدا ہر چیز کا خالق ہے)

کا کارنامۂ تخلیق تسلیم کریں ..... ، یہ واضح تضاد ہے، کیونکہ اگر پہلی بات درست تسلیم کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ انسان کہ جسے انسان نے خلق کیا ہے انسان کی مخلوق نہ کہلائے اور اگر دوسری بات تسلیم کی جائے تو ''جبر'' کے اس نظریہ کی نفی ہوتی ہے جسے وہ خود تسلیم کرتے ہیں۔

بہر حال خدا کے وجود کو تسلیم کرنے والوں کے عقیدہ کی وضاحت میں جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کی باریکیوں کو سمجھنا اگرچہ سادہ لوح افراد اور عوام الناس کی قوت فکر سے بالاتر ہے لیکن اس کی اصل حقیقت اجمالی طور پر ہر شخص کے ذہن و فکر میں موجود ہے یعنی سب یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ وسیع کائنات کہ جس میں بے شمار علتیں اور معلولات موجود ہیں ایک معبود و خالق کا شاہکار تخلیق ہے، یہ ایک بات!

دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان فلاسفہ علت و معلول کے عام قانون و نظام کو تسلیم و ثابت کرنے کے باوجود ہزاروں سال پہلے سے اب تک تمام ممکن الوجود علتوں کے ایک واجب الوجود علت سے مربوط و وابستہ ہونے کی بابت جو عقلی دلائل پیش کرتے چلے آرہے ہیں (اور کسی فلاسفر نے اس میں اختلافات رائے ظاہر نہیں کیا کہ عالم طبیعت کی موجودات اپنی ممکن الوجود مادی علتوں کے ساتھ واجب الوجود علت سے وابستہ اور اس کا شاہکار تخلیق ہیں) ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ نظریہ عالم ہستی کی موجودات کی مادی علتوں سے ناآگاہی کے سبب وجود میں نہیں آیا اور نہ ہی وہ بعض مادی امور کی مادی علتوں سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے ایک مافوق المادۃ اور ماورائے طبیعت علت (خدا) کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ جو اس عالم طبیعت پر حکم فرما ہے اس حقیقت کے قائل ہوئے کہ تمام مادی موجودات اپنی تمام مادی علتوں کے باوجود اور تمام مادی علتیں اپنے تمام مادی معلولات کے ساتھ ایک واجب الوجود علت کا شاہکار تخلیق اور اس سے وابستہ ہیں جو اس مادی دنیا سے ماوراء و مافوق ہے،

تیسری بات یہ کہ قرآن مجید کہ جس میں توحید اور خدا کی یکتائی کا اثبات کیا گیا ہے اور متعدد آیات کریمہ میں خدا کے ''ایک'' ہونے کا تذکرہ ہوا ہے اس میں بھی موجودات عالم طبیعت میں علت و معلول کے عام قانون و نظام کے جاری و نافذ العمل ہونے کی تصدیق کے ساتھ ساتھ ہر چیز کے وجود میں آنے کو اس کی مخصوص علت کا عملی نتیجہ قرار دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں عقلی فیصلوں کو بھی صحیح تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ اس کتاب الٰہی میں کئی مقامات پر مادی و طبیعی امور و موجودات کو ان کی مادی و طبیعی علتوں سے مربوط و مستند قرار دے کر ذکر کیا گیا اور انسان کے اختیاری افعال (وہ کام جو وہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ انجام دیتا ہے) کی نسبت خود اسی کی طرف دی گئی ہے، پھر ان سب کی نسبت۔۔کسی استثناء کے بغیر۔۔خداوند عالم کی طرف دی گئی ہے۔ مثلاً:

سورہ زمر، آیت ۶۲:

○ ''اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۔۔۔۔''

(خدا ہر چیز کا خالق ہے)

سورہ مومن، آیت ۶۲:

○ "ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ"،

(یہ اللہ تمہارا پروردگار، ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں)

سورہ اعراف، آیت ۵۴:

○ "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ"......،

(جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اسی کا ہے)

بنا برایں جس پر بھی لفظ "شئی" (چیز) کا اطلاق درست ہو وہ خدا کی مخلوق اور اسی سے منسوب ہے البتہ ایسی نسبت سے کہ جو ذاتِ کردگار کے شایانِ شان اور اس کے تقدس و کمال کی آئینہ دار ہو۔

یہ ہیں وہ آیات جن میں تمام موجودات عالم کی خلقت و آفرینش کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے، اس کے علاوہ کچھ آیات ایسی بھی ہیں جن میں دونوں نسبتوں کو ذکر کیا گیا ہے یعنی افعال کی نسبت ان کے فاعل (انجام دینے والوں) اور خداوند عالم دونوں کی طرف یکجا کر دی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورہ صافات، آیت ۹۶:

○ "اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ"......،

(خدا نے تمہیں اور جو تم عمل کرتے ہو اسے پیدا کیا)

سورہ انفال، آیت ۱۷:

○ "وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى"......،

(اور جب تو نے تیر...... یا پتھر...... پھینکا تو وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا)

اس آیت میں خداوند عالم نے لوگوں کے اعمال و افعال کی نسبت خود ان کی طرف دی اور پھر ان کی اپنی تخلیق اور ان کے اعمال کی نسبت کی نفی کر کے اپنی طرف اس کی نسبت دی۔

ذیل میں اسی باب سے چند دیگر آیات بھی ذکر کی جاتی ہیں جن میں دونوں نسبتوں کو عمومی طور پر یکجا کر کے ذکر کیا گیا ہے:

سورہ فرقان، آیت ۲:

○ "وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا"......،

(اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کے لئے اندازے و حدود (اصول و ضوابط) مقرر کر دیئے)

سورہ قمر، آیت ۵۳:

○ "اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ... وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ"......،

(ہم نے ہر چیز کو اندازے کو ساتھ پیدا کیا......اور ہر چھوٹی، بڑی چیز لکھی جا چکی ہے۔۔)

سورہ طلاق، آیت ۳:

o "قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا "...،

(خدا نے ہر چیز کے لئے اندازہ (وحدود) مقرر کر دیئے۔۔)

سورہ حجر، آیت ۲۱:

o "وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ "--،

(جو کچھ بھی ہے، ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم کچھ نازل نہیں کرتے مگر معین اندازے کے ساتھ)

آن آیات مبارکہ میں "تقدیر" سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کی مادی علتوں اور زمان و مکان کے مخصوص حالات و قیود کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ امر ہر طرح کہ شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن مجید نے خدائے یکتا کے وجود کا اثبات عالم ہستی کی تمام موجودات میں پائے جانے والے علت و معلول کے وسیع و جامع نظام کے اثبات کے حوالہ سے اور پھر ان سب کی ایک ہی معبود و موجد اور خالق و آفریدگار کی طرف نسبت کے ذریعے کیا ہے کہ جس میں کسی بھی پہلو سے کوئی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی، نہ کہ اس طرح سے جیسے ان حضرات نے گمان کیا اور بعض چیزوں کی نسبت تو خدا کی طرف اور بعض کی نسبت ان کی معلوم مادی علتوں و اسباب کی طرف دی۔ بہر حال ان حضرات کے راہ حقیقت سے بھٹک جانے اور خدا کی بابت غلط نظریہ و اعتقاد قائم کرنے کا اصل سبب وہی کمزور بحثیں اور مسئلہ توحید جیسے اہم ترین موضوعات میں عامیانہ استدلالات ہیں جو قرونِ وسطیٰ میں کلیساؤں کے توسط سے عوام الناس میں پھیلائے گئے یا دیگر ادیان کے کم علم علماء و نادان دانشوروں کے وہ نہایت بے جان دلائل ہیں جو انہوں نے دینی مسائل و موضوعات بالخصوص خدا کی بابت ذکر کئے جو کہ تحریف شدہ مسائل اور مسخ شدہ مطالب پر مشتمل ہیں لہٰذا ان حضرات نے جب اپنے صحیح و برحق مدعا یعنی توحید کہ جس کی حقانیت عقلی طور پر ان کے نزدیک اجمالاً ثابت ہو چکی تھی کو تفصیلی اور واضح دلائل کے ساتھ بیان کرنا چاہا تو اپنی کم علمی کی وجہ سے بھٹک گئے اور راہ سے بے راہ چل پڑے چنانچہ انہوں نے باطل نظریات اور غلط دلائل کو شامل بحث کر کے ہر موجود و معلول کہ جس کے وجود میں آنے کی علت معلوم نہ تھی اسے بلا واسطہ خدا کی طرف منسوب کر دیا اور اختیاری افعال کی بابت ان کے وجود میں آنے کی علتوں و اسباب کی نفی کر دی، یا پھر یہ کہہ دیا کہ انسان اپنے اختیاری افعال انجام دینے میں خدا کی احتیاج ہی نہیں رکھتا بلکہ اس حوالہ سے مکمل استقلال رکھتا ہے، بہر حال اس سلسلے میں ہم آیت ۲۶ (سورۂ بقرہ) "وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ" کی تفسیر میں کچھ مطالب ذکر کر چکے ہیں اور کچھ مطالب یہاں ذکر کرتے ہیں۔

بعض محدثین اور ظاہر پرست مسلمان متکلمین و دانشوروں اور غیر مسلم علماء نے انسان کے اختیاری افعال کی خدا کی طرف نسبت جو اس کے مقام ربوبیت کے شایان شان ہے کے حقیقی معنی کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ

انسان اپنے افعال میں ہر لحاظ سے خود مختار ہے اور خدا کا ان سے ہرگز کوئی تعلق و ربط نہیں بالخصوص وہ چیزیں کہ جن میں خدا کی معصیت کا پہلو موجود ہے مثلاً شراب اور لہو وقمار بازی (جوئے) کے آلات وغیرہ جبکہ خداوند عالم نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ ''اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ'' (شراب، جوا، بت اور قرعہ کے تیر یہ سب نجس شیطانی کام ہیں ان سے دور رہو)۔۔سورہ مائدہ، آیت ۹۰۔۔اس آیت میں خداوند عالم نے مذکورہ کاموں کو شیطان کے کام کہا ہے تو انہیں اللہ کی طرف کیونکر منسوب کیا جاسکتا ہے؟

اس سلسلہ میں ہم اپنے سابقہ بیانات میں اس باطل نظریہ و بے بنیاد عقیدہ کی نفی عقل اور آیات و روایات کے حوالہ سے کر چکے ہیں، بنابریں جس طرح سے انسان کے اختیاری افعال ایک لحاظ سے خدا کی طرف نسبت رکھتے ہیں (ایسی نسبت جو ذات احدیت کے شایان شان ہے) اسی طرح ان افعال سے حاصل ہونے والے نتائج اور وہ چیزیں جو انسان بناتا ہے (اس کی مصنوعات) اور ان کے ذریعے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرتا ہے وہ بھی خدا کی طرف خاص نسبت رکھتی ہیں۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا آیت (مائدہ ۹۰) میں ''انصاب'' کے لفظ سے مراد وہی بت اور تصاویر ہیں جنہیں مشرکین اپنے تئیں خدا و معبود قرار دے کر ان کی عبادت کرتے تھے انہی کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ یہ سب اس کی مخلوق ہیں ''وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ'' (خدا نے تمہیں اور جو تم انجام دیتے ہو اسے خلق کیا ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان اشیاء و مخلوقات میں نسبت کے حوالہ سے کئی پہلو پائے جاتے ہیں اور گوناگوں حیثیتوں کی نسبتیں موجود ہیں جن میں سے بعض نسبتیں خداوند عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اور وہ عبارت ہیں ان چیزوں کے اصل وجود اور ذات سے، یعنی ان کا وجود اور اصل ذات خدا کا شاہکار تخلیق ہے لیکن ان میں پائی جانے والی دیگر نسبتیں مثلاً معصیت و گناہ کا پہلو تو یہ الگ موضوع ہے جس کا اس کے اصل وجود و ذات کی تخلیق سے کوئی تعلق نہیں، مثال کے طور پر بت اپنی اصل حقیقت و ذات کے لحاظ سے ایک پتھر یا مخصوص دھات ہے جسے خاص شکل و صورت میں ڈھال دیا جاتا ہے اور اس کی اصل ذات کے حوالہ سے خدا کی طرف اس کی نسبت دینے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی لیکن اس کے بت اور معبود ہونے کے حوالہ سے اسے ہرگز خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا بلکہ ضروری ہے کہ اس حوالہ سے اس کی خدا کی طرف نسبت اور اسے خدا کا شاہکار تخلیق قرار دینے کی نفی کی جائے اور اسے شیطان یا کسی انسان کا عمل قرار دیا جائے یہی حال دیگر اشیاء و موجودات کی نسبتوں کا ہے کہ ان کے اصل مواد اور ذات و حقیقت کی تخلیق کی نسبت خدا کی طرف اور اس سے مختلف شکلوں اور صورتوں میں بنائی جانے والی چیزوں کے حوالہ سے ان کی نسبت غیر خدا کی طرف دی جاسکتی ہے۔

بہرحال ان تمام مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ مصنوعات کی نسبت ..... ان کے اصل وجود و ذات کی تخلیق کے حوالہ سے عالم طبیعت کی موجودات و مخلوقات کی مانند کارخانہ خلقت کی طرف ہے اور اس حوالہ سے ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا تاہم اس نسبت میں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیے کہ ان سب کو خدا کی طرف منسوب کرنے میں صرف ان کے وجود و ہستی کو ملحوظ رکھا جائے۔

پانی سے زمین اور زمینی مخلوق کی زندگی کا ذکر

○ ''وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ''

(اور اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا پھر اس سے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کا چوپایہ پھیلا دیا)

اس جملہ میں خداوند عالم کے وجود کی دیگر آیات ونشانیوں کو ذکر کیا گیا ہے، سب سے پہلے پانی! دریا کا پانی مختلف عناصر کے مجموعہ سے تشکیل پاتا ہے اور سورج کی گرمی کی وجہ سے گرم بخارات کی صورت میں بلند ہو کر فضا کی وسعتوں میں پھیل جاتا ہے یہاں تک کہ ہوا کے ٹھنڈے حصہ تک پہنچتا ہے اور وہاں سے بارش کے قطروں یا منجمد ہو کر برف اور اولوں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر اپنے بھاری پن کی وجہ سے زمین پر گرتا ہے اور خشک وپیاسی زمین اسے پی کر حیات نو پاتی ہے اور کچھ مقدار ذخیرہ کر لیتی ہے جس سے مختلف خطوں اور علاقوں میں چشمے پھوٹتے ہیں کہ جن سے گونا گوں جاندار ونباتات وغیرہ سامان حیات پاتے ہیں، بنا برایں آسمان سے گرنے والا پانی ایک ایسے مضبوط ومستحکم اور منظم ومرتب نظام کا حامل ہے کہ جس میں نہ کوئی استثنائی صورت پائی جاتی ہے اور نہ ہی اس کے سلسلۂ تاثیر میں کوئی خلل پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے ٹھوس نظم وترتیب کے ساتھ قائم ہے اور ہر طرح کی نباتات وحیوانات کے نشوونما پانے کا سرچشمہ ہے اور چونکہ وہ پورے عالم ہستی کی دیگر موجودات سے بنیادی ربط وتعلق کے حوالہ سے کائنات کا ایک حصہ ہے لہٰذا پوری کائنات اس کے سمیت ایک مجموعہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو اپنے وجود میں ایک موجد وخالق کی محتاج ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ایک ہی معبود ہے اور چونکہ انسان کا وجود اور بقاء اسی سے وابستہ ہے لہٰذا یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس پورے عالم ہستی کا معبود وخالق وہی خدائے یکتا ہے جو انسان کا خالق ومعبود ہے۔

ہواؤں کا ادھر ادھر جانا

○ ''وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ''

''تصریف الریاح'' سے مراد مختلف طبیعی عوامل کے ذریعے ہواؤں کا ایک جانب سے دوسری جانب جانا ہے، عام طور پر ہواؤں کے چلنے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ سورج کی شعائیں ہوا پر پڑتی ہیں جس سے اس میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے لطیف اور ہلکا وخفیف بنا دیتی ہے کیونکہ حرارت ہی ہلکے پن اور لطافت کا سب سے بڑا عامل وسبب ہے، لہٰذا وہ اپنے اوپر کی اور آس پاس کی ثقیل ٹھنڈی ہواؤں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی جس کے نتیجہ میں وہ بکھر جاتی ہے اور اس کی جگہ بھاری ٹھنڈی ہوائیں آ جاتی ہیں جو اسے مخالف سمت میں دھکیل دیتی ہیں اور وہ لطیف وخفیف ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک جانب

سے دوسری جانب...... منتقل ہو جاتی ہے۔اسے ہی ''تصریف الریاح'' ہواؤں کا چلنا اور ادھر ادھر جانا کہتے ہیں اسی سے گونا گوں فوائد حاصل ہوتے ہیں مثلاً نباتات کی تخم ریزی وزرخیزی، گھاس پھوس اور درختوں کا پھلنا پھولنا، فضائی آلودگی کا دور ہونا، گندے بخارات اور دھوئیں وغیرہ کا دور ہونا، بارش برسانے والے بادلوں کو ادھر ادھر لے جانا وغیرہ، بنابرایں ہواؤں کا چلنا...... ایک جانب سے دوسری جانب جانا...... نباتات' حیوانات اور انسانوں کی زندگیوں کی بقاء کے طبیعی عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل اور بنیادی سبب ہے اسی سے ان موجودات کی حیات وابستہ ہے

ہوا کا منظم ومرتب طریقہ سے چلنا بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کے وجود کا ثبوت ہے اور جب اسے دیگر موجودات عالم کے ساتھ مجموعی طور پر دیکھیں تو یہ پورا عالم خدائے یکتا کے وجود کا ثبوت پیش کرتا ہے اور چونکہ ہواؤں کا چلنا انسان کے وجود اور بقاء کی بابت حیاتی عامل کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اور غیر انسان سب کا خالق وآفریدگار اور معبود برحق ایک ہی ہے۔

بادلوں کا مسخر کیا جانا

○ ''وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ''

(اور وہ بادل جسے آسمان وزمین کے درمیان مسخر کیا گیا ہے)

''سحاب'' یعنی بادل سے مراد وہ متراکم ومنجمد بخارات ہیں جن سے بارشیں ہوتی ہیں یہ بخارات جب تک زمین پر ہوں تو انہیں ''ضباب'' (کہر، دھند) کہتے ہیں اور جب زمین سے جدا ہو کر ہوا میں بلند ہوں تو انہیں ''سحاب'' ''غمام'' اور ''غیم'' کہا جاتا ہے یہ تینوں الفاظ ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

''تسخیر'' سے مراد کسی چیز کو مغلوب کرنا اور اپنے قابو میں کر لینا ہے یعنی اس کی ہر حرکت وعمل کو اپنے تابع کر لینا، زیر نظر جملہ میں بادل کی تسخیر سے مراد یہ ہے کہ اس کا چلنا اور برودت وہوا کے ساتھ بارش برسانا وغیرہ خدا کے اذن کے ساتھ اس پر مسلط کر دیا گیا ہے، یہ بھی سابقہ ذکر کی گئی اشیاء کی طرح خدا کے وجود ووحدانیت کی ایک دلیل ہے۔

یاد رہے کہ زیر بحث آیت شریفہ میں جن چیزوں کو ذکر کیا گیا ہے یعنی رات اور دن کا آنا جانا، آسمان سے پانی کا گرنا...... بارش ہونا...... ہواؤں کا چلنا، مسخر کئے ہوئے بادل، یہ سب نظام تخلیق وآفرینش اور تمام زمینی موجودات ومخلوقات جن میں نباتات، حیوانات اور انسان شامل ہیں کے عام عوامل ہیں انہی کے ساتھ عالم طبیعت کا سلسلۂ حیات وابستہ ہے، درحقیقت یہ آیت سورۂ فصلت کی ایک آیت کے اجمالی بیان کی وضاحت وتفصیل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں کہا گیا ہے:

سورہء فصلت، آیت ۱۰:

O "وَ بٰرَكَ فِيۡهَا وَقَدَّرَ فِيۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا فِىۡۤ اَرۡبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيۡنَ۔" ......،

(اور اس نے اس (زمین) میں برکت دی اور اس میں اس کی غذاؤں کو چار دنوں میں مقدر کر دیا (اندازہ مقرر کر دیا) کہ جو سب طلب کرنے والوں کے لئے برابر ہے)

عقل وفہم کے حامل لوگ!

O "لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ"

(عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں)

"عَقل" عَقَلَ یَعقِلُ کا مصدر ہے (عَقَلَ: اس نے سمجھ لیا، (یعقل) وہ سمجھتا ہے) اس کا معنی کسی چیز کا ادراک اور اسے اچھی طرح سمجھنا ہے، اسی سے لفظ "عقل" بنا ہے یعنی وہ حقیقت کہ جس کے ذریعے انسان اچھائی وبرائی، حق و باطل اور سچ وجھوٹ کے درمیان تمیز کرتا ہے اور وہی نفس اور روح انسانی ہے جو فہم وادراک رکھتی ہے نہ یہ کہ وہ انسان کی دیگر قوتوں اور نفس کی فروع و "اجزء" مثلاً قوت حافظہ وقوتِ باصرہ وغیرہ کی طرح ایک بدنی وجسمانی قوت ہے۔

محبت کے درجات ومراتب

O "يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ"

(وہ ان سے محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں)

اس جملہ میں لفظ "يُحِبُّوۡنَهُمۡ" ذکر کیا گیا ہے اور ضمیر "ھم" جمع مذکر ذوی العقول کے لئے آتی ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں "ھم" کہ جس کا اشارہ "انداد" کی طرف ہے، سے مراد صرف بت نہیں بلکہ فرشتے اور انسان بھی اس میں شامل ہیں جنہیں خدا کے مقابلے میں معبود بنا لیا گیا بلکہ اس سے بالاتر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں وہ سب افراد شامل ہیں جن کی اطاعت وپیروی خدا کے اذن واجازت کے بغیر کی جاتی ہے جیسا کہ اس کے بعد والی آیت (۱۶۶) سے اس کا ثبوت ملتا ہے جس میں ارشاد فرمایا:

"اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِيۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا ......" (جب وہ لوگ برائت کریں گے جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی)

اسی طرح دیگر مقامات میں یوں ارشاد ہوا:

سورہء آل عمران، آیت ۶۴:

○ ''وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ''......،

(ہم میں سے بعض دوسرے بعض کو خدا کے علاوہ معبود و رب قرار نہ دیں ۔۔)

سورہء توبہ، آیت ۳۱:

○ ''اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ''......،

(انہوں (یہودیوں اور نصرانیوں) نے اپنے راہبوں کو خدا کے علاوہ معبود و رب بنالیا)،

محبت خدا

زیر بحث آیت مبارکہ میں محبت خدا کا تذکرہ ہوا ہے اور آیت کے الفاظ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی معنی میں محبت ہونا ممکن ہے کیونکہ ارشاد ہوا ''وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ '' (جو مومن ہیں وہ خدا سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں) لہٰذا جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ محبت چونکہ ایک نفسیانی کیفیت وشہوانی وصف وحالت کا نام ہے اس لئے وہ صرف جسم وجسمانیات سے مخصوص ہے اور خداوند چونکہ جسم وجسمانیات سے بالاتر ومنزہ ہے اس لئے اس سے ''محبت'' ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جہاں بھی خدا سے محبت کا تذکرہ ہوا ہے اس سے مراد اس کی اطاعت وفرمانبرداری ہے یعنی اس نے جس کام کا حکم دیا اسے انجام دینا اور جس کام سے اس نے روکا اس سے رک جانا ہی اس سے محبت کرنے سے عبارت ہے، گویا خدا کے حوالہ سے محبت حقیقی معنے میں نہیں بلکہ مجازی معنے میں ہوتی ہے جیسا کہ اس نے خود ارشاد فرمایا ہے:

سورہء آل عمران، آیت ۳۱:

''قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ '' ......،

(کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرے گا) ۔

ان کا یہ نظریہ درست نہیں بلکہ زیر بحث آیت ہی ان کے مدعا کی نفی کرتی ہے کیونکہ اس میں ''اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ '' کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ محبت خدا کے کئی درجے ہیں اور مومنین کی خدا سے ''محبت'' مشرکین کی خدا سے محبت سے کہیں زیادہ ہے، اگر ''محبت'' سے مراد ''اطاعت و پیروی'' ہو ..... جو کہ محبت کا مجازی معنی ہے ..... تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ''مومنین'' مشرکین سے زیادہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں'' گویا مشرکین کے لئے بھی ایک طرح کی اطاعت ثابت ہو جائے گی جو کہ ہرگز درست نہیں کیونکہ وہ تو خدا کی اطاعت کرتے ہی نہیں اور ان کی اطاعت خدا کے نزدیک اطاعت ہی قرار نہیں پاتی اس لئے اطاعت کا تقابل بیجا ہے اور اس طرح آیت میں لفظ ''اَشَدُّ حُبًّا'' جو کہ زیادہ محبت کے بیان پر مشتمل ہے بے معنی ہو جائے گا۔ بنا برایں یہ ثابت ہوا کہ یہاں محبت خدا سے مراد محبت کا حقیقی معنی ہے نہ کہ مجازی!، چنانچہ اس کا ثبوت ایک اور

آیت میں بھی ملتا ہے ملاحظہ ہو:

سورہ توبہ، آیت ۲۴:

ﮓ "قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ" ......

(کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ دادا تمہارے بیٹے و اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری ازواج، تمہارا قبیلہ و کنبہ، تمہارے اموال جو تم نے کمائے ہیں، تمہاری تجارت کہ جس میں گھاٹے کا تم اندیشہ رکھتے ہو اور تمہارے گھر کہ جنہیں تم بہت چاہتے ہو تمہیں خدا، رسول خدا اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ خدا کا حکم آ جائے، اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا، رسول خدا، باپ دادا، اولاد، بھائی، بیویاں، مال و دولت وغیرہ سب سے "محبت" ہو سکتی ہے اور وہ (محبت) ایک ہی سنخ و نوع رکھتی ہے ایسا نہیں کہ خدا سے محبت تو کسی اور معنے میں ہو (مجازی معنے میں) اور باپ دادا، اولاد وغیرہ سے محبت کسی دوسرے معنے میں ہو (حقیقی معنے میں!) کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو لفظ "احب" ذکر نہ کیا جاتا جو کہ تقابل میں اضافہ کے بیان کے لئے آتا ہے اور "افعل التفضیل" کا صیغہ اس کا متقاضی ہوتا ہے کہ مفضل (جسے برتری دی گئی ہو) "مفضل علیہ" (جس پر برتری دی گئی ہو) سے اصل معنی میں مشترک ہو اور دونوں میں فرق صرف اس صفت کے کم یا زیادہ ہونے کے حوالہ سے ہو، بنابر ایں اگر خدا سے محبت اور باپ دادا .... وغیرہ سے محبت اصل معنی اور نوع و سنخیت کے لحاظ سے مختلف ہوتی تو آیت میں لفظ "احب" افعل التفضیل کا صیغہ..... استعمال نہ کیا جاتا کیونکہ اس صورت میں تقابل درست نہ ہوتا بلکہ ہر ایک کا معنی مستقل ہوتا یعنی خدا سے محبت کا معنی اطاعت (جو کہ محبت کا مجازی معنی ہے) اور دوسروں سے محبت کا معنی نفسانی وصف (جو کہ محبت کا حقیقی معنی ہے) ہوتا کہ جن میں تقابل اور ایک کی دوسرے پر برتری کا مسئلہ ہی زیر بحث نہ آتا جبکہ آیت میں "احب" کے لفظ سے دونوں محبتوں کا حقیقی معنی میں استعمال ہونا ثابت ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے پہلے مشرکین کی مذمت کی اور وہ اس لیے کہ انہوں نے خدا کے علاوہ دیگر معبود بنا لئے اور ان سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرتے ہیں اور اس کے بعد مومنین کی تعریف کی کہ وہ مشرکین سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں، اس تقابلی تذکرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین کو اس لئے مورد مذمت قرار دیا گیا کہ انہوں نے محبت خدا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور دونوں کو مساوی و برابر حیثیت دی خدائے یکتا کو بھی اور اپنے باطل خداؤں کو بھی۔ تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مشرکین اپنے باطل خداؤں سے کم اور خدائے یکتا سے زیادہ محبت کرتے تو شاید خدا ان کی مذمت نہ کرتا لیکن ایسا ہرگز نہیں اور اس احتمال کی نفی آیات کے ذیلی جملوں سے ہوتی ہے جن میں یوں ارشاد ہوا: "إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا" (اور جب وہ عذاب کو دیکھیں

گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہر طرح کی طاقت خدا کے لئے مخصوص ہے) "اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ" (جن کی پیروی کی گئی وہ جب ان لوگوں سے اظہار برائت کریں گے جنہوں نے ان کی پیروی کی اور عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے......)، "كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ" (اسی طرح اللہ انہیں ان کے اعمال دکھائے گا جن پر وہ کف افسوس ملتے رہ جائیں گے) یہ سب جملے اس امر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ان کی مذمت صرف اس لئے نہیں ہوئی کہ انہوں نے غیر خدا سے محبت کی ہے بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ غیر اللہ کی محبت کے نتیجہ میں انہوں نے ان کی پیروی کی کیونکہ وہ گمان کرتے تھے کہ وہ (غیر اللہ) بھی ان کی مدد کر سکتے ہیں اور انہیں بھی حصول فوائد اور دفع ضرر کی قوت حاصل ہے اسی وجہ سے انہوں نے حق کی پیروی کو بالکل ہی چھوڑ دیا بعض امور میں اتباع حق کیا اور بعض میں نہ کیا، جبکہ یہ بات واضح ہے کہ جو شخص بعض فرامین پر تو عمل کرے اور بعض پر عمل نہ کرے وہ حقیقی پیروکار و فرمانبردار نہیں ہو سکتا، بنا بر ایں ثابت ہوا کہ مذکورہ احتمال (کہ اگر مشرک اپنے خداؤں کی نسبت خدائے یکتا سے زیادہ محبت کرتے تو شاید خدا ان کے مذمت نہ کرتا) درست نہیں اور حقیقت امر یہ ہے کہ حقیقی محبت تبھی کہلائے گی جب صرف خدا سے ہو اور اس میں کسی کو حصہ دار نہ بنایا جائے ورنہ شرک لازم آئے گا (شراکت کی محبت خدا کو ہرگز قبول نہیں) اور خدا سے خالص و حقیقی محبت کی شدت و زیادتی ہی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس کے ہر فرمان کا اتباع و پیروی کی جائے۔ اسی بنیاد پر خداوند عالم نے مومنین کی مدح و تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (کہ مومنین خدا سے زیادہ شدت کے ساتھ محبت کرتے ہیں)

محبت خدا کی بحث میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ تعریف اور مذمت کی وجہ محبت کا اثر و نتیجہ یعنی اطاعت و پیروی ہے لہٰذا ضمناً یہ ثابت ہوا کہ اگر غیر خدا سے محبت کا نتیجہ خدا کی اطاعت ہو کیونکہ اس (غیر خدا) کا کام ہی لوگوں کو خدا کی اطاعت اور اس کے فرامین......اور اوامر و نواہی ...... پر عمل کرنے کی دعوت دینا ہے تو اس صورت میں وہ محبت قابل مذمت نہیں بلکہ قابل مدح و تعریف ہوگی جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۲۴ میں ارشاد ہوا: "اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" (تمہیں اللہ اور اللہ کے رسول کی نسبت ان سے زیادہ محبت ہے) تو اس میں خدا نے اپنی اور اپنے پیغمبر گرامی قدر کی محبت کو ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت درحقیقت خدا سے محبت ہے اور وہ یوں کہ آنحضرتؐ سے محبت کا نتیجہ آپؐ کی اطاعت و پیروی ہے جو کہ خدا کی اطاعت ہی کا دوسرا نام ہے اسی لئے خداوند عالم نے آنحضرتؐ کی اطاعت و پیروی کا حکم دیا چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورۂ نساء آیت ۶۴:

"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ......"

(ہم نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر صرف اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے خدا کے حکم کے ساتھ)

اورارشاد فرمایا: ''قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ'' (کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرے گا) یہی بات ان سب کی بابت صادق آتی ہے جن کی پیروی کرنے سے خدا کی اطاعت ہوتی ہے اور جن کا کام ہی لوگوں کو خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کی دعوت دینا ہے جیسے کوئی عالم اپنے علم کے ذریعے خدا کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے یا کوئی آیت اپنے معنی ومفہوم کے ذریعے یا قرآن مجید اپنی تلاوت وقرائت کرنے کے ذریعے خدا کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے تو ان سب سے محبت کرنا درحقیقت خدا سے محبت کرنا ہے اور ان کی پیروی کرنا خدا کی اطاعت سے عبارت ہے کہ جس سے تقربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے۔

مذکورہ تمام مطالب وبیانات سے دو نتیجے حاصل ہوتے ہیں:

(۱) جو شخص غیر خدا سے اس بنیاد پر محبت کرے کہ وہ اس کے مسائل ومشکلات کو حل کرنے کی قدرت رکھتا ہے یا ان چیزوں میں اس کی اطاعت وپیروی کرے جن کا خداوند عالم نے اسے حکم نہیں دیا تو گویا اس نے خدا کے ساتھ شرک کیا اور خدا کے مقابلے میں دوسرے خدا بنا لئے لہٰذا خدا بہت جلد اس کے اعمال کا انجام اس پر ظاہر کردے گا کہ پھر وہ کف افسوس ملتا رہ جائے گا، لیکن مومنین وہ ہیں جو خدا کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتے، وہ اس کے سوا کسی کو توانا وقدرتمند وطاقتور سمجھتے ہیں کہ جو ان کے مسائل حل کرسکے اور نہ اس کے احکام وفرامین کے علاوہ کسی چیز یا شخص کی پیروی واتباع کرتے ہیں، کہ یہی ہے خلوص اور سچی محبت کا تقاضا، ایسے افراد خدائے یکتا کے خالص بندے ہیں۔

(۲) جن سے محبت درحقیقت خدا سے محبت اور جن کا اتباع بعینہ خدا کا اتباع وپیروی ہے مثلاً پیغمبر اکرمؐ، اہل بیت اطہارؑ، علماء الٰہی، کتاب خدا، سنت نبویؐ اور ہر وہ چیز جو خدا کی یاد تازہ کردے تو ان سب سے محبت دراصل خدا سے خالص محبت ہے اور ہرگز شرک نہیں کہ جس کی مذمت کی جائے، بنابرایں ان سب کا تقرب خدا کا تقرب اور ان کی تعظیم تقوائے الٰہی سے عبارت ہے جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا:

سورہ حج، آیت ۳۲:

''وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ...''

(جو شخص شعائر اللہ۔ اللہ کی نشانیوں ...کی تعظیم کرے تو اس کا یہ عمل دل کا تقویٰ ہے)

''شعائر اللہ'' ان علامات ونشانیوں کو کہتے ہیں جو خدا کے وجود کا ثبوت اور اس کی پہچان کا ذریعہ ہوں اور اس آیت میں ''شعائر'' کو کسی خاص چیز کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا جیسا کہ ایک اور آیت میں صفا ومروہ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جو خدا کے وجود کی نشانی وعلامت ہے اور اس کی یاد دلانے والی ہے اس کی تعظیم واحترام ہی دلوں کے تقویٰ کا عملی ثبوت ہے اس لئے قرآن مجید کی وہ تمام آیات جو تقوائے الٰہی اختیار کرنے کا حکم یا ترغیب دلاتی ہیں ان سب میں ان آیات وعلامات کی تعظیم شامل ہے۔

البتہ ہر صاحب عقل وشعور اس بات سے آگاہ ہے کہ ان شعائر وعلامات اور آیات ونشانیوں کو خدا کے مقابلہ

میں مستقل حیثیت کا حامل سمجھنا اور یہ عقیدہ ونظریہ رکھنا کہ وہ اپنے یا کسی اور کی بابت نفع ونقصان یا موت وحیات وغیرہ کا مستقل اختیار رکھتی ہیں درحقیقت انہیں شعائر وعلامات ہونے کی حیثیت سے نکال کر الوہیت کے دائرے میں لانے کے برابر ہے جو کہ خدا کے ساتھ شرک ہے، خدا ہمیں اس شرک سے محفوظ رکھے۔

طاقت کا محور ومرکز خدا کی ذات ہے

○ "وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوٓا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۙ وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ"

(اور جب ظلم کرنے والے لوگ عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمام طاقت وقدرت خدا کے پاس ہے اور خدا سخت عذاب کرنے والا ہے)

اس آیت میں بظاہر لفظ "اذ" فعل مضارع "یری" کا معفول ہے ("الَّذِينَ ظَلَمُوٓا" فعل یریٰ کا فاعل ہے) اور جملہ "أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا" عذاب کا بیان ہے اور حرف "لَوْ" تمنا اور آرزو کے لئے ہے۔ بنابرایں آیت کا معنی یہ ہے کہ "کاش وہ لوگ دنیا ہی میں جب خدا کے عذاب کو دیکھتے تو اس بات سے آگاہ ہو جاتے کہ ہر طرح کی قوت وقدرت خدا کے پاس ہے اور انہوں نے اپنے باطل خداؤں کو جس مقام ومرتبہ کا حامل سمجھا وہ غلط ونادرست ہے اور خدا کا عذاب بہت سخت ہے جو کہ انہیں اس غلط کام کی سزا کا مزا چکھا رہا ہے"۔ لہٰذا آیت میں "عذاب" سے مراد دو چیزیں ہیں: ایک یہ کہ وہ اپنی اس غلطی سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں گے کہ انہوں نے خدا کے علاوہ جنہیں معبود تسلیم کر کے انہیں سرچشمۂ قدرت وطاقت سمجھ رکھا تھا وہ درست نہ تھا، دوسری یہ کہ وہ اس غلطی کی سزا دیکھیں گے، چنانچہ ان مطالب کی تصدیق بعد والی دو آیتوں سے ہوتی ہے کہ جن میں یوں ارشاد ہوا: (۱) "إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ" (۱۶۶) یعنی جن کی پیروی کی گئی وہ ان سے اظہار برائت کریں گے جنہوں نے ان کی پیروی کی، کیونکہ وہ لوگ جو فوائد ان سے حاصل کرنا چاہتے تھے وہ انہیں حاصل نہیں ہوئے اور وہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ بھی کریں گے مگر اب کوئی سبب ووسیلہ ان کے پاس باقی نہ ہوگا جو انہیں خدا کے عذاب سے بچا سکے اس وقت خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہ ہو گی، (۲) "وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ" (۱۶۷) یعنی جن لوگوں نے پیروی کی وہ کہیں گے کہ اے کاش ہمیں دنیا میں واپس جانا ہوتا (دنیا میں واپس جانے کی آرزو کی گئی ہے) تو ہم بھی اپنے پیشواؤں وباطل خداؤں سے دنیا ہی میں اظہار برائت کرتے جس طرح انہوں نے آخرت میں ہم سے اظہار برائت کیا ہے، بہرحال اسی طرح خدا انہیں ان کے

اعمال یعنی غیر خدا سے محبت اور ان کی پیروی کا انجام دکھائے گا کہ جس پر وہ کف افسوس ملتے رہ جائیں گے اور وہ ظالم اپنے اعمال کے نتیجہ میں ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلتے رہیں گے جس سے کبھی باہر نہ آ سکیں گے۔

جہنم: ظالموں کا ابدی ٹھکانہ!

○ ''وَمَاهُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ''
(اور وہ جہنم سے کبھی باہر نہ آئیں گے)

یہ جملہ ان حضرات کے نظریہ وعقیدہ کی صریح نفی کرتا ہے جو کہتے ہیں کہ آخرت کا عذاب ہمیشہ باقی نہ رہے گا بلکہ ختم ہو جائے گا، اس جملہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین اور غیر خدا سے محبت اور ان کی اطاعت کرنے والے کبھی آتش جہنم سے نہیں نکل سکیں گے۔

روایات پر ایک نظر

جنگ جمل کے دن، درس توحید

کتاب خصال، توحید اور معانی الاخبار میں شریح بن ہانی سے منقول ہے:

(ان اعرابیاً قام یوم الجمل الیٰ امیر المومنین علیه السلام فقال یا امیر المومنین! اتقول ان الله واحد؟ قال. فحمل الناس علیه فقالوا: یا اعرابی اما تریٰ ما فیه امیر المومنین من تقسیم القلب؟ فقال امیر المومنین: دعوه فان الذی یریده الاعرابی هو الذی نریده من القوم، ثم قال: یا اعرابی! ان القول فی ان الله واحد علیٰ اربعة اقسام: فوجهان منها لا یجوز ان علی الله تعالیٰ، و وجهان یثبتان فیه. فاما اللذان لا یجوز ان علیه فقول القائل واحد یقصد به باب الاعداد فهذا لا یجوز لان ما لا ثانی له لا یدخل فی باب الاعداد، اما تریٰ انه کفر من قال انه ثالث ثلاثة؟ و قول القائل هو واحد من الناس یرید به النوع من الجنس فهذا ما لا یجوز لانه تشبیه و جل ربنا و تعالیٰ عن ذلك. واما الوجهان اللذان یثبتان فقول القائل هو واحد لیس له فی

الاشياء شبه كذلك ربنا . وقول القائل انه عز و جل احدی المعنیٰ يعني به : انه لا ينقسم في وجود ولا عقل الا وهم كذلك ربنا)

جنگ جمل کے دن ایک اعرابی نے حضرت امیر المؤمنینؑ کے پاس آ کر کہا: آیا آپ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا ایک ہے؟ لوگوں نے اس اعرابی کو ڈانٹا اور کہا کہ آیا تو اس وقت امام سے اس طرح کے مسائل پوچھ رہا ہے جبکہ آپؑ میدان جنگ میں ہیں اور آپؑ کا ذہن جنگ کے مسائل و امور میں مصروف ہے! مگر امامؑ نے لوگوں سے فرمایا کہ اسے کچھ نہ کہو' جو بات وہ پوچھ رہا ہے یہی تو ہم ان لوگوں (کہ جن سے ہم جنگ کر رہے ہیں) سے چاہتے ہیں' اس کے بعد امیر المؤمنینؑ نے فرمایا: اے اعرابی! یہ کہنا کہ خدا ایک ہے اس کی چار صورتیں ممکن ہیں، جن میں دو صورتیں خدا کی بابت صحیح نہیں جبکہ دو صورتیں صحیح ہیں، جو دو صورتیں خدا کی بابت نادرست ہیں وہ یہ ہیں: پہلی صورت یہ کہ کوئی یہ کہے کہ خدا ایک ہے اور وہ اعداد و شمار اور گنتی کے باب سے "ایک" کا ارادہ کرے تو یہ درست نہیں کیونکہ جو "ایک" "دوسرا" نہ رکھتا ہو...... (اس کا کوئی ثانی نہ ہو)...... وہ گنتی کے باب میں نہیں آتا آیا تو نے نہیں دیکھا کہ جنہوں نے خدا کے بارے میں کہا کہ "انه ثالث ثلثة" (وہ تین میں کا تیسرا ہے) وہ کافر ہو گئے، دوسری صورت یہ کہ کوئی یہ کہے کہ خدا ایک ہے اور اس سے جنس کی ایک نوع مراد لے تو یہ بھی خدا کی بابت درست نہیں کیونکہ یہ تشبیہ ہے اور ہمارا پروردگار اس سے بالاتر ہے کہ اسے کسی کے مشابہ قرار دیا جائے، باقی جو دو صورتیں خدا کی بابت درست ہیں وہ یہ ہیں: پہلی صورت یہ کہ کوئی یہ کہے کہ خدا ایک ہے اور یہ ارادہ کرے کہ کوئی چیز اس جیسی نہیں ۔۔۔ یہ درست ہے اور ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے کہ کوئی چیز اس کی ہمسر نہیں، دوسری صورت یہ کہ کوئی کہے کہ خدا ایک ہے اور اس سے یہ مراد لے کہ وہ "احدی المعنیٰ" ہے یعنی وہ وجود اور عقل و شعور کی دنیا میں قابل تقسیم نہیں ۔۔۔ وہ یکتا ہے ۔۔۔ ہاں ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے!

یہ دو صورتیں جو حضرت امیر المؤمنینؑ نے خدا کی وحدانیت کی بابت صحیح و درست قرار دی ہیں بعینہ یہی مطالب آیت "وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" کی تفسیر میں بیان کئے جا چکے ہیں)

اس کے علاوہ حضرت امیر المؤمنین علیؑ، امام رضاؑ اور دیگر آئمہ اطہارؑ کے بیانات وارشادات میں یہ جملہ بارہا دیکھنے کو ملتا ہے: "انه واحد لا بالعدد" (وہ ایک ۔ یکتا ۔ ہے لیکن گنتی کے باب سے نہیں) اور یہ وہی مطلب ہے جو ذات احدیت کی بابت ذکر ہو چکا ہے کہ وہ یکتا ہے، اس کی ذات مطلق ہے اس لیے اسے گنتی میں کسی صورت سے شامل نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے صحیفہ کاملہ کی ایک دعا میں یہ الفاظ استعمال کئے: "لك وحدانية العدد" اس کا معنی یہ ہے کہ اعداد و شمار کا نقطہ وحدت تیرے اختیار و ملکیت میں ہے نہ یہ کہ تو عددی ایک ہے کیونکہ عقلی دلائل اور آیات و روایات سے ثابت ہے کہ خدا کا وجود مقدس ہر طرح کی قید و شرط سے ماوراء و منزہ ہے یعنی وہ وجود ہی وجود ہے، وجود محض ہے، اس کی ذات و حقیقت میں کسی بھی حوالہ سے تعدد و تکرر قابل تصور نہیں، (ممکن ہے "لك وحدانية

العدد ’’کا معنی یہ ہو کہ ’’ایک‘‘ ہونے کی حقیقت تیرے لئے خاص ہے اور یا یہ کہ ’’یکتائی‘‘ تجھ سے مخصوص و مختص ہے کیونکہ حرف لام کا ایک معنی اختصاص ہے، مترجم)

ظالم پیشوا اور ان کے پیروکار

کتاب ’’کافی‘‘، ’’اختصاص‘‘ اور تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے آیت ’’ومن الناس من یتخذ من دون الله انداداً‘‘ کی تفسیر میں منقول ہے آپ نے جابر سے ارشاد فرمایا: اے جابر! خدا کی قسم! ان سے مراد ظالم پیشوا اور ان کے پیروکار ہیں، تفسیر العیاشی میں مذکورہ روایت کے الفاظ یوں ہیں: (والله یا جابر! هم أئمة الظلم و اشیاعهم) قسم بخدا اے جابر! ان سے مراد پیشوایان ظلم اور ان کے پیروکار ہیں۔

اس روایت کا معنی و مقصود سابقہ بیانات سے بخوبی واضح ہو چکا ہے اور امامؑ کا یہ فرمان کہ ان سے مراد ظالم پیشوا یا پیشوایان ظلم ہیں تو یہ زیر بحث آیت کے الفاظ ’’وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوٓا، الخ‘‘ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں ان پیروکاروں کو جنہوں نے خدا کے شریک بنائے ظالم کہا گیا ہے لہٰذا ان کے پیشوا کہ جن کی انہوں نے پیروی کی ظالم پیشوا یا ظالموں کے پیشوا ہیں،

بخیل شخص کا برا انجام

کتاب ’’کافی‘‘ میں ’’كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ‘‘ کی تفسیر میں منقول ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

(هو الذی یدع ماله لا ینفعه فی طاعة الله بخلاً ثم یموت فیدعه لمن یعمل فی طاعة الله او معصیة الله فان عمل به فی طاعة الله رآه فی میزان غیره حسرة و قد کان المال له، وان کان عمل به فی معصیة الله قواه فی ذالك المال حتی عمل به فی معصیة الله)

اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنا مال جمع کرتا رہے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرے پھر وہ مر جائے اور اپنا مال و دولت ایسے لوگوں کے لیے چھوڑ کر جائے کہ یا تو وہ اسے خدا کی اطاعت میں خرچ کریں یا اس کی معصیت میں، اگر وہ اسے خدا کی اطاعت میں خرچ کریں تو قیامت کے دن وہ اس مال کو دوسروں (ان خرچ کرنے والوں) کے میزان و ترازوئے اعمال میں دیکھے گا تو حسرت زدہ ہوگا کیونکہ یہ تو اس کا مال تھا، اور اگر وہ اسے خدا کی معصیت میں خرچ کریں تو گویا اس نے ہی خرچ کرنے والے معصیت کاروں کو تقویت بخشی تب بھی وہ اس پر حسرت و افسوس کرے گا۔

اسی طرح کی روایت عیاشی، صدوقؒ، مفیدؒ اور طبرسیؒ نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کی ہے، بہر حال یہ روایت ’’انداد‘‘ کے معنی کی وسعت کو بیان کرتی ہے کہ جس کی بابت مربوطہ مطالب ذکر کئے جا چکے

ہیں۔

فلسفیانہ بحث

''محبت'' ایک ایسی حقیقت ہے جس کا احساس ہم اپنے باطن و وجدان میں کرتے ہیں جیسا کہ غذا، عورت، مال و دولت، جاہ و وقار اور علم سے محبت، یہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کی محبت ہمارے اندر ہمہ وقت موجود ہے اور یہ بات ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ان تمام موارد میں محبت ایک ہی حقیقت رکھتی ہے، یہ سب ایک ہی حقیقت کی حامل محبت کے مصادیق ہیں، ایسا نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ محبت مستقل معنی رکھتی ہو بلکہ سب میں ایک ہی حقیقت و معنی رکھتی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان سب میں محبت مشترک معنوی ہے نہ کہ مشترک لفظی یعنی ایسا نہیں کہ صرف لفظ ''محبت'' میں ان کا اشتراک ہو بلکہ محبت کے معنے میں ان کا اشتراک ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ان سب میں محبت ایک ہی معنی وحقیقت کی حامل ہے تو پھر یہ مختلف مصداق نوعی اعتبار سے فرق رکھتے ہیں یا کسی اور حوالہ سے؟

اگر ہم ان میں سے کسی ایک کی بابت محبت کے بارے میں غور کریں۔ مثلاً غذا جیسے پھل تو معلوم ہو جائے گا کہ اس (پھل) سے اس لیے ہم محبت کرتے ہیں کہ اس کا تعلق ہمارے بدن میں پائی جانے والی غذائی قوت کے عمل سے ہے اور اگر اس قوت کا یہ عمل نہ ہوتا اور اس کے ذریعے انسان جسمانی کمال نہ پاتا تو ہرگز پھل سے محبت نہ کرتا اور ''محبت'' پیدا ہی نہ ہوتی لہٰذا حقیقت میں محبت غذا کھانے والی قوت اور اس کے عمل اور اس لذت کے سبب سے ہے جو اس قوّت کے عمل سے حاصل ہوتی ہے البتہ لذت سے ہماری مراد ذائقہ کی لذت نہیں کیونکہ قوت ذائقہ خود قوت تغذیہ کی غلام ہے نہ کہ اس کی اصل، بلکہ لذت سے مراد وہ خاص احساس اور مخصوص رضا وخوشی ہے جو قوت تغذیہ اپنے عمل سے حاصل کرتی ہے، یہی حال عورت سے محبت کی بابت ہے کہ اس میں بھی محبت درحقیقت جنسی عمل سے حاصل ہونے والی لذت کے حوالہ سے ہے اور خود عورت سے محبت ثانوی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ اصل غذا سے محبت ثانوی حیثیت کی حامل ہوتی ہے اور جنسی عمل اس قوت کا نتیجہ واثر ہے جو حیوان میں موجود ہے جیسا کہ غذا کھانا اس قوت کا اثر ونتیجہ ہے جو حیوان میں پائی جاتی ہے، بنابرایں یہ ثابت ہوا کہ ان دونوں محبتوں کی بازگشت ایک ہی معنی کی طرف ہے اور وہ عبارت ہے ان دو قوتوں اور ان کے درمیان پائے جانے والے ربط وتعلق سے، یعنی ''محبت'' ان دو قوتوں اور ان کے کمال عملی کے درمیان رابطہ ایجاد کرنے والی حقیقت ہے، ممکن ہے یہ احتمال دیا جائے کہ یہ بات انہی دو قوتوں ــــ قوت تغذیہ اور جنسی قوت ــــ کے بارے میں تو صحیح ہے لیکن ان کے علاوہ دیگر موارد میں صادق نہیں آتی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر محبت کے آثار کی بابت غور کیا جائے تو مذکورہ احتمال ہرگز باقی نہیں رہتا اور واضح ہو

جاتا ہے کہ یہ بات محبت کے تمام موارد میں پائی جاتی ہے کیونکہ جس مخصوص رابطہ کا نام ''محبت'' رکھا گیا ہے وہ فاعل میں خاص اثر باقی چھوڑتا ہے جو کہ عبارت ہے اس امر سے کہ فعل انجام دینے والی قوت ہمیشہ اس کی انجام دہی کی خواہاں رہتی ہے اور جب تک اسے انجام نہ دے اس کی توجہ اس سے جدا نہیں ہوتی اور جب انجام دیتی ہے تو اسے باقی رکھنا اس کا مطلوب قرار پاتا ہے، یہ دو خصوصیتیں (فعل کی بقاء اور ہمیشہ اس کی طلب) کہ جنہیں ایک لحاظ سے ایک خصوصیت کہا جا سکتا ہے ہمارے ادراکات کی تمام قوتوں اور ان کے افعال میں موجود ہیں یعنی ہماری قوت باصرہ ۔۔۔ دیکھنے کی طاقت ۔۔۔، قوت سامعہ ۔۔۔ سننے کی طاقت ۔۔۔، قوت حافظہ ۔۔۔ یاد کرنے کی طاقت ۔۔۔، قوت متخیلہ ۔۔۔ سوچنے کی طاقت ۔۔۔ اور دیگر تمام قوتوں اور ظاہری و باطنی حواس میں یہ خاص صفت پائی جاتی ہے کہ وہ سب خواہ فاعلی قوتیں ہوں یا انفعالی ہمیشہ اپنے افعال سے محبت کرتی ہیں اور ان کی انجام دہی کی خواہاں و مشتاق ہوتی ہیں اور یہ صرف اس لیے ہے کہ ان کے افعال ان کے کمالات کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں پائی جانے والی کمزوریوں و نواقص کو دور کرتے ہیں، اسی سے مال، جاہ و جلال اور علم سے محبت کی حقیقت حال بھی واضح ہو جاتی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک چیز انسان کے لیے ''کمال'' کی حیثیت رکھتی ہے یعنی انسان ان کے ذریعے اپنے لیے ایک طرح کا کمال حاصل کر لیتا ہے۔

بنابرایں یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ محبت انسان اور اس کے کمال کے درمیان ایک خاص تعلق اور مخصوص شعوری جاذبہ و کشش کا نام ہے اور آثار و نتائج سے حاصل ہونے والے تجربات و عمیق تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ جاذبہ و کشش دیگر حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جاذبہ و کشش دراصل اس تاثیر یا تاثر (فعل و انفعال) سے پیدا ہوتی ہے جسے محب اپنے فعل اور اس کے اثر سے حاصل کرتا ہے اور اسی کے نتیجہ میں دیگر امور مثلاً پھل، عورت وغیرہ سے محبت ہو جاتی ہے، اور یہی کیفیت اگر حیوانات کے علاوہ دیگر موجودات میں پائی جائے یعنی ان میں شعور کے ساتھ حصول کمال یا عطائے کمال قابل تصور ہو تو اس صورت پر بھی ''محبت'' کا اطلاق ہوگا۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ محبت چونکہ محب اور محبوب کے درمیان ایک خاص وجودی تعلق وارتباط کا نام ہے اس لیے اگر معلول کہ جس کے ساتھ اس کی علت کی محبت وابستہ ہوئی ہے ذی شعور ہو تو وہ اپنی علت سے محبت اپنے اندر (روح میں) محسوس کرے گا بشرطیکہ وہ صاحب نفس ہو اور استقلال جوہری رکھتا ہو۔

مذکورہ بالا تمام مطالب سے درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

(۱)۔ محبت ایک خاص وجودی تعلق و مخصوص جاذبہ و کشش ہے جو کمال پہنچانے والی علت اور کمال حاصل کرنے والے معلول کے درمیان پائی جاتی ہے (یا ان جیسے علت و معلول کے درمیان موجود ہوتی ہے) اسی وجہ سے ہم اپنے افعال سے محبت کرتے ہیں کہ وہ ہمارے حصول کمال کا ذریعہ ہیں اور اسی طرح اپنے افعال سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے بھی محبت کرتے ہیں مثلاً وہ غذا جو ہم تناول کرتے ہیں، بیوی کہ جس سے استمتاع کرتے ہیں، مال و دولت کہ جسے اپنے مصرف میں لاتے ہیں، جاہ و مقام کہ جس سے استفادہ کرتے ہیں، اپنے محسن کہ جو ہم پر احسان کرتے ہوئے ہمیں کچھ عطا کرتا ہے،

استاد کہ جو تعلیم دیتا ہے، رہبر و رہنما کہ جو ہماری رہبری کرتا ہے، مددگار و معاون جو ہماری مدد و نصرت کرتا ہے، شاگرد کہ جو ہم سے علم حاصل کرتا ہے، خادم کہ جو ہماری خدمت گزاری کرتا ہے یا ہر وہ شخص جو کسی بھی حیثیت وصورت میں ہماری اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے، تو ہم ان سب سے محبت کرتے ہیں اور ہر ایک سے محبت ایک مستقل عنوان رکھتی ہے تو یہ سب محبت کی مختلف قسمیں ہیں جن میں سے بعض فطری و طبیعی، بعض خیالی و تصوارتی اور بعض عقلی ہیں۔

(۲)۔ محبت مختلف مراتب رکھتی ہے کہ ان میں سے بعض شدید اور بعض ضعیف ہیں کیونکہ۔۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ۔۔ محبت ایک خاص وجودی تعلق وارتباط سے عبارت ہے اور ''وجود'' شدت و ضعف کے لحاظ سے 'مختلف مراتب رکھتا ہے، اور یہ بات بھی واضح طور پر معلوم ہے کہ جو وجودی تعلق علت تامہ اور اس کے معلول کے درمیان پایا جاتا ہے وہ اس تعلق سے بہت مختلف ہے جو علت ناقصہ اور اس کے معلول کے درمیان ہے اور دوسری جانب یہ بھی ثابت ہے کہ وہ کمال کہ جس کے سبب سے محبت پیدا ہوتی ہے اس کی کئی قسمیں ہیں: کچھ ضروری ولازمی اور کچھ غیر ضروری و غیر لازمی ہیں، کچھ اہم اور کچھ غیر اہم ہیں، کچھ مادی ہیں مثلاً غذا وغیرہ اور کچھ غیر مادی ہیں مثلاً علم ودانش، بنابرایں یہ نظریہ غلط ہے کہ محبت صرف مادی امور میں ہوتی ہے غیر مادی امور میں نہیں، اور یہ بھی غلط ہے۔۔ جیسا کہ بعض حضرات کہتے ہیں۔۔ کہ محبت کی اصل و اساس غذا ہے اور باقی سب محبتوں کی بازگشت اسی کی طرف ہے یا جیسا کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کی اصل جنسی عمل ہے اور باقی اقسام کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

(۳)۔ خداوند عالم ہر لحاظ سے قابل محبت ہے کیونکہ وہ ذاتاً صاحب کمال ہے، اس کا کمال لامتناہی ولامحدود ہے، اس کے علاوہ جس کمال کا بھی تصور کریں وہ متناہی ومحدود ہے اور یہ واضح حقیقت ہے کہ ہر متناہی اپنے وجود میں لامتناہی ذات سے وابستہ ہے اور یہی امر، دائمی وناقابل زوال محبت کا سرچشمہ ہے اور پھر ذات حق تعالیٰ ہمارا خالق وآفریدگار اور ہمارا محسن ہے، وہ ہمیں لامتناہی و بے شمار اور دائمی نعمتیں عطا کرنے والا ہے اس لیے ہم اس سے محبت کرتے ہیں کیونکہ ہم ہر نعمت عطا کرنے والے سے اس کے احسان اور نعمت عطا کرنے کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔

(۴)۔ چونکہ محبت ایک وجودی تعلق وربط سے عبارت ہے اور وجودی رابطے اپنے موضوع کے وجود سے باہر نہیں ہوتے بلکہ اس کے وجودی مراتب ودرجات میں شمار کئے جاتے ہیں لہٰذا یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ہر چیز (صاحب وجود) اپنے آپ سے محبت کرتی ہے، اور چونکہ کسی چیز سے محبت اس کے متعلقات اور اس سے وابستہ ہر چیز سے محبت کا سبب ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے وجودی آثار سے بھی محبت کرتی ہے، بنابرایں یہ ثابت ہوا کہ خدا اپنی مخلوقات سے محبت کرتا ہے کیونکہ اسے اپنی ذات سے محبت ہے (اور مخلوقات اس کی ذات سے وابستہ ہیں) اور وہ اپنی مخلوق سے اس لیے بھی محبت کرتا ہے کہ مخلوق نے اس کے انعامات اور اس کی ہدایت کو قبول وتسلیم کیا ہے۔

(۵)۔ محبت کے باب میں شعور وعلم کی ضرورت اس کے مصداق کی بابت ہوتی ہے ورنہ محبت درحقیقت وجودی ارتباط کے سوا کچھ نہیں جو کہ شعور وعلم سے ماوراء و بے نیاز ہے، بنابرایں یہ ثابت ہوا کہ طبیعی قوتیں وصلاحتیں کہ جو شعور وعلم سے

خالی ہوتی ہیں وہ بھی اپنے آثار وافعال سے محبت کرتی ہیں۔

(۶)۔ مذکورہ تمام مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ محبت ایک ایسی حقیقت ہے جو تمام موجودات میں پائی جاتی ہے (خداوند عالم اور ذی شعور وغیر ذی شعور موجودات بھی اس میں شامل ہیں)۔

دوسری فلسفیانہ بحث

''عذاب'' کے بارے میں اہل تحقیق مختلف آراء ونظریات رکھتے ہیں اور عقلی دلائل وظواہر الفاظ کی روشنی میں اس کی بابت دو نظریات پائے جاتے ہیں: ایک یہ کہ عذاب ہمیشہ رہے گا اور دوسرا یہ کہ ختم ہو جائے گا۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ قرآن مجید میں واضح طور پر عذاب کے دائمی ہونے کو بیان کیا گیا ہے چنانچہ زیر بحث آیت (۱۶۷) میں صریح الفاظ میں ذکر ہوا:

''وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ''

(وہ ہرگز آتش جہنم سے باہر نہیں آئیں گے)

یہ قرآنی نص ہے، اسی طرح آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی متعدد روایات سے اس کی تائید ملتی ہے کہ عذاب دائمی ہوگا، اور اہل بیت علیہم السلام کے علاوہ دیگر اسناد سے جو روایات اس باب میں وارد ہوئی ہیں ان میں عذاب کے منقطع ہونے اور ختم ہو جانے کا اثبات اور خلود و ہمیشہ باقی رہنے کی نفی ہوئی ہے لیکن چونکہ یہ بات قرآنی نص وواضح بیان کے صریح خلاف ہے اس لیے ان روایات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

اب رہے عقلی دلائل! تو ان کی بابت ہم آیت مبارکہ: ''وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا'' (سورہ بقرہ آیت ۴۸) کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ معاد کے بارے میں جو کچھ شریعت میں بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیلات اور جزئیات کو عقلی استدلال اور دلائل وبراہین سے ثابت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہماری عقل جزئیات اور معاد کی باریکیوں کو سمجھنے سے قاصر ہے لہٰذا اس کی بابت صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ رسول صادق حضرت پیغمبرؐ نے وحی کے حوالہ سے ہمیں بتایا ہے اس کی تصدیق کریں کیونکہ عقلی دلائل سے اسی راستہ کے صحیح ہونے اور آنحضرتؐ کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔

اور جہاں تک ان عقلی وروحانی نعمتوں وعذاب کا تعلق ہے جو نفس کے اچھے اخلاق یا برے اخلاق وعادات سے متصف ہونے کی وجہ سے اسے حاصل یا لاحق ہوتے ہیں یا اچھے وبرے حالات واحوال سے متصف یا دوچار ہونے کے سبب پیدا ہوتے ہیں تو ان کی بابت سابقہ فلسفیانہ بحثوں میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ یہ تمام احوال واستعدادت ان قبیح یا

حسن ‌صورتوں کی وجہ سے ہیں جو نفس میں پائی جاتی ہیں یا اس پر عارض ہوتی ہیں یعنی اپنی اصل حقیقی صورتوں کے ساتھ (خواہ وہ صورتیں اچھی ہوں یا بری) صفحۂ نفس پر ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ نفس ان میں سے اچھی صورتوں سے متنعم (لطف اندوز) ہوتا ہے بشرطیکہ ذاتاً سعادتمند ہو اور بری صورتوں سے معذب (پریشان واذیت کا شکار) ہوتا ہے خواہ ذاتاً سعادتمند ہو یا شقی و بد بخت! اگر وہ برے اخلاق وعادات نفس میں راسخ نہ ہوں اور ذاتاً اس سے ہمرنگ نہ ہوں تو یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ ان سے چھٹکارا پالے گا اور وہ عادات وبرے اخلاق ختم ہو جائیں گے کیونکہ اس طرح کی جبری وعارضی کیفیات کثیر اور دائمی نہیں ہوتیں بلکہ زوال پذیر ہوتی ہیں اور یہ نفس جو کہ ذاتاً سعادتمند ہے اور ان نامطلوب وزوال پذیر بری وشقاوت آمیز عادات واخلاق سے دوچار ہو چکا ہے ان سے نجات پالے گا مثلاً گناہ کا ارتکاب کرنے والے مؤمنین کے نفوس! تو وہ یقیناً شقاوت آمیز کیفیتوں سے چھٹکارا پالیں گے، لیکن اگر بری عادات واخلاق نفس میں راسخ ہو جائیں یہاں تک کہ نئی صورتیں یا نئی صورتوں کی مانند ہو جائیں تو اسے ایک جدید نوع میں ڈھال دیں گی جیسے ''بخیل انسان'' کہ ''بخل'' اس طرح اس کی انسانیت کی ایک صورت بن جاتا ہے جیسا کہ ''نطق'' اس کی حیوانیت کے ساتھ اس کی ایک صورت وجزء ہے کہ اس کے حوالہ سے وہ ''حیوان'' کی ایک مخصوص نوع وقسم (انسان) قرار پایا ہے اسی طرح ''بخیل انسان'' بھی ''انسان'' کی ایک مخصوص نوع وقسم بن گیا، (جس طرح ''حیوان'' کے مفہوم میں انسان اور غیر انسان شامل تھے اور ''نطق'' کی وجہ سے انسان کو ''حیوان ناطق'' کہا گیا جس سے وہ غیر انسان سے مختلف ہو کر ''حیوان'' کی ایک خاص قسم بن گیا اسی طرح ''انسان'' کے مفہوم میں بخیل اور غیر بخیل شامل تھے لیکن ''بخل'' کے عارض ولاحق ہونے کی وجہ سے ''بخیل انسان'' کے نام پر ''انسان'' کی ایک قسم بن گئی کہ ''بخل'' جس کی پہچان اور ذات انسانی کا حصہ بن گیا) اور اب یہ قسم ہمیشہ اپنی مستقل وجودی حیثیت کی حامل رہے گی لہٰذا وہ سب کام جو نفس میں راسخ نہ ہوتے ہوئے جبری طور پر اس سے سرزد ہوں گے وہ ان سے متالم ہوگا کیونکہ وہ سب اس کی مخصوص نوع (بخیل انسان) کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں نہ کہ کسی اور عامل کے نتیجہ میں! اس لئے جب تک وہ بنیاد موجود ہوگی اس سے اس طرح کے امور وافعال سرزد ہوتے رہیں گے جن سے وہ متالم ہوگا، ایسے شخص کی مثال کہ جو اپنے ہی اندر پائی جانے والی وجودی صورت کے سبب الم انگیز امور کے وجود میں آنے سے متالم ہوتا ہے اس شخص جیسی ہے جو ''مالیخولیا'' اور ہمیشہ خیالات کی دنیا میں گم رہنے کے مرض کا شکار ہوتا ہے کہ ہر وقت اس کی قوت خیال سے ایسی ہولناک صورتیں نکلتی رہتی ہیں جن سے وہ متالم وپریشان ہوتا ہے اور ایسے تصورات اس کے دماغ پر چھائے رہتے ہیں کہ وہ ہر آن اپنے آپ کو ان کے اثرات کی زد میں سمجھتے ہوئے متالم ومعذب ہوتا ہے اور یہ سب اس کے نفس ہی کی کارآرائیاں ہیں اس میں کسی بیرونی عامل کے جبر کا کوئی دخل نہیں کیونکہ اگر وہ صورتیں اس کے بیمار مزاج سے ہمرنگ نہ ہوتیں تو وہ کبھی انہیں وجود میں نہ لاتا۔ بنابرایں وہ شخص اگرچہ ان صورتوں کی بابت اس لیے متالم نہیں ہوتا کہ ان کی نسبت اس کی طرف ہے اور ان کے وجود میں آنے کا سرچشمہ وہ خود ہی ہے بلکہ وہ اس لئے متالم ہوتا ہے کہ ''عذاب'' ایک ایسی چیز ہے جس سے ہر انسان فطری طور پر نفرت کرتا ہے اور جب اس میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سے نجات پانے کا خواہاں رہتا ہے، یہ بات بعینہ ان خوفناک امور

اور ہولناک و ناپسندیدہ صورتوں کی بابت صادق آتی ہے جن سے عالم آخرت میں شقی و بد بخت انسان دو چار ہوگا کہ وہ سب خود اس کی اپنی کارآرائیوں کے نتائج ہیں اور انہیں "عذاب" سے تعبیر کیا جاتا ہے، لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ ذاتاً شقی و بد بخت انسان ہمیشہ اور کبھی ختم نہ ہونے والے "عذاب" میں مبتلا ہوگا۔

اس مقام پر چند اعتراضات پیش کئے گئے ہیں جو کہ واضح طور پر غلط و نادرست ہیں، ذیل میں وہ اعتراضات اور ان کے جوابات ذکر کئے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

پہلا اعتراض:

خداوند عالم نہایت وسیع رحمت والا ہے، اس کی رحمت کی کوئی حد و انتہا نہیں تو اس وسیع و لامتناہی رحمت کے ہوتے ہوئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ایک ایسی مخلوق پیدا کرے جس کا انجام کار ہمیشہ کا عذاب ہو؟

دوسرا اعتراض:

"عذاب" اسی صورت میں عذاب ہوتا ہے جب وہ طبیعت کے ناموافق ہو اور اس سے ہم رنگ نہ ہو کہ اس صورت کو "قسر" (جبر) کہا جاتا ہے اور چونکہ جبر کو دوام حاصل نہیں ہوتا اس لیے ہمیشہ کے عذاب کا تصور کیونکر ممکن ہے؟

تیسرا اعتراض:

بندہ جو گناہ بھی کرتا ہے اس کی حد و انتہا ہوتی ہے، کوئی گناہ لامحدود و غیر متناہی نہیں ہوتا، لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کی سزا دائمہ و لامتناہی ہو؟

چوتھا اعتراض:

عالم ہستی کے نظام میں اہل شقاوت و معصیت کار لوگوں کی خدمات اہل سعادت و اطاعت گزار حضرات سے کم نہیں کہ اگر وہ (اہل شقاوت) نہ ہوں تو اہل سعادت اس وسیع نظام کائنات میں سعادت کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے، تو ایسی صورت حال کے پیش نظر ان کا ہمیشہ کے عذاب سے دو چار ہونا کس طرح ممکن ہے؟

پانچواں اعتراض:

"عذاب" درحقیقت معصیت کار اور خدا کے احکامات اور اوامر و نواہی کی نافرمانی کرنے والوں سے انتقام کی ایک صورت ہے اور "انتقام" اس نقصان کی تلافی کے لیے ہوتا ہے جو معصیت و نافرمانی کرنے والا انتقام لینے والے طاقتور کو پہنچاتا ہے جبکہ خدائے قدوس کی بابت اس طرح کا سوچنا ہرگز درست نہیں کیونکہ وہ غنی مطلق ہے، ہر چیز اور ہر ایک سے بے نیاز ہے، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اس کے خزانہ قدرت میں ہرگز کوئی کمی نہیں آسکتی تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ کسی کو عذاب میں مبتلا کرے۔۔ اس سے انتقام لے اور اپنی کمی و نقصان کی تلافی کرے۔۔ اور وہ بھی ہمیشہ کا عذاب؟

یہ پانچ اور اس طرح کے دیگر اعتراضات "ہمیشہ کے عذاب" کی بابت پیش کئے گئے ہیں لیکن "دائمی" اور ہمیشہ کے عذاب کی بابت ہم جو وضاحت کر چکے ہیں اس کی روشنی میں ان تمام اعتراضات کا نادرست ہونا ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ

''ہمیشہ کا عذاب'' (العذاب الخالد) دراصل شقاوت کی صورت کا ایک اثر و نتیجہ ہے جو شقی انسان کی لوح نفس پر ثبت ہو جاتی ہے لہٰذا جب کوئی انسان ذاتاً شقی ہو جائے تو اس کی ذاتی شقاوت اس میں پائی جانے والی وجودی صلاحیتوں کی بنیاد پر ایسی عملی صورتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو اس سے ہم رنگ ہوں اور اس کی سنخ استعداد کے مناسب ہوں، بنابرایں یہ سوال بیجا ہے کہ اس کی ذاتی شقاوت کے عملی آثار کیوں ظاہر ہوئے اور وہ ان آثار کے نتائج سے کیوں دو چار ہوا کیونکہ اس کی ذات میں پائی جانے والی شقاوت اس کی وجودی صلاحیتوں کے امتزاج سے جن آثار کو جنم دیتی ہے وہ ان سے ہرگز اپنا دامن نہیں بچا سکتا بلکہ وہ ان آثار و نتائج سے ہر حال میں اور ہر مورد میں دو چار ہوگا کیونکہ ان کا سرچشمہ اس کی قوت اختیار ہے اور یہ صورت حال بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے کسی انسان کے بارے میں اس وقت یہ سوال کیا جائے جب اسے انسانی صورت حاصل ہو چکی ہو (''انسان'' ہو) کہ اس سے انسانی افعال کیوں سرزد ہوتے ہیں؟ یہ سوال ہرگز معقول نہ ہوگا اسی طرح ذاتی شقاوت کے آثار و نتائج کہ جن میں سے ایک ''ہمیشہ کا عذاب'' بھی ہے کی بابت بھی یہ سوال درست نہیں کیونکہ وہ (ہمیشہ کا عذاب) ذاتی شقاوت کہ جس کی بازگشت انسان کے اپنے ''اختیار'' کی طرف ہے کا نتیجہ اور اس کا لازمی امر ہے، اس لیے وہ تمام اعتراضات جو ''ہمیشہ کے عذاب'' (العذاب الخالد) کی بابت پیش کئے گئے ہیں وہ نادرست ہیں۔

بہرحال یہ ہے ان پانچ اعتراضات کا اجمالی و جامع جواب، اب ہر ایک کا تفصیلی جواب ملاحظہ ہو!

پہلے اعتراض کا جواب:

جہاں تک خدا کی رحمت کا تعلق ہے تو اس کی بابت عرض ہے کہ جب ''رحمت'' کی نسبت خدا کی طرف ہو اور کہا جائے کہ ''خدا رحمت والا ہے'' تو اس میں ''رحمت'' سے مراد رحم دلی اور نرم مزاجی نہیں ہوتی کیونکہ یہ (رحم دلی و نرم مزاجی) مادہ و جسم سے تعلق رکھنے والے امور ہیں جبکہ خداوند عالم مادہ و مادیات اور جسم و جسمانیات سے پاک و منزہ ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر شخص میں پائی جانے والی ذاتی صلاحیتوں اور استعداد و اہلیت کی بناء پر اسے فیض پہنچاتا ہے یعنی جس میں جتنی اہلیت و صلاحیت ہوتی ہے اس کے مطابق اسے اپنی عنایتوں سے نوازتا ہے کیونکہ ہر شخص اپنی استعداد و اہلیت اور بھرپور صلاحیتوں کی بنیاد پر یہ چاہتا ہے کہ اسے اس کی استعداد و صلاحیت کے مطابق عطا کیا جائے لہٰذا وہ زبان حال ہی سے عنایات الٰہیہ کا طالب ہوتا ہے گویا اس کی وجودی صلاحیتیں در رحمت الٰہی پر آ کر عطائے فیوضات کی التجا کرتی ہیں اور خداوند علم کی طرف سے اس پر عنایتوں کی بارش ہوتی ہے اور اسے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو اس کی استعداد و اہلیت کے مطابق ہو۔

یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ ''رحمت'' کی دو قسمیں ہیں: (۱) عام رحمت، (۲) خاص رحمت، عام رحمت سے مراد ہر چیز کو اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نعمت وجود و ہستی عطا کرنا ہے اور خاص رحمت سے مراد ہر چیز کو اس کی استعداد و اہلیت کے مطابق نعمت ہدایت و سعادت (ہدایت بہ سوئے توحید اور سعادت تقرب الٰہی) عطا کرنا ہے، اور جہاں تک کسی کو صورت شقاوت عطا کرنے کا تعلق ہے کہ جس کا لازمی اثر و نتیجہ ہمیشہ کا عذاب ہے تو یہ بھی انسان کی اس بھرپور استعداد کی وجہ

سے ہوتا ہے جو اس نے حاصل کی ہو اس لیے اسے صورت شقاوت عطا کرنا خدا کی عام رحمت کے منافی نہیں بلکہ اس کا حصہ ہے لیکن جہاں تک خاص رحمت کا تعلق ہے تو اس کی بابت ہرگز یہ معقول نہیں کہ وہ اسے حاصل ہو جو اس کے حصول کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔ بنا برایں یہ کہنا درست نہیں کہ دائمی عذاب رحمت کے منافی ہے کیونکہ اگر رحمت سے عام رحمت مراد لی جائے تو اس سے ہرگز منافی نہیں بلکہ اس کا ایک مصداق ہے اور اگر خاص رحمت مراد لی جائے اس صورت میں بھی اس کے منافی نہیں کیونکہ اس سے شقاوت و عذاب کا کوئی تعلق و ربط ہی نہیں بلکہ اس کا مورد ہی کچھ اور ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس اعتراض کو صحیح و درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ صرف دائمی عذاب ہی سے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ عارضی و ختم ہو جانے والے عذاب بلکہ دنیاوی عذاب پر بھی وارد ہوگا۔

دوسرے اعتراض کا جواب:

پہلی بات تو یہ ہے کہ ''طبیعت کے ناموافق'' اور اس سے ہمرنگ نہ ہونے سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت ضروری ہے، اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اس شخص اور اس سے صادر ہونے والے فعل کے درمیان کوئی سنخیت اور قدر مشترک نہیں پائی جاتی یعنی وہ فعل کسی جبر کرنے والے کے جبر کی وجہ سے اس سے سرزد ہوا تو یہ بات زیر بحث موضوع کے دائرہ سے خارج ہے کیونکہ فرض یہ ہے کہ جو کام (اثر) شقی انسان انجام دیتا ہے وہ اس کی طبع ذات سے ہمرنگ ہوتا ہے اگرچہ اس کا سبب نفس انسانی پر عارض ہونے والے وہ احوال ہیں جو اس میں راسخ ہو جاتے ہیں (گھر کر جاتے ہیں) جن سے ایک مستقل نوع کی صورت وجود میں آتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ شخص (شقی انسان) ان سے متالّم اور ان سے نجات حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے، اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ آثار (افعال و نتائج) شقی انسان کے پسندیدہ ہیں اور وہ انہیں چاہتا ہے لہٰذا اس کے مزاج ذات سے ہمرنگ ہیں تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ وہ تو ان سے نفرت کرتا ہے اور ان سے متالّم ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے ''مالیخولیا'' میں مبتلا شخص کی مثال دی ہے کہ اس کی قوت خیال سے ہر لحہ ایسی ہولناک صورتیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں کہ وہ ہر آن اپنے آپ کو ان کی زد میں سمجھتے ہوئے متالّم و معذب رہتا ہے، بعینہٖ یہی حال شقی انسان کا ہے کہ اگرچہ وہ افعال جو اس کی ناپاک طبع ذات کی بنیاد پر اس سے سرزد ہوتے ہیں اس کے مزاج طبع سے ہمرنگ ہوتے ہیں کیونکہ ان کا سرچشمہ اس کی طبع خبیث ہی ہے اور ہر اثر اپنی طبیعت سے ہمرنگ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس شخص کے لیے ''عذاب'' بھی ہیں کیونکہ ''عذاب'' کا معنی و مفہوم ان پر صادق آتا ہے اس لیے کہ ذوق و وجدان کے لحاظ سے وہ ان سے ناخوش ہوتا ہے خواہ ان کے وجود میں آنے کا سبب ہونے کی وجہ سے انہیں پسند ہی کیوں نہ کرے،

تیسرے اعتراض کا جواب:

''عذاب'' درحقیقت ان ناپسندیدہ آثار سے عبارت ہے جو اپنے مسلمہ حقیقی و واقعی موضوعات پر مترتب ہوتے ہیں یعنی بار بار گناہ و معصیت جو کہ یقیناً محدود ہیں کا ارتکاب کرنے سے نفس میں ایک صورت شقاوت پیدا ہو جاتی ہے گویا وہ محدود معصیتیں ہی دراصل اس صورت شقاوت کے وجود میں آنے کی علتیں ہیں اور پھر اس صورت شقاوت کے نتیجہ میں ایسے ناپسندیدہ آثار ظاہر ہوتے ہیں جنہیں ''عذاب'' کہا جاتا ہے، بنابرایں وہ آثار اس صورت شقاوت کے نتائج ہیں جو شقی انسان کی لوح ذات پر ثبت ہو چکی ہوتی ہے نہ کہ ان معصیتوں کے آثار کہ جو اس صورت شقاوت کے وجود میں آنے کی علتیں اور محدود ہیں لہٰذا اس سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ محدود ومتناہی معصیتوں کے آثار و نتائج لامحدود و لامتناہی کیونکر ہو سکتے ہیں؟ جیسا کہ صورت انسانیت کی بابت بھی یہی بات صادق آتی ہے کیونکہ چند مقررہ محدود علتیں ''مادہ'' کے صورت انسانیت میں ڈھل جانے کا سبب بنتی ہیں اور جب ''انسان'' وجود میں آجاتا ہے تو اس سے ہمیشہ کے لیے آثار انسانیت ظاہر ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی! کیونکہ جب تک ''علت'' وموجد باقی و موجود ہے ''معلول'' بھی موجود رہے گا اور ممکن نہیں کہ علت تو باقی ہو لیکن معلول باقی نہ ہو لہٰذا جب تک صورت انسانیت موجود ہوگی اس کے آثار بھی موجود و باقی رہیں گے اس لیے یہ سوال ہی نادرست ہے کہ محدود علتیں لامحدود آثار کا سبب کیوں ہیں؟

چوتھے اعتراض کا جواب:

جہاں تک خدمت و عبودیت کا تعلق ہے تو رحمت کی طرح اس کی بھی دو قسمیں ہیں: عام عبودیت اور خاص عبودیت! عام عبودیت سے مراد سرچشمہء وجود و ہستی (ذات پروردگار) کے حضور وجود و ہستی کے حوالہ سے خضوع اور قبول صورتِ وجودی، اور خاص عبودیت سے مراد اقرار توحید کے بعد تعلیمات الٰہیہ کا عملی اتباع ہے، اور ان دونوں عبودیتوں کے لیے ان سے مناسب و موزوں جزاء مقرر ہے اور ہر ایک کا نتیجہ مخصوص رحمت سے عبارت ہے اور وہ یوں کہ عام عبودیت جو کہ نظام ہستی میں انجام دی جاتی ہے اس کی جزاء عام رحمت ہے جس میں دائمی نعمت اور دائمی عذاب دونوں شامل ہیں کیونکہ وہ دونوں عام رحمت کا حصہ ہیں جبکہ خاص عبودیت کی جزاء خاص رحمت ہے جو کہ اخروی نعمت اور بہشت بریں سے عبارت ہے، بنابرایں اگر اس اعتراض کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ معصیت کاروں کے لیے نہ دنیا میں کوئی عذاب ہے نہ آخرت میں اور نہ ہی عارضی عذاب ہے نہ دائمی! جو کہ ہرگز صحیح نہیں۔ (یعنی دنیا و آخرت دونوں میں عارضی وغیر دائمی عذاب کی نفی ہو جائے گی)

پانچویں اعتراض کا جواب:

دائمی عذاب کی بابت آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ اس کی نسبت اس صورت شقاوت کی طرف ہے جو انسان میں پیدا

ہو جاتی ہے اور خدا کی طرف اس کی نسبت اسی حوالہ سے ہے جو تمام موجودات عالم کے وجود کی ذات احدیت کی طرف نسبت کا حوالہ ہے نہ کہ انتقامی طور پر اور دل کی تشفی کے لیے، جو کہ خدا کی بابت ناممکن ہے! البتہ اگر انتقام سے مراد وہ سخت سزا اور مشقت آمیز کیفر کردار ہو جو مولا و آقا اپنے غلام کو نافرمانی و سرکشی کے ارتکاب اور حکم عدولی و تمرد کی بناء پر دیتا ہے تو یہ بات خدائے قدوس کی بابت درست ہے کہ وہ اپنے سرکش و نافرمان بندوں کو سخت ترین سزا دے گا اور اس طرح کی سزا کو "انتقام" یا بدلہ لینا نہیں کہا جا سکتا، بنا بر ایں اگر اس پانچویں اعتراض کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس سے دنیا و آخرت کے دائمی و غیر دائمی ہر عذاب کی نفی ہو جائے گی، جو کہ ہرگز صحیح نہیں۔

قرآن و احادیث کے حوالہ سے ایک بحث

(سابقہ بحث کا تکمیلی حصہ)

واضح رہے کہ "دائمی عذاب" پر کیے جانے والے اعتراضات کے جوابات میں جو بنیاد قائم کی گئی ہے اور جو اسلوب و روش اختیار کی گئی ہے اس کی اصل و اساس قرآنِ مجید اور احادیث و روایات میں موجود ہے، مثال کے طور پر درج ذیل آیت مبارکہ ملاحظہ ہو:

سورہ اسریٰ آیت ۲۰:

"مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا "۔

(جو دنیا ہی کا انعام چاہے گا تو ہم اسے اس میں سے جو چاہیں گے اور جسے چاہیں گے جلدی دے دیں گے پھر ہم اس کے لئے جہنم مقرر کریں گے جس میں وہ ذلت و خواری کے ساتھ بیچارگی کے عالم میں داخل ہوگا اور جو شخص آخرت کی جزا چاہے گا اور اس کے حصول کی بھرپور کوشش کرے گا جبکہ وہ باایمان ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش قابلِ تشکر و مقبول ہوگی، اور ہم ان کی مدد بھی کرتے ہیں اور یہ تیرے پروردگار کی عطاء و عنایت ہے کہ ہم ان کی بھی مدد کرتے ہیں اور تیرے رب کی عطا و

عنایت کا دروازہ کسی پر بند نہیں (کوئی اس کی عنایت سے محروم نہیں)

اس آیت میں عذاب، اور تشکر (ثواب) دونوں کو عطیہ و رحمت الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان دونوں کا وجود میں آنا بندوں ہی کے ارادہ و کوشش پر موقوف ہے، اور یہ بعینہ وہی اسلوب وروش ہے جسے ہم نے زیر نظر اصل مسئلہ اور اس پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات میں اختیار کیا ہے۔

بہرحال اس موضوع سے تعلق رکھنے والی اور اس اسلوب وطرز تفکر کے بیان پر مشتمل متعدد دیگر آیات بھی موجود ہیں جن کی بابت ان کے موزوں موارد و مقامات پر بحث و گفتگو کی جائے گی انشاءاللہ تعالیٰ۔

آیات ۱۶۸تا۱۷۱

o يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ
إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿۱۶۸﴾

o إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۶۹﴾

o وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ
أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾

o وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً
وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾

ترجمہ

○ ''اے لوگو! زمین میں جو چیزیں موجود ہیں ان میں سے جو حلال اور پاک ہے اسے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کہ وہ تمہارا واضح دشمن ہے''۔ (۱۶۸)

○ ''وہ (شیطان) تمہیں صرف انہی کاموں کا حکم دیتا ہے (ترغیب دلاتا ہے) جو برے اور قبیح و غلط ہیں اور (تم سے کہتا ہے کہ) تم جس بات کا علم نہیں رکھتے ہو اس کی نسبت خدا کی طرف دے دو'' (۱۶۹)

○ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل فرمایا ہے اس پر عمل کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اسی راستہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا ہے، آیا ان کے آباؤ واجداد ایسے نہیں کہ نہ تو کچھ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور نہ ہی ہدایت یافتہ ہیں'' (آیا اگر ان کے باپ دادا ناسمجھ و گمراہ بھی ہوں تب بھی وہ ان کی پیروی کریں گے؟) (۱۷۰)

○ ''ان کافروں کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص جانوروں کے پیچھے زور زور سے چلاتا ہے مگر وہ اس کی آواز اور چلا کر بولنے کے سوا کچھ نہیں سنتے، وہ (کفار) بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، وہ عقل اور سمجھ بوجھ ہی نہیں رکھتے۔ (۱۷۱)

تفسیر و بیان

حلال و پاک اشیاء کھانے کا حکم

○ "یَاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۔۔۔۔۔ الخ"

(اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال و پاک ہے اسے کھاؤ)

اس آیت مبارکہ اور اس کے بعد والی آیتوں میں چند الفاظ ایسے ہیں جن کے معانی کی وضاحت و بیان پہلے ضروری ہے مثلاً حلال، طیب، خطوات وغیرہ:

حلال: یہ "حرام" کے مقابل میں آتا ہے کہ جس کا انجام دینا ممنوع ہوتا ہے (لہٰذا حلال سے مراد جائز عمل ہے)۔

حِلّ: یہ "حرمت" کے مقابل میں ہے جس کا معنیٰ ممانعت ہے (لہٰذا حل کا معنی جواز ہوگا)

حَلّ: یہ "حرم" کے مقابل میں آتا ہے کہ جس کا معنی عبادت گاہ ہے۔ اور یہ (حل) بمقابل "عقد" بھی استعمال ہوتا ہے کہ جس کا معنیٰ گرہ لگانا ہے اس وقت "حل" کا معنی گرہ کھولنا ہوتا ہے۔

بہر حال تمام موارد میں اس سے مراد کسی چیز کے عمل و اثر میں آزادی و عدم ممانعت ہے، مثلاً عملِ حلال اس کام کو کہا جاتا ہے جسے انجام دینے کی آزادی و عام اجازت ہو اور "حل" اس جگہ کو کہتے ہیں جو "حرم" یعنی عبادت گاہ یا مقدس مقام کی حدود و قیود سے باہر و آزاد ہو۔

طیب: یہ "خبیث" کے مقابل میں ہے کہ جس کا معنی بری چیز و برائی ہے۔ بنا بر ایں "طیب" کا معنی اچھی چیز و اچھائی ہوگا، تاہم اس سے مراد موافق، موزوں و مناسب چیز ہے مثلاً "کلام طیب" یعنی اچھی بات یا اچھا بیان اسے کہتے ہیں جو سننے کے قابل اور قوت سماعت کو بھلا لگے اور "عطر طیب" یعنی اچھی خوشبو یا اچھا عطر اسے کہتے ہیں جو سونگھنے کے قابل اور قوت شامہ کو بھا جائے، اسی طرح "مکان طیب" اچھی جگہ یا اچھا گھر اسے کہتے ہیں جو رہنے کے قابل اور رہنے والوں کے شایانِ شان ہو۔

خطوات: پہلے حرف (خ) اور دوسرے حرف (ط) پر پیش (ُ) کے ساتھ "خطوۃ" کی جمع کا صیغہ ہے کہ جس کا

معنی ہے ایک قدم کا فاصلہ، یعنی جب کوئی شخص چلتا ہے تو اس کے دو قدموں کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے اسے "خطوہ" کہتے ہیں، تاہم اسے (خطوات کو) خ اور ط پر زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے جو کہ "خطوۃ" کی جمع ہے کہ جس کا معنی "ایک قدم" ہے

جملہ "خطوات الشیطان" سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کا تعلق و نسبت شیطان کے ہدف و مقصد یعنی گمراہی و شرک سے ہے اور یہ نسبت و تعلق بعینہٖ اسی طرح کی نسبت و تعلق جیسا ہے جو کسی راستہ چلنے والے کا اپنے مقصد و منزل مقصود سے ہوتا ہے یعنی وہ اس کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ بنا برایں خطوات الشیطان یعنی شیطان کے قدموں سے مراد وہ سب کام ہیں جو شیطان کے مقصد و مطلوب یعنی شرک اور خدائے قدوس سے دوری کا سبب بنتے ہیں۔

امر: (حکم) اس سے مراد یہ ہے کہ حکم دینے والا اپنا ارادہ اس شخص پر مسلط کرے جسے وہ حکم دیتا ہے تاکہ وہ شخص اس کے ارادے کو عملی جامہ پہنائے (کسی شخص کا دوسرے کو "حکم" دینا اپنی مراد و مقصود کو اس کے ذریعے عملی صورت دینے سے عبارت ہے) اور جہاں تک شیطان کے امر (حکم) کرنے کا تعلق ہے (جسے آیت میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے "اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ الخ") تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے اور اپنے ناپاک و مذموم مقاصد کو انسان کی نگاہِ فکر کے سامنے نہایت خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ اس کا دل ان کی طرف راغب ہو اور وہ ان مقاصد کی تکمیل میں عملی اقدام کرے اس طرح وہ اپنا ارادہ انسان پر مسلط کر دیتا ہے۔

سوء: اس چیز کو "سوء" کہتے ہیں جس سے انسان نفرت کرے اور اسے معاشرے میں قبیح و بری سمجھا جائے، اسی قبیح و نفرت انگیز چیز کو اس وقت "فحشاء" کہا جاتا ہے جب وہ برائی اور قابلِ نفرت ہونے میں حد سے بڑھ جائے اس لیے زنا کو فحشاء کہتے ہیں۔

فحشاء: یہ مصدر ہے جیسے سرائ، ضراء وغیرہ، اس سے مراد انتہائی بری اور حد درجہ کی قابلِ نفرت چیز یا عمل۔

زیرِ نظر آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے تمام لوگوں (خواہ وہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں) سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا "یَآاَیُّھَا النَّاسُ" (اے لوگو! اے انسانو!) کیونکہ اس میں جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ ہر ایک سے تعلق رکھتا ہے اور لوگوں کی روزمرہ کی ضروریات زندگی سے مربوط ہے، اور مشرکین کے بارے میں تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض چیزوں کو بلا وجہ اور خدا پر افتراء پردازی کرتے ہوئے خود ہی اپنے لیے حرام قرار دیا ہوا تھا جیسا کہ ثقیف، خزاعہ، بنی عامر بن صعصعہ اور بنی مدلج قبیلوں کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ انہوں نے بعض سبزیاں و چوپایے وغیرہ اپنے لیے حرام کیے ہوئے تھے، یہ تو تھے عرب قبائل، اسی طرح غیر عرب اقوام میں بھی یہ باتیں عام تھیں اور انہوں نے بھی بہت سی چیزوں کو اپنے لیے حرام قرار دیا ہوا تھا، یہاں تک کہ مؤمنین میں بھی اس طرح کی خرافات و بے بنیاد باتیں پائی جانے لگیں کیونکہ اسلام لانے کے بعد بھی قبل از اسلام کی قومی، معاشرتی، اخلاقی عادات و رسوم میں سے بعض چیزیں ان میں باقی رہ گئیں اور وہ دینی و مذہبی روایات کہ جو یکسر منسوخ کر دی گئی تھیں ان کے کچھ آثار ابتدائے اسلام میں دکھائی دے رہے تھے اور یہ بات غیر

معمولی بھی نہیں تھی کہ اہل ایمان اسلام لانے کے بعد اپنی سابقہ عادات وروایات کو مکمل طور پر کیوں ترک نہیں کر پائے تھے (کیونکہ عام طور پر مروجہ معاشرتی عادات رفتہ رفتہ زائل ہوتی ہیں اور اسلام نے سابقہ ادیان وقوانین کو یکسر منسوخ کر دیا اور تمام قومی ومعاشرتی رسوم وعادات کو باطل کر دیا جو کہ اس کا فطری تقاضا بھی تھا) کیونکہ ہر نیا اصول وآئین اور طریقہ وضابطہ خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی جب وہ کسی قوم میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کا ہدف قدیم اصول وقوانین ہوتے ہیں کہ وہ انہیں جڑ سے کاٹ دیتا ہے اور اگر وہ جدید آئین وضابطہ مضبوط ہو جائے اور اپنی جڑیں پختہ کر لے۔ جو کہ حسن تربیت وحسن قبولیت پر منحصر ہے۔ تو دوسرے مرحلہ میں قدیم اصولوں وقوانین کی فروعات اور شاخوں کو کاٹتا ہوا یکے بعد دیگرے انہیں ختم کرتا چلا جاتا ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے اور جدید اصول وآئین قدیم اصولوں وقوانین کو مکمل طور پر ختم نہ کر سکے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں قدیم وجدید اصولوں وقوانین اور ضابطوں وعادات کا امتزاج عملی صورت اختیار کر لیتا ہے اور پھر ایک مرکب معجون وجود میں آجاتا ہے کہ جس میں کچھ قدیم اور کچھ جدید اصول شامل ہوتے ہیں جو کہ نہ پورے طور پر قدیم ہوتا ہے اور نہ جدید بلکہ ایک تیسری چیز بن جاتی ہے، بنا برایں خداوند عالم نے فرمان جاری کیا کہ تمام لوگ جو کچھ بھی زمین میں ہے اسے کھائیں اور خرافات وبے بنیاد باتوں کی وجہ سے بلاوجہ کوئی چیز اپنے لیے حرام قرار نہ دیں۔

آیت میں "لَا تَأْكُلُوْا" ذکر ہوا ہے "اکل" عربی زبان میں چبا کر نگل لینے کے معنے میں آتا ہے اور کبھی "اکل" (کھانے) کا لفظ اموال میں ہر طرح کا تصرف کرنے کے لیے بھی بطور کنایہ استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ "اکل" (کھانا) ہی انسانی افعال میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اسی پر انسان کی زندگی کا انحصار ودار ومدار ہے گویا وہ حیات انسانی کے لیے بنیادی ستون ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہ نساء، آیت ۲۹:

"لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ"

(تم اپنے اموال آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ باہمی رضامندی کا سودا ہو)

اس آیت میں "اکل" (کھانے) سے اس کا وسیع وجامع معنی مراد لینے میں بظاہر کوئی مانع دکھائی نہیں دیتا بلکہ اس کی تائید ملتی ہے کیونکہ "لَا تَأْكُلُوْا" (نہ کھاؤ) کسی قید وشرط کے بغیر ذکر ہوا ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیت کا معنی یوں ہے: اے لوگو! زمین نے جو نعمتیں خدا کے حکم سے تمہارے لیے مہیا کی ہیں ان نعمات خداوندی سے لطف اندوز ہو اور ان سے بھرپور استفادہ کرو کہ انہیں خداوند عالم نے تمہارے اختیار میں قرار دیا ہے، حلال وجائز اور پاک وپاکیزہ طور پر انہیں استعمال کرو یعنی انہیں کھانے یا انہیں استعمال میں لانے سے نہ تو تمہاری طبیعتوں اور نہ طبع زمین کی طرف سے کوئی مانع درپیش ہے، تمہاری طبع مزاجی انہیں کھانے اور انہیں استعمال میں لانے سے ہرگز نہیں روکتی اور نہ ہی وہ ایسی ہیں کہ انسانی مزاج ان کے کھانے کو پسند نہ کرتا ہو، گویا نہ تو وہ ایسی ہیں جنہیں تمہاری طبع ناپسند کرے اور نہ ہی تمہیں ان کے استعمال میں لانے اور استفادہ کرنے میں کوئی مانع درپیش ہے۔ البتہ طبع انسانی (طبع سلیم) اسی صورت میں انہیں کھانا ناپسند کرتی ہے جب وہ (غیر

شرعی اور) ناجائز طریقہ سے دستیاب ہوں۔

بنابرایں جملہ، "كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا" میں ہر چیز کے مباح ہونے اور اسے استعمال کرنے کا جواز کسی قید و شرط کے بغیر ثابت ہوتا ہے یعنی یہ کہ جو کچھ بھی زمین میں ہے اسے کھاؤ اور حلال و جائز طور پر اسے استعمال کرو اس سے بھرپور استفادہ کرو۔ لیکن اس کے بعد والے جملہ "وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ" سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں اور امور ایسے بھی ہیں جنہیں "خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ" (شیطان کے قدم) کہا گیا ہے کہ جن کا تعلق حلال و پاک کھانے ہی سے ہے ان سے دور رہنے اور ان کی پیروی نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ دو طرح سے قابل تصور ہیں: ایک یہ کہ نعمات الٰہی کے کھانے سے اجتناب کیا جائے یہ بھی شیطان کا اتباع ہے اور دوسرا یہ کہ انہیں کھایا اور استعمال میں لایا جائے (ناجائز طریقے سے)، یہ بھی شیطان کی پیروی کی ایک صورت ہے، اس کے بعد ایک قاعدۂ کلیہ اور عام ضابطہ و دستور یہ بیان کیا گیا کہ "خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ" یعنی شیطان کے قدم درحقیقت "سوء"، "فحشاء" اور "خدا پر افتراء پردازی" سے عبارت ہیں (اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ)، بنابرایں جس طرح بعض چیزوں اور نعمات الٰہی کے کھانے سے اجتناب کرنا جبکہ خدا نے اس (اجتناب کرنے) کا حکم نہ دیا ہو جائز نہیں اسی طرح اس کی عطا کردہ نعمتوں سے اس کی اجازت و حکم کے بغیر استفادہ کرنا بھی جائز نہ ہوگا لہٰذا کھانا اور نعمتوں سے استفادہ کرنا خدا کے اذن و اجازت پر موقوف و منحصر ہے اور زمین میں پائی جانے والی کوئی نعمت اس وقت تک حلال و جائز نہ ہوگی جب تک کہ اس کے کھانے اور استعمال کرنے کا حکم یا اجازت خداوند عالم نہ دے اور خدا نے اسی آیت مبارکہ (زیر بحث آیت) میں تمام نعمات الٰہی سے استفادہ کرنے کا عام اذن صادر فرما دیا ہے اور اس طرح کی دیگر آیات میں زمین میں موجود تمام نعمتوں کے کھانے اور استعمال میں لانے کی عام اجازت ذکر کی گئی ہے سوائے ان اشیاء و موارد کے کہ جن کا تذکرہ خاص طور پر مستقل آیات میں کیا گیا ہے مثلاً "اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ .... الخ" (تم پر مردار اور خون حرام کیا گیا ہے.....) کہ جس کی تفسیر اس کے اصل مقام میں ذکر کی جائے گی۔

بہر حال زیر بحث آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا کہ: اے لوگو! وہ تمام نعمتیں کھاؤ جو خدا نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کر دی ہیں کہ خدا نے وہ سب تمہارے لیے حلال و پاک قرار دی ہیں اور ان میں سے بعض نعمتوں کو بلاوجہ اپنے لیے حرام و ممنوع قرار نہ دو اور ان سے استفادہ کرنے اور انہیں کھانے سے اجتناب نہ کرو کہ ایسا کرنا "سوء"، "فحشاء" اور خدا پر افتراء پردازی ہے جو کہ تمہارے لیے روا نہیں کیونکہ وہ شیطان کی پیروی اور اس کے نقش قدم پر چلنے کا دوسرا نام ہے۔

زیر بحث آیت کی بابت اب تک جو مطالب ذکر کیے جا چکے ہیں ان کی روشنی میں درج ذیل چند اہم نکات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے:

۱۔ ہر چیز اور ہر کام حلال و جائز ہے سوائے ان اشیاء و امور کے کہ جن کی بابت مستقل دلیل موجود ہو کہ خداوندِ عالم نے انہیں حرام و ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح ہر چیز اور ہر کام کو جائز قرار دینے کا حق خدا کو حاصل ہے اسی

طرح حرام وممنوع قرار دینے کا حق بھی اسے حاصل ہے۔

۲۔ جس چیز کو خداوند عالم نے حلال قرار دیا ہے اسے بلا وجہ اور بغیر دلیل کے حرام قرار دے کر اس سے اجتناب کرنا جائز نہیں۔

۳۔ شیطان کے نقش قدم پر "چلنے" سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ان چیزوں یا کاموں کو لازم قرار دے جن کی بابت خدا نے اذن وحکم نہیں دیا، کچھ چیزوں یا کاموں کو اپنے لیے حرام قرار دے کر ان سے اجتناب کرے جبکہ خدا نے ان سے منع نہ کیا ہو۔ ورنہ خداوند عالم نے اصل راستہ چلنے کی ہرگز ممانعت نہیں فرمائی بلکہ اس طرح راستہ چلنے کی ممانعت کی ہے کہ انسان شیطان کے قدم بہ قدم چلے اور اس کا چلنا شیطان کے ساتھ چلنا کہلائے کہ اسے شیطان کا پیروکار اور اس کے نقش قدم پر چلنے والا کیا جائے، اس سے یہ مطلب بھی معلوم وواضح ہو جاتا ہے کہ آیت "إِنَّمَا يَأْمُرُكُم..." سے بظاہر یہ ثبوت ملتا ہے کہ ہر طرح سے شیطان کی پیروی ممنوع ہے خواہ فعل اور انجام دینے میں ہو یا ترک اور انجام نہ دینے میں! یعنی بغیر علم کے کوئی کام انجام دیا جائے یا بغیر علم کے کوئی کام ترک کیا جائے دونوں شیطان کی پیروی کے باب میں آتے ہیں لیکن آیت "كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ..." میں صرف دوسری شق یعنی بغیر علم کے ترک کرنے کو "اتباع خطوات الشیطان" (شیطان کے پیچھے قدم بہ قدم چلنے) کا نام دیا گیا ہے اور اسی سے ممانعت ونہی کی گئی ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں صرف اسی شق کو بیان کیا گیا ہے نہ کہ بغیر علم کے کوئی فعل انجام دینے کو بھی! اگرچہ یہ بھی شیطان کی پیروی کی ایک صورت ہے لیکن اسے "شیطان کے پیچھے قدم بہ قدم چلنا" نہیں کہا گیا۔

شیطان کی کارستانی

"إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ"

(وہ تمہیں برائی وفحشاء اور اللہ پر افتراء پردازی کا حکم دیتا ہے)

اس آیت میں تین چیزیں ذکر کی گئی ہیں:

(۱) سوء

(۲) فحشاء

(۳) قول بغیر علم (خدا پر افتراء پردازی)

پہلی دو (سوء اور فحشاء) کا تعلق فعل وعمل سے ہے جبکہ تیسری بولنے اور کہنے سے مربوط ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیطان جس چیز کا بھی حکم دیتا ہے وہ صرف وہی افعال ہیں جو "سوء" اور "فحشاء" کا مصداق ہیں اور وہی گفتار و بیان ہے جو "قول بغیر علم" سے عبارت ہے۔

خدا کی پیروی کی بجائے آباء واجداد کی پیروی

○ "وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا......الخ"

(اور جب ان سے کہا گیا کہ تم اس کی پیروی کرو جو خدا نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں: بلکہ ہم اس کی پیروی کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا)

'اَلْفَيْنَا' 'الفاء سے ہے اس کا معنی ہے پانا، تو "اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا" سے مراد یہ ہوگا "وجدنا علیه آبائنا" یعنی جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا، یہ آیت اس مطلب کی تصدیق کرتی ہے جو سابقہ آیت میں "خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ" کے معنی ومراد کی بابت ذکر کیا جا چکا ہے۔

جاہل و گمراہ آباء کا اتباع

○ "اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ"۔

(خواہ ان کے آباء علم اور ہدایت سے بے بہرہ ہی کیوں نہ ہوں؟)

یہ جملہ درحقیقت کفار کی اس بات کے جواب میں ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم تو اپنے باپ دادا کے کردار و گفتار اور قول و فعل کی پیروی کرتے ہیں، قرآن مجید نے اس جملے میں ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کیا کہ ان کی بات عقل کے منافی ہے اور یہ "قول بغیر علم" (جاہلانہ بات) کا مصداق بھی ہے کیونکہ ان کا یہ کہنا کہ "ہم اسی چیز کی پیروی کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا" "مطلق اور کسی قید و شرط سے خالی" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کو خواہ وہ جس حال میں بھی تھے اور جو کچھ بھی کرتے تھے پیروی کرتے ہیں اور خواہ وہ کچھ نہ جانتے اور نہ ہدایت یافتہ تھے اس کے باوجود ہم کہتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ حق اور صحیح ہے! یہ بات "قول بغیر علم" کے سوا کچھ نہیں بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس طرح کی بات جاہل تو جاہل کوئی عقلمند بھی نہیں کرسکتا بشرطیکہ وہ اس کی اصل حقیقت و معنی میں غور کرے، ہاں اگر وہ اپنے آباء واجداد کی پیروی ان چیزوں میں کرتے جن کی بابت وہ علم و آگاہی کے حامل اور ہدایت یافتہ تھے تو ان کی پیروی "علم و ہدایت" کی بنیاد پر ہوتی کہ جسے جاہلانہ اتباع نہ کہا جاتا۔

اس بیان سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کا یہ ارشاد گرامی "لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ" کہ "وہ کچھ بھی نہیں جانتے اور نہ ہی ہدایت یافتہ ہیں" کسی مبالغہ پر مبنی نہیں جیسا کہ بعض حضرات گمان کرتے ہیں کہ یہ بات مبالغہ آرائی ہے کیونکہ یہ کہنا کہ "وہ کچھ بھی نہیں جانتے" سرے سے ان کے علم و آگاہی کی نفی ہے جبکہ وہ کچھ تو جانتے ہی تھے بلکہ اپنی زندگی میں کئی چیزوں کو جانتے تھے، اس جملہ کا مبالغہ پر مبنی نہ ہونا یوں ہے کہ یہ بات فرض و تصور کے طور پر کی گئی ہے اور

گویا اس طرح کہا گیا ہے" آیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ باپ دادا کی پیروی ہر صورت میں ضروری ہے خواہ وہ کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہی ہدایت یافتہ ہوں"، تو " لَا يَعْقِلُونَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ" درحقیقت ان لوگوں کی بات کا جواب ہے جو یہ کہتے تھے" ہم تو صرف اسی کی پیروی کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے آباؤ واجداد کو پایا ہے" کیونکہ وہ اپنے باپ دادا کی پیروی کرنا بطور مطلق ضروری سمجھتے تھے اس لیے خدا نے فرمایا کہ خواہ ان کے باپ دادا علم و ہدایت سے بے بہرہ بھی ہوں تب بھی یہ ان کی پیروی کریں گے؟

کافروں کے حوالہ سے ایک مثال

" وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً "۔

(کفر اختیار کرنے والوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جو اسے آواز دیتا ہے جو سوائے بلائے جانے کی آواز اور پکار کے کچھ نہیں سنتا)

لفظ" مثل" کا معنی ہے کہاوت، مقولہ اور ضرب المثل، اور کبھی صفت و حالت کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

سورہ فرقان، آیت ۹:

" اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا "...،

(دیکھو انہوں نے کیسی مثالیں تیرے لیے ذکر کی ہیں پس وہ گمراہ ہو گئے ہیں اب وہ سیدھا راستہ نہیں پا سکتے)۔

" نعیق"، چرواہے کی اس آواز کو کہتے ہیں جو وہ اپنی بھیڑ بکریوں کی سرزنش اور انہیں ڈرانے کے لیے نکالتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: " نعق الراعی بالغنم ینعق نعیقا" (چرواہے نے بھیڑ بکریوں کو آواز دی، سخت چلایا) یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ جانوروں کو زور زور سے آواز دے اور انہیں ڈرانے کے لیے چیخے چلائے۔

" نداء" مصدر ہے نادیٰ ینادی مناداۃ " سے، (نادیٰ: اس نے بلایا' ینادی: وہ بلاتا ہے، مناداۃ: بلانا)، یہ لفظ (نداء) لفظ" دعاء" سے زیادہ خاص معنی کا حامل ہے کہ اس میں بلند آواز سے بلانے یا پکارنے کا معنی پایا جاتا ہے جبکہ " دعاء" میں ایسا نہیں کیونکہ اس میں صرف" بلانے" کا معنی پایا جاتا ہے، بنابریں آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا: " تیری مثال ان کافروں کو دعوتِ حق دینے۔ حق کی طرف بلانے۔ کے حوالہ سے اس شخص کی ہے جو چوپایوں کو بلند آواز سے پکارتا ہے مگر وہ اس کے چیخنے اور چلانے سے کچھ بھی نہیں سنتے سوائے ایک آواز اور پکار کے، اور وہ جوں ہی اس کی آواز سنتے ہیں تو مچلنے لگتے ہیں اور خوفزدہ ہو کر رک جاتے ہیں گویا کہ وہ بہرے ہیں جنہیں کچھ سنائی نہیں دیتا اور جو بات ان کے لیے فائدہ مند ہے وہ اسے سن ہی نہیں سکتے، گونگے ہیں اور کوئی اچھی و مفید بات کر نہیں سکتے اور اندھے ہیں کہ انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا، خلاصہ یہ کہ

وہ کچھ سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ فہم وادراک اور تعقل کے تمام راستے ان پر بند ہو چکے ہیں۔

مذکورہ بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آیت میں مذکور مثال میں ایک طرح کا الٹ پلٹ (جسے اصطلاح میں ''قلب'' کہتے ہیں) یا اس سے مشابہ امر پایا جاتا ہے اور وہ یوں کہ ارشاد ہوا: کافروں کی مثال اس شخص جیسی ہے جو پکار کر۔ چلا کر۔ بلا رہا ہے مگر اس کی آواز اور پکار کے سوا کوئی کچھ نہیں سنتا، تو اس میں پکارنے والے کی مثال چرواہے کے ساتھ دی گئی ہے نہ کہ کافروں کی، (پکارنے والے کو اس چرواہے جیسا ذکر کیا گیا ہے جس کی پکار اور صرف آواز کے سواء کوئی کچھ نہیں سنتا) جبکہ آیت کے ظاہری الفاظ میں اس کے بالکل الٹ بات ہے کیونکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ کافروں کی مثال اس شخص جیسی ہے جو پکار رہا ہے مگر کوئی اس کی بات سوائے اس کی پکار کے نہیں سنتا، حالانکہ پکارنے والا رسول خداؐ ہے جو کافروں کو حق کی طرف بلا رہا ہے لیکن جو تین اوصاف مثال کے نتیجہ کی صورت میں ذکر کیے گئے ہیں (بہرے، گونگے، اندھے) چونکہ وہ کافروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثال کافروں کی ہے کہ وہ ایسے ہیں کہ جنہیں کوئی شخص حق کی طرف بلاتا ہو اور وہ اس کی بات نہ سنتے ہوں سوائے اس کی آواز اور پکار کے، نہ کہ اس شخص کی مثال جو انہیں بلا رہا ہے۔ بنابرایں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیت کے الفاظ میں ''قلب'' یعنی الٹ پلٹ جیسی صورت پائی جاتی ہے۔

روایات پر ایک نظر

بیٹے کے ذبح کرنے کی قسم

کتاب تہذیب میں عبدالرحمان سے منقول ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ اس شخص کے بارے میں فرمائیں جس نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی قسم کھائی ہو امامؑ نے فرمایا: یہ ''خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ'' کے باب سے ہے۔

طلاق، عتق اور نذر کی قسم

منصور بن حازم سے منقول ہے کہ مجھ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: آیا تو نے طارق کا واقعہ سنا ہے؟ طارق مدینہ کا ایک بردہ فروش شخص تھا ایک دفعہ وہ ابوجعفر (امام محمد باقرؑ) کی خدمت سے حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں نے

طلاق، عتق (غلام آزاد کرنے) اور نذر کی قسم کھائی ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ امامؑ نے فرمایا: اے طارق یہ سب "خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ" (شیطان کے قدموں اور اس کی پیروی) کے باب سے ہے۔

تفسیر "عیاشی" میں امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا: خدا کے سوا جس کی قسم بھی کھائی جائے وہ "خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ" کے باب سے ہے۔

کسی کام کے ترک کرنے کی قسم

"کافی" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی چیز کے ترک کرنے کی قسم کھائے جبکہ اس کا انجام دینا اس کے ترک کرنے سے بہتر ہو تو اسے چاہئے کہ اس کام کو انجام دے کہ جو بہتر ہے اور اس پر۔ اس قسم کا۔ کوئی کفارہ نہیں، کیونکہ اس طرح کی قسم کھانا "خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ"۔ شیطان کے نقش قدم پر چلنے کے باب سے ہے۔

تبصرہ و توضیح:

مذکورہ بالا احادیث و روایات سے۔ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ "خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ" سے مراد وہ اعمال ہیں جو بظاہر قربۃً الی اللہ کی نیت سے انجام دیئے جائیں جبکہ وہ قرب الٰہی کے موجب نہ ہوں کیونکہ شریعت میں ان کی کوئی حیثیت نہیں (شرعی لحاظ سے انہیں قرب الٰہی کا موجب قرار نہ دیا گیا ہو) جیسا کہ "وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ" کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے، اور جہاں تک طلاق وغیرہ کے باطل ہونے کا تعلق ہے تو اس کی ایک اور وجہ ہے اور وہ یہ کہ جو طلاق قسم پر مشتمل ہو وہ معلق و مشروط ہوتی ہے جبکہ علم ادب و قواعد میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ انشاء میں ہر طرح کی قید و شرط اس کے منافی ہوتی ہے لہٰذا اطلاق جیسے امور کو مشروط نہیں کیا جا سکتا کیونکہ طلاق عقد نہیں بلکہ انشاء ہے اس لیے اسے مشروط اور کسی چیز سے مقید و معلق نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ باطل ہوگی، بہر حال یہ فقہی مسئلہ ہے اس کی مزید وضاحت علم فقہ میں مذکور ہے، خدا کے علاوہ کسی کی قسم کھانا کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا لہٰذا "غیر اللہ کی قسم" سے مراد وہ قسم ہے جسے شرعی قسم قرار دے کر اس پر شرعی احکام لاگو کیے جائیں یا ان چیزوں کی قسم کھانا مراد ہے جن کی قسم خدا نے نہیں کھائی اور نہ ہی ان کی کوئی عظمت و حرمت ہے۔

تمثیل کی واضح تشریح

تفسیر "مجمع البیان" میں آیت "وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ ...... الخ" کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ اے میرے نبی! ان کافروں کی مثال تیری دعوت حق و ایمان کے حوالہ سے ایسی ہے جیسے چرواہا اپنے ریوڑ کو آواز دیتا ہے مگر وہ اس کی آواز سننے کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے۔

ایک اخلاقی و معاشرتی بحث

سہیل سکینہ
حیدرآباد لطیف آباد یونٹ نمبر ۹

انسان کے عقائد و نظریات دو طرح کے ہوتے ہیں:

ایک: وہ جو صرف فکر و نظر سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا عمل سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا جیسے ریاضیات، طبیعیات اور ماوراء الطبیعہ سے تعلق رکھنے والے مسائل۔

دوسرے: وہ جو براہِ راست عمل سے تعلق رکھتے ہیں جیسے علم فقہ و اخلاق سے تعلق رکھنے والے مسائل کہ جن میں یہ بحث ہوتی ہے کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے،

پہلی قسم کے عقائد و آراء کی بنیاد صرف علم و یقین کی پیروی ہے کہ جس کا سرچشمہ عقلی و حسی (طبیعی) دلائل ہیں، اور دوسری قسم کی بنیاد، عمل کا انسان کی سعادت و خوش بختی کے حصول کی راہ میں مؤثر ہونا اور ان چیزوں سے دوری اختیار کرنا جو انسان کی بدبختی و شقاوت اور سعادت سے محرومیت کا سبب ہوں، لہٰذا وہ عقائد و نظریات جن کی بنیاد علم و یقین نہ ہو (پہلی قسم میں) اور اسی طرح وہ کہ جن میں انسان اپنے لیے خیر و شر اور نفع و نقصان کا علم نہ رکھتا ہو (دوسری قسم میں) انہیں خرافات و بے بنیاد اعتقادات کہا جائے گا، اور چونکہ انسان کے عقائد و نظریات کی بنیاد و سرچشمہ اس کے فطری تقاضے ہیں کہ جو اسے ہر چیز کی علت و سبب سے آگاہی کے حصول کی ترغیب دلاتے ہیں اور عملی طور پر اس کی طبع وجود اسے اس کے حقیقی کمال کے حصول کی دعوت دیتی ہے لہٰذا وہ ہرگز کسی بے بنیاد نظریے اور جہالت پر مبنی اعتقادات و آراء کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا البتہ کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ نفسانی جذبات و باطنی احساسات کہ جنہیں اس کی قوت خیال برانگیختہ کرتی ہے۔ بالخصوص خوف و امید۔ اس امر کا سبب بنتے ہیں کہ وہ بعض امور میں بے بنیاد نظریات و خرافات پر مبنی آراء و عقائد اپنا لیتا ہے اور وہ یوں کہ قوتِ خیال بعض خوف انگیز یا امید بخش صورتیں اس کے آئینہ نگاہ میں ثبت کر دیتی ہے کہ جن کی وجہ سے خوف یا امید کی حس بھڑک اٹھتی ہے اور ان صورتوں کو اپنے دامن احساس میں چھپا لیتی ہے اور انہیں خوفزدہ یا پرامید نفس سے ہرگز جدا نہیں ہونے دیتی بلکہ ہر لحہ انہیں نگاہِ نفس کے سامنے رکھتی ہے مثلاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی تاریک اور خوفناک و وحشت انگیز جنگل و بیابان میں پھنس جاتا ہے اور تنہا و بے یار و مددگار ہوتا ہے کوئی اسے تسلی و سہارا دینے والا نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے کوئی ایسا وسیلہ و ذریعہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ روشنی وغیرہ کی مدد سے خوفناک و پرخطر جگہوں یا چیزوں کی پہچان کر کے ان سے بچ سکے تو اس حالت میں اس کی قوتِ خیال اپنا کام شروع کر دیتی ہے اور جو شکل بھی اس کے سامنے آتی ہے اسے ہیبت ناک صورت میں اس کے سامنے مجسم کر دیتی ہے یہاں تک کہ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ چیز اسے ہلاک کرنا چاہتی ہے یا کوئی روح ہے جو اس کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتی ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس کی قوتِ خیال ایسی شکلیں و صورتیں اس کے سامنے مجسم کرتی ہے کہ

وہ انہیں چلتا پھرتا، آتا جاتا، آسمان کی طرف اڑتا اور زمین پر اترتا محسوس کرنے لگتا ہے اور وہ گونا گوں وعجیب وغریب حالتوں میں اسے دکھائی دیتی ہیں اور اس طرح اس کی لوح فکر وتصور میں ثبت ہو جاتی ہیں کہ جب بھی وہ اس جیسے ماحول میں ہوتا ہے تو وہ تمام صورتیں اس کے سامنے مجسم ہو جاتی ہیں اور اس پر خوف ووحشت کی حالت طاری ہو جاتی ہے، پھر وہ ان تمام حالتوں کو جب کسی دوسرے شخص کے سامنے بیان کرتا ہے تو اس میں بھی اسی طرح کے خیالات وتصورات اور احساسات وجود میں آجاتے ہیں یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے اور رفتہ رفتہ یہ احساسات ایک بے بنیاد عقیدہ اور خرافی نظریہ کا روپ دھار لیتے ہیں اور لوگوں میں پھیل جاتے ہیں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی دفاعی حس حرکت میں آجاتی ہے اور اسے ایسے اعمال انجام دینے کی ترغیب دلاتی ہے جن سے وہ اس خیالی چیز کے شر سے بچ سکے لہٰذا وہ پھر خرافات وبے بنیاد کاموں کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور من گھڑت نظریات پر مبنی اعمال انجام دیتا ہے اور دوسروں کو بھی ان کی تعلیم دیتا ہے کہ جو رفتہ رفتہ ایک مستقل باطل عقیدہ و اوہام پرستی کے نظریہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ انسان قدیم زمانہ سے اوہام پرستی کی لعنت کا شکار ہوتا چلا آرہا ہے اور اب تک یہ صورت حال باقی ہے اور ایسا بھی نہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات گمان کرتے ہیں۔ کہ یہ اوہام پرستی اور باطل خیالی نظریات صرف مشرق کے باسیوں میں پائے جاتے ہوں بلکہ اہل مغرب بھی اوہام پرستی میں اگر مشرق والوں سے زیادہ مبتلا نہ ہوں تو کم بھی نہیں ہیں۔ تاہم ہر قوم کے اہل دانش وصاحبان علم اور بزرگان ومصلحان ملت گونا گوں وسائل وذرائع کو بروئے کار لاکر اور مؤثر انداز میں نصیحتوں اور لطائف الحیل کے ذریعے ان خرافات وباطل نظریات اور اوہام پرستی کے بے بنیاد عقائد ورجحانات کو ختم کرنے اور ان کی بیخ کنی کے لیے کوشاں رہتے ہیں جو عوام الناس میں پھیلے ہوئے ہیں اور لوگوں کے دل ودماغ میں گھر کر چکے ہیں لیکن افسوس صد افسوس کہ اس مہلک بیماری نے معالجوں کو تھکا دیا ہے اور وہ ابھی تک انسانی معاشرے میں سرطان کی مانند پھیلی ہوئی ہے کیونکہ انسان ایک طرف تو عقائد ونظریات اور حقائق سے آگاہی کی بابت دوسروں کی تقلید وپیروی سے بے نیاز وبے بہرہ نہیں اور دوسری جانب احساسات ونفسانی جذبات وعواطف اس کا دامن نہیں چھوڑتے لہٰذا علماء ومصلحین کی تمام تر کوششوں کے باوجود ابھی تک اس تباہ کن بیماری کا کوئی علاج مؤثر ثابت نہیں ہوا، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی علوم جدیدہ کے ارباب تحقیق اور متمدن دانشور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "آج کا علم حس وتجربہ کی بنیاد پر قائم ہے اور جو چیز حس وتجربہ کے ذریعے قابل ادراک نہیں اسے رد کرتا ہے اور تہذیب وتمدن کی بنیاد بھی معاشرتی کمالات کے حصول کی کوشش ہے جہاں تک بھی حصول کمال ممکن ہو اور افراد معاشرہ کی تربیت کا نظام بھی اسی پر قائم ہے"۔ ان دانشوروں نے اپنے اس نظریہ کی بنیاد پر یہ سمجھ لیا ہے کہ اس سے خرافات واوہام پرستی کا خاتمہ ہو گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ نظریہ بذات خود خرافات کے اتباع سے عبارت ہے کیونکہ علوم طبیعی کا دائرۂ عمل موجودات ہستی کی طبیعی خصوصیات واحوال سے بحث کرنے تک محدود ہے اور دوسرے لفظوں میں یہ کہ مادی علوم ہمیشہ "مادہ" کے اسرار و خصوصیات سے پردہ اٹھاتے ہیں اور اس سے مربوط احوال واوصاف کو بیان کرنے تک محدود ہیں اور جہاں تک غیر مادی امور کا تعلق ہے تو یہ علوم ان کی نفی یا اثبات کی بابت کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے لہٰذا جو چیز حس وتجربہ کی دسترس سے باہر ہو تو کسی

دلیل کے بغیر اس کی نفی اور موجود نہ ہونے کا عقیدہ رکھنا بذات خود سب سے واضح خرافات ہے، اسی طرح یہ کہنا کہ تہذیب و تمدن کی بنیاد معاشرے کا حصولِ کمال ہے خرافات سے کم نہیں کیونکہ اس طرح معاشرے کا حصول کمال وسعادت عام طور پر بعض افراد کے اپنی زندگی اور انفرادی سعادت سے محرومی کا سبب بنتا ہے مثلاً کوئی شخص اپنے وطن کے دفاع و قانون کی پاسداری وغیرہ کے لیے اپنی جان کی قربانی دے اور اپنی سعادت کو معاشرے کے وقار و سربلندی پر قربان کردے تو اس طرح کی شخصی و انفرادی محرومیتوں پر کوئی شخص راضی نہیں ہوسکتا سوائے اس کے کہ وہ ان کو اپنے لیے ''کمال'' سمجھتا ہو حالانکہ حقیقت میں یہ محرومیتیں اس کے لیے ''کمال'' نہیں بلکہ محرومی ہی محرومی ہے اور اگر نہیں کمالات مان بھی لیا جائے تو وہ حقیقت میں معاشرے کے لیے کمالات ہوں گے کہ جنہیں اس نے اپنے لیے کمالات سمجھ لیا ہے اور انفرادی و شخصی محرومیت کو اپنے لیے کمال کا نام دے دیا ہے جو کہ انتہائی غیر معقول بات اور خرافات ہے کیونکہ عدم اور محرومیت کو کمال کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، اور پھر یہ کہ انسان معاشرے کو اپنے لیے چاہتا ہے نہ کہ خود کو معاشرے کے لیے!۔ بنابریں یہ تمام موارد جو ذکر کیے گئے ہیں اشتباہ، غلط فہمی اور بے بنیاد نظریات و خرافات کے سوا کچھ نہیں کہ انفرادی محرومی کو ''کمال'' کا نام دے دیا جائے، چنانچہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگوں کو معاشرے میں گوناگوں طریقوں سے دھوکہ دیا جاتا ہے اور انہیں انفرادی محرومی کو قبول کرنے کی ترغیب دلانے کے لیے مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ انسان فداکاری و جانبازی اور اپنی جان کا نذرانہ دے کر نیک نامی اور تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنا نام و تذکرہ زندہ و جاوید کرسکتا ہے اور اس طرح اسے دائمی سعادت و ابدی حیات مل سکتی ہے وغیرہ وغیرہ، تو یہ باتیں درحقیقت خرافات ہیں کیونکہ اس طرح کی باتیں کرنے والے پہلے تو خود اس بات کے قائل نہیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے اور دوسری بات یہ کہ اس طرح مرنے اور فنا ہوجانے کے بعد کون سی معاشرتی زندگی ہے کہ جسے ہم ''زندگی'' کہتے ہیں، آیا یہ ایک فرضی وخیالی چیز نہیں کہ جس میں کوئی حقیقت نہیں پائی جاتی؟

اس مقام پر ایک بات کی طرف اشارہ ضروری ہے جو کہ مذکورہ مطلب کی طرح خرافات کے سوا کچھ نہیں اور وہ یہ کہ کہا جاتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اجرائے قانون کی تلخی کہ جس کے سبب اس کی ذاتی خواہشات پوری نہیں ہوسکتیں اور وہ شخصی محرومیوں کا شکار ہوجاتا ہے اس پر صبر کرے تاکہ معاشرے کا تحفظ ہوسکے اور وہ (معاشرہ) ''کمال'' پائے، گویا یہ سمجھ لے کہ معاشرے کا کمال ہی اس کا کمال ہے۔

آیا یہ بات خرافات نہیں تو کیا ہے؟ کیونکہ معاشرے کا کمال اسی صورت میں اس کا کمال ہوگا جب وہ دونوں کمال یکجا ہوں لیکن اگر ایسا نہ ہو بلکہ معاشرے کا کمال فرد کی محرومی کا سبب بنے تو اسے فرد کا کمال کیونکر کہا جاسکتا ہے، بنابرایں اگر کوئی فرد یا قوم خواہ طاقت و ظلم کے ذریعے ہی سہی اپنے مقاصد وخواہشات کو پالے تو وہ فرد اپنے ''کمال'' کو معاشرے کا کمال اور وہ قوم اپنے کمال کو دوسری قوموں کا کمال کیوں قرار دے؟ اور صرف نیک نامی کے خیالی کمال کے پیشِ نظر اپنے اصلی وحقیقی کمال سے کیوں محروم ہو؟ جیسا کہ قوموں کے طاقتور افراد کا طریقہ کار ہمیشہ سے یہی چلا آرہا ہے کہ وہ کمزور و ناتوان طبقے کو اپنا غلام بناکر ان کی زندگیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں ہر طرح کی ذلت وخواری سے دوچار کرکے اپنے مقاصد کی

تکمیل کے لیے انہیں استعمال کرتے ہیں اور انہیں ان کی زندگی سے محروم کر دیتے ہیں، آیا نیک نامی اور معاشرے کی بقاء کے لیے قربانی کے نام پر کسی فرد یا قوم کی محرومی کو اس کا کمال قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ خرافات نہیں تو کیا ہے؟

لیکن اس سلسلے میں جو روش قرآن مجید نے اپنائی وہ یہ ہے کہ انسان عقائد و نظریات کے باب میں صرف اسی بات کو تسلیم کرے جو خدا نے ارشاد فرمائی اور نازل کی ہے (ما انزل اللہ) اور اس کے علاوہ کوئی بات علم و یقین کے بغیر قبول نہ کرے اور نہ اس کا قائل ہو، اور عمل کے باب میں بھی صرف احکام الٰہی کی پیروی کرے اور خدا سے ہی اپنے اعمال کے اجر کا خواہاں ہو کہ اگر ان کے ذریعے اس کی نفسانی خواہشات اور آرزوں کی تکمیل ہو جائے تو اس میں اس کی دنیاوی و اخروی سعادت ہے اور اگر مادی لذتوں سے محروم ہو تو خداوندِ عالم کے پاس اس کا اجر محفوظ ہے جو کہ ہر اجر و کمال سے زیادہ بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی ملاحظہ فرمائیں کہ علوم حسی کے دلدادہ اور حس و تجربہ کو ہر چیز کی اصل و اساس قرار دینے والے حضرات کہتے ہیں کہ دین کی پیروی ایک طرح کی تقلید (لکیر کا فقیر ہونا) ہے جو کہ علم کی رو سے درست نہیں اور علم اس سے منع کرتا ہے اور اس طرح کی تقلیدیں دراصل ان چار دورانیوں میں سے دوسرے دورانیہ کے خرافات کا حصہ ہیں جو تخلیق بشر سے اب تک حیات انسانی میں آئے ہیں (یاد رہے کہ چار دورانیوں سے مراد یہ زمانے ہیں: داستانوں اور قصہ و کہانیوں کا دور، مذہب کا دور، فلسفہ کا دور، علم کا دور، اور آج کا یہ دور کہ جس میں انسان زندگی بسر کر رہا ہے علم کا دور اور خرافات کو دُور پھینک دینے کا زمانہ ہے)

یہ ہے ان حضرات کا نظریہ! جو کہ بذاتِ خود جاہلانہ اور علم سے عاری بات اور خرافات پر مبنی عقیدہ ہے تفصیل ملاحظہ ہو:

(۱) وہ کہتے ہیں کہ ''دین کی پیروی ایک طرح کی تقلید ہے''۔

ان کی یہ بات سرے ہی سے غلط ہے کیونکہ ''دین'' ایک جامع آئین و دستور حیات ہے کہ جس میں مبداء و معاد (سرچشمۂ وجود و منزلِ مقصود) یعنی خدا اور قیامت سے مربوط معارف و حقائق اور معاشرتی قوانین و احکامات مثلاً عبادات و معاملات جو کہ بذریعہ وحی و بوسیلۂ نبی و پیغمبر ہم تک پہنچے ہیں، اور اس طرح کے دیگر امور پائے جاتے ہیں اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مبداء و معاد (خدا و قیامت) سے تعلق رکھنے والے عقائد کی بنیاد علم و یقین اور عقلی دلائل ہیں اور عبادات و معاملات کے قوانین و احکام بھی چونکہ وحی کے ذریعے اور بوسیلہ نبی کہ جس کی صداقت واضح و ناقابل انکار علمی دلائل سے ثابت ہوئی، حاصل ہوئے ہیں لہٰذا وہ بھی علم و یقین پر مبنی ہیں اور ان کی پیروی حقیقت میں علم کی پیروی ہے اور جو بات سچے نبی نے بیان فرمائی ہے اسے تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا عقلی فیصلہ اور علم کا اتباع ہے۔ بنابرایں دین کی پیروی تقلید نہیں بلکہ حق و حقیقت کو علم و یقین کے ساتھ تسلیم کرنے سے عبارت ہے،

بہر حال تقلید کی بابت سورۂ بقرہ ہی کی آیت ۶۷ (واذقال موسیٰ لقومہٖ ان اللہ یأمرکم ان تذبحوا

بقرۃ...) کی تفسیر میں تفصیلی مطالب ذکر کیے جا چکے ہیں، رجوع فرمائیں۔

(۲) تعجب کی بات یہ ہے کہ دین کی پیروی کو تقلید کا نام ان لوگوں نے دیا ہے جو خود اپنے اصول زندگی و معاشرتی رسم و رواج اور معمولات حیات مثلاً کھانے پینے، پہننے، رہنے سہنے، مناکحت وغیرہ تک کے مسائل میں اندھی تقلید اور نفسانی خواہشات کی اندھا دھند پیروی کا شکار ہیں، البتہ انہوں نے جو بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ یہ کہ تقلید کا نام بدل کر اسے ایک ایسے نام سے موسوم کیا ہے جس میں اندھی تقلید کی اصل روح پوشیدہ ہے یعنی ''ترقی یافتہ دنیا کے رسم و رواج کو اپنانا''، یہ ہے وہ نام جو انہوں نے تقلید کی بیخ کنی کے لیے منتخب و تجویز کیا ہے کہ جس کے نتیجہ میں تقلید کا نام تو ختم ہو گیا مگر اس کی حقیقت باقی رہ گئی بلکہ پختہ ہو گئی اور لفظ مٹ گیا مگر معنی باقی رہ گیا، تقلید کے لفظ کا استعمال ترک کر دیا گیا مگر اس کے معنی و مفہوم اور حقیقی روح کو اپنا لیا گیا، اور ''دوسروں جیسے ہو جاؤ'' کا نعرہ لگا کر اسے علمی و ترقی یافتہ و متمدن رنگ دے دیا گیا اور قرآنی نعرہ ''وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ ''۔ سورہ ص، آیت ۲۶ (ہویٰ و ہوس اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں گمراہ کر دے گی۔) کو دینی تقلید اور خرافات قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا۔

(۳) انہوں نے حیات انسانی کے چار دورانیے ذکر کیے ہیں یہ بھی صحیح نہیں بلکہ نہایت بے بنیاد بات ہے اور تاریخ ادیان و فلسفہ اس کی تکذیب کرتی ہے اور یہ درست نہیں کہ فلسفہ کا دور دین و مذہب کے دور کے بعد تھا۔ کیونکہ دین ابراہیمیؑ کا ظہور اس وقت ہوا جب ہندوستان و مصر و کلدان میں دورِ فلسفہ ختم ہو چکا تھا اور دین عیسیٰؑ عہد فلسفۂ یونان کے بعد ظہور پذیر ہوا اور آفتاب دین محمدیؐ۔ اسلام۔ دورِ فلسفۂ یونان اور اسکندریہ کے بعد طلوع ہوا، خلاصہ یہ کہ عہد فلسفہ ظہور دین کے عہد سے پہلے تھا اور فلسفہ کے عروج کا دورانیہ دین و مذہب کے عروج سے بہت پہلے تھا اس لیے فلسفہ کو ظہور دین پر زمانی تقدم حاصل ہے جبکہ ان حضرات نے اپنے چار دورانیوں میں عہد مذہب کو عہد فلسفہ سے پہلے ذکر کیا ہے، اور یہ بات بارہا ذکر ہو چکی ہے کہ دینِ توحید عہد و زمانے کے لحاظ سے دیگر تمام ادیان سے مقدم و پہلے ہے۔ اور جہاں تک حیات انسانی کی تاریخ کی بابت قرآنی بیانات کا تعلق ہے تو ان کے مطابق اس کے دو دورانیے ہیں: ایک عہد وحدتِ اقوام و اتحادِ امم اور عصر سادگی اور دوسرا عہدِ حس و مادہ، اس موضوع کی بابت تفصیلی تذکرہ آیت مبارکہ: ''كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ...'' سورہ بقرہ، آیت ۲۱۳: (سب لوگ امتِ واحدہ تھے پھر خدا نے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا......) کی تفسیر میں ہوگا۔ انشاءاللہ تعالیٰ،

آیات ۱۷۲ تا ۱۷۶

○ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِلّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ
اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾

○ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيۡرِ اللّٰهِ ۚ
فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۷۳﴾

○ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَشۡتَرُوۡنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ۙ
اُولٰٓئِكَ مَا يَاۡكُلُوۡنَ فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيۡهِمۡ ۖۚ
وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۷۴﴾

○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى وَالۡعَذَابَ بِالۡمَغۡفِرَةِ ۚ فَمَاۤ
اَصۡبَرَهُمۡ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

○ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِى الۡكِتٰبِ لَفِىۡ
شِقَاقٍ بَعِيۡدٍ ﴿۱۷۶﴾

ترجمہ

○ "اے اہل ایمان! ہم نے جو پاک رزق تمہیں دیا ہے اس میں سے۔ جو چاہو۔ کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر صرف اسی کی عبادت کرتے ہو۔" (۱۷۲)

○ "اللہ نے تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جو جانور غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا ہو سب حرام کیے ہیں، پس جو شخص حالتِ اضطرار و مجبوری میں ہو کہ نہ تو ظالم و سرکش ہو اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہو تو ان چیزوں کے کھا لینے میں اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا، خدا تو گناہ معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے"۔ (۱۷۳)

○ "جو لوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں جو خداوند عالم نے کتاب میں نازل کیے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت وصول کرتے ہیں (اپنے اس عمل کو دنیا کے نہایت ناچیز مال سے بیچتے ہیں) ایسے لوگ اپنے شکم میں جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں ڈالتے، خدا قیامت کے دن ان سے بات ہی نہیں کرے گا اور نہ انہیں اس گناہ سے پاک کرے گا بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے۔" (۱۷۴)

○ "انہی لوگوں نے گمراہی کو ہدایت کے عوض اور عذاب کو مغفرت کے بدلے میں خریدا ہے یہ لوگ آتش جہنم پر کتنے بے باک و جری ہیں۔" (۱۷۵)

○ "یہ سب اس لیے ہے کہ خدا نے کتاب کو برحق اور حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور جن لوگوں نے کتاب الٰہی میں اختلاف کیا وہ یقیناً نہایت پراگندگی و گمراہی میں ہیں۔" (۱۷۶)

تفسیر و بیان

پاک و طیب رزق کھانے کا حکم

○ "یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ..."

(اے ایمان والو! تم اس پاک رزق سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے)

اس آیت میں خداوند عالم نے خاص طور پر مؤمنین کو مخاطب کر کے بات کی ہے جبکہ اس سے پہلے آیت (۱۶۸) میں بالعموم سب لوگوں کو مخاطب کیا تھا، اور یہ بیان کا ایک مخصوص انداز ہے جسے علم البیان میں **"انتزاع الخطاب من الخطاب"** کہا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بات کرنے والا اپنے سلسلۂ بیان میں اپنے مخاطب افراد کے بجائے کسی اور کو مخاطب کر کے بات کرنے لگے، گویا پہلے مخاطب کیے گئے افراد کے بارے میں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ سب اس کی بات پر کان دھرنے والے نہیں اس لیے اپنا روئے سخن ان میں سے ان چند افراد کی طرف کرتا ہے جن میں توجہ اور عملی اقدام کا جذبہ دیکھتا ہے۔ چنانچہ ان دو آیتوں (۱۶۸ اور ۱۷۲) میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ خداوند عالم نے پہلے بالعموم تمام انسانوں کو مخاطب کر کے (یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ) کہہ کر بات کی اور جب دیکھا کہ یہ سب اس کے فرمان پر عمل نہیں کریں گے تو اپنے بیان کا رخ ان افراد کی طرف کر دیا جو اس پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اس کی بات پر توجہ دیتے ہیں اور عمل کرتے ہیں، لہٰذا مخاطب کی تبدیلی کے سبب بیان میں بھی تبدیلی آ گئی اور پہلے بیان میں عام لوگوں کو مخاطب کر کے یوں فرمایا "كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا" (کھاؤ زمین کی نعمتوں میں سے جو حلال و پاک ہے) لیکن دوسرے بیان میں الفاظ تبدیل کر کے یوں ارشاد فرمایا "كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ" (کھاؤ اس پاک رزق سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے) یہ تبدیلی اس لیے کی کہ خدا پر ایمان رکھنے والوں سے اس حکم پر عمل کرنے کی توقع و امید تھی اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں خدائے یکتا کے حضور شکر گزاری کی ترغیب دلانا بھی مقصود تھا کیونکہ وہی اس پر اور اس کی توحید پر خالص ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سوا کسی کی پرستش نہیں کرتے اس لیے "مارزقتم (جو کچھ تمہیں رزق دیا گیا ہے) یا "ما فی الارض" (جو کچھ زمین میں ہے) وغیرہ جیسے الفاظ کی بجائے یہ فرمایا "مَا رَزَقْنٰكُمْ" (جو کچھ ہم نے تمہیں رزق عطا کیا ہے) کیونکہ ان الفاظ میں اس امر کا اشارہ یا ثبوت ملتا ہے کہ وہ افراد (مؤمنین) خداوندِ عالم کو اچھی طرح پہچانتے اور اس کی معرفت رکھتے ہیں اور اپنے قریب سمجھتے ہیں کہ اب انہیں

نام یاد دلانے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ کہنا کافی ہے کہ "ہم نے تمہیں رزق دیا ہے" اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کا پروردگار ان پر نہایت مہربان و شفیق ہے۔

ایک ادبی نکتہ سے ایک اہم مطلب کی طرف اشارہ

اس مقام پر ایک اہم مطلب قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ جملہ: "مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ" میں صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے نہ کہ صفت موصوف کی قائم مقام ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں آیت کا معنی مختلف ہے، پہلی صورت (صفت کی اضافت موصوف کی طرف) میں آیت کا معنی یہ ہوگا: **كلوا من رزقنا الذی كله طيّب** " (کھاؤ ہمارے رزق سے کہ وہ سب پاک و پاکیزہ ہے) جبکہ دوسری صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا "**كلوا من طيب الرزق لا من خبيثه**" (پاک رزق سے کھاؤ نہ کہ ناپاک رزق سے)، دونوں معنوں میں غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ پہلا معنی برمحل اور مقام و موقعہ کے مناسب و موزوں ہے کیونکہ یہ تقرب و عنایت اور مہربانی و مرحمت کا مقام ہے اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ "ہمارے رزق میں سے کھاؤ کہ وہ سب پاک و پاکیزہ ہے"، جبکہ دوسرا معنی اس مقام سے ہرگز موزوں نہیں خاص طور پر جب مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے من گھڑت اصولوں اور ان جاہلانہ نظریات جن کی بنیاد پر خدا کے عطاء کردہ رزق میں سے بعض چیزوں سے اجتناب کیا گیا اور انہیں حرام قرار دے دیا گیا تھا کی نفی کرتے ہوئے خدا کے پاک و پاکیزہ رزق سے استفادہ کرنے کی راہ میں پائی جانے والی ہر رکاوٹ دور کر دی جائے۔

عطائے ربانی پر ادائے شکر کا حکم

○ "وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ"۔

(اور تم اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم صرف اسی کی بندگی کا دم بھرتے ہو!)

اس آیت میں "واشكروا لنا" (تم ہمارا شکر ادا کرو) کی بجائے ارشاد ہوا "وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ" (اللہ کا شکر ادا کرو) تا کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا واضح ثبوت فراہم ہو کیونکہ ذات کردگار کے اسم مبارک کا صریح ذکر ہی توحید کی طرف متوجہ رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور خدا پرستوں کا کمالِ معرفت بھی اس سے وابستہ ہے۔ اس لیے "وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ" کے بعد ارشاد ہوا "اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ" (اگر صرف اسی کی عبادت کرتے ہو) کیونکہ یہ الفاظ "معبود ہونے کے خدا کے ساتھ اختصاص" کو ثابت کرتے ہیں یعنی ان سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں۔ اور اگر ان الفاظ کی بجائے یہ کہا جاتا "ان كنتم تعبدونه" (اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو) تو اس سے معبودیت کا اختصاص ثابت نہیں ہوتا کیونکہ عین ممکن ہے کہ وہ خدا کی عبادت بھی کرتے ہوں اور اس کے ساتھ کسی اور کی بھی!

حرام کی گئی اشیاء کا ذکر

O "اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَةَ وَالدَّمَ وَ لَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیۡرِ اللّٰهِ"۔

یعنی میتہ (مردار) دم (خون) اور لحم الخنزیر (سؤر کا گوشت) کو تم پر حرام قرار دیا گیا ہے، اس کے بعد ارشاد فرمایا "وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیۡرِ اللّٰهِ" (اور وہ بھی حرام کیا گیا ہے جو غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے) اس سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں بتوں وغیرہ کے لیے ذبح کیا جاتا تھا۔

اضطراری حالت میں استثنائی حکم

O "فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ..."

(مگر جو شخص مضطر ہو مگر باغی اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو)

"غیر باغ" یعنی بغاوت کرنے والا اور ظالم نہ بن کر، "غیر عاد" یعنی حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو کر، اس جملے میں "غَیۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ" ادبی قواعد کی رو سے (دونوں حال ہیں اور ان کا عامل "اضطر" ہے (اردو زبان میں اس کا ترجمہ یوں کیا جائے گا۔ پس جو شخص مضطر و مجبور ہو جبکہ وہ ستمگر و سرکش اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو......) بنابرایں آیت کا معنی یہ ہے کہ جو شخص ان چیزوں کے کھانے پر مجبور ہو جائے جو اس پر حرام کی گئی ہیں جبکہ وہ سرکش اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو تو وہ انہیں کھا لے تو اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا، لیکن اگر ظالم و سرکش اور حد سے تجاوز کرنے والا ہو کر وہ چیزیں کھانے پر مجبور ہو جائے جو اس پر حرام کی گئی ہیں تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ اس نے خود ہی حرام کھانے کا سبب (اضطرار و مجبوری) فراہم کیا ہے، اور خداوند عالم کا یہ ارشاد: "اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ" (خدا گناہ معاف کر دینے والا مہربان ہے) اس بات کا ثبوت ہے کہ مؤمنین کو خدا کی طرف سے جو شدید مجبوری کی حالت میں حرام کھا لینے کی اجازت دی گئی ہے یہ ان پر نرمی اور آسانی کے طور پر ہے ورنہ حرام کھانے سے ممانعت کا سبب تو اضطرار و مجبوری کی صورت میں بھی موجود ہے یعنی جس وجہ سے انہیں حرام قرار دیا گیا وہ وجہ انسان کے مجبور ہو جانے کی حالت میں بھی موجود ہوتی ہے۔

ما انزل اللہ کا کتمان!

O "اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ الۡکِتٰبِ... الخ"۔

(جو لوگ کتمان کرتے ہیں اس کا جو اللہ نے کتاب نازل کی۔۔)

یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے کہ بہت سی چیزیں ان پر حلال تھیں مگر ان حلال اور پاک و پاکیزہ چیزوں کو ان کے بزرگوں اور حکمرانوں نے ان پر حرام کر دیا اور اپنی ذاتی اغراض کی بناء پر عبادات وغیرہ میں تحریمی احکام صادر

کر دیئے، حالانکہ ان کے پاس جو کتاب ہے اس میں ان پاک و پاکیزہ چیزوں سے ہرگز نہی وممانعت نہیں کی گئی اور انہوں نے کتاب میں مذکور حقیقت کو صرف اس لیے چھپایا تا کہ اپنی ریاست واقتدار، جاہ ومقام اور مالی فوائد کا تحفظ کر سکیں۔

اس کے علاوہ یہ آیت آخرت میں "تجسّم اعمال" کے مسئلہ کو بھی ثابت کرتی ہے اور اس بات کو واضح کرتی ہے کہ قیامت کے دن ان اعمال کے نتائج حقیقی صورت میں مجسم ہوں گے کیونکہ ابتداء میں ارشاد ہوا کہ انہوں نے احکام الٰہی کو نہایت کم قیمت پر بیچ کر جو کمایا ہے وہ آگ کھانے کے سوا کچھ نہیں، اس کے بعد ارشاد ہوا کہ انہوں نے احکام الٰہی کے بیان پر جس قیمت کے حصول کو ترجیح دی ہے وہ درحقیقت گمراہی کو ہدایت پر اور عذاب کو مغفرت پر ترجیح دینے سے عبارت ہے، پھر آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ "کس چیز نے انہیں آتش جہنم کے سہ لینے کا سبق دے دیا ہے"۔ بہرحال ان لوگوں نے بظاہر جو کام کیا وہ آیات واحکامِ الٰہی کا کتمان اور ان پر پردہ ڈالنا اور اس کام پر ڈٹے رہنا تھا اور اس کی بابت گونا گوں الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور ان کے اس عمل کو مختلف زاویوں سے ذکر کیا گیا ہے (غور کریں)۔

روایات پر ایک نظر

شکاری اور چور کا استثنائی حکم

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے آیت مبارکہ "فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

(الباغی باغی الصید، والعادی السارق، لیس لهما ان یاکلا المیتة اذا اضطرا الیها، هی حرام علیهما لیس هی علیهما کما هی علی المسلمین ولیس لهما ان یقصرا الصلاة)

باغی اسے کہتے ہیں جو شکار کھیلنے جائے اور عادی سے مراد چور ہے ان دونوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ مردار کا گوشت کھائیں جب انہیں مردار کا گوشت کھانے کی شدید مجبوری لاحق ہو، مردار ان دونوں پر حرام ہے، اس سلسلے میں ان میں اور دیگر عام مسلمانوں میں فرق ہے کیونکہ عام مسلمان جب شدید مجبوری سے دوچار ہوں تو ان کے لیے مردار کا گوشت کھانا جائز ہے لیکن ان دو کو یہ حق حاصل نہیں اور نہ ہی وہ اس سفر میں نماز قصر کر سکتے ہیں۔

باغی اور تعدی کرنے والے کے بعض مصادیق

تفسیر ''العیاشی'' میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: باغی سے مراد ظالم اور عادی سے مراد غاصب ہے۔(الباغی الظالم، والعادی الغاصب)

حمادؒ سے منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: آیت مبارکہ میں (غَيْرَ بَاغٍ) سے مراد یہ کہ وہ امام مسلمین سے بغاوت نہ کرنے والا ہو اور (وَّلَا عَادٍ) سے مراد یہ ہے کہ معصیت وگناہ کا ارتکاب کر کے اہل حق کے راستہ سے تعدی و تجاوز اور انحراف کرنے والا نہ ہو۔

مجمع البیان کی روایت

تفسیر مجمع البیان میں امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے منقول ہے کہ 'غَيْرَ بَاغٍ' سے مراد یہ ہے کہ اس نے امام مسلمین کے خلاف بغاوت نہ کی ہو اور ''وَّلَا عَادٍ'' سے مراد یہ ہے کہ وہ گناہ و معصیت کا ارتکاب کر کے اہل حق کے راستہ سے منحرف نہ ہو گیا ہو۔

مذکورہ بالا روایات میں ''باغی'' اور ''عادی'' کے جو معانی ذکر کیے گئے ہیں وہ سب ان کے مصادیق ہیں (جن پر ان کی تطبیق ہوتی ہے) اور اس سے اس معنی و مفہوم کی تصدیق ہوتی ہے جو ہم نے ان الفاظ سے بظاہر سمجھا ہے۔

آتش جہنم پر صبر کیونکر؟

کافی اور تفسیر العیاشی میں ''فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ'' کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کس طرح اس کام کو انجام دیتے رہتے ہیں کہ جس کے بارے میں انہیں معلوم ہے کہ وہ انہیں آتش جہنم کی طرف لے جائے گا۔(ما اصبرهم على فعل ما يعلمون ان يصيرهم على النار)

امام جعفر صادقؑ کے ارشادات

تفسیر مجمع البیان میں علی بن ابراہیم کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ'' سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ آتش جہنم کی بابت کتنے بے باک وجری ہیں!

اس سلسلے میں ایک اور روایت میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جہنمیوں کے اعمال انجام دیتے ہیں (ان کے اعمال جہنم والوں کے اعمال جیسے ہیں)۔

مذکورہ بالا تمام روایات معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کیونکہ پہلی روایت میں "آگ پر صبر" کرنے کی تفسیر آگ کے سبب پر صبر کرنے کے ساتھ کی گئی ہے (وہ کام انجام دیتے رہنا جو آتش جہنم کی طرف لے جاتا ہے)، اور دوسری روایت میں اس کی تفسیر "آتش جہنم کی بابت جری ہونے" کے ساتھ کی گئی ہے جو کہ "آگ پر صبر" کا لازمی اثر اور اس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے، اور تیسری روایت میں اس کی تفسیر "جہنم والوں کے اعمال جیسے کام انجام دینے" کے ساتھ کی گئی ہے کہ اس کی بازگشت پہلی روایت میں مذکورہ معنی کی طرف ہوتی ہے۔ لہذا یہ تینوں روایات ایک دوسرے سے قریب المعنی ہیں۔



آیت ۱۷۷

○ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ

○ ”نیکی صرف یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق و مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیک تو وہ ہے جو خدا، قیامت کے دن، فرشتوں، کتاب الٰہی اور انبیاء پر ایمان لائے اور مال و دولت سے محبت کے باوجود اسے اپنے قریبوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کرے، اور نماز باقاعدگی سے ادا کرے، زکوٰۃ ادا کرے، اور وہ ایسے ہیں کہ جب وعدہ وعہد کر لیتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں اور ناداری وتنگدستی، بیماری ومصیبت اور دورانِ کارزار صبر کرتے ہیں، ایسے لوگ ہی سچے اور یہی متقی و پرہیزگار ہیں۔ (۱۷۷)

تفسیر و بیان

اس آیت کے شان نزول کی بابت کہا گیا ہے کہ جب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا تو لوگوں میں سخت اختلاف اور نزاع و جھگڑا شروع ہو گیا اور وہ آپس میں شدت کے ساتھ الجھ گئے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ جس میں ان بحثوں میں الجھنے اور آپس میں لڑنے جھگڑنے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے لوگوں کو اصل ہدایت و نیکی کے حصول کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

مشرق و مغرب کی طرف رخ کرنا ہی نیکی نہیں

○ "لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ"۔

(نیکی یہی نہیں کہ تم اپنے رخ مشرق اور مغرب کی طرف کرلو۔۔۔)

اس آیت مبارکہ میں جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں پہلے ان کے اور ان سے مشابہ الفاظ کے معانی ذکر کئے جاتے ہیں:

"بِرّ" (بؔ کے نیچے زیر کے ساتھ) نیکی و احسان میں وسعت کے معنی میں ہے۔

"بَرّ" (بؔ پر زبر کے ساتھ) صفت مشبہ ہے اس سے مراد نیک آدمی اور نیکی و احسان کرنیوالا شخص ہے،

"قِبَلَ" (ق کے نیچے زیر اور ب پر زبر کے ساتھ) کا معنی طرف اور سمت ہے، اور "قِبلہ" بھی اسی باب سے ہے کیونکہ وہ ایک مخصوص سمت ہے،

"ذَوِی الْقُرْبٰی" یعنی اقرباء و رشتہ دار،

"یتامیٰ" یتیم کی جمع ہے، یتیم اسے کہتے ہیں جو والد سے محروم ہو،

"مساکین" مسکین کی جمع ہے، مسکین اسے کہتے ہیں جو فقیر سے زیادہ بدحال ہو یعنی ناداری میں فقیر سے زیادہ بری حالت کا شکار ہو،

"اِبْنَ السَّبِیْلِ" اسے کہتے ہیں جو اپنے اہل و عیال اور گھر والوں سے دور و منقطع ہو جائے،

"رقاب" رَقَبَۃ کی جمع کا صیغہ ہے کہ جس کا معنی گردن اور اس سے مراد غلام ہے،

"بأساء" مصدر ہے جیسے "بؤس"، اس کا معنی سختی و ناداری ہے،

"ضّراء" مصدر ہے جیسے "ضر"، اس کا معنی آفت ومصیبت ہے کہ جو انسان کو کسی بیماری یا زخم یا مال واولاد سے محروم ہوجانے سے لاحق ہوتی ہے۔

"بأس" کا معنی جنگ کی شدت ہے۔

نیکی اور نیک کی اصل حقیقت

○ "وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ...... الخ"۔

(لیکن نیک وہ ہے جو ایمان لائے اللہ پر۔۔۔)

اس جملے میں "بِرّ" (ب کے نیچے زیر کے ساتھ)۔ نیکی۔ کی تعریف اور اس کی وضاحت کی بجائے "بَر" (ب پر زبر کے ساتھ)۔ نیک آدمی۔ کی تعریف وتوصیف ذکر کی گئی ہے تاکہ ان لوگوں کی پہچان ہو سکے جو اس صفت (بِر۔ نیکی۔) کے حامل ہیں اور ان کی تمام صفات بیان ہو جائیں، اور ضمناً اس بات کی طرف متوجہ کرنا بھی مقصود ہے کہ کسی فضلیت یا صفت کے معنی ومفہوم کی اس کے مصداق (جس پر وہ منطبق ہو) کے بغیر کوئی حقیقت واثر ہی نہیں، اور بیانِ مطالب میں قرآنی طریقہ واسلوب ہی یہ ہے کہ اس میں جہاں بھی صفات وخصوصیات اور فضائل وکمالات کا تذکرہ ووضاحت مقصود ہوتی ہے وہاں ان صفات کے معانی ومفاہیم کو بیان کردینے اور ان کی وضاحت وتشریح پر اکتفاء نہیں کی جاتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان صفات کے حامل افراد کا تعارف وتوصیف بھی کر دی جاتی ہے تاکہ کسی موضوع کے تمام پہلو اس کے مصداق کی پہچان کے ساتھ واضح ہو سکیں۔

بہرحال جملۂ "وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ......" نیک وصالح افراد کی تعریف وتوصیف پر مشتمل ہے اور انکی حقیقت حال کی وضاحت کرتا ہے سب سے پہلے ان کے تعارف میں تین چیزوں یعنی اعتقادات، اعمال اور اخلاق کو "مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ..." کے الفاظ میں ذکر فرمایا، پھر ان کے سچا ہونے کی توصیف "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا" کے الفاظ میں اور پھر ان کے تقویٰ وپرہیزگاری کو "وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ" کے الفاظ میں بیان کیا، ان سب کا تفصیلی بیان ملاحظہ ہو:

ایمان واعتقاد کا ذکر

سب سے پہلے نیک وصالح افراد کے ایمان واعتقاد کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد حق تعالیٰ ہوا "مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ" یعنی وہ لوگ خدا، قیامت کے دن، فرشتوں، کتاب اور نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں، یہ صفت ان تمام معارف وعقائد حقہ کی جامع ہے جو مطلوب خدا ہیں اور اس نے اپنے بندوں کو ان مطالب پر

ایمان واعتقاد رکھنے کا حکم دیا ہے، البتہ اس ایمان سے مراد کامل ایمان وعقیدہ ہے کہ جس کے آثار ونتائج ہرگز اس سے جدا نہیں ہوتے، نہ دل میں اور نہ اخلاق واعمال میں، یعنی دل میں کوئی شک وشبہ یا تذبذب واعتراض یا کسی پریشانی و ناگوار حالت کے لاحق ہونے سے ناراضگی وغیرہ نہیں پیدا ہوتی اور نہ برے اخلاق وعادات اور قبیح اعمال کی طرف توجہ ہوتی ہے، اس کا ثبوت کہ آیت سے مراد یہی ہے جو ہم نے ذکر کیا یہ جملہ ہے: "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا" (یہی لوگ سچے ہیں) اس جملے میں ان کے سچا ہونے کو بطور مطلق اور کسی قید وشرط کے بغیر ذکر فرمایا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے سچے ہیں عقیدہ میں بھی اور اعمال میں بھی، دل اور اعضاء وجوارح سے تعلق رکھنے والے ہر کام میں سچے ہیں اور وہی حقیقی معنے میں مؤمن ہیں، جیسا کہ ایک اور آیت میں خداوندِ عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ نساء، آیت ۶۵:

"فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا"۔

(نہیں، تیرے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تجھے اپنے تنازعات وجھگڑوں میں فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں اور پھر جب تو ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو تیرے فیصلہ سے اپنے دلوں میں کوئی ناراضگی ورنجش نہ لائیں اور اسے اس طرح تسلیم کریں جیسے تسلیم کرنے کا حق ہے)

اس طرح وہ لوگ ایمان کے اس چوتھے درجہ پر فائز ہوں گے جو ہم نے اسی سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۱ (اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ...) کی تفسیر میں مراتبِ ایمان کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

اعمال کا ذکر

ایمان واعتقاد کے تذکرہ کے بعد ان کے بعض اعمال کو ذکر فرمایا: وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ"، یعنی وہ:

۱۔ مال ودولت سے محبت کے باوجود اسے

(ا) رشتہ داروں

(ب) یتیموں

(ج) مسکینوں

(د) مسافروں

(ھ) سوالیوں

(و) غلاموں پر خرچ کرتے ہیں، اور

(۲) نماز قائم کرتے ہیں، اور

(۳) زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

تو اس میں ان کا ایک عمل نماز قائم کرنا ذکر کیا گیا ہے جو کہ ایک عبادت وفریضۂ الٰہی ہے اور اس کے بارے میں دیگر آیات میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ عنکبوت، آیت ۴۵:

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ"

(یقیناً نماز فحشاء ومنکر۔۔ برائیوں اور غلط کاموں۔۔ سے روکتی ہے)

سورۂ طہٰ، آیت ۱۴:

"وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِكْرِیْ"۔

(میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو)

اور اس کے بعد زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر ہے جو کہ ایک مالی عبادت اور معاشرے کی معاشی بہتری کا ذریعہ ہے، ان دو یعنی نماز اور زکوٰۃ سے پہلے مال دینے وخرچ کرنے کا ذکر ہوا جو کہ نیکی پھیلانے اور احسان وبھلائی کرنے سے عبارت اور غیر واجب مالی عبادت ہے جس سے ضرورت مندوں کی حاجت روائی واقتصادی ڈھارس ہوتی ہے۔

اخلاقی صفات کا ذکر

عقائد واعمال کا ذکر کرنے کے بعد خداوندِ عالم نے ان کی چند اخلاقی صفات بیان فرمائیں: "وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ"، یعنی وہ:

(۱) جب وعدہ وعہد کرتے ہیں تو اپنے عہد وپیمان کو پورا کرتے ہیں۔

(۲) تکلیفوں، مصیبتوں، پریشانیوں اور شدت کارزار کے وقت صبر کرتے ہیں۔

"عہد" کا مطلب کسی چیز کو اپنے ذمہ میں لے لینا اور اس کا وعدہ کر لینا ہے، اس آیت میں "عہد" بطور مطلق ذکر ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ایمان اور اس سے مربوط احکام کا وعدہ اور انہیں اپنے ذمہ میں لینا شامل نہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے۔ کیونکہ "اِذَا عٰهَدُوْا" کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ عہد وپیمان اور وعدے ہیں جو "کبھی" انجام دیئے جاتے ہیں جبکہ ایمان اور اس سے تعلق رکھنے والے احکام کا عہد وپیمان ایسا نہیں بلکہ وہ ہر وقت اور ہر لحہ باقی ہوتا ہے اس کے لیے کسی وقت اور حالات کی کوئی قید وشرط نہیں اس لیے یہاں "عہد" سے مراد۔ ایمان اور اس سے تعلق رکھنے والے احکام کے علاوہ۔ ہر وہ وعدہ اور عہد وپیمان ہے جو انسان کرے، اس پر پابند ہونے اور عمل کرنے کا ذمہ لے لے مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ میں ضرور فلاں کام انجام دوں گا یا فلاں کام ضرور ترک کروں گا (ہرگز انجام نہ دوں گا) تو یہ

عہد یا معاہدہ ووعدہ کہلاتا ہے اور اس معنی میں وہ تمام عقود جو معاملات ولین دین وغیرہ میں انجام پاتے ہیں شامل ہیں۔

''صبر'' سے مراد سختیوں، مصیبتوں، تکلیفوں، پریشانیوں، ناگوار حالتوں، اور میدان جنگ میں مدمقابل کے سامنے استقامت وپائیداری اور ثباتِ قدم اختیار کرنا ہے۔

بہر حال یہ دو صفتیں یعنی وفائے عہد اور صبر اگرچہ تمام اخلاقی فضیلتوں کی جامع نہیں لیکن ان کی اہمیت وہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ جب یہ دو کسی شخص میں پائی جائیں تو ان کی وجہ سے دیگر تمام اخلاقی صفات خود بخود اس میں وجود پالیتی ہیں، اور یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ وفائے عہد اور سختیوں میں صبر کرنا دو ایسی صفتیں ہیں جن میں سے ایک میں سکون اور دوسری میں حرکت پائی جاتی ہے، وفائے عہد، حرکت ہے اور صبر، سکون سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا ان دو صفتوں سے متصف ہونے کا خاص طور پر ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ (مومنین) ایسے ہیں کہ جب کچھ کہتے ہیں تو اس پر عمل کرتے ہیں اور ہرگز اپنے کہے کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

صداقت وسچائی کا ذکر

پہلے مرحلہ میں اعتقادات، اعمال اور اخلاق کا تذکرہ کرنے کے بعد دوسرے مرحلہ میں خداوند عالم نے ان کی توصیف ان الفاظ میں کی: ''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا'' (یہی لوگ سچے ہیں)، صداقت درحقیقت علم وعمل کی تمام فضیلتوں کی جامع صفت ہے مثلاً عفت وپاکدامنی، شجاعت وبہادری، حکمت ودانائی اور عدل وانصاف اور ان کے فروعات وغیرہ تمام صفات کی بنیاد یہی ہے کیونکہ انسان تین چیزیں رکھتا ہے (۱) اعقیدہ وایمان (۲) قول وگفتار (۳) عمل وکردار، اور جب وہ صداقت اپنائے تو یہ تینوں یکجا ہوجاتی ہیں یعنی وہی کرتا ہے جو کہتا ہے اور وہی کہتا ہے جو عقیدہ رکھتا ہے، اس کا عمل اس کے قول کے مطابق اور اس کا قول اس کے عقیدہ کے مطابق ہوتا ہے، اور چونکہ انسان فطری طور پر حق کو قبول کرنے والا اور باطنی طور پر اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہے خواہ ظاہراً اس کے برعکس کیوں نہ ہو (حق کا منکر کیوں نہ ہوجائے) لہٰذا جب حق کو دل سے تسلیم کرلیتا ہے اور اس میں سچا بھی ہوتا ہے تو اس کی گفتار اس کے عقیدہ کے مطابق اور اس کا عمل وکردار اس کے قول کے عین مطابق ہوتا ہے وہ صرف وہی بات کرتا ہے جس کا عقیدہ رکھتا ہے اور وہی کام کرتا ہے جو کہتا ہے، اسی سے اس کے خالص ایمان، اخلاقی فضائل اور عملِ صالح کی تکمیل ہوجاتی ہے اور وہ کامل مؤمن، پاکیزہ صفات رکھنے والا اور نیک وصالح وباکردار انسان بن جاتا ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ توبہ، آیت ۱۱۹:

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ''۔

(اے اہل ایمان! تقوائے الٰہی اختیار کرو اور سچوں کے ساتھ ہوجاؤ (سچوں کے ساتھ رہو)

بنابرایں ''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا'' میں جو حصر پایا جاتا ہے اس سے ''سچے مؤمن'' کی پہچان کی قرآنی اساس

واضح ہو جاتی ہے اور ان کی مذکورہ بنیادی صفات کی تائید ہوتی ہے۔ اس طرح "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا" کا معنی ۔ واللہ اعلم ۔ یہ ہوگا کہ "اگر تم سچوں کو دیکھنا چاہو تو وہی نیک و صالح افراد ہیں"۔

تقویٰ و پرہیزگاری کا ذکر

تیسرے مرحلہ میں خداوند عالم نے ان کی پہچان اس طرح کروائی: "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ" (یہی لوگ متقی و پرہیزگار ہیں)، اس جملے میں بھی حصر سے مقصود یہ ہے کہ ان لوگوں کے کمال کو بیان کیا جائے کیونکہ جب تک بر اور صدق ۔ نیکی و سچائی ۔ درجۂ کمال کو نہ پہنچیں اس وقت تک حصول تقوی کی تکمیل نہیں ہو سکتی، گویا تقویٰ کا حصول اور اس کا کمال ،صداقت، نیک اعمال بجالانے اور نیکی اختیار کرنے پر موقوف و منحصر ہے۔

یاد رہے کہ یہ صفات جو خداوند عالم نے سچے مؤمنین و ابرار (نیک افراد) کے لیے اس آیت میں ذکر فرمائی ہیں کئی دیگر آیات میں بھی ان کا تذکرہ ہوا ہے مثلاً:

سورۂ دہر، آیات ۵ تا ۱۲:

"اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝"

(نیک و صالح افراد ایسا جام نوش کریں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی ۔ وہ ایسا چشمہ ہوگا جس سے اللہ کے خاص بندے ہی پئیں گے کہ جسے وہ ہر طرف رواں دواں کر دیں گے ۔ وہ ایسے ہیں کہ جو اپنی نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن کا خوف دلوں میں رکھتے ہیں جس کی سختی سب پر چھائی ہوئی ہوگی ۔ اور وہ کھانا کھانے کی طلب و چاہت کے باوجود مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں ۔ (وہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں سے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف رضائے الٰہی کے لیے کھلاتے ہیں تم سے ہرگز کسی جزا اور شکریہ کے طالب نہیں ہیں ۔ ہم اپنے پروردگار سے اس دن کا خوف رکھتے ہیں جو نہایت سخت و ناگوار ہوگا ۔ پس اللہ انہیں اس دن کی سختی سے بچا لے گا اور انہیں تازگی و خوشحالی اور خوشی و مسرت عطا کرے گا ۔ اور انہیں ان کے صبر کے عوض میں بہشت اور ریشم و حریر سے نوازے گا)۔

ان آیات مبارکہ میں خدا اور قیامت کے دن پر ایمان، رضاء الٰہی کے لیے انفاق، وفائے عہد اور صبر کا تذکرہ کیا گیا ہے، ایک اور آیت میں یوں ارشاد ہوا:

سورہء مطففین، آیت ۲۸:

○ ''كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ... يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ...... عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ''

(ہرگز ایسا نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نیک وصالح لوگوں کی کتاب (نامۂ اعمال) علیین میں ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ علیین کیا ہے؟ وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔ کہ جسے بارگاہ الٰہی کے مقربین دیکھتے ہیں۔ نیک وصالح افراد نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔..... انہیں ایسی خالص و پاک شراب پلائی جائے گی جو سربمہر ہوگی..... وہ ایک ایسا چشمہ ہے جس سے مقرب بندے ہی پیئیں گے......)

ان آیات کی سابقہ آیات موازنہ و تطبیق کریں تو نیک وصالح افراد (ابرار) کی صفات و اوصاف اور انجام خیر سے آ گاہی ہو جاتی ہے اور ان میں غور کرنے سے ان کی حقیقت حال واضح ہوتی ہے، ان آیات میں خداوند عالم نے ان کی توصیف ''عباداللہ'' (بندگان خدا) اور ''مقربین'' کے عنوان سے کی ہے اور ان دونوں (عباداللہ، مقربین) کے بارے میں دیگر آیات میں یوں ارشاد ہوا:

سورہء حجر، آیت ۴۲:

○ ''اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ''۔

(''میرے بندوں پر تو ہرگز کوئی تسلط واختیار نہیں رکھتا)

یہ آیت ''عباداللہ'' کی توصیف میں ہے، مقربین کی توصیف میں یوں ارشاد فرمایا:

سورہء واقعہ، آیت ۱۲:

○ ''وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝''

(اطاعت ونیکیوں میں دوسروں پر سبقت لے جانے والے ہی تو سب سے مقدم ہیں وہی مقربین ہیں کہ جو نعمتوں سے بھرے ہوئے باغات میں ہوں گے)

بنابرایں جو دنیا میں اپنے پروردگار کی طرف سبقت اختیار کرتے ہیں وہی آخرت میں اس کی نعمتوں کی طرف سبقت پائیں گے، بہر حال اگر اسی طرز پر دیگر آیات میں غور و فکر اور تدبر و تفکر سے کام لیں تو ان مقربین وصالحین کے بارے میں عظیم حقائق سے آگاہی حاصل ہوگی۔

مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ صالحین وابرار ایمان کے بلند ترین درجہ ومرتبہ پر فائز ہیں جو کہ ایمان کا چوتھا مرتبہ ومقام ہے کہ جس کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے، انہی کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورہ انعام، آیت ۸۲:

o "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ"

(جولوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کوظلم وستم سے آلودہ نہ کیا وہی حقیقی معنی میں امن وامان میں ہوں گے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)

تکلیفوں میں صبر کرنے والے!

o "وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ..."۔

(اور وہ تکلیفوں میں صبر کرنے والے ہیں)

اس جملہ میں "الصابرین" مقام مدح میں ہونے کی وجہ سے منصوب ذکر ہوا ہے (اسے اعراب کے لحاظ سے نصب دی گئی ہے) اور اس کی وجہ صفت صبر کی عظمت کو بیان کرنا مقصود ہے، علم القواعد کے ماہرین میں سے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اگر کسی کلام میں یکے بعد دیگرے صفات واوصاف ذکر کیے جائیں تو کچھ اوصاف مدح وذم درمیان میں ذکر کی جاسکتی ہیں اور ان کا اعراب رفع (پیش) اور نصب (زبر) کے حوالہ سے مختلف ہوسکتا ہے۔ (لہٰذا "الصابرین" جوکہ حالت نصب میں ہے قواعد لغت وادب کے منافی نہیں)۔

روایات پر ایک نظر

ایمان کی تکمیل کا ذریعہ

حضرت پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: (من عمل بهذه الآية فقد استكمل الايمان) "جو شخص اس آیت (۱۷۷) پر عمل پیرا ہوا گویا اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔"

آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی کا بنیادی فلسفہ ہمارے سابقہ بیانات اور مذکورہ مطالب سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے اور جس اساس وبنیاد پر ایمان کے کامل ہونے کا ذکر آپؐ نے فرمایا اس سے آگاہی حاصل ہوتی ہے لیکن "زجاج" اور "فراء" کے حوالہ سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ یہ آیت صرف انبیاء معصومینؑ سے مخصوص ہے کیونکہ اس میں جو صفات واوصاف ذکر ہوئی ہیں وہ سب سوائے پیغمبران الٰہی کے کسی میں یکجا نہیں ہوسکتیں اور کوئی شخص پورے طور پر۔ کما حقہٗ۔ ان کا حامل

نہیں ہوسکتا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آیات شریفہ کی بابت اچھی طرح غور وفکر اور تدبر سے کام نہیں لیا جس کی وجہ سے روحانی مراتب ودرجات میں مغالطہ کا شکار ہوگئے اور ان کے درمیان تمیز نہ کر پائے ورنہ ان آیات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان میں مذکورہ صفات انبیاء الٰہی سے مخصوص ہیں اور ان کے علاوہ کوئی بھی پورے طور پر ان کا حامل نہیں ہوسکتا، اس کے ساتھ ساتھ سورۂ دہر کے شان نزول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اہل بیت رسولؐ کے بارے میں نازل ہوا ہے اور اس میں خداوند عالم نے انہیں "ابرار" کے نام سے موسوم فرمایا ہے جبکہ وہ (اہل بیت رسولؐ) انبیاء نہیں تھے، اور جہاں تک "ابرار" (صالحین) کے مقام و مرتبہ کا تعلق ہے تو وہ نہایت عظیم و بلند ہے یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے اُولُوا الۡاَلۡبَابِ " ۔صاحبان عقل وفکر۔ کی توصیف میں پہلے یہ ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ کو قیام وقعود۔ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہر حال میں یاد کرتے ہیں اور وہ زمین وآسمانوں کی خلقت وآفرینش میں غور وفکر کرتے ہیں، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ وہ خدا سے استدعاء والتجا کرتے ہیں کہ وہ انہیں "ابرار" (نیک وصالحین) کے ساتھ ملحق کر دے اور "تَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ" (سورہ آل عمران، آیت ۱۹۳)۔ ہمیں صالحین وابرار کے ساتھ ہی موت دے۔ کی دعا کرتے ہیں۔

ظاہر وباطن میں یکسانیت

تفسیر "درمنثور" میں حکیم ترمذی کے حوالہ سے ابو عامر اشعری سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت پیغمبر خداؐ سے پوچھا: (ما کمال البر) نیکی کا کمال کیا ہے (کامل نیکی کیا ہے)؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: (ان تعمل فی السر ما تعمل فی العلانیة) یہ کہ چھپ کر بھی وہی کام کرو جو ظاہر بظاہر کرتے ہو! (اپنے ظاہر وباطن میں یکسانیت برقرار رکھو)

ذوی القربیٰ کون ہیں؟

تفسیر "مجمع البیان" میں امام ابوجعفر محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ آیت مبارکہ میں "ذَوِی الۡقُرۡبٰی" سے مراد حضرت پیغمبر اکرمؐ کے اقرباء (قرابتدار) ہیں۔ (ذوی القربیٰ قرابة النبی)

یہ حدیث "ذَوِی الۡقُرۡبٰی" کے مصداق کے بیان پر مشتمل ہے جیسا کہ آیت ۲۳ سورۂ شوریٰ میں "ذَوِی الۡقُرۡبٰی" سے مراد پیغمبرؐ کے اقرباء ہیں۔

فقیر، مسکین اور بائس کے معانی

کتاب الکافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: "فقیر" اسے کہتے ہیں جو کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرے، "مسکین" اسے کہتے ہیں جو مالی لحاظ سے فقیر کی نسبت زیادہ تنگدستی کا شکار ہو اور "بائس" اسے کہتے ہیں جو "فقیر" اور "مسکین" دونوں سے زیادہ مالی طور پر بدحال ہو۔ (الفقیر الذی لا یسئال

والمسکین اجھد منه والبائس اجدھم)

ابن السبیل کا جامع معنی

تفسیر ''مجمع البیان'' میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ ''ابن السبیل'' اسے کہتے ہیں جس کا ہر ایک سے رابطہ منقطع ہو چکا ہو۔(ابن السبیل المنقطع به)

غلام کی آزادی کا شرعی حکم

کتاب ''تہذیب'' میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ اگر ''مکاتَب'' مقررہ رقم ادا نہ کر سکے جبکہ اس نے کچھ رقم ادا کر دی ہو تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: صدقہ کے مال سے اس کی بقایا رقم ادا کی جائے گی کیونکہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: ''وَفِي الرِّقَابِ'' (غلام آزاد کرنے میں)۔

یاد رہے کہ ''مکاتَب'' اس غلام کو کہتے ہیں جس نے اپنے مالک سے معاہدہ کیا ہو کہ اسے وہ پیسے دے کر آزاد ہو جائے گا ''مال الکاتبہ'' اس رقم کو کہتے ہیں جس کی بنیاد پر معاہدہ کیا گیا ہو۔

صبر اور صابرین کے بارے میں!

تفسیر قمی میں ہے کہ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ'' کی تفسیر میں امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بھوک: پیاس اور خوف کے وقت صبر اختیار کرتے ہیں، اور ''حِيْنَ الْبَاْسِ'' کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد جنگ کی شدت ہے۔

آیات ۱۷۸ و ۱۷۹

○ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

○ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

ترجمہ

○ ''اے اہل ایمان! مقتولین کی بابت قصاص کا حکم تمہارے لیے لکھ دیا گیا ہے۔ اور وہ یوں کہ۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ کو قتل کیا جائے گا۔ اور اگر کسی کو اس کے مؤمن بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے (مقتول کے وارث قصاص کا حق معاف کر دیں) تو دیت کے سلسلے میں معقول و موزوں راستہ اختیار کیا جائے (حد سے تجاوز نہ کیا جائے) اور دیت کی ادائیگی میں نیک روش و حسن سلوک اپنایا جائے، یہ (دیت کا حکم) تمہارے پروردگار کی طرف سے نرمی و آسانی اور رحمت کے طور پر ہے لہٰذا جو شخص اس کے باوجود حد سے تجاوز کرے اور نا انصافی اختیار کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔'' (۱۷۸)

○ ''اور تمہارے لیے قصاص ہی میں زندگی ہے اے صاحبان عقل! تاکہ تم متقی ہو جاؤ'' (۱۷۹)

تفسیر و بیان

قصاص کا واضح حکم

○ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ…"۔

(اے ایمان والو! تم پر قتل میں قصاص واجب کر دیا گیا ہے، آزاد کے بدلے آزاد۔۔۔)

اس آیت میں خاص طور اہل ایمان کو مخاطب کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم قصاص صرف مسلمانوں کے لیے ہے اور جہاں تک غیر مسلموں یعنی کفار ذمی وغیرہ کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں یہ آیت خاموش ہے، بہر حال یہ آیت سورۂ مائدہ کی آیت ۴۵ (اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ) کی تفسیر کے طور پر ہے لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ یہ آیت سورۂ مائدہ کی آیت ۴۵ کی ناسخ ہے اور اس میں مذکور حکم اب منسوخ ہو گیا ہے اس لیے کسی آزاد کو غلام کے بدلے میں اور مرد کو عورت کے بدلے میں قصاص کے طور پر قتل نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال لفظ "قصاص" مصدر ہے "قاص، یقاص" کا، اور "قَصَّ اَثَرَهٗ" کا معنی ہے "اس نے اس کی پیروی کی، اس کے پیچھے پیچھے چلا" اس لیے واقعات و حکایات بیان کرنے والے کو "قصاص" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ گزرے ہوئے لوگوں کے پیچھے جاتا ہے اور ان کے آثار کو ڈھونڈتا ہے، زیر بحث مقام میں قاتل کو قتل کے بدلے قتل کرنے کا عمل "قصاص" سے موسوم کیا گیا ہے اس کی وجہ بھی اصل معنی کی مناسبت ہے اور وہ یہ کہ قاتل ہی کی پیروی میں (اس کے پیچھے چل کر) اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو اس نے دوسرے کے ساتھ کیا (قتل)۔

دیت کا قانونی حق

○ "فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ"۔

(مگر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔۔)

اس جملے میں "مَن" (فَمَنْ) اسم موصول ہے اس سے مراد قاتل ہے اور اسے "عفو" (معاف) کرنے سے مراد

یہ ہے کہ مقتول کے وارث قصاص کی بابت اسے معاف کر دیں اور اسے بطور قصاص قتل کر دینے کے اپنے مسلّم حق سے دستبردار ہو جائیں،

"شَيْءٌ" سے مراد حق قصاص ہے اور اسے (شَيْءٌ کو) بصورت نکرہ ذکر کرنے کا مقصد اس کی عمومیت کا بیان ہے یعنی خواہ وہ حق پورے کا پورا معاف کر دیا جائے۔۔قصاص نہ لیا جائے۔۔یا کچھ معاف کر دیا جائے جیسے اگر مقتول کے وارث زیادہ ہوں اور کچھ معاف کر دیں اور کچھ معاف نہ کریں تو اس صورت میں قصاص نہیں ہوگا بلکہ دیت (خوں بہا) ہوگی، بنابرایں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جب قاتل کو اس کے مسلمان بھائی کی طرف سے قصاص کا کچھ حق معاف کر دیا جائے تو اس صورت میں قصاص (قتل کرنے) کا حکم جاری نہیں ہوگا بلکہ اس پر واجب ہوگا کہ وہ دیت دے، ضمناً یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں "ولیٔ دم" یعنی مقتول کے وارث کو قاتل کا "اخ" (بھائی) کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ محبت و نرمی اور عفو و مدارات کے احساس کو برانگیختہ کرنا ہے اور اس امر کی طرف اشارہ و توجہ دلانا مقصود ہے کہ عفو و درگذر ہر حال میں پسندیدہ صفت ہے بالخصوص قصاص کے وقت!

نیک سلوک و احسان کا حکم

○ "فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ"۔

یہ جملہ "مبتدا" ہے اس کی خبر محذوف ہے یعنی "علیہ"۔ اس کا معنی یہ ہے کہ: جب مقتول کا وارث قصاص کے حق سے دستبردار ہو جائے اور معاف کر دے تو اس پر لازم ہے کہ دیت (خون بہا) کا مطالبہ کرنے میں معقول و موزون اور اچھی روش اپنائے، اسی طرح قاتل پر بھی لازم ہے کہ دیت ادا کرنے میں اپنے بھائی (مقتول کے وارث) کے ساتھ نیک سلوک کرے اور ادائیگی میں کوتاہی و سستی کا مظاہرہ کر کے اسے رنجیدہ خاطر نہ کرے۔

خدا کی طرف سے نرمی و رحمت

○ "ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ"۔

(یہ تمہارے رب کی طرف سے نرمی و رحمت ہے)

اس سے مراد یہ ہے کہ قصاص کے حکم کو دیت کی ادائیگی میں بدل دینا تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نرمی و رحمت سے عبارت ہے اور اس میں دوبارہ کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی، بنابرایں معاف کر دینے کے بعد مقتول کے وارث کو قصاص کرنے کا حق حاصل نہیں ورنہ یہ زیادتی، ظلم اور حد سے تجاوز کرنا ہوگا اور جو شخص اس زیادتی کا مرتکب ہو کر قصاص کرے۔ جبکہ پہلے معاف کر چکا ہو۔ تو وہ خدا کی طرف سے دردناک عذاب کا شکار ہوگا۔

قصاص میں زندگی ہے

○ "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ"۔

(اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے صاحبان عقل! تاکہ تم متقی ہو جاؤ)

یہ جملہ حکم قصاص کی بنیادی حکمت کو بیان کرتا ہے اور اس سوال کا جواب بھی ہے جو بعض لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے کہ "معاف کر دینا اور خوں بہا لے لینا قصاص کرنے سے بہتر ہے کیونکہ اس سے (عفو اور دیت کے ذریعے) معاشرے میں نرمی و رحم دلی اور مدارات کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور عفو و درگذر کرنا لوگوں کی صلاح و بہتری کا ضامن ہے"۔

اس جملے میں اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ عفو و درگذر کرنا اگرچہ رحم دلی و نرمی کے جذبہ و احساس کو جنم دیتا ہے لیکن جہاں تک تمام افراد معاشرہ کی بہتری کا تعلق ہے تو وہ صرف قصاص کے ذریعے ممکن ہے اس کے بغیر اجتماعی زندگی کی بقاء کی ضمانت نہیں دی جا سکتی اور عفو و درگذر اور دیت وصول کرنے وغیرہ سے اس طرح کی ضمانت نہیں مل سکتی، اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر صاحب عقل و شعور اور اہل فکر و نظر اس کی تصدیق کرتا ہے۔

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" حکم قصاص کی علت (و ہدف) کے بیان پر مشتمل ہے اس کا معنی یہ ہے کہ شاید (یا تاکہ) تم قصاص کے پیش نظر قتل کے ارتکاب سے رک جاؤ۔

یہاں یہ اہم نکتہ قابل ذکر ہے کہ ہمارے بزرگ علماء و ارباب دانش نے فرمایا ہے کہ آیت "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ...... الخ" اختصار و اجمال، حروف کی کمی، لفظوں کی روانی اور ترتیب و ترکیب کی خوبصورتی و دلکشی کے ساتھ قرآن مجید کی نہایت بلیغ اور فصیح ترین آیات میں سے ایک ہے، اس میں بیان حقائق و اظہار اسرار کا مخصوص انداز اس کی فصاحت و بلاغت کو چار چاند لگائے ہوئے ہے، یہ آیت کتاب الٰہی کا ایسا عظیم و منفرد شاہکار ہے جس میں نہایت مضبوط و قوی استدلال اور معنے کی لطافت و جمال کو حسن ادا و جمال بیان کے ساتھ لطف دلالت و وضوح مطلب سے ہم رنگ و یکجا کر دیا گیا ہے اس کے معانی و مفاہیم و حقائق اپنی تمام تر باریکیوں کے باوجود اس کی جبین استدلال پر چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں یہاں تک کہ اس سے پہلے اہل فصاحت و بلاغت نے قصاص و قتل کے باب میں جو عمدہ تعبیرات اور کمال ادب کے شاہکار جملے پیش کیے وہ سب اس آیت کی فصاحت و بلاغت اور حسن ترتیب کے سامنے ماند پڑ گئے، نمونہ کے طور پر عرب شعراء و اہل ادب اور صاحبان فصاحت و بلاغت کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

○ "قتل البعض احیاء للجمیع"۔

(کچھ کو قتل کرنا (قصاص) سب کو زندگی دینا ہے)

○ "اکثروا القتل لیقل القتل"۔

(کثرت کے ساتھ قتل کرو (قصاص لو) تاکہ قتل کرنا کم ہو جائے)

اور سب سے زیادہ مرغوب و دلکش جملہ جسے وہ اپنی فصاحت و بلاغت کا عظیم شاہکار سمجھتے تھے یہ ہے:

"القتل انفی للقتل"

(قتل (قصاص) ہی قتل کا راستہ روکتا ہے)

لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان تمام جملوں پر غالب آ گئی اور ان کی فصاحت و بلاغت کو مات دے گئی اور وہ سب ایوان فراموشی کے سپرد ہو گئے کیونکہ "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ" (تمہارے لیے قصاص ہی میں زندگی ہے) کم الفاظ اور آسان تلفظ کے ساتھ ساتھ جن بلند پایہ معانی و حقائق کا حامل یہ جملہ ہے اس کی مثال کسی کلام میں نہیں ملتی اور کوئی ادیب اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا چنانچہ اس کے امتیازات میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں قصاص کو معرفہ (القصاص) اور حیٰوۃ کو نکرہ (حیٰوۃ) کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ اس کا نتیجہ (یعنی حیات و زندگی) اس (قصاص) سے زیادہ بہتر و ہمہ گیر اور مثبت و عظیم نتائج کا حامل ہے اور یہ آیت اسی نتیجہ اور حکم قصاص کے بنیادی مقصد یعنی حیات کے بیان پر مشتمل اور اس کی غرض و غایت کی مکمل و واضح تفسیر پیش کرتی ہے کیونکہ "قصاص" ہی کے ذریعے یہ عظیم مقصد یعنی زندگی کا حصول ممکن ہے نہ کہ "قتل" کے ذریعے، اس لیے آیت میں لفظ "قصاص" ذکر کیا گیا ہے جبکہ مذکورہ جملوں اور ادیبوں کے کلام میں اس کے بجائے "قتل" کا لفظ ذکر کیا گیا ہے جبکہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ "قتل" سے زندگی نہیں ملتی جبکہ "قصاص" سے زندگی ملتی ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ "قتل" عداوت و دشمنی کی بناء پر انجام پائے تو اس میں زندگی ملنے کا کیونکر تصور ہو سکتا ہے، یہ تو قصاص ہے کہ جس میں حصول حیات کی روشنی نظر آتی ہے۔

اس کے علاوہ "قصاص" کے ضمن میں جن دوسری چیزوں کو ذکر کیا گیا ہے وہ سب حصول حیات کا سبب ہیں مثلاً قتل کے علاوہ قصاص کی دیگر اقسام، کیونکہ "قصاص" کا مفہوم "قتل" کے مفہوم سے زیادہ وسیع و ہمہ گیر ہے اس میں وہ تمام اقسام شامل ہیں جن سے انسانی معاشرہ کی اجتماعی زندگی وابستہ ہے۔

اس آیت کی ایک اور ادبی و علمی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اتباع و پیروی کے معنی و مفہوم کو جس خوبصورت انداز میں لفظ "قصاص" کے ذریعے بیان کیا گیا ہے وہ اپنی نوعیت میں بے مثال ہے جبکہ "القتل انفی للقتل" کے جملہ میں حصولِ حیات کے اس سبب یعنی اتباع و پیروی کا دور سے اشارہ بھی نہیں ملتا۔

یہ ہے لفظ "قصاص" کے حوالہ سے آیت کی امتیازی حیثیت، اس کے علاوہ لفظ "حیواۃ" کے بصورتِ نکرہ ذکر کرنے میں جو اہم ترین راز پوشیدہ ہے وہ جستجو اور تلاش مطلوب کے جذبہ کو برانگیختہ کرنے سے عبارت ہے کیونکہ اس لفظ سے ایک باقدر و قیمت اور باعظمت زندگی کے وجود کی نشاندہی ہوتی ہے کہ جو افراد بشر سے مخصوص ہے اور وہ اس کی بابت غفلت کا شکار ہو چکے ہیں لیکن ان کے لیے اس کا حصول ناگزیر ہے اس لیے انہیں چاہیے کہ وہ اسے پانے کی بھرپور کوشش کریں، یہ اسی طرح ہے جیسے آپ کسی سے کہیں: تیرے لیے فلاں جگہ یا فلاں شخص کے پاس مال و دولت رکھی ہوئی ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کے دل میں اس کے حصول کا جذبہ موجزن ہو جائے گا اور وہ اس کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لائے گا تاکہ اس

سے محروم نہ ہو۔

مذکورہ بالا تمام امتیازی خصوصیات کے علاوہ اس آیت مبارکہ کے الفاظ میں انداز بیان کی جو منفرد صورت موجود ہے اس سے اس امر کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ بات کرنے والا صرف اپنے مخاطب افراد کی بہتری و فائدہ اور بھلائی چاہتا ہے اسے اس میں ذاتی و شخصی کسی نفع کا حصول مقصود نہیں اس لیے اس نے ارشاد فرمایا "لکم" (تمہارے لیے......)۔

یہ ہیں اس آیت شریفہ کے چند امتیازی علمی و ادبی پہلو اور لطیف نکات! ان کے علاوہ کئی دیگر خصوصیات بھی ذکر کی گئی ہیں جن سے آگاہی حاصل کرنا آیت کے الفاظ و ترتیب اور ترکیب و معانی کی بابت مزید غور کرنے پر موقوف ہے، تاہم اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت کی بابت جس قدر زیادہ تدبر و تفکر سے کام لیا جائے اس کے حسن و جمال کی تجلیات اور اس کی معنوی نورانیت کے جلوے زیادہ دکھائی دیں گے یہاں تک کہ انسان ان حقائق کا شیفتہ و فریفتہ ہو کر اس کے دریائے عظمت میں غرق ہو جائے گا، ایسا کیوں نہ ہو یہ تو کلام الٰہی ہے اور "کلمة الله هی العلیا" خدا کی بات ہی بڑی ہے۔

روایات پر ایک نظر

قصاص کا ایک عملی پہلو

تفسیر "العیاشی" میں "الحر بالحر" کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

(لا یقتل الحر بالعبد ولکن یضرب ضربا شدیدا و یغرم دیة العبد وان قتل رجل امراة فاراد اولیاء المقتول ان یقتلوه ادوا دیته الی اولیاء الرجل)

آزاد شخص کو غلام کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے سخت (تازیانے) مارے جائیں گے اور اس سے عبد (غلام) کی دیت بھی وصول کی جائے گی، اور اگر کسی مرد نے عورت کو قتل کیا اور مقتول کے وارث اسے قصاص کے طور پر قتل کرنا چاہیں تو انہیں اس مرد (قاتل) کے وارثوں کو آدھی دیت ادا کرنی پڑے گی۔

آیات احکام کی تفسیر

کتاب الکافی میں حلبی سے منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے "فمن تصدق به فهو کفارة له"؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ جس قدر اس نے معاف کیا خداوند عالم اس قدر اس کے گناہوں کو معاف کر دے گا، اور میں نے اس آیت کی بابت پوچھا اس سے کیا مراد

ہے: "فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ"؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص قصاص کا حق رکھتا ہے اگر وہ دیت لینے پر مصالحت کر لے تو اسے چاہیے کہ اپنے مسلمان بھائی کو تنگی و زحمت میں نہ ڈالے اور جس شخص پر حق دیت ادا کرنا واجب ہو جائے اسے چاہیے کہ اس کی ادائیگی میں حتی الامکان کوتاہی و سستی نہ برتے بلکہ نیکی واچھے انداز کے ساتھ اس حق کو ادا کر دے، پھر میں نے امامؑ سے پوچھا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے "فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ"؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد وہ شخص ہے جو دیت کو قبول کر لے یا معاف کر دے یا مصالحت کر لے اور پھر زیادتی کرتے ہوئے اس شخص (قاتل کہ جس کے ساتھ مصالحت ہو چکی ہے) کو قتل کر دے تو اس کے لیے جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے دردناک عذاب مقرر ہے۔

مذکورہ بالا روایت میں جو مطالب ذکر کیے گئے ہیں اس طرح کے مطالب پر مشتمل روایات کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

ایک علمی بحث

تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جس زمانہ میں آیت قصاص نازل ہوئی اس سے پہلے بھی عربوں میں قصاص، قتل کی صورت میں رائج تھا اور وہ اسے تسلیم کرتے تھے البتہ اس کی بابت کسی قسم کی حدود و حدود اور پابندی کے قائل نہ تھے بلکہ یہ کام قبائل کی طاقت یا کمزوری پر منحصر ہوتا تھا چنانچہ کبھی تو مرد کے بدلے مرد کو اور عورت کے بدلے عورت کو قتل کیا جاتا تھا اور اس طرح قتل کی بابت عملی طور پر مساوات و برابری ہو جاتی تھی اور کبھی دس آدمیوں کو ایک آدمی کے بدلے اور آزاد کو غلام کے بدلے اور سردار و رئیس کو مرؤس اور عام آدمی کے بدلے قتل کر دیا جاتا تھا اور کبھی صورت حال یہ ہو جاتی تھی کہ ایک شخص کے قتل کے بدلے پورے قبیلہ کو نابود کر دیا جاتا تھا۔

یہودی بھی قصاص کے قائل تھے جیسا کہ تورات میں سفر خروج کی فصل ۲۱ اور ۲۲ اور سفر عدد کی فصل ۳۵ میں مذکور ہے اور قرآن مجید نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے:

سورہء مائدہ، آیت ۴۵:

"وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ"

(اور ہم نے ان کے لیے تورات میں لکھ دیا (واجب کر دیا) کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے قصاص ہے)۔

نصاریٰ (عیسائیوں) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قتل کی بابت عفو و درگذر اور دیت کے علاوہ کسی چیز کے قائل نہیں تھے، دیگر اقوام اپنے تمام تر اختلافات اور گوناگوں طبقات میں منقسم ہونے کے باوجود اجمالاً قتل میں قصاص کی قائل تھیں اگرچہ اس کی بابت کسی ضابطہ و معین اصول و قانون کا آخری صدیوں تک کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس میں قتل کی بابت ایک درمیانی راستہ اختیار کیا گیا ہے جس میں نہ تو قصاص کی سرے سے نفی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا تعین، بلکہ قصاص کی اجازت بھی ہے اور عفو و دیت کی گنجائش بھی! یعنی مقتول کے وارثوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ قتل کے بدلے قتل کرنا چاہیں تو یہ ان کا حق ہے اور اگر معاف کر دیں اور دیت وصول کریں یہ بھی ان کے اختیار پر منحصر ہے تاہم اسلام

نے قصاص کے باب میں قاتل اور مقتول کے درمیان جنسی صنف کے لحاظ سے برابری و یکسانیت کو ضروری قرار دیتے ہوئے آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہی کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہ تھا قصاص کی بابت ادیان و مذاہب کا نظریاتی جائزہ، لیکن یہاں جس اہم ترین موضوع کے بارے میں بحث کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ کچھ لوگ قصاص کو کسی بھی صورت میں درست قرار نہیں دیتے اور بالخصوص جب قتل کی صورت میں ہو تو ہرگز اسے صحیح نہیں سمجھتے اور بھرپور اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو معاشرتی قوانین ترقی یافتہ قوموں نے بنائے ہیں ان میں اس کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے اور وہ قوانین اس دور میں قصاص بصورت قتل کے نفاذ کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔

قصاص بصورت قتل کو نادرست قرار دینے والے مزید یہ کہتے ہیں کہ:۔

(۱) قتل کے بدلے قتل ایسی چیز ہے جس سے طبع انسانی نفرت کرتی ہے اور انسانی شعور اسے قبیح و مذموم قرار دیتا ہے بلکہ ضمیر انسانیت اسے کسی بھی صورت میں قبول نہیں کرتا اور اسے ممنوع قرار دیتا ہے۔

(۲) اگر پہلا قتل ایک شخص کے ضائع ہونے کا سبب ہوا ہے تو قصاص میں قاتل کو قتل کر دینے سے ایک اور شخص کی جان ضائع ہو جائے گی لہٰذا اس سے "نقصان پر نقصان" (ایک نقصان کے بدلے دوسرا نقصان) ہوگا جو کہ صحیح نہیں۔

(۳) قصاص بصورت قتل قساوت قلب و سنگدلی اور انتقام پسندی ہے اور اس طرح کی بری صفتوں کو لوگوں کی فکری تربیت کے ذریعے ان کے دلوں سے دور کر دینے کی ضرورت ہے اور اسی تربیت کے حوالے سے قاتل کو ضرور سزا دینی چاہیے لیکن وہ سزا قتل کی صورت میں نہ ہو بلکہ قید اور مشقت آمیز کاموں کی شکل میں ہو۔

(۴) مجرم درحقیقت نفسیاتی مریض ہوتا ہے اور عقلی بیماری کی وجہ سے جرم کا ارتکاب کرتا ہے اس لیے اس کا معالجہ ضروری ہے اور اسے نفسیاتی بیماریوں کی علاج گاہوں میں داخل کر کے اس کا علاج کیا جائے لہٰذا قتل کے مجرم کو قتل کر دینا

اس کی بیماری کا مداوا نہیں۔

(۵) معاشرتی قوانین ہمیشہ معاشرے کے تقاضوں کے مطابق اور اس کے حالات کے تابع ہوتے ہیں اور چونکہ انسانی معاشرہ ہمیشہ ایک ہی حال پر نہیں رہتا بلکہ بدلتا رہتا ہے لہٰذا اس سے تعلق رکھنے والے قوانین بھی اس کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، بنابرایں قانون قصاص کو بھی انسانی معاشرے کا دائمی وابدی قانون قرار دے کر موجودہ ترقی یافتہ معاشروں میں نافذ العمل نہیں قرار دیا جاسکتا اور قتل کے بدلے قتل کی قدیم سنت کو اس دور میں بھی باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں بلکہ ضروری یہ ہے کہ معاشرہ اپنے افراد کے وجود سے حتی الامکان استفادہ کرے اور انہیں زندہ رکھ کر ان کی توانائیوں سے فائدہ اٹھائے، اس لیے یہ ممکن ہے کہ قاتل مجرم کو قتل کے علاوہ دوسری سزائیں کہ جو نتیجۃً قتل کے برابر ہوں دی جائیں مثلاً عمر قید یا کئی سالوں کی قید وغیرہ کہ اس طرح دونوں حق حاصل ہوسکتے ہیں معاشرے کا حق بھی اور مقتول کے وارثوں کا حق بھی! لیکن اگر قاتل کو قتل کر دیا جائے تو اس سے معاشرے اور مقتول کے وارثوں کو کیا حاصل ہوسکتا ہے؟

یہ ہیں قصاص بصورت قتل کے قانون کو نا درست قرار دینے والے حضرات کے بیانات اور نظریات کے اہم ترین نکات اور بنیادی پہلو! لیکن قرآن مجید نے ان سب کا جواب ایک ہی جملے میں دے کر حقیقت حال واضح کر دی اور ہر طرح کی غلط فہمی کو دور کر دیا، ملاحظہ ہو:

سورہ مائدہ، آیت ۳۲:

"مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔۔"

(جو شخص ایسے شخص کو قتل کرے کہ جس نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہو اور نہ زمین میں فساد پھیلایا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا، اور جو شخص کسی کو زندہ کرے (موت سے بچالے) تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دی)۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ: انسانی معاشرے میں رائج قوانین اگرچہ معاشرتی بہتری کے بلند پایہ مقصد کے پیش نظر بنائے گئے ہیں اور ان میں افراد بشر کی اجتماعی زندگی کی بھلائی ملحوظ رکھی گئی ہے لیکن ان سب کی اصل واساس اور بنیادی علت، انسان کی طبع وجود ہے کہ جو اسے طبعی کمزوریوں اور تخلیقی احتیاجات کو دور کرنے کی دعوت دیتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ طبع وجود نہ تو افرادِ بشر کی تعداد سے عبارت ہے اور نہ ان کی اجتماعی و معاشرتی وحدت سے بلکہ وہ خود انسانی معاشرے کے وجود میں آنے کا سرچشمہ ہے اور انسانی معاشرہ کا وجود اسی کا شاہکار صنعت ہے بلکہ وہ خود انسان اور اس کی طبیعت وہستی کے سوا کچھ نہیں اسی لیے ایک انسان اور ہزاروں انسانوں پر مشتمل معاشرہ کے افراد میں انسان ہونے کے حوالہ سے کوئی فرق نہیں پایا جاتا بلکہ وجود وہستی کے لحاظ سے سب ایک ہیں اور سب کی حیثیت برابر ہے۔

اور یہ انسانی طبع وجود ذاتاً ایسی قوتوں اور آلات ووسائل سے لیس ہے کہ جن کی مدد سے "عدم" کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیتی بلکہ اسے خود سے دور کرتی ہے" کیونکہ اسے اپنے آپ سے محبت ہے اور اپنی ہستی و وجود سے محبت کرنا اس کی فطرت کا

حصہ بلکہ بنیاد ہے لہٰذا وہ ہر اس چیز سے نبرد آزما ہوتی ہے جو اس کی حیات کے لیے خطرہ بنے یہاں تک کہ اس کے لیے وہ کسی بھی ذریعہ و وسیلہ کو اختیار کرنے سے دریغ نہیں کرتی بلکہ ہر ممکن ذریعہ اپنا کر اپنی زندگی کا تحفظ کرتی ہے خواہ اسے اس مقصد کے لیے کسی کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے چنانچہ آپ ملاحظہ کریں کہ جب کوئی شخص کسی کو قتل کرنے کے لیے اس پر حملہ کرے اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ پائے کہ حملہ آور کو قتل کر دے تو وہ اسے قتل کرنا صحیح و جائز بلکہ ضروری سمجھتا ہے اور اس کی فطرت اسے ایسا کرنے کی ترغیب دلاتی ہے کیونکہ اس کی حیات حملہ آور کو قتل کرنے کے علاوہ بچ نہیں سکتی اور حفظ حیات اس کی فطرت کا بنیادی تقاضا ہے، بنابرایں یہ ترقی یافتہ اقوام ہی ہیں جو اپنے استقلال و آزادی اور قومیت کے دفاع و تحفظ کے لئے خطرناک و تباہ کن جنگوں سے دریغ نہیں کرتیں یعنی وہ اپنی آزادی و قومیت اور استقلال کی پاسداری و تحفظ کے لیے دوسروں کو قتل کرنا روا جانتے ہیں تو اگر کوئی خود ان کو جان سے مارنا چاہے تو آیا اسے موت کے گھاٹ اتارنے کو روا نہیں قرار دیں گے؟ ان قوموں کا تو یہ حال ہے کہ اپنے قوانین کے تحفظ کے لیے بھی کسی کو قتل کرنے سمیت کسی چیز سے دریغ نہیں کرتیں اور اگر ان کے مفادات جنگ کے بغیر محفوظ نہ رہ سکیں تو یہ بے دریغ اس میں کود جاتے ہیں اور ایسی جنگ کی آگ جلاتے ہیں جو پوری دنیائے انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے کر سب کچھ راکھ بنا دے اور نسل انسانی کا نام و نشان باقی نہ رہے، یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہ ترقی یافتہ قومیں اسلحہ کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لینے میں کوشاں نظر آتی ہیں اور ہر قوم یہ چاہتی ہے کہ اس کے پاس دوسروں سے زیادہ طاقتور اور تباہ کن اسلحہ و جنگی ساز و سامان ہو، اور یہ سب کچھ صرف معاشرے کی بھلائی اور اجتماعی حیات کے تحفظ کے لیے کیا جاتا ہے جبکہ معاشرہ انسان ہی کی طبع وجود کا شاہکار صنعت ہے تو پھر خود انسان کے وجود کے تحفظ کے لیے اسے غلط کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ جب انسانی وجود کے شاہکار صنعت یعنی معاشرہ کے تحفظ کے لیے قتل و غارت اور قوموں کو خاک و خون میں لوٹا دینا صحیح و روا ہو تو خود انسان اور اس کی حیات کے تحفظ کے لیے اسے غلط و ناروا قرار دینا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ آیا یہ بات صحیح ہے کہ جس نے ابھی قتل کا عملی ارتکاب نہیں کیا بلکہ صرف اس کی تیاری کر رہا ہو اسے تو قتل کرنے کی اجازت ہو لیکن جس نے یہ جرم انجام دے دیا ہو اور قتل کا مرتکب ہو چکا ہو اسے قصاص کے طور پر قتل کر دینے کی اجازت نہ ہو؟ یہ بات کیونکر قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ انسانی فطرت تاریخی حوادث و واقعات میں عکس العمل (ردعمل) کے قانون کو صحیح قرار دے اور "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" کی بنیاد پر ہر عمل کے ردعمل کو قانونی حیثیت کا حامل سمجھے لیکن قتل کے بدلے قتل کی بابت عمل کے ردعمل کو ظلم قرار دیتے ہوئے اپنے ہی قانون کو توڑ دے؟

اس کے علاوہ یہ امر قابل توجہ ہے کہ اسلام دنیا میں کسی انسان کی قدر و منزلت کی بنیاد اس کا موحد و خدا پرست (دیندار ہونا) قرار دیتا ہے، بنابرایں اسلام کے نقطۂ نظر میں پورا انسانی معاشرہ اور ایک توحید پرست انسان قدر و منزلت کے لحاظ سے یکساں ہیں اس لیے ان دونوں کی بابت اس کا حکم ایک ہی ہے لہٰذا جو شخص کسی ایک مؤمن کو قتل کرے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا کیونکہ دونوں صورتوں میں اس نے حق و حقیقت کی عظمت کو پامال کیا ہے اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے کہ جو کسی ایک

شخص کو قتل کرے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا کیونکہ دونوں صورتوں میں اس کا عمل وجود ہستی کا خون کرنے کے حوالہ سے یکساں ہے، بنابرایں ترقی یافتہ اقوام کی نظروں میں اگر دین، عظمت ومنزلت کے لحاظ سے معاشرہ سے زیادہ نہ سہی اس کے مساوی بھی ہوتا تب بھی وہ دین دار و توحید پرست افراد کے لیے اسی معیار پر فیصلہ کرتے جس پر عام معاشرہ کی بابت سوچتے ہیں اور جس طرح معاشرہ کے تحفظ کے لیے کسی چیز سے بھی فروگذاشت نہیں کرتے اسی طرح ایک مؤمن وخدا پرست کے تحفظ کے لیے بھی کسی کو قتل کر دینا روا جانتے۔

اور اسلام کا قانون قصاص پورے عالم انسانیت کے لیے ہے نہ کہ کسی خاص قوم وقبیلہ یا مخصوص ومعین ملت وگروہ کے لیے! اور یہ ترقی یافتہ قومیں قصاص کے بارے میں جو منفی رائے رکھتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں اپنے افراد کی صحیح تربیت اور اپنی حکومتوں کے حسن سلوک کے یقینی تصور پر اپنے ممالک میں جرائم کی شرح کو نہایت کم سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہماری صحیح تربیت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے عوام جرائم اور قتل وغارت سے نفرت کرتے ہیں اس لیے پہلے تو یہ عمل (قتل) بہت کم انجام پاتا ہے اور اگر کہیں واقع ہو بھی جائے تو اس کی سزا قتل نہیں ہوتی بلکہ مقتول کے وارث اس کے علاوہ کسی سزا پر راضی ہو جائے ہیں۔ لیکن ان قوموں کی اپنے افراد، اپنی حکومتوں اور اپنے حسن تربیت کے آثار کی بابت خوش فہمی یا غلط فہمی پر بحث کرنے کی بجائے ہم عفو و درگزر کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اسلام نہ تو صحیح تربیت اور حسن سلوک کا مخالف ہے اور نہ صحیح تربیت کے اثر و نتیجہ یعنی عفو و درگزر کا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ مقتول کے وارثوں کے لیے قصاص کے حق کو بھی محفوظ قرار دیتا ہے کہ اگر کسی مورد میں مقتول کے وارث قاتل کو قتل کرنے کے علاوہ کسی سزا پر راضی نہ ہوں تو انہیں ایسا کرنے سے روکا نہیں جاسکتا کیونکہ یہ انہی کا حق ہے اور وہی اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں نہ یہ کہ کوئی قانون انہیں اپنے اس مسلمہ حق سے دستبردار ہونے پر مجبور کرے، اور اسلام تو خود دین تربیت و آئین محبت ہے اور اس میں تربیت کی بابت نہایت پاکیزہ اصول موجود ہیں چنانچہ اسی زیر بحث آیت میں بھی اعلیٰ ترین تربیت کے نتائج کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے "فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ" (پس جسے اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو نیکی کے ساتھ اس کا اتباع کرنا چاہیے اور احسان وحسن سلوک کے ساتھ برتاؤ کرنا چاہیے) یہ الفاظ اخلاقی تربیت کے مخصوص انداز کے حامل ہیں اور ان میں عفو و درگزر کے انسانی جذبہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب کسی قوم کی اخلاقی تربیت کا معیار اس قدر بلند ہو جائے کہ وہ عفو و درگزر کو اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھے تو یقیناً وہ کسی بھی انتقامی راہ وروش اپنانے کی بجائے مدارات ومعاف کر دینے کو ترجیح دے گی لیکن اس کے علاوہ دیگر اقوام کہ جو اس طرح کی تربیت سے محروم ہیں ان میں عفو و درگزر اور مدارات کا نتیجہ منفی ہو سکتا ہے جیسا کہ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جرائم پیشہ لوگ اور فتنہ پرور افراد نہ تو قید وزندان سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور نہ مشقت آمیز کاموں سے سبق حاصل کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی نصیحت ان پر اثر کرتی ہے، ان کی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ انسانی حقوق کی پاسداری وتحفظ کا کوئی جذبہ ہی ان میں نہیں پایا جاتا اور قید خانوں میں آرام و آسائش کے جو وسائل ان کے لیے مہیا کیے گئے ہیں وہ ان سے باہر کی ذلت ومشقت آمیز زندگی کی نسبت قابل قیاس ہی نہیں اسی لیے جیل ان کے لیے ہرگز کسی ڈر اور خوف وحشت کا

سبب نہیں بنتی بلکہ وہ اس میں آرام وسکون کا سانس لیتے ہیں ایسے لوگوں کو ہرگز کسی سرزنش وملامت کی پرواہ نہیں ہوتی چنانچہ ایسے افراد کی بابت نرم گوشہ رکھنا اور قاتلوں کے لیے عمر قید وغیرہ کی سزاؤں تک محدود کرنا معاشرے میں جرائم کے خوفناک اضافہ کا سبب ہے جیسا کہ موجود دور میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرف جرائم اور قتل وغارت کا بازار گرم ہے اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، بنابرایں یہ امر نا قابل انکار ہے کہ ایک ہی قانون دونوں قسم کی قوموں (صحیح تربیت پانے والوں اور اس سے محروم لوگوں) کے لیے جرائم کی راہ روکنے میں بنیادی کردار ادا کرسکتا ہے اور وہ ہے قانون قصاص کہ جس کے ساتھ ساتھ عفوو درگزر کی گنجائش بھی موجود ہے اور اس کی عملی صورت نتیجتاً یہ ہوگی کہ جو قوم صحیح تربیت سے بہرہ ور ہو کہ عفوودرگزر ان کے لیے موزوں وموثر ہے وہ یقیناً قانون میں پائی جانے والی عفو کی گنجائش سے فائدہ اٹھاسکیں گے اور اگر کچھ لوگ اخلاقی پستیوں میں گر کر اپنے پروردگار کی پاکیزہ نعمتوں کے کفران کے مرتکب ہوتے ہوئے فسق وفجور اور قتل وغارت کی راہ پر گامزن ہوں کہ جن کی بابت عفوودرگزر منفی نتیجہ رکھتا ہے تو یقیناً ان کے لیے قانون قصاص کے اجراء کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں۔

اور جہاں تک قصاص بصورت قتل پر اعتراض کرنے والوں کی اس بات کا تعلق ہے کہ انسانیت رحمت ونرمی اور محبت ورحمدلی چاہتی ہے جبکہ قصاص میں اس کے برعکس شقاوت وسنگدلی پائی جاتی ہے، تو اس سلسلے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر رحمدلی ونرمی درست نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اسے انسانی فضیلت قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ اس کے لیے بھی محل ومقام دیکھا جاتا ہے اور جو شخص عادی مجرم، شقی القلب وسنگدل اور کسی کی جان ومال کا احترام نہ کرنے والا سرکش وبے رحم ہو اس سے نرمی ورحمدلی معاشرے کے نیک وصالح افراد پر ظلم کرنے کے مترادف ہے اور برمحل وبے محل ہر مقام پر نرمی ورحمدلی پورے معاشرتی نظام کے درہم برہم ہونے، انسانیت کی تباہی اور نیکیوں واچھائیوں کی سرے سے نفی وبطلان کا سبب ہوگئی ہے۔

اور ان کا یہ کہنا کہ قصاص سنگدلی وانتقام جوئی کا نتیجہ ہے، یہ بھی ان کی اس پہلی بات کی مانند ہے کیونکہ ہر انتقام برا نہیں ہوسکتا مثلاً کسی مظلوم کی دادرسی اور حق وانصاف کی خاطر کسی ظالم سے انتقام لینا ہرگز قبیح ومذموم نہیں بلکہ یہ عین عدل وانصاف ہے جو کسی صورت میں مذموم وبرا نہیں ہوسکتا، اس کے ساتھ ساتھ قانون قصاص میں جو اہم نکتہ ملحوظ ہے وہ صرف انتقامی پہلو نہیں بلکہ ایک طرح سے اخلاقی وانسانی حقوق کے احترام کا درس ہے کہ جس کے ذریعہ قتل وفساد کا راستہ روکنا ہے۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قتل درحقیقت نفسیاتی بیماری کی وجہ سے انجام پاتا ہے اور قاتل چونکہ عقلی ونفسیاتی طور پر بیمار ہوتا ہے اس لیے اس کا معالجہ کرنا چاہیے اور اسے نفسیاتی ہسپتالوں میں داخل کرکے اس بیماری سے نجات دلانی چاہیے، تو یہ صرف ایک بہانہ ہے جو مجرم کو سزا سے بچانے کے لیے تراشا گیا ہے (جو کہ بظاہر خوبصورت بہانہ بھی ہے) لیکن ایسا کہنے والے انسانی معاشرے میں ہر طرف پھیلے ہوئے جرائم اور ان کی روز افزوں شرح پر غور کریں تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ اس طرح کے بہانے ہی دراصل ان تمام واقعات اور ناگوار حالات وحوادث کا سبب ہیں اور جو شخص بھی قتل وفساد کا خواہاں ہو اگر اس سے آگاہ ہوجائے کہ اس میں عقلی ونفسیاتی بیماری پائی جاتی ہے اور اسی بناء پر اس کا بہانہ قابل قبول ہوگا اور حکومتوں کا فرض ہے کہ اس کا علاج کروائیں اور اس بناء پر اس کے ساتھ نرمی ورحمدلی اور مدارات کا برتاؤ کیا جائے تو آیا وہ اس صورت میں مزید جرائم نہیں کرے گا اور قتل وغارت کا مرتکب نہیں ہوگا؟

اس کے علاوہ یہ بات بھی درست نہیں کہ قاتلوں اور مجرموں کو جیلوں میں بند کر کے ان سے مشقت آمیز کام لیے جائیں اور ان سے معاشرے کی بہتری کے لیے استفادہ کیا جائے یعنی انہیں معاشرے سے دور رکھ کر جبری طور پر ان سے کام لیا جائے تا کہ ان کے کاموں کے نتائج وفوائد سے معاشرے کے دیگر افراد استفادہ کر سکیں، یہ بات اس لیے درست نہیں کہ جیلوں میں ایسے افراد کا موجود ہونا خود ایک خطرہ ہے اور ان سے استفادہ کی بجائے ان سے پیدا ہونے والے خطرات پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ جو حضرات اس طرح کی باتیں کرتے ہیں ان کے ہاں مروجہ قوانین میں بھی پھانسی کی سزا کو بعض موارد میں قانونی حیثیت دی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نظریاتی طور پر وہ بھی اسے درست تسلیم کرتے ہیں لیکن جب اسلام کے قانون قصاص کا مسئلہ آتا ہے تو وہ حضرات چیخ وپکار کرتے ہیں کہ یہ ظلم ہے، ناانصافی ہے وغیرہ وغیرہ حالانکہ اگر یہ حقیقت میں ظلم ہے تو پھر اسے بعض موارد میں کیوں روا سمجھا جاتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ وہ حضرات بھی پھانسی کی سزا کے دوررس نتائج کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور انہیں بھی اس کی اہمیت کا بخوبی علم ہے لیکن وہ اس سزا کو صرف معاشرتی نقصان کے حوالہ سے تجویز کرتے ہیں جبکہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ طبیعت وفطرت کی نگاہ میں ایک فرد انسان اور تمام انسانوں پر مشتمل معاشرہ میں وجود وہستی کے حوالہ سے کوئی فرق نہیں دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔

آیات ۱۸۰ تا ۱۸۲

○ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۱۸۰﴾

○ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۱﴾

○ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸۲﴾

ترجمہ

○ ''تمہارے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کسی کا وقت آخر قریب ہو تو اگر کوئی اچھی چیز (مال) چھوڑے تو اس کے بارے میں اپنے والدین اور قریبیوں کے لیے اچھی وصیت کرے کہ یہ پرہیزگاروں پر لازمی امر ہے۔'' (۱۸۰)

○ ''اور جو شخص وصیت سن کر پھر اسے بدل دے تو اس کا گناہ انہی لوگوں پر ہوگا جو اسے بدلیں، خدا تو سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔'' (۱۸۱)

○ ''اور اگر کوئی شخص وصیت کرنے والے کے بارے میں اس بات سے ڈرے (اسے اندیشہ لاحق ہو) کہ کہیں اس نے انحراف یا گناہ تو نہیں کیا اور وہ وارثوں کے درمیان صلح و مصالحت کرا دے تو اس پر (وصیت) کی تبدیلی کے سبب کوئی گناہ نہ ہوگا، خدا معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے''۔ (۱۸۲)

تفسیر و بیان

وصیت کا شرعی حکم

O "کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ"۔

(تم پر واجب قرار دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کا وقت آخر نزدیک ہو تو اگر وہ مال چھوڑ جائے تو اچھی وصیت کرے۔۔)

اس آیت مبارکہ میں بوقت احتضار وصیت کرنے کا بظاہر واجب وضروری ہونا بیان کیا گیا ہے کیونکہ "کُتِبَ" (لکھ دیا گیا) کے لفظ سے ظاہراً "وجوب" سمجھا جاتا ہے چنانچہ یہ لفظ قرآن مجید میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس میں متعلقہ کام کا واجب ولازمی ہونا ہی مراد ہوتا ہے اور اس کی تائید آیت کے آخر میں لفظ "حقا" سے بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ بھی "کتب" کی طرح واجب ولازمی ہونے کا معنی دیتا ہے لیکن یہاں "حقا" کو "علی المتقین" کے ساتھ مقید کرنے سے اس کام (وصیت) کا واجب ولازمی ہونا مشکوک ہو جاتا ہے کیونکہ اگر یہ کام واجب ہوتا تو "حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ" (پرہیز گاروں پر حق لازم ہے) کی بجائے "حقاً علی المؤمنین" (مؤمنین پر لازم ہے) کہا جاتا۔

اس آیت کی بابت یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ میراث کی آیت کے ذریعے منسوخ ہو گئی، اگر اس رائے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ اس کا واجب ہونا منسوخ ہوا ہے نہ کہ اس کا استحباب اور بذاتہ اچھا عمل ہونا! اور شاید "حقاً" کو "علی المتقین" کے ساتھ مقید کر کے ذکر کرنا بھی اسی مقصد کے بیان کے لیے ہو کہ وصیت کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب عمل ہے۔

آیت میں لفظ "خیر" سے مراد مال و دولت ہے، گویا کافی مقدار میں مال ہونا چاہیے نہ کہ تھوڑا سا! کیونکہ تھوڑے سے مال کو کون اہمیت دیتا ہے (اور وہ بھی ایسی اہمیت کہ وصیت کو ضروری قرار دیا جائے؟)

"معروف" سے مراد نیکی واحسان اور اچھا عمل ہے۔

وصیت میں تبدیلی کا عدم جواز

○ "فَمَنۡۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ"۔

(پھر جو شخص اسے سننے کے بعد بدل دے تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اسے بدلیں)

اس جملے میں "اثمہ" کی ضمیر (ہٗ) کی بازگشت تبدیل کرنے (بَدَّلَهٗ) کی طرف ہے اور آیت میں مذکور دیگر تمام ضمیریں "وصیت بالمعروف" کی طرف لوٹتی ہیں چونکہ "الوصیۃ" مصدر ہے اس لیے ضمیر مذکر اور ضمیر مؤنث دونوں اس کی طرف لوٹ سکتی ہیں۔

یہاں "عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ" فرمایا ہے جبکہ ممکن تھا کہ "علیھم" (ان پر) کہا جاتا، تو اس کے دو سبب ہیں؛ ایک تو یہ کہ ان کے گناہ کی علت و وجہ یعنی اچھی و پسندیدہ وصیت کو تبدیل کر دینا ذکر ہو سکے اور دوسرا یہ کہ اس کے بعد والی آیت کا اس سے تعلق و ربط (جو فرع کا اصل سے ہوتا ہے) واضح و روشن ہو جائے، بنابراین آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو لوگ اچھی و پسندیدہ وصیت کو تبدیل کر دیں تو اس تبدیلی کا گناہ انہی پر ہوگا جنہوں نے اسے تبدیل کیا۔

اصلاح کرنے والے کا حکم

○ "فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا فَاَصۡلَحَ بَيۡنَهُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ"۔

(جو شخص وصیت کرنے والے کے بارے میں کجروی و ناانصافی یا گناہ کا اندیشہ رکھتا ہو اور ان کے درمیان اصلاح کا اقدام کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں)

"جنف" کا معنی رغبت و میلان اور انحراف و کجروی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی دونوں قدموں کا حلقہ سے باہر کی طرف انحراف کرنا ہے جیسا کہ "حنف" (ح کے ساتھ) کا معنی دونوں قدموں کا حلقہ سے اندر کی طرف چلے جانا ہے،

بہر حال یہاں آیت میں "جنف" سے مراد گناہ کی طرف رجحان و میلان ہے کیونکہ اس کے بعد "او اثما" ذکر ہوا ہے جس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ "جنف" سے مراد گناہ کی طرف میلان ہے۔

یہ آیت سابقہ آیت کا حصہ ہے اور اس کا تعلق اس آیت سے ایسا ہے جیسے فرع (شاخ) کا اصل (جڑ) سے ہوتا ہے بنابراین اس کا معنی (واللہ اعلم) یہ ہوگا: اچھی و پسندیدہ وصیت کو تبدیل کرنے کا گناہ ان پر ہوگا جنہوں نے اسے تبدیل کیا۔ اور اس کے بعد یہ کہ جسے یہ اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے کی وصیت گناہ یا گناہ کی طرف رغبت دلانے والے کام سے متعلق ہے تو وہ وارثوں کے درمیان اصلاح کے پیش نظر وصیت کو اس طرح تبدیل کر دے کہ اس میں گناہ کا کوئی پہلو باقی نہ رہے ایسے شخص پر وصیت کی تبدیلی کا گناہ نہیں ہوگا کیونکہ اس نے اچھی و پسندیدہ وصیت میں تبدیلی نہیں کی بلکہ صرف گناہ یا گناہ کی طرف راغب کرنے والے امر میں تبدیلی کی ہے۔

روایات پر ایک نظر

وصیت سے متعلق ایک شرعی حکم

کتاب کافی، تہذیب اور تفسیر العیاشی میں محمد بن مسلم سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: آیا وارث کے لیے وصیت کرنا جائز ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ہاں جائز ہے، اس کے بعد آپؑ نے یہ
آیت تلاوت فرمائی "اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۖۚ اۨلۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ" (اس روایت کے الفاظ تفسیر العیاشی سے نقل کیے گئے ہیں)۔

قریبیوں کے لئے وصیت کرنا

تفسیر العیاشی میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے پدر بزرگوار کے حوالہ سے امیر المومنین علی علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی ذکر فرمایا: (من لم یوص عند موته لذوی قرابته ممن لا یرث فقد ختم عمله بمعصية) کہ جو شخص مرتے وقت اپنے ان قریبیوں کے لیے وصیت نہ کرے جو اس سے میراث نہیں پا سکتے تو گویا اس کا خاتمہ معصیت پر ہوا۔

وصیت میں مقدار کا تعین

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس آیت (۱۸۰) کی تفسیر میں منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (حق جعله الله فی اموال الناس لصاحب هذا الامر) یہ ایک حق ہے جو خداوند عالم نے لوگوں کے اموال میں امام وقت کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ (راوی نے کہا) میں نے عرض کی: (لذالك حد محدود؟) آیا اس کی کوئی حد معین ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: (نعم) ہاں اس کی حد معین ہے! (راوی کہتا ہے) میں نے پوچھا: کتنی ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: (ادناه السدس و اکثره الثلث) کم سے کم چھٹا حصہ (۱/۶) اور زیادہ سے زیادہ تیسرا حصہ (۱/۳) ہے۔

اسی طرح کی روایت شیخ صدوقؒ نے بھی اپنی مشہور و معروف کتاب من لا یحضرہ الفقیہ" میں امام جعفر صادقؑ کے حوالہ
سے ذکر کی ہے، تو درحقیقت یہ ایک دلچسپ ولطیف نکتہ سنجی ہے جو زیر بحث آیت مبارکہ اور درج ذیل آیت کے یکجا کرنے سے ہوئی ہے۔:

سورہ احزاب، آیت ۶:

"اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا

(پیغمبر اسلام مؤمنوں پر ان کی اپنی نسبت زیادہ حق رکھتے ہیں اور ان (پیغمبر) کی بیویاں ان (مومنین) کی مائیں ہیں، اور قریبی رشتہ دار کتاب اللہ میں (احکام الٰہی کے حوالہ سے) دیگر مؤمنین و مہاجرین کی نسبت ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں کے لیے کوئی نیک عمل انجام دو (ان کے لیے وصیت کرو) تو یہ کتاب میں لکھ دیا گیا ہے)

یہ آیت اس حکم کو منسوخ کرتی ہے جو صدر اسلام میں دینی بھائیوں کے درمیان اخوت ایمانی کے تعلق کی بنیاد پر ایک دوسرے سے میراث پانے کے بارے میں تھا اور اس کی نفی کر کے قرابت داروں کے لیے اس کا اثبات کرتی ہے اور پھر آخر میں ایک استثنائی حکم کو بیان کرتی ہے جو وصیت کرنے والا اپنے دوستوں کے لیے نیک وصیت کرے تو شرعی طور پر ایسا کرنا صحیح و درست ہے، اس کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ طاہرینؑ کو مؤمنین کے اولیاء قرار دے کر ان کے لیے وصیت کرنے کے پسندیدہ و نیک عمل کا استثنائی حکم "اِنْ تَرَكَ خَیْرَا ۖۚ الْوَصِیَّةُ..." کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہی حقیقی قرابت دار ہیں۔ (غور کریں)

وصیت و میراث کی آیتوں کا ربط

تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ میں سے ایک کے حوالہ سے آیت مبارکہ "كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ... الخ" کی تفسیر میں منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (هی منسوخة نسختها آیة الفرائض التی هی المواریث) یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے اس کی ناسخ، آیت میراث ہے۔

اس روایت اور سابقہ روایات سب کو صحیح و قابل عمل قرار دینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ آیت مبارکہ میں وصیت کی بابت جو چیز منسوخ ہوئی ہے وہ اس کا وجوب ہے اور اس کا استحباب اپنے مقام پر باقی ہے، گویا یہ کہ وصیت کرنا واجب نہیں بلکہ سنت و مستحب ہے (تا کہ اس کا ترک گناہ و موجب عقاب نہ ہو)۔

جنف کا معنی

تفسیر ''مجمع البیان'' میں امام ابوجعفر (محمد باقر علیہ السلام) سے ''فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا ...الخ'' کی تفسیر میں منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: (الجنف ان یکون علیٰ جهة الخطاء من حیث لا یدری انه یجوز) ''جنف'' سے مراد یہ ہے کہ وہ کام غلطی سے انجام دے اور اسکے جائز ہونے سے ناآگاہ ہو۔

وصیت کی تبدیلی کا جواز وعدم جواز

تفسیر قمی میں مذکور ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جب کوئی شخص وصیت کرے تو وصی کے لیے اس کی وصیت کو تبدیل کرنا جائز نہیں بلکہ اس پر واجب ہے کہ اسی طرح عمل کرے جس طرح اس نے وصیت کی ہے مگر یہ کہ اس نے حکم خدا کے منافی کس چیز کی وصیت کی ہو اور اپنی وصیت میں گناہ و معصیت اور ظلم کا مرتکب ہوا ہو تو اس صورت میں وصی کے لیے جائز ہے کہ اس کی وصیت کو تبدیل کر کے اسے جائز وصحیح اور حق کے مطابق قرار دے مثلاً کسی کے وارث زیادہ ہوں اور وہ اپنی وصیت میں سارا مال چند وارثوں کے نام کر دے اور دوسرے وارثوں کو محروم کرے اس صورت میں وصی کو حق حاصل ہے کہ وصیت کو تبدیل کر کے اسے حق کے مطابق بنائے تاکہ کوئی حقدار اپنے حق سے محروم نہ ہونے پائے اس لیے خدا نے فرمایا ہے ''جَنَفًا اَوْ اِثْمًا''، ''جنف'' سے مراد یہ ہے کہ وصیت کرنے والا بعض وارثوں کی طرف میلان رکھے اور بعض کو نظر انداز کر دے، اور ''اثم'' سے مراد یہ ہے کہ اپنی وصیت میں آتشکدہ کی تعمیر اور نشہ آور چیزیں بنانے (شراب سازی وغیرہ) کا حکم دے ان صورتوں میں وصی کو حق پہنچتا ہے کہ اس کی وصیت پر ہرگز عمل نہ کرے۔

اس روایت میں ''جنف'' کے معنی کی وضاحت کے بعد جملہ ''فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ'' کا مطلب بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد وارثوں کے درمیان وصیت کرنے والے کے ''جنف'' و ناانصافی کی وجہ سے رونما ہونے والے جھگڑے اور اختلافات کو دور کرنا ہے۔

وصیت میں تبدیلی کے جواز کا سبب

کتاب کافی میں ''محمد بن سوقہ'' سے منقول ہے کہ میں نے امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے آیت ''فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ'' کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس کے بعد والی آیت نے اسے منسوخ کر دیا ہے یعنی ''فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ''، اس کے بعد امام نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وصی کو وصیت کرنے والے کی بابت یہ اندیشہ ہو کہ اس نے اپنی اولاد کے لیے جو وصیت کی ہے اس میں حکم خدا کی نافرمانی پائی جاتی ہے اور وہ ناحق ہے تو اسے حق حاصل ہے کہ اس کی وصیت کو تبدیل کر کے اسے حکم خدا کے مطابق بنا دے اس میں وہ ہرگز گناہگار نہیں۔

اس روایت میں امامؑ نے جو تفسیر ذکر فرمائی ہے وہ درحقیقت ”آیت کی تفسیر آیت کے ذریعہ“ کے باب سے ہے لہٰذا اس میں ”نسخ“ و منسوخ ہونے سے اس کا اصطلاحی معنی مراد نہیں اور ہم ”نسخ“ کی بحث میں ذکر کر چکے ہیں کہ آئمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات عالیہ میں لفظ ”نسخ“ سے بعض اوقات اس کا اصطلاحی معنی مراد نہیں ہوتا بلکہ اسے کسی اور معنی میں استعمال کیا جاتا ہے نہ کہ اس معنی میں جو علماء علم اصول کے ہاں معروف و مصطلح ہے۔

الحمدلله رب العالمین و الصلوٰة علیٰ نبیه محمد و آله الطاهرین، خدا کا شکر ہے کہ المیزان کی پہلی جلد کا ترجمہ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۹۵ء کو بوقت گیارہ بجکر پینتالیس منٹ قبل از ظہر حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر مانچسٹر میں اختتام پذیر ہوا۔ خدایا اس ناچیز عمل کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما!

العبد حسن رضا غدیری
ابن مزمل حسین میثمی الغدیری

الغدیر اکیڈمی کے اہم اشاعتی منصوبے

ماہنامہ الغدیر کی مسلسل اور معیاری اشاعت کے ساتھ ساتھ ہمارے اشاعتی منصوبوں میں قرآنیات اور عقائد و اخلاق، تاریخ، ادب، فقہ اور دعاؤں پر مشتمل کتب کا معیاری طباعت کے ساتھ شائع کرنا شامل ہے۔ الحمدللہ اب تک ہماری شائع کردہ کتب کو قارئین کی طرف سے بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور ماہنامہ الغدیر بھی اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کر چکا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ اپنی تمام مطبوعات کو اہم موضوعات کے ساتھ ساتھ طباعت کے اعلیٰ ترین معیار کا حامل قرار دیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اپنے قارئین کرام کی معاونت مطلوب ہے تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ کتب شائع کر کے اہل ایمان اور علم دوست حضرات تک ایمانی اور علمی دولت کو پہنچا سکیں۔

اب تک جن حضرات نے ہمارے خالص دینی و تبلیغی اشاعتی منصوبوں میں معاونت کی ہے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی مزید توفیق کے لئے دعا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ قارئین کی طرف سے تعاون اور حوصلہ افزائی کا یہ سلسلہ جاری رہا تو ہم اپنے منصوبوں کو مزید وسعت دینے میں کامیاب ہوں گے۔ ہماری مطبوعات کاروباری بنیاد پر نہیں بلکہ خالص دینی جذبہ پر مبنی ہیں اس لئے ان کی قیمتوں میں اصل اخراجات سے کہیں کمتر مقدار مقرر کی جاتی ہے اور بقیہ اخراجات ادارہ اہل خیر حضرات کے تعاون سے پورا کرتا ہے۔ ہم اپنے تمام کرمفرماؤں سے گزارش کرتے ہیں کہ ہمارے اشاعتی منصوبوں میں ہمارے ساتھ شریک کار ہوں اور اپنے اجر و ثواب اور اپنے بزرگوں کی بلندیٔ درجات کے لئے دینی کتب کی اشاعت میں معاونت کریں۔

یہاں یہ بات ذکر کرنا ضروری ہے کہ ہماری اولین ترجیح عالم اسلام کی عظیم علمی تفسیر المیزان فی تفسیر القرآن کی اشاعت ہے جس کی دو جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور دیگر جلدوں کی تدوین و ترتیب اور تکمیل پر تیزی سے کام جاری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مقدس سلسلہ اشاعت کو جاری و ساری رکھنے اور اس میں وسعت دینے میں آپ ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے۔

ہماری مطبوعات انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبرنگ ایجنسی وزارت تعلیم حکومت پاکستان اسلام آباد سے باقاعدہ رجسٹرڈ ہوتی ہیں اس لئے کوئی ادارہ ہماری مطبوعات کو اپنی طرف سے شائع کرنے کا مجاز نہیں اگر کسی شخص یا ادارے کی طرف سے ہماری اجازت کے بغیر کوئی کتاب شائع کی گئی تو قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ ہوگا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے معیار اور غیر منفعتی حوالہ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ جس دینی خدمت اور تبلیغی جذبہ کے تحت ہم کتب شائع کرتے ہیں وہ باقی رہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی خاص عنایات سے نوازے اور ہمیں اس مقدس مشن کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے تمام معاونین کو اجر عظیم دے۔

سید دولت علی زیدی

الغدیر اکیڈمی پاکستان

